قرآن مجید اور عصر حاضر

جو قرآن مجید اور مختلف مذہبی کتابوں کی مشترکہ تعلیمات، عصری مسائل سے متعلق قرآن مجید کے تصورات، قرآن مجید سے متعلق پیدا کی جانے والی غلط فہمیاں، قرآن مجید اور سائنس، دینی مدارس اور عصری دانش گاہوں میں قرآن مجید کی تدریس، نیز عام مسلمانوں کو قرآن سے جوڑنے کے طریقۂ کار جیسے اہم موضوعات پر ملک کے ممتاز اہل علم کے بیش قیمت مقالات پر مشتمل ہے، جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ''بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار'' مورخہ ۲-۴ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ مطابق ۶-۸ فروری ۲۰۱۱ء میں پیش کیے گئے۔

زیر سرپرستی : **مولانا خالد سیف اللہ رحمانی**

ترتیب : **مولانا سید عبدالرشید**

باہتمام :

ناشر : ھدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد-۲

طبع اول ۱۴۳۳ھ — ۲۰۱۲ء

تقسیم کار

معاونین

- ☆ مولانا اشرف علی قاسمی
- ☆ مولانا مصطفیٰ عبد القدوس ندوی
- ☆ مولانا شاہد علی قاسمی
- ☆ مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی
- ☆ مولانا محمد اعظم ندوی
- ☆ مولانا انصار اللہ قاسمی

مجلس مشاورت

- ☆ جناب محمد جعفر
- ☆ اقبال احمد انجینئر
- ☆ جناب سید عظمت اللہ
- ☆ مولانا خواجہ نذیر الدین سبیلی
- ☆ ڈاکٹر سید عبد الرشید
- ☆ حیدر محی الدین غوری

ناشر

ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد-۲

Huda Book Distributors

Publishers, Importers & Exporters

455, Purani Haveli, Hyderabad-500002, India

Ph: 040-24514892, 66481637

E-mail:hudabook@yahoo.com www.hudaboodshyd.com

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی (''العالم'' اُردو کمپیوٹر سنٹر، حیدرآباد، فون نمبر: 9959897621)

فہرست مضامین

تیسرا باب : قرآن مجید اور جدید سائنس

چوتھا باب : قرآن مجید کی تعلیمات — عصری افکار کے تناظر میں

پانچواں باب : قرآن مجید اور غلط فہمیاں

چھٹا باب : ہندوستانی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم

ساتواں باب : دینی مدارس و جامعات میں قرآن مجید کی تدریس

آٹھواں باب : عصری تعلیمی اداروں اور عوام الناس میں قرآن کی تعلیم

نواں باب : متفرق مقالات

⊙ ⊙ ⊙

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور جیسے آفتاب کا وجود خود آفتاب کی دلیل ہے، اسی طرح قرآن خود اپنے حق ہونے اور اللہ کی طرف سے اُتارے جانے کی دلیل ہے، اس نے پہلی قوموں اور اُمتوں کے بارے میں جو خبریں دی ہیں، وہ نہ صرف پہلی مذہبی کتابوں کے مطابق ہیں؛ بلکہ اِن کتابوں میں انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں نے جو نقائص پیدا کردیے ہیں، یہ کتاب ان کی اصلاح بھی کرتی ہے؛ حالاں کہ محمد رسول اللہ ﷺ اُمی شخص تھے، آپ ﷺ نے نہ کسی درسگاہ میں پڑھا اور نہ گذشتہ کتابوں سے استفادہ کیا، نہ کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور نہ اس ماحول میں پچھلی قوموں کے واقعات کا چرچا تھا، قرآن نے مستقبل کے بارے میں بہت سی خبریں دیں اور یہ پیشین گوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں، قرآن نے جس اُسلوب اور لب ولہجہ میں اپنی بات پیش کی ہے، وہ ایسا مؤثر کلام ہے کہ علم وادب کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی، اس نے ان لوگوں کو اس کی نظیر پیش کرنے کے لئے چیلنج کیا، جن کو اپنی زبان وبیان پر ناز تھا اور جو اپنے مقابلہ پوری دنیا کو گونگا اور بے زبان سمجھتے تھے؛ لیکن ہزار مخالفت اور عداوت کے باوجود وہ اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے اور آج بھی قرآن کا یہ چیلنج باقی ہے، قرآن اگرچہ سائنس کی کتاب نہیں ہے؛ لیکن بطور اللہ کی نشانیوں کے قرآن مجید نے بعض کائناتی حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے، حیرت انگیز طور پر یہ حقائق صرف نظری فلسفوں ہی سے نہیں؛ بلکہ مشاہداتی سائنس سے بھی ہم آہنگ ہیں، جہاں سائنسی انکشافات گذشتہ مذہبی کتابوں کو منھ چھپانے پر مجبور کررہے ہیں، وہیں یہ قرآن مجید کی صداقت اور اس کی حقانیت کو روشن صبح کی طرح واضح کررہے ہیں، قرآن مجید کی صداقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے لئے جو قانون عطا کیا ہے، وہ حد درجہ فطرتِ انسانی کے مطابق اور انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ہم آہنگ ہے، آج دنیا کا کوئی نظام قانون ایسا نہیں، جس میں اسلام کے خرمن ہدایت سے خوشہ چینی نہ کی گئی ہو؛ اس لئے کسی صاحب انصاف کو اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ انسانیت کے لئے اس کے خالق کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز زندہ ہوتی ہے، وہ عداوت اور دشمنی کا ہدف بھی بنتی ہے، لوگ اسے نشانۂ تنقید بناتے ہیں اور معاندین اس کی قوت اور اثر انگیزی سے گھبراتے اور خوف کھاتے ہیں؛ چنانچہ اس وقت مغربی دنیا کا قرآن مجید کے ساتھ یہی رویہ ہے، صورتحال یہ ہے کہ مغرب ایک ایسے تمدن کا داعی ہے جو خدا، روحانیت اور اخلاق کے تصور سے خالی ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اس کو قبول نہیں کرسکتا؛ کیوں کہ ہر مذہب کی بنیاد خدا کے تصور پر ہے، ہر مذہب روحانیت کی طرف انسان کو بلاتا ہے، ہر مذہب اخلاقی قدروں کا داعی ہے، اس لئے کوئی بھی مذہب ایسے تمدن کو قبول نہیں کرسکتا؛ لیکن افسوس کہ آج تمام مذاہب نے مغرب کے مادی تصورِ زندگی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، اسلام واحد مذہب ہے اور مسلمان واحد اُمت ہیں، جو خدا بیزاری کے سیلاب کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں، اس لئے پوری مادی دنیا اسلام اور اسلام سے مربوط ہر شئے کو نشانہ بنا رہی ہے اور اس میں سرفہرست پیغمبر اسلام رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید ہے؛ چنانچہ کبھی ہتک آمیز کارٹون بنائے جاتے ہیں، کبھی زہر آلود بیانات دیئے جاتے ہیں اور کبھی قرآن مجید کو جلانے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ صرف اسی بغض و عناد کا نتیجہ ہے جس سے ان کے سینے بھرے ہوئے ہیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں تک قرآن مجید کی حقیقی تعلیمات کو پہنچائیں، پروپیگنڈوں کے جو غبار قرآن کے رُخِ روشن پر ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، اسے صاف کریں اور غلط فہمیوں کے ازالہ پر توجہ دیں؛ کیوں کہ کچھ لوگ تو دانستہ مغالطہ انگیز باتیں کرتے ہیں؛ بلکہ انھوں نے اس کو اپنا اُوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ان پروپیگنڈوں کو سن کر غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئی ہے اور اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس کا شکار ہے، ایسی کوششوں سے گو معاندین کی اصلاح کی زیادہ اُمید نہیں؛ لیکن ایسے سادہ لوح غافلین کا ذہن صاف ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اسی پس منظر میں جب ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' نے اپنے قیام پر دس سال گذرنے کی نسبت کے اعتبار سے ایک سیمینار کرنے کا ارادہ کیا؛ تاکہ ماضی کو پلٹ کر دیکھا جائے اور مستقبل کی طرف نئے حوصلوں کے ساتھ قدم بڑھایا جائے، تو معہد کی مجلس انتظامی نے اس کا مرکزی عنوان ''قرآن مجید'' کو بنایا—— اس مرکزی موضوع کے تحت ذیلی عناوین میں یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ اس دور کے مسائل کو پیش نظر رکھا جائے، سیمینار کے تمام عنوانات اسی پس منظر میں ہیں، قرآن مجید اور مختلف مذہبی کتابوں کے مشترکہ مضامین و واقعات اور شخصیات میں یہ بات پیش نظر ہے کہ یہ معلومات دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوں گی اور یہ بات بھی

واضح ہوگی کہ قرآن کی جن تعلیمات کو ہدف بنایا جارہا ہے، وہ درحقیقت تمام مذاہب کا مشترکہ اثاثہ ہیں، قرآن مجید اور عصری مسائل کے تحت اس دور میں جو سماجی اور بین الاقوامی مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے؛ تاکہ لوگ قرآن مجید کی انسانی فطرت سے ہم آہنگی کو محسوس کرسکیں، قرآن مجید اور سائنس ایک اہم موضوع ہے، جو قرآن کی حقانیت کے لئے ٹھوس دلائل فراہم کریں گے اور انشاء اللہ دعوتِ دین کا کام کرنے والے لوگ اس سے فائدہ اُٹھاسکیں گے۔

سیمینار کا اہم ترین عنوان قرآن مجید سے متعلق وہ غلط فہمیاں ہیں، جو موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ پھیلائی جارہی ہیں، اس موضوع سے متعلق مقالات میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ایسے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے — سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ قرآن مجید تک پوری اُمت اور تمام انسانیت کی رسائی کیسے ہو، اسی مقصد کے لئے قرآن مجید کی تدریس کا عنوان رکھا گیا ہے، جس سے اُمید ہے کہ تعلیمی ادارے اور قرآن مجید کی خدمت سے مربوط اکیڈمیاں فائدہ اُٹھائیں گی۔

''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کے قیام پر گیارہ سال کا عرصہ گذرچکا ہے، اس عرصہ میں اس نے پانچ سو سے زیادہ فضلاء مدارس کی تربیت کی ہے، تقریباً ۱۳۸ — اہم فکری، علمی اور فقہی و دعوتی موضوعات پر معہد کے زیر تربیت فضلاء سے تحقیق کا کام لیا گیا ہے، جس کی ضخامت ساٹھ ہزار صفحات سے بھی زیادہ ہے، ان میں سے تقریباً تین درجن مقالات شائع ہوچکے ہیں اور انھیں عوام وخواص کے درمیان پذیرائی حاصل ہوئی ہے، ادارہ نے آندھرا پردیش میں برادرانِ وطن میں دعوت کے کام کو ایک تحریک بنادیا ہے اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس کے تربیت یافتہ دعاۃ اس اہم خدمت اور بنیادی فریضہ کو ادا کرنے میں مصروف ہیں، قارئین دُعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ ان حقیر کاوشوں کو قبول فرمائے اور معہد کا جو اصل مقصود ہے — افراد کار کی تیاری اور رجال سازی — اس میں اس ادارہ کو کامیابی سے سرفراز فرمائے کہ :

جو کچھ ہوا ہے ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

خالد سیف اللہ رحمانی
(خادم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

۱ر شعبان ۱۴۳۲ھ
۳ر جولائی ۲۰۱۱ء

قرآن مجید اور عصر حاضر

پہلا باب

اہم خطابات اور تجاویز

خیر مقدمی کلمات

جناب محمد جعفر ⊙

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے آج یہ دن دکھایا کہ ’’المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد‘‘ کے قیام کو گیارہ سال کا عرصہ ہو رہا ہے، اس دوران معہد نے کئی میدانوں میں بڑے اہم کام کئے ہیں، پانچ سو سے زائد طلبہ کو تفسیر، حدیث، افتاء، دعوت، انگریزی زبان اور کمپیوٹر کی تربیت دی، ان میں ایک بڑی تعداد امامت و خطابت، مدارس، اسکول اور کالجس میں تدریس، پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا اور دیگر میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے، یہاں سے اب تک تقریباً سو کتابیں مختلف موضوع پر شائع ہو چکی ہیں، اس ادارہ کو ملک کی کئی اہم اور ممتاز شخصیتوں کی سرپرستی حاصل ہے، ہمارے محبوب عالم دین، ملک کی ممتاز شخصیت، فقیہ دکن، شہر حیدرآباد کی آبرو حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جس دور اندیشی، فراست، محنت اور لگن سے اس ادارہ کو چلا رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے، معہد کے دارالافتاء سے لوگوں کی جانب سے پوچھے گئے سوالوں کا شرعی حل بھی پیش کیا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں بھی اس نے اچھی مثال قائم کی ہے۔

معہد کے قیام کو دس سال گذرنے پر ایک ’’دس سالہ جشن‘‘ بھی منایا جاسکتا تھا؛ لیکن وہ صرف مسرت کے اظہار اور مبارکبادی قبول کرنے کا ذریعہ ہوتا، اس اُمت کا مستقبل اس کی دینی روح اور قومی شعور سے جڑا ہوا ہے اور یہ شعور اور اسپرٹ ہمیں قرآن مجید میں جس تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ملتی ہے؛ کہیں اور نہیں ملتی؛ چوں کہ یہ کتاب رہتی دنیا تک کے لئے کتابِ ہدایت ہے، اس پس منظر میں معہد کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس موقع پر ’’قرآن مجید اور اس کی ربانی تعلیمات‘‘ کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا جائے، جس میں ملک اور بیرون ملک کے منتخب علماء اور دانشوران کو دعوت دی جائے اور قرآن مجید کی آفاقی تعلیمات کو سننے اور سنانے میں تین مبارک دن گزارے جائیں۔

⊙ جنرل سکریٹری استقبالیہ: بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار۔

حضرات! میرے پاس شکریہ کے لئے الفاظ نہیں ہیں؛ لیکن دل کے جذبات اپنے اظہار کے لئے الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں، ہم اپنی طرف سے تمام ارکان استقبالیہ اور معہد کے اساتذہ وطلبہ کی جانب سے آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہماری حقیر دعوت پر اپنی تحریریں عنایت کیں اور دور دراز کا سفر کر کے یہاں تشریف لائے۔

اللہ کی ذات سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ محض اپنے فضل وکرم سے اس سیمینار کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے، شروع سے آخر تک ہمارا ہر لمحہ اس کے مبارک کلام کے تذکرے سے معطّر رہے۔ آمین

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خطبۂ افتتاحیہ

مولانا محمد سالم قاسمی صاحب ⊙

الحمد لصاحب الجلالة والصلوٰة والسلام علی صاحب الرسالة . أما بعد !

معززین ملت! میرے لئے یہ ایک غیر معمولی عزوشرف ہے کہ آپ اربابِ فضل وکمال نے اس مبارک محفل میں مجھے طالب علمانہ معروضات پیش کرنے کی عزت بخشی ، میں بصمیم قلب شکر گزاری کے بعد عرض گزار ہوں کہ بیسویں صدی کی حیرتناک سائنسی ترقیات کے ذریعہ چاند اور مریخ تک ریسرچ کی کمندیں ڈالنے والے مادیت میں غرق سائنس دانوں کو اکیسویں صدی نے بھولے ہوئے اس فکر کو تشویش انگیز انداز میں یاد دلایا ہے کہ گذشتہ صدی میں تمہاری تمام تر سائنسی ترقیات کا محور ''انسان'' اور انسانیت سے یکسر بے علاقہ رہا ہے۔

آج علم وخبر کے حیرتناک وسائل کی ایجاد نے فاصلوں کو ختم کرکے وحی ربانی کے عقلی استبعاد کو بے معنی بنادیا، ایسے ہی تیز رفتار سواریوں نے عقلاً براق کے انکار کو ناممکن بنادیا، ایرکنڈیشننگ نے موسموں پر انسان کو قابو یافتہ بنادیا ہے، آسائش اور آرائش کے دلکش وعجیب سامانوں نے عالم جنت کی عقل سے ماوریٰ عجیب وغریب نعمتوں سے اعراض وانکار کو ناممکن بنادیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''**لا عین رأت ولا أذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر**'' (۱) کو انسانوں کے لئے مزید قریب الفہم کردیا ہے۔

نیز زمین کے پوشیدہ خزانوں پر قدرت وتصرف، ہوا اور اس کی لمحہ بھر میں عالمی گردش کرنے والی لہروں پر انسانی اختیار، آگ کے وحشت ناک احراق کو ماچس کی تیلیوں میں بند کرکے انسان نے عناصر کو تابع فرمان بنالیا ہے؛ لیکن یہ سب ایجاداتی عجائب تمہارے بیرون کے لئے کارآمد ہیں؛ لیکن تمہارا اندرون ارتقاء سے یکسر محروم اور بے نصیب ہی رہا ہے۔

لیکن کیا ان تمام ایجادات نے انسانیت کو ظلم سے، قتل وغارت گری سے، عزتوں کی پامالی سے، فریب

⊙ مہتمم: دارالعلوم وقف، دیوبند۔

(۱) بخاری: ۳۲۴۴، مسلم: ۲۸۲۴، عن ابی ہریرۃؓ۔

کاریوں سے، حقوق کے اتلاف سے اور ایذا رسانیوں سے نجات دی ہے، اگر نہیں ملی اور یقیناً نہیں ملی تو یہ صورتِ حال اس کی متقاضی ہے کہ اپنے تمدنی نظام سے پیدا شدہ بے کراں آلام وآفات سے نجات کے لئے علمی وسائنسی کوششوں کا رُخ فلاحِ انسانیت کے نظامِ فطرت کی جانب موڑ دیا جائے۔

نیز یہ بھی لائق توجہ ہے کہ آج یورپ اور امریکہ میں اسلام کی طرف غیر معمولی عوامی رجحان، سابق نامکمل نظام سے اُکتاہٹ کے بعد انسانی فطرت کے لئے آسودگی کا ضامن ہے، کہ جو اپنی اصل اور حقیقی صورت میں قائلین لا اِلٰہ الا اللہ کے سوا کسی کے پاس موجود نہیں ہے، حقیقت ہے کہ سائنس میں غیر معمولی ترقی کے باوجود امریکہ، انگلینڈ، فرانس اور جرمنی وغیرہ کی چکاچوند نے صراطِ مستقیم کو نگاہوں سے اُوجھل کر دیا ہے اور ان کے دلوں کی بے تحاشا تاریکیاں انسانی شعور کو تمیز حق و باطل سے محروم کر رہی ہیں، آج اکیسویں صدی میں عقیدۂ توحید کی سکون آفریں دولت سے مالا مال ملت اسلامیہ کے در پر مادیت زدہ طبقہ کو دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔

پس اس عبرتناک پس منظر نے مسلمانوں پر اس بھولی ہوئی حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے، کہ عالمی قیادت کی قطعی یقینی اور عجیب وغریب حکیمانہ رہنمائی مختصر اور جامع ترین تعبیر میں صرف ان ہی کے پاس ہے، کہ جو خاتم الرسل ﷺ نے اپنے درج ذیل ہادیانہ ارشاد میں فرمائی ہے، ضرورت ہے کہ رہنمائی کے حقدار علماء کرام اسے بطور خاص ہمیشہ؛ بلکہ ہمہ وقت پیش نظر رکھیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : من استویٰ یوماہ فھو مغبون ومن کان امسہ خیرا من یومہ فھو محروم . (١)

یعنی جس کے دو دن ترقی میں برابر رہے، وہ نقصان میں ہے اور جس کا گزرا ہوا دن ترقی میں آج سے بہتر رہا، وہ محروم ہے۔

اس بے مثل رہنمائی نبوت کی روشنی میں اس پر غور وفکر کی ضرورت ہے کہ اگر ہماری موجودہ صدی انیسویں صدی سے علمی، فکری اور مادی اعتبار سے برابر رہی ہے تو ہم فلاحی لحاظ سے نقصان میں ہیں اور اگر ہماری انیسویں صدی بیسویں صدی سے بہتر رہی ہے تو ہمیں اپنی محرومی کے اعتراف کے ساتھ اس حرماں نصیبی سے نکلنے کی راہوں کی تلاش کو اپنا موضوع فکر بنانا چاہئے۔

غالبًا اس بارے میں دو رائیں نہیں ہوں گی کہ بظاہر حالات اکیسویں صدی میں ہمارا موضوع اول الذکر

(١) شیخة قاضي المارستان :٣٢٢، عن ابن عمرؓ، وسنده ضعیف جداً، وقال السخاوي في المقاصد :١٠٨٠، رواه الدیلمي عن علي مرفوعاً، وسنده ضعیف.

یعنی تلافی نقصان نہیں بنے گا؛ بلکہ ثانی الذکر یعنی اپنی متاع گمشدہ کی بازیابی کے عزم واحساس کے ساتھ ماضی کے اسباب محرومی کا تجسس اور مستقبل میں مکمل سیادت وحفاظت کا نظم کرنا ہوگا؛ تا کہ ان دونوں یعنی اپنی دینی معنویت کی برقراری کے ساتھ ہدایت نبوت کی روشنی میں دنیوی لحاظ سے ترقی یافتہ اقوام عالم کے دوش بدوش باعزت زندگی گزرنے کا متوازی مسلمانہ لائحہ عمل تیار کرسکیں، جس کے لئے ہمیں آج کے مادی ارتقاء کی اس تدریج کو ملحوظ رکھنا ہوگا، کہ انیسویں صدی میں انسان نے بھاپ کی طاقت پر غلبہ حاصل کیا اور پھر اسی ارتقائی کامیابی کے سہارے بیسویں صدی میں انسان کو اٹمک انرجی تک رسائی حاصل ہوئی اور اب اکیسویں صدی میں فضاؤں، ہواؤں اور خلاؤں تک سائنس ایسے نئے عالمی انکشافات سامنے لارہا ہے، کہ جن سے دین فطرت اسلام کے سوا تمام اقوام واُمم کے بے شمار مختلف مذہبی یا فکری مسلمات ومزعومات کا تار و پود بکھرتا جارہا ہے، بالفاظ دیگر اکیسویں صدی ''وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ'' (الجاثیة:۱۳) کے نئے قرآنی مصداقات کے انکشافات کی صدی ہے۔

آج انٹرنیشنل وسائل علم وخبر کے دور میں عالمی پیمانے پر عصری تعلیم میں مشغول نئی مسلم نسل میں اعلیٰ علمی دینی ذوق کی تولید کے لئے یہ تجرباتی طرز تعلیم کامیاب ثابت ہورہا ہے کہ پاکٹ سائز (جیبی سائز) پر زیادہ سے زیادہ چالیس تا پچاس صفحات پر ابتدائی درجہ کے طلبا اور طالبات کے لئے بک لیٹ میں اسلامی بنیادی عقائد ان کی سمجھ کے مطابق آسان زبان میں ان کے اجمالی دلائل کے ساتھ تیار کئے جائیں، دوسرے درجہ کے لئے اس سے آگے کی بک لیٹ تیار کی جائے، اس ترتیب سے تمام درجات کے مطابق آخر تک ہر سال کی بک لیٹ جو ضروریات دین پر مشتمل ہوں تیار کی جائیں اور ان مختصر ترین بک لیٹ کا حفظ کرانا لازمی قرار دیا جائے، ان کا امتحان بھی حفظ ہی لیا جائے اور یہ ہر سال کی بک لیٹ کو لازمی سبجیکٹ کی حیثیت دے کر ترقی کا مدار کامیابی قرار دیا جائے، اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس مختصر آسان کورس کے ذریعہ بہ تسلسل تمام ضروریات دین سے بآسانی طلبہ کے لئے واقفیت کا حصول متوقع ہی نہیں؛ بلکہ متیقن ہو جاتا ہے کہ یہ مختصر ذریعہ تعلیم ضروری تعلیم دین کا ایک کامیاب ذریعہ ثابت ہوگا، جس میں تجرباتی شواہد بھی موجود ہیں اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جو اصل مقصود ہے وہ یہ کہ اس طرز تعلم سے طلبہ میں اعلیٰ تعلیم دین کا ذوق، شوق کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

یہود کی یہ معاندانہ فتنہ انگیزی ہے کہ مسلمانوں کے مدمقابل خود آنے کے بجائے انھوں نے مسلمانوں اور قرآن کو مسیحیت کا واحد مخالف؛ بلکہ دشمن باور کرادیا ہے اور اسلام کے بارے میں یہ تصور دیا جارہا ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کی تکمیل میں بلا کسی قسم کی اخلاقی یا دینی قید کے کھلے عام اجازت دیتا ہے اور مسلمان قوم مجموعہ عیوب ہونے کی وجہ سے جرائم پیشگی کو اپنا حق سمجھتی ہے، یہ تمام بدترین سازشیں اس اسلامی عقیدۂ توحید کے برخلاف کی

جارہی ہیں، جو کہ کائنات کے جز و کل پر غالب اور تمام انسانی اعمال و افکار پر غلبہ و استیلاء کی خدائی کلید ہے۔

یہی اسلامی عقیدۂ توحید ہے کہ جس نے ''شرک'' و ''شاہیت'' زدہ اہل دانش کو اس حقیقت سے آشنا کیا کہ خالقِ کائنات خدائے واحد ہے، بادشاہ نہیں ہے، توحید اسلامی کا یہ فکری انقلاب شاہی عتاب عظیم کا ذریعہ ضرور بنا؛ لیکن دانشوروں میں فکر توحید کو بدترین شاہی مظالم ختم نہ کر سکے۔

پھر اقتدار و دولت کی ہوس میں عیسائی چرچ (یعنی مذہبی مقتدائیت) شاہیت کے بے پناہ مظالم کا ہم نوا بن گیا؛ اس لئے وہ مذہبی مقتدائیت بھی شاہیت کے ساتھ ذلت ناک شکست اور زبردست عوامی غیظ و غضب کا شکار بن کر اپنی مقتدائیت کھو بیٹھی، پھر استشراق کے عنوانی فریب کے درپردہ یہودی عزائم کا پردہ مسلمانوں نے بروقت چاک کر دیا، اس لئے سراپا عناد یہود نے اسلام کو اپنے زعم باطل کے تحت مشکوک و مشتبہ بنانے کے لئے عالمی میڈیا کو اپنایا، ماضی کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے یہ عالمی عنادی طرز و طریق شدید تر تو تھا ہی؛ لیکن میڈیا کی عالمگیری نے اس کو بدترین بنا دیا؛ لیکن اس مرحلے پر مدد خداوندی بھی لائق شکر اور قابل ذکر ہے کہ بے شمار شدید ترین مراحل عناد کا مقابلہ کرنے والی ملتِ قرآن لاچارگی اور بے بسی سے بفضل خداوندی چوں کہ آشنا نہیں ہے؛ اس لئے مسلمان میڈیا کی فتنہ پروری کے برخلاف تعلیمی راہوں سے تحریری، تقریری، اشاعتی اور تدریسی طریقوں سے نئی نسل کے ذریعہ اس کا توڑ تیار کرنے سے بھی غافل نہیں۔

لیکن مسلمانوں پر عائد کردہ یہودی جھوٹ جب عیسائیوں پر کھلے تو اس کے ساتھ ان کے سامنے تمام اخلاقی قدروں سے خالی نہ صرف خود اپنی نام نہاد تہذیب و ثقافت ہی آئی؛ بلکہ سائنسی ارتقاء کی راہ سے عیسائیوں کے سامنے اپنی بد اخلاقی کو عالم گیر بنانے کا اپنا جرم عظیم بھی سامنے آیا؛ لیکن اس کے باوجود اسلام کو ہدف تنقیص بنانے کے لئے یہود نے ''استشراق'' کا عنوان ایجاد کیا؛ تاکہ اپنی سراپا جرم تہذیب کی طرف سے قومی توجہات کو ہٹا کر اسلام کے برخلاف یہودی فکر بد نہاد کو دنیا کے دماغوں پر مسلط کیا جائے، پس اسلام دشمن مفسد مستشرقین نے اپنے بد فکر شاگردوں یعنی نام نہاد مسلمانوں کے ذریعہ مصر میں جہالت پر مبنی فرعونی تہذیب، عراق میں آشوری تہذیب اور فلسطین و لبنان میں فینیقی تہذیبوں کو زبانوں کے احیاء کے نام پر اسلام دشمنی کے تحت برپا کرنے کی بدترین کوششیں شروع کیں؛ لیکن اسلام کی فطری اور دین حق پر مبنی تہذیب نے بحمد اللہ ان تمام فاسقانہ کوششوں کو زندگی پانے کا موقع ہی نہیں دیا، آج پھر یہ معاندین خاص طور پر یہود، اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں؛ لیکن اسلام کی بقاء و ارتقاء کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے، اس لئے یہ خدا کا مقابلے کرنے والے ان شاء اللہ ذلت ناکامی سے تو دوچار رہوں گے ہی؛ لیکن ملت اسلامیہ پر دورِ حاضر میں اس کے مقابلے کا یہ فرض اس اعلان کے ساتھ پوری قوت سے عائد کر رہا ہے کہ :

دے کے اس تہذیب نمرودی کو پیغام خلیل
آؤ اس آتش کدے میں گلستاں پیدا کریں

محترم حضرات ! مجھے بے حد خوشی ہے کہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قیام کو بہت عرصہ نہیں گذرا ہے؛ لیکن وہ اپنی تعلیمی، تربیتی، تحقیقی اور دعوتی محنتوں اور کامیابیوں کے اعتبار سے اس وقت ایک مثالی ادارہ بن چکا ہے، اس کا فیض دور دور تک پہنچ رہا ہے اور اپنے اکابر اور بزرگوں کے ساتھ اس کا فکری رشتہ پوری قوت کے ساتھ اُستوار ہے، وہ اب قرآن مجید سے متعلق یہ اہم بین الاقوامی سیمینار منعقد کر رہا ہے، سیمینار کے موضوعات خود ادارہ اور اس کے ذمہ دار عزیز محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی فکری بلندی اور زمانہ شناسی کی دلیل ہیں، میں اس سیمینار کے انعقاد پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، دُعاء کرتا ہوں کہ یہ پروگرام ہر طرح سے کامیاب ہو، اللہ تعالیٰ اس ادارہ سے اسلامی علوم کی خدمت لے اور یہاں سے ایسے افراد پیدا ہوں جو پوری دنیا میں لوگوں تک اسلام کی آواز پہنچائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

⊙ ⊙ ⊙

خطبۂ صدارت

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ⊙

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی وبعد!

حضرات ! المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، دینی علوم میں تحقیقی اور مطالعاتی کاموں کی تربیت کا فعال اور تعمیری مرکز ہے، جس کو ملک کے معروف عالم دین وفقیہ جلیل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے قائم کرکے اس کو اس سطح تک پہنچادیا ہے کہ اس میں ہندوستان کے فضلاءِ علم دین آآ کر علمی وتحقیقی کاموں کی تربیت حاصل کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں اس نے نیک نامی کے ساتھ دس سال گزارے اور وہ ملک میں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک معتبر ادارہ بن گیا، کارگزاری کے دس سال گزارنے پر مرکز کے بانی وسربراہ نے قرآن مجید کے تعلق سے ایک مجلس مذاکرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، جو ملک کے علماءِ دین اور شائقین تحقیق علمی کے ایک اجتماع کا ذریعہ بن سکے اور اس موقع سے المعہد العالی الاسلامی کے کام کی اہمیت سے واقفیت کا ذریعہ بھی بنے، اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن مجید کے تعلق سے علمی وتحقیقی مقالے پہلے سے حاصل کرلئے اور طبع کرانے کا فیصلہ کیا اور مجھ سے بھی صدارتی خطبہ کے طور پر مقالہ طلب کیا، میں نے ان کے کاموں کی قدردانی کے اظہار کے طور پر ایک خطبہ تیار کیا، خواہ کوئی خاص مقالہ نہ ہو؛ لیکن شرکت بزم کا حق حاصل کرسکے گا اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی فرمائش پورا کرسکے گا۔

حضرات ! اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی صلاح وبہبود اور فلاح اخروی کی رہنمائی کے لئے نازل کی گئی آخری کتاب قرآن مجید، رضائے الٰہی کے حصول کی راہ کے لئے ایسی مشعل ہدایت ہے کہ اس کی روشنی سے انسانوں کو کوئی استغناء نہیں اور جو بھی اس سے استغناء برتتا ہے وہ حقیقی اور دائمی کامیابی سے محروم ہوجاتا ہے، مزید یہ کہ وہ کلام الٰہی ہونے کی بناپر مقدس کلام اور آسمانی مقام اور بلند وبالا مرتبہ رکھتا ہے؛ اسی لیے اس کی صرف تلاوت بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور رضائے الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کے مضامین اور مطالب دنیاوی زندگی میں صلاح اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہ اپنی اعلیٰ صفات اور خصوصیات کی بناپر حقائق

⊙ ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

واسرار کا گنجینہ ہے، جس کے متنوع پہلو اور اسرار برابر کھلتے رہتے ہیں اور اس کے نئے نئے فوائد سامنے آتے رہتے ہیں، اس کی طرف اشارہ کے طور پر خود قرآن مجید میں کہیں اس کو ''نور'' یعنی اعلیٰ روشنی، کہیں اس کو ''اَلْـمُبِیْـن'' یعنی بات کو واضح کرنے والا، کہیں اس کو ''حکیم'' یعنی حکمت و دانائی والا کلام، کہیں اس کو ''عربی'' یعنی فصاحت و بلاغت کا کلام، کہیں پر اس کو ''ذکریٰ'' یعنی یاد دلانے والا کلام، کہیں اس کو ''ہدیٰ'' یعنی رہنمائی کرنے والا، کہیں اس کو ''فرقان'' یعنی اچھے اور برے کا فرق بتانے والا، کہیں اس کو ''رحمت'' یعنی اپنے ماننے والوں کے لیے خیر اور رحمت کا باعث بننے والا کلام، کہیں اس کو ''شفاء'' یعنی باطنی خرابیوں سے نکالنے والا کلام، کہیں اس کو ''ضیاء'' یعنی روشنی والا کلام، کہیں اس کو ''مبارک'' یعنی برکت عطا کرنے والا کلام، کہیں اس کو ''عزیز'' یعنی مضبوط اور غالب کلام، کہیں اس کو ''کریم'' یعنی عزت دلانے والا کلام، کہیں اس کو ''عَلِیٌّ'' یعنی بلند مقام والا کلام، اور کہیں اس کو ''امّ الکتاب'' یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری کائنات اور مخلوقات کے لیے طے کردہ ارادوں اور رایوں کے دفتر کا خصوصی حصہ قرار دیا گیا ہے، اس طریقہ سے قرآن مجید ایسی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کی متنوع صفات اور خصوصیات ہیں اور انسانی فلاح وصلاح کی ضرورت کے لیے اس سے زیادہ کارگر کوئی کتاب نہیں ہے۔

انسان کے مزاج اور خصوصیات میں جو تنوع ہے ان کی باریکیوں تک کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے؛ اس لئے کہ اسی نے سب کو پیدا کیا اور ان میں خصوصیات اور باریکیاں رکھی ہیں، وہ اپنی اس عظیم کتاب قرآن مجید میں —— جس کو انسان کو سمجھانے کے لئے اور اس کو راہ ہدایت دکھانے کے لئے اس ذات اعلیٰ و برتر اور قادر عظیم نے نازل فرمایا —— انسانوں کو انسان کے مزاجی تنوع اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے سمجھاتا اور رہنمائی کرتا ہے، اور اس سمجھانے اور اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کے ایسے نمونے جن میں انسان کے مزاجی اور نفسیاتی تنوع کی رعایت ہے، اس کے کلام مجید میں بہت مؤثر اسلوب میں پائے جاتے ہیں، اور وہ اس کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں، مثلاً سورۂ تکاثر میں بیان ہے کہ حق سے منحرف انسان میں خود غرضی اور خواہش نفس کے لئے فکرمندی و شوق اتنا بڑھ جایا کرتا ہے اور اس سلسلہ میں وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح منہمک ہو جاتا ہے کہ بالآخر اس کی موت کا وقت آجاتا ہے، اور اس وقت اس کو اپنے برے انجام کا پتہ چلتا ہے کہ ہائے کیا ہوا، اور پھر اپنی غفلت کا انجام جہنم کی شکل میں دیکھتا ہے، اور یہ کہ اب اپنے رب کے سامنے جواب دہی اور حساب دینا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ، حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ، كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ، ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ، كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ، ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ، ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ . (التکاثر:۱-۸)

تم کو (مال ودولت کی کثرت کی فکر) نے غافل کردیا ہے؛ یہاں تک کہ تم قبروں تک پہنچ گئے ، دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا ، پھر دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا ، دیکھو اگر تم جانتے (یعنی) علم الیقین (رکھتے تو غفلت نہ کرتے) ، تم دوزخ دیکھو گے ، پھر اس کو ایسا دیکھو گے کہ عین الیقین (آجائے گا) ، پھر اس روز تم سے (دنیا میں ملی ہوئی) نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی ۔

اسی طرح سورۂ ماعون میں بھی اللہ نے ایسے انسان کی تصویر ظاہر کی ہے ، جو خود غرضی اور من مانی زندگی میں ڈوبا ہوا ہے ، اور اپنے رب کی اطاعت اور حق بات کو قبول کرنے سے بالکل باغی ہوجاتا ہے ، وہ اوّلاً اپنے رب کے احکام کا انکار کرتا ہے ، اور اس کا رویہ یہ ہوجاتا ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے گریز کرتا ہے ، یتیم کو دھتکارتا اور غریب کو کھانے کی مدد دینے کے لئے نہیں کہتا ، اور (اپنے رب کی عبادت) نماز سے غفلت برتتا ہے ، اور دکھاوے کے کام میں لگا رہتا ہے ، اور چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کسی کو دینے میں بخل کرتا ہے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

أَرَأَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ، فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ، وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ، فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ، الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ، الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاؤُوْنَ ، وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ . (الماعون:۱-۷)

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے ، یہ وہی بد بخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے ، اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا ، تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے ، جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں ، جو ریاکاری کرتے ہیں ، اور برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے ۔

اسی طرح سورۂ والعصر دیکھئے : اس مختصر سورہ میں اللہ تعالیٰ کامیاب انسان کی کیفیت پیش فرماتا ہے ، زندگی کے عظیم نقصان سے وہی انسان بچتا ہے جس نے اپنے رب کے احکامات کو تسلیم کیا ہو ، اور ان کے مطابق اچھے اعمال اختیار کئے ہوں ، اور ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی طرف متوجہ کرتا رہا ہو ، اور تبلیغ حق میں اس کو جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہوں یا مخالفتیں ہوتی ہوں تو ان کو بسر وچشم برداشت کیا ہو ، اور برداشت کرنے کا آپس میں مشورہ دیا ہو ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَالْعَصْرِ ، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ ، إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ . (العصر:۱-۳)

زمانہ کی قسم! انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

اسی طرح دیکھا جائے تو قرآن مجید میں بکثرت مثالیں انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے سلسلہ میں انسانوں کے مزاج اور ان کی طبیعتوں کے حوالہ سے بڑی متنوع اور پُر اثر طور پر بیان کی گئی ہیں، ان کے ذریعہ قرآن مجید ہر طرح کے انسانوں کی نفسیات کی رعایت کے ساتھ ان کی ہدایت کا سامان کرتا ہے، اور اس طریقہ سے انسانوں کی ہدایت کے لئے بہت کامل اور مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے، اور انسانی فطرت کا ایسا لحاظ کرتا ہے کہ سننے والے کے دل میں بات اتر جائے، اور کسی بھی قسم کا انسان ہو اس کو اس کے خیر کی بات اس میں مل جائے اور اس کو لغزش سے بچانے والی بات اس کے سامنے آجائے، اس طرح یہ انسانوں کی ہدایت و فلاح و بہبود کے لئے ایسی کامل رہنما کتاب ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

حضرات! عربوں کی زندگی تمدن سے دور ہونے اور معاشی حالت کی کمزوری کی وجہ سے جسمانی محنت اور جفاکشی پر مجبور کرتی تھی، اور خوداری اور قومی غیرت وحمیت بہت جلد جنگ پر آمادہ کرتی تھی، خشک علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی کچھ قدریں بن گئی تھیں، جس سے آپس میں لڑائیوں کی نوبت آتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ مسافروں کی مدد اور خاطر داری خشک علاقوں میں ان کی ضرورت بن گئی تھی، جس کے سبب مسافر و مہمان کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی کا جذبہ عام تھا، اور آپس کی لڑائیاں بعض وقت معاشی ضرورت کے لئے برسہابرس کے لئے ہوتی رہتی تھیں، اس کے لئے ان کو ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا، اس ضرورت کے لئے ان کو اولاد کی کثرت اور جنگی سامان رکھنے کی ضرورت تھی، جس میں لڑکوں کا کردار بہت اہم تھا، اچھے سے اچھا گھوڑا جو جنگ میں چستی و چابکدستی میں ممتاز ہو، ان کو دوسری محبوب چیزوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتا اور گھوڑے کی خوبیوں پر فخر کرتے تھے، جنگ میں اپنی اور گھوڑے کی کارگزاری ان کی مجلسوں کو گرمادیتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت پر آمادہ کرنے کے سلسلہ میں ان کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے معجزانہ انداز میں سورہ ''العادیات'' میں بات کہی کہ: ''تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم، جن کی تیزی اور برق رفتاری ایسی کہ ان کی ٹھوکروں سے چنگاریاں اڑیں اور منہ میں تھوک بھر جائے اور وہ صبح ہوتے ہوتے دشمن پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور ان کے قدموں سے غبار اڑنے لگتا ہے، اور دشمن کے مجموعہ کے بیچ میں پہنچ جاتے ہیں''، اسی طرح ان کے ذہنوں اور دلوں کو موہ لیتے ہوئے اور طبیعتوں میں شوق کو ابھارتے ہوئے فرمایا کہ: ''انسان بھی کتنا ناشکرا ہے اور وہ اپنی ناشکری کو خود بھی اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے''، یعنی ایسے دلچسپی اور شوق کے حالات اور سامان حسن عطا کئے اس پر بھی وہ اس کی اطاعت اور شکر گزاری کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور انسان

فائدہ کی طلب میں بہت آگے چلا جاتا ہے (یہاں تک) کہ جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے اور ان لوگوں کے کرتوت سامنے لائے جائیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ سمجھ لے گا :

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحاً ، فَالْمُوْرِيَاتِ قَدْحاً ، فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا، فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعاً ، فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعاً ، إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُوْدٌ ، وَإِنَّهُ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ، وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ، أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ، وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ، إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ . (العادیات:۱-۱۱)

قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو دوڑتے ہیں ہانپتے ہوئے، پھر وہ چنگاریاں جھاڑتے ہیں ٹاپ مار کر، پھر وہ تاخت وتاراج کرتے ہیں صبح کے وقت، پھر وہ اڑاتے ہیں اس موقع پر گرد وغبار، پھر وہ اسی حالت میں جا گھستے ہیں کسی لشکر میں، بلاشبہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے اپنے رب کا، اور وہ خود اس پر گواہ بھی ہے، اور یقیناً یہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے، تو کیا اس کو معلوم نہیں (ہولنا کی اس وقت کی) کہ جب نکال باہر کیا جائے گا ان (مردوں) کو جو (پڑے ہیں) قبروں میں، اور کھول کر رکھ دیا جائے گا وہ سب کچھ جو کہ (مخفی ومستور) ہوگا سینوں میں، بلاشبہ ان کا رب اس دن ان سے پوری طرح باخبر ہوگا۔

خود اپنے ہاتھ سے تراشے مجسموں کو خدا سمجھ کر ان کی عبادت کئے جانے کا تذکرہ ایسے نفسیاتی انداز میں اور نفسیاتی ترکیب کے ساتھ کرتے ہوئے سورہ حج میں فرماتا ہے کہ اے لوگو! یعنی شکر نہ کرنے والو، بیشک جس کو تم اپنی حاجت کے لئے خدا سمجھ کر پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر، ان کا تو حال یہ ہے کہ مکھی جیسی حقیر چیز کو بنا نہیں سکتے اور پھر اگر یہ سب مل کر بھی ایسا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، پیدا کرنا تو بڑی بات، مکھی ان کی مٹھائی کو کھانے لگے یا اٹھا لے جائے تو اس کو چھڑا بھی نہیں سکتے، ان سے مانگنے والے اور جن سے مانگ رہے ہیں کتنے کمزور ہیں اور یہ پروردگار عالم اللہ تعالیٰ کے مقام کو نہیں سمجھتے :

إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ، مَا قَدَرُوا اللهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ . (الحج:۷۳-۷۴)

بے شک جن ہستیوں کو تم لوگ پوجتے پکارتے ہو اللہ کے سوا، وہ ایک مکھی بھی نہیں

بنا سکتے، اگر چہ اس کی کوشش کے لئے وہ سب اکٹھے بھی ہو جائیں اور مکھی بنانا تو دور کی بات ہے ان کا حال تو یہ ہے کہ اگر وہ مکھی ان سے کچھ چھین لے تو یہ اس کو بھی اس سے چھڑا نہیں سکتے، کتنا کمزور ہے چاہنے والا اور کتنا کمزور ہے وہ جس سے مدد چاہی جاتی ہے، ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق تھا بے شک اللہ تعالیٰ بڑا ہی قوت والا نہایت ہی زبردست ہے۔

ان آیتوں میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ذہن کو مطمئن کرنے میں بڑی نفسیاتی ترکیب رکھی ہے، کہ انسان کی طاقت اتنی بھی نہیں کہ ایک چھوٹی سی مکھی جیسی کمزور چیز کو بنا سکے، اور ان کے رب کریم نے پوری کائنات بنائی، اور سب کو بنایا اور سب انسان مل کر چھوٹی سی بات نہیں کر سکتے، بنانا تو بڑی بات ہے جن کو یہ پوجتے ہیں، وہ تو مکھی کو اڑا بھی نہیں سکتے، قرآن میں انسان کی نفسیات اور متأثر ہونے کی جو کیفیات ہیں، اس کے کلام مقدس میں پائی جاتی ہیں، کہ بات دل میں اتر جائے اور انسان نے جو رسم اور جہالت میں اپنے ذہن سے افسانے بنا رکھے ہیں اس کا طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے، یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے، قرآن مجید میں قارئین اور سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی حیثیتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً سربلندی کے لئے الگ الگ مضمون کی طرف اختیار کرنے والا لفظ، جب نافرمانوں کے لئے استعمال کیا، جیسے فرعون تو علو کا لفظ اختیار کیا جس کا ماضی علا، اور مضارع یعلو "إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلاَ فِي الْأَرْضِ "یعنی "فرعون نے سربلندی اختیار کی"، اس میں اس کا اشارہ ہے، نافرمانی، ظلم اور خود اپنی ذات اور اس کی بلندی کے لئے، اور اچھی بلندی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے علا کے اشتقاق کو اختیار کیا اور اپنے لئے عالی کے بجائے 'علیّ' اختیار کیا، فرمایا: " علي كبير "اور جیسا کہ آیۃ الکرسی میں ہے "وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ "اسی طرح ہوا کے لئے، جس ہوا سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اس کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا 'ریاح' اور مضرت اور آفت والی ہوا کے لئے واحد کا لفظ 'ریح' استعمال کیا مختلف موقعوں پر مترادف الفاظ میں سے ایسے لفظ اختیار کئے ہیں، کہ اس کی کیفیت بھی سامنے آ جائے، جیسے سورہ مریم کی آخری آیتیں اس میں جو آواز بنتی ہے اس سے پوری کیفیت بھی سامنے آ جاتی ہے، اسی طرح نعمت اور انعام کے الفاظ ہیں، ان کے لفظوں کے استعمال میں "نِعمة" بکسر النون اللہ تعالیٰ نے خود اپنی پسند کے موقع پر استعمال کیا ہے؛ لیکن وہ نعمت جو دنیاداری اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے لئے ہو وہ نون کے فتح کے ساتھ استعمال کیا ہے، جیسے کافروں اور خالص دنیا پسندوں کے لئے فرمایا" ونَعمة كانوا فيها فاكهين "(الدخان:۲۷) اسی طرح "خطأ" کا لفظ ہے، دنیاوی معاملات کے لئے ثلاثی مجرد اور دینی معاملات کے لئے ثلاثی مزید فیہ کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں، اس طرح اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، یہاں پر چند پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اس طرح اس کتاب مقدس میں دل ودماغ دونوں کو سامنے رکھ کر باتیں کی گئی ہیں، کہ اس کے سننے پر آدمی بالکل مبہوت ہو جاتا ہے اور قائل ہو جاتا ہے، جیسا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جیسے حضورﷺ کی لبید سے گفتگو کے موقع پر قرآن کی آیات کا اثر ہوا، قرآن کا یہ معجزاتی انداز دعوتی کام کرنے والوں کے سامنے بہترین نمونہ سامنے لاتا ہے۔

کلام الٰہی کی عظمت اور انسانوں کے لئے اس کی ضرورت کی طرف خود اللہ رب العزت نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے :

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ . (الحشر:۲۱)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جارہا ہے اور ہم اس کی مثالوں کو لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں ؛ تاکہ غور کریں اور سمجھیں۔

پھر قرآن پاک کی جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی اس آیت سے انسان کی اعلیٰ ترین صلاحیت یعنی علم سے کام لینے کا حوالہ دیا گیا ہے، علم زبان کے ذریعہ ہی انسانوں کو حاصل ہوتا ہے اور اس کی بدولت زمین پر موجود تمام مخلوقات میں انسان کو امتیازی شان اور فوقیت حاصل ہے، اور علم رب العالمین کا وہ عطیہ ہے جس سے انسان مادی اور معنوی زندگی میں ہمہ جہتی ترقی کے لئے استفادہ کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی اس کا محتاج رہے گا۔

حضرات ! قرآن مجید جن عظیم خصوصیات اور بے شمار فوائد کی حامل کتاب ہے، ان میں انسان کی ہدایت اور انہیں تاریکی سے روشنی کی طرف لانے کو سرفہرست رکھا گیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

آلٓرٰ كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ . (ابراہیم:۱)

یہ ایک پرنور کتاب ہے، اس کو ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ (یعنی) ان کے پروردگار کے حکم سے غالب اور قابل تعریف (خدا) کے رستے کی طرف۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج، ضروریات زندگی اور اس کے تمام تر تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے انسانوں کو مخاطب کیا ہے؛ چنانچہ اس نے اس کی ہدایت کے لئے اس زبان کا انتخاب فرمایا جو براہ راست مخاطب

لوگوں کی جانی پہچانی زبان تھی؛ حتی کہ ان کے اَن پڑھ کو بھی اس کے سمجھنے کی صلاحیت حاصل تھی، اس زبان کے الفاظ، اُسلوب بیان ایسے جواُن کی انسانی فہم وادراک کے عین مطابق ہیں، ان کا قرآن مجید میں لحاظ ہے، اور وہ انسان کی نفسیات اور عقل وفہم کو اپیل کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک بیک وقت دل وعقل دونوں کے ساز کو چھیڑتا اور متاثر کرتا ہے، اس کی یہ تاثیر معجزاتی تاثیر ہے، کسی بھی انسانی کلام کے اسلوب وبیان میں یہ تاثیر نہیں پائی جاتی اور نہ آج تک تاریخ اس کی نظیر پیش کرسکی ہے، اس طرح قرآن پاک ایک سراپا معجزہ ہے، اگرچہ اس سے فائدہ اٹھانا انسانی عقل وفہم سے ماوراء نہیں ہے، لوگ اسے پڑھتے اور سمجھتے ہیں، ارشاد ربانی ہے :

وَتِلْکَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ . (العنکبوت:۴۳)

اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں۔

چنانچہ انسان کے لئے اللہ تعالی کی قدرت وحکمت کا سمجھنا اس کی علمی صلاحیت کی بنیاد پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے بطور خاص اس کو دی گئی ہے آسان ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں علم کے بارے میں آیا ہے :

اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْأَکْرَمُ ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ،عَلَّمَ الإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ . (العلق:۳-۵)

پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

اور پھر فرمایا گیا :

قُلْ هَلْ يَسْتَوِیْ الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ . (الزمر:۹)

کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہوسکتے ہیں۔

پھر کہا گیا :

إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ . (الفاطر:۲۸)

خدا سے تو ان کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔

اللہ تعالی نے ان کو علم ایک ایسی کلید کے طور پر دیا ہے کہ جس کے ذریعہ انسان مختلف حالات وکوائف جان سکتا ہے اور مختلف شعبہ ہائے حیات میں نئے نئے امکانات تلاش کرسکتا ہے۔

علم سے متعلق قرآن کی توجہ دہانی ہے کہ یہ اُمت عربی جو اُمی تھی، علم کا اہتمام کا کرے؛ تاکہ وہ اس کے لئے گنجینۂ حیات ثابت ہو اور زندگی کی فلاح وبہبود اور ان تمام امکانات تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہو، جو اُن کے لئے

معاون و ممد ثابت ہوں۔

اللہ رب العزت نے ''قلم'' کی قسم کھائی ہے اور قلم وہ شئے گراں مایہ ہے جو انسان کے لئے علوم وفنون کے نئے نئے دریچے کھولتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ . (القلم:۱)

نٓ، قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید کو اپنے خزانہ علم وارادہ سے جس کو ''الکتاب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اسی کا ایک حصہ بنایا ہے، اس کا یہ خزانہ علم وارادہ وہ علم ہے جو کائنات کے پیدا کرنے اور بنانے والے کے ساتھ مخصوص ہے، قدرتِ الٰہی وصفاتِ الٰہی کا علم ایسا بحر بیکراں ہے جس کی نہ تو کوئی ابتداء کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ انتہاء کا، اللہ رب العزت نے اپنی اسی کتاب علم وعرفاں کا ایک چھوٹا سا حصہ قرآن پاک کی شکل میں دنیائے انسانی کو عطا کیا، ارشاد باری ہے :

الٓمٓ ، ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ . (البقرۃ:۱،۲)

یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں کہ کلام خدا ہے، خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔

یہی وہ علم ہے جس کا ایک حصہ اللہ کی اس کتاب قرآن مجید میں ہے، یہ حق و باطل کے درمیان تفریق کرنے والا پاکیزہ کلام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنے بندوں کے لئے نازل فرمایا؛ تاکہ ان کی دنیوی واخروی سعادت کا ذریعہ بنے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نصیحت کی ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ بارگاہ ایزدی میں دنیا وآخرت کی کامیابی کا طلب گار رہو اور اپنے رب سے ان الفاظ میں دست بدعا ہو :

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ . (البقرۃ:۲۰۱)

پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت سے نواز اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

اور پھر کہے کہ :

رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ . (آل عمران:۱۹۴)

اے پروردگار! تو نے جن جن چیزوں کے ہم سے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے وعدے کئے ہیں، وہ ہمیں عطا فرما اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر، کچھ شک نہیں کہ

تو خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

یہ آیات انسان کے اصل مقاصد زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ وَمَثَلاً مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ . (النور:۳۴)

اور ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں نازل کی ہیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کی خبریں اور پرہیز گاروں کے لئے نصیحت۔

اس کے ذریعہ قرآن میں مذکور تین قسم کے مضامین کا اشارہ ملتا ہے :

اول : قرآن پاک کی وہ آیات جو بالکل واضح ہیں، جن سے ہر کوئی استفادہ کر سکتا ہے، جو پڑھتا اور سمجھتا ہے، یہی وہ آیات ہیں جو زندگی کے بالکل سیدھے اور مثالی طریق زندگی کے طرف رہنمائی کرتی ہیں، یہ آیات مظاہر کائنات اور متنوع علوم وفنون سے پُر ہیں، نیز یہ آیات ایسے کائناتی حقائق پر دلالت کرتی ہیں جو مسلّم اور تحقیق شدہ ہیں اور انسان کو صحیح عقیدہ اور دنیوی واخروی راہ نجات کا پتہ دیتی ہیں۔

دوم : قرآن پاک میں ان پچھلی امتوں کے واقعات کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے اپنی جانب بھیجے گئے انبیاء ورسل کی نصیحت کو بالائے طاق رکھ دیا اور ان کی ایک نہ سنی، انہوں نے نہ ہی کائناتی دلائل و براہین سے سبق سیکھا، چنانچہ تباہی وبربادی ان کا مقدر بن گئی۔

سوم : قرآن پاک میں نصیحت اور موعظت کے ایسے اسلوب ملتے ہیں، جو پرہیز گاروں کے دلوں کو واکر دیتے ہیں، انہیں اعمال خیر وفلاح پر اُبھارتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیات اسی جانب اشارہ کرتی ہیں :

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ . (الزمر:۲۷)

اور ہم نے لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں؛ تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

اسی طرح دوسری آیت :

قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (الفرقان:٦)

کہہ دو کہ اس نے اس کو اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے، بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنے کلام کے جاہ وجلال اور اعجازِ اُسلوب کا بھی ذکر فرمایا اور اس بات کا بھی ذکر فرمایا کہ قرآن مجید آیات مغیبات پر مشتمل ہے، جس کا انسانی حواس ادراک کرنے سے عاجز وقاصر ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے :

تِلْکَ مِنْ أَنبَاء الْغَیْبِ نُوحِیْھَا إِلَیْکَ مَا کُنتَ تَعْلَمُھَا أَنتَ وَلاَ قَوْمُکَ مِن قَبْلِ ھَـذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ . (ہود:۴۹)

یہ (حالات) من جملہ غیب کی خبروں کے ہیں جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور اس سے پہلے نہ تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم (ہی ان سے واقف تھی) تو صبر کرو کہ انجام پرہیز گاروں کا ہی (بھلا) ہے۔

قرآن مجید میں معنوی اور لفظی دونوں لحاظ سے انسانی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اعلیٰ انداز کلام اور انسانی نفسیات کی رعایت اختیار کی گئی ہے اور اس کی آیات پر غور وتدبر سے ایسے نکتے سامنے آتے ہیں، کہ غور کرنے والے کو حیرانی ہوجاتی ہے اور قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور اسی لئے قرآن مجید کو جو بھی کھلے دل سے پڑھتا ہے وہ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے اور آمنا وصدقنا کہتا ہے، یہ انسان کی زندگی کو راہ راست پر لانے کے سلسلہ میں سب سے بڑا رہبر اور تابناک مشعل راہ ہے۔

اخیر میں ایک بار پھر ہم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اور ان کے رفقاء کو اس بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار کے انعقاد پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ یہ سیمینار دورِ حاضر میں قرآن مجید سے استفادہ کے بہت سے نئے گوشے سامنے لائے گا، اور یہ بات پورطور سے کھل کر سامنے آئے گی کہ یہ کلام الٰہی ایمانی زندگی کا رہنمائے کامل اور پوری انسانیت کے لئے نجات دہندہ اور کتاب ہدایت ہے کہ ایک طرف وہ ایمان اور تقویٰ کی زندگی گزارنے والوں کو اعلیٰ زندگی عطا کرتا ہے اور عام انسانوں کو جو ہدایت سے بالکل دور ہیں ہدایت کا راستہ بتاتا ہے؛ اس لئے اس کو ایک طرف ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کہا گیا اور دوسری طرف ھُدًی لِّلنَّاسِ سے تعبیر کیا گیا ہے؛ اس لئے ایمانی زندگی رکھنے والوں کی یہ بڑی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس کو تمام انسانوں تک پہنچانے کی طرف بھی متوجہ ہوں؛ تاکہ دوسرے اس آسمانی فیض سے محروم نہ ہوں اور ٹھوکر کھانے سے بچیں۔

⊙ ⊙ ⊙

خصوصی خطاب

قرآن کریم — ایک مکمل دستور حیات

ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی⊙

صدر محترم، علماء کرام اور برادرانِ اسلام !

یقیناً وہ قرآن کریم ہے، اور وہ ایک محفوظ کتاب میں موجود ہے، اس کو وہی لوگ
ہاتھ لگا سکتے ہیں جو پوری طرح پاکیزہ ہوں۔ (واقعہ:۷۷-۷۹)

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، اس لئے کہ قرآن کریم وہ کتاب ہے، جو زندگی، انسان اور کائنات سب کے لئے مشعل راہ ہے؛ بلکہ واقعہ ہے کہ وہ مکمل آسمانی دستور ہے، جس کی روشنی میں رہ کر ہر انسان اپنے ماحول اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو قابل رشک بنا سکتا ہے اور انسانیت کا صحیح نمونہ پیش کر سکتا ہے، وہ اس کتاب عزیز کی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کر کے اس عالم کو امن و سلامتی اور اطمینان و سکون کا گہوارہ نہایت آسانی کے ساتھ بنا کر ایک مثالی زندگی کا نمونہ پیش کرنے اور کائنات سے پوری طرح ہم آہنگ ہونے کے لئے صراطِ مستقیم کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتا ہے۔

قرآن مجید، دائمی دستور العمل

قرآن کریم اسی جیسی ایک زندگی کی تعمیر کی دعوت دیتا ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک دائمی دستور عطا کرتا ہے، جو انسان کے پیدا ہونے سے لے کر اس کی موت تک اور موت کے بعد آنے والے تمام حالات پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس وسیع و عریض دنیا میں ہر بہترین زندگی گذارنے کے لئے مفصل تعلیمات سے بھرپور اپنی بیش قیمت اور عظیم کتاب قرآن کریم سے پوری دنیائے انسانیت کو نوازا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے :

⊙ مہتمم: دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ و مدیر البعث الاسلامی۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَنزَلَ عَلَی عَبْدِهِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَل لَّهُ عِوَجَا، قَیِّماً لِّیُنذِرَ بَأْساً شَدِیْداً مِن لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْراً حَسَناً ، مَاکِثِیْنَ فِیْهِ أَبَدَا ۔ (الکہف:۱-۳)

تمام حمد وشکر اس اللہ کے لئے ،جنھوں نے اپنے بندے محمد رسول اللہ ﷺ پر یہ کتاب نازل کی ، اور اس میں کوئی شک نہیں ، بہت واضح اور ٹھیک ہے؛ تا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سخت پکڑ سے لوگوں کو ڈرائے اور اہل ایمان کو خوشخبری سنائے ، جو اچھائیاں اور اعمالِ صالحہ کرتے ہیں کہ ان کے لئے اچھا اجر ہے،جس میں ہمیشہ زندگی گذاریں گے۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ، الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلاۃَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ یُنفِقُوْنَ، وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنزِلَ إِلَیْکَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِکَ وَبِالآخِرَۃِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ، أُوْلَـئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُوْلَـئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (البقرۃ:۲-۵)

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل صحیح ہے کہ اللہ کی کتاب کے ذریعہ جو شریعت حاصل ہوئی ہے،اس کے پانچ بنیادی ستون ہیں۔

شریعت کے پانچ ستون

حضرات! اس کی بنیادی خصوصیات میں پانچ چیزیں بہت واضح طریقہ سے سمجھ میں آتی ہیں :

(۱) یہ کتاب ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کے خوف سے اور تقویٰ کی نعمت سے مزین ہوں، اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۲) ایمان بالغیب،جس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے بنائے انسان کی زندگی مکمل نہیں ہوتی۔

(۳) اقامتِ صلاۃ۔

(۴) اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا (انفاق فی سبیل اللہ)۔

(۵) آخرت کا یقین۔

یہ دراصل اس شریعت کے مضبوط ستون ہیں،جن کے بغیر ایمانی زندگی کی عمارت تعمیر نہیں ہوسکتی اور اگر غور کیا جائے تو اس کے ذریعہ بہترین نتائج برآمد ہوتے ہیں، جیسے دینی حس، اخلاقی شعور اور ذمہ داری کا احساس جس

کے ذریعہ نصح وخیر کا جذبہ، عمل صالح کا شوق اور اس کی فکر، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت وطاعت میں فنائیت اور ساری دنیا کے سامنے ایک حیرت ناک انسانی نمونہ پیش کرنے کے لئے اسلامی شریعت سے روشنی حاصل کرنا اور ایک ایسی ممتاز اُمت بن کر اُبھرنا، جس کو آسمان کی آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا اور نہ زمانہ کے کانوں نے اس اُمتِ وسط کے بارے میں کبھی کوئی تذکرہ سنا تھا، قرآن کریم نے اعلان کیا کہ اے لوگو! ہم نے تمہارے دین کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا اور تمہیں پر یہ عظیم نعمت پوری کردی، اور اسلام کو ایک دین کامل کی حیثیت سے ہم نے پسند کرلیا اور دین تو دراصل اسلام ہی ہے، اس اعلان کے بعد جو اُمت وجود میں آئی، اس کو خیر اُمت کے نام سے پکارا گیا، جو ایمان کی تمام خصوصیات سے بہرہ ور تھی اور جس کا اصل مشغلہ یہ تھا کہ اچھائیوں کی دعوت دے اور برائیوں سے روکے؛ چنانچہ خیر اُمت کی اس جامعیت اور توازن کو ہر زمان ومکان میں دیکھا گیا اور تاقیامت اس اُمت کا یہ امتیاز باقی رہے گا، اسی طرح قرآن کریم ایک پائدار اور انسانی مزاج سے ہم آہنگ زندگی کا طریقہ بتاتا ہے، اس کو ہم اسلامی تہذیب کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

ثقافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی

محترم سامعین! ثقافت کے لغوی معنی مہارت اور بسرعت کسی بات کو سمجھ لینے کے ہیں؛ لیکن اصطلاح میں ثقافت، مختلف علوم وفنون اور آداب وافکار پر دسترس حاصل کرنے کا نام ہے، ہم اثنائے گفتگو اکثر یہ لفظ کسی شخص کی علمی اور تعلیمی وجاہت بیان کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بہت اچھی ثقافت کے مالک ہیں، یعنی مختلف ضروری علوم وفنون اور آداب وافکار پر ان کی نظر بہت گہری اور ہمہ گیر ہے، ثقافت ایک بہت ہی خوبصورت وصف ہے، پڑھے لکھے وسیع النظر اور مہذب انسانوں کی تعریف عام طور سے اسی وصف سے کی جاتی ہے اور اسلامی ثقافتی ماحول میں لوگ کسی کی تعریف میں ''مثقف'' کہنا بھی پسند کرتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کا مفہوم

اسلامی تہذیب سے مراد ہے، اسلامی علوم وفنون اور اسلامی آداب وافکار، اس تہذیب کا محور اسلام ہے اور اس کا اصل سرچشمہ کتاب وسنت ہے، اس سے علوم وفنون کے سوتے پھوٹتے ہیں اور اسی سے صحت مند افکار وآداب کا تعین ہوتا ہے، جو لوگ اسلامی علوم وآداب پر پوری گہرائی کے ساتھ دسترس رکھتے ہیں اور اسلامی فکر پر ان کی نظر نہایت وسیع اور ہمہ گیر ہوتی ہے، وہ اسلامی تہذیب کے نمائندے کہے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں، ایک ایسے مسلمان عالم یا داعی کا جو دعوتِ اسلامی اور فکر اسلامی کی خدمت کرنا چاہتا ہو، اسلامی تہذیب وثقافت سے اس کا تعلق

قریبی اور گہرا ہونا ازبس ضروری ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی علوم وفنون اور اسلامی افکار وآداب پر وہ مہارت بھی رکھتا ہو اور اس کی اصالت اور اولویت کا قائل ہو اور نہ صرف یہ کہ وہ اس میدان میں اسلام کا نمائندہ ہو؛ بلکہ وہ دوسری مادی قوموں کے علوم وفنون اور افکار وآداب سے بھی واقف ہو اور ان پر نظر رکھتا ہو اور وہ علم وثقافت کے قدیم وجدید حالات اور اس کے مضمرات اور نتائج سے بھی پوری طرح واقف ہو، کسی ایسے فاضل شخص کو ہم وسیع تر تہذیب وثقافت کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں اور بلاتردد اس کے لئے ''مہذب ومثقف'' کی صفت استعمال کر سکتے ہیں۔

ایک مسلمان عالم اور داعی کے لئے ایمان واخلاق کی بنیاد پر زندگی کی عمارت اُٹھانے کے بعد علم وثقافت کے میدان میں امتیاز حاصل کرنا ضروری ہے؛ تاکہ وہ اسلامی فکر کی نمائندگی کر سکے، وہ تمام مادی فکروں اور فلسفوں سے واقف ہو، وہ کائناتی علوم کے بارے میں بھی واقفیت رکھتا ہو، وہ مغربی طرزِ فکر اور مادی نقطۂ نظر کو بھی سمجھتا ہو اور اس کے زندگی پر پڑنے والے نقصان دہ اثرات سے غافل نہ ہو، وہ مادی علوم وافکار اور ثقافت کے نمائندوں سے بھی کسی حد تک باخبر ہو اور اسلام کے لائے ہوئے اُصول وعقائد سے اس کے ٹکراؤ کو بھی بخوبی جانتا ہو اور یہ یقین رکھتا ہو کہ اسلامی نظامِ زندگی، اس کے فلسفۂ حیات وموت، اس کے بنیادی ارکان وعقائد کے مقابل میں مادی نظامِ زندگی اور اس کا فلسفہ بالکل متضاد کیفیت رکھتا ہے اور ان دونوں طریقہ ہائے زندگی میں اتحاد کا تصور محال ہے۔

اسلامی تہذیب کی بنیاد

اسلامی ثقافت کا بنیادی پتھر قرآن کریم ہے، اس کتاب عظیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ ایک ایسی طاقتور، برحق اور کھلی ہوئی کتاب منزل ہے کہ اس پر باطل کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا:

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ، لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ . (حم السجدة: ۴۱-۴۲)

اور یہ قرآن بڑی باوقعت کتاب ہے، جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے آسکتی ہے، یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔

قرآن کریم اسلامی تعلیمات اور اسلامی ثقافت کا اولین سرچشمہ ہے، یہ کتاب ہدایت ہے، تمام عقائد اور تصورات اور اخلاقی قدریں اور پیمانے، اسی طرح عبادات اور اعمال وآداب، قوانین شریعت، طریقۂ زندگی اور اسلامی شعار، ان تمام حقائق کا بنیادی تعلق قرآن کریم سے ہے، یہ وہ صحیفہ آسمانی ہے جو ناسخ ملل ومذاہب ہے، اس کے بعد نہ کسی کتاب یا صحیفہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی ایسے رہبر اُصول کی احتیاج باقی رہتی ہے کہ جس کے بغیر زندگی کامیابی اور سعادت سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔

اس کتاب سے اہل علم و دعوت اور اصحاب فکر و عمل کا غیر معمولی تعلق ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے، زندگی کے تمام شعبوں میں اسی کا اثر انگیز عمل ہمہ دم جاری و ساری رہتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی جس قدر نمائندگی ممکن ہے وہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ،قرآن کریم میں ان تمام حقائق و معارف اور علوم و افکار کا خزانہ موجود ہے جن کی اسلامی تہذیب کی تعمیر میں اشد ضرورت ہے، اس بنا پر سب سے زیادہ اولین اور اہم حیثیت حضارۃ الاسلام کے موضوع پر گفتگو کرتے وقت قرآن کریم کو حاصل ہے۔

قرآن کریم اور ہماری ذمہ داریاں

برادرانِ اسلام ! اس موقع پر قرآن کریم کے بارے میں چند گذارشات عرض کرنے کے بعد اس کی کچھ بنیادی خصوصیات کا ذکر کرنا بہر حال مناسب ہوگا۔

پہلی گذارش تو یہ ہے کہ ہمیں قرآن کریم کے مکمل حفظ کا اہتمام کرنا چاہئے اور اگر مکمل حفظ کا اہتمام مشکل ہو تو بقدر استطاعت ایک معتد بہ حصہ ضرور ہمارے سینوں میں محفوظ ہونا چاہئے؛ تا کہ اس کے نور اور اس کی برکت سے ہم ہر موقع پر رہنمائی حاصل کر سکیں ، اس لئے کہ قرآن در اصل ایک عظیم الشان سرچشمہ زندگی ہے، اس کی روانی اور شیرینی کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔

دوسری گذارش اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہم کتاب اللہ کی تلاوت کا اہتمام کریں اور غور و فکر کا کوئی گوشہ چھوڑے بغیر ہم اس کے معانی و مفاہیم ،اس کی ہدایات و تعلیمات کو اس کے حقائق و اسرار اور اس کے لطائف و رموز کو ممکن حد تک سمجھنے کی پوری کوشش کریں ، اس کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت بھی دیجئے کہ قرآن کریم کے صحیح تلفظ اور اُصولِ تجوید کے مطابق اس کی تلاوت کا زبردست اہتمام کریں، عام طور سے طبقہ اہل علم اس پہلو کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور اکثر اسلامی مدارس اور اداروں کے فارغین اُصول تجوید سے نابلد ہوتے ہیں اور تلاوت میں قواعد کی بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی چند خصوصیات

اس مختصر گذارش کے بعد اب قرآن کریم کی چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے :

یوں تو اس بحر ناپیدا کنار کو عبور کرنے کا تصور بھی کسی حال میں ممکن نہیں ہے اور اس کے اندر علوم و حقائق کے جو ذخیرے موجود ہیں ان پر احاطہ کرنا کسی بڑی سے بڑی انسانی طاقت کے لئے بھی محال ہے۔

قرآن کریم کی پہلی اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلام الٰہی ہے اور ہر طرح کے انسانی علم و تخیل کی آمیزش

سے پاک اور منزہ ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کے ناقل اور حضرت محمد ﷺ اس کے حامل وحافظ اور اس کے شارح ہیں :

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ، نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ، عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ . (الشعراء:۱۹۲-۱۹۵)

اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں؛ تا کہ آپ بھی من جملہ ڈرانے والوں کے ہوں۔

ایک عام مسلمان کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور وہ علم قطعی ہے اس میں کسی درجہ میں بھی ادنیٰ شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری خصوصیت اس کا خلود ودوام ہے، یہ کسی خاص قوم یا نسل، یا زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے؛ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو نبی آخر الزماں پر نازل ہوئی اور ہمیشہ کے لئے وہ قائم ودائم ہے اور روشنی کا عظیم الشان مینارہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے :

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ . (الحجر:۹)

اور ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

چودہ صدیاں اس پر گذر جانے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب اسی طرح تروتازہ اور جدید ہے جس طرح اپنے نزول کے ابتدا میں تھی، اسی طرح محفوظ، اسی طرح مقبول، اسی طرح ہاتھوں ہاتھ لئے جانے والی، تلاوت کرتے وقت ہمیں اس احساس وشعور کو اس کے بارے میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔

تیسری اہم خصوصیت اسکی ہمہ گیریت ہے، چنانچہ یہ ہر زمانے کی کتاب ہونے کے ساتھ دین اسلام کی ایک مکمل اور جامع کتاب ہے، اسکے سامنے نہ کسی کتاب کی کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کا قائم رہنا ممکن ہے، یہ کتاب ہر زمانے پر حاوی ہے، ہر مذہب اور اُمت کے لئے بالکل کافی وشافی ہے، اور مضامین کے لحاظ سے بھی ہمہ گیر ہے، انسانی ہدایت وضرورت کی کوئی بات یا مضمون نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو، عقیدے سے لے کر معاشرہ کے حالات اور خاندان کے تعلقات تک اس کتاب میں بہ تفصیل موجود ہیں، اس کے مفاہیم عالیہ پر غور کرنے والوں کو معلوم ہوگا کہ قرض لینے دینے کے سلسلہ میں اس کو نوٹ کر لینے اور لکھ لینے کے بارے میں سب سے لمبی آیت قرآن میں موجود ہے، یہ پہلو بہت نازک ہوتا ہے اور ذرا سی غفلت سے بہت زیادہ برائیوں اور خرابیوں کا باعث ہوتا ہے، اس لئے اس کی اہمیت واضح کرنا ضروری ہے۔

قرآن کریم اپنی ہمہ گیر خصوصیت کی بنیاد پر، پوری انسانیت اور پوری دنیا کی ایک دائمی کتاب ہے :

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ .(التکویر:۲۷)

پس یہ تو دنیا جہان والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے۔

اسی طرح قرآن کی ہمہ گیری یہ بھی ہے کہ وہ صرف عقل یا صرف قلب کو مخاطب کرنے پر اکتفا نہیں کرتا؛ بلکہ وہ پورے انسانی وجود، اس کے وجدان کو، اس کے ضمیر کو، اس کی روح کو، اس کے جسم کو اس کے حواس کو اسی طرح مخاطب کرتا ہے جس طرح عقل اور قلب کو۔

قرآن کریم کی چوتھی بڑی خصوصیت اس کا اعجاز ہے، وہ عرب قوم جو اپنی فصاحت و بلاغت کے سامنے ساری دنیا کو عجم کے نام سے یاد کرتے تھے اور اپنے سوا تمام انسانوں کو زبان و بیان کی طاقت سے محروم سمجھتے تھے اور اپنے کلام کو بلاغت و بیان کے آخری درجہ پر شمار کرتے تھے؛ لیکن قرآن کریم کی جب کچھ سورتیں نازل ہوئیں اور تمام انسانوں کو مخاطب کرکے کبھی ''یأیها الناس ''اور کبھی ''یأیها الذین آمنوا ''اور ''یأیها الناس أنتم الفقراء إلی الله ''اور اس طرح کے دیگر خطابات سے نوازا گیا تو جزیرۂ عرب کے اہل فصاحت و بلاغت نے کسی حد تک کلام الٰہی کی طرف توجہ مبذول کی، رسول کریم ﷺ کے ذریعہ اس نے کفار و مشرکین عرب کو چیلنج کیا کہ وہ افصح الفصحاء اور ابلغ البلغاء ہونے کے باوجود کوئی اس جیسا طرز بیان لاکر دکھائیں، یا دس سورتیں اس جیسی لکھ کر دکھائیں یا اس جیسی ایک ہی سورت پیش کردیں؛ لیکن وہ ناکام رہے، اللہ تعالیٰ نے بےبسی اور ناکامی پر کسی افسوس کا اظہار کئے بغیر فرمایا :

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَـذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً . (الاسراء:۸۸)

آپ فرمادیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات اس بات کے لئے جمع ہوجائیں کہ ایسا قرآن بنالائیں، تب بھی ایسا نہ لاسکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

لیکن انھوں نے جب زیادہ غور و فکر سے کام لیا تو وہ بے ساختہ بول پڑے کہ یہ کلام کسی بشر کا نہیں ہوسکتا؛ بلکہ یہ کسی مافوق البشر ہستی کا کلام ہے اور جوں جوں وہ اس میں غور و فکر کرتے رہے، اپنے آپ کو اس جیسا یا اس کے مشابہ کسی کلام کے پیش کرنے سے پوری طرح عاجز پایا۔

(۱) قرآن کریم کا اعجاز ہر ناحیہ سے دیکھا جاسکتا ہے، زبان و بیان اور ادب و بلاغت، لفظ و نظم ہر اعتبار سے وہ معجزہ ہے۔

(۲) اپنے موضوعات کے تنوع اور ہمہ گیریت کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے۔

(۳) علمی حقائق اور کائناتی اسرار و حِکَم کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے۔

قرآن کریم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَلَوْ أَنَّ قُرْآناً سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَل لِّلّٰهِ الأَمْرُ جَمِيْعاً . (الرعد:۳۱)

اگر بالفرض کسی قرآن (آسمانی کتاب) کے ذریعہ پہاڑ چلا دیئے جاتے یا زمین ٹکڑے ٹکڑے کردی جاتی یا مردوں سے باتیں کرادی جاتیں پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے ؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف کی ابتدا ان الفاظ سے فرمائی :

الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ، إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ . (یوسف:۱-۲)

یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں ، یقیناً ہم نے اس کو قرآن عربی نازل فرمایا ہے کہ تم سمجھ سکو۔

سورۂ یونس کا آغاز کچھ اس طرح فرمایا گیا :

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيْمِ ، أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَباً أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ قَالَ الْكَافِرُوْنَ إِنَّ هَـذَا لَسَاحِرٌ مُّبِيْنٌ . (یونس:۱-۲)

یہ پُر حکمت کتاب کی آیتیں ہیں ، کیا ان لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیج دی کہ سب آدمیوں کو ڈرایئے اور جو ایمان لے آئے ان کو یہ بھی خوشخبری سنایئے کہ ان کے رب کے پاس ان کو پورا اجر و مرتبہ ملے گا ، کافروں نے کہا یہ شخص تو بلاشبہ صریح جادوگر ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ :

قرآن روئے زمین پر اللہ کا خوان نعمت ہے ، تو اس سے خوب فیض اُٹھاؤ۔

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ :

جو مسلمان قرآن شریف پڑھتا ہے ، اس کی مثال ترنج (خوشبودار پودے) کی سی ہے ،

اس کی خوشبو بھی عمدہ ہوتی ہے اور مزہ بھی لذیذ اور جو مومن قرآن نہ پڑھے اس کی مثال کھجور کی سی ہے، کہ خوشبو کچھ نہیں مگر مزہ شیریں ہوتا ہے اور جو منافق قرآن شریف نہیں پڑھتا اس کی مثال حنظل کے پھل کے سی ہے کہ مزہ کڑوا اور خوشبو کچھ نہیں اور جو منافق قرآن شریف پڑھتا ہے، اس کی مثال خوشبودار پھول کی سی ہے کہ خوشبو عمدہ اور مزہ کڑوا۔(۱)

حضرات! میں اس مبارک موقع پر المعہد العالی الاسلامی اور اس کے بانی و ناظم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور ان کے رفقاء کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایک اہم موضوع پر یہ اجتماع منعقد کیا ہے، جس سے قرآن مجید کی عظمت وحقانیت کے ساتھ ساتھ قیامت تک اس کے رہبر ورہنما ہونے کی صلاحیت لوگوں پر واضح ہو سکے گی، معہد کی تعلیم و تربیت اور دعوت و تحقیق کے میدان میں ترقی قابل تحسین اور نہایت خوش آئند ہے اور اس وقت پورے ملک میں اس کو عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو مزید ظاہری و معنوی ترقیوں سے نوازے اور اس کے فیض کو عام کرے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

⊙ ⊙ ⊙

---

(۱) صحيح البخاري:۵۰۵۹،صحيح مسلم:۷۹۷،عن أبي موسى الأشعريؓ .

کلیدی خطبہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی⊙

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين
وعلى آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد !

صدر عالی قدر، بزرگان محترم، برادران اسلام!

آج کے اس اجتماع کو دیکھ کر اور آپ حضرات کی میزبانی کی سعادت پا کر شکر و سپاس کے جذبات کی لہریں کچھ اس طرح موجزن ہیں کہ انہیں الفاظ کے پیکر میں ڈھالنا دشوار ہو رہا ہے، یہ رسمی الفاظ نہیں ہیں؛ بلکہ یہ دل کی آواز ہے، اللہ تعالیٰ آپ حضرات کی زحمت فرمائی کو قبول فرمائے اور اس اجتماع کو اسلام کی سربلندی اور امت کی سرفرازی کا ذریعہ بنائے۔

حضرات! انسان خود پیدا نہیں ہوا ہے؛ بلکہ وہ پیدا کیا گیا ہے، اسے جس دنیا میں بسایا گیا ہے، وہ اس دنیا ہی سے نہیں؛ بلکہ اپنے آپ سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہے، وہ اپنے نفع ونقصان سے بھی آگاہ نہیں ہے، وہ اپنی منزل کے بارے میں بھی نہیں جانتا کہ آخر اس دنیا کی آبلہ پائی کر کے اسے کہاں پہنچنا ہے، اور موت کے بعد اس کی خوابگاہ کہاں ہے، اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے؟ —— ان ساری باتوں کے جاننے کے لئے وہ کسی ایسی ہستی کا محتاج ہے، جس کا علم انسان اور اس کے گرد پھیلی ہوئی کائنات کو محیط ہو، جو انسان کا خیر خواہ اور اس سے محبت رکھنے والی ہو اور جو پوری انسانیت؛ بلکہ تمام مخلوقات کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کر سکتی ہو۔

وہ ذات ہے خالق کائنات کی؛ کیوں کہ کسی شئے کی تخلیق کرنے والے سے بڑھ کر اس شئے کی حقیقت اور اس کے نفع ونقصان سے کوئی اور ذات واقف نہیں ہو سکتی؛ اس لئے اسی کی رہنمائی میں انسان اپنا سفر کامیابی کے ساتھ طے کر سکتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ“ (الأعراف:۵۴) یعنی خدا ہی نے انسانیت کی تخلیق کی ہے اور اسی کا حکم انسانیت پر چلنے کے لائق ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جیسے کائنات میں انسان کی

⊙ ناظم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔

مادی ضرورتوں کا انتظام کیا ہے، اس کی روحانی ضرورتوں کی تکمیل کا بھی خیال رکھا ہے، اس کو کائنات کے اسباب ووسائل سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بھی سکھایا گیا ہے اور زندگی گذارنے کے سلسلہ میں بھی اس کی رہنمائی کی گئی ہے، اس رہنمائی کے لئے خدا نے ایک طرف اپنی کتابیں اتاریں، دوسری طرف انسانوں ہی میں اپنے پیغمبر بھیجے؛ کیوں کہ انسان کے لئے انسان ہی نمونۂ عمل بن سکتا ہے، اگر خدا خود انسانی شکل میں آجاتا، جیسا کہ اوتار واد کا تصور ہے تو وہ انسان کے لئے قابل پیروی نہیں بن پاتا؛ کیوں کہ وہ ان خواہشات سے عاری اور ان ضروریات سے فارغ ہوتا، جو انسان کے لوازم میں سے ہیں، ہدایت کے یہی دو چراغ ہیں، جن کی روشنی انسان کو صراط مستقیم پر قائم رکھتی ہے، اس ہدایت ربانی کی ضرورت انسان کو اس لئے بھی ہے کہ وہ اپنی مصلحتوں کے مقابلہ اپنی خواہشات سے شکست کھا جاتا ہے، وہ جن چیزوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ اس کو نقصان پہنچانے والی ہیں، غلبۂ خواہشات کی وجہ سے ان کا بھی ارتکاب کرنے پر اتر آتا ہے، خدا پر ایمان ، حرام وحلال کی پہچان، آخرت کی جواب دہی کا احساس اور اپنی بے ثباتی کا یقین ہی وہ حقیقتیں ہیں، جو خواہشات کی غلامی سے بچنے میں مُمد ومعاون ہوتی ہیں۔

اپنے اپنے عہد میں جتنی آسمانی کتابیں آئی ہیں اور انسانیت کے لئے جو ہدایت نامے بھیجے گئے ہیں، ان سب کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات والا صفات ہے، اس کے باوجود کہ انسان کی آمیزش پسندی نے قرآن مجید کے علاوہ کسی الہامی کتاب کو مکمل طور پر محفوظ نہیں رہنے دیا، خدا کا یقین، جزا وسزا کا تصور، کچھ کاموں کا باعث اجر ہونا اور کچھ کا سبب مؤاخذہ ہونا تمام مذہبی کتابوں کی مشترکہ تعلیمات ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سی اخلاقی قدریں مذاہب کے درمیان متفق علیہ ہیں، افسوس کہ اس وقت مغرب کے افق سے جو تمدن طلوع ہورہا ہے، اس کا بنیادی مزاج یہ ہے کہ انسان خدا کے تصور سے آزاد ہوجائے یا برائے نام چھٹی انگلی کی طرح خدا کا اور مذہب کا نام لے، حلال وحرام کی سرحدیں ختم ہوجائیں، لذت پرستی اور خواہشات کی حکمرانی میں کوئی چیز رکاوٹ ڈالنے والی نہ ہو؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آج مغرب اور مغرب زدہ دنیا میں شراب اور پانی میں کوئی فرق نہیں، جائز رشتے بوجھ بن گئے ہیں اور غیر قانونی تعلق فیشن بن گیا ہے، شرم وحیا فرسودہ چیز سمجھی جانے لگی ہے، اور ایسے عالمی نظام کی بنیاد رکھی جارہی ہے، جس میں مذہب کا کہیں گذر نہ ہو اور انسانی زندگی میں اس کو دخل دینے کی بالکل اجازت نہ ہو۔

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس وقت قریب قریب دنیا کے تمام مذاہب نے اس طوفان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اپنی مذہبی کتابوں سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، دنیا میں اس وقت مسلمان ہی ایک ایسی امت ہیں، جنھوں نے ہزار کوتاہیوں کے باوجود اپنی مذہبی کتاب سے اپنا رشتہ باقی رکھا ہے، وہ چاہے مسجد کی چہار دیواری میں ہو یا مدرسہ وخانقاہ کے احاطہ میں، تجارت کی منڈی میں ہو یا انصاف کی کرسی پر، تخت اقتدار پر ہو یا تختۂ دار پر،

مسلمانوں کی بڑی تعداد ہر حال میں اور ہر جگہ اپنے علماء سے حکم شرعی دریافت کرتی ہے اور حلال وحرام کی حدوں کو جاننا اور بہ حد امکان ان پر عمل کرنا چاہتی ہے، یہی وہ بات ہے جس نے مغرب کے میخانۂ الحاد کو امت مسلمہ کے خلاف کھڑا کر دیا ہے کہ مسلمان اس حمام میں آنے کو کیوں تیار نہیں ہیں، جس میں ساری دنیا بے لباس ہو کر آچکی ہے اور یہ امت ابھی تک کیوں حلال وحرام اور اخلاق وحیا کے فرسودہ خیالات کی اسیر ہے، اسی باعث مسلمانوں کو بنیاد پرستی، قدامت پسندی اور دقیانوسیت وغیرہ کے طعنے بھی دیے جاتے ہیں؛ لیکن بحمد اللہ مسلمانوں کو خدا اور رسول کی محبت میں طعن وطنز اور سب وشتم کے یہ کانٹے بھی پھول نظر آتے ہیں کہ :

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہ یار سلامت ہزار میخانے

چنانچہ اس وقت دنیا میں قرآن مجید سے عداوت وعناد کی جو لہر پیدا کی جارہی ہے، جس کا ظہور کبھی قرآن مجید کو جلانے کی شکل میں ہوتا ہے، کبھی حامل قرآن مجید کے کارٹون بنا کر اور کبھی قرآن مجید کے خلاف زہر آلود لٹریچر اور پروپیگنڈے پر مبنی ابلاغی کوششوں کے ذریعہ، ان کا اصل ہدف صرف قرآن دشمنی نہیں ہے؛ بلکہ خدا بیزاری اور مذہب اور اخلاقی قدروں سے مکمل طور پر آزاد ہوجانے کا جذبہ ہے، —— اسی پس منظر میں قرآن مجید کے موضوع پر یہ سیمینار منعقد کیا جارہا ہے۔

حضرات ! اس کائنات کا ایک فطری نظام یہ ہے کہ جو چیز انسانیت کے لئے مفید اور نافع ہوتی ہے، دست قدرت خود اس کی حفاظت کرتا ہے، قرآن مجید نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ
كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ . (الرعد:۱۷)

کائنات کی تمام چیزوں میں فطرت کا یہی نظام جاری وساری ہے؛ یہاں تک کہ یہ انسان جو اس دنیائے بے ثبات کی سب سے قیمتی شئے ہے، وہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں، جب انسان کی صلاحیتیں اپنے عروج پر پہنچ کر زوال کی طرف سفر کرتی ہیں تو پھر فرشتۂ غیب اس کو پردۂ ہستی سے ہٹا دیتا ہے اور انسان کے قریب ترین اعزہ واقارب بھی اسے زیادہ دیر اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوتے؛ کیوں کہ اب اس سے اس دنیا کا کوئی مفاد متعلق نہیں رہا۔

خدا کا یہی نظام مذہبی کتابوں کے سلسلہ میں بھی رہا ہے، جن کتابوں سے اب انسانیت کی ہدایت اور اس کا روحانی نفع متعلق نہیں ہے، وہ محفوظ نہیں رہیں، بعض کتابیں وہ ہیں، جن کو اہل مذہب الہامی کتاب کہتے ہیں؛ لیکن یہ کتاب کس شخصیت پر الہام ہوئی، وہ اس کو بھی بتانے سے قاصر ہیں اور ان کے پاس اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے،

محمد رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین عہد میں جو کتابیں نازل کی گئیں، ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ اپنی اصل زبان میں موجود نہیں ہیں؛ بلکہ ترجمہ در ترجمہ کی شکل میں ہیں، نہ ان کی کوئی سند ہے اور نہ ان کے جمع و تدوین کی کوئی تاریخ؛ بلکہ اب تک اصلاح کے نام پر ان کی تعبیرات میں تبدیلیاں کی جاتی رہتی ہیں، قرآن مجید سے چوں کہ انسانیت کی ہدایت متعلق ہے اور اب قیامت تک کوئی اور کتاب آنے والی نہیں ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے: ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ''. (الحجر:۹)

قرآن مجید کی حفاظت کا یہ وعدہ اس شان سے پورا ہوا ہے کہ نہ صرف اس کے الفاظ کی حفاظت کی گئی؛ بلکہ اس کے طرز ادائیگی اور منہج تلاوت کی بھی حفاظت کی گئی اور اس کے لئے مستقل طور پر فن تجوید و قرأت وجود میں آیا، قرآن مجید کے رسم الخط کی بھی حفاظت کی گئی؛ چنانچہ آج بھی رسم عثمانی کے مطابق قرآن کی کتابت ہوتی ہے اور علماء نے اس سے انحراف کرنے سے منع کیا ہے، قرآن مجید کے معانی کی بھی حفاظت کی گئی؛ چنانچہ محدثین نے رسول اللہ ﷺ کی تشریحات کو محفوظ کر کے اور فقہاء نے درست مفاہیم مستنبط کر کے تحریف معنوی کا راستہ بند کر دیا؛ حالاں کہ تاریخ میں بعض ایسے گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے قرآن میں معنوی تحریف کی کوشش کی ہے اور اپنے ذاتی خیالات کو قرآن میں سمونا چاہا ہے؛ لیکن امت میں کبھی ایسے افکار کو پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس زبان اور بیان کے اس اسلوب کو بھی محفوظ رکھا، جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، پندرہ سو سال سے کم عرصہ میں زبانیں اس قدر بدل جاتی ہیں کہ قدیم زبان کی جگہ گویا ایک نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے؛ لیکن اس کے باوجود کہ طویل عرصہ سے عربی زبان، سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان نہیں ہے اور نہ اس سے لوگوں کے معاشی مفادات متعلق تھے، پھر بھی معجزاتی طور پر نہ صرف یہ زبان محفوظ ہے؛ بلکہ اس کے ادب کا وہی معیار آج تک قائم ہے، جو نزول قرآن کے زمانہ میں تھا، اللہ تعالیٰ نے ان مقامات کی بھی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، جہاں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے، یعنی حرمین شریفین کہ انشاء اللہ دجال کے فتنے سے بھی ان کی حفاظت ہوگی اور اللہ نے اس امت کی بھی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے جو قرآن مجید کی حامل ہے؛ چنانچہ حضور ﷺ کی پیشینگوئی ہے کہ اس امت پر اجتماعی عذاب نازل نہ ہوگا، جیسا کہ پچھلی بعض قوموں پر نازل ہو چکا ہے، قرآن مجید کی اس طرح غیر معمولی طور پر حفاظت کا غیبی انتظام دراصل اسی بنیاد پر ہے کہ اب قیامت تک انسانیت کی ہدایت اور اس کی فلاح و کامیابی قرآن مجید سے مربوط ہے۔

حضرات! قرآن مجید کا اصل مقصد ہدایت ہی ہے؛ اسی لئے اس میں بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ ''وہ کتاب ہدایت ہے، متقیوں کے لئے'' (البقرۃ:۲) ''وہ ہدایت ہے تمام انسانیت کے لئے'' (البقرۃ:۱۸۵) ''وہ سب سے زیادہ

درست اور سیدھے راستے کی رہنمائی کرتا ہے'' (الاسراء: ۹) اسی ہدایت کا ایک پہلو یہ ہے کہ جو لوگ قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، وہ بھی قرآن کے بعض احکام کو قبول کرنے پر مجبور ہیں، دنیا کے اکثر مذاہب میں طلاق کا تصور نہیں تھا؛ لیکن طلاق بعض دفعہ ایک ضرورت بن جاتی ہے، جیسے باتھ روم ایک ناپسندیدہ جگہ ہے، جہاں انسان ضرورت سے زیادہ وقت گذارنا نہیں چاہتا؛ لیکن وہ گھر نامکمل ہے، جہاں انسان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام نہ ہو، اسی طرح طلاق ایک ناپسندیدہ شئے ہے؛ لیکن وہ خاندانی نظام ناقص و نا تمام ہے جس میں نفرت کا شعلہ بھڑک جانے کے بعد رشتۂ نکاح کو ختم کرنے کی گنجائش نہ ہو، اسی طرح عورتوں کو میراث میں حق نہیں ملتا تھا، قرآن نے ماں، بیٹی اور بیوی کو لازماً وارث قرار دیا اور بعض صورتوں میں دوسری خاتون رشتہ داروں کو بھی (النساء: ۱۲-۱۱)، لڑکیوں کو خود اپنے لئے رشتہ کے انتخاب کا حق نہیں تھا، قرآن نے ان کو اس کا حق دیا: ''فَلاَ تَعۡضُلُوۡهُنَّ أَن يَنكِحۡنَ أَزۡوَاجَهُنَّ '' (البقرۃ: ۲۳۲) قرآن مجید کے ایسے بہت سے احکام ہیں جن کو آج پوری دنیا نے قبول کیا ہے، غرض کہ قرآن صرف آخرت کی فلاح و نجات ہی کے لحاظ سے ہادی نہیں ہے؛ بلکہ وہ خوشگوار، پُرسکون اور بہتر دنیوی زندگی کے لئے بھی ہادی و رہبر ہے۔

بزرگانِ محترم ! یہ سوال بار بار اٹھایا جاتا ہے کہ قرآن مجید اس دور میں اتارا گیا ہے، جب انسان ترقی کی ابتدائی حالت میں تھا، جب انسان اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی منزلیں طے کرتا تھا، جب انسانیت آج کی سہولتوں سے محروم تھی، اور آج صورت حال یہ ہے کہ انسان ہوا کے دوش پر اڑتا ہے، اس نے سمندر کی گہرائیوں کو فتح کر لیا ہے، وہ ایک لمحہ میں اپنی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچا سکتا ہے اور دنیا کے ایک کونے میں بیٹھ کر دوسرے کونے کے مناظر کو دیکھ سکتا ہے، اس دور کے لئے وہ کتاب کیسے کافی ہوسکتی ہے جو تمدن سے محروم بدوی دور میں نازل کی گئی؟ بظاہر یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات نئی نسل کے دلوں میں شکوک و شبہات کے کانٹے بونے کا باعث بھی بنتی ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ محض ایک مغالطہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے، ان کا تعلق وسائل سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کی بنیادی ضرورتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اپنی منزل تک جلد پہنچنے کی خواہش انسان کے اندر پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، پہلے انسان اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اونٹوں اور گھوڑوں کا سہارا لیتا تھا، اور اب موٹر، بس، ٹرین اور جہاز کا سہارا لیتا ہے، انسان پہلے بھی بیماریوں سے شفا کا طلب گار تھا اور جڑی بوٹیوں سے استفادہ کرتا تھا، اب بھی وہ صحت و علاج کے لئے بے قرار رہتا ہے اور آج جو وسائل میسر ہیں، ان سے استفادہ کرتا ہے، کل بھی سچائی کو پسند کیا جاتا تھا، دھوکہ اور جھوٹ کو لوگ ناپسند کرتے تھے، آج بھی سلیم الفطرت انسان کی پسند و ناپسند یہی ہے۔

قرآن مجید اصل میں وسائل کو نہیں ؛ بلکہ انسان کے فطری جذبات اور برتاؤ کو اپنا موضوع بناتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ کن وسائل کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ اگر آپ کے پاس تیز رفتار سواری ہے تو آپ اسے خیر کے کاموں میں استعمال کریں نہ کہ شر کے، اگر آپ کو جدید اور تیز رفتار ذرائع ابلاغ میسر ہیں تو آپ کی طرف سے ان کا استعمال خیر کی اشاعت اور بُرائی کو روکنے میں ہو، اگر آپ نے دفاعی قوت حاصل کی ہے تو اس کا استعمال ظلم کے مقابلہ کے لئے ہو نہ کہ ظلم کرنے کے لئے، غرض کہ قرآن کی تعلیمات کا تعلق اصل میں وسائل کے استعمال سے ہے نہ کہ وسائل کی پیدائش سے ؛ اس لئے سائنس جس قدر ترقی کرتی جائے گی، ایجادات واختراعات جس قدر بڑھتی جائیں گی اور وسائل میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا، قرآن کی ہدایت اور اس کی رہنمائی کی ضرورت بھی بڑھتی جائے گی؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ موجودہ ترقیات نے قرآن مجید کی رہنمائی کی ضرورت کو کم نہیں کیا ہے؛ بلکہ بڑھا دیا ہے۔

حضرات ! اس سیمینار کے لئے ایسے عناوین منتخب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو عصر حاضر کے تناظر میں اہمیت کے حامل ہیں، جن سے انشاء اللہ قرآنی تعلیمات کی آفاقیت، انسانی ضرورت ومصلحت سے ہم آہنگی، فطرت سے موافقت اور عقل وتجربہ کی روشنی میں واقعیت وحقانیت کی وضاحت ہوگی، نیز دعوتی کام کرنے والوں کو بہتر مواد فراہم ہوگا؛ تاکہ ان کی دعوت شعور وآگہی اور بصیرت پر مبنی ہو، نیز اس کے علاوہ قرآن کی تدریس کو مؤثر بنانے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک قرآن کو پہنچانے کے مفید طریقوں کی بھی رہنمائی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو ان مقاصد کے حاصل ہونے کا ذریعہ بنائے!

حضرات ! ہمارے لئے خوشی کی بات ہے کہ اس وقت ہندوستان کا ایک تاریخی شہر حیدرآباد جس کا تاریخی نام ''فرخندہ بنیاد'' ہے، آپ کے لئے دل کی آنکھیں بچھائے ہوئے ہے، اس شہر کی بنیاد ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں محمد قلی قطب شاہ جیسے عابد شب بیدار بادشاہ نے رکھی، اور خود اسے یہ شہر ایسا بھایا کہ اس نے شعر میں اپنے ہی بنائے اور بسائے ہوئے شہر کو داد دی کہ :

لطیف و دل کشا آب و ہوائے
مبارک منزلے فرخندہ جائے

یہ شہر اور دکن کا پورا خطہ ابتدائی دور ہی سے علم وادب کا مرکز رہا ہے، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی دکنی اور اردو کی پہلی نثر ''معراج العاشقین'' جو خواجہ گیسو دراز کی طرف منسوب ہے، دونوں کا تعلق دکن سے تھا، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ اردو کی جائے پیدائش اور جائے پرورش ہے، زمانہ قدیم کے علاوہ ماضیٔ قریب میں بھی اس شہر میں بڑی اہم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، جامعہ نظامیہ کے بانی فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی، محدث دکن

مولانا عبداللہ شاہ، تحریک اسلامی کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلی مودودی، مولانا حسام الدین فاضل، نواب وحید الزماں حیدرآبادی (مترجم کتب حدیث) اور میدان تحقیق کے درآبدار اور نادرۂ روزگار ڈاکٹر محمد حمید اللہ اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں، اسی طرح امجد حیدرآبادی جیسے رباعی گو اور اخلاقیات کے شاعر، مخدوم محی الدین جیسے باغیانہ شاعری کے سپہ سالار اور جدید لب ولہجہ کے شعراء شاذ تمکنت اور اوج یعقوبی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا، حال حال کی شخصیتوں میں مجلس تعمیر ملت کے بانی سید خلیل اللہ حسینی، بلند پایہ واعظ و مصلح اور عالم حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقلؒ اور بالغ نظر حوصلہ مند معروف قائد سلطان صلاح الدین اویسی یہیں پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کی کوششیں پورے ہندوستان تک پہنچیں، گذشتہ ایک دہے میں یہ شہر جن اہم علمی و دینی ہستیوں سے محروم ہوا ہے، ان میں معروف صاحب قلم مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا سید اکبر الدین قاسمی اور محترم دوست جناب قاری محمد تقی الدین صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شہر کی بنیاد بھی ایک ایسے بادشاہ نے رکھی جو سلطان ہونے کے باوجود درویش تھا، اور اس شہر میں اسلام کی دعوت واشاعت کا کام بھی ایک صاحب نسبت بزرگ بابا شرف الدین عراقیؒ سے ہوا ہے، جو براہ راست شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مجاز تھے، یہ عراق سے شمالی ہندوستان اور وہاں سے دکن تشریف لائے، ۶۸۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی، آپ کی قبر شہر کے ایک کنارے یہاں سے قریب ایک پہاڑی پر موجود ہے، جو بابا شرف الدین کی پہاڑی کہلاتی ہے، آپ کے ساتھ آپ کے بھائی بابا شہاب الدین بھی تشریف لائے تھے، جنھوں نے اس علاقہ میں بڑا دعوتی کام کیا اور بابا شرف الدین کے چار سال بعد وفات پائی، اس علم پرور شہر میں بہت سے علماء یمن، افغانستان اور شمالی ہند کے علاقوں سے آکر بھی خیمہ زن ہوئے ہیں، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندی، مولانا سید مناظر حسن گیلانی، مولانا سید عبدالباری ندوی، مولانا فضل اللہ جیلانی، پروفیسر الیاس برنی، مولانا عبدالقدیر بدایونی، مولانا ابوالوفاء افغانی وغیرہ ان ہی علماء میں ہیں، یہیں ان کی مسند فیض بچھی اور یہیں سے ان کے علم کی روشنی پوری دنیا میں پہنچی، ان کے علاوہ یہ شہر مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور ماہر القادری نیز جوش ملیح آبادی جیسے علماء وادباء کا بھی میزبان رہا ہے۔

یہ شہر تحریکوں اور اداروں کا بھی مرکز رہا ہے، خاص کر جامعہ نظامیہ ہندوستان کی قدیم دینی درسگاہوں میں سے ایک ہے، جس کے فیض یافتگان ہندوستان کے علاوہ بیرون ملک میں بھی بکثرت موجود ہیں، دوسرا اہم بلکہ اپنی نوعیت کا منفرد اور پورے ملک کے لئے مایہ افتخار ادارہ ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' ہے، حدیث ورجال، فقہ وتاریخ، طب ولغت اور تفسیر کے بہت سے مخطوطات پہلی بار دائرہ سے شائع ہوئے، شیخ علی متقی کی ''کنز العمال''،

علامہ سمعانی کی ''کتاب الأنساب''، امام محمد بن حسن الشیبانی کی ''کتاب الأصل''، علامہ ذہبی کی ''تذکرۃ الحفاظ'' اور نہ جانے کیسے کیسے علمی ذخیرے ہیں، جو دائرۃ المعارف کے واسطے سے اہل علم کی آنکھوں کا سرمہ بنے اور اس کے ذریعہ یہ علمی امانتیں مخطوطات کے دفینوں سے مطبوعات کے سفینوں تک پہنچیں، جب کہ اس وقت عربی کتابوں کی طباعت آسان نہیں تھی۔

جب ذکر اداروں کا آیا ہے تو دو 'مرحوم' اداروں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، ایک دارالترجمہ کا جسے آصف جاہی حکومت نے قائم کیا، اور جس نے مشرق و مغرب کے لعل و گہر کو اردو کا جامہ پہنایا، نیز اردو اصطلاحات کو وضع کرنے کا نہایت اہم کام انجام دیا، جس کا فائدہ اب بھی پڑوسی ملک کو پہونچ رہا ہے، دوسرا ''احیاء المعارف النعمانیہ'' ہے، ممتاز فقیہ اور صاحب نظر عالم مولانا ابوالوفاء افغانی نے جس کی بنیاد رکھی، یہیں سے امام ابویوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار'' شائع ہوئی، امام محمد کی ''جامع کبیر'' طبع ہوئی، سرخسی کی شرح السیر الکبیر اور شرح الزیادات طبع ہوئی، زیادات الزیادات کی طباعت عمل میں آئی، غرض کہ فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں جو اہل علم کی نظر سے اب تک مخفی تھیں، اسی ادارہ کے ذریعہ اہل ذوق کے ہاتھوں تک پہونچیں۔

۱۹۴۸ء میں ایک ایسا طوفان آیا کہ اگر آسمان اس پر خون کے آنسو برساتا تب بھی بجا ہوتا، لگتا تھا کہ اس خطہ سے ہر وہ علامت مٹادی جائے گی، جس کی نسبت اسلام اور مسلمانوں سے ہو؛ لیکن اسلام کا نشہ ایسا نشہ نہیں ہے، جسے ظلم و جور کی آندھیاں اُڑا لے جائیں؛ چنانچہ طوفان آیا اور گذر گیا، اس موقع سے شہداء حق نے جو اپنے لہو نچوڑ نچوڑ کر سرزمین دکن کو آبیار کیا، اسی کی آغوش سے ایک نیا سورج طلوع ہوا، دین پر استقامت کا سورج، علم کا سورج، حوصلہ وہمت کا سورج؛ چنانچہ آج یہ شہر دینی تعلیم، عصری تعلیم، دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کے اداروں، اور ان اداروں کے تحت ہونے والی کوششوں، نیز مسلمانوں کی سیاسی قوت کے اعتبار سے ایک مثالی شہر بن چکا ہے، شاید یہ اس شہر کے بانی قلی قطب شاہ کی دعاء دردمندانہ کا اثر ہے، جنھوں نے کہا تھا :

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر

اس حقیقت کا عرض کرنا مناسب ہوگا کہ قرآن مجید کی خدمت میں بھی دکن اور حیدرآباد کا نمایاں حصہ رہا ہے، بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیق کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی سے بھی کافی پہلے دکنی اُردو میں قرآن مجید کا ترجمہ ہوا ہے، ان کا اندازہ ہے کہ یہ ترجمہ دسویں صدی کے اوائل کا ہے، جب کہ شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے تیرہویں صدی کے آغاز کے ہیں، ان ہی کے تحقیق کے مطابق ''تنزیل'' کے نام سے قرآن مجید کی ایک قدیم تفسیر ملتی ہے، جو ۱۱۴۷ھ کی تالیف ہے، اور مصنف کا نام سید بابا قادری ہے، یہ

تفسیر اگر چہ خالص دکنی زبان میں نہیں ہے؛ لیکن اس میں دکنی الفاظ بھی موجود ہیں جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مصنف دکن کے رہیں ہوں گے، اور تفسیر اردو میں لکھی ہوگی؛ لیکن اپنی مادری زبان کے الفاظ بے ساختہ قلم پر آگئے ہوں گے، ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' نے قرآن سے متعلق متعدد کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سرفہرست امام برہان الدین ابراہیم بن عمر بقاعی (متوفی: ۸۸۵ھ) کی ''نظم الدرر'' ہے، جو بائیس جلدوں پر مشتمل ہے، یہ کتاب یوں تو قرآن مجید کی ایک مکمل تفسیر ہے؛ لیکن ربط آیات و ربط سور کے سلسلہ میں منفرد نوعیت کی حامل کتاب ہے، جس پر دائرہ کے فاضل مصحح مولانا محمد عمران اعظمی نے بڑی محنت سے تحقیق و تعلیق کا کام کیا ہے، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی شرح میں علامہ عبدالکریم ہروی کی ''الکہف والرقیم'' ایک فاضلانہ تالیف ہے، سورہ فاتحہ کی مبسوط تفسیر ''اعجاز البیان فی تأویل الفرقان'' بھی پہلی بار یہیں سے شائع ہوئی، جو مشہور صوفی محی الدین ابن عربی کے شاگرد علامہ محمد بن اسحاق صدر الدین قونوی (متوفی: ۶۷۲ھ) کی تالیف ہے، قرآن مجید کے مفردات اور وجوہ و نظائر پر علامہ جمال الدین ابوالفرج بن جوزی (متوفی: ۵۹۷ھ) کی ''نزهة الأعين النواظر في علم الوجوه والنظائر'' یہیں سے شائع ہوئی ہے، قرآن اور حدیث کے مفردات پر مشترک کتاب ''الغريبين'' (تالیف: علامہ ابوعمر ہروی، متوفی: ۴۰۱ھ) پہلی بار یہیں سے شائع ہوئی ہے۔

جامعہ نظامیہ — جو جنوبی ہند کی ممتاز اور بافیض دینی درسگاہ ہے — سے تعلق رکھنے والے بزرگوں نے بھی قرآن مجید کی خدمت میں اپنا حصہ ادا کیا ہے، بانی جامعہ حضرت مولانا شاہ انوار اللہ فاروقیؒ کی گراں قدر تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قرآنیات کا خاص ذوق تھا؛ چنانچہ آپ کے قرآنی افادات کو جامعہ کے ایک فاضل نے ''تفسیرات انوار'' کے نام سے شائع کیا ہے، جامعہ کی ایک قابل قدر ہستی مولانا محمد شطاری نے قرآن مجید کی قسموں پر، حروف مقطعات پر، قرآن مجید کی پیشینگوئیوں پر، اور سورہ عصر کی تفسیر پر مختلف مختصر و مبسوط کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، اسی طرح مولانا محمد شاہ عمر حسینی اور ان کے صاحبزادہ گرامی معروف فاضل مولانا سید محمد بادشاہ حسینی قادری نے مل کر پورے قرآن مجید کی تفسیر فرمائی، جس کا نام ''تفسیر قادری'' ہے، اور تاریخی نام ''کشف القلوب'' ہے، حیدرآباد میں قرآن مجید کی قابل ذکر خدمات میں ایک مولانا قاری محمد عبدالباری صاحب کا ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی ہے، جو عوام کے لئے نہایت سہل زبان میں کیا گیا ہے، ماضی قریب میں ''قصص قرآن'' پر مولانا عبدالرحمٰن مظاہری کی دو جلدوں میں ''ہدایت کے چراغ'' بھی ایک بہتر تالیف ہے۔

مغربی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ کی خدمت میں بھی حیدرآباد کا نمایاں حصہ رہا ہے، مارماڈیوک پکتھال —— جن کا انگریزی ترجمہ مقبول خاص و عام ہے —— نے حیدرآباد ہی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور یہیں کے

تعاون سے مصر جا کر اس کی تصحیح کی ، انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ایک اور ترجمہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف کا ہے ، ان کا بھی تعلق حیدرآباد ہی سے تھا ، انگریزی کا ایک آسان ترجمہ ڈاکٹر انیس الدین صاحب مرحوم نے کچھ ہی عرصہ پہلے کیا ہے ، جس میں سائنسی حقائق کو واضح کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے ، انگریزی ترجموں کے سلسلہ میں عماد الملک سید حسین بلگرامی کا ذکر بھی مناسب ہوگا ، جنھوں نے ابتداء سے سورۂ طٰہٰ کے ختم تک قرآن پاک کا ترجمہ کیا ، مولانا عبد الماجد دریابادی نے ان کے ترجمہ پر خوب داد دی ہے ، یہ ترجمہ حیدرآباد میں ہوا ، اور نظام ہفتم کے خصوصی تعاون سے ہوا ، فرنچ زبان میں ترجمہ قرآن کی خدمت مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کی اور عرصہ تک پیرس میں مقیم رہے ، اور سیکڑوں لوگوں کو ان کے ذریعہ ہدایت حاصل ہوئی ، اس کے علاوہ میر عثمان علی خان نظام ہفتم نے مرہٹی ، گجراتی ، تمل اور گورمکھی ترجموں کی تیاری اور اشاعت میں بھی تعاون کیا ہے ، ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حوالہ سے اس کی تفصیل نقل کی ہے ۔

ترجمہ وتفسیر کے علاوہ تجوید کے سلسلہ میں یہ شہر طویل عرصہ سے اعلیٰ ذوق کا حامل رہا ہے ، اس سلسلہ میں قاری محمد کلیم اللہ حسینی مرحوم کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس شہر سے تعلق رکھنے والے کئی قراء حضرات کو قرأت کے سلسلہ میں بین الاقوامی ایوارڈ مل چکا ہے ، غرض کہ قرآن مجید کی خدمت میں حیدرآباد کا بھی قابل ذکر حصہ رہا ہے ۔

''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' جس کے زیر اہتمام یہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے ، ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۰۰۰ء میں اس کا قیام عمل میں آیا ، ادارہ کے ایک صاحب ذوق مخلص نے اس کی تاریخ ''وَلاَ نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ'' کے فقرہ سے نکالی ہے ، اس کے قیام کے بنیادی مقاصد ہیں : مختلف اسلامی علوم میں باصلاحیت افراد کار کی تیاری ، علماء کو جدید تقاضوں سے واقف کرانا ، اور عصری تعلیم یافتہ حضرات کو دین سے آشنا کرنا ؛ تاکہ اہل علم کی ایک ایسی ٹیم تیار ہو سکے جو دینی وعصری علوم کی جامع ہو ، جن موضوعات پر تحقیق کی ضرورت ہے ، ان میں فضلاء سے جمع وتحقیق کا کام لیا جائے اور جو مخطوطات اب تک تشنۂ طبع ہیں ان پر بھی تحقیق وتعلیق کا کام ہو ، نیز برادران وطن میں دعوت کے کام کے لئے دینی مدارس اور عصری دانش گاہوں کے فضلاء کو تیار کیا جائے ۔

ان مقاصد کے لئے یہاں علوم القرآن ، علوم الحدیث ، فقہ اسلامی ، دعوت اور مقارنۃ الأدیان میں اختصاص کے شعبے شروع سے قائم ہیں ، گذشتہ سال سے افتاء کئے ہوئے طلبہ کے لئے اسلامک فائنانس میں ڈپلوما کا بھی آغاز کیا گیا ہے ، ان تمام شعبوں میں انگریزی زبان ، کمپیوٹر ، جغرافیہ ، تاریخ ہند ، علم شہریت اور معاشیات کے مبادی ، نیز دستور ہند کے بعض ابواب لازمی طور پر داخل نصاب ہیں ، گذشتہ دس سال کے عرصہ میں فتاویٰ سراجیہ ، فوائد ظہیریہ ،

تفسیرات احمدیہ، احکام القرآن للجصاص، شرح معانی الآثار للطحاوی، الکافی للحاکم الشہید، الأدلة الشریفة علی مذہب أبي حنیفۃؒ وغیرہ متعدد مخطوطات یا مطبوعات پر تحقیق و تعلیق کا کام ہوا ہے، یا ابھی جاری ہے، یوں تو معہد میں دعوتی تربیت کا ایک شعبہ بھی ہے؛ لیکن اس کے علاوہ معہد کے زیرنگرانی مستقل ایک دعوتی ادارہ بھی ''سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج'' کے نام سے قائم ہے، جو برادران وطن میں دعوت کا اور مختلف اہل مذاہب کے درمیان مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام کرتا ہے، بحمد اللہ آندھرا پردیش میں بحیثیت مجموعی ٦٠ مقامات پر اس کے تحت کام ہوتا ہے۔

عصری دانش گاہوں کے فضلاء کو دینی تعلیم دینے کے لئے معہد نے ایک مختصر مدتی عالم کورس ''مدرسہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ'' کے نام سے قائم کیا ہے، جس کی تعلیم روزانہ مغرب کے بعد تین تا چار گھنٹے ہوتی ہے، اس میں زیادہ تر عصری درسگاہوں میں زیر تعلیم طلبہ یا وہاں سے پڑھے ہوئے لوگ داخل ہوتے ہیں، اور انہیں ابتدائی نحو و صرف سے لے کر صحاح ستہ کے منتخبات تک پڑھائے جاتے ہیں۔

حضرات ! آج جب کہ معہد کے قیام پر ۱۰؍سال کا عرصہ مکمل ہو چکا ہے، ادارہ کے ٹرسٹ کی جانب سے اعلان کیا جاتا ہے کہ :

☆ انشاء اللہ جون ۲۰۱۱ء سے کامرس اور ایم بی اے کے طلبہ کے لئے ''اسلامک فائنانس'' ڈپلوما کورس شروع کیا جائے گا۔

☆ دوسرے معہد نے طے کیا ہے کہ ایک ایسی دینی درسگاہ کا آغاز کیا جائے، جس کا ذریعۂ تعلیم عربی اور انگریزی ہو اور جس میں جلالین اور ہدایہ اولین تک تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک تک کے نصاب کے اہم مضامین اس طرح شامل کئے جائیں کہ وہ دسویں جماعت کا امتحان دے سکیں ؛ تاکہ اگلے پانچ سال میں وہ چاہیں تو فضیلت اور آگے کا کورس کریں یا گریجویشن کریں، جیسا کہ اس وقت برطانیہ یا خلیجی ممالک کا تعلیمی نظام ہے، خدا کرے یہ تجربہ کامیابی سے ہمکنار ہو، انشاء اللہ جون ۲۰۱۱ء یا شوال ۱۴۳۲ھ سے اس کی ابتداء کی جائے گی۔

☆ تیسرا منصوبہ مستقل طور پر تحقیق مخطوطات کے شعبہ کا قیام ہے؛ کیوں کہ دائرۃ المعارف العثمانیہ کی زبوں حالی اور حکومت کی طرف سے سوتیلے سلوک کے پس منظر میں اب یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ جس طرح مسلمان اپنی مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں حکومت کے تعاون سے آزاد ہو کر خدمت کر رہے ہیں، اسی طرح وہ اپنے

بزرگوں کے علمی ورثہ کی بھی خود حفاظت کریں اور حکومت یا کسی اور پر تکیہ نہ کریں۔

آپ حضرات کی دُعاؤں کی جلو میں اللہ کے فضل و کرم سے انشاءاللہ یہ تعلیمی اور تحقیقی منصوبے آگے بڑھیں گے اور یہ کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا۔

میں اخیر میں ایک بار پھر آپ حضرات کی تشریف آوری اور عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خدا کے حضور دعاء گو ہوں کہ وہ اخلاص اور عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اسی ذات یکتا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ :

جو کچھ ہوا ہے ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

⊙ ⊙ ⊙

مکتوبِ گرامی

(شیخ محمد محمد عوامہ حفظہ اللہ)

ترجمہ: مولانا سید عبد الرشید ⊙

حضرت العلام محدث عصر شیخ محمد محمد عوامہ کا خطاب جو سیمینار میں پیش کیا گیا تھا، صحیح طور پر ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے تحریر میں نہیں لایا جا سکا، رابطہ کرنے پر شیخ کے پاس بھی اس کی کوئی نقل نہ مل سکی، سیمینار کے بعد ارسال کردہ ایک مکتوب میں شیخ نے 'قرآن مجید سیمینار' کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا تھا، خطاب کی جگہ اسی مکتوب کو شامل کیا جا رہا ہے۔

الحمد لله رب العالمين ، موفق من شاء لما شاء من الخيرات ، والصلاة والسلام على سيدنا محمد المؤيد بالمعجزات الباهرات ، وعلى آله وصحبه أولي المكرمات الظاهرات ، ورضي الله عن التابعين لهم بإحسان إلى يوم الدين ، وبعد .

یقیناً اللہ عزوجل اپنے مومن بندوں میں سے مخلصین صادقین کو اپنی خاص توفیق اور کرم سے نوازتا ہے، ان ہی مخلصین میں بلند ہمت، علم و دین اور مسلمانوں کے مصالح کی خدمت میں سرگرم، جدید پیش آمدہ مسائل پر خصوصی نگاہ رکھنے والے عالم و فقیہ شیخ خالد سیف اللہ رحمانی ہیں جو ہندوستان میں علم و عمل اور دعوت دین کی ممتاز شخصیتوں میں سے ایک ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے، دنیا و آخرت میں ان کی دستگیری فرمائے اور ان کو مخلص ساتھی مہیا فرمائے۔

مولانا ان لوگوں میں ہیں جن پر خاموش مجاہد اور پرسکون سمندر کا وصف منطبق ہوتا ہے، ان کی خاموشی ان کی گویائی پر غالب ہے؛ لیکن ان کی جد و جہد اور سرگرمی، راحت و آرام سے کہیں زیادہ ہے، ان کے کارنامے اور اسلام کے لئے ان کی خدمات کو تو باہمت اور طاقتور افراد کی پوری ٹیم بھی بمشکل انجام دے سکتی ہے، یہ اللہ کی مدد

⊙ فاضل دمشق، استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

اور اس کی توفیق کی دین ہے؛ کیوں کہ وہ :

(۱) اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے جنرل سکریٹری۔

(۲) المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے بانی و ناظم۔

(۳) جامعہ عائشہ نسوان حیدرآباد دکن کے ناظم، جس میں (۱۶۰۰) طالبات زیر تعلیم ہیں، جو اعدادیہ، ثانویہ اور عالیہ کے تعلیمی مراحل اور تخصص فی الفقہ اور تخصص عربی ادب کے شعبوں پر مشتمل ہے۔

(۴) ریاست آندھرا پردیش کے قاضی القضاۃ۔

(۵) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری۔

(۶) دینی مدارس بورڈ آندھرا پردیش کے صدر۔

(۷) دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی مجلس علمی کے رکن۔

(۸) دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے ممبر۔

(۹) ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں متعدد اسلامی مالیاتی اداروں کے شرعی مشیر۔

(۱۰) اور روز نامہ ''منصف'' اُردو کے مستقل کالم نگار ہیں، جس میں ان کے مستقل دو کالم ہیں، ایک فقہ و فتاویٰ کا، دوسرے علمی، تربیتی اور جدید پیش آنے والے موضوعات کا، یہ روز نامہ سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اور شائع ہونے والا مسلم اخبار ہے، قارئین ان کالموں کو بڑے اشتیاق سے پڑھتے ہیں؛ کیوں کہ ان میں ان کی فقہی اور فکری مسائل کا حل موجود ہوتا ہے۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں مولانا اپنی تخلیقات کی کثرت کی وجہ سے عصر حاضر کے زود نویس مصنفین میں شمار ہوتے ہیں، ہم ان کے کاموں پر نظر ڈالیں، پچاس سے زیادہ مولانا کی تصنیفات ہیں، جن میں بڑی بڑی جامع اور ضخیم کتابیں بھی ہیں اور چھوٹے با مقصد کتابچے بھی، ان میں جدید عصری مواد بھی لازماً پایا جاتا ہے، جس سے ان کا امتیاز ثابت ہوتا ہے، بعض کتابوں کا دیگر زندہ زبانوں مثلاً: عربی، انگریزی، فارسی اور ہندی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ان تمام کاموں کا طرۂ افتخار وہ کاوش ہے جو ابھی ترجمہ قرآن مجید کی شکل میں سامنے آئی ہے۔

قرآن مجید کے ترجموں کی کمی نہیں، ہندوستان میں اس کی ابتداء امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ) کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی، ان کے بعد ان کے فرزندوں اور شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا؛ لیکن یہ ترجمے علمیت و اُسلوب کے قدیم رنگ میں ہیں؛ کیوں کہ اُردو زبان میں بھی دیگر عالمی زبانوں کی طرح پر پیچ گھاٹیاں ہیں اور وقت کے ساتھ اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے، جس کی وجہ سے متاخرین کے لئے متقدمین کی تحریروں کا سمجھنا مشکل

ہو جاتا ہے، مزید یہ کہ اعلیٰ علمی ذوق کے حامل قدیم علماء ایسے علمی اور فقہی مسائل سے خاص طور پر تعرض کرتے ہیں، جن سے صرف متخصصین کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔

لہٰذا امام شاہ ولی اللہ اور ان کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں کی تحریریں اور ترجمے صرف علماء اور متخصصین کے لئے رہ گئے اور قرآن مجید کے ایک ایسے ترجمے کی ضرورت باقی رہی، جس میں جدید لب و لہجہ میں عصری تعلیم یافتہ طبقہ کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کو مخاطب کیا گیا ہو اور اللہ عز و جل کا دستور بھی یہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو اپنی قوم کی زبان میں دعوت دینے والا بنا کر بھیجا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی کہ ایسی راہ تلاش کی جائے، جس کے ذریعہ نوجوانوں کے جدید ذہنوں تک پہنچا جا سکے اور اس سلسلہ میں کتاب اللہ کو ذریعہ بنایا جائے جو کتاب ہدایت ہے اور ایسا نور ہے جس کی پیروی کرنے والا گمراہ نہیں ہوتا، مولانا نے اس عظیم اہمیت کے حامل خلا کو اُردو زبان میں قرآن مجید کے ترجمے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتے ہوئے پر کیا، اس ترجمہ میں قدیم و جدید کی جامعیت اور اُصول کی پختگی اور زمانہ شناسی کا امتزاج ہے، قدیم رنگ کے خالص علمی و فقہی ضروری مسائل کے ساتھ عصری سوچ و فکر اور نئی نسل کے ذہنوں کو اپیل کرنے والے سلیس اُسلوب کا جامع ہے، شاہ ولی اللہؒ کے ترجمہ اور ان کے مدرسۂ فکر سے پہلی خصوصیت اخذ کی ہے اور دوسری خصوصیت مولانا کے اپنے زمانہ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے آئی ہے، اب یہ ترجمہ دعوتی رنگ میں جمع بین الحسنیین کا مصداق ہے۔

قرآن کریم کی خدمت میں اضافہ کرتے ہوئے، مزید فائدہ کے لئے مولانا محترم دامت برکاتہم نے ترجمہ کے ساتھ طوالت سے گریز کرتے ہوئے مختصر اور مفید تفسیر بھی کی ہے؛ تاکہ جس کو ترجمہ کے علاوہ مزید وضاحت کی ضرورت ہو، اس کو وہیں اپنا مقصود بھی مل جائے اور کسی دوسری کتاب کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہے، اس سے مزید آسانی اور سہولت پیدا ہوگی۔ جزاہ اللہ عن الکتاب الکریم خیر الجزاء.

قارئین کے لئے اس ایک جلد میں قرآن کریم کے آٹھ پاروں، یعنی سورۂ فاتحہ سے سورۂ اعراف تک کا ترجمہ و تفسیر موجود ہے، مولانا دامت برکاتہم گذشتہ کئی سال سے رمضان المبارک کے عشرۂ اخیر کے اعتکاف میں اس تفسیر کے لئے یکسو ہو جاتے تھے اور اب وہ ہر ہفتہ میں دو دن اس عظیم کام کی تکمیل کے لئے فارغ کرتے ہیں، مولائے کریم سے التجاء ہے کہ اپنے کرم سے عافیت کے ساتھ اس مبارک کام کی تکمیل کی توفیق بخشے اور اُردو بولنے والے لاکھوں مسلمانوں میں قرآن سے استفادہ کرنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے اس تفسیر کو متداول بنا کر مولانا کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے، یقیناً سوال کرنے اور اُمید لگانے کے لائق وہی بزرگ و برتر ذات ہے۔

قبل اس کے کہ میں مولانا کے متعلق اپنی بات کو ختم کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کے ایک اور عظیم کام کا تذکرہ کرتا چلوں، جس کو مولانا نے انتہائی کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے، یعنی ''بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار''۔

مولانا نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کی طرف سے مورخہ ۱-۴ ربیع الاول کو حیدرآباد میں یہ سیمینار بلایا، میرا ماننا ہے کہ اللہ کے شکر سے اس بین الاقوامی سیمینار نے کامیابی کے تمام بنیادی نقاط حاصل کئے :

☆ اس سیمینار نے بے دین مغرب کی طرف سے مسلمانوں کے مقدسات کی پامالی خصوصاً قرآن کریم کے سلسلہ میں اس کی زیادتیوں پر دنیائے عرب وعجم میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے مذمت وانکار کے جذبات کی عکاسی کی ہے، مولانا نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا: قرآن مجید سیمینار کے انعقاد کا سبب وہ اسلام دشمن سرگرمیاں ہیں، جو اعداء اسلام قرآن اور پیغمبر قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تعلق سے انجام دے رہے ہیں، ان کے گنہگار ہاتھوں سے قرآن کریم کے تقدس کو پامال کیا جارہا ہے، کبھی قرآن کے نسخوں کو نذر آتش کرتے ہیں، تو کبھی پیغمبر قرآن کی طرف گستاخانہ ونازیبا تصویریں منسوب کرتے ہیں، مختلف ذرائع ابلاغ کو کام میں لاکر اس عظیم کتاب کے متعلق مسموم لٹریچر شائع کرتے ہیں، جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔

☆ کیوں کہ یہ سیمینار ایک ایسے شہر میں منعقد ہورہا تھا، جہاں مختلف ادیان سے تعلق رکھنے والے لوگ بستے ہیں، اس لئے اور اپنی بات کو تمام عالم تک پہنچانے کی ضرورت کے پیش نظر مولانا نے ہندوستان کی بڑی بڑی دینی وعلمی شخصیتوں کو دعوت دی اور ساتھ ہی عیسائی، ہندو اور سکھ مذہب کے چار نمائندوں کو بھی بلایا۔

☆ سیمینار کے پانچوں مباحث قرآن کریم سے تعلق رکھنے والے اہم اعتقادی، سائنسی، سماجی، اقتصادی اور تربیتی موضوعات پر مشتمل تھے۔

☆ ہر مبحث پر کئی پہلوؤں سے لکھا گیا، جس کی وجہ سے تقریباً تیس سے زائد زندہ موضوعات زیر بحث آئے۔

☆ ہر موضوع پر ایک سے زائد مقالہ نگاروں نے قلم اُٹھایا، جس کی وجہ سے مقالہ نگاروں اور باحثین کی تعداد ساٹھ سے متجاوز تھی۔

☆ مجھ کو عربی زبان میں ایک پمفلٹ دیا گیا، جس میں بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار کا پروگرام درج تھا، اس میں تمام مباحث اور مقالوں کا عنوان، مقالہ نگاروں کے ناموں کی تفصیل تھی، میں نے محسوس کیا کہ تمام موضوعات انتہائی مؤثر اور اہم ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر عربی زبان میں ان کی اشاعت ہوتی، اللہ کو منظور ہو تو یہ بڑے خیر کا کام ہوگا۔

ہمارے مولانا نے ––– اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے ––– اور ان کے رفقاء کار اور محبین نے قرآن مجید سیمینار کی تیاریوں میں بڑی مشکلات اور پریشانیاں برداشت کیں، اس کا اجر عظیم مولائے کریم کے پاس ضرور ملے گا، یہ کیا کم ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ابدی کتاب قرآن کریم کی خدمت کے لئے ہوا۔

سونے پر سہاگہ یہ کہ اس قرآن مجید سیمینار میں حدیث شریف کے لئے بھی ایک نشست مقرر کی؛ تاکہ دونوں کے نور اور دونوں کی برکتیں حاصل ہو جائیں، اللہ تعالیٰ ہر بھلائی سے نوازے اور ان مبارک کوششوں کا ثمرہ عطا فرمائے۔

والحمد لله رب العالمين، وصلى الله على سيدنا محمد و على آله وصحبه أجمعين.

۱۸ / ربیع الاول ۱۴۳۲ھ　　　　**محمد محمد عوامہ**

۲۲ / فروری ۲۰۱۱ء　　　　(مدینہ منورہ)

⊙ ⊙ ⊙

خطابِ خاص

(ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ)

ترجمہ: مولانا سید عبدالرشید ⊙

الحمد لله رب العالمين ، أرسل رسوله بالهدى والدين ، وأنزل عليه كتابه المبين ، كتابا معجزاً أفحم الخطباء ، وخطابا مسكتا أعجز جهابذة البلغاء ، قرآنا عربيا غير ذي عوج ، أمر فيه وزجر ، وبشر وأنذر قرآنا من تمسك بعروته الوثقى فازونجا، ومن نبده وأعرض عنه هوى وتردى .

وصلاة ربي وسلامه على من أرسله هاديا وبشيرا ، وأنزل عليه القرآن ليكون للعالمين نذيراً ، وعلى آله البررة ، وصحبه الخيرة ، مصابيح الكرم ، ومفاتيح الكرم ، ومن تبعهم بإحسان وسلم تسليماً كثيراً كثيراً .

علماء ذی وقار، حاضرین کرام :

آپ تمام حضرات بخوبی واقف ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم کو ایسا چراغ بنایا جس کی لَو کبھی مدھم نہیں ہوتی اور ایسا روشن ستارہ بنایا جس کی آب وتاب کبھی متاثر نہیں ہوتی اور ایسا نور بنایا، جس کی چمک دمک کبھی ماند نہیں پڑتی؛ کیوں نہیں، خود آقائے نامدار، قرآن کے سب سے زیادہ واقف کار، اس کے لعل وجواہر کا سب سے زیادہ علم رکھنے والی ہستی —صلوات ربی وسلامہ علیہ— نے اس کا وصف یہ بیان کیا ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور موقوفاً مروی ہے :

كتاب الله ، فيه نبأ ماقبلكم ، وخبر ما بعدكم ، وحكم ما بينكم ، وهو

⊙ فاضل دمشق، استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ، ومن ابتغى الهدى في غيره أضله الله ، وهو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، وهو الصراط المستقيم ، وهو الذي لا تزيغ به الأهواء ، ولا تلتبس به الألسنة ، ولا يشبع منه العلماء ، ولا يخلق على كثرة الرد ، ولا تنقضي عجائبه وهو الذي لم تنته الجن إذ سمعته حتى قالوا : " إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآناً عَجَباً ، يَهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ " من قال به صدق ، ومن حكم به عدل ، ومن دعا إليه هدى إلى الصراط المستقيم . (۱)

خدا تعالیٰ کی کتاب ، اس میں تم سے پہلوں کی خبر ہے ، تمہارے پچھلوں کا علم ہے ، تمہارے آپس کے معاملات کے احکام ہیں ، یہ فیصلہ کی کتاب ہے ، نہ کہ مذاق ، جو کسی ظالم کے ڈر سے اس کو چھوڑے گا ، خدا تعالیٰ اس کو توڑ کر رکھ دے گا ، جو اس کے علاوہ کہیں ہدایت کا متلاشی ہوگا ، خدا تعالیٰ اس کو گمراہ کر دے گا ، یہ خدا کی مضبوط رسی ہے ، حکمت سے پُر نصیحت ہے ، یہی صراط مستقیم ہے ، اس کی تابعداری سے خواہشات گمراہ نہیں ہوتیں ، مومنین کی زبانوں پر اس کی تلاوت دشوار نہیں ہوتی ، علماء کو اس سے سیرابی نہیں ہوتی ، کثرت تکرار سے اس کی جدت ختم نہیں ہوتی ، اس کے عجائبات لامتناہی ہیں ، یہ وہ کلام ہے کہ جنات نے سنا تو بول اُٹھے : " إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآناً عَجَباً ، يَهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ " (الجن:۱-۲) (ہم نے ایک عجیب وغریب کلام سنا ہے ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے) جو قرآن کی بات کرے گا اس کی تصدیق کی جائے گی ، جو اس پر عمل کرے گا وہ ماجور ہوگا ، جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا وہ عادل ہوگا ، جو اس کی طرف بلائے گا اس کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی ہوگی ۔

کسی شاعر نے کتنی سچی بات کہی :

أتى بكتاب أعجز الخلق لفظه … فكل بديع عذره صار أبكما
تحدى به أهل البلاغة كلهم … فلم يفتحوا فيما يعارضه فما
حوى كل برهان عل كل مطلب … ويعرف هذا كل من كان أفهما

ترجمہ : حضور پاک ﷺ ایسی کتاب لے کر آئے ، جس کے الفاظ نے مخلوق کو

(۱) رواہ الدارمی:۳۳۷۴ ، والترمذی:۲۹۰۶ ۔

بے بس بنادیا اور بے مثال و مدلل گفتگو کرنے والے بھی بے زبان بن کر رہ گئے۔
آپ ﷺ نے قرآن کے ذریعہ تمام فصحاء و بلغاء کو چیلنج کیا؛ لیکن کسی نے اس کے مقابلہ میں زبان نہیں کھولی۔
اس کتاب میں ہر بات کی دلیل موجود ہے، جس کو ہر صاحب علم شخص جانتا ہے۔

علماء ذی وقار ! ملت اسلامیہ جن شدید حالات سے دوچار ہے، ان حالات میں قرآن مجید پر ایسی علمی اور تحقیقی کانفرنس منعقد کرانا ایک شدید ضرورت اور ایک مبارک اقدام ہے اور اس معہد کے ذمہ داروں کی جانب سے متعدد اُمور کی طرف اہم اشارہ بھی ہے، ان اُمور میں اہمیت وعظمت کے لحاظ سے باہم تفاوت ہے؛ لیکن سب سے بلند مرتبہ، عظیم الشان اور محکم بات کتاب اللہ کی طرف رُجوع ہے، قول وفعل میں، سیرت واخلاق میں، فیصلہ اور احکام میں، اسی طرح ملک وملت اور افراد و جماعتوں کے بارے میں؛ کیوں کہ قرآن ہی سے اُمت مسلمہ کی عزت و کرامت اور تہذیب وثقافت کی بقا وابستہ ہے، قرآن حکم دے، ہم تعمیل کریں، قرآن منع کرے، ہم احتراز کریں، ہمارا دستور قرآن ہو اور ہماری شریعت نبی عربی کا فرمان ہو، صلی اللہ علیہ وسلم۔

دوسری بات جو اہمیت وعظمت اور مرتبہ میں اس کے بعد آتی ہے، وہ ہے کتاب اللہ میں تدبر وتعمق، علمی گہرائی، باریک بینی اور گیرائی، تاکہ ایسا متبحر اور جامع عالم کینہ پرور مستشرقین کے سامنے مکمل علمی لیاقت کے ساتھ کھڑا ہو، ان کی بنیاد ڈھادے، ان کی آتش فرو کردے، اس یقین کامل اور راسخ عقیدہ کے ساتھ کہ نہ ان کی کوئی اساس ہے اور نہ علمی روشنی؛ بلکہ سینوں میں چھپا ہوا کینہ اور مذموم غیرت مندی اور شدید احساس کمتری ہے، اسی وجہ سے برطانوی مستشرق ''تأثير الإسلام على أوربا في العصور الوسطى ''(قرونِ وسطیٰ میں یورپ پر اسلام کے اثرات) کے مصنف نے ان کا پول کھولتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اہل یورپ کے درمیان اسلام کی شبیہ بگاڑنا اس لئے ضروری تھا؛ تاکہ ان کی پسماندگی اور پچھڑے پن کے احساس کا بدل ہو سکے۔

جی ہاں، حضرات گرامی ! تہذیب وتمدن کے علمبردار ہم ہیں، تاریخ نے ہماری تہذیب وترقی سے بلند تر اور عظیم تر کوئی تمدن نہیں دیکھا؛ البتہ یہ اس وقت تھا جب ہم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو تھامے ہوئے تھے۔

میں اپنی بات کی طرف لوٹتے ہوئے کہتا ہوں: کتنی شدید ضرورت ہمیں پختہ اور لائق عالم بلکہ علماء کی ہے، جو مستشرقین سے ڈٹ کر ایسا مقابلہ کریں، کہ دل سے پہلے عقلیں دنگ رہ جائیں، جو منکرین کی افتراء پردازی کا منھ توڑ جواب دیں، ملحدین کے راستے پر بند باندھیں، اس عالم کی طرح مقابلہ پر آئیں، جو ماضی کے علمی رسوخ اور عصر حاضر کے لفظی شور وشغب پر حاوی ہو، ایسے عالم کی طرح جس نے دونوں ثقافتوں کا گہرا مطالعہ کیا ہو اور دونوں تہذیبوں — شاندار اسلامی تہذیب اور کھوکھلے مغربی تمدن — میں اپنی روح کے ساتھ زندگی گذاری ہو، ان کی زبان پر عبور حاصل کیا ہو، ان کے راستوں اور چور دروازوں سے واقف ہو، ان کی افترا پردازیاں اور شعبدہ بازیاں

اس کی نگاہ میں ہوں، تب جا کر یہ مقابلہ علمی اور عملی حیثیت رکھنے والا ہوگا، جو تعصب اور جانبداری سے پاک ہوگا۔

حضرات گرامی ! ہمیں کتنی سخت ضرورت ایسی نسل تیار کرنے کی ہے، جو ہمارے مستقبل کا اثاثہ ہو۔

حضرات گرامی ! ہمیں کتنی سخت ضرورت ایک قرآنی نسل تیار کرنے کی ہے، جو اُمت کی قیادت کرے۔

حضرات گرامی ! ہمیں کتنی سخت ضرورت آج کے نوجوانوں کو بنیاد فراہم کرنے کی ہے، تاکہ وہ کل کے مردان کار بن سکیں :

رجال الغد المأمول إنا بحاجة　　إلى قادة تبني وشعب يعمر

رجال الغد المأمول إنا بحاجة　　إلى عالم يدعو وداع يذكر

رجال الغد المأمول إنا بحاجة　　إلى عالم يدري وعلم يقرر

رجال الغد المأمول إنا بحاجة　　إلى حكمة تملى وكف تحرر

رجال الغد المأمول إنا بحاجة　　إليكم فسدوا النقص فينا وشمروا

رجال الغد المأمول لا تتركوا غداً　　يمر مرور الأمس والعيش أغبر

رجال الغد المأمول إن بلادكم　　تناشدكم بالله إن تتذكروا

عليكم حقوق للبلاد أجلّها　　تعهّد روض العلم فالروض أقفر

قصارى منى أوطانكم أن ترى لكم　　يدا تبتني مجداً ورأساً يفكر

فكونوا رجالا عاملين أعزة　　وصونوا حمى أوطانكم وتحرروا

مستقبل کے مردانِ کار! ہمیں ایسے قائدین اور ایسی قوم کی ضرورت ہے، جو تعمیری کام انجام دیں۔

مستقبل کے مردانِ کار! ہمیں داعی صفت عالم اور خیر خواہ داعی کی ضرورت ہے۔

مستقبل کے مردانِ کار! ہمیں صاحبِ بصیرت عالم اور مدلل علم کی ضرورت ہے۔

مستقبل کے مردانِ کار! ہمیں حکیمانہ رہنمائی اور آزادی دلانے والے ہاتھوں کی ضرورت ہے۔

مستقبل کے مردانِ کار! ہمیں خود تمہاری ضرورت ہے؛ لہٰذا ہماری کمیوں کو پورا کرو اور کمر باندھ کر تیار ہو جاؤ۔

مستقبل کے مردانِ کار! آنے والا کوئی دن گذرے ہوئے کل کی طرح نہ گذر جائے، کہ زندگی ختم ہو جانے والی ہے۔

مستقبل کے مردانِ کار! تمہاری سرزمین تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہے، اگر تم یاد کرو، تم پر تمہارے وطن کے حقوق ہیں اور سب سے بڑا حق یہ ہے کہ علم کے باغ کی آبیاری کرو؛ کیوں کہ یہ اب اُجڑنے کے قریب ہے۔

تمہارے وطن کی آخری تمنا یہ ہے کہ عز و شرف کی تعمیر کرنے والے ہاتھ اور سوچنے سمجھنے والا ذہن تمہارے پاس ہو۔

لہٰذا عزت وکرامت اور جہد وعمل کے پیکر بنو، اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرو اور آزادی کے ساتھ زندگی گزارو۔

علماء ذی وقار ! یہ مبارک سرزمین جہاں علم اور اہل علم کی کثرت ہے، اس کی مستحق ہے کہ یہاں ایسی نفع بخش کانفرنسوں اور مفید علمی سیمیناروں کا سلسلہ منقطع نہ ہو، عرب وعجم کے مختلف ممالک سے علمی پختگی رکھنے والے اور علم میں رسوخ پیدا کرنے والے، للّٰہیت کی صفت رکھنے والے علماء کو دعوت دی جائے، جو مسلک ومشرب میں ہم آہنگ ہوں؛ تاکہ فکروں میں امتزاج پیدا ہو اور نگاہوں میں وسعت، ہر ایک دوسرے کے مشام جاں کو معطر کرے، یقیناً علماء کا متحد ہونا اور عقلاء وفضلاء کا فکر وعقیدہ، فقہ وحدیث اور تزکیہ وسلوک کے سلسلہ میں ایک وحدت اور اکائی پر متفق ہونا بڑا ہی خوش کن ہوگا، اسی وحدت کی طرف ہم نے چار ماہ قبل استنبول (ترکی) میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی علمی کانفرنس میں دعوت دی، جس کی سرگرمیوں کے ذیل میں ''جائزۃ الإمام محمد قاسم النانوتوی الإسلامیۃ العالمیۃ'' (امام محمد قاسم نانوتوی بین الاقوامی اسلامی ایوارڈ) بھی شامل تھا، جو اس مبارک معہد کے تابع ہے۔

حضرات گرامی ! اخیر میں میں آپ کی اجازت سے فضیلۃ الشیخ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی طرف دو باتوں کو لے کر متوجہ ہونا چاہتا ہوں :

اولاً: تو ان کا بے حد شکریہ اور قدر دانی کہ انھوں نے یہ عظیم علمی اجتماع منعقد کیا، باری تعالیٰ اس کو کامیاب فرمائے اور اس کی کامیابی سے اس کے منتظم کی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے، یقیناً اسی کریم ذات کے سامنے دست سوال دراز کیا جاسکتا ہے اور وہی آرزؤں کو پورا کرنے پر قادر ہے۔

دوسرے: آنجناب سے یہ گذارش ہے کہ اس قرآن کانفرنس کے بعد حدیث شریف کی اہمیت وحجیت منکرین حدیث اور حدیث کے گرد شکوک وشبہات پیدا کرنے والوں کی تردید پر ایک کانفرنس کا انعقاد کریں؛ کیوں کہ یہ اس دور کی اہم ضرورت ہے۔

میں آپ تمام کا بے حد شکر گذار اور احسان مند ہوں کہ آپ نے توجہ اور دھیان کے ساتھ ان کلمات کو سماعت فرمایا۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم .

ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ

(مدینہ منورہ)

⊙ ⊙ ⊙

تجاویز : بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار

المعہد العالی الاسلامی کے زیر انتظام حیدرآباد میں ۲-۴/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ مطابق ۶-۸ فروری ۲۰۱۱ء روز یک شنبہ تا سہ شنبہ ''بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار'' منعقد ہوا، جس میں ملک کی تقریباً تمام ہی ریاستوں اور نمائندہ اداروں سے علماء واسکالرس شریک ہوئے، ان کے علاوہ بیرون ملک سے بھی دس اہم علمی شخصیتوں نے شرکت فرمائی، جن میں سرفہرست معروف محدث شیخ محمد محمد عوامہ حفظہ اللہ (مدینہ منورہ) ہیں، ۲/ربیع الاول کو سیمینار کا آغاز ہوا اور ۴/ربیع الاول ۱۴۳۲ھ کو بعد نماز مغرب کے اجلاس عام پر سیمینار کا اختتام عمل میں آیا، سیمینار میں درج ذیل تجاویز منظور ہوئیں :

(۱) قرآن مجید خدا کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ہدایت ہے، جو پوری انسانیت کی طرف اللہ کا پیغام ہے؛ اس لئے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والوں تک قرآن مجید پہنچانے کے لئے ہر زبان میں اس کا ترجمہ کریں اور جو زبانیں کلام الٰہی کی اس امانت سے محروم ہیں، ان کے بولنے والوں تک بھی خدا کے احکام پہنچائیں، ہر ریاست کے بڑے دینی مدارس، مذہبی تنظیمیں اور ادارے اپنے علاقہ کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیں اور جن زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ نہیں ہوا ہے، ان میں مستند زبان داں اشخاص سے ترجمہ کرائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ان کو پہنچانے کا نظم کریں۔

(۲) عام طور پر مدارس میں دوسرے علوم کی بہ نسبت تفسیر قرآن مجید کو کم حصہ دیا گیا ہے؛ حالاں کہ قرآن مجید دین کی اساس و بنیاد ہے؛ اس لئے اس موضوع کے لئے زیادہ وقت دیا جائے اور مختلف اہم تفسیروں کے ذریعہ پورے قرآن مجید کو پڑھایا جائے۔

(۳) اُصولِ تفسیر اور علوم القرآن کے ذیل میں آنے والے مضامین کی تعلیم مدارس میں 'نہیں' کے برابر ہوتی ہے؛ اس لئے اس موضوع پر طلبہ افسوس ناک حد تک بے خبر رہ جاتے ہیں

علم ہوتے ہیں؛ لہٰذا اصول فقہ اور اصول حدیث کی طرح ''علوم القرآن'' کو مستقل ایک مضمون کی حیثیت سے نصاب میں داخل کیا جائے۔

(۴) قرآن مجید پر مستشرقین یا معاندین ماضی میں جو بے جا اعتراضات کرتے رہے ہیں، یا موجودہ دور میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، ان کی تردید کو خصوصی اہمیت دیتے ہوئے ایک مضمون کے طور پر اس کو داخلِ نصاب کیا جائے۔

(۵) فضیلت کے بعد بڑی جامعات میں تخصص فی علوم القرآن کا دوسالہ نصاب شروع کیا جائے، جس میں تفسیر کی اہم کتابوں کے مطالعہ کے علاوہ تدوین قرآن مجید کی تاریخ، تفسیر کے اصول، رسم قرآنی، ارض القرآن، علوم القرآن، مختلف ادوار میں ہونے والی قرآنی خدمات کا جائزہ وغیرہ کو شامل نصاب رکھا جائے۔

(۶) قرآن مجید کی تدریس کو زیادہ مؤثر اور نافع بنانے کے لئے مقامات قرآنی وغیرہ کی توضیح اور عصر حاضر کے مسائل کی بابت قرآنی تصورات کی تشریح میں عصری معلومات اور جدید وسائل سے استفادہ کیا جائے؛ تاکہ درس قرآن اس عہد کے طلبہ کے ذہن سے قریب ہو۔

(۷) ماحولیات اور سائنس کے مختلف شعبوں سے متعلق آیات قرآنی کو جمع کر کے آیات احکام کی طرح دینی مدارس میں اسے بھی بطور تقابلی مطالعہ شامل درس کیا جائے۔

(۸) دینی مدارس میں ''تحلیلی تفسیر'' کے ساتھ ساتھ ''موضوعی تفسیر'' کو بھی شامل کیا جائے؛ تاکہ مختلف مسائل کے بارے میں قرآن مجید کی تمام ہدایات اور اوامر ونواہی ایک ساتھ سامنے آجائیں، اس سے طلبہ میں قرآن مجید کے مطالعہ کا ذوق بھی پیدا ہوگا اور کسی بھی موضوع پر قرآن کو اولیت دیتے ہوئے غور وفکر کرنے کا جذبہ بھی پروان چڑھے گا۔

(۹) چوں کہ اب بچے بہت کم عمری سے تعلیم گاہوں میں داخل کردئے جاتے ہیں اور ان کو قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلہ میں وقت نہیں ملتا؛ اس لئے جو عصری تعلیمی ادارے مسلمان انتظامیہ کے تحت ہیں، ان میں انتظامیہ کو چاہئے کہ ناظرۂ قرآن مجید کے علاوہ قرآنی تعلیمات اور سادہ طریقہ پر ترجمۂ قرآن مجید کو بھی شامل نصاب کریں،

اس سلسلہ میں موجودہ دور میں جو کاوشیں ہوئی ہیں ، ان سے استفادہ کیا جائے اور قرآن مجید سے طلبہ وطالبات کا رابطہ مضبوط کیا جائے۔

(۱۰) چوں کہ زیادہ تر عصری تعلیم کے ادارے غیر مسلم انتظامیہ کے تحت ہیں ؛ اس لئے والدین اور مذہبی اداروں کا فریضہ ہے کہ وہ ان کے لئے صباحی ومسائی مکاتب کا اور ہر اتوار کو ہفتہ وار کلاس کا نظم کریں۔

(۱۱) دیہات وقریہ جات میں زیادہ سے زیادہ قرآنی مکاتب قائم کئے جائیں ؛ تاکہ لوگوں میں نہ صرف دینی شعور پیدا ہو ؛ بلکہ مسلمانوں کی نئی نسل ارتداد کے فتنہ سے محفوظ رہے ، دینی جامعات اور مذہبی جماعتوں کو خاص طور پر اس جانب توجہ دینی چاہئے۔

(۱۲) عوام میں قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے مساجد کے منتظمین سے گذارش کی جاتی ہے کہ وہ مسجدوں میں 'دروس قرآن مجید' کے حلقے قائم کریں اور علماء کے تعاون سے قرآن مجید کے درس کا اہتمام کرائیں ؛ تاکہ عام مسلمان قرآن مجید سے مربوط ہوسکیں۔

(۱۳) خواتین انسانیت کا نصف حصہ ہیں ، ان کو تعلیم یافتہ بنائے بغیر معاشرہ کی اصلاح نہیں ہوسکتی ؛ اس لیئے خواتین کے لئے بھی درس قرآن مجید کے حلقے قائم کئے جائیں اور ان حلقوں کو قرآن مجید کے واسطہ سے اصلاح معاشرہ کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۱۴) غیر مسلم بھائیوں اور خود مسلمانوں کی نئی نسل تک قرآنی تعلیمات کو پہنچانے کے لئے مختلف عالمی زبانوں میں خصوصی ویب سائٹیں بنائی جائیں ، جن سے نہ صرف قرآن مجید کی تفسیر نشر کی جائے ؛ بلکہ عصری مسائل سے متعلق قرآنی تعلیمات کو بھی واضح کیا جائے ، غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا جائے اور قرآن مجید سے متعلق 'آن لائن سوال وجواب' کا بھی نظم رکھا جائے۔

(۱۵) قرآن مجید اور دیگر مذہبی کتابوں کی مشترکہ تعلیمات پر مبنی لٹریچر دعوتی نقطۂ نظر سے تیار کیا جائے اور ان مشترکہ تعلیمات کو عام لوگوں تک پہونچانے کے لئے غیر مسلم بھائیوں کا بھی تعاون حاصل کیا جائے ، اس سے ہم آہنگی کا ماحول پیدا ہوگا اور دعوت کے مواقع وسیع ہوں گے۔

(۱۶) قرآن مجید تمام انسانیت کے لئے ہے، رسول اللہ ﷺ نے جو دعوتی خطوط لکھے، ان میں قرآنی آیات بھی تھیں؛ اس لئے زیادہ سے زیادہ غیر مسلم بھائیوں تک قرآن مجید کا مستند ترجمہ ان کی زبان میں پہونچایا جائے۔

(۱۷) قرآن مجید امن وآشتی، تکریم انسانیت اور عدل وانصاف کی داعی کتاب الٰہی ہے، اس کی تعلیمات اعتدال اور عدل پر مبنی ہیں، یہ انسانی مسائل کو حل کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتی ہے اور نہ صرف آخرت کی نجات؛ بلکہ دنیا کی فلاح وکامیابی بھی اس سے متعلق ہے؛ اس لئے کہ انسان کے خالق سے بڑھ کر اس کے نفع ونقصان کا ادراک کسی اور کو نہیں ہوسکتا؛ اس لئے یہ سیمینار پوری دنیائے انسانیت سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ہر طرح کی تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر اس کتاب کا مطالعہ کریں اور جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، ان پر یقین کرنے کی بجائے خود اس کتاب کو پڑھ کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔

(۱۸) یہ اجلاس اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایسا قانون بنائے جو مذہبی شخصیتوں، مذہبی کتابوں اور مذہبی مقدسات کے بارے میں اہانت آمیز تقریر وتحریر، کارٹون اور کسی بھی دل آزار عمل کو یا ایسے عمل کی حوصلہ افزائی کو جرم قرار دیتا ہو، آزادیٔ اظہار کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی دل آزاری کی جائے اور ایک بڑے گروہ کے جذبات کو مجروح کرنے کا ارتکاب کیا جائے۔

(۱۹) ہمارے ملک ہندوستان میں شروع ہی سے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے آئے ہیں اور یہی رنگارنگی اس ملک کی پہچان ہے، عمومی طور پر ہمارے ملک میں مختلف مذاہب کی مقدس شخصیتوں اور شناختوں کے احترام کا مزاج ہے، اور یہ نہایت ہی خوش آئند بات ہے؛ لیکن بعض دفعہ فرقہ پرست عناصر اس کے برخلاف کسی گروہ کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور ان کو مشتعل کرنے کے لئے مذہبی شخصیتوں اور مذہبی کتابوں کی اہانت کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ اجتماع حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مؤثر قانون سازی کرے اور تمام مذاہب کے احترام کو یقینی بنائے۔

⦿ ⦿ ⦿

دوسرا باب

قرآن مجید اور دوسری مذہبی کتابیں

قرآن مجید اور ہندو مذہبی کتابیں — مشترک شخصیات کی تلاش

سید عبداللہ طارق ⊙

ہندو کی تعریف (Definition) ایک معمہ

ہندو لفظ کی تعریف کیا ہے، اس پر جتنے اہل علم ہیں اتنی ہی رائیں ہیں، سناتن دھرم کی کسی مقدس کتاب میں ہندو لفظ کہیں نہیں آیا، عام طور سے اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ مسلمان جب اس ملک میں آئے تو انھوں نے 'سندھو' کو 'ہندو' کر دیا؛ کیوں کہ ان کی زبان میں سنسکرت کے 'س' کو 'ہ' میں بدل دیا جاتا ہے، جیسے سپتاہ کو ہفتہ کہتے ہیں، ان لوگوں نے سندھو ندی کے دوسری طرف کے لوگوں کو ہندو کہنا شروع کیا اور اس ملک کو ہندوستان نام دیا، اس بار بار دہرائے جانے والی بات کی بنیاد بہت کمزور ہے، سپتاہ کو ہفتہ فارسی زبان میں کہتے ہیں، فارسی زبان میں چند سنسکرت الفاظ کے 'س' کو 'ہ' بولنے سے یہ قاعدہ نہیں بن جاتا، سمندر کو فارسی میں ہمندر نہیں کہتے، سومناتھ مندر کو افغانوں نے ہومناتھ نہیں کہا، ستیہ (सत्य) کو فارسی میں ہتیہ نہیں کہتے 'سچ' کہتے ہیں، بہت مثالوں کی ضرورت نہیں ہے، پاکستانی علاقے کے سندھ حصہ کو آج بھی سندھ کہا جاتا ہے ہند نہیں، اس لئے یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ سندھو کے 'س' کو 'ہ' میں بدلنے پر ہندو لفظ بن گیا۔

پھر ہندو لفظ کا مطلب کیا ہے؟ کسے ہندو کہا جائے؟ کچھ لوگ اسے ایک مذہب کا نام بتاتے ہیں؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خالص موّحد بھی ہندو ہوتے ہیں، کروڑوں دیوی دیوتاؤں میں ایمان رکھنے والے بھی ہندو کہلاتے ہیں اور ایسے بھی ہندو ہوتے ہیں جو ملحد ہیں یعنی خدا کو سرے سے مانتے ہی نہیں، ہندو کہلانے والوں میں وید کے ماننے والے بھی ہوتے ہیں اور ان کو برا کہنے والے بھی ہوتے ہیں، بہت سے ہندو گیتا کو مقدس گرنتھ مانتے ہیں جب کہ برہما کماری مَت کو ماننے والے بھی ہندو کہلانے کے حقدار ہیں جو مشہور ومقبول گیتا کو فرضی بتاتے ہوئے بابا لیکھ راج کے الفاظ کو حقیقی گیتا کہتے ہیں، برہما کماری، نرنکاری منڈل، لنگایت اور آریہ سماج کے عقائد باہم بالکل مختلف ہونے کے باوجود ان سبھی کے ماننے والے ہندو کہلاتے ہیں، الغرض 'ہندو' لفظ کو کسی مخصوص مذہبی عقیدے سے منسلک نہیں کیا جا سکتا۔

⊙ داعیِ اسلام، رامپور۔

ایک جملہ یہ بھی بہت دہرایا جاتا ہے کہ ہندو کوئی مذہب نہیں؛ بلکہ ایک طریقۂ زندگی (Way of Life) ہے، سننے میں یہ چاہے جتنا اچھا لگے، زندگی گزارنے کا طریقہ ہمارے ملک میں ہر جگہ الگ ہے، سبزی خور، انڈا خور، گوشت خور اور گائے کا گوشت کھانے والے ہر طرح کے ہندو ہندوستان میں رہتے ہیں، ہندوؤں کو آخری رسومات میں چِتا پر بھی جلایا جاتا ہے اور قبر میں بھی دفن کیا جاتا ہے، ہندوؤں میں مرد اور عورتوں کا لباس دھوتی و ساڑی بھی ہے اور پاجاما کرتا، شلوار جمپر، پینٹ شرٹ، شیروانی اور اسکرٹ بلاؤز وغیرہ بھی ہر طرح کے ہندوؤں کے پہناوے ہیں، طریقۂ زندگی کی ایسی کوئی محدود تشریح ممکن نہیں ہے جس سے ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد خارج نہ ہو جائے۔

بہت سے لوگ ہندو لفظ کا تعلق ایک مخصوص خطۂ زمین سے قائم کرتے ہیں؛ لیکن اس خطہ کے تمام باشندوں کو وہ ہندو نہیں کہتے، اگر ہندوستان یا بھارت میں رہنے والے ہندو کہلائیں تو نہ صرف سبھی ہندوستانی مسلمان، عیسائی اور دیگر مذاہب کے پیرو ہندو کہے جائیں گے؛ بلکہ غیر ممالک میں پیدا ہوئے ہندو، ہندو نہیں رہیں گے۔

ہندو مہا سبھا کے لیڈر ساورکر کی بیان کردہ ہندو لفظ کی ایک یہ تشریح بھی موجودہ دور میں از سر نو مشہور ہوئی کہ جن کے آباء واجداد کا وطن ہندوستان ہو اور ساتھ ہی ان کی مقدس سرزمین (पुण्य भूमि) بھی ہندوستان ہو وہی ہندو کہلائیں گے، اجداد کے وطن سے مراد یہ بتائی گئی کہ چاہے وہ ۶، ۷ صدیوں سے فجی، ماریشس یا دوسرے ملکوں میں پیدا ہوئے اور رہتے چلے آئے ہوں اور چاہے ان کا ہندوستانی زبان اور تہذیب سے کوئی ناتہ نہیں ہو؛ لیکن ان کے اجداد ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوں، مقدس سرزمین کا مطلب یہ بتایا گیا کہ ان کے مقاماتِ مقدسہ ہندوستان میں ہوں، نہ کہ مکہ مدینہ میں اور ہندوستان کی زمین کے مقدس ہونے میں ان کا یقین ہو، اب اسے کیا کہا جائے کہ ایک مخصوص گروہ کو ہندو لفظ کے تحت لانے کی یہ کوشش بھی ناکام ہی ہے، ہر ایسی کوشش کو ناکام ہونا ہی ہے جس میں ہندو لفظ کو اس کے نامعلوم مفہوم سے ہٹا کر اپنے من پسند گروہ سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہو، سناتن دھرم کے مطابق ویدوں کا اوّلین صحائف ہونا اور اسلامی روایات کے مطابق دنیا کے پہلے انسان حضرت آدم کا ملک ہندستان ہونا، ان دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسل انسانی کی ابتدا ہندوستان کی سرزمین سے ہوئی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے آباء واجداد ہندوستان کے تھے، اس طرح اگر باپ دادا کی زمین ہونے کے لے ایک یا دو پیڑھیوں کی شرط نہ لگائی جائے تو ہر انسان کے آبا واجداد کا وطن ہندوستان ہوگا، اور اگر آبا و اجداد کی زمین ہونے کے لئے ایک یا دو یا کچھ صدیوں پہلے ہندوستان میں پیدا ہونے کی شرط لگائی جائے تو باہر ملکوں میں رہنے والی ایک بڑی تعداد ہندو کہلانے کی حقدار نہیں رہے گی، اس کے علاوہ باہر ملکوں میں آج جو ہندو ہیں کچھ پیڑھیوں کے بعد ان کے بچے ہندو کہلانے کا حق کھو بیٹھیں گے، اسی طرح جہاں تک ہندو ہونے کے لئے اس شرط کا سوال ہے کہ ان کے مقاماتِ

مقدسہ یا تیرتھ ہندوستان سے باہر نہ ہوں تو جن کے تیرتھ چین کے کیلاش مانسرور میں ہیں انھیں کیا کہیں گے؟

آریہ سماج ہندوستان یا کسی دوسری جگہ پر کسی بھی مقام کے مقدس ہونے کو تسلیم نہیں کرتا، رہی بات ہندوستان کو مقدس ماننے کی تو اسلام کے پہلے پیغمبر کا ہندوستانی ہونا اسے ہندوستان سے شروع ہونے والا دین ثابت کرتا ہے اور آخری رسول حضرت محمد ﷺ کو ہندوستان کی طرف سے جنت کی خوشبو آنا، بلاشبہ ہندوستان کو دنیا کے سبھی مسلمانوں کے لئے مقدس مقام قرار دیتا ہے، جن مسلمانوں کے آباواجداد ہمیشہ سے یہیں پیدا ہوتے اور رہتے آئے ہوں، کیا انھیں بھی دستورِ ہند یا دیگر اہل علم ہندو کہیں گے؟

افغانستان سے جو مسلمان ہندوستان آئے ان سے صدیوں پہلے ہندو لفظ کا وجود تھا، حضرت محمد ﷺ کی پیدائش سے پہلے ہی عرب کے لوگ ہماری خوبصورت زمین کو 'ہند' کہتے تھے، عرب ممالک میں خوبصورت عورتوں کا نام 'ہند' رکھا جاتا تھا، حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ انھیں 'ہند' سے جنت کی خوشبو آتی ہے، بہت سی حدیثوں میں 'ہند' لفظ ہندوستان کے لے استعمال ہوا ہے، ظاہر ہے کہ عربی لوگوں کی زبان عربی تھی نہ کہ فارسی، فارسی کے بارے میں تو یہ کہا گیا کہ اس میں سنسکرت کے 'س' کو 'ہ' سے بدل دیا جاتا ہے؛ لیکن عربی زبان کے لئے ایسا نہیں کہا جاسکتا، یہ بھی غور طلب بات ہے کہ عرب میں سندھ اور ہند دونوں نام ساتھ ساتھ سندھو ندی کے دونوں طرف کے علاقوں کے لے چلے آرہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ 'ہند' نام عربی الاصل ہے، ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے آنے سے بہت پہلے ساتویں صدی میں ہی مسلمان تاجر کیرل کے مالابار ساحل سے ہوتے ہوئے ہندوستان آنے لگے تھے اور تبھی سے جنوب میں رہنے والے لوگوں نے اسلام کو قبول کرنا شروع کردیا تھا، جنوبی ہند کی طرف سے آنے والے عربی مسلمانوں کی زبان میں اس ملک کا نام ہند تھا جسے بعد میں افغان نسل کے لوگ ہندوستان کہنے لگے، ساتوی صدی میں عرب تاجروں نے ہند میں رہنے والوں کو 'ہندی' کہہ کر پکارا، عربی زبان میں آج بھی ہندوستان میں رہنے والوں کو 'ہندی' کہتے ہیں، کچھ عرصہ کے بعد مقامی نومسلموں نے ہندوستان میں رہنے والوں کے لئے 'ہندی' کے بجائے 'ہندو' لفظ استعمال کرنا شرع کردیا۔

ہندو مذہب اور ہندوستانی راشٹر — مسلمانوں کا تحفہ

سرزمین عرب سے جو مسلمان یہاں آئے، انھوں نے مقامی باشندوں کو ہندی کہا، یہ لفظ وقت کے ساتھ بدل کر ہندو ہوگیا، اسلام کے علاوہ مسلمان جن مذاہب سے آشنا تھے وہ عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت تھیں، وہ نہ بدھ مذہب سے واقف تھے، نہ جین دھرم کو جانتے تھے اور نہ ویشنو، شیو، شاکت، ویدانت، انش واد، نیائے،

ویشیشک ، سانکھیہ ، میمانسا جیسے سینکڑوں ہندوستانی مذاہب اور فلسفوں سے واقف تھے ، یہودیت ، عیسائیت اور مجوسیت کے علاوہ ان کی لغت میں ہندوستان کے دیگر سبھی لوگوں کا مذہب یا کفروشرک تھا یا دین ہندی ، دین ہندی یا مذہبِ ہندی یا (ہندی کے ہندو ہو جانے کے بعد) 'ہندو مذہب' مقامی عربی النسل مسلمانوں کی زبان میں مسلمانوں ،عیسائیوں ، یہودیوں اور مجوسیوں کے علاوہ دیگر ہندوستانی باشندوں کے مذاہب کا مشترکہ نام تھا ، جب افغانستان کے راستے آنے والے حکمرانوں کی مستقل حکومت ہندوستان پر قائم ہوگئی تو یہ نام اپنی اسی تشریح کے ساتھ قانونی ودستوری شکل اختیار کرگیا ، ہندوستانی سرزمین میں نئے نئے مذاہب پھوٹتے رہے اور ہندو مذہب کا جز بنتے رہے ، مسلمانوں ، یہودیوں ، مجوسیوں (پارسیوں) اور عیسائیوں کے علاوہ ہندوستان میں اب صرف ایک مذہب اور تھا ، ہندو مذہب ، ہزاروں مختلف عقائد میں تقسیم اور بعض اوقات باہم متحارب گروہوں کو ایک لڑی میں پروکر ایک عظیم مذہبی گروہ کی بنیاد رکھنا مسلمانوں کا کارنامہ ہے ۔

اسی طرح ہندوستان ، تاریخ میں کبھی ایک بڑا ملک نہ تھا ، سینکڑوں چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں اور رجواڑوں میں سب سے بڑی ریاست 'ویشالی' موجودہ صوبۂ بہار کے برابر بھی نہ تھی ، مسلمانوں کی فتوحات آزاد ریاستوں کو ایک ملک بناتی چلی گئیں اور اورنگ زیب کے ہندوستان کی سرحدوں نے افغانستان اور برما کو بھی شامل کر لیا ، مسلمانوں کا عطا کردہ ملک ہندوستان ، انگریزوں کے ہاتھوں تقسیم ہوکر نسبتاً بہت چھوٹا رہ گیا ؛ لیکن ہندو مذہب کی تعریف جسے انگریزوں نے برقرار رکھا تھا ، کچھ لفظی ترمیم کے ساتھ آزاد ہندوستان کے دستورِ ہند کو بھی بھا گئی ...... اور اس طرح ...... ہندوستان دنیا کے بڑے ممالک اور ہندو مذہب دنیا کے بڑے مذاہب کی فہرست میں شامل ہو گیا ، اس حقیقت کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کے بعض گروہ جب یہ نعرہ دیتے کہ ''گرو ٔ سے کہو ہم ہندو ہیں'' یا جس ''بھارت راشٹر'' کے لئے وندے ماترم نہ کہنے والوں کو دیش چھوڑنے کے لئے کہا جاتا ہے یہ دونوں دراصل مسلمانوں کے عطا کردہ عطیات ہیں ۔

ہندو کہلانے والوں کی مذہبی کتب

یہ تفصیل گزر چکی کہ ہندو کسی ایک مذہب یا عقیدہ کا نام نہیں ہے ؛ بلکہ یہ سینکڑوں مذاہب کا مجموعہ ہے ، اسے لیگ آف ریلیجنز (League of religions) یا عصبۃ المذاہب کہنا زیادہ درست ہوگا ، موجودہ ہندو مذہب کے فرقوں میں سب سے بڑا اور قدیم ترین سناتن دھرم ہے ، بعد کے سینکڑوں فرقوں کی اپنی اپنی مذہبی کتب ہیں ؛ لیکن خود سناتن دھرم کی مذہبی کتب کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کے صرف نام یاد کر لینا بھی بہت مشکل کام ہے ، سناتن

دھرم کی مذہبی کتب میں قدیم ترین چار وید ہیں اور آخری دور کی کتابیں پُران (पुराण) کہلاتی ہیں جن میں ۱۸ پُرانوں کو مستند مانا جاتا ہے، اگر یہ معلوم کیا جاسکے کہ ویدوں سے پرانوں تک کا دور کون سا ہے تو ان کتب میں مذکور شخصیات کے تعین میں بھی آسانی ہوگی۔

ویدوں اور پرانوں کے ادوار

ویدوں کی قدامت کے بارے میں مغربی اور ہندوستانی محققین و ہندو مذہبی شخصیات کے مابین زبردست اختلافات ہیں، مغربی محققین عام طور سے ویدوں کا زمانہ ۳۰۰۰ سے ۱۵۰۰ ق م بتاتے ہیں، بعض ہندوستانی محققین انھیں ۶۰۰۰ ق م اور بعض پرانوں کی اندرونی شہادتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ۲۵ سے ۳۰ ہزار ق م تک لے جاتے ہیں، آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کا دعویٰ ہے کہ نہ تخلیق کی کوئی ابتدا ہے اور نہ ویدوں کی، تخلیق کے ظہور کے طویل ادوار ہیں اور ہر وقفۂ ظہور کے درمیان طویل وقفے ہیں، ہر تخلیق کے ظہور کی ابتدا میں یہی چار موجودہ وید چار رشیوں کی معرفت نسل انسانی کو دیے جاتے ہیں، آریہ سماج کے مطابق موجودہ ظہورِ تخلیق کو ابھی تک تقریباً دو ارب (۱،۹۶،۰۸،۵۳،۱۳۴) سال کا عرصہ گزرا ہے، آریہ سماج کا دعویٰ تو ظاہر ہے کہ سنجیدہ محققین کے لئے قابل اعتنا ہی نہیں ہے؛ لیکن بعض ایسے ثبوت بھی ہیں جو موجودہ دور سے لاکھوں سال قبل ویدوں کی نشان دہی کرتے ہیں، اس مقام پر ان ثبوتوں کی تفصیل میں جائے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے اور اس کی غیر جانبدار محققین کی بڑی اکثریت تائید کرتی ہے کہ وید اس وقت دنیا میں موجود مذہبی کتب میں قدیم ترین ہیں، بعض محققین وید کے ایک منتر کا حوالہ دیتے ہوئے، جس میں ان کے خیال میں زرتشتی کلام 'اَوستھا' کا ذکر ہے، یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ویدوں کا دور اَوستھا کے بعد ہے؛ لیکن مذکورہ وید منتر کے ترجمہ میں اختلاف سے قطع نظر، وہ منتر بہت سے دوسرے منتروں کی طرح بعد کے کسی دور کا الحاق شدہ بھی ہوسکتا ہے۔

ویدوں کی طرح ہی پرانوں کے دور کے بارے میں بھی بہت اختلافات ہیں، محققین کی اکثریت کی مانیں اور پرانوں کے داخلی شواہد پر غور کریں تو بعض پران ۳۰۰۰ سال سے زیادہ پرانے اور بعض یا ان کے کچھ اجزاء ۵۰۰ سال قبل کے ہوسکتے ہیں۔

اس طرح سناتن دھرمی گرنتھوں کی لمبی قطار قدیم ترین مذہبی کتب کے دور سے شروع ہوکر سولھویں صدی عیسوی پر ختم ہوتی ہے، موجودہ ہندو فرقوں میں سناتن دھرم کے علاوہ دیگر فرقوں کی کتب میں سے بیشتر چودھویں سے بیسویں صدی عیسوی کے درمیان تحریر کی گئیں، برہما کماری فرقے کے مطابق ان کے یہاں نزولِ وحی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

بعض ان شخصیات کے ہندو مذہبی کتب میں تذکرے کی تلاش کا سلسلہ جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، ظاہر ہے کہ ویدوں سے شروع ہوگا اور ماضی قریب کی کتب تک چلے گا، ان میں سے بعض کتب کے الہامی ہونے کا امکان ہوسکتا ہے اور دیگر مختلف مصنفین کی تصانیف ہیں، ان میں سے بعض میں ان شخصیات کے تذکروں کی حیثیت پیشین گوئی یا بشارت کی ہوسکتی ہے اور بعض میں ان شخصیات کی تصدیق کی۔

ویداور عقیدۂ رسالت

سناتن دھرمی ہندوؤں کی عظیم اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ وید خدا کا کلام ہیں، خود وید کا دعویٰ بھی یہی ہے :

यः समिधा य आहुती यो वेदेन ददाश मर्तो अग्नये। यो नमसा स्वध्वरः ।।

جو فانی (انسان) جلائی جانے والی چیزوں (اور) عبادت میں پیش کی جانے والی چیزوں (اور) وید کے ذریعہ خدا کی خدمت کرتا ہے اور اچھے عمل والا ہو کر جھکتا ہے (وہ فلاح پاتا ہے)۔ (رگ وید: ۸:۱۹:۵)

तस्माद्यज्ञात् सर्वहुत ऋचः सामानि जज्ञिरे। छन्दांसि जज्ञिरे तस्माद्यजुस्तस्मादजायत ।।

اس سب کو عطا کرنے والے معبود سے رگ (وید) اور سام وید ظاہر ہوئے اس سے ہی اتھرو (وید) ظاہر ہوا، اس سے ہی یجر (وید) ظاہر ہوا۔ (اتھرو وید ۱۹:۶:۱۳ نیز رگ وید: ۱۰:۹۰:۹)

سنسکرت میں رسول یا پیغمبر کے لئے 'دُوت' (दूत) لفظ استعمال ہوتا ہے، ویدوں میں یہ لفظ بکثرت آیا ہے، جیسے :

यज्ञं पृच्छाम्यवमं स तद् दूतो विवोचति। ;ऋग्वेद 1रू105रू4द्ध.

میں سب کے بعد والے یگیہ (यज्ञ قربِ الٰہی کے مناسک) کا سوال کرتا ہوں، اس کی تفصیل 'وہ پیغمبر' کرے گا۔ (رگ وید: ۱:۱۰۵:۴)

رِگ وید: ۱:۱۲:۱، ۱۰:۷۰:۳، اور ۱۰:۱۲۲:۵ وغیرہ میں بھی 'دُوت' لفظ کو دیکھا جاسکتا ہے۔

سناتن دھرمی ہندوؤں کی عظیم اکثریت ویدوں کو کلامِ الٰہی مانتی ہے لیکن یہ کلام کس شخص یا کن شخصیات پر نازل ہوا، یہ بتانے سے وہ قاصر ہیں، اللہ کی طرف سے انسانوں کو کلام پہنچانے والا کوئی نہ کوئی انسان ہی تو ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ کئی انسانوں پر اس کلام کے مختلف اجزا نازل ہوئے ہوں، کلامِ الٰہی کو انسانوں تک پہنچانے والے پہلے انسانی ذریعہ ہی کو اسلامی اصطلاح میں نبی یا رسول کہتے ہیں، کلامِ الٰہی کا عقیدہ ہونے کے ساتھ عقیدۂ نبوت خود بہ خود لازم ہو جاتا ہے، چاہے اس کا استحضار سناتن دھرمیوں کو ہو یا نہیں۔

ویدوں کا نبی

یقیناً بغیر ٹھوس ثبوتوں کے سناتن دھرمی ہندوؤں کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وید الہامی کلام ہیں؛ لیکن بنا تحقیق ان کے دعوے کو مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ہر خطۂ زمین پر اللہ کے رسول آئے اور جہاں ان کی بعثت ہوئی وہیں کی زبان میں اللہ کا کلام ان پر نازل ہوا :

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَسُوْلٌ .... (یونس:۴۷)

ہر اُمت کے لئے کوئی رسول تھا......۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ . (ابراہیم:۴)

اور ہم نے ہر رسول کو اس کی اپنی قوم کی زبان (میں پیغام) کے ساتھ ہی بھیجا تاکہ وہ ان پر (اسے) خوب واضح کر سکے۔

ہم جانتے ہیں کہ تاریخی دور میں تو ہندوستان میں کوئی رسول یا نبی مبعوث نہیں ہوا اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت تھی؛ لہٰذا مندرجہ بالا قرآنی اصولوں کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہے کہ ہندوستان میں بھی رسول آئے اور جو رسول یہاں مبعوث ہوئے ان پر اللہ کا کلام سنسکرت زبان میں نازل ہوا، کیا وید میں الحاق وتحریف کے باوجود کلامِ الٰہی ہوسکتا ہے؟ اگر ہاں تو جن رسولوں یا انبیا سے ہم قرآن کے ذریعہ واقف ہیں کیا ان میں سے کسی یا کئی سے ان کا تعلق ہوسکتا ہے؟ یا اگر یہ (تحریف شدہ) کلامِ الٰہی نہ بھی ہوں تو کیا ان میں قرآن میں موجود شخصیات کے تذکرے ہیں؟ ان میں آخری استفسار کا جواب نسبتاً آسان ہے اور اس کا جواب ملنے پر ہوسکتا ہے کہ اول الذکر سوالات کے حل میں بھی مدد مل سکے۔

ہندو مذہبی کتب میں کن انبیاء کے تذکرے کا امکان ہے؟

وید قدیم ترین مذہبی کتب ہیں، ویدوں کا نزول یا ان کی تصنیف کم از کم جدید اور مستند تاریخ نویسی سے پہلے کی بات ہے، سلسلۂ انبیا ورسل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام تاریخی دور کے پہلے نبی تھے، ان کے باپ کا نام، پیشہ، علاقہ، اس خطہ کے اربابِ اقتدار، ان کی تہذیب، مذہبی تصورات ورجحانات ودیگر تفصیلات تاریخ وآثارِ قدیمہ میں درج ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کے انبیا کے زمانۂ بعثت یا خطۂ نبوت کے بارے میں تاریخ خاموش ہے، تاریخ کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے علاقے 'اُر' میں پیدا ہوئے اور عراق، شام، فلسطین، مصر، اردن اور سعودی عرب سے ان کے تعلق کی بہت سی تفصیلات کا ہمیں علم ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے

تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل تشریف لائے تھے، وید چوں کہ قبل از تاریخ دور کے ہیں اس لئے یہ واضح ہو گیا کہ ویدوں کا دور کم از کم ۲۰۰۰ ق م سے قبل کا تو یقیناً ہے، ویدوں کا زمانہ متعین کرنے والے بیشتر محققین بھی ان کا دور اس سے قدیم مانتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کی بنیاد پر ویدوں میں جب ہم قرآن میں مذکور انبیا کے ناموں کی تلاش کرنے چلیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پیشتر نبیوں کے ناموں ہی پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے، اور بہر حال اگر وید ہندوستان میں آئے کلام الٰہی کے باقیات ہوے تو رسولِ میثاق ﷺ کا تذکرہ بھی ان میں ہونا ضروری ہے؛ کیوں کہ ہر نبی نے خاتم النبیین ﷺ کی بشارت دی تھی، وید کے علاوہ دیگر سناتن دھرمی مذہب کتب میں سے حالاں کہ بہت سی کتابیں بہت بعد کے دور کی ہیں؛ لیکن ویدک روایات سے چلی آرہی شخصیات میں سے بعض کے تذکرے ان میں بھی ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے؛ لہٰذا یہ دیگر کتب بھی ہماری تلاش کے دائرے میں شامل ہیں اور ان انبیا کے ہندوستان سے تعلق کی جو روایات اسلامی مآخذ میں ہمیں ملتی ہیں ان کا تذکرہ بھی مفید ہوگا۔

حضرت آدم علیہ السلام ــــ اسلامی مآخذ کی روایات

اخرج ابن جرير وبن أبي حاتم و الحاكم وصححه عن ابن عباس رضي الله عنهما قال : " أول ما اهبط ا لله آدم الىٰ الأرض الهند" وفي لفظ : " بدجنى ارض الهند" .

ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تخریج کی اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ آدم کو اللہ نے شروع میں سرزمین ہند میں اتارا اور ایک روایت میں 'سرزمین ہند میں دجنی' کا لفظ ہے۔(۱)

سید سلیمان ندویؒ نے خیال ظاہر فرمایا ہے کہ لفظ 'دجنی' دکھنی یعنی جنوبی کا معرب ہوسکتا ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو جنوبی ہند میں اتارا گیا۔(۲)

و أخرج ابن جرير و الحاكم و صححه و البيهقي عنه قال : قال على ابن ابى طالب : أطيب ريح الأرض الهند ، هبط بها آدم فعلق شجرها من ريح الجنة . و أخرج ابن سعد و ابن عساكر عن ابن عباس قال : أهبط آدم بالهند و حواء بجدة ...... و أخرج الطبراني و أبو نعيم في الحلية

(۱) امام شوکانی، تفسیر فتح القدیر، در تفسیر ولکم فی الارض مستقر، البقرة ۳۶۔ (۲) سید سلیمان ندوی، عرب ہند تعلقات: ۱-۲۔

عن أبي هريرة قال : قال رسول اللهﷺ : "أنزل آدم عليه السلام بالهند"...... وقد روي عن جماعة من الصحابة أن آدم أهبط الى أرض الهند ، منهم جابر اخرجه ابن الدنيا و ابن ابي المنذر و ابن عساكر، و منهم ابن عمر أخرجه الطبراني .

ابن جریر اور حاکم اور بیہقی نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے تخریج کی اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سرزمین ہند کی ہوا کتنی پاکیزہ ہے کہ اس کے سہارے آدم اترے پھر جنت کی ہوا سے اس کے پیڑ مستفیض ہوئے اور ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ سے تخریج کی کہ انھوں نے فرمایا کہ آدم ہند میں اترے اور حوا جدّہ میں، اور طبرانی نے اور ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابو ہریرہ سے تخریج کی کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام ہند میں اتارے گئے، اور صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کیا گیا ہے کہ آدم کا اترنا سرزمین ہند کی طرف ہوا، ان میں سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ابن الدنیا اور ابن ابی المنذر اور ابن عساکر نے تخریج کی اور ان میں ابن عمرؓ ہیں جن سے طبرانی نے تخریج کی۔(۱)

والتنور اختلف في تفسيرها على اقوال ...... الثامن أنه موضع بالهند ، قال ابن عباس : كان تنور آدم بالهند .

اور تنور کی تفسیر میں جو اقوال ہیں ان میں اختلاف ہے......آٹھواں قول یہ ہے کہ وہ ہند میں ایک جگہ ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آدم کا تنور ہند میں تھا۔(۲)

سدیؒ کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہند میں اترے، آپ کے ساتھ حجر اسود تھا اور جنتی درخت کے پتے تھے جو ہند میں پھیلا دیے اور اس سے خوشبودار درخت پیدا ہوئے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہند کے شہر دجنا میں اترے تھے، حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ آدم ہند میں اور مائی حوا جدہ میں اتریں۔(۳)

زمانۂ قدیم میں ہندوستان اور سری لنکا تقریباً ملے ہوئے تھے، یعنی سری لنکا کو زمانۂ قدیم کے جنوبی ہند میں

---

(۱) امام شوکانی، تفسیر فتح القدیر، در تفسیر ولکم فی الارض مستقر، البقرۃ:۳۶۔

(۲) امام شوکانی، تفسیر فتح القدیر، در تفسیر "وفار التنور" ہود:۴۰۔

(۳) ابن کثیر در تفسیر: ولکم فی الارض مستقر، البقرۃ:۳۶۔

شامل کیا جا سکتا ہے، سری لنکا کے ایک پہاڑ کی ۲۲۴۳ میٹر بلند چوٹی پر جسے کوہِ آدم (Adam's Peak) کہا جاتا ہے، ۵ فٹ ۷ انچ لمبا ایک بہت واضح بائیں پیر کا نشان ہے جس کے بارے میں مقامی عیسائی اور مسلمان یہ مانتے چلے آرہے ہیں کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے پیر کا نشان ہے، ہندو اسے شیو جی کے اور بدھ اسے گوتم بدھ کے پیر کا نشان مانتے ہیں، سری لنکا اور ہندوستان کے درمیان اتھلے سمندر اور بڑے بڑے پتھروں کی ایک ۳۰ کلومیٹر لمبی قطار سی چلی گئی ہے جن کی گہرائی ۳ سے ۳۰ فٹ تک ہے، جیالوجی کے بعض ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ انسانی تعمیر تھی، اسے آدم کا پل (Adam's Bridge) کہا جاتا ہے، سناتن دھرمی ہندو اسے رام سیتو کہتے ہیں۔

ہندو مذہبی کتب میں مَنو

ہندو مذہبی کتب میں وقت کو ۱۴ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کو ایک منونتر (मन्वन्तर) کہا گیا ہے، ہر منونتر یا دور کو شروع کرنے والی عظیم شخصیت کا لقب 'منو' ہے، مانا جاتا ہے کہ ۱۴ منوؤں میں سے پہلے منو (سویم بھومنو) سے نسل انسانی کی اولین ابتدا اور ۷ ویں منو (ویوسوت منو वैवस्वत मनु) سے نسل انسانی کی دوبارہ شروعات ہوئی جب ایک عالم گیر عظیم سیلاب سے منو اور ان کے چند ساتھیوں کے علاوہ سب ختم ہو گئے تھے، یہ دیکھنا اہم ہوگا کہ کیا یہ پہلے اور ۷ ویں منو کی داستانیں حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کی ہیں؟ اور اگر ایسا ہو تو ان دونوں کے درمیان کے منوؤں کا تذکرہ لازماً آدم علیہ السلام و نوح علیہ السلام کے درمیان ۵ بڑے انبیاء کی نشان دہی ہوگی۔

لفظِ آدم

لفظ آدم نہ عربی اصل کا ہے اور نہ عبرانی یا سریانی، بعض حضرات نے اسے عربی کے اَدیم (زمین) یا اُدْمٌ (موافقت) یا اُدْمَۃ (گندم گوں) سے مشتق بتایا ہے؛ لیکن دیگر محققین نے اسے کھینچا تانی کہتے ہوئے آدم کو عجمی نام کہا ہے، لفظ آدم کا سنسکرت اصل کا ہونا بہت واضح ہے، سنسکرت میں آدِ (आदि) یا آدِم (आदिम) سب سے پہلے یا سب سے قدیم کو کہتے ہیں جس سے لفظ آدم بننا بالکل قرین قیاس ہے۔

وید میں منو

ویدوں میں منو لقب والی شخصیت یا شخصیات کا تذکرہ بہت کثرت سے ہے؛ لیکن اگر یہ بہت سے منو ہیں تو ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے، ویدوں میں ایک مرکزی کردار یا ہستی 'اگنی' (حقیقتِ احمدی) کا تذکرہ بھی بہت کثرت سے ہے، اگنی کا اصل مطلب 'سب سے اول' ہے، اس لفظ کا استعمال کہیں ذاتِ باری

تعالیٰ اور بیشتر تخلیق اوّل کے لئے کیا گیا ہے، وید میں منو، بیشتر مقامات پر اگنی کی تعریف یا اگنی کے قیام کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں، چند وید منتر جن میں منو کا تذکرہ ہے درج ذیل ہیں :

... जनं मनुजातं ... (ऋग्वेद 1:45:1).

سب انسان منو کی نسل (سے ہیں)۔(رگ وید:۱:۴۵:۱۱)

नि त्वा यज्ञस्य साधनमग्ने होतारमृत्विजम्। मनुष्वद्देव धीमहि प्रचेतसं जीरं दूतममर्त्यम्।। (ऋग्वेद 1:44:11)

اے وسیلۂ قربانی، امامِ قربانی، خردمند، تیز گام، لازوال رسول اگنی ہم تمہیں منو کے طریقہ پر اپنائیں۔(رگ وید:۱:۴۴:۱۱)

नि त्वामग्ने मनुर्दधे ज्योतिर्जनाय शश्वते। (ऋग्वेद 1:36:19)

اے لازوال نور اگنی منو نے تمہیں لوگوں کے لئے قائم کیا۔(رگ وید:۱:۳۶:۱۹)

यच्छं च योश्च मनुरायेजे पिता तदश्याम तव रुद्र प्रणीतिषु।। (ऋग्वेद 1:114:2).

اے خدا جو صحت اور قوت منو نے قربانی کے ذریعہ حاصل کی تھی انھیں ہم آپ کی رہنمائی میں حاصل کریں۔(رگ وید:۱:۱۱۴:۲)

وید میں حضرت آدم سے مماثل واقعات کے چند تذکرے

حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق قرآن کے بیان کردہ دو واقعات کا تذکرہ بھی وید منتروں میں محسوس ہوتا ہے اگر چہ ان منتروں میں منو نام نہیں آیا ہے، ان میں سے پہلا حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کا علم دیا جانا اور فرشتوں کا ان کو سجدہ کرنا ہے (الاسماء کلھا کا علم اور سجدۂ ملائکہ، وید میں الگ الگ مقامات پر ہیں) اور دوسرا بنی آدم کی پیٹھوں سے نفوس کا نکالا جانا ہے :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا .... (البقرۃ:۳۱)

اور اللہ نے آدم کو تمام ناموں کا علم دیا......۔

बृहस्पते प्रथमं वाचो अग्रं यत्प्रैरत नामधेयं दधानाः। (ऋग्वेद 10:71:1)

خدا نے سب سے پہلی تعلیم یہ دی کہ تمام ناموں کا علم القاء کیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا .... (البقرۃ:۳۴)

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا۔

......देवा यद्यज्ञं तन्वाना अबध्नन्पुरुषं पशुम् ।। यज्ञेन यज्ञमयजन्त देवस्तानि धर्माणि प्रथमान्यासन् । ते ह नाकं महिमानः सचन्त यत्र पुर्वेसाध्याः सन्ति देवाः ।। (ऋग्वेद 10:90:15,16)

مندرجہ بالا منتروں کا پنڈت شری رام شرما آچاریہ کا کیا ہوا ترجمہ درج ذیل ہے (اسی ترجمہ سے ان دو منتروں کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے) :

(प्रजापति के प्राण रूप देवताओं ने पुरुष्ब को मानसिक यज्ञ के अनुष्ठान काल में वरण किया। .... देवताओं ने मानसिक यज्ञ में जो विराट पुरुष्ब का पूजन किया उस से संसार के गुण धर्मों के धारण कर्ता धर्म उत्पन्न हुए। जिस स्वर्ग में देवगण निवास करते हैं उस स्वर्ग को याज्ञिक सन्तजन प्राप्त करते हैं।).

پرجاپتی (مخلوقات کے مالک) نے پُرُش (انسان، مرد) کو روحانی قربانی کے مناسک کے دورِ اوّل میں منتخب کیا، دیوتاؤں (فرشتوں) نے روحانی قربانی میں جو عظیم انسان کے سامنے سر جھکایا اس سے دنیا کے وہ طریق ہائے زندگی پیدا ہوئے جو دینی صفات کے حامل تھے، جس بہشت میں فرشتوں کی رہائش ہے اس جنت کو قربانی ادا کرنے والے نیک لوگ حاصل کرتے ہیں۔ (رگ وید: ۱۰: ۹۰: ۱۵، ۱۶)

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ . (الاعراف: ۱۷۲)

اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے ان کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو نکالا۔

آیت کی تشریح میں ابن کثیر نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ مقام نعمان میں بروزِ عرفہ نفوس سے وعدہ لیا گیا تھا اور آدم کی صلب سے نکال کر ذرّوں کی طرح پھیلا دیا گیا تھا، الشیخ ابن القیم نے کتاب الروح میں ضحاک کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ نے جس دن آدم کو پیدا فرمایا اسی دن ان کی پشت سے قیامت تک کی دنیا میں آنے والی تمام روحیں چیونٹیوں کی طرح نکال کر ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار لے لیا تھا اور فرشتے گواہ بن گئے تھے :

देवी द्यावापृथिवी मखस्य वामद्य शिरो राध्यासं देवयजने पृथिव्यः। मखाय त्वा मखस्य त्वा शीर्ष्णे।। देव्यो वम्रयो भूतस्य प्रथमजा मखस्य वोऽद्य शिरो राध्यासं देव यजने पृथिव्याः। मखाय त्वा मखस्य त्वा शीर्ष्णे।। (यजुर्वेद 37:3,4)

مقدس سرزمین جنت، مکہ کی چوٹی پر تم دونوں کے لئے آج فرشتوں کی قربان گاہ میں
زمین ہموار کروں ہم مکہ کے لئے، تم کو مکہ کا تاج۔

اے مقدّس چیونٹیو! تم سب سے پہلے پیدا کی گئیں، مکہ کی چوٹی پر تم سب کے لئے آج فرشتوں کی قربان گاہ میں زمین ہموار کروں، تم مکہ کے لئے، تم کو مکہ کا تاج۔

(مندرجہ بالا منتر میں سنسکرت لفظ 'मख' کا ترجمہ ویدوں کے سبھی سناتن دھرمی مترجمین نے 'یگیہ' 'यज्ञ' کیا ہے، مشہور عیسائی مترجم گرفتھ نے اس کا ترجمہ کرنے کے بجائے اسے کوئی مقام مانتے ہوئے انگریزی میں Makha 'مکھ' ہی رہنے دیا ہے، سَر مونئیر ولیمز کی مشہور اور مستند سنسکرت انگریزی لغت میں 'मख' کے ایک معنی لکھے ہیں: City of Mecca یعنی شہرِ مکہ)۔

بھوشیہ پُران

بھوشیہ پران میں حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کے جنت میں شجر ممنوعہ چکھنے کا بیان ہے، یہاں سنسکرت متن میں آدم کا نام آدم، حوا کا حویہ وتی (हव्यवती) اور شیطان کا کلی (कलि) ہے، جنت کو پردان نگر (شہرِ عطا प्रदान नगर) اور شجر ممنوعہ کو پاپ ورکچھ (पाप वृक्ष گناہ کا درخت) کہا گیا ہے :

इन्द्रियाण्दिमित्वा यो ह्यात्मध्यानचरायणः। तस्मात् आदम नामासौ पत्नी हव्यवती स्मृता।। प्रदान नगरस्यैव पूर्वभागे महावनम्। ईश्वरेण कृतं रम्यं चतुःक्रसेशायतं स्मृतम्।। पापवृक्ष तले गत्वा पत्नीदर्शनतत्परः। कलिः तत्रागतस्तूर्ण सर्पररूपं हि तत्कृतम्।। वन्चिता तेन धूर्तेन विष्णवाज्ञा भंगता गता। खादित्वा तत्फलं रम्यं लोकमार्गप्रदं पतिः।। (भविष्य पुराणश प्रतिसर्ग पर्व, खण्ड 1,4:29—32)

ضبطِ حواس کر کے جو مراقبۂ نفس میں مشغول تھا، اس کا نام آدم تھا اور اس کی بیوی کا نام حویہ وتی کہا گیا ہے، پردان نگر ہی کے مشرقی حصہ میں ایک وسیع جنگل ہے، یہ ایشور کا بنایا ہوا چار کوس کا بہت دلکش بتایا گیا ہے، پاپ ورکچھ کے نیچے جا کر وہ وہاں پتنی کے درشن میں لگ گیا، جلد ہی سانپ کی سرشت کا کلی وہاں پہنچ گیا، اس بدمعاش نے انھیں (فرماں برداری سے) محروم کر کے وشنو کی نافرمانی کروادی، اس دلکش پھل کو کھا کر شوہر دنیا کی راہ کا راہی ہوا۔ (بھوشیہ پُران، پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ: ۴:۲۹-۳۲)

دیگر پُرانوں میں منو اور ان کی زوجہ شت رُوپا (آدم و حوا؟)

بھوشیہ پران کے علاوہ دیگر پرانوں میں اصل ناموں کے بجائے ان شخصیات کو منو کہا گیا ہے جو ایک لقب ہے، پہلے یہ تذکرہ گزر چکا ہے کہ منو لقب والی ۱۴ شخصیات میں سے پہلے منو کو मनु 'स्वयंभु' سویم بھو منو کہا گیا ہے، स्वयं سویم کا مطلب ہے 'خود' اور 'بھو' ہونے کو کہتے ہیں، سویم بھو منو سے مراد وہ منو ہیں جو خود سے ہوئے یعنی جن کے کوئی ماں یا باپ نہیں تھے، ان کا تذکرہ تقریباً ہر پران میں ہے، ان کی زوجہ کا نام شَت رُوپا بتایا گیا ہے، شَت سَو (۱۰۰) کو کہتے ہیں اور سینکڑوں رُوپوں والی انھیں اس لئے کہا گیا ہے کہ ان سے ہی نسلِ انسانی کے سینکڑوں صفات والے لوگ پیدا ہوئے، سناتن دھرمی دیو مالائی رنگ لئے ہوئے سویم بھو منو اور شت روپا کی تفصیلات میں بغیر ماں اور باپ کے وجود میں آنے والے پہلے مرد و عورت کو پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہے، بیشتر پرانوں میں منو اور شت روپا کا تذکرہ ہے، ان میں سے چند مثالیں ذیل میں دی جارہی ہیں :

شری مد بھاگوت مہاپُران

ताभ्यां रूपविभागाभ्यां मिथुनं समपद्यत।। 52 यस्तु तत्र पुमान्सोऽभून्मनुः स्वायम्भुवः स्वराट्। स्त्री यांसीच्छतरूपाख्या महिष्यस्य महात्मनः।। 53 तदा मिथुनधर्मेण प्रजा ह्येधाम्बभूविरे। स चापि शतरूपायां पञ्चापत्यान्यजीजनत्।। 54
(श्रीमद्भागवत महापुराण 3:12:51—55)

جب وہ (برہما جی) یہ غور کر رہے تھے تبھی اچانک ان کا جسم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، اس تقسیم سے ایک مرد اور عورت کا جوڑا ظاہر ہوا، ان میں جو مرد تھا وہ ساری زمین کا راجہ سویم بھو منو ہوا، اور جو عورت تھی وہ ان کی مہارانی شت روپا ہوئی، اس وقت سے جنسی ملاپ کے ذریعہ ایک کے بعد ایک اولادیں پیدا ہونے لگیں۔
(شری مد بھاگوت مہاپران: ۳:۱۲:۵۲-۵۴)

برہم پران

स सृष्टवा तु प्रजास्त्वेवमापवो वै प्रजापतिः लेभे वै पुरुषः पत्नीं शतरूपामयोनिजाम् 1 आपवस्य महिम्ना तु दिवमावृत्य तिष्ठतः धर्मेणैव मुनिश्रेष्ठाः शतरूपा व्यजायत 2 स तु वर्षायुतं तप्त्वा

तपः परमदुश्चरम् भर्तारं दीप्ततपसं पुरूषं प्रत्यपद्यत 3 स वै स्वायंभुवो विप्राः पुरुषो मनुरुच्यते तस्यैकसप्ततियुगं मन्वन्तरमिहोच्यते 4 (ब्रह्म पुराण 2:1–4)

اس طرح (دیگر) مخلوقات کی تخلیق کرتے رہنے کے بعد بھی جب مخلوق میں اضافہ نہیں ہوا تب پرجاپتی (مخلوقات کے سرپرست) اپنے جسم کے دو حصے کر کے آدھے سے مرد اور آدھے سے عورت ہو گئے، مرد کا نام منو ہوا، عورت بغیر ذریعہ کے پیدا ہونے والی شت روپا تھی جو منو کو زوجہ کی صورت میں حاصل ہوئی، اس نے دس ہزار سال زبردست تپسیا کر کے شاندار مرد کو شوہر کی حیثیت میں حاصل کیا، ان کے منونتر کی مدت اکھتر (۷۱) چتر یگ کی بتائی جاتی ہے۔ (برہم پران ۲:۱-۴)

وشنو پران

ततो ब्रह्मात्मसंभूतं पूर्वं स्वायंभुवं प्रभु आत्मानमेव .तवान्प्रजापाल्ये मनुं द्विज 16 शतरूपां च तां नारीं तपोनिर्धूतकल्मषाम् स्वायंभुवो मनुर्देवः पत्नीत्वे जगृहे प्रभुः 17 (विष्णु पुराण 1:7:16–17)

تب اپنے سے پیدا اپنے ہی مانند سویم بھو کو برہما جی نے مخلوق کو پالنے کے لئے پہلے منو کو بنایا، ان سویم بھو منو نے اپنے ساتھ پیدا ہوئی، تپسیا کے ذریعہ پاک ہوئی، شت روپا کو اپنی بیوی کی حیثیت سے اپنایا۔ (وشنو پران ۱:۷:۱۶-۱۷)

رام چرت مانس

[illegible] r[illegible]
[illegible]*¼jkepfjr
ekul ckyda.M]'yksd 141]1pkSa 1½.

سویم بھو منو اور شت روپا جن سے انسانوں کی یہ بہترین نسل چلی، ان دونوں شوہر و بیوی کے دین و اخلاق بہت اچھے تھے، ان کی عظمت کا بیان وید آج بھی کرتے ہیں۔

(رام چرت مانس: بال کانڈ، شلوک: ۱۴۱، چوپائی: ۱)

حضرت نوح کے ہندوستانی روابط سے متعلق اسلامی مآخذ کی روایات

(الف) قرآن مجید اور قومِ نوح: قرآن شریف سے ہمیں واضح الفاظ میں نہ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانۂ بعثت معلوم ہوتا ہے اور نہ قبل از سیلاب اور بعد از سیلاب ان کے خطۂ تبلیغ کے نام کا علم ہوتا ہے؛ البتہ حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرے میں قرآن نے جو اشارے دیے ہیں ان پر غور کرنے سے جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں وہ محققین حضرات کے لئے دلچسپ اور داعیانِ اسلام کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔

سورۃ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے متکبرین کی جو زبان درج ہے اس پر غور کرنے سے کچھ دریچے کھلتے ہیں۔

ان کی دعوت کے جواب میں متکبرین قوم یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ تمہارے پاس رذیل لوگ ہوتے ہیں جن کے باعث ہم تمہارے پاس نہیں آسکتے۔

......وَمَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِینَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ...... ۔ (ہود:۲۷)

...... اور ہم تو تمہارے متبعین کو اس کے سوا نہیں دیکھتے کہ وہ بادی النظر میں ہمارے رذیل تر لوگ ہیں......۔

یہاں جس لفظ 'ارذل' کا استعمال ہے وہ غریبوں یا معاشی پس ماندہ لوگوں کے لئے نہیں بولا جاتا، یہ پیدائشی طور پر نیچی ذات کے لوگ ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں چھوت چھات اور اونچ نیچ کا طبقاتی نظام رائج تھا۔

سورۃ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی زبان کو عربی میں درج کیا گیا ہے، انھوں نے باری تعالیٰ سے فریاد کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی قوم کو یہ بھی سمجھایا :

وَقَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا ۔ (نوح:۱۴)

اور یقیناً اللہ نے تمہیں مختلف طریق پر تخلیق کیا۔

وَاللّٰہُ اَنْبَتَکُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۔ (نوح:۱۷)

اور اللہ نے تمہیں زمین سے نباتات (بنا کر) اُگایا۔

ان دونوں آیات کا اگر ہم لفظی ترجمہ لیں تو سناتنی ہندوؤں کے آواگون جیسی بات محسوس ہوگی، اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم وہ تھی جس کی دینی اصطلاحی زبان کو اگر کوئی لفظی معنیٰ پہنانے کی کوشش

کرے تو آواگون کا عقیدہ بن جائے گا، بالفاظ دیگر، دنیا میں اگر کوئی قوم ایسی ہے جو آواگون کا عقیدہ رکھتی ہے تو وہ قومِ نوح ہوسکتی ہے، جس کے اس بگاڑ کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنی دینی اصطلاحی زبان کو لفظی معنوں میں ملبوس کردیا ہوگا۔

اسی سورۃ میں حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو کائناتی مظاہرِ نجوم پر غور کرنے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں :

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ، وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا . (نوح:۱۵-۱۶)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے سات آسمانوں کو کیسے طبقات میں تخلیق کیا اور چاند کو ایسے بنایا کہ اس میں (دوسرے سے مستعار) نور رکھا جب کہ سورج کو ایسے بنایا کہ وہ (بذاتہٖ خود) چراغ ہے۔

قابل غور ہے کہ پچھلے انبیاء میں سے حضرت نوح کے علاوہ کسی نبی کا اپنی قوم کو فلکیات پر غور کرنے کی دعوت کا بیان ہمیں قرآن حکیم میں نہیں ملتا، گزشتہ اقوام اجرامِ فلکی کے بارے میں عجیب وغریب نظریات رکھتی تھیں، یہ دعوت صرف اسی قوم کو دی جاسکتی ہے جس نے ماضی میں علمِ فلکیات میں قابل لحاظ ترقی کی ہو۔

سورۃ نوح ہی میں ہمیں قومِ نوح کے چار بڑے بتوں یا معبودوں کے نام ملتے ہیں، سابقہ انبیا کی اقوام میں سے کسی اور قوم کے بتوں کے نام قرآن میں مذکور نہیں ہیں، شرک ہر منکر قوم نے کیا؛ لیکن جن قوموں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ان کے دیگر جرائم کے تذکرے کو نظر انداز کرکے قرآن نے صرف ہر قوم کے سب سے نمایاں جرم کو بیان کیا ہے، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بدکاری، قومِ شعیب کی تجارت میں بے ایمانی، قومِ عاد کی رہزنی اور قومِ شعیب کے مالداروں کا چراگاہوں پر قبضے کے ذریعہ عوام کا معاشی استحصال وغیرہ کچھ اقوام کے نمایاں جرائم تھے جن کے باعث وہ عذابِ الٰہی کی مستحق ہوئیں، قومِ نوح کا نمایاں جرم شرک و بت پرستی تھا۔

شرک ومورتی پوجا، آواگون کا عقیدہ اور عوام کی اونچے نیچے طبقات میں تقسیم —— جس قوم کے یہ جرائم ہیں کیا اس کی نشان دہی ہنوز باقی ہے؟ واضح رہے کہ جن اولوالعزم رسولوں کا قرآن میں بار بار ایک ساتھ تذکرہ ہوا ہے ان میں سے حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ سبھی کی قومیں آج دنیا میں معلوم ومعروف ہیں، قومِ نوح بھی نمایاں اور معروف قوم ہونی چاہئے، حضرت نوح علیہ السلام کے جن مومن ساتھیوں نے طوفان کے بعد ہندوستان کو وطن بنایا، ان کی آنے والی نسلوں نے ان سنے ہوئے واقعات کو اپنی وراثت سمجھ کر وہی طرزِ عمل اختیار کرلیا جو ڈوبنے والوں کا تھا اور ان ہی بتوں کی پرستش شروع کردی جنھیں ان کے متقدمین پوجتے تھے، یہ بعید از قیاس نہیں ہے۔

(الف:۱) قومِ نوح کے اصنام کی تحقیق

قرآن نے ان کے چار بڑے معبودوں کے نام بتائے ہیں، قابلِ غور ہے کہ کیا وَدّا، سواع، یغوث، یعوق اور نصر موجودہ سناتن دھرمی ہندوؤں کے واسودیو (वासुदेव)، شیوا (शिवा)، یگیش (यज्ञेश)، یکچھ (यक्ष) اور نکچھتر (नक्षत्र) کے معرب تو نہیں ہیں؟ قومِ نوح کے معبودین کے تعین میں ہشام ابن الکلبی (۷۳۷-۸۱۹ھ) کی کتاب الاصنام کے حوالے بہت اہم ہو سکتے ہیں، ۱۹۵۲ء میں نبیہ امین فارس نے اس نادر کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا جسے پرنسٹن یونیورسٹی پریس نے شائع کیا، موجودہ مقالے میں اس کتاب کے حوالے وصفحہ نمبر انگریزی ترجمہ سے ہیں، ہشام نے مندرجہ بالا بتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا عرب میں پوجا جانا بھی معلوم ہوا ہے؛ لیکن ان پانچ میں سے تین کے ثبوت عرب میں کم از کم ہشام کے دور میں فراہم نہیں ہو سکے:

> سُواع : ہذیل نے سواع کو معبود بنایا اور مدینہ کے ایک گاؤں ینبوع کے قریب رُحات میں نصب کیا، اس معبد کے مجاور بنولحیان تھے؛ لیکن مجھے ہذیلیوں کی شاعری میں اس بت کا کوئی تذکرہ نہیں ملا؛ البتہ مجھے ایک یمنی کی ایک نظم میں سواع کا تذکرہ ملا ہے۔ (ص:۸،۹)
>
> یعوق : خیوِن نے یعوق کو اپنا معبود بنایا، مکہ کی جانب دو راتوں کی مسافت پر اسے خیوان میں نصب کیا گیا، میں نے ہمدان یا کسی اور عرب قبیلہ کو اپنے افراد کے نام یعوق کے نام پر (جیسے عبد یعوق) رکھتے نہیں پایا، ان کی شاعری میں بھی یعوق کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ (ص:۱۰)
>
> نسر : ہمیار نے نسر کو اپنایا اور بلخا میں اس کی پوجا ہوئی؛ لیکن مجھے ہمیار کے کسی فرد کا نام نسر کے نام پر نہیں ملا اور نہ مجھے کہیں عرب شاعری میں نسر کا تذکرہ ملا۔ (ص:۱۰)

سواع یعوق اور نسر نام کے بتوں کا نہ عرب علاقوں میں پتہ چلنا، نہ عرب شاعری میں ان کا نام ونشان ہونا اور نہ کسی عرب قبیلے میں ان کے نام پر کسی کے نام ہونے سے یہ ظاہر ہے کہ یہ بت عرب علاقوں کے نہیں تھے۔

نسر، نکچھتر (नक्षत्र) کا معرب ہو سکتا ہے، نسر عربی میں عقاب یا گدھ کو کہتے ہیں، سنسکرت میں نکچھتر سیاروں کو کہتے ہیں جن کے اثرات کو علم نجوم میں بڑی اہمیت حاصل ہے، عقاب (گَرڑ गरुड़) کو سناتنی ہندوؤں میں

مقدس مانا جاتا ہے، اسے وشنو بھگوان کی سواری بھی کہتے ہیں اور ہندوؤں کے پانچ پنچھی شاستر میں گِلپھتروں سے اس کا تعلق مانا جاتا ہے۔

سواع اور شیو یا شِوا میں بہت مماثلت ہے جو سناتی ہندوؤں کا مشہور دیوتا ہے، یعوق ہندوستان کے یکچھ کا معرب ہوسکتا ہے جسے فطرت کی طاقتوں کا دیوتا مانا جاتا ہے۔

کتاب الاصنام کے صفحہ ۹ پر 'واد' اور 'یغوث' کی مدح یا ان سے استعانت کی عربی شاعری کی مثالیں دی گئی ہیں، قوم نوح کا وَدّ یا وَدّا عرب کا 'واذ' ہے، واد عربوں کا محبت اور دوستی کا دیوتا تھا، اور ہندوستان کا واسُد یو (کرشن کا ایک نام) رادھا اور ۱۶۰۰۰ گوپیوں سے محبت کے کھیلوں اور پانڈوؤں سے دوستی نبھانے کے لئے مشہور ہے، یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ سری لنکا میں ایک جنگلی قبیلہ کو 'ودّا' کہا جاتا ہے اور محققین کے مطابق یہ وہاں کے قدیم ترین اصل باشندے ہیں جو قبل از تاریخ دور سے وہاں بسے ہوئے ہیں، محققین کے مطابق یہ لوگ اصلاً وہاں کے رتناپور ضلع کے 'کوہِ آدم' علاقے کے باشندے ہیں۔

قدیم دیوتاؤں کے موضوع پر ایک اور نادر کتاب جو 'دی لائبریری آف کیلیفورنیا' میں محفوظ کی گئی ہے ۱۸۵۶ء میں ایس ایف ڈنلپ نے لکھی تھی، کتاب کا نام ہے The Origin of Ancient Names of Countries, Cities, Individuals and gods (قدیم ناموں، ملکوں، شہروں، افراد اور دیوتاؤں کی اصل) اس کتاب کے صفحہ ۹ پر یغوث (व्हश्‌ लहश्‌ मे) کے بارے میں لکھا ہے: Og'-yg'-es The Sun-god of the flood-legend (یغوث، سیلابِ عظیم کی داستان کا سورج دیوتا) سورج دیوتا کے لئے قربانیوں (یگیہ यज्ञ) کے دیوتا کا نام ہندوستان میں یگیہ ایش یعنی 'یگییش' (यज्ञेश) ہے۔

(الف:۲) سیلاب کی ابتدا اور تنور کی تحقیق

سیلابِ نوح کی ابتدا کا مقام نامعلوم تصور کیا جاتا ہے اور کشتیِ نوح کا مستقر، اہل بائبل نے غلط مشہور کر دیا؛ حالاں کہ ان دونوں مقامات کے نام قرآن نے بتائے ہیں، جو قرآن نے بتایا ہے وہ نامعلوم نہیں ہوسکتا، ضرورت صرف تحقیق اور غور و خوض کی ہے، سورۃ ہود آیت ۴۰ کے مطابق تنّور کے ابل پڑنے سے سیلاب کی ابتدا ہوئی، کسی نے تنور کو زمین کے چشمے کہا، کسی نے فوارے اور کسی نے روٹی پکانے والا تنور، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کی تلاش کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تنور مقام بھی تو ہوسکتا ہے اور اگر وہ مقام ہے تو اس کی تلاش اہم ہے، اب اسے کیا کہیں کہ قرآن میں مذکور قومِ نوح کی صفات جس قوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں اسی کے خطے میں ساحلِ سمندر پر تنور نامی مقام آج بھی موجود ہے جہاں سطحِ سمندر بلند ہونے سے سیلاب کی ابتدا ہونی ممکن ہے، ہندوستان کے صوبۂ

کیرالہ کے ضلع ملاّپورم کی تحصیل تنور، بحیرۂ عرب کے ہندوستانی کنارے پر واقع ہے اور اس کے ساحلی حصہ کی بلندی سطح سمندر سے صفر یا زیرو فٹ ہے۔

(الف:۳) کشتیِ نوح کے مستقر جودی کی تحقیق

قرآن نے کشتی کے ٹھہرنے کے مقام کو جودی کہا ہے (ہود: ۴۰)، بائبل نے ارارات کی پہاڑیوں پر کشتی رکنا بتایا ہے۔

''اور کشتی ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کو ارارات کی پہاڑیوں پر رکی'' (کتاب پیدائش: ۸:۴) عیسائی محققین نے ارارات کو ترکی کے آرمینیا بارڈر پر قرار دیا، وہاں سے تقریباً ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر اغری داغی (Agri Daghi) ہے جسے کشتی کے ٹھہرنے کا مقام مانا جاتا ہے، داغ یا داغی ترکی زبان میں پہاڑ یا پہاڑی کو کہتے ہیں، کچھ دوسرے محققین اس سے ۲۰۰ کلومیٹر جنوب میں ترکی کے کودی داغ Cudi Dagh کو جودی سے ملتا جلتا ہونے اور کچھ دیگر ثبوتوں کی بنیاد پر کشتیِ نوح کا مستقر مانتے ہیں، یہ ترکی کے عراق اور شام بارڈر پر ہے، کشتیِ نوح مل جانے، اسے دیکھے جانے یا اس کے فوٹوؤں کی تمام داستانیں غلط ثابت ہوچکیں، کشتی تو شاید مرورِ زمانہ سے اپنے عناصرِ ترکیبی فطرت کے سپرد کر چکی ہو لیکن موجودہ ارارات کو اس کا نام پہلی صدی عیسائی میں دیا گیا، آرمینیائی ترکی میں اس پہاڑ کا نام اُرارتو Urartu تھا، ارارات کی تلاش میں ارارتو کو غالباً محض صوتی مناسبت کے باعث اُرارات مان لیا گیا، ارارتو یا موجودہ ارارات کی سب سے بلند چوٹی جس پر آج بھی کشتی کی تلاش جاری ہے، تقریباً ۷۰۰۰ افٹ اونچی ہے اور ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے، طوفانِ نوح میں سمندر کی سطح اتنی بلند ہو جانا قرین قیاس نہیں ہے، اس لئے تلاش کا دائرہ سطح سمندر سے زیادہ سے زیادہ ۵۰۰۰ فٹ اونچے مقامات یا چوٹیوں سے باہر نہیں ہونا چاہئے۔

عبرانی زبان میں ارارات لفظ کا مطلب ہے 'غیر ملکی اصل والا' 'Of foreign Origin' بائبل کشتی کے کسی ارارات نامی پہاڑ پر رکنے کی بات نہیں کرتی بلکہ ارارات (علاقے) کی پہاڑیوں پر کشتی رکنا بتاتی ہے، ''اور کشتی ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کو ارارات کی پہاڑیوں پر رکی'' (کتاب پیدائش: ۸:۴) حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھی جس علاقے کے رہنے والے تھے اور جس خطے سے طوفان کی ابتدا ہوئی تھی، بائبل کے مطابق کشتی اس سے دور کسی خطے میں روکی گئی اور شاید لفظ ارارات (غیر ملکی سرزمین) میں یہ بھی اشارہ ہو کہ سیلاب سے قبل حضرت نوح علیہ السلام کا جو خطۂ تبلیغ تھا اسے عذاب کے بعد اللہ نے تبدیل کر دیا اور انھیں ایک نئی سرزمین سے ابتدا کرنے کو کہا گیا، ہندوستانی مذہبی کتب بھی حضرت نوح علیہ السلام کا دور ۵۰۰۰ سال بتاتی ہیں (۱) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیلاب کے بعد وہ ہندوستان نہیں آئے۔

---

(۱) بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ: ۴: ۴۵۔

جودی یا کشتیِ نوح کے مستقر کی تلاش ترکی میں محصور ہوگئی کیوں کہ ارارات کو پہاڑ سمجھ لیا گیا اور پھر اُرارتو کا نام اَرارات رکھ لیا گیا، یاقوت الحموی و ابن بطوطہ وغیرہ مسلمان محققین بھی ترکی سے باہر نہیں نکلے؛ کیوں کہ انھیں ''کودی داغ'' مل گیا جسے جبل الجودی کہا جانے لگا اور ایک چوٹی کا نام سفینۂ نوح نبی رکھ کر وہاں ایک مسجد بھی بنالی گئی؛ لیکن اگر قبل از طوفانِ نوح حضرت نوح علیہ السلام کا خطہ تبلیغ معلوم ہو جائے تو اُس علاقے کی روایات کو بھی تحقیق کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکے گا اور ممکن ہے کہ اس سے کچھ نئے دریچے کھل سکیں؛ چوں کہ قرآن (اور بہت سے دیگر روایتی و درائتی ثبوت جن کا یہاں ذکر نہیں کیا جا رہا ہے) کے اشارات کی بنیاد پر (قبل از سیلاب) سرزمین ہند کا خطۂ نوح ہونا اغلب ہے؛ لہٰذا یہ دیکھنا اہم ہوگا کہ ہندوستانی روایات کشتی کے مستقر کے سلسلہ میں کیا کہتی ہیں۔

مہابھارت میں کشتیِ نوح کے مستقر کا نام نوبندھن بتایا گیا ہے:

> नौर मत्स्यस्य वचो शरुत्वा शृङ्गं हिमवतस तदा 46 तच च नौबन्धनं नाम शृङ्गं हिमवतः परम खयातम अधापि कौन्तेय तद विद्धी भरतर्षभ 47 (महा भारत, वन पर्व 185:46—47)
>
> (ویاس جی) کو روایت سناتے ہوئے سُوت جی نے کہا) اور مچھلی کی بات سن کر انھوں نے (منو نے) فوراً کشتی کو برفیلے پہاڑ کی اونچی چوٹی سے باندھ دیا، اے کونتی کے بیٹے (ویاس) اور ہندوستانی نسل کے لعل! برفیلے پہاڑ کی اونچی چوٹی آج بھی 'نوبندھن' نام سے مشہور ہے۔ (مہابھارت، وَن پَرو: ۱۸۵: ۴۶-۴۷)

نوبندھن کی تلاش زیادہ دور نہیں جاتی، ایران کے صوبہ خراسان میں افغانستان کی سرحد کے قریب شہر نہبندان Nehbandan ہے، ہوسکتا ہے نہبندان کا 'نہ' Neh کبھی نوح رہا ہو، اس نظریہ کو دو چیزوں سے تقویت ملتی ہے، اول یہ کہ خراسان ہی میں (حالاں کہ اس سے ۶۰۰ کلومیٹر دور) جودی بھی ہے، قصبہ آرک کے قریب ویران پہاڑوں کی تقریباً ۵۰۰۰ فٹ کی اونچائی پر 'آرگِ نَو جودی' ہے، آرگ کا مطلب ہے خطہ اور 'نَو' حالاں کہ فارسی میں نئے کو کہتے ہیں لیکن 'نَو' Nau or Now اسے حال ہی میں کیا گیا ہے پہلے یہ 'نُو' Nu تھا جو بول چال میں نوح کا مخفف ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ جودی ہی اصل نوبندھن ہو لیکن چونکہ یہ قابل رہائش پہاڑ نہیں ہے اس لئے اس سے دور اسی صوبہ میں ایک آبادی کا نام نوبندھن یا نہبندان رکھ لیا گیا ہو، دوسری بات جو اس نظریہ کو تقویت پہنچاتی ہے وہ بائبل کا ایک حوالہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کشتیِ نوح کے مسافر بابل (مصر) میں مشرق سے آئے تھے، ترکی یا آرمینیہ کے اُرارتو اور کودی سے بابل پہنچنے والوں کو شمال سے آنے والا کہا جائے گا، ایرانی جودی سے پہنچنے والے

واقعتاً مشرق سے پہنچیں گے۔

And the whole earth was of one language, and of one speech. And it came to pass, as they journeyed from the east, that they found a plain in the land of Shinar; and they dwelt there. (Genesis 11:1-2)

اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی، اور ایسا ہوا کہ مشرق کی جانب سے سفر کرتے کرتے ان کو ملک سِنعار (سمجھا جاتا ہے کہ یہ بابل ہے) میں ایک میدانی علاقہ ملا اور وہ وہاں بس گئے۔ (کتاب پیدائش:۱۱:۱-۲)

ایران میں موجود جودی کی طرف محققین کی توجہ کی ضرورت ہے جہاں بائبل، قرآن اور ہندوستانی روایات تینوں کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

(ب) تفسیری روایات

تفسیر فتح القدیر میں سورۃ ہود کی تفسیر میں تنور کے بارے میں روایات نقل کرتے ہوئے علامہ شوکانی نے نقل کیا ہے:

الثامن أنه موضع بالهند، آٹھواں قول یہ ہے کہ وہ ایک مقام ہے جو ہند میں ہے۔

نوح علیہ السلام کا نام

لفظ نوح کا مادّہ نہ عربی زبان میں ملتا ہے اور نہ عبرانی یا سریانی میں، اس کا مادہ (मूल धातु) سنسکرت زبان میں موجود ہے، سنسکرت میں نُہ नु का مطلب ہے کشتی یا بحری جہاز (دیکھیں سَر ولیم مونیر کی سنسکرت انگلش ڈکشنری) جس سے لفظ نیوح न्यूह یعنی 'کشتی والا' بنا، نوح اسی کا معرب ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیشتر ساتھیوں کا مستقر بابل کا علاقہ بنا؛ لیکن غالبًا ان کے ہمراہیوں میں سے سات لوگ ہندوستان آئے جو یہاں کی روایات میں سَپت رشی کہلائے، سپت رشیوں کا تذکرہ کثرت سے ہندو مذہبی کتب میں ہے اور یہ مانا جاتا ہے کہ سیلابِ عظیم والے منو کے ساتھ کشتی پر صرف سپت رشی تھے، ہندوستان میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پہلے انبیاء کی تعلیمات انھیں سپت رشیوں کی معرفت دوبارہ ہندوستان پہنچی ہوں گی۔

وید میں وَیوَسْوَت वैवस्वत मनु (سیلابِ عظیم والے منو)

جن وید منتروں میں سیلاب یا سیلاب والے منو کا ذکر ہے وہ نمایاں طور پر بہت بعد کے زمانے کے ہیں، اس سے یہ واضح ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے نام سے تعلق تو ہندوستانی اقوام نے باقی رکھا؛ لیکن بعد از سیلاب کسی کلامِ الٰہی کا وید میں ہونے کا امکان نہیں محسوس ہوتا :

आ सूर्यो अरूहच्छुक्रमर्णोघ्युक्त यद्धरितो वीतपृष्ठाः। उद्ना न नावमनयन्त धीरा आशृण्वतीरापो अर्वागतिष्ठन्।।10 धियं वो अप्सु दधिषे स्वर्षा ययातरन्दश मासो नवग्वाः। अया धिया स्याम देवगोपा अया धिया तुतुर्यामात्यंहः।।11 (ऋग्वेद 5:45:10–11)

جب چمکتا ہوا سورج سیلاب کی اتری ہوئی سطح پر سوار ہوا تو عقلمند فرماں بردار لوگ پانی پر تیرتی ناؤ سے سیلاب کے بعد اترے، خدا کے جس دھیان کے ذریعہ کشتی کے مسافر دس مہینے میں پار ہوئے اسی دھیان کو اپناتے ہوئے خدا ہماری حفاظت کرے، اسی دھیان کو اپناتے ہوئے ہم ہر آفت سے خیریت سے گزریں۔ (رگ وید: ۵:۴۵:۱۰-۱۱)

यत्र नावप्रभ्रंशनं यत्र हिमवतः शिरः। तत्रामृतस्य चक्षणं ततः कुष्ठों अजायत। स कुष्ठो विश्वभेषजः साकं सोमेन तिष्ठति। तक्मानं सर्वं नाशय सर्वाश्च यातुधान्यः।। 8 यं त्वा वेद पूर्व इक्ष्वाको यं वा त्वा कुष्ठ काम्यः। यं वा वसो यमात्स्यस्तेनासि विश्वभेषजः।। 9 (अर्थ्व वेद 19:39:8.9)

جہاں کشتی غائب ہوئی، جہاں برفیلی چوٹی ہے وہاں کُشٹ (بُوٹی) پیدا ہوئی، ہر مرض کو دور کرنے والی وہ کشٹ سوم کے ساتھ ملائی جاتی ہے، ہر جادو ٹونے اور چڑیل کے اثر کو دور کرو، (اے کشٹ) تم جسے اِکْچھو اکو (इक्ष्वाकु سناتنی روایات کے مطابق اِکْچھو اکو سیلابِ عظیم والے منو کے بیٹے کا نام تھا) سے پہلوں نے جانا یا کشٹ کی تمنا کرنے والوں نے یا جسے بسنے والوں یا ہر سمت سفر کر جانے والوں نے جانا، تم ہر مرض کا علاج ہو۔ (اتھروید: ۱۹:۳۹:۸-۹)

तस्या मनुर्वैवस्वतो वत्स आसीत् पृथिवी पात्रम्।। 10 तां पृथी वैन्योऽधोक् तां कृषि च सस्यं चाधोक्।। 11 ते कृषि चं मनुष्या 3

उपजीवन्ति... ।। 12 (अथर्ववेद 8:10–4:10,11,12)

منو ویوسوت اس (عظیم قوت) کا لاڈلا تھا اور زمین اس کا برتن (مخلوق اور اس کی ضروریات کو رکھنے کی جگہ)، اس (زمین) کو پیارے وین (؟) نے استعمال کیا اور اس (زمین) سے کھیتی اور پیداوار کو استعمال کیا، اس کھیتی اور پیداوار سے انسان اپنی گزربسر کرتے ہیں۔ (اتھروید: ۸:۱۰-۴:۱۰،۱۱،۱۲)

بھوشیہ پُران میں حضرت نوح علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کی طرح بھوشیہ پران میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ بھی ان کے ہندوستانی روایتی لقب منو کے بجائے ان کے اصل نام سے ہے، فرق صرف مختلف زبانوں کے تلفظ کا ہے، بھوشیہ پران میں انھیں سنسکرت متن میں نُیوح (न्यूह) کہا گیا ہے:

तस्माज्जातः सुतो न्यूहो निर्गतस्तूह एव सः। तस्मान्न्यूहः स्मृतः प्राज्ञै राज्यं पञ्चशतं .तम्।। (भविष्य पुराण, प्रतिसर्ग पर्व, खण्ड 1,4:45)

اس سے نیوح نام کا لڑکا پیدا ہوا، اس کو نیوح نام سے ہی یاد کیا گیا، اس نے ۵۰۰ سال تک راج کیا۔ (بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو پہلا کھنڈ، ۴:۴۵)

एकदा भगवान्विष्णुस्तत्स्वप्ने तु समागतः।। 47 वत्स न्यूह श्रृणुष्वेदं प्रलयः सप्तमेऽह्नि। भविता त्वं जनैस्सार्धं नावमारुह्य सत्वरम्।। 48 जीवनं कुरू भक्तेन्द्र सर्वश्रेष्ठो भविष्यसि। तथेति मत्वा स मुनिर्नावं .त्वा सुपुष्टिताम्।। 49 हस्तत्रिशतलम्बां च पञ्चाशद्धस्तविस्तृताम्। त्रिंशद्धस्तोच्छ्रितां रम्यां सर्वजीवसमन्विताम्।। 50 आरूह्य स्वकुलैस्सार्द्धं विष्णुध्यानपरोऽभवत्। सांवर्तको मेघगणो महेन्द्रेण समन्वितः।। 51 चत्वारिंशद्दिनान्येव महावृष्टिमकारयत्। सर्वं तु भारतं वर्षं जलैः प्लाव्य तु सिन्धवः।। 52 चत्वारो मिलिताः सर्वे विशालायां न चागताः । अष्टाशीतिसहस्त्राणि मुनयो ब्रह्मवादिनः।। 53 न्यूहश्च स्वकुलैस्सार्धं शेषास्सर्वे विनाशिताः। तदा च मुनयस्सर्वे विष्णुमायां प्रतुष्टुवुः।। 54

ایک بار بھگوان وشنو اس کے خواب میں آئے اور خواب میں ہی وشنو نے کہا: اے لاڈلے نیوح میری یہ بات غور سے سن لو، آج سے ساتویں دن قیامت ہوگی، تم لوگوں کے ساتھ

جلد ہی کشتی میں سوار ہو کر زندگی کی حفاظت کرنا، اے اندر کے بھکت، تم سب سے بہتر ہو جاؤ گے، اس خواب میں دیے گئے حکم کی تعمیل میں اس نے ایک بہت مضبوط کشتی بنائی جو تین سو ہاتھ لمبی، اور پچاس ہاتھ چوڑی تھی، وہ تیس ہاتھ اونچی بہت کارآمد تھی، اور سبھی جاندار اس میں تھے، اس کشتی میں اپنے گھر والوں کے ساتھ وہ سوار ہو گیا، سانورتک نامی بادلوں کے غول نے عظیم اندر کے ساتھ چالیس دن تک اتنی زبردست بارش برسائی کہ چاروں سمندروں کا پانی آپس میں مل گیا اور یہ سارا بھارت پانی سے بھر گیا؛ لیکن اس وسیع (کشتی) میں (سیلاب کا پانی) نہیں آیا...... اور نیوح اپنے گھر والوں کے ساتھ وہاں تھا باقی سب ہلاک ہو گئے۔ (بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ: ۴: ۴۷-۵۴)

अब्दान्तरे मही सर्वा स्थली भूत्वा प्र.श्यते। आराच्च शिषिणा नाम हिमाद्रेस्तटभूमयः ।। 59 न्यूहस्तत्र स्थितो नावमारुह्य स्वकुलैस्सह। जलान्ते भूमिमागत्य तत्र वासं करोति सः ।। 60

ایک سال کے اندر (پانی اترنے کے بعد) ساری زمین کی سطح دکھائی دینے لگی، جلد ہی برفیلے پہاڑ کی وادی میں شِشِنا نام کا ایک مقام ہے، وہاں گھر والوں کے ساتھ کشتی لے کر اسی مقام پر ٹھہرے تھے، سیلاب کے ختم ہونے پر وہ زمین پر اتر آیا اور وہاں اس نے رہائش اختیار کی۔ (بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ: ۴: ۵۹-۶۰)

دیگر پُرانوں میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ

بھوشیہ پران کے علاوہ دیگر بہت سے پرانوں میں کشتی میں سوار ہو کر سیلابِ عظیم سے پار ہونی والی شخصیت کو ۱۴ میں سے ایک منو بتایا گیا ہے، پرانوں کے علاوہ شت پتھ براہمن اور مہا بھارت میں یہ قصہ ملتا ہے، ان سب میں اس واقعہ کو متسیہ اوتار मत्स्य अवतार کے دیو مالا سے منسلک کیا گیا ہے، ویوسوت منو کے گلاس میں پانی لیتے ہوئے ایک چھوٹی سی مچھلی آ گئی، وہ مچھلی کو لے آئے، مچھلی بڑی ہوتی رہی اور اس کی فرمائش پر منو اس کو بڑے برتنوں میں منتقل کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اتنی بڑی ہو گئی کہ اسے سمندر میں ڈالنا پڑا، مچھلی کی شکل میں دراصل وہ متسیہ اوتار تھے جو برے لوگوں کا خاتمہ اور دھرم کو دوبارا قائم کرنے دنیا میں آئے تھے، انھوں نے منو سے کشتی بنانے کو کہا اجب سیلاب آیا تو اس دیو قامت مچھلی یا متسیہ اوتار کے کہنے پر منو نے کشتی کو رسہ سے باندھ کر اس کا ایک سرا مچھلی کے سینگ میں پھنسا دیا تھا، سیلاب اترنے کے بعد متسیہ اوتار چلے گئے۔

شت پتھ براہمن तपथ ब्राहमन میں منو کا واقعہ

(متسیہ اوتار نے منو سے کہا)......تمام جانداروں کو ایک سیلاب بہا لے جائے گا......تم میری ہدایت کے مطابق ایک کشتی بناؤ گے اور جب سیلاب آئے تو تم کشتی میں داخل ہو جانا میں تمہاری سیلاب سے حفاظت کروں گا ......اس نے ایک کشتی بنائی اور جب سیلاب آیا تو وہ اس میں داخل ہو گیا......اور اس طرح وہ کشتی میں شمال کے پہاڑوں پر پہنچا......ہدایت کے مطابق وہ (سیلاب اترنے کے بعد) آہستہ آہستہ پہاڑ سے اترا......سیلاب سبھی جانداروں کو بہا لے گیا اور صرف منو وہاں رہ گیا۔(شت پتھ براہمن ۱:۸:۱:۱-۶)

مہابھارت

25 भगवन .ता हि मे रक्षा तवया सर्वा विशेषतः। पराप्तकालं तु यत कार्यं तवया तच छरूयतां मम।। 26 अचिराद भगवन भौमम इदं सथावरजङ्गमम। सर्वम एव महाभाग परलयं वै गमिष्यति।। 27 संप्रक्षालन कालो घ्यं लोकानां समुपस्थितः। तस्मात तवां बोधयाम्य अध तत ते हितम अनुत्तमम।। 28 तरसानां सथावराणां च यच चेङ्गं यच नेङ्गति। तस्य सर्वस्य संप्राप्तः कालः परमदारुणः।। 29 नौश च कारयितव्या ते दृढा युक्तवटाकरा। तत्र सप्तर्षिभिः सार्धम आरुहेथा महामुने।। 30 बीजानि चैव सर्वाणि यथोक्तनि मया पुरा। तस्याम आरोहयेर नावि सुसंगुप्तानि भागशः।। 31 नौस्थश च मां परतीक्षेथास तदा मुनिजनप्रिय। आगमिष्याम्य अहं शृङ्गी विज़ेयस तेन तापस।। 32 एवम एत तवया कार्यम आपृष्टो घसि वरजाम्य अहम। नतिशङ्क्यम इदं चापि वचनं ते ममाभिभो।। 33 एवं करिष्य इति तं स मत्स्यं परत्यभाषत। जग्मतुश च यथाकामम अनुज़ाप्य परस्परम।। 34 ततो मनुर महाराज यथोक्तं मत्यकेन ह। बीजान्य आदाय सर्वाणि सागरं पुप्लुवे तदा। नावा तु शुभया वीर महोर्मिणम अरिंदम।। 35 चिन्तयाम आस च मनुस तं मत्स्यं पृथिवीपते। स च तच चिन्तितं जज्ञात्वा मत्स्यः परपुरंजय। शृङ्गी तत्राजगामाशु तदा भरतसत्तम।। 36 तं दृष्ट्वा

मनुजेन्द्रेन्द्र मनुर मत्स्यं जलार्णवे। शृङ्गिणं तं यथोक्तेन रूपेणाद्रिम इवोच्छ्रितम।। 37 वटाकरमयं पाशम अथ मत्स्यस्य मूधनि। मनुर मनुजशार्दूल तस्मिन्त्र शृङ्गे नयवेशयत।। 38 संयतस तेन पाशेन मत्स्यः परपुरंजय। वेगेन महता नावं पराकर्षल लवणाम्भसि।।39 स ततार तया नावा समुद्रं मनुजेश्वर। नृत्यमानम इवोर्मीभिर गर्जमानम इवाम्भसा।। 40 कषोभ्यमाणा महावातैः सा नौस तस्मिन महोदधौ। धूर्णते चपलेव सत्री मत्ता परपुरंजय।। 41 नैव भूमिर न च दिशः परदिशो वा चकाशिरे। र्सवम आम्भसम एवासीत खं दयौश च नरपुंगव।। 42 एवं भूते तदा लोके संकुले भरतर्षभ। अदृश्यन्त सप्तर्षयो मनुर मत्स्यः सहैव ह।। 43 एवं बहून वर्षगणांस तां नावं सो घ्थ मत्स्यकः। चकर्षातन्द्रितो राजंस तस्मिन सलिलसंचये।। 44 ततो हिमवतः शृङ्गं यत परं पुरुषर्षभ। तत्राकर्षत ततो नावं स मत्स्यः कुरुनन्दन।। 45 ततो घ्बरवीत तदा मत्स्यस तान ऋषीन परहसन्त्र शनैः। अस्मिन हिमवतः शृङ्गे नावं बध्नीत माचिरम।। 46 सा बद्धा तत्र तैस तूर्णम ऋषिभिर भरतर्षभ। नौर मत्स्यस्य वचो शरुत्वा शृङ्गे हिमवतस तदा।। 47 तच च नौबन्धनं नाम शृङ्गं हिमवतः परम। खयातम अद्यापि कौन्तेय तद विद्धि भरतर्षभे।। (महाभारत, वन पर्व, 186:25–47)

(متسیہ اوتار نے منو سے کہا)……اب میری بات غور سے سنو کہ وقت آنے پر تمہیں کیا کرنا ہے، اے خوش قسمت اور عبادت گزار انسان! اس دنیا کا خاتمہ قریب ہے، اس دنیا کی اصلاح کا موزوں وقت اب آپہنچا ہے، اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے لئے کیا بہتر ہے، اس دیا میں جتنی حرکت کرنے والی اور حرکت نہ کرنے والی مخلوقات ہیں ان کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے، تمہیں ایک بہت بڑی کشتی بنانی ہے اور اس میں ایک لمبا رسّہ بھی رکھنا، اے عظیم منو اس وقت تم سپت رشیوں सप्तऋषियों کے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو جانا اور اس میں دوبارا تخلیق کے لئے تمام بیج رکھ لینا اور ان کی حفاظت کرنا،……طوفانی سمندروں میں اس نے اپنا جہاز اتارا……سمندری طوفان کے موجوں میں وہ جہاز کسی نشہ باز کی مانند ڈول رہا تھا اور زمین کے کناروں کا کہیں کوئی نشان نہ تھا، ہر سمت پانی تھا اور پانی سے زمین و آسمان بھر گئے تھے، پانی کے علاوہ صرف

منو، سات رشی اور متسیہ اوتار کا وجود نظر آتا تھا، متسیہ اوتار نے کشتی کو برفیلے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچا دیا اور کشتی والوں سے پہاڑ کی چوٹی سے اسے باندھ دینے کو کہا، انھوں نے کشتی کو پہاڑ کی چوٹی سے باندھ دیا اور برفیلے پہاڑ کی وہ چوٹی آج بھی نوبندھن کہلاتی ہے۔ (مہابھارت، وَن پرؤ: ۱۸۶: ۴۵-۴۷)

منو کو وید دیئے گئے

منو اور سیلاب کا یہ واقعہ کم و بیش انھیں تفصیلات کے ساتھ پدم پران (اتّر کھنڈ ادھیائے: ۷)، سریمد بھاگوت پران (اسکند: ۸، ادھیائے: ۵)، وَراہ پران (پہلا کھنڈ، ادھیائے: ۵)، اگنی پران (پہلا کھنڈ، پہلا ادھیائے) اور متسیہ پران (پہلا اور دوسرا ادھیائے) میں مذکور ہوا ہے، ان میں سے دو پرانوں وراہ اور اگنی پران میں ویدوں کی سیلاب سے حفاظت اور متسیہ پران میں منو کو خطاب کرتے ہوئے سیلاب کے بعد وید کے نفاذ کی بات بھی کہی گئی ہے، متسیہ پران کا حوالہ درج ذیل ہے :

......एवमेकाणे जाते चाक्षुषान्तरसंक्षये ।। वेदान् प्रवर्तयिष्यामि त्वतर्गादौ महीपते ।.... (मत्स्य पुराण 2:14—15)

اے زمین کے محافظ 'چاکشش منونتر' کے دورِ قیامت میں جب ساری زمین ایک سیلاب میں غرق ہو جائے گی اور تمہارے ذریعہ مخلوق کی دوبارہ ابتدا ہوگی تب میں ویدوں کو نافذ کروں گا۔ (متسیہ پران: ۲: ۱۴-۱۵)

حضرت آدم علیہ السلام و نوح علیہ السلام سے متعلق گزشتہ مندرجات کا خلاصہ

حضرت آدم و حضرت نوح علیہما السلام سے متعلق اب تک کے مندرجات کا خلاصہ درج ذیل ہے :

- وید میں سب سے پہلا علم تمام ناموں کا علم 'الاسماء کلھا' بتایا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ پہلے انسان کو دیا گیا۔
- وید میں پہلے انسان کے لئے دنیا میں آنے سے پہلے فرشتوں کے سجدے کا تذکرہ ہے۔
- وید میں سب انسانوں کو منو کی اولاد کہا گیا ہے۔
- جس پہلے انسان کے ماں باپ نہیں تھے انھیں پرانوں میں سویم بھو منو اور ان کی بیوی کو شت روپا کہا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ تمام انسان ان دونوں کی نسل سے ہیں۔
- بھوشیہ پران میں ان دونوں کا نام آدم اور حویہ وتی بتایا گیا ہے اور ان کے جنت میں رہنے اور شیطان کے بہکائے میں آکر شجر ممنوعہ چکھنے کا بیان ہے۔

⊙ بہت سی اسلامی روایات حضرت آدم علیہ السلام کا ہندوستان میں اتارا جانا بیان کرتی ہیں۔
⊙ لفظ آدم سنسکرت اصل کا ہے۔
⊙ قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم انھیں بتایا گیا ہے جن میں چھوت چھات اور نسلی طبقاتی نظام رائج تھا۔
⊙ حضرت نوح علیہ السلام کی جو تمثیلی زبان قرآن میں نقل کی گئی ہے اسے اگر لفظی معنوں میں لیا جائے تو آواگون جیسا عقیدہ بنایا جا سکتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم وہ ہو سکتی ہے جس نے اصل تعلیمات کو مسخ کر کے آواگون کا عقیدہ بنالیا۔
⊙ قومِ نوح کا اصل جرم مورتی پوجا تھا، ان کے چار بتوں کے جو نام قرآن نے بتائے ہیں وہ ہندوستانی اقوام کے دیوتاؤں سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔
⊙ قرآن نے طوفانِ نوح کی ابتدا کے مقام کا جو نام بتایا ہے اس نام کا مقام دنیا میں صرف ہندوستان میں ساحلِ سمندر پر ہے۔
⊙ وید اور پران طوفانِ نوح کا تذکرہ کرتے ہیں، اور حضرت نوح کو ویوسوت منو کہتے ہیں۔
⊙ وید اور بیشتر پرانوں نے طوفان کی جس مرکزی شخصیت کو ویوسوت منو کہا ہے، بھوشیہ پران نے اسی تفصیل سے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس شخصیت کا نام 'نیوح' بتاتا ہے جس کے بعد اسے محض قیاس نہیں کہا جا سکتا کہ سناتنی مذہبی کتب کے منو ویوسوت ہی کا اصل نام 'نیوح' تھا، اور اگر ان کتب کے ساتویں منو نوح ہیں تو پہلے منو کے آدم ہونے کی بات مضبوط تر ہو جاتی ہے۔
⊙ لفظ نوح کا مادّہ عربی، عبرانی یا سریانی کے بجائے سنسکرت میں ملتا ہے۔
⊙ وید اور پرانوں کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعد از طوفانِ نوح، حضرت نوح علیہ السلام نے ہندوستان کے علاوہ کسی اور خطہ کو اپنا مرکز بنایا، پرانوں کے مطابق وہ پانچ سو سال ہندوستان میں رہے۔
⊙ پرانوں میں سیلاب کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کو وید دوبارہ دیے جانے کا بیان ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پران وید کو حضرت نوح علیہ السلام کا کلام مانتے ہیں۔
⊙ قرآن میں جس چوٹی پر سیلاب کے بعد کشتیِ نوح کا ٹھہرنا مذکور ہے اس کا نام جودی ہے اور جودی نام کی چوٹی ایران میں موجود ہے، مہابھارت جس مقام پر کشتی کا مستقر بتاتا ہے وہ بھی ایران میں ہے۔

حضرت آدم ونوح کی درمیانی مدت کے انبیاء علیہم السلام

گزشتہ صفحات میں ہندو مذہبی کتب کے چودہ میں سے پہلے اور ساتویں منو، سویم بھومنو اور ویوسوت منو کے بارے میں یہ تفصیلات گزر چکیں کہ یہ دونوں ہندوستانی روایات میں آدم علیہ السلام و نوح علیہ السلام کے نام ہیں، اگر یہ درست ہو تو ظاہر ہے کہ درمیانی پانچ منو بھی کوئی نبی رہے ہوں گے، اگر ان دونوں برگزیدہ شخصیات کا تعلق ہندوستان سے تھا تو سنت اللہ کے مطابق ان کے درمیانی وقفہ کے انبیاء بھی ہندوستانی رہے ہوں گے، قرآن کریم میں جن انبیاء کرام کا نام سے ذکر ہے، روایات کے مطابق ان میں سے حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس درمیانی وقفہ میں مبعوث ہوئے تھے، کیا ان دونوں ناموں کی مطابقت منو نمبر ۲ سے منو نمبر ۶ تک کسی کے حالات سے ہے، یہ تحقیق کا موضوع ہے، قرآن سے ہمیں حضرت شیث علیہ السلام یا حضرت ادریس علیہ السلام کی زندگیوں کی تفصیلات نہیں ملتیں، روایات بیشتر ابن اسحاق، ابن اثیر یا طبری کی تواریخ سے ملی ہیں جو زیادہ مستند نہیں ہیں، حتمی طور پر تو یہ بھی ثابت نہیں ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک لازماً حضرت آدم علیہ السلام ونوح علیہ السلام کی درمیانی کڑی تھے، مستند حالاتِ زندگی کے نہ پائے جانے کے باعث ان کا ہندو دیو مالائی روایات میں بعض قابل قبول اجزا چھانٹ کر ان سے ان کا تقابل کرنا تقریباً ناممکن ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے منو کے نام 'سواروچش' स्वारोचिष اور شیث میں کافی صوتی مماثلت ہے۔

کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' کے حوالے

اس مقالے میں حضرت نوح علیہ السلام کے ہندوستان سے تعلق کے اب تک جو ثبوت پیش کئے گئے ہیں وہ راقم الحروف کی تحریر کردہ کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' میں اسی موضوع پر پیش کئے جا چکے ثبوتوں پر مستزاد ہیں، قارئین اور محققین حضرات کی سہولت کے لئے مذکورہ کتاب کے متعلقہ اجزا یہاں نقل کیے جا رہے ہیں۔

وہ کون سی قوم ہو سکتی ہے؟

اب آیئے اس قوم کی تلاش کی طرف جسے پروردگار عالم قوموں کی امامت کے منصب پر فائز کرنا چاہتا ہے، اگر اللہ اور اس کے رسول نے تبدیلی کی خبر اور وقت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے تو یقیناً اس قوم کی نشاندہی بھی کی ہوگی، تبدیلی قوم کی جن آیات کے تراجم اوپر نقل کئے جا چکے ہیں، ان کی مختلف تفاسیر پر نظر ڈالیں۔

سورۃ محمد آیت ۳۸ کے ذیل میں عبد الرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور بیہقی

نے حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا، حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ...... ''اور اگر تم پیٹھ پھیرو گے'' ...... تو صحابہ ؓ نے پوچھا ''یا رسول اللہ ﷺ آخر یہ کون لوگ ہیں جو اس وقت ہماری جگہ بدل کر آئیں گے جبکہ ہم نے پیٹھ پھیر دی ہو، اور مزید یہ کہ وہ ہم جیسے نہ ہوں گے''، تب حضور ﷺ نے حضرت سلمان ؓ کے کندھے پر تھپکی دی اور فرمایا: ''یہ ہے وہ اور اس کی قوم ہے وہ، اور قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر ایمان ثریا پر چلا جائے گا تو فارس کے یہ لوگ وہاں تک اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ جائیں گے''۔(۱)

سورۃ جمعہ آیت ۳ کے ضمن میں بھی اسی مضمون کی روایت بخاری میں آئی ہے، سورۃ مائدہ کی آیت ۵۴ کے ذیل میں تفسیر فتح القدیر میں ہمیں جو روایات ملی ہیں ان کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

⊙ ابن جریر نے شریح بن عبید سے روایت کی ہے انھوں نے کہا کہ جب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی تو حضرت عمر ؓ نے سوال کیا، ''یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں اور میری قوم مراد ہے؟'' فرمایا: ''نہیں بلکہ یہ شخص اور اس کی قوم''، یعنی ابوموسیٰ اشعری ؓ۔

⊙ عیاض الاشعری سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ شخص اور اس کی قوم'' (اس حدیث کو ابن سعد، ابن ابی شیبہ نے اپنی مسند میں، عبد بن حمید، ترمذی اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح حدیث قرار دیا ہے)۔

⊙ حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کے سامنے یہ آیت تلاوت کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوموسیٰ اشعری یہ تیری قوم ہے، یمن کی قوم!'' (اس حدیث کو ابو الشیخ، ابن مردویہ، شعبہ، بیہقی، ابن عساکر اور حاکم نے اپنی جمع میں نقل کیا ہے)۔

⊙ حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ اس آیت پر فرمایا: ''وہ اہل یمن کی قوم میں سے ہیں'' (اس روایت کو ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور بخاری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔(۲)

سورۃ توبہ آیت ۳۹ کے ذیل میں تفسیر فتح القدیر جلد دوم ص ۳۴۵ پر علامہ شوکانی لکھتے ہیں: ''اور اس پر اختلاف رائے ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، چنانچہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ یمن والے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ فارس والے ہیں اور دلیل کے بغیر اس جگہ کے تعین کی کوئی شکل نہیں ہے''۔

اب آپ غور فرمائیں کہ کیا (نعوذ باللہ) اللہ کے سچے رسول ﷺ مختلف موقعوں پر مختلف صحابہ ؓ سے الگ الگ قسم کی متضاد باتیں کہہ سکتے تھے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ان کے منہ پر اہل فارس (ایران) کو بتا دیا

(۱) تفسیر فتح القدیر: ۴۱/۵۔ (۲) بحوالہ فتح القدیر: ۴۹-۵۰۔

اور حضرت موسیٰ اشعری ؓ جو یمن کے رہنے والے تھے، ان کے سامنے اہل یمن کہہ دیا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے (اور آپ ﷺ کی زبان پر ہمیشہ حق بولتا تھا) تو پھر ہمیں ان دو بظاہر متضاد قسم کی روایات میں تطبیق ڈھونڈنا پڑے گی، دنیا میں صرف ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں یہ دونوں قومیں اکٹھی ہوگئی ہیں، اہل فارس (ایرانی) آرین نسل کے لوگ تھے اور شمالی ہندوستان میں آرین نسل کے لوگ آکر آباد ہوئے، جنوبی ہندوستان کے دراوڑ نسل کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد یمن میں آباد تھی، بدھ مت کو ماننے والی سندھی قومیں: مید سبا بجہ، سیابجہ اور احامرہ نامی قومیں بھی یمن میں آباد تھیں، (۱) اور وہاں آج بھی ہندوستانی تہذیب کی زبردست چھاپ ہے، ہند، ہندہ، شیام یا شام، ریام نامی عظیم الشان قلعے وہاں موجود ہیں۔ (۲)

ان دونوں نسلوں کا ایک ہی ملک ہند میں اکٹھا ہونا بھی ناظمِ کائنات کے نظم انتظام کا ایک نمونہ ہے تاکہ اس کے رسول کی اُس وقت بظاہر متضاد پیشین گوئیاں یہاں سچی ثابت ہوسکیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اہل ایران اور ان کے ہمدرد صرف حضرت سلمان فارسی ؓ سے متعلق روایات کو لے کر موجودہ ایرانی انقلاب کا ذکر کرتے ہیں ہم ان کے بارے میں خوش گمانی رکھتے ہوئے صرف اتنا کہہ سکتے ہیں، حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے متعلق روایات پر ان کی نظر نہیں پڑسکی ہوگی جو جاٹوں کے اوّلین قبولِ اسلام میں بھی عہد آفریں تاریخی رول ادا کرچکے ہیں۔ (۳)

مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفے کے سب سے بڑے علمبردار تھے اپنی کتاب، (۴) میں سورۂ جمعہ کی آیت ۳ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> ...... ہمارے نزدیک ''آخرین منھم'' کے مصداق اہل ایران، ہندوستان والے اور اس ضمن میں جو ان کے ساتھ شامل ہوں......۔

یہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک پیشین گوئی بھی سنتے چلیں:

> اور جس بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ کہ اگر مثلاً ہندوؤں کا ہندوستان کے ملک پر تسلّط محکم اور ہر پہلو کے اعتبار سے ہو جب بھی اللہ کی حکمت کی رو سے یہ واجب اور ضروری ہے کہ

---

(۱) رسالہ معارف، اعظم گڈھ: ۸۹/۵۔

(۲) سیرت النبی، از: مولانا شبلی حصہ اول: ۱۱۵-۱۱۶۔

(۳) جاٹوں کی اسلامی تاریخ، از: مہربان علی بڑوتوی: ۸۹۔

(۴) شاہ ولی اللہؒ اور ان کا فلسفہ، مطبوعہ: ہندسا گرا کاڈمی، لاہور: ۱۱۶۔

ہندوؤں کے سرداروں اور لیڈروں کے دل میں یہ الہام کرے کہ وہ دین اسلام کو اپنا
مذہب بنالیں۔(۱)

شاہ صاحب کی مغلوں کے دور میں کی گئی پیشین گوئی کا پہلا جز پورا ہو چکا ہے، یعنی ہندوستان پر عملاً ہندوؤں کا تسلّط محکم ہو چکا ہے، انشاء اللہ اس پیشین گوئی کا اگلا حصہ یعنی اس قوم کا قبولِ اسلام بھی ضرور پورا ہوگا۔(۲)

حضرت نوح کی اُمت کا نبی بھی کھویا ہوا ہے!

ہندو قوم رامائن اور مہابھارت کو انسانوں کی لکھی ہوئی کتابیں تسلیم کرتی ہے؛ لیکن ویدوں کے بارے میں ان کے سوادِ اعظم کا عقیدہ ہے کہ یہ کلامِ الٰہی ہیں، اس کے باوجودہ وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ کس رسول کے ذریعہ دنیا میں آئے، اپنے نبی کو انھوں نے دیو مالاؤں میں گم کردیا، دنیا کی ہر مذہبی قوم کسی نہ کسی شخصیت کو اپنی مذہبی کتب سے منسوب نبی مانتی ہے؛ لیکن ہندو قوم وہ واحد مذہبی قوم ہے جس کا اصل نبی کھویا ہوا ہے، اس حقیقت پر نظر رکھیں اور بخاری شریف کی مندرجہ ذیل حدیث پر غور کریں :

''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا (کہ کیا انھوں نے اپنی امت کو احکامِ خداوندی) پہنچائے تھے؟ وہ عرض کریں گے، ''بے شک اے میرے پروردگار،'' پھر حضرت نوح علیہ السلام کی اُمت سے پوچھا جائے گا کہ کیا (نوح علیہ السلام نے) تم تک ہمارے احکام پہنچائے تھے؟ وہ لوگ انکار کریں گے اور کہیں گے ''ہمارے پاس تو کوئی بھی ڈرانے والا نہیں آیا تھا،'' اور پھر (حضرت نوح علیہ السلام سے) پوچھا جائے گا،'' تمہارے گواہ کون ہیں؟'' اور وہ کہیں گے ''میرے گواہ حضرت محمد ﷺ اور ان کی اُمت کے لوگ ہیں،'' اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تب تمہیں پیش کیا جائے گا اور تم یہ گواہی دو گے کہ (حضرت نوح علیہ السلام نے احکام) پہنچائے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ (البقرۃ:۱۴۳)(۳)

اب ذرا غور فرمائیں، ایک طرف تو حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی امت اپنے رسول کو پہچاننے سے انکار کردے گی، اور دوسری طرف ہم یہ جانتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں صرف ہندو قوم کا نبی کھویا ہوا ہے۔

(۱) الفرقان بریلی، شاہ ولی اللہؒ نمبر ۱۹۴۱ء، طبع دوم، ص: ۱۵۸۔

(۲) اگر اب بھی نہ جاگے تو......: ۲۵ تا ۲۸۔

(۳) بخاری، بحوالہ مشکوۃ، باب الحساب والقصاص والمیزان۔

پھر سوچیں، ایک طرف تو ہم جانتے ہیں کہ ہندو قوم تبدیل ہو کر اُمتِ محمدی بنے گی اور موجودہ اُمتِ محمدی کے افراد اس تبدیلی کا ذریعہ بنیں گے اور دوسری طرف حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح کے اپنے نبی کو پہچاننے سے انکار کے بعد اُمتِ محمدی گواہی دے گی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو احکام خداوندی پہنچائے تھے، یعنی گواہی دینے والی اُمت محمدی کے افراد حضرت نوح علیہ السلام کی امت کو اور ان سے حضرت نوح علیہ السلام کے رشتہ کو پہچانتے ہوں گے، کیا یہ واضح دلیل اس بات کی نہیں محسوس ہوتی کہ موجودہ ہندو قوم حضرت نوح علیہ السلام کی اُمت ہے۔

ہندو قوم قومِ نوح ہے

ویسے بھی ویدک دھرم دنیا کے تمام مذاہب میں متفقہ طور پر سب سے پرانا مذہب ہے اور حضرت نوح علیہ السلام دنیا کے سب سے پہلے صاحبِ شریعت رسول تھے۔

لیکن ابھی یقین کرنے سے پہلے خود ویدک دھرم سے معلوم کرنا بھی ضروری ہے، ابھی ہم چاہے ہندو قوم کے اس دعوے کو تسلیم نہ کریں کہ وید کلام الٰہی ہیں؛ لیکن یہ تو دیکھیں کہ یہ کتابیں جن کو ہندو قوم کلامِ الٰہی قرار دیتی ہے اپنا نبی کون سا بتاتی ہیں؟ فرانسیسی مصنف ڈیوبائیس (A.J.A.Dubios) جس نے چالیس سال تک ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ کیا اور ہندو مذہبی رسم ورواج پر آج تک کی سب سے مستند اور ضخیم کتاب ہندو شعائر مراسم ومناسک (Hindu Manners, Customs & Ceremonies) لکھی اس نے اپنی کتاب میں جو حقیقتیں بیان کی ہیں وہ شاید قارئین کی دل چسپی کا سبب بنے بغیر نہیں رہ سکیں گی :

"...... مختصر یہ کہ ایک مشہور شخصیت جس سے ہندوؤں کو بہت عقیدت ہے اور جسے وہ مہانووُو (Mahanuvu) کے نام سے جانتے ہیں، (سیلاب کی) تباہی سے ایک کشتی کے ذریعہ بچ نکلی جس میں سات مشہور رشی بھی سوار تھے...... مہا نوو دو الفاظ کا مرکب ہے، مہا کے معنی عظیم اور نوو بلا شک وشبہ (حضرت) نوح علیہ السلام ہی ہیں......"۔(۱)

"عملاً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان اس سیلاب عظیم کے فوراً بعد آباد ہوا تھا، جس نے پوری دنیا کو ویران کردیا تھا......"۔(۲)

"...... مارکنڈیہ پران اور بھاگوت میں اس کا بہت واضح بیان ہے کہ اس حادثہ میں تمام نسلِ انسانی ختم ہوگئی تھی سوائے سات مشہور عبادت گزار رشیوں کے جن کا میں نے بہت سے مقامات پر ذکر کیا ہے، یہ سات رِشی ایک

(۱) Hindu Manners, Customs & Ceremonies P:48.

(۲) Hindu Manners, Customs & Ceremonies P:100.

کشتی پر بیٹھ کر عالمگیر تباہی سے بچ سکے تھے، اس کشتی کو وشنو (خدا) خود چلا رہا تھا، ایک اور عظیم شخصیت جو بچ جانے والوں میں تھی، وہ منو کی تھی جس کو میں نے دوسرے مقامات پر ثابت کیا ہے کہ (حضرت) نوح کے سوا کوئی نہیں تھی ...... جہاں تک مجھے علم ہے ان تمام مشرک اقوام میں کسی نے سیلاب کو اتنی تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے اور اس واقعہ کی تفصیلات حضرت موسیٰ کی (توریت میں) بیان کردہ تفصیلات سے کسی قوم کی تحریروں میں اتنی مماثلت نہیں رکھتیں جتنی کہ ان ہندو کتابوں میں ہے جن کا میں نے ذکر کیا ہے، یہ قابل ذکر بات ہے کہ یہ شہادت ہمیں اس قوم میں ملی ہے جس کے قدیم ہونے پر سب متفق ہیں، (۱) حضرت نوح علیہ السلام اور سیلاب نوح کے واقعات بہت تفصیل کے ساتھ بھوشیہ پران اور متسیہ پران میں بھی بیان ہوئے ہیں جن کے حوالے ہم آئندہ ابواب میں پیش کریں گے۔

منو کا لفظ بہت سی ہندو مذہبی شخصیات کے لئے استعمال ہوا ہے، (جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ...... بتایا گیا ہے منو کے بائیں حصے سے شت روپا یعنی حضرت حوا پیدا ہوئیں (۲)؛ لیکن پرانوں، ویدوں اور دیگر ہندو مذہبی کتب میں سب سے زیادہ تفصیل سے جس منو کا تذکرہ ہے وہ حضرت نوح ہی ہیں" ویدوں میں حضرت نوح کا ذکر منو کے نام سے ۷۵ مقامات پر آیا ہے"۔

ویدوں کا انگریز مفسر وید کے ایک منتر میں آنے والے لفظ منو کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے: "منو (نوح) لاجواب شخصیت اور انسانوں کے نمائندے تھے، تمام نسل انسانی کے باپ (سیلاب کے بعد آدمِ ثانی کی حیثیت سے) اور پہلی شریعت کے شروع کرنے والے تھے"۔ (۳)

نوٹ: ترجموں میں بین القوسین (بریکٹ کے درمیان) الفاظ ہمارے ہیں۔

پرانوں اور ویدوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی تفصیلات کے علاوہ ایک اور بہت اہم ثبوت اس قوم کے حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق ہونے کا ہم پیش کر رہے ہیں۔

اکثر اقوام کا اپنے انبیاء سے تعلق کا ایک مظہر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ان کے زمانے سے اپنا سال یا سن شمار کرتے ہیں، جیسے مسلمان اپنا سن ہجری حضرت محمد ﷺ کی ہجرت سے شمار کرتے ہیں، اور عیسائی اپنے سال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے گنتے ہیں، اسی طرح ہندو قوم اپنے اہم واقعات کے وقت کو حضرت نوح علیہ السلام سے گنتی ہے، اس کے لئے وہ حضرت نوح علیہ السلام کے سیلاب سے ہر ساٹھ سال کے وقفہ کو ایک اکائی یا ایک سال مانتے ہیں اور ان سالوں سے اپنے اہم واقعات کو شمار کرتے ہیں، ڈیوبائس اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتا ہے:

---

(۱) Hindu Manners, Customs & Ceremonics P 416-417.

(۲) رام چرت مانس، مفسر ہنومان پرشاد پوت دار مطبوعہ: گیتا پریس، گورکھپور ایڈیشن: ۱۵، ص: ۱۵۴، اور ہندو مذہب کی معلومات، از خواجہ حسن نظامی دہلوی، مطبوعہ حلقۂ مشائخ دہلی ایڈیشن ۲۰ دسمبر ۱۹۲۷ء، ص: ۶۔

(۳) گرفتھ کا یہ تشریحی نوٹ رگ وید ۱-۱۳-۴ کے ذیل میں ہے۔

''ہندوؤں کا موجودہ یگ کلیگ تقریباً اسی زمانے سے شروع ہوتا ہے جو سیلابِ نوح علیہ السلام کا زمانہ ہے، یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو وہ یادگار سمجھتے ہیں اور ان کے مصنفین اسے جل پرلیاون یا پانی کے سیلاب کا نام دیتے ہوئے اس کا وضاحت سے ذکر کرتے ہیں، اس موجودہ یگ کی تاریخ یقیناً 'جل پرلیاون' کے آغاز سے شروع ہوتی ہے......

......اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندو اپنی زندگی کے تمام اہم اور مشہور واقعات و معمولات اور اپنی تمام عوامی یادگاروں کی تاریخ یا سن کو ایک سیلاب کے خاتمہ سے شمار کرتے ہیں......سیلاب کے بعد ہر ساٹھ سال کا ایک سال مان کر ان سالوں سے اپنے تمام عوامی اور ذاتی واقعات کی مدت شمار کرتے ہیں، (۱) اس قوم کا حضرت نوح علیہ السلام (ان کی زبان میں منو) سے خصوصی تعلق ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی مذہبی کتب میں منو اسمرتی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

ہندو قوم کی مذہبی تاریخ اور مذہبی کتب کے حضرت نوح علیہ السلام سے خصوصی تعلق کی چند مثالیں یہاں پیش کی گئیں، قوم نوح علیہ السلام سے متعلق بخاری شریف کی جو حدیث اس باب کے شروع میں گزری اس میں ہم نے دیکھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی امت ان کو اپنے نبی کی حیثیت سے نہیں پہچانتی ہوگی اور ہم جان چکے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سے زبردست رشتہ موجود ہونے کے باوجود ہندو قوم بحیثیت مجموعی ان کو نہیں جانتی ہے، اسی حدیث سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ قیامت کے دن اُمت محمدی حضرت نوح علیہ السلام کے اپنی قوم میں پیغام پہنچانے کی گواہ بنے گی، اور ہمیں معلوم ہے کہ دیگر احادیث نے اس قوم کے اُمتِ محمدی بننے کی طرف اشارہ کیا ہے، ظاہر ہے ان تمام حقیقتوں کے آشکارا ہونے کے بعد اور اُمتِ محمدی میں شامل ہونے کے بعد وہی اس بات کی گواہی دیں گے؛ لیکن ان تمام ثبوتوں کے بعد بھی ابھی آخری اور مستند ترین گواہی باقی ہے، قرآن عظیم، آیئے دیکھیں :

قرآن کی گواہی

دنیا کی تمام قوموں کو دو طرح کی نسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، سامی نسلیں (Semetic races) اور غیر سامی قومیں (Non-Semetic races) غیر سامی قوموں میں آرین نسل آتی ہے اور سیمیٹک قوموں میں یہودی، بیشتر عیسائی اور جزیرہ نمائے عرب کے بنی اسماعیل۔

دنیا کی دو نسلوں میں تقسیم ہونے اور ان میں سے ایک نسل کا تعلق حضرت نوح علیہ السلام سے ہونے کی قرآن بھی تصدیق کرتا ہے :

''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، من جملہ (دیگر) انبیاء کے نسل آدم سے (تھے) اور بعض ان کی

(۱) Hindu Manners, Custums & Ceromonics P-416-417.

نسل سے تھے جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا، اور بعض ابراہیم علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں، اور یہ سب ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور ہم نے ان کو مقبول بنایا''۔ (سورۃ مریم: ۵۸)

قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نسلِ آدم میں سے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کی نسل الگ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کی نسل یعنی بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل الگ نسلیں ہیں، ہم جانتے ہیں کہ بنی اسماعیل و بنی اسرائیل سامی نسلیں Semetic Races ہیں صاف ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کی نسل غیر سامی Non- Semetic یا آرین نسل ہونی چاہئے، آرین نسل دنیا کے بہت سے ملکوں کے علاوہ ہندوستان کے بیشتر حصے میں آباد ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کی نسل کو حضرت نوح علیہ السلام کی امت کیسے کہہ رہے ہیں، کسی رسول کی امت کہلانے کے لئے ان کی نسل سے ہونا یا نہ ہونا ضروری نہیں ہے، ہم مسلمان ہیں، حضرت محمد مصطفیٰ کی اُمت ہیں؛ حالاں کہ ہم میں اکثر ان کی نسل سے نہیں ہیں، ہم ان کی امت ہیں کیونکہ ہم ان کو اپنا رسول تسلیم کرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت میں سے جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغمبر خدا ہونے کا اقرار کیا، وہ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کہلائے، حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کے وہی ساتھی طوفانِ نوح علیہ السلام سے بچالئے گئے تھے جو ان پر ایمان لائے تھے، وہ ان کے امتی تھے، اُن ساتھیوں کی نسل یا آرین نسل میں سے موجودہ ہندو مذہبی قوم چوں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے دوسرے انبیاء کو اپنا نبی تسلیم نہیں کرتی ہے، اس لحاظ سے ہم نے اپنی تحریروں میں ان کو حضرت نوح علیہ السلام کی امت یا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کہا ہے، یہ ایک الگ بات ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو بھی ان کی اصل حیثیت کے ساتھ یہ قوم نہیں پہچانتی ہے جس کا اظہار ہم ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نبی کو دیو مالاؤں میں گم کر دیا ہے۔(۱)

حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی مماثلت میں کھینچا تانیاں

قرآن کریم میں مذکور جن شخصیات کا ذکر ہمیں سناتنی مذہبی کتب میں ملتا ہے ان کی شناخت میں بعض اہل قلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برہما یا رام سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شری کرشن سے ملانے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں جتنی کاوشیں آج تک سامنے آئیں ان کا درجہ کھینچا تانی سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام پہلے بائبل کے مطابق ابرام تھا، وہ جس خطہ میں تھے اسی علاقے سے مغربی مصنفین کے مطابق آرین ہندوستان آئے تھے، عراق یا مصر اور قدیم ہندوستانی آریائی تہذیبوں میں بہت مماثلت ہے، مندرجہ بالا ثبوتوں کی بنیاد پر

(۱) اگر اب بھی نہ جاگے تو......:۳۱ تا ۳۷۔

ابراہیم علیہ السلام اور رام کو ایک شخصیت کہنا مضحکہ خیز ہے۔

برہما کی پتنی کا نام سرسوتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی ایک بیوی کا نام سارہ تھا، برہما، ابراہیم اور سرسوتی سارہ، ان میں بہت صوتی مماثلت ہے اس لئے ابراہیم علیہ السلام ہی کو ہندوستان میں برہما کہا گیا، یہ خیال بھی بچکانا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرعون کو نجومیوں نے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل کا ایک لڑکا تمہارے لئے موت کا پیغام ہوگا اس لئے وہ بنی اسرائیل کے تمام نوزائیدہ بچوں کو قتل کرادیتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر ان کی والدہ نے انھیں ایک لکڑی کے صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے صندوق پر نظر رکھی، صندوق کو امرأۃ فرعون نے نکلوایا اور موسیٰ کو گود لے لیا، کرشن کی پیدائش سے پہلے بد دین راجہ کنس کو نجومیوں نے بتایا کہ اس کی اپنی بہن دیوکی کا آٹھواں لڑکا اس کی موت کا پیغام ہوگا، کنس نے اس کے پہلے سات بیٹوں کو قتل کروادیا (کیوں؟) آٹھویں کرشن کو دیوکی نے ایک ٹوکری میں رکھ کر جمنا میں ڈال دیا، دیوکی اور ان کے شوہر واسودیو نے کرشن کو اگلے کنارے پر نکال لیا اور گوکل لے گئے، اس طرح انھوں نے ننھے کرشن کو بچالیا، محض ان دونوں کہانیوں کی بنیاد پر دنیا میں کم از کم کوئی محقق ان دونوں شخصیات کو ایک کہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

بعض ایسے ثبوت موجود ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی نبوت سے قبل خانہ بدوشوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، ان کی شخصیت میں شروع ہی سے ایسی کشش اور انفرادیت تھی کہ ان کے تذکرے بعض تبتی مٹھوں میں محفوظ رہ گئے ہوں، یہ ناممکن نہیں ہے، دورِ قبل مسیح و بعدہٗ بودھوں اور ایسین Escene گروپوں کی فلسطین اور ہمالیائی علاقوں میں دوطرفہ آمدورفت کے ثبوت ملتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبل از نبوت ایسین قبائل سے روابط کے شواہد بھی موجود ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اگر تشریف نہ بھی لائے ہوں تب بھی ان کی بعثت کے قصے ہمالیائی مٹھوں میں پہنچے تھے، غالباً دورِ خلفِ مسیح کے سیاحوں سے ملنے والی روایات اور پچھلی روایات کے اختلاط سے وجود میں آنے والی کہانیاں بھوشیہ پران کے مصنف کو بھی پہنچیں جسے اس نے ہندوستانی رنگ میں رنگ کر پران میں درج کیا، بہر حال حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر بھوشیہ پران میں ہے، بھوشیہ پران کے علاوہ کسی اور سناتنی ہندو کتاب میں ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔

بھوشیہ پران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر

....ददर्श बलबान्राजा गौराङंग श्वेतवस्त्रकम्। 22 को भवानिति

तं प्राह स होवाच मुदान्वितः। ईशपुत्रं च मां विद्धि कुमारीगर्भसंभवम्। 23 म्लेच्छधर्मस्य वक्तारं सत्यव्रतपरायणम्। इति श्रुत्वा नृपः प्राह धर्मः को भवतो मतः। 24 श्रुत्वोवाच महाराज प्राप्ते सत्यस्य संक्षये। निर्मर्यादे म्लेच्छदेशे मसीहोघ्हं समागतः। 25 ईशामसी च दस्यूनां प्रादुर्भूता भयङकरी। तामहं म्लेच्छतः प्राप्य मसीहत्वमुपागतः। 26 म्लेच्छेषु स्थापितो धर्मो मया तच्छृणु भूपते। मानसं निर्मलं .त्वा मलं देहे शुभाशुभम्। 27 नैगमं जपमास्थाय जपेतु निर्मलं परम्। न्यायेन सत्यवचसा मनसैक्येन मानवः। 28 ध्यानेन पूजयेदीशं सूर्यमण्डलसंस्थितम्। अचलोघ्यं प्रभुः साक्षात्तथा सूर्योघ्चलः सदा। 29 तत्त्वानां चलभूतानां कर्षणः स समन्ततः। इति .त्येन भूपाल मसीहा विलयं गता। 30 ईशमूर्तिर्हृदि प्राप्ता नित्यशुद्धा शिवङकरी। ईशामसीह इति च मम नाम प्रतिष्ठितम्। 31 इति श्रुत्वा स भूपालो नत्वा तं म्लेच्छपूजकम्। स्थापयामास तं तत्र म्लेच्छस्थाने हि दारुणे। 32 (भविष्य पुराण, प्रतिसर्ग पर्व, खण्ड 3, 2:22 से 32)

''......ایک بار شکادھیش نے ہمالیہ کے ایک ٹیلے کا سفر کیا، وہاں ہونڑ (بودھوں کے) علاقے کے درمیان انھوں نے ایک بابرکت انسان کو دیکھا جس کا رنگ گورا اور کپڑے سفید تھے، آپ کون ہیں؟ یہ سوال کرنے پر اس نے خوشگوار لہجے میں کہا میں خدا کا بیٹا ہوں اور میری پیدائش کنواری ماں کے پیٹ سے ہوئی ہے، میں ملیچھ म्लेच्छ (غیر ملکی، بھوشیہ پران نے ملیچھ دھرم کی بہت تعریف کی ہے، دیکھیں پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ: ۴: ۴۰ تا ۴۲) دھرم کا مبلغ اور سچائی پر کاربند ہوں، یہ سن کر راجہ نے پوچھا کہ دھرم کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے؟ یہ سن کر اس نے کہا مہاراج ملیچھ علاقے میں سچ اور اخلاقی اقدار سے محروم ہیں تو میں مسیح بن کر آیا ہوں، عیسیٰ کی مسیحیت بدکردار لوگوں کے لئے بھیانک بن جائے گی، اسی لئے میں ملیچھوں کے لئے مسیحیت حاصل کر کے آ گیا ہوں، اے راجہ میں ملیچھوں میں (جس) دھرم کا قیام کر چکا ہوں (اس کے بارے

میں سنو)، من کو پاک کر کے ناپاک جسم میں بھی سب برکت ہی برکت ہو جاتی ہے، ایمان کے لئے کلامِ الٰہی کا پاکیزہ وِرد کرنا اور انسان انصاف وسچائی کو اپنا کر توجہ مرکوز کر کے اس سورج میں قائم خدا کی عبادت اور دھیان کرے، جس طرح خدا اچل (نا قابل تبدیل) ہے اسی طرح مجسم سورج بھی ہمیشہ سے نا قابل تبدیل ہے، اے راجہ فانی عناصر کو ہر طرف سے کھینچنے کے عمل سے مسیحا (اسی میں) سما گیا اور قلب میں ہمیشہ پاک اور نفع بخش خدا کی مورت قائم ہوگئی، اسی لئے میرے نام عیسیٰ مسیح کو عزت ملی، یہ سن کر راجہ نے اس ملیچھ عابد کو عزت دیتے ہوئے اس دشوار ملیچھ مقام میں قائم کر دیا''۔

(بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو، کھنڈ ۳:۲،۳: ۲۱ تا ۳۲)

سناتنی ہندو مذہبی کتب میں حضرت محمد ﷺ کی بشارتیں

ویدوں میں سب سے زیادہ جس ہستی کا بیان، اس سے تعلق قائم کرنے پر زور اور اس کی حقیقت کی تحقیق پر زور دیا گیا ہے وہ 'تخلیق اول یا حقیقتِ احمدی ہے، چاروں وید اس کے بیان سے بھرے ہوئے ہیں، بہت سے دیگر صفاتی ناموں کے ساتھ اسے عام طور سے وید نے 'اگنی' کہا ہے، سنسکرت زبان کے سب سے قدیم اور آخری سند تسلیم کیے جانے والے ماہر زبان 'یاسک' 'اگنی لفظ کی اصل 'اگرنی' (अग्रणी) یعنی 'سب سے اول' ہے، اگنی آگ کو کہتے ہیں؛ لیکن اس کا اصل مطلب 'سب سے اول' تھا اور اس سے تعلق قائم کرنے کی بے حد تاکید تھی اسی لئے بگاڑ کے دور میں آگ کی پوجا یا پوجا میں آگ کا استعمال سناتن دھرم میں اہم ترین درجہ اختیار کر گیا، حقیقتِ احمدی کو چوں کہ مادی اور معروف لفظوں میں کوئی شخص یا شخصیت نہیں کہا جا سکتا اس لئے اس کا بیان اس مضمون کے دائرے سے خارج ہے، اس کے باوجود چوں کہ وید کے مطابق اسی اولین تخلیق، یا حقیقت یا ہستی کا ایک دنیوی یا مادّی مظہر 'محمد ﷺ' تھے اس لئے انتہائی ضروری مقامات پر اس کا تذکرہ بھی ناگزیر ہوگا۔

دُوت اور نراشنس

دوت (दूत) اور نراشنس (नराशंस)، ان دو الفاظ کی وضاحت آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے، لفظ دوت کا مطلب ہے بھیجا ہوا نمائندہ یا پیغام بر، وید میں رسول یا نبی کے لئے یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے، ویدک سنسکرت میں لفظ 'نراشنس' محمد ﷺ کا قائم مقام ہے، جیسے گزشتہ دیگر صحائف میں لفظ محمد کا قائم مقام ان کی اپنی زبان میں پیراکلیٹ (Parclete فارقلیط) یا پیریکلائٹاس (Periclytos) دیا گیا اسی طرح وید میں نبی آخر ﷺ کا نام

نراشنس مذکور ہوا، یہ حقیقت بجائے خود وید کے کم از کم بشارتِ محمدی والے حصوں کے الہامی ہونے کی دلیل ہے، نراشنس تین الفاظ نر नर، آآ आ، اور 'شنس' शंस کا مرکب ہے، 'نر' آدمی کو کہتے ہیں، ویدک سنسکرت میں 'آ' کا ستعمال رحمت کے لئے بھی ہوتا ہے اور 'شنس' حمد یا تعریف کو کہتے ہیں، نراشنس کا مطلب ہوا 'وہ انسان جس پر رحمت ہوئی اور جس کی حمد ہوئی'۔

ویدوں کے تراجم میں اختلاف کے سبب مصلحت کا تقاضہ

ویدوں میں نراشنس نام سے حضرت محمد ﷺ کا تذکرہ ۳۱ منتروں میں ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ ان منتروں سے ملحق دیگر منتر بھی انھیں کا بیان کررہے ہیں چاہے ان میں ان کا نام نہ ہو، ان کے علاوہ بھی بہت سے منتر مثلاً جن میں کعبہ کا ذکر ہے وہاں بعض منتروں میں آنحضرت ﷺ کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے چاہے وہاں نام نہ لیا گیا ہو؛ لیکن اس مضمون میں صرف وہی منتر شامل کیے گئے ہیں جن کو اختلاف کرنے والوں پر ثابت کیا جا سکے، ویدک سنسکرت اور موجودہ سنسکرت میں اکثر کافی فرق ہوتا ہے، دیگر سناتنی مذہبی کتب کی زبان چوں کہ عام فہم ہے اس لئے ان کے تراجم میں اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے؛ لیکن ویدوں کے بڑے حصے میں منتروں کے تراجم میں خود وید مترجمین کا باہم اختلاف ہے؛ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ منتروں کے حوالوں کی کثرت کے بجائے صرف انھیں پر اکتفا کیا جائے جن کے تراجم کسی ہندو مترجم کے ترجمے سے ماخوذ ہیں یا جن کے تراجم ثابت کئے جا سکیں۔

ویدوں میں حضرت محمد ﷺ کی بشارت، لفظ 'احمد' کے ساتھ ذکر

حقیقتِ احمدی اور محمد کی بحث سے قطع نظر چوں کہ 'احمد' نام سے تمام مسلمان مانوس ہیں اور یہ نام قرآن کریم میں وارد ہوا ہے اس لئے ذیل میں چند وید منتر دیے جا رہے ہیں جن میں لفظ احمد استعمال ہوا ہے :

> वेदाहमेतं पुरुषं महान्तमादित्यवर्ण तमसः परस्तात्। तमेव विदित्वाति मृत्युमेति नान्यः पन्था विद्यतेऽयनाय।। (यजुर्वेद 31:18)
>
> اندھیروں سے آزاد سورج کی مانند روشن عظیم انسان احمد کو جانو، اس کو جان کر ہی (انسان) لافانی ہوتا ہے، اس (لافانی ہونے) کے لئے اور کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔
>
> (یجروید ۳۱:۱۸)

مندرجہ بالا منتر میں صرف ایک لفظ 'ویداہمیتم' वेदाहमेतम् کا ترجمہ ویدوں کے دیگر مترجمین سے مختلف ہے، بقیہ حصے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، مترجمین نے اس لفظ کی تفریق (संधि विच्छेद) اس طرح کی ہے، وید

वेद (جانتا ہوں)+ اَ ہَم अहम् (میں)+ ایتَم एतम् (اس)، یعنی میں اس کو جانتا ہوں، اس میں غلطی یہ ہے کہ ''میں'' یا अहम् کے ساتھ سنسکرت کے ضابطے میں وید نہیں بلکہ ویدامِ (वेदामि) لفظ استعمال ہوگا جس کے معنی ہیں 'جانتا ہوں' لفظِ وید جب فعل کے طور پر استعمال ہوگا تو یہ امر کا صیغہ ہوگا جس کے معنی ہیں 'جانو'، میں اس کو جانتا ہوں کے لئے 'ویدا َمہمیتم (वेदामिहमेतम्) ہونا چاہیے تھا، یہاں اس لفظ کی تفریق اس طرح کی گئی ہے، وید + احمیتم، سنسکرت میں بعض جگہ ''ت'' त کو ''د'' द سے تبدیل کردیا جاتا ہے، اس طرح یہ تفریق وید+احمیدم، مفعول میں آخر میں م کی آواز زائد ہوتی ہے اس طرح اس کا ترجمہ ہوا 'احمید' کو جانو، احمد اور احمید کا فرق محض زبانوں کے تلفظ کا اختلاف ہوسکتا ہے :

अहमिद्धि पितुष्परि मेघामृतस्य जग्रभ। अहं सूर्य इवाजनि।। (ऋग्वेद 8:6:10)

(ہم سب کے) باپ احمد ہی نے سچائی کے علم کو حاصل کیا (اور بتایا کہ) میں سورج کے مانند ہوگیا۔ (رگ وید: ۸:۶:۱۰)

مندرجہ بالا منتر میں احمِدّ ھ (अहमि کی تفریق میں عام مترجمین سے اختلاف کیا گیا ہے، ان کی تفریق یہ ہے، اہَم अहम् (میں)+ اِتِ इति (یہ)+ ہِ हि (ہی)، منتر کی اس طرح تفریق پر اس منتر کے کوئی معنی نکالنے میں بہت کھینچا تانی کرنی ہوگی، یہاں اس لفظ کی تفریق احمِد + ہِ کی گئی ہے جس کا مطلب ہے 'احمد ہی'۔

यज्ञं पृच्छाम्यवमं स तद् दूतो विवोचति। क्वं ऋतं पूर्व्यं गतं
कस्तद्बिभर्ति नूतनो वित्तं मे अस्य रोद.

اس منتر کے ہر لفظ کے الگ الگ معنی درج ذیل ہیں :

पृच्छामि ← سوال کرتا ہوں، अवमं ← سب سے پیچھے، سب سے بعد، यज्ञं ← یگیہ کو، قربِ خداوندی کے منسک کو، तत् ← اس کو، सः दूतः ← وہ رسول، विवोचति ← واضح کرتا ہے، पूर्व्यं ← پرانے دور کا، پچھلا، ऋतं ← حق، راہِ حق، क्वं ← کہاں، गतं ← گیا، कः ← کون، तत् ← اس کو، नूतनः ← نیا، تجدید شدہ، बिभर्ति ← اپناتا ہے، रोदसी ← آسمانی زمین، روحانی زمین، جنت کی زمین، मे ← میرے، अस्य ← اس کو، वित्तम् ← جانو، دھیان دو۔

ترجمہ : ''(میں) سب سے آخری قربِ خداوندی کے منسک کا سوال کرتا ہوں، اس کی 'وہ نبی' تشریح کرتا ہے، قدیم راہِ حق کہاں (کھو) گئی؟ کون اس کی تجدید کرتا ہے؟ اے آسمان و زمین میرے اس (درد) کو سمجھو''۔

(رگ وید: ۱:۱۰۵:۴)

منتر کا ترجمہ واضح ہے، یہاں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ دین میں تبدیلی ہوجائے گی اور اللہ کی طرف سے آخری تجدید شدہ شریعت کے ساتھ 'وہ نبی' آئے گا، جب ایسا وقت آئے تو وید کو ماننے والا یہ دعا کیا کرے، منتر میں

'وہ نبی' کے الفاظ اہم ترین ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر دور میں اتنا معروف ہوگا کہ نام لینے کے بجائے صرف وہ نبی کہنا کافی ہے، دین کی آخری تجدید کرنے والا وہ نبی کون ہے؟ مسلمان یہ بخوبی جانتے ہیں؛ لیکن تاکہ ان سب کو ایک سلسلے کا خدائی کلام مانا جائے اس لئے انجیل میں بھی یہی الفاظ دہرائے گئے :

And this is the record of John, when the Jews sent priests and Levites from Jerusalem to ask him, Who are you? And he confessed, and denied not; but confessed, I am not the Christ. And they asked him, What then? Are you Elias? And he said, I am not. Are you that prophet? And he answered, No. (John:1:19-21)

''اور یوحنا (حضرت یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلیم سے کاہن اور لیوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا، اور انکار نہ کیا؛ بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ (حضرت الیاس علیہ السلام) ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو 'وہ نبی' ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ (انجیل یوحنا ۱:۱۹تا۲۱)

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جب نبوت کا اعلان کیا تو اس وقت بنی اسرائیل تین نبیوں کے منتظر تھے، انھوں نے حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے تو نام لے کر دریافت کیا؛ لیکن کوئی نبی انبیاء گزشتہ کی پیشین گوئیوں کی وجہ سے اتنا معروف تھا کہ اس کا نام لئے جانے کے بجائے صرف یہ دریافت کرنا کافی تھا کہ کیا تم 'وہ نبی' ہو، انجیل میں تو اس مقام پر مزید تشریح نہیں ہے؛ لیکن وید نے یہ وضاحت کی کہ وہ آخری ہوگا اور اسی دین کی تجدید کرے گا جسے پچھلے انبیاء لائیں گے اور لوگ اسے کھو چکے ہوں گے۔

وید میں نراشنس

اتھروید کے مندرجہ ذیل تین منتر محمد رسول اللہ ﷺ کی خبروں کے ذیل میں بہت اہم ہیں، ایک ایک کرکے ان کا ترجمہ اور تشریح دی جارہی ہے :

इदं जना उप श्रुत नराशंस स्तविष्यते। षष्टिं सहस्रा नवतिं च कौरम आ रुशमेषु दद्महे।। (अथर्व वेद 20:127:1)

इदम् یہ، जना: اے لوگو، उपश्रुत ادب سے سنو، नराशंस نراشنس، وہ انسان جس پر رحمت

ہوئی اور جس کی حمد ہوئی، محمد،त्रस्तविष्यते‏ مدح کی جائے گی،त्र कौरम‏ زمین میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے والا، مہاجر،त्रआ दद्महे،‏ ساٹھ ہزار اور نوے،त्र षष्टिं सहस्रा नवतिं च‏ دشمنوں کے بیچ،त्र रुशमेषु‏ ہم پاتے ہیں۔

ترجمہ: ''اے لوگو ادب سے سنو! نراشنس کی تعریف کی جائے گی، (اس) مہاجر (ہجرت کرنے والے) کو ہم ساٹھ ہزار نوے (۶۰۰۹۰) دشمنوں کے درمیان پاتے ہیں''، (اتھروید: ۲۰:۱۲۷:۱) آریہ سماجی ترجمہ میں نراشنس کا ترجمہ لکھا گیا ہے 'لوگوں میں تعریف کیا گیا انسان' اسے انھوں نے کسی شخصیت کا نام نہیں تسلیم کیا ہے، لفظ کورم कौरम کا مطلب آریہ سماجی ترجمہ میں 'زمین پر چلنے پھرنے والے' کیا ہے، مہاجر اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

उष्ट्रा यस्य प्रवाहणो वधूमन्तो द्विर्दश। वर्ष्मा रथस्य नि जिहीडते दिव ईषमाणा उपस्पृशः।। (अथर्व वेद 20:127:2)

त्र यस्य‏ جس کی،त्र प्रवाहणो‏ سواری،त्र उष्ट्रा‏ اونٹ،त्र द्विर्दश‏ دو بار دس (بیس)،त्र वधूमन्तो‏ مادائیں (اونٹنیاں)،त्र वर्ष्मा‏ عالی مقام،त्र रथस्य‏ رتھ کی،त्र ईषमाणा‏ تیز رفتار،त्र दिव‏ آسمانی بلندیوں کو،त्र उपस्पृशः‏ قریب سے چھوتے ہوئے،त्र नि जिहीडते‏ نیچا دکھاتی ہے۔

ترجمہ: ''جس کی سواری اونٹ ہے، بیس اونٹنیاں (بھی) ہیں، (اس کی) عالی مقام سواری کی تیز رفتاری آسمان کو چھوتے ہوئے جھکاتی ہے'' (اتھروید: ۲۰:۱۲۷:۱) اس منتر کے ترجمے کو بیشتر مسلمان مصنفین یا داعیانِ اسلام نے پنڈت وید پرکاش اپادھیائے کی کتاب 'نراشنس اور انتم رشی' سے لیا ہے جس میں 'دوادش' کو بیس کے بجائے بارہ مانا گیا ہے، ان کی معلومات کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ کی ازواج کی تعداد ۱۲ تھی اور اسی لئے ودھومنتو کا ترجمہ انھوں نے بیویاں کرتے ہوئے ۱۲، ازواج مطہرات گنائی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ نہ کسی ایک وقت میں ازواج مطہرات کی تعداد ۱۲ رہی اور نہ ان کی کل تعداد ۱۲ تھی۔

एष इषाय मामहे शतं निष्कान् दश स्रजः। त्रीणि शतान्यर्वतां सहस्रा दश गोनाम् ।। (अथर्व वेद 20:127:3)

त्र एष‏ اس،त्र इषाय‏ تعمیری صلاحیت والے کو،त्र शतं निष्कान्‏ سو طلائی سکے،त्र दश स्रजः‏ دس گلے کے ہار،त्र त्रीणि शतान्यर्वतां‏ تین سو گھوڑے،त्र सहस्रा दश गोनाम्‏ دس ہزار گائیں،त्र मामहे‏ عطا کی ہیں۔

ترجمہ: ''اس (اللہ) نے (اس) زرخیز (انسان) کو سو دینار (سونے کے سکے)، دس گلے کے ہار، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں عطا کی ہیں'' (اتھرو وید: ۲۰:۱۲۷:۱) دلچسپ بات یہ ہے کہ حالاں کہ آریہ سماجی ان منتروں میں رسولِ آخر ﷺ کی خبر ہونے کی سب سے بڑھ چڑھ کر مخالفت کرتے ہیں؛ لیکن ترجمہ کرتے وقت آریہ سماجی مترجم ۱۰۰ سونے کے سکوں کو ۱۰۰ دینار لکھ گئے، واضح رہے کہ دینار نہ ہندوستانی کرنسی کا نام ہے اور نہ یہ ہندوستانی لفظ ہے، ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں یہ خوب ہوگا کہ ان منتروں کے اصل مصداق کون ہیں، انھوں نے ترجمہ میں خوب ہیر پھر کر کے اسے نا قابل فہم تو بنا دیا؛ لیکن عرب کرنسی کا نام ان کی نوکِ قلم سے پھسل ہی گیا، یہ بھی اہم ہے کہ آریہ مترجم نے ان منتروں کے مختلف الفاظ کے الگ الگ جو معنی درج کیے ہیں وہ تقریباً سب وہی ہیں جو اس تحریر میں اوپر لکھے گئے ہیں؛ لیکن الفاظ کی ترتیب ادھر ادھر کر کے انھوں نے جو مطلب نکالا ہے اسے قارئین آریہ پرتی ندھی سبھا کے شائع کیے ہوئے ترجمے میں دیکھیں اور تین کام کریں: لطف اٹھائیں، ان کے عمداً حق کو چھپانے کے انجام پر افسوس کریں اور ان کے لئے ہدایت کی دُعاء کریں۔

جملوں میں الفاظ کی ترتیب بگاڑ کر کسی منتر کو نا قابل فہم کیسے بنایا جاتا ہے یہ تو ان کے شائع کئے ہوئے ویدوں میں ہی ملاحظہ کریں؛ لیکن ان تینوں منتروں کو نا قابل فہم بنانے کے بعد قابل فہم مجموعی مفہوم اخذ کر کے جو انھوں نے تحریر کیا ہے اس کا ہندی سے اردو ترجمہ درج ذیل ہے :

''اعلیٰ کام کرنے والا شخص دنیا میں ہمیشہ بڑائی پاتا ہے، یہ خیال کرتے ہوئے راجہ باصلاحیت بہادروں کے درمیان عزت دیتے ہوئے مستحقین کو بہت انعام دے، راجہ بیسیوں اونٹوں و اونٹنیوں وغیرہ کو رتھ وغیرہ میں جوت کر بہت تعمیری صنعتی کام پر نکلے، بھیجے اور صنعت کاروں کو بہت انعام و اکرام و سہولیات دے''۔

مندرجہ بالا تینوں منتروں کے قابل غور نکات

اے لوگو ادب سے سنو: جس شخصیت کا ذکر آنے والا ہے وہ قابل احترام ہے۔

نراشنس کی بہت مدح کی جائے گی

یہ مستقبل کی خبر ہے، نراشنس وہ ہوگا جس کے ساتھ رحمت اور مدح جڑی ہوگی، اہم بات یہ ہے کہ نراشنس انتہائی محترم ویدک نام ہونے کے باوجود بعثتِ محمدی تک کسی نے یہ نام کبھی نہیں رکھا، یہ حفاظت رب حکیم نے فرمائی تاکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے کوئی یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ نراشنس تو فلاں صاحب تھے جو گزر چکے، اب نہ ماننے والے انکار تو کر سکتے ہیں لیکن کسی اور کو دعوے میں پیش نہیں کر سکتے، نراشنس کی مدح والی خصوصیت میں بھی تاریخ

عالم میں کوئی اس ایک شخصیت کے ہم پلہ نہ ہو سکے گا، تحریروں تقریروں یا نعت خوانیوں کے علاوہ وقت کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جب جناب محمد ﷺ پر ایک بڑی تعداد صلوٰۃ و سلام نہ بھیج رہی ہو؛ کیوں کہ دنیا میں ہر لمحہ کسی نہ کسی خطہ میں نماز یا اذان جاری ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے لئے درود و رحمت و برکت کی دعائیں لازم ہیں؛ لہٰذا پیشین گوئی کے اس حصے کا مصداق رحمت عالم کے علاوہ نہ کوئی ہوا ہے نہ ہو گا۔

۶۰۰۹۰ دشمن اور ہجرت

ابن اثیر نے تاریخ الکامل میں لکھا ہے کہ بعثتِ نبوی کے وقت مکہ اور اس کے مضافات کی آبادی ساٹھ ہزار تھی، کوئی مردم شماری تو ہوئی نہیں تھی، مؤرخ نے ایک تخمینی تعداد راؤنڈ فیگر (Round Figure) میں رپورٹ کی، وید ایک ایسی تعداد بتا رہے ہیں جو صرف وہ بتا سکتا ہے جو یا تکّے لگا رہا ہو یا جس نے ایک ایک فرد کو گنا ہو، تقریباً ایک صد ایمان والوں کو چھوڑ کر مکہ کی آبادی کا تقریباً ہر فرد رحمت للعالمین کا دشمن تھا، دشمنوں کی اس تعداد کا بیان جو دنیا میں کبھی کسی نے نہیں بتائی، صرف یہی ایک ثبوت اس کے لئے کافی ہے کہ وید کے کم از کم یہ منتر کلامِ الٰہی ہیں پر مبنی ہیں، ان جانی دشمنوں سے اللہ تعالیٰ نے ہجرتِ نبوی کے ذریعہ نراشنس کی حفاظت فرمائی۔

اُونٹ کی سواری اور ۲۰ اُونٹنیاں

نراشنس کی یہ اہم پہچان ہے کہ وہ ریگستان کا باشندہ ہے، حضرت محمد ﷺ نے ۲۰ اُونٹنیاں اپنی زوجہ حضرت خدیجہؓ کے مہر میں دی تھیں۔

رتھ کی عظمت کا آسمان کو چھونا

یہ واقعۂ معراج کی طرف اشارہ ہے۔

سو طلائی سکے، دس گلے کے ہار، تین سو گھوڑے اور ایک ہزار گائیں

تمثیلی زبان میں سونے کے بیش قیمت سکے حبشہ کی طرف دوسری مرتبہ ہجرت کرنے والے ایثار کے پیکروں کو کہا گیا، ۱۰ گلے کے ہار عشرہ مبشرہ ہیں، گھوڑا تمثیلی زبان میں بہادر کو کہا جاتا ہے، جنگ بدر سے فتح یاب ہو کر آنے والے ۳۰۰ غازیوں کو گھوڑوں سے تشبیہ دی گئی ہے، صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ رسول ﷺ نے خواب دیکھا کہ گائیں کاٹی جارہی ہیں اور تعبیر دی کہ بہت سے صحابہ احد میں شہید ہوں گے، گایوں کو صحابہ سے تشبیہ دی گئی، اس وید منتر میں ۱۰۰۰۰ گایوں سے مراد وہ صحابہ ہیں جو فتح مکہ پر ساتھ تھے اور جن کی تعداد متفقہ طور پر ۱۰۰۰۰ تھی۔

'اللہ اُپنشد' میں تذکرہ

بعض مسلمان محققین کی تحقیق ہے کہ سات منتروں پر مبنی ایک سُوکت सूक्त اتھرووید کے آخر میں تھا جسے اپنشد کا درجہ دے کر اتھرووید سے الگ کر دیا گیا جیسے 'ایش اپنشد' تقریباً لفظ بہ لفظ یجروید کا آخری باب ہے، اُپنشد دراصل وہ گرنتھ ہیں جو ویدوں کے عوام کی زندگی سے نکل جانے کے بعد لکھے گئے، ان کا یقینی دور تو نامعلوم ہے؛ لیکن اس پر اتفاق ہے کا اپنشد ویدوں کے دور کے بعد اور پرانوں کے دور سے پہلے تصنیف کئے گئے، اپنشد بہت ہیں؛ لیکن ان میں سے ۱۰۸ کو مستند تسلیم کیا جاتا ہے، اللہ اپنشد اس فہرست میں نہیں ہے، جیسے سرِ دست انجیل برناباس کی دعوتی افادیت نہیں ہے؛ کیوں کہ اسے عیسائی مستند نہیں مانتے ویسے ہی اللہ اپنشد کی بھی کوئی دعوتی اہمیت نہیں ہے، اس کا حوالہ اس مضمون میں صرف اس لئے درج کیا جارہا ہے کہ اس پر محققین حضرات مزید تحقیق کر سکیں اور یہ کم از کم انجیل برناباس کے درجہ پر آجائے تو مستقبل میں شاید اس کی کچھ افادیت بھی ہو، اللہ اپنشد کے ساتوں شلوکوں میں بار بار اللہ کا نام آیا ہے اور آخری دو شلوکوں میں محمد ﷺ کے اللہ کے رسول ہونے کا ذکر ہے :

हरिः ऊँ अस्य इल्लां इलल्लं मित्रा वरुणो राजा पूर्ण दधुः ।। वहयामि मित्रां इल्लां रकवर इल्लां रसुल महंमद् रकब रस्य अल्लं अल्लां पुर्ण दधुः ।। 6 अल्ला इलल्लां अनादि स्वंरूपायं अंथ र्वणो शाखां हीं जनान पशुं संधान जल चराम अदरुटे कुरु कुरु फदं असुंर संहा रिणी हां अल्लां रसूल अहमद रकबरस्य अल्लं अल्लां इलल्लेति इंलल्लाः ।। 7

اس دیوتا کا نام اللہ ہے وہ ایک ہے مترا، ورونا اس کے صفات ہیں یقیناً اللہ ورونَ ہے جو تمام کائنات کا بادشاہ ہے، دوستو! اس اللہ کو اپنا معبود سمجھو وہ ورونَ ہے اللہ ایک دوست کی طرح وہ تمام لوگوں کے کام سنوارتا ہے وہ 'اندرا' ہے عظیم الشان اندرا، اللہ سب سے بڑا سب سے بہتر اس سے زیادہ مکمل اور سب سے زیادہ مقدس ہے، محمد رسول اللہ (ﷺ) اللہ کے عظیم ترین رسول ہیں، اللہ اول آخر اور رب العالمین، تمام اچھے کام اس کے لئے ہی ہیں، درحقیقت اللہ ہی نے یہ سورج، چاند اور ستارے پیدا کئے ہیں۔

اللہ نے سب رشی بھیجے اور سورج، چاند، ستاروں کو پیدا کیا اسی نے تمام رشی بھیجے اور آسمانوں کو پیدا کیا، اللہ نے ارض و مکان کو ظاہر کیا، اللہ عظیم ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اے پجاری (اتھر وارشی) کہہ دے لا الہ الا اللہ، اللہ ازل سے ہے، وہ رب العالمین ہے وہ تمام برائیوں اور مصیبتوں کو دور کرنے والا ہے، محمد (ﷺ) اللہ کا رسول ہے جو اِس عالم کا رب ہے پس اعلان کرو اللہ ایک اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں''۔

بھوشیہ پران میں حضرت محمد ﷺ کا تذکرہ

بھوشیہ پران میں حضرت آدم، نوح، عیسیٰ اور محمد ﷺ کو ملیچھ کہا گیا ہے اور ملیچھ کن صفات کے حامل انسان کو کہتے ہیں یہ بھی بتایا گیا ہے، بعد میں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال ہونے لگا جو ہندوستان سے باہر بھی سفر کیا کرتے تھے یا مستقل طور پر ہندوستان سے باہر رہتے تھے، حضرت آدم و نوح چوں کہ حج بیت اللہ کے لئے یا اس کے علاوہ بھی بیرونِ ہند سفر کرتے تھے اس لئے انھیں بھی ملیچھ کہا گیا، بہت بعد کے دور میں جب برہمنوں نے بیرونِ ہند سفر نہ کرنے کا ضابطہ مقرر کیا تو یہ لفظ برے لوگوں کے لئے استعمال ہونے لگا، ملیچھ کی تعریف بھوشیہ پران نے اس طرح کی ہے :

आचाश्च विवेकश्च द्विजता देवपूजनम्। .तान्येतानि तेनैव तस्मान्म्लेच्छः स्मृतो बुधैः। 41 विष्णुभक्त्याग्निपूजा च ह्यहिंसा च तपो दमः। धर्माण्येतानि मुनिभिर्म्लेच्छानां हि स्मृतानि वै। 42

(भविष्य पुराण, प्रतिसर्ग पर्व, खण्ड 1,4:41से42)

کردار اور عقل و خرد رکھتے ہوئے شریف گھرانوں کے افراد کی طرح عبادت کرنا، علم والوں نے یہی ملیچھ ہونا بتایا ہے اور یہی وہ بھی کرتے تھے، وشنو (خدا) کی بندگی، اگنی (حقیقتِ احمدی) کا احترام، عدم تشدد، ریاضت اور ضبطِ نفس، مُنیوں نے یہی ملیچھوں کا دھرم بتایا ہے۔ (بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ: ۴: ۴۱-۴۲)

بھوشیہ پران کے پرتی سرگ پرو کا تیسرا کھنڈ جس میں رسول اکرم ﷺ کا نام آیا ہے اور راجہ بھوج کے ان سے متاثر ہونے کا ذکر ہے، اس حصے کو بہت سے سناتن دھرمی اداروں نے شائع کرنا بند کر دیا ہے، گائتری پریوار نے پنڈت سری رام شرما کا وید کا ترجمہ ۱۰۸ اپنشدوں کا ترجمہ اور ان کی لکھی ہوئی ۳۰۰ سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں، بھوشیہ پران کا ترجمہ بھی انھوں نے شائع کیا ہے؛ لیکن وہ حصہ دستیاب نہیں ہے جس میں حضرت محمد ﷺ کا ذکر ہے، بعض اداروں نے جنھوں نے اسے شائع کیا ہے متعلقہ اشلوکوں کے ترجمے میں کافی ردّ و بدل کی ہے، اس حصہ کا متن اور ترجمہ درج ذیل ہے :

एतस्मिन्नन्तरे म्लेच्छ आचर्य्येण समन्वितः। महामद इति ख्यातः शिष्यशाखासमन्वितः।। 5 नृपश्चैव महादेवं मरुस्थलनिवासिनम्। गङ्गाजलैश्च संस्नाप्य पञ्चगव्यसमन्वितैः। चन्दनादिभिरभ्यर्च्य तुष्टाव मनसा हरम्।। 6 भोजराज उवाच नमस्ते गिरिजानाथ मरुस्थलनिवासिने। त्रिपुरासुरनाशाय बहुमायाप्रवर्तिने।। 7 म्लेच्छैर्गुप्ताय

शुद्धाय सच्चिदानन्दरुपिणे। त्वं मां हि किङकरं विद्धि शरणार्थमुपागतम्।। 8 सूत उवाच इति श्रुत्वा स्तवं देवः श्ब्दमाह नृपाय तम्। गन्तव्यं भोजराजेन महाकालेश्वरस्थले।। 9
म्लेच्छैस्सुदूषिता भूमिर्वाहीका नाम विश्रुता। आर्य्यधर्मो हि नैवात्र वाहीके देशदारुणे।। 10 बभूवात्र महामायी योघ्सौ दग्धो मया पुरा। त्रिपुरो बलिदैत्येन प्रेषितः पुनरागतः।। 11 अयोनिः स वरो मत्तः प्राप्तवान्दैत्यवर्द्धनः। महामद इति ख्यातः पैशाच.तितत्परः ।। 12 नागन्तव्यं त्वया भूप पैशाचे देशधूर्तके। मत्प्रसादेन भूपाल तव शुद्धिः प्रजायते।। 13 इति श्रुत्वा नृपश्चैव स्वदेशान्पुनरागमत्। महामदश्व तैः सार्द्धं सिन्धुतीरमुपाययौ।। 14 उवाच भूपतिं प्रेम्णा मायामदविशारदः। तव देवो महाराज मम दासत्वमागतः।। 15 ममोच्छिष्ठं समुञजीयाद्यथा तत्पश्य भो नृप। इति श्रुत्वा तथा .ष्ट्रा परं विस्मयमागताः।। 16 म्लेच्छधर्मे मतिश्चासीत्तस्य भूपस्य दारुणे।। 17 तच्छ्रुत्वा कालिदासस्तु रुषा प्राह महामदम्। माया ते निर्मिता धूर्त नृपमोहनहेतवे।। 18 हनिष्यामि दुराचारं वाहीकं पुरुषाधमम्। इत्युक्त्वा स द्विजः श्रीमात्रवार्णजपतत्परः।। 19
जप्त्वा दशसहस्त्रं च तद्दशांशं जुहाव सः। भस्म भूत्वा स मायावी म्लेच्छदेवत्वमागतः।। 20 भयभीतास्तु तच्छिष्या देशं वाहीकमाययुः। गृहित्वा स्वगुरोर्भस्म मदहीनत्वमागतम्।। 21
स्थापितं तैश्च भूमध्ये तत्रोषुर्मदतत्पराः। मदहीनं पुरं जातं तेषां तीर्थं समं स्मृतम्।। 22 रात्रौ स देवरुपश्च बहुमायाविशारदः। पैशाचं देहमास्थाय भोजराजं हि सोघ्ब्रवीत्।। 23 आर्य्यधर्म्मो हि ते राजन्सर्वधर्मोत्तमः स्मृतः। ईशाज्ञया करिष्यामि पैशाचं धर्मदारुणम्।। 24 लिङगच्छेदी शिखाहीनः श्मश्रुधारी स दूषकः। उच्चालापी सर्वभक्षी भविष्यति जनो मम।। 25 विना कौलं च पशवस्तेषां भक्ष्या मता मम। मुसलेनैव संस्कारः कुशैरिव भविष्यति।। 26 तस्मान्मुसलवन्तो हि जातयो धर्मदूषकाः। इति पैशाचधर्मश्च भविष्यति मया .तः।। 27

''ایک ملیچھ یا اجنبی ملک اور زبان کا معلم روحانی اپنے صحابہ کے ساتھ آئے گا اس کا نام محمد ﷺ ہوگا راجہ (بھوج) نے مہادیو (ملائک سیرت) عرب کے رہنے والوں کو آب رود گنگا اور پنچ گویہ سے غسل کرا کے (یعنی تمام گناہوں سے پاک ٹھرا کر) دلی ارادت سے نذر و نیاز پیش کر کے اس کی تعظیم کی اور کہا کہ میں تیرے حضور میں جھکتا ہوں، اے فخر نسل انسانی عرب کے رہنے والے شیطان کے مارنے کے لئے بہت سی طاقت مہیا کرنے والے دشمن ملیچھوں سے محافظت کئے گئے ہو، اے پاک ہستی مُطلق اور سرور کامل کے مظہر میں تیرا غلام ہوں مجھ کو اپنے قدموں میں آیا ہوا جانئے''۔

عرب کے مشہور ملک کو ملیچھوں نے خراب کر دیا ہے اس ملک عرب میں آریہ دھرم نہیں ہے:۱۰، یہاں پہلے بھی ایک گمراہ شیطان ہوا تھا جس کو میں نے بھسم کر دیا تھا، وہ طاقتور دشمن کا بھیجا ہوا پھر آ گیا ہے:۱۱، ان دشمنوں کی اصلاح وفلاح کے لئے جس نے مجھ پر برہما کا لقب حاصل کیا ہے وہ معروف مشہور محامد پشاچوں کی بگڑی بنانے میں مشغول ہے:۱۲، اے راجا تجھے بے وقوف پشاچوں کے ملک میں نہیں جانا چاہئے میری مہربانی سے تیرا تزکیہ یہیں ہو جائے گا: ۱۳،......رات کے وقت فرشتہ سیرت تدبیر کا ہوشیار پشاچ کا بھیس اختیار کر کے یقیناً راجا بھوج سے وہ بولا:۲۳۔

اے راجہ تیرا آریہ دھرم تمام مذاہب پر فائق کیا گیا ہے، مگر ایشور پر ماتما کے حکم سے میں گوشت خوروں کے مضبوط مذہب کو جاری کروں گا:۲۴۔

میرا پیرو ختنہ کیا ہوا، بغیر چوٹی کے داڑھی والا اور انقلاب پیدا کرنے والا، اذان دینے والا سب حلال اشیاء کھانے والا ہوگا:۲۵، سُور کے سوا اور سب مویشی کھانے والا ہوگا، مقدس گھاس سے پاکیزگی حاصل کرنے کی بجائے ان کا تزکیہ جنگ سے ہوگا:۲۶۔

دھرم بگاڑنے والی قوموں سے لڑنے بھڑنے والے ہونے کی وجہ سے وہ مسلمان کہلائیں گے، یہ گوشت خور قوم کا مذہب مجھ سے ہی بنایا ہوا ہوگا:۲۷۔ (بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو، کھنڈ:۳،۳:۵تا۲۷)

خلاصہ

اس مضمون میں وید اور دیگر ہندوستانی کتب میں مذکور حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام اور رسولِ آخر حضرت محمد ﷺ کے بعض تذکروں کی تفصیلات بیان کی گئیں، اس باب میں ابھی بہت تحقیق کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ دیگر ضرورتوں کے ساتھ اس کی دعوتی افادیت بھی بہت زیادہ ہے، قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے فرمایا کہ ''ہم نے اس کتاب میں کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے'' اور ''یہ ہر شئے کا بیان ہے''، حامل قرآن ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کے معجزات قیامت تک کھلتے رہیں گے، یہ ناممکن ہے کہ قرآن نے جن انبیاءِ کرام یا دیگر شخصیات کا نام لیا ہے

انھیں ہم تلاش نہ کرسکیں ،قرآن جن پر نازل ہوا ان کا نام سے ذکر قرآن میں صرف ۴ مقامات پر ہے، یہ بھی قابل غور ہے کہ گزشتہ ۱۳۰۰ برسوں میں دنیا بھر میں محققین نے بائبل پر بہت کام کیا اور اس میں ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی بشارتوں کی نشان دہی کی ، یہ بشارتیں سینکڑوں نہیں ہیں، چند انجیل میں اور چند پچھلی کتب میں مذکور پائی گئیں،حوالوں یا منتروں کی کثرت کے بجائے ہمیں چند مستند حوالوں کی ضرورت ہے (اور چند ہی ان میں ہوں گے) ؛ لیکن وہ حوالے ایسے ہوں جن کی تشریح کو ہم مسلمانوں ہی پر نہیں ؛ بلکہ غیر مسلم برادرانِ وطن پر ثابت کرسکیں ۔

اس مضمون میں بعض تذکرے وہ ہیں جو پہلے ہی جگہ جگہ شائع ہو چکے ہیں ،بعض پچھلی تحقیقات کی اصلاح (Corrections) کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض گوشے پہلی بار سامنے لائے گئے ہیں ،اللہ سے دُعاء ہے کہ خالص دعوتی نقطۂ نظر سے کی گئی اس کاوش کو قبول فرمائے اور ان کو بھی اجرِ عظیم عطا فرمائے ،جنھوں نے اس مضمون کو مرتب کرنے کی ترغیب دی۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن کریم اور ہندو مذہب کی تعلیمات

مولانا عبدالماجد قاسمی⊙

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علٰی سید المرسلین و علٰی آلہ و اصحابہ اجمعین امابعد ، فقد قال اللہ تعالٰی فی القرآن الکریم :

" وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ " (الشعراء:۱۹۶) صدق اللہ العظیم .

اگر پھول ہو؛ لیکن اس کی خوشبو نہ پھیلے تو وہ نمائش کی ایک چیز ہوسکتی ہے؛ لیکن اس سے لوگوں کو نفع نہیں پہنچ سکتا، اگر شمع موجود ہو؛ لیکن اسے جلایا اور روشن نہ کیا جائے تو اس سے گھر کو آراستہ کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس سے ماحول کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، یہی معاملہ دین حق کا ہے، اگر اللہ کا بھیجا ہوا دین اور اس کی نازل کی ہوئی کتاب کسی کمی بیشی کے بغیر موجود ہو؛ لیکن اسے ہدایت سے محروم انسانیت تک پہنچایا نہ جائے تو اس کا حقیقی نفع عام نہیں ہوگا؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو کتاب محفوظ سے سرفراز کرنے اور حق وہدایت سے نوازنے کے ساتھ اس کی دعوت واشاعت کا بھی حکم دیا اور اسے اُمت کا فریضۂ منصبی قرار دیا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ . (آل عمران:۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے نکالے گئے ہو، تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر اس کے لئے دو طرح کی غذاؤں کا انتظام فرمایا، ایک مادی اور دوسرے روحانی ، مادی غذاؤں کو زمین سے نکالا اور روحانی غذاؤں کو آسمان سے اتارا، ان دونوں کے توسط سے انسان عبدیت کے بلند مقام کو پہنچتا ہے، اس لئے ایک کامیاب انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی گذارے، قرآن کریم نے ہر دو پہلو کو واضح کردیا ہے۔

⊙ صدر: شانتی سندیش کیندر، پٹنہ، استاذ: شعبۂ دعوۃ جامعہ انوارالہدیٰ، حیدرآباد۔

یہ کون سی قوم ہے؟

وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَافِيْهَا نَذِيْرٌ . (الفاطر:۲۴)

کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو کسی ڈرانے والے ہادی سے خالی ہو۔

ہر دور میں اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے رسولوں کی بعثت فرمائی اور بندوں کی ہدایت کے لئے کتابوں اور صحیفوں کو نازل فرمایا قومیں اپنی تاریخ اور مذہبی کتابوں سے پہچانی جاتی ہیں، ہندو قوم کے تعلق سے مسلمانوں میں عموماً یہ غلط فہمیاں ہیں کہ قرآن وحدیث میں اس قوم کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے، جب کہ قرآن وحدیث میں نہ صرف یہ کہ اس قوم کا ذکر موجود ہے؛ بلکہ اس کے قبول اسلام کی واضح پیشین گوئی کے ساتھ قوت ایمان میں بے مثال حیثیت سے اس کا ذکر موجود ہے، حضور اکرم ﷺ نے بارہا اس قوم کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جسے تاریخ اسلام نے اس طور پر محفوظ کر رکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمان فارسی ﷺ کی قوم (جو ایران وفارس میں آباد تھی) اور یمن کی قوم کے ایمان میں مضبوط ترین قوم کی حیثیت سے پیشین گوئی کی ہے، جو لوگ ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ یہاں آ کر بسنے والی دو قومیں ہیں (۱) آرین جو ایران میں آباد تھی، (۲) دراوڑ جو یمن میں آباد تھی، یہاں پہنچ کر دونوں نے آپس میں مل کر ایک مذہب ''ہندو'' نام سے ایجاد کیا، سرکار دو عالم حضرت محمد ﷺ نے لفظ ہندو سے تو نہیں بتایا، مگر اس کے احوال وکوائف اور اوصاف کا ذکر فرما دیا، جیسا کہ ارشاد ہے :

عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : أى الخلق اعجب اليكم ايمانا ؟ قالوا : الملائكه ، قال: ومالهم لايؤ منون وهم عند ربهم ؟ قالوا : فالنبيون ، قال : ومالهم لايؤمنون والوحي ينزل عليهم ؟ قالوا : فنحن ، قال : ومالكم لاتؤ منون وأنا بين أظهركم ؟ قال : فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنَّ أعجب الخلق إلي إيمانا قوم يكونون من بعدي يجدون صحفا فيها كتاب يؤ منون بما فيها . (۱)

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک دن صحابہ سے) پوچھا ایمان کے لحاظ سے کون سی مخلوق

---

(۱) أخرجه البيهقي فى دلائل النبوة:۵۳۸/۶۔

تمہارے نزدیک سب سے عجیب اور عزیمت والی ہے؟ صحابہ ﷺ نے عرض کیا: فرشتے، آپ نے فرمایا ان کے ایمان میں کیا عجیب بات ہے؟ وہ ایمان کیوں نہ لاتے جب کہ وہ اپنے پروردگار کے قریب رہتے ہیں، صحابہ ﷺ نے کہا: وہ جماعت انبیاء ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ایمان کیوں نہ لاتے؟ جب کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! پھر وہ ہم لوگ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم ایمان کیوں نہیں لاتے، جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، راوی کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمام مخلوقات میں ایمان کے اعتبار سے قوی اور عجیب ترین حقیقتاً ایک قوم ہوگی، جو میرے بعد ہوگی اور وہ اپنے پاس کچھ صحیفے پائیں گے، ان صحائف میں کتاب ہے، جو کچھ ان صحائف میں ہے، اس پر وہ ایمان لائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے جس قوم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے شاید وہ قوم ہندو ہے جن کی مذہبی کتابیں ایسی ہیں کہ ان میں قرآن اور اسلام کے بے شمار مضامین موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا ہے ''فیھا کتاب یؤمنون بما فیھا'' ''جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے'' اور نبی کی زبان سے نکلی ہوئی بات پتھر کی لکیر سے بڑھ کر ٹھوس اور مضبوط ہوتی ہے، اس میں اب کچھ شک کرنا اپنے ایمان کے کمزور ہونے کی دلیل ہوگی، اس حدیث کو پڑھنے کے بعد ہر مسلمان کو یقین ہونا چاہیے کہ جب آقا نے فرمادیا، تو یقیناً وہ سب ایمان قبول کریں گے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِيْ دِيْنِ اللهِ أَفْوَاجاً . (النصر:۲)

اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتا ہوا۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ أُوْلٰئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ . (البقرہ:121)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت کرتے رہے، جس طرح کہ تلاوت کا حق ہے، ایسے لوگ اس پر ایمان لے آتے ہیں۔

یعنی اگر اہل کتاب (جن لوگوں کو بھی اللہ نے کتاب دی اور وہ کتاب ان کے پاس کسی نہ کسی شکل میں موجود بھی ہے، اگر وہ لوگ) اپنی کتابوں کو کما حقہ پڑھتے تو ضرور وہ لوگ قرآن کریم پر ایمان لاتے کیوں کہ ان کتابوں میں اس قرآن مجید پر ایمان لانے کا انہیں پابند بنایا گیا ہے اور ان میں قرآن کریم کی تعلیمات کا ذکر ہے، اسی لئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

اَوَلَمۡ تَاتِهِمۡ بَيِّنَةُ مَافِي الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى. (طٰہٰ:۱۳۳)

کیاان کے پاس کھلی دلیل نہیں آئی جواگلی کتابوں میں مذکور ہے۔

آیت مذکورہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم پچھلی آسمانی کتابوں کا خلاصہ ہے، جو بندوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے نازل کیا ہے، اس طرح قرآن کی تعلیمات کو قبول کرنا اوراس پر ایمان لانا اپنی ہی اصل پر ایمان لانا ہے۔

مفسرین نے اس آیت کریمہ کے تحت لکھا ہے کہ ''الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى'' سے مرادتورات، انجیل، زبور اوردیگرتمام سماوی کتب (جوعقائد صحیحہ اوراحکام شرعیہ پر مشتمل ہیں) ہے: ''یرید التوراۃ والانجیل والکتب المقدمۃ وذٰلک اعظم آیۃ اذا اخبر بما فیھا''. (۱)

قرآن کریم کاارشاد ہے :

نَزَّلَ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ . (آل عمران:۳)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے واقعیت کے ساتھ اس کیفیت سے کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوچکی ہیں۔

یہاں قرآن کریم کو سابقہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی کتاب کہا گیا ہے، یہ بھی قرآن کا مزاج ہے کہ وہ اپنے موافق تعلیمات کی ہی تصدیق کرتا ہے، اگر قرآن سے ملتی جلتی تعلیمات نہ ہوں تو پھر اس کی تصدیق نہیں کرتا اوراب جبکہ سابقہ کتابوں کی تصدیق ہورہی ہے جیسا کہ آیت مذکورہ سے پتہ چلتا ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی کتابوں میں قرآن مجید کی تعلیمات موجود ہیں۔

اللہ رب العزت کا پاک ارشاد ہے :

وَاِنَّهٗ لَفِيۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ . (الشعراء:۱۹۶)

اور بے شک یہ (قرآن) پہلی کتابوں میں موجود ہے۔

دنیا کی قدیم ترین کتاب وید مانی جاتی ہے اور ویدوں کے تعلق سے ہندو بھائیوں کا خیال ہے کہ وہ الہامی کتاب ہے، قطع نظر اس بات سے کہ وہ الہامی ہے یا نہیں، اللہ اعلم بالصواب، مگر اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں الہامی تعلیمات بکثرت موجود ہیں اور یہ کہ وید دنیا کی قدیم ترین کتاب ہے، ''زبرالاولین'' سے شاید اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ کیوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو اتنی پرانی کتاب کا دعوہ مذہبی کتاب کی حیثیت سے کرتی ہو، صرف ہندو قوم ایسی ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی قدیم ترین کتاب وید ہی ہے اور یہ خدا کی طرف سے

(۱) قرطبی:۱۱/۱۷۵، نیز دیکھئے: التفسیر المنیر للدکتور وہبہ الزحیلی:۱۶/۳۱۳۔

الہام کی گئی ہے، بہر حال نصوصِ قرآنی اور حدیث نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ''قرآنی تعلیم'' خود ان کی کتابوں میں موجود ہے، اگر یہ کہا جائے کہ پہلے یہ تعلیمات موجود تھیں اور اب نہیں ہیں تو گویا قرآن کے دعوے پر ایک سوالیہ نشان ہے (نعوذ باللہ من ذالک)، آج بھی غیر مسلم برادران (بالخصوص ہندو بھائی) کی کتابوں (ویدوں، پُران، اُپنشد اور بھگوت گیتا) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مذہبی کتابوں میں قرآن مجید سے ملتی جلتی بے شمار تعلیمات موجود ہیں، اگر ہم واضح نہ کرسکیں تو یہ ہم مسلمانوں کی کمی ہے، قرآن نے تو اعلان کردیا کہ قرآنی تعلیمات پہلی کتابوں میں موجود ہیں تو یقیناً موجود ہوں گی، اب ہم مسلمانوں کا کام اور ہماری ذمے داری ہے کہ ہم ان کی کتابوں سے قرآن کی تعلیمات کو واضح کرکے لوگوں کے سامنے ان تعلیمات کو پیش کریں؛ تاکہ غیر مسلم برادران بالخصوص ہندو بھائی اپنا دین سمجھ کر دین اسلام کو قبول کرنے میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ محسوس کریں، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے فرمایا:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ. (النحل:44)

یعنی ہم نے آپ کے پاس ذکر (قرآن مجید) نازل کردیا ہے، (قرآن کریم کی روشنی میں) آپ لوگوں کے پاس ضرور ان تعلیمات کو واضح فرمادیں جو ان کے پاس نازل کی گئی ہیں؛ تاکہ وہ لوگ غور وفکر کریں۔

اسی وضاحت کی ایک کڑی مندرجہ ذیل تعلیمات ہیں جو قرآن کریم اور ہندو مذہبی کتابوں سے تقابلی اعتبار سے پیش کی جارہی ہیں، پہلے قرآن کریم کی آیات اور اس کا ترجمہ اور اس کے بعد وید کا منتر اور ترجمہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الفاتحة:1:1)

سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

مَهِی دِوَسْیَ سَوِتَہَ پَرِشْتُتِهَ. (رگ وید 5:81:1)

प्रिस्टुतिय: मही देवस्य सवित:

ساری تعریفیں کائنات کے خالق کے لئے ہی ہیں۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ. (الفاتحة:1:4)

ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

تَسْیَتِ بهکْتِ وَانْسَهٗ سْیَام. (اتھروید 6:79:3)

तस्य ते भक्तिवास: स्याम:

اے پربھو! ہم تیری ہی عبادت کریں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ . (الفاتحة1:5)
ہم کو سیدھی راہ پر چلا دے۔
نَیَ سُوْپَتھا رَایِ اَسْمَانُ . (یجروید40:16)
नय सुपथा राये अस्मान
ہمکو ہماری نجات کے لئے سچائی کی راہ چلا۔
اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالُ . (13:9)
(اللہ) بڑائی میں بہت ہی عالیشان ہے۔
اَدَادَه دِو مَهَا . (اتھرووید20:58:3)
अध्दा देव महा
یقیناً ایشور بڑا ہے۔
لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ . (الشوریٰ:۱۱)
اس (اللہ) کی کوئی مثال نہیں۔
نَتَسْیَ پَرتِما اَستی یَسیَ نامَ مَهَدَّشَه . (یجروید32:3)
न तस्य प्रतिमा अस्ति यस्य नाम महध्दशः
اس کی کوئی مورتی، کوئی شبیہ نہیں، اس کے نام کو یاد (جپ) کرنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔
وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ . (البقرة2:115)
مشرق و مغرب سب اللہ کا ہے سو تم جس طرف بھی منھ کرو گے اللہ کا جلوہ وہیں پاؤ گے۔
يَسْیَ مَاهَ پَرَدِشَه . (رگ وید10:121:4)
यस्यै माः प्रदिशः
یہ سب دشائیں (جہتیں) اسی کی ہیں۔
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا . (25:2)
اور اسی (اللہ) نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور اپنے قبضۂ قدرت میں ہر ایک کو جکڑ دیا۔
پَرَجَاپَتِرْ جَنْ يَتِ پَرَجَا اِمَاهَ . (اتھرووید7:19:1)
प्रजा पतिर्ज नयति प्रजा इमाः
پرمیشور نے ہی ساری کائنات کی تخلیق کی ہے۔

يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَايَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ . (57:4)

زمین میں جو چیز داخل ہوتی ہے اور جو کچھ زمین سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو چیز آسمان میں چڑھتی ہے سب کچھ وہ جانتا ہے اور جہاں کہیں تم ہوتے ہو اللہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔

سَرْوَتَدْرَاجَاوَرُنْ کِچَشُٹِ يَدَنْ تُرَا رُدَسِي يَتْ پَرَسْتَاتَ . (اتھروید4:16:5)

सर्व तद राजा वरुणो किच श्ठे यदन्तरा रोदसी यत परस्तात

جو آسمان و زمین کے بیچ ہے اور جو کچھ اس کے پیچھے ہے ان سب کو ایشور دیکھتا ہے۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَالَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْر . (2:107)

کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کی بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین میں اور تم کو اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور مددگار نہ مل سکے گا۔

مَهُدِ وَهَ پِرتُھوِیَاشُچَ سَمْرَاتُ نَہ بھوَتِوَرْدَمْ اُتِی . (رگ وید1:100:1)

महो दिव: पिर्थवियाश च सम्रट न: भवतिवद्रं ऊती

وہ پرمیشور بڑے آسمان اور زمین کا مالک ہے، وہ ایشور ہماری مدد کرے۔

وَاللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْم . (49:16)

اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

یُوشْوَامِیُ وِپَشْیَتِیُ بَھوَنَاسَنْچَ پَشْیَتِیُ . (رگ وید10:187:4)

यो विश्वामि वि पश्यति भवना सन्च पश्यति

وہ ایشور ساری دنیاؤں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَاتَكْسِبُوْنَ . (6:3)

تمہارے چھپے اور ظاہر سب کو جانتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو سب کچھ اس کے علم میں ہے۔

يَسْتِشْنُهتِی وَرَتِ يَشْچَ وَجُوَتِ يُوْنَلَايَمْ چَرِتْ پَرَتَمْ كَمُدَوْ سَتِشْدَهَ

یَنْمَنْتُرْیَتِ رَاجَاتَدْوِیْدُ وَرَنَسْ تُتْیَہَ (اتھروویدٖ4:16:2)

यसितश्ठ ति वरित यश्च वज्वति यो निलयम चरति य:
प्रतम्कम दौव सनिशध यन्मन्त्त्र्येते राजा तद वेद वृणस्ततिय:

جو کھڑا ہو کر چلتا ہے اور جو دھوکہ دیتا ہے، جو چھپ کر پھرتا ہے اور جو دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے ایشور ان سب کو جانتا ہے۔

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ . (7:54)

اور سورج اور چاند اور ستاروں کو اس نے اپنے حکم سے کام میں لگا رکھا ہے۔

تَسْیَامْ سَرْوَاوَ کْشْتَرَاوَشِ چَنْدْرَمَسَاسَہَ . (اتھرووید13:4:28)

तस्याम सर्वा वक्श्त्रा वशे चन्द्रमसा सह

چندرما (چاند) اور یہ سب نکشتر (سیارے) اسی کے (وَش) قبضے میں ہے۔

وَلاَ یُحِیْطُونَ بِشَیْیٍٔ مِّنْ عِلْمِهِ إِلاَّ بِمَا شَاء وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ . (2:255)

(اللہ کے چاہے) بغیر اس کے علم میں سے کسی بھی چیز پر یہ لوگ حاوی نہیں ہو سکتے، اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

نَیَسْیَ دھَاوَا پِرتھِوِی اَنُوْیَچْ نَسِنْدُھورَجْسُوْ اَنْتَمَا نُشُوْقَ، نَتَسْوَ وَرْشَثَمْ اَسْیَ یَدھْیَتِ اِکُوَانْیَچْ چکِرَشِ وِشْوَمَا نُوْشَکْ . (رگ وید1:25:7)

न यस्य धावा प्रथवी अनु व्यचो न सिन्धवो रजसो अन्तमानशु:
नोत स्वविश्ठम अस्य युध्य्त एको अन्यच चकशे विशवमानुशक.

اس پرمیشور کی حد کو نہ زمین و آسمان پا سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا سیارہ، اور نہ آسمان سے ہونے والی بارش، اس ایک کے سوا دوسرا کوئی اس کائنات پر قدرت نہیں رکھتا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِیْ الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللهِ . (سورۂ لقمان:۳۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ سمندر میں کشتیاں اللہ کی نعمتوں کو لئے پھرتی ہے۔

وِیْدَ نَا وَسَمُدْ رِیَہَ . (رگ وید1:25:7)

वेद नाव समुद्रिय:

وہ سمندر کی نوکا (کشتی) کو جانتا ہے۔

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ . (2:115)
سوتم جس طرف بھی منھ کروگے اللہ کا جلوہ وہیں پاؤ گے۔
سَوِتَا پَشْچا تَاتْ سَوِتَا پُرَسْ تَاتَ سَوِتُرْتْ تَرَاتَّاتْ سَوِتَا دَهرَاتْ تَاتْ . (رگ وید10:34:14)
सविता पशचातात सविता पुरस्तात सवितोत्त्रातात्ते सविता धरात्तात.
کائنات کا مالک آگے پیچھے اوپر نیچے سب جگہ ہے۔
قُلِ ادْعُوا اللهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى . (بنی اسرائیل:110)
اے نبی! ان سے کہو، اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کے لئے سب اچھے ہی نام ہیں۔
اِيكَمْ سَدْ وِپْرَا بَهُدَها وَدَنْتِيَ . (رگ وید1:164:46)
एकं सद्विप्रा बहुधा वदन्ती
سچا خدا ایک ہے، اسی کو علماء (ودوانوں) نے الگ الگ ناموں سے جانا ہے۔
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ . (سورۃ الانعام:103)
نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے۔
نَہ سَنْدُرُشِيتِشْتَتِي رُوپَمَسْيَا نَہ چَكْشُشَا پَشْيَتْ كَشْ چَنَيْنَمْ . (شیویتاشوتر اپنشد4:20)
नसंदृशे तिश्ठति रुपमस्य न चक्शुशा पश्यति कश्चनोनमं
اس کی شکل وصورت سوچ وسمجھ سے بالاتر ہے، آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں۔
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ . (50:16)
اور ہم تو انسان کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
تُوَمْ نُو اَنْتَمَ اَتَ تَرَاتَا . (رگ وید5:24:1)
त्वंनो अन्तम उत त्राता.
تو ہم سے انتہائی قریب اور ہمارا محافظ ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ . (59:22)
اللہ تو بس وہی ایک ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود ہو نہیں سکتا چھپی اور کھلی ہر بات کو جانتا ہے۔

یَاکَ اِتّ مُشْٹُھِی کَرُشِٹْنَامْ وِچُرْشُنِیَہ . (رگ وید6:45:16)

य एक इत्त मुश्टु हि करिश्ट्नां विचश्र्णी:

جوایک انسانوں کو دیکھنے والا ہے، اسی ایک کی تعریف کرو۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ . (1:1)
کہہ دو کہ وہ اللہ ایک ہے اکیلا ہے۔

سَ اِشَ اِکَ اِکَ وِرْدِکَ اِوَ . (اتھروید14:4:12)

स एश एक एक विर्देक एव.

وہ ایشور ایک ہے اور حقیقت میں وہ ایک ہی ہے۔

أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللّٰهَ إِنِّیَ أَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ أَلِیمٍ . (11:26)
کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو میں تمہارے بارے میں ایک دردناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

مَاچِدَنْیَدْ وِشَنْسَتْ سَکھَا یُوْمَا رِشْنِیَ . (رگ وید8:1:1)

मा चिदन्यद विशंसत सखायो मा रिश्ण्य.

اے لوگو! پرمیشور کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو تو تمہارا فائدہ ہے (تمہارا نقصان نہ ہوگا)۔

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا . (5:76)
کہہ دو کیا تم اللہ کے سوا ان کی عبادت میں لگے ہو جو تمہارے نقصان اور نفع کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

اَنْدَھنْ تَمَہ پَرَاوِشَنْتِ اَسَمْبُھوْتِیْ مُپَاسَتِ تَتُو بُھوْیَ اِوَتِ تَمُوْ سَمْبُھو تِیَامْ رَتَہ . (یجروید40:9)

अन्धन्तम: प्र विशन्ति असम्भुतिमुपासते ततो भुय इवते तमो यओ सम्भुती अम रत:

جوکوئی اسمبھوتی (خدا کی بنائی ہوئی چیزیں انسان کے لئے ناممکن، آگ، ہوا، پانی اورمٹی، انسان اورحیوان وغیرہ) کی پوجا کرتے ہیں، انھیں اندھیری جہنم میں داخل کیا جائے گا اور جوکوئی سمبھوتی (انسانوں کے لئے ممکن، جیسے مکان، مندر، گاڑی اور مورتی وغیرہ) چیزوں کی پوجا کرے گا، وہ مزید گہرے اور اندھیری جہنم میں گرایا جائے گا۔

وَإِن يَرَوْاْ سَبِيْلَ الرُّشْدِ لاَ يَتَّخِذُوهُ سَبِيْلاً . (7:146)

اور بھلائی کی راہ دیکھیں تو اسے اپنی راہ نہیں بنائیں گے۔

رِتَسْیَ پَنْتھَا نَتَرَنْتَمْ دُشْکُرْتَہَ . (رگ وید 9:73:6)

रितस्य पन्था न तरान्तं दुश्कुर्त:

سچائی کی راہ کو فسادی (ظالم) حاصل نہیں کر سکتے۔

وَقُرْآنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودا . (17:78)

اور فجر کی نماز میں قرآن پڑھا کرو، یقیناً صبح میں قرآن پڑھنا مشاہدہ (ملائکہ) کا وقت ہے۔

اَگِنَہٗ پَرَاتَہَ سَوَنے پَاتوَسْمَانُ وَیْشْوَانَرُ وِشْوَکُدَ وِشْوَ شَمْبھُوَہٗ. (اتھروید 6:47:1)

अगिन: प्रात: सवने पात्वस्मान वैश्वानरो विशवक्द विश्वशंभु:

سارے انسانوں کے محبوب، کائنات کے پالنہار سب کی نیاں پار لگانے والے پرمیشور پراتہ کال کی اُپاسنا (اعمال کی دنیا) میں ہماری حفاظت فرمائیں۔

قَالَ عَذَابِيْ أُصِيْبُ بِهِ مَنْ أَشَاء وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ . (7:156)

اللہ نے فرمایا میرا عذاب میں جس پر چاہوں ڈال کر رہتا ہوں اور میری رحمت نے ہر ہر چیز کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔

تَسْیَ وَیَمْ ہِڈِسِیْ مَاپِی بھُومَ سُمْ ڈِکِ اَسِیَ سُمْتُ سْیَام . (اتھروید 7:20:3)

तस्य वयं हेडिसि मापि भुम सुम्डीके असु सुमतो स्याम

ہم اس پرمیشور کے غضب میں کبھی نہ آویں، اس کی مہربانی اور رحمت کے سائے میں رہیں۔

لاَ تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ . (10:64)

اللہ کا فرمان بدلا نہیں جا سکتا۔

اَدُبُدَھانِیُ وَرُنَسَیَ وَرُتَانِی ۔ (رگ وید1:24:10)

अदब्धानी वरुणस्य वर्तनि

ایشور کے فیصلے نہیں بدلتے۔

وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيْلاً ۔ (48:23)

اور اللہ کے دستور میں تم کسی طرح کی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

نَہُ کِرَسَیَ پَرَبھِنَنتِ وَرُتَانِی ۔ (اتھروید18:1:5)

न किरस्य प्रभिनन्ति व्रतानि

ایشور کے فیصلہ کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً ۔ (7:55)

تم اپنے اسی ایک رب سے گڑگڑا کر عاجزی اور چپکے سے دعا کرو۔

ھُوتَارَمْ سَتَیَ یَجَمْ رُوُدَسْیَ رُنتَانَہَ ھَسْتِ نَمَسَا وِوَاسَتِ ۔ (6:16:46رگوید)

होतारं सत्ययजं रोदस्यो रुन्तान हस्तो नमसा विवासते

آسمان و زمین کو چلانے والے پرمیشور، سچائی کی راہ پر چلانے والے عبادت کے لائق پرمیشور سے پورے دھیان کے ساتھ ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا کرو۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔ (الرحمٰن:26-27)

زمین پر جو کوئی ہے، فنا ہونے والا ہے، صرف آپ کے رب کی ذات باقی رہنے والی ہے، جو بزرگی اور عظمت والی ہے۔

اَوِکتَم وِکتی مَاپَنَّم مَنیَنتِ مامَ بُدَّھیَہَ پَرَم بھاوَ مَجانَنتو مَماوِیَیَ مَانُتَّمَمْ ۔ (بھگوت گیتا:7:24)

अव्यक्तं व्यक्तीमापन्नं मन्यन्ते मामबुदधय: परं भावमजानन्तो ममाव्ययमनुत्तमम.

میں لافانی ہوں اعلیٰ فطرت ہوں، مجھے نہ تو حواس پاتے ہیں اور نہ نفس، مگر کم عقل لوگ میری پاک صفات کو نہ جان کر مجھے زندگی اور موت کے چکر میں گھومنے والا معمولی انسان سمجھتے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ (البقرہ:156)

ہم اللہ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں۔

وَبِالْآخِرَتِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ . (البقرہ:5)

اور آخرت پر یقین رکھنے والے لوگ ہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

یُوْنَہَ پِتا جَنِتا یُو وِدَھا تادَھا مَانِی وِیْدُ بُھوُنَانِی وِشْوَا،یُو دِیوَ انَامْ نامَ دَھا اِیکَ اِوَ تَمْ سَمْ پَرَشْنَمْ بُھوُنا یَنْتُ یَنْیا . (رگوید 10:82:3)

यो नः पिता जनिता यो विधाता धामानि वेद भुवनानी विशवा यो देवानां नामधा एक एव तं स्मप्रशनं भुवना यान्तयन्या.

جو خدا ہماری تخلیق کرنے والا ہے، وہی سب کا پالنہار ہے، وہ پوری جگہوں اور دنیاؤں کا چلانے والا ہے، وہی سب کو جاننے والا اور سب کا نگہبان ہے، وہ ایک اکیلے ہو کر بھی طرح طرح کے (مختلف) ناموں سے جانا جاتا ہے، سب لوگوں کو آخر میں اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيْراً . (2:269)

اور جس کو چاہتا ہے دانائی عطا فرماتا ہے۔

اِنْدْرُ کْرُتَمْ نَآبھَرَ . (اتھرووید 18:3:67)

इन्द्र क्रोतुं न आभर

اے پرمیشور! تو ہمیں حکمتوں سے نواز دے۔

أَرَضِيْتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الآخِرَةِ . (9:38)

کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے۔

اَنْـوَارَ بھِ تھَامَنُسَرَمْ بھتھَا مِتَمْ لُوکَمْ شَرَدَّدھَانَاہ سَچَنْت .(اتھرووید 6:122:3)

अन्वार भेथामनुसरं भथामेतं लोकं शरददधाना: सचन्ते

ایمان والے (متقین) لوگ آخرت کا دھیان رکھتے ہوئے لگن کے ساتھ اعمال صالحہ کرتے ہیں۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ . (41:31)

اور جنت میں تمہارے لئے جو جی چاہے ہر چیز موجود ہے اور جو کچھ نعمت تم طلب کرو گے سب تم کو دی جائے گی۔

يَتَرَانَنْدَاشْچَ مُدَاشْچَ مُدَهَ پْرَمُدَاسْتِ. (رگ وید 9:113:11)

यत्रानन्दशाच मोदाशच मुद: प्रमुद आस्ते

جہاں ساری خوشیاں ملتی ہوں اور جہاں ساری آرزوئیں پوری ہوتی ہوں، اس غیر فانی دنیا میں میری جگہ ہو۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا . (3:193)

اے رب تو بخش دے ہمارے گناہ اور ہماری برائیوں کو مٹا دے۔

اَوَ نُو وَجِرْنَا شِشِي هِيْ .(رگ وید 10:105:8)

अवनो व्जिना शिशी हि

ہے پرمیشور! آپ ہمارے پاپوں کو (ہم سے) دور کیجیے۔

وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ . (46:15)

اور میرے پیچھے میری اولاد کی بھی اصلاح جاری رکھیو۔

شَمْنَهَ كُرُ پْرَجَابْهِيَهَ . (یجر وید 36:22)

शनं: कुरु प्रजाभ्य:

پربھو! ہمارے خاندان (سنتان) کی نجات (کلیان) فرما۔

مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى . (20:2)

ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں فرمایا کہ آپ (ﷺ) اتنی تکلیف اور مشقت اٹھائیں۔

سُگَمْ رِتَسْيَ پَنْتهَاهَ. (رگ وید 8:31:13)

सुगा रित्स्य पन्था:

سچائی کا راستہ آسان ہے۔

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا . (49:13)

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا فرمایا اور تم کو خاندان اور قبیلے والے بنا دیے تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

جَنَمْ مَنُوْجَاتَمْ . (رگ وید 1:45:1)

जनं मनुजातं.

سب منو کی سنتان ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسٰى أَن يَكُوْنُوْا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسٰى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ . (49:11)

اے ایمان والو! سنو کوئی قوم کسی قوم کو حقیر جان کر ہنسی نہ اڑائے، بہت ممکن ہے کہ وہ ہنسی اڑانے والوں سے بہتر ہوں، عورتیں بھی دوسری عورتوں کا دل دکھانے کے لئے ہنسی نہ کریں، عجب نہیں کہ وہ ہنسنے والیوں سے بہتر ہوں۔

مَابھَرَاتَا بھَرَاتَرَمْ دِوِکْشَنْمَا سْوَسَارَ مُتَسْوَسَا ، سَمْيَگچہ سَرْوَتَا بھُتْوَا وَچَمْ وَدَتَ بھَدْرَيَا . (اتھروید 3:30:3)

मा भ्राता भ्रत्रं द्विक्शन्मा स्वसारमुत स्वसा, सम्यग्च: सव्रता भुत्वा वाचं वदत भद्रया.

بھائی بھائی سے اور بہن بہن سے جھگڑا نہ کریں، ایک من اور گتی والے (ہم خیال) ہو کر منگل مَیٔ (خوشی سے) باتیں کریں۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا . (17:23)

اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، تمہاری موجودگی میں اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے تک پہنچ جائیں تو ان کو اُف بھی نہ کہو اور ان کو نہ جھڑکنا۔

اَنُوْ بَرَتَہ پِتُوْہ پُتْرُمَا تَابھَوَتُ سَمْنَاہ . (اتھروید 3:30:2)

अनुव्रत: पित: पुत्तो माता भवतु सम्ना:

بیٹا باپ کا خدمت گذار اور ماں کا ہم خیال ہو۔

وَأَنفِقُوا خَيْراً لِّأَنفُسِكُمْ . (64:16)

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اس میں تمہارے لئے خیر ہے۔

یَہْ اِکَ اِدوِدْیَتِ وَسُوَ مَتْرَایَ دَاشُوْشِ . (رگ وید 1:84:7)

यह एक इद विदयतेवसु मर्ताय दाशुशे.

جو پرمیشور ایک ہے وہی خرچ (انفاق) کرنے والے لوگوں کو اچھی زندگی دیتا ہے۔

وَلاَ تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ . (4:29)

اور تم اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔

اَسُـرِیَ یَـنَامَتِ لُکَ اَنْدَہ نَہ تَمَسَا وَرُتَہ تَانْسَیَ پَرِتُیَایَ گَچّھنْتَہ یِکِ چَاتْ مَھَنُوجَنَاہ . (یجروید 40:3)

असुय यनामते लोका अन्धेन तमसा वृता: तान्सै प्रेत्यापि गचछिन्त ये के चात्महनो जना:

جو انسان زندگی میں خودکشی کرتے ہیں وہ مرنے کے بعد اندھیری جہنم میں سزا کی دنیا میں جاتے ہیں۔

وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ . (24:31)

اور ایمان والی (عورتوں) کو بھی یہ حکم سنادو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے آبرو کی حفاظت کریں۔

اِدَھـہَ پَشْیَسْـوَمُـوپَـرِیَ سَـنْتَـرَامْ پَـادَکَـرْھَـرْمَاتِ کَاشَپْلُ کَرْ دَرْشَنْ اِستِرِھیٰ بَرْھَمَّا بَبُھُوتَھ . (رگ وید 8:33:19)

अध: पशयस्व मोपरि सन्तरां पादको हर मा ते काशप्लको दर्शन स्त्रि हि ब्रहम्मा बभुविथ.

عورتیں جب مردوں کے سامنے گھر سے نکلے تو نیچے دیکھے اور اپنے دونوں پاؤں کو سمیٹ کر اس طرح چلے کہ تیری پنڈلی نظر نہ آئے۔

لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً . (30:21)

تا کہ تم ان (بیویوں) سے چین اور راحت پاسکو اور تمہارے درمیان چاہت، محبت اور مہربانی کے جذبات رکھ دیئے۔

جَایَاپَتْیُ مَدْھُورَتِیُ وَاچَمْ وَدَتُوشَانْتِیُ وَامْ . (اتھروید 3:30:3)

जाया पात्ये मधुतीं वाचं वदतु शानित्वाम.

بیوی شوہر سے میٹھی بول بولنے والی ہو۔

فَلاَ وَ رَبِّکَ لا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوکَ فِیْ مَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ۔ (النساء:۶۵)

یعنی آپس کے اختلاف کے سلسلہ میں جب تک آپ ﷺ سے فیصلہ نہ کرالیں خدا کی قسم وہ مؤمن نہیں ہوسکتے۔

یَہْ شَا سْتْرَا وِدھِیْ مُتْسُرْجِیَہْ، وَرْتَتِ کَامَکَا رَتَھا ، نَسا سِدّھِی مُوَاپْنُوتِی،نہ سُکھَمْ نہ پَرانگتِم ۔ (گیتا:16:23)

य: शास्त्र विधिमुत्सुज्य वर्तते कामकारत: न स सिदधिमवापनोति न सुखं न परां गतिम.

جوشخص مقدس کتابوں (شاستر) کے احکام کی پرواہ نہ کر کے آزادانہ رویہ اختیار کرتا ہے،تو وہ کمال (سدھی) حاصل نہیں کرسکتا ہے،اس کو نہ تو اس عالم میں مسرت حاصل ہوتی ہے اور نہ اُس عالم میں اور نہ ہی اس کو منزلِ اعظم (پرم پد) حاصل ہوسکتی ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ (النساء:۵۹)

اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو،تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کردیا کرو۔

تَسْمَا چْ چھا سْتْرَمْ پَرَ ما نَمْتِ، کَارِیَہْ اَکَارِیَہْ وِوَسْتِھتَوْ گِنَا تُوَا شَا سْتْرَا وِدَھا نُوکْتَمْ ، کَرْمَکَرْ تُوْ مِھَرْ ھَسِ ۔ (بھگوت گیتا:16:24)

तस्माच्छास्त्रं प्रमाणं ते कार्याकार्यव्यवस्थितौ ज्ञात्वा शास्त्रविधानोक्तं कर्म कर्तुमिहार्हसि.

اس لئے اس امر کی تعین کے لئے کہ کونسا کام کرنے کے قابل ہے اور کونسا نہیں ، مقدس کتابیں ہی معیار ہیں ؛ اس لئے مقدس کتابوں میں بتائے ہوئے کاموں کو جان کران پرعمل کرنا چاہئے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُوحٰی ۔ (النجم:۳-۴)

وہ اپنی خواہش نفسانی سے نہیں بولتے، یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے۔

اَهَـمِـوَ سَوْ یَمِـدَمْ بَدَامِیْ جُشْتَمْ دِیْوَابِهِیْرُتْ مَانُوشِبِهِیْ ، یَمْ کَامَیِ تَتْ مَگْرَ کُرْنُمِتَمْ بَرهَمَانَمْ تَمُرْ شِتَمْ سُمِدَهامْ . (رگ وید 10:125:5)

अहमेव स्व्यमिदं वदामि जुश्टं देवेभिरुत मानुशेभि यं कामये तंतमुग्रं क्रणोमि तं ब्रह्मणं तमुर्शितं सुमेधाम.

مُنُش دیوگن (پیغمبر) جس کا مَنْ (جس کی تبلیغ) کرتے ہیں، وہ سندیش میرے ذریعہ ہی بھیجا جاتا ہے، جس کے اوپر میری کرپا (مہربانی) ہوتی ہے، وہ لوگ بڑے ہی عقلمند اور حکمت والے ہوتے ہیں۔

وَاِذْقَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰاتِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗ اَحْمَدُ . (الصّف:6)

اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے آئی ہوئی (اللہ کی کتاب) تورات کی تصدیق کرنے والا اور ایک ایسے رسول کی خوشخبری سنانے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام احمد ہوگا۔

یَگْیَمْ پَرَچ چھامْیَوَمْ سَتَدَدوُتْ ، وِوُچتی کَورِتَم پُروِیَم گَتَمْ کَسْتَدْ بِبهارَتَ ، نُتَ نَو وِتّمْ اسیَ رُودَسِی . (رگ وید 1:105:4)

यज्ञं प्च्छाम्यवमं स तददूतो वि वोचति क्व रितं पुर्व्यं गतं कस्तद्द्भार्त नुतनो वित्तं मे अस्य रोदसी .

میں تجھ سے آخری یگیہ (طریقۂ عبادت، قربانی، مذہبی طریقہ یا رسوم) کا سوال پوچھتا ہوں، جس کی تشریح ''وہ نبی'' آکر کرے گا، پچھلے رشیوں والا دھرم و دھان کہاں چلا گیا، کون اس کی پھر تجدید کرے گا، اے آسمان و زمین کے مالک میرے اس دکھ پر دھیان دو۔

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ مَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی . (البقرہ:۲۵۶)

بے شک حق واضح ہو چکا ہے گمراہی سے، جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا۔

دَرِشْٹْوَا رُوُپِ وِیَاکَارُتْسَتْیَا نُتِ پَرَجَاپَتِیَہ ، اَشْرَدَّھا مَنُوتُو اَدْدَھا چُچَھدَادْہُ سَتْیِ پَرَجَاپَتِیَہ . (یجروید 19:77)

द्दृष्ट्वा रुपे व्याकरोत्सत्या नुते प्रजापतिः अश्रद्धा मनुतो अद धाच्छधा सत्ये प्रजापतिः

پرمیشور نے حق اور باطل کو اپنی قدرت سے الگ الگ کر دیا اور حکم دیا کہ حق پر ایمان لاؤ اور باطل کو ٹھکرا دو۔

حضرت محمد ﷺ کا ذکر مقدس ہندو مذہبی کتابوں میں!

حضور اقدس ﷺ کے متعلق ہندو مذہبی کتابوں میں جو پیش گوئیاں آئی ہیں وہ اس طرح ہے :

یَگْیَمْ پَرَچْ چھامْیَوَمْ سَـــتَدَدُوتُ وِوُچَتی کَورِتَمْ پُرُوْیَمْ گَتَمْ کَسْتَد بِبھَارَتَ نُتَنُ وِتَّمْ اَسیَ رُودَسِی . (رگ وید 1:105:4)

यज्ञं पृच्छाम्यवमं स तद्दूतो वि वोचति क्व रितं पुर्व्यं गतं कस्तद् बभार्त नुतनो वित्तं मे अस्य रोदसी.

میں تجھ سے آخری یگیہ (طریقۂ عبادت، قربانی، مذہبی طریقہ یا رسوم) کا سوال پوچھتا ہوں ، جس کی تشریح وہ نبی آ کر کرے گا، پچھلے رشیوں والا دھرم ودھان کہاں چلا گیا، کون اس کی پھر تجدید کرے گا، اے آسمان وزمین کے مالک میرے اس دکھ پر دھیان دو۔

سَہ: وہ، دُوتُ: نبی، یعنی آخر میں آنے والا نبی اتنا مشہور ہوگا کہ اسے ہر کوئی جانتا ہوگا، اس کا نام لئے بغیر ضمیر کا مرجع انہیں کی طرف لوٹے گا، اس نبی کا انتظار ہوگا، سابق نبیوں کی تعلیمات کھو چکی ہوں گی، تب اس کی تصحیح وتشریح کے لئے وہ آئیں گے، بندوں کا رشتہ اس کے خالق سے جوڑیں گے، اس آخری میں آنے والے نبی کے متعلق جو پیشین گوئیاں آئی ہیں، وہ یہ ہیں :

وِیْدَاھَمِ تَمْ پُرُشَمْ مَھَانْتَمَادِتْی وَرَنْ تَمْ سَہ پَرَسْتَاتْ . (یجروید 31:18)

वेदाहमेतं पुरूशं महान्तमादित्यवर्णं तमसः परस्तात.

احمد وید (برہما گیان) ہیں (خالق کو جاننے والے ہیں) عظیم انسان ہیں، روشن سورج
کی طرح اندھیروں کو ختم کرنے والے ہیں۔

اِیدَم جَناُپ شُرُت نَراشَنسَ تَوِشیتِ، شِرِشتَم سَهَستُرَ نَورَتِچ کُورَم
آرُوشَمِ شُدَّمَهِ . (اتھروید1:127:20)

इदं जना उप श्रुत नराशंस स्तविश्यते शश्टिं सहस्त्रा नवतिं
च कौरम आ रूशमेशु द्दमहे.

اے لوگو! غور سے سنو! نراشنس (محمد) کی بہت تعریف کی جائے گی، اس مہاجر کو
60090 ساٹھ ہزار نوے دشمنوں سے میں پناہ میں لوں گا۔

''نَرَ''، انسان، ''آشَنسَ''، ستودہ شخصیت (تعریف کیا ہوا شخص) دونوں لفظوں کے ملانے سے معنی ہوتا ہے ''تعریف کیا ہوا انسان'' اور محمد کا معنی بھی ''تعریف کیا ہوا شخص ہوتا ہے''، ''کورم'' مہاجر، ''شِرِشتَم سَهَستُرَ'' ساٹھ ہزار، ''نَوَتِمچَهُ'' نوے، رسول ﷺ کی بعثت کے وقت مکہ میں پورے ساٹھ ہزار نوے لوگوں کی آبادی تھی، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اب تک کسی کا بھی نام ''نراشنس'' نہیں رکھا گیا ہے، اس وقت پوری دنیا میں جتنی تعریف حضرت محمد ﷺ کی کی جارہی ہے کسی کی گئی اور نہ کی جائے گی، آپ کی تعریف اذان میں، نماز میں، درس حدیث اور درس قرآن میں مسلسل کی جارہی ہے، اور ہر وقت آپ پر درود وسلام بھیجا جارہا ہے، کوئی لمحہ ایسا نہیں، جس میں آپ پر درود وسلام نہ بھیجا جاتا ہو۔

اُشٹرا یَسیَ پَرَواهَنُ وَدهُو مَنتُ دِوِرُدَشَ وَرشما رَتهسِیَ نِجهِڑِتِ دِو
اِشمانا اُپسپَرُشَه . (اتھروید2:127:20)

उश्ट्रा यस्य प्रवाहणो वधुमन्तो द्विर्दष वश्मर्ा रथस्य
निजिहीड्ते दिव ईशमाणा उपस्प्रश:

اس کی سواری اونٹ ہوگی، بیس اونٹنیاں ان کی ملکیت ہوں گی، اس کی سواری کی
عظمت آسمان کی بلندی کو چھوتی ہے۔

''دُوِرُ'' دو، ''دَش'' دس، ''دُوِرُدشَ'' دو دس یعنی بیس، ''وَدهُومَنت'' مادہ اونٹنیاں، یعنی بیس اونٹنیاں، وید کے اس حوالے میں جس مقدس ذات کی پیشین گوئی کی گئی ہے، وہ حضرت محمد ﷺ ہیں، جنگ ''الغابہ'' میں حضور کے پاس بیس اونٹنیاں تھیں،، ڈاکٹر ایم اے شری واستو نے اپنی کتاب ''حضرت محمد ﷺ اور بھارتیہ دھرم

گرنتھ'' میں لکھا ہے کہ اس منتر کے پورے مصداق حضرت محمد ﷺ ہیں؛ کیونکہ ہندو دھرم کی کسی بھی مہان شخص کی سواری اونٹ نہیں تھی، تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ آپ ﷺ کی سواری آسمان کی بلندی کو چھو کر آئی ہے، جسے ''واقعہ معراج'' سے یاد کیا جاتا ہے۔

اِشْ اِشـائِــے مَامَہِ شِتَمْ نِشْکَانُ دَشْ سَتْرَجَہْ ، تِرِنِ شْتا نْیُوَرْتامْ سَہَسْتْرا دَشْ گُونام . (اتھروید 127:20:3)

एश इशाय मामहे शतं निश्कान दश स्त्रज: त्रीणि श्तान्यर्वतां सहस्त्रा दृश गोनाम.

ایشور مامہے رشی کو سوسونے کے سکے دے گا، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں دے گا۔

سو (۱۰۰) سکے سے مراد حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے سو اصحاب ہیں، حبشہ کی طرف دو مرتبہ ہجرت ہوئی ہے، دونوں مرتبہ کے مہاجرین کی مجموعی تعداد سو ہوتی ہے جیسا کہ ''اصح السیر'' (صفحہ ۴۵) میں مذکور ہے۔

ڈاکٹر ایم اے شری واستو نے لکھا ہے کہ ''سو سکے'' سے مراد ''اصحاب صفہ'' ہیں، تین سو گھوڑے سے مراد تین سو تیرہ اصحاب بدر ہیں، ڈاکٹر وید پرکاش اپادھیائے نے لکھا ہے کہ سنسکرت میں تین سو سے زیادہ کے لئے بھی تین سو کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے یہاں پر ہوا ہے، گھوڑا بہادری کی علامت ہے، یہ صحابہ بھی بڑے بہادر تھے، اسی وجہ سے انہیں گھوڑے سے تشبیہ دی گئی، دس ہزار گائے سے مراد فاتحین مکہ ہیں، جنہوں نے غیر معمولی شفقت ومحبت اور عفو درگذر کی ایسی بے مثال تاریخ قائم کردی کہ جسے قیامت تک کی انسانیت یاد رکھے گی، لفظ ''گائے'' نیکی کے معنی کی ادائیگی کے لئے بھی بولا جاتا ہے، اصحاب رسول ﷺ بھی نیکیوں کے پیکر تھے، دس مالائیں سے مراد عشرہ مبشرہ ہیں، جنھیں اسی دنیا میں جنت کی بشارت دیدی گئی تھی، جس طرح گلے کی چاروں طرف مالائیں ہوتی ہیں، اسی طرح یہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کے اردگرد ہوتے تھے، جو ہر وقت دین وایمان کی اور رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، حضرت محمد ﷺ کا ذکر صرف ویدوں میں ہی نہیں ہے؛ بلکہ ہندو مذہبی کتاب ''پرانوں'' میں بھی بڑی تفصیل سے آیا ہے۔

پُرانوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم

داوَدَشیام شُکَلْ پَکْشَسْیَ مادھُوِماسی مادھَوَمْ جاتے دَدَرْ شْتُوہ پُتْرَمْ پِتْرَو ھَشْٹَمانْسَوْ . (کلکی پران 2:15)

द्वादश्यां शुकल पक्शस्य माध्वे मासि माधव: जाते ददृशतु: पुत्रं पित्रौ हष्टमानसौ.

جس کی پیدائش سے دکھی لوگوں کو خوشیاں ملیں گی ،اس کی پیدائش مدھو ماس (چیت ویشاکھ کا مہینہ) میں سموار کو چاند کی بارہ تاریخ کو ہوگی۔

لِنگ چھیدِیُ شِکھَاھِنَہَ شِمَشْرُو دَھارِی سَدُوشَکَہَ — اُچَّ لاَپِی سَرْوَ بھَکْشی بھَوِشْیَتی جَنُومَمْ — وِناکولَمْچَ پَشْوَسْتِ شامْ بھَکْشیا مَتا مَم ، مُسَلِ نَیوَسَنْسْکارَہ کوشَیْرِوْ بھَوِشْیَتی — تَسْمانْ مُسَلْوَنْتُوهِي جاتَیُو دَھرَمْ دُوشَکاہَ — اِتی پَیْشاچْ دَھرْمَشْچَ بھَوِشْیَتِی مَیاکُرْتَہَ . (بھوشیہ پران 3:3:1:25-27)

लिन्नच्छेदि शीखाहीन: शमश्रुधरी स दूशक: उच्चालापी सर्व भक्शी भविशयति जनोमम, विना कैलं च पशवस्तेशां भक्श्या मताम्म, मूसलेनेव संस्कार: कूशैरिव भविशयति, तस्मान्मुसलवन्तो हि जातयो धर्मदूशका:, इति पौशाचधर्मश्च भविशयति मया कूत:.

وہ مختون ہوں گے ،جٹو نہیں رکھیں گے ،داڑھی رکھے ہوں گے ،اونچی اور مضبوط آواز میں بلائیں گے (یعنی اذان دیں گے) گوشت ترکاری دونوں کھائیں گے (مشرا ہاری ہوں گے)(اللہ) ایشور کے نام سے ذبح کیا ہوا کھانا ہی کھائیں گے (حلال گوشت کھائیں گے)مسلمانوں کے نام سے جانے جائیں گے، انہی سے اسلام دھرم پھیلے گا۔

اِے تَسْمِنَّنْ تُرِ مَلیچھ آچارِیَنْ سَمَنْوِتَہَ ، مَحامَدَ اِتکھْیاتَ شِشْیَ ساکھَ سَمَنْوِتَہَ . (مہا بھوشیہ پران 3:3:5-8)

एतस्मिन्नतरे म्लेच्छ आचार्येर्ण समन्वित: महामद इति ख्यात: शिश्यशाखा समन्वित:

بیرون ملک کا ایک مبلغ (دھرم گرو) اپنے شاگردوں سمیت آئے گا،جن کا نام محمد ہوگا،وہ ریگستان کا رہنے والا ہوگا۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ ہندو دھرم گرنتھوں میں بہت معروف ہیں اور ہندو برادران کو ان کی اپنی نجات کے لئے حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دیگر اقوام کو، اس طرح

معلوم ہوا کہ ہندو مذہبی کتابوں میں قرآنی تعلیمات اور حضرت محمد ﷺ کا ذکر بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے :

الَّذِيْنَ آتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ . (البقرہ:121)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ کما حقہ اس کتاب کی تلاوت کرتے تو اس (قرآن) پر ضرور ایمان لاتے۔

اب کیا کرنا چاہئے؟

مندرجہ بالا حوالجات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر صاحب ایمان کا دل بیقرار ہوگا اور پھر وہ اس بات کی طرف کوشاں ہوں گے کہ میں بھی نبی کی اس سنت کو زندہ وتابندہ کرنے کے لئے اپنی جان اور اپنے مال کی بازی لگا دوں گا، جس کی تگ ودو میں محبوب کبریا نے اپنی ساری محنتیں لگا دیں اور دنیا کے لوگوں کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خالق کی غلامی میں آنے کی راہ دکھائی اور اس کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑی، آپ ﷺ بیک وقت مبلغ ومعلم، مجاہد، ناصح، حاکم، عادل اور منصف کے ساتھ اخلاق کے اونچے معیار پر فائز تھے، آپ ﷺ اپنی امت کے لئے ایسے آئیڈیل اور نمونہ ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد پوری انسانیت مل کر بھی اس جیسی کوئی ایک مثال نہ پیش کی ہے اور نہ پیش کر سکے گی :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا . (الاحزاب:۲۱)

اللہ کے رسول ﷺ تم میں سے اس کے لئے نمونہ ہیں جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی تم میں سے اس کے لئے بہترین نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، حضور اقدس ﷺ کی بعثت پوری انسانیت کے لئے ہے اور قیامت تک کا ہر فرد آپ کا اور قرآن پاک کے پیغام کا مخاطب ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ، کہہ کر بات ارشاد فرمائی ہے کہ ساری دنیا کے انسانوں، بادشاہوں، وزیروں، گورنروں، حاکموں، محکوموں، امیروں، غریبوں، زمینداروں، مزدوروں، تاجروں، خریداروں، عادلوں، قاضیوں، صنعت کاروں، سیاستدانوں، دوسری طرف ایمان لانے والوں، غیر ایمان والوں، نبیوں، ولیوں، مرشدوں، مریدوں، مقتداؤں، مفتیوں، عالموں، فاضلوں، مہتمموں، ناظموں، متعلموں، معلموں، محدثوں، صوفیوں، زاہدوں، نمازیوں، روزے داروں، حاجیوں، قاریوں، حافظوں، ذاکروں، عارفوں، مفسروں، داعیوں، مصلحوں، غرض دنیا اور دین کے جس منصب اور غالب ومغلوب حالت میں دنیا میں قیامت تک کوئی بھی انسان جہاں کہیں بھی آباد ہو، اس سے

خطاب ہے کہ تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی اُسوہ ہے اور وہ صراطِ مستقیم جو اکیلا سیدھا راستہ کامیابی وکامرانی اور نجات کا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب تک پہنچانے والا وہ اکیلا راستہ رسول ﷺ کی زندگی کو نمونہ بنا کر چلنا اور آپ کی اتباع کرنا ہے اور یہی ہے سیدھا راستہ۔

کیوں کہ اسلام کو رہتی دنیا تک کا دین بنانا اللہ تعالیٰ کے یہاں طے تھا، اس لئے کہیں ذاکر کثرت ذکر کو نبی کی اتباع سمجھ کر صرف ذکر کو اسلام نہ سمجھنے لگے، کوئی اسلامی مباحث کو، کوئی مخلوق کی خدمت کو، کوئی درس وتدریس، کوئی مراقبہ اور کوئی اوراد واشغال کو، کوئی اصلاح وتذکیر کو صراط مستقیم، اور کامل اسلام اور نبی ﷺ کی مکمل اتباع سمجھ کر صرف ذکر کو اسلام نہ سمجھنے لگے، اس لئے ساری غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لئے ببانگِ دہل اپنے نبی سے اعلان کروادیا کہ اے نبی اعلان کردیجئے گمراہی اور اجزائے دین کو دین سمجھنے والوں کو اور زادراہ کو راہ سمجھنے والوں کو واضح اور دوٹوک الفاظ میں سمجھا دیجئے:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ. (یوسف:۱۰۹)

"هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓ اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ "میرا راستہ میرا طریقہ اللہ کی طرف بلانا دعوت دینا ہے، اندھا بہرہ ہو کر نہیں؛ بلکہ دلائل اور براہین سے مطمئن کر کے، یہ راستہ میرے لئے ہی مخصوص نہیں میں تو خدا کا رسول ہوں، یہ دعوت اِلی اللہ کا کام مجھ پر ختم ہوگیا میں نے اس کا حق ادا کردیا کہ میرے اصل نام محمد احمد مصطفیٰ ہیں اور میں اس دعوت اور کارِ رسالت کی پہچان سے بطور نام رسول اللہ زمین وآسمان اور کل جہان میں مشہور ہوگیا، اور دعوت کا یہ کام میرے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ "اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ "یہ دعوت اِلی اللہ میرا اکیلا طریقہ نہیں؛ بلکہ میرا درد میری تڑپ کو سمجھ کر میری اتباع اور میری پیروی کرنے والے ہر اُمتی کا یہی طریقہ ہے، اس دعوت اِلی اللہ کے کام کو پہچان بنائے بغیر کسی راستے پر میں نہیں چلوں گا "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ "اس راستہ کے علاوہ کوئی راستہ صراط مستقیم نہیں ہے اس کے علاوہ ہر راستہ اللہ سے دور پہنچانے والا ہے اور میں اس پر چل کر شرک کرنے والا نہیں بن سکتا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے کسی طبقہ، علاقے کا کوئی فرد ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے صراطِ مستقیم، دین قیم اور اسلام کے علاوہ کوئی راستہ منزل تک رسائی اور نجات کا ذریعہ نہیں ہوسکتا اور صراط مستقیم رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اور آپ کی اتباع ہے اور وہ اتباع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی رسول اللہ ﷺ کی طرح رسول اللہ یعنی داعی اِلی اللہ، داعی اسلام مشہور نہ ہوجائے اور دعوت اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو دوزخ سے بچانے کا اس پر اس طرح غلبہ نہ ہوجائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات عالی پر تھا جس میں غیر ایمان والوں کو ایمان لانے کی فکر کو بنیادی

حیثیت حاصل ہے، آپ ﷺ کی مبارک زندگی تبلیغ دین اور دعوتِ اسلام سے ایسی معمور تھی کہ شب وروز اہم ترین مشغلہ یہی عظیم کام کارِ دعوت تھا، بے ایمان والوں کو دعوتِ اسلام دینے کی فکر کس درجہ تھی اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے لگایا جاسکتا ہے جو سورۂ شعراء میں وارد ہوا ہے، بلاشبہ اس آیت کریمہ میں آپ ﷺ کی کیفیت قلبی بیان ہوئی ہے :

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ .(الشعراء:۳)

شاید آپ اپنے آپ کو اس وجہ سے ہلاک کرلیں گے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

اُمتِ مسلمہ کو اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پانے کے لئے ضروری ہے کہ صراطِ مستقیم کی رہنمائی میں، اپنے رسول ﷺ کی اتباع میں نہ صرف دعوتی شعور پیدا ہو؛ بلکہ وہ عملاً اپنے منصبی فریضہ پر کھڑی ہو، دعوت کے اس فرض منصبی کو انجام دینے کے لئے اس کو قرآن وسیرت سے کچھ رہنما اصول معلوم کرکے ان کے سایہ میں اس کام کو کرنا ہوگا، ان اُصولوں کی اہمیت محض علم سے نہیں؛ بلکہ میدان عمل میں پہنچنے کے بعد ہی معلوم ہوسکتی ہے، ہندو بھائی کو ان کی کتابوں کی تعلیمات بتا کر بھی مطمئن کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا حوالجات سے معلوم ہوتا ہے، دور حاضر میں مسلمانوں کے لئے برادران وطن کو دین اسلام کی دعوت دینا نہایت آسان ہے، اس لئے کہ ان کی کتابوں میں پوشیدہ تعلیمات کو منظر عام پر لایا جاچکا، اگر کوئی عزم مصمم کے ساتھ اس کار خیر کو لے کر آگے بڑھتا ہے تو ایک کے حق میں لاکھوں افراد آئیں گے جو دین اسلام کو اپنا دین سمجھ کر قبول کریں گے جسے تجربہ کرکے دیکھا جاسکتا ہے، اس طرح سے داعی کے لئے بھی جنت کا حصول آسان ہوجائے گا؛ بلکہ فرمان نبوی ﷺ کے مطابق جنت واجب ہوجاتی ہے۔

وما توفيقي إلا بالله .

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید اور بدھ مت کی کتابیں
مشترک تعلیمات — جائزہ اور تجاویز

مولانا محمد سرور فاروقی ندوی⊙

قرآن عربی کا لفظ ہے، جو فعلان کے وزن پر ہے یعنی پڑھنا۔ دنیا میں بہت سی کتابیں پڑھی گئیں؛ لیکن قرآن کا پڑھا جانا عجیب وغریب معجزہ ہے کہ پورے چوبیس گھنٹے میں کوئی ایسا سکینڈ نہیں گذرتا جس میں کہیں نہ کہیں قرآن پڑھا نہ جاتا ہو، اس سے قرآن کا نام قرآن ہونا خود ثابت ہو جاتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ یہ قیامت تک باقی رہنے والی کتاب ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ . (الحجر:۹)

بے شک ہم ہی نے نصیحت نامہ نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت میں ڈرانے والے بھیجے؛ لیکن وہ نبی چوں کہ آخری نہ تھے اور نہ اُن کی تعلیمات آخری تھیں، اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کو ایسی کتاب دیکر بھیجا گیا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا وعدہ فرمایا یعنی اب قیامت تک صرف یہی ہدایت کی کتاب رہے گی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہ تو رہبانت کی تعلیم دی اور نہ نفس کو مارنے کی اس لئے کہ انسان ایک اس فطری نظام سے یعنی عبادت گاہ ہو یا گھر، دوکان ہو یا کھیت، تجارت ہو یا ملازمت، سیاسی دائرہ ہو یا فرائض کی ذمہ داریاں، اس سے جدا ہو کر حقیقی زندگی نہیں گزار سکتا، جب کہ قرآن انفرادی، اجتماعی، اعتقادی، فکری، عملی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، قانونی، سیاسی یا عدلیہ کا نظام ہو، ہر جگہ انسان کی رہنمائی کرتا ہے، اس کے برعکس پچھلی جتنی تعلیمات ہیں ان سب میں تحریفات ہو چکی ہیں، اس لئے وہ تمام تعلیمات ناقابل عمل ہیں، یوں تو گوتم بدھ کے بارے میں حمید عبد القادر صاحب نے اپنی کتاب ''**بدھا حیاتہ وفلسفاتہ**'' میں ثابت کیا ہے کہ گوتم بدھ سے مراد ذوالکفل ہیں اور البیرونی نے بھی رسول سے تعبیر کیا ہے؛ لیکن قرآن وحدیث سے اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی، یہاں گوتم بدھ اور ان کی کتاب سے متعلق معلومات دعوت کے نظریہ سے پیش کی جاتی ہیں۔

⊙ صدر: جمعیت پیامِ امن، لکھنؤ۔

بدھ مت کا مختصر تعارف

بدھ مذہب (बुद्ध धर्म) کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح ہوا، جس کے بانی گوتم بدھ (गौतम बुद्ध) سدھارتھ (सिद्धार्थ) جو شدودھن (शुद्धोधन) کے بیٹے تھے، ان کی پیدائش ہندوستان نیپال کی سرحد پر واقع لمبنی گارڈن میں ہوئی تھی، ولادت کے سات روز بعد والدہ کا انتقال ہوگیا، سوتیلی ماں نے پرورش کی، ان کی پرورش شاہانہ ہوئی، انھیں کسی بھی طرح کے عیش وآرام اور مادی راحت وآسائش کی کمی نہیں تھی، ان کی شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہوگئی تھی شادی کے دس سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام راہل رکھا۔

ایک روز شہزادہ سدھارتھ راج محل سے سیر وتفریح کی غرض سے باہر نکلے، راستے میں ایک بوڑھا آدمی نظر آیا، شہزادہ نے ساربان سے پوچھا: کیا میں بھی بوڑھا ہو جاؤں گا؟ ساربان نے کہا ہاں، مہاراج ہم تمام انسان ایک روز اسی حالت کو پہنچیں گے غمگین شہزادہ سدھارتھ نے متفکر ہو کر رتھ واپس محل لے چلنے کا حکم دے دیا۔

دوسرے دن پھر تفریح کے لئے ساربان کے ساتھ رتھ کی سواری پر نکلے، کچھ دور چلنے کے بعد ایک بیمار انسان کو دیکھ کر رتھ رکوادیا، ساربان سے دریافت کیا: یہ کون ہے ساربان نے بتایا کہ یہ شخص ایک مہلک بیماری سے متاثر ہے، شہزادہ نے پوچھا، کیا ہم بھی بیمار ہو سکتے ہیں؟ ساربان نے جواب دیا: ہاں، شہزادے ہم تم اور دوسرے تمام انسانوں کی یہ حالت ہو سکتی ہے‘‘ شہزادہ فکرمند ہو کر رتھ واپس لے چلنے کا حکم دے دیا۔

تیسرے دن پھر جب شہزادہ ساربان کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر باغ کی طرف رخ کرتا ہے تو راستہ میں ایک شخص کی لاش کو چار آدمی کندھے پر اُٹھائے لئے جا رہے تھے، گوتم نے پوچھا: یہ کون ہے؟ ساربان نے بتایا کہ یہ ایک مردہ ہے، شہزادہ نے پوچھا: کیا ہم بھی مر جائیں گے؟ ساربان نے جواب دیا: ہم، آپ اور دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں، ایک روز سب کو مرنا ہے، یہ سن کر شہزادہ نے رتھ واپس لے چلنے کا حکم دیا اور اس منظر کو دیکھ کر وہ بہت غمگین اور فکرمند ہو گیا۔

چوتھے دن شہزادہ رتھ پر سوار ہو کر تفریح کے لئے نکلا تو راستہ میں ایک سنیاسی ملا، شہزادہ نے ساربان سے پوچھا: یہ کون ہے؟ ساربان نے بتایا: یہ سنیاسی ہے، یہ دنیا کی ساری دلفریبیوں کو ترک کر کے آزادانہ غور وفکر میں محو ہو گئے، یہ انھیں تمام مادی عیش وآرام اور تمام دنیاوی علائق سے بے نیاز ہو جانے کا باعث بنی، شہزادہ اپنے ایک سال کے بیٹے راہل اور بیوی یشودھرا (यशोधरा) کو چھوڑ کر گھر سے نکل گئے۔

گھر چھوڑنے کے بعد گوتم کو پیدائش، بیماری، بڑھاپا اور موت وغیرہ دکھوں سے نجات حاصل کرنے کی غیر معمولی فکر اور تجسس ہوئی، ایک روز انھوں نے اپنا سر مونڈ ڈالا اور ایک سنیاس کا زرد لباس اختیار کرلیا، مسلسل چھ سال

تک وہ اپنے مسئلہ کے حل کے لئے مشہور روحانی گروؤں سے تربیت حاصل کر کے سخت ریاضت کرتے رہے مگر انھیں یہ سب بھی بے کار محسوس ہونے لگا اور دلجمعی حاصل نہ ہو سکی، ایک روز جب وہ اوریلہ (उरुवेला) نام کے ایک گاؤں میں سادھنا (گیان دھان) میں مستغرق تھے کہ اسی حال میں ۴۹ دن کے مراقبہ کے بعد بہار میں جس مقام کو بودھ کہا جاتا ہے وہیں پر ایک روشنی ظاہر ہوئی، جس کے معنی ہوتے ہیں روشن یا گیان (معرفت) حاصل کر لینے والا معرفت کو ''بودھی'' کہا جاتا ہے اور جس درخت کے نیچے گیان حاصل ہوا تھا اسے ''بودھی ورکچھ'' کہا جاتا ہے۔

ایک روز ایک درخت کے نیچے صبح سے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے، شام کے وقت اچانک ایک وجدانی کیفیت پیدا ہوئی اور انھیں بودھ کا درجہ مل گیا، وہ بے ساختہ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوئے :

> اے انسانوں کے خالق ! جب تک میں نے تجھے نہیں پایا تھا مجھے حیات وممات کی کشمکش سے گذرنا پڑتا تھا؛ لیکن اب میں نے تجھے دیکھ لیا ہے مجھے اُمید ہے کہ تو پھر رزیل نہیں بنائے گا۔

یہ جملے جو بے اختیار زبان سے نکلے اس میں بدھا نے خدا کا اعتراف کیا ہے؛ لیکن بعد میں پھر کبھی ان کی زبان پر خدا کا نام نہیں آیا اور خدا کی ذات وصفات کے متعلق انھوں نے اپنے مریدوں کو بھی تعلیم نہیں دی، شاید ان کا مقصد اخلاقی اُصول مرتب کرنا رہا ہوگا، بہر حال جو کچھ وہ تعلیم دیتے رہے اس کا خلاصہ جو انھوں نے اپنے ابتدائی پانچ مریدوں کے سامنے دیا تھا، وہ اس طرح ہے۔

سنو اے بھکشو! دکھ کی اعلیٰ سچائی، پیدائش دُکھ ہے، زوال (عمر) دکھ ہے، بیماری دکھ ہے، موت دکھ ہے، سنو اے بھکشو! دُکھ کے سبب کی اعلیٰ سچائی، راحت کی تشنگی زندگی کی تشنگی، ثروت کی تشنگی، نئی پیدائش کی تشنگی۔

سنو اے بھکشو! دکھ دُور کرنے کی اعلیٰ سچائی، خواہش کا فنا کر دینا، تشنگی معدوم کر دینا۔

سنو اے بھکشو! اس جادہ کی اعلیٰ سچائی جو رفع تکلیف تک پہنچا دیتا ہے، صحیح عقیدہ، صحیح تمنا، صحیح کلام، صحیح چال چلن، صحیح ذریعہ معاش، صحیح کوشش، صحیح میلان، صحیح مراقبہ۔

جس روز بدھا کو گیان حاصل ہوا تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال کی تھی اس کے بعد ۴۵ سال تک تعلیم وتبلیغ میں مصروف رہے یہاں تک کہ ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

سب سے پہلے انھوں نے اپنا علم ومعرفت ان پانچ سنیاسیوں کے سامنے پیش کیا جو بعد میں ان سے ناراض ہو کر رشی پتن (ऋषिपत्तन) یعنی سارناتھ آ گئے تھے (یہ مقام بنارس سے قریب ہے) اس کے بعد یش (यश) نام کے مہاجن سیٹھ اور اس کے ساٹھ دوستوں کو تربیت دی اور پھر اپنے مذہب کی تبلیغ میں لگ گئے۔

گوتم بدھ کو جن چار مقدس صداقتوں کا علم ہوا وہی چاروں قدیم سچائیاں بودھ مذہب کی بنیاد بنے: (۱) دکھ (۲) دکھ کی وجہ (۳) دکھ کا ازالہ (۴) دکھ کے ازالہ کی تدبیر۔

بنیادی طور پر مہاتما بدھ مصلح تھے اور عام طور پر بانی مذہب کی حیثیت سے مشہور ہیں، موصوف نے سماج میں پائی جانے والی خرابیوں اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی، اپنے اُصولوں کی تبلیغ کرتے وقت انھوں نے بار بار کہا: (एबाद्यम्मौ सनातन) یعنی یہ سچائی ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔

انھوں نے مذہب کی حقیقی شکل کو "بہوجن ہتائے، بہوجن سکھائے" (बहुजन हिताय बहुजन सुखाय) (یعنی سب کا بھلا ہو اور سب کو آرام ملے) کے جذبہ سے پیش کیا، انھوں نے بتایا کہ انسان کی زندگی میں پیدائش سے لے کر موت تک دکھ ہی دکھ ہے جسے انھوں نے چار عظیم حقیقتوں کے روپ میں پیش کیا۔

بدھ مت کے عقائد

توحید کے متعلق عقیدہ: توحید کے بارے میں یہ خاموش ہیں، ایک بار بدھ کے شاگرد نے پوچھا کہ اللہ کون ہے؟ یہ خاموش رہے جب پھر زور دے کر پوچھا تو جواب دیا کہ اگر آپ کے پیٹ میں درد ہو تو کیا اس پر غور وفکر کریں گے یا علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس جائیں گے، ہمارا کام تو مصیبتوں کو دُور کرنا ہے، بدھ نے فطری قوانین کو ہی اللہ کا درجہ دیا۔

حقائق کی روشنی میں چار باتیں بدھ مت کی چار اعلیٰ صدائیں کہلاتی ہیں: (۱) دکھ یعنی دنیا میں ہر طرف دکھ ہی دکھ ہے، (۲) دکھ کا سبب یعنی خواہش ہے، (۳) دکھوں کا ازالہ خواہش کے ختم کر دینے سے ممکن ہے، (۴) دکھ کے ازالہ کی تدبیر۔

دکھ کے ازالے کی تدبیر کے لئے بدھ نے مندرجہ ذیل آٹھ اُصول مقرر کئے ہیں۔

(۱) صحیح نظریات (समयक दृष्टि): اس کا مطلب ہے زندگی کے بارے میں بدھ مت کے نقطۂ نظر اور خاص طور سے اس کی تعلیم کردہ چار صداقتوں کو غیر مشروط طریقے سے مان لینا ہے۔

(۲) صحیح عقیدہ (समयकसन्कल्प): اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر ایسے خیالات اور جذبات کو پیدا کرے، جو تمام اخلاقی برائیوں سے پاک ہوں۔

(۳) صحیح قول (समयक वाक): اس کا مطلب ہے کہ جھوٹ، غیبت اور بدزبانی سے بچا جائے۔

(۴) صحیح عمل (समयक कर्म): اس سے مراد یہ ہے کہ خیانت، بدکاری، قتل وغارت گری سے بچا جائے۔

(۵) صحیح رزق (सम्यक आजीविका): اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی محنت سے اور جائز طریقے سے حاصل کی ہوئی روزی پر گزارا کرنا چاہئے۔

(۶) صحیح کوشش (सम्यक व्यायाम): اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے احکام پر پوری طرح عمل در آمد کرنا چاہئے۔

(۷) صحیح حافظ (सम्यक स्मृति): اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے گذشتہ اعمال کو یاد رکھتے ہوئے محاسبہ کرتے رہنا چاہئے۔

(۸) صحیح تخیل (सम्यक समाधि): اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو دنیاوی لذات سے بے نیاز ہو کر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہنا چاہئے۔

ان آٹھ طریقوں پر عمل کرنے کے بعد گوتم بدھ نے مندرجہ ذیل دس اخلاقی احکام دیئے اور بودھوں سے کہا کہ وہ ان احکام کی سختی سے پابندی کریں۔

(۱) کسی جاندار کو قتل نہ کرنا۔ (۲) چوری نہ کرنا۔

(۳) جھوٹ نہ بولنا۔ (۴) زنا نہ کرنا۔

(۵) نشہ آور اشیاء کا استعمال نہ کرنا۔ (۶) دوپہر کے بعد کھانا نہ کھانا۔

(۷) ناچ، گانے اور موسیقی سے دور رہنا۔ (۸) خوشبو کا استعمال نہ کرنا۔

(۹) کسی آرام دہ جگہ پر نہ بیٹھنا نہ سونا۔ (۱۰) سونے اور چاندی کا استعمال نہ کرنا۔

بدھ مت کے مندرجہ بالا عقائد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انتہائی سیدھا سادا حکم دیا تھا تا کہ اس پر تمام لوگ آسانی سے عمل کر سکیں، چاہے وہ کسی بھی ذات سے تعلق رکھتے ہوں۔

گوتم بدھ نے عوام کو دکھوں اور تکلیفوں سے نجات دلانے کے لئے ذات پات کے نظام سے پاک سماج کی تشکیل کی اور سبھی لوگوں کے لئے مذہب کا دروازہ کھولتے ہوئے انھوں نے کہا :

> جو بھی شخص، چاہے، وہ برہمن ہو، چھتری ہو، ویش ہو یا شودر، نیک عمل کرے گا وہی نجات کا حقدار ہوگا۔(۱)

بدھ مت اور رسالت

گوتم بدھ اوتار واد پر یقین بالکل نہیں رکھتے تھے، ان کی حیات تک بدھ مت میں اوتار واد کا کوئی تصور نہ تھا،

(۱) ریتا شرما، پراچین بھارت کا اتہاس: ۸۔

ان کے یہاں بدھ کو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک انسان ہی سمجھتے ہیں کسی کا تبدیل شدہ روپ تسلیم نہیں کرتے؛ البتہ گوتم بدھ سے پہلے بھی تقریباً ۲۴ بدھ مانتے ہیں، ول ڈیورنٹ کے الفاظ میں :

گوتم بدھ نے حصول علم وآگہی کا دعویٰ کیا تھا اوتار واد کا نہیں ۔(۱)

بدھ مت میں اوتار واد کا نظریہ کنشک کے زمانے میں شامل کیا گیا بدھ مت شروع میں دو فرقوں (۱) یان اور (۲) مہایان میں تقسیم ہو گیا اور مہایانیوں نے بدھ کی مورتی بنا کر اس کی پوجا شروع کردی، کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ کی پہلی مورتی غالباً بھارت میں تقریباً ۵۰ء میں بنائی گئی، بعد میں بعض لوگوں نے گوتم بدھ کو وشنو کا اوتار کہہ ڈالا۔

بدھ مذہب میں عبادت کے طریقے

مختلف بودھ ملکوں میں عبادت کے مختلف طریقے رائج ہیں، بھارت میں لوگ بدھ کی مورتی کی پوجا کرتے ہیں، تھائی لینڈ میں عام لوگوں کے لئے یہی کافی ہے کہ ہر روز یا کبھی کبھی عبادت کرلیں؛ لیکن مذہبی رہنماؤں کے لئے دن میں تین بار صبح، دوپہر اور شام عبادت کرنا لازمی ہے۔

بودھوں کی عبادت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی کوششوں سے، بغیر کسی مافوق الفطرت نجات دہندہ کی اعانت کے خود ہی نجات حاصل کی جائے، بدھ مت کی عبادت کا ہر عمل بدھا کے لئے اظہار عقیدت کے تعریفی کلمات سے شروع ہوتا ہے، تعریف اسی کے لئے ہے، بابرکت ذات، اعلیٰ وافضل، پوری طرح باخبر ذات، اس کے فوراً بعد تین تعوذ (پناہ طلب کرنے والے کلمات) ادا کئے جاتے ہیں :

میں بدھا کی ذات کی طرف پناہ کے لئے رجوع کرتا ہوں، میں عقیدہ کی طرف اپنی پناہ گاہ کے طور پر رُجوع کرتا ہوں، میں راہبوں کی برادری سے پناہ کے لئے رجوع کرتا ہوں۔

اس کے فوراً بعد پانچ احکامات کہے جاتے ہیں، یہ فرامین واحکام ہیں جن کے پابندی کی ایک بدھ سے توقع کی جاتی ہے فی الواقع وہ احکامات نہیں؛ بلکہ ہر شخص کے عزم کو ظاہر کرنے والے کلمات ہیں، عبادت کرنے والا مقولوں کو خود اپنے طور پر ادا کرسکتا ہے یا وہ اس کام میں راہب سے اعانت طلب کرسکتا ہے، دوسری صورت میں راہب کے ان کلمات کی ادائیگی کے ساتھ خود ان کو دہراتے ہیں، یہ اقوال مندرجہ ذیل ہیں۔

ایک بدھا کو جن چیزوں کا عہد لینا ہوتا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) میں جان کے ضیاع سے پرہیز کرنے کی پابندی کا عہد کرتا ہوں۔

---

(۱) پراچین بھارت، ٹی این گپتا:۱۲۔

(۲) میں اس قول کی پابندی کا عہد کرتا ہوں کہ وہ چیزیں میں نہ لوں گا جو مجھے نہیں دی گئی ہیں۔
(۳) میں جنسی بے راہ روی سے پرہیز کرنے کی پابندی کا عہد کرتا ہوں۔
(۴) میں غلط بیانی سے پرہیز کرنے کی پابندی کا عہد کرتا ہوں۔
(۵) میں کشید کی ہوئی اشیاء سے حاصل کردہ شرابوں سے پرہیز کرنے کا عہد کرتا ہوں۔

اس طرح ان کے یہاں عبادت میں نذر و نیاز اور دعاؤں کے اہتمام کے ساتھ ایصال وثواب کا طریقہ بھی رائج ہے، ساتھ ہی مقدس مقامات کی زیارت اور بعض تہوار بھی مناتے ہیں۔

عبادت میں نذر و نیاز کا طریقہ

عبادت گزار عبادت کی ہر جگہ پر نذر پیش کرتے ہیں، یہ مختلف قسم کی ہوتی ہیں، پھول، تیل سے روشن ہونے والے لیمپ (چراغ)، موم بتیاں، جلانے والی خوشبوئیں، کھانا، مشروبات اور راہبوں کی ضرورت کی اشیاء۔

جب کوئی عبادت کرنے والا پھولوں کا نذرانہ پیش کرتا ہے تو وہ زندگی کی ناپائداری پر غور کرتے ہوئے مندرجہ ذیل کلمات ادا کرتا ہے :

> میں پھولوں کا ہر گلدستہ تازہ رنگ و بو والا منتخب عالی مقام عارف کے مقدس کنول سے مشابہ قدموں میں پیش کرتا ہوں، میں بدھا کی تعریف پھولوں سے کرتا ہوں اور اس کار خیر کے ذریعہ ہوسکتا ہے کہ میری نجات ہو جائے یا میں نروان حاصل کرلوں، جس طرح یہ پھول کملانے والے ہیں، اسی طرح جسم تباہی موت کی طرف رواں دواں ہے۔

جب عبادت گزار تیل سے روشن ہونے والا لیمپ (چراغ) یا موم بتیاں پیش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے :

> میں یہ تیزی سے روشن ہونے والی روشنی کی اشیاء تاریکی کو دور کرنے کے لئے ذات بصیر کو پیش کرتا ہوں جو تینوں دنیاؤں کا نور ہے جس نے جہل کی تاریکی کو دُور کر دیا ہے۔

روشنیوں کی نذر کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ نیکیوں اور خوبیوں کا بہت بڑا خزانہ ساتھ لاتی ہیں جو مدت دراز تک ختم نہیں ہوتا، جب کھانے کی نذر پیش کی جاتی ہے تو نظر ماننے والا کہتا ہے :

> اے آقا اس اعلیٰ درجہ کے کھانے کو ہم نے تیرے لئے تیار کیا ہے، اپنے کرم و مہربانی سے اسے قبول فرما، ہم پر رحم کرتے ہوئے اسے قبول فرما، میں یہ نذر کا کھانا مالک و آقا کو گہری عقیدت و احترام کے ساتھ پیش کرتا ہوں، کاش ایسا ہو کہ یہ کھانے کے نذرانے کی پیش کش میرے گناہوں کو مٹا ڈالے اور مجھے نروان کے حصول کے قابل

بنا دے۔

اسی طرح کی دُعائیں دوسری نذروں کے ساتھ بھی کی جاتی ہیں۔

دُعاؤں کا اہتمام

عبادت کرنے والے انسانی ضروریات کے لئے دُعائیں کرتے اور امداد کے طالب ہوتے ہیں، مندرجہ ذیل دُعا سری لنکا میں بہت مشہور ہے :

کاش ایسا ہو کہ مناسب وقت (موسم) پر بارش ہو اور فصلیں خوب پیدا ہوں، کاش! ایسا ہو کہ بادشاہ نیک ہوں اور ملک خوشحال ہو جائے۔

اسی طرح :

اے میرے آقا! میرے گناہوں کو معاف فرما دے جو مجھ سے تیری نافرمانی کرتے ہوئے سرزد ہوئے ہوں، ہو چاہے وہ خیال میں ہوں یا لفظاً اور عملاً ہوئے ہوں، میں اس بات کا عزم اور عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی گناہ نہ کروں گا۔

مقدس مقامات کی زیارت

کسی مقدس مقام کی زیارت کے لئے جانا کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے اور جو شخص جتنے زیادہ مقامات کی زیارت کرتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کا ثواب سمجھا جاتا ہے، اس لئے ہر بودھ کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ جگہوں کی زیارت کر سکے اور زائد بار کر سکے، بدھا نے خود اعلان کیا تھا کہ ''چار جگہیں ایسی ہیں جنھیں مقدس جذبے کے ساتھ دیکھنا چاہئے: بدھا کی جائے پیدائش، اس کے حصول معرفت (گیان) کا مقام، جہاں اس نے پہلی بار تبلیغ کی اور دھرم کے چکر کو حرکت میں لایا، اور وہ مقام جہاں وہ نروان حاصل کیا اور اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ان مقامات کی زیارت کی غرض سے اس لئے جانا چاہئے کہ جو کوئی ایسی زیارت گاہوں کے لئے سفر کرتا ہے وہ اطمینان قلب سے مر جائے تو اس کے (مردہ) جسم کے شکستہ ہو جانے کے بعد، وہ موت کی دست سے دور، بابرکت جنتی دنیا میں دوبارہ پیدا ہو گا۔

بدھا کے ان الفاظ نے صدیوں کے دوران لاکھوں کروڑوں زائرین، راہبوں، راہباؤں اور غیر راہب عقیدتمندوں کو بدھ دنیا کے دور دراز مقامات سے، سارے خطرات مول لے کر طویل سفروں پر ابھارا کہ وہ ان

مقامات پر عبادت کریں جہاں بدھا پیدا ہوا تھا، یہ خصوصی ثواب کا باعث سمجھا جاتا تھا کہ یہ سارے سفر پیدل چل کر طے کئے جائیں چاہے اس میں کچھ تکلیف کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

سری لنکا میں سب سے زیادہ پسندیدہ مقام ہے جو ۷۵۰۰ اسکوائر فٹ بلند پہاڑ ہے، اس پہاڑ کا نام ''سری پدا'' ہے جس کے معنی ہیں مقدس نقش قدم، اسے آدم کی چوٹی (کوہ آدم) بھی کہا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں بودھ، ہندو، عیسائی اور مسلمان زیارت کے لئے جاتے ہیں، زیارت کے موسم میں ہزاروں انسان اس مقدس نقش قدم اور اس مقدس پہاڑ کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں، مختلف قسم کی نذریں پیش کرنے کے لئے جاتے ہیں اور اپنی عقیدت مندانہ رسوم پوری کرتے ہیں، ایک مذہبی روایت کے مطابق بدھا نے اپنے بائیں پاؤں کا نقش کوہ آدم کی چوٹی پر چھوڑا تھا اور پھر ایک ہی قدم رکھ کر تھائی لینڈ پہنچ گیا تھا، یہ ایک ایسا مقام ہے جو ہزاروں زائرین کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

گوتم بدھ کے مرنے کے بعد باقیات کی پرستش

گوتم بدھ کے مرنے کے بعد اس کے باقیات جیسے اس کے دانت، سر کے بال اور اس کی ہنسلی کی ہڈی کو بڑی احتیاط سے محفوظ کرلیا گیا تھا، وہ سب مینار نما زیارت گاہوں میں رکھی ہوئی اور جو ساری بودھ دنیا میں پائی جاتی ہیں، انھیں اسٹوپا کہتے ہیں جس کے لفظی معنی ٹیلہ یا مٹی کا تودہ کے ہیں، ایشیا بھر میں منتشر یہ اسٹوپا لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں؛ لیکن سب میں بدھا کے تبرکات نہیں ہیں، بعض میں بدھا کے چیلوں کے تبرکات ہیں یا ان لوگوں کے جو قابل احترام ہیں اور کچھ دوسری چیزیں جو بدھا کی یاد دلاتی ہیں، جیسے مورتیاں، مقدس تحریریں اور دُعائیں۔

جب کوئی عقیدت مند مندر میں داخل ہوتا ہے تو وہ پہلے اسٹوپا کی پوجا کرتا ہے، مراقبہ میں محو، وہ اس کے تین چکر لگاتا ہے اس لحاظ سے کہ پوجا کی جانے والی شئے یعنی اسٹوپا ہمیشہ اس کے داہنی جانب رہے، اس کے بعد وہ پوجا میں مصروف ہو جاتا ہے، اس حال میں کہ وہ سجدہ ریز ہو یا گھٹنے زمین پر ٹیکے ہوئے دو زانوں بیٹھے رہے، یا کھڑے رہے، اس وقت دونوں ہاتھوں سے ایک پیالے کی شکل بن جاتی ہے، اسٹوپا کی پوجا کے بارے میں لوگوں کا ایمان ہے کہ اس سے بہت ثواب ملتا ہے، بدھا کے تبرکات کو اسٹوپا کے وسطی حصہ میں رکھ کر اُگتے ہوئے پنجوں کی شکل میں جما دیا جاتا ہے، عبادت گزاروں کا ایمان ہے کہ یہ عمارت پر زندہ ہستیوں کی طرح اثر ڈالتے اور ہر دور کے اور سارے انسانوں کے لئے بدھا کی روحانی قوت کو زندہ اور پائندہ رکھتے ہیں، ہر مندر میں ایک اسٹوپا ہوتا ہے اور ان میں سے بعض بہت غیر معمولی بڑی جسامت کے ہوتے ہیں۔

ان کا بہت بڑا اسٹوپا سری لنکا میں پایا جاتا ہے، جب یہ پہلی بار بنایا گیا تو اس کی بلندی ۴۰۵ فٹ تھی،

مصر کے بلندترین اہرام سے صرف ۵۰ فٹ پست اور لندن کے سینٹ پال کیتھیڈرل (گرجا) کے گنبد سے ۱۵ فٹ زیادہ بلند تھا، سب سے زیادہ معروف ومشہور اسٹو پاؤں میں ایک شوی ڈاگون پیگوڈا ہے، رنگون میں ایک پہاڑی چوٹی پر تعمیر کردہ یہ ایک مرکزی مینار ہے اور اس کے گرد مخروطی مینار نُما زیارت گاہیں ہیں اور ان پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے ہیں، یہ عام طور پر دیکھنے کے لائق دلچسپ منظر ہوتا ہے کہ غیر راہب شوی ڈاگون پیگوڈا کے فرش پر جھاڑو لگا رہے ہوں یا پیگوڈا کے وسطی مینار پر اپنے ساتھ لائے ہوئے سونے کے پتر چڑھا رہے ہوں۔

یہ دوسرا عمل (مینار پر سونا چڑھانا) ایک بہت زیادہ ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے اور اسے صرف مرد ہی انجام دے سکتے ہیں، عورتیں صرف سونے کا پتر خرید کر اور اُجرت پر مردوں کی خدمات حاصل کر کے اسے گنبد پر چڑھا سکتی ہیں۔

اسٹوپا کی تعمیر یا اس کی تعمیر میں تعاون اور اشتراک ایک بڑے ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے اور تھیراوڈا ممالک میں قدیم زمانہ کے راجاؤں نے اسٹوپا تعمیر کرانے اور حصول ثواب کے لئے غیر معمولی طور پر کثیر دولت خرچ کی تھی۔

بدھا کی شبیہ یا مورتی پوجا

مورتی پوجا کی بدھ مت میں کوئی جگہ نہیں ہے، گوتم بدھ کی کبھی یہ خواہش نہیں ہوئی کہ اس کو کسی طرح بھی پوجا جائے، ابتدائی دور میں بدھا کی مورتیاں بالکل نہیں تھیں اسے علامتی طور پر ظاہر کیا جاتا تھا جیسے پہیہ، نقش پا، وہ گدی جس پر بیٹھا تھا، اس کے سائے کی شکل جس کے بارے میں خیال تھا کہ وہ چٹانوں پر ثبت ہے، اس کے مرنے کے چار پانچ صدی بعد ہی ایسا ہوا کہ اس کی نمائندگی اس کی مورتی سے ہونے لگی، آج بودھوں کی عقیدت مندانہ زندگی میں مورتی پوجا مرکزی مقام رکھتی ہے۔

گوتم بدھ کی مورتیاں اسے تین انداز سے پیش کرتی ہیں :

(۱) سادھنا میں۔

(۲) نشست (بیٹھنے) کی حالت میں۔

(۳) سہارے سے بیٹھے یا لیٹے ہوئے۔

بودھوں کے بہت سے گھروں میں بدھا کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں رہتی ہیں کسی گھر میں ایسی زیارت گاہ کی موجودگی اس کی پوجا کے لئے معقول سبب بن جاتی ہے اور اس کے بارے میں یہ اعتقاد بھی ہے کہ یہ برکت اور جادو سے تحفظ کا ذریعہ ہے۔

نجات (نروان) کا تصور یا آخرت

دراصل نروان سکینت قطعی اور علم وآگہی کی وہ حالت ہے جسے حاصل کر لینا سب کچھ حاصل کر لینے کی طرح

ہے، اسے حاصل کر کے انسان امر ہو جاتا ہے۔

ہر شخص نیک اعمال کے ذریعہ اسے حاصل کر سکتا ہے، کوئی طاقت ذرہ برابر بھی کسی کی مدد نہیں کر سکتی، یہ بات گوتم بدھ نے اپنی وفات کے وقت اپنے شاگردوں سے کہی تھی :

> اپنے نروان کے لئے خود ریاضت کرو، میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا تمہاری مدد کوئی نہیں کر سکتا، اپنی مدد آپ کرو۔(۱)

آج کل زیادہ تر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہی شخص اپنی حیات ارضی کے اختتام پر اگلے جنموں میں زندہ رہتا ہے، یہ واضح طور پر اس دُعاء جنازہ سے سمجھ میں آجاتا ہے، جس میں اس توقع کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ماتم کرنے والے رخصت ہونے والے سے کسی دوسرے جنم میں دوبارہ مل سکتے ہیں۔

ایصالِ ثواب کا طریقہ

اکثر عبادت کرنے والے اپنے اعزہ کے نام سے نذرانے پیش کرتے ہیں، لباس کی شکل میں تحفے، ظروف، دوائیں اور راہبوں کے لئے کھانے پیش کئے جاتے ہیں، ان نذرانوں سے حاصل ہونے والا ثواب مردوں، دیوتاؤں اور دوسری ہستیوں کو منتقل ہو جاتا ہے، ایسے کام کرنے پر عبادت گزار کہتا ہے :

> اس کار ثواب سے، کاش ایسا ہو کہ ہمارے محبوب مرد اس سے مستفید ہو سکیں، کاش وہ مسرت سے ہمکنار ہو سکیں، جیسے کہ بارش سے فیضیاب ہو کر بھر جانے والے دریا اپنا پانی سمندر میں انڈیل دیتے ہیں اور بھر جاتا ہے، اسی طرح میری اس نذر کا ثواب ہمارے مردہ اعزہ کو منتقل ہو جائے۔

اسی طرح :

> کاش ایسا ہو کہ پیش کردہ یہ تحفے (نذرانے) میرے اعزہ کے حساب میں منتقل کر دیئے جائیں، میری ماں، میرے باپ کو خاص طور پر اور کاش میرے سارے اعزہ واقارب، خصوصاً میری ماں اور میرے باپ، میری اس پیش کش سے میری خواہش کے مطابق حصہ پائیں۔

برما میں دُعائیہ کلمات اس طرح کے ہیں

> میں اپنے اس (نیک) عمل کے ثواب میں اپنے والدین، احباب اور اعزہ اور ارواح

(۱) بھگوان بدھ تتھاان کا سندیش، سوامی وویکانند: ۱۲، دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء۔

اور ساری زندہ ہستیوں کو شریک کرتا ہوں، کاش ایسا ہو کہ زمین اس فعل کی گواہی دے۔

مردوں کے ساتھ معاملہ

تھائی لینڈ میں بودھ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں اور جاپان میں دفناتے یا سمندر میں بہا دیتے ہیں، کچھ ملکوں میں بدھ مت کے پیرو مردوں کو جلاتے ہیں اور کہیں کہیں دفن کرتے ہیں۔

بدھ دھرم میں شادی کا تصور

گوتم بدھ کے ماننے والے غیر فطری بات پر بہت زیادہ دنوں تک عمل پیرا نہیں رہ سکے، فطری طور پر ان کے یہاں شادی، بیاہ رائج ہو گیا، بودھوں کے شادی بیاہ کی رسم و رواج مختلف ملکوں میں وہاں کے مقامی رسم و رواج کے مطابق الگ الگ ہوتے ہیں۔

بودھوں کے یہاں عام طور پر آپس میں ہی شادیاں ہوتی ہیں، لڑکے کا انتخاب عموماً لڑکی کے والدین کرتے ہیں، اس کے بعد لڑکے والے لڑکی کے لئے عروسی جوڑے بھیجتے ہیں اور شادی طے ہو جاتی ہے۔

بودھ ملکوں میں کہیں کہیں یہ دلچسپ رسم و رواج بھی قائم ہے کہ لڑکی کی ساڑی کا آدھا حصہ کھول کر لڑکے کی کمر کے گرد لپیٹ دیا جاتا ہے، اس کے بعد دونوں کے سروں پر مقدس پانی ڈالا جاتا ہے کہ ان کے جسم بھیگ جاتے ہیں اور اس رسم کے بعد وہ پوری طرح دولہا دلہن سمجھے جانے لگتے ہیں، پروہت پانی چھڑکنے اور منتر پڑھنے کا کام کرتا ہے۔

دولہا دلہن کی رسمیں

سری لنکا میں دُولہا اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ تحفے اور مٹھائیاں لے کر دلہن کے گھر جاتا ہے، دولہا دلہن ایک ہی برتن میں کھانا کھاتے ہیں اور بعض اوقات دونوں کے انگوٹھے ایک ڈوری سے باندھ دیئے جاتے ہیں، تھائی لینڈ اور برما میں ڈوریاں انگوٹھے کے بجائے دولہا، دولہن کے سر پر باندھی جاتی ہیں، اس کے بعد پروہت پتوں کے ذریعہ مقدس پانی کا چھڑکاؤ کرتا ہے اور منتر پڑھتا ہے، بھارت اور دوسرے ملکوں میں بھی پروہت گھر آ کر شادی کی رسموں کو انجام دیتے ہیں، اگلے دن کھانے کے بعد دولہا، دلہن کو لے کر رخصت ہو جاتا ہے، دلہن کے ساتھ اس کی چند سہیلیاں بھی اسے پہنچانے جاتی ہیں، اس جلوس میں دلہن ہمیشہ آگے آگے رہتی ہے۔

بودھوں میں طلاق بھی رائج ہے، اگر کسی وجہ سے شوہر بیوی میں بدمزگی پیدا ہو جائے تو دونوں الگ ہو سکتے ہیں یا ہو جاتے ہیں، لڑکی والے جہیز میں جو سامان دیتے ہیں وہ واپس کر دیا جاتا ہے اگر بچے ہوئے تو بیٹی ماں کو اور بیٹا باپ کو دے دیا جاتا ہے۔

خصوصی تہوار

بودھ ساری دنیا میں ایک تہوار مناتے ہیں جسے ''ویساک'' کہا جاتا ہے، ویساک قمری تقویم کے ایک مہینہ کا نام ہے جو مئی کے قریب آتا ہے، اس مقدس دن کی بڑی اہمیت ہے، کہا جاتا ہے کہ بدھا مئی کے مہینہ میں چاند کی چودھیں کو پیدا ہوا تھا، اسی دن گیان حاصل کیا تھا اور اسی دن اس نے وفات پائی تھی۔

بودھ ویساک کو بہت بڑے پیمانے پر مناتے ہیں، جس میں بڑی چہل پہل اور رونق رہتی ہے، وہ اس موقع پر مندروں، گھروں، گلیوں اور سڑکوں پر چراغاں کرتے ہیں اور تعلیم اور روحانی، اخلاقی سربلندی کے لئے خصوصی عبادتیں اور دُعائیہ رسوم ادا کی جاتی ہیں، اس متبرک دن سفید لباس میں ملبوس بودھ عقیدت مند، مرد، عورتیں اور بچے مندروں میں بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں، وہ اپنی مذہبی رسوم اسٹوپا، بودھی ورکش (شجر معرفت) بدھا کی شبیہ کے پاس ادا کرتے ہیں اور احکام کی پابندی کی غرض سے زمین پر دوزانو بیٹھتے ہیں، پھر مراقبہ کرتے ہیں اور بودھ تعلیمات کو سنتے ہیں۔

اس مقدس ترین دن، مخصوص طور پر بدھ عقیدت مند، محبت بھرے اور لطف وعنایت سے لبریز خیالات (پیغامات) ساری زندہ ہستیوں اور مردوں کو بھیجتے ہیں اور محبت بھری لطف وعنایت سے بدھا کی تقریر کو ذہن میں لاتے ہیں۔

بدھ مذہب کی رسمیں

ان کے اہم تین رسوم میں سے ایک رسم وہ ہے جسے پیریت (پی ریت) کہا جاتا ہے، اس میں کہا جاتا ہے کہ یہ مقام بدھا کا پسندیدہ ہے، بھوتوں یا بری روحوں کے بغض وعناد سے بچنے کے لئے نیز برکتیں حاصل کرنے کے لئے۔

پیریت رسم میں بودھ راہب ایک لمبی ڈوری کو ایک سرے سے تھام لیتے ہیں اور فرش پر بیٹھا مجمع دوسرے سرے کو پکڑتا ہے ڈوری کے درمیانی سرے کو ایک مٹی کے برتن کی گردن سے باندھ دیا جاتا ہے اور راہب بودھ صحائف سے منتخب منتر پڑھتے ہیں جسے پرتاس کہتے ہیں، جب منتروں کا گانا اختتام کو پہنچتا ہے تو ڈوری کو توڑ کر ٹکڑوں میں بانٹ دیا جاتا ہے اور یہ ٹکڑے لوگوں کے ہاتھوں اور گردنوں میں لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ برتن کا وہ برکت والا پانی لوگوں پر چھڑک دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے:

> ساری آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنے کے لئے ساری عظیم برکات کے نزول کے لئے، سارے دکھوں کو ختم کردینے کے لئے ہر طرح کے خوف اور بیماری اور درماندگی کے خاتمے کے لئے پرتاس کی نغمہ خوانی کرو۔

بدھ مت کا معاشی نظام

بدھ مت کے مطابق ضرورتیں کم سے کم بڑھائی جائیں؛ تاکہ اخراجات کم سے کم ہوں اس لئے کہ جب سب لوگ اپنی ضرورتیں کم کرلیں گے تو ایک اچھے معاشرہ وجود میں آئے گا جس سے سیاسی استحکام حاصل ہوگا اور پورا معاشرہ سکون سے زندگی بسر کرسکے گا اس سے نروان حاصل ہو جائے گا۔

بدھ مت کی مقدس کتابیں

گوتم بدھ کی وفات کے کئی سو سال بعد بدھ مت کی کتابیں لکھی گئیں، ان میں کافی تحریف کی جا چکی ہیں، دھرمانن کوسمبی جی کہتے ہیں کہ: یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں بدھ کے فرمودات کتنے ہیں اور وضع کردہ روایات کتنی ہیں، بہر حال یہاں بدھ مت کی مقدس کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

بدھ مت کے صحائف جو پالی زبان میں ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سری لنکا میں پہلی صدی قبل مسیح میں جمع کئے گئے تھے، اس مجموعے صحائف کو تری پٹک (त्रिपिटक) جو مختلف متنوں کے مجموعوں پر مشتمل ہیں، جن کو تین ٹوکریوں کا نام دیا جاتا ہے اور اسی کو ہنایانا صحائف بھی کہہ سکتے ہیں، ان تین ٹوکریوں کی تفصیل یعنی تری پٹک (त्रिपिटक) صحائف تین ہیں۔

(۱) ونے پٹک (विनयपिटक)۔

(۲) سوترا پٹک (सूत्रा पिटक)۔

(۳) ابھی دھم پٹک (अभिधम पिटक)۔

۱-ونے پٹک (विनयपिटक)

ونے پٹک (یعنی نظم وضبط کی ٹوکری) ہے، جس میں بدھی سنیاسی اور سنیاسیوں کے طریقے زندگی کا ذکر ہے، اس میں ایک ہی ہدایت دو، دو مرتبہ ہوتی ہے، ایک دفعہ مرد کے لئے اور دوسری دفعہ عورت کے لئے، جیسے:

(۱) ستر بھنگ (सुत्तभिन्ना) جس کے دو حصہ ہیں۔

(الف) مہاو بھنگ (महा विभन्ना) اور (ب) بھکھری و بھنگ (भछुणी विभन्ना)۔

(۲) کھندھکا (खन्दका)۔

(۳) چل وگ (चुल्ल वग्ग)۔

(۴) پریوار (परिवार)۔

۲-سوتر اپٹک(सूत्रा पिटक)

سوتر اپٹک (یعنی تقریروں اور مکالموں کی ٹوکری) اس میں بدھا کی تقریروں، مکالموں اور اقوال کے ساتھ سبق آموز کہانیاں ہیں جو اس طرح تقسیم کیے گئے ہیں :

(۱) دیرگھ نکائے(दीर्घ निकाय)۔
(۲) مجھم نکائے(मुज्झिम निकाय)۔
(۳) انگتر نکائے(अन्गुत्र निकाय)۔
(۴) سدک نکائے(सुददक निकाय)۔

ان چار کے علاوہ ایک اور متفرق مجموعہ ہے جس کا نام کہد کا نکائے ہے، جو دراصل حواریوں کا کلام ہے، جسے کہا جاتا ہے کہ یہ مہاتما کی زبانی ہے، اس مجموعہ میں اس طرح کے باب ہیں۔

(۱) کہد کا پاٹھ: اس میں چھوٹے مضمون میں جو دیگر مجموعوں سے ملتے جلتے ہیں۔
(۲) دہم پاد: اس میں مہاتما کا کلام منظوم انداز میں ہے۔
(۳) اڈانا: اس میں چند مفید کہانیاں ہیں، جن سے اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے۔
(۴) ایتی وتیکا: اس میں مختصر اپدیش (نصیحتیں) ہیں۔
(۵) ستانپاتا: یہ مجموعہ فقروں اور جملوں کا ہے، جو دوسرے مجموعوں میں پائے جاتے ہیں۔
(۶) ہیترا گاتا ہیتری گاتا: اس میں نظمیں ہیں، جو سنیاسی اور سنیاسیوں نے تصنیف کی ہیں۔
(۷) جاٹک: اس میں گذشتہ زندگی کی ۵۴۷ حکاتیں ہیں۔
(۸) ندیسا: یہ شرح ہے، ۳۳ عبارتوں کی جو ستاپتا سے لی گئیں ہیں۔
(۹) پتی سمید ھاما گا: یہ ہدایتوں کا مجموعہ ہے، جس سے مسلک دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے۔
(۱۰) اپ دانا: اس میں سنتوں اور سنتیوں کی سوانح عمریاں ہیں۔
(۱۱) مدھیاونس: اس میں بدھوں کے جانشینی کی تواریخ ہے۔
(۱۲) کریا پھنکا: اس میں بدھ کے گذشتہ زندگی کا حال منظوم کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔
(۱۳) کریا پھنکا: اس میں بدھ کے زندگی کا حال منظوم میں اندار بیان کیا گیا ہے۔

۳-ابھی دھم پٹک(अभिदम पिटक)

یہ علم طبعی، علم موجودات کی ٹوکری ہے، جس میں بعد کے آنے والے علماء کے نظریات، عقائد اور اخلاقیات

وفلسفہ پر مبنی تحریروں کے مجموعہ کو جمع کیا گیا ہے، ابھی دم پٹک (अभिदम पिटक) کو راہب خاص طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس میں (۱) دھم سنگے (۲) وبھنگ (۳) دھاتو کلا (۴) پگل انوپاتی (۵) کھتا وتو (۶) یامکا (۷) پتھانا شامل ہیں۔

ان کے علاوہ ملند پنہو (मिलिन्दपन्हो) بدھیا چریتر (बुद्धा चरित्र)، سوندرانند (सौन्दरा नन्द) دویا ودان (दिव्या वदान) للت وستار، (ललित विस्तार) مہاوستو (महावस्तु)، دیپ ونش (दीप वन्श) مہاونش (महावन्श) ساری پترا (सारि पुत्रा) جاتک کتھائیں (जातक कथाएँ) وغیرہ۔

بودھ مت سے متعلق یہ وہ کتابیں ہیں، جو ایک مدت تک لکھی اور لکھوائی جاتی رہیں، (۱) اس کے بعد بدھ مت میں مختلف فرقے بنتے چلے گئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

مہایانا صحائف

مہایانا کے اولین صحائف شمالی ہند سے آئے ہیں، وہ پہلی سے آٹھویں صدی عیسوی (۱۰۰-۸۰۰) کے درمیان سنسکرت میں لکھے گئے تھے، مثلاً چینی، تبتی، نیپالی، کوریائی اور جاپانی میں، تاہم یہ تین خاص حصوں میں منقسم ہیں :

(۱) ونایا (مذہبی نظام کے لئے قواعد)۔

(۲) سوتر (تقاریر اور مکالمے کم وبیش تھیرا وڈا استاپٹا کا سے مشابہ)۔

(۳) شاستر (فلسفیانہ مباحث)۔

لیکن یہ مہایانا کتب ارتقا کرتی ہوئی مختلف مجموعوں میں تبدیل ہوگئیں اور اس میں زیادہ تر افسانے اور عوام پسند نوعیت کی تصانیف بھی شامل ہوگئیں، ان میں سب سے زیادہ شوق سے پڑھی جانے والی کتاب للتاوستارا، ایک بہت واضح اور تفصیلی کتاب ہے اور مستقبل میں آنے والی بودھی ستوا اور سدھرما پنڈاریکایا ''حیرت انگیز قانون کا کنول'' ہیں، جو بدھی ستوا کی نمائندگی کو تقریباً قادر مطلق خدا کی نمائندگی جیسا بتاتی معلوم ہوتی ہے، جو اس پوری کائنات کو کنٹرول کر رہا ہے۔ (۲)

بدھ مت کے دیگر مختلف فرقے

گوتم بدھ کی وفات کے بعد بدھ مت مختلف فرقوں جیسے ہیان (हीयान)، وجریان (वज्रयान)، کال

---

(۱) ہندوستان سے اپجے دھرم، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ (۲) مطالعہ مذاہب ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی۔

چکریان (काल चक्रयान)،فتریان شرواک یان (फ़त्रयान श्रावकयान)، سہج یان (सहजयान)،تنتریان (तन्त्रायान)اوگھڑ پنتھ (अवघड पन्थ)وغیرہ میں تقسیم ہوگیا۔

مہایانیوں نے گوتم بدھ کو وشنو کا اوتار مان لیا، انھیں انسان سے بھگوان بنا دیا اور ان کی مورتی بنا کر ان کی پوجا کرنے لگے، مہایان فرقہ بدھ مت تو کم مگر ہندو مت زیادہ ہوگیا، اس مت میں نظریہ تجسیم (अवतारवाद) اور مورتیوں پر یقین رکھنے کے عقائد داخل ہوگئے، بدھ مت کے دیوی دیوتاؤں کی ایک لمبی فہرست تیار کردی گئی، بودھ فرقوں کے درمیان فکری اور نظریاتی خلیج اتنی بڑھ گئی کہ یہ فرقے ایک دوسرے کے مخالف سمت میں بڑھتے نظر آنے لگے۔

ہر فرقہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ صرف اسی کا مسلک اصل بدھ مت ہے، مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لئے چار سنگیتیوں کے علاوہ لاتعداد، جلسے اور اجتماعات کا انعقاد کیا گیا؛ لیکن ان میں اتحاد و اتفاق کا جو نازک رشتہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہوگیا، اس طرح بدھ مت نے اپنی شناخت کھودی، اگر گوتم بدھ کو انسان ہی رہنے دیا جاتا، بھگوان نہ بنایا جاتا تو بدھ مت اپنی اصل عقائد کے زیادہ قریب ہوتا۔

زمانہ قدیم سے ہی بدھ مت اور برہمن مت ایک دوسرے سے کشمکش کرتے رہے ہیں، ان کے درمیان جاری کشمکش کی شدت کی جانکاری، آر ایس ایس کے دوسرے سابق سرسنگھ چالک اور وشو ہندو پریشد کے بانی گرو جی وگولور کر کی مندرجہ ذیل تحریر سے ہوتی ہے :

> راہ میں بڑے بڑے جنگل، جن میں خونخوار جنگلی، جانوروں سے بھی زیادہ خونخوار انسان اور عدم تشدد کے نام پر دہاڑنے والے بدھ مت کے پیرو کار، ان کو (یعنی شنکر اچاریہ کو) زہر دے کر موت کی نیند سلا دینے پر آمادہ تھے۔(۱)

بدھ مت اور قرآنی تعلیمات

حقائق کی روشنی میں چار باتیں بدھ مت کی چار اعلیٰ صدائیں کہلاتی ہیں جس میں دکھ کے ازالے کی تدبیر کے لئے بدھ نے مندرجہ ذیل آٹھ اُصول مقرر کئے ہیں۔

۱- صحیح نظریات (समयक दृष्टि): اس کا مطلب ہے زندگی کے بارے میں بدھ مت کے نقطۂ نظر اور خاص طور سے اس کی تعلیم کردہ صداقتوں کو غیر مشروط طریقے سے مان لینا ہے، یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے کہ اسلام کسی بھی نظریہ کو بغیر تحقیق کے قبول نہیں کرتا۔

(۱) شری گرو جی سمگر درشن ج، کھنڈ: ۱۶/۳۔

۲- صحیح عقیدہ (सम्यक संकल्प): اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر ایسے خیالات اور جذبات کو پیدا کرے، جو تمام اخلاقی برائیوں سے پاک ہوں؛ لیکن اسلام اخلاقی برائیوں کے خاتمہ کے لئے توحید کی دعوت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هَلْ مِن شُرَكَآئِكُم مَّن يَهْدِىٓ إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِى لِلْحَقِّ أَفَمَن يَهْدِىٓ إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَن يُتَّبَعَ أَمَّن لَّا يَهِدِّىٓ إِلَّآ أَن يُهْدَى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ . (یونس:۳۵)

کہہ دیجئے: کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے ساجھے داروں میں کوئی ایسا ہے جو سچی راہ دکھا سکے؟ کہہ دیجئے: اللہ ہی حق کا راستہ دکھاتا ہے، تو پھر جو حق کا راستہ دکھائے، وہ اس لائق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود ہی راہ نہیں پاسکتا جب کہ دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے؟ تو تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کر رہے ہو؟

۳- صحیح قول (सम्यक वाक): اس کا مطلب ہے کہ جھوٹ، غیبت اور بدزبانی سے بچا جائے، جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح واضح فرمایا ہے:

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لاَ يَسْتَجِيْبُونَ لَهُم بِشَيْئٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِيْنَ إِلَّا فِيْ ضَلاَلٍ . (الرعد:۱۴)

اسی کے لئے سچی پکار ہے، اس کے علاوہ جن کو یہ پکارتے ہیں، وہ ان کی پکار کا کچھ بھی جواب نہیں دیتے، بس یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف اس لئے پھیلائے کہ وہ اس کے منھ میں پہنچ جائے؛ حالاں کہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں، کفر کرنے والوں کو پکار تو بس بھٹکنے کے لئے ہی ہوتی ہے۔

۴- صحیح عمل (सम्यक कर्म): اس سے مراد یہ ہے کہ خیانت، بدکاری، قتل و غارت گری سے بچا جائے، انسانی ہمدردی والے اعمال اختیار کئے جائیں جو اسلام سے قریب تر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئاً وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَلاَ تَقْتُلُوْا أَوْلاَدَكُم مِّنْ إِمْلاَقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلاَ تَقْرَبُوْا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلاَ تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن . (الانعام:۱۵۱)

کہہ دیجئے: آؤ ہم تمہیں وہ باتیں سنائیں جو چیز تمہارے رب نے تم پر حرام کردی ہیں،
یہ کہ کسی چیز کو اللہ کا ساجھے دار نہ بنانا اور ماں باپ سے (اچھا) سلوک کرتے رہنا
اور بھوکمری کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا؛ کیوں کہ تم کو اور ان کو 'ہم' ہی روزی
دیتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں کے پاس بھی نہ جانا چاہے وہ کھلی ہوئی ہوں یا
چھپی ہوئی ہوں اور کسی جاندار کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام کردیا ہو، قتل نہ کرنا، مگر حق
کے لئے جسے شریعت حکم دے؛ ان باتوں کی 'وہ' تمہیں تاکید کرتا ہے؛ تاکہ تم سمجھو۔

۵- صحیح رزق (समयक आजीवीका): اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی محنت اور جائز طریقے سے حاصل کی ہوئی روزی پر گزارا کرنا چاہئے، یہ بھی اسلام کے نظریہ کے مطابق ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ
رَبِّكَ ثَوَاباً وَخَيْرٌ أَمَلا . (الکہف:۴۶)

مال اور اولاد تو دنیوی زندگی کی زینت ہے اور باقی رہنے والے اچھے عمل ہیں،
جو تمہارے 'رب' کے نزدیک بدلے کی نظر سے بہتر ہیں اور اُمید کی نظر سے بھی۔

۶- صحیح کوشش (समयक व्यायाम): اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے احکام پر پوری طرح عمل در آمد کرنا چاہئے؛ لیکن قرآن صحیح وغلط کی تشریح اس طرح کرتا ہے۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لاَ يَسْتَجِيْبُونَ لَهُم بِشَيْئٍ إِلاَّ
كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دُعَاء الْكَافِرِيْنَ إِلاَّ
فِيْ ضَلاَلٍ . (الرعد:۱۴)

اسی کے لئے سچی پکار ہے، اس کے علاوہ جن کو یہ پکارتے ہیں، وہ ان کی پکار کا کچھ بھی
جواب نہیں دیتے، بس یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف اس
لئے پھیلائے کہ وہ اس کے منھ میں پہنچ جائے؛ حالاں کہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں،
کفر کرنے والوں کی پکار تو بس بھٹکنے کے لئے ہی ہوتی ہے۔

۷- صحیح حافظہ (समयक स्मृति): اس کا مطلب یہ کہ لوگوں کو اپنے گذشتہ اعمال کو یاد رکھتے ہوئے محاسبہ کرتے رہنا چاہئے؛ لیکن یہ آخرت میں جزا وسزا کے قائل نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوْا إِلاَّ سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ قَدْ
خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْن . (یونس:۴۵)

اور جس دن 'وہ' ان کو اکٹھا کرے گا تو ایسا لگے گا جیسے وہ (دنیا میں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ ٹھہرے ہی نہیں تھے، آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے، وہ لوگ گھاٹے میں پڑ گئے جنھوں نے اللہ نے ملنے کو جھٹلایا اور راستہ نہ پا سکے۔

۸۔ صحیح تخیل (सम्यक समाधि): اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو دنیاوی لذات سے بے نیاز ہو کر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہنا چاہیئے، یہ بات اسلامی نظریہ کے خلاف ہے اگر چہ اصل مقصد آخرت ہو؛ لیکن دنیا میں رہبانیت نہیں اختیار کی جائے گی، جسے اللہ نے اس طرح فرمایا ہے:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَى مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَى . (طٰہٰ:۱۳۱)

اور ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھئے جو کچھ 'ہم نے' ان میں سے کچھ لوگوں کو دنیا کے آرام کی چیزیں دے رکھی ہیں، تاکہ 'ہم' اس کے ذریعہ انھیں آزمائیں؛ اور آپ کے 'رب' کی روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

ان آٹھ طریقوں پر عمل کرنے کے بعد گوتم بدھ نے مندرجہ ذیل دس اخلاقی احکام دیئے اور بودھوں سے کہا کہ وہ ان احکام کی سختی سے پابندی کریں۔

۱۔ کسی جاندار کو قتل نہ کرنا: یہ نظریہ اسلام کے مطابق ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

كَتَبْنَا عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعاً وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالبَيِّنَاتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيراً مِّنْهُم بَعْدَ ذَلِكَ فِي الأَرْضِ لَمُسْرِفُونَ . (المائدۃ:۳۲)

اسی وجہ سے ہم نے نبی اسرائیل کے لئے لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی آدمی کو، کسی کے خون کا بدلہ لینے یا زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ کسی اور وجہ سے قتل کر ڈالا، تو مانو اس نے سارے ہی انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے اسے زندگی دی، اس نے مانو سارے انسانوں کو ہی زندگی دی اور ان لوگوں کے پاس 'ہمارے' رسول کھلی دلیلیں لا چکے ہیں، پھر بھی ان میں بہت سے لوگ زمین میں زیادتی کرنے والے ہی ہیں۔

۲۔ چوری نہ کرنا: یہ بھی نظریہ اسلام کے مطابق ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللهِ وَاللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ . (المائدۃ:٣٨)

اور جو چوری کرے، مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کے کرتوتوں کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے نصیحت ہے؛ اور اللہ بڑی حکمت والا ہے۔

٣- جھوٹ نہ بولنا: یہ بھی نظریہ اسلام کے مطابق ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وللهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ . (الجاثیۃ:٢٧)

اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کو ہے اور جس دن وہ گھڑی آئے گی، اس دن جھوٹ والے گھاٹے میں ہوں گے۔

٤- زنا نہ کرنا: یہ بھی نظریہ اسلام کے مطابق ہے۔

وَلاَ تَقْرَبُوْا الزِّنٰى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلاً . (بنی اسرائیل:٣٢)

اور زنا کے قریب بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔

٥- نشہ آور اشیاء کا استعمال نہ کرنا: یہ بھی نظریہ اسلام کے مطابق ہے۔

٧- ناچ، گانے اور موسیقی سے دور رہنا: یہ بھی اسلام کے مطابق ہے۔

٨- خوشبو کا استعمال نہ کرنا: یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے۔

٩- کسی آرام دہ جگہ پر نہ بیٹھنا نہ سونا: یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے۔

١٠- سونے اور چاندی کا استعمال نہ کرنا: یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے۔

بدھ مت کے مندرجہ بالا عقائد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انتہائی سیدھا، سادا حکم دیا تھا؛ تا کہ اس پر تمام لوگ آسانی سے عمل کر کے با اخلاق بن سکیں، چاہے وہ کسی بھی ذات سے تعلق رکھتے ہوں۔

بدھ مت اور اسلام

١- بدھ مذہب میں مراقبہ کے ذریعہ غموں اور تکلیفوں کو بھلانے کی کوشش کی جاتی ہے، اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس سے دکھ وقتی طور پر دور ہو جاتا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں، اس کے بالمقابل قرآن میں تقدیر پر ایمان رکھنے کی بات کہی گئی ہے، جس سے ایک مسلمان اپنے حالات کو اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کا غم ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتا ہے۔

۲- بدھ عبادت میں یوگا کر کے ناچنے لگتے ہیں، اس سے بھی وقتی سکون حاصل ہو سکتا ہے، دائمی نہیں، جب کہ اسلام دائمی سکون کا راستہ ہموار کرتا ہے۔

۳- اسی طرح عبادت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جھنڈے پر اپنی خواہشات کو لکھ کر باندھ دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر اس جھنڈے کو ہوا اُڑا لے گئی تو خواہش پوری ہو جائے گی، ورنہ نہیں، جب کہ اسلام میں ایسی بے بنیاد چیزوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

۴- بدھ اپنے آبا و اجداد کی باتوں کو ہی مانتے ہیں اور پورے دن چکر چلا کر عبادت کرتے ہیں، جس سے سمجھتے ہیں کہ نروان مل جائے گا، جب کہ قرآن عمل صالح کی دعوت دیتا ہے، جس کی بنیاد پر جنت کا داخلہ آسان ہو جاتا ہے۔

۵- بدھ مورتی کے سامنے پوجا کرتے ہیں؛ لیکن قرآن اس کا سخت مخالف ہے۔

۷- موم بتی کی یا جلتی ہوئی آگ کی پوجا کرتے ہیں، قرآن مخلوق کی عبادت کا سخت مخالف ہے۔

۸- بدھ مت میں تسبیح پر بدھا کے نام کا لاکھوں بار جاپ کرتے ہیں، قرآن غیر اللہ کے ذکر کا مخالف ہے۔

۹- بدھ مورتی کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، ساشٹانگ کرتے ہیں، مندر میں گھستے وقت تھوڑا جھکتے ہیں، اس کے بعد پیٹ کے بل لیٹ جاتے ہیں، یہ سب طریقے توحید کے خلاف ہیں، جن کی قرآن وحدیث میں کوئی گنجائش نہیں۔

۱۰- ساڑھے چار میٹر لمبا زیڈانگ ہوتا ہے جسے مذہبی رسموں میں استعمال کرتے ہے، قرآن فضول کاموں سے منع کرتا ہے۔

۱۱- بدھ کے جو مہاتما ہوتے ہیں، ان کے لئے اُصول الگ ہوتے ہیں اور عوام کے لئے اُصول الگ، مہاتما صاحب دوپہر کے بعد کھانا نہیں کھا سکتے پھر اگلے دن ہی کھانا کھا سکتے ہیں اور رات کو عبادت کرتے ہیں، قرآن میں جو احکام ہیں وہ سب کے لئے یکساں ہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ بھی قرآنی تعلیمات کا جو حکم دیتے ہیں، اس پر خود بھی عمل کر کے دکھاتے ہیں۔

اس طرح بدھ مذہب میں اگر کوئی عابد اور متقی بننا چاہے تو خاص لوگ ہی بن سکتے ہیں، سب کے لئے قابل عمل نہ ہوگا، جب کہ قرآن قیامت تک کے تمام انسانوں کی فطرت کے مطابق زندگی گذارنے کا طریقہ بتاتا ہے، جو سب کے لئے قابل عمل ہو۔

گوتم بدھ کی آخری رسول ﷺ کے بارے میں پیشین گوئی

سنسکرت کے مشہور عالم و محقق پنڈت وید پر کاش اپادھیائے جی نے اپنی کتاب ''وید کے رشی نراشنس قرآن کے انتم ایش دوت محمدؐ'' کے چھٹے باب میں گوتم بدھ جی کی پیشین گوئیوں کے ذریعہ حضرت محمد ﷺ کو آخری بدھ اس طرح ثابت کیا ہے کہ گوتم بدھ نے اپنی موت کے وقت عزیز شاگرد آنند سے بتاتے ہوئے کہا تھا۔

> آنند! اس دنیا میں نہ تو میں پہلا بدھ ہوں اور نہ آخری بدھ ہوں، اس دنیا میں سچائی و خیر خواہی کی تعلیم دینے کے لئے اپنے وقت پر ایک اور بدھا آئے گا، وہ دوسروں کی بھلائی کرنے والا ہوگا، اس کا دل صاف ستھرا ہوگا علم و دانائی سے لبریز اور سب لوگوں کا قائد ہوگا، جس طرح میں نے دنیا کو مستحکم سچائی کی تعلیم دی ہے، اسی طرح وہ بھی دنیا کو سچائی کی تعلیم دے گا، دنیا والوں کو زندگی گذارنے کا ایک ایسا راستہ بتائے گا جو سیدھا اور صاف ستھرا ہوگا، آنند! اس کا نام میتریہ ''मैत्रेय'' ہوگا۔(۱)

بدھ کا مطلب عقل سے युक्त ہوتا ہے بدھ انسان ہی ہوتا ہے دیوتا وغیرہ نہیں۔(۲)

آنے والے آخری بدھ کی خصوصیات

بدھ جی نے اوپر کی سطروں میں جن خاص خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس طرح ہیں :

(۱) وہ دنیا کو سچائی اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کی تعلیم دے گا۔

(۲) وہ دنیا کا رہنما ہوگا۔

(۳) وہ دنیا والوں کو ایک راستہ دکھائے گا، جو سچ اور سیدھا ہوگا۔

(۴) وہ اپنے وقت پر آئے گا۔

(۵) اس کا دل پاک صاف اور علم و عقل سے بھرا ہوگا۔

(۶) اس کا نام میتریہ 'मैत्रेय' ہوگا۔

حضرت محمد ﷺ اور آخری بدھ

۱- وہ دنیا کو سچائی اور بھلائی کی تعلیم دے گا : انسانوں کا سب سے بڑی حقیقت و سچائی کو حاصل کرنا اپنے پیدا کرنے والے کو ماننا اور اسی کی عبادت و بندگی کرنا ہے؛ لیکن جس وقت رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی دنیا سے یہ

Mohammad in Buddhist Scriptures. P.1 (2)   Gospel of Buddha by Grus, Page 215 (1)

سچائی ناپید ہو چکی تھی اور خدا کے ساتھ چاند، سورج، ستاروں، سیاروں، زندہ و مردہ، بڑے لوگوں، خیالی طاقتوں، جانوروں، پیڑ پودے، ندی نالوں وغیرہ کی عبادت و بندگی ہو رہی تھی اور ان ہی سے دُعائیں اور التجائیں کی جارہی تھیں، کوئی اللہ کا بیٹا مانا جارہا تھا تو کوئی اوتار، صرف ایک اللہ کو عبادت و بندگی کرنے کے لائق ماننے والا کوئی نہ تھا، ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان کیا ''لا الـہ الا اللہ محمد رسول اللہ ''یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول (سندیشٹا) ہیں، یعنی محمد ﷺ نہ اللہ کے بیٹے ہیں اور ان کے مشابہ اور نہ اللہ کا کوئی جز، وہ صرف اللہ کے بندے اور عبادت کرنے والے ہیں۔

یہ ہے ہر طرح کی سچائی کا سرچشمہ اور وہ بنیادی حقائق جن کی تعلیم آخری رسول نے دنیا کو دی، یہی وہ تعلیم ہے جس پر آپ ﷺ کی اور قرآن کی ساری تعلیمات منحصر ہے، یہی تعلیم انسانی زندگی کی بنیاد ہے اور دنیا بھر کی تمام مسجدوں میں دن رات میں پانچ مرتبہ اسی حق کی پکار لگتی ہے، یہ سچ کی کسوٹی ہے جو اس پر کھرا اُترے وہ کھرا، اور جو اس پر کھوٹا اُترے وہ کھوٹا، مگر یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ دنیا کے لوگ اس تعلیم کی قیمت کو نہیں سمجھنا چاہتے ہیں، اسی لئے انسانیت ذلیل و رسوا ہوتی جارہی ہے۔

قرآن پاک اور حضرت محمد ﷺ نے اللہ کی عبادت کے ساتھ ہی بھلائی کی بھی تعلیم دی ہے، نماز اور زکوۃ، اسلام کے دو اہم ستون (رکن) ہیں، نماز عبادت کا ایک خاص طریقہ ہے اور زکوۃ امداد کا ایک خاص طریقہ ہے، قرآن میں دونوں کا حکم کئی جگہوں پر ساتھ ساتھ آیا ہے، زکوۃ کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ زکوۃ میں مالداروں کا خاص دخل ہے، اس لئے یہ امداد (زکوۃ) ہر مالدار پر فرض ہے اور اس کے علاوہ عام امداد الگ ہے جسے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، عام امداد کی نیکیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن پاک میں بتایا گیا ہے۔

> جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے کہ کسی چیز کا
> ایک دانا زمین پر بویا جائے اور اس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں ۱۰۰ دانے
> ہوں، اللہ جس کے ثواب کو چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔(۱)

حضرت محمد ﷺ خود ہی ایسے امداد کرنے والے تھے کہ فقیروں کو کھانا دے دیتے اور خود بھوکے سو جاتے، جسم مبارک کے کپڑے بھی اُتار کر دے دیتے، آپ ﷺ کی تعلیم و سخاوت کے اثرات سے آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ایسے سخی ہو گئے تھے کہ عزیزوں کو جو مدد ملتی وہ اپنے سے زیادہ دین کے لئے امداد کر دیتے۔

اس لئے آنے والے بدھ کے تیئں بدھ جی کی جو دوسروں کی بھلائی کی پیشین گوئی تھی وہ حضرت محمد ﷺ پر ہی ثابت ہوتی ہے۔

(۱) سورہ بقرہ: ۲۶۲-۲۶۷ تک تفصیل سے اور اس کے آگے کی آیت میں سود کو حرام ٹھہرا گیا ہے۔

۲-آخر رسول عالمی رہنما ہوگا : پیغمبر حضرت محمد ﷺ بھی دنیا کے رہنما تھے، جس کی تصدیق خود قرآن پاک نے اس طرح کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

بڑی برکت والا ہے، وہ (اللہ) جس نے اپنے بندے پر قرآن اُتارا؛ تاکہ وہ ساری دنیا کو ڈرانے والا ہو۔ (الفرقان:۱)

(اے محمد ﷺ!) ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے؛ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سورۂ سبا:۲۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

(اے محمد ﷺ!) آپ کہہ دیجئے : میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (سورۂ اعراف:۱۵۸)

محمد ﷺ کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ حجۃ الوداع ہے، جس کے چوتھے مہینے بعد ہی آپ آخرت کو کوچ کر گئے، عرب پر آپ کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور ملک بھر میں اسلام پھیل چکا تھا اس لئے چاروں طرف سے مسلمان اُمنڈ پڑے تھے، اس تاریخی موقعہ پر آپ ﷺ نے بنیادی عنوان پر جو خطبہ دیا اس میں کہا اے لوگو! جان لو کہ تمہارا اللہ ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، عربی کو عجمی (غیر عربی) پر اور عجمی کو عربی پر اور گوروں کو کالوں پر اور کالوں کو گوروں پر کوئی فوقیت نہیں ہے، بڑائی ہے تو زہد و تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔

بدھ جی کی اطلاع کے مطابق آنے والے بدھ آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ ہیں، جن کی وعظ و نصیحت قبول کرنے والے بھائی بھائی بن گئے۔

۳-وہ دنیا والوں کو صاف ستھرا راستہ دکھائے گا : بدھ جی نے آنے والے بدھ کے بارے میں بتایا کہ وہ زندگی کا سیدھا اور صاف ستھرا راستہ دکھائے گا، زندگی کے راستہ کا مطلب ہے مذہبی دستور العمل۔

بدھ جی نے زندگی گذارنے کی خوبی یہ بتائی ''وہ سیدھا اور صاف ستھرا ہوگا'' شدھ دھرم (سیدھے مذہب) کا مطلب ہے، خالص اللہ والا مذہب، جس میں کئی دیوی دیوتا، مادی، خیالی قوتوں کی تعظیم، عبادت و بندگی اور بڑائی وغیرہ کے لئے کوئی جگہ نہ ہو حضرت محمد ﷺ نے بھی ایسا ہی سچا اور خالص اسلامی مذہب بتایا۔

مہاتما بدھ جی نے زندگی گذارنے کی دوسری خوبی یہ بتائی کہ وہ سیدھا راستہ دکھائے گا، حضرت محمد ﷺ کا بتایا ہوا سیدھا راستہ جس کا انحصار قرآن پاک اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ کی گئی اس کی تفسیر پر ہے، یہی انسانوں کے زندگی گذارنے کا آئین ہے، یہ عقیدہ کی بات نہیں ہے؛ بلکہ حقیقت ہے۔

حضرت محمد ﷺ نے عرب میں اسی قانون کے مطابق حکومت قائم کی، یہ حکومت خطہ ارض پر خدائی حکومت

تھی جس کے منتظم انسان ہی تھے؛ لیکن قانون خدا کا تھا، اس کی تعمیل جس طرح عام لوگ کرتے تھے اسی طرح خود حضرت محمد ﷺ بھی کرتے تھے، عام انسانوں کی طرح حضرت محمد ﷺ بھی اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھتے تھے۔

اس کا منتظم کار نہ بادشاہ کہلاتا تھا نہ راجہ، خود حضرت محمد ﷺ نے بھی اس طرح کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا اور نہ ہی اپنے لئے محل اور تخت و تاج بنوایا، کھجور کے پتوں سے چھائی ہوئی مسجد میں چٹائی پر بیٹھ کر انتظامی کام کرتے تھے، حضرت محمد ﷺ کے خلیفہ بھی ایسے ہی منتظم کار تھے۔

اس حکومت میں دیش، رنگ، نسل، اونچ نیچ، چھوت چھات میں کوئی فرق و امتیاز نہ تھا، تمام لوگوں کا دخل عام تھا، وہ حکومت کا نظام چلانے والا ہو یا مدعا علیہ اسے بھی قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ نہ عربوں کو عجمیوں پر اور نہ عجمیوں کو عربوں پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گوروں کو کالوں پر اور نہ کالوں کو گوروں پر، اللہ کے نزدیک بہتر وہ ہے جو اس (اللہ) سے ڈرتا ہو اور نیک چال چلن والی زندگی گذارتا ہو، یہ سب واضح دلیلیں ہیں آخری بدھ حضرت محمد ﷺ کی۔

۴- وہ اپنے وقت پر آئے گا: بدھ جی نے نند کو دلاسہ دیتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ آخری بدھ میرے جاتے ہی آئے گا؛ بلکہ یہ کہا تھا کہ اپنے وقت پر آئے گا، یہ بڑی معنی خیز اطلاع تھی، مقصد یہ ہے کہ وہ ایسے زمانے میں آئے گا، جب دنیا بھر میں سچا مذہب بگڑ چکا ہوگا، جیسا کہ حضرت محمد ﷺ سے پہلے کے حالات کا بیان آپ نے اوپر پڑھا جو آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر ثابت ہوتا ہے، وہی ان کے آنے کا وقت تھا۔

۵- اس کا دل صاف ہوگا اور وہ ذی علم و صاحب فہم ہوگا: مہاتما بدھ جی کی بتائی ہوئی خوبیوں میں آخری بدھ کی ایک خوبی یہ ہے جسے ہم نے اوپر کے صفحات میں لکھ چکے ہیں، اس کا ناقابل تردید ثبوت ہے، جس کے قلب پر قرآن پاک نازل ہوا اس سے زیادہ صاف ستھرا دل کس کا ہوسکتا ہے اور ایسا ذی علم و صاحب عقل وفہم کون ہوسکتا ہے؟ (اس کی تفصیل کے لئے حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کریں)

۶- مہاتما بدھ جی نے بتایا کہ آخری بدھ کا نام مَیتریہ 'मैत्रेय' ہوگا: ''میتریہ'' کا مطلب ہوتا ہے دَیا سے یُکت، ۱۶/اکتوبر ۱۹۳۰ء لیڈر صفحہ ۷ کالم ۳ میں ایک مطالعہ بدھ نے میتریہ کا مطلب رحم दया کیا ہے، محمد بھی رحم دل تھے؛ اسی لئے حضرت محمد ﷺ کو ''رحمت اللعالمین'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے: دنیا کے لئے दया سے یُکت۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے ہی قرآن پاک میں پوری دنیا کے لئے 'رحمت' یعنی رحم والا کہا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعالمین . (الحج:۱۰۷)

اے رسول! اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فطرتاً ایسے رحم والے تھے کہ ہر طرح کی تکلیفیں جھیل کر انسانوں کو گناہوں کے دلدل اور جہنم

سے بچانے کی کوشش کرتے جو رسول اللہ ﷺ کی اہم صفت تھی۔

بدھ جی کی پیشین گوئی کے اس معتبر توضیح سے آخری اِیش سندیشٹا (ईशासन्देष्टा) حضرت محمد ﷺ کا بدھ میتریہ ہونا مکمل طور پر ثابت ہوتا ہے۔

بدھ میتریہ کی خصوصیات اور حضرت محمد

بدھ میتریہ کے بارے میں دی گئی خصوصیات مکمل طور پر حضرت محمد ﷺ ہی پر ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) بدھ انسان ہوتے ہیں دیوتا نہیں، حضرت محمد ﷺ بھی انسان تھے، آپ ﷺ نے کسی کا اوتار ہونے کا دعوہ نہیں کیا۔

(۲) بدھ عورت اور حکومت سے جڑا ہوتا ہے، حضرت محمد ﷺ بھی عورت اور حکومت سے جڑے ہوئے تھے۔

(۳) بدھ اپنی پوری زندگی تک زندہ رہتا ہے، حضرت محمد ﷺ بھی پوری زندگی تک زندہ رہے۔

(۴) بدھ اپنا کام خود کرتا ہے، حضرت محمد ﷺ بھی اپنا کام خود کرتے تھے۔

(۵) بدھ مذہب کو پھیلانے والا ہوتا ہے، حضرت محمد ﷺ بھی اپنے مذہب کی اشاعت کرنے والے تھے۔

(۶) بدھ اپنے سابقہ بدھ کا ذکر کرتا ہے، حضرت محمد ﷺ بھی اپنے سابقہ نبیوں کا ذکر کرتے تھے۔

(۷) بدھ کے ساتھی پکے ساتھی ہوتے ہیں، کوئی ان کو ان کے راستے سے ہٹا نہیں سکتا، حضرت محمد ﷺ کے صحابہ کو بھی کوئی ان کے راستہ سے ہٹا نہیں سکا۔

(۸) بدھ کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کا کوئی بھی آدمی اس کا استاذ نہ ہو، حضرت محمد ﷺ کا بھی کوئی آدمی گرو (استاذ) نہ تھا۔

خلاصہ

اس طرح گوتم بدھ جی کے ذریعہ کی گئی پیشین گوئیوں پر اگر غیر جانب دار ہوکر فیصلہ کیا جائے تو وہ صرف حضرت محمد ﷺ پر ہی ثابت ہوتی ہیں، اُمید ہے کہ پڑھنے والے اوپر لکھی گئی باتوں کو سمجھ کر ضرور سچائی قبول کریں گے۔

تجاویز

(۱) غیر مسلموں کے لئے قرآنی مضامین مختلف موضوع پر تیار کرکے تقسیم کئے جائیں؛ تاکہ قرآن سے متعلق اشکالات دُور ہوں اور قرآنی تعلیمات سے روشناس ہوں، اس کے لئے کبھی کبھی خصوصی میٹنگ کے ذریعہ بلایا جاسکتا ہے۔

(۲) تمام مذاہب کی کتبِ مقدسہ کے تقابلی مطالعہ کے ذریعہ قرآن کی حقانیت کو واضح کیا جائے۔

(۳) قرآن کے تحقیقی مراکز قائم کر کے دعوتی کتابیں محققین کو فراہم کی جائیں۔

(۴) غیر مسلموں خصوصاً ہندو مذہب میں دعوت و تبلیغ کو محبت و ہمدردی کے جذبے سے عام کیا جائے، خود ملاقات کرنے کی کوشش کی جائے؛ تاکہ ان کے اشکالات کو خوش بیانی سے رفع کیا جا سکے۔

(۵) قرآن پر کی جانے والی تنقیدوں اور حملوں کا جواب تحریر کیا جائے، اس کے لئے اخبار و رسائل کا اجراء اور دینی کتب کی اشاعت ہو۔

(۶) اسلامی تہذیب و تمدن پر زور دے کر خاص طور سے قرآن سے عوام الناس کو روشناس کرایا جائے۔

(۷) ملک کے تمام اسلامی حلقوں اور تحریکوں کو خصوصاً متحد ہو کر قرآن کی اشاعت کے مشن کو ملک گیر اور عالمی سطح پر بغیر کسی تفریق اور شور و ہنگامہ کے بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے۔

(۸) مسلم نوجوانوں کو منتخب کر کے ان کو خود اعتمادی کے ساتھ اشاعت قرآن کے لئے استعمال کیا جائے۔

(۹) مسلم عوام کو غیر مسلموں کے ساتھ اچھے اخلاق برتنے پر زور دے کر اسلامی تعلیمات سے آشنا کرایا جائے۔

(۱۰) اسکولوں میں پڑھنے والے طلباء کو ترغیب دی جائے کہ اپنے غیر مسلم دوستوں کو خصوصاً اسلام اور قرآن کا تعارف کروائیں۔

(۱۱) اس قسم کے لٹریچر کو تقسیم کروانے کی لوگوں کو اہم موقع پر جیسے شادی کی تقریب ہو یا انتقال کا موقع ہو یا کوئی اور پروگرام ہو ترغیب دی جائے۔

(۱۲) داعی کو قرآن کے علاوہ دیگر مذاہب بالخصوص مدعو کے مذہبی معتقدات کا گہرا علم ہو۔

(۱۳) یہ سب کام للہ کرنے کی کوشش کی جائے، اُجرت اور مالی معاملے کا تعلق اگر ہو تو حساب درست رکھا جائے۔

اپیل

حضرات گرامی! یہ سیمینار اسی مقصد کے لئے بلایا گیا ہے کہ ہم سب متحدہ طور پر دعوت کو بہتر انداز میں پیش کر سکیں، اس کے لئے ہم مسلک، جماعتوں، تنظیموں اور دوسرے فروعی اختلافات سے اوپر اُٹھ کر حفاظت دین کے ساتھ اشاعتِ دین کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہوں۔

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز۔

⊙ ⊙ ⊙

بائبل اور قرآن مجید — مشترکہ تعلیمات

پروفیسر محسن عثمانی ندوی⊙

تقابلی مطالعہ ادیان کا کام ایک مشکل کام ہے، اس کے لئے متعلقہ مذاہب کا بہت تفصیلی اور گہرا مطالعہ درکار ہے اور یہ موضوع درحقیقت کسی مختصر مقالہ یا خطبہ کا موضوع نہیں ہے؛ بلکہ ایک پوری کتاب اور بحث وتحقیق کا موضوع ہے، بائبل کے تمام نوشتوں کا مطالعہ کرنا اور پھر قرآن کے مضامین کا مطالعہ اور پھر دونوں کے درمیان مابہ الاشتراک موضوعات کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں؛ لیکن یہ اتنا اہم موضوع ہے کہ اس پر غور وفکر کرنا ایک سعادت کی بات ہے، قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام انسانوں کے لئے ہدایت نامہ اور ضابطہ زندگی ہے اور یہ قرآن تمام انبیاء کرام پر نازل کی گئی کتابوں تصدیق بھی کرتا ہے، اس لئے مذہب کی بہت سی بنیادی تعلیمات مذاہب کے ماننے والوں کی مشترک میراث ہیں، بائبل اور قرآن کی مشترک تعلیمات کے منتخب حصوں کو تلاش کرنا بہت زیادہ دشوار نہیں، بے شک قرآن کے مضامین پر اور بائبل کے مضامین پر جو مدون شکل میں موجود ہیں جو غور کرے گا تو اسے دونوں سمندروں میں یکساں نوعیت کے آبدار موتی ہاتھ آجائیں گے، مثال کے طور پر تخلیق انسانی اور اس کے مقاصد کا ذکر قرآن مجید میں بھی ملے گا اور بائبل میں بھی نظر آئے گا، مثال کے طور پر تخلیق انسانی سے متعلق قرآن مجید کی ان آیات پر غور کیجئے :

هَلْ أَتٰى عَلَى الْإِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ، إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ، إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُوْرًا . (الدہر:۱-۳)

کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ قابل ذکر چیز نہ تھا، ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا؛ تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا، ہم نے اسے راستہ دکھایا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

⊙ شعبۂ عربی: ایفل یونیورسٹی، حیدرآباد۔

اسی طرح سے قرآن مجید میں انسان کی پیدائش کا مقصد وجود بیان کیا گیا ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ . (الذاريات:٥٦)

ہم نے نہیں پیدا کیا انسانوں کو اور جنوں کو مگر اپنی عبادت کے لئے۔

انسان عبادت اور اطاعت کا حق ادا کر کے سعادت و کمال کے مدارج طے کرتا ہے، اسی طرح قرآن میں انسانی مساوات کا تصور واضح طور پر موجود ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ . (الحجرات:۱۳)

اے لوگوں! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے، جو تمہارے درمیان سے سب زیادہ پرہیز گار ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کا تذکرہ ہے، انسان سر سے پیر تک اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے، قرآن میں ہے :

وَإِن تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللهِ لاَ تُحْصُوْهَا . (ابراہیم:۳۴)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔

عقیدۂ توحید وہ جلی عنوان ہے جس کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے، یہ زبردست کائنات یہ لاکھوں سیارے، یہ زمین یہ آسمان یہ چاند جو راتوں کو اپنی نورانی کرنیں پھیلاتا ہے، یہ سورج جو صبح کو طلوع ہوتا ہے، یہ بے شمار تارے جو آسمان میں چمکتے ہیں، ان سب میں باقاعدگی پائی جاتی ہے، رات اپنے وقت سے پہلے نہیں آتی، دن اپنے مقررہ وقت سے پیشتر نہیں نکلتا، نہ چاند زمین سے ٹکراتا ہے، نہ سورج اپنا راستہ بدلتا ہے، زمین کی کشش نے سب کو اپنے حلقہ میں باندھ رکھا ہے، اگر ایک لمحہ کے لئے یہ کشش ختم ہو تو سارا کارخانہ بکھر جائے، اس کارخانہ کے جتنے پرزے ہیں، سب نظم وضبط کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے ہیں، ہوا اپنے وقت پر چلتی ہے، بارش اپنے نظام کے مطابق برستی ہے، روشنی کے لئے جو رفتار مقرر کردی گئی ہے، اس میں کبھی فرق نہیں آتا، چانداور سورج کے بیچ جو فاصلے طے کردیئے گئے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، ان میں معمولی سار دو بدل اس پوری کائنات کے لئے زلزلہ خیز ثابت ہوجائے، رات اور دن کے حساب میں کبھی فرق نہیں ہوتا، ہوا کا محکمہ پانی کے محکمے سے کبھی برسر پیکار نہیں ہوتا، ہر شئے قانون اور ضابطہ کی پابند ہے اور ہر چیز یہ گواہی دیتی ہے کہ خدا اس کائنات کا مالک اور بادشاہ ہے، قرآن میں ہے :

وَإِلٰـهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ . (البقرة:۱۶۳)

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس رحمٰن اور رحیم کے سوا کوئی معبود نہیں۔

توحید کا تذکرہ ہو یا تخلیق انسانی کی ابتداء کا، جنت کا ذکر ہو یا بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک کا، تخلیق انسان کے مقصد کا بیان ہو یا بندگانِ خدا کے ساتھ مدد اور حسن سلوک کا، یہ ساری باتیں جس طرح سے قرآن میں ہیں اسی طرح سے بائبل میں بھی ہیں، تخلیق انسانی کے بارے میں بائبل میں ہے :

اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، نر و ناریوں کو پیدا کیا۔

(کتاب پیدائش، باب:۱، آیت:۲۷)

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں بائبل میں ہے :

جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا تو اسے اپنے شبیہ پر بنایا، نر و ناریوں کو پیدا کیا اور ان کو برکت دی اور جس روز وہ خلق ہوئے ان کا نام آدم رکھا۔

(کتاب پیدائش، باب:۵، آیت:۱-۲)

پھر تخلیق انسانی کے بارے میں بائبل میں صراحت ہے :

خداوند کریم نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا وہ انسان جیتی جان ہوا۔ (کتاب پیدائش، باب:۲، آیت:۷)

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر چیز کو جوڑے سے پیدا کیا، آدم اور حوا کی تخلیق کا تذکرہ ہے، اسی طرح سے کتاب مقدس میں یہ آیت ملتی ہے :

خدا نے آدم کے لئے ایک مددگار بنایا اور خدا نے کہا کہ آدم کو اکیلا رکھنا اچھا نہیں ؛ اس لئے ایک مددگار اس کے لئے بناؤں گا۔ (کتاب پیدائش، باب:۳، آیت:۱۸)

توحید اور اطاعت الٰہی کے ذکر سے قرآن مجید کی سورتیں بھری ہوئی ہیں، بائبل میں بھی یہ موجود ہے :

پس اے اسرائیل ! خداوند تیرا خدا تجھ سے اس کے سوا کہتا ہے کہ قوم اپنے خدا کا خوف مانے اور اس کی سب راہوں پر چلے اور اس سے محبت رکھے اور اپنے سارے دل جان سے اپنے خدا کی بندگی کرے اور خداوند کے جو احکام اور آیتیں جو میں تجھ کو آج بتاہوں، ان پر عمل کرے؛ تاکہ تیری خیر ہو، دیکھ آسمان اور زمین اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب خداوند ہی کا ہے۔ (کتاب استثناء، باب:۱۰، آیت ۲۱-۱۴)

بائبل میں قرآن کی طرح شرک کی ممانعت ہے، اسی طرح بائبل میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم بھی موجود ہے :

> اگر تیرے درمیان تیری بستیوں میں جن کو خداوند تیرا خدا تجھ کو دے کہیں کوئی مرد یا عورت ملے، جس نے بدکاری کی ہو اور خداوند کے عہد کو توڑا ہو اور جاکر دوسرے معبودوں کی یا سورج یا چاند یا اجرام فلکی کی پوجا و پرستش کی ہو، جس کا حکم میں نے نہیں دیا، تو اگر کسی کے بارے میں تجھ کو یہ باتیں بتائی جائیں اور سننے میں آئیں تو جانفشانی سے تحقیقات کرنا اور اگر یہ ٹھیک ہو اور قطعی طور پر ثابت ہو جائے کہ اسرائیل میں ایسا مکروہ کام ہوا تو اس مرد یا عورت کو جس نے یہ برا کام کیا ہو باہر اپنے پھاٹکوں پر نکال لے جانا اور ان کو ایسا سنگسار کرنا کہ وہ مر جائیں۔ (کتاب استثناء، باب:۱۷، آیت:۲-۵)

قرآن میں نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے کا حکم ہے، خدمت انسانیت سے متعلق قرآن میں آیات ہیں، اس سلسلے میں تمام آیتوں کا اور حدیثوں کا شمار کیا جائے تو اتنی زیادہ ملیں گی کہ اس تعداد میں کسی صحیفہ آسمانی میں نہیں مل سکیں گی، اس سلسلے میں بائبل کے اندر بھی آیتیں موجود ہیں :

> جو ملک خداوند خدا تجھ کو دیتا ہے اگر اس میں کہیں تیرے بھائیوں میں سے کوئی مفلس ہو تو اپنے اس مفلس بھائی کی طرف سے نہ اپنا دل سخت کرنا اور نہ اپنی مٹھی بند کر لینا؛ بلکہ اس کی احتیاج رفع کرنے کو جو چیز اسے درکار ہو اس کے لئے ضرور فراخ دستی سے اسے قرض دینا...... میں تجھ کو حکم کرتا ہوں کہ تم اپنے ملک میں اپنے بھائی یعنی کنگالوں اور محتاجوں کے لئے اپنی مٹھی کھلی رکھنا۔ (کتاب استثناء، باب:۱۵، آیت:۷-۹)

قرآن مجید میں والدین کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ کبھی ان کے سامنے اُف تک نہ کہنا اور نہ ان سے سختی کے ساتھ بات کرنا: ''فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا '' (بنی اسرائیل:۲۳) یہ حکم بائبل میں بھی موجود ہے :

> اے فرزندو! اپنے ماں باپ کے فرمانبردار رہو؛ کیوں کہ یہ واجب ہے، اپنے باپ اور ماں کی عزت کر؛ تاکہ تیرا بھلا ہو اور تیری عمر زمین پر دراز ہو، جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرتا ہے، اس کا چراغ گہری تاریکی میں بجھایا جائے گا۔
>
> (کتاب امثال، باب:۲۰، آیت:۲۰)

قرآن مجید میں انسان کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دیا گیا ہے، قتل ناحق سے سختی سے منع کیا گیا ہے، یہاں

تک کہ یہ موجود ہے کہ جس نے ایک شخص کو قتل کیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا، بائبل میں بھی اس طرح کے احکام موجود ہیں، معصوم جان کی حفاظت کا ذکر بھی بائبل میں ہے، قرآن میں ''إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ'' (ہود:۱۱۴) (نیکیاں برائیوں کو زائل کر دیتی ہیں) کمپیوٹر وسائنس کی اصطلاح میں (Delete) کرنا کہتے ہیں، بائبل میں موجود ہے :

> شفقت وسچائی سے بدی کا کفارہ ہوتا ہے اور لوگ خداوند کے خوف سے بدی سے باز آتے ہیں اور جب انسان کی روشیں خداوند کو پسند آتی ہیں تو وہ اس کے دشمنوں کو بھی اس کا دوست بناتا ہے۔ (کتاب امثال، باب:۲۰، آیت:۲۰)

حسن نیت اور اخلاص کے سلسلے میں بھی بائبل میں بیش قیمت تعلیمات موجود ہیں، دنیا واسبابِ دنیا سے متعلق قرآن میں جو نقطۂ نظر ملتا ہے وہ بائبل میں بھی مل جاتا ہے، قرآن کی طرح بائبل میں بھی اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ :

> اللہ ہی خالق و مالک ہے اور خیر وکرم اور حق وصداقت اور حسن وخوبی کا سرچشمہ ہے۔
> (کتاب خروج، باب:۲۰، آیت:۵-۶)

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید اور بائبل — ایک تقابلی مطالعہ

جناب آصف الدین محمد ⊙

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين محمد و على آله و أصحابه أجمعين ، أما بعد !

سورہ بقرہ کی آیت نمبر: ۷۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتَابَ بِأَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هَـٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهِ ثَمَناً قَلِيۡلاً ۔

تو آفت ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے تو کتاب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے (آئی) ہے تا کہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کریں (یعنی دنیوی منفعت)۔

ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ توراۃ، زبور اور انجیل اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتابیں ہیں، جو کہ حسب ترتیب موسیٰ علیہ السلام داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئیں،، جن کے بارے میں یقینی طور پر مسلمانوں کو معلوم ہے کہ ان کتابوں میں تحریف کردی گئی ہے، لیکن اکثر غیر مسلمین خصوصاً عیسائی اور یہود اس حقیقت سے ناواقف ہیں، اور تو اور یہ لوگ اس کے برعکس اسلام اور قرآن پر حملہ آور ہیں، مثال کے طور پر وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں انبیاء کرام کے جو بھی واقعات اور قصے ہیں وہ بائبل سے نقل کئے گئے ہیں، اور قرآن اور بائبل میں جو باتیں یکساں ہیں ان کے بارے میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے ان باتوں کو بائبل سے قرآن میں نقل کیا ہے۔

اور جب کسی قصہ میں انہیں فرق نظر آتا ہے تو کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے ناواقفیت کی وجہ سے اس قصہ کو غلط بیان کیا ہے، اور ان کا یہ الزام ''چت میں جیتا، پٹ تو ہارا'' کے مصداق ہے اگر کسی قصہ کی بات بائبل سے ملتی جلتی ہوتی ہے تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے وہ قصہ بائبل سے اخذ کیا ہے، اگر کوئی بات بائبل سے مختلف ہو تو

⊙ حیدرآباد۔

پھر وہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے بائبل سے غلط نقل کیا ہے، اور انھوں نے ایسا ناواقفیت میں کیا ہے، چنانچہ ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے، کیا ہمارے پاس کچھ ٹھوس دلائل ہیں جن سے ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن میں جو قصے بیان کئے گئے ہیں، اللہ کی طرف سے ہیں اور ان کی جو بھی یکسانیت بائبل کے قصوں سے نظر آتی ہے، اس یکسانیت کی ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے کہ اللہ رب العالمین جس نے قرآن نازل کیا ہے، اسی رب نے تورات انجیل اور زبور کو نازل کیا ہے؛ لہٰذا ہمیں دلیل چاہئے جس سے اس بات کو ہم ثابت کر دیں، اور دوسرے پہلو سے اگر کوئی چیز قرآن میں اور بائبل میں مختلف ہو تو اس اختلاف کی وجہ ان کتابوں تورات، انجیل اور زبور میں ہونے والی تحریف ہے، اس تحریف کا سلسلہ صدیوں جاری رہا اور اسی کے سبب ان دونوں کتابوں کی بعض باتوں میں اختلاف ہے۔

آیئے اس ضمن میں ہم پہلے چند انبیاء کے واقعات پر غور کرتے ہیں؛ کیوں کہ مضمون کا عنوان بھی یہی ہے ،یعنی قرآن اور بائبل میں انبیاء کے قصوں میں کمپاریزن، ہم اول نوح علیہ السلام کے قصہ پر غور کرتے ہیں، کیوں کہ اس میں اکثر چیزیں قرآن سے ملتی جلتی ہیں، مثلاً نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن میں ہے کہ انھوں نے کشتی بنائی تھی، ان کی قوم پر عذاب آیا تھا، تمام چیزیں اسی طرح سے بائبل میں بھی ہیں؛ لیکن بعض چیزوں پر غور کرنے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ہرگز سچ نہیں ہوسکتیں، مثال کے طور پر کتاب پیدائش باب ۹، جملہ ۲۰ تا ۲۵ میں ہے :

> اور نوح کاشتکاری کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا، اور اس نے اس کی مئے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہوگیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا اور اپنے دونوں بھائیوں کو باہر آکر خبر دی، تب سم اور یافت نے ایک کپڑا لیا اور اسے اپنے کندھوں پر دھرا اور پیچھے کو الٹے چل کر گئے اور اپنے باپ کی برہنگی ڈھانکی، سو ان کے منھ اُلٹی طرف تھے، اور انھوں اپنے باپ کی برہنگی نہ دیکھی، جب نوح اپنی مئے کے نشے سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا، اسے معلوم ہوا اور اس نے کہا کہ کنعان ملعون ہو، وہ اپنے بھائیوں کے غلاموں کا غلام ہوگا، پھر کہا: خداوند سم کا خدا مبارک ہو اور کنعان سم کا غلام ہو، خدا یافت کو پھیلائے کہ وہ سم کے ڈیروں میں بسے، اور کنعان اس کا غلام ہو۔

تو جب نوح علیہ السلام کو ہوش آتا ہے، ان کو شراب پینے پر ندامت ہونے کے بجائے مدہوش ہونے پر ندامت ہونے کے بجائے اور اتنے بے ہوش بے خیال کہ ان کے کپڑے بھی ان کے بدن پر ہیں یا نہیں، اس پر ان کو ندامت ہونے کے بجائے، اس پر ان کو غصہ آتا ہے کہ ان کے چھوٹے بیٹے نے ان کو اس حالت میں دیکھ لیا ہے اور اس غصہ

کے سبب وہ اس بیٹے کو بددُعا دیتے ہیں اور اس کے لئے لعنت بھیجتے ہیں کہ وہ بیٹا اور اس کی نسلیں تمام کی تمام دوسرے بیٹے اور ان کی نسلوں کی غلام بن جائیں، تو اس طرح سے ایک بیٹے کو غلام بنانے کے لئے بالخصوص اس کی نسلیں اس کی اولاد اس کے پوتے، جن کا کوئی قصور نہیں، ان کو غلام بنانے کے لئے اس طرح کا غیر منصفانہ رویہ اور خود کی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے بیٹے کے اوپر اپنا غصہ اُتارنا، اس طرح کی چیزیں انبیاء کو زیب نہیں دیتیں؛ لیکن بائبل اس طرح کا الزام نوح علیہ السلام پر ڈالتی ہے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کی شان میں بائبل کے اندر کس طرح کی خرافات مذکور ہیں :

جب لوط علیہ السلام کی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے، اس کے بعد لوط علیہ السلام اور ان کی دو بیٹیاں وہاں سے بچ کر نکلتی ہیں اور وہاں سے نکل کر وہ لوگ ایک پہاڑ پر جاتے ہیں تو وہاں لڑکیاں ایک دوسرے سے کہتی ہیں کہ دیکھو اب ہم سے نکاح کرنے کے لئے کوئی مرد تو موجود نہیں ہے، اور ہماری نسل کی افزائش ضروری ہے؛ لہٰذا ہم اپنے ہی والد کو نسب میں ڈال دیں مطلب ان کو شراب نوشی کرادیں، اور جب وہ نشے میں مست ہو جائیں تو ان کے ساتھ ہم جنسی اختلاط کریں، اور اس اختلاط کے ذریعے سے ہم بچے حاصل کریں، سوچنے کی بات ہے کہ ان لڑکیوں کو اتنا گندہ خیال آیا کہ وہ اپنے والد سے جنسی اختلاط کریں اور اس کے لئے یہ عذر پیش کریں کہ اس عمل کے لئے دنیا میں کہیں مرد موجود نہیں۔

حالاں کہ اس وقت حضرت براہیم علیہ السلام موجود تھے، ان کی اولاد موجود تھی، اور ان کی آپس میں رشتہ داری بھی تھی اور بھی کئی قومیں وہاں موجود تھیں اور بھی کئی ممالک دنیا میں تھے، تمام جگہ پر انسان موجود تھے؛ لیکن یہ لوگ ایسا بہانہ بناتے ہیں جیسے کہ صرف اور صرف یہ دو لڑکیاں اور یہ والد ہی کل کائنات تھے۔

اب دیکھئے ان کا یہ عمل یعنی والد کو منصوبہ بند طریقہ سے شراب پلا کر اور انہیں بدمست کرکے ان کے ساتھ جنسی اختلاط کرتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں انہیں بچے پیدا ہوتے ہیں اور ان لڑکیوں نے ان بچوں میں سے ایک کا نام موآب یعنی میرے باپ سے، اور دوسرے کا بنیامین یعنی میرے رشتہ دار کا بیٹا نام رکھا اور یہ وہ نام ہیں جن سے ان لڑکیوں کی بے شرمی عیاں ہوتی ہے اور یہ باتیں بائبل میں، انبیاء کے متعلق خرافات کے تحت، کتاب پیدائش باب: ۱۹، جملہ نمبر ۳۰ سے لے کر ۳۸ میں درج ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے :

> اور لوط صُغر سے نکل کر پہاڑ پر جابسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں؛
> کیوں کہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا، اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے،
> تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا

کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے ، آؤ ہم اپنے باپ کو مئے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں ؛ تا کہ اپنے باپ کی نسل کو باقی رکھیں ، سو انھوں نے اسی رات اپنے باپ کو مئے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی ، پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی ، آؤ آج رات بھی اس کو مئے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو ؛ تا کہ ہم اپنے باپ کی نسل کو باقی رکھیں ، سو اس رات بھی انھوں نے اپنے باپ کو مئے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی ، پھر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی ، سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام موآب رکھا ، وہی موآبیوں کا باپ ہے ، جو اب تک موجود ہیں اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمّی رکھا اور وہی بن عموں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں ۔ (کتاب پیدائش ، باب :۱۹ ، جملہ :۳۰-۳۸)

لیکن ایک اور چیز اگر کوئی پڑھنے والے سوال کرنا چاہیں گے ، بائبل لکھنے والے سے کہ چلو مان لیجئے کہ جس وقت لوط علیہ السلام کی بیٹیاں اپنے والد کے ساتھ عذاب سے بچ کر نکلی تھیں ، اس وقت پوری دنیا میں کوئی بھی دوسری قوم میں یا کسی مقام پر یا کسی ملک میں کسی بھی جگہ ان کے والد کے سوا ایک بھی مرد موجود نہیں تھا ، اب انھوں نے جو زنا کیا ہے اس کے ذریعہ ان کو دو بیٹے ہوئے ، جس کے باعث ان لڑکیوں نے اپنے باپ سے جنسی میل ملاپ کیا اور اس کے ذریعے ان کو دو بیٹے ہوئے اب بتائیے جب مرد نا پید ہیں تو ان کے ان دو بیٹوں کو اولاد کس طرح ہوں گی ، کیا نعوذ باللہ انھوں نے اپنی ماؤوں کے ساتھ زنا کیا ؟ چنانچہ ان باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ بے حیائی اور نا سمجھی کے بہت سارے قصے اور واقعات بائبل کے اندر موجود ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بائبل اللہ کا کلام نہیں بلکہ تحریف شدہ کتاب ہے ؛ لیکن بحمد اللہ قرآن میں جو واقعات موجود ہیں ؛ وہ واقعات ان خرافاتی باتوں سے بالکل پاک ہیں ، اور قرآن کے مطابق انبیاء اس طرح کے گناہوں سے بری الذمہ ہیں ، اور قرآن سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عیسائیوں کی تمام باتیں مفروضہ ہیں ۔

اب آیئے ایک اور قصہ پر غور کریں ، ہم سبھی جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بحمد اللہ ذی مرتبت نبی ہیں ، اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں میں سے ایک ہیں ، ان کا لقب خلیل اللہ ہے ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے کئی

واقعات ہیں جن سے وہ اس اعلیٰ مقام تک پہنچے ہیں، اس میں سے ایک یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو عزم کیا اور اس کے سبب اللہ تعالیٰ ان سے خوش اور راضی ہوا اور ان کو اور بھی اپنا محبوب بندہ بنایا، فرزند اسماعیل کی قربانی کے واقعہ میں جو خوبصورت بات قرآن کی سورۂ صافات (سورہ نمبر: ۳۷، آیت نمبر: ۱۰۱-۱۰۲) میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاف الفاظ میں اپنے فرزند سے کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، پھر ان کے فرزند کہتے ہیں کہ آپ کو اللہ کا جو بھی حکم ہے اس پر عمل کیجئے، آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے؛ لیکن جب آپ بائبل میں مذکور اس قصہ کو پڑھیں گے، تو بے حد حیرت ہوگی، اس حوالے سے بائبل کے Jezeses کتاب پیدائش، باب نمبر: ۲۲، جملہ نمبر: ۲-۸ تک میں مذکور ہے:

> اپنے اکلوتے بیٹے اضحاق کو جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لے کر موریاہ کے علاقہ میں جا اور وہاں کے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا، اسے سوختی قربانی کے طور پر نذر کر؛ دوسرے دن صبح سویرے ابراہام نے اُٹھ کر اپنے گدھے پر زین کسا اور اپنے خادموں میں سے دو کو اور اپنے بیٹے اضحاق کو اپنے ساتھ لیا، جب اس نے سوختی قربانی کے لئے حسب ضرورت لکڑیاں کاٹ لیں، تو وہ اس مقام کی طرف چل دیا جو خدا نے اسے بتایا تھا، تیسرے دن ابراہام نے اوپر نگاہ کی اور وہاں سے دور اسے وہ مقام دکھائی دیا، اس نے اپنے خادموں سے کہا: تم یہیں گدھے کے پاس ٹھہرو اور میں اور یہ لڑکا اوپر جاتے ہیں، وہاں ہم عبادت کریں گے اور پھر تمہارے پاس لوٹ آئیں گے، ابراہام نے سوختی قربان کی لکڑیاں لے کر اپنے بیٹے اضحاق کو دیں کہ وہ انھیں اُٹھا لے، اور آگ اور چھری خود سنبھالی، جیسے ہی وہ دنوں ایک ساتھ روانہ ہوئے اضحاق اپنے باپ ابراہام سے کہنے لگا: ابا! ابراہام نے جواب دیا، ہاں میرے بیٹے؟ اسحاق نے کہا: آگ اور لکڑیاں یہاں ہیں؛ لیکن سوختی قربانی کے لئے برہ کہاں ہے؟ ابراہام نے جواب دیا: اے مرے بیٹے خدا آپ ہی سوختی قربانی کے لئے برہ مہیا کرے گا، اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ (کتاب پیدائش، باب: ۲۲ جملہ: ۲-۸)

یعنی ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو کہہ رہے ہیں کہ چلو ہم قربانی دینے جاتے ہیں، اور وہ قربانی کے لئے تمام سامان لے کر جاتے ہیں؛ لیکن قربانی کے لئے بکرا یا دنبہ وہ اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتے اور انھوں نے اپنے بیٹے کو اطلاع بھی نہیں کی کہ میں تمہیں قربان کرنے والا ہوں، کچھ دور جانے کے بعد ان کے بیٹے کے ذہن میں یہ سوال آتا

ہے کہ ہم قربانی دینے جارہے ہیں اور ہمارے پاس کوئی دنبہ نہیں ہے، پھر ہم کس چیز کی قربانی کریں گے اس ضمن میں جب بیٹا اپنے والد سے پوچھتا ہے کہ ہمارے پاس دنبہ تو نہیں ہے پھر آپ کس طرح قربانی کریں گے، اس کے جواب میں حضرت ابراہیم ؑ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنبہ کا انتظام کردے گا، یعنی آخری لحہ تک انھوں نے اپنے بیٹے کو دھوکہ میں رکھا اور ان کو یہ نہیں بتایا کہ میں تمہیں قربان کرنے والا ہوں اور ان سے اجازت طلب نہیں کی، اس طرح کا رویہ اپنے خود کے بیٹے کے ساتھ قطعاً کوئی نبی اختیار نہیں کرسکتے۔

اب آیئے اسحاق (ؑ) کی ولادت کے تعلق سے بائبل میں کیا خرافات ہیں ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں، بائبل کہتی ہے، کتاب پیدائش باب ۲۵ میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے، چوں کہ عیسائی لوگوں کو بخوبی معلوم ہے کہ مسلمان حیا والے ہوتے ہیں؛ لہٰذا انھوں نے اردو بائبل میں کچھ باتیں تبدیل کردی ہیں لیکن انگلش بائبل میں صاف طور سے لکھا ہوا ہے کہ :

> ...... *and the lord visited sara, and did unto her as he promeseo, and sara became bregnant.*
>
> خدا تعالیٰ نے سارہ سے ملاقات کی یعنی اس کی زیارت کی اور اس کے ساتھ ایسے کیا جیسا اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا اور وہ سارہ حاملہ ہوگئی۔

اب سوچیے کہ کتنے بھونڈے الفاظ بائبل میں درج ہیں، کوئی بھی انسان اسے پڑھ کر یہی سوچ سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کچھ ایسی غلط حرکت کی، اس طرح کے تعلق سے ان کا ایمان یا عقیدہ ہے، شاید اسی وجہ سے یہودی کہتے ہیں کہ ''نحن أبناء الله'' کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں، یہ بات وہ خود نہیں کہتے بلکہ وہ اپنے اکابرین کے سکھائے ہوئے عقیدے کے مطابق کہتے ہیں۔

اب آیئے خدا تعالیٰ کی شان میں ایک اور گستاخی : یہ گستاخی حضرت یعقوب ؑ کے ایک من گھڑت واقعہ سے منسلک ہے، وہ یہ کہ ایک مقام پر حضرت یعقوب ؑ ایک آدمی سے ساری رات کشتی لڑتے ہیں اور اخیر میں جب صبح ہونے والی تھی تو اس شخص نے حضرت یعقوب ؑ کی ران کی ہڈی کو تھوڑا سرکا دیا اور اس کے بعد اس نے کہا کہ آپ بہت طاقتور ہیں وغیرہ، اور حضرت یعقوب ؑ کی خوب تعریف کی، اس کے بعد حضرت یعقوب ؑ اس شخص سے اس کا نام پوچھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے دعائیں دیجیے، وہ شخص نام بتائے بغیر دعائیں دے کر چلا جاتا ہے، اس کے بعد حضرت یعقوب ؑ نے اس جگہ کا نام فنی ایل رکھا جس کا مطلب ہے میں نے خدا کو اس جگہ اپنے روبرو دیکھا ہے :

اس رات یعقوب اٹھا اور اس نے اپنی دو بیویوں، اپنی دو کنیزوں اور اپنے گیارہ بیٹوں کو لے کر انھیں یبوق کے گھاٹ کے پار اُتارا، انھیں یردن کے اس پار بھیجنے کے بعد اس نے اپنا سب مال و اسباب بھی بھیج دیا، تب یعقوب اکیلا رہ گیا اور ایک آدمی پو پھٹنے تک اس سے کشتی لڑتا رہا، جب اس آدمی نے دیکھا کہ وہ یعقوب پر غالب نہیں آسکتا تو اس نے یعقوب کی ران کے جوڑ کو ایسا چھوا کہ اس آدمی سے کشتی لڑتے لڑتے اس کی نس چڑھ گئی، تب اس آدمی نے کہا، مجھے جانے دے؛ کیوں کہ اب پو پھٹنے کو ہے؛ لیکن یعقوب نے جواب دیا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، تب اس آدمی نے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یعقوب، تب اس آدمی کہا: اب سے تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا؛ کیوں کہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا؛ تب یعقوب نے کہا: براہ کرم مجھے اپنا نام بتا؟ لیکن اس نے جواب دیا: تجھے میرے نام سے کیا؟ اور اس نے وہاں اس کو برکت دی؛ چنانچہ یعقوب نے اس مقام کا نام یہ کہتے ہوئے فنی ایل رکھا کہ میں نے خدا کو روبرو دیکھا تو بھی میری جان سلامت رہی۔ (کتاب پیدائش، باب، جملہ ۲۲-۳۰)

اور ابھی تک یہودی اور عیسائی یہ مانتے ہیں کہ اس جگہ خدا تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑی، اب انسان کی عقل میں یہ بات آنی چاہئے کہ جو خدا تعالیٰ ''کن'' کہہ کر ساری کائنات کو وجود میں لاسکتا ہے، جو خدا تعالیٰ ''کن'' کہہ کر ساری کائنات کو ختم بھی کرسکتا ہے، ویسا خدا ایک انسان سے رات بھر کشتی لڑتا رہا اور رات ختم ہونے تک اس پر حاوی نہیں ہوسکا، کیا یہ احمقانہ باتیں نہیں ہیں؟ بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ خدا تعالیٰ کی شان میں عظیم گستاخی ہے یہاں اول غور طلب بات یہ ہے کہ کیا خدا تعالیٰ انسان کی شکل میں آتا ہے، دوسرے یہ کہ کیا وہ کشتی بھی لڑتا ہے تیسرے یہ کہ خالق کو اپنی مخلوق یعنی انسان سے کشتی لڑنے میں اتنی دشواری ہوتی ہے کہ وہ اس کو چت کرنے کے لئے اس سے گھنٹوں کشتی لڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں اللہ کی شان میں گستاخی ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کا ایسا ہی ماننا ہے کہ یہ بات حقیقت ہے، مگر حقیقت کچھ نہیں۔

اب آیئے ایک اور چیز پر ہم غور کرتے ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ایک واقعہ، بائبل کی کتاب خروج، باب نمبر: ۳۳، جملہ ۱۸ سے ۲۳ تک میں مذکور ہے:

تب موسیٰ نے کہا کہ اب مجھے اپنا جلال دکھا اور خداوند نے کہا کہ میں اپنا جلال تیرے

سامنے عیاں کروں گا اور اپنا نام ''خداوند'' کا تیری موجودگی میں اعلان کروں گا، میں جس پر رحم کرنا چاہوں گا اس پر رحم کروں گا اور میں جس پر مہربان ہونا چاہوں گا، اس پر مہربان ہوں گا اور یہ بھی کہا کہ تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا؛ کیوں کہ کوئی بھی انسان مجھے دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا، پھر خداوند نے کہا کہ میرے قریب ایک جگہ ہے وہاں تو ایک چٹان پر کھڑا ہو جا اور جب میرا جلال وہاں سے گذرے گا تو میں تجھے اس چٹان کے شگاف میں رکھوں گا اور اپنے ہاتھ سے تجھے ڈھانکے رکھوں گا، جب تک کہ میں گذر نہ جاؤں، پھر میں اپنا ہاتھ ہٹالوں گا اور تیری نظر میری پشت پر پڑے گی؛ لیکن تجھے میرا چہرہ ہرگز دکھائی نہیں دے گا۔ (کتاب الخروج، باب: ۳۳ جملہ ۱۸-۲۳)

یعنی موسیٰ علیہ السلام خدا سے کہتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو دیکھوں، تو خدا جواب دیتا ہے کہ کوئی انسان میرا چہرہ دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا، وہاں یہ نہیں کہا گیا کہ کوئی مجھے دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا، وہاں کہا گیا ہے کہ کوئی میرا چہرہ دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا، پھر بعد میں خدا خود ایک تجویز پیش کرتا ہے کہ تم ایسے کرو کہ تم ان دو پہاڑوں کے درمیان جو شگاف ہے اس شگاف میں چھپ جاؤ اور میں اس شگاف کے سامنے سے گذروں گا اور جب میں گذرتا رہوں گا تو میں اپنے گذرنے کے مقام سے پہلے اس شگاف کو اپنے ہاتھ سے ڈھاپوں گا؛ تاکہ تم میرا چہرہ نہ دیکھ سکو، پھر میرے آگے جانے کے بعد تم شگاف سے مجھے دیکھ سکتے ہو، پھر موسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کرتے ہیں، یہ بات بائبل کے تحت ممکن ہے؛ چنانچہ وہ خدا کو پیچھے سے دیکھتے ہیں، اب ایک سوال یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا کو پیچھے سے دیکھا تو کیا دیکھا؟ تو عیسائی کہتے ہیں کہ خدا کا لباس دیکھا ہوگا، تو کیا خدا تعالیٰ لباس پہنتا ہے؟ کون درزی اسے سیتا ہے؟ اب دیکھئے اللہ تعالیٰ کے تعلق سے اسلام کا جو صحیح عقیدہ ہے اس کے مطابق اس واقعہ میں کوئی عریانیت نظر نہیں آتی؛ لیکن درحقیقت بائبل کے (کتاب پیدائش باب: ۱، جملہ ۲۶-۲۷) میں ہے کہ خدا نے انسان کو خود اپنی ہی شکل میں بنایا ہے، یعنی خدا ہو بہو انسانوں کی طرح ہے، تو اس عقیدہ کے مطابق ثابت ہوا کہ مذکورہ واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام نے خدا کو پیچھے سے دیکھا تھا اور خدا لباس بھی نہیں پہنا تھا، ذرا غور کیجئے کہ عیسائیوں کے ذہن میں ایسے قصے کہانیاں پڑھنے کے بعد خدا کے تعلق سے کیا کیا غلط سلط خیالات آتے ہوں گے، کیا اس میں کوئی سبق یا کوئی ہدایت ہے؟ کچھ نصیحت ہے؟ کچھ نہیں ہے، بس یہ ایک من گھڑت قصہ ہے اور ایسی باتیں بائبل میں بے شمار ہیں۔

اب آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق بائبل میں کیا کیا الفاظ مذکور ہیں، ہم سبھی جانتے ہیں کہ قرآن کی سورۂ آلِ عمران میں آیت نمبر: ۴۵ سے ۴۹ تک اس معجزہ کو بیان کیا گیا ہے کہ جبرئیل امین آکر

مریمؑ سے مخاطب ہوتے ہیں اور خوشخبری دیتے ہیں کہ ان کو ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے، تو حضرت مریم علیہا السلام پوچھتی ہیں کہ مجھے لڑکا کیسے ہوگا جب کہ مجھے کسی مرد نے چھوا ہی نہیں تو جبرئیل امین کا جو جواب ہے وہ اللہ کی شان کے مطابق ہے وہ فرماتے ہیں کہ "اذا قضیٰ امراً فانما یقول له کن فیکون" یعنی اللہ جو بھی چیز کا ارادہ کرے گا تو اسے ہوجا کہے گا تو وہ ہوجائے گا؛ آپ جب بائبل میں اس چیز کو دیکھیں گے کہ عیسیٰ کی خوشخبری دینے کے لئے جبرئیل امین حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آتے ہیں تو وہ پلٹ کر وہی جواب دیتی ہیں کہ میں کسی مرد کو نہیں جانتی، تو مریم علیہا السلام کی طرف سے جو جواب دیا گیا ہے وہ جواب قابلِ غور ہے، انجیل لوقا باب: ا جملہ ۳۰ سے ۳۵ تک یہ بات درج ہے، کہ: فرشتے نے جواب دیا کہ پاک روح (یعنی روح القدس) تجھ پر نازل ہوگا اور خدا کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی، اب سوچنے والی بات ہے کہ پاک روح کا نازل ہونا اور خدا کی قدرت کا ایک لڑکی پر سایہ ڈالنے سے کیا مراد ہے اور کس چیز کی طرف اس کا اشاہ جاتا ہے، اگر کسی پر واضح نہیں ہورہا ہے، بات اس کو سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو وہ بس اس جملہ کے بعد کا حصہ پڑھ لے اسی جملہ کے دوسرے حصہ میں آتا ہے کہ: اس لئے کہ وہ مقدس جو پیدا ہوگا وہ خدا کا بیٹا کہلائے گا، یعنی یہ کہ جس طریقہ سے ان کا حمل ٹھہر رہا ہے اس کی وجہ سے عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا کہلائے گا، اور اس کے پس منظر میں ہمیں وہ واقعہ بھی ذہن میں رکھنا ہے، جس کے بارے میں بائبل کہتی ہے کہ اسحاق کی پیدائش سے پہلے خدا نے سارہ کے ساتھ ایسا کیا جیسا کہ اس سے وعدہ کیا تھا اور سارہ حاملہ ہوگئی، تو اس کو مدنظر رکھتے ہوئے جب یہ پڑھیں گے تو واضح ہوجائے گا کہ اسی کی وجہ سے اس کو خدا کا بیٹا کہا گیا؛ چنانچہ عیسائی حضرات کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا جانا بائبل سے اشارۃً ثابت ہے اور اگر وہ لوگ اس طرح کی باتیں جھٹلاتے ہیں تو صرف اس وجہ سے جھٹلاتے ہیں کہ مسلمان کے پاس الحمد للہ بہترین دستور خدا موجود ہے اور اسلام میں توحید کا جو تصور ہے وہ بہترین تصور ہے اور وہ لوگ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے، اور ان کے عقیدہ کے اندر جو بھی خامیاں ہیں اس کو چھپانے اور پوشیدہ رکھنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ جنے ہوئے، یا بیٹے سے فلاں چیز مراد نہیں بلکہ کچھ اور چیز مراد ہے۔

اور یہ تمام تفصیلات جو یہاں میں نے بیان کی ہیں اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں عیسائیوں کو شرمندہ کروں یا انھیں ٹھیس پہنچاؤں؛ بلکہ صرف اور صرف میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ اپنی کتاب میں اتنی تحریفات اتنے مغالطے، اتنے غلط تصورات رکھتے ہیں، ان لوگوں کو یہ قطعی حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کے کلام کی طرف انگلی اُٹھائیں اور اس کی شان میں گستاخی کریں، ان کو چاہئے کہ وہ یہ محسوس کرلیں کہ ان کے پاس جو کتاب ہے اس کی کوئی حقیقت اور بنیاد نہیں ہے؛ لٰہذا ان کے پاس اللہ کی کوئی سچی کتاب نہیں ہے؛ چنانچہ ان کو چاہئے کہ وہ اللہ کے

کلام (قران) جس کی حفاظت کی اللہ نے ذمہ داری لی ہے، کی طرف رُجوع ہوں اور اپنی دنیا اور آخرت کو سنوارنے کی کوشش کریں۔

اور اخیر میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ بہت سی جگہ قرآن اور بائبل میں بہت زیادہ ملتے ہوئے نظریات ہیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی، اسی طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو قربانی کے لئے لانا، اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے جلتے ہیں؛ لیکن جب وہ یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ قرآن میں جو تفصیلات آئی ہیں وہ بائبل سے کاپی کرکے ہوئی ہیں تو ان کو یہ بات سمجھنا چاہئے کہ ایک ہی نبی کا واقعہ اللہ کی طرف سے دو الگ الگ زمانوں میں دو الگ الگ کتابوں میں بیان کیا جائے تو ان کے درمیان چند چیزوں میں مماثلت نظر آئے گی، اگر اس پر ان کو اعتراض ہے تو پھر ان کو بھی یہ بات ماننی پڑے گی کہ جس طرح کی خرافات ان کی کتاب میں موجود ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کتاب تحریف شدہ ہے، اس میں انسانوں کی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کی گئی ہیں، اخیر میں اللہ سے دُعاء ہے کہ وہ تمام عیسائی و یہودی لوگوں کو توفیق دے کہ وہ سچے دل سے اپنی کتاب کو پڑھیں اور قرآن کو بھی پڑھیں اور پھر ان میں فرق کو سمجھیں، اور پھر اس کے بعد خدا تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ انھیں سیدھا راستہ دکھائے۔ (آمین)

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین .

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید اور بائبل — مشترکہ تعلیمات

جناب اقبال احمد انجینئر ⊙

انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جان سے بنایا، اسی جان سے اس کے زوج کو بنایا اور پھر زمین پر مردوں اور عورتوں کو ان دونوں کے ذریعہ پھیلا دیا، انسانوں کے درمیان رشتے بھی اللہ تعالیٰ نے بنائے، باپ، بیٹا، بھائی، بہن، ماں اور بیوی (زوج) اور دیگر رشتے سب اسی کے دیئے ہوئے ہیں، الغرض دنیا ایک ہی خاندان کے افراد سے بھری ہے، یہ بین الاقوامی بھائی چارگی کا احساس اول دن سے ہی دیا گیا ہے، جب آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا گیا تو یہ وعدہ بھی لیا گیا کہ زندگی گذارنے کے صحیح طریقہ بتائے جائیں گے اور جو کوئی ان ہدایات کو مانے گا وہی کامیاب ہے اور جو اسے جانتے بوجھتے جھٹلائے یا انکار کرے وہ نقصان اُٹھائے گا، دنیا کی زندگی ایک آزمائش ہے اور انسان اپنے اختیارات (عارضی) کو کیسے استعمال کرتا ہے، اسی پر اس کی دائمی زندگی آخرت کا انحصار ہے، نفسانی خواہشات اور شیطان مردود کے بہکانے سے جو انسانی ماحول بنتا ہے اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں مشکلات پیدا ہوتی ہیں، اس کے نفاذ کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کی ذات واحد، صفات، اختیارات اور احکامات میں کسی کو شریک نہ کریں، توحید زندگی کی راہ اصل ہے، جو اگر صحیح ہو جائے تو ساری زندگی کامیاب اور جب جب اس توحید میں بگاڑ پیدا ہوا اور معاشرہ فساد سے بھر گیا تو اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے؛ تاکہ انھیں سیدھا راستہ بتایا جائے، کوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جہاں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو اور انھیں شریعت نہ دی گئی ہو، مگر ان قوموں کا طریقہ یہ رہا کہ کبھی انھوں نے ان کو مانا بھی تو ان کے بعد شریعت میں تحریف کر ڈالی اور اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق اسے ڈھال لیا، مگر اکثر یہی ہوتا رہا کہ نبیوں کو جھٹلایا گیا اور انھیں قتل بھی کیا گیا، قدیم شریعتوں میں تحریف انسانی کے باوجود ان میں بنیادی عقائد توحید، رسالت اور آخرت موجود ہیں، یعنی انسانی علم کو اتنی جرأت نہیں دی گئی کہ ان کو مکمل ختم ہی کر سکے، اسی لئے آخری کتاب قرآن میں تذکرہ موجود ہے کہ قدر مشترک اللہ کی ذات واحد کو بنایا جا سکتا ہے اور دیگر مذاہب (یہود و نصاریٰ) سے بات چیت کی جا سکتی ہے، دعوت دین کے لئے جو میدان کھلا ہے اس میں اس ہتھیار کا استعمال

⊙ حیدرآباد۔

نتیجہ خیز ہوتا ہے، آسمانی کتابوں کا جو ذکر قرآن مجید میں ہے ان میں توزبور، توریت اور انجیل کے ہی نام آتے ہیں، ان کے علاوہ صحیفوں کا بھی تذکرہ ہے اور دیگر کتابوں کی بات کی گئی، جن کے نام نہیں بتائے گئے۔

قرآن اب حق وباطل کی کسوٹی ''فرقان'' ہے؛ چوں کہ یہ آخری کتاب ہے اور خود خالق کائنات نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اس لئے انسانی تحریفات سے یہ پاک ہے، خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ زندگی ہی انسانیت کی کامیابی کا ضامن ہے اور قابل تقلید بھی یہی ہے، عربی زبان میں نازل قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ ہر زمانے میں جو نبی بھیجے گئے اپنی قوم کی زبان میں بھیجے گئے جو اس زبان کے اُسلوب، معاشرے کی تہذیب اور اس کی فکر سے واقف تھے، قرآن عربی میں اُتارا گیا ہے اور دعوت دین کے لئے جب کوشش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں موجود معاشرہ انسانیت میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کی تہذیب الگ ہے، فکر جدا ہے اور زبان کی اصطلاحیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں، ان سب کے علاوہ مذاہب کے اعتبار سے ان معاشروں کے پاس کوئی نہ کوئی کتاب اور اُصول تحریراً موجود ہیں، خالق کائنات کو ماننے والے ان افراد کے علاوہ بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کے سرے سے منکر بھی اور یہ سب اس معاشرے کا حصہ ہیں؛ چوں کہ موضوع قرآن اور بائبل ہے اس لئے اس معاشرے میں موجود عیسائیت اور یہودیت کی کتابوں کے بارے میں جاننے کی ہی کوشش کی گئی ہے۔

دعوت مسلمانوں کی اہم ذمہ داری ہے، اس اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس دعوتی میدان میں مسلمانوں کو بھیجا گیا ہے اور جو مسائل اس میدان میں پیدا ہوتے ہیں ان تمام کا احاطہ قرآن نے دلیلوں کے ساتھ کیا ہے اور رہنمائی بھی کی ہے کہ دعوت کیسے دی جائے۔

اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں

دعوت دین اب اُمتِ مسلمہ کی اہم ذمہ داری ہے اور یہی پیغام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے وقت دیا تھا کہ جو لوگ موجود ہیں وہ آنے والوں تک اس بات کو پہنچادیں، تب ہی یہ حق منصب رسالت ادا ہوگا:

> اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا، اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے، یقین رکھو وہ کافروں کو (تمہارے مقابلے میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔ (المائدۃ: ۶۷، تفہیم القرآن)

قرآن اور اسوۂ حسنہ اُمت مسلمہ کے پاس اب ایک امانت ہے اور یہ رہتی دنیا تک ساری انسانیت کے

لئے رہنمائی ہے، امانت کا حق تو اسی وقت ادا ہوگا جب وہ جن کے لئے آئی ہے ان کو پہنچائی جائے، اُمتِ مسلمہ جو اس منصب رسالت کی امین ہے اسے اس کا حق بہر حال ادا کرنا ہی ہوگا، ورنہ اس کے بارے میں اس سے سوال بھی کیا جائے گا، رہا اس دعوت کے میدان میں مشکلات اور پریشانیاں، تو جب اللہ نے مسلمان داعی کو لوگوں کے شر سے بچانے کا وعدہ کر رکھا ہے اور یہ بھی اطمینان دلایا گیا ہے کہ کافروں یعنی جانتے بوجھتے انکار کرنے والوں کو مسلمانوں پر کبھی کامیابی نہیں ہوگی، غلبہ صرف حق کا ہوگا، تو اس یقین دہانی کے بعد یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جس سے اجتناب مصائب و پریشانی کا باعث ہوتا ہے، موجودہ دور میں کثرت تعداد کے باوجود اُمتِ مسلمہ کی دھاک ختم ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس دعوت دین سے غفلت برتی جارہی ہے۔

طریقۂ کار دعوت

دعوت کی ذمہ داری کو جب سمجھ لیا گیا تو اس کا طریقہ کار کیا ہو اس کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن اور اسوۂ حسنہ کیا رہنمائی کرتے ہیں :

> کاش! انھوں نے تورات، انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں، ایسا کرتے تو ان کے لئے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا، اگرچہ کہ ان میں کچھ لوگ راست رو بھی ہیں ؛ لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔ (المائدۃ:٦٦، تفہیم القرآن)

یہاں تورات، انجیل کے علاوہ دوسری اللہ کی کتابوں کا حوالہ دیا گیا (ناموں کی صراحت نہیں کی گئی) یعنی اس بات کی تصدیق کی گئی، راہ عمل کے لئے شریعت الٰہی کا نزول وقت ضرورت ہوا ہے اور اگر ان کتابوں میں تلاش کیا جائے تو توحید ضرور مل جائے گی، اگر واقعی وہ ان کتب الٰہی کے موضوع اور مقصد کو سمجھتے تو قرآن کو سمجھنا بہت آسان ہوتا، اس کا انکار مشکل ہوتا، اسی لئے کہا گیا کہ دعوتِ دین کے لئے ان مذاہب میں اقدار مشترک کو تلاش کرنا چاہئے، دوسری اہم بات یہ بھی بتائی گئی، مذاہب کے ماننے والوں میں اب بھی ایک قلیل تعداد ایسی موجود ہے جو راست رو ہیں جو دعوت دین کے منتظر ہیں، یعنی داعی کو میدان عمل میں جانے کے لئے راستہ بتایا جارہا ہے اور افراد کا بھی تعین کیا جارہا ہے اور یقین دلایا جارہا ہے کہ تمہاری دعوت بے کار نہیں جائے گی ؛ بلکہ ان میں موجودہ لوگ جو حق کی تلاش میں ہیں اس دعوت پر لبیک کہیں گے۔

اقدار مشترک میں پہل کیسی ہو؟

پہلا موضوع کتاب: قرآن نازل شدہ کتابوں کے جو حوالے دیتا ہے ان میں توراۃ اور انجیل کا بار بار ذکر

ہوتا ہے، یہودیت کی طاقت اور عیسائیت کے ماننے والوں کی کثیر تعداد اور فکر کا دنیا میں اثر ہے، اس لئے اہل کتاب کے نام سے جب بھی انھیں پکارا گیا تو انھیں ان کی کتابوں کی یاد دلائی گئی؛ کیوں کہ آج بھی ان مذاہب کا قیام ان ہی کتابوں پر ہونے کا دعویٰ وہ کرتے ہیں۔

> صاف کہہ دو! اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات وانجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں، ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھادے گا، مگر انکار کرنے والوں پر کچھ افسوس نہ کرو۔ (المائدۃ: ۶۸، تفہیم القرآن)

اہل کتاب کے ذکر کے ساتھ تورات، انجیل اور دوسری کتابوں کا بھی ذکر ہے، جو ان کتابوں سے قبل آئی ہیں (ان کی تعداد اور ناموں کا تذکرہ نہیں ہے) یہودیوں سے بات کریں تو توریت کو قائم کرنے کی بات کریں، عیسائیوں سے بات کریں تو انجیل کے قائم کرنے کی بات کریں، اس کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب ایسا ہے جو کتاب شرکھنے کا دعویٰ کرتا ہے اور قرآن کے مطابق کسوٹی پر اُترتا ہے تو ان کی کتاب کو بھی موضوع بنانے کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

تین اہم باتیں یہاں پر معلوم ہوتی ہیں :

(۱) صرف کتابوں (شریعتوں) (انجیل اور توراۃ) کو ہی قائم کرنا ہے، وہی ایک بنیادی عمل ہے۔

(۲) اگر کتابوں کو بنیاد نہیں بنایا گیا تو پیروی کرنے کی کوئی اصل بنیاد ہی نہیں ہے اور جو کچھ عمل ہو رہا ہے وہ قابل اعتبار ہے، نہ لائق توجیہہ، محض من گھڑت کہانیاں یا قصے ہیں۔

(۳) اگر اللہ کی قدیم کتابیں قائم ہوتیں یا ان کی معلومات عام ہوتیں تو پھر قرآن کو سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی؛ کیوں کہ تمام کتابیں توحید کا ہی درس دیتی ہیں اور اللہ ہی کی عبادت کی تلقین کرتی ہیں، آخرت کی زندگی کی بات کرتی ہیں اور رسالت کو بندوں اور اللہ کے درمیان جوڑنے کا کڑی سمجھتی ہیں۔

چوں کہ انھوں نے اصل بنیاد اللہ کی کتابوں کو ہی چھوڑ دیا ہے (تحریف کرنے کے بعد شریعت کو بدل دیا ہے، اور نفس اور شیطان کے غلام بن گئے ہیں، مفادات واقتدار کا تحفظ چاہتے ہیں، اس لئے جب وہی قدیم اصل بنیادیں قرآن کے ذریعہ سامنے آئی ہیں تو ہٹ دھرمی پر اُتر آئے، سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی آسمانی کتاب سے توحید کو نکالا نہیں جاسکتا، اس لئے دیگر مذاہب میں بھی توحید کا ذکر پایا جاتا ہے اور سارے مذاہب کے پیرو بھی اللہ کی

وحدانیت کا تصور رکھتے ہیں۔

دوسرا موضوع اللہ کی وحدانیت : وحدانیت کا تذکرہ موجود ہونے کا دعویٰ تو سارے مذاہب کرتے ہیں؛ لیکن وحدانیت کی تعریف ان کے پاس جدا جدا ہے، اس لئے جب توحید کی بات ہو تو اس کی مکمل صراحت بھی ہو۔

> اے نبی کہو! اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے، اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منھ موڑ لیں تو کہہ دو: تم گواہ رہنا کہ ہم اطاعت کرنے والے ہیں۔ (آل عمران: ۶۴ تفہیم القرآن)

توحید کی صراحت میں تین باتیں بتائی گئیں: بندگی یعنی پہلی بات عبادت صرف اللہ ہی کی ہو، دوسری بات کوئی ذات عبادت کے قابل نہیں ہے، تیسری بات اللہ ہی کو رب مانو اور عبادت کے لئے تین یا تین سے زیادہ کو خدا بنالو تو یہ توحید نہیں ہوئی؛ بلکہ شرک ہوا کہ اس کی صفات ہیں دوسروں کو شامل کرلیا گیا، یہی نہیں ضروریات کو پورا کرنے والا بھی صرف اللہ واحد ہے، کئی ارباب نہیں، اگر توحید کے یہ معنی لئے جاتے تو پھر بھلا جھگڑا کیسا، اس آیت میں داعی کے لئے یہ رہنمائی کی گئی ہے کہ اگر آج کی توراۃ اور انجیل (مذاہب کی کتابوں میں) اللہ کی توحید تلاش کریں تو یہی اصل حقیقت سامنے آئے گی، جس کی وضاحت قرآن کررہا ہے۔

اس حجت کی تکمیل کے باوجود اگر اہل کتاب اس سے انکار کرتے ہیں تو یہ ان کا کردار ہے، بات کو پورے طور سے پہنچا دینا اور امانت کا دے دینا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، اس کے بعد وہ بری الذمہ ہیں، ہدایت کا دینا اللہ کی ذمہ داری ہے، وہ تو صدق دل کی طلب سے ملتی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو قدر مشترک بنانا

یہود و نصاریٰ دونوں کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام محترم ہیں، نبی ہیں، انھیں وہ جدامجد سمجھتے ہیں، عہد نامہ قدیم میں ابراہیم السلام کے متعلق جو باتیں آج بھی موجود ہیں، ان کو اگر قدر مشترک بنایا لیا جائے تو ان کی اطاعت الٰہی اور اپنے بیٹے (اسماعیل علیہ السلام) کی قربانی کا ذکر ملتا ہے، قرآن بھی ابراہیم کے طریقے کو ہی سیدھا راستہ بتاتا ہے، جس کی تلقین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے :

> تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں سے ایک اچھا نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا " ہم تم سے اور تمہارے معبودوں سے جن کو تم خدا کو

> چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بے زار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا، ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا، جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ'' مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے کہنا (اس سے مستثنیٰ ہے) کہ میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا اور اللہ سے آپ کے لئے کچھ حاصل کر لینا میرے بس میں نہیں ہے (ابراہیم علیہ السلام اور اصحاب ابراہیم کی یہ دُعا تھی کہ) اے ہمارے رب تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رُجوع کر لیا اور تیرے ہی حضور میں ہمیں پلٹنا ہے۔ (الممتحنۃ:۴، تفہیم القرآن)

ابراہیم علیہ السلام پر ان سب کا اتفاق ہے اور آپ کی ذات اچھا نمونہ زندگی ہے؛ لیکن آپ کا قطعی اعلان تو اللہ کی عبادت اور دوسرے معبودوں سے بے زاری ہے اور بعد از مرگ اللہ کی طرف پلٹنے کا یقین ہے تو پھر آج یہودی وعیسائی کس دین پر ہیں، یہ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے یا پھر اپنا من گھڑت دین، اگر یہودی اور عیسائی اپنے دین کو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے الگ بتاتے ہیں تو پھر بھلا وہ ابراہیم علیہ السلام کے پیرو کیسے ہوئے اور دین ابراہیم کے متعلق مسلمانوں سے ان کا جھگڑا بے معنی ہے؛ کیوں کہ ابراہیم علیہ اسلام نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی؛ بلکہ وہ تو مسلم تھے۔

> اے اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے، تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو ان میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب ان معاملے میں کیوں بحث کرتے ہو، جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں ہے، اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے، ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھا نہ عیسائی؛ بلکہ وہ تو مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا، ابراہیم (علیہ السلام) سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے، جنھوں نے اس کی پیروی کی، اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں، اللہ صرف ان کا حامی اور مددگار ہے۔ (آل عمران:۶۵-۶۸، تفہیم القرآن)

اس طرح قدر مشترک کے موضوعات تین ہوئے، ایک کتاب، دوسرا اللہ، تیسرا متفقہ نبی، جب یہ موضوعات لے کر اہل کتاب کے پاس جائیں تو ان میں قلیل افراد ایسے موجود ہیں جو اس دعوت کو قبول کریں گے؛

کیوں کہ قرآن اس بارے میں رہنمائی کرتا اور اس سلسلے میں اہل کتاب کی تقسیم کرتے ہوئے ان کی فکر اور عقیدے کا بھی ذکر کرتا ہے؛ تاکہ حکمت کی بنیاد پر ان کو دعوت دی جاسکے۔

اہل کتاب کی تقسیم

۱- **راہ راست پر قائم لوگ** : پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو راہ راست پر قائم ہیں جس کا قرآن یوں ذکر کرتا ہے :

> مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں ، ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں ، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔(آل عمران:۱۱۳، تفہیم القرآن)

یہ لوگ اللہ کے خوف سے سجدہ ریز ہو کر اپنی آخرت کا بھلا چاہتے ہیں ، یعنی ایک قلیل تعداد اب بھی اہل کتاب (یعنی وہ ساری کتابیں جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں) میں چند ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کتابوں کی اصل سے واقف ہیں اور عبادت میں مصروف ہیں ،قرآن کو سمجھنا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

۲- **صالحین** : دوسری قسم صالحین کی اہل کتاب میں موجود ہے :

> اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ، نیکی کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں ، یہ صالح لوگ ہیں۔(آلِ عمران:۱۱۴،تفہیم القرآن)

یعنی جو کتابیں ان پر نازل کی گئی ہیں ، ان میں اللہ اور بعد از مرگ آخرت پر ایمان کے ساتھ ساتھ معروف ومنکر کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انسانیت کی بھلائی کے کاموں میں سرگرم عمل ہیں ، یہ وہ صالح عنصر ہے جو منتظر رہتا ہے کہ صحیح پیغام اس تک پہنچے؛ تاکہ وہ اسے قبول کریں اور عمل کریں۔

۳- **قرآن کو ماننے والے** : یہ تیسری قسم جو صرف دعوت کی منتظر ہے کہ قرآن ہی اب حق و باطل کی کسوٹی ہے :

> اہل کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں ، اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں ، جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی ، اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں ، اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر نہیں بیچتے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں کرتا۔(آلِ عمران:۱۹۹، تفہیم القرآن)

ایسے لوگوں کے سامنے دین کی دعوت کو پیش کیا جائے تو قبولیت کے مواقع زیادہ ہیں، کیوں کہ انھوں نے قرآن کو سمجھ لیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئی کو سچ مان لیا ہے، اگر یہ مسلمان بن جاتے ہیں تو وہ صالح اعمال جو انھوں نے پہلے کئے ہیں ان کا اجر بھی دیا جائے گا، انھیں سمجھنا پڑے گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور قرآن پر ایمان لازم وملزوم ہیں، اسی میں نجات ہے۔

۴- **رہبانیت** : اللہ کی خوشنودی کے لئے رہبانیت کا اختیار کرنا دراصل ان کے نرم دل احساس تڑپ کا نتیجہ ہے جو وہ انسانیت کے ساتھ رکھتے ہیں، ترک دنیا کا ان کا طریقہ اللہ کی خوشنودی کے لئے اختیار کیا گیا، مگر یہ اللہ کا حکم نہیں تھا، مگر فطرت انسانی کے خلاف اس عمل نے فسق وگمراہی کے دروازے کھولا ہے :

> ہم نے پئے در پئے اپنے رسول بھیجے، پھر ان سب کے بعد عیسیٰ بن مریم کو مبعوث کیا اور اس کو انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ہم نے ان کے دلوں میں نرمی اور رحمت رکھی اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کرلی، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی سے یہ بدعت نکال لی، پھر اس کی پابندی کا حق جو تھا اسے ادا نہ کیا، ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے ان کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا، مگر ان میں اکثر لوگ فاسق ہیں۔ (الحدید:۲۷، تفہیم القرآن)

۵- **عبادت گزار عالم وفقیر** : نصاریٰ مسلمانوں سے قریب ہیں، جب کہ یہودی ومشرکین سخت ہیں :

> تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان والوں کے لئے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے، جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں تمرد نفس نہیں ہے، جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں اور وہ بول اُٹھتے ہیں کہ ''پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے'' اور کہتے ہیں کہ آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اسے کیوں نہ مان لیں؛ جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرلے، ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ نے ان کو ایسی جنتیں عطا کیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ جزا نیک رویہ اختیار

کرنے والوں کی ہے، وہ لوگ جنھوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا اور انھیں
جھٹلایا تو وہ جہنم کے مستحق ہیں۔ (المائدۃ:۸۲-۸۶، تفہیم القرآن)

ان آیتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نصاریٰ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہے اور اس قرآن کی آیتوں کو جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو مضمون کی یکسانیت سے وہ اس حق کو پہچان لیتے ہیں، ان عالموں کے کردار کی خصوصیت عبادت گزار تارک الدنیا فقیر ہے اور دوسری اہم خصوصیت غرور نفس جیسی مہلک بیماری سے وہ پاک ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اللہ سے لگاؤ کی اس کیفیت میں حکمت سے تعلیم اور اس کی دعوت کے جو نتائج برآمد ہوں گے اس پر یقین ہونے کی بابت قرآن نے کہا: وہ قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اعتراض کرنے والوں کو سخت جواب بھی دیتے ہیں کہ کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں؟ اور قرآن اور ایمان کو حق مانتے ہیں، یہی نہیں بلکہ سچ کو ماننے کی مصیبتوں میں ثابت قدم بھی رہتے ہیں اور مقابلہ کرتے ہیں؛ تاکہ صالح لوگوں میں شامل ہوں۔

ایسی مثالیں اب بھی معاشرے میں موجود ہیں، جن یہودی ونصرانی عالموں نے اسلام قبول کیا انھوں نے انتہائی ثابت قدمی سے اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کیا اور کر رہے ہیں۔

۶- **علماء باطل** : اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں نے اپنی کتابوں کو دنیا کے عوض بیچ ڈالا، ان کی اکثریت وہ ہے جو مالی فائدوں کے لئے غلط رہنمائی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے :

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے
کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ سے روکتے
ہیں، دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں
خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ایک دن آئے گا، کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی
آگ دہکائی جائے گی اور پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں
کو داغا جائے گا، یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا لو اب اپنی سمیٹی ہوئی
دولت کا مزہ چکھو۔ (تفہیم القرآن)

عام عیسائیوں کو بتانے کے لئے ان آیات کا استعمال کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح عیسیٰ علیہ السلام کے زندگی کے اُصول اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو انھوں نے چھپا دیا اور اپنے مفادات باطلہ کے تحفظات میں جٹ گئے، ان کا ہر عمل دنیا کے فائدہ کے لئے اور حق کو چھپانے کے لئے ہوتا ہے اور وہ عوام الناس کو بھٹکا دیتے ہیں۔

ان چھ گروہوں میں تقسیم کے بعد جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اکثریت چھٹے گروہ کی ہے اور ان کے متعلق بھی کہا گیا، وہ ہرگز راضی نہ ہوں گے، یہاں تک کہ ان کے طریقے کی پیروی نہ کریں، یہاں لفظ راضی استعمال ہوا ہے، یعنی ان سے ضرور گفتگو کی جائے؛ حالاں کہ یہ معلوم ہے کہ ان کو اپنے مفادات زیادہ عزیز ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اول تو وہ اپنے عقائد کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کرسکیں گے، دوسرے یہ کہ جب وہ کوئی دلیل پیش نہ کرسکیں گے تو ظاہر ہے ان کے ماننے والے جو علم کے اعتبار سے کم تر ہوں گے، ان کی اس کمزوری سے تائب ہوکر اسلام کی طرف راغب ہوں گے۔

عیسائیت کی موجودہ صورت حال

۱- اہل کتاب خواہشات کی پیروی کرتے ہیں :

کہو ! اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور نہ ان لوگوں کے تخیلات کی پیروی کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سواء السبیل سے بھٹک گئے۔ (المائدۃ:۷۷، تفہیم القرآن)

اہل کتاب کا موجودہ معاشرہ اپنی خواہشات کی پیروی و اتباع کرتا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی نہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی پیروی نہیں کرتے وہ گمراہ ہیں، گمراہ کرتے ہیں۔

۲- عیسائی کفر کرتے ہیں :

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا مسیح ابن مریم ہی خدا ہے، اے نبی ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم اور اس کی ماں کو اور تمام زمین والوں کو ہلاک کردینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے؟ اللہ تو زمین و آسمان اور ان سب چیزوں کا جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہیں مالک ہے، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہوتی ہے۔ (المائدۃ:۱۷، تفہیم القرآن)

کفر یعنی جانتے ہوئے انکار کرنا عیسائی (علماء) جانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں ہیں باوجود اس کے وہ اپنے فائدے کے لئے اور عوام کو بھٹکانے کے لئے انھیں خدا بناتے ہیں۔

۳- عقیدۂ تثلیث کفر ہے :

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا: اللہ تین میں سے ایک ہے؛ حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس

جس نے کفر کیا ہے، اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔ (المائدۃ:۸۷، تفہیم القرآن)

یہاں بھی اس بات کو بتایا جارہا ہے، عیسائی مذہبی پیشوا اچھی طرح جانتے ہیں کہ عقیدۂ تثلیث من گھڑت ہے باوجود اس کے وہ بغیر دلیل کے اسے پھیلاتے ہیں؛ تاکہ دنیاوی فائدے حاصل کئے جائیں، یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، (موجودہ بائبل بھی اس پر دلالت کرتی ہے)۔

۴- عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت سے کفر:

> جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر اور انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے، حواریوں نے جواب دیا "ہم اللہ کی راہ میں مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں، (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے والے)۔ (آل عمران:۵۳، تفہیم القرآن)

عیسائی مذہبی پیشوا اچھی طرح جانتے ہیں کہ عیسیٰ کے حواری عیسیٰ پر بہ حیثیت رسول ایمان لائے تھے (موجودہ بائبل بھی اس پر دلالت کرتی ہے)؛ لیکن اصل حقیقت کو چھپا دینا یا انکار کرنا ان کی عادت بن گئی ہے، عوام چوں کہ بائبل سے واقف نہیں ہوتے اور اس نے وہی سب کچھ صحیح سمجھ لیتے ہیں جو ان سے کہا جاتا ہے، تحقیق نہیں کرتے۔

۵- کیا عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر چڑھایا گیا؟

> اور خود کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کردیا؛ حالاں کہ فی الواقع انھوں نے اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا؛ بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کردیا گیا اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں ہیں ان کے پاس اس معاملے میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے، انھوں نے مسیح علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا۔ (النساء:۱۵۷، تفہیم القرآن)

قرآن مجید نے اللہ کی وحدانیت، عیسیٰ کی رسالت (معجزاتی پیدائش)، عقیدۂ تثلیث اور عقیدۂ مصلوبیت کی حقیقت کیا ہے اس کی صراحت کی ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا، تین میں سے ایک خدا پھر ان کو صلیب پر چڑھانے کے عقیدوں کو مسترد کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت اور عقیدہ آخرت کا تذکرہ موجودہ بائبل میں ہونا چاہئے، یہ مشترکہ تعلیمات ہر نبی کا بنیادی پیغام اور دعوت رہی ہے، قرآن میں ان تذکروں کے بعد بائبل (قدیم عہد نامہ اور جدید عہد نامہ میں) ان کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

عیسائیت کے کتب (بائبل) چار ہیں :

(۱) Orthodox Version (O.V) 86 کتابیں۔
(۲) Chaelsmatic Version (C.V) 76 کتابیں۔
(۳) Roman Catholic Verion (R.V) 79 کتابیں۔
(۴) Protestant Version (P.V) 66 کتابیں۔

پروٹسٹنٹ ورژن جسے King James Version (KJV) کہا جاتا ہے عوام میں ملتا ہے؛ چوں کہ پروٹسٹنٹ اس ورژن کو تبلیغ عیسائیت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور مرتد بھی بناتے ہیں، اس لئے اس کا جاننا ضروری ہے 95 فیصد اسی کا استعمال ہوتا ہے، اس ورژن میں جملہ 66 کتابیں ہیں اور دو حصوں میں تقسیم ہیں :

پہلا حصہ قدیم عہد نامہ Old Testament جس میں 39 کتابیں ہیں۔

دوسرا حصہ جدید عہد نامہ New Testament جس میں 27 کتابیں ہیں۔

قدیم عہد نامہ: ابتدائی (5) کتابیں موسیٰ علیہ السلام کی لکھی ہوئی ہیں، یہ عیسائیوں کا ایمان ہے، باقی کی (34) کتابوں میں نبیوں کا زمانہ بتایا گیا ہے مگر ان میں سے اکثر نبیوں کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے۔

جدید عہد نامہ: جملہ (27) کتابیں ہیں جن میں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، ان کی تعلیمات اور ان کے قریب کے حواریوں کے پیامات ہیں۔

مشترکہ تعلیمات

۱- **خدا کی قسم کھانا :** (خدا نے کہا:) میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی، کلام صدق میرے منھ سے نکلا ہے اور ٹلے گا نہیں کہ ہر ایک گھٹنا میرے حضور جھکے گا اور ہر ایک زبان میری قسم کھائے گی۔(یسعیاہ:45:23)

(موسیٰ علیہ السلام نے کہا:) تو اپنے خداوند اپنے خدا کا خوف ماننا اور اسی کی عبادت کرنا اور اسی کے نام کی قسم کھانا۔(استثناء:6:13)

غیر اللہ کے قسم سے جب معاشرہ میں کبائر پیدا ہوئے تو عیسیٰ علیہ السلام نے قسم کھانے سے منع فرمایا۔

(عیسیٰ نے کہا:) پھر تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ جھوٹی قسم نہ کھانا؛ بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے لئے پوری کرنا۔(متیٰ:5:33)

لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ بالکل قسم نہ کھانا، نہ تو آسمان کی کیوں کہ وہ خدا کا تخت ہے۔(متیٰ:5:34)

نہ زمین کی کیوں کہ وہ اس کے پاؤں کی چوکی ہے، نہ یروشلم کی، کیوں کہ وہ بزرگ بادشاہ کا شہر ہے۔(متیٰ:5:35)

نہ اپنے سر کی قسم کھانا؛ کیوں کہ تو ایک بال کو بھی سفید و کالا نہیں کر سکتا۔(متی 5:36)

بلکہ تمہارا کلام ہاں ہاں یا نہیں نہیں ہو؛ کیوں کہ جو اس سے زیادہ ہو بدی ہے۔(متی 5:37)

عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد یعقوب: "مگر اے میرے بھائیو، سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ قسم نہ کھاؤ، نہ آسمان کی نہ زمین کی اور نہ کسی چیز کی؛ بلکہ ہاں کی جگہ ہاں اور نہیں کی جگہ نہیں؛ تاکہ سزاء کے لائق نہ ٹھہرو۔(5:12:James)

قرآن میں قسم

پھر اگر شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں: ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو ہم اس کی رعایت کرنے والے ہیں اور نہ خدا کے واسطے گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گنہگاروں میں شمار ہوں گے۔(ق:۱۰۶/۵، تفہیم القرآن)

قرآن میں بھی قسم اللہ ہی کی کھانے کا حکم دیا گیا ہے، مہمل قسموں سے پرہیز کا حکم ہے، وراثت یا کوئی نزع یا جھگڑے کی بابت معلومات میں اختلاف ہو اور ہر فریق اپنی رائے اڑا رہا ہے تو پھر ایسے وقت اللہ کی قسم نزع مٹانے کے لئے ہونی چاہئے، ذاتی فائدے کے لئے نہیں؛ لیکن بنی اسرائیل کی تاریخ قسموں سے بھری پڑی ہے انھوں اپنے فائدوں کے لئے اللہ کو چھوڑ کر کبھی خود اور کبھی دوسری اشیاء — آسمان اور زمین — کی قسم کھائی، عیسیٰ نے انھیں حکم دیا کہ قسم نہ کھاؤ، کیوں کہ تم اس سے بگاڑ پیدا کر رہے ہو، اس لئے سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہو۔

۲- عقیدہ تثلیث کے خلاف شہادتیں

اللہ کی شہادت کہ اکیلا وہ خدا ہے:

خداوند تیرا فدیہ دینے والا جس نے رحم ہی سے تجھے بنایا یوں فرماتا ہے کہ میں خداوند سب کا خالق ہوں، میں اکیلا ہی زمین کو تاننے اور زمین بچھانے والا ہوں، کون میرا شریک ہے۔(یسعیاہ:۲۴:۴۴)

خداوند فرماتا ہے: تم میرے گواہ ہو اور میرے خادم بھی جسے میں نے برگزیدہ کیا؛ تاکہ تم جانو اور مجھ پر ایمان لاؤ اور سمجھو کہ میں وہی ہوں، مجھ سے پہلے کوئی خدا نہ ہوا اور نہ میرے بعد بھی کوئی نہ ہوگا۔(یسعیاہ:۱۰:۴۳)

۳- نبیوں کی شہادت

داؤد علیہ السلام کی شہادت :

تیری صداقت خدا کے پہاڑوں کے مانند ہے اور تیرے احکامات نہایت عمیق ہیں،
اے خدا تو انسان اور حیوان دونوں کو محفوظ رکھتا ہے۔(زبور:۶:۳۶، داؤد)

زکریا علیہ السلام کی شہادت :

اور خداوند ساری دنیا کا بادشاہ ہوگا اس روز ایک ہی خداوند ہوگا اور اس کا نام واحد
ہوگا۔(زکریا:۹:۱۴)

عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت :

تم اپنے باپ سے کام کرتے ہو،انھوں نے اس سے کہا: ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے،
ہمارا ایک باپ ہے خدا۔(یوحنا:۴۱:۸، عیسیٰ)

عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت :

اور اگر میں فیصلہ کروں بھی تو میرا فیصلہ سچا ہے؛ کیوں کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور باپ
سے جس نے مجھے بھیجا ہے۔(یوحنا:۱۶:۸)

عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت :

یسوع نے اس سے کہا: تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے،کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔
(مرقس:۱۸:۱۰)

عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت :

زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو،تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے۔(متیٰ:۹:۲۳)

۴- پال کی شہادت (آج کی عیسائیت کا بزرگ و بانی)

کیا خدا صرف یہودیوں ہی کا ہے؟ غیر قوموں کا نہیں؟ بے شک غیر قوموں کا بھی ہے۔
(رومیوں کے نام خطوط:۲۹:۳)

کیوں کہ خدا ایک ہے اور خدا اور انسانوں کے بیچ میں درمیان بھی ایک یعنی مسیح یسوع جو انسان ہے۔
(تمتھیس کے نام پہلا خط:۵:۲)

اور سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔

(افسیوں کے نام خط :۶:۴)

لیکن ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے، یعنی باپ جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں اور ہم اسی کے لئے ہیں اور ایک ہی خداوند ہے یسوع مسیح، جس کے وسیلے سے سب چیزیں موجود ہیں اور ہم بھی اسی کے وسیلے سے ہیں۔

۵- خدا زمین و آسمان کا خالق ہے

(قرآن کی دلیل) اللہ تمہارا رب، کوئی خدا اس کے سوانہیں ہے، ہر چیز کا خالق؛ لہٰذا تم اس کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔ (ق:۱۰۲/۶، انعام، تفہیم القرآن)

(داؤد علیہ السلام) میری کمک، خداوند سے ہے، جس نے آسمان اور زمین کو بنایا۔

(زبور:۲:۱۲۱، داؤد)

(عیسیٰ علیہ السلام) عیسیٰ نے شکر ادا کیا اس خدا کا جو زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ (لوقا:۲۱:۱۰)

(پال کا خط) میں اس خدا کو جو سب چیزوں کو زندہ کرتا ہے اور مسیح یسوع کو جس نے پنطیس میلاطس کے سامنے اچھا اقرار کیا تھا، گواہ کر کے تجھے تاکید کرتا ہوں۔

(تمتھیس کا پہلا خط:۱۳:۶)

(پال کا خط) اس لئے کہ انھوں نے خدا کی سچائی کو بدل کر جھوٹ بناڈالا اور مخلوقات کی زیادہ پرستش کی اور عبادت کی بہ نسبت اس خالق کی جو ابد تک محمود ہے۔

(رومیوں کے نام خط:۲۵:۱)

(رسول کے اعمال) جس خدا دنیا اور اس کی سب چیزوں کو پیدا کیا وہ آسمان اور زمین کا مالک ہو کر ہاتھ کے بنائے ہوئے مندروں میں نہیں رہتا۔ (رسولوں کے اعمال:۲۴:۱۷)

۶- صفت نور

(قرآن) اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (ق:۳۵:۲۴، النور، تفہیم القرآن)

(JOHN-1) اس سے سن کر جو پیغام ہم تمہیں دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا نور ہے اور اس میں ذرا بھی تاریکی نہیں۔ (یوحنا کا پہلا خط:۵:۹۱)

(JOHN) یسوع نے پھر ان سے مخاطب ہو کر کہا: دنیا کا نور میں ہوں، جو میری

پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلے گا؛ بلکہ زندگی کا نور پائے گا (عیسیٰ کا نور خدا کے نور سے الگ ہے)۔ (یوحنا:۸:۱۲)

7- فیصلہ کرنے والا

(قرآن) ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے گا اور وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔ (ق:۲۶/۳۴،السبا،تفہیم القرآن)

(عہدنامہ قدیم) خدا انسانوں کا فیصلہ کرتا ہے اور میرا بھی (داؤد علیہ السلام)۔ (زبور:۸:۷)

(عہدنامہ جدید) جو مجھے نہیں مانتا اور میری باتوں کو قبول نہیں کرتا، اس کا ایک مجرم ٹھہرانے والا ہے، یعنی جو کلام میں نے کیا ہے آخری دن وہی اسے مجرم ٹھہرائے گا۔
(یوحنا:۴۸:۱۲)

(عہدنامہ جدید) اور جب کہ تم باپ کہہ کر اس سے دُعاء کرتے ہو، جو ہر ایک کے کام کے موافق بغیر طرفداری کے انصاف کرتا ہے تو اپنی مسافرت کا زمانہ خوف کے ساتھ گذارو۔ (پطرس کا پہلا خط:۱:۱۷)

(عہدنامہ قدیم) اور تو کھائے گا اور سیر ہوگا اور اس اچھے ملک کے لئے جسے خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے، اس کا شکر بجالائے گا۔ (استثناء:۸:۱۰،موسیٰ علیہ السلام)

(عہدنامہ جدید) اس گھڑی وہ روح القدس سے خوشی میں بھر گیا اور کہنے گا اے باپ! آسمان اور زمین کے خداوند! میں تیری حمد کرتا ہوں کہ تو نے یہ باتیں داناؤں اور عقلمندوں سے چھپائیں اور بچوں پر ظاہر کیں، ہاں اے باپ، کیوں کہ ایسا ہی تجھے پسند ہے۔ (لوقا:۲۱:۱۰)

(عہدنامہ جدید) پس انھوں نے اس پتھر کو ہٹا دیا، پھر یسوع نے آنکھیں اُٹھا کر کہا: اے باپ! میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تو نے میری سن لی۔ (یوحنا:۴۱:۱۱)

(عہدنامہ جدید) ہمارے خداوند یسوع مسیح کے خدا اور باپ کی حمد ہو۔
(پطرس کا پہلا خط:۳:۱)

(عہدنامہ جدید) ہمارے خداوند یسوع مسیح کے خدا اور باپ کی حمد ہو جو رحمتوں کا باپ اور ہر تسلی کا خدا ہے۔ (کرنتھیوں کے نام دوسرا خط:۳:۱)

۸- اللہ دکھائی نہیں دیتا (غیب ہے)

(قرآن) اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجاء کی ''اے رب مجھے یارائے نظر دے کہ میں کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا''۔(ق:۱۴۳:۷، الاعراف، تفہیم القرآن)

(قرآن) نگاہیں اس کو پا نہیں سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے۔(ق:۱۰۳:۶، انعام)

(عہد نامہ قدیم) اور یہ بھی کہا تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا؛ کیوں کہ انسان مجھے دیکھ کر زندہ نہیں رہے گا، (عیسیٰ کو دیکھ کر تمام انسان زندہ ہیں تو وہ کیسے خدا ہو سکتے ہیں)۔

(خروج:۲۰:۳۳)

(عہد نامہ جدید) اور باپ جس نے مجھے بھیجا ہے، اس نے میری گواہی دی ہے، تم نے نہ کبھی اس کی آواز سنی ہے اور نہ اس کی صورت دیکھی۔(یوحنا:۳۷:۵)

(عہد نامہ جدید) خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا اگر ہم ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں تو خدا ہم میں رہتا ہے۔(یوحنا کا پہلا خط:۱۲:۴)

(عہد نامہ جدید) بقاء صرف اسی کو ہے اور وہ اس نور میں رہتا ہے، جس تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی، نہ اسے کسی انسان نے دیکھا اور نہ دیکھ سکتا ہے۔(تیمھس:۱۴:۶)

۹- عقیدہ مصلوبیت

(قرآن) اور خود کہا کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا؛ حالاں کہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا؛ بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے، انھوں نے مسیح کو یقیناً قتل نہیں کیا؛ بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اُٹھالیا۔(ق:۴/۱۵۵-۱۵۸، تفہیم القرآن)

(عہد نامہ جدید) اس نے دکھ سہنے کے بعد بہت سے ثبوتوں سے اپنے آپ کو ان پر زندہ ظاہر کیا؛ چنانچہ وہ چالیس دن تک انھیں نظر آتا اور خدا کی بادشاہی کی باتیں کرتا رہا۔

(اعمال:۳:۱)

(عہد نامہ جدید) اور جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے سانپ کو بیان میں اونچے

چڑھایا، اسی طرح ضروری ہے کہ ابن آدم بھی اوپر چڑھایا جائے۔ (یوحنا:۱۴:۳)

(عہد نامہ جدید) اس نے ان سے کہا: تم نیچے کے ہو، میں اوپر کا ہوں، تم دنیا کے ہو میں دنیا کا نہیں ہوں۔ (یوحنا:۲۳:۸)

(عہد نامہ جدید) اور میں اگر زمین سے اونچے پر چڑھایا جاؤں گا تو سب کو اپنے پاس کھینچوں گا۔ (یوحنا:۳۳:۱۲)

(عہد نامہ جدید) یہ کہہ کر وہ ان کے دیکھتے دیکھتے اوپر اُٹھالیا گیا اور بدلی نے اسے ان کی نظروں سے چھپالیا۔ (اعمال:۹:۱)

(عہد نامہ جدید) جب وہ انھیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اُٹھالیا گیا۔ (لوقا:۵۱/۲۴)

عیسیٰ ہی نہیں قدیم عہد نامہ میں ایک اور نبی ایلیاہ کا تذکرہ ہے، جنھیں آسمان پر اُٹھالیا گیا۔

اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھا ایک آتشتی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا۔ (سلاطین:۲-۱۱:۲)

اور پھر انھیں واپس بھیجے جانے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

نتیجہ

اس مقالہ میں دو اہم بنیادی باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے :

(۱) قرآن ہی کسوٹی ہے، فرقان ہے اور اسی کی رہنمائی میں دوسرے ادیان تک دعوت دین اسلام پہنچا تا ہے، سب اہل کتاب یکساں نہیں ہوتے، اس لئے ان کی زبان، تہذیب اور علم کے اعتبار سے بات کرنا چاہئے اور مشترک اقدار میں اللہ کی وحدانیت کتابیں اور متفقہ رسول کو تلاش کریں، اگر ممکن ہو۔

(۲) قرآن کی دلیل کے مطابق ''توحید'' ہر مذہب کی بنیاد ہوتی ہے اور اسی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور چوں کہ یہ بگاڑ انسانوں کا پیدا کردہ ہے اس لئے وہ معقول دلیل میں اُلجھ جاتے ہیں اور اپنی مرضی اور اپنے علم کے مطابق تاویل کرتے ہیں اور ان کتابوں میں جگہ دیتے ہیں، جسے تحریف یا تبدیلی کا نام دیا جاتا ہے؛ لیکن تحریف یا تبدیلی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حق ختم ہو گیا؛ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اسے چھپانے کی کوشش کی گئی اور اب یہ فرقان جو مسلمانوں کے پاس ہے وہ اس حق کو واضح کردے گی۔

اس لئے عیسائی عقائد حلول و تجسم، مصلوبیت، حیات ثانیہ، کفارہ جو بہر حال عقیدہ تثلیث کا محرک بنا ہے ان

ہی کی موجودہ کتابوں میں اُلجھن کا باعث ہے، اس لئے عیسائیوں کو ان ہی کی کتابوں کی اس اُلجھن کو بتاتے ہوئے سچ اصل میں کیا ہے یہ سوال اُٹھاتا ہے تاکہ وہ پہلے فیصلہ کرلیں کہ جو موجود ہے وہ پیش کی جاسکتی ہے، اس طرح اہل کتاب کی ہر عقیدۂ رسم ورواج کا جواب دیا جاسکتا ہے، خود ان ہی کی کتابوں کی اُلجھنوں کو سامنے لاکر اور قرآن کے صحیح علم کو بتاکر۔

حوالہ جات

(۱) تفسیر ابن کثیر: خطیب الہند مولانا محمد جونا گڑھی۔
(۲) تفہیم القرآن: ابوالاعلیٰ مودودی۔
(۳) بائبل سے قرآن تک: جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی۔
(۴) بائبل KJV (اُردو اور انگریزی)۔

قرآن مجید اور گوروگرنتھ صاحب — مشترک تعلیمات

مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی⊙

سکھ مذہب کے گورو صاحبان

سکھ مذہب کے بانی گورو نانک دیو جی ہیں ، ان کی پیدائش 1469ء میں ہوئی اور وفات 1538ء یا 1539ء میں ہوئی۔

سکھ مذہب کے گورو نانک دیو جی سمیت کل دس گورو ہوئے ،جن کے نام تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ذیل ہیں :

2- گورو انگد جی (اصل نام لہنا)، پیدائش 1504ء وفات 1552ء۔

3- گورو امر داس جی (پہلا نام امرُو جی)، پیدائش 1479ء وفات 1574ء۔

4- گورو رام داس جی (پہلا نام بھائی جیٹھا جی)، پیدائش 1534ء وفات 1581ء۔

5- گورو ارجن دیو جی (پہلا نام ارجن جی)، پیدائش 1563ء وفات 1606ء۔

6- گورو ہرگوبند جی، پیدائش 1595ء وفات 1644ء۔

7- گورو ہری رائے جی، پیدائش 1630ء وفات 1661ء۔

8- گورو ہری کرشن جی، پیدائش 1656ء وفات 1664ء۔

9- گورو تیغ بہادر جی، پیدائش 1621ء وفات 1675ء۔

10- گورو گوبند سنگھ جی، پیدائش 1666ء وفات 1708ء۔

دسویں اور آخری گورو گوبند سنگھ جی ہیں، ان کے بعد گوروؤں کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا، اب سکھوں کو کسی انسانی گورو کی ضرورت نہیں، گرنتھ صاحب ہی ان کا گورو ہے۔

⊙ دار السلام اسلامی مرکز، مالیر کوٹلہ، پنجاب۔

گورو گرنتھ صاحب کی تدوین

سکھ مذہب کی بنیادی کتاب گرنتھ صاحب ہے ،اس کو سکھوں کے پانچویں گورو، گوروارجن دیو جی نے 1603ء میں مرتب کیا،اس میں گورونانک دیو جی سے پہلے کے بہت سے سنتوں جیسے رامانند،کبیراور بابا فرید وغیرہ کا کلام بھی درج ہے۔

شیخ فریدالدین مسعودؒ گنج شکر (1173ء569ھ — 1227ء664ھ) کے دوسوسال بعد سکھ مذہب کے بانی گورونانک دیو جی 1469ء میں پیدا ہوئے ، پاک پٹن میں بابا فرید کے مزار پر شیخ ابراہیم رہتے تھے،جن کو فرید ثانی بھی کہا جاتا تھا، گورونانک دیو جی نے ان سے بابا فرید کا کلام سنا تو بے حد متاثر ہوئے ،اسی لئے ان کے 130 اشعار گوروگرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔

گوروارجن دیو جی نے امرتسر کے سرودر (پانی کے تالاب) کو اینٹیں لگوا کر پکا کروایا اور 1589ء میں سری ہرمندر صاحب کی بنیاد رکھی ، کہا جاتا ہے کہ گورو جی نے ہرمندر صاحب کی بنیاد مسلمان فقیر سائیں میاں میر سے رکھوائی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے روزنامچہ نویس لالہ سوہن لال تھے،انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''عُمدة التــواریخ ''لالہ سوہن لال جو لالہ گن پت رائے کے بیٹے اور لالہ حکومت رائے کے پوتے تھے،انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ فرماں روائے پنجاب کا پورا دورِ حکومت دیکھا تھا......لالہ سوہن لال لکھتے ہیں کہ :

گوروارجن دیو جی اکثر رتھ میں سوار ہوکر شاہ میر صاحب عرف میاں میر صاحب کی خدمت میں جایا کرتے تھے،ان کے الفاظ ہیں کہ :

ذاتِ عالی ازمحلِ استقامتِ خود بر رتھ سواری فرمودہ بنا بر زیارت واقفِ رُموزِ تقدیر شاہ میر تشریفِ شریف اَرزانی می فرمودند۔

لاہور میں ایک شخص '' کانہہ '' نام کا رہتا تھا ،یہ مذہبی قیود سے آزاد ، درویشانہ حالت میں رہتا تھا اور وحدانیت باری تعالیٰ کے مضمون پر اشعار لکھا کرتا تھا،اس نے جب یہ سنا کہ گوروارجن دیو جی گرنتھ صاحب کی تالیف میں مصروف ہیں تو وہ گورو صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میرے طبع زاد اشعار بھی آپ اپنی کتاب میں شامل فرمالیں ، گورو جی نے کہا کیا حرج ہے آپ اپنے دو تین اشعار سنائیں ، اگر وہ اس قابل ہوئے تو میں آپ کی فرمائش پوری کردوں گا ، کانہہ نے اپنے اشعار سنائے ، گورو صاحب نے سن کر کہا کہ تمہارے اشعار میں اَنانیت کی بُو آتی ہے،اس لئے تمہارے اشعار گرنتھ صاحب میں شامل نہیں ہوسکتے۔(۱)

(۱) عالم گیر ہندوؤں کی نظر میں......مصنف محمد ایوب خاں:57-58۔

واضح رہے کہ گورو ارجن دیو جی نے تبرک اور شاعری کے نقطۂ نگاہ سے گرنتھ صاحب میں سب سے پہلے گورو نانک دیو جی کی دُعاؤں کے مجموعے ''جپ جی'' کو جگہ دی ہے، گویا جپ جی تمام گورو صاحبان کے کلام کی کلید اور سنگِ بنیاد ہے۔

جپ جی میں کل 38 پوڑیاں یعنی بند ہیں، 38 بندوں کے علاوہ دو اَشلوک ہیں، ایک شروع میں اور ایک اخیر میں۔

جپ جی میں فارسی، عربی زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں اور بعض جگہ کھڑی بولی یعنی ہندی اور اُردو کی ابتدائی صورت بھی مل جاتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابا نانک جی کے دور میں کھڑی بولی ارتقائی منزل طے کر رہی تھی۔

گرنتھ صاحب کا رسم الخط گورمکھی ہے، گورمکھی سکھ گوروؤں کا اختیار کردہ رسم الخط ہے، گوروؤں کے کلام کے لئے سب سے پہلے اسے دوسرے گورو اَنگد جی نے اختیار کیا اور اسے اُن کے کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے، گرنتھ صاحب کے الفاظ سنسکرت کی طرح ملا کر لکھے جاتے ہیں، ہندی اور پنجابی وغیرہ زبانوں کی طرح الگ الگ نہیں۔

گرنتھ صاحب میں گورو نانک دیو جی کے علاوہ پانچ اور گوروؤں کا کلام درج ہے، علاوہ ازیں دسویں گورو، گورو گوبند سنگھ جی کا ایک الگ گرنتھ ''دسم گرنتھ'' کے نام سے ہے، اِس گرنتھ کے کئی نام ہیں، یہ خاصا ضخیم ہے اور مطبوعہ شکل میں بھی ملتا ہے، مختلف مذہبی اور سماجی تقریبات کے موقع پر دونوں گرنتھوں کو ساتھ رکھا جاتا ہے۔

گورو گرنتھ صاحب کی ترتیب مضامین گوروؤں کے لحاظ سے نہیں، راگوں کے حساب سے ہے، ہر راگ کے گیت الگ جمع کر دیئے گئے ہیں۔

موجودہ گرنتھ میں 33 ابواب اور 5894 اشعار ہیں، اپنی وفات کے وقت گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے متبعین کو یہ نصیحت کی تھی کہ ان کے بعد گوروؤں کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے اور اب ''آدی گرنتھ صاحب'' کو اپنا گورو سمجھیں، اس وقت سے آدی گرنتھ یعنی گورو گرنتھ صاحب سکھوں کے لئے نہ صرف مقدس قرار دیا گیا ہے؛ بلکہ اس کا احترام ہر سکھ پر لازم ہے۔

گورو گرنتھ صاحب میں کل 31 راگ ہیں، جن میں سے 19 راگوں میں بابا نانک جی نے اپنا کلام موزوں کیا ہے۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ فرماتے ہیں :

اکثر گورو بذاتِ خود عظیم موسیقار اور کلاسیکل موسیقی کے ماہر تھے، ہمیں معلوم ہے کہ

گورونانک دیو جی ہمیشہ اپنے ساتھ ایک مسلمان بھائی مردانہ کو رکھتے تھے، جو رباب بجاتا تھا اور گورونانک جی بڑے مجمعوں کے سامنے گاتے تھے بھائی مردانہ کی نسل کے لوگ جو مذہباً مسلمان ہیں، ان موسیقاروں میں سے ہیں جن کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے اور جو آج کے دن تک سکھوں کے مشہورترین گوردواروں میں گورو کا کلام گاتے ہیں، گورو ارجن دیو جی خود ایک عظیم موسیقار اور ایک اچھے سازندہ تھے اور چوں کہ پورا گرنتھ بلندترین شاعری میں ترتیب دیا گیا ہے اس لئے موسیقی اور شاعری سکھوں کی مذہبی عبادت ورسوم اور سکھوں کے طرز تہذیب کا جزوِلا ینفک بن گئی ہیں اور اس جمالیاتی مذہب سے تعلق رکھنے والے ہر مرد وعورت کے خون میں دوڑ رہی ہے۔(۱)

1604ء میں گورو گرنتھ صاحب کو سنہری مندر امرتسر میں رکھ دیا گیا تھا، اس گرنتھ کو رات سے پہلے سنہری مندر سے لے جاکر اکال تخت کے ایک کمرے میں جسے کوٹھا صاحب کہا جاتا ہے رکھ دیا جاتا ہے، اکال تخت سنہری مندر کے مقابل ایک عمارت کا نام ہے، اکال تخت میں دنیاوی معاملات اور مقدمات کے فیصلے کئے جاتے ہیں اور سنہری مندر میں روحانی فیصلے کئے جاتے ہیں۔

ابتداء سے یہیں پر ''سربت خالصہ'' منعقد کی جاتی ہے، اس وقت بھی سکھوں کے نام تمام حکم نامے یہیں سے جاری کئے جاتے ہیں، ہر ایک سکھ کو پانچ چیزیں رکھنے یا پہننے کا گورو گوبند سنگھ جی نے حکم دیا ہے، جن کے نام ''ک'' سے شروع ہوتے ہیں اور انھیں ''پانچ ککار'' کہا جاتا ہے:

1- کیش یعنی بال...... بدن کے کسی حصے کے بال کاٹنا جائز نہیں ہے اور یہ حکم پیدائش سے لے کر موت تک کے لئے ہے۔

2- کنگھا...... مرد کے لئے اپنے سر میں ایک چھوٹی سی کنگھی رکھنی بھی ضروری ہے؛ تاکہ وہ اپنے بال درست کرسکیں۔

3- کڑا...... ہر مرد پر لوہے کا کنگن یا کڑا پہننا لازم ہے۔

4- کچھا...... مرد پر لنگوٹ یا کچھا باندھنا بھی لازم ہے، یہ اس کی پاک دامنی اور عفت کی علامت ہوگی۔

5- کرپان...... ہر سکھ کے لئے ایک چھوٹا سا خنجر اپنے پاس رکھنا ضروری ہے؛ تاکہ وقت پر اپنی طاقت کا اظہار کرسکے یا پیش آنے والے خطرات سے اپنا دفاع کرسکے۔

---

(۱) سکھ مت اور توحید...... سید حامد علی: 39، بحوالہ: گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ، دیباچہ عنوان، گرنتھ صاحب کی تدوین: 17۔

سکھ حضرات گورو گوبند سنگھ جی کی اس پیشین گوئی پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ ایک وقت آئے گا جب کہ پورے عالم میں سکھ مذہب پھیل جائے گا اور پوری دنیا پر سکھوں کی حکومت قائم ہوجائے گی۔

سکھ مت کے مشہور مؤرخ ایم اے میکلف لکھتے ہیں کہ :

> جب سکھ دوبارہ اپنے گورو (گورو گوبند سنگھ جی) کے پاس آخری ہدایت لینے پہنچے تو انھوں نے پوچھا کہ ان کا جانشین کون ہوگا؟ گورو جی نے جواب دیا کہ میں نے تمہیں لازوال خدا کے سپرد کیا ہے، جہاں کہیں بھی پانچ سکھ اکٹھے ہوں گے، جنھوں نے گورو کی تعلیمات کے لئے خود کو حوالے کردیا ہو، میں ان کے درمیان ہوں گا، اب کے بعد گورو خالصہ ہوگا اور خالصہ گورو ...... میں نے اپنے دماغ اور جسمانی روح کو گرنتھ صاحب اور خالصہ میں انڈیل دیا ہے۔(۱)

گورو گوبند سنگھ نے پانچ پیاروں کو اپنے ہاتھ سے اَمرت چھکایا تھا اور ان سے خود بھی چھکا تھا اور انھیں پنتھ کے معاملات میں فیصلہ کرنے کا حق دیا ہے۔

گورو گرنتھ صاحب کو سکھوں کے دائمی گورو کی حیثیت حاصل ہے، گوردواروں میں جو کہ سکھوں کی عبادت گاہ ہوتی ہے، گرنتھ صاحب اونچے مقام پر ریشمی غلاف میں رکھا جاتا ہے اور لوگ دور ہی سے اسے سجدہ کرتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں، کچھ لوگ قریب آکر سجدہ کرتے ہیں، گرنتھ صاحب سے دُعائیں مانگی جاتی ہیں اور مختلف تقریبات کے موقع پر اس کا طواف بھی کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ لکھتے ہیں کہ :

> گرنتھ صاحب میں سکھ گوروؤں کی مرقومات کے علاوہ دورِ وسطیٰ کے تقریباً تمام ہندو بھگتوں کی مرقومات بھی ہیں، مثلاً کبیر، رامانند، روی داس، سور داس سائیں اور بھیکھان یوپی سے، جے دو بنگال سے، نام دیو، ترلوچن اور پرمانند مہاراشٹر سے، پیپا اور دھنّا راجستھان سے اور بینی، یہ سب لوگ اس وقت شمالی ہند میں معروف تھے، پانچ مسلمانوں: بابا فرید، بھیکھان، ستّا، بلونڈ اور مردانہ کی مرقومات بھی شامل ہیں۔(۲)

---

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی:105، بحوالہ سکھ ریلیجن:244/5۔

(۲) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی:106، بحوالہ: گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ جلد اول، دیباچہ:17۔

سکھ مذہب کی تعلیمات

توحید: گورونانک جی کی تعلیم میں توحید کا بنیادی تصور ملتا ہے، وہ اللہ کی تعریف اِن الفاظ میں کرتے ہیں :

ایک اونکار ست نام، کرتا پُرکھ نربھو نرویر، اکال مورت اجونی سے بھنگ گُر پرساد۔

جپ جی میں ہے کہ :

آد سچ، جگاد سچ، ہے بھی سچ نانک ہوسی بھی سچ۔

ترجمہ: اونکار جو واحد ہے وہی کثرت میں نمایاں ہے، اس کا نام سچ ہے، وہ خالقِ دو جہاں ہے، بے خوف اور بے لاگ (عداوت) ہے، موت و پیدائش سے بالاتر ہے، قائم بالذات ہے، وہ مُرشدِ کامل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اُسی واحد ہستی کی پرستش کرنی چاہئے جو روزِ ازل سے پیشتر بھی سچا تھا اور ظہورِ عالم کے وقت بھی سچا تھا، دورِ حاضر میں بھی سچا ہے، گورونانک دیو جی کہتے ہیں ابد اور ابد کے بعد بھی وہ سچا ہوگا۔

سردار کالا سنگھ بیدی ایم اے، پی ایچ ڈی، اپنی کتاب ''بابا نانک حیات و جپ جی'' صفحہ: 103 میں لکھتے ہیں کہ :

گوروصاحب کا عقیدہ ہے ذاتِ الٰہی واحد ہے، لاشریک ہے، وہ ہمیشہ دائم و قائم ہے، ذرہ ذرہ میں اس کا ظہور ہے، کل عالم کا منبع و مبدأ ہے، کل عالم سے جدا بھی اور سب میں شامل بھی ہے، پیدائش اور موت سے بالاتر ہے، سب دنیا اس کے سہارے زندہ ہے، مگر اسے کسی کا سہارا نہیں، وہ اپنی ذات پر ہی قائم ہے؛ مگر اس کا احساس صرف ہادیٔ کامل ہی کرسکتا ہے۔

ڈاکٹر کالا سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ :

گورونانک دیو جی کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ مخلوقات (جمادات، نباتات اور حیوانات) سے بالاتر ہے، تمام دیوتا، اولیاء، رُسل، غوث، پیر اور فقیر وغیرہ اس کی مخلوق ہیں، وہ ذاتِ کریم سب کو دیکھتی ہے؛ مگر اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا، وہ کریم، رحیم، ظاہر، حاضر اور ناظر ہے دیوتا اور فرشتے اس کی جدا جدا طاقتوں کے نام ہیں، مالک سب کا وہی ہے، خالق و قادر صرف اسی کی واحد ذات ہے :

برہما بسن مہیش اِک مورت آپے کرتا کاری۔ (رام کلی محلّہ پہلا :106)

گورونانک دیو جی کا کہنا ہے کہ: ''دنیا کا انحصار اسی ذات کریم پر ہے، وہ ذرے ذرے میں موجود ہے :

سبھ میں جیو جیو ہے سوئی گھٹ گھٹ رہیا سمائی۔ (ملار اشٹ پدیاں محلّہ پہلا)

گورونانک دیو جی فرماتے ہیں کہ یہ مسلم ہے کہ وہ ہر شئے میں موجود ہے، ذرے ذرے میں اس کا جلوہ ہے، مگر پھر بھی وہ علاحدہ اور جُدا ہے۔

سبھ کے مدھِ سب ہوتے باہر راگ دوکھ تے نیارو۔ (سوہی چھنت محلّہ پہلا)

گورو جی کا مقولہ ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی اپنی واحد ہستی سے نظامِ عالم کو چلا رہی ہے، اسی کے حکم کے تحت سب کچھ ہورہا ہے، مگر الٰہی حکم کا قلم اعمال وافعال کے مطابق چلتا ہے :

حکمے اندر سب کو باہر حکم نہ کو۔ (جپ جی صاحب)

ازل اور ابد، پیدائش و مرگ حکم الٰہی کے تابع جاری وساری ہیں :

ایسا سا چو توا یکو جان جمن مرنا حکم پچھان(۱)

خدا کی ہستی اپنی ذات پر قائم ہے، اس کو پیدا کرنے والی کوئی دیگر ہستی نہیں، وہ شکل وصورت سے بالاتر ہے؛ کیوں کہ اگر وہ کسی شکل میں ظاہر ہو تو محدود ہو جاتا ہے؛ حالاں کہ وہ لامحدود ہے، وہ عقل سے بالاتر ہے، اس لئے اس کی قیاسی تصویر بنا کر پرستش کرنا جہالت پر مبنی ہے اور یہ انسانی غلطی وحماقت ہے کہ اس لامحدود کو ایک تصور کے ذریعہ دکھایا جائے :

تھاپیا نہ جائے کیتا نہ ہوئے، آپے آپ نرنجن سوئے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے نظامِ عالم کو قائم کئے ہوئے ہے، شب وروز، زمین وآسمان، ماہتاب وآفتاب کل عالم کا سلسلہ اس کے حکم کے اندر چل رہا ہے، مگر خدا کو اتنے بڑے سلسلہ کو چلانے میں کوئی تھکاوٹ یا ماندگی پیدا نہیں ہوتی، وہ ہر حالت میں خوش ہے :

حُکمی حکم چلائے رہ، نانک وِگسے وے پرواہ۔ (جپ جی صاحب:107-108)

گورو ارجن دیو جی فرماتے ہیں :

''آپن آپ آپے اُپایو''یعنی خدا کی ہستی خود بخود قائم ہے، اس کو پیدا کرنے والا کوئی دوسرا نہیں۔

گرنتھ صاحب کے حوالے سے سردار جودھ سنگھ لکھتے ہیں کہ :

---

(۱) آسا محلّہ پہلا اشٹ پدیاں۔

خدا جیسا کہ گورو نانک دیو جی اور ان کے جانشینوں نے سمجھا، اس کائنات کی تمام محسوس اور غیر محسوس اشیاء کا کلی خالق ہے، وہ سنسار کو وجود میں لانے کے لئے کسی بھی دوسرے ذریعہ کا محتاج نہیں ہے ''تو بذاتِ خود میز ہے، تو ہی قلم ہے اور تو ہی اس کے اوپر کی تحریر، نانک! تنہا ایک ہی بات کرو، دوسرے کی نشاندہی کیوں؟ تو ہی بذاتِ خود ہر جگہ جاری و ساری ہے، تو نے ہی بذاتِ خود کائنات کو بنایا، تیرے سوا کوئی اور موجود نہیں، تو ہر چیز پر محیط ہے، تو ہی بذاتِ خود اپنا پیمانہ اور اپنا مقصد جانتا ہے اور تو ہی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے، تو ناقابلِ فہم، ناقابلِ ادراک اور حواس کے ذریعہ ناقابلِ احساس ہستی ہے؛ لیکن گورو کے کلام کے ذریعہ تجھے پا سکتے ہیں۔(۱)

گورو گوبند سنگھ جی ''جپ جی'' میں فرماتے ہیں :

خدا ایک ہی ہے، ستیہ ہے، عظیم ہے، داتا ہے، اس کا کوئی چکر نہیں، کوئی نشان نہیں، کوئی رنگ نہیں، کوئی ذات اور سلسلۂ نسب نہیں، کوئی شکل، کوئی رنگ، کوئی خاکہ، کوئی طریقہ کسی طرح بھی اس کو بیان نہیں کر سکتا، وہ غیر متحرک ہے، بے خوف ہے، روشن ہے، اس کی طاقت بے اندازہ ہے، وہ بادشاہوں کا بادشاہ اور لکھوکھا اِندر کا مالک تصور کیا گیا ہے، وہ تین دنیاؤں کا مقتدرِ اعلیٰ ہے۔(۲)

گورو گوبند سنگھ جی اکال استت (غیر فانی خدا کی حمد، دسم گرنتھ) میں فرماتے ہیں :

ہمیں اکال (لازوال) خدا کی حفاظت حاصل ہو، ہمیں سرب لوہ (سرتا پا فولاد) خدا کی حفاظت حاصل ہو، ہمیں سَربْ کال (کلی موت) خدا کی حفاظت حاصل ہو۔(۳)

گورو گرنتھ صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے سردار جودھ سنگھ کہتے ہیں کہ :

سکھوں کی مذہبی کتاب ایک کی گنتی سے شروع ہوتی ہے، آخری حقیقت (خدا) کی وحدت کو واضح کرنے کے لئے گورو نانک دیو جی ایک کی گنتی استعمال کرتے ہیں، اس گنتی کے بعد 'اوم' کا لفظ آتا ہے، جس کا تلفظ ''اِک اونکار'' کیا جاتا ہے، حقیقت جو

(۱) سکھ مت اور توحید: ۱۱۰، بحوالہ: گورو گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ، جلد سوم، دیباچہ: 2۔

(۲) سکھ مت اور توحید: ۱۱۱، بحوالہ: سکھ ریلی جن: 261/5۔

(۳) سکھ مت اور توحید سید حامد علی: ۱۱۱، بحوالہ: سکھ ریلی جن: 261/5۔

'اوم' کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے ایک ہے، اگر تم اسے نام دینا چاہتے ہو تو اسے ستیہ (دائمی حق) کہو، وہ فاعل ہے، ہر شے میں جاری و ساری ہے، خوف اور بغض سے پاک ہے، اس کی ہستی پر وقت کا اثر نہیں ہے، وہ پیدا شدہ نہیں ہے، آپ موجود ہے، گورو کی مہربانی سے اسے پایا جا سکتا ہے۔(۱)

سری گورو گرنتھ صاحب محلہ ایک، صفحہ: 350 پر ہے، گورونانک جی فرمارہے ہیں :

''صاحب میرا ایکو ہے بھائی ایکو ہے'' یعنی میرا خدا واحد ہے، وہ ایک ہی ہے۔

دوسری جگہ گورونانک جی کا یہ قول سری گورو گرنتھ صاحب محلہ ایک صفحہ: 1190 پر ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتے ہیں :

بے محتاج، بے اَنت، اَپارا، یعنی وہ بے محتاج اور بے انت ہے، کوئی اس کی انتہا کو نہیں پا سکتا۔

گورو گرنتھ صاحب سوڑہ آسا محلہ ایک صفحہ: 597 پر ہے، گورونانک جی فرماتے ہیں کہ :

''نہ تِش مات پتا ست بندھک، نہ تِش کام نہ ناری'' یعنی اس کے نہ تو کوئی ماں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی باپ ہے اور نہ ہی اس کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں اور نہ ہی اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ کوئی اس کا رشتہ دار۔

یہ تقریباً ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' کا ترجمہ ہے :

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۔ (اخلاص)

اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا، نہ اس کو کسی نے جنا، کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

چنانچہ گورونانک جی گورو گرنتھ صاحب آسا محلہ ایک صفحہ: 416 پر لکھتے ہیں کہ :

''تم سم سر اور کونا ہیں'' یعنی اس کے ہم پلہ اور کوئی نہیں ہے۔

گورونانک جی گورو گرنتھ صاحب ماجھ شلوک محلہ ایک صفحہ: 148 پر لکھتے ہیں :

''خالق کو اولیس ڈھاڈی گاؤنا'' یعنی میں تو اپنے خالق، پیدا کرنے والے کی حمد کے ہی گیت گاتا ہوں۔

گورو گرنتھ صاحب مارو محلہ ایک صفحہ: 1042 پر لکھتے ہیں :

---

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی: ۱۰۹، بحوالہ: گورو گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ: ڈاکٹر گوپال سنگھ جلد: 1/1۔

''جی اُپائے رزق دے آپے''یعنی وہی پیدا بھی کرتا ہے وہی روزی بھی دیتا ہے۔

دوسری جگہ گرنتھ صاحب ارماجھ شلوک محلّہ ایک صفحہ:141 پر لکھتے ہیں :

''رب کی رضا منّے سَر اوپر کرتا منّے آپ گنوا دے''یعنی اپنے پالنے والے کے سامنے سر کو جھکا دو اور اپنے آپ کو مٹا دو۔

ایک جگہ گوروگرنتھ صاحب سری راگ محلّہ ایک صفحہ:15 پر گورونانک جی نے وہ بات فرمائی جو قرآن مجید کی ایک آیت میں بیان ہوئی ہے کہ اگر سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بنا دیئے جائیں اور اللہ کی نشانیاں اور اس کے احسانات لکھنے لگیں، تو سمندر خشک ہو جائیں گے، قلم گھس جائیں گے اور اللہ کی نشانیاں پھر بھی ختم نہ ہوں گی۔

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا . (سورۃ الکہف:۱۰۹)

فرماتے ہیں گورونانک جی :

نانک کاغذ لکھ مناں پڑھ پڑھ کیجئے بھاؤ
مسو توٹ نہ آوی لیکھن پون چلاؤ
بھی تیرے قیمت نہ پوے ہوں کیوں ڈاکھاں ناؤں

یعنی اے نانک لاکھوں من کاغذ ہوں اور میں پڑھ پڑھ کر ان کا خلاصہ نکالوں اور بے شمار سیاہی اور قلم بھی ہوں اور قلم ہوا کے مانند چل رہا ہو، مگر میں پھر بھی تیرا حسن بیان کرنے سے قاصر رہوں گا، یہ بے شمار کاغذ اور سیاہی ختم ہو جائیں گے، مگر تیرا حسن ختم نہیں ہوگا۔ (گوروگرنتھ صاحب سری راگ محلّہ ایک صفحہ:16)

ایک جگہ گوروگرنتھ صاحب گوڑی محلّہ ایک صفحہ:233 پر فرماتے ہیں :

''ان کو حکم ورتے سب لوئی''یعنی ہر جگہ خدائے واحد کا حکم چل رہا ہے۔

''حکم نہ جائی میٹیا''اس کا حکم کسی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔

اور یہ بھی تقریباً قرآن مجید کی آیت کی ترجمانی ہے۔

گوروگرنتھ صاحب آسا محلّہ ایک صفحہ:347 پر فرماتے ہیں :

''گاون تدھنوں کھنڈ منڈل کر کرر کھے تھارے''یعنی اے خدا تیری بنائی ہوئی ساری کائنات تیرے نام کی تسبیح پڑھ رہی ہے۔

گرنتھ صاحب کی یہ عبارتیں اور یہ حوالے ہم نے مولانا حبیب اللہ قاسمی کی کتاب ''گورونانک صاحب اوران کی تعلیم ودعوت'' کے صفحہ:57 تا صفحہ:63 سے لئے ہیں۔

مندرجہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گورونانک جی کے یہاں توحید کا بنیادی تصور موجود ہے۔

گورونانک جی دیوی دیوتاؤں کے قائل ضرور تھے،مگران کومخلوق مانتے تھے،ملاحظہ ہو: ڈاکٹر کالاسنگھ بیدی کی کتاب''بابانانک''صفحہ:104پر ہے :

وہ تین دیوتاؤں، برہما، بشن، مہیش کی ہستی کے قائل ہیں، مگرانھیں مخلوق اور قادر مطلق کی طاقتوں کا نام دیتے ہیں۔

جپ جی پوڑی30 میں لکھتے ہیں :

ایکا مائی جُگتِ وِیائی تِن چیلے پروان
اک سنساری ایک بھنڈاری اک لائے دیبان
جِوتِس بھارے تِوے چلاوے جو ہووے فرمان
اوہ دیکھے اوناں ندرنہ آوے بہتاے اوڈان

اس کا ترجمہ یہ ہے :

قادر مطلق اور قدرت کے وصل سے قدرت حاملہ ہوئی،اس سے تین مرید پیدا ہوئے، ایک برہما، ایک وشنواور ایک شوجی (ان تینوں کے سپرد نظام ہوا) جس طرح وہ قادر مطلق چاہتا ہے اسی طرح وہ تینوں دیوتا عمل کرتے ہیں (یعنی وہ آزاد نہیں ہیں)۔(۱)

وحدۃ الوجود (ادویت واد) کا نظریہ سکھ مت کے تصورِ توحید پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

گورونانک دیوجی ''وار ملہار'' میں فرماتے ہیں :

تم ہی میز ہواور تم ہی قلم اور تم ہی تحریر، نانک جی کہتے ہیں: بس تنہا تم ہی ہو، تمہارے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔(۲)

سری راگ میں گورونانک دیوجی فرماتے ہیں :

تم ہی بذاتِ خود پانی ہواور تم ہی بذاتِ خود مچھلی، تم ہی بذاتِ خود جال ہواور تم ہی نے خود جال پھینکا ہے۔

---

(۱) بابانانک، ڈاکٹر کالاسنگھ بیدی، صفحہ:104-105۔

(۲) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی، صفحہ:35، بحوالہ: گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ، جلد چہارم صفحہ:1232۔

(۳) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی، صفحہ:35، بحوالہ: گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ، جلد اول، صفحہ:6۔

گرنتھ صاحب کے راگ گونڈ میں پانچویں گورو ارجن دیو جی نے کہا ہے :

گورو خدا ہے، اس لئے وہ موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا نانک گورو ہے اور نانک خدا ہے۔(۱)

اسلام میں توحید کا نکھرا ہوا تصور

اسلام میں توحید کا تصور انتہائی نکھرا ہوا اور ہر طرح کی پیچیدگی سے محفوظ ہے، توحید کا عقیدہ یہ ہے کہ :

1- اللہ کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جو آپ سے آپ وجود میں آ گئی ہو، ہر چیز اس کی مخلوق ہے، مخلوق کی کوئی صفت ذاتی نہیں، اس میں جو بھی وصف ہے اللہ کا دیا ہوا ہے اور جب تک اللہ چاہتا ہے اس وقت تک وہ وصف اس میں رہتا ہے۔

2- اللہ کی ذات تمام موجودات سے مختلف ہے اور کسی بڑی سے بڑی ہستی پر بھی اسے قیاس نہیں کر سکتے، لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ، نہ وہ کسی کا باپ ہے، نہ وہ کسی کا بیٹا...... نہ وہ کسی کے ساتھ متحد ہوتا ہے، نہ وہ کسی کے اندر حلول کرتا ہے، وہ جسم اور جسمانی صفات نہیں رکھتا۔

3- صرف اللہ کی رضا جوئی سارے انسانی اعمال کا محرک اور مقصد ہونا چاہئے۔

4- پرستش وعبادت کی قسم کے سارے اعمال اللہ کے لئے مخصوص ہونے چاہئیں۔

5- وہ جذبات واحساسات بھی اللہ ہی کے لئے خاص ہونے چاہئیں جن کے اندر بندگی کی روح پائی جاتی ہو۔

6- اس پوری کائنات کا مقتدرِ اعلیٰ اللہ ہے جس کا ایک چھوٹا سا حصہ یہ دنیا بھی ہے، حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف وہی ہے۔

7- اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو، جو پوجے جانے کا مستحق ہو، جس کی رضا چاہی جائے، کوئی اور نہیں جسے کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، جس سے دُعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں، اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے، دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے، جس سے اُمیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت رکھی جائے۔

سکھ مت اور رسالت

سکھ مت اوتارواد کا منکر ہے، وہ اس بات کا قائل ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں کو بھیجتا ہے اور ان کے منھ

---

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی، صفحہ:16-17، بحوالہ:37(OUR HERITAGE.P) مصنف نارائن سنگھ۔

میں اپنا کلام ڈالتا ہے، یہ لوگ سکھ مت میں گورو کہلاتے ہیں، یہ خدا کے بندے اور انسان ہوتے ہیں۔

سکھ مت میں گورو کا یہ تصور اسلام کے تصورِ رسالت کے کافی قریب ہے؛ لیکن اسلام میں حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، جب کہ سکھ مذہب میں دسویں گورو، گورو گوبند سنگھ جی آخری گورو ہیں اور ان کے بعد کوئی گورو انسانی شکل میں نہیں آئے گا؛ بلکہ گرنتھ صاحب سے ہی رہنمائی حاصل کی جائے گی اور اسی کو گورو سمجھا جائے گا۔

گورو نانک دیو جی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی کشادہ دلی کے ساتھ تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان سے عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی پیروی کرنے کو باعث نجات سمجھتے ہیں۔

درج ذیل اقتباسات ہم نے مولانا حبیب اللہ قاسمی کی کتاب ''گورو نانک صاحب اور ان کی تعلیم و دعوت'' کے صفحہ:64 تا 68 سے لئے ہیں :

گورو نانک جی فرماتے ہیں: جنم ساکھی ولایت والی، صفحہ:246 :

صلاحت محمدی مکھ ہی آکھونت
خاصہ بندا سجیا سر مترا ہوں مت

یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ تعریف کرتے رہو، آپ ﷺ خدا کے خاص بندے اور سارے نبیوں کے سردار ہیں۔

جنم ساکھی ولایت والی صفحہ:250 پر گورو نانک جی فرماتے ہیں :

''سیئی چھوٹے نانکا حضرت جہاں پناہ'' یعنی نجات ان لوگوں کے لئے ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں آئیں گے۔

حضرت محمد صاحب کی عقیدت اور محبت کے حوالے سے گورو گرنتھ صاحب صفحہ:420 پر لکھتے ہیں :

اٹھے پہر پھوندا پھرے کھاون سندے سول
دوزخ پوندا کیوں رہے جاں چت نہ ہوئے رسول

ترجمہ: جن لوگوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور محبت نہ ہوگی وہ بھٹکتے پھریں گے اور دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔

جنم ساکھی ولایت والی صفحہ:168 پر فرماتے ہیں :

لے پیغمبری آیا اس دنیا ما ہے
ناؤں محمد مصطفیٰ ہو آبے پروا ہے

یعنی جس کا نام محمد ﷺ ہے وہ اس دنیا میں پیغمبر بن کر آئے ہیں، ان کو کسی باطل کا خوف اور ڈر نہیں ہے، وہ بالکل بے پرواہ ہیں۔

جنم ساکھی بھائی بالا صاحب صفحہ:195 پر لکھتے ہیں :

حجت راہ شیطان واکیتا جہاں قبول
سو درگاہ ڈھوئی نہ لہن بھرے نہ شفاعت قبول

یعنی جولوگ شیطان کا راستہ اختیار کریں گے، ایسے لوگ اللہ کے سچے دربار میں نہیں جاسکتے اور نہ ایسے لوگوں کے لئے محمد ﷺ کی شفاعت قبول ہوگی۔

ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں کہ :

یہ بالکل واضح ہے کہ گورونانک نے اسلام کے رسول کو بطور ماڈل (نمونہ واُسوہ) اپنے سامنے رکھا، اسی لئے ان کی تعلیمات پر فطری طور سے حقیقت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔(۱)

اسلام میں رسالت کا تصور

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے رسالت یعنی اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا اور ان کو اللہ کا سچا رسول ماننا ہے، دنیا کے آغاز سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے یہ انتظام کیا ہے کہ وہ اپنی مرضی بتانے اور اپنے احکام پہنچانے کے لئے انسانوں میں سے ہی کسی انسان کو اپنی پیغمبری کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

اللہ کی مرضی کیا ہے، یہ جاننے کے لئے ایسا ذریعہ ہونا ضروری ہے جسے خود خالق اور مالک اپنی مرضی بتانے کے لئے مقرر کرے، اس لئے رسول ریاضت اور عبادت سے نہیں بنتا؛ بلکہ یہ ایک منصب ہے اس پر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں مقرر کرتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنا رسول یا پیغمبر مقرر کرتے ہیں تو وہ شخص اپنا کام اس دعویٰ سے شروع کرتا ہے کہ "میں اللہ کا مقرر کیا ہوا رسول ہوں" اور وہ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرتا ہے کہ میں واقعی اللہ کا سچا رسول ہوں اور اس پر ایمان لانے والوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی صداقت کی تصدیق کرنے کے لئے اس سے ایسے ثبوت طلب کریں جو سورج کی طرح روشن ہوں۔

---

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی: 61، بحوالہ: ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر: 169۔

انسان نے جب سے اِس دھرتی پر قدم رکھا ہے، اس کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ ہر زمانے میں، ہر قوم میں اپنے رسول بھیجتا رہا ہے، حضرت آدم علیہ السلام جو پہلے انسان تھے، وہ پہلے پیغمبر بھی تھے، ان سے یہ سلسلہ شروع ہوا، رسول آتے رہے، اللہ کی ہدایات پہنچاتے رہے، انسانی تمدن آگے بڑھتا رہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچتے پہنچتے انسان اُس دور میں داخل ہو چکا تھا کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں رابطہ ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق دنیا کے کلیدی مقام پر آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا، اللہ کی ہدایات مکمل اور آخری شکل میں انسانوں کو دیدی گئیں اور یہ بھی انتظام کر دیا گیا کہ اللہ کی کتاب ہر طرح کے تغیر اور تبدیلی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے۔

رسول انسانوں کے لئے نمونہ ہوتا ہے، اس لئے اس کا انسان ہونا بھی ضروری ہے اور کامل انسان ہونا ضروری ہے، تمام رسولوں کو سچا مانتے ہوئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی ماننا اور ان کی لائی ہوئی تعلیم پر عمل کرنا، انسانوں کی دونوں جہان کی کامیابی کے لئے، اللہ کی مرضی پر چلنے کے لئے لازم ہے، توحید کے بعد رسالت کا یہ عقیدہ اسلام کی بنیاد ہے، رسول کے ذریعے ہم اللہ کو بھی جان سکتے ہیں، پہچان سکتے ہیں اور اس کی مرضی معلوم کر کے اس کی راہ پر چل سکتے ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ رب العالمین تمام جہانوں کے پروردگار، پالن ہار ہیں، اسی طرح آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین، تمام جہانوں کے لئے باعثِ رحمت ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاتفریق رنگ و نسل، قوم و ملک، تمام عالم کے لئے تا قیامت پیغمبر آخر الزماں ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنا کلام قرآن مجید نازل کیا، قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا رسول ہونے کا ثبوت اور اس کی روشن دلیل ہے کہ آپ کو اللہ نے تمام عالم کی ہدایت کے لئے مقرر کیا تھا۔

قرآن مجید بلاشبہ اللہ کا کلام ہے، وہ تمام دنیا کو یہ چیلنج کرتا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ خدا کی کتاب نہیں ہے تو اس جیسی کتاب؛ بلکہ اس کتاب کی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دو۔

یہ اعلان آج بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ آج تک قرآن کے اس چیلنج کا جواب نہیں دیا جا سکا۔

قرآن کہتا ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ، وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ. (سورۂ بقرہ:۲۳)

اپنے بندے پر اپنا جو کلام ہم نے اُتارا ہے اگر اس کے کلام الٰہی ہونے کے بارے

میں تمھیں شبہ ہے تو اس جیسی ایک سورت لکھ کر لے آؤ اور خدا کے سوا اپنے تمام مدد
گاروں کو بھی بلالو اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو۔

قرآن کا یہ کہنا کہ وہ ایسا کلام ہے جسے انسانی ذہن تخلیق نہیں کرسکتا اور آج تک کسی انسان کا اس پر قادر نہ ہونا قطعی طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ یہ خدائی منبع سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔

قرآن کا یہ چیلنج آج تک بدستور قائم ہے اور صدیاں گذر گئیں مگر کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔

قرآن کی پیشین گوئیاں اور ان کا سچا ثابت ہونا، یہ بھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔

قرآن کی زبان آج بھی ایک زندہ زبان ہے، آج بھی وہ اسی طرح تازہ اور شاداب ہے، جس طرح آج سے صدیوں پہلے تھی، کسی کتاب کی زبان کا اس طرح زندہ اور تازہ رہنا کہ صدیاں گذرنے پر وہ اسی طرح باقی رہے ایک حیرت انگیز بات ہے، کتنی ہی کتابیں ہیں جن کی زبان آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی اور آج ان کا سمجھنا سمجھانا کافی مشکل ہے؛ لیکن قرآن کی زبان آج بھی ایک زندہ زبان ہے اور اس کا ادب تازہ پھول کی طرح سرسبز و شاداب ہے۔

قرآن نے حیرت انگیز طور پر سائنس کے ان مسائل کو ٹچ کیا ہے، جن تک آج کی سائنس بڑی تحقیق کے بعد پہنچی ہے۔

رسول اور ایک مصلح اور ریفارمر میں بڑا فرق ہے، رسول ایک منصب ہے، جس پر تقرر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، ریفارمر کوئی عہدہ نہیں ہے، جب وہ اپنی فطری صلاحیت اور دل سوزی کی بناء پر قوم کی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے اور اس کی فہم و فراست، ہمدردی اور نیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح اور ریفارمر کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔

رسول ایک طرح کی سفارت ہوتی ہے، ہر سفیر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے، مگر ہر قابل کے لئے سفیر ہونا ضروری نہیں، یہ بادشاہ کی اپنی مصلحت اور صواب دید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔

آخرت

اسلام کے تین بنیادی عقیدے ہیں: توحید، رسالت اور آخرت۔

توحید اور رسالت کا بیان اوپر گذر چکا، اسلام میں آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان درج ذیل حقیقتوں کو تسلیم کرے :

1- انسان کی پیدائش ایک متعین مقصد کے تحت ہوئی ہے، وہ ایک ذمہ دار ہستی ہے۔
2- انسان کی زندگی موت کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی؛ بلکہ اس کے بعد بھی مسلسل باقی رہنے والی ہے

اور ایک دن ایسا آئے گا جب دنیا کا یہ کارخانہ ختم کر دیا جائے گا، اسے قیامت کہتے ہیں۔

3- قیامت کے بعد ابتداء سے اُس دن تک پیدا ہو کر مٹ جانے والے سارے جاندار جسم و جان کے ساتھ دوبارہ اُٹھا کر کھڑے کئے جائیں گے، اسے حشر کہتے ہیں۔

4- حشر کے بعد زندگی کا ایک دوسرا دور شروع ہوگا، اس میں حساب کتاب کے لئے سب ہی اللہ کی عدالت میں حاضر ہوں گے اور جس نے جیسے اعمال کئے ہوں گے ان کے مطابق جزاء وسزا کا مستحق قرار پائے گا اور کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی، جس نے نیک اعمال کئے ہوں گے، اسے جنت نصیب ہوگی اور برے اعمال والے تکلیفوں اور اذیتوں بھری جہنم میں جائیں گے۔

5- حساب کتاب اور جنت اور جہنم کے فیصلے کے بعد زندگی کا نہ ختم ہونے والا دوسرا دور شروع ہوگا جو ہمیشہ کے لئے ہوگا اور یہاں موت نام کی کوئی چیز نہ ہوگی، یہ ہے اسلام میں آخرت کا تصور جو اسلامی عقیدے کی اہم بنیاد ہے۔

گورو نانک دیو آواگون (تناسخ) پر یقین رکھتے تھے، آپ نے سمجھایا ہے کہ انسان کو نیک اعمال وافعال کرنے چاہئیں؛ کیوں کہ موت کے بعد اعمال کی بنا پر جسم ملے گا، اگر انسان گناہوں میں مبتلا رہے گا تو پھر اسے کتے یا دیگر حیوانات کے اجسام سے گذرنا ہوگا، اسی طرح 84 لاکھ اجسام میں سے گذرتے ہوئے انسانی جسم نصیب ہوگا، بنابرایں اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے:

جُڑ جڑ وِ چھُڑے وِچھُڑے جُڑے جیو جیو موئے موئے جیوے
کیتیا کے پاپ کیتیا کے بیٹے کیتے گورو چیلے ہوئے
آگے پاچھے گنت نہ آوے کیا جاتی کیا ہُن ہوئے
سبھ کرنا کِرت کر لکھیئے کرِ کرِتا کرے کرے
من مُکھ مریے گورمکھ تریے نانک ندری ندر کریئے(۱)

بابا نانک جی کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر انسان بدافعال کا شکار ہوگا تو اس کی روح، سگ، سانپ وغیرہ کے اجسام میں بھی داخل ہو کر تکالیف میں مبتلا ہوگی:

سو کر سوان گردبھ منجارا
پسو ملیچھ نیچ چنڈالا
گورتے منھ پھیرتے تن جون بھوایئے
بندھن بادھیا آیئے جایئے

(۱) سلوک محلّہ پہلا وار سانگ محلّہ 4، بابا نانک، صفحہ:153۔ (۲) بلاول محلّہ پہلا، بابا نانک صفحہ:154۔

نیز بابا نانک جی یہ بھی فرماتے ہیں :

پریت پنجر ہی دُوکھ گھنیرے
نرک پیچے اگیان اندھیرے
دھرم رائے کی باقی لیجے
جن ہری کا نام وِسارا ہے (۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

جیوں آرن لوہا پائے بھن گھڑائیے
تیوں ساکت جونی پائے بھوے بھوائیے (۲)

جوانسان سالک اور طالب رہ طریقت اختیار کرتا ہے اور مُرشدِ کامل کی پناہ میں جا کر اُس کے پند و نصائح پر عمل کرتا ہے وہ آواگون کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے، (۳) گورو ارجن دیو جی فرماتے ہیں :

لکھ چو راسی جون سبائی
مانس کو پربھ دی وڈیائی
اِس پوڑی تے جونر چوکے
سوآئے جائے دُکھ پایدا

گورو تیغ بہادر جی کا قول ہے :

پھرت پھرت بہتے جُگ ہاریو مانس دیہہ لہی
نانک کہت مِلن کی بربا سمرت کہا نہیں

گورو ارجن دیو جی کا عقیدہ ہے :

پھوٹو آنڈا بھر کامنے بھیو پرگاس
کاٹی بیڑی پگھہ تے گور کینی بند خلاص
آون جان رہیو تپت کڑاہا بُجھ گیا
گورسیتل نام دیو۔ (۴)

(۱) مارو محلّہ پہلا سولہے، بابا نانک صفحہ:154۔ (۲) سوہی چھنت محلّہ پہلا۔
(۳) بابا نانک، صفحہ:154۔ (۴) بابا نانک: حیات وجپ جی، ڈاکٹر کالا سنگھ بیدی، صفحہ:152 تا154۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد سکھ مت میں موکش یا نرمان ہے یعنی آواگون کے چکر سے چھوٹ جانا۔

انسان دنیا میں بار بار جنم لیتا ہے اور یہ بھی پچھلی زندگی کے اعمال کے مطابق ہوتا ہے مگر سکھ مذہب میں کرم کا نتیجہ لازمی نہیں ہے، اس کے برعکس خدا کے رحم وکرم سے ایک ہی جنم میں انسان نجات حاصل کر سکتا ہے، مگر یہ نجات خدا کی والہانہ پرستش سے حاصل ہوتی ہے، یہ والہانہ پرستش خدا کا نام لینے اور نام کے راستے (نام مارگ) پر چلنے سے ہوتی ہے۔

سکھ مذہب میں انسانی مساوات

ڈاکٹر گوپال سنگھ فرماتے ہیں :

(سکھ مت میں) نہ کوئی ذات اونچی ہے نہ نیچی، نہ کوئی آدمی مردود و گنہگار ہے، نہ کوئی مقدس ہستی ہے، خداوند خدا کی عدالت میں جو شخص جس طرح ہے بس وہ شخص ویسا ہی ہے۔(۱)

گورو صاحب فرماتے ہیں :

اونچے تے اونچا بڑا سبھ سنگ بریہہ
داس داس کو داسرا نانک کریہہ

انسان سب یکساں درجہ رکھتے ہیں، دربارِ الٰہی میں ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں۔(۲)

اسلام میں انسانی مساوات

اسلام میں انسانی برابری اور مساوات کا تصور بہت ہی واضح ہے، قرآن مجید کا اعلان ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ، إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ . (سورۃ الحجرات:13)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے؛ تا کہ ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ؛ لیکن خدا کے یہاں زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ محتاط اور پرہیز گار ہو۔

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی، صفحہ:58، بحوالہ: انگلش ترجمہ جلد اول، دیباچہ، صفحہ:27۔

(۲) بابا نانک، ڈاکٹر گوپال سنگھ، صفحہ:170۔

اسلام کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ تمام انسان ایک ہی ذات پاک وحدۂ لاشریک کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور رنگ ونسل، زبان اور وطن کے امتیازات صرف تعارف اور پہچان کا ذریعہ ہیں، انسانی عز وشرف میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اُخوت ومساوات کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے حضرت محمد ﷺ نے اس کو صرف ایک میٹھی بات اور دل پذیر اور خوبصورت نصیحت ہی کا درجہ نہیں دیا؛ بلکہ اپنے دلکش عمل کے تسلسل اور زبردست جدوجہد سے ایسے تمام احتمالات کا خاتمہ کردیا جو کسی درجے میں بھی انسانی وحدت کے رشتے پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

آپ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ کی شادی مکہ کے زرخرید غلام زید بن حارثہ ؓ سے کر کے حسب ونسب کے بجائے انسانی مساوات اور برابری کا عملی نمونہ پیش کردیا، قریش کی ممتاز خاتون فاطمہ بنت ولید کا نکاح ابوحذیفہ ؓ کے غلام اسامہ ؓ سے کرایا۔

مدینے کے انصار اپنی بیٹی دینے میں بہت سخت تھے، قریش کے رئیس ہاشم نے جب مدینے کی ایک خاتون سے نکاح کی درخواست کی تھی تو اس قبیلے نے اس شرط پر شادی کی اجازت دی تھی کہ ہماری بیٹی کبھی رخصت ہوکر مکہ نہ جائے گی، مگر اسلام میں آنے کے بعد اسلام کی تعلیم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نتیجے میں اس قبیلے کا ذہن اتنا تبدیل ہو چکا تھا کہ ایک روز مشہور صحابی حضرت بلال ؓ نے مسجد نبوی میں اپنے بھائی کے لئے درخواست کی کہ لوگو! میں غلام ہوں، حبشی ہوں، بے مایہ ہوں، اس کے باوجود بھائی کی شادی کا خواہاں ہوں تو حضرت بلالؓ کے اس کہنے پر مدینے کے کئی معزز خاندانوں نے اُن سے رشتہ قائم کرنے کی خود پیش کش کی۔

اس طرح انسانی مساوات اسلامی معاشرے میں صرف ایک دل خوش کن نظریہ ہی نہیں تھا؛ بلکہ ٹھوس حقیقت بن گیا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر جو اہم ترین اعلانات آپ ﷺ نے فرمائے ان میں ایک اہم اعلان یہ بھی تھا کہ:

> لَا فَضَلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ ، وَلَا عَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ ، كُلُّكُمْ بَنُوْا آدَمْ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ .
>
> کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

وحدۃ الوجود

سکھ مذہب اَدْوِیت وادیعنی وحدۃ الوجود کا قائل ہے، گورو گرنتھ صاحب میں یہ نظریہ پوری قوت اور وضاحت

سے بار بار بیان ہوا ہے۔

گورونانک دیو جی ''وار ملہار'' میں فرماتے ہیں :

تم ہی میز ہو اور تم ہی قلم اور تم ہی تحریر۔

گورونانک دیو جی کہتے ہیں :

بس تنہا تم ہی ہو، تمہارے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔(۱)

سری راگ میں گورونانک فرماتے ہیں :

تم ہی بذاتِ خود پانی ہو اور تم ہی بذاتِ خود مچھلی، تم ہی بذاتِ خود جال ہو اور تم ہی نے خود جال پھینکا ہے۔(۲)

زمین و آسمان ہر جگہ اور خود انسان کے اندر اللہ کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں ، ان چیزوں کو دیکھ کر اللہ کی قدرت اور اس کے کمالات کا اندازہ ہوتا ہے، جیسے کسی تصویر کو دیکھ کر تصویر بنانے والے کی طرف ذہن جاتا ہے، تصویر اچھی ہو تو دیکھنے والا کہتا ہے کہ بڑا اچھا آرٹسٹ ہے، خوب تصویر بنائی ہے، اچھی تصویر......تصویر بنانے والے کے فن اور اس کے کمال کو بتاتی ہے، تصویر بنانے والا تصویر کے اندر نہیں ہوتا، اس کے باہر ہوتا ہے، ہاں تصویر اس کے کمال کو، اس کے فن کو اور اس کے آرٹ کو ضرور ظاہر کرتی ہے، تصویر بنانے والے کو ڈھونڈنا ہو تو اس کی تصویر کے باہر ڈھونڈا جائے گا، تصویر کے اندر نہیں کہ ہم اس تصویر کے اندر گھس کر اس کو تلاش کرنے کی کوشش کریں ، ہاں تصویر کی خوبیوں سے اس کے بنانے والے کی خوبیوں کو ضرور سمجھ سکتے ہیں ، بات ذرا اور کھل جائے اس کو سمجھنے کے لئے ایک تاریخی قصہ سنئے !

ایران کے ایک شاعر نے ایک مصرعہ کہا، مصرعہ یوں تھا :

دُرِ　　اَبلق　　کسے　　کم　　دیدہ　　موجود

یعنی چت کبرا، کالا اور سفید رنگ ملا ہوا موتی کسی نے دنیا میں نہیں دیکھا، شاعر نے ایک مصرعہ تو کہہ لیا، دوسرا مصرعہ اس کے ذہن میں نہ آیا کہ مل کر پورا شعر ہو جائے، وہ بے چین رہنے لگا کہ کسی طرح ایک مصرعہ اور مل کر پورا شعر ہو جائے، اس نے بڑے بڑے شاعروں کو دعوت دی کہ اس کے مصرعے پر مصرعہ لگائیں، کسی کے سمجھ میں نہ آیا، بات ایران سے ہندوستان پہنچی، یہاں کی شہزادی شاعرہ تھیں، انھوں نے اس مصرعے پر مصرعہ لگا کر بھیجا :

(۱)　سکھ مت اور توحید، سید حامد علی، صفحہ:35، بحوالہ: گورو گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ:1232/4۔

(۲)　سکھ مت اور توحید، سید حامد علی:34-35، بحوالہ: گرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ:6/1۔

وَلے چشمِ بُتانِ سرمہ آلود

یہ مصرعہ ملا کر اب پورا شعر اس طرح ہو گیا :

دُرِ اَبلق کسے کم دیدہ موجود
وَلے چشمِ بُتانِ سرمہ آلود

یعنی چت کبرا موتی دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا، مگر حسینوں کی سرمہ لگی آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں وہ چت کبرے موتی بن جاتے ہیں۔

ایران کا شاعر اس مصرعے پر پھڑک اُٹھا کہ یہ کوئی بڑا عظیم شاعر ہے، ملاقات کی خواہش کی، شہزادی پردہ نشین تھی، سامنے آنا نہ چاہتی تھی، اس نے جواب لکھا :

در سخن مخفی مَنَم چوں بوئے گل اندر روئے گل
ہر کہ دیدن مَیل دارد در سخن بیند مرا

''میں اپنے کلام میں اس طرح پوشیدہ ہوں جس طرح پھولوں کی خوشبو پھول میں چھپی رہتی ہے جو مجھے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے وہ مجھے میرے کلام میں دیکھ لے''۔

شاعر کے کمال کا اس کے کلام سے پتہ چلتا ہے، اس کے فن کا اظہار اس کے کلام سے ہوتا ہے۔

جی ہاں! پہچانا جاتا ہے :

آرٹسٹ اپنے آرٹ سے۔

مصور اپنی تصویر سے۔

شاعر اپنے کلام سے۔

آرٹسٹ اپنے آرٹ کے اندر نہیں ہوتا، آرٹ میں اس کا فن ہوتا ہے، مصور اپنی تصور کے اندر نہیں ہوتا، تصویر میں اس کی مصوری جھلکتی ہے، شاعر اپنے کلام کے اندر نہیں ہوتا شعر سے اس کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے، ہر ہر چیز اور خود انسان پروردگار کی قدرت اور اس کی کاریگری کی منھ بولتی تصویر ہے۔

وَحدتِ اَدیان

تمام مذاہب حق ہیں، اس بات کو گورونانک دیو جی نے پوری قوت کے ساتھ پیش کیا، باقی نو گوروؤں نے بھی اس کا پرچار کیا، گورونانک جی فرماتے ہیں :

ہندو کے چھ مکاتبِ فکر ہیں اور ہر ایک کا اپنا ایک گورو (بانی) ہے، تمام گوروؤں کا گورو

ایک ہے؛ لیکن اس کے مظاہر بہت سے ہیں، جس مکتبِ فکر میں بھی خالق کے کرشمے بیان کئے جائیں اسے اس طرح قبول کرو جیسے وہ تمہارا اپنا مکتبِ فکر ہو، اسی میں تمہارا ارتقاء ہے، سورج ایک ہی ہے؛ لیکن موسم بہت سے ہیں، (موسموں کے نام) اے نانک! خدا ایک ہے، اگرچہ اس کی شکلیں بہت سی ہیں۔ (گوروگرنتھ صاحب، راگ آسا)

گوروگوبند سنگھ جی فرماتے ہیں :

مندر اور مسجد ایک ہی ہیں، ہندو پوجا اور مسلم نماز بھی ایک ہی ہیں۔

(اکال اُستت، آور ہیر پیٹھ :22)

اس نقطۂ نظر کا حاصل یہ تھا کہ سب مذاہب حق ہیں، اختلافات ظاہری و سطحی ہیں، اس لئے لوگوں کو لڑنے کے بجائے اپنے اپنے مذہب کی مخلصانہ پیروی کرنی چاہئے۔

گورونانک جی نے ایک موقع پر کہا تھا :

سچا مسلمان ہونا مشکل ہے؛ لیکن اگر سچا مسلمان ہے تو اسے مسلمان رہنے دو۔(۱)

وحدتِ دین

انسانی زندگی سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی ہے، دنیا کے آغاز سے لے کر قیامت تک دنیا میں جتنے انسان پیدا ہوئے یا پیدا ہوں گے، ان سب کے مورثِ اعلیٰ اور جدامجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، تمام انسان ایک باپ آدم اور ایک ماں حوا کی اولاد ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم وحوا علیہما السلام کو زمین پر بھیجا تو ان کو ہدایت سے نوازا، زندگی گذارنے کا طریقہ اور مقصدِ زندگی بتایا، آدم وحوا علم کی پوری روشنی میں دنیا میں آئے، پروردگار نے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے یہ بھی ہدایت کی کہ وہ یہی طریقہ اپنی اولاد کو بھی سکھائیں، یہی انسان کا پہلا مذہب تھا اور اس پہلے مذہب کا نام تھا ''اسلام''۔

اولادِ آدم زمین پر پھیلتی گئی، آہستہ آہستہ باپ کے سکھائے ہوئے طریقے سے دور ہوتی گئی اور کچھ اپنے خیالات بھی اس طریقے میں شامل کر لئے، بھولے ہوئے سبق کو دوبارہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی، اللہ نے اپنے پیغمبر بھیجے، پیغمبر آتے رہے، اسی طریقے کی یاد دہانی کراتے رہے، کچھ لوگوں نے ان کی بات مانی، کچھ نے نہیں مانی، ماننے والے شروع سے ایک ہی طریقے پر رہے، نہ ماننے والے مختلف خانوں میں بٹتے چلے گئے اور انھوں نے اپنے اپنے مذہب بنالئے، اصل مذہب شروع سے ایک تھا، ایک ہی رہا۔

---

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی: 23-24، بحوالہ: راگ ماجھ OUR HERITAGE. P.24۔

اب انسان فکری طور پر اس مقام پر پہنچ چکا تھا کہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ایک ہی پیغمبر، پیغمبر عالم، آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مقرر کیا گیا، ایک مکمل دین اور مکمل شریعت کے ساتھ، وہ کتاب قرآن مجید ان پر نازل کی گئی جو قیامت تک جوں کی توں رہے گی، انسان کا اصل مذہب ایک تھا، ایک ہے اور ایک ہی رہے گا، مختلف مذہبوں میں ملتی جلتی باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اصل سرچشمہ ایک ہی تھا، لوگوں نے کچھ باتیں اپنی طرف سے اصل دھارے میں ملا دیں، اصل دھارے کو الگ کرنے کے لئے ہی پیغمبر آتے رہے ہیں اور آخری کتاب قرآن مجید نے بغیر کسی جھجک کے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ وہ دین جس کی رہنمائی اللہ کی طرف سے ہوئی ہے وہ دین اسلام ہے، وحدتِ ادیان کے بجائے وحدتِ دین، یہی درست اور صحیح راستہ ہے۔

دنیا کے بارے میں سکھ مذہب کا نقطۂ نظر

ڈاکٹر گوپال سنگھ لکھتے ہیں کہ سکھ مت کے دو بنیادی اُصول ہیں کہ :

زندگی اپنی اصل کے اعتبار سے گناہ پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ ایک پاک سرچشمہ (خدا) سے صادر ہونے کے باعث بنیادی طور پر پاک ہی ہے، (گورو گرنتھ صاحب آسا 3 میں ہے اے دماغ! تم دنیا کے نور سے نکلے ہو، اپنی اصل کو جانو) جہالت یا مایا کے باعث اگر اس کی گرد گندگیاں جمع ہو جاتی ہیں تو انھیں دھو کر صاف کیا جا سکتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص پاک وصاف ہو کر اس طرح چمکنے لگتا ہے جیسے کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے تھا، (گورو گرنتھ صاحب رام کلی 3 میں ہے، اے میرے جسم! جب خداوندِ خدا تیرے اندر اپنا نور رکھے گا تو تو زندگی حاصل کرے گا) (جیسا کہ گورو گرنتھ صاحب رام کلی 3 میں ہے یہ دنیا واحد حق کا مسکن ہے اس کے اندر واحد حق رہتا ہے) اور یہ دنیا پھولوں کا ایک باغ ہے جہاں زندگی ہمیشہ جوبن پر رہتی ہے، بلا شبہ یہ دنیا ایک فرد کے لئے چند روزہ ہے؛ لیکن یہی ایک شخص کے لئے واحد موقع ہے اپنے خدا سے ملنے کا اور برائیوں کے تمام جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کرنے کا، جیسا کہ گورو گرنتھ صاحب آسا 3 میں ہے :

تم انسان کے جسم میں آ گئے ہو یہ تمہارے لئے اپنے خدا سے ملنے کا ایک ہی موقع ہے۔

اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ یہ جھاڑ جھنکاڑ کہاں پر اُگے ہوئے ہیں، انسان کو اپنے شعور میں یا اس کی ذات کے باہر ایک ملک میں یا دوسرے ملک میں، اِس قوم میں یا اُس قوم میں یہ بات بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس جھاڑ جھنکاڑ کا رنگ اور شکل کیا ہے، سماجی، اخلاقی، ذہنی یا سیاسی اس طرح آدمی ایک باغبان بن جاتا ہے جس کا کام خدا کی نرسری کی نگہداشت ہوتا ہے اور ایک جنگجو سپاہی ہو جاتا ہے جو اپنے اندر کی پانچ خواہشوں کے خلاف لڑتا ہے اور اتنی ہی باہر کی چیزوں کے خلاف جنگ کرتا ہے۔

انسان کی وہ پانچ خواہشیں کیا ہیں؟ کام یعنی شہوت ، کرودھ یعنی غصہ، لوبھ یعنی لالچ ،موہ یعنی محبت اوراَہنکار، گوروگرنتھ صاحب سری راگ پانچ میں ہے کہ: میں خدا کا جنگجو سپاہی ہوں ، اپنے گورو سے ملتے ہوئے میری ٹوپی کی کلغی حرکت کرتی ہے۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ :

> نہ صرف سکھ فلاسفی پوری سکھ تاریخ اور سکھ کردار ان ہی دو اُصولوں سے نکلتے ہیں ، تیاگ (ترک دنیا) فطری طور سے اس نظام میں ممنوع ہے،اسی طرح جیسے ذات ، پات ، رنگ ونسل یا صنف کے امتیازات ، زندگی ہمیں اسی لئے دی گئی ہے کہ اسے پوری طرح گذاریں ، اس لئے نہیں کہ اسے پھینک دیں ، پھر زندگی گذارنے کا مطلب زندگی کو بہ حیثیت کل گذارنا ہے، نہ کہ مختلف حصوں میں بانٹ دینا،ایک آدمی خدا کا پرستار وفدا کار ہے، یہی آدمی عائلی زندگی گذار رہا ہے، وہی صلح کا علمبردار ہے اور وہی تلوار اُٹھائے ہوئے ہے، وہ ایک کاشتکار، دکاندار، صناع یا شہزادہ خواہ کچھ ہو؛ لیکن اپنی ذات کے لئے وہ پروہت ہوگا......اس کے لئے کوئی کھانا ممنوع نہیں ہے، بجز اس کے جو اس میں بدی یا تکلیف پیدا کرے،سوائے اس لباس کے جو گناہ اور دکھ کا موجب ہو۔(۱)

اسلام میں رہبانیت ،ترکِ دنیا اور دین ودنیا کی علاحدگی کا کوئی تصور نہیں ہے

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آخرت کا راستہ دنیا سے ہوکر گذرتا ہے، دنیا کو اس طرح برتنا کہ وہ آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بن جائے ،اسلام نے اس کے لئے جو جامع دُعا سکھائی ہے وہ قرآن مجید میں ہے اور ہر نماز میں اس کو پڑھا جاتا ہے، وہ ہے :

> رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ .
>
> اے ہمارے رب ہمیں دنیا کی بھلائیاں بھی عطا فرما اور آخرت کی بھلائیاں بھی اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

اسلام اللہ اور بندوں کے حقوق میں توازن قائم کرتا ہے اور انسان کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی کے ساتھ رب کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرے ؛ بلکہ اسلام میں عبادت کا تصور ہی پوری زندگی پر

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی: 53 تا 55، بحوالہ: گوروگرنتھ صاحب کا انگلش ترجمہ: 1/26-27۔

پھیلا ہوا ہے کہ ہر وہ کام جو رب کے حکم کے مطابق اور پروردگار کی رضا کے لئے کیا جائے وہ عبادت ہے، چاہے بہ ظاہر وہ کام دنیاوی نظر آتا ہو، مثلاً: شادی کرنا بھی عبادت ہے اور شادی کے نتیجے میں جو ذمہ داریاں بیوی بچوں کی آتی ہیں ان کو ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

جس طرح پانچ وقت نماز پڑھنا عبادت اور اللہ کا حق ہے، اسی طرح اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا ضعیفوں اور کمزوروں کے کام آنا، غریبوں کی ہمدردی کرنا، حق کی حمایت کرنا، یہ بھی عبادت ہے۔

اس طرح اسلام اور سکھ مت کا نقطۂ نظر دنیا کے بارے میں کافی حد تک ایک دوسرے کے قریب ہے۔

سکھ اور مسلم تعلقات

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغل فرماں رواؤں نے سکھ گوروؤں کو بڑی بڑی جاگیریں اور وظیفے دیئے ہیں۔

گورو گوبند سنگھ جی نے اپنے فارسی اشعار میں اورنگ زیب کی تعریف کی ہے اور ان کو روشن ضمیر، ملائک صفت اور دین کا محافظ فرمانروا قرار دیا ہے، یہ اشعار گورو گوبند سنگھ جی کے ''دسم گرنتھ'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

سکھوں اور مسلمانوں کے خوش گوار تعلقات کی یہ ایک روشن دلیل ہے کہ گوروارجن دیو جی نے امرتسر کے بیچو بیچ ایک عبادت گاہ بنوائی جو عام طور پر گولڈن ٹیمپل کے نام سے معروف ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے انھوں نے ایک مسلم صوفی درویش سائیں میاں میر سے درخواست کی تھی اور انھوں نے سنگ بنیاد رکھا بھی۔(۱)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ دسویں گورو، گورو گوبند سنگھ جی ایک عالم، فاضل انسان تھے، انھوں نے نہ صرف فارسی؛ بلکہ سنسکرت اور ہندی زبانیں بھی سیکھیں، سنسکرت اور ہندی سے متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، ظفر نامہ گورو گوبند سنگھ جی کا اورنگ زیب کے نام خط ہے وہ اس میں اورنگ زیب کی تعریف کرتے ہیں۔

دسویں گورو، گورو گوبند سنگھ جی میں جنگ جوئی کی اسپرٹ اپنی انتہاء پر تھی وہ نہ صرف یہ کہ خود زندگی بھر اورنگ زیب سے لڑتے رہے؛ بلکہ پورے سکھ فرقے کو جنگ جو فوج میں تبدیل کردیا، اس جنگ نے سکھ مسلم تعلقات پر گہرا اثر ڈالا؛ لیکن یہ جنگ مذہب کی جنگ نہ تھی؛ بلکہ ایک سیاسی جنگ تھی۔

گورو گوبند سنگھ جی کی تصنیفات میں کہیں ''اینٹی مسلم'' رجحان نہیں پایا جاتا ہے، گورو گوبند سنگھ کو ہندو راجاؤں کے خلاف بھی اسی طرح جنگ کرنی پڑی جس طرح اورنگ زیب اور ان کی فوجوں سے۔

تاریخ کی سچائی یہی ہے کہ سکھوں اور مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ نہایت دوستانہ اور خوش گوار رہے ہیں، انگریز مؤرخوں نے کچھ کہانیاں گھڑ کر ان تعلقات کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے، خاص طور پر اس میں انگریز مؤرخ

(۱) سکھ مت اور توحید، سید حامد علی: 87-88، بحوالہ: انگلش ترجمہ جلد اول دیباچہ: 41۔

میکلف نے بہت رول ادا کیا ہے، سچائی یہ ہے کہ سکھ گوروؤں کے تعلقات مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ بہت اچھے رہے ہیں۔

رائے بولار ایک بھٹی راجپوت مسلمان تھا،تلونڈی کے اِردگرد کا سارا علاقہ اس کی جاگیر تھا، بابا گورونانک جی کے والد کالو جی اس کے گماشتے تھے اور اس کی ساری زمین کے منتظم تھے،تاریخ بتاتی ہے کہ یہ مسلمان سردار رائے بولار ہمیشہ بابا صاحب کے ساتھ دلی محبت اور احترام کے ساتھ پیش آتا تھا۔

رائے بولار نے نانک سرنام کا ایک تالاب بنوادیا تھا،آج تک ننکانہ صاحب میں موجود ہے۔(۱)

رائے بولار نے تلونڈی کی بہت سی زمین بابا صاحب کو نذر کردی تھی،ایک وِدوان نے لکھا ہے کہ :

> ننکانہ صاحب سارا ہی گورودوارے کی ملکیت ہے، رائے بولار نے سارا رقبہ ہی گورو کے لئے نذر کردیا تھا۔(۲)

بابر بادشاہ اور بابانانک صاحب دونوں ایک ہی وقت میں ہوئے ہیں،ایک سکھ وِدوان لکھتے ہیں کہ :

> بابر کے ساتھ گورو جی کے بہت سوال و جواب ہوئے ، جب اس کو ہوگیا معلوم کہ یہ کوئی ولی ہے تو کہنے لگا کہ آپ مجھ سے کوئی جاگیر وغیرہ مانگ لیں ، اس پر گورو جی نے کہا کہ سب کے رزاق کے بغیر کسی سے مانگنا فقیروں کا کام نہیں ، بابر نے کہا میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں ، آپ کامل فقیر ہیں ، میری حکومت کی کامیابی کے لئے دُعا کرو، گورو صاحب نے وعدہ کیا کہ اگر تو حکومت چاہتا ہے تو سب بے گناہ قیدیوں کو رہا کردے ، یہ سن کر بابر نے سب قیدیوں کو رہائی کا حکم دیدیا ، اس کے بعد گورو صاحب کے ساتھ بابر نے یہ اقرار کیا کہ ''میں انصاف وعدل کروں گا ، آپ کی گدّی کی ہمیشہ عزت کرتا رہوں گا۔(۳)

گورودوارہ نانک متا پیلی بھیت (یوپی) میں ہے ، اس کے ساتھ کچھ گاؤں کی زمین بطور جاگیر ہے جو اَودھ کے نوابوں نے نذر کی ہوئی ہے۔(۴)

---

(۱) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ :48،بحوالہ:سوانح عمری سری گورونانک دیو جی:44۔

(۲) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ :48،بحوالہ: گوردھام دیدار:126۔

(۳) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ،بحوالہ:اتہاس سکھ گورو صاحبان:99۔

(۴) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ،بحوالہ:پراچین بیڑاں:289۔

ایک مرتبہ اکبر بادشاہ گوروامر داس جی سے ملاقات کے لئے آیا اور اس نے چوراسی گاؤں بطور جاگیر گورو صاحب کی نذر کئے۔(۱)

ایک سکھ ودوان نے اس جاگیر کے متعلق اپنے خیالات یوں لکھے ہیں کہ :

> اکبر بادشاہ سے پہلے بھی چاہے اسلامی بادشاہوں نے گوروگھر کے ساتھ پریم کیا تھا؛ لیکن اس بادشاہ نے اسلام کا سکھوں کے ساتھ وہ رشتہ جوڑ دیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں پرگنہ جھبال کے چوراسی گاؤں سری گوروامر داس صاحب کی بیٹی بیوی بھانی جی کے نام جاگیر لگادی جن میں دین اور دنیا کا مرکز سری امرتسر بھی ہے۔(۲)

گورو ارجن دیو جی اور جہانگیر بادشاہ کے ابتدائی تعلقات بہت اچھے تھے اور جہانگیر گورو صاحب کی بہت عزت کرتا تھا، مشہور سکھ اسکالر سردار کاہن سنگھ لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے اپنی شہزادگی کے زمانے میں ایک بھاری جاگیر گورو ارجن صاحب کی نذر کی تھی؛ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ :

> اکبر کے زمانے میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) اس (کرتارپور) کی معافی کا پٹہ دھر مسالہ کے نام 1655ء بکرمی میں دیا جس میں رقبہ 8964 گھماؤں 7 کنال 15 مرلہ درج ہے۔(۳)
>
> یاد رہے کہ جہانگیر بادشاہ کی طرف سے دی گئی اس جاگیر کا ذکر گوروگرنتھ صاحب کے اس قلمی نسخہ کے زائد اوراق میں بھی ہے، جس کو سکھوں کی ایک بڑی تعداد اصل جلد گرنتھ صاحب کی مانتی ہے اور وہ آج کل کرتارپور میں ہے۔(۴)

ایک ودوان لکھتے ہیں کہ :

> 1589ء میں سری ہرمندر صاحب کا سنگ بنیاد لاہور کے نیک سیرت فقیر میاں میرؒ نے رکھا تھا، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سنہری جڑاؤ کا کام ایک مسلمان انجینئر محمد یار خاں کی زیرنگرانی ہوا تھا، 1923ء میں جب تالاب کی سیوا کی گئی تھی تو مالیر کوٹلہ کے نواب کی جتھیداری کے ماتحت دوسو مسلمان پوتر گارے کی ٹوکریاں اُٹھانے

---

(۱) گورودھام دیدار: 89-90 پران گاؤں کی فہرست بھی دی ہوئی ہے۔

(۲) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ، بحوالہ: رسالہ اُپدیشک، جولائی 1933ء۔

(۳) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ، بحوالہ: مہان کوش: 903۔

(۴) راگ مالا کھنڈن: 7، وپراچین بیڑاں: 256۔

کے لئے امرتسر آئے تھے۔(۱)

گورو ارجن صاحب کی بانی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں مسلمانوں کے لئے محبت اور پیار کے جذبات تھے، آپ کا یہ قول گورو گرنتھ صاحب میں درج ذیل ہے :

مسلمان موم دل ہووے ، انتر کی مل دل تے دھووے
دنیا رنگ نہ آوے نیڑے ، جیوں کُسم پاٹ گھیو پاک ہرا(۲)

یعنی مسلمان نرم دل ہوتا ہے، وہ دل کے گناہوں کی گندگی دھوڈالتا ہے، دنیا کا رنگ اس کے نزدیک نہیں آتا جس طرح کُسبھہ اور گھی کا برتن صاف ہوتا ہے،......اس کے علاوہ گورو ارجن صاحب کا سکھ دھرم کے پوتر دھرم پستک گورو گرنتھ صاحب میں مسلمان بزرگ کے کلام کو درج کرنا اور سکھوں کا اس بانی کو بڑی عزت کے ساتھ پڑھنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ مسلمانوں کو بُری نگاہ سے نہ دیکھتے تھے؛ بلکہ ان کے دل میں مسلمان بھائیوں اور پیروں فقیروں کے لئے بے حد پیار تھا، اسی طرح مسلمان بھی آپ کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے، یہ بتایا گیا ہے کہ جہانگیر نے اپنی شہزادگی کے وقت بہت سی زمین گورو ارجن صاحب کی نذر کی تھی اور گورو صاحب نے اس زمین میں کرتار پور آباد کیا اور دھرم سالہ بھی بنائی، گیانی گیان سنگھ صاحب لکھتے ہیں کہ گورو صاحب کو کرتار پور آباد کرنے کی تحریک بھی ایک مسلمان سید عظیم خاں نے کی تھی۔(۳)

سکھ مؤرخ بتاتے ہیں کہ حکومت کی فوج کے حصہ لینے پر پہاڑی راجاؤں کا زور بڑھ گیا اور اس طرح گورو گوبند سنگھ جی پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ کے کئی سکھ بے دعویٰ لکھ کر چلے گئے، اس طرح گورو صاحب کو آنند پور چھوڑ کر ماچھی واڑے کے جنگلوں میں مسلمان حاجی کا لباس پہننا پڑا، اس وقت جن لوگوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو گورو صاحب کی سیوا کے لئے پیش کیا وہ غنی خاں اور نبی خاں دو مسلمان تھے، انھوں نے گورو صاحب کو پالکی میں بٹھالیا اور اس پالکی کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دوسری جگہ پہنچا دیا۔(۴)

سکھ مسلم تعلقات میں باہمی رواداری کی یہ چند مثالیں نمونے کے طور پر سامنے لائی گئی ہیں، پنجاب صوفیانِ کرام اور قابل قدر مذہبی رہنماؤں کی سرزمین ہے اور یہاں کی مٹی میں ایک دوسرے کے احترام کا جذبہ شامل ہے،

(۱) رسالہ خالصہ پارلیمنٹ گزٹ، اکتوبر 1956ء۔

(۲) مارومحلہ 5۔

(۳) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ: 131، بحوالہ: تواریخ گورو خالصہ: 715۔

(۴) سکھ مسلم اتحاد کا گلدستہ: 184، بحوالہ: گورو پرتاپ سورج گرنتھ ورت چھ، آنسو 48 وظفر نامہ سٹیک صفحہ ڈ ڈاوجیون کتھا: 35 وغیرہ۔

ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنا، اس کی سچائی کو جاننا ہر ایک کا فرض ہے؛ تاکہ باہمی تعلقات میں محبت کا رنگ اور زیادہ گہرا ہو جائے، جہاں تک مذہب کا مطالعہ ہے اس کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ :

1- ہم سب سے پہلے اس بات کا دل کی پوری گہرائی کے ساتھ یقین کریں کہ ہم سب کا پروردگار، ہمارا پالن ہار وہی ہے جس نے ہمیں اور اس کائنات کی ہر ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

2- پروردگار کی رحمت اور اپنی مخلوق کے ساتھ اس کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں وہ اپنے بندوں کی پرورش کا سامان کرے اس کے ساتھ مخلوق کے ساتھ اس کی محبت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جسم و جان کی پرورش کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کا بھی انتظام کرے، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اپنی اولاد کی پرورش کے ساتھ ان کو اچھی باتیں سکھانے کا بھی انتظام کرتے ہیں۔

3- ایک انسان تو کیا اگر دنیا کے سارے انسان مل کر بھی اپنے لئے ہدایت کا راستہ متعین کرنا چاہیں تو کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ راستہ صحیح ہوگا؛ کیوں کہ پروردگار علیم وخبیر ہے، تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، اس لئے اس نے انسان کو اندھیرے میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑا؛ بلکہ اس نے یہ ذمہ داری لی ہے کہ جس طرح جسم و جان کی پرورش کی ذمہ داری پروردگار کی ہے اسی طرح ہدایت کا راستہ دکھانے کی ذمہ داری بھی اسی کی ہے اور اس نے شروع سے یہ انتظام کیا ہوا ہے۔

4- مذہب یعنی ہدایت کا راستہ وہ ہے جو ہمارے سب کے پروردگار نے بنا کر بھیجا ہے، ہمارا کام اتنا ہے کہ ہم پوری طرح تحقیق کر لیں اور تسلی کر لیں کہ ہدایت کا یہ راستہ رب کا بنایا ہوا ہے یا نہیں؟ جب یہ ثابت ہو جائے کہ راستہ اسی کا بنایا ہوا ہے تو اب بس اس کے اوپر چلنا ہمارا فرض ہے؛ کیوں کہ وہ ہمارا مالک ہے اور ایک بندہ ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام ہے کہ ہم اپنے مالک کی فرماں برداری کریں۔

اس بنیادی اُصول کو سامنے رکھا جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہم صحیح راستہ پالیں گے ایک دوسرے کا احترام، رواداری، ہر ایک کی عزت کرنا یہی مذہب کی تعلیم ہے، مذہب محبت سکھاتا ہے، پیار سکھاتا ہے اور انسان کو آپس میں جوڑ کر ایک کنبہ بناتا ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

تیسرا باب

قرآن مجید اور جدید سائنس

قرآنِ مجید اور سائنس — اُصولی موقف

مولانا سید اسرار الحق سبیلی ⊙

قرآن مجید اور سائنس ایک ایسا موضوع ہے جس میں بعض اہل علم اور اسکالرس افراط وتفریط میں مبتلا رہے ہیں، قرآن کے بعض پر جوش حامی قرآنی آیات کی سائنسی انداز میں تشریح کرتے ہیں اور قرآن میں علم طب، کیمیا اور فلکیات وغیرہ کی جزئیات تلاش کرتے ہیں اور بعض ناقدین قرآن میں سائنسی نظریات سے متصادم باتوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں؛ اس لئے اس موضوع پر بصیرت، وسعت نظر، کشادہ قلبی اور مرعوبیت سے دور رہ کر سوچنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہئے کہ قرآن اور سائنس کا موضوع کیا ہے؟ قرآن کا موضوع انسان اور اس کی روحانی ترقی ہے؛ جب کہ سائنس کا موضوع مادہ اور اس کے عوارض ذاتیہ ہیں، مذکورہ ذیل آیات میں قرآن کے موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

> كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ، اللهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِينَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ، الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجاً أُولٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ . (ابراہیم:۱-۳)
>
> یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر نازل کیا ہے؛ تاکہ آپ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف یعنی اللہ غالب و قابلِ تعریف کے راستے کی طرف لائیں، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی ملکیت ہے اور بڑی خرابی ہے ان کافروں کے لئے جو دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں

⊙ لکچرار: گورنمنٹ جونیر کالج ظہیر آباد، اے پی۔

اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں، ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں۔

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ، مَا خَلَقْنَا السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى وَالَّذِينَ كَفَرُوْا عَمَّا أُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ . (الاحقاف:۲-۳)

یہ کتاب اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے نازل کی گئی ہے، ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے، حق کے ساتھ ایک متعین مدت کے لئے پیدا کیا ہے اور جو لوگ کافر ہیں، ان کو جس چیز سے ڈرایا جاتا ہے وہ اس سے بے رخی کرتے ہیں۔

قرآن انسان کے ظاہر اور باطن کی اصلاح کرتا ہے اور انسانی فطرت کو مسخ ہونے سے بچاتا ہے، تو ہم پرستی اور اندھی تقلید سے نکال کر حقیقت پسندانہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، دنیا کی چمک دمک اور شادابی پر ریجھنے کے بجائے آخرت کے دائمی عیش وعشرت کو حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے؛ جب کہ سائنس نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ روح کے بارے میں اسے کوئی ثابت شدہ چیز معلوم ہے؛ کیوں کہ سائنس کی بنیاد ہی مادہ پر ہے اور مادی طریقے سے جانچ پرکھ کر ہی سائنس کوئی فیصلہ کرتا ہے، سائنسی طریقۂ تحقیق کے پابند اہل دانش نے ہمیشہ روحانیت کے میدان میں دخل دینے سے گریز کیا ہے؛ کیوں کہ اس میدان میں کسی حقائق کے جاننے کے لئے قرآن وحدیث کے یقینی ذرائع کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا سائنسی علوم جیسے فلکیات، طبعیات، نفسیات، آبی وسائل، جغرافیہ، نباتیات، حیوانیات، میڈیکل سائنس، جنیٹک سائنس اور عمومی سائنس کے بارے میں ہمارا کیا نظریہ ہونا چاہئے؟ کیا جن آیات میں ان علوم کے بارے میں سرسری طور پر ذکر کیا گیا ہے، ان آیات کی تشریح مذکورہ سائنسی علوم ونظریات کی روشنی میں کرنا کیا قرآن کی بہتر خدمت ہوگی کہ جن علوم تک رسائی سائنس نے بہت تاخیر سے کی ہے، قرآن نے چودہ سو سال قبل ہی ان علوم سے واقف کرادیا تھا، گویا اس سے قرآن کی عظمت اور اس کے من جانب اللہ ہونے پر استدلال کیا جائے، علماء کے اکثریتی طبقہ نے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا ہے، ان میں مشہور مفسر قرآن سید قطب شہید، ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ، استاذ محمد شلتوت، استاذ محمد الصادق عرجون اور مولانا محمد تقی عثمانی اصحابِ علم وفضل وغیرہ ہیں۔

اس موضوع پر سید قطب شہید نے بہت تفصیلی بحث کی ہے، ان کی بحث کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے :

قرآن کوئی فلکیاتی، کیمیاوی اور طبی علوم کی کتاب نہیں ہے؛ جیسا کہ بعض لوگ قرآن میں ان علوم کی جزئیات تلاش کرتے ہیں، اس طرح کی کوشش قرآن کے مزاج، اس کے کردار اور میدان عمل کو نہ سمجھ سکنے کی دلیل ہے، قرآن کا میدان نفس انسانی اور حیات انسانی ہے، قرآن کا کام یہ ہے کہ کائنات کے وجود کا عام تصور پیدا کرے، انسان کو اس کے خالق سے جوڑے اور اس تصور کی بنیاد پر ایک ایسا نظام حیات قائم کرے جو انسان کے لئے تمام طاقتوں کو اپنی گرفت میں لینے کے قابل بنائے، ان طاقتوں میں ایک اہم طاقت عقلی طاقت ہے، جو صحیح طور پر پروان چڑھنے سے اور سائنٹفک تحقیق، تجربہ، تطبیق اور ممکنہ انسانی کوشش کے ذریعہ سے آزادانہ سرگرم عمل ہوتی ہے اور کسی نتیجہ پر پہنچتی ہے جو کسی طور آخری اور قطعی نہیں ہوتی ہے۔

قرآن اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل کتاب ہے اس کا موضوع مذکورہ تمام علوم سے زیادہ وقیع ہے؛ کیوں کہ یہ موضوع انسان کی ذات ہے جو ان علوم کا اکتشاف کرتی ہے اور ان سے استفادہ کرتی ہے اور بحث، تجربہ اور تحقیق انسانی عقل کے خواص ہیں، قرآن انسانی ذات، اس کی شخصیت، اس کے ضمیر اور اس کی عقل وفکر کی تعمیر کرتا ہے، نیز وہ ایسے انسانی معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جو انسان کو اس کے اندر ودیعت کردہ قوتوں کو سلیقے سے استعمال کا پورا پورا موقع دے، قرآن انسان کو تفتیش و تجربہ کے لئے آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ وہ علم اور تحقیق کے میدان میں اپنی صلاحیت کے مطابق غلطی بھی کرسکتا ہے اور صحیح نتیجہ تک بھی پہنچ سکتا ہے؛ البتہ قرآن نے صحیح غور وفکر اور تصور کا پیمانہ مقرر کیا ہے۔

آگے سید قطب شہید لکھتے ہیں :

یہ بات جائز نہیں ہوگی کہ قطعی حقائق جن کا ذکر قرآن کائنات کے مزاج، خالق سے اس کے تعلق اور اجزاء کائنات کے باہمی ربط کے بارے میں صحیح تصور قائم کرنے کے لئے کرتا ہے، ان کو ہم انسانی مفروضات اور نظریات کا پابند کردیں، یہ طریقہ تو ہمیں ان سائنٹفک حقائق کے بارے میں بھی اختیار نہیں کرنا چاہئے، جن تک انسان اپنے خیال میں قطعی تجربہ کے طریقہ سے پہنچا ہے۔ (فی ظلال القرآن: ۹۵/۲-۹۹)

ڈاکٹر محمد بن لطفی الصباغ نے لکھا ہے کہ عام قرآنی اشارات کو جدید تغیر پذیر سائنسی نظریات سے جوڑ دینا تفسیری اُصول کے مطابق غلط ہے اور یہ تین بنیادی غلط طرزِ فکر کا نتیجہ ہے :

۱- داخلی شکست خوردگی کا احساس جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ سائنس اصل ہے اور قرآن اس کے تابع ہے، اس بنا پر وہ لوگ قرآن کو سائنس سے ثابت کرنے اور اس سے استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ جب کہ قرآن اپنے موضوع میں مکمل اور اپنے حقائق میں قطعی ہے اور سائنس کے موضوع کا حال یہ ہے کہ جس چیز کو اس نے کل ثابت کیا، آج اسے رد کر دیتا ہے اور جس نظریہ تک وہ پہنچتا ہے وہ نہ آخری ہوتا ہے اور نہ مطلق۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کے مزاج اور اس کے وظیفہ عمل کے بارے میں غلط فہمی ہے، قرآن آخری اور قطعی حقیقت ہے، جس کا مقصد انسان کی ایسی تعمیر ہے جو کائنات اور قوانین الٰہی سے ہم آہنگ ہو؛ تا کہ انسان اپنے اطراف پھیلی ہوئی کائنات سے ٹکرانے کے بجائے اس کی تصدیق کرے اور اس کے بعض اسرار سے واقف ہو جائے اور اس کے بعض قوانین کو اپنے کارِ خلافت میں استعمال کرے۔

۳- تیسری بات یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کی تکلف اور کھینچ تان کر ہر بار نئی تاویل کی جاتی ہے؛ تا کہ ان مفروضات و نظریات سے ان کی مطابقت ثابت کی جائے جو ناپائیدار اور غیر مستقل ہیں اور جن میں نئے اضافہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

یہ تینوں ہی باتیں قرآن کریم کی عظمت کے شایانِ شان نہیں ہیں۔(۱)

اس موضوع پر مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے، ان کا بھی نقطۂ نظر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں گمراہی کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کے موضوع کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھتے اور اس میں وہ باتیں تلاش کرتے ہیں جو اس کے موضوع سے خارج ہیں، جیسے بعض حضرات اس جستجو میں رہتے ہیں کہ قرآن مجید سے کائنات کے تمام سائنسی اور طبعی حقائق مستنبط کئے جائیں اور سائنس کے مسلمات کو قرآن سے ثابت کیا جائے؛ چنانچہ وہ پورے خلوص کے ساتھ سائنسی تحقیقات کو قرآنی آیات سے ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور بسا اوقات اس غرض کے لئے قرآنی الفاظ کو غلط معنی پہنا دیتے ہیں؛ حالاں کہ قرآن کا اصل موضوع سائنس نہیں ہے؛ اس میں اگر کہیں کائنات کے حقائق کا ذکر آیا تو ضمنی طور پر آیا ہے؛ لہٰذا اگر اس میں کہیں کوئی سائنسی حقیقت واضح طور پر مل جائے تو اس پر بلاشبہ ایمان رکھنا چاہئے؛ لیکن سائنس کا کوئی مسئلہ پہلے سے ذہن میں رکھ کر قرآن کریم سے اسے زبردستی نکالنے کی کوشش ایسی ہی ہے، جیسے کوئی شخص قانون کی کتاب میں طب کے مسائل تلاش کرنے لگے۔(۲)

(۱) لمحات فی علوم القرآن: ۲۹۷۔ (۲) علوم القرآن: ۳۸۶-۳۹۳۔

اس تفصیل سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں :

(۱) سائنس کو اصل مان کر قرآن کی تشریح سائنسی افکار کے مطابق کرنا درست نہیں ہے۔

(۲) قرآنی آیات کے مفہوم کو توڑ مروڑ کر اور بہ تکلف کسی سائنسی نظریہ کو ثابت کرنا درست نہیں ہے۔

(۳) سائنس کا جو مسئلہ متفق نہ ہو اور اس میں اختلاف ہو یا اختلاف کی گنجائش ہو ایسے مسئلہ کو قرآنی آیات سے ثابت کرنے کی کوشش درست نہیں ہے۔

کیوں کہ یہ باتیں قرآن کی عظمت اور قرآن کی بہت سی آیات کے منافی ہیں :

۱- ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْهِ . (البقرۃ:۲)

یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

۲- لاَ تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللهِ . (یونس:۶۴)

اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

۳- افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر الله لوجدوا فیه اختلافا کثیرا .

کیا وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔

۴- اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ، وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ . (الطارق:۱۳-۱۴)

یہ ایک فیصلہ کن کلام ہے، کوئی مذاق نہیں ہے۔

۵- اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ . (الحجر:۹)

ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ ہیں۔

۶- وَمَا یَتَّبِعُ اَکْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنّاً اِنَّ الظَّنَّ لاَ یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئاً . (یونس:۳۶)

ان میں سے اکثر لوگ گمان پر چلتے ہیں اور گمان حق کے مقابلہ میں کوئی کام نہیں آتا۔

البتہ ان سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ قرآن سے سائنس کا کوئی مسئلہ اخذ کرنا علی الاطلاق جرم ہے، یا سائنسی اکتشافات سے استفادہ کرنا، یا کائنات وحیات سے مطالق سائنسی اکتشافات سے فہم قرآن میں مدد لینا درست نہیں ہے؛ جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

سَنُرِیْهِمْ آیَاتِنَا فِی الْآفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ . (حم السجدۃ:۵۳)

ہم عنقریب ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھائیں گے
اور خود ان کی ذات میں بھی، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ قرآن حق ہے۔

اس آیت کا تو تقاضہ ہے کہ آفاق و انفس سے متعلق تمام سائنسی اکتشافات پر ہم غور کریں اور ان کے ذریعہ قرآن کے مفہوم کی توسیع کریں؛ لیکن یہ کیسے ممکن ہے جب کہ قطعی نصوص کو ایسے مفاہیم کا پابند بنانا لازم آتا ہے جو نہ قطعی ہیں اور نہ آخری؟ اس کو مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے، اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيراً . (الفرقان:۲)

اور ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا۔

اب سائنسی تحقیقات یہ انکشاف کرتی ہیں کہ اس کائنات میں بڑی باریکی کے ساتھ ہم آہنگی اور نظم و ضبط پایا جاتا ہے، زمین کی موجودہ ہیئت، سورج اور چاند کا زمین سے مناسب فاصلہ پر ہونا، سورج، چاند اور زمین کے حجم میں مخصوص نسبتوں کا پایا جانا، زمین کی حرکت کی مخصوص رفتار، پھر اس کا اپنے محور پر ایک خاص حد تک جھکا ہونا اور زمین کی سطح کی مخصوص نوعیت، اس طرح کی ہزاروں خصوصیات ہیں جو زمین کو زندگی کے لئے سازگار بنائے ہوئے ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی ایک عارضی حادثہ اور اتفاقی امر قرار نہیں دیا جا سکتا، جس کے پیچھے کوئی مقصد نہ ہو۔

یہ تحقیقات مذکورہ آیت کے معنی میں وسعت پیدا کرتی ہیں اور ہماری فکر میں گہرائی پیدا کرتی ہیں؛ لہٰذا ان جیسی تحقیقات کے تتبع میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ جائز اور مطلوب ہے۔

اسی طرح یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ قرآنی احکام میں جس حکم کی بابت کسی کو اعتراض ہو اور اس حکم کی حکمت و مصلحت سائنسی نقطۂ نظر سے بھی واضح ہو سکتی ہو تو سائنٹفک انداز میں اس حکمت کو واضح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ قرآن کی آیت :

فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاء أَن تَضِلَّ إْحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الأُخْرَى . (البقرۃ:۲۸۲)

پھر اگر مرد گواہ میسر نہ ہو تو ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو؛ تاکہ ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

جس پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں ایک عورت کو نصف درجہ دیا گیا ہے، اس کی سائنسی وجہ حالیہ تحقیق سے سامنے آئی ہے کہ چند مردوں اور عورتوں کے دماغ پر تحقیق کی گئی تو دیکھا گیا کہ مرد کا دماغ ایک ہی رخ پر پوری توجہ مرکوز کرتا ہے، جب کہ عورت کا دماغ کئی رُخوں پر متوجہ رہتا ہے، اس تحقیق سے یہ بات

واضح ہوتی ہے کہ کسی واقعہ کو مرد نے پوری توجہ سے ذہن نشیں کیا ہو جب کہ عورت سے اس بات کا امکان ہے کہ اس نے واقعہ کو پوری طرح ذہن نشیں نہیں کیا ہو، تو اس کمی کو دوسری عورت پوری کر سکتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

لیکن جو چیز ناجائز اور علمی اعتبار سے درست قرار دی جا سکتی اس کو دوسری مثال سے سمجھا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِيْنٍ . (المومنون:۱۲)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔

اس آیت کے ضمن میں اگر والاس اور ڈارون کا نظریۂ ارتقاء پیش کیا جائے کہ زندگی ایک خلیہ کی صورت میں شروع ہوئی اور اس کا نشو و نما پانی میں ہوا، پھر یہ خلیہ بتدریج ترقی کرتا ہوا انسان کی تخلیق پر ختم ہوا، اگر ہم اس آیت سے اس نظریہ کو ثابت کرنے لگیں کہ قرآن بھی یہی کہتا ہے تو یہ غلط بات ہوگی۔(۱)

اسی طرح مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ جس وقت سائنس کی دنیا میں یہ نظریہ مشہور رہا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور دوسرے سیارے اس کے گرد حرکت کرتے رہتے ہیں، تو کچھ لوگوں نے اس نظریہ کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس آیت سے استدلال کیا: ''أَمَّن جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَاراً ''(النمل :۶۱)''یا وہ ذات جس نے زمین کو جائے قرار بنایا''۔

پھر جب سائنس نے زمین کے ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو کچھ حضرات کو یہ نظریہ بھی قرآن سے ثابت کرنے کی فکر لاحق ہوئی اور یہ آیت تائید میں پیش کی :

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ . (النمل:۸۸)

اور تم پہاڑ کو جامد دیکھ رہے ہو وہ (قیامت کے دن) بادلوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔

جب کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اللہ نے زمین کو جائے قرار بنایا ہے اور اس پر انسان اطمینان وسکون سے رہتا ہے، اگر زمین ہلتی رہتی تو زمین پر انسان کے لئے رہنا بہت مشکل ہو جاتا، جیسا کہ بس یا ٹرین کے سفر میں دشواری پیش آتی ہے اور دوسری آیت میں قیامت کی حالت بیان کی گئی ہے کہ جو پہاڑ اپنی جگہ ساکن نظر آتے ہیں قیامت کے دن ہلکے بادلوں کی طرح فضاء میں اُڑتے نظر آئیں گے، حقیقت یہ ہے کہ زمین کی حرکت اور سکون کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔(۲)

(۱) لمحات فی علوم القرآن:۲۹۷-۲۹۹۔ (۲) علوم القرآن:۳۹۳-۳۹۴۔

اسی طرح قرآن میں ہے :

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا . (یٰسین:۳۸)

اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔

اس آیت سے صرف ایک حقیقت سامنے آتی ہے کہ سورج حرکت کرتا ہے، جب کہ سائنسی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سورج اپنے اطراف ستاروں کی نسبت سے تقریباً بارہ میل فی سکنڈ رفتار سے حرکت کرتا ہے؛ لیکن وہ جس کہکشاں کا ایک ستارہ ہے، اس پوری کہکشاں سمیت ایک سوستر میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتا ہے؛ لیکن فلکیات کی یہ تحقیق قرآن کا عین مطلب قرار نہیں دی جاسکتی ، یہ اضافی حقیقت آخری اور قطعی نہیں ہے ؛ بلکہ قابل ترمیم وتردید ہے ، یہاں آیت سے صرف ایک حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سورج حرکت کرتا ہے اور اس حقیقت کو سائنسی تحقیق کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔(۱)

اسی طرح قرآن کا ارشاد ہے :

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا . (الانبیاء:۳۰)

کیا ان کافروں کو معلوم نہیں ہے کہ آسمان اور زمین پہلے بند تھے پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ زمین سورج ہی کا ایک ٹکڑا تھی جو اس سے الگ ہوگئی ہے، اب اگر کوئی اس آیت کو لے کر کہے کہ یہی بات قرآن میں کہی گئی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب وغیرہ نے کہی ہے کہ بگ بینگ کے نظریہ کے مطابق ابتدا میں یہ ساری کائنات ایک بڑی کمیت کی شکل میں تھی ، پھر ایک عظیم دھماکہ یعنی بگ بینگ ہوا، جس کا نتیجہ کہکشاؤں کی شکل میں ظاہر ہوا، پھر یہ کہکشائیں تقسیم ہوکر ستارے، سیارے، سورج، چاند اور زمین وغیرہ کی صورت میں آئیں۔(۲)

زمین کے آغاز کے بارے میں سائنٹفک ثبوت کے اعتبار سے اسی پایہ کہ دوسرے نظریات بھی موجود ہیں ؛ جب کہ قرآن کی قطعی حقیقت صرف اتنا متعین کرتی ہے کہ زمین آسمان سے الگ ہوئی ، یہ کیسے ہوا؟ وہ آسمان کیا چیز ہے جس سے وہ الگ ہوئی ؟ آیت ان باتوں سے کوئی تعرض نہیں کرتی ، اس لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ اس مسئلہ میں کسی ایک سائنٹفک مفروضہ کے بارے میں کہا جائے کہ وہی آیت کا آخری مفہوم ہے۔(۳)

---

(۱) لمحات فی علوم القرآن:۲۹۹۔ (۲) ڈاکٹر ذاکر نائیک، قرآن اور سائنس:۲۲۔

(۳) سید قطب شہید، قرآن اور سائنس:۳۴۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی مذکورہ کتاب کے مترجم علیم احمد کراچی نے مصنف کی اس غلطی کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے کہ مذکورہ سطور میں محترم مصنف بھی اسی غلط فہمی کا شکار نظر آتے ہیں، جو ابتداء کائنات کے حوالہ سے عام لوگوں میں پائی جاتی ہے، سائنسی حقائق اس کے برعکس ہیں، درحقیقت ابتداء کائنات کا لمحہ سائنس دانوں کے لئے آج بھی اتنا ہی پریشان کن ہے جتنا کہ آج سے ۸۰ برس پہلے تھا، جب بگ بینگ کا تصور نیا نیا متعارف ہوا تھا، اس ضمن میں تقریباً درجن بھر متبادل نظریات موجود ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی اب تک قبولیت عام یا ماہرین کونیات کا عمومی اتفاق رائے حاصل نہیں ہوسکا، اسی طرح مترجم نے مصنف کی فلکیات وکونیات سے متعلق بیانات کو تسلیم شدہ سائنسی وتاریخی حقائق سے متصادم قرار دیا ہے۔(۱)

ان تصریحات سے یہ بات تقریباً واضح ہوجاتی ہے کہ قرآنی آیات کی سائنسی انداز میں تشریح بہت حساس اور ذمہ دارانہ موضوع ہے، جو دو دھاری تلوار سے کم نہیں، اس میں ذرہ برابر کوتاہی غیر مسلموں میں قرآن کی مخلصانہ تبلیغ کی کوشش نفع بخش اور شبہات واشکالات کو ختم کرنے کے بجائے مزید شکوک وشبہات کو جنم دے سکتی ہے۔

پوری بحث کا خلاصہ

☆ قرآن اور سائنس کا موضوع الگ الگ ہے؛ اس لئے بلاضرورت ایک کو دوسرے سے جوڑنا مناسب نہیں ہے۔

☆ قرآن کی باتیں قطعی اور آخری حقیقت ہیں؛ بلکہ سائنس کی باتیں ظنی اور قابل تبدیل ہیں۔

☆ سائنس کو اصل مان کر سائنس کی روشنی میں قرآن کی تشریح کرنا درست نہیں ہے۔

☆ قرآن نے جو حقیقت بیان کی ہے، سائنسی تحقیقات سے اس پر اضافہ کرنا اور اس کو قرآن کا مطلوب قرار دینا درست نہیں ہے۔

☆ قرآنی حقیقت کو اصل مان کر سائنس کی روشنی میں اس کے معنی کی توسیع وتشریح کی جاسکتی ہے۔

☆ قرآنی احکام کی حکمت ومصلحت اگر سائنس سے واضح ہورہی ہو تو اس کو بیان کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے: عرض مترجم، قرآن اور سائنس از: ڈاکٹر ذاکر نائیک، مطبوعہ اسلامک بک سروس، دریا گنج نئی دہلی، ۲۰۰۸ء۔

قرآنِ مجید اور سائنسی تحقیقات

مولانا عبدالباسط ندوی ⊙

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی ایک محکم و مستند کتاب ہے، اس کے من عنداللہ ہونے میں ذرہ برابر شبہ کی گنجائش نہیں، آج بھی اس کا ایک ایک حرف اپنی اصلی حالت پر برقرار ہے اور جس طرح اس کے الفاظ اپنی اصلی حالت پر ہیں ویسے ہی اس کے معانی میں بھی کسی طرح کی تبدیلی یا ردو بدل ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمائی اور اس کا اصل موضوع انسان ہے؛ چنانچہ قرآن کریم نے کہا :

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیَ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ . (البقرۃ:۱۸۵)

ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا ہے، وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور (اس میں) کھلے ہوئے (دلائل ہیں) ہدایت اور (حق و باطل میں) امتیاز کے۔

کہیں ارشاد ہوا :

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ . (البقرۃ:۲)

یہ کتاب (کہ) کوئی شبہ اس میں نہیں، ہدایت ہے (اللہ سے) ڈرر کھنے والوں کے لئے۔

کہیں :

وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ . (البقرۃ:۹۷)

اور (یہ کلام) ہدایت ہے اور ایمان والوں کے لئے خوشخبری ہے۔

اور کہیں کہا :

هَـٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ . (آل عمران:۱۳۸)

یہ ایک اعلان ہے (سارے) لوگوں کے لئے اور ڈرنے والوں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے۔

⊙ استاذ: المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء، پھلواری شریف، پٹنہ۔

نیز قرآن کریم سے قبل جتنی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں، ان سب کا موضوع بھی انسان ہی رہا اور انسان کی ہدایت ہی رہی، قرآن کریم نے تورات وانجیل کا ذکر کرتے ہوئے کہا :

وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ ، مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ . (آل عمران:۳-۴)

اور اس نے اُتارا تھا توریت اور انجیل کو (اس سے) پیشتر لوگوں کی ہدایت کے واسطے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ . (المائدة:۴۴)

بے شک ہم ہی نے توریت نازل کی ہے، جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔

غرضیکہ آسمانی کتابوں اور خصوصاً قرآن کریم کا اصل موضوع انسان ہے اور اس کی ہدایت ہے؛ چوں کہ انسان کے دائرہ کار میں ایسے علوم وفنون بھی شامل ہیں، جن کی انسان کو ضرورت ہے اور وہ اس سے اپنا اشتغال رکھتا ہے، اس لئے قرآن کریم نے جگہ جگہ ایسی چیزوں کا بھی تذکرہ کیا ہے؛ لیکن اس کا تذکرہ اسی مفہوم میں ہے کہ انسان اصل تو قرآن کریم کو قرار دے اور دوسرے علوم کو اس پر پرکھے اور جانچے، اگر وہ اس کے مطابق ہے تو درست قرار دے اور اگر ان کے خلاف ہے تو قرآن کریم کی تاویل وتوجیہ کے بجائے ان علوم وفنون کو غلط سمجھے اور اس کی از سر نو تحقیق کرے، قرآن کریم کو چھوڑ کر دوسرے علوم یا دوسری چیزوں کے ذریعہ راہ راست کی تلاش کرنا سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں۔

امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب جامع ترمذی میں حضرت علیؓ کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک کے ذریعہ قرآن کریم کا تعارف یوں نقل فرمایا ہے :

كتاب الله فيه نبأ ما قبلكم ، وخبر ما بعدكم ، وحكم ما بينكم ، وهو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ، ومن ابتغى الهدى في غيره أضله الله ، وهو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، وهو الصراط المستقيم ، هو الذي لا تزيغ به الأهواء ، ولا تلتبس به الألسنة ، ولا تشبع منه العلماء ، ولا يخلق عن كثرة الرد ، ولا تنقضي عجائبه ، هو الذي لم تنته الجن إذ سمعته حتى قالوا " إنا سمعنا قرآنا عجبا يهدي إلى الرشد فآمنا به " من قال به صدق ، ومن عمل به أجر ، ومن حكم به عدل ، ومن دعا إليه هدى إلى صراط مستقيم .(۱)

(۱) سنن ترمذی، باب ماجاء فی فضل القرآن، حدیث نمبر:۲۹۰۶۔

یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے واقعات ہیں، تمہارے بعد پیش آنے والے حالات بھی بیان کردیئے گئے ہیں، تمہارے درمیان اس کی حیثیت حکم کی ہے، یہ دوٹوک اور ٹھوس حقائق پر مبنی باتوں کا مجموعہ ہے، کوئی دل لگی اور تفریحی بات نہیں، جوکوئی سرکش اس کو چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اس کی کمر توڑ کر رکھ دے گا اور جوکوئی اسے چھوڑ کر کہیں اور ہدایت طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہی میں چھوڑ دے گا، یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، یہ ذکر حکیم ہے، صراط مستقیم ہے، یہ وہ کتاب ہے جس کو خواہشات نہیں چلاتیں اور جس کے پڑھنے سے زبانیں گڈمڈ نہیں ہوتیں، علماء کو کبھی اس سے سیری نہیں ہوتی، بار بار پڑھنے کے باوجود یہ کلام پرانا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے عجائب ختم ہوتے ہیں، اس کی آیات کو سن کر جنات بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں (ہم نے عجیب وغریب تلاوت سنی، وہ راہ حق کی طرف رہنمائی کرتی ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے) ان آیات سے جو استدلال کرے وہ سچا ہے اور جو ان پر عمل کرے اس کو اجر سے نوازا جائے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے وہ انصاف ور ہوگا اور جو اس کی طرف دعوت دے اس کو سیدھا راستہ دکھایا جائے گا، (اس حدیث کی سند اگرچہ قوی نہیں ہے، مگر مفہوم کے اعتبار سے درست ہے)۔

سید قطب شہیدؒ ''فی ظلال القرآن'' میں لکھتے ہیں :

إن مادة القرآن التي يعمل فيها هي الانسان ذاته، تصوره واعتقاده، ومشاعره ومفهوماته، وسلوكه واعماله، وروابطه وعلاقاته. (البقرة:۱۸۹)

قرآن کا موضوع خود انسان ہے، اس کا تصور و اعتقاد اس کا شعور و ادراک، اس کا رویہ اور طرز عمل اور اس کے تعلقات روابط۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

لقد كان القرآن بصدد إنشاء تصور خاص، ونظام خاص، ومجتمع خاص، كان بصدد إنشاء أمة جديدة في الأرض، ذات دور خاص في قيادة البشرية، لتنشئ نموذجا معينا من المجتمعات غير مسبوق، ولتعيش حياة نموذجية خاصة غير مسبوقة، ولتقرّ قواعد هذه الحياة في الارض، وتقود إليها الناس. (۱)

(۱) فی ظلال القرآن: ۱/۱۸۱۔

> قرآن کریم ایک مخصوص تصور، ایک مخصوص نظام اور ایک مخصوص سماج پیدا کرنا چاہتا تھا، وہ زمین میں ایک نئی اُمت برپا کرنے آیا، جسے انسانیت کی رہنمائی کا ایک خاص کردار ادا کرنا تھا؛ تاکہ یہ اُمت سماج کا ایک مخصوص نمونہ پیش کرے، جو اس سے پہلے کبھی نہیں پیش کیا جا سکا تھا اور ایک ایسی زندگی گزار کر دکھلائے جو اس سے پہلے کبھی نہیں گزاری تھی اور اس طرح اسی طرز زندگی کے اُصول زمین میں قائم کر جائے اور انسانوں کو اس کی طرف لے آئے۔

چنانچہ قرآن کریم کا اصل موضوع تو انسان کی ہدایت ہی ہے؛ البتہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہدایت سمجھنے کے لئے عقل وشعور سے نوازا اور قرآن کے ذریعہ اس عقل کو بروئے کار لانے اور اپنی بساط بھر استعمال کرنے کا بھی حکم دیا، مگر عقل کو حکم وفیصل نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں :

> **المنهج الصحيح في التلقي عن الله ، هو ألا يواجه العقل مقررات الدين الصحيحة — بعد أن يدرك المقصود بها — بمقررات له سابقة عليها ، كونها لنفسه من مقولاته " المنطقية " أو من ملاحظاته المحدودة ، أو من تجاربه الناقصة ، إنما المنهج الصحيح أن يتلقى النصوص الصحيحة ، ويكون منها مقرراته هو ، فهي أصح من مقرراته الذاتية ، ومنهجها أقوم من منهجه الذاتي قبل أن يضبط بموازين النظر الدينية الصحيحة — ومن ثم لا يحاكم العقل مقررات الدين متى صح عنده أنها من الله — إلى أية مقررات أخرى من صنعه الخاص !**

> اللہ تعالیٰ سے (ہدایت) اخذ کرنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ عقل دین کے ثابت شدہ حقائق کے مفہوم کو ٹھیک طور پر سمجھ لینے کے بعد ان کے مقابلے میں اپنی طرف سے طے کئے ہوئے کچھ حقائق لائے جنھیں اس نے منطقی مقدمات سے ترتیب دیا ہو، جو اس کے محدود مشاہدات اور ناقص تجربات کا نتیجہ ہوں، صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ ثابت نصوص کو لے اور ان کی روشنی میں اپنے اُصول کو ترتیب دے؛ کیوں کہ یہ نصوص اس

کے اپنے اُصول سے زیادہ صحیح ہیں اور ان کا طریقہ اس کے ذاتی طریقے سے زیادہ درست ہے، وہ ذاتی طریقہ جسے صحیح دینی غور وفکر کے معیاروں کی روشنی میں نہ ترتیب دیا گیا ہو، معلوم ہوا کہ عقل دین کے ثابت شدہ حقائق کو جانچنے کے لئے اپنے وضع کردہ اُصول کو معیار نہیں بنا سکتی۔

إن العقل ليس إلها ، ليحاكم بمقرراته الخاصة مقررات الله ، إن له أن يعارض مفهوماً عقلياً بشرياً للنص بمفهوم عقلي بشري آخر له ، هذا مجاله ، ولا حجر عليه في هذا ، ولا حجر مادام هنالک من الأصول الصحيحة مجال للتأول والأفهام المتعددة .(۱)

عقل خدا نہیں ہے کہ اپنے بنائے ہوئے اُصول کو معیار بنا کر اللہ کے دیئے ہوئے اُصول کو جانچے، بلا شبہ عقل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی نص سے سمجھے ہوئے ایک انسانی مفہوم کے مقابلہ میں دوسرا مفہوم پیش کرے، ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ اس سلسلہ میں عقل پر کوئی پابندی عائد کی جاسکتی ہے؛ بشرطیکہ صحیح اُصول کی بنیاد پر اس کی گنجائش موجود ہو کہ اس نص کی متعدد تاویلیں کی جاسکیں۔

چنانچہ ان علمی اکتشافات اور نئے علوم وفنون سے فائدہ اُٹھاتے وقت یہ پیش نظر ضرور رہنا چاہئے کہ ہماری معلومات کا ذریعہ عقل ہے اور عقل غلط بھی کرسکتی ہے اور صحیح بھی اس لئے اس سلسلہ میں ایسی چیز کو کسوٹی اور معیار قرار دیا جائے، جس کے غلط ہونے کا ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہو اور وہ صرف اور صرف اللہ کی کتاب قرآن کریم ہی ہے۔

اس لئے ہماری نئی تحقیق اگر قرآن کے بتائے ہوئے اُصول کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ ہے تو بلا تکلف ہم اس کی تائید کرتے ہیں؛ لیکن اس میں ٹکراؤ اور تضاد کی شکل پائی جاتی ہے تو پھر ہم بلا کسی تردد کے قرآن کی حقانیت وصداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور نئی تحقیق کی تغلیط کرتے ہیں، یہ نئے علوم جنھیں ہم سائنس سے تعبیر کرتے ہیں بلا شبہ انسانی علوم ہی کی ایک شاخ ہیں اور کائنات کے نظام کی جملہ چیزوں کی معرفت آہستہ آہستہ انسان کو ہوتی رہے گی، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی زبان میں ''و علم آدم الأسماء كلها ''میں ''كلها '' کی تصریح سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ تکوینی سلسلہ میں معرفت اشیاء ساری کی ساری انسان کو ہوکر رہے گی اور اسی لئے علوم کے سلسلہ میں ابھی اسے بے شمار منزلیں طے کرنا ہیں۔(۲)

---

(۱) فی ظلال القرآن:۲/۸۰۷، النساء:۱۶۵۔ (۲) تفسیر ماجدی:۱/۱۰۰، البقرۃ:۳۱۔

چنانچہ سائنس کی رسائی ان علوم کے سلسلے میں جن کا تذکرہ قرآن کریم نے کیا ہے، جہاں تک ہوئی ہے اور آج کی دنیا میں عقل اسی کی تائید بھی کرتی ہے تو اگر وہ قرآن کے بتائے ہوئے نظریات سے متفق ہے تو بلاشبہ یہ خود قرآن کریم کے من عند اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے کہ جن نظریات تک رسائی علوم کے اتنے مراحل طے کرنے کے بعد آج ہوئی، قرآن کریم نے ایسے زمانہ میں اس کو بیان کیا جب کہ انسانی ذہن و دماغ کو ان علوم کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، قرآن کریم نے دو سمندروں کے آپس میں ملنے کے باوجود دونوں کے مزہ میں فرق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ :

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخاً وَحِجْراً مَّحْجُوْراً . (الفرقان:۵۳)

اور وہ وہی (اللہ) ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا، ایک شیریں و تسکین بخش ہے اور ایک کھاری اور تلخ ہے اور ان کے درمیان ایک حجاب اور مانع قوی رکھ دیا۔

سورۂ فاطر میں فرمایا :

وَمَا يَسْتَوِيْ الْبَحْرَانِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ . (فاطر:۱۲)

اور دونوں دریا برابر نہیں ایک تو شیریں پیاس بجھانے والا ہے اور ایک شور تلخ ہے۔

اور سورۂ رحمٰن میں ہے :

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ . (الرحمٰن:۱۹-۲۰)

اسی نے دو دریاؤں کو ملایا کہ باہم ملے ہوئے ہیں ان دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے کہ دونوں بڑھ نہیں سکتے۔

مشہور فرانسیسی ماہر سمندریات ژاک کسٹو (Jack Cousto) نے جب اپنی تحقیق و جستجو سے اس خصوصیت کا پتہ لگایا تو اس نے اپنی تحقیق کو حیرت انگیز انکشاف قرار دیا؛ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی متعدد آیتوں نے بہت پہلے ہی اس کو بیان کر دیا ہے تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ یہ ان کے ایمان لانے کا ذریعہ بن گیا۔

اسی طرح ڈاکٹر آرتھر ایلیسن نے جب اپنے علمی و تحقیقی کام کے دوران قرآن کریم کی اس آیت :

اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضَى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَى إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى إِنَّ فِيْ ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ . (الزمر:۴۲)

اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور ان جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت، پھر ان جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعاد معین تک کے لئے رہا کر دیتا ہے، اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے کے عادی ہیں دلائل ہیں۔

تک پہنچے تو ان کی حیرت کی انتہاء نہ رہی اور کہنے لگے کہ ''جس موضوع پر میں سالہا سال سے عرق ریزی کر رہا ہوں، قرآن نے اس سے متعلق حقیقتیں اپنے حسین اور دلکش پیرائے میں بہت عرصہ قبل بیان کر دی ہیں'' ان کے تحقیقی کام کا موضوع تھا ''موت اور نیند کا قریبی تعلق'' انھوں نے اس موضوع سے متعلق انسانی دماغ پر عصر حاضر کی جدید مشینوں اور الکٹریکل آلات سے تجربات کئے اور اسی دوران دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کا مطالعہ کیا؛ لیکن جب قرآن کریم کی اس آیت پر ان کی نظر پڑی اور اپنے تجربات کے نتائج کو جب انھوں نے قرآن کی روشنی میں دیکھا تو بے حد متاثر ہوئے اور یہ ان کے ڈاکٹر آرتھر ایلیس سے ڈاکٹر عبداللہ بننے کا ذریعہ بن گئی، گویا قرآن کریم ان کی اپنی ریسرچ کا گواہ اور عینی شاہد بن گیا، جس تحقیق پر انھوں نے برسہابرس کام کیا، انھوں نے اپنی اس تحقیق کو ان الفاظ میں پیش کیا ''ہم سائنسی تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب کوئی شخص سوجاتا ہے تو کوئی چیز اس کے جسم سے نکل جاتی ہے اور جب واپس آجاتی ہے تو وہ بیدار ہو جاتا ہے اور جب وہ نہیں آتی ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے، یہی وہ نکات ہیں جو قرآن نے صراحت کے ساتھ بیان کئے ہیں'' انھوں نے زور دیا کہ مغربی دانشوں اور سائنس دانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن اور اسلام کو طبی اور سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھیں، انھوں نے اپنے پرجوش پیغام میں مغربی سائنس دانوں سے اپیل کی ہے کہ ''وہ اسلام کی عالمگیر صداقتوں پر ایمان لے آئیں، جو عقل وفکر، استدلال اور ذہانت کا سبق دینے کے ساتھ ساتھ جذبات کی تسکین اور روحانی تشنگی کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بھی فراہم کرتا ہے، انھوں نے مزید کہا کہ قرآن سائنس کو رد نہیں کرتا؛ بلکہ اس کی تائید وتوثیق کرتا ہے، اور یہ کہ اگر کہیں گاہے بگاہے ایسا شائبہ بھی آجائے تو وہ سائنس کے ناقص ہونے کی دلیل ہے اور اس مخصوص شعبہ میں کام کرنے کی ضرورت ہے، مگر قرآن کی آفاقی عظمت اور بزرگی بہر حال مسلم ہے''۔(۱)

ان کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جو کائناتی نظام اور تکوینی اُمور کی طرف توجہ دلاتی ہیں، مثلاً تخلیق انسانی سے متعلق سورہ المومنون کی یہ آیتیں :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِيْنٍ ، ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ

(۱) بحوالہ حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ کی کتاب ''اسرارِ حیات''۔

عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۔ (المومنون:۱۲-۱۴)

اور بالیقین ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے، پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا ایک محفوظ مقام میں، پھر ہم نے نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا، پھر ہم نے خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنا دیا، پھر ہم نے بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اسی کو ایک دوسری مخلوق بنا دیا، سو کیسی شان والا ہے اللہ تمام صناعوں سے بڑھ کر۔

زمین وآسمان کی پیدائش سے متعلق فرمایا:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۔ (الأنبياء:۳۰)

کیا جو لوگ کفر (اختیار) کئے ہوئے ہیں انھیں علم نہیں کہ آسمان و زمین ایک ہیولا تھے (یعنی جڑے ہوئے) پھر ہم نے دونوں کو توڑ کر الگ کر دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے، سو کیا پھر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

سورج و چاند کی گردش کے متعلق فرمایا:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ، وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ، لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۔ (یٰسین:۳۹-۴۰)

اور آفتاب اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے، یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اس کا جو زبردست علم والا ہے اور چاند کے لئے منزلیں مقرر کیں، یہاں تک کہ ایسا رہ جاتا ہے، جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی، نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور دونوں ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے تکوینی اُمور ہیں جن کے متعلق سائنس کی تحقیق نے وہی نظریہ پیش کیا جو آج سے صدیوں قبل قرآن کریم نے بتا دیا تھا؛ چنانچہ ایسے سائنسدان اور محققین جن کی آنکھوں پر تعصب کا پردہ نہیں پڑا ہو، وہ قرآن کی حقانیت و علمیت کے قائل ہوئے اور پھر اللہ نے انھیں اپنے بندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی توفیق عطا

فرمادی اور خود ان کی یہ تحقیق ان کے نزدیک قرآن کریم کے من عنداللہ ہونے پر مہر لگاتی چلی گئی؛ چنانچہ اللہ کا یہ فرمان حرف بحرف ثابت ہوتا چلا جارہا ہے کہ :

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللهِ ثُمَّ كَفَرْتُم بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ، سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ . (فصلت:۵۲-۵۳)

آپ کہئے بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر یہ قرآن اللہ کے یہاں سے آیا ہو اور پھر تم اس کا انکار کرو تو ایسے شخص سے زیادہ کون غلطی میں ہوگا جو ایسی دور دراز مخالفت میں پڑا ہو، ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جاوے گا کہ وہ قرآن حق ہے، کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان کا مقصود اصلی قرآن اور اس کے احکام ہیں اور دنیا کے تمام ذرائع واسباب ان تک پہنچنے کے لئے وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں، انھیں ذرائع میں سے ایک ذریعہ سائنس بھی ہے؛ چنانچہ قرآن کی حیثیت مقصود اصلی کی ہے؛ جب کہ سائنس کی وسیلہ و ذریعہ کی، مقصد متعین اور غیر متبدل ہوتا ہے؛ جب کہ وسائل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، انسان کی نظر ہمیشہ مقصد پر رہنی چاہئے نہ کہ وسیلہ پر، اسی سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ کسی ترقی وتنزلی کا معیار کیا ہونا چاہئے؟ بلاشبہ مقصد میں ترقی ہی اصل ترقی کہلائے گی نہ کہ صرف وسائل کی ترقی، ترقی کہلائے گی، ہم اسی سے مسلمانوں کی ترقی وتنزلی کے اسباب کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں کہ آج ان کے تنزل کا سبب مقصد سے بچھڑنے کی وجہ سے ہے نہ کہ وسائل کی کمی کی وجہ سے۔

شریعت نے ہمیں ان تمام وسائل کو اختیار کرنے کی نہ صرف اجازت دی ہے؛ بلکہ اس کو فرض کفایہ قرار دیا؛ چنانچہ فقہاء نے جس طرح تفقہ فی الدین یا افتاء و قضاء کو فرض کفایہ قرار دیا، اسی طرح صنعت و حرفت، طب وانجینئرنگ اور دیگر ان تمام علوم وفنون کو جس کی انسانی زندگی کو ضرورت ہے فرض کفایہ قرار دیا، (دیکھئے: فقہ واُصولِ فقہ کی کتابیں) خود قرآن کریم نے کفر وشرک سے مقابلہ کے لئے تیار رہنے کا حکم اس طرح دیا کہ :

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ . (الانفال:۶۰)

اور ان سے مقابلہ کے لئے جس قدر بھی تم سے ہوسکے سامان درست رکھو، قوت سے

اور پلے ہوئے گھوڑوں سے جن کے ذریعہ سے تم اپنا رعب رکھتے ہو اللہ کے دشمنوں
اور اپنے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی۔

ظاہر ہے ''قوۃ'' سے مراد ہر زمانہ میں وہی ''قوۃ'' ہوگی، جس سے قرآن کا یہ مقصد ''ترھبون بہ'' پورا ہو سکے اور اس کے لئے ہمیں ایسے علم کی ضرورت ہے، جو اس تکمیل میں معاون ثابت ہو، اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا :

ما خلق اللہ داء الا وقد خلق له دواء ، عرفه من عرفه وجهله من جهله ؛ الا السام وهو الموت . (۱)

اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں فرمائی، جس کے لئے دوا نہ پیدا کی ہو، سوائے موت کے، کسی کی اس دوا تک رسائی ہوئی اور کسی کی نہیں ہو سکی۔

اور خود فقہاء بھی بعض حالات میں طبیب حاذق مسلم کی شرط لگاتے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس علم کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے کس قدر ضروری ہے۔

بس ہمیں ان تمام علوم کے درمیان توازن برتنے اور برقرار رکھنے کی ضرورت ہے اور یہ توازن کیسا اور کتنا ہو؟ اس کے لئے ہمیں مشہور محدث تابعی، حضرت سفیان ثوریؒ کے اس قول سے رہنمائی ملتی ہے :

اعمل للدنیا بقدر بقائک فیها ، و اعمل للآخرة بقدر دوامک فیها . (۲)

دنیا کے لئے اتنا کر جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کر جتنا وہاں رہنا ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

(۱) المعجم الاوسط:۲/۱۵۷۔

(۲) وفیات الاعیان:۲/۳۸۷۔

قرآن، سائنس اور سائنسی مزاج — ماضی، حال اور مستقبل

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز⊙

انسانی مزاج تین عناصر کا مرکب ہے، اول وہ نسلی خواص جو کسی شخص میں اس کے والدین کی جانب سے منتقل ہوتے ہیں، دوم اس کی تربیت اور ماحول اور سوم اس کی تعلیم، ان تینوں عناصر میں سے نسلی خواص کا رول اس معنی میں کم تر ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق ایک صحت مند ذہن بنانے تک محدود ہوتا ہے، محققین یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ایک صحت مند انسان اوسط ذہانت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس کا ذہن تمام بنیادی کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس کی کارکردگی اور نشو ونما کا انحصار اس ماحول، تربیت اور تعلیم پر ہوتا ہے، جو اسے نصیب ہوتی ہے۔

مزاج کے دیگر مظاہر کی طرح اس کا ''سائنسی پن'' بھی اس کو ملنے والی تعلیم و تربیت کا عکاس ہوتا ہے، آج رنگ و نسل ملک و زبان اور مسلک و عقائد کے خانوں میں بٹے ہوئے مسلمانوں کے درمیان ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے سائنسی مزاج، سائنسی شعور اور فطری علوم کا فقدان اور ان کی جانب بے التفاتی، تمام عالم کے مسلمانوں میں عام طور سے اور برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں میں خاص طور سے سائنسی رجحان کی کمی ایک سنگین مسئلہ ہے، جو ہماری توجہ، تحقیق اور کاوش کا اولین مستحق ہے، یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ ہمارا یہ مزاج، اس کی اچھائیاں اور برائیاں، اس تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہیں جو ہمیں برسوں سے دی جا رہی ہے اب یہاں سوال اٹھتا ہے کہ ہم کس تعلیم کا ذکر کر رہے ہیں؟ اگر یہ وہ اسکولی یا ''سیکولر'' تعلیم ہے جو آج کل تعلیمی اداروں میں دی جاتی ہے اور اگر اسے ہم ناقص تسلیم کریں تو پھر اس تعلیم سے بہرہ آور ہونے والے ہمارے دیگر ہم وطن کس طرح سائنسی میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں — اگر اس تعلیم سے ہماری مراد وہ دینی یا اسلامی تعلیم ہے جو ہمارے مدارس میں دی جاتی ہے اور اگر اسے ہم ناقص مانیں تو پھر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اگر اسلامی تعلیمات مسلمانوں کو سائنسی شعور اور رجحان عطا نہیں کرتیں تو پھر ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک مسلمان سائنسدانوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اور موجودہ سائنس کی بنیادیں اُستوار کیں وہ کیوں کر ممکن ہوا؟ — اس مسئلے کا مکمل احاطہ کرنے، اس کے وجود میں آنے کے

⊙ ڈائریکٹر: اسلامک فاؤنڈیشن برائے سائنس و ماحولیات، نئی دہلی۔

اسباب کو سمجھنے، اس کی وجہ سے پیدا شدہ خرابیوں کا تفصیلی جائزہ لینے اور اس کا مؤثر اور قابل عمل حل تلاش کرنے کے لئے لازمی ہے کہ ہم ماضی کو کریدیں اور ان وجوہات کو سمجھیں جن کی وجہ سے موجودہ صورت حال پیدا ہوئی۔

انسانی تاریخ میں ایسے بھی ادوار گزرے ہیں جب تعلیم کا مطلب محض مذہبی تعلیم ہوتا تھا، اس وقت کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مذہبی تعلیم کے ذریعے ان کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو حیاتِ انسانی کا مقصود ہے، انسان میں وہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو اس کی روحانی اور جسمانی، انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہود کے لئے لازم ہیں، یہاں ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنا ہوگی کہ علم و آگہی کے دو ہی ذرائع ہیں :

وحی الٰہی یعنی (Revealed Knowledge) اور صحیفۂ فطرت یعنی قدرت کے شاہکاروں، اس کے نظاروں اور مظاہر کی تحقیق، اول الذکر ذریعہ پیغمبروں کو نصیب تھا؛ جب کہ دوسرا محققین کے حصے میں آیا ہے، انسانی تاریخ کی شروعات کے ادوار میں علم و واقفیت کا واحد ذریعہ وحی الٰہی تھا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ قوانین وضوابط رسولوں کی معرفت عام انسان تک پہنچتے تھے، یہی تعلیم و تربیت کا واحد طریقہ تھا، کلامِ پاک میں اس انداز سے علم عطا کرنے کا کئی جگہ ذکر ہے، مثلاً حضرت نوح کو کشتی بنانے کا علم اسی طرح عطا کیا گیا :

......اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بناؤ......۔(ہود:37)

حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ذکر ہے :

......اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اُسے قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا۔

(یوسف:22)

...... یوسف نے کہا یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اُس کے آنے سے پہلے میں تمہیں
ان خوابوں کی تعبیر بتادوں گا، یہ اُن علوم میں سے ہے، جو میرے رب نے مجھے عطا
کئے ہیں۔(یوسف:37)

اس دور کے انسان کی محدود ضروریات اور محدود وسائل کو اگر ہم ذہن میں رکھیں تو صورتِ حال سمجھ میں آجاتی ہے، تاہم جیسے جیسے دنیا میں انسانوں کی آبادی بڑھی، سماجی ڈھانچہ مضبوط ہوا، ضروریاتِ زندگی میں اضافہ ہوا، علم حاصل کرنے کے دیگر انداز اور طریقے بھی اللہ تعالیٰ نے واضح کردیئے، مفکروں کی کاوشوں سے نئے نئے علوم وجود میں آئے اور ان کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا، امام غزالیؒ(1111-1058) کا قول ہے کہ: عقل فعال کی نشوونما کے لئے عقیدہ کی پاکیزگی اور ایمان کی پختگی پہلی شرط ہے؛ لہٰذا ابتدائی تعلیم مذہبی عقائد اور مذہبی احکامات کے مطابق ہونی چاہیئے، تاہم وہ تعلیم کو محدود کرنے کے مخالف تھے، اسی لئے انھوں نے جو نصابِ تعلیم ترتیب دیا تھا، اس میں اس وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے بُنائی، کھیتی باڑی اور لکڑی کے کام جیسے ہنر شامل تھے۔(1:114)

جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور یہاں آباد ہونے لگے، تو شروع شروع میں انھوں نے مذہبی بقا کے لئے مدرسے کھولے، جہاں بنیادی دینی کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھایا جاتا تھا؛ چنانچہ تیرہویں صدی عیسوی تک تعلیم میں منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ (2:144)

حالاں کہ اسلامی ممالک میں اس قسم کے مضامین نصاب میں شامل تھے، جیسا کہ اوپر امام غزالیؒ کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے، مگر خالص دینی تعلیم کا انتظام بہت عرصے تک قائم نہیں رہا، تعلیم میں رفتہ رفتہ دین کے ساتھ ساتھ دینوی مضامین کا اضافہ ہوتا گیا۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کے دور میں تعلیم پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں تھا، دراصل اسلامی ممالک میں بھی اس زمانے تک تعلیم حکومت کے اثرات سے عموماً آزاد تھی کیوں کہ وہاں تعلیم کی ابتداء اور مدارس کا انتظام کلی طور پر آزادانہ شوق کا نتیجہ تھا، شروع شروع میں ہر ایک بستی کی مسجد مدرسے کا بھی کام دیتی تھی، یا پھر مسجد سے ملحق ابتدائی تعلیم کے لئے ایک مکتب ہوتا تھا، چھ برس کی عمر سے لڑکوں کی تعلیم شروع ہو جاتی تھی، استاد کسی صاحب جائیداد شخص یا جماعت کی طرف سے مقرر ہوتا تھا جو اُن کے بچوں کو تعلیم دیتا تھا، ان مکتبوں میں تعلیم کی سہولت نادار بچوں کو بھی دستیاب تھی، (3:11-13) ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی تعلیم کچھ اِسی نہج پر شروع ہوئی تھی، پٹھانوں اور مغلوں کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام بھی نجی کوششوں کا رہین منت تھا، تاہم کبھی کبھی تعلیمی اداروں کو حکمرانوں اور علم دوست حضرات سے بڑے بڑے عطیے ملتے تھے، تعلیم میں سرکاری دلچسپی کا سہرا اکبر کے سر ہے، اس کے عہد میں پہلی بار حکومت نے تعلیمی میدان میں اقدامات کئے، ایک محکمۂ تعلیمات قائم کیا گیا، جس کے تحت رعایا کی تعلیم کا انتظام بلالحاظ مذہب وملت ہوتا تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم ایک ہی ادارے میں ہوتی تھی، گرچہ ان کے نصابِ تعلیم جدا جدا تھے؛ لیکن چند مضامین مثلاً ریاضی، سائنس وغیرہ مشترک تھے، (4:224) پٹھانوں اور مغلوں کے عہد حکومت میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی گئی، خاص طور پر طب کی تعلیم کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے فائدہ اُٹھایا، مسلمان حکمرانوں کے آخری دور میں تعلیم سے متعلق ایک نیا رجحان اور رویہ نظر آتا ہے، مثال کے طور پر یہاں میں حیدرآباد (دکن) کے بعض مسلم حکمرانوں کی تعلیمی کارگزاریوں کا ذکر کرنا چاہوں گا، ایک مشرقی علوم کا کالج جسے دارالعلوم کہتے تھے، شہر حیدرآباد میں 54-1853ء میں قائم کیا گیا، اسے تعلیم عامہ کی سمت میں پہلا قدم کہا جا سکتا ہے، اس میں عربی، فارسی، مراٹھی، تیلگو اور انگریزی زبان کی تعلیم اور ان زبانوں کے ذریعہ کلاسیکی ادب تک رسائی کا انتظام تھا، یہاں نہ صرف تعلیم مفت دی جاتی تھی؛ بلکہ طلباء کی ہمت افزائی کے لئے انھیں وظائف اور انعامات سے بھی نوازا جاتا تھا، چند سال

بعد 1859-60ء میں ہر ایک تعلقہ میں ایک ایک فارسی کا اور ایک ایک مقامی زبان کا اسکول کھولا گیا، ان اسکولوں کے نصابِ تعلیم میں زبانوں کے علاوہ ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ جیسے مضامین شامل تھے، ان اداروں کے دروازے بلا امتیاز نسل و مذہب سبھی کے لئے کھلے ہوئے تھے، 1878ء میں انگلستان کی وضع کا ایک پبلک اسکول بھی قائم کیا گیا، جہاں مسلمان اور ہندو شرفاء کے بچے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔(5:1-4)

اپنی سرزمین کی بات کرنے کے بعد آیئے اب تاریخ کے کچھ اور اوراق پلٹتے ہیں اور اس عہد میں چلتے ہیں، جسے اسلامی سائنس کے عروج کا دور کہا جاتا ہے، مشہور مؤرخِ سائنس جارج سارٹن (George Sarton) نے ''تاریخ سائنس'' (14) میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک کے دور کو اگر پچاس پچاس سال کے ادوار میں منقسم کر کے ان میں سے ہر ایک دور کو اس وقت کے کسی ایک عظیم عالم سے منسوب کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ سارے ادوار مسلمان سائنسدانوں کے ناموں سے منسوب ہیں، ایک اور جگہ جارج سارٹن لکھتا ہے :

> انسانیت کے بنیادی کام کو مسلمانوں نے پورا کیا، اپنے وقت کا عظیم ترین فلاسفر مسلمان تھا، عظیم ترین ریاضی داں مسلمان تھا، عظیم ترین تاریخ داں بھی مسلمان ہی تھا۔

یہی نہیں رابرٹ برائفالٹ (Robert Brifalt) نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اسلام سے قبل سائنس کا وجود نہ تھا، اس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ طب کو علم کا درجہ دینے اور وقار بخشنے کا کام بھی مسلمانوں کے ہاتھوں ہی انجام پایا، وہ لکھتا ہے کہ :

> *Medicine was more of a magic than medcine before Islam . (15)*

ترجمہ: اسلام سے قبل، طب جادو زیادہ تھی، طب کم۔

یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان مغربی مصنفین کی نظر میں اسلام کی شروعات آنحضور ﷺ کے زمانے سے ہوئی ہے؛ لہٰذا اس سے قبل کے دور کو یہ اسلام سے قبل کا دور کہتے ہیں، مسلمان علماء کا ایک بہت بڑا اور تاریخ ساز کارنامہ تجربات کی ابتداء تھی، مسلمانوں کے اس سنہرے دور سے قبل دنیا باقاعدہ و باضابطہ تجربات اور ان کی افادیت سے ناواقف تھی، مسلمانوں نے ہی دنیا کو تجربات کی اہمیت سے روشناس کیا، بقول رابرٹ برائفالٹ :

> یونانیوں نے تدوین کا کام کیا، عام اُصول بنائے اور انھیں علمی زبان میں بیان کیا؛ لیکن تجربے کی کسوٹی پر نتائج اخذ کرنا یونانی فطرت کے خلاف تھا، جسے ہم سائنس کہتے

> ہیں اس کی بنیاد مشاہدات اور تجربات پر ہے اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو عربوں نے متعارف کرایا، اسلامی تہذیب کا سب سے قیمتی عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔

جارج سارٹن بھی اس بات کی توثیق ان الفاظ میں کرتا ہے :

> قرون وسطیٰ کا اصلی؛ لیکن سب سے کم معروف کارنامہ تجرباتی طریقے کی تخلیق ہے اور یہ دراصل مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا جو بارہویں صدی عیسوی تک جاری رہیں۔(14)

احیائے اسلام کے فوراً بعد ہی مسلمانوں میں علم وآ گہی، تحقیق وجستجو کا جو ولولہ نظر آتا ہے وہ ایک نہایت اہم اور قابل غور نکتہ ہے، جاں نثاران رسول ﷺ اور فدایانِ قرآن کی یہ روش اس بات کی روشن اور واضح دلیل ہے کہ علم وآ گہی کی یہ پیاس مسلمانوں میں کلام پاک اور اللہ کے رسول ﷺ نے پیدا کی تھی، قرآن کریم کی ہدایات پر عمل کر کے مسلمان بہت جلد نہ صرف علوم پر دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے؛ بلکہ ان میں بیش بہا اضافے بھی کرنے لگے، نتیجتاً انھوں نے دنیا کے بیشتر علاقوں میں اپنی طاقت وعظمت کا سکہ اس طرح جما دیا کہ یورپ کی اقوام باوجود ہزاروں کوششوں کے، صدیوں تک مسلمانوں کو زیر نہ کر سکیں۔

عہد وسطیٰ کے یورپ اور اسلامی دنیا کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا آزاد ''غبارِ خاطر'' میں لکھتے ہیں :

> یورپ مذہب کے مجنونانہ جوش کا علمبر دار تھا، مسلمان علم و دانش کے علمبر دار تھے، یورپ دُعاؤں کے ہتھیاروں سے لڑنا چاہتے تھے، مسلمان لوہے اور آگ کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے، یورپ کا اعتماد صرف خدا کی مدد پر تھا، مسلمانوں کا خدا کی مدد پر بھی تھا؛ لیکن خدا کے پیدا کئے ہوئے سروسامان پر بھی تھا، ایک صرف روحانی قوتوں کا معتقد تھا، دوسرا روحانی اور مادی دونوں کا، پہلے نے معجزوں کے ظہور کا انتظار کیا، دوسرے نے نتائج کے ظہور کا، معجزے ظاہر نہیں ہوئے؛ لیکن نتائج عمل نے ظاہر ہو کر فتح وشکست کا فیصلہ کر دیا۔

اس تحریر میں مولانا آزاد نے بارہویں صدی عیسوی کی ان صلیبی جنگوں کا ذکر کیا ہے، جب مسلمانوں نے پیٹریری (Petrary) نام کے نئے ہتھیار بنا لئے تھے جو دشمنوں پر آگ برساتے تھے، پانچویں صلیبی جنگ میں ان ہتھیاروں کی مدد سے جارج لوئس کی فرانسیسی فوج کے ٹھکانوں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا، مؤرخین کا کہنا ہے کہ ان

ہوائی حملوں سے فرانسیسی فوجی اتنے ہراساں ہو گئے تھے کہ ان کے کمانڈر لارڈ والٹر (Lord Walter) نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں فوجیوں کو مشورہ دیا کہ :

جونہی مسلمان آگ کے بان چلائیں ہمیں چاہئے کہ گھٹنے کے بل جھک جائیں اور اپنے نجات دہندہ خداوند سے دُعاء مانگیں کہ اس مصیبت میں ہماری مدد کرے۔

لیکن بقول مولانا آزاد :

فرانسیسیوں کا خوش اعتقادانہ یقین، وہم سے زیادہ نہ تھا، کیوں کہ بالآخر کوئی دُعا بھی سودمند نہ ہوئی اور انھیں شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔(16)

سائنسی علوم اور ان کی مدد سے ہونے والی نت نئی ایجادات نے مسلم ممالک کو اتنی طاقت عطا کر دی تھی کہ صدیوں تک وہ اسلام مخالف طاقتوں پر خدائی قہر بن کر ٹوٹتے رہے، تاہم ان ہی صدیوں کے دوران واقع ہونے والی کچھ بیرونی اور اندرونی خرابیوں نے، جن کا ذکر میں آگے کروں گا، ان کو علم سے اتنا بیزار کر دیا کہ ان کا حال وہی ہو گیا جو ساتویں صدی عیسوی سے چودہویں صدی عیسوی تک یورپی اقوام کا تھا، اب مسلمان دُعاؤں پر زیادہ انحصار کرنے لگا اور علم و عمل کو بے معنی قرار دینے لگا، مسلمانوں کی اس ذہنی اور فکری تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے بخارا پر روسیوں کے حملے کی روداد یوں بیان کی ہے :

انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تو امیر بخارا نے حکم دیا کے تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے، اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں اِدھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے ''یامقلب القلوب ، یا محول الأحوال'' کے نعرے بلند کر رہے تھے، آخر وہی ہوا جو کہ ایک ایسے مقابلے کا نتیجہ نکلنا تھا، جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو، دوسری طرف ختم خواجگان —— دُعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر ان ہی کو جو عزم و ہمت رکھتے ہیں، بے ہمتوں کے لئے وہ ترکِ عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔(16)

ساتویں صدی عیسوی سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک کے دور کو اگر اسلامی تمدن کا قرنِ اول کہا جائے اور چودہویں صدی عیسوی سے تا حال دور کو قرنِ دوم کا نام دیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں ادوار میں سائنسی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت ایک دم مختلف نظر آتی ہے، قرنِ اول میں اسلامی دنیا علم کے نور سے منور تھی؛

جب کہ اس وقت یورپ جہل اور وہم و بدگمانی کی تاریکیوں میں غرق تھا، اس کے برخلاف قرنِ دوم میں بساط اُلٹ چکی تھی، اس دور میں مسلمان سائنس سے رشتہ توڑ کر جہالت، بدعقیدگی اور شرک کے عمیق سمندر میں ڈوب چکے تھے، جب کہ یورپ مسلمانوں کے فراہم کردہ علوم کی روشنی سے جگمگا رہا تھا، مشہور مصنف ڈی کیمبیل (17) نے اس دور کو یوں بیان کیا ہے :

> اسلامی سائنس کے دور میں یورپ میں تاریک دور تھا اور کٹر پن، ظلم، گنڈہ تعویز اور ٹونے ٹوٹکے کی برائیاں عام تھیں۔

قرن اول کے دور کے مسلمانوں کے علمی ذوق میں ایک بے حد اہم اور غور طلب زاویہ اُن کے علم کی ہمہ گیریت کا ہے، اپنے اپنے ادوار کے بیشتر سائنسداں نہ صرف علومِ فطرت میں ماہر تھے؛ بلکہ علومِ دین پر مکمل دسترس رکھتے تھے، مثلاً جابر بن حیان نے سائنسی تحقیقات شروع کرنے سے قبل مدینہ منورہ میں رہ کر حضرت امام جعفر صادق سے دین کا علم حاصل کیا تھا، عین ممکن ہے کہ اسی دوران انھوں نے کلام پاک پر غور وفکر کر کے سائنسی تحقیق کا راستہ پایا ہو، زکریا رازی اور بوعلی سینا اپنے وقت کے امام طب ہونے کے ساتھ علم دین اور علم فلسفہ کے بھی ماہر تھے، اسی طرح الکندی عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ علم موسیقی، علم طبیعات علم بصریات اور علم ریاضی کا بھی ماہر تھا۔

مسلمانوں کے قرن اول کا ایک اور قابل توجہ مطالعہ چارلس جیلیپی (Charles Gillespie) نے کیا ہے ، اس مؤرخ نے ان سائنسدانوں کی فہرست مرتب کی ہے ، جنھوں نے ساتویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی کے درمیان سائنس کو فروغ دیا اور موجودہ دور کے سائنسی انقلاب کی بنیاد رکھی، اس فہرست میں ایک سو بتیس (132) سائنسدانوں کے نام شامل ہیں، جن میں سے ایک سو پانچ کا تعلق اسلامی دنیا سے تھا، دس وہ تھے جو غیر اسلامی دنیا یعنی یورپ سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن ان میں سے بیشتر نے اسلامی اسپین کی یونیورسٹیوں (قرطبہ، غرناطہ وغیرہ) میں سائنس کی تعلیم حاصل کی تھی، گویا کہ اس دور کے لگ بھگ نوے فیصد (90%) سائنسداں اسلامی دنیا سے تعلق رکھتے تھے، یہی تناسب سائنسی ایجادات اور سائنسی تصانیف کا بھی تھا، اب آیئے بساط اُلٹنے کے بعد دوسرے دور کی آخری یعنی موجودہ صدی کا جائزہ لیں، 1981ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق جو پچیس (25) مما لک سب سے زیادہ سائنسی لٹریچر ہر سال شائع کرتے ہیں ان میں ایک بھی مسلمان ملک کا نام نہیں ملتا، 1996ء میں دنیا بھر میں جو سائنسی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوئے، ان میں مسلم مصنّفین کی تعداد ایک فیصد سے بھی کم تھی، گویا قرنِ اول میں جب مسلمانوں کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا محض 15 فیصد تھی، اُس وقت سائنسی سرگرمیوں میں اُن کا 90 فیصد حصہ تھا اور آج جب مسلمانوں کی آبادی تقریباً 22 فیصد ہے تو سائنس میں ان کا حصہ ایک فیصد

سے بھی کم رہ گیا ہے، ایک زمانہ تھا جب بغداد کی صرف ایک شاہراہ پر کتابوں کی دوسو دکانیں تھیں، جہاں قرآن پاک سے لے کر فلکیات، طبیعات، ریاضی، کیمیا، طب وغیرہ کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں، لوگوں کے گھروں میں ذاتی لائبریریاں تھیں، علمی مجلسیں آراستہ کی جاتی تھیں، نئی دریافتوں اور نئے علوم کی روشنی میں کلام پاک پر غور وفکر کیا جاتا تھا، آج کسی دُکان یا کسی ذاتی لائبریری میں تو کیا کسی مسلم ادارے کی لائبریری میں بھی مشکل سے ہی رازی یا جابر بن حیان یا الکندی کی تصانیف نظر آئیں گی، بقول شیخ سید ابوالحسن علی ندوی :

> یہ تاریخ کا عبرت انگیز واقعہ ہے کہ سائنس کی عظیم الشان خدمات انجام دینے کے بعد مسلمان اپنی تحقیق وعلمی روش بھول گئے اور مقلدانہ اور روایتی ذہنیت کا شکار ہو گئے، جس کے نتیجے میں وہ سائنسی اور صنعتی میدان میں مغرب سے پیچھے رہ گئے۔(19)

ایڈورڈ ایٹیا(Edward Atiya) اس دور کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> اس دور میں مسلمان سوچنے اور ایجاد کی صلاحیت کو کھو بیٹھا اور صرف پرانی کتابوں کو رٹ لینے کو علم سمجھ بیٹھا۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی، سچ تو یہ ہے کہ وہ قدیم کتابوں پر شرحیں لکھنے لگا پھر شرحوں کی شرحیں تحریر کی جانے لگیں، اس کے نزدیک یہ اس کے علمی مشاغل تھے، اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں کدو کاوش کا جو مادہ رکھا ہے، جدو جہد اور کارکردگی کا جو خمیر شامل کیا ہے، اسے تحقیق وجستجو کا راستہ نہ ملا تو وہ تقلید وتنقید اور فروعی مسائل پر اپنی توانائی صرف کرنے لگا۔

اب آیئے اس بنیادی اور اہم نکتے کی طرف پلٹتے ہیں کہ مسلمانوں میں علم کے تئیں اس اہم فکری تبدیلی کی وجہ یا وجوہات کیا تھیں، ان کو سمجھنے کے بعد ہی ہم ان کو دور کرنے کے طریقے پر غور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، انسان اگر کوئی کام کرتا ہے تو اس کے پیچھے دو ہی محرکات ہوتے ہیں، یا تو اس کام کے بدلے اسے مال وعزت یا پھر حسب خواہش کسی اور شئے کے ملنے کی توقع ہوتی ہے، یا پھر وہ کسی جذبے، لگن یا فرض کے تحت اپنی رضامندی سے وہ کام انجام دیتا ہے، مسلمانوں کی علوم سے وابستگی بھی ان ہی دو محرکات کے گرد گھومتی ہے، آنحضور ﷺ کی بعثت کے بعد پہلا محرک جس نے مسلمانوں کو تحقیق وجستجو اور مطالعۂ فطرت کی طرف راغب کیا، بلاشبہ قرآن پاک تھا، اس وقت کے پاک وصاف ماحول میں کہ جب مسلمانوں کا واحد فوکل پوائنٹ کلام پاک تھا، رسول پاک ﷺ کی صحبت وتربیت انھیں نصیب تھی، مسلمانوں نے کلام الٰہی سے بھرپور فیض اور رہنمائی حاصل کی، آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد یہ صورت حال تبدیل ہونا شروع ہوئی، اگرچہ یہ تبدیلیاں بہت دھیرے دھیرے آئیں، مختلف طریقوں سے آئیں

تاہم یا تو ان کو محسوس نہیں کیا گیا یا دیگر مفادات کو مقدم رکھتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے کام لیا گیا، حضرت عثمان ؓ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے اتحاد کی طاقت کمزور پڑ گئی، رفتہ رفتہ خلافت بادشاہت میں تبدیل ہوگئی، اقتدار کی خواہش اور افضلیت کے جھگڑے بڑھنے لگے، اسی دوران احادیث رسول کو جمع کرنے کا کام شروع ہو چکا تھا، احادیث کی صحت و سند سے متعلق مختلف رجحانات پیدا ہونے لگے تھے، فقہی مسائل پر مباحثوں نے نیز مسلکی اختلافات نے رنجشیں پیدا کردی تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کی حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا تھا، نئے ممالک اور علاقے ان کے زیر نگیں آرہے تھے، کچھ لوگ سچ مچ ہدایت پاکر اسلام قبول کررہے تھے تو کچھ مصالحت اور حکومت وقت کے منظور نظر ہونے کے لئے اسلام میں داخل ہورہے تھے، مسلمانوں کے عروج سے جن اقوام کو زیر ہونا پڑا تھا ان کے اہل فکر و دانش مسلمانوں کے عروج کے اسباب اور ان کا توڑ تلاش کرنے میں سرگرداں ہو چکے تھے، ان کو اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ قرآن اور صرف قرآن ہے جس نے اس پر ایمان لانے والوں کو سیماب صفت بنادیا تھا، جس کی ہدایت کی روشنی میں وہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق علوم کے ماہر ہوکر ایک مضبوط سماجی، تہذیبی اور فوجی طاقت بن چکے تھے، اب دشمنان اسلام کی سمجھ میں یہ بات بھی آچکی تھی کہ قرآن میں تحریف کرنا ممکن نہیں ہے؛ لہٰذا انھوں نے دوسرا راستہ چنا اور ایک منظم کوشش مختلف طریقوں اور حربوں سے یہ شروع کی کہ مسلمانوں کی توجہ قرآن سے ہٹا کر دوسری طرف لگادی جائے، ان کی فکر و تدبر کی صلاحیتیں دیگر مسائل کی نذر کردی جائیں، ان تمام سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اکثریت کی توجہ کلام حق سے ہٹ گئی؛ لہٰذا تحقیق و جستجو کا رخ بدل گیا، گوکہ سفر جاری رہا؛ لیکن اس کا رُخ معراج و ترقی کی اس منزل کی جانب نہ رہا جس کا وعدہ قرآن پاک میں ان لوگوں کے لئے کیا گیا ہے کہ جو علم کی راہ میں سرگرداں رہتے ہیں، اسلام ڈائیلیوٹ (Dilute) ہونا شروع ہوگیا، جو نئے علاقے اور اقوام اسلام میں داخل ہوئیں ان تک اب کلام پاک کے علاوہ دیگر لٹریچر بھی پہنچنے لگا جس میں مختلف قسم کی گنجائشیں اور متبادل موجود تھے، ان نومسلمین نے اپنے رسم و رواج اور طریقوں کو بھی اسلام میں شامل کرنے کے لئے بہانے اور طریقے ڈھونڈ لئے، اسلام اس معنی میں ''آسان'' ہوگیا کہ آباء واجداد کے رسم و رواج اور طریقوں کو چھوڑے بغیر جنت کی ضمانت مل گئی، تاہم وہ نیا سماج وہ نئی تہذیب اور کردار جو قرآن کے اسلام نے پیدا کیا تھا ان دھندلکوں میں گم ہوگیا، منافقین اور فاسقین کے تیار کردہ اس اسلام کے زیر اثر مسلمان فکر و عمل کے اعتبار سے کمزور ہونے لگا، وہ کلام پاک میں تحریر آیات کو پڑھنے اور یاد کرنے میں تو مصروف رہا؛ لیکن صحیفۂ فطرت یعنی کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی آیات سے غافل اور لاپرواہ ہوگیا، علم کے سوتے سوکھ گئے جمود و تعطل کا دور آگیا، عقل کا راستہ بند کردیا گیا نقل و تقلید کی راہ کشادہ ہوگئی، امام غزالیؒ (1111-1058) دشمنانِ اسلام کی اس سازش کو

سمجھ رہے تھے، تاہم مسلمانوں کی اکثریت ان کے اقوال اور تحریروں پر توجہ نہیں دے رہی تھی، ان کا یہ قول کہ ''جو شخص عقل کو بالکل معزول کر کے محض تقلید کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے وہ جاہل ہے'' نظر انداز کر دیا گیا، سائنسی حقائق یعنی صحیفۂ فطرت کے معترضین پر تنقید کرتے ہوئے وہ ''تہافت الفلاسفہ'' میں لکھتے ہیں :

> مذہب کے خلاف سب سے بڑے جرم کا ارتکاب وہ لوگ کرتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام کا دفاع علوم ریاضی کے انکار سے بھی ہوسکتا ہے، جب کہ ان علوم میں کوئی بات مذہب کے خلاف نہیں ہے، ان لوگوں کی اسلام کے بارے میں یہ بڑی جسارت ہے جن کا گمان ہے کہ اسلام ان علوم کے انکار کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؛ حالاں کہ ان علوم وتحقیقات میں دینی اُصول کو کوئی تعرض نہیں۔

اسی کتاب میں وہ دوسری جگہ رقم طراز ہیں :

> جو یہ گمان کرے کہ سورج اور چاند گہن کو غلط ثابت کرنے کے لئے حجت کرنا دین کی خدمت ہے اس نے دین پر بہتان باندھا اور اس کو کمزور کیا؛ کیوں کہ یہ وہ اُمور ہیں جن کی بنیاد ریاضی کے حقائق پر قائم ہوتی ہے۔

احیاء العلوم میں امام غزالیؒ نے نہ صرف علم کی نہایت جامع تعریف بیان کی ہے؛ بلکہ اپنے دور کے مسلمانوں کی فکر اور ان کی روش پر بھی شدید نکتہ چینی کی ہے، آپ لکھتے ہیں :

> فرض کفایہ وہ علم ہے جس کے بغیر دنیاوی ضرورتیں انجام نہ پاسکتی ہوں، مثلاً علم طب؛ کیوں کہ بقائے زندگی کے لئے یہ ضروری چیز ہے، یا علم حساب؛ کیوں کہ معاملات میں اور تقسیم ترکہ میں اس کی ضرورت پڑتی ہے، ہمارے اس قول پر کہ طب وحساب فرض کفایہ ہیں، تعجب نہ کرنا چاہئے؛ بلکہ صنعتی علوم بھی فرض کفایہ ہیں، بہت سے شہر ایسے ہیں جہاں صرف یہودی یا عیسائی طبیب ہیں اور ان کی شہادتیں فقہ کے طبی مسائل میں معتبر نہیں، باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ طب کو کوئی نہیں سیکھتا اور فقہ پر گرے پڑتے ہیں، کیا اس کا سبب بجز اس کے کچھ اور ہوسکتا ہے کہ طب کے ذریعے سے یہ بات نہیں حاصل ہوسکتی کہ اوقاف پر، وصیت پر، یتیموں کے مال پر قبضہ حاصل ہو، قضا کا عہدہ ملے، حکومت ہاتھ آئے، ہم عصروں پر تفوق حاصل ہو، مخالفین کو زیر کیا جائے۔

اللہ کی پناہ، گیارہویں صدی میں مسلمانوں کی حکومت کی خواہش، گروپ بندی اور بے ایمانی کی یہ تصویر واضح طور پر بتاتی ہے کہ مسلمان کلام پاک اور اس کی رہنمائی سے کتنا دور جا چکا تھا۔

مسلمان حکمرانوں کے خاصے بڑے طبقے نے اپنے اپنے زمانے میں علم وحکمت کی سرپرستی کی یہ وہ دوسرا محرک تھا، جس کی وجہ سے بہت سے مسلمان سائنسی تحقیقات کی طرف راغب ہوئے، تاہم جب مسلمان حکمرانوں اور حکومتوں میں آپسی اختلافات اور ان کا زوال شروع ہوا تو علم کی سرپرستی بھی کم ہونے لگی، علاوہ ازیں کچھ بادشاہوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے اوپر یا اپنے مذہبی عقائد پر تنقید گوارہ نہیں کرتے تھے، ایسے ماحول میں آزادیٔ فکر کا ختم ہونا لازمی تھا، دوسری طرف جنگ وجدال نے علم کے لئے ماحول ناسازگار کر دیا، انسان کا جبر وقہر بڑھ گیا تھا، بادشاہت کے انداز اس حد تک بدل چکے تھے، احکام الٰہی کے اس قدر خلاف ہو چکے تھے کہ علماء حق یا تو بادشاہ وقت کی مخالفت پر مجبور تھے یا پھر گوشہ نشین ہو گئے تھے، دور مامون سے ہی مسلمانوں میں یونانی فلسفے کے چرچے شروع ہو گئے تھے، تاتاریوں کے حملے نے جو خوف وہراس کا ماحول پیدا کیا ایسے میں لوگوں نے ''اسٹوائس ازم'' (Stoicism) کو اپنانا شروع کر دیا جس میں یاسیت، محرومی، بے نیازی، قنوطیت کے احساسات خاص عناصر تھے، اس صورتِ حال کو تاتاری حکمرانوں نے خوب بڑھاوا دیا؛ کیوں کہ مایوس مسلمانوں پر حکومت زیادہ آسان تھی، مایوسی کے عالم میں مسلمانوں کو درگاہوں میں قلبی سکون محسوس ہونے لگا، یہ تمام سازشیں اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ بقول شیخ ابوالحسن علی ندوی دورِ انحطاط اسلامی میں جینئس (Genius) بہت کم نظر آنے لگے، وہ فرماتے ہیں :

> زیادہ تر علماء اور مفکرین نے علوم مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کی طرف توجہ زیادہ کی اور علوم طبعیہ اور عملی اور نتیجہ خیز فنون کی طرف توجہ کم کی، ان مباحث میں جن کا دنیا و آخرت میں کوئی فائدہ نہ تھا، صدیوں تک دردسری و دیدہ ریزی کرتے رہے، اور ان علوم اور تجربوں کی طرف توجہ نہ کی جو ان کے لئے کائنات کی طبیعی قوتیں مسخر کر دیتے اور اسلام کے مادی اور روحانی تسلط کو تمام عالم پر قائم کر دیتے۔(19)

اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا حال ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ رومن سلطنت کے زوال کے وقت یورپی اقوام کا تھا، جنھوں نے عیسائیت کو قبول تو کر لیا تھا؛ لیکن صرف روحانیت کے واسطے، دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا؛ لہٰذا عیسائیوں کو علم دنیا (یا جدید علوم) سے اتنی نفرت ہوئی کہ انھوں نے اقلیدس، افلاطون جالینوس وغیرہ کی تصنیفات کو کفر کے ذخائر بتایا اور ان لائبریریوں کو آگ لگا دی جہاں یہ کتابیں محفوظ تھیں، اسی غیر عقلی رویے کی وجہ سے رومیوں نے پانچویں صدی عیسوی میں اسکندریہ کی مشہور لائبریری کو آگ لگا دی تھی —— مسلمان بھی جب

منافقین اور فاسقین کی سازشوں کے جال میں پھنس کر قرآن سے دور ہوگیا، دین، دنیا، دینی اور دنیوی علوم کو الگ کر بیٹھا تو اس کا بھی حال ایسا ہی ہوگیا، مسلمانوں کے تنزل کی اس کیفیت کو مولانا آزاد نے غبار خاطر میں یوں بیان کیا ہے :

> علم کو روحانی اور دینی مراکز میں محدود کر دیا گیا جو خود جمود کا شکار تھے، جدید اور سائنسی علوم کو خلاف دین قرار دیا گیا، 1857ء کو دہلی کالج کی لائبریری کو لوٹا گیا، انگریزی اور سائنس کی کتابوں کو پھاڑ ڈالا گیا، سائنس کے آلات کو آلات شیطانی کہہ کر توڑا، بلوائی عربی اور فارسی کتابوں کو ساتھ لے گئے اور کباڑ میں بیچ ڈالا۔

علوم سے بیزاری کا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ صدی کے اوائل میں ہی مسلمان معاشی اور فوجی طاقت کے اعتبار سے بھی کمزور ترین قوم بن گئے، 1918ء میں یورپی افواج نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا، ان فوجوں کی قیادت کرنے والے فیلڈ مارشل الن بی (Allenby) نے اعلان کیا کہ ''یہ جنگ آٹھویں صلیبی جنگ تھی جس میں ہمیں مکمل فتح حاصل ہوئی ہے'' گویا مسلمان ہمیشہ کے لئے پسپا کر دیا گیا۔

دشمنانِ اسلام کی سازشوں کے نتیجے میں ہم آج علم کی تقسیم شدہ میراث لئے بیٹھے ہیں، جو دین محض چند ارکان کا مجموعہ نہیں؛ بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات تھا، اس کے پیروکاروں نے دین دنیا کو الگ کر دیا، دینی علوم کے نام پر تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، اسرار شریعت اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم دی جانے لگی، تمام جدید علوم کو دنیوی علوم کا نام دے کر دنیاداروں کے لئے چھوڑ دیا گیا، جس کو دنیا کی تمنا ہو، جو محض دنیوی زندگی پر یقین رکھتا ہو، اُسے سنوارنا چاہتا ہو وہی ان علوم کا مطالعہ کرے، ساتھ ہی ساتھ دونوں تقسیم شدہ خانوں کو ایک دوسرے کی ضد اور ناقابل امتزاج سمجھ لیا گیا، صف بندی مکمل ہوگئی، اب جسے چندروزہ دنیوی زندگی کو سنوارنا ہو وہ دنیوی علوم پڑھے اور اگر عاقبت سنوارنی ہے تو دینی علوم پر توجہ دے، کیا واقعی ایسا ہے؟ آیئے اس کا حل تلاش کریں، اس نکتے پر گفتگو کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ''سائنس'' اور ''علم'' کی تعریف وتشریح کرلیں، سائنس کے سلسلے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس کو ایک مضمون سمجھا جاتا ہے، اُسی طرح جیسے کہ جغرافیہ، معاشیات یا لسانیات، حقیقت یہ ہے کہ سائنس کسی مضمون کا نہیں؛ بلکہ ایک طریقۂ کار کا نام ہے، انگریزی زبان میں مستعمل اس لفظ کے لغوی معنی حقائق، عوامل، قوانین نیز اُن کی وجوہات سے واقفیت کے ہیں، نامعلوم کو معلوم کرنے کے ہیں، اس واقفیت کے حصول اور تصدیق کے لئے مشاہدے، استدلال، تجربات اور تفکر وتدبر سے کام لیا جاتا ہے، انگریزی کی مشہور لغت ویبسٹر (Webster) سائنس کی یہی تعریف بیان کرتی ہے، اب آیئے علم کی تعریف پر نظر ڈالیں، لغات کے مطابق علم (عَلِمَ ، یَعْلَمُ) کا

مفہوم ہے کسی چیز کو کما حقہ جاننا، پہچاننا، حقیقت کا ادراک کرنا، یقین حاصل کرنا، محسوس کرنا، محکم طور پر معلوم کرنا (تاج العروس ومحیط المحیط) اس طرح ادراکِ حقیقت کرنے والے کو عالم کہتے ہیں، اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز پر ایسے نشان کے ہیں جس سے وہ شئے دیگر اشیاء سے متمیّز ہو سکے، (مقاییس اللغة ، ابن فارس) گویا علم کا بھی وہ مفہوم ہے جو سائنس کا ہے، انگریزی — عربی لغت، المورد بھی سائنس کے لئے عربی متبادل ''علم'' ہی بتاتی ہے، اگر آپ کسی عربی ملک میں جائیں اور وہاں کسی یونیورسٹی کی سائنس فیکلٹی میں تشریف لے جائیں تو وہاں فیکلٹی آف سائنس کا عربی ترجمہ ''کلیة العلوم'' ہی لکھا ملے گا، آیئے اب دیکھیں کہ قرآن کریم علم کسے کہتا ہے؟ — قرآن حکیم کے نزدیک علم وہ شئے ہے جس کو آنکھ نے دیکھا ہو، کان نے اس کے صحیح ہونے کی گواہی دی ہو اور فواد (قلب بہ معنی ذہن) نے اس کے دھوکہ نہ ہونے کی تصدیق کی ہو، سورہ بنی اسرائیل کے چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں (کیوں کہ) بے شک ترے کان اور آنکھ
اور ذہن (فواد) سب سے اس شئے کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (17:36)

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ جس شئے کی تصدیق انسان کے یہ تین اعضاء کردیں وہ علم ہے اور قرآن منع کرتا ہے کہ اس کے سوا کسی اور شئے کی پیروی کی جائے، گویا لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کے بجائے علم کی پیروی کریں، ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مافوق الفطرت سب باتیں جھوٹ ہیں اور قرآن حکیم ان کے پیچھے پڑنے کی اجازت نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ کی کائنات میں اس کی قدرت کے جو مظاہر بکھرے پڑے ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے لئے بنیادی طور پر آنکھ اور کان کی ہی ضرورت پڑتی ہے، مثلاً ہم اپنی آنکھوں سے پہاڑوں کے سلسلے اور ان میں رنگ برنگے پتھر دیکھتے ہیں، ہوا کے دوش پر اُڑتے بادلوں کو دیکھتے ہیں، جو چیز آنکھ کی قوت سے باہر ہوتی ہے اس کو دوربین یا خوردبین کی مدد سے دیکھتے ہیں، مثلاً بادلوں کے پار خلاء کا مطالعہ دوربین سے کرتے ہیں اور جب بصری دوربین بھی ناکارہ ہو جاتی ہے تو ریڈیائی دوربین سے خلاء کا معائنہ کرتے ہیں، پہاڑوں کے رنگ برنگے پتھروں کے ذرات کی بناوٹ کو سمجھنے کے لئے مختلف قسم کی خوردبینیں استعمال کرتے ہیں، جن میں حسبِ ضرورت روشنی کی کرن سے لے کر الیکٹران بیم (Beam) تک کا استعمال کرتے ہیں، قابلِ غور بات یہ ہے کہ آنکھ اور کان دونوں ہی اعضاء کے استعمال میں ذہن استعمال ہوتا ہے، ان اعضاء کے پیغامات کو ذہن ہی وصول کرتا ہے اور پھر اسی کی مدد سے ہم غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کے شاہکاروں اور اس کی تخلیق کی خوبصورتی، پیچیدگی اور کارکردگی کو سمجھ پاتے ہیں، گویا جس اندازِ فکر کو آج سائنسی اندازِ فکر کہا جاتا ہے، جس میں مشاہدے، استدلال، تفکر و تدبر پر زور دیا جاتا ہے وہ دراصل ''اسلامی اندازِ فکر'' ہے، جس کو اپنانے کا اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے: قرآن

کریم نے سمع، بصر اور قلب (بمعنی ذہن) کو حصولِ علم کے ذرائع قرار دیا ہے۔ (الاسراء:36)

اس اعتبار سے وہ تمام علوم جو صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنے والے عالموں نے وضع کئے ہیں اور جن کی مدد سے وہ خالق کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں، علم کے دائرے میں آتے ہیں مثلاً علم طبیعیات، علم حیاتیات، علم کیمیاء، علم طبقات الارض، علم ریاضی، علم طب، علم خلاء وغیرہ علم کی قرآنی تعریف کے دائرے میں آتے ہیں، علاوہ ازیں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ چوں کہ قرآن عرب قوم پر اُتارا گیا تھا؛ لہٰذا قرآن کی زبان عربی ہے؛ تاکہ وہ اس کے معنی ومفہوم کو احسن طریقہ پر سمجھ سکیں، کلام پاک میں اس بات کی وضاحت سورۂ ابراہیم میں اس طرح کی گئی ہے :

> ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے؛ تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔ (14:4)

علامہ محمد لطفی جمعہ نے اپنی کتاب ''فلسفۂ اسلام'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ :

> قرآن تقریباً تین سو علوم کا منبع ہے اور ان میں سے اکثر علوم کا راست ماخذ خود قرآن ہے اور دوسرے علوم قرآن کی خدمت کے لئے مدون کئے گئے ہیں۔

الجواہر فی تفسیر القرآن کے مصنف شیخ طنطاوی نے اپنی تفسیر کے دیباچہ میں لکھا ہے :

> قرآن میں آیات العلوم کی تعداد سات سو پچاس ہے، جس میں فلکیات، ریاضی، ہندسہ، طب، معدنیات، زراعت اور دوسرے علوم طبعی شامل ہیں، قرآن جامع العلوم ہے، علمی تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے کہ تمام دنیوی علوم کا منبع صرف قرآن ہے۔

اب آیئے اس بات پر غور کریں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے علم حاصل کرنے کی تاکید کیوں کی ہے، اللہ سبحانہ تعالیٰ نے انسان کو جو کام بھی کرنے کا حکم دیا ہے اس میں انسان کے لئے مکمل فائدے ہیں جو اس کی دنیا اور عاقبت دونوں پر محیط ہیں، مثلاً نہ صرف نماز؛ بلکہ وضو میں بھی صحت وصفائی سے لے کر جسمانی ورزش تک کے وہ وہ فوائد ہیں جو فی الفور انسانی جسم کو درست کرتے ہیں اور درست رکھتے ہیں، اگر انسان نماز کو سمجھ کر ادا کر رہا ہے تو اس کا ذہن اللہ کی حمد وثناء کے علاوہ اس کی ہدایات کا بھی اعادہ کرتا ہے؛ چوں کہ یہ ہدایات ذہن نشین رہتی ہیں لہٰذا اس میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو اس کی ذہنی اور نفسیاتی صحت کو ٹھیک ٹھاک رکھتا ہے، مزید یہ کہ وہ جیسے جیسے متقی ہوتا جاتا ہے اللہ کا قرب اسے حاصل ہوتا جاتا ہے، گویا نماز فوری دنیوی فائدوں سے لے کر قربِ الٰہی حاصل کرنے تک انسان کی مدد کرتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سبھی احکامات ہمیں دنیوی زندگی سے آخرت تک فائدہ پہنچاتے ہیں۔

جب تک زمین پر پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا انسان ان سے ہدایت کی روشنی پاتا رہا، اپنا ایمان

مضبوط کرتا رہا، آنحضور ﷺ نبی آخر الزماں تھے، آپ پر ہی اللہ کا یہ دین مکمل کیا گیا، ایک مکمل کتاب انسان کے سپرد کردی گئی، اب ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ شیطان نے تو نسل انسانی کو قیامت تک گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اللہ سے مہلت مانگی تھی جو اسے دے بھی دی گئی تھی، گویا شیطانی قوتیں تو قیامت تک نسل انسانی کو گمراہ کریں گی تو پھر ان کو ہدایت دینے کا کام کس طرح ہوگا اور کون اسے انجام دے گا، اگر اللہ نے انسانیت کی ہدایت کے لئے نیز شیطانی قوتوں اور ان کی سازشوں سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں رکھا تو کیا نعوذ باللہ میرے منہ میں خاک، اللہ تعالیٰ نا انصاف ہے؟ ہرگز نہیں — اللہ سبحانہ تعالیٰ نے قیامت تک ہدایت کا فیض جاری کرنے کے لئے کلام پاک اور اُمت محمدی کو بھیجا ہے اور اس عمل کی کنجی علم یعنی سائنس ہے، بہ ظاہر عجیب اور کچھ لوگوں کو متضاد لگنے والی یہ بات درحقیقت خالق، مخلوق اور تخلیقات کے مابین ایک سیدھا سادا رشتہ ہے، سائنس کی مدد سے ہم چیزوں کو پہچانتے ہیں، ان کی بناوٹ، صفات اور کارکردگی کو سمجھتے ہیں، کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی تخلیقات کا جب ہم اس طرح بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان میں خالق کی کاریگری، عظمت اور صناعی کے نمونے نظر آتے ہیں، عقل حیران رہ جاتی ہے کہ واہ کیا چیز بنائی ہے، کیا زبردست توازن ہے، کتنی پیچیدگی ہے پھر بھی کتنا زبردست نظم و انتظام ہے کہ جو اس مشین کو چلا رہا ہے، اگر ہم سائنسی دریافتوں اور علوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جیسے جیسے انسان کی عقل و شعور اور واقفیت میں اضافہ ہوا ہے ویسے ویسے ہی اس پر مزید پیچیدہ اور حیران کن اسرار قدرت کے انکشافات ہوئے ہیں، جب انسان کا علم کم تھا تب وہ ایک معمولی سے مائیکرو اسکوپ کے ذریعہ سیل (Cell) کی بناوٹ دیکھ کر ہی حیران رہ گیا تھا، اس کی جستجو نے جب زیادہ طاقتور ''آنکھ'' یعنی خوردبین بنالی تو سیل کی اندرونی بناوٹ دیکھ کر عش عش کر اُٹھا، پھر مزید طاقتور خوردبین نے اس کو ننھے ننھے عضلات کی دنیا سے روشناس کرایا، الغرض یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس پر قدرت کے راز آشکارا ہوتے گئے، اب اگر اس سائنسداں کا دل ایمان سے منور ہوگا تو اسے ان تمام تخلیقات میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی تجلیاں نظر آئیں گی، ہر نئی دریافت، ہر نئی پیچیدگی اس کے ایمان کو تقویت پہنچائے گی، وہ دل سے اللہ کی عظمت کا قائل ہوگا، لیجئے ہدایت کا کام علم کے ذریعے انجام پا گیا، ایک مومن کائنات اور مخلوقات کے ان مظاہر (آیات) میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے دیکھتا ہے، ان سے نصیحت حاصل کرکے ان ہی کی مانند اللہ کی بندگی کرتا ہے جب کہ ایک ایسا شخص کہ جس کے پاس کلام پاک کا نور نہیں ہے محض مادی فوائد کی تلاش و جستجو میں رہتا ہے، جبھی تو اللہ تعالیٰ اپنے قوانین، مظاہر فطرت اور تخلیقات کے مطالعہ کا حکم دیتا ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا :

علم رکھنے والے نبیوں کے وارث ہیں اور انبیاء کا ورثہ دینار و درہم نہیں ہیں؛ بلکہ ان کا

ورثہ علم ہے۔(ترمذی،ابوداؤد)

اب آیئے ذرا دیکھیں کہ یہ جو بات میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اسے کلام پاک سے کیوں کر تقویت حاصل ہورہی ہے،سورۃ المومنون میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے،مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو"۔(23-78)

غور فرمائیں آنکھ کان اور دل (بہ معنی دماغ) ہی تو وہ اعضاء انسانی ہیں کہ جن کی مدد سے وہ کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں کا مطالعہ کرتا ہے،ان اعضاء کا اس سے بہتر شکر کیا ہوگا کے ان کا صحیح اور وہی استعمال کیا جائے کہ جن کے واسطے یہ ہم کو عطا کئے گئے ہیں،اسی لئے اللہ تعالیٰ ان سے متعلق باز پرس بھی کرے گا،سورہ یونس میں ارشاد ہے :

ان سے کہو زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے دیکھو۔(10-101)

نظر کے لغوی معنی دیکھنے،غور کرنے،معائنہ کرنے اور سوچنے کے ہیں،گویا ہمیں جس طرح بھی ممکن ہو کائنات کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے،یہ مطالعہ ہم کس طرح کریں اس بات کو سمجھنے کے لئے ایک نسبتاً واضح مثال کا سہارا لیتے ہیں،کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ نماز پڑھیں،اب یہ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ نماز ادا کرنے کے لئے جو ضروری کام ہیں ان کو وہ انجام دے،یعنی پاک صاف ہو،کپڑے پاک ہوں،وضو کرے اور پھر مسجد میں جا کر صحیح طریقے سے نماز ادا کرے،اسی طرح اگر کائنات کے بغور مطالعہ کی ذمہ داری ہمیں دی گئی ہے،اللہ کا ایک واضح حکم ہے تو ہمیں چاہئے کہ اس حکم کی تعمیل میں کائنات میں گھومنے کی کوشش کریں،گھومنے اور سفر کرنے کے لئے تیز سواریاں ایجاد کریں،کائنات میں پھیلے ہوئے مظاہر کے بغور مطالعے کے لئے اگر آنکھ ناکافی ہے تو ایسے آلات ایجاد کریں کہ ہم کائنات کی اشیاء کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کر سکیں،اگر ہم ایسا کریں گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی عظمت کے قائل ہوتے چلے جائیں گے،تاہم حقیقت کیا ہے اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف میں اشارہ کیا ہے :

زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں
اور ذرا توجہ نہیں کرتے،ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے
ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔(12:105-6)

اس آیت میں بیک وقت کئی باتیں بیان کی گئی ہیں،واضح طور پر تو ان لوگوں کا ذکر ہے جو اللہ کی کائنات اور اس کی تخلیقات کی طرف توجہ نہیں دیتے یعنی لاعلم،غافل اور جاہل رہتے ہیں،دوسری طرف زمین اور آسمانوں کی

نشانیوں پر سے لوگوں کے گزرنے کا ذکر ہے، گویا اللہ تعالیٰ یہ بات بیان فرماتا ہے کہ زمین اور آسمان میں انسان اتنا سفر کرے گا کہ ان نشانیوں پر سے گزرے گا، ایک اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ کی تخلیقات پر غور نہیں کرے گا تو لازماً وہ اس کی عظمت کا پوری طرح قائل نہیں ہوگا، ایسی صورت میں لازم ہے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو جائے گا، جیسا کہ فرمایا ہے کہ ان میں سے اکثر مشرک ہوں گے، اللہ اللہ! کتنی واضح بات ہے کہ ان ہی نشانیوں پر جو غور کرکے آگے بڑھے وہ متقی ہوگیا، مسلم ہوگیا اور جو صرف نظر کر گیا، لا پرواہ رہا وہ مشرک ہوگیا، اس شرک کا انجام ہلاکت کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے، سورہ الاعراف میں اسی ہلاکت کی اطلاع دی گئی ہے :

> کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور جس چیز کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا، شاید ان کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔(7:185)

آیت کا لفظ کلام پاک میں دو معنی میں استعمال ہوا ہے، ایک تو ان آیات کے لئے جو اللہ تعالیٰ کا پیغام ہیں اور کلام پاک میں درج ہیں، دوسرے ان تمام نشانیوں کے لئے جو کائنات میں پھیلی پڑی ہیں، اللہ تعالیٰ نے کائنات میں پھیلی اپنی نشانیوں کے مطالعہ کی کس قدر تاکید کی ہے اس کا اندازہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ قرآن حکیم میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، طلاق وغیرہ جیسے ارکان اور سماجی اُمور سے متعلق آیات کی تعداد ڈیڑھ سو ہے، جب کہ مطالعہ کائنات سے متعلق 756 آیتیں کلام پاک میں ہیں، اس سے نعوذ باللہ یہ مقصود نہیں کہ جن اُمور و احکام سے متعلق کم آیات ہیں وہ کم اہم ہیں اور مطالعۂ فطرت زیادہ اہم ہے، ایسا نہیں ہے؛ بلکہ یہاں بھی اللہ کی مشیت کا ایک نمونہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور وہ اس کی فطرت سے واقف ہے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ ایسے ارکان ہیں کہ جو دین کا لازم حصہ سمجھے جاتے ہیں، تاہم یہ مکمل دین بھی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے مطالعۂ فطرت کا جو بار بار ذکر کیا ہے وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اس قوم پر ایک دور وہ آئے گا جب یہ احکام الٰہی کے ایک حصے کو پکڑ کر بیٹھ جائے گی، مزید یہ کہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے مطالعۂ فطرت کے نتیجے میں ہی انسان پر رفتہ رفتہ راز کھلیں گے جو ہر دور میں اللہ کی عظمت کو ثابت کریں گے، حق کو واضح کریں گے اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنیں گے۔

اہل علم سے متعلق دو اہم بیانات کلام پاک میں دعوت فکر دیتے ہیں، سورۂ فاطر میں ارشاد ہے :

> کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، پہاڑوں میں بھی سفید سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح

انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔(35:27-28)

ان آیات میں سردست تین اشارے نظر آتے ہیں، اول یہ کہ کائنات میں رنگوں کے اختلاف میں بھی راز ہیں، یہ اشارہ علم جینیات (Genetics) اور علم طبقات الارض (Geology) سے متعلق ہے، دوسرے یہ کہ ان چیزوں کا علم رکھنے والے ہی اللہ کی عظمت اور کارکردگی کو اس طرح سمجھتے ہیں اور مرعوب رہتے ہیں کہ اللہ سے ڈرتے ہیں، تیسرے یہ کہ ان آیات میں بندگی کے درجات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ علم نہ رکھنے والے بھی اللہ کے بندے ہیں اور ہو سکتے ہیں تاہم ان میں سے صرف علم رکھنے والے ہی اس سے ڈرتے ہیں، علاوہ ازیں ان آیات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اصلی علم صحیفۂ فطرت کے مطالعہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

کفر یا انکار دو طرح سے ہوتا ہے، اولاً زبان سے کہ آپ کسی چیز کی موجودگی سے انکار کر دیں، دوسرا عملاً کہ آپ زبان سے تو انکار نہ کریں؛ لیکن آپ کا عمل اس کی موجودگی کا منکر ہو، مثلاً ایک سرکش بچہ منہ سے بھی کہہ سکتا ہے کہ میں ابا کا کہنا نہیں مانتا، دوسری صورت میں وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتا؛ بلکہ ابا جان، ابا جان کی رٹ بھی لگاتا ہے، تعریفیں بھی کرتا ہے؛ لیکن ابا حضور کے زیادہ تر احکامات کی خلاف ورزی کرتا ہے، کچھ ایسا ہی معاملہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رہے ہیں، کلام پاک کے کچھ احکامات کو، کہ جن پر عمل کرنا آسان ہے ہم نے اپنا لیا ہے، جب کہ دیگر احکامات سے اس طرح آنکھیں موڑ لی ہیں کہ ہم عملاً ان کے منکر ہو چکے ہیں، سورۂ البقرہ میں ارشاد ہے :

> تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو، پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دئے جائیں۔(2:85)

آگے ارشاد ہے :

> اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ۔(2:208)

ذرا غور کیجئے! آج ہماری ذلت وخواری کی وجہ یہی تو نہیں ہے کہ ہم نے کلام پاک کے ایک حصے کو تو اپنا لیا ہے؛ لیکن بقیہ احکامات کی طرف سے غافل ہو چکے ہیں، افسوس یہ ہے کہ ہم نے جن احکامات کی طرف سے رخ پھیر لیا ہے ان ہی میں نہ صرف ہماری اجتماعی فلاح پوشیدہ ہے؛ بلکہ دنیا وآخرت میں سرخروئی وکامیابی ہے اور ان ہی پر عمل کر کے ہم خیر اُمت کے فریضہ کو نبھا سکتے ہیں، صحیفۂ فطرت یعنی اللہ تعالیٰ کی کائنات کے مطالعہ کو آج ہم نے

اپنے اوپر لگ بھگ حرام کرلیا ہے، ہمارے تعلیمی اداروں کی اکثریت ان کو دنیوی علوم کے خانے میں رکھ کر ان سے کنارہ کش ہو چکی ہے، اب آیئے ذرا غور کریں کہ سورۃ النمل میں اللہ تعالیٰ کیا فرماتا ہے :

> اور ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے، پھر ان کو مرتب کیا جائے گا، یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے تو ان کا رب ان سے پوچھے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا حالاں کہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے۔(27:83-84)

یعنی اگر تم اللہ کی آیات کا علمی احاطہ نہیں کر رہے تھے تو پھر کیا کر رہے تھے — کیا اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں صحیفۂ فطرت کے مطالعے کا حکم ہوسکتا ہے کہ جس میں عبرت بھی ہے اور انکار کا انجام بھی پیش کر دیا گیا ہے، اگر ایسے واضح احکامات کے بعد بھی ہم علم کو تقسیم کئے ہوئے ہیں تو پھر اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس دین کے خلاف کافروں کی ایک ایسی سازش ہے کہ جس کی طرف سورۂ بقرہ میں اشارہ ہے :

> وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں اس دین سے پھیر لے جائیں، تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔(2:217)

ذرا سوچیے کیا دین کے واضح احکامات سے پھرنا دین سے پھرنا نہیں ہے؟

قصہ مختصر یہ کہ جب ہم دین سے پھرے تو علم سے بھی پھرے اور جب ہم علم سے پھرے تو علمی مزاج سے بھی پھرے، اب ہم آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے ہیں؛ کیوں کہ ہم اللہ کی آیات کی قرأت تو کرتے ہیں؛ لیکن ان کو سمجھ کر اللہ کی قدرت کا مشاہدہ و مطالعہ نہیں کرتے، ان پر غور و فکر نہیں کرتے صحیفۂ فطرت میں جستجو نہیں کرتے، مسند نشین ہو کر آیات کی گردان کرتے ہیں۔

اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد آیئے اب اس بات پر غور کریں کہ اس صورت حال کو کیوں کر تبدیل کیا جاسکتا ہے، علم کی تقسیم نے ہمارے علمی اداروں کو بھی تقسیم کر دیا ہے، ''دنیوی علم'' کے اداروں میں بچوں کو اسلامی تعلیمات میسر نہیں آتی اور ''دینی علوم'' کے اداروں میں علم کا مکمل احاطہ نہیں ہوتا، یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر بچے کو اسلام کی مکمل تعلیم نہیں دی جائے گی تو جدید علوم سے آراستہ ہو کر بھی وہ ایک نافع انسان نہیں بن پائے گا، علم اور ایمان زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں اگر ایک میں بھی جھول ہوا تو گاڑی ٹھیک نہیں چل سکتی،

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں جو ذہن پرورش پاتا ہے اس میں انسانیت کی چاشنی ہوتی ہے، اس جسم میں اسلامی روح ہوتی ہے جو اسے لوگوں کی بھلائی کے کاموں پر آمادہ کرتی ہے، تاہم یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ راقم جس اسلام کی تعلیمات کی بات کر رہا ہے وہ محض چند ارکان یا فرائض پر مشتمل نہیں ہیں؛ بلکہ اس کا اشارہ اس مکمل ضابطۂ حیات کی طرف ہے کہ جس کی تعلیم قرآن میں دی گئی ہے، ان تمام حقائق کی روشنی میں ہم صرف یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہمیں ہر حال میں اور ہر سطح پر قرآن کی طرف لوٹنا ہے، اس کو سمجھنا ہے اور اس کی روشنی میں اپنے تعلیمی نصاب ترتیب دینے ہیں، ہمیں ایسی مکمل درسگاہیں تیار کرنی ہیں کہ جن میں مسلم علماء تیار کئے جائیں، ہمیں اپنی یہ سوچ بدلنی ہے کہ مدرسے اور مسجد کی تعمیر میں چندہ دینا ثواب جاریہ ہے اور دنیوی تعلیم کے مدارس کو بنانا فضول یا زیادہ سے زیادہ دنیوی فائدہ اور شہرت کا کام ہے، یاد رکھئے ہر نافع علم کا فروغ ایک خالص دینی کام ہے، ہمیں اس انداز کے معلم تیار کرنے ہوں گے جو مکمل مسلم ذہن رکھتے ہوں اور جدید علوم میں بھی ماہر ہوں، اس کے لئے قابل عمل ترکیب یہ ہے کہ ہم میں سے جو لوگ علوم پر مہارت رکھتے ہیں وہ رضا کارانہ طور پر کلام پاک کا بغور مطالعہ کرکے، نیز علمائے قرآن کی مدد لے کر اپنے آپ کو تیار کریں یا دیگر حضرات کو اس نہج پر تیار کریں، معلمین کی تیاری کے بعد ہمیں اس انداز کے ''ماڈل مدارس'' بنانا ہوں گے جہاں ''مکمل تعلیم'' کا انتظام ہو، ان مدارس میں قرآن ناظرہ، ترجمہ اور تفسیر کے علاوہ جدید علوم اور زبانوں کا نصاب ہو 10+2 کے انداز میں بچہ یہاں سے فارغ ہوکر پھر چاہے تو جدید علوم میں مہارت حاصل کرے یا پھر اگر حدیث فقہ اور دیگر علوم شرعیہ کی تعلیم کا طلب گار ہو تو ان مدارس سے رُجوع کرے جو ان علوم کی تعلیم دیتے ہوں، ایسا ہر طالب علم کم از کم قرآنی تعلیمات سے بخوبی واقف ہوگا؛ لہٰذا توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کا کردار اور معاملات مسلم ہوں گے نیز مصالحتوں اور گنجائشوں سے پاک ہوں گے، قرآنی تعلیمات اس کے مشاہدے، تجربے، تجزیے اور فکر و تحقیق کی فطری صلاحیتوں کو اُبھار دیں گی، ان ہی صلاحیتوں کو تو آج ہم سائنسی فکر اور شعور کے نام سے جانتے ہیں، اس انداز پر تربیت شدہ عالم دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح اور مکمل ترجمانی کر سکے گا۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کا احساس کریں، تاہم ان پر نادم ہونے، اشک بار ہونے، ان کا ماتم کرنے یا ان کے لئے ذمہ دار کون ہے اس بحث میں جانے یا ذمہ داروں کا مرثیہ پڑھنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ ہمیں جہاد و عمل کا حکم دیتا ہے، اس بُرائی سے لڑنے کے لئے ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی سطح پر کمربستہ ہونا ہوگا، ہمیں ایک صالح، نافع اور مجسم ہمدرد و مفید معاشرے کے طور پر اُبھرنا ہوگا جبھی ہم اس دنیا میں عزت کے ساتھ زندہ رہ پائیں گے۔

حوالہ جات

1- خالدیارخاں،تاریخ تعلیم،اُردومرکزلاہور1960۔

2- سیدمناظراحسن گیلانی،ہندوستان میں مسلمانوں کانظام تعلیم وتربیت(حصہ اوّل)ندوۃ المصنفین،دہلی1944۔

3- فضل کریم خاں درّانی،اسلامی نظام تعلیم،قومی کتب خانہ،لاہور1932۔

4- سیدنوشہ علی(ایڈیٹر)،مسلمانان ہندوپاک کی تاریخ تعلیم،سلمان اکیڈمی،کراچی1963۔

Education Under Asaf Jah VII:A Retrospect. Hyderbad (Dn). The Govt. Central Press:1945 -5

Di Bona, Joseph (Ed). One Teacher One Scool. Biblia Impex (P) Ltd., New Delhi. 1983. -6

7- سیدنوراللہ،جے،پی نائک،تاریخ تعلیم ہند،نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا،نئی دہلی1973۔

Mahmood Syed. A History of English Education in India (1781-1893). M.A.O. College, Aligarh.1895-8

Dutt, R.P. India Today. People's Publishing House, Bombay, 1949 -9

Faruqi, Z.H. The Deoband School And The Demand For Pakistan. Asia Publishing House, Bombay, 1959 -10

Indian National Congress: Language Policy. Muslim India. Jan. 1985 -11

12- شیخ محمداکرام،موج کوثر،مرکنٹائل پریس،لاہور1940۔

13- ضیاءالحسن فاروقی وغیرہ(مرتبین)مجیب صاحب،احوال وافکار،مکتبہ جامعہ،دہلی1984۔

George Sarton. An Introduction to the History of Science, London. 1936. -14

Robert Brifalt. The Making of Humanity, London.1983. -15

16- مولاناابوالکلام آزاد،غبارخاطر،ساہتیہ اکادمی،نئی دہلی۔

Donald Compbell. Arabian Medicine and its Influence on the Middle Ages. (Vol.I) London.1926 -17

18- طٰحہٰ حسین مترجم مولاناعبدالسلام ندوی،ابن خلدون،معارف پریس،اعظم گڑھ1940۔

19- مولاناابوالحسن علی ندوی،مسلم ممالک میں اسلامیت اورمغربیت کی کشمکش،ندوۃ العلماء1963۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید اور ارضیاتی سائنس

مولانا سید عبد الرشید⊙

قرآن کریم نہ فلسفہ وتاریخ کی کتاب ہے اور نہ فلکیات، ارضیات، طبیعیات، میڈیکل سائنس، سیاسیات، معاشیات اور دیگر علوم جدیدہ وقدیمہ کی؛ بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے، اور انسانیت کی تا قیام قیامت رہنمائی کے لئے ماوراء الغیبیات، فلسفہ وعلم الاخلاق، مناسب ترین سیاسی معاشی سماجی اُصول، ادیان وملل کی پیچیدہ گتھیوں کی عقدہ کشائی اور ان کی تاریخی غلطیوں کی تصحیح اس میں مذکور ہے اور چوں کہ یہ خالق کی طرف سے اشرف المخلوقات کے لئے رہنمائی ہے؛ اس لئے معرفت باری کے لئے قدرت کی نیرنگیوں میں غور وتدبر کی دعوت دی گئی ہے اور کائنات میں قدرت خداوندی کو نمایاں کیا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں حیرت انگیز طور پر ایسے سائنسی حقائق بیان ہوئے ہیں، جن کی تحقیق اکتشافات واختراعات کے موجودہ دور ہی میں ممکن ہوئی ہے، اور چوں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ان معلومات کا حصول کسی انسانی ذریعہ سے ناممکن اور غیر معقول ہے؛ اس لئے یہ علمی حقائق اس کتاب کے خالق کائنات کی طرف سے ہونے کی دلیل ہیں، ارشاد باری عز اسمہ ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ، (حم السجدہ:۵۳) ''ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گردونواح میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جاوے گا کہ وہ قرآن حق ہے''۔

قرآن وسنت کے سائنسی اعجاز سے بحث کرنے والے علماء نے یہ اُصول قرار دیا ہے کہ اس موضوع کے مطالعہ کے وقت تجربی علم سے ثابت شدہ حقائق اور اعداد وشمار پر اعتماد کیا جائے، نہ کہ نظریاتی علم (Hypothetical Knowledge) کو زیر بحث لایا جائے، (۱) اس قاعدہ کے تحت اس مقالہ میں ہم زمین سے متعلق قرآنی آیات کا جدید ارضیاتی سائنس (Geology) کی روشنی میں مطالعہ کریں گے۔

جیولوجی Geology کا لفظ یونانی زبان کے ge یعنی زمین اور Logos یعنی مطالعہ سے مشتق ہے،

⊙ استاذ: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

(۱) ملاحظہ ہو: مقدمہ موسوعۃ الاعجاز العلمی فی القرآن والسنۃ، راتب النابلسی۔

اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ علم ہے، جس میں زمین کی ترکیب وتشکیل، تخلیق کے وقت ظہور پذیر واقعات، زمین سے متعلق تمام چیزوں کی کیفیت اور مختلف عوامل کی بناء پر ہونے والی تبدیلیوں سے بحث کی جاتی ہے، خواہ یہ اسباب داخلی ہوں جسے زلزلے اور آتش فشاں، یا خارجی ہوں جیسے ماحول اور شہاب ثاقب وغیرہ۔

بنیادی طور پر علم الارض Geology علم الکواکب یا (Planetary Science) کے زمرے میں آتا ہے، دیگر سیاروں کے درمیان زمین تنہا سیارہ ہے جس کے اوپر حیات کا وجود ہے، قرآن کریم منکرین کو معرفت باری تعالیٰ کے لئے اور مؤمنین کو ایمان وایقان میں اضافہ کے لئے اس زمین میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے، ارشاد ہے :

وَفِیْ الْأَرْضِ آیَاتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ، وَفِیْ أَنفُسِکُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ . (۱)

اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی، کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا۔

قرآن پاک کا نزول متفرق جگہوں اور مختلف زمانوں میں ہوا ہے، اس میں باری تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی نشانیوں کے طور پر بر و بحر کا ذکر آیا ہے، یہ عجیب اتفاق ہے، جس کو معجزہ کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں ''بحر'' کا لفظ ۳۳ مرتبہ، ''بر'' کا لفظ ۱۲ مرتبہ اور ''یبس'' کا لفظ ایک مرتبہ آیا ہے۔ (۲)

- ⊙ لہٰذا کل خشکی : 13=1+12
- ⊙ اور پانی : 33
- ⊙ نتیجتاً کل زمین : 46=33+13

(۱) 13 کا 46 میں کیا تناسب ہے؟

46\13×100=28.26087% خشکی۔

(۲) 33 کا 46 میں کیا تناسب ہے؟

46\33×100=71.73913% پانی۔

یہی وہ دقیق تناسب ہے جس کے قریب تک جدید علم باریک حسابات کے بعد پہنچ سکا ہے، قرآن نے اس کے بارے میں اس وقت انکشاف کیا، جب کہ انسانیت نے ملکوں کے درمیان کا فاصلہ بھی صرف قیاس ہی سے ناپا تھا۔ (۳)

---

(۱) الذاریات: ۲۰-۲۱۔ (۲) ملاحظہ ہو: المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم ، فؤاد عبد الباقي ۔

(۳) دکتور شوقی ابو خلیل کے محاضرہ سے مستفاد۔

زمین میں باری تعالیٰ کی نشانیوں کے ذیل میں زمین کی نباتات، معدنیات، زلزلوں، پہاڑ، سمندر کا تموج اور اس کی لہریں، لیل ونہار کی گردشیں، زمین کی تخلیق اور اس کی اندرونی پرتوں وغیرہ کے متعلق قرآن مجید میں آیات وارد ہوئی ہیں اور اس ضمن میں علم الارض (Geology) اور اس کے فرعی علوم: علم المعادن (Mineralogy) علم الصخور (Petrolgy) علم الزلزال (Earthquake) علم المحیطات (Oceanography) اور علم طبقات الارض وغیرہ کے حیرتناک اسرار کا ذکر آ گیا ہے اور ایسا اس لئے ہوا؛ تا کہ قرآن نوع انسانی کے متمدن وترقی یافتہ دور میں بھی ایسا ہی معجز ثابت ہو جیسا کہ ظہور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں معجز ثابت ہوا: لِّكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (الانعام:۶۷) ''ہر خبر کے وقوع کا ایک وقت ہے اور جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا''۔

علم جتنا ترقی کرتا جائے گا، قرآن کی نشانیاں کھل کر سامنے آتی رہیں گی اور کائنات میں قرآن کا اعجاز کھلتا جائے گا۔

قالتا أتینا طائعین

آج کے زمانہ میں اگر یہ کہا جائے کہ زمین اور آسمان سے ابتداء خلقت میں صوتی لہریں خارج ہوئی تھیں تو یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی؛ لیکن نزول قرآن کے زمانہ میں یہ بات یقیناً قابل تعجب تھی؛ کیوں کہ اس وقت آواز کی لہروں اور صوتی امواج کا تصور موجود نہیں تھا؛ لیکن قرآن نے ایک سے زائد آیتوں میں یہ بات بیان کی ہے اور مفسرین نے اس کی تفسیریوں کی کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو گویائی عطا کی اور وہ گویا ہوئی، ارشاد خداوندی ہے:

ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعاً أَوْ كَرْهاً قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِيْنَ . (حم السجدۃ:۱۱)

پھر آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت دھواں سا تھا، سو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا زبردستی سے، دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔

اور ارشاد ہے:

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءِ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنظَرِيْنَ. (الدخان:۲۹)

سو نہ تو ان پر آسمان اور زمین کو رونا آیا اور نہ اس کو مہلت دی گئی۔

www.discoverymagazem.com پر ایک مقالہ بعنوان Earth Speaks کے نام سے موجود ہے اور پروفیسر مارک ویٹل (ورجینیا یونیورسٹی) نے www.space.com پر ایک مقالہ بعنوان Big Bang

Sound نشر کیا ہے، پروفیسر مارک ویٹل نے بتایا کہ یہ صوتی امواج کائنات سے اس وقت خارج ہوئیں، جب کہ اس کی عمر ۳۸۰ ہزار سال تھی اور کائنات کے توسع اور اور پھیلاؤ کے نتیجہ میں خارج ہونے والی اصوات زمین کی عمر ایک ملین سال ہونے تک جاری رہیں، جس وقت کہ ستاروں کی تشکیل ہوئی۔(۱)

گہوارۂ زمین

اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہمارے لئے فرش بنایا ہے:''وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ''(الذاریات:۴۸) (اور زمین کو ہم نے بچھادیا، ہم کیا خوب ہموار کرنے والے ہیں)اس آیت کی روشنی میں سائنسی حقائق کا جائزہ لیجئے؛ تاکہ زمین کا فرش ہونا اور اس کا''مہد'' ہونا عیاں ہوجائے۔

علم ارضیات کے موافق خط استواء کے پاس زمین کا محیط 40,075.16 کیلومیٹر ہے اور سطح کا رقبہ 510,072,000 مربع کیلومیٹر ہے، جس میں 148,940,000 مربع کیلومیٹر یعنی 29.2 فیصد خشکی اور باقی 361,132,000 مربع کیلومیٹر پانی ہے، زمین کا وزن 736×10^{24} کیلوگرام ہے، زمین کا حجم 1.08321×10^{12} مکعب کیلومیٹر ہے، زمین اپنے محور پر گھومنے کے علاوہ 29.78 میٹر فی ثانیہ یا 107,208 کم فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے، وہ اس کا مدار ہے، زمین کا محور اس مدار پر ساڑھے 62 درجہ جھکا ہوا ہے، اسی لئے ہمارے دن رات میں فرق واقع ہوتا رہتا ہے، اگر زمین کا محور اس مدار ارضی پر عموداً واقع ہوتا تو ہر جگہ 12 گھنٹے کا دن اور 12 گھنٹے کی رات ہوتی، اور اگر یہ محور مدار کے متوازی ہوتا تو نصف حصہ ہمیشہ روشن رہتا اور دوسرا نصف ہمیشہ تاریک رہتا:

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَداً إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيكُم بِضِيَاءٍ أَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ، قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَداً إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيكُم بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ . (القصص:۷۱-۷۲)

اگر زمین کی محوری گردش میں ذرا تیزی آجائے تو دن رات گھٹ جائیں اور اگر محوری گردش ذرا سی دھیمی ہوجائے تو دن رات طویل ہوجائیں؛ لیکن یہ گردش تقریباً ۲۴ گھنٹے میں پوری ہوتی ہے، یہی مدت انسانی جسم کی ساخت، عمر اور حرکت کے موافق ہے، انسان سات یا آٹھ یا نو گھنٹے سے زیادہ نہیں سوسکتا، اسی لئے باری تعالیٰ نے ایک اندازہ مقرر کردیا:''ذالک تقدیر العزیز العلیم''جو زبردست اور خوب جاننے والا ہے۔

---

(۱) یہ مقالہ htep://www.space.com/scienceastronomy/big_bang_sound_040601.htmt پر موجود ہے، نیز ملاحظہ ہو:www.kahee7.com۔

زمین کروی یعنی گول ہے، اس کا محیط اور دائرہ کا قطر زندگی کی نشو نما کے لئے از حد مناسب ہے، جہاں نظر دوڑائی جائے، ہم کو نہ زمین کی کرویت محسوس ہوتی ہے اور نہ اس کی گردش؛ بلکہ ایک مسطح اور ہموار شکل نظر آتی ہے، اگر زمین کا محیط 40,075 کیلومیٹر سے کم یا زیادہ ہوتا تو ہرگز یہ شکل فراہم نہ ہوسکتی ''وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ'' (الغاشیۃ:۲۰) مفسر ابو حیان فرماتے ہیں کہ ''سطحت'' یعنی چلنے پھرنے والوں کے لئے ہموار کردی گئی، اگر زمین کی مداری گردش تیز ہوتی تو ساری مخلوقات خلا میں بکھر جاتیں اور کشش ثقل زمین پر استقرار کے لئے ناکافی ہوتی :

اللهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَاراً. (المؤمن:۶۴)

اللہ ہی ہے جس نے زمین کو (مخلوق کا) قرار گاہ بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان نشانیوں کو اس لئے بیان کیا؛ تاکہ اس کی ربوبیت کو انسان پہچان لے، اسی لئے آگے فرمایا :

ذٰلِكُمُ اللهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْئٍ لَّا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّى تُؤْفَكُوْنَ ، كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِآيَاتِ اللهِ يَجْحَدُوْنَ ، اللهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَاراً وَالسَّمَاءَ بِنَاء وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ذٰلِكُمُ اللهُ رَبُّكُمْ فَتَبَارَكَ اللهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ . (المؤمن:۶۲-۶۴)

پس یہ اللہ ہے تمہارا رب، سو بڑا عالی شان ہے اللہ جو سارے جہان کا پروردگار ہے، وہی (ازلی ابدی) زندہ رہنے والا ہے، اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو تم (سب) خالص اعتقاد کرکے اس کو پکارا کرو، تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہان کا۔

''قرار'' لغت میں ٹھہرنے کے لائق جگہ اور سکون و اطمینان حاصل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں، ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ اس نعمت کا ذکر یوں فرماتے ہیں :

أَمَّن جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَاراً وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَاراً وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزاً أَإِلَهٌ مَّعَ اللهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ . (النمل:۶۱)

یا وہ ذات جس نے زمین کو (مخلوق کا) قرار گاہ بنایا، اور اس کے درمیان نہریں بنائیں اور اس زمین کے ٹھہرانے کے لئے پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان ایک حد فاصل بنائی، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین نہیں مانتے) بلکہ اس میں زیادہ تو (اچھی طرح) سمجھتے بھی نہیں۔

امام ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی اللہ نے زمین کو ساکن اور ثابت مقام بنایا کہ وہ نہ ڈگمگاتی ہے اور نہ ہلتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو زمین پر بسنا اور زندگی گذارنا خوشگوار نہ ہوتا، اللہ نے اپنے فضل اور اپنی رحمت سے اس کو ہموار کر کے بچھا دیا، نہ متزلزل ہوتی ہے اور نہ ہلتی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ''اللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَاراً وَالسَّمَاءَ بِنَاءً''۔ (المومن:۶۴)(۱)

والارض ذات الصدع

''صدع'' کی تفسیر میں چار اقوال منقول ہیں، جن کو ماوردی نے 'النکت والعیون' میں اور دوسرے مفسرین نے بیان کیا ہے، ایک یہ کہ اس سے نباتات مراد ہیں، یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، دوسرے یہ کہ اس سے وادیاں مراد ہیں، یہ ابن جریج کا قول ہے، تیسرے یہ کہ اس سے راستہ مراد ہے، یہ مجاہد کا قول ہے، چوتھے یہ کہ اس سے کھیتی مراد ہے، ایک اور قول یہ ہے کہ اس سے مردے مراد ہیں؛ لیکن ''صدع'' لغت میں ''شق'' کو کہتے ہیں اور دیگر معانی جو مراد لئے گئے ہیں، وہ صدع بمعنی 'ما یصدع به' کے اعتبار سے ہیں؛ کیوں کہ زمین کے پھٹنے سے ہی نباتات اور کھیتی کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے پھٹنے سے قیامت کے روز مردوں کا ظہور ہوگا، ابوحیان نے البحر المحیط میں اور آلوسی نے روح المعانی میں مجاہد کا یہ قول بھی ذکر لیا ہے کہ اس سے زمین کی خندقیں دراڑیں اور وادیاں مراد ہیں، عبدالرحمٰن بن زید نے 'ذات الصدع' کی تشریح 'ذات الانشقاق' سے کی ہے۔

بیسویں صدی کے وسط سے سائنس دانوں نے غور کرنا شروع کیا کہ زمین ایک ٹکڑا نہیں؛ بلکہ کئی پلیٹوں میں منقسم ہے اور ان پلیٹوں کے درمیان دراڑیں ہیں جو ہزاروں کیلومیٹر دور تک چلی گئی ہیں، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بحر اوقیانوس (Pacific ocean) کی گہرائی میں ۴۰ ہزار کیلومیٹر لمبی حلقہ نما ایک دراڑ کی دریافت ہوئی ہے، جس کو Pacific Ring of Fire کہتے ہیں جو امریکہ کے مغربی ساحل اور الاسکا سے ہوتے ہوئے جاپان، فلپائن، انڈونیشیا اور بحر اوقیانوس کے جنوبی مغربی جزیروں سے گذر کر نیوزی لینڈ تک پھیل گئی ہے۔

اسی طرح کیلی فورنیا (امریکہ) میں سان اینڈ ریس کی دراڑ جو تقریباً ایک ہزار کیلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے اور زمین کو اس مقام پر دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، اتھوپیا میں پائی جانے والی دراڑ جو سرزمین عرب کی پلیٹ کو براعظم افریقہ کی پلیٹ سے الگ کرتی ہے، قرآن پاک کی آیت 'والأرض ذات الصدع'' قرآن کے قول فیصل اور حق ہونے کی واضح دلیل ہے، جس میں ۱۴۰۰ سال پہلے ان ارضیاتی حقائق کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر سورۂ نمل، آیت: ۶۱

زلزلہ اور وضع حمل

ایک حالیہ سروے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ زلزلہ کے دوران پائی جانے والی کشیدگی اور دباؤ کو حاملہ خواتین میں ولادت کے عمل کو تیز کرنے میں بڑا دخل ہے، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کے محققین کی جانب سے کئے گئے ایک سروے میں پتہ چلا ہے کہ حمل کے ابتدائی مراحل میں اگر زلزلہ آئے تو رحم مادر میں موجود ولادت کے وقت کی تحدید کے ذمہ دار ایک آلہ میں تیزی آجاتی ہے۔

۱۹۹۴ء میں ہونے والے زلزلے نے لاس اینجلس کو ہلا کر رکھ دیا، زلزلہ کی شدت ریکٹر اسکیل پر 7.6 ریکارڈ کی گئی، جس کے نتیجے میں 150 افراد ہلاک ہوئے اور 40 ارب ڈالر کے نقصانات کا اندازہ لگایا گیا، یونیورسٹی آف کیلی فورینا کے سروے میں 40 حاملہ خواتین کا بھی احاطہ کیا گیا، جن میں سے 5 خواتین کے ابتدائی تین ماہ سے کم کے حمل زلزلہ کی وجہ سے ساقط ہوگئے، جب کہ 8 خواتین کا آخری تین ماہ کے دوران کا حمل ساقط ہوگیا، مزید 11 خواتین کا اس زلزلے میں حمل ساقط ہوا، مورا گلین نامی محققہ کا کہنا ہے کہ کشیدگی اور دباؤ سے رحم مادر میں موجود گھڑی میں تیزی آجاتی ہے۔

زلزلہ ایک تباہ کن اور خوفناک قدرتی عمل ہے، سائنس دانوں نے زلزلہ کے دوران آنے والی صوتی امواج سے زمین کے سات طبقات کی جانکاری میں مدد لی ہے، جدید تحقیق یہ ہے کہ زلزلہ کی صوتی لہریں حاملہ خواتین پر اثر انداز ہوتی ہیں اور پیدائش کے عمل کو تیز کر دیتی ہیں اور جتنا زیادہ طاقتور زلزلہ ہوگا، اتنا ہی پیدائش کا عمل تیز ہوگا۔

قرآن کریم نے زلزلہ اور پیدائش کے عمل میں ربط کو چودہ سو سال پہلے ذکر کیا اور ارشاد باری ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ، يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا . (الحج:۱-۲)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، (کیوں کہ) قیامت (کے دن) کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی، جس روز تم لوگ اس (زلزلہ) کو دیکھو گے (اس روز) تمام دودھ پلانے والیاں (مارے ہیبت کے) اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائیں گی اور تمام حمل والیاں اپنا حمل (پورے دن ہونے سے پہلے) ڈال دیں گی۔

طبقات الارض

سائنس دانوں کا خیال تھا کہ زمین صرف تین طبقات پر مشتمل ہے، ایک قشرہ (Crust)، دوسرا مرکز

(Core) اور تیسرے دونوں کے درمیان کا حصہ؛ لیکن بعد میں اس بات کا پتہ چلا کہ مرکز Core درحقیقت دو پرتوں پر مشتمل ہے :

(۱) ایک خارجی پگھلا ہوا حصہ:Melten outer core۔

(۲) دوسرا اندرونی مرکز:Inner core۔

پھر اس بات کا انکشاف ہوا کہ قشرہ Crust کے نیچے ایک چٹانی غلاف پایا جاتا ہے، پھر اس بات سے پردہ اُٹھا کہ Mentle یعنی وسطی حصے میں دو پرتیں پائی جاتی ہیں، جن میں ایک حصہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ گرم ہے، اب آخری تحقیقات جو 2007ء میں سامنے آئی ہیں، وہ بتاتی ہیں کہ زمین سات پرتوں میں منقسم ہے، جن میں ہر پرت دوسری پرت کے مقابلہ حرارت اور کثافت میں یکسر مختلف ہے۔

ہمیں تعجب ہوگا جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے وقت اس آیت کو پڑھتے ہیں ''اَللهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ '' (الطلاق:۱۲) آج جو سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں وہ خالق کے محیط علم کی روشن دلیل ہیں، خدا کا حکم جس طرح ساتوں آسمانوں میں جاری ہے، اسی طرح زمین کی ساتوں پرتوں میں بھی جاری ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کو اسی نے اپنے علم کے گھیرے میں لے رکھا ہے :

یَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا أَنَّ اللهَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ وَأَنَّ اللهَ قَدْ أَحَاطَ بِکُلِّ شَیْئٍ عِلْماً . (الطلاق:۱۲)

ادنی الارض

قرآن کریم کے تاریخی اعجاز اور مستقبل کی پیش گوئی کے سلسلہ میں سورہ روم میں روم و فارس کے معرکہ کا وقوع سے سات برس پیشتر ذکر اپنی مضبوط حیثیت رکھتا ہے، اس اجمالی پیش گوئی میں جو سورہ روم کی ابتدائی چند آیات میں آئی ہے ایک ضمنی اشارہ اس مکان کے متعلق ہے، جہاں یہ معرکہ پیش آیا اور اس مقام کے لئے ''أدنی الأرض '' کا لفظ استعمال ہوا ہے، 'أدنی 'انگریزی زبان کے Lowest کا مترادف ہے جو پست ترین کے معنی میں ہے،(۱) اور 'دنـا یـدنو دنواً ' سے ادنی بمعنی 'أقرب ' آیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی مقاتل وغیرہ حضرات کا قول ہے کہ اس سے مراد اُردن اور فلسطین کے درمیان کا حصہ ہے۔(۲)

دشوقی ابوخلیل أطلس القرآن میں رقم طراز ہیں: ''أدنی الأرض ''یعنی فلسطین کا نشیبی حصہ، بحرمیت جو سطح سمندر سے 392 میٹر نیچے ہے۔

---

(۱) المورد القریب۔ (۲) ملاحظہ ہو: تفسیر سمرقندی ، البحر المحیط زاد المسیر، الروم:۳۔

فأدنى الأرض : القريبة المنخفضة ، وهذا تحقق كما أخبر القرآن الكريم بانتصار لروم على الفرس في فلسطين ، وأدنى الأرض أخفض نقطة على سطح الأرض كافة ، وهي البحر الميت —— ۳۹۲ متر—— اقرب أرض الروم إلى فارس والجزيرة العربية . (۱)

پروفیسر پالمر امریکہ کے صف اول کے ماہر ارضیات ہیں، مسلمانوں کے ایک گروپ نے ان سے ملاقات کے درمیان جب ان کو قرآن وسنت میں موجود سائنسی معجزات کے بارے میں بتایا تو وہ بہت متعجب ہوئے، ان کو قرآن مجید میں مذکور زمین کے سب سے پست حصہ کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ یروشیلم کے نزدیک ہے، جہاں ایرانیوں اور رومیوں کی لڑائی ہوئی تھی، سورۂ روم میں ہے ''الم غلبت الروم في أدنى الأرض '' (آیت:۱-۳)

پروفیسر پالمر نے جغرافیائی کرہ (Topografical Globe) کو گھمایا اور یروشیلم کے نزدیک کے علاقہ پر مخصوص نشان کو نمایاں کیا، ان کو تعجب ہوا کہ اس علاقہ کے ایک جانب ایک علامت ان الفاظ کے ساتھ لگی ہوئی ہے The lowest part on the face of earth یہیں پر بحر مردار ہے جو سطح سمندر سے 392 فٹ نیچے ہے۔

ظلمات البحر اللجی

Geology (علم الارض) کی ایک شاخ Oceanography (علم البحار) بھی ہے، قرآن میں سمندر، اس میں میٹھے اور نمکین پانی کے ایک ساتھ بہاؤ، روز قیامت اس میں ہونے والے انفجار وغیرہ کے متعلق متعدد آیات وارد ہوئی ہیں، ان میں سے سورۂ نور کی ایک آیت میں کافروں کے اعمال کی تشبیہ گہرے سمندر کی تاریکیوں سے دی گئی ہے، ارشاد خداوندی ہے :

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّن فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللهُ لَهُ نُوراً فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ . (النور:۴۰)

یا (ان کافروں کے اعمال کی مثال) ایسی ہے جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے کہ اس کو ایک بڑی موج نے ڈھانک لیا ہو، اس کے اوپر دوسری موج ہو، اس کے اوپر بادل، اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) کہ اگر اپنا ہاتھ نکالے تو دیکھنے کا احتمال بھی نہیں، جس کو اللہ ہی نور نہ دے اس کو (کہیں سے بھی) نور نہیں (میسر آسکتا)۔

(۱) أطلس القرآن:۱۶۴۔

بحر لغت میں کثیر پانی یا پانی کی بڑی مقدار کو کہتے ہیں، خواہ میٹھا ہو یا کھارا، ابن فارس کہتے ہیں :

البحر : يطلق في اللغة على الماء الكثير ، ملحا كان أو عذبا ، وقد غلب على الملح حتى قل في العذب .(۱)

''لجي'' لُجّة یعنی پانی کا بڑا حصہ، اور ''بحر لجي'' بحر بے پایاں، اتھاہ سمندر، لسان العرب میں ہے :

لجة البحر حيث لا يدرك قعره ، ولج الليل شدة ظلمته وسواده . (۲)

صاحبِ کشاف فرماتے ہیں :

اللجيّ : العميق الكثير الماء ، منسوب إلى اللج وهو معظم البحر . (۳)

مفسرین کے نزدیک ظلمات کی تفسیر

تفسیر ماوردی میں ہے :

ان ظلمتوں سے مراد بادل کی تاریکی، رات کی تاریکی، اور سمندر کی تاریکی ہے۔(۴)

واحدی اور بغوی کے نزدیک بادلوں، موج اور سمندر کی تاریکیاں ہیں، (۵) امام آلوسی فرماتے ہیں: ظاہر آیت سے پتہ چلتا ہے کہ مانع رؤیت تاریکی کی شدت ہے اور مراد یہی ہے؛ کیوں کہ اس جہان میں عادۃً رویت کا سبب روشنی ہے اور ارشاد باری: ''من فوقه سحاب'' کا مطلب یہ ہے کہ اس موج کے اوپر تاریک بادل ہیں جو ستاروں کی روشنی کو روک لیتے ہیں۔(۶)

اب ہم جدید اکتشافات کی روشنی میں اس آیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور سمندر کی تہہ میں پیدا ہونے والی تاریکیوں کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں :

پہلا حاجز بادل

سورج کی روشنی جب کرۂ ہوائی تک پہنچتی ہے تو بالائے بنفشی شعاعوں کے اکثر حصہ کو اوزون کی پرت واپس لوٹا دیتی ہے اور ہوائی غلاف کے نچلے حصے تک پہنچتے پہنچتے روشنی کا تقریباً 30 فیصد حصہ واپس منعکس ہو چکا ہوتا ہے، اس کے بعد جو روشنی باقی بچتی ہے اس کا مزید 19 فیصد حصہ بادلوں، پانی کے بخارات، ہوا اور گرد و غبار کے ذرات میں جذب ہو جاتا ہے، اس طرح تقریباً 49 فیصد روشنی کی شعاعیں زمین تک نہیں پہنچتیں اور تاریکی کی ابتداء ہو جاتی ہے۔

(۱) معجم مقاییس اللغۃ مادہ : ب ، ح ، ر۔ (۲) لسان العرب، مادہ : لجج۔

(۳) کشاف:۳۰۹/۴۔ (۴) النکت و العیون:۱۱۱/۴۔

(۵) الوسیط للواحدی:۳۲۲/۳، تفسیر البغوی:۳۵۰/۳۔ (۶) روح المعانی:۱۸۳/۱۸۔

دوسرا حاجز سطح سمندر کی موج

تقریباً 35 فیصد زیریں سرخ شعاعوں کا استعمال سمندری پانی کی تبخیر، بادلوں کے بننے اور سمندری نباتات میں ہونے والے ضوئی تعامل میں ہوتا ہے، اور باقی شعاعوں کا مزید 5 فیصد حصہ سطح سمندر کی موجیں منعکس کرتی ہیں، اسی انعکاس کی وجہ سے سمندر کی سطح چمکدار دکھائی دیتی ہے۔(۱)

تیسرا حاجز موج داخلی

اب روشنی کی یہ شعاعیں جو سطح سمندر کو پار کر کے اندر داخل ہوتی ہیں، تو رنگوں کے طول موج کے اختلاف کے سبب یکساں طاقت سے اس میں نفوذ نہیں کرتیں، اس وجہ سے روشنی کا تناسب سطح سمندر کے مقابلہ 35 میٹر کی گہرائی پر 10 فیصد رہ جاتا ہے، جو 85 میٹر پر 1 فیصد اور 135 میٹر پر 0.1 فیصد اور 190 میٹر پر 0.01 فیصد رہ جاتا ہے، (۲) روشنی کی مقدار میں کمی کا سبب پانی میں درجہ بدرجہ رنگوں کا جذب ہونا ہے، سرخ رنگ 20 میٹر پر جذب ہوجاتا ہے، 30 میٹر پر نارنگی رنگ، پھر 50 میٹر پر زرد رنگ، پھر 100 میٹر پر سبز، پھر اُودا اور بنفشی رنگ اور اخیر میں 200 میٹر پر آسمانی رنگ جذب ہوتا ہے، (۳) — اور یہ تاریکیاں بتدریج وقوع پذیر ہوتی ہیں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''**ظلمات بعضها فوق بعض**''۔

اس طرح سمندر میں 200 میٹر پر تقریباً کلی تاریکی پیدا ہوجاتی ہے اور سورج کی روشنی کا 0.01 فیصد سے بھی کم حصہ باقی رہتا ہے، جو موجوں کے مسلسل تلاطم اور پانی کی کثافت کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے سطح سمندر سے 1000 میٹر (ایک کیلومیٹر) پر بالکلیہ معدوم ہوجاتا ہے، جہاں پر موج داخلی تیسرے حاجز کا کام کرتی ہے اور روشنی کا ذرا سا حصہ بھی آگے نہیں بڑھتا، اس طرح گہرے سمندر میں مکمل تاریکی کا راج ہوتا ہے۔

سائنس دانوں نے اس بات کا پتہ لگایا ہے کہ ہر سمندر میں ایک گہرا عمیق علاقہ پایا جاتا ہے، جہاں کا پانی سمندر کی تہہ سے 1000 میٹر بلند ہوتا ہے، یہ بلندی کہیں 2000 میٹر تک بھی ہوتی ہے، اسی علاقہ کو آیت بالا میں ''لجی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سائنس دانوں نے یہ بھی پتہ لگایا ہے کہ یہ گہرا سمندر اوپری سمندر سے تمام چیزوں میں مختلف ہوتا ہے، اپنی حرارت، کثافت، نمکیات کے تناسب اور سمندری زندگی کے حساب سے یہ ایک مستقل سمندر ہے، یہاں کے حیوانات بالائی سمندر کے حیوانات سے یکسر مختلف اور الگ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک عام انسانی ذہن

(۱) امواج البحر اللجی، اعداد: مجدی عبد الشافی۔ (۲) امواج البحر اللجی: عبد المجید زندانی۔

(۳) موسوعة الإعجاز العلمي: ۴۴۱، بحوالہ: جیرلوف کی کتاب: Marine optics۔

میں یہ خیال بھی نہیں آسکتا کہ اس ایک سمندر میں الگ الگ دوسمندر پائے جاتے ہیں، ریسرچ اور تحقیق اور سائنسی اکتشافات کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ بحرِعمیق جس کو قرآن نے ''بحر لجی '' کے نام سے ذکر کیا ہے، داخلی موج کے نیچے موجود ہے اور اس سمندر کو اوپری سمندر سے جدا کرنے والی وہ موج ہے جو ان دونوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔

1955ء میں سائنس دانوں نے اکتشاف کیا کہ 1000 میٹر گہرائی پر ایسی موجیں پائی جاتی ہیں جو سطح سمندر کی موجوں سے اپنے طول موج اور بلندی میں سینکڑوں گنا زیادہ ہیں، (من آیات الاعجاز العلمی) —— ان کی لمبائی بیسیوں سے سینکڑوں کلومیٹر تک ہوتی ہے، اور اونچائی سومیٹر تک، یہ موجیں 5 تا 100 سنٹی میٹر فی ثانیہ کی رفتار حرکت کرتی ہیں اور 4 منٹ سے 25 گھنٹے تک چلتی رہتی ہیں، یہ شدید اضطرات اور تحرک جو داخلی موج میں پیدا ہوتا ہے، اس کی طرف قرآن کریم نے ''یغشاہ'' کے لفظ سے اشارہ کیا ہے اور علم صرف کا قاعدہ ہے کہ مضارع کا صیغہ تجدد اور استمرار پر دلالت کرتا ہے؛ جب کہ یہ لفظ سطح سمندر کی موج کے لئے استعمال نہیں کیا گیا، جہاں اس قدر شدید تحرک واضطراب نہیں پایا جاتا، (امواج البحر اللجی ،مجدی عبدالشافی) اور پھر اس تحرک کی وجہ سے یہ موج روشنی کے لئے حاجز کا کام دیتی ہے اور روشنی اپنی انتہائی تیز رفتار کے باوجود جو خلا میں تین لاکھ کیلومیٹر فی ثانیہ اور 250,000 کیلو میٹر فی ثانیہ پانی میں ہوتی ہے، سمندر میں 1000 میٹر سے زیادہ نہیں جاسکتی۔

یہ ناممکن تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کوئی شخص سمندر میں ان مقامات تک رسائی حاصل کرے، جہاں کے بعض حصوں میں پانی کا دباؤ 600 کیلوگرام فی سنٹی میٹر ہوجاتا ہے، انسان اپنے عادی جسم کے ساتھ 30 میٹر سے زیادہ پانی میں نہیں جاسکتا؛ کیوں کہ اس سے آگے پانی کا دباؤ فضائی دباؤ سے چار گنا زیادہ ہوجاتا ہے اور نائٹروجن خون میں گھلنے لگتی ہے، جس کی وجہ سے انسان اپنے جسم پر کنٹرول کھودیتا ہے، جدید ترین آلات اور ترقی یافتہ مشینری کے بغیر سودوسو میٹر بھی سمندر میں جانا ناممکن ہے۔

آیتِ قرآنی ہم کو عمیق سمندر میں ''ظلمات'' کی خبر دیتی ہے، ''ظلمات'' جمع قلت ہے، اس کا اطلاق تین سے دس تک ہوتا ہے، جدید سائنس ہم کو تین رکاوٹوں بادل، سطح سمندر کی موج اور داخلی موج کے بارے میں خبر دیتی ہے، اور مزید سات تاریکیوں کے بارے میں بھی بتاتی ہے، جو سات رنگوں کے انجذاب سے پیدا ہوتی ہیں، یہ مجموعی طور پر 10 تاریکیاں ہوئیں اور اس کے نیچے اگر انسان اپنا ہاتھ نکال کر دیکھنا چاہے تو نہ دیکھ سکے ''إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا''۔

کاد افعال مقاربہ میں سے ہے اور مفسرین نے اس کے دو معنی بتائے ہیں، ایک: ''لم یکد یراھا ''یعنی بمشکل تمام دیکھ پانا، جیسا کہ طبری نے نقل کیا ہے، (تفسیر طبری، سورہ نور:۴۰) اور دوسرا: بالکل نہ دیکھ سکے، جیسا کہ قرطبی

نے نحاس سے نقل کیا ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۵/۳۰۴) اور زمخشری کا بھی یہی قول ہے، (کشاف: ۴/۳۰۹-۳۱۰) اس گہرائی پر کوئی روشنی نہیں، حتیٰ کہ سمندری مچھلیاں حیوانات وغیرہ جو اس گہرائی پر زندگی گزارتے ہیں وہ بھی اپنی طبعی روشنی رکھتے ہیں؛ تاکہ راستہ تلاش کریں اور جس کو خدا روشنی نہ دے اس کے لئے کوئی روشنی نہیں ''وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْراً فَمَا لَهُ مِن نُّوْرٍ''۔

حضرات گرامی و دانشورانِ عالی قدر! سائنس اس چیز کو بالائے طاق رکھ کر کہ مذہب کے حواری کیا کہتے ہیں اور مذہب کے دشمن کیا کہتے ہیں، حقائق کی طرف بڑھ رہی ہے، اگر کوئی مذہب حقائق کی بنیاد پر کھڑا ہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ سائنس کی آخری منزل وہی حقیقت کل ہوگی، جسے دنیا خدا کہتی ہے، چرچ چیختا ہے تو چیختا رہے، مندر کی پیشانی پر بل پڑتے ہیں تو پڑتے رہیں؛ لیکن مسجدوں میں کاہے کا واویلا، جب کہ وہاں زمین نہ تو ساکن ہے اور نہ بیل کی سینگوں پر کھڑی ہے، وہ اگر گلیلیو کو پھانسی دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ اس نے زمین کو متحرک ثابت کیا اور چاند پر پہاڑ بتائے۔

قرآن کا خدا بہت بڑا حساب داں اور سائنس دان بھی ہے، وہ خدا زندہ جاوید ہے، جس کے لئے ہمارا مستقبل بھی ماضی ہے:

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللّٰہ

⊙ ⊙ ⊙

مصادر

(۱) تفسیر القرآن العظیم: أبوجعفر محمد بن جریر طبری۔
(۲) النکت و العیون: ماوردی۔
(۳) کشاف: زمخشری۔
(۴) زاد المسیر: ابن جوزی۔
(۵) تفسیر قرطبی۔
(۶) تفسیر البحر المحیط: ابوحیان۔
(۷) تفسیر ابن کثیر۔
(۸) روح المعانی: آلوسی۔
(۹) کتاب الایمان: عبدالمجید زندانی۔
(۱۰) الاعجاز العلمی فی القرآن والسنۃ: دراتب النابلسی۔
(۱۱) اطلس القرآن: شوقی ابوخلیل۔
(۱۲) الموسوعۃ الحرۃ ویکیپیڈیا۔
(۱۳) موقع المھندس عبدالدائم الکحیل www.kaheel7.com۔
(۱۴) سائنسی انکشافات قرآن وحدیث کی روشنی۔
(۱۵) معجم مقاییس اللغہ: ابن فارس۔
(۱۶) لسان العرب: ابن منظور۔
(۱۷) ظلمات البحر اللجي: انٹرنیٹ پر مجدی عبدالشافی عبدالجواد کا مقالہ۔
(۱۸) ترجمہ آیات از بیان القرآن، مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

قرآن مجید اور میڈیکل سائنس

ڈاکٹر سید عبدالرشید⊙

سائنس کے معنی: اس کے معنی علم کے ہیں، جب اس کا اطلاق انسانی علم سے کرتے ہیں تو اس کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں :

۱- انسانی علم: (الف) انسانی اندازوں والا علم (نظریاتی علم)(Hypothetical knowledge) اس میں غلطی کا امکان رہتا ہے، (ب) انسان کا حقائق والا علم۔

۲- خدائی علم: جب اس کا اطلاق خدائی علم سے کرتے ہیں تو یہ محض حقائق ہوتے ہیں، جس میں غلطی نہیں ہو سکتی۔

۱-انسانی علوم جن میں محض اندازے ہوتے ہیں

(الف) یہ ہمیشہ ناقص رہتے ہیں، ترقی پذیر ہوتے ہیں، پچھلی معلومات میں مزید نکھار لانے کی ضرورت پڑتے رہتی ہے اور اس طرح ہر زمانے میں اس طرح کے علم کو حسب حال بنانا پڑتا ہے۔

انسان پہلے کسی چیز کے بارے میں اندازہ لگاتا ہے، پھر غور وفکر اور تحقیق کے بعد جس نتیجہ پر بھی پہنچتا ہے اگر وہ حقیقت کے مطابق ثابت ہو جائے تو اب یہ علم بدلتا نہیں، مثلاً زمین کے بارے میں انسان نے غور کیا تو ظاہراً اُسے چپٹی نظر آئی، ستارے، سورج وغیرہ اسی کے اطراف گردش کررہے ہیں، معلوم ہوا۔ مادے کے بارے میں اندازہ لگایا گیا اور کہا جارتا رہا کہ مادہ فنا نہیں ہوسکتا اور نہ پیدا ہوسکتا ہے، مگر یہ صرف اندازے تھے جواب غلط ثابت ہو رہے ہیں، اسی طرح ڈارون کا نظریہ ارتقاء جو ابھی نظریہ ہی ہے حقیقت کے مطابق ثابت نہیں کیا جاسکا۔

(ب) انسانی علوم جواب حقیقت کے مطابق ثابت ہوئے :

مثلاً زمین چپٹی نہیں گول ہے، زمین ٹھہری ہوئی نہیں ہے، حرکت کررہی ہے (اپنے محور کے گرد اور مدار میں یہ دو قسم کی حرکتیں زمین کی چل رہی ہیں) زمین اور دوسرے سیارے بھی سورج کے اطراف گھوم رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

⊙ ایم، بی، بی، ایس، عثمانیہ، نائب صدر: سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، حیدرآباد۔

۲- خدائی علم: اللہ کا علم اپنے آپ میں کامل غیر ناقص، نا قابل تغییر، ترقی یافتہ ہوتا ہے، اس کا انداز شروع ہی سے حتمی ہوتا ہے حقائق پر مبنی ہوتا ہے، جس طرح اس کی بنائی ہوئی کائنات یا اس کا کوئی جز بنانا کسی فرد کے بس میں نہیں (اور نہ کسی کے بس میں کائنات یا اس کے کسی جز کے بارے میں کبھی بھی مکمل معلومات حاصل کر سکتا ہے) اسی طرح اللہ کے کلام کا کوئی جز بھی بنانا کسی کے بس کی بات نہیں ہے، نہ خدائی کائنات میں کوئی خرابی نکال سکتا ہے، نہ اس کے کلام میں کوئی نقص نکال سکے گا؛ اس لئے کہ اللہ حقیقی بادشاہ ہیں اور ان کا کلام ان کے علم کامل ہونے کا مظہر ہے، کسی نے خوب کہا :

کلام الملوک ملوک الکلام بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے؛ چنانچہ نہ اللہ کی طرح کوئی بادشاہ ہے نہ ہوگا، اسی طرح اللہ کے کلام کی طرح کوئی کلام شاہانہ ہے اور نہ ہو سکے گا۔

انسان اپنے ناقص علم کے ساتھ کائنات کا اور اللہ کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے تو شروع میں ان کے بارے میں غلط رائے قائم کر لیتا ہے کہ ان میں نقص ہے، مگر جیسے جیسے انسان کا علم ترقی کرتا جاتا ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا جاتا ہے اور اس کے اپنے اندر کا نقص نظر آنے لگتا ہے اور خدا کی کائنات کی سچائی اور اس کے کلام کی سچائی ثابت ہوتے چلی جاتی رہتی ہے، ٹھیک اسی طرح قرآن کی بہت سی باتیں شروع میں نا قابل فہم تھیں اور اب وہ بہت سی قابل فہم اور سچی نظر آ رہی ہیں اور لامحدود مدتوں تک بہت ساری باتیں قرآن کی قابل فہم ہوتی جائیں گی، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں؛ بلکہ اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ کے سچے ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ خود اس شاہانہ کلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ میں اور نہ کوئی ایسا کلام پیش کر سکتا ہے، قرآن خود کہتا ہے سورۂ بقرہ میں :

الٓمٓ . ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْه . (البقرۃ:۲)

یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے (یہ حقائق کی کتاب ہے)۔

وَإِن کُنتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّن مِّثْلِه وَادْعُوْا شُهَدَاءکُم مِّن دُوْنِ اللهِ إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ ، فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَن تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوْا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ . (البقرۃ:۲۳-۲۴)

اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر دکھاؤ؛

لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر جو مہیا کی گئی ہے انکار کرنے والوں کے لئے۔

مَّا تَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ . (الملک:۳-۴)

تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد واپس لوٹ آئے گی۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ . (حم سجدہ:۵۳)

عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے، کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔

قرآن اور میڈیکل سائنس

قرآن میں میڈیکل سائنس (انسانی جسم اور اس کی نفسیات والے علم) کے بارے میں بھی کئی حقائق (چودہ سو سال پہلے) بیان کئے گئے ہیں جو اُس وقت ناقابل فہم تھے، مگر آج ان حقائق کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا ہے اور بھی بہت سے حقائق صحیح ثابت ہو رہے ہیں اور بہت سے قرآنی حقائق ایسے ہیں جن کے بارے میں ابھی انسان بعد کی تحقیق کے ذریعہ یہ جانے گا کہ یہی حق ہیں۔

میڈیکل سائنس کا وہ علم جو قرآن میں ہے اس کو دو حصوں میں بانٹ کر مطالعہ کریں گے۔

(الف) طب نفسیاتی : Medical sciense of psychiatry

(ب) طب جسمانی : Medical science of human body

(الف) طب نفسیاتی: آج کل میڈیکل سائنس پر واضح ہو رہا ہے کہ نفسیاتی ہیجان Tension anxiety جسمانی قوت میں کمی کا باعث ہوتا ہے اور قوت مدافعت بھی کم ہو جاتی ہے اور اس طرح جسم مختلف قسم کے امراض کی آماجگاہ بن جاتا ہے؛ اس لئے ماہر امراض نفسیات اطمنان قلب کی ادویات دیتے ہیں جن کو Sedatives Tranquilisers کہتے ہیں۔

نفسیاتی ہیجان کے مضر اثرات: نفسیاتی ہیجان کی وجہ سے درد کا احساس حد سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، ہاضمی

نظام بھی درہم برہم ہو جاتا ہے، جنسی بیماریاں اور پھیھڑوں کی بیماریاں جنم لیتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

جیسے: Hypertension, Asthmatic Diseases, Ischaemic Heart Disease.

قرآن میں Tension کی وجہ سے Cataract یعنی آنکھ میں سفیدی آجانے اور نظر کی کمی ہونے کا ذکر

۱- قرآن میں اس بات کا اشارہ ہے کہ (Tension) سے آنکھ میں Cataract آجاتا ہے، اس طرح انسان کی آنکھ چیزوں کو دیکھ نہیں پاتی، جس کو آج کی سائنس صحیح مانتی ہے:

وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ . (یوسف:۸۴)

(یعقوب) کی آنکھیں سفید ہوگئیں غم اور گھٹن کی وجہ سے۔

۲- قرآن میں ذکر ہے کہ نفسیاتی ہیجان ماحولیاتی آلودگی پیدا کرتا ہے، خودغرضی بھی نفسیاتی بیماری ہے، بےلوثی، صبر، برداشت (Tolleranee) یہ وہ چیزیں ہیں، جس کا گہرا تعلق ماحولیاتی آلودگی (اور ماحولیاتی پاکیزگی) سے ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيْ النَّاس . (الروم:۴۱)

خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد پھیل گیا ہے۔

۳- قرآن میں ذکر ہے کہ اطمینان قلب جو ایمان کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے جسمانی قوت بھی بڑھ جاتی ہے (Confusion) سے جسمانی قوت گھٹتی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ يَغْلِبُوْا أَلْفاً مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ . (الانفال:۶۵)

اے نبی! مومنین کو قتال کی ترغیب دیجئے (اطمینان دلایئے) کہ ان کے (پکے ایمان والے اطمینان کی وجہ سے صبر Patience, Tollerance والے ہیں اور اس طرح تم میں سے) بیس انکار کرنے والوں کے سو آدمیوں پر غالب رہیں گے اور تم میں کے سو افراد انکار کرنے والوں کے ایک ہزار پر غالب آئیں گے اس لئے کہ جو لوگ انکار کرتے ہیں اُن کی سوچ سمجھ صحیح نہیں ہے۔

نفسیاتی بیماریوں کا قرآنی علاج

۴- اصلی سکون (Sedation) اللہ کے ذکر سے (حقیقت کے ادراک اور صحیح فہم) نصیب ہوتا ہے،

صبر (Tolerance) پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے مناسب اور متناسب اعمال کا اظہار ہوتا ہے امن قائم ہوتا ہے، ورنہ فساد جسمانی اور فسادِ ماحول جنم لیتا ہے :

أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب . (الرعد:۲۸)

آگاہ رہو اللہ کے ذکر ہی سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاء لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ . (یونس:۵۷)

لوگوں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نصیحت آ گئی ہے، یہ وہ چیز ہے جو دلوں کی (سوچ سمجھ کی خرابی کی) شفاء (علاج) ہے (دلوں کے امراض اور سینے کے امراض کے لئے علاج ہے)۔

سینہ میں دل اور پھیپھڑے اور دیگر اشیاء ہوتے ہیں، جن کے امراض کی شفاء بھی قرآن کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے۔

۵- نیند انسانی صحت کے لئے ناگزیر ضرورت ہے

انسان کی جسمانی صحت اور نفسانی صحت کے لئے مکمل آرام نیند سے مہیا ہوتا ہے، ورنہ نفسیاتی اور جسمانی امراض رونما ہوتے ہیں اس لئے قرآن میں سورہ النبا، آیت:۹ میں فرمایا گیا: ''وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ''یعنی نیند کو ہم نے آرام دینے والی بنایا ہے، قدرتی نیند کبھی بھی دواؤں کے ذریعہ حاصل ہی نہیں ہو پاتی۔

۶- خوف اور غم کا علاج

حقیقت کا ادراک اور صحیح (Orientation) نہ ہو تو خوف اور غم بڑھتا ہے، بے سکونی بڑھتی ہے، حقیقت سمجھ آجائے تو سکون دماغی حاصل جاتا ہے اور ایمان دراصل حقیقت کا ادراک ہی تو ہے :

فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ . (الانعام:۴۸)

جو بھی اللہ کو پہچان لے حقیقتاً اور پھر رویہ درست کر لے تو آئندہ کا خوف ہوگا نہ پچھلے کا غم ستائے گا۔

(ب) طب جسمانی اور قرآن

قرآن میں اس تعلق سے کئی مقامات پر ایسے حیرت انگیز انکشافات ہیں، جس کے بارے میں اب ترقی

یافتہ آلات کے ذریعے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ قرآنی معلومات ہی صحیح ہیں، مگر چودہ سو سال پہلے ان کا قرآن میں بیان اس بات کی کافی دلیل بن جاتی ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں؛ بلکہ خالق کائنات کا کلام ہے۔

۱- روح اور موت

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ . (الملک:۲)

(اللہ) نے موت اور حیات کو پیدا کیا۔

جس طرح حیات (زندگی) کو بنانا پڑتا ہے روح کے ذریعے سے، اسی طرح موت کو بھی بنانا پڑتا ہے، جس طرح موت کی بھی علاحدہ علاحدہ قسمیں ہیں اور سطح (Levels) ہیں اسی طرح روح اور حیات کی بھی علاحدہ علاحدہ قسمیں اور سطح (Level) ہیں :

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ . (سورۂ واقعہ:۶۰)

اور ہم نے تمہارے درمیان موت کے (Values) مقرر کئے (موت کے بھی Standards ہوتے ہیں)۔

موت کی حقیقت

روح کے نکل جانے سے موت واقع ہوتی ہے، اللہ کے پاس موت ایک حسابی معاملہ ہے، اس کی مقدار (قدر) ہوتی ہے، اس کا ایک خاص حساب ہوتا ہے، اس کو لوگوں کے درمیان اللہ ایک حساب سے تقسیم کرتے ہیں، کتنے بچے مرتے ہیں، اس کا ایک حساب ہے، کتنے مرد مرتے ہیں اس کا بھی حساب ہے، کتنی عورتیں مرتی ہیں، اس کا بھی ایک حساب ہے وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح انسان کے جسمانی اعضاء کی بھی مختلف طرح سے مختلف اوقات میں جس کا ایک حسابی انداز ہے، موت ہوتی ہے، اس حقیقت کو جاسوسی کرنے اور مجرمین کو پکڑنے میں آجکل استعمال کیا جا رہا ہے جس کو (Medical Jurisprudence) کہتے ہیں۔

۱- سارے جسم کی موت

انسان کے جسم سے روح نکل جاتی ہے تو موت واقع ہوتی ہے اور اس کو (Brain death) کہتے ہیں، دماغ میں اعضاء رئیسی کے (Centres) مراکز ہوتے ہیں وہاں آکسیجن نہ پہنچے تو دماغ مر جاتا ہے، تو سارے جسم کے افعال رئیسی کام کرنا بند کر دیتے ہیں، مثلاً دل پھیپھڑے کام کرنا بند کر دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۲- مختلف اعضاء کی موت اور اس کی اہمیت (Organic death)

مختلف اعضاء جسمانی کی موت کا معاملہ جسمانی موت کے ساتھ متصلاً بڑے حساب سے شروع ہو جاتا ہے اور ہر عضو کے خلیات کی موت کا ایک خاص وقت مقرر ہوتا ہے اور جب وہ موت خلیوں (Cell) میں ہوتی ہے تو خلیے اکڑ جاتے ہیں، مر جاتے ہیں (Cell death) جس کو (Rigor Mortris) کہتے ہیں، ہوتی ہے سب سے پہلے آنکھ کی پتلیوں کی موت ہوتی ہے (Loss of Pupilaryreflex)، اس میں روشنی کے ساتھ آنکھ کی پتلی جو چھوٹی بڑی ہوتی رہتی ہے وہ کام کرنا بند کر دیتی ہے۔

اس کے بعد آنکھ کے پلک کی (Celluler death) خلیوں کی موت ہوتی ہے، اس لئے موت کے فوراً بعد آنکھ کی پلک کو آنکھ پر ڈھانک دیا جاتا ہے، ورنہ آنکھ کھلی رہ جاتی ہے (Rigor mortris) کے بعد، اس طرح (Cell death) سے پہلے یعنی خلیوں کی روح نکلنے سے پہلے اگر ان اعضاء کو محفوظ کر لیا جائے تو پیوند کاری کی جا سکتی ہے، جیسے آنکھ کے اعضاء اور گردے، دل، جگر وغیرہ جیسے مختلف قسم کے (Transplantations) کی جا سکتی ہیں، اور اِن اعضاء کے حفاظت کے کئی طریقے ہیں جیسے (Deepfreezing) وغیرہ۔

روح کی حقیقت (زندگی، حیات کی حقیقت)

جس طرح اللہ نے موت کی تخلیق کی اس طرح روح کی بھی تخلیق کی ہے، روح کی موجودگی سے جسم میں حیات آتی ہے، جسے زندگی کہتے ہیں، مگر روح کی حقیقت کیا ہے اس کے بارے میں اللہ حتمی طور سے کہتے ہیں کہ :

وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ وَمَا أُوتِيتُم مِّن الْعِلْمِ إِلاَّ قَلِيْلا . (الاسراء:۸۵)

تم سے سوال کرتے ہیں، روح کے بارے میں، کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے تعلق رکھتی ہے اور تم کو اس بارے میں بالکل ہی نا قابل لحاظ علم دیا گیا ہے۔

اللہ جس طرح موت کو بھی انسانوں میں ایک حساب سے تقسیم کرتے ہیں، اسی طرح روح کی بھی کئی اقسام ہیں، جس کی تقسیم کا بھی ایک خاص حساب ہے، مثلاً ایام طفل کی حیات، ایام جوانی کی حیات، بڑھاپے کی حیات اور ہر (Level) پر حیات کی ایک مقررہ (مدت) وقت ہوتا ہے :

ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّى وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا . (الحج:۵)

تم کو بچے کی شکل میں نکالتے ہیں تا کہ تم جوانی کی عمر کو پہنچو، تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے؛ تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔

وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُوْن . (یٰسین:٦٨)

جس شخص کو لمبی عمر دیتے ہیں اس کی ساخت کو پھر الٹ دیتے ہیں (یہ ایک Geriatics کا علم ہے) تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اگر عقل سے کام لیا جائے تو آج کل کے ترقی یافتہ دور میں یہ بات سامنے آرہی ہے کہ یہ روح کے مختلف حالتیں جو جسم کی مختلف حالتوں میں ڈالی جاتی ہیں، وہ سب ایک غیر اختیاری نظام (Harmonal, involuntary System) کے تحت ہوتے ہیں، جس کا کچھ حصہ ڈاکٹروں کو اس وقت معلوم ہو رہا ہے اور بہت کچھ معلوم ہونا باقی ہے اور اسی علم کو عمل میں لا کر بعض Harmones کے ذریعہ بعض بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے، جیسے نامکمل جسمانی اور نفسیاتی حالتیں جن کو انگریزی میں (Immature Physical and mental retardation) کہتے ہیں، ان بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

روح کی اقسام

☆ روحِ جسمانی: انسان کے جسم کی روح (Organism) جب یہ نکل جاتی ہے تو انسانی جسم مر جاتا ہے۔

☆ روحِ خلیاتی: جسمانی اعضاء کی روح (Cellular life) یہ روح جب تک جس کسی اعضاء کے خلیوں میں ہوتی ہے (جس کی علامتیں ڈاکٹروں کو معلوم ہیں) اس وقت تک اعضاء کی پیوند کاری کرتے ہیں، جیسے:"Organic Transplantaion".

☆ روحِ انسانی: انسان کی اخلاقی روح جس کے ذریعہ سے انسان حیوانی صفات سے بالاتر ہو کر ان پر قابو پاتا ہے، ورنہ چلتا پھرتا جانور کہلاتا ہے، یہ ہوتا ظاہراً انسان ہے، مگر اس کی سوچ حیوانوں کی طرح ہوتی ہے: أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَام، (الاعراف:۱۷۹) ''یہ جانوروں کی طرح ہیں''۔

☆ روحِ ایمانی: یہ وہ روح ہے جو روحِ انسانی میں رہتی ہے، اس کے ذریعہ سے انسان کائنات میں صحیح طور سے غور کر کے خدا کو پہچان لیتا ہے، اور اپنی کائنات کی حقیقت جان لیتا ہے، پھر اس کی روح قرآن کی روح سے جب جوڑ بن جاتی ہے تب وہ انسانوں کے لئے رحمت بنتا ہے، ایسے انسان کو زندہ انسان کہتے ہیں، ورنہ چلتا پھرتا مردہ انسان کہا جاتا ہے: لينذر من كان حياً، (یٰسین:۷۰) ''یہ قرآن ان کے لئے نصیحت ہے، جو زندہ ہیں (جن کی روحِ انسانی اور روحِ ایمان برقرار ہے)''۔

إِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۔ (النمل:۹۰)
تم مردوں کو نہیں سنا سکتے نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہیں۔

۲- قوتِ سماعت

قُلْ هُوَ الَّذِیْ أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۔ (الملک:۲۳)
وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دی سوچنے سمجھنے والے دل دیئے۔

علم الجنین کے جاننے والے اور ڈاکٹر جانتے ہیں کہ ماں کے پیٹ سے لے کر بچہ پیدا ہوکر بلوغ تک اسی ترتیب سے ان اعضاء کی پیدائش، ان کا نمو و افزائش ہوتا چلا جاتا ہے، حیرت ہے کہ چودہ سو سال بعد (Ultrasonogrophy) وغیرہ کی ایجاد کی وجہ سے اب یہی ترتیب کا صحیح ہونا واضح ہو رہا ہے، تو چودہ سو سال پہلے قرآن میں دی گئی معلومات انسان کی نہیں خالقِ انسان کی ہی ہیں، تو کلام الٰہی ہے قرآن، یہ بات ثابت ہوگئی۔

حالتِ حمل میں

قوت سماعت کے اعضاء ابتدائی شکل میں 24week میں بنائے جاتے ہیں پھر قوت بصارت (دیکھنے کے اعضاء) اپنی ابتدائی شکل میں 28week بنائے جاتے ہیں، پھر دماغ اور اعصابی نظام (Nervous System) اپنی ابتدائی شکل میں بنایا جاتا ہے، بچہ پیدا ہونے پر کان کام کرتے ہیں، مگر آنکھ دیکھنے کے قابل نہیں رہتی، پروفیسر مارشل جانسن امریکہ کے مشہور سائنس دان جو فلاڈلفیا کے تھامس جافرسن یونیورسٹی میں صدر شعبہ اناٹومی ہیں، ان کا اندازہ تھا کہ محمد کے پاس یقیناً ایک طاقتور خوردبین ہونا چاہئے جبھی تو ماں کے پیٹ کے تخلیقی ادوار کا صحیح بیان قرآن میں دیا گیا، مگر سبھی جانتے ہیں کہ خوردبین کی ایجاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی سو سال بعد ہوئی، یہ معلومات انسانی نہیں بلکہ خالقِ انسان کی ہیں، یہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر کیتھ مور کو بھی حیرت ہے جنھوں نے (علم الجنین) Embriology کے علم پر دنیا میں پڑھی جانے والی کتابیں ڈاکٹروں کے لئے لکھی ہیں :

حالتِ حمل میں جنین کے بنائے جانے کے مختلف ادوار کا علم بغیر Scaning کے کیسے ممکن ہوسکا، جب کہ یہ آلات چودہ سو سال پہلے نہیں تھے۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، اس لئے کہ یہ خالق کائنات کا انکشاف ہے قرآن، نہ کہ محمد ﷺ کا، محمد ﷺ

خود کہتے تھے کہ میں یہ کلام نہیں کہہ سکتا اور نہ کوئی اور کہہ سکتا ہے سوائے اللہ کے، نیند میں انسان کی سماعت کام کرتی ہے، بصارت کام نہیں کرتی، آنکھ بند رہتی ہے، زور سے آواز پر وہ نیند سے ہوشیار ہو جاتا ہے۔

کان کے افعال دو ہیں :

(۱) سننا : Hearing.

(۲) توازن کا احساس : Sense of Balance and Equilibrium.

انسان آنکھ بند کر کے بھی یہ محسوس کر سکتا ہے کہ وہ اب کیسی پوزیشن میں ہے لیٹا ہے یا کھڑا ہے وغیرہ، قرآن میں حیرت ناک طرح سے گہری نیند کا اثر حیات کی بقا اور بھوک پیاس کا احساس ختم کرنے کے تعلق سے کہا گیا ہے جس کی تحقیق مکمل طور سے شاید آئندہ ہوگی تو بات پوری طرح سے سمجھ میں آئے گی۔

واقعہ ہے کہ جاگنے کی حالت میں ہم سب صبح سے شام تک تین بار یا اس سے زیادہ کھا پی لیتے ہیں اس لئے کہ بھوک پیاس کا احساس جاگنے میں رہتا ہے، چاہے آدمی بستر پر لیٹا ہی کیوں نہ ہو، مگر رات میں آٹھ نو گھنٹے نیند لگ جائے تو نیند کی حالت میں کبھی بھوک اور پیاس سے آدمی بیدار نہیں ہوتا۔

نینداورافعال سماعت، آپس میں ان کا رشتہ

فَضَرَبْنَا عَلٰی آذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۔ (الکہف:۱۱)

(وہ چند نوجوان تھے) ان کے کانوں پر تھپکی دے کر غار میں کئی سال گہری نیند سلا دیا۔

کانوں پر تھپکی دینے کے معنی کان کے مذکورہ بالا افعال (سننا اور توازن کا احساس) کو مکمل بند کر دیا جانا ہے؛ چنانچہ گہری نیند کے لئے کانوں کے افعال کو مکمل بند کر دینا ضروری ہو جاتا ہے، ان کا ذکر قرآن میں حیرت انگیز انداز سے کیا گیا ہے۔

نیند کی حالت میں انسان کو کروٹ بدلنا ضروری ہوتا ہے

نیند کی حالت میں شعور ہم کو نہیں رہتا، مگر اس کے باوجود بے شعوری میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں، جس کا مطالعہ ہم سونے والے آدمی کو دیکھ کر کرتے رہتے ہیں، یہ کروٹیں دلانے کا نظام (اللہ نے Involuntary غیر ارادی افعال کے نظام کے ذریعہ) جس کو جسم میں اللہ نے رکھا ہے کرواتے ہیں اگر یہ نہ ہوتا تو ایک پہلو پر ہی دیر تک پڑے رہنے سے جسم کا وزن خون کی نالیوں پر پڑتا ہے، جس کی وجہ سے یہ نالیاں بند ہو جاتی ہیں اور خون کا دوران بند ہو جانے کی وجہ سے جسم کے اس حصہ میں سڑن پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حصہ مر جاتا ہے جس کو Bedsores

کہتے ہیں، اسی وجہ سے بعض بیماریوں میں جیسے فالج اور ہڈیوں کے ٹوٹنے وغیرہ کی صورت میں بہت دنوں تک انسان کو بستر پر پڑے رہنا پڑتا ہے تو نرسینگ کیر Nursing Care میں خصوصیت سے پڑھایا جاتا ہے کہ Bedsores سے بچانے کے لئے انسان کو بار بار کروٹ بدلنا ضروری ہے۔

کروٹ بدلنے کی دوسری وجہ جو ضروری ہے یہ ہے کہ: جسم کا وزن کسی اعصاب Nerves پر مسلسل پڑتا ہے تو اس میں فالج کا اثر پیدا ہو جاتا ہے، جس حصہ کی Nerve Supply متاثر ہوگی، جسم کا وہ حصہ کام کرنا بند کر دیتا ہے، اس لئے بھی کروٹ کا نیند میں بدلنا ضروری ہوتا ہے: ''وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ''(الکہف:۱۸) ''ہم ان کو دائیں بائیں پلٹاتے رہتے تھے'' اسی کو سورۂ کہف آیت ۱۱ میں کہا گیا: '' فَضَرَبْنَا عَلَى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ''(الکہف:۱۱) ہم نے ان کو سلا دیا کئی سال کان پر تھپکی دے کر، چودہ سو سال پہلے اس کی سائنٹفک حقیقت معلوم نہیں تھی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

۳- آواز کی لہریں Sound Waves اور ان کا جسم پر اثر

ان میں اتنا شدید ارتعاش Vibration ہوتا ہے کہ اس کے اثر سے بڑی بڑی بلڈنگیں اور بڑے بڑے پُل گر جاتے ہیں، اسی لئے ہوائی اڈوں کے قریب ہمہ منزلہ عمارتیں بنانے کی اجازت نہیں دی جاتی اور پُل پر بینڈ باجہ بجایا نہیں جاتا؛ اس لئے کہ Sound waves سے پل یا Bridge کمزور ہو جاتے ہیں، قرآن میں نفع صور سے ساری کائنات درہم برہم ہو جائے گی کہا گیا، جس کے اِمکان کو اب آواز کی حقیقت پر تحقیق کرنے سے ممکن سمجھا جا رہا ہے، ورنہ اس کو پہلے غیر معقول (عقل میں نہ آنے والی) سمجھا جاتا تھا۔ یہی بات کہی گئی کہ آواز کی شدت سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے :

> يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ فِيْ آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ . (البقرۃ:۱۹)
> یہ لوگ اپنے کانوں میں اپنی اُنگلیاں شدید بجلی کی کڑک سے بچنے کے لئے ٹھونس رہے ہیں، کہ کہیں موت نہ واقع ہو جائے، اس ڈر سے یہ لوگ اپنے کانوں میں اپنی اُنگلیاں ٹھونس رہے ہیں۔

۴- قوت بصارت اور نور

دیکھنے کے لئے انسان کو آنکھ اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے، تیز روشنی کو کم مقدار میں داخل کرنے کا حیرت ناک نظام آنکھ میں Focussing System کے طور پر اللہ نے رکھا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو تیز روشنی آنکھ کے پردہ

(Retina) پر پڑ کر قوت بینائی ختم کر سکتی ہے، اس کو قرآن یوں بتلا رہا ہے :

یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۔ (البقرۃ:۲۰)

(بجلی کی) تیز روشنی سے اُنکی آنکھ کی بینائی گویا ختم ہو رہی ہے۔

نور کی حقیقت اور سایہ

قرآن میں شفاف اور غیر شفاف چیزوں کا ذکر ہے، ان چیزوں کی اہمیت طب میں بہت ہے :

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُم مِّمَّا خَلَقَ ظِلاَلاً ۔ (النحل:۸۱)

اور اللہ نے تمہارے لئے اپنی بعض مخلوقات کے سائے بنائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض مخلوقات کا سایہ ہونا بھی ہمارے فائدہ کے لئے ہے اور بعض مخلوقات کا سایہ نہ ہونا بھی ہمارے لئے فائدے کے لئے ہے۔

شفاف (Transparent) چیز کا سایہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ ان میں سے روشنی کی شعاعیں آر پار گذر جاتی ہیں، نزولِ قرآن کے وقت شفاف چیزوں کا علم اور ان کی اہمیت واضح نہیں ہوئی تھی اور حیرتناک بات ہے کہ آنکھ میں (Cornea) اور (Lens) شفاف ہونے کی وجہ سے روشنی کو اپنے اندر داخل ہونے دیتے ہیں، جب (Cornea) مجروح ہوتا ہے، تو اس پر سفید داغ Lukoma ہو جاتا ہے، Lens اور جس کو عدسہ کہتے ہیں، اس میں سفیدی (Cataract) آنے سے شفافیت کو کھو دیتے ہیں اور روشنی آنکھ کے اندر داخل نہیں ہو سکتی اور چیزیں نظر نہیں آسکتیں، تو بعض چیزوں کا سایہ نہیں ہوتا اس کی بات قرآن میں اس وقت کہی گئی جب کہ شفاف چیزوں کے وجود کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا تھا، جن کا موجود ہونا محمد ﷺ سے بہت بعد میں معلوم ہوا، سائے کے نہ ہونے والی چیزوں (Glass) سے عینک بنائی جاتی ہے یہ کتنے فائدے کی بات ہے، انسان کے لئے۔

سایہ کن چیزوں سے بنتا ہے

غیر شفاف چیزوں کا سایہ بنتا ہے، اس لئے کہ روشنی ان میں سے گذر نہیں سکتی، جیسے جھاڑ، مکان وغیرہ، Mirror آئینہ بھی چوں کہ غیر شفاف ہوتا ہے مگر ایک سطح شفاف ہوتی ہے تو روشنی منعکس Reflect ہو جاتی ہے تو آئینہ میں چیزوں کا عکس بھی (Image) سایہ ہوتا ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ چیزوں کو دیکھے بغیر آئینہ میں اس کا سایہ (Image) دیکھ کر چیزوں کی حقیقت پہچانی جاتی ہے۔

چنانچہ آج کل کی میڈیکل سائنس میں اس کا استعمال (E.N.T) ڈاکٹرس (ناک، کان، حلق) کی چیزوں

کو آئینہ کے عکس میں (اندر کی وہ چیزیں جن کو نہیں دیکھا جاسکتا) دیکھ کر پہچان جاتے ہیں (Dentists) یہ دانتوں کے ڈاکٹرس آئینہ میں دانتوں کا عکس (Image) دیکھ کر دانتوں کے سوراخوں کی گہرائی وغیرہ پہچانتے ہیں ، (Endoscopy) کے ذریعہ پیٹ کے اندر کی چیزیں (Reflectng mirrors) کے ذریعہ آئینوں میں عکس (Image) دیکھ کر ڈاکٹر مرض کا اندازہ لگاتے ہیں :

بہت سی چیزیں اور شعاعیں ایسی ہیں جس کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی

فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ، وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ . (الحاقۃ:۳۸)

پس ہرگز نہیں میں ان چیزوں کی بھی قسم کھاتا ہوں، جس کو تم دیکھ رہے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔

وہ چیزیں جن کو ہم نہیں دیکھ پارہے ہیں ، مگر موجود ہیں جن سے ہم فائدہ اُٹھا رہے ہیں ، جن کے وجود کا احساس تک چودہ سو سال پہلے نہیں تھا ، جب کہ قرآن نازل ہورہا تھا، مگر قرآن پہلے ہی بہت ساری نہیں دیکھ سکنے والی چیزوں کا موجود ہونا ثابت کیا وہ کئی ہیں ، ان میں سے کچھ یہ ہیں ، گاما شعاعیں ایکسرے، الٹراوائلیٹ رے، انفراریڈ شعاعیں ، شارٹ ویو، مائکروویو، ریڈیو ویو وغیرہ :

Gama rays, X rays, Ultravoilet rays, Infra red rays, Short waves, Microwaves, Radio waves etc.

اس آیت کی رو سے یقیناً مزید ایسی لامحدود چیزیں (میڈیکل سائنس کے اعتبار سے اور پھر دیگر کائناتی حقائق کے اعتبار سے جن کا علم ابھی تک انسان کو نہیں پہنچ سکا) ہوسکتی ہیں کہ جو اس وقت انسان کی بصارت کی دسترس سے بعید ہوں ، مگر بعد کو اس کا علم ہوجائے گا، اس کا تجربہ سابق میں ہوتا ہی رہا ہے۔

۵- لوہے کا فائدہ

لوہے کو (Chemisrtry) میں (Ferrum) کہتے ہیں۔

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ . (الحج:۲۵)

ہم نے لوہا اُتارا (نازل کیا) اس میں بہت زیادہ سختی ہے اور انسانوں کے لئے فائدہ مند ہے۔

لوہے کے بارے میں آج کی تحقیق یہ ہے کہ یہ زمین کا جز نہیں ہے بلکہ (Extra-Territorial) ہے، یہ باہر سے زمین پر آیا ہے، یہ ایسی عجیب حقیقت ہے کہ جس کو قرآن چودہ سو سال پہلے بتا رہا ہے، یہ سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں بتا سکتا۔

لوہے کا فائدہ ہے کہ خون کی کمی میں اس کو دیا جاتا ہے؛ تاکہ خون کی مقدار بڑھے اور خون انسان کے لئے بے حد مفید ہے اور اس کے من جملہ فائدوں میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ خون میں ہونے والے اجزا میں سے (R.B.C) کا جز ہے اور (R.B.C) کا اہم کیمیائی حصہ ہیموگلوبین (Haemo Globin) ہوتا ہے، اور جس میں لوہا ہوتا ہے اور یہ ہیموگلوبین آکسیجن کو مختلف اعضاء تک پہنچانے میں ضروری شئے ہے۔

لوہے کی ایک خاص مقدار خون میں اللہ نے رکھی ہے، جب یہ بڑھ جاتا ہے تو (Haemo Cidroris) کہتے ہیں، جو بیماری ہے اور کم ہو جاتا ہے تو (Anaemia) کہتے ہیں (خون کی کمی) :

وَكُلُّ شَيْئٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ . (الرعد:۸)

اور اللہ کے پاس ہر چیز کی ایک مقررہ مقدار ہے۔

۶- شہد کی مکھی کا طبی فائدہ

فِيْهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ . (النحل:۶۹)

(شہد) میں انسانوں کے لئے شفا ہے (بیماری کو دور کرتا ہے) اس میں فکر کرنے والوں کے لئے یقیناً نشانی ہے۔

اس کے طبی فائدے جواب تک تحقیق سے معلوم ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں اور مزید فائدے ہو سکتے ہیں آئندہ انسانوں پر کھلیں گے جو فکر کرنے والے (تحقیق کرنے والے) ہیں :

۱- غذائیت: Nutritious ہے اس میں ایک خاص قسم کی بہترین شوگر ہے اور Vitk ہے جو خون کے بہاؤ کو روکتا ہے، جس کو (Bleeding Disease) میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۲- پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت:Hygroscpic یہ سوجن کو جس میں پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے کم کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

۳- مُضاد حیوی:Antibacterial کئی جراثیم کو مارنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے۔

۴- محلل: اپنے اندر بہت سی چیزوں کو حل کر لیتا ہے، اس لئے ان ادویات کو بنانے میں بے حد کام آتا ہے، جو مرکبات ہوتے ہیں۔

۷- شراب اور اس کا طبی استعمال

یَسْـأَلُوْنَکَ عَنِ الْـخَـمْـرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَا إِثْمٌ كَبِیْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا . (البقرۃ:۲۱۹)

تم سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو ان میں بہت گناہ ہے اور انسانوں کے لئے فائدہ بھی ہے، فائدہ کے بمقابلہ گناہ زیادہ ہے۔

گویا بعض ناگزیر حالات میں شراب کا استعمال محلل کے طور پر مرکبات بنانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور آپریشن کے دوران (بے ہوش کرنے کے دوران) نیند پیدا کر کے درد کے احساس کو کم کرنے کے لئے مجبوراً استعمال کیا جاتا ہے، جو اس کے فائدوں میں سے ایک ہے۔

شراب کے نقصانات

۱- اللہ نے (اثم) گناہ زیادہ ہے کہہ کر ایک کثیر نقصانات کی فہرست کو ایک لفظ ''گناہ'' میں سمو دیا ہے اور گناہ حقیقت میں اللہ کی پہچان نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، اگر یہ ہو تو ہر قسم کا نقصان انسان کو پہنچتا ہے، مثلاً باپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بچہ چلتا ہے تو مطمئن چلتا ہے اس لئے کہ وہ ہر نقصان سے بچا دیتا ہے، پہچان کے نہ ہونے کو (Disorientation) کہتے ہیں، یہ سب سے بڑا نقصان ہے کہ جو شراب میں ہے۔

۲- Euphoria خیالات کی بھرمار ہوتی ہے مگر عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔

۳- جنسی جذبات پر برا اثر ہوتا ہے۔

۴- ہاضمی نظام اور جگر پر مہلک اثر ہوتا ہے۔

۵- سنٹرل نروس سسٹم پر بُرا اثر پڑتا ہے Addiction عادت ہو جاتی ہے، جسم اس کا غلام ہو جاتا ہے اور اس کے بے شمار نقصانات ہیں۔

شراب کاAddictionاوراس کاعلاج

شراب اُن چیزوں میں سےایک ہےجس کی اگر عادت ہوجائےتو یہ چیز انسان کی جسمانی ساخت اوراس کے افعال کی ناگزیرضرورت بن جاتی ہے،تو ایسی چیزوں کو بیک وقت روک دینے سے (عادت چھڑانے سے) انسان مزید بیمارہوجاتا ہے،اس لئے بہتر ہے کہ ان کی عادت کوچھڑاناہوتو بتدریج چھڑاناضروری ہے،اس کوآج کی سائنس قرآن کےطریقہ علاج ہی سےثابت کررہی ہے،چنانچہ قرآن میں اس کاطریقہ علاج بتلایا گیا ہے :

پہلا درجہ :

يَسْـأَلُـوْنَكَ عَـنِ الْـخَـمْـرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا. (البقرة:۲۱۹)

پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیاحکم ہے؟ کہوان دوچیزوں میں بڑی خرابی ہے، اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں،مگران کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔

دوسرادرجہ :

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوْا لاَ تَقْرَبُوْا الصَّلاَةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ . (النساء:۴۳)

اے وہ لوگوجوایمان لائے ہو!جب تم نشہ کی حالت میں ہوتو نماز کےقریب نہ جاؤ۔

تیسرادرجہ :

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالأَنصَابُ وَالأَزْلاَمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ . (المائدة:۹۱)

اےلوگوجوایمان لائے ہو!شراب جوا،آستانے ،پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کروکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔

۸- جانوراوراس کےطبی فوائد

أَوَلَـمْ يَـرَوْا أَنَّـا خَـلَـقْـنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ أَيْدِيْنَا أَنْعَاماً فَهُمْ لَهَا مَالِكُوْنَ ، وَذَلَّـلْـنَـاهَـا لَهُـمْ فَـمِـنْهَـا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُوْنَ ، وَلَهُـمْ فِيْهَـا مَـنَافِعُ وَمَشَارِبُ أَفَلاَ يَشْكُرُوْن . (یٰسین:۷۰-۷۲)

کیا لوگ دیکھتے نہیں ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے مویشی پیدا کئے ہیں اور اب یہ ان کے مالک ہیں، ہم نے انھیں اس طرح ان کے بس میں کردیا کہ ان میں سے کسی پر سوار ہوتے ہیں اور کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں اور ان کے اندر طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں۔

جانوروں کے طبی فائدے یہ ہیں کہ ان کے پروٹین اور چربی سے غذا کی چیزیں اور بہت سارے جلدی مراہم بنائے جاتے ہیں اور بعض ہارمون جانورں سے نکال کر انسانوں میں دئے جاتے ہیں جس سے انسانی جسم کے نمو میں اور شوگر کی بیماری میں شوگر کو کنٹرول کرنے میں مدد ملتی ہیں اور بیماری سے بچنے کے Vaccines لقاحات بھی جانوروں کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں۔

(الف) جانوروں کے دودھ کا فائدہ

ان کے دودھ کے بہت فائدے ہیں :

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَناً خَالِصاً سَآئِغاً لِلشَّارِبِيْن . (النحل:۶۶)

اور تمہارے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے ان کے پیٹ سے جذب ہوئے مادے اور خون کے درمیان سے ہم ایک چیز پلاتے ہیں یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار ہے۔

دودھ، خون اور معدہ سے جذب کئے ہوے مشمولات (مادوں) میں جو مضر اجزا ہوتے ہیں اِن سے پاک اور خالص کیا ہوا ہوتا ہے معدہ سے جذب کی ہوئی غذاوں میں Toxins اور نقصان دہ چیزیں ہوتی ہیں اور خون میں بھی بہت سے اجزا ہوتے ہیں جو اگر دودھ میں چلے جائیں تو نقصان دہ ہوتے ہیں، چھاتیوں (پستان میں) ایک عجیب نظام کے ذریعہ دودھ کو خالص بنایا جاتا ہے پھر مزے اور سفید رنگ کی خوشگواری اس میں ملائی جاتی ہے دودھ انسان کی غذایت کے لئے اور بہت سی بیماریوں کے علاج کے لئے بہت فائدہ مند ہے، کئی دوائیاں بھی اور جلدی امراض کو دور کرنے والی دوائیاں بھی اسی سے بنائی جاتی ہیں۔

(ب) جانوروں کے گوشت اور دیگر مشروبات جو اِن سے بنائے جاتے ہیں، ان کا فائدہ جو طبی سائنس میں غیر مختلف فیہ ہے، مگر بعض حضرات کا یہ اعتراض ہے کہ اس کو اذیت حیوانات (ہلاکت حیوانات) یا جیو ہتھیا کہتے ہیں، اس لئے یہ غیر مذہبی طریقہ ہے۔

اس کا رد اور جواب

انسان کے دانتوں کی بناوٹ اور ہاضمی نظام ترکاری اور گوشت، دونوں قسم کی غذا کے لئے انتہائی موزوں اور مناسب بنایا گیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خالق نے انسان کو سبزی اور گوشت دونوں کو استعمال کرنے کی محدود اجازت دی ہے ورنہ بعض جاندار صرف سبزی خور ہوتے ہیں اور بعض صرف گوشت خوری غذا پر زندہ رہتے ہیں، مثلاً اول الذکر میں بھیڑ بکری وغیرہ اور آخر الذکر میں شیر چیتا بلی وغیرہ :

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ، لَن يَنَالَ اللهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ . (الحج:۳۶-۳۷)

پس تم کھڑا کر کے (جانوروں کو جیسے اونٹ وغیرہ) اِن پر اللہ تعالیٰ کا نام لو جب اُن کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں (یعنی روح جسم سے نکل جانے) تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور بے سوالی اور سوالی سبھی لوگوں کو کھلاؤ، اِن جانوروں کو ہم نے تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر گذار بنو، نہ اُنکا گوشت اللہ کی پہنچتا ہے اور نہ خون پہنچتا ہے اُسے صرف تمہارا تقوی پہنچتا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک کا یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ درد کا احساس زخم پہنچتے ہی انسان کو نہیں ہوتا؛ بلکہ تھوڑی دیر بعد (چار پانچ منٹ بعد) کیمیائی مادے زخم کی جگہ جب جمع ہو جاتے ہیں تو اس مقام کے اعصاب (Nerves) درد کے احساس کو دماغ تک لے جاتے ہیں، جہاں درد کو پڑھا جاتا ہے؛ مگر ذبح کرتے وقت جانور کو تیز دھاری دار آلے سے فوراً کاٹا جاتا ہے تو (ویسے بھی تیز دھاری والے آلہ کی وجہ سے اور سبک رفتاری کی وجہ سے درد محسوس نہیں ہوتا) سارے جسم کا خون فوراً نکل جاتا ہے تو وہاں کے اعصاب (Nerves) خون کی آکسیجن نہیں مل پانے کی وجہ سے اپنا کام سست کر دیتے ہیں اور جو بھی احساس دماغ تک پہنچتا ہے تو اس سے پہلے ہی دماغ مر جاتا ہے (خون نہ پہنچنے کی وجہ سے جو بہہ چکا ہوتا ہے) اور اس طرح دماغ درد کو پڑھ نہیں پاتا، درد کا احساس پہنچنے سے پہلے ہی دماغ مر جاتا ہے۔

اس لئے قرآن علم کامل اور حضور ﷺ عمل کامل ہیں، جن کی حکمتوں کو لوگ آہستہ آہستہ صدیوں تک سمجھتے جاتے ہیں، یہ کتنی حیرت کی اور حکمت کی بات ہے کہ ذبح کرنے میں دو باتیں اللہ کا نام لینے کے علاوہ (تاکیداً)

خاص طور سے بتلائی گئی وہ یہ کہ (۱) تیز دھاری والا آلہ ہونا چاہئے، (۲) اور بہت فوراً ہی جلد اور شہ رگوں کو کاٹ ڈالنا چاہئے۔

(ج) إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ ۔ (البقرۃ:۱۷۳)

اللہ کی طرف سے پابندی ہے کہ تم مردار نہ کھاؤ، خون اور سور کے گوشت سے پرہیز کرو۔

مُردار جانور کے گوشت میں سڑن اور جراثیم پیدا ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے (Food Poisoning) ہوتی ہے، صحت کے لئے بہت مُضِر ہوتا ہے، سڑان کے اس عمل میں جراثیم اور زہریلے کیڑے ہونا آج کی تحقیق ہے، ورنہ جراثیم کے معنی سمجھنا بھی چودہ سو سال پہلے انتہائی ناممکن تھا۔

(د) خون کو حرام قرار دینے کی وجہ

خون میں مختلف قسم کے زہریلے مُضِر مادے ہوتے ہیں جن کو گردے، جگر کے ذریعہ غیر مضر بنایا جاتا ہے اس لئے صحت کو نقصان پہنچتا ہے، اسکے علاوہ جاندار کے جسم کے گوشت کا مزہ بھی انتہائی خراب ہوتا ہے اور آج کل تو HIV اور HBS بیماریوں کا متعدی ہونا معلوم ہوا ہے، جو خون کے ذریعہ سے پھیلتے ہیں، یہ آج کی تحقیق ہے۔

(ھ) سور کا گوشت اور نقصانات

ابھی تک کی معلومات میں یہ ہے کہ سور کے گوشت میں کولیسٹرال بہت ہوتا ہے اور اس میں طفیلیات Parasites ہوتے ہیں اور خدا جو رحیم ہے، اس نے اپنی رحمت سے قرآن کو شفاء بنایا ہے اور اس میں بیماریوں سے بچنے کے لئے تدابیر بتائی ہیں، چاہے عقل میں آج آتی ہوں یا نہ آتی ہوں۔

۹- ماں کا دودھ، مدتِ رضاعت اس کے فائدے

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۔ (البقرۃ:۲۳۳)

مائیں بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔

مدتِ رضاعت کو طب میں Weaning Period دودھ چھڑانے کی مدت کہتے ہیں۔

ماں کے دودھ کے فائدے

(۱) بالکل خالص ہوتا ہے، مضر اثرات سے پاک ہوتا۔

(۲) خوشگوار ہوتا ہے۔

(۳) قوت مدافعت بڑھانے والے Antibodis ہوتے ہیں۔
(۴) کینسر (Cancer) سے لڑنے والے اجزاء ہوتے ہیں۔
(۵) بچے کے لئے انتہائی قابل ہضم ہوتا ہے۔
(۶) بچے میں ماں کی محبت بڑھتی ہے ادب اخلاق آتے ہیں نفسیاتی بیماریاں کم ہوتی ہیں۔
(۷) دودھ پلانے والی ماں کی چھاتیوں میں (Cancer) عموماً بہت کم ہوتا ہے۔
(۸) دوسال تک ماں کا دودھ پینے والے بچے کم بیمار ہوتے ہیں بہ نسبت اُن بچوں کے جو مصنوعی دودھ پر پرورش پاتے ہیں۔

۱۰- Period of Viability

بچے کی کم سے کم عمر حالت حمل میں جس میں صحت مند بچے کی ولادت ہوسکتی ہے: ماں کے پیٹ میں بچے کی کم سے کم عمر چھ ماہ ہوسکتی ہے یہ حیرت انگیز انکشاف آج کل کے ڈاکٹر ماننے پر مجبورر ہیں، چودہ سوسال پہلے اس بات کا قرآن میں پایا جانا اللہ کے کلام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ماں کے پیٹ سے صحت مند بچہ پیدا ہونے کی کم سے کم عمر چھ ماہ ہوتی ہے مگر آج تک کم سے کم صحت مند (ماں کے پیٹ سے جو پیدا ہوتا ہے) بچہ ۷ ماہ کا سمجھا جاتا تھا جس کو انگیریزی میں ڈاکٹر Minimum Period of Viability کی حیثیت سے جانتے ہیں :

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهاً وَوَضَعَتْهُ كُرْهاً وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلاثُونَ شَهْراً. (الاحقاف:۱۵)

اس کی ماں تکلیف کے ساتھ (بچے) کا حمل اُٹھاتی ہے اوراس کی ولادت بھی تکلیف سے کرتی ہے، اس کا حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس ماہ ہوتے ہیں۔

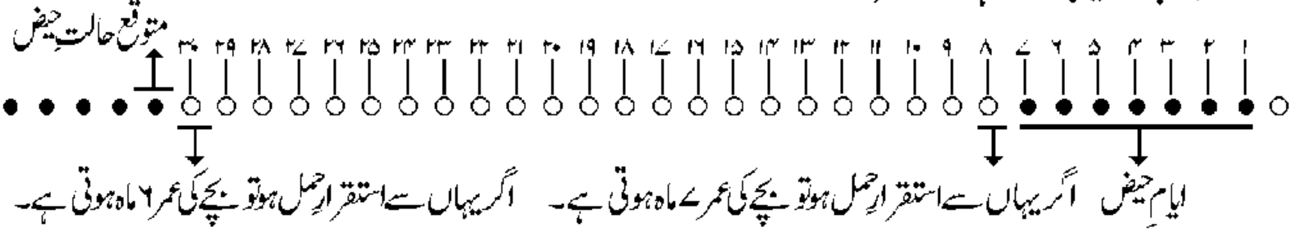
حمل+مدت رضاعت=جملہ 30 ماہ۔

صرف مدت رضاعت=24 ماہ دوسال۔

مدت حمل=(30-24)=6 ماہ۔

اقل ترین حمل کی مدت ثابت ہوگئی کہ 28 ہفتہ (سات ماہ) کے بجائے استثنائی صورتوں میں چھ ماہ ہوسکتی ہے، یہ بات آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے تو چودہ سوسال پہلے یہ بات کسی انسان کی سمجھ سے بالاتر تھی یقیناً۔

ڈاکٹر حضرات عموماً بچے کی عمر ماں کی پیٹ میں کتنی ہے اس کا حساب حالت حیض شروع ہو کر ختم ہونے کے دن سے لگاتے ہیں، مگر استثنائی صورتوں میں حمل کا وقوع متوقع حالت حیض کے شروع ہونے سے چند گھنٹے پہلے بھی ٹھہر سکتا ہے، ایسی صورت میں جب کہ استقرارِ حمل متوقع حالت حیض کے شروع ہونے سے چند گھنٹے پہلے ہوا ہو تب اگر استقرارِ حمل کی مدت کا حساب حالت حیض کے عملاً ختم ہونے کے دن سے لگایا جائے تو بچے کے حمل میں خواہ مخواہ تقریباً ایک ماہ کا اضافہ متصور ہوگا، جب کہ وہ حمل چھ ماہ کا ہی ہوا ہے (آج کل ایسے طریقے دریافت ہو گئے ہیں، جس کے ذریعہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ استقرار حمل کس تاریخ سے ہوا) :



۱۱- تخلیق انسانی کے تین طریقے یا اقسام

پہلا طریقہ: ''خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ''۔ (النساء:۱)

تم کو بنایا ایک جان سے۔

یعنی بغیر جوڑے کے، آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے، آدم علیہ السلام سے اوپر کوئی جوڑ نہیں تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک جان سے (بغیر جوڑ کے) پیدا کیا گیا۔

دوسرا طریقہ: ''وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا''۔

اور پھر (نفس واحدہ) کا جوڑ بنایا، مرد اور عورت پھر ان کے جوڑ سے انسان تخلیق ہوئے۔

تیسرا طریقہ: ''وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَنِسَاءً''۔

اور پھر ان دونوں کے بار ملنے سے کئی جوڑے بچے (مرد اور عورت) اور کئی بچوں کے آپس میں ملنے سے کئی بچے ہوئے ان میں سے کئی مرد اور کئی عورتیں بنانے کا ایک پیچیدہ مگر حسابی طریقہ ہے، جس کو اللہ جانتے ہیں اور مردوں اور عورتوں کی تعداد کو مناسب متناسب انداز میں پھیلاتے ہیں، مرد اور عورت بنایا جانا کروموزوس (Chromosomes) کے مطابق ہوتا ہے، اگر (xx) کروموزومس ہوں تو عورت کی تخلیق ہے اور اگر (xy) کروموزومس ہوں تو مرد کی تخلیق ہے۔

۱۲- عورت اور مرد کا مقصد تخلیق

عورت کو ذریعہ سکون بنایا گیا ہے مرد کے لئے، آپس میں ایک دوسرے کی طرف میلان کے عوامل

(Harmones) بنائے ، اس کے علاوہ ہم جنسی سکون کا مادہ اللہ نے رکھا ہی نہیں ہے ، اس کو طبی زبان میں (Perversion) کہتے ہیں ، جس کو حد سے بڑھ جانا کہتے ہیں ، اس سے معاشرتی بیماریاں جنسی بیماریاں جیسے (Aids) وغیرہ پیدا ہوتی ہیں :

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً . (الروم:۲۱)

اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہاری جانوں میں سے جوڑے بنائے ؛ تا کہ سکون حاصل کرسکو اور دونوں کے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُواْ حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ . (البقرۃ:۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہارے لئے کھیتیاں ہیں ، پس تم اپنی کھیتی میں جاؤ ، جس طرح بھی تم چاہو (اس کے علاوہ دوسرے طریقے حد سے بڑھ جانا Perversion کہلائے گا ، جس سے مہلک بیماریاں ہوتی ہیں)۔

عورتوں میں بچے پیدا کرنے کے لئے مخصوص مقام بنایا ہے، اللہ نے اس کو کھیتی کا مقام کہا ہے، پھر 'اپنی کھیتی' اس وقت بنے گی جب نکاح کرو گے ، نکاح کے بعد خاص کھیتی کے مقام میں جانے کی شرط ہے ، باقی جس طرح بھی جاؤ مگر کھیتی میں جاؤ ، دیگر جگہ ممنوع ہے ، مضر ہے دونوں کی صحت کے لئے ۔

۱۳- سورج کی روشنی اور طبِ انسانی

سورج کی روشنی انسان کی غذا اور نباتات وحیوانات کے لئے ضروری ہے ، نتیجتًا یہ دونوں انسان کی غذا بنتے ہیں ، ورنہ غذائیت نہ ہوتو انسان بیمار ہو جاتا ہے۔

سورج کی مختلف قسم کی روشنی انسان کی جلد اور ہڈیوں کی صحت کے لئے ضروری ہے صبح اور شام کی روشنی کی بعض شعاعوں سے (الٹراوایلٹ ریز) اور دیگر شعاعوں سے بہت سی جلدی اور ہڈیوں کی بیماریوں میں فائدہ ہوتا ہے اور جلد میں Vit. D3 اور کیلشیم اسی روشنی سے تیار ہوتے ہیں ؛ اسی لئے صبح اور شام سورج کی روشنی میں چہل قدمی سے بڑے طبی فائدے ہوتے ہیں ، اس لئے اللہ نے مشرق اور مغرب بنائے اور ہر خطہ کے رہنے والے ہر فرد کے لئے مشرق اور مغرب کی روشنی صرف اس لئے ممکن ہوئی کہ زمین گول ہے اور یہ اپنے محور پر سورج کے سامنے گردش کررہی ہے ، اسی لئے قرآن میں ''رب المشارق والمغارب'' کہا گیا ، ''ان گنت مشرقوں اور مغربوں کا رب اللہ ہے''۔

تاریک رات بھی ضروری ہے ؛ تا کہ سکون کی نیند ہو سکے جو انسان کے لئے تر و تازہ ہونے کے لئے بہت

ضروری ہے، ورنہ بیماریاں جنم لیتی ہیں، یہ جسمانی بھی (Exhaustion) کی وجہ سے اور نفسیاتی (Tension) کی وجہ سے ہوتی ہیں، رات کا وجود بھی زمین کے گول ہونے کی وجہ سے اور سورج کے سامنے محوری گردش کی وجہ سے ممکن ہوا :

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ اللَّیْلَ لِتَسْکُنُوْا فِیْهِ . (یونس:۶۷)

وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ اس میں تم سکون حاصل کرسکو۔

وَمِنْ آیَاتِهٖ مَنَامُکُم بِاللَّیْلِ . (الروم:۲۳)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات میں سونا۔

اس لئے جسمانی صحت اور نفسیاتی صحت کے لئے رات میں سونا نہایت ضروری ہے۔

۱۴- قرآن اور حیض

وَیَسْـأَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ هُوَ أَذًی فَاعْتَزِلُوْا النِّسَاءَ فِیْ الْمَحِیْضِ وَلاَ تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ أَمَرَکُمُ اللهُ . (البقرۃ:۲۲۲)

آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دو (سراسر) تکلیف ہے اور اس میں عورتوں سے علاحدہ رہو اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائیں۔

اذیت ایک ایسا لفظ ہے جو طبی اعتبار سے بالکل ہم آہنگ ہے، ایام حیض میں رحم Uterus کی اندرونی سطح اصل دیوار سے اور خون کی رگوں سے کٹ جاتی ہے اور رحم کی دیوار سے جھڑنے لگتی ہے جو خون کے ساتھ خارج ہوتے رہتی ہے یہ ایک ہفتہ تک چلتے رہتا ہے۔

جلد کے اوپر سے خون اسی وقت خارج ہوتا ہے جب کہ زخم ہو اور جلد کے نیچے خون کی رگیں کھل جائیں، جلد مجروح ہوتی ہے تو خون نکلتا ہے اور اسی طرح رحم کے اندر کی سطح مجروح ہوتی ہے، جس کو انگریزی میں Injury مجروح ہونا کہتے ہیں، تو خون بہتا ہے، لفظ اذیت میں مجروح ہونا ظاہر ہو رہا ہے، رحم کی اندرونی سطح کے مجروح ہونے کی کیفیت اب آج کل خوردبین سے رحم سے خارج شدہ ٹکڑوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے، Ultrasound سے بھی معلوم ہوتی ہے، مگر چودہ سو سال پہلے قرآن میں اس کا ذکر موجود ہونا جو حسب حال ہے، خدائی کلام ہونے کی دلیل ہے۔

عورتوں کے قریب نہ جانا: یعنی (Sex) نہ کرنا، اس لئے کہ خون کے اخراج میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس

سے مرد اور عورت دونوں کو انفکشن کا ڈر رہتا ہے، اس لئے کہ خون جراثیم کے لئے بہترین غذا ہے۔

نتیجتاً خون ایک گندگی اس لئے ہے کہ یہ Organic Matter ہے جسم سے نکلا ہوا مردہ مادہ ہوتا ہے، جب کہ وہ جسم سے خارج ہوتا ہے اور اس میں سڑن اور بدبو پیدا ہوتی ہے، اور یہ طہارت کے خلاف ہے، اذیت کا ترجمہ گندگی کیا جانا خلافِ حقیقت ہے، لفظی ترجمہ تکلیف صحیح ہے، گندگی اس کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔

۱۵- حالت حمل مکمل تکلیف دہ عمل ہے

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلٰى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ . (لقمان:۱۴)

ہم نے انسان کو والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے کہ اس کی والدہ نے اس کے حمل کو ضعف پر ضعف جھیل کر برداشت کیا اور دو سال اس کے دودھ چھڑانے میں لگتے ہیں۔

☆ وھن : کمزوری کو کہتے ہیں اور کمزوری کی کیفیت کس طرح ہوتی ہے اس کو آج کی (Obstetrician) ڈاکٹر لیبارٹری کی جانچ سے معلوم کرتے ہیں حمل کے دوران ماں کے جسم کے ہر حصہ میں ایسی عظیم تبدیلیاں بڑھتی رہتی ہیں کہ زچگی تک چلتی رہتی ہیں یہ سب بچے کو ماں کے رحم میں پالنے کے لئے ہوتی ہیں، ان تبدیلیوں سے عورت مسلسل بوجھل ہوتی چلی جاتی ہے۔

☆ Morning Sickness اس میں ماں کو حمل کے ابتدائی تین ماہ کے دوران غذا کھانے سے کم رغبت ہوتی ہے؛ بلکہ قئے آتے رہتی ہے، کمزوری سے چکر آتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں جو غذا کھاتی ہے اس میں زہریلے مادے ہوتے ہیں، ان کو کم زہریلے (یا زہر ختم کرنے کا طریقہ Detoxification) ماں میں ہوتا ہے اور قوت مدافعت زیادہ ہوتی ہے، اس لئے ماں کو نقصان نہیں پہنچتا، مگر یہی مادے جو ماں کے لئے نقصاندہ نہیں ہوتے، اگر بچے کو (جو ماں کے رحم میں بہت ہی چھوٹا خورد بینی ہوتا ہے) پہنچ جائے (تو چوں کہ بچے میں ان نقصانات سے بچنے کا طریقہ ہی نہیں ہوتا) نقصان پہنچتا ہے، اس لئے اللہ نے ایسا نظام بنایا کہ ماں کو قئے آئے اور وہ غذا کم لے؛ تاکہ یہ غذا بچے کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

عموماً پہلے تین ماہ کے حمل (First Trimester) میں بچہ کے ہر عضو کی ابتدائی شکل بنتی رہتی ہے جو تین ماہ میں مکمل ہو جاتی ہے، اس کے بعد کے مراحل میں یہ ابتدائی شکل نمو پذیر رہتی ہیں، یہاں تک کہ وضع حمل کے بعد بھی، بعض اعضاء کا نمو تو بلوغ تک پہنچ جانے کے بعد مکمل ہوتا ہے اور ہڈیوں کا بڑھنا بھی تقریباً ۲۲ سال میں مکمل ہوتا ہے، اس لئے حمل کے تین ماہ کے دوران متلی قئے کے ذریعہ وہ غذا جو بچے کے اعضاء کو نقصان پہنچا سکتی ہے، ماں کے

جسم سے خارج کردی جاتی ہے، اسی لئے ان تین ماہ کے دوران طبیب حضرات ماں کو ہر دوا کے استعمال کا پرہیز بتلاتے ہیں۔

☆ پیشاب کی زیادتی ہوتی ہے جسم کا وزن بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے تھکان لاحق ہوتا ہے۔

☆ خون کی کمی Anaemia ہو جاتا ہے، جس سے کمزوری دکھائی دیتی ہے۔

☆ کمر میں درد وغیرہ عمومی شکایت ہوتی ہے۔

یہ تمام تکالیف وضع حمل کے بعد بھی دودھ پلانے کے دور میں بھی رہتی ہیں، جیسے چھاتیوں میں دودھ پلانے کی وجہ سے درد کا رہنا اور بچے کی پرورش کے لئے نیند کی کمی ہوتی ہے، چھاتی میں بچے کے دودھ بننے کے لئے اسے بار بار زائد غذا مجبوراً کھانا پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ، اس بات کو کتنی خوبصورتی سے قرآن میں اس وقت بتایا گیا جب کہ اس وقت یہ تمام چیزوں کو (Test) کیا ہی نہیں جا سکتا تھا آج ہم کو صد فیصد اس کا صحیح ہونا معلوم ہو رہا ہے :

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهاً وَوَضَعَتْهُ كُرْهاً . (الاحقاف:۱۵)

اس کی ماں اس کے بوجھ کو تکلیف کے ساتھ اُٹھاتی ہے اور اس کا وضع حمل بھی تکلیف کے ساتھ ہوتا ہے۔

حمل کی تکالیف اور کمزوریوں کا کچھ حصہ اوپر بیان کیا گیا اور وضع حمل کی تکلیف ایک مستقل مضمون ہے، جس کی تکالیف کا احاطہ کرنا اس مقالہ میں ناممکن ہے، اشارۃً عرض ہے :

۱- زچگی سے پہلے خون کے اخراج کی کئی صورتیں ہیں Antepartum haemorhage۔

۲- زچگی کے دوران خون کا اخراج (Haemorhage)۔

۳- وضع حمل کے بعد خون کا اخراج Postpartum Haemorhage۔

۴- چالیس دن تک وضع حمل کے بعد مکمل صحت ہونے تک کئی تکالیف سے گذرنا پڑتا ہے Puerperal Sepsis جو پیشاب کی نالی اور رحم کا انفکشن ہوتا ہے۔

۵- خون کی نالیوں میں خون کا انجماد اور Phlebo Thrombosis۔

۶- Obstructed Labour.

۷- متعدد بار حمل کے رہنے سے رحم کی دیوار کا کمزور ہو کر پھٹنے کا خدشہ رہتا ہے۔

ان گنت تکالیف کو برداشت کرنا پڑتا ہے ماں کو، جس کا ذکر قرآن میں چودہ سو سال پہلے اشارہ کیا گیا ہے، جس کی تفصیل ڈاکٹروں کو اب معلوم ہو رہی ہے۔

۱۶- جلد ہی میں درد کا احساس ہوتا ہے

انسان کی جلد میں ہی درد کو محسوس کرنے کے اعصاب ہوتے ہیں جن کو (Pain Receptors) کہتے ہیں اور Pertonium (پیٹ کے اعضاء کو باندھنے والی جھلی) میں درد کا احساس لے جانے والے اعصاب Nerve Endings ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان دو مقامات میں ہی درد کا احساس رہتا ہے ورنہ آنت معدہ دیگر اعضاء وغیرہ کو جلایا جائے یا کاٹا جائے تو بھی درد محسوس نہیں ہوتا، اس کی تفصیل آج ڈاکٹروں کو معلوم ہو رہی ہے، مگر چودہ سو سال پہلے قرآن میں ان باتوں کا ذکر ہے، جو قرآن کے خدا کے کلام ہونے پر دلیل بنتی ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَاراً كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللهَ كَانَ عَزِيزاً حَكِيماً . (النساء:۵۶)

بے شک جو لوگ ہماری نشانیوں کا انکار کر رہے ہیں، ان کو آگ میں ڈال دیا جائے گا، جب جب بھی ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال دیں گے؛ تاکہ عذاب (تکلیف) کا مزہ چکھیں اور بے شک اللہ زبردست بھی ہے اور (درد کی ودیگر) حکمتوں کو جانتا ہے۔

آنتوں کا مادہ جب آنتوں کے باہر آتا ہے تو پیٹ کی دیوار اور آنتوں کے درمیان خلا ہوتا ہے، جس کو Peritoneal Cavity کہتے ہیں اور اس میں یہ مادے کے کیمیائی اجزا درد کے اعصاب Nerve Endigs تک پہنچتے ہیں تو شدید درد ہوتا ہے اس کی وجہ سے پیٹ کی دیوار سخت ہو جاتی ہے، جس کو ڈاکٹر Board Like Rigidity کہتے ہیں:

وَسُقُوا مَاءً حَمِيماً فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُم . (محمد:۱۵)

جہنمی لوگوں کو ایسا پانی پلایا جائے گا جو آنتوں کو گلا کر کاٹ ڈالے گا۔

۱۷- قرآن میں فضاء کی ہوا کے اجزاء کا ذکر جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا

فضاء میں آکسیجن کی موجودگی ضروری ہے، زمین کے اوپر جانے پر فضاء کی سرحدوں میں آکسیجن کی مقدار کم ہونے سے سینے میں گھٹن ہونے کا لفظ قرآن میں موجود ہونا انتہائی معنی خیز ہے، جس کا ذکر قرآن میں چودہ سو سال پہلے کیا گیا، جب کہ ہوا کا کیمیائی تجزیہ اُس وقت کیا ہی نہیں گیا تھا کہ فضاء میں آکسیجن کی موجودگی ہے اور اس کے افعال کا علم (بدن میں اس کا اثر) اور اُس کی اہمیت انتہائی ناگزیر ہے، آج انسان کو معلوم ہوا ہے۔

آکسیجن کے افعال

انسان کے پھیپھڑوں میں ہوا کی آکسیجن پہنچتی ہے تو خون کو صاف کردیتی ہے، ایسے خون کو Oxy Haemoglobin کہتے ہیں اور یہ جسم کے سارے حصوں میں پہنچ کر غذائی مادوں کو استعمال کرنے میں مدد دیتی ہے اور استعمال ہوجانے کے بعد کاربن ڈائی آکسائیڈ وہاں نکلتی ہے، اس خون کو جس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی آمیزش ہوگئی ہو اُس کو Reduced Haemoglobin کہتے ہیں، یہ خون دل کے ذریعہ پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے اور پھر سے آکسیجن لے کر صاف ہوجاتا ہے۔

اونچائی پر آکسیجن کی مقدار کم ہوتے ہوئے فضاء میں ختم ہوجاتی ہے، تو جسم کے خون میں آکسیجن کی کمی ہوتی ہے اس کو Ischemia or Anoxaemia کہتے ہیں تو دل میں اور پھیپھڑے میں درد محسوس ہوتا ہے اور دماغ میں چکر محسوس ہوتی ہے، اس کو کس خوبصورتی سے قرآن میں بتلایا گیا، جب کہ خون کے دوران اور آکسیجن کی اہمیت چودہ سو سال پہلے واضح ہی نہیں تھی، تو یہ قرآن کے اللہ کے کلام ہونے پر دال ہے :

وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقاً حَرَجاً كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ . (الانعام: ۱۲۵)

جسے اللہ گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتے ہیں، اس کے سینے میں تنگی کردیتے ہیں، ایسی جیسے کہ وہ آسمانوں میں چڑھ رہا ہو۔

چنانچہ اونچائی پر چڑھائی کے وقت (High Altitudes) ساتھ میں آکسیجن لے جانا ضروری ہوتا ہے۔

۱۸- Finger Printing قرآن میں

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَجْمَعَ عِظَامَهُ ، بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ . (القیامۃ: ۳-۴)

کیا یہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے ہم ان ہڈیوں کو دوبارہ جمع نہیں کرسکیں گے؛ کیوں نہیں ہم تو اس پر بھی قادر ہیں کہ انگلیوں کے پور پور تک ٹھیک بنادیں۔

۱۹۸۸ء میں سَر فرانسس گولٹ نے Finger Printing پر تحقیق کی اور معلوم ہوا کہ دنیا میں جتنے انسان ہیں ان کی انگلیوں کے نشانات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں؛ اسی وجہ سے پولیس فورس والے ساری دنیا میں انسان کی پہچان کے لئے Finger Prints کو قابل بھروسہ سمجھتے ہیں، چودہ سو سال پہلے قرآن میں کہی ہوئی بات کی اہمیت کا اندازہ آج کل کی سائنس کو ہورہا ہے تو پھر کیا یہ انسان کا کلام ہوسکتا ہے؟

۱۹- ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا گیا

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ . (الأنبیاء:۳۰)

اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو بنایا کیا پھر بھی یقین نہیں کرو گے۔

آج کل سائنس اس بات پر متفق ہے کہ انسانی خلیوں کا جز و لاینفک پانی ہے اور بہت زیادہ حصہ اہمیت اور کمیت کے اعتبار سے خاص ہے، انسانی خلیات کا اسی فیصد حصہ پانی ہے، یہ آج کے سائنس کی تحقیق ہے۔

پانی کی اہمیت

۱- یہ جسم میں مختلف مادوں کو اپنے اندر حل کر لیتا ہے اور خون کے ذریعہ مختلف ضروری مقامات پر پہچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

۲- جسمانی حرارت جو مسلسل بڑھتے رہتی ہے، اس کو اعتدال میں رکھنے کے لئے پانی کی ایک مقررہ مقدار جسم میں ہونا ضروری ہے۔

ایک پیچیدہ Water Cycle System ہے جس کے ذریعہ انسان پیاس محسوس کر کے پانی پیتا ہے اور پھر جسم کی ساری جلد میں موجود مسامات کے ذریعہ پانی پسینہ بن کر مسلسل بخارات بن کر اُڑتا رہتا ہے اور اس طرح بخارات بنانے میں جلد کے اندر موجود خون کی گرمی مدد دیتی ہے اور اس طرح خون کی حرارت مسلسل کم ہو کر جسم کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔

۳- جسم کے خون کے دباؤ کو کنٹرول کرتا ہے (Blood Pressure)۔

۴- اس کی مناسب اور متناسب مقدار خلیوں کی (اور جسمانی شکل اور بناوٹ میں پہچان پیدا کرنے کا ذریعہ ہے)۔

۵- زہریلے مادوں کو خون میں (Diluted) غیر مرتکز حالت میں رکھتا ہے۔

۶- پانی پاکیزگی کے لئے ضروری ہے اور بھی بہت سے افعال ہیں پانی کے، جن کا احاطہ اس مقالہ میں ناممکن ہے۔

پانی کے بہت زیادہ اخراج سے نقصانات

۱- Dehydration کی وجہ سے بلڈ پریشر کم ہو جاتا ہے۔

۲- خون گاڑھا ہونے کی وجہ سے مختلف زہریلے مادے خون میں مرتکز ہو جاتے ہیں، تو جسم کے خلیوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

۳- Hyperthermia بخار ہوتا ہے۔

۴- جسم کے خلیے Flacid ہو جاتے ہیں پانی کے اخراج کی وجہ سے اور جلد کا نکھار ختم ہو جاتا ہے۔

۵- خون کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے، اس طرح جسم کے خلیات آکسیجن کی مقررہ مقدار حاصل نہیں کر سکتے اوراس طرح Ischaemia کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۲۰- پاکیزگی طہارت Cleanliness

اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ۔ (البقرة:۲۲۲)

اور اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

آج کل زندگی کے مختلف پہلوؤں میں پاکیزگی کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے، جس میں فضاء کو پاک رکھنا، اپنے قرب وجوار کو پاک رکھا، کپڑوں کو پاک رکھنا، جسم کو پاک رکھنا داخل ہے اور یہ ایک مستقل فن اختیار کر گیا ہے۔

قرآن چوں کہ علم کامل اور حضور ﷺ کا عمل کامل ہے جس کو حضور ﷺ نے مکمل طور سے عمل کر کے پاکیزگی کا جو تصور دیا ابھی دنیا اس کی ابتداؤں کو جان نہ سکی ہے تو عمل کیسے کر سکے گی :

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا إِذَا قُمْتُمْ إِلَی الصَّلاةِ فاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَأَیْدِیَكُمْ إِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُؤُوْسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَی الْكَعْبَیْنِ وَإِن كُنتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُوْا وَإِن كُنتُم مَّرْضَی أَوْ عَلَی سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مَّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْداً طَیِّباً فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَأَیْدِیْكُم مِّنْهُ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلٰكِن یُرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ ۔ (المائدة:٦)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کے لئے اُٹھو تو چاہیئے کہ اپنے منھ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو، سروں پر ہاتھ پھیر لو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولو، اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرو بس اس پر ہاتھ مار کر اپنے منھ اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو، اللہ تم پر تنگی کرنا نہیں چاہتے، مگر وہ چاہتے ہیں کہ تم کو پاک کرے۔

قرآن پاک میں کپڑوں کی صفائی کا حکم ہے ''وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ'' (سورۂ مدثر:۴) اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔

وضو کی اہمیت

مسلمانوں کو پانچ مرتبہ نماز پڑھنا پڑتا ہے، دن میں ہر نماز سے پہلے وضو ضروری ہے اور اس میں :

۱- ہاتھ دھوتے ہیں پہنچوں تک، اِس سے گندگی گرد وغبار اور بکیٹریا صاف ہو جاتے ہیں، اور یہ عمل تین بار ہوتا ہے۔

۲- پھر تین مرتبہ کلی کی جاتی ہے، پھر اس میں ہر بار دانتوں اور زبان کو صاف کرتے ہوئے (انگلی منہ میں ڈال کر) کلی کی جاتی ہے اور پانی کو حلق تک پہچایا جاتا ہے، جس سے حلق کا وہ حصہ جو ناک کے پیچھے ہوتا ہے Naso Pharynx دانت، زبان، منہ صاف ہو جاتے ہیں اس سے منہ میں سڑان کی چیزیں جراثیم وغیرہ صاف ہو جاتے ہیں۔

۳- ناک میں تین بار پانی ڈال کر صاف کیا جاتا ہے، جس سے ناک کی گندگی (Dust وغیرہ جراثیم) صاف ہو جاتے ہیں۔

۴- پھر تین بار چہرہ دھو لیتے ہیں (جس میں مردوں کو داڑھی بھی مکمل دھونا پڑتا ہے) اس طرح آنکھ، بھویں، پلک تھوڑی وغیرہ تین بار دھو لئے جاتے ہیں، جس سے چہرے کی صفائی ہوتی ہے۔

۵- پھر ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لیتے ہیں تین بار۔

۶- سر کا مسح پانی سے جس میں گردن اور کان کا پچھلا حصہ صاف کرلیا جاتا ہے۔

۷- آخر میں پاؤں کو ٹخنوں تک دھولیا جاتا ہے، پیر کی انگلیوں کے درمیان بھی پانی سے دھونا پڑتا ہے۔

اس طرح جو جسم کے حصہ گرد وغبار سے متاثر ہوتے ہیں وہ سارے پانچ مرتبہ دھو لئے جاتے ہیں، جس سے عموماً جلدی امراض میں کمی ہو جاتی ہے اور حلق، ناک اور کان کے امراض جیسے Sinusitis Pharyngitis Ginguitis Caries tooth وغیرہ بہت حد تک کم ہو جاتے ہیں۔

آج کل منہ کی بدبو کو پانی سے صاف کر کے دور کرنے کے بجائے صرف منہ میں Spray مار لینے کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے، کتنی گندی بات ہے۔

غسل جنابت

جب عورت اور مرد مجامعت کرتے ہیں تو اس کے بعد نہانا بہت ضروری ہے، اس میں بھی پہلے کی طرح وضو کیا جاتا ہے، اس لئے کہ مجامعت کے دوران ملاعبت ہوتی ہے اور اس دوران ایک دوسرے کہ منہ ملوث ہوتے

ہیں تو جراثیم کا اور گندگی کا استبدال ہوتا ہے، جو اس طرح صاف ہو جاتے ہیں، پھر شرمگاہ کو اچھی دھولیا جاتا ہے، یہ اس لئے کہ شرمگاہوں کی پاکی ضروری ہے ورنہ عورتوں میں اور مردوں میں شرمگاہ کے مقامات پر جراثیم کا حملہ ہوسکتا ہے، پھر سارا بدن دھولیا جاتا ہے، یہ کتنا اچھا اُصول پاکیزگی اور نعمت ہے خدا کی طرف سے۔

رفع حاجت کے وقت بھی پانی سے دھولینا چاہیے جائے مقام کو، چاہے پیشاب کے ذریعہ رفع حاجت ہوئی ہو یا اجابت کے ذریعہ حاجت ہوئی ہو، آج کل باہر کے ملکوں میں صرف جذب کرنے والے کاغذوں سے صفائی کئے جانے پر اکتفا کیا جاتا ہے، جس سے ناپاکی رہ جاتی ہے، بہتر طریقہ یہ بتایا گیا کہ پہلے سوکھے ڈھیلے سے یا جاذب پیپر سے صاف کرلیا جائے؛ تاکہ پیشاب اور پاخانہ کی گندگی کا پانی جذب ہوکر صاف ہو جائے، پھر پانی سے دھولیا جائے، یہ کتنا اچھا طریقہ ہے، باہر کے ملکوں میں عجیب بات ہے کہ Toilet کو تو پانی سے اور Basins کو صاف کیا جاتا ہے پانی سے، مگر جسم کو صرف خشک کیا جاتا ہے کاغذ سے، اور اس کو کافی سمجھا جاتا ہے، یہ عقل کی گندگی نہیں تو اور کیا ہے۔

اسلام میں تو یہاں تک تعلیم ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو جذب خشک ڈھیلہ یا پیپر سے اور پھر مٹی سے کم از کم صاف کرلو، مگر پاک اور صاف مٹی ہونی چاہئے، جس کو تیمّم کہا جاتا ہے، پھر پانی مل جائے تو پانی سے وضو اور غسل کرلیا جائے۔

کپڑوں کو بھی پانی سے بار بار دھوکر صاف کرنا اور نہا کر پہننا چاہئے: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، (المدثر:۴) ''اور اپنے لباس کو پاک رکھو''۔

مسواک (دانت کی صفائی)

بار بار دانت کو مسواک کے ذریعہ برش Brush کر کے صاف کرنے کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، آج کل Tooth Brush, Paste اسی کا قائم مقام ہے، مگر اس طرح روزانہ متعدد بار کرنا چاہئے۔

بدبودار منھ لے کر لوگوں میں آنے سے پرہیز کرنے کی ہدایت

ایسی چیزیں کھا کر لوگوں کے سامنے نہ آیا جائے جس سے منھ کی بدبو باہر جاتی ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیاز کھا کر لوگوں کے سامنے نہ آنے کے لئے کہا اور کہا کہ اس سے منھ کی بدبو دوسروں تک پھیلتی ہے، یا تو صاف کر کے (منھ کو) باہر نکلنا ہے یا نکلتے وقت کھانا نہیں چاہئے، یہ صرف ایک پیاز کی مثال ہے مگر ساری بدبودار چیزیں جو منھ میں بدبو پیدا کرتی ہیں اس سے لوگوں سے ملنے کے وقت استعمال کو منع کیا ہے۔

اسلام اور ختنہ Circumcission

مرد کے عضو تناسُل کا اگلا چمڑا Fore Skin کو کاٹ کر نکالنے کے عمل کو ختنہ کہتے ہیں، یہ دو وجوہ سے ضروری ہے: (۱) پیشاب کے قطرے پوری طرح سے صاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے اس کی موجودگی میں (۲) اس چمڑے کے اندر غدود سے مادہ نکلتا ہے وہ عضو کے حشفہ Glans Penis کے پیچھے جمع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اکثر سرطان ہو جاتا ہے اس کو مسلسل دھونے پر بھی مکمل صاف نہیں ہوسکتا، اس لئے ختنہ کا عمل پاکیزگی کے اعتبار سے ضروری ہے، اور جنسی جذبات کو بہتر رُخ دینے میں مددگار ہوتا ہے۔

۲۱- صلوٰۃ (نماز) اور اس کے فائدے

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَاباً مَّوْقُوتا . (النساء:۱۰۳)

نماز درحقیقت ایک ایسا فرض ہے جو پابندئ وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا اسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ . (البقرۃ:۱۵۳)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز سے مدد لو۔

نماز مومنین کے لئے وقت کی پابندی کے ساتھ ضروری ہے اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگنی چاہئے۔

گویا صبر اور نماز ہماری مدد کرنے والی چیزیں ہیں، انسان کو صبر کے ذریعہ سے بھی مدد ملتی ہے اور نماز سے بھی مدد ملتی ہے، اس کے علاوہ نماز کو صبر سے ادا کرنا چاہئے بے صبری سے نماز کہیں چھوٹ نہ جائے۔

نماز کی پابندی میں صبر کی (استقامت) کی ضرورت ہوتی ہے یہ اس لئے کہ ہر ایمان والے کو روزانہ پانچ وقت بلوغ کے بعد سے ساری عمر پڑھتے رہنا چاہئے یہاں تک کہ بستر پر فریش ہوں تب بھی، حالت خوف میں ہوں تب بھی نماز فرض ہے۔

نماز سے پہلے وضو اور غسل جنابت ضروری ہے اگر اس کی ضرورت (جنابت) کی پیش آئے، یہ موضوع طہارت کے ضمن میں آ گیا نماز کی مختلف پوزیشن سے ہم کو صحت کی برقراری میں مدد ملتی ہے۔

۱- مختلف حرکات سے (رکوع سجدہ قیام قعدے کی حالتوں سے) دورانِ خون بڑھتا ہے اور اس سے قلب کی قوت اور دوران خون میں مدد ملتی ہے، مختلف مقامات پر خون پہنچتا ہے، مثلاً Nasal Sinuses اور دماغ کو خون سجدے کی حالت میں زیادہ پہنچتا ہے اور خون کے ذریعہ ان مقامات پر آکسیجن اور دیگر چیزیں پہنچ کر وہاں کے امراض کے Prevention میں مدد ملتی ہے یا پھر امراض کے علاج میں معاونت ہوتی ہے۔

۲- جسم کی سارے ہڈیوں کے جوڑ باری باری حرکت میں آنے سے یہ جوڑ اور عضلات کے لئے بہترین ورزش ہوتی ہے جس کی وجہ سے جوڑوں کے درد میں یہ ایک بہترین ورزش ہو جاتی ہے، جس کو Physiotherapy کہتے ہیں، مسلسل نماز پڑھنے والوں کو نماز Cervical Spondylosis اور جسم کے بڑے بڑے جوڑوں کو Osteo arthritis سے بچاتی ہے۔

۳- نماز میں جو دھیان خدا کی طرف بنتا ہے اس سے ذہنی پراگندگی ختم ہو جاتی ہے Anxiety Nurosis ختم ہو جاتا ہے ذہنی سکون نصیب ہوتا ہے اور اس طرح سکون کی وجہ سے جسمانی وقوت میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر قسم کی مشکلات پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔

۴- وقت کی پابندگی کی عادت ہونے سے انسان میں Regularity آتی ہے Systematism اور نظم پیدا ہوتا ہے۔

۵- سجدے کی حالت میں بار بار جانے سے پھیپھڑوں میں کا جمع شدہ بلغم آسانی سے کشش ثقل کی وجہ سے Drain ہوتا ہے، نماز پڑھنے والوں کو Bronchieetasis مرض (پھیپھڑوں کی نالیوں کا پھیل جانا اور بلغم کا اس میں ٹھہر جانا یا رک جانا) دور ہو جاتا ہے اور پھیپھڑوں کے اندر ہوا داخل زیادہ ہوتی ہے اور خارج بھی زیادہ ہوتی ہے، جس کو Vital Capacity of Lung کا بڑھ جانا کہتے ہیں جو بہترین صحت کی علامت ہے۔

۶- یہ ایسی ورزش ہے جو جسم کی چربی کو کنٹرول کرتی ہے اور مزید فائدے قیامت تک کھلتے رہیں گے اور نماز انسان کو ہر لحاظ سے مدد دیتی رہے گی۔

۲۲- روزہ اور طبی فائدے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ . (البقرۃ:۱۸۳)

اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے
لوگوں پر فرض کئے تھے، تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو (تا کہ تم اللہ کے غضب سے بچ سکو،
روحانی اور جسمانی بیماریوں سے بچ سکو)۔

جس طرح نماز کے لامحدود فائدے ہیں، روزے کے بھی لامحدود فائدے ہیں ان کے فائدوں کا احاطہ کرنا کسی انسان کے بس سے باہر ہے جو بھی فائدے سمجھ میں آج آتے ہیں وہ یہ ہیں۔

روزے کے نفسیاتی فائدے

چوں کہ روزے میں سحر کے بعد سے مغرب تک کھانے پینے سے اور مجامعت (Sex) سے بچنا ہے جو ضروری چیزیں ہیں انسان کی زندگی کے لئے عام حالت میں وہ روزے میں منع ہیں، تو سوچنے کی بات ہے کہ عام حالات میں جن سے منع کیا گیا وہ تو اشد منع ہے روزے کی حالت میں، جیسے لڑائی جھگڑا، جھوٹ، چوری، زنا، وغیرہ)۔

☆ انسان کی ضرورتیں جن چیزوں سے وابستہ ہیں وہ اگر وافر مقدار میں ملتی جائیں تو ان چیزوں کی قدر و قیمت کا احساس ختم ہو جاتا ہے، مگر جب یہ چیزیں نایاب ہو جائیں، یا کم یاب ہو جائیں تو ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، مثلاً بھوک میں کھانا نہ ملے، پیاس میں پانی نہ ملے اور جنسی ضرورت کا سامان نہ ملے تو کھانے کی پانی کی اور مرد و عورت کی قدر کا احساس ہوتا ہے، پھر ان کو حاصل کرنے کی فکر ان چیزوں کے بنانے والے کی طرف ڈھکیل دیتی ہے؛ اس لئے کہ کائنات میں خالق کائنات کے سوا (اللہ کے سوا) کوئی نہیں ہے جو زمین کو اُگانے کی صفت دے سکے اور پانی بنا سکے، یا عورت اور مرد کو بنا سکے، ایسے میں آسانی سے اللہ یاد آجاتا ہے، گویا اللہ کے منکر کو اللہ کا قائل ہونا پڑتا ہے اور ایمان والے کا ایمان بڑھ جاتا ہے، تقوی بڑھ جاتا ہے، اللہ سے محبت بڑھ جاتی ہے اللہ کا خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر اس طرح خود کی محتاجی کا احساس دوسروں کی محتاجی کو دور کرنے کی طرف مائل کرتا ہے، ایثار و ہمدری پیدا ہوتی ہے، کفایت شعاری آتی ہے، پھر اس طرح (اللہ والی) زندگی کا اطمینان ملتا ہے اور نفسیاتی ہیجان Anxiely سے بچاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

روزے کے جسمانی فائدے

☆ وزن کم کرنے میں روزہ مددگار ہے، خون کی چربی نارمل ہوتی ہے، ایک ماہ مسلسل کھانے پینے پر پابندی سے وزن کم ہوتا ہے اس طرح Obesity دل اور پھیپھڑوں کی بیماریوں کا علاج آسان ہو جاتا ہے۔

☆ بلڈ پریشر کم ہوتا ہے ادویات کی کم ضرورت پڑتی ہے۔

☆ شوگر کم ہوتی ہے کم کھانے سے شوگر کنٹرول ہوتی ہے۔

☆ ہاضمی نظام کے افعال بہتر طور سے کام کرنے لگتے ہیں، کم کھانے سے جگر کے افعال صحیح ہو جاتے ہیں، جن کو Liver Function کہتے ہیں۔

۶- وزن کم ہونے سے جوڑوں کی وزن کا تحمل کرنے کی قوت بڑھ جاتی ہے اور جوڑوں کا درد کم ہو جاتا ہے۔

۷- Obesity سے عموماً Fertility (بچوں کی پیدائش) میں کمی ہوتی ہے روزہ سے وزن کم ہو کر یہ عارضہ دور ہو سکتا ہے اور روزن کم ہونے سے جنسی خواہش بڑھتی ہے اور اس طرح Sex harmones بہتر طور سے کام کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۲۳- قرآن میں ذکر کہ ہر چیز کو ایک خاص پیمانے پر رکھا گیا ہے اور اس کے فوائد

وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ . (الرعد:۸)

اللہ کے نزدیک ہر چیز کی ایک مقدار ہے۔

یہ ایک ایسی آیت ہے جو نہ صرف حیاۃ انسانی کو محیط ہے؛ بلکہ ساری کائنات سے متعلق ہے، مگر ہم اپنے موضوع کے اعتبار سے مقدار کے طبی پہلوؤں پر غور کرینگے، تو ہم کو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ایسا تفصیلی موضوع ہے جس پر مکمل روشنی کے لئے اس محدود مقالہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور اتنا تفصیل طلب ہے کہ اس میں انسان کی صحت کے مختلف پہلوؤں کا اختصاصی علم رکھنے والوں کی معلومات کا ذخیرہ کرلیں تب بھی اللہ کی اس آیت کی پوری تفصیل کا احاطہ ناممکن ہے۔

مقدار بہ اعتبار کمیت Quantity کیفت Quality شکل Shape جسامت Size وغیرہ کے اعتبار سے ہوتی ہے انسان کے جسم کے تمام اعضا، عضلات، ہڈیاں، خون، اعصاب اور ان کے افرازات کیمیائی اجزا وغیرہ جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب کی ہر اعتبار سے ایک مقدار مقرر ہے، اس میں زیادتی سے بھی جسمانی اور روحانی فعالیت میں فرق پڑ جاتا ہے اور کمی سے بھی فعالیت میں فرق پڑ جاتا ہے۔

مثلا لوہے کی مقدار خون میں مقرر ہے بڑھا تو یہ مقدار بڑھ جائے تو بیماری ہوتی ہے، کم ہو جائے تو خون کی کمی ہوتی ہے، شوگر کی خون میں مقدار مقرر ہے بڑھ جائے تو شکر کی بیماری، کم ہو جائے تو Hypoglycemia جو مزید نقصان دہ ہے خون کے اجزائے ترکیبی میں مختلف خلیوں کا ہر اعتبار سے معیار، مقدار مقرر ہے، کمی بیشی سے امراض ہوتے ہیں، معدہ میں ہائڈروکلورک ایسڈ انتہائی مرتکز معدہ کے گوشت میں اللہ تعالیٰ ایک خاص مقدار میں بناتے ہیں؛ مگر یہ تیزاب اپنی نارمل مقدار میں معدہ کے اندر پہنچنے والے گوشت ہڈیوں پر گرتا ہے تو گلاتا ہے اور ہضم میں اس طرح مدد ملتی ہے؛ لیکن اگر اس تیزاب کی مقدار بڑھ جائے تو یہ تیزاب جس گوشت سے نکلتا ہے اسی کو اور معدے کے گوشت کو گلانا شروع کرتا ہے، تو اس کی ابتدائی شکل کو Hyper Acidity کہتے ہیں یہ اپنی انتہائی شکل میں معدہ میں آرپار، سوراخ بھی کر دیتا ہے جو ایک خطرناک طبی ایمرجنسی ہے جس میں انسان کو موت سے بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

بلڈ پریشر کی مقدار مقرر ہے، جسم کے اندر آکسیجن ضروری ہے مگر اس کی مقررہ مقدار ہوتی ہے، بڑھ جائے تو نقصان ہوتا ہے، کم ہو جائے تو خون میں اور سارے جسم کے اعضاء میں خرابی آجاتی ہے؛ اس لئے کہ آکسیجن جسم کے ہر قسم کے خلیوں کے لئے ضروری ہے۔

یہ وہ حیرت انگیز آیت ہے، جس کو حضرت محمد نے جو ظاہراً پڑھے لکھے نہیں تھے پیش کیا اور اس کو خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کیا، یقیناً وہ اپنے قول میں صحیح ہیں؛ اس لئے کہ ایسی باتیں انسان کا کلام ہو ہی نہیں سکتیں، کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا Credit خدا کے بجائے اپنے لئے حاصل کر لیتا۔

۲۴- تخلیق انسان اور جدید میڈیکل سائنس

(الف) تخلیق انسان روح کے جسم میں داخل کئے جانے سے پہلے۔

(ب) تخلیق انسان روح کے جسم میں داخل ہونے کے بعد۔

(الف) تخلیق انسانی، روح کے جسم میں داخل ہونے سے پہلے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ . (الحج:۵)

لوگو! تمہیں اگر زندگی بعد موت کے بارے میں شک ہے تو تم کو معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر نطفہ سے، پھر لٹکے ہوئے لوتھڑے سے، پھر بوٹی سے، جو بناوٹ دی ہوئی اور کچھ بناوٹ نہیں دی ہوئی ہوتی ہے۔

مٹی سے بنایا جانا

حیرت کی بات ہے کہ آج کے تجربہ والے سائنس دان نے پتہ لگایا ہے کہ انسان کے جسم میں مکمل طور سے Clay Elements مٹی کے عناصر ہی ہیں، جو آج کل کے کیمیائی تجزیہ سے ثابت ہو رہا ہے، پہلے کوئی لیاب تھا ہی نہیں جس کے بل بوتے پر یہ یقین سے بات کی جا سکتی ہو، تو یہ یقیناً خالق کا کلام ہے، پھر کائنات کے خالق نے قرآن میں روح جسم میں ڈالے جانے سے پہلے کے مدارج بھی بتائے ہیں، کوئی اس طرح چیلینجنگ انداز سے کہہ ہی نہیں سکتا، انسان کی اگر پیش کردہ چیز ہوتی تو وہ اندازے کے طور پر اپنا نظریہ پیش کر سکتا تھا۔

(۱) تراب: ''مٹی'' Dust۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَاب . (الحج:۵)

اے لوگو! اگر تم دوبارہ زندہ کئے جانے کے تعلق سے شک میں ہو تو ہم نے تم کو مٹی (تراب) سے بنایا۔

(۲) طین: گیلی مٹی سے، مٹی کو گیلا کیا گیا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُم مِّن طِیْن . (الانعام:۲)

وہی ہے جس نے تم کو گیلی مٹی سے (گارے) سے بنایا۔

(۳) سلالۃ من طین: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِن سُلَالَۃٍ مِّن طِیْن . (المومنون:۱۲)

اور یقیناً ہم نے اس کو گیلی مٹی کے خلاصہ سے بنایا۔

(۴) طین لازب: اِنَّا خَلَقْنَاھُم مِّن طِیْنٍ لَّازِب . (الصافات:۱۱)

پھر ہم نے ان کو بنایا چپکتی مٹی سے (جس میں چپکنے کا مادہ پیدا ہو گیا)

(۵) سوکھی مٹی: مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْن . (الحجر:۲۸)

سڑا سڑا کر مٹی کو سکھایا گیا۔

(۶) بجنے والی مٹی: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِن صَلْصَالٍ کَالْفَخَّار . (الرحمٰن:۱۴)

اُس نے (اللہ نے) ان کو کھنکتی بجتی ہوئی مٹی سے بنایا۔

سڑی ہوئی مٹی کو اتنا زیادہ خشک کیا گیا کہ اس میں مارنے سے بجنے کی آواز پیدا ہونے لگی تب ایسی مٹی سے بنایا گیا، اوپر کے مدارج ضروری نہیں کہ اسی ترتیب سے ہوں؛ اس لئے کہ قرآن میں ایسی ترتیب بتائی نہیں گئی ہے، مگر اتنی بات تو ضرور ہے کہ ان چھ مراحل سے گذار کر انسان کے جسم کو بنایا گیا ہے۔

(ب) تخلیق انسانی روح کے داخل کئے جانے کے بعد

تخلیق انسانی کے تین طریقے اور مدارج :

(۱) تخلیق نفس واحدہ، حضرت آدم علیہ السلام کی (اور عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق)۔

خَلَقَکُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَۃ . (النساء:۱)

ہم نے تم کو نفس واحدہ ایک جان سے بنایا۔

حضرت آدم علیہ السلام ہی ایک نفس واحدہ ہیں ابتداء میں، مگر بعد میں بھی نفس واحدہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کی، بغیر ازواج کے بنایا۔

(۲) تخلیق انسان کا دوسرا مرحلہ: تخلیق زوجین۔

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا . (النساء:۱)

پھر اس سے (نفس واحدہ سے) اس کا جوڑ بنایا۔

یعنی اس نفس واحدہ سے عورت بنائی پھر دونوں کے جوڑے سے اولاد بنائی۔

(۴) کئی عورت اور کئی مرد کے جوڑ سے بکثرت انسانیت بنانا :

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاء . (النساء:۱)

(پھر) ان دونوں جوڑوں سے کئی مرد اور کئی عورتیں بنائی (اللہ نے)۔

اس طرح انسان قیامت تک بنتے چلے جائیں گے، آج کل سائنس داں اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں انسان سے کم تر مخلوقات میں، بغیر جنسی تعلق کے یعنی (بغیر مرد اور عورت) کے ایک فرد میں مرد اور عورت کے مادے ہوتے ہیں اور ان کا ارتباط اسی فرد میں ہوتا ہے اور اپنے ہی جیسے افراد بناتے ہیں اور صرف نفس واحد بنتے چلے جاتے ہیں جن کے ہر فرد میں مرد اور عورت کے اجزا ہوتے ہیں، اس قسم کی تخلیق (فرد واحد سے بنایا جانا) بھی نچلی مخلوقات میں دیکھی گئی ہے، جس کو حیوانات کے اطباء زیادہ جانتے ہیں، تو اللہ رب العالمین نے آدم علیہ السلام کو نفس واحدہ بنایا، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نفس واحدہ سے تخلیق کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق ہے جن کو بغیر ازدواج کے (مرد اور عورت کے ارتباط کے) اللہ نے بنایا، یہ حیرت ناک بات ہے جس کے امکان کو (آج کل کے سائنس دانوں کے لئے) رد کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے :

إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِندَ اللهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَاب . (آل عمران:۵۹)

بے شک عیسیٰ کی مثال (تخلیق کے اعتبار سے) اللہ کے پاس آدم کی تخلیق کی طرح ہے کہ جن کو اللہ نے مٹی سے بنایا۔

عورت اور مرد کی تشکیل ایک پیچیدہ مگر اللہ کے پاس ایک حسابی معاملہ ہے، مردوں کی تعداد اور عورتوں کی تعداد اپنے حساب سے بناتے ہیں اور یہ کس طرح بنتے ہیں آج سائنس دانوں کو معلوم ہے کہ مرد کے نطفہ میں yx کروموزومس ہوتے ہیں اور عورت کے نطفہ میں xx کروموزومس ہوتے ہیں، عورت اور مرد کے نطفے جب امشاج Zygote بنتے ہیں، تو اللہ اس کی تقسیم میں xx کروموزوم رکھ کر عورت بناتے ہیں اور وہی yx رکھ کر مرد بناتے ہیں، اس طرح کثیر مرد اور عورت بناتے ہیں۔

۲۵- علم الجنين Embriology

۱- ماء مهين :

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاء مَّهِينٍ . (السجدة:۸)

پھر اس کی (انسان) کی نسل کو ایک بے قدر پانی کے خلاصے سے جاری کیا۔

۲-ماء دافق :

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ، خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ . (الطارق:۵-۶)

پس انسان کو یہ ضرور دیکھنا چاہئے کہ وہ کیسے بنایا گیا، ایک اُچھلتے پانی سے (بنایا گیا)۔

مرد کا ماءِ مہین : یہ حقیر پانی اللہ بناتے ہیں، اس پانی کے کئی اجزاء ہوتے ہیں خصیہ کا اِفراز، پروسٹیٹ کا افراز اور دیگر غدود کا افراز، یہ سب افرازات Secretions مل کر ''ماءِ مہین'' بنتے ہیں۔

عورت کا ماءِ مہین : اس میں بھی کئی قسم کے افرازات ہوتے ہیں، جیسے عورت کی Ovary کا افراز اور دیگر غدود کے افرازات مل کر عورت کا ماءِ مہین بنتا ہے۔

۳- منی (سلالة من ماء مهين)

حقیر پانیوں کا (مرد کا پانی اور عورت کا پانی کا) بہترین جز Sperm Fluid اور Ova Fluid مرد کی منی اور عورت کی منی کہا جاتا ہے، جن کو زور سے اچھال کر جو دونوں میں Orgasm نفسیاتی ہیجان کے ذریعہ ہوتا ہے، رحم مادر میں ڈالا جاتا ہے، جس کو قرآن شریف میں ''مـاء دافـق'' کہا گیا، اس کی حکمت سے اللہ ہی واقف ہیں، یا پھر کوئی مزید تحقیق کرے تو اس کو آئندہ معلومات ہوں گی کہ اُچھال کر منی کو ڈالنے میں کیا حکمتِ عملی ہے، جو جنسی ہیجان Orgasm کے ذریعہ رونما ہوتا ہے :

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَى . (القیامۃ:۳۷)

کیا تم نطفہ نہیں تھے، اس منی کا جس کو تم ٹپکاتے ہو (عورت کے رحم میں)۔

وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى ، مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَى . (النجم:۴۵-۴۶)

اُسی نے نر اور مادہ کا جوڑہ بنایا ایک منی کے نطفہ سے جو ٹپکائی جاتی ہے (مرد کے ذریعہ اور عورت کے ذریعہ عورت کے رحم Uterus میں)۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ قرآن میں خصیہ Testes اور Ovary کا حقیقی مقام جو پہلے ماں کے پیٹ میں بنایا گیا اور اُس جگہ سے نکال کر وضع حمل کے وقت اُتار کر خصیوں کو جسم کے باہر تھیلی میں ڈال دیا جاتا ہے اور عورت کی Ovary بھی بچے دانی سے قریب کے مقام پر اُتاری جاتی ہیں، مگر ان کا مقام اصلی ریڑھ کی ہڈی کے دونوں جانب گردہ کے مقام پر گیارھویں اور بارھویں پسلیوں کے پاس ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اِن غدود کی خون کی رگوں کو بھی اور اعصابی رگوں Nerve Sugply کو بھی اُسی مقام سے یعنی (Aorta) شہ رگ سے نکال کر خصیہ تک نیچے اور Ovary کو نیچے پیٹ میں اُتارا جاتا ہے اسی کو قرآن میں حیرت انگیز طور پر بیان کیا گیا ہے :

فَلْيَنظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ، خُلِقَ مِن مَّاء دَافِقٍ ، يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِب . (الطارق:۵-۷)

پھر ذرا انسان یہ ضرور دیکھ لے کہ کس چیز سے بنایا گیا، وہ ایک اُچھلنے والے پانی سے بنایا گیا، جو نکلتا ہے ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان سے۔

۴- نطفۂ منی

مرد کا نطفۂ منی: (مرد کا) نطفۂ منی جو خلاصہ کا بہت ہی چھوٹا حصہ ہوتا جو سادی آنکھ سے نظر نہیں آتا اس کو Sperm مرد کا جرثومہ کہتے ہیں، یہ ایک وقت کی منی میں تین ملین جرثومے ہوتے ہیں اس میں ایک بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے۔

عورت کا نطفۂ منی: عورت کا نطفۂ منی اس کو Ova کہتے ہیں یہ بھی خوردبین ہی سے دیکھا جا سکتا ہے :

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَى . (القیامۃ:۳۷)

کیا تم نطفہ نہیں تھے اُس منی کا جو ٹپکایا جاتا ہے۔

۵- نطفۂ امشاج

إِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ . (الدھر:۲)

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔

Ova عورت اور مرد Sperm کو جب رحم میں ٹپکایا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو ملاتے ہیں تو یہ دونوں مل کر مخلوط نطفہ Zygote کہلاتے ہے۔

۶- علقہ

اب اس نطفہ امشاج Zygote میں کئی طرح سے تبدیلیاں کر کے اللہ تخلیق کرتے ہوئے اس کو علقہ بناتے ہیں :

ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ . (المومنون:۱۳)

ہم اس نطفہ کو ایک سکون کی جگہ قرار عطا کیا۔

اب تک کہ ترجمے علقہ کے جو کیئے گئے وہ خون کا لوتھڑا کہہ کر کیئے گئے، شاید وہ اس لئے کہا گیا کہ اسقاط حمل کے دوران تین ماہ تک تقریباً حمل خون کے لوتھڑے کی شکل کا ہی نظر آتا ہے، شاید اس لئے بھی خون کا لوتھڑا لکھا ہوگا، ورنہ لفظی معنی کے اعتبار سے عربی میں علقہ کے معنی ''وہ چیز جو لٹکنے والی ہو'' آتا ہے جو Scaning سے پتہ چلتا ہے کہ ماں کے رحم سے لٹکا ہوا رہتا ہے Placenta کے ذریعہ، اور بچہ کے اطراف پانی Amniotic Fluid ہوتا ہے اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ بچے کو قرار ملے اور سکون ملے اور علقہ کی شکل کو سکون سے بہت گہرا تعلق ہے ماں

کے پیٹ میں استقرار حمل سے تین ماہ تک بچے کے تمام اعضاء کی ابتدائی شکلیں اللہ تعالیٰ بناتے رہتے ہیں جیسے دل دماغ گردے ہڈیاں وغیرہ سارا ہی جسم اور اس کے مشمولات کی ابتدائی شکل تین ماہ کے اندر ہی بنائی جاتی ہیں اور پھر اس کے بعد ان کا نمو ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ بعض اعضاء کا نمو وضعِ حمل کے بعد سے جوانی تک ہوتا رہتا ہے۔

اِن ابتدائی تین ماہ کے دوران بچے کی شکل نرم لوتھڑے کی ہوتی ہے، جس میں پانی کی مقدار اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے پانی ہی سے بنایا ہے اور پھر اس پانی پر اللہ بناتے ہیں تو اگر اس کو دھکے لگتے رہیں تو یہ شکل بگڑ سکتی ہے؛ اس لئے اس کے ماحول کو انتہائی سکون کا؛ بلکہ Shock Proof بنایا اور اس ماحول کے اندر اس کو ایک قرار کے ساتھ ایک سکون والے مکان کا مکین بنایا، دیکھئے اب جو سائنس کی آج کل کی تحقیقات سامنے آتی ہیں ان کی رُو سے جسم کے اعضا کو اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی طرح سے کہیں نہ کہیں Fix کر دیا ہے، مگر بچہ دانی کو پیٹ میں Fix نہیں کیا؛ بلکہ اس کو Fixed Vagina کے ساتھ ایسا جوڑ دیا گیا کہ اس کا اوپری حصہ معلق رکھا تا کہ وہ جوں جوں اندر بچہ بڑھتا جائے گا اسی حساب سے بچہ دانی بھی پیٹ میں بڑھتی جائے اور جھولے کی طرح جھومتی رہے۔

اب اندازہ لگایئے کہ اگر پیٹ پر کوئی دھکا لگے تو یہ Shock پورے پیٹ کی دیوار میں پھیل جاتا ہے، اگر اس سے زیادہ Jerk دھکّہ لگے تو بچے دانی خود بچے کو لئے ہوئے جُھول جاتی ہے تا کہ اندر بڑھتے ہوئے بچے کے اعضا متاثر نہ ہوں، پھر اگر اس سے بڑھ کر دھکہ لگے تو رحم کے اندر پانی میں دھکے کا اثر پھیل جاتا ہے پھر اس سے بھی زیادہ دھکّہ لگے تو؛ چونکہ بچہ بچے دانی سے (رحم سے) پانی میں لٹکا ہوتا ہے وہ پانی میں بہت ہی ہلکا جھول جاتا ہے؛ بلکہ جھول ہی نہیں پاتا اور جھولے گا تو جھولے کی طرح سے حرکت میں دھکہ نہیں لگتا، اس میں Pendulum کی طرح حرکت ہوتی ہے، تو دل جھوم جاتا ہے حضور ﷺ کی سچائی پر کہ کئی سال بعد خدائی حقیقتیں جو قرآن میں کہی گئیں، اس کا خود کوئی Credit نہ لینا کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے تو یہ ان کی سچائی اور خدا کے کلام ہونے کی سچی دلیل کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

رحم مادر میں بچے کی کیفیت :

۷- مضغہ

خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُم . (الحج:۵)

ہم نے سوکھی مٹی سے تم کو بنایا، پھر نطفہ سے بنایا پھر علقہ (لٹکی ہوئی چیز) سے بنایا، پھر لوتھڑے سے بنایا، جو شکل والی (تشکیل دی ہوئی) ہوتی ہے اور غیر تشکیل دی ہوئی بھی ہوتی ہے۔

ماں کے پیٹ کے اندر جو بچے کی شکل ہوتی ہے وہ لوتھڑے کی سی ہوتی ہے جس میں کچھ حصے اپنی ابتدائی شکل میں ہوتے ہیں، جس کو پہچان سکتے ہیں کہ یہ سننے کے Buds ہیں اور دیکھنے کے Buds ہیں اور دماغ کے Buds ہیں، ہاتھوں اور پیر کے Buds ہیں، کلی جو ابھی کھلی نہ ہو اس شکل کو Bud کہتے ہیں، مگر بہت سی شکلیں ابھی نہیں بنی ہوتی ہیں، اس لئے کہ بہت سی چیزوں کی تشکیل اور نمو مسلسل ہوتا ہی رہتا ہے، یہاں تک کہ وضع حمل کے بعد جوانی تک یہ تشکیل ایک کے بعد درجہ درجہ ہوتی ہی جاتی ہے، یہ کتنی حسب حال بات ہے۔

يَخۡلُقُكُمۡ فِيۡ بُطُوۡنِ أُمَّهَاتِكُمۡ خَلۡقاً مِن بَعۡدِ خَلۡقٍ فِيۡ ظُلُمَاتٍ ثَلاثٍ . (الزمر:٦)
وہی ہے جو تم کو تمہاری ماں کے پیٹ میں تین پردوں میں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔

یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ جنین میں اللہ تعالیٰ تین پردے نمودار کرتے ہیں اور ان تین پردوں میں سے اللہ تعالیٰ جسم کے مختلف اعضاء بناتے ہیں، آیت بالا میں ''یخلقکم'' میں ''کم'' کی ضمیر جنین کے لئے ہے، اور ''ظلمات ثلاث'' سے حسب ذیل تین پردے مراد ہیں، جو کہ خود جنین میں نمودار ہوتے ہیں، نہ کہ ماں کا پیٹ اور رحم کی دیوار وغیرہ، اوپر کے فوٹو گراف میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح ایک کے بعد ایک شکل اللہ دیتے چلے جاتے ہیں، جن میں کچھ کی پہچان ہو جاتی ہے اور کچھ کی پہچان بعد میں بنائی جاتی ہے، یہ تمام باتیں Scaning کے ذریعہ معلوم ہو رہی ہیں، جب کہ چودہ سو سال پہلے بوقتِ نزول قرآن یہ ساری سہولتیں نہ ہونے کے باوجود ان حقائق کا بتایا جانا حیرت انگیز ہے۔

پھر تین اندھیرے پردوں میں بنایا، آج جنین کے ماہر جانتے ہیں کہ بچے کے تمام اعضاء تین پردے سے بنتے ہیں :

۱- Ecto Derm جس میں جلد اور اس کے متعلقات کی ابتدائی شکلیں اللہ تعالیٰ بناتے ہیں۔
۲- Meso Derm جس میں اللہ تعالیٰ ہڈیوں اور گوشت کی ابتدائی شکلیں بناتے ہیں۔
۳- Endo Derm جس میں ہاضمی نظام کے اعضاء پیشاب کی تھیلی اور دیگر غدود کی ابتدائی شکلیں بناتے ہیں۔

تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہی حق ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

۸- عظام (ہڈیوں کا بنایا جانا)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ، ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ . (المومنون:۱۱-۱۴)

ہم نے یقیناً انسان کو مٹی کے گارے کے خلاصہ سے بنایا، پھر اس کو ''نطفہ'' بنا کر ایک سکون وقرار کی جگہ میں لٹکا ہوا علقہ بنایا، پھر اس علقہ کو مضغہ (لوتھڑا) بنایا، پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک آخری شکل دی، پس اللہ بڑا ہی بابرکت والا ہے، جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

پہلے ہڈیوں کی ابتدائی شکل اللہ بنائے ہیں، پھر اس میں بڑے حسابی انداز سے مختلف قسم کی ہڈیاں بنائی جاتی ہیں، بعض نرم، بعض بہت سخت، جیسے دانت، پھر بعض بڑی ہڈیاں، بعض بہت ہی چھوٹی ہڈیاں، جیسے کان کے اندر کی ہڈیاں، پھر مختلف حرکتوں کے لئے مختلف قسم کے جوڑ، اس طرح پورا ہڈیوں کا ڈھانچہ اور اس کا ایک مکمل نظام بنایا جاتا ہے، جو ترقی کرتے رہتا ہے، حالت حمل میں بلکہ وضع حمل کے بعد بھی جوانی کی عمر تک ترقی کرکے ایک مکمل شکل بنادیتے ہیں اللہ رب العالمین، اس کو Skeletal System کہتے ہیں جو بڑا تفصیل طلب ہے۔

۹- لحم (گوشت)

جیسا کہ اوپر کی آیتوں سے معلوم ہوا کہ ہڈیوں کے بعد ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے، یہ گوشت ہڈیوں پر ایک ترتیب سے چڑھایا جاتا ہے، ہر قسم کے گوشت میں کئی ریشے Muscle Fibres ہوتے ہیں، ہڈیوں پر ایک طرف حسابی انداز سے گوشت کو جوڑا جاتا ہے اور دوسرے حصہ کو چپکا دیتے ہیں؛ تا کہ ایک مناسب اور متناسب جوڑ کی حرکت ہو، گوشت کے اندر کئی ہزار ریشے ہوتے ہیں جو گوشت کو قوت دیتے ہیں، اس میں سے چند کم کر دیئے جائیں تو جوڑ کی حرکت متاثر ہو جائے اور یہ کمی بیشی حرکت کی زیادتی یا کمی کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔

پھر جسم کے سارے حصوں میں اچھے خون کو لانے اور استعمال شدہ خون کو واپس لے جانے کا ایک پیچیدہ نظام جس کو Vascular System کہتے ہیں اور پھر دماغ کو احساسات لے جانے اور دماغ سے احساسات لانے

کے لئے اور پھر مختلف غیر ارادی افعال کے لئے علاحدہ اعصابی نظام اور Harmonal System وغیرہ وغیرہ، بڑے حسابی انداز سے بنائے جاتے ہیں، پھر جسم پر حسابی انداز سے چربی اور چمڑا چڑھاتے ہیں اور چمڑا بھی مختلف مقام پر مختلف قسم کا ہوتا ہے، اِس طرح آخری شکل دے کر انسان بناتے ہیں۔

۱۰- تسویہ وتعدیل

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ، الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ، فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ . (الانفطار:۵-۷)

اے انسان! کس جس چیز نے تجھے اپنے پالنے والے کریم سے بھلا رکھا ہے (اُس رب سے) جس نے تجھے بنایا پھر (ہر عضو کی) Finishing کی اور پھر اس میں مناسب تناسب (تعدیل) قائم کیا، پھر جس صورت میں چاہا (اللہ نے) اُس نے تجھ کو (تیرے ہر اعضاء کو) جوڑ کر تیار کیا۔

ہم جب بھی کوئی چیز بناتے ہیں (اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل سے اور اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعہ سے) تو اس کی ابتدائی شکل بناتے ہیں ایک خاص مقصد کے ساتھ، پھر اس کو مکمل تیار کرنے کے بعد اس کی Finishing کر کے آخری شکل دیتے ہیں، اگر کوئی چیز جوڑ دار بناتے ہیں تو اس کے ہر جوڑ میں ربط وتعدیل ومناسبت پیدا کر کے پھر اس کو بھی آخری شکل دے دیتے ہیں، غور کیجئے ہم جو چیز جس طرح بناتے ہیں (وہ بھی اللہ کی دی ہوئی چیزوں کے ذریعہ سے) وہ کتنی ناقص نامکمل ہر اعتبار سے ہے اور پھر اللہ کی بنائی چیزیں کتنی غیر ناقص اور مکمل ہیں، ہم اپنی ہی مصنوعات میں اتنے غرق ہیں کہ اللہ کی عظیم مصنوعات کے ذریعہ سے اللہ کو پہچاننا بھول گئے؛ حالاں کہ اللہ کے بغیر بن بھی نہیں سکتے، پل بھی نہیں سکتے، جی بھی نہیں سکتے، مر بھی نہیں سکتے، اللہ کرے ہم سب کو اللہ کی پہچان ہو جائے اس قرآن کلامِ الٰہی کے ذریعہ۔ آمین

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید اور جدید میڈیکل سائنس

ڈاکٹر مظفر الاسلام عارف ⊙

قرآن حکیم اللہ رب العزت کی آخری کتاب ہے، یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے آج سے چودہ سو سال قبل اپنے حبیب خاتم الانبیاء جناب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمائی، آپ ﷺ کی عمر مبارک چالیس سال مکمل ہونے کے بعد قرآن کریم کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا، سب سے پہلے یہ کتاب آسمانِ دنیا پر یک بارگی نازل کی گئی اس کے بعد ضرورت کے مطابق آپ ﷺ پر نازل ہوتی رہی، اس کتاب کو لانے والے اللہ کے مقرب فرشتہ حضرت جبرئیل امین ہیں، یہ کتاب آسمان دنیا سے حضرت محمد ﷺ پر ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہوئی۔

پہلے یہ بات واضح کردینا زیادہ مناسب ہے کہ قرآن کریم میں دنیاوی تمام علوم وفنون کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے؛ لیکن اس کی تفصیل وتفسیر حضرت محمد ﷺ کے اقوال وافعال ہیں، بغیر احادیث نبویہ کی طرف رُجوع کئے ہوئے قرآن کا کما حقہ سمجھنا نہایت دشوار عمل ہے، اس لئے سب سے پہلے ہم آیاتِ قرآنی سے بحث کریں گے، اس کے بعد احادیث نبوی کی طرف رُجوع کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نزولِ قرآن کریم سے قبل کے واقعات آثار اور قیامت تک پیش آنے والے ان تمام پیچیدہ مسائل و واقعات کو واضح طور پر بیان کردیا ہے؛ تاکہ عقل وخرد رکھنے والا انسان سب سے پہلے اپنی پیدائش کا فلسفہ قرآن حکیم میں تلاش کرے کہ وہ دنیا میں کس طرح پیدا کیا گیا ہے؛ چنانچہ قرآن حکیم کی سب سے پہلی وحی جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی اسی میں انسان کی پیدائش کا اجمالی فلسفہ بیان کردیا، اللہ پاک فرماتا ہے :

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ (العلق:۱-۲)

پڑھو (اے نبی!) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔

یہاں عربی لفظ ''علق'' استعمال ہوا ہے جس کا ایک مطلب تو خون کا لوتھڑا ہے، جب کہ دوسرا مطلب کوئی ایسی چیز ہے جو ''چمٹ'' جاتی ہو، یعنی جونک جیسی کوئی چیز ہو۔

⊙ لکچرر: گورنمنٹ طبیہ کالج واسپتال، قدم کنواں، پٹنہ۔

پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور، یونیورسٹی آف ٹورنٹو (کناڈا) میں ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ اور جنینیات کے پروفیسر ہیں وہ کہتے ہیں:

> مجھے معلوم نہیں تھا کہ حمل کے ابتدائی مرحلوں میں جنین Foetus (ایمبریو) کی شکل جونک جیسی ہوتی ہے یا نہیں، یہ معلوم کرنے کے لئے میں نے نہایت طاقتور اور حساس آلات کی مدد سے جنین کے ابتدائی مراحل کا بڑے محتاط انداز میں مطالعہ کیا اور پھر ان تصاویر کا موازنہ جونک کے خاکے سے کیا، میں دونوں کے درمیان غیر معمولی مشابہت دیکھ کر حیران رہ گیا، اسی طرح میں نے جنینیات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں جو قرآن پاک سے تھیں اور جن سے وہ قبل ازیں واقف نہیں تھے۔

انسان کی افزائش نسل

انسان کی افزائش نسل کا واقعہ قرآن حکیم کی درجنوں آیات میں بیان کیا گیا ہے اور مختلف سیاق وسباق کے ساتھ ہے، ان کی تشریح ایسے بیانات کے ذریعہ ہوئی ہے، جن میں ایک بار سے زیادہ مخصوص نکات کا تذکرہ ہے، قرآن میں ہر بات آسان لفظوں میں بیان کردی گئی ہے جو انسان کے آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے اور اس چیز سے پورے طور پر مطابقت رکھتی ہے جس کی دریافت بہت بعد میں ہونے والی تھی، بعض ان بنیادی تصورات کو یاد دلانا قطعی ضروری ہے جو نزولِ قرآن کے وقت اور اس کے بعد کی صدیوں میں نامعلوم تھیں۔

انسان کی افزائش نسل ایک ایسے سلسلہ عمل سے ہوتی ہے جو ہمارے اور دودھ پلانے والے جانوروں میں مشترک ہے، نقطۂ آغاز ایک ایسے بیضہ کا بارآور ہوتا ہے جو خود کیسہ تخم (بیضہ دان) سے الگ ہوجاتا ہے، یہ عمل حیض کے دوران نصف مدت میں قنات المبیض (Follopian Tube) میں انجام پاتا ہے، بارآور کرنے والا عامل مرد کا نطفہ ہے یا زیادہ صحیح کہیں تو حیوان منویہ ہے جس کا محض ایک بارآور کرنے والا خلیہ درکار ہوتا ہے؛ لہٰذا بارآوری کے عمل کو یقینی بنانے کے لئے مادۂ منویہ کی نہایت ہی قلیل مقدار جس میں ایک بڑی تعداد حیوانات منویہ کی (ایک وقت میں کڑوروں) ہو درکار ہوتی ہے، یہ مادہ خصیوں سے پیدا ہوتا ہے اور عارضی طور پر متابع اور نالیوں کے ایک نظام میں جمع رہتا ہے اور آخر میں پیشاب کی نالی میں پہنچ جاتا ہے، اس مؤخر الذکر نالی کے اِردگرد دوسرے غدود ہوتے ہیں جو اپنی اضافی رطوبات کو منی کے اندر شامل کردیتے ہیں۔

اس عمل سے بارآورشدہ بیضہ (Fertilised ovum) کا استقرار نسوانی نظام تولید میں ایک مخصوص مقام

پر انجام پاتا ہے اور ایک قنات المبیض کے ذریعہ رحم میں داخل ہو جاتا اور رحم کے اندر قیام کرتا ہے، جہاں وہ عضلہ اور جھلی کی دبازت میں پیوست ہو کر اصطلاحی طور پر استقرار پاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی مدد سے آنول نال کی تشکیل ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر اگر بارآور بیضہ کا استقرار بجائے رحم کے قنات المبیض میں ہو گیا تو حمل میں بے ضابطگی پیدا ہو جائے گی۔

جب ایک مرتبہ جنین خالی آنکھ سے نظر آنے لگے تو وہ گوشت کی ایک چھوٹی سی بوٹی کی طرح معلوم ہوتا ہے، جس کے مرکز پر شروع شروع میں انسانی شبیہ نا قابل شناخت ہوتی ہے، وہاں یہ مختلف اور ترقی یافتہ مدارج سے گزرتی ہے جس کے متعلق آج کل بخوبی علم و واقفیت ہے، وہ بڑھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتی ہے، اس پر عضلات چڑھتے ہیں، اعصابی نظام قائم ہوتا ہے، پھر دورانِ خون اور احشاء وغیرہ کی تخلیق ہوتی ہے۔

یہ تصورات حوالہ کی ان اصطلاحوں کو سمجھنے میں کام دیں گے، جن کے ساتھ افزائش نسل سے متعلق قرآن میں دیئے ہوئے بیانات کا مقابلہ کرنا ہے۔

مقدارِ نطفہ

قرآن حکیم میں کم از کم گیارہ مرتبہ کہا گیا ہے کہ انسان کو "نطفہ" سے تخلیق کیا گیا ہے، جس کا مطلب مائع کی نہایت معمولی مقدار یا پیالہ خالی ہو جانے کے بعد اس کی دیوار میں لگا رہ جانے والا مائع ہے، سائنس نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ بیضہ (Ovum) کو بارآور کرنے کے لئے اوسطاً تیس لاکھ خلیات نطفہ (Sperms) میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے، مطلب یہ ہوا کہ خارج ہونے والے نطفہ کی مقدار کا تیس لاکھواں حصہ ہی بار آوری (حمل ٹھہرانے) کے لئے کافی ہوتا ہے۔

مائع کا جوہر

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ . (السجدة:۸)

پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔

"سلالة" عربی لفظ ہے جس سے مراد کسی مائع کا بہترین حصہ، خلاصہ یا جوہر ہے، اب ہم جان چکے ہیں کہ زنانہ بیضے کی بار آوری کے لئے مرد سے خارج ہونے والے لاکھوں کروڑوں خلیات نطفہ میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے، لاکھوں کروڑوں میں سے ایک خلیہ نطفہ کو قرآن پاک نے "سلالة" کہا ہے، اب ہمیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ عورت میں پیدا شدہ ہزاروں بیضوں (Ovam) میں سے صرف ایک ہی بار آور ہوتا ہے، ان

ہزاروں بیضوں میں سے اسی ایک بیضہ کے لئے (جو بارآور ہوتا ہے) قرآن پاک نے "سلا لة" کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لفظ کا ایک اور مفہوم کسی مائع سے (کسی چیز کا) بڑی احتیاط سے اخراج بھی ہے، اس مائع سے مراد زنانہ اور مردانہ دونوں طرح کے تولیدی مائعات بھی ہیں، جن میں صنفی تخم (Gametes) موجود ہوتے ہیں، بارآوری کے مرحلہ کے دوران نطفہ، خلیہ اور بیضہ دونوں ہی اپنے اپنے ماحول سے بہ احتیاط جدا ہوتے ہیں۔

باہم ملے ہوئے مائعات

باہم ملے ہوئے مائعات کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً . (الدہر:۲)

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا؛ تا کہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔

"نطفة أمشاج" میں آپس میں ملے ہوئے مائعات کے ذریعہ مردانہ وزنانہ صنفی مواد (تولیدی مائع یا خلیات) اور اس کے اِردگرد مائعات کے کچھ حصے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

جنس کا تعین

پختہ جنین (Foetus) کی جنس کا تعین (یعنی اس سے لڑکا ہوگا یا لڑکی) خلوی نطفے سے ہوتا ہے نہ کہ بیضہ سے مطلب یہ کہ رحم مادر میں ٹھہرنے والے حمل سے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی اس کا انحصار کروموسوم کے 23 ویں جوڑے میں بالترتیب xs/xy کروموسومز کی موجودگی پر ہوتا ہے، ابتدائی طور پر جنس کا تعین بارآوری کے موقع ہی پر ہوجاتا ہے اور اس کا انحصار خلوی نطفے (اسپرم) کے صنفی کروموسوم (سیکس کروموسوم) پر ہوتا ہے جو بیضے کو بارآور کرتا ہے، اگر بیضے کو بارآور کرنے والے اسپرم میں x صنفی کروموسوم ہے تو ٹھہرنے والے حمل سے لڑکی پیدا ہوگی، اس کے برخلاف اگر اسپرم میں صنفی کروموسوم y ہے تو حمل کے نتیجے میں لڑکا پیدا ہوگا، اسی کو قرآن نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ، مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ . (النجم:۴۵-۴۶)

اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا، ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔

مذکورہ آیت میں نطفہ کا مطلب تو مائع کی نہایت قلیل مقدار ہے جب کہ "تمنیٰ" کا مطلب شدت سے ہونے والا اخراج یا پودے کی طرح بوئی گئی کوئی چیز ہے؛ لہٰذا نطفہ بطور خاص اسپرم ہی کی طرف اشارہ کررہا ہے؛

کیوں کہ یہ شدت سے خارج ہوتا ہے، قرآن پاک میں ارشاد ہے :

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنٰى ، ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ، فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى. (القیامۃ:۳۷-۳۹)

کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضاء درست کئے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔

''نطفة من منی'' میں جو کہ مرد کی طرف سے آتا ہے، رحم مادر میں بچے کی جنس کے تعین کا ذمہ دار ہے، برصغیر میں یہ افسوس ناک رواج ہے کہ عام طور پر ساسوں کو پوتیوں سے زیادہ پوتوں کا ارمان ہوتا ہے اور اگر بہو کے ہاں بیٹوں کے بجائے بیٹیاں ہو رہی ہوں تو انھیں ''اولادِ نرینہ'' پیدا نہ کر سکنے پر طعنے دیتی ہیں، اگر انھیں صرف یہی پتا چل جاتا کہ اولاد کی جنس کے تعین میں عورت کے بیضے کا کوئی کردار نہیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری مردانہ نطفے پر عائد ہوتی ہے اور اگر پھر بھی وہ لعن طعن پر آمادہ ہوں تو انھیں چاہئے کہ وہ (اولادِ نرینہ کے نہ ہونے پر) اپنی بہوؤں کے بجائے اپنے بیٹوں پر طعن کریں، قرآن پاک اور جدید سائنس دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ بچے کی جنس میں مردانہ تولیدی مواد ہی ذمہ دار ہے، عورت کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

رحم کے اندر جنین کا ارتقاء

جنین کے بڑھنے اور ترقی کرنے کے بعض مدارج کا قرآنی بیان پوری طرح ان معلومات سے مطابقت رکھتا ہے، جو اس کے بارے میں آج ہمیں حاصل ہے اور قرآن کریم میں ایک بھی بیان ایسا نہیں ہے جو جدید سائنس کے لحاظ سے تنقید کی زد میں آ سکے۔

کسی جمی ہوئی شئے (جو نہایت مستحکم عبارت ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) کے بعد قرآن ہمیں اس امر سے واقفیت دلاتا ہے کہ جنین ''گوشت کے لوتھڑے'' (مضغہ) کی شکل سے ہو کر گزرتا ہے، اس کے بعد استخوانی نسیجیں ظاہر ہوتی ہیں اور ان پر گوشت چڑھتا ہے (اس چیز کو ایک مختلف لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے، جس کا مفہوم بندھی ہوئی بوٹی ہوتا ہے) اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے :

فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً . (المومنون:۱۴)

پھر ہم نے لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔

لفظ ''مضغہ'' گوشت کے لوتھڑے کو کہتے ہیں ''لحم'' کے معنی بندھی ہوئی بوٹی (گوشت یا عضلات) کے ہیں، اس فرق پر خصوصیت سے توجہ دینے کی ضرورت ہے، جنین ابتداء میں ایک ''چھوٹی سی پھٹکی'' کی شکل میں تھا، پھر وہ خالی آنکھ کو ایک لوتھڑے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے، بعدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اس لوتھڑے کے اندر ارتقاء پاتا ہے، جس کو وسطی مغز کہا جاتا ہے، جب ہڈیاں تخلیق پا جاتی ہیں ان پر عضلات (گوشت) چڑھ جاتے ہیں، ان پر لفظ ''لحم'' کا اطلاق ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے تمام بیانات کا مقابلہ آج کل کے تسلیم شدہ تصورات سے کیا جانا چاہئے، ان کے درمیان مطابقت نہایت واضح ہے؛ لیکن یہ نہایت اہم بات ہے کہ اس موضوع پر عقائد سے جو نزول قرآن کے وقت رائج تھے ان کا مقابلہ اس غرض سے کیا جائے کہ اس زمانہ میں لوگ ان مسائل سے متعلق اس طرح کے نظریات سے کتنی دور تھے، جس طرح کے نظریات یہاں قرآن میں بتائے گئے ہیں، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ وحی کی تشریح اس طرح کرنے سے قاصر تھے جو آج ہم کر سکتے ہیں؛ کیوں کہ ہمیں ان چیزوں سے مدد ملتی ہے جو جدید معلومات ہمارے لئے فراہم کرتی ہیں، درحقیقت انیسویں صدی کے دوران ہی یہ ہوا کہ لوگوں کو اس مسئلہ کا کس قدر زیادہ واضح تصور حاصل ہوا۔

پورے قرونِ وسطی میں انتہائی متنوع اُصول وضوابط کی ابتداء بے بنیاد اساطیر اور قیاسیات سے ہوئی تھی، وہ اس عہد کے بعد کئی صدیوں تک قائم رہے، جنینیات کی تاریخ میں انتہائی بنیادی مرحلہ ہاروے کا یہ بیان تھا (۱۶۵۱ء) کہ ''جملہ ہدایات ابتداء بیضہ سے ظہور پائی ہے'' لیکن اس وقت بھی جب پیدائش سے متعلق سائنس نے (مضمون ہمدست کے لئے) بہت کچھ خوردبین کی ایجاد سے فائدہ اُٹھالیا تھا، لوگ بیضہ اور حیوان منویہ کے انفرادی کردار پر گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے تھے، عظیم ماہر حیوانات ونباتات بفون ان لوگوں میں سے تھا جو بیضہ کے نظریہ کے حامی تھے؛ لیکن بونے نے تخموں کے باہم ملاپ کے نظریہ کی حمایت کی، یہ خیال تھا کہ اماں حوا کی جو جملہ نسل انسانی کی ماں تھیں، بیضہ دانیوں میں تمام انسانوں کے تخم موجود تھے، جو ایک دوسرے کے اندر گتھے ہوئے تھے، اس نظریہ کی حمایت اُٹھارہویں صدی تک ہوتی رہی۔

ہمارے زمانے سے ایک ہزار سال سے زیادہ قبل جب یہ توہماتی ضوابط ہنوز رائج تھے لوگوں کو قرآن کی معلومات حاصل تھیں، اس میں جو بیانات شامل ہیں ان سے نہایت سادہ الفاظ میں بنیادی اہمیت کے ان حقائق کا اظہار ہوتا ہے، جس کی دریافت میں انسان نے صدیاں لگادی ہیں۔

عالم حیوانی

قرآن مجید میں عالم حیوانی سے متعلق متعدد سوالات ہیں جو ایسی تشریحات کے موضوع ہیں جن کا جدید سائنسی معلومات سے مقابلہ وموازنہ ہوتا ہے؛ لیکن اگر اس اقتباس جیسی جو آئندہ دیا جاتا ہے اس موقع پر کوئی عبارت چھوڑ دی جائے تو پھر قرآن میں اس مضمون کے متعلق جتنا کچھ شامل ہے اس کا ایک نامکمل تصور ہی حاصل ہوتا ہے، اس عبارت میں عالم حیوانی میں پائے جانے والے کچھ عناصر کی تخلیق اس غرض سے بیان کی گئی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اس فضل وکرم پر غور کرے جو خداوند قدوس نے اس پر کیا ہے، یہ عبارت بنیادی طور پر اس طریقہ کی مثال پیش کرنے کے لئے نقل کی گئی ہے، جس طریقہ سے قرآن انسانی ضروریات کے مطابق تخلیق کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کا ذکر کرتا ہے، یہ خصوصیت سے ان لوگوں کے معاملہ کو بیان کرتا ہے، جو دیہاتی ماحول میں رہتے ہیں، اس لئے کہ کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا جائزہ کسی اور نقطۂ نظر سے لیا جا سکتا ہو :

وَالأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ، وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ، وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ، وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ . (النحل:۵-۸)

اس نے جانور پیدا کئے جن میں تمہارے لئے پوشاک بھی ہے اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی ، اس میں تمارے لئے جمال ہے جب تم صبح کے وقت انھیں چرنے کے لئے بھیجتے ہو اور جب کہ شام کے وقت انھیں واپس لاتے ہو، وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے ،حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے؛ تا کہ ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں، وہ اور بہت سی چیزیں تمہارے فائدے کے لئے پیدا کرتا ہے، جن کا تمھیں علم تک نہیں ہے۔

جانوروں اور پرندوں میں معاشرے کا وجود

اللہ پاک قرآن حکیم میں فرماتا ہے :

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الأَرْضِ وَلاَ طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلاَّ أُمَمٌ أَمْثَالُكُم مَّا

فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۔ (الانعام:۳۸)

زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں اور ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔

تحقیق سے ثابت ہوا کہ جانور اور پرندے بھی معاشروں (Communities) کی شکل میں رہتے ہیں، مطلب یہ کہ ان میں بھی ایک اجتماعی نظم وضبط ہوتا ہے، وہ مل جل کر رہتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔

بلاشیر کا کہنا ہے کہ :

ایک قدیمی مفسر جیسے رازی (امام فخر الدین رازیؒ) کا خیال تھا کہ یہ آیت محض جبلی افعال کی جانب سے اشارہ کرتی ہے جو یہ ہے کہ جانور خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

شیخ ابوبکر حمزہ اپنے ترجمہ قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

اس جبلت کا ذکر کرتے ہیں جو حکمت ربانی کے بموجب جملہ اشیاء کو جماعتوں کی شکل میں اس طرح آگے کی جانب ڈھکیلتی ہے کہ ان کا ہر فرد سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ تمام جماعت کی خدمت انجام دے۔

قریبی دہ سالوں میں حیوانی طرز عمل کا بغور جائزہ لیا جا چکا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حقیقی طور پر حیوانی برادریاں وجود رکھتی ہوئی معلوم ہوئیں، یقیناً طویل عرصہ تک ایک جماعت یا برادری کے کام کا جائزہ لیا گیا اور اس کے نتیجہ میں یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ برادری کی تنظیمیں قائم ہیں؛ لیکن حال ہی میں ایسا ہوا ہے کہ اس نوع کی کسی تنظیم کے لئے جس نظام کی کارفرمائی ہے وہ صرف چند انواع میں دریافت ہوئی ہے، جس معاملہ کا سب سے زیادہ مطالعہ کیا گیا ہے اور جس کے بارے میں سب سے زیادہ واقفیت ہے وہ شہد مکھی کا معاملہ ہے جس کے طرز عمل اور کارگزاری سے فان فریش کا نام وابستہ ہے، فان فریش لارنیز اور ٹمبرگین نے اس شعبہ میں جو کام کیا اس کے لئے انھیں ۱۹۷۳ء میں نوبل انعام ملا تھا۔

جب اعصابی نظام کے ماہرین اس انوکھی تنظیم کی نمایاں مثالیں فراہم کرنا چاہتے ہیں جو حیوانی رویہ اور طرز عمل میں رہنمائی کرتی ہے تو اس میں امکانی طور پر جن جانوروں کا زیادہ حوالہ دیا جاتا ہے، وہ شہد کی مکھیاں، مکڑیاں اور پرندے (بالخصوص موسمی پرندے) ہیں، بات خواہ کچھ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں جماعتیں ایک انتہائی ترقی یافتہ تنظیم کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن کا متن عالم حیوانی میں اس مثالی مکڑی کا حوالہ دیتا ہے، جو اس غیر معمولی دلچسپ طرز عمل کے ساتھ مطلقاً مطابقت رکھتی ہے، جو ان جانوروں میں سے ہر ایک سائنسی نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے۔

شہد کی مکھیاں

قرآن مجید میں شہد کی مکھیاں سب سے طویل تفسیر وتشریح کا موضوع ہیں، اللہ پاک فرماتا ہے :

وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ۔ (النحل:٦٨)

اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کردی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹیٹوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بناؤ۔

یہ جاننا اس وقت تک مشکل ہے کہ ''اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر'' چلتے رہنے کا صحیح مفہوم کیا ہے، جب تک کہ اس کو عام اصطلاحوں میں نہ سمجھا جائے ،ان کے طرز عمل سے حاصل شدہ معلومات کے سلسلہ میں وہ سب کچھ جو کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ یہاں...... جیسا کہ ان تین جانوروں میں سے جن کو بطور مثال قرآن میں بیان کیا گیا ہے، ہر ایک کے معاملہ میں...... ایک عجیب وغریب اعصابی نظام ان کے رویہ اور طرز عمل کو سہارا دے رہا اور چلا رہا ہے، یہ بات معلوم ہے کہ شہد کی مکھی کے ناچ کا ڈھنگ دوسری مکھیوں کی جانب خبر رسانی کا ایک ذریعہ ہوتا ہے ......اس طریقہ سے شہد کی مکھیاں اپنی ہی نوع کو ہدایت اور ان پھولوں کے فاصلہ کے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں، جن سے رس جمع کرنا ہوتا ہے، فان فریش نے اس سلسلہ میں جو تحریر کیا ہے وہ اس مخلوق کی اس نقل وحرکت کے مفہوم کو واضح کر دیتا ہے،جس کا مقصد مزدور مکھیوں کے درمیان خبریں منتقل کرنا ہے۔

شہد ایک مکمل میڈیسن ہے

شہد نوع انسانی کے لئے ایک نایاب شفا ہے،شہد کی مکھی کئی طرح کے پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور اسے اپنے جسم کے اندر شہد میں تبدیل کرتی ہے،اس شہد کو وہ اپنے چھتے میں بنے خانوں (Cells) میں جمع کرتی ہے، آج سے صرف چند صدیوں قبل ہی انسان کو یہ معلوم ہوا ہے کہ شہد اصل میں شہد کی مکھی کے پیٹ (Belly) سے نکلتا ہے، مگر یہ حقیقت قرآن پاک نے چودہ سو سال قبل درج ذیل آیت مبارکہ میں بین کر دی تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

ثُمَّ كُلِيْ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً يَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (النحل:٦٩)

ہر طرح پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہ پر چلتی رہ، اس مکھی کے "پیٹ کے" اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے، جس میں شفاء ہے لوگوں کے لئے، یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے، ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں جدید سائنس نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ شہد میں شفاء بخش خصوصیت پائی جاتی ہے اور یہ اوسط درجے کے دافع عفونت (مائلڈ اینٹی سیپٹک) کا کام بھی کرتا ہے، دوسری جنگ عظیم میں روسیوں نے بھی اپنے زخمی فوجیوں کے زخم ڈھانپنے کے لئے شہد کا استعمال کیا تھا، شہد کی خاصیت ہے کہ یہ نمی کو برقرار رکھتا ہے اور بافتوں پر زخموں کے بہت ہی کم نشان باقی رہنے دیتا ہے، شہد کی کثافت (Density) کے باعث کوئی پھپھوندی یا جراثیم، زخم میں پروان نہیں چڑھ سکتے۔

سسٹر کیرول نامی ایک عیسائی راہبہ (Nun) نے برطانوی شفا خانوں میں سینے اور الزائیمر کے عارضوں میں مبتلا بائیس ۲۲ ناقابل علاج مریضوں کا علاج پروپولس (Propolis) نامی مادے سے کیا، شہد کی مکھیاں یہ مادہ پیدا کرتی ہیں اور اسے اپنے چھتوں کو جرثوموں کے خلاف سربند (Seal) کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پودے سے ہونے والی الرجی میں مبتلا ہو جائے تو اسی پودے سے حاصل شدہ شہد اس شخص کو دیا جا سکتا ہے؛ تاکہ وہ الرجی کے خلاف مزاحمت پیدا کر لے، شہد وٹامن کے (K) اور فرکٹوز (ایک طرح کی شکر) سے بھی بھرپور ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں شہد اس کی تشکیل اور خصوصیات کے بارے میں جو علم دیا گیا ہے اسے انسان نے نزول قرآن کے صدیوں بعد اپنے تجربے اور مشاہدے سے دریافت کیا ہے۔

پرندوں کی پرواز

أَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا اللهُ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ . (النحل:۷۹)

کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں، اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے، اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔

دوسری جگہ اللہ پاک فرماتا ہے :

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ . (الملک:۱۹)

کیا یہ لوگ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے ؟ رحمٰن کے سوا کوئی نہیں جوانھیں تھامے ہوئے ہو، وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔

عربی لفظ ''امسک'' کا لغوی ترجمہ ''کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دینا، روکنا، تھامنا، یا کسی کی کمر پکڑ لینا'' ہے، مذکورہ بالا آیات میں ''یمسکھن'' سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے پرندوں کو ہوا میں تھامے رکھتا ہے، ان آیات ربانی میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ پرندوں کے طرز عمل کا مکمل انحصار ان ہی قوانین پر ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمایا ہے۔

عالم نبات میں افزائش نسل

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ عالم نبات میں افزائش نسل کے دو طریقے ہیں، ایک جنسی دوسرا غیر جنسی، ان میں صرف پہلا طریقہ ایسا ہے جو افزائش نسل کی اصطلاح کا فی الحقیقت مستحق ہے؛ کیوں کہ اسی سے ایک ایسے حیاتی عمل کا تعین ہوتا ہے، جس کا مقصد اس پودے کے مقابلہ میں جس سے یہ پیدا ہوا ہے، ایک جدید منفرد وجود کا اظہار ہے۔

غیر جنسی افزائش نسل بالکل سادہ طریقہ پر تعداد میں اضافہ کا نام ہے، یہ ایک نامیاتی وجود کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے، جو اصل پودے سے جدا ہو گیا ہو اور اسی طریقہ سے ترقی پا گیا ہو کہ وہ پھر اسی پودے سے واصل ہو جائے جس سے وہ نکلا تھا، گلیر مونڈ اور مینگنو کے نزدیک یہ بالیدگی کی ایک مخصوص کیفیت ہے اس کی ایک سادہ سی مثال قلم لینا ہے، کسی پودے سے قلم لے کر اس کو موزوں پانی میں نم مٹی کے اندر لگا دیا جاتا ہے اور نئی جڑیں نکل آنے سے وہ پھر جم جاتا ہے، بعض پودوں کے نامیاتی اجزا خصوصیت سے اسی مقصد کے لئے وضع ہوتے ہیں؛ لیکن کچھ ایسے ہوتے ہیں، جن میں کلے پھوٹتے ہیں اور ان کا عمل وہی تخم جیسا ہوتا ہے (یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تخم جنسی افزائش نسل کے عمل کے نتائج ہیں)۔

عالم نبات میں جنسی افزائش نسل ایک ہی پودے پر نر و مادہ کے ملاپ سے جنسی تشکیل کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، یا جداگانہ پودوں پر قائم ہو جاتی ہے صرف یہی وہ وجہ ہے جس کا تذکرہ قرآن میں کیا گیا ہے۔

پودوں میں نر اور مادہ

قدیم زمانے کے انسان کو یہ معلوم نہیں تھا پودوں میں بھی جانوروں کی طرح نر اور مادہ ہوتے ہیں؛ البتہ

جدید نباتیات یہ بتاتی ہے کہ ہر پودے کی نر اور مادہ صنف ہوتی ہے؛ حتیٰ کہ وہ پودے جو یک صنفی (Unisexual) ہوتے ہیں، ان میں بھی نر اور مادہ کے امتیازی اجزاء یکجا ہوتے ہیں، اسی طرف قرآن حکیم نے بھی اشارہ کیا ہے :

وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّن نَّبَاتٍ شَتَّى . (طٰہٰ:۵۳)

اور اوپر سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار ''جوڑا جوڑا'' نکالی۔

وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ . (الحج:۵)

اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکا یک وہ بھیگ اُٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اُگنی شروع کر دی۔

أَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ . (الشعراء:۷)

پس ہم نے زمین میں پودوں اور نباتات کے اچھے جوڑے اُگائے۔

پھلوں میں نر اور مادہ کا فرق

وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ . (الرعد:۳)

اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کئے۔

اعلیٰ درجے کے پودوں (Superior Plants) میں نسل خیزی کی آخری پیداوار ان کے پھل (Fruits) یعنی اسٹیمنز (Stamens) اور اوویولز (Ovules) ہوتے ہیں جب کوئی زردانہ (Pollen) کسی پھول تک پہنچتا ہے، تبھی وہ پھول ''بار آور'' ہو کر پھل میں بدلنے کے قابل ہوتا ہے، یہاں تک کہ پھل پک جاتا ہے اور (اس پودے کی) اگلی نسل کو جنم دینے والے بیج سے لیس ہو کر تیار ہو جاتا ہے؛ لہٰذا تمام پھل اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ (پودوں میں بھی) نر اور مادہ اعضاء ہوتے ہیں، یہ ایک ایسی سچائی ہے، جسے قرآن پاک بہت پہلے بیان فرما چکا ہے۔

پودوں کی بعض انواع میں غیر بار آور (Nonfertilized) پھولوں سے بھی پھل بن سکتے ہیں (جنھیں مجموعی طور پر ''پارتھینو کارپک فروٹ'' کہا جاتا ہے) ان میں کیلے کے علاوہ انناس، انجیر، نارنگی اور انگور وغیرہ کی بعض اقسام شامل ہیں، ان پودوں میں بھی بہت واضح صنفی خصوصیات (Sexual Characteristics) موجود ہوتی ہیں۔

ہر چیز کو جوڑوں میں بنایا گیا ہے

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ . (الذاریات:۴۹)

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو۔

اس آیت مبارکہ میں ہر چیز کے جوڑوں کی شکل میں ہونے پر زور دیا گیا ہے، انسانوں، جانوروں، پودوں اور پھلوں کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ یہ آیت مبارکہ بجلی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہو کہ جس میں ایٹم منفی بار والے الیکٹرونوں اور مثبت بار والے مرکزے پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے جوڑے ہو سکتے ہیں۔

فعلیات (Physiology) دورانِ خون (بلڈ سرکولیشن) اور دودھ

قرآن پاک کا نزول، دورانِ خون کی وضاحت کرنے والے اولین مسلمان سائنسدان ابن النفس سے چھ سو سال پہلے اور اس دریافت کو مغرب میں روشناس کروانے والے ولیم ہاروے سے ہزار سال پہلے ہوا تھا، تقریباً تیرہ صدیوں پہلے یہ معلوم ہوا کہ آنتوں کے اندر ایسا کیا کچھ ہوتا ہے جو نظام ہضم میں انجام پانے والے افعال کے ذریعہ دیگر جسمانی اعضاء کی نشوونما کی ضمانت فراہم کراتا ہے، قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ جو دودھ کے اجزاء کے ماخذ کی وضاحت کرتی ہے، اس تصور کے عین مطابق ہے۔

مذکورہ تصور کے حوالے سے آیت قرآنی کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا اہم ہے کہ آنتوں میں کیمیائی تعاملات (Reactions) واقع ہوتے ہیں اور یہ کہ آنتوں ہی سے ہضم کردہ غذا سے اخذ کئے ہوئے مادے ایک پیچیدہ نظام سے گزر کر دوران خون میں شامل ہوتے ہیں، کبھی وہ (مادوں) کو تمام اعضاء تک پہنچاتا ہے، جن میں دودھ پیدا کرنے والے (چھاتیوں کے) غدود بھی شامل ہیں۔

سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنتوں میں موجود غذا کے بعض مادے آنتوں کی دیوار سے سرایت کرتے ہوئے خون کی نالیوں (Vessels) میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر خون کے راستے یہ دوران خون کے ذریعے کئی اعضاء تک جا پہنچتے ہیں، یہ فعلیاتی تصور مکمل طور پر لازماً ہماری گرفت میں آجائے گا، اگر ہم قرآن پاک کی درج ذیل آیاتِ مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے :

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ
لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِلشَّارِبِينَ . (النحل:٦٦)

اور تمہارے لئے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے، ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۔ (المومنون:۲۱)

اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے، ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لئے ان میں بہت سے فائدے بھی ہیں، ان کو تم کھاتے ہو۔

چودہ سو سال قبل قرآن پاک کی فراہم کردہ یہ وضاحت جو گائے میں دودھ کی پیداوار ہونے کے حوالے سے ہے، حیرت انگیز طور پر جدید فعلیات سے بھرپور انداز میں ہم آہنگ ہے، جس نے اس حقیقت کو حال ہی میں دریافت کیا ہے۔

غیر متعصب سائنسدانوں نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ یہ کتاب جو آج سے چودہ سو سال قبل اللہ کے نبی محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے اس میں دنیا و مافیہا کی تمام چیزوں کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے اور قیامت تک آنے والی والی تمام دشواریوں کا حل قرآن میں موجود ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ عصبیت کے عینک کو اُتار کر اسے تسلیم کرکے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرلیا جائے۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن اور جدید میڈیکل سائنس

مولانا نثار احمد حصیر القاسمی ⊙

سائنس کا لفظ لاطینی زبان کے لفظ سائنٹیا Scientia سے ماخوذ ہے، جس کے معنی علم Knowledge کے ہیں، اور اصطلاح میں سائنس کا مفہوم ہے: تجرباتی علوم حکمت یعنی فطری وطبیعی مظہر کا باقاعدہ علم یا طبیعتی حقائق کا وہ علم جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہو، جدید سائنسی علوم میں ریاضی، کیمیا، طبیعیات، ارضیات، نباتیات، حیوانیات (حیاتیات) فلکیات اور طب سے متعلق علوم شامل ہیں، ہم اس وقت سائنس کے ایک جزء جدید علم طب کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا قرآن سے کس قدر ربط وتعلق ہے اور قرآن میں اس علم سے متعلق کس طرح کے حقائق کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے، علم یعنی نالج وسائنس کا تعلق اسلام اور اس کی کتاب ہدایت قرآن کریم سے گہرا ہے، قرآن کی وہ آیت جو سب سے پہلے نازل ہوئی علم ہی سے متعلق ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ، عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ . (العلق:۱-۵)
>
> پڑھیں اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپ پڑھتے رہیں، آپ کا رب بڑا اکرم والا ہے، جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، جس نے انسان کو سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

علم کی اہمیت وفضیلت پر دلالت کرنے والی آیتیں بے شمار ہیں، احادیث کے اندر بھی نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ دینے کی تاکید کی اور اسے دین ودنیا کی فلاح وبہبود اور کامیابی وکامرانی کا ذریعہ قرار دیا ہے، جس کی تفصیل میں جانے کی اس وقت ضرورت نہیں، اس وقت صرف اتنا اشارہ کردینا کافی ہے کہ قرآن نہ تو فلسفہ وسائنس کی کتاب ہے نہ محض مذہبی وروحانی رہنمائی کی کتاب؛ بلکہ اس کے اندر وہ تمام علوم سموئے ہوئے ہیں، جس کا سہارا لے کر اور تحقیق وجستجو وگہرائی حاصل کرلینے کے بعد انسان خدائے واحد کی راہ پاسکتا ہے اور صحیح منزل کی

⊙ استاذ: دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

رہنمائی اسے حاصل ہوسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں ایسی ہیں کہ ان میں جن حقائق کی طرف آج سے چودہ سو سال قبل اشارے کئے گئے ہیں، جدید سائنس طویل مسافت طے کرنے کے بعد اب وہاں تک پہنچ پائی ہے، اور اس سے قرآن کی حقانیت وصداقت کی توثیق ہوئی ہے، قرآن کو اپنی صداقت پر استدلال کے لئے سائنس کی ضرورت نہیں، مگر ان جدید انکشافات سے ہمارے ایمان ویقین میں زیادتی اور اطمینان ضرور حاصل ہوتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید سراپا ہدایت ہے، جسے نازل کرکے اللہ نے انسان پر احسان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

الٓمٓ ، ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ . (البقرة:۱-۲)

الٓــمٓ ،اس کتاب (کے اللہ کی کتاب ہونے میں) کوئی شک نہیں، پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔

یعنی اس کے اندر جو حقائق و واقعات احکام و مسائل اور طبی و سائنسی نکتے بیان کئے گئے ہیں، اس کی صداقت میں، ان سے انسانیت کی فلاح ونجات وابستہ ہونے میں، اور اس کے اندر جن باتوں اور حقائق ورموز کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، اس کے برحق ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، یہ کتاب ان لوگوں کی رہنمائی کرتی ہے، جو حق کے متلاشی اور خوف الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنَّ هٰــذَا الْقُرْآنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ أَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا کَبِیْرًا . (الإسراء:۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے، جو بالکل سیدھی ہے، جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب عزیز کو انسانوں کے لئے سراپا ہدایت وراہنما بنایا ہے، جس میں ساری انسانیت کی دنیوی واخروی فلاح وبہبود اور بہتری وعمدگی کا سامان مہیا ہے۔

اس کے رہنما ہونے کا لازمی تقاضہ ہے کہ اللہ نے اس کے اندر وہ تمام علوم قاعدہ کلیہ کی حیثیت سے رکھ دئے ہیں جس کی تہہ تک پہنچنے اور ان علوم تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ایک طرف وہ اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کا اقرار واعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کا سرا جوڑتے ہوئے خدائے واحد تک رسائی حاصل کرتا اور اعتراف کرتا ہے کہ یقیناً اس کا خالق ومالک اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے، اس کی گہرائی میں پہنچنے

کے بعد انسان کو احکام خداوندی کی علتوں، حکمتوں اور مصلحتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے، اور وہ انسان کائنات کی حقیقت کے تمام اہم ترین مسائل اور اس کے حل سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے، احکام خداوندی کی حکمتیں اور علتیں ایک تسلسل کی صورت میں ہیں، ہر حکمت کے اندر ایک اور حکمت، اور ہر علت کے پیچھے ایک اور علت موجود ہوتی ہے، اور حکمتوں وعلتوں کا یہ سلسلہ اللہ کی ذات پر ختم ہوتا ہے: ''وَأَنَّ إِلَى رَبِّكَ الْمُنتَهَى'' (النجم:۴۲) جہاں پہنچ کر ہر انسان اس خدائے واحد کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے؛ البتہ جن کے دلوں پر مہر لگ گئی ہو وہ ان واضح نشانیوں کے باوجود اللہ کی وحدانیت کے اقرار سے منہ موڑے رہتے ہیں؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت ورہنمائی کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ اس کے اندر راہ پانے کا جذبہ بھی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لئے کائنات میں بے شمار نشانیاں بکھیر دی ہیں، جو ہر صاحب عقل ودانش کو دعوت فکر دیتی ہیں، یہ نشانیاں زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ خود بخود وجود میں نہیں آگئی ہیں؛ بلکہ اسے کسی طاقتور ہستی نے نہایت باریکی اور منظم طریقہ پر ہم آہنگی کے ساتھ وجود بخشا ہے، آفاق کائنات کے علاوہ خود انسانی وجود کے اندر بے شمار نشانیاں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۔ (فصلت:۵۳)
>
> عنقریب ہم ان کو نفس انسانی کے اندر اور خارج کی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے، (یعنی ان کی نفسیات، طبعیات، حیاتیات اور اس جیسے بعض دیگر علوم کے حقائق سے آشنا کریں گے) یہاں تک کہ ان پر ثابت ہو جائے گا کہ قرآن خدا کی پہنچی ہوئی کتاب ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ قرآن کریم نہ تو تاریخ وفلسفہ کی کتاب ہے نہ ماحولیات وفلکیات کی، نہ سائنس وطب کی کتاب ہے نہ ہندسہ وعمرانیات کی، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے اندر تمام علوم کے اشارے موجود ہیں، جس سے رہنمائی حاصل کر کے انسان اللہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۔ (سورۃ الأنعام:۵۹)
>
> کوئی خشک وتر شئے ایسی نہیں جس کا ذکر اس واضح کتاب میں موجود نہ ہو۔

یعنی منزل مقصود تک پہنچنے میں انسانوں کی رہنمائی کرنے والی ہر چیز اس کتاب کے اندر موجود ہے، ان میں سے بعض کو تو سائنسی تحقیقات نے دریافت کر لیا ہے، مگر بہت سی حقیقتیں وہ ہیں جس کی دریافت اب تک نہیں ہو سکی

ہے، اور موجودہ سائنسی تحقیقات وہاں تک رسائی حاصل کرنے سے ہنوز قاصر ہیں، دوسری جگہ اسی مفہوم کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کیا ہے :

مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ . (الأنعام:۳۸)

یہ ممکن نہیں کہ اس کتاب مبین میں ماحولیات، فلکیات، طبعیات اور دیگر علوم اور اس کے حقائق کی طرف تو واضح اشارہ ہو، اور میڈیکل سائنس کی طرف اشارہ نہ ہو، قرآن کریم کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جو طبی علوم کے میدان میں معجزانہ حیثیت رکھتی ہیں، یہ ایسے بے مثال نمونے ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے کیوں کر انسانی علوم و معارف پر سبقت حاصل کی ہے؟ یہ قرآنی حقائق آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل نازل ہوئے تھے، اس وقت ان کو سمجھنا آسان نہیں تھا، مگر آج طب اور حیاتیاتی علوم میں جدید انکشافات نے اسے سمجھنا آسان بنا دیا ہے، گویا قرآن کریم نے جس طرح دوسرے علوم کو موضوع بنایا اور اس کی طرف اشارہ کیا ہے، علم طب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، خود اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو شفاء قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاء وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلاَ يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إَلاَّ خَسَاراً . (الاسراء:۸۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاء لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِين . (یونس:۵۷)

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاء . (فصلت:۴۴)

قرآن کے شفاء ہونے کو جھاڑ پھونک اور عقائدی وروحانی شفاء تک محدود رکھنا زیادتی ہوگی، یہ حقیقت ہے کہ آیت کا راست مفہوم بڑی بیماری یعنی کفر و شرک اور ضلالت و گمراہی سے شفاء ہے، مگر جسمانی شفایابی کو اس سے خارج نہیں کیا جاسکتا ہے، اس کا مطلب ہوگا کہ اس کی بعض آیتوں سے جس طرح روح و عقیدے کی بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا، اسی طرح اس کے ذریعہ جسمانی بیماریوں کا بھی علاج کیا جاسکتا ہے، اور اس میں غور و فکر کے ذریعہ طبی حقائق تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے :

واعلموا أن هذا القرآن هو الناصح الذي لا يغش ، والهادي الذي لا

يضل ، والمحدث الذي لا يكذب ، وما جالس هذا القرآن أحد الا قام عنه بزيادة أو نقصان ، زيادة في هدى ، أو نقصان من عمى ، واعلموا أنه ليس على أحد بعد القرآن من فاقة ، ولا لأحد قبل القرآن من غنى ، فاستشفوه من أدواء كم ، واستعينوا به على لأوائكم ، فإن فيه شفاء من أكبر الداء ، وهو الكفر والنفاق ، والغي والضلال ، فاسئلوا الله به وتوجهوا إليه بحبه ، ولا تسألوا به خلقه .

یاد رکھو! یہ قرآن ایسا ناصح وخیر خواہ ہے جو دھوکا نہیں دیتا، ایسا رہنما ہے جو راہ نہیں بھٹکاتا، ایسی بات کہنے والا ہے جو خلاف واقعہ نہیں کہتا، اس قرآن کے پاس جو بھی بیٹھا وہ کچھ نہ کچھ کمی زیادتی کے ساتھ ہی اٹھا، یعنی ہدایت میں زیادتی یا گمراہی میں کمی لے کر، یاد رکھو! قرآن کے بعد کسی کو محتاجی نہیں، اور نہ قرآن سے پہلے کسی کے لئے اس سے بے نیازی ہے، اس لئے اپنی بیماریوں کے لئے اس سے شفاء طلب کرو، اور تنگی و پریشانی میں اسی سے مدد طلب کرو، اس میں بڑی بیماری یعنی کفر ونفاق، اور گمراہی و ضلالت سے بھی شفاء ہے، اللہ سے ہر چیز اسی کے ذریعہ طلب کرو، اور اس کی محبت کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو، اس کے رہتے ہوئے مخلوق کے سامنے دست سوال مت پھیلاؤ۔

قرآن کی صداقت اور وحی و الہام کے انکشافات کی توثیق کے لئے طبی انکشافات یا سائنسی حقائق کی ضرورت ہرگز نہیں، مگر قرآن کریم نے ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتے ہوئے جن حقائق کو تسلیم کرنے کا حکم دیا ہے، اگر وہ تجرباتی، مشاہداتی سائنسی اور طبی انکشافات کے ذریعہ سامنے آجائیں تو اس سے اطمینان قلب حاصل ہوگا اور یقین میں پختگی پیدا ہوگی، جو ایمان کو مکمل کرے گی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''ليطمئن قلبي'' کہا تھا۔

ہمیں غور کرنا چاہئے کہ قرآن کی مجموعی آیات ۶۶۱۶ میں سے احکام سے متعلق کم وبیش صرف ۵۰۰ آیات ہیں اور سائنس سے متعلق آیات کی تعداد ۷۵۰ سے کچھ زائد ہیں اور اس کی تقریبا ایک تہائی تعداد میڈیکل سائنس سے متعلق ہے۔

قرآن کی ان ہی آیات میں غور وفکر اور تدبر کرنے کا نتیجہ تھا کہ قرون وسطی میں مسلمانوں نے غور وفکر اور تحقیق وتدقیق کی طرف توجہ دی، اس میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دئے اور ایسی ایسی چیزیں ایجاد کیں

جو سائنس کی برق رفتار ترقی کے باوجود اپنی افادیت رکھتی ہیں، موجودہ سائنس کی بنیاد ان ہی کی تحقیقات پر رکھی گئی ہے، ان مسلم سائنسدانوں نے جغرافیہ، ریاضی، فزکس، کیمسٹری، فلکیات، بیالوجی اور طب جیسے علوم میں ان مٹ نقوش چھوڑے اور دنیا کو نئے نئے علوم وفنون سے آشنا کیا ہے۔

میڈیکل سائنس اور عمومی سائنس سے متعلق آیات قرآنی کو کئی اہل علم نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے، جدید میڈیکل سائنسدانوں کے لئے سب سے محیر العقول قرآن کی وہ صراحت ہے جس میں اس نے جنین کے نطفہ، علقہ، مضغہ وغیرہ کے مختلف مراحل سے گذرنے کا تذکرہ کیا ہے، ان حقائق سے متعلق مستقل کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں؛ اس لئے اس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، آئندہ سطور میں ہم بطور مثال صرف ان چند حقائق کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جن کی تفصیلات زیادہ نہیں آئی ہیں، ہمارا منشأ صرف یہ اجاگر کرنا ہے کہ جدید میڈیکل سائنس کا قرآن سے بہت قریبی رشتہ ہے جو توثیق کرنے والی ہے کہ قرآن برحق اور منزل من اللہ ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا دین سچا اور اسی کے ذریعہ انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے :

اَلْحَقُّ مِن رَّبِّکَ فَلاَ تَکُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۔ (البقرۃ:۱۴۷)

رحم کی کارکردگی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ أُنثَی وَمَا تَغِیضُ الأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَکُلُّ شَیْئٍ عِندَہُ بِمِقْدَارٍ ۔ (الرعد:۸)

مادہ اپنے شکم میں جو کچھ رکھتی ہے، اسے اللہ بخوبی جانتا ہے، اور پیٹ کا گھٹنا بڑھنا بھی، ہر چیز اس کے پاس اندازے سے ہے۔

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ رحم کی شکل اور اس کے اجزاء ومشتملات کی عمر کے مختلف مراحل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، نابالغ بچی کا رحم بالغ بچی سے بالکل مختلف ہوتا ہے، اسی طرح بالغہ دوشیزہ کا رحم سن ایاس کی عمر کو پہنچی ہوئی عورت کے رحم سے مختلف ہوتا ہے، بلوغ اور سن ایاس کے درمیان کی مدت عورت کے لئے زرخیزی وشادابی کا زمانہ ہوتا ہے، یہ مدت عام طور پر چالیس سال تک رہتی ہے، اس زمانہ میں رحم پورے طور پر ماہانہ اپنی کارکردگی انجام دیتا رہتا اور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، جب حمل قرار پاتا ہے تو اس کا یہ ماہانہ عمل موقوف ہوجاتا ہے اور ایک نہایت اہم عمل شروع ہوجاتا ہے، اس دوران رحم اپنی وضع، شکل، حجم، سائز اور عناصر میں تبدیل ہونے لگتا ہے، یہاں تک کہ حمل جب مکمل ہوجاتا اور نفاس کا زمانہ گذر جاتا ہے تو وہ اپنی اصل ہیئت وشکل میں واپس آجاتا ہے۔

نابالغ بچیوں کا رحم بالغ لڑکیوں سے مختلف ہوتا ہے، بچی کے رحم کی دیوار باریک اور ڈھیلی ہوتی ہے، جبکہ بالغہ کے رحم کی دیوار موٹی ہوتی اور اس پر عضلات کے تین تہہ چڑھے ہوتے ہیں، بچی کا رحم بڑا اور گردن چھوٹی ہوتی، جبکہ نوجوان عورت کا رحم چھوٹا اور اس کی گردن طویل ہوتی ہے۔

نابالغ بچی کے رحم کی وضع بھی بالغہ کے بہ نسبت مختلف ہوتی ہے، بچی کے اندر رحم حوض کے اوپری حصہ سے جوف بطن کی طرف ابھرتا ہے، جبکہ بالغہ کا رحم وسط حوض میں ابھرتا ہے، اور جوں جوں بچی بڑی ہوتی رہتی رحم نیچے کی طرف اترتا ہے اور ساتھ ہی حوض کے اندر وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے، اور سات سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ اپنے اصل مقام پر پہنچ جاتا ہے، اس کے بعد اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہتی ہے اور بلوغ کے وقت وہ اپنی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے۔

بالغہ عورت کا رحم پابندی کے ساتھ اپنی ماہانہ کارکردگی انجام دیتا رہتا ہے، اس میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے اور عورت کے خون میں ہارمون کی مسلسل تبدیلی کے ساتھ رحم کی تہیں ہم آہنگ رہتی ہیں، جب عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو اس میں بڑی اور اہم تبدیلی؛ بلکہ عورت کے پورے وجود میں تبدیلی رونما ہو جاتی ہے، عورتوں کا رحم تین تہوں پر مشتمل ہوتا ہے:

(۱) بیرونی پریٹن تہہ جو رحم کے جسم کو اور اس کی گردن کے کچھ حصے کو ڈھکے ہوتا ہے۔

(۲) عضلاتی تہہ، یہ غیر ارادی عضلات کے مجموعے پر مشتمل ہوتا ہے، اس کی دبازت تقریباً پانچ سینٹی میٹر ہوتی ہے اور یہ خود بھی اپنے اندر جھلیوں کی تین تہہ لئے ہوتی ہے، رحم کی دیوار کا موٹا پن اور اس کے عضلات کی دبازت رحم کی مکمل حفاظت کرتی ہے، اسی طرح رحم کی گردن کے عضلات اس کی گردن کو دبائے رہتے ہیں، ان عضلات کی ذمہ داری ہے کہ وہ رحم کے اندر سے خاص طور پر ولادت کے بعد خون کے بہاؤ پر روک لگائیں، اگر یہ نہ ہو تو پیدائش کے بعد عورت کا خون رکے ہی نہیں اور وہ موت کے منہ میں چلی جائے۔

(۳) اندرونی طبقہ، بلغم جیسی جھلی کا ہوتا ہے، جو رحم کا اندرونی پردہ ہوتا ہے اس کے اندر بھی کئی تہیں ہوتی ہیں، جس کے درمیان بے شمار رحم کے غدود اور خونی تھیلیاں ہوتی ہیں، یوں تو پورا رحم ہارمون کے زیر اثر ہوتا ہے، مگر اس کا سب سے زیادہ اثر رحم کی اندرونی جھلی پر ہوتا ہے۔

رحم کی کارکردگی دم حیض کے رکنے کے بعد سے شروع ہو جاتی ہے، اس وقت رحم کے پردے کی جھلی باریک ہوتی ہے، جو نصف ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی، اس وقت سے اس کی ترقی کا مرحلہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ انڈے کی تھیلی سے اسٹروجین ہارمون روانہ ہونا شروع ہوتا ہے، جس سے رحم کی جھلی بڑھنے لگتی ہے اور نصف ملی میٹر سے

بڑھ کر وہ پانچ ملی میٹر تک پہنچ جاتی ہے، اسی طرح خون کی تھیلی بھی پھیلنے لگتی ہے، یہاں تک کہ اس کی شکل دراز ہوجاتی ہے، ساتھ ہی رحم کے غدود کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا اور وہ دراز ہوکر پائپ کی شکل اختیار کرلیتا ہے، مادہ کا ہارمون صرف یہی تبدیلی پیدانہیں کرتا؛ بلکہ ساتھ ساتھ وہ رحم کی دیوار کے عضلات کو بھی ترقی دیتا ہے، اس مرحلہ کے اخیر میں رحم میں مادۂ منویہ کا شدت سے اشتیاق پیدا ہوجاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی پستان میں بھی ترقی ہوتی ہے، روغنیات اس میں جمع ہونے لگتے اور وہ گول ہونے لگتا ہے، پھر سخت ہوجاتا ہے، اور لمس کے وقت نہایت حساس ہوجاتا ہے، اسی طرح روغنیات دونوں رانوں اور سرین کی طرف بھی رخ کرتا اور اسے بھی حساس بناتا ہے، پورے جسم کی جلد نرم ہوجاتی اور دوشیزہ کی آواز بھی باریک و نرم ہوجاتی ہے، یہ ہارمون صرف یہی نہیں کرتا؛ بلکہ عورت کے اندر جنسی خواہش کو بھی ابھارتا ہے اور اس کی اداؤں میں بھی فرق لاتا ہے، یہ ہارمون اپنی ذمہ داری بڑی خوبی و باریکی سے انجام دیتا ہے، یہی ہارمون عورت کو مرد کی طرف راغب کرتا اور مردوں کو عورتوں کی نگاہ میں محبوب بناتا ہے، جیسا کہ مردوں کا ہارمون ''ٹسٹرن'' مردوں میں مردانگی اور قدرت جماع پیدا کرتا ہے، ہارمون اسٹروجین عورت کے صرف رحم اور بچے دانی پر اثر انداز نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کے پورے جسم پر اثر کرتا اور اس کے اندر حرارت پیدا کرکے جنسی خواہش کو ابھارتا ہے، اور الفت و محبت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ . (الروم:۳۰)

اس مرحلہ کے مکمل ہوجانے کے بعد ایک دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ ہے چھٹائی کا مرحلہ، اس کے اندر رحم کی اندرونی جھلی پانچ ملی میٹر سے بڑھ کر سات آٹھ ملی میٹر تک پہنچ جاتی ہے، رحم کے غدود کی بھر مار ہوجاتی ہے اور اس کثرت کی وجہ سے اس کی شکل لبلبی جیسی ہوجاتی ہے، اس کے اندرونی حصہ میں چھانٹ کر علحدہ کیے گئے اجزاء جمع ہوجاتے، پھر رحم کو غذا پہنچانے والے شرایین بڑھنے لگتے ہیں، خلیے بھی غدود کے اندر بڑے ہونے لگتے ہیں، جس سے جھلی اوپری سطح میں مضبوط و ہموار رحم کی دیوار کی جانب سیدھا اور اسپنج کی شکل کی ہوجاتی ہے، اس تبدیلی کی وجہ بروجسٹرن ہارمون یا حمل کا ہارمون ہوتا ہے، جسے معمولی مقدار میں Blister کے Ovary پیدا کرتے ہیں، پھر اس تھیلی سے انڈوں کا اخراج ہوتا ہے، اس مرحلہ میں اسے زرد جسم کے نام سے موسوم کردیا جاتا ہے، اس کی زردی انڈوں سے جدائی کے غم کا اظہار ہوتا ہے، مگر یہ زرد جسم اپنا اہم ہارمون ارسال کرتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے رحم

انڈوں کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، وہ اس کے لئے قالین بچھاتا، غذاء حاضر کرتا، اور رحم کو خون سے تر کرتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ رحم کے عضلات کو حکم دیتا ہے کہ ابھی اچھلنے کودنے اور طیش میں آنے کی ضرورت نہیں، ابھی اطمینان رکھو؛ کیوں کہ سخت حرکت اور بوجھل کام علقہ کو رحم سے باہر گرا سکتا اور خون جاری کر سکتا ہے، اسی طرح وہ رحم کی گردن سے بھی کہتا ہے کہ اپنی چھٹائی میں کمی کرو اور منی کے کیڑوں کو تیزی کے ساتھ اپنی مادہ سے ملنے کے لئے اندر جانے دو، جہاں انڈے کی تھیلی سے انڈے نکل کر اس کا استقبال کرنے کے لئے پہلے سے تیار کھڑے ہوتے ہیں، جب سینچا گیا انڈا رحم سے لٹک جاتا ہے تو وہ اپنا قاصد زرد جسم کے پاس بھیجتا ہے (تناسلی غدود کو غذا فراہم کرنے والے اس قاصد کو Gonadotrophin کہا جاتا ہے) اور اسے خبر دیتا ہے کہ اسے اس کی مدد کی ضرورت ہے، تو وہ اس کے پاس ہارمون حمل یا ہارمون پروجسٹرن بھیجنے لگتا ہے، زرد جسم اپنا یہ ہارمون تین ماہ کے اختتام تک یعنی اس وقت تک بھیجتا رہتا ہے کہ بچے دانی کی اندرونی جھلی بن کر تیار نہیں ہو جاتی، اس کی تکمیل کے بعد وہ اس کی مواد کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اسے مدد روک دینے کے لئے کہتا ہے، اس کے ساتھ ہی زرد جسم اس مشقت سے چھٹکارا حاصل کر لیتا اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ "قرار مکین" محفوظ مقام میں نطفہ جگہ پا چکا ہے، اور بچے دانی نے اپنی ذمہ داری پورے طور پر اٹھالی ہے، اس کے بعد یہ ہارمون عورتوں کے اندر رفتہ رفتہ جنسی خواہش میں کمی لانے لگتا اور ماں بننے کے جذبے کو پروان چڑھانے لگتا ہے، چھاتی میں پہلی بار دودھ کے غدود پیدا ہونے لگتے اور چھاتیوں کو غذا کی فراہمی اور خون کی سیرابی کا عمل شروع ہو جاتا ہے؛ تا کہ کچھ دنوں کے بعد اس مقام سے وہ خوشگوار وصحت بخش بچے کی غذا نکلنے لگے جس کا کوئی متبادل نہیں، اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَناً خَالِصاًسَآئِغاً لِلشَّارِبِيْن . (النحل:٦٦)

اس کے اندر بچوں کے لئے ضروری پروٹین وٹامن اور نمک موجود ہوتا ہے جو ولادت کے وقت سے اس کے جسم کے موافق ہوتا ہے، پھر دن بدن اس دودھ کی صنعت میں بچوں کی نشوونما کے مطابق تبدیلی آتی رہتی ہے :

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ أَعْطٰی کُلَّ شَیْئٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰی . (طٰہٰ:٥٠)

اللہ نے چھاتی کی رہنمائی کی کہ وہ اپنے دودھ اور اس کے اجزاء کو بچے کی ضرورت کے مطابق تبدیل کرتی رہے، بچوں کی رہنمائی کی کہ وہ اپنی غذا چھاتی سے حاصل کرے، حمل کا پروجسٹرن ہارمون حاملہ کے جسم میں پانی اور نمک کا ذخیرہ کرتا ہے؛ تا کہ وہ جنین کی ضروریات کی تکمیل کرتا رہے، اس دوران قلب بھی خون کی پمپنگ میں اضافہ کر دیتا ہے، اور اس عمل میں ہڈی کے گودے بھی شریک ہو جاتے ہیں، سرخ وسفید خون کی افزائش بڑھادی جاتی ہے، پھر عورت کے جسم کا ذرہ ذرہ حمل کا احساس کرنے لگتا اور اس پر چوکنا ہو جاتا اور اس کے لئے حرکت میں

آجاتا ہے، ان ساری کدو کاوش اور تمام اعضاء کے باہمی تعاون کے باوجود اگر اللہ کی مشیت سے حمل قرار نہیں پاتا ہے، تو رحم کو اس پر بڑا ملال ہوتا اور مارے غم کے وہ نڈھال ہوجاتا اور رونے لگتا ہے، اس کا رونا آنسو سے نہیں ؛ بلکہ خون سے ہوتا ہے، جو دم حیض ہوتا ہے، پھر تو رحم کی اندرونی جھلی ٹوٹ پھوٹ کی شکار ہوجاتی، خوف جاری ہوجاتا، اور وہ ساری عمارت منہدم ہوجاتی ہے، قالین سمٹ جاتا اور ساری تیاریاں خاک میں مل جاتی ہیں، جو نطفہ کے استقبال کے لئے کی گئی تھیں، اور حمل کے ہارمون نے جو کچھ کیا تھا ساری تبدیلیاں و تدبیریں الٹی ہوجاتی ہیں، زرد جسم مرجاتا اور حمل کے ہارمون کی افزائش موقوف ہوجاتی ہے؛ کیوں کہ جب حمل نہیں تو اس کی افزائش کیوں؟ جب کہ جسم میں کسی چیز کی پیداوار بلاوجہ نہیں ہے، ہر چیز کی غرض و غایت اور ہر مخلوق کی انتہا اور مقررہ وقت ہے :

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لاَ يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلاَ يَسْتَقْدِمُوْن . (الأعراف:۳۴)

پھر رحم اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آتا اور از سر نو اپنا کام شروع کرتا ہے، اور اگر نطفۂ امشاج رحم کے اندر پہنچ جاتا اور اللہ کی مشیت سے وہ بیضۂ انثی سے بغل گیر ہوکر رحم کی دیوار میں چپک کر لٹک جاتا اور اس کی مدد زرد جسم سے ہارمون حمل کی شکل میں آنے لگتی ہے، تو رحم کے اندر زبردست تبدیلی آنے لگتی ہے، اس کا سائز دو ملی میٹر کی گنجائش سے بڑھ کر ایک بڑا عضو بن جاتا ہے جس کی ضخامت 7000 ملی میٹر تک کی ہوجاتی اور وزن میں 50 گرام سے 1000 گرام کا اضافہ ہوجاتا ہے، وہ اپنی تہہ کے اندر جو لئے ہوتا اس کا وزن 5000 گرام ہوتا ہے جس میں 3500 گرام وزن جنین کا 1000 گرام جنین کا احاطہ کئے ہوئے امینوسی سیال کا، اور 500 گرام بچے دانی کی جھلی کا ہوتا ہے۔

حمل کے دوران رحم کے اندر زبردست تبدیلی ہوتی رہتی ہے، تاکہ جنین کو ضروری غذا اور آکسیجن ملتا رہے اور سکنڈ آکسیڈ کاربن، اور یولینا جیسے مضر اجزاء کو دور کرتا رہے، اس کے نتیجہ میں مائکروپ جیسے مضر مواد جنین تک نہیں پہنچ پاتے ہیں، عضلاتی طبقہ میں بھی جنین کی یومیہ ترقی کے مطابق ترقی ہوتی رہتی ہے، حمل سے قبل رحم کی لمبائی تین انچ چوڑائی دو انچ اور دبازت ایک انچ ہوتی ہے، مگر حمل کے بعد اس میں ایسی تبدیلی آتی ہے کہ اس کا سائز 3000 گنا بڑا اور وزن سیکڑوں گنا زیادہ ہوجاتا ہے، اگر حمل اپنی انتہا کو نہیں پہنچ پاتا یا اللہ کی مشیت سے جنین ساقط ہوجاتا یا ولادت ہوجاتی ہے تو رحم نفاس کے دوران ہی اپنی سابقہ حالت پر لوٹ آتا ہے، عورت کا جسم بھی سابق کی طرح ہوجاتا ہے، پھر رحم کا ماہانہ عمل شروع ہوجاتا ہے اور حمل کے ایک نئے دور کی تیاری شروع ہوجاتی ہے، مگر جب عورت اور اس کے رحم کے آرام کا وقت آجاتا، اور وہ حمل کی مشقت برداشت کرنے کی اہل نہیں رہتی تو رحم کو چھپا دیا جاتا،

انڈے کی تھیلی کو بیضہ کی افزائش واخراج سے روک دیا جاتا ،نسوانیت کو ابھارنے والے ہارمون کی ترسیل روک دی جاتی ،اس کا ماہواری دم حیض آنا بند ہو جاتا اور رحم بچپن کی شکل میں لوٹ آتا ہے،عورت کے بچہ پیدا کرنے کا مرحلہ ختم ہو جاتا ،تمام اعضاء مضمحل ہو جاتے اور اللہ کا یہ فرمان صادق آتا ہے :

كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۔ (الأعراف:۲۹)

رحم میں کمی زیادتی کے ان مراحل پر نظر ڈالنے کے بعد اللہ کا یہ کلام کتنا سچ نظر آنے لگتا ہے :

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْئٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۔ (الرعد:۸)

محفوظ جگہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

أَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِيْنٍ ، فَجَعَلْنَاهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ، إِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ، فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُوْنَ ۔ (المرسلات:۲۰-۲۳)

کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی (منی) سے پیدا نہیں کیا، پھر ہم نے اسے مضبوط ومحفوظ جگہ میں رکھا، ایک مقررہ وقت تک، پھر ہم نے اندازہ کیا، اور ہم کیا خوب اندازہ کرنے والے ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الإِنْسَانَ مِن سُلاَلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ، ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۔ (المومنون:۱۲-۱۴)

یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا، پھر اسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دے دیا، پھر نطفہ کو ہم نے جما ہوا خون (علقہ) بنا دیا، پھر اس خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا (مضغہ) کر دیا، پھر گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیاں بنا دیں، پھر ہڈیوں پر ہم نے گوشت پہنا دیا، پھر دوسری بناوٹ میں اس کو پیدا کر دیا، وہ اللہ برکتوں والا ہے جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رحم کو ''قرار مکین'' محفوظ جگہ قرار دیا ہے، جہاں مخلوط نطفہ بڑھتا اور پرورش پاتا رہتا ہے، پہلے جنین کی شکل اختیار کرتا، حمل بنتا اور اخیر میں مکمل خلقت والا بچہ بنکر اس دنیا میں نمودار ہوتا ہے، یہ محفوظ مقام کیسا ہے؟ اور مختلف ادوار سے گذرنے کی طرف اللہ نے جو اشارہ کیا ہے وہ کس طرح ہوتا ہے؟ ماہرین طب جدید کا کہنا ہے کہ رحم عورت کے ڈھانچے کے حقیقی حوض کے اندرونی حصہ میں رکھا ہے، یہ حوض بیرونی حملوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے، کئی طرح کے باریک ریشے اور جھلیاں رحم کو مضبوطی سے پکڑے اور تھامے ہوتے ہیں، مگر اس کے باوجود اسے حرکت کرنے اور بڑھتے رہنے کی اجازت ہوتی ہے، یہاں تک کہ حمل کے آخری مرحلہ میں وہ 3000 گنا بڑا ہو جاتا ہے، بالغ عورت کے رحم کی گنجائش ڈھائی ملی میٹر کی ہوتی ہے، جو بڑھ کر آخری مرحلہ میں 7000 ملی میٹر کی گنجائش کے سائز کا ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود رحم اپنی جگہ مربوط و مستحکم برقرار رہتا ہے، حوض اور خصیتین و دبر کے درمیانی حصے رحم کی حفاظت کرتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ حوض کے اندر موجود مثانہ اور بہاؤ کی نالیاں بھی اس کی حفاظت میں اہم رول ادا کرتی ہیں، ماہرین کا کہنا ہے کہ خصیتین اور دبر کے درمیانی حصے کے عضلات کا مسلسل دباؤ نہ رہے تو رحم مثانہ اور بہاؤ کی نالیاں جیسے حوض کے اعضاء نیچے کو گر پڑیں اور جسم سے باہر نکل جائیں، اس کا مشاہدہ اطباء کو اس وقت ہوتا ہے جب مشکل و کٹھن ولادت کی صورت میں خصیتین و دبر کے درمیانی حصے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں یا اس میں کوئی بیماری لاحق ہو جاتی ہے تو یہ اعضاء اپنی جگہ سے ہٹ جاتے اور نیچے کو اتر آتے ہیں، اس کے بعد ریٹرکٹ خلیاتی جالی جو رحم کی گردن اور بچے دانی Vagina کے اوپری حصے میں ہوتا اور اس کے اجزاء آگے سے مثانہ اور پیچھے سے ریکٹم سے مربوط ہوتے ہیں، رحم کو محفوظ بنانے میں بھرپور مدد کرتے اور سرگرم رول ادا کرتے ہیں؛ تاکہ انسانی نطفہ مختلف ادوار سے گذرتے ہوئے ترقی کرتا رہے، جوف بطن اور جوف حوض میں موجود دباؤ کے درمیان حیران کن توازن ہوتا ہے اور اسی توازن کی وجہ سے سارے اعضاء اپنی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔

حوض کے اعضاء ایک دوسرے کا تعاون کرتے رہتے ہیں، چنانچہ رحم کا اتصال گردن سے، اور گردن کا اتصال Vagina سے رحم کو اپنی جگہ برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں، پھر رحم خود بھی تین تہوں پر مشتمل ہوتا ہے، ایک بیرونی تہہ پریٹن کی، دوسری اندرونی تہہ جو رحم کی جھلی تیار کرتی ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک دبیز تہہ ہوتی ہے جو خود بھی عضلات کی تین تہوں پر مشتمل ہوتی ہے، یہ عضلات رحم سے خون کے اخراج کو خاص طور پر ولادت کے بعد روکتے ہیں؛ کیوں کہ اگر اس کے اندر سخت سکڑنے کی صلاحیت نہ ہو تو کھلی ہوئی خونی تھیلی خون کا دریا بہادے اور جسم کے پورے خون کو نکال کر زچہ کو موت کے منہ میں پہنچادے، مگر اللہ ان عضلات کے ذریعہ ولادت کے فوری بعد خون کے بہاؤ کے منہ کو بند کر دیتا ہے، رحم کی اپنی جگہ برقراری حمل کے بروجسٹرن ہارمون کی افزائش

کی وجہ سے بھی ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ ہارمون رحم کے انقباض کو سست کر دیتے ہیں اور یہ نسوانیت کے اسٹروجین ہارمون کے برعکس ہوتا ہے؛ کیوں کہ اسٹروجین ہارمون رحم کے انقباض کو نہایت حساس بنا کر اسے مادۂ منویہ کا مشتاق اور ہشاش بشاش بنا دیتا ہے، رحم کے اسی شدت اشتیاق کی وجہ سے کبھی انسان جماع کے وقت محسوس کرتا ہے کہ جیسے رحم اس کے ذکر کو اپنی طرف کھینچ رہا اور اندر کی طرف جذب کر رہا ہے، حمل کے دوران یہ صورت حال نہیں ہوتی ہے؛ کیوں کہ بروجسٹرن ہارمون رحم کو ایسا کرنے اور طیش میں آنے سے روک دیتا اور اطمینان وسکون کے ساتھ پروقار رہنے کا حکم دیتا ہے؛ کیوں کہ اس کے اندر انمول موتی چھپا ہوا ہے اور ایسی حرکت کرنے کی وجہ سے خطرہ ہے کہ وہ اس موتی کو باہر پھینک کر ضائع نہ کر دے، اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ رحم کو ''قرار مکین'' اور محفوظ مقام کیوں قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے بجا طور پر کہا ہے: کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی (منی) سے پیدا نہیں کیا، پھر ہم نے اسے مضبوط و محفوظ جگہ میں رکھا، ایک مقررہ وقت تک، پھر ہم نے اندازہ کیا، اور ہم کیا خوب اندازہ کرنے والے ہیں۔(۱)

کچھ دنوں قبل ایمان یونیورسیٹی یمن کے بانی وچانسلر شیخ زندانی کی سرپرستی میں مسلم میڈیکل سائنسدانوں کے گروپ نے جنین سے متعلق اور دیگر سائنسی علوم کے بارے میں قرآنی معلومات جمع کرنے اور انگریزی میں ترجمہ کرنے کے بعد اسے یونیورسیٹی آف ٹورنٹو (کنیڈا) میں اناٹومی شعبہ کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر کیتھ لور کے سامنے پیش کیا جو جنین سائنس کے پروفیسر ہیں اور ان کی رائے طلب کی تو ان کا کہنا تھا کہ جنین سے متعلق آیات قرآنی میں بیان کردہ تمام معلومات جدید سائنسی دریافتوں کے عین مطابق ہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعض ایسی بھی آیات ہیں جن کی سائنسی درستگی کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے، وہ نہیں بتا سکتے کہ وہ آیات سائنس کی مطابقت میں صحیح ہیں یا غلط؛ کیوں کہ انہیں خود ان آیات میں دی گئی معلومات سے متعلق کچھ علم نہیں، ان کے متعلق جنینیات کے جدید مطالعہ اور تحقیقاتی مقاموں میں بھی کچھ موجود نہیں ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے جن حقائق کی نشاندہی کی ہے، ان میں سے بعض تک جدید سائنس ہنوز رسائی حاصل نہیں کر سکی ہے، مگر اس میں آئندہ جب ترقی ہوگی اور سائنس کا قدم مزید آگے بڑھے گا تو یقیناً، یہ سائنسدان وہ ان حقائق کی بھی تصدیق کرنے پر مجبور ہوں گے۔(۲)

دوران خون اور دودھ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ
لَّبَناً خَالِصاً سَآئِغاً لِلشَّارِبِين . (النحل:٦٦)

(۱) دورۃ الارحام للدکتور محمد علی الباز۔ (۲) ویب سائٹ، اعجاز القرآن۔

تمہارے لئے تو چو پایوں میں بھی بڑی عبرت ہے کہ ہم تمہیں اس کے پیٹ میں جو کچھ ہے اسی میں سے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ . (المؤمنون:۲۱)

تمہارے لئے چوپایوں میں بھی بڑی عبرت ہے، ان کے پیٹوں میں سے ہم تمہیں دودھ پلاتے ہیں اور بھی بہت سے نفع تمہارے لئے ان میں ہیں، ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔

خون کے سرکولیشن کی وضاحت کرنے والے سائنسدان ابن نفیس سے قرآن پاک کا نزول 600 سال پہلے اور مغربی سائنسدان ولیم ہاروے سے ایک ہزار سال پہلے ہوا تھا، قرآن نے ان سائنسدانوں کی دریافت سے صدیوں پہلے بتادیا تھا کہ آنتوں کے اندر ایسا نظام جاری ہے جو نظام ہاضمہ میں انجام پانے والے افعال کے ذریعہ دیگر جسمانی اعضاء کی نشو نما کی ضمانت دیتا ہے، سائنسدانوں نے واضح کیا ہے کہ آنتوں میں کیمیائی عمل (Reactions) جاری رہتا ہے، آنتوں ہی کے ذریعہ ہضم کی ہوئی غذا سے جذب کئے ہوئے مادے ایک پر پیچ نظام سے گذر کر دوران خون میں شامل ہوتے ہیں، کبھی یہ مادے لیور سے گذرتے ہیں، جس کا انحصار ان کی کیمیائی ترکیب پر ہوتا ہے، جن میں دودھ پیدا کرنے والی مشین (پستان) کے غدود بھی شامل ہیں، یعنی آنتوں کی غذا کے کچھ مادے اس کی دیوار سے رس کر خون کی نالیوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر دوران خون کے ذریعہ کئی اعضاء تک پہنچتے ہیں، اور چھاتیوں میں دودھ تیار ہوتا ہے، اس کے اندر بے شمار فوائد ہیں، قرآن کی یہ وضاحت عصر حاضر کے میڈیکل سائنس سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور جس افادیت کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے، مسلّم ہے۔

زیتون اور جدید میڈیکل سائنس

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہدایت میں زیتون کی قسم کھا کر اس کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ، وَطُورِ سِينِينَ . (التین:۱-۲)

اسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

كلوا الزيت وادهنوا به ؛ فإنه من شجرة مباركة . (۱)

دور حاضر کے سائنسدانوں اور جدید میڈیکل سائنس سے متعلق تحقیقات کرنے والوں نے پتہ لگایا ہے کہ بحر متوسط کے جزیرہ ''کریٹ'' کے باشندے ساری دنیا کے مقابلہ میں سب سے کم امراض قلب اور کینسر میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کے حیرت واستعجاب کی انتہا اس وقت نہیں رہی جب انہیں معلوم ہوا کہ کریٹ کے باشندے دنیا کے دیگر عوام کے بہ نسبت سب سے زیادہ زیتوں اور اس کے تیل کا استعمال کرتے ہیں ، وہ لوگ یومیہ جو کیلوری (Calorie) استعمال کرتے ہیں، اس کا 33 فیصد حصہ وہ ہوتا ہے جسے وہ زیتون سے حاصل کرتے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زیتوں کے تیل کا اس سے کیا تعلق ہے؟ کیا اس تعلق سے جدید میڈیکل سائنس کچھ کہتی ہے؟ میڈیکل سائنس کے ماہرین نے زیتوں کے تیل کے بارے میں غوطہ زنی شروع کی تا کہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ قلب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے اور اس کے کولسٹرول کی اثر انگیزی کیا ہے؟ آئندہ سطور میں ہم اس پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

صحیح طور پر کسی کو یہ علم تو نہیں ہوسکا کہ زیتوں کے تیل کو سب سے پہلے کس نے استعمال کیا، اور کس نے اس کا تیل نکالنے کا طریقہ ایجاد کیا، مگر تاریخی دلائل ودستاویزات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیتون کے درخت کا اولین وطن شام تھا، یہاں اس کی کاشت سامیوں سے 6000 سال قبل شروع ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اسی زیتوں کا تذکرہ سورۂ نور کے اندر بھی کیا ہے، اس کے تیل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کہنا ہے :

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوْقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُّوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِيْ اللّٰهُ لِنُوْرِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ . (النور:۳۵)

اس کی خاصیت یہ ہے کہ جسم انسانی کی صحت کی برقراری میں یہ اہم رول ادا کرتا اور اس کا استعمال کرنے والے دماغ کے ماؤف ہونے، یادداشت کے کم ہونے اور قلب کے امراض سے محفوظ رہتے ہیں، اس کے استعمال میں کوئی خطرہ نہیں ؛ بلکہ پوری رغبت ودلچسپی سے ہم اسے استعمال کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ (۲)

---

(۱) سنن الترمذي ، كتاب الأطعمة ، باب ما جاء في أكل الزيت، حدیث نمبر:۱۹۶۹۔

(۲) ڈاکٹر ولیم کاسیٹلی ڈائرکٹر آف فرامنگھم (Farmangham) انسٹی ٹیوٹ۔

نیویارک کے کالیفورنیا یونیورسیٹی کے ماہر طب ڈاکٹر اہرنس کا کہنا ہے: ''ہمیں بخوبی علم ہے کہ بحر متوسط کے باشندوں کے بنیادی طور پر زیتون کا تیل ہی غذا میں استعمال کرنے کی وجہ سے ان میں امراض قلب نہیں پائے جاتے''، ڈاکٹر ولیم کاسٹیلی اس کے استعمال کے فوائد کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں: ''بحر متوسط کے باشندے اگر چہ بھیڑ، بکرے، مکھن، گھی اور اس جیسی فیٹ سے بھری ہوئی غذا استعمال کرتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ بنیادی طور پر چوں کہ اپنی غذا میں زیتون کا تیل بھی استعمال کرتے اور اسی تیل سے اپنی غذا تیار کرتے ہیں؛ اسی لئے ان میں شرایین قلب کی بیماریاں پیدا نہیں ہوتیں''، ان کا یہ بھی کہنا ہے: ''کھانا و سالن اور غذائی اشیاء تیار کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسے زیتون کے تیل میں تیار کیا جائے؛ البتہ اس کی جگہ کبھی کبھی مکئی اور سن فلاور کا تیل بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، مکئی اور سن فلاور کے تیل میں پائے جانے والے اجزاء کی جسم کو بہت معمولی ضرورت ہے، جبکہ جسم کی ضروریات کے لئے سب سے بہتر زیتون کا تیل ہے، کہ یہی واحد تیل غیر فیٹی اجزاء سے بھر پور اور فیٹی اجزاء سے خالی ہے، نیویاک یونیورسیٹی میں میڈیکل سائنس کے پروفیسر ڈاکٹر ٹریفیلیڈ نے زیتون کے تیل کے فوائد کا ''گاما'' میگزین میں 1995 میں شائع شدہ اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''دورِ حاضر میں میڈیکل سائنس نے شرایین قلب کی بیماریوں میں زیتون کے تیل کی افادیت وتاثیر کی یقین دہانی کردای ہے، تحقیق اگرچہ بنیادی طور پر خون میں پائے جانے والے دہنیات پر مرکوز ہے، مگر بے شمار جدید میڈیکل تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ اس کے فوائد بے شمار ہیں، خاص طور پر امراض قلب، ذیابطیس اور بلڈ پریشر کے مریضوں کے لئے۔

جدید میڈیکل تحقیقات

1986 تک میڈیکل تحقیقات اور اس سے متعلق کتابوں میں یہی کہا جارہا تھا کہ زیتون کا تیل بلڈ کولسٹرول پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے، نہ اس میں اضافہ کرتا نہ کمی کرتا ہے، مگر جدید ترین تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ زیتون کا تیل بلڈ کولسٹرول کی سطح میں قابل لحاظ حد تک کمی لاتا ہے، مگر اس کمی کے باوجود بلڈ کے لئے مفید وضروری کولسٹرول میں کمی نہیں لاتا؛ بلکہ اس طرح کے مفید کولسٹرول میں اضافہ کرتا ہے، اور میڈیکل سائنس کی رو سے یہ بات محقق ہے کہ اس قسم کے کولسٹرول میں جتنا اضافہ ہوتا ہے امراض قلب کا عارضہ (Heart Clot) اتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے۔

زیتون کا تیل اور شرایین قلب کی بیماری

دوران خون کو جاری رکھنے والے قلب کے رگوں کی بیماریاں اس کے تنگ یا بند ہوجانے کی وجہ سے پیدا

ہوتی ہیں اور یہ اس Coronary Artery کے اندر پیدا ہوتا ہے جو قلب کے عضلات کو غذا فراہم کرتا ہے، عام طور پر یہ بیماری سینے کی بندش وخناق (Angina Pictoris) کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جس کی وجہ سے محنت ومشقت کے وقت سینے میں سخت تکلیف ہوتی یا کبھی قلب کی بستگی و جماؤ (Heart Clot) پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے قلبی شرایین (Angina Pictoris) میں بندش پیدا ہو جاتی ہے۔

زیتون کا تیل اور بلڈ پریشرڈ

بلڈ پریشر کی بیماری ساری دنیا میں عام ہے، امریکہ اور برطانیہ کے ۲۰ فیصد باشندے اس بیماری میں مبتلا ہیں، اور اس تناسب میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے، 95 فیصد حالتوں میں ڈاکٹروں کو اس کی وجہ کا پتا نہیں چل پاتا ہے، کہ یہ مریض کن اسباب ووجوہات کی وجہ سے اس بیماری میں مبتلا ہے، اسٹانفورڈ امریکن یونیورسیٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ویلیمز نے بلڈ پریشر کی بیماری میں زیتون کے تیل کی تاثیر وافادیت کا اندازہ کرنے کے لئے ایسے 76 افراد پر تحقیق وتجربہ کیا جو کسی بھی طرح کی دل کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے، ان کے ساتھ میڈیکل سائنس کے اسکالروں کی پوری ٹیم تھی، تحقیقات کے بعد ان محققین کو پتا چلا کہ جن لوگوں نے زیتون کا تیل استعمال کیا ان کا بلڈ پریشر قابل لحاظ حد تک کم ہو گیا، اور جن لوگوں نے اپنی یومیہ غذا کے اندر اسے غذا کا جزء بنایا انہیں، بلڈ پریشر سے بڑی راحت مل گئی، خاص طور پر ان لوگوں کو جنھوں نے یومیہ 45 گرام زیتون کا تیل استعمال کیا۔

زیتون کا تیل اور ذیابطیس

شوگر کی بیماری پنکریس (Pancreas) انسلیون کی چھٹائی میں کمی آجانے یا اس کے بالکلیہ ختم ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، پھر خون میں شوگر کی مقدار بڑھ جاتی ہے، ''امریکن یونین برائے شوگر کے مریض'' نے شوگر کی بیماری میں مبتلا اشخاص کو ہدایت کی ہے کہ وہ ایسا غذائی نظام (چارٹ) استعمال کریں جس میں دہنیات 35 فیصد کالوری (Colorie) فراہم کرتا ہو اور اس میں فل فیٹ کی مقدار ۱۰ فیصد سے زیادہ نہ ہو، باقی فیٹ زیتون کے تیل یا مکئی یا سورج مکھی کے تیل کی شکل میں ہو، دنیا کے مشہور فارسیی دائرہ المعارف ''مارٹندل'' نے جدید تحقیقات کی روشنی میں انکشاف کیا ہے کہ زیتون کا تیل انتہائی درجہ ملیّن اور جلد کے اندر تراوٹ ونرمی اور گداز پن پیدا کرتا ہے اور امساک کے لئے انتہائی درجہ مفید ہے، اس کا تیل جلد کے آبلے کی سطح میں نرمی پیدا کرتا اور اکزیما اور اس جیسی بیماریوں کی وجہ سے جلد کے اندر جو شگاف پیدا ہوتا ہے، اس میں تراوٹ پیدا کر کے بہت جلد اس شگاف کو دور کرتا ہے، شاید اسی وجہ سے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا :

ائتدموا بالزیت وادھنوا به . (۱)

زیتون کے تیل سے سالن حاصل کرو اور اسے جسم پر لگاؤ۔

اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے درخت کو بابرکت قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونِةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ . (النور:۳۵)

آج جدید میڈیکل سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ بلاشبہ یہ درخت بابرکت، اس کا تیل بابرکت اور اس کا استعمال ڈھیر ساری بیماریوں سے شفاء یابی کا ذریعہ ہے۔(۲)

شہد اور جدید تحقیق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ، ثُمَّ كُلِىْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِىْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاً يَّخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيْهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ . (النحل:۶۸-۶۹)

آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں درختوں میں اور لوگوں کی بنائی ہوئی اونچی اونچی ٹٹیوں میں اپنے گھر (چھتے) بنا، اور ہر طرح کے میوے کھا اور اپنے رب کی آسان راہوں میں چلتی پھرتی رہ، ان کے پیٹ سے رنگ برنگ کا مشروب (شہد) نکلتا ہے، اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے، غور وفکر کرنے والوں کے لئے اس میں بھی بہت بڑی نشانی ہے۔

آج کی جدید سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ شہد میں شفا بخش خصوصیات وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں اور یہ اوسط درجے کی دافع عفونت کا کام کرتا ہے، شہد کی خاصیت یہ ہے کہ یہ نمی کو برقرار رکھتا اور بافتوں پر زخموں کے بہت ہی کم نشان باقی رہنے دیتا ہے، شہد کی کثافت کے باعث کوئی جراثیم زخم میں پروان نہیں چڑھ سکتے ہیں۔

عیسائی راہبہ کیرولی نے سینے اور الزائمر کے عارضوں میں مبتلا 22 نا قابل علاج مریضوں کا علاج برطانیہ کے دواخانوں میں پروپولس مادے سے کیا، اس مادے کو شہد کی مکھیاں پیدا کرتی ہیں، اور اسے اپنے چھتوں کو جرثوموں کے خلاف مہر بند کرنے کے لئے کرتی ہیں، تو انہیں شفایابی حاصل ہوئی۔

---

(۱) سنن ابن ماجة ، كتاب الأطعمة ، باب الزيت، حدیث نمبر:۳۳۱۹۔ (۲) مجلّہ العربی عدد ۴۱۱، فروری:۱۹۹۳ء۔

کسی پودے سے ہونے والی الرجی کے خلاف اسی پودے سے حاصل شدہ شہد کا استعمال مفید ہے؛ کیوں کہ وہ الرجی کے خلاف مزاحمت کی قوت کو بڑھا دیتا ہے، شکر کی ایک خاص قسم ''فرکٹوز'' اور وٹامن کے (k) سے شہد بھر پور ہوتا ہے۔

شہد کی خصوصیات و شفائیت کے بارے میں قرآن میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں آج دنیا اس کا اقرار واعتراف کرنے پر مجبور ہے، بلاشبہ ''فیه شفاء للناس ''۔

روزہ اور جدید میڈیکل سائنس

اللہ تعالیٰ نے بندۂ مؤمن پر سال میں ایک ماہ روزہ رکھنے کو فرض کیا ہے؛ البتہ بیماروں اور مسافروں کو چھوٹ دی ہے کہ وہ اس ماہ کے اندر روزہ نہ رکھ کر اس کی قضاء سال کے دیگر ایام میں کبھی بھی کر سکتے ہیں۔

روزہ کے موضوع پر چند سال قبل تک بین الاقوامی میڈیکل میگزین میں بہت کم تحقیقی مضامین شائع ہو رہے تھے، مگر ادھر چند سال سے میڈیکل سائنس کے ماہرین اس موضوع پر خصوصی توجہ دے رہے اور نئی نئی تحقیقات وانکشافات پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، 1966 سے تا حال کی تحقیقات کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پوری دنیا میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی بیماری ''بین الاقوامی فیڈل یونین برائے شوگر کے مریض'' کی سروے رپورٹ 1991 کے مطابق شوگر کی بیماری ہے، اس مرض کے شکار عالم اسلام کے مسلمانوں میں تین سے پانچ فیصد لوگ ہیں، چوں کہ شوگر کے مریض روزہ توڑنا نہیں چاہتے اور وہ روزہ رکھنے پر اصرار کرتے ہیں؛ اس لئے ضرورت پڑی کہ بھوکا رہنے کی صورت میں جسم پر پڑنے والے اثرات اور اس کے لئے ضروری دوا کے استعمال کے بارے میں تحقیق کی جائے، برٹش میڈیکل میگزین کے 1993 کے شمارہ میں ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع ہوئی ہے، یہ تحقیق مراکش کے رباط یونیورسیٹی اور دار بیضاء یونیورسیٹی کے میڈیکل محققین نے کی ہے، اس تحقیق کے دوران 1591 ایسے مریضوں پر تجربہ کیا گیا جو کڈنی شوگر کی بیماری میں مبتلا تھے، جس میں انسولین لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ان کا علاج شوگر کی بیماری کی مشہور دوا ڈاؤنیل Glibenclemied daonli سے کیا گیا، تحقیقات کا خلاصہ یہ تھا کہ اس دواء کا روزہ کے دوران استعمال مناسب ہے، اور بلڈ شوگر پر کنٹرول کرنے میں روزہ منفی اثر نہیں ڈالتا ہے، تحقیق کرنے والوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ بلا تکلف صبح کا ڈوز افطار کے وقت اور شام کا ڈوز سحری کے وقت دیا جا سکتا ہے؛ البتہ جنہیں 24 گھنٹے میں صرف ایک ڈوز کی ضرورت ہوتی ہے انہیں یہ افطار کے وقت دینا بہتر ہے۔

کڈنی کی ناکامی کا شکار کیا روزہ رکھ سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے دونوں گردوں کے اندر ایسی قدرت رکھی ہے کہ وہ دس گنا یا اس سے بھی زیادہ پیشاب کی مقدار کو مجتمع رکھ سکتا ہے، جسم کے اندر سائل مادوں کی حفاظت کرتا اور اسے اتنا ہی باہر پھینکتا ہے جتنا پیشاب کے لے ضروری ہوتا ہے، اگر دونوں گردے صحیح و سالم اور تندرست ہوں تو روزہ اس کے لئے بڑی راحت و عافیت کی چیز ہے؛ البتہ اگر گردہ بیمار ہو تو وہ پیشاب کو جمع کرنے کی مطلوبہ صلاحیت سے قاصر رہتا ہے، پھر روزہ گردے کی خرابی میں مبتلا شخص کے لئے بوجھ بن جاتا ہے، خاص طور پر گرم علاقوں میں، اس کی وجہ سے خونی پیشاب اور کریاتیفن کے تناسب میں اضافہ ہوسکتا ہے، کچھ عرصہ قبل An Nals Of Saudi Medicine میگزین نے ریاض میں قائم آرمی ہاسپٹل میں کی گئی تحقیق کا خلاصہ شائع کیا ہے، یہ تجربہ گردے کے مریض اور پیلائسس کے مرحلہ سے گذرنے والوں پر کیا گیا، تحقیق کرنے والے اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان مریضوں کے لئے روزہ رکھنا ممکن ہے؛ البتہ مصنوعی گردے والوں کو رگوں کے ذریعہ سائل اشیاء اور بعض ادویہ دینا مناسب ہے، مگر یہ صورت روزے کے منافی ہے، اسی لئے ان ماہرین کا کہنا تھا کہ ایسے مریض ان ایام میں روزہ رکھ سکتے ہیں، جبکہ گردے کی دھلائی کا عمل نہ ہو، ماہرین اس بات پر حیران تھے کہ روزہ کی وجہ سے پورے مہینہ ان کے بلڈ یورین، کریاٹین، بیکریونیٹ، یا کیلشیم میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی؛ البتہ پوٹاسیم کی مقدار میں اضافہ ضرور ہوا، مگر اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہوں نے افطار کے بعد ایسی غذاؤں کے استعمال میں بداحتیاطی کی جس میں پوٹاسیم کی مقدار بھرپور تھی، گردے کی بیماری کے شکار لوگوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ روزہ سے متعلق ڈاکٹر سے مشورہ لیں؛ تاکہ وہ ان کی حالت کا جائزہ لے کر یہ تعین کر سکے کہ ان کے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے یا رخصت پر عمل کرنا۔

سعودی میڈیکل جرنل نے 1989 میں اردن یونیورسیٹی کی جانب سے کرائی گئی میڈیکل تحقیقات کا خلاصہ شائع کیا تھا، اس تحقیق کے دوران 137 بالغ نوجوانوں پر روزہ کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا، ان ماہرین نے انہیں تین گروپ میں تقسیم کیا تھا :

(۱) بہت زیادہ وزن والوں کا گروپ۔

(۲) فطری وزن کے حامل افراد کا گروپ۔

(۳) فطری وزن سے 5 فیصد وزن کم رکھنے والے نوجوانان۔

رمضان کے ختم پر ریکارڈ کیا گیا کہ پہلے گروپ والوں کا وزن 2,6 کیلوگرام کے تناسب سے کم ہو گیا اور دوسرے گروپ کا دو کیلو کم ہوا اور تیسرے گروپ کا نصف کیلو کم ہوا، میڈیکل سائنسدانوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رمضان کا روزہ سال میں ایک بار وزن کم کرنے کا بہترین طریقہ ہے، یہ انتہائی درجہ محفوظ و متوازن طریقہ ہے،

اس کا کوئی سائیڈ افیکٹ جسم پر نہیں پڑتا اور جسمانی اعضاء کی کارکردگی وفعالیت متوازن ہوجاتی ہے۔

ایک اور رپورٹ امریکن جرنل آف کلینیکل نیٹریشن(American journal of clinical nutration) میں شائع ہوئی، اس کی تحقیق امریکہ کے مشہور میڈیکل سائنٹسٹ ڈاکٹر فیڈل (Fedail) اور ان کے ساتھیوں نے 28 تندرست افراد پر کی جو رمضان میں روزہ رکھ رہے تھے، وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ روزے کی وجہ سے ان کے وزن میں ایک کیلو 800 گرام وزن کم ہوا، ان غیر مسلم ڈاکٹروں نے پورے وثوق سے کہا کہ بعض مسلمانوں کی جانب سے رمضان کی غذا میں اسلام کے صحیح قواعد کی پابندی نہ کرنے اور حد سے زیادہ چکنائی ومیٹھا کا استعمال کرنے کے باوجود وزن کی کمی واضح دلیل ہے کہ مسلمان اگر اپنے مذہب کی تعلیمات کی پابندی کریں اور رمضان کی غذاؤں میں صحیح ومحفوظ نظام کے مطابق ہی غذا لیں تو روزے کی وجہ سے چاہے انسان کا وزن کتنا ہی بڑھا ہوا کیوں نہ ہو اس میں ضرور توازن پیدا ہوجائے گا، اور اس کے مٹاپے کا علاج کسی دوا کے بغیر ہر سال ہوجایا کرے گا۔

1993 میں آرچیف اوف ہیرسل میڈیسن (Archives of Hsersal Medicine) میں میڈیکل ماہرین نے واضح کیا تھا کہ بلڈ پریشر میں معمولی اضافہ کے مریض کے بلڈ پریشر کو کم کرکے اسے نارملی سطح پر لانے کے لئے صرف ساڑھے چار کیلو وزن کم کردینا کافی ہے، اور یہ وزن شرعی قواعد کی پابندی کے ساتھ اور اسراف وفضول خرچی سے بچتے ہوئے روزہ رکھنے کی صورت میں کم ہوسکتا ہے۔

کولسٹرول اور روزہ

1993 ہی میں امریکن جرنل آف نیٹریشن نے ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کی تھی، یہ تحقیق خون کی چکنائی کے مفید قسم پر روزے کے اثرات کا پتا چلانے کے لئے کی گئی تھی، اس تحقیق سے پتا چلا کہ جن 24 تندرست افراد پر تحقیقات کی گئیں رمضان کے اختتام تک ان کے جسم میں مفید کولسٹرول MDL کی مقدار 30 فیصد بڑھ گئی، کڈنی کولسٹرول اور نقصاندہ کولسٹرول کی مقدار میں اسی تناسب سے کمی آگئی، اور ہر کسی کو اندازہ ہے کہ اس طرح کا کولسٹرول جتنا کم ہوگا، اتنا ہی جسم کے لئے بہتر ہوگا، اس مفید کولسٹرول کے اضافہ اور مضر کولسٹرول کی کمی کی وجہ سے قلب کی رگوں کی بندش کے عارضہ کا احتمال کم ہوگیا؛ کیوں کہ مفید کولسٹرول شریانوں کی سختی سے جسم کی حفاظت کرتا اور مضر کولسٹرول (LDL) کو دور کرتا ہے، جو شریانوں کی دیواروں پر جم جاتا پھر اسے جگر میں منتقل کردیتا ہے۔

بلاشبہ اس طرح کی میڈیکل تحقیقات حوصلہ افزا ہیں، اور اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو بھی حکم دیا ہے وہ مصلحت سے خالی نہیں ہے اور اس کے اثرات روحانیت تک محدود نہیں؛ بلکہ جسمانی صحت پر بھی میڈیکل تحقیقات رہی ہیں۔

خاتمہ

اسلام چوں کہ ایک دائمی وابدی مذہب ہے،اس لئے قرآن میں قیامت تک ہر زمانے کی ذہنیت اور اس کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے؛ تا کہ وہ قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کر سکے اور خدا پرستی وانسانی اقدار کا احیاء کرتا رہے،اس سچے دین کی سچی کتاب میں سائنس اور اس کے متعلقات سے بھر پور تعرض کیا گیا ،اور لوگوں کو اس میں غور وفکر کرنے ،حقائق دریافت کرنے اور نئے نئے نکتوں تک رسائی حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے،قرآن ہی وہ واحد صحیفہ ہے،جس میں انسان کو کائنات اور اس کے نظام میں غور وفکر کے ذریعہ بصیرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلٰى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا . (محمد:۲۴)

مگر افسوس کہ جس قوم کو اس کی کتاب ہدایت نے غور وفکر کرنے کی دعوت دی اور علم وسائنس کو نہ صرف دنیا کی ترقی کی بنیاد قرار دیا؛ بلکہ اخروی کامیابی سے بھی اسے جوڑ دیا ہے،اسی قوم نے چند صدیوں سے اس سے منھ موڑ لیا اور ان پر جمود طاری ہو گیا ہے،جبکہ اسی غور وفکر کے نتیجہ میں ہمارے اسلاف نے میڈیسین اور سائنس کے دیگر شعبوں میں وہ کارہائے نمایاں پیش کئے جسے دوسروں نے مشعل راہ بنا کر ترقی کی اور اس میدان میں مسلسل ترقی کر رہے اور نت نئے انکشافات کر رہے ہیں،ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے مذہبی نصاب میں میڈیکل سائنس سے متعلق آیات قرآنی کو شامل کریں اور قرآن وجدید میڈیکل سائنس کے تقابلی مطالعہ کو جز ونصاب بنائیں ،اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہر زمانے کی ترقی کے ساتھ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ، اور نئے نئے انداز سے اسلام کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے،اسی لئے متقدمین نے سابق میں بعض ان علوم کی داغ بیل ڈالی جس کے ذریعہ اسلام کے خلاف بپا کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دیا جا سکا اور نو پید مسائل کا حل تلاش کیا جا سکا تھا، یہ دور سائنسی ترقی کا دور ہے، اس لئے اسلام ہم سے تقاضہ کرتا اور قرآن ہمیں تاکید کرتا ہے کہ ہم اس میدان میں تاخیر ہی سے سہی قدم رکھیں اور سائنس کے ذریعہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے انسانیت کا رشتہ خالق کائنات سے جوڑنے کی کوشش کریں ،مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ سائنسی تحقیق میں ہمارا رخ صحیح سمت میں رہے؛ کیوں کہ ہر نو ایجاد شئے کے اندر خیر وشر ہر دو کا پہلو ہوتا ہے،خود انسان کے اندر بھی ہر دو مادے پائے جاتے ہیں ،ہمیں اس کے خیر کے پہلو کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہی قرآن کا مطلوب ہے اور شر کے پہلو یا اس کے ذریعہ نظام قدرت میں چھیڑ چھاڑ کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر کوئی بھی چیز نہ تو بے کار پیدا کی ہے

اور نہ ہی ایسا کہ اس کے اندر توازن کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے اندر توازن رکھا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ . (الحجر:۱۹)

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے اور اس پر اٹل پہاڑ ڈال دیے ہیں اور اس میں ہم نے ہر چیز ایک معین مقدار سے اگا دی ہے۔

ایک جگہ فرمایا :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلاً ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ . (صٓ:۲۷)

اور ہم نے آسمانی و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو ناحق پیدا نہیں کیا، یہ گمان تو کافروں کا ہے، سو کافروں کے لئے خرابی ہے آگ کی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مخلوقات میں غور وفکر کرنے، تحقیق وجستجو کرنے، اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرنے اور اس پر تجربات کرنے کی تاکید کی ہے۔(الغافر:۸۲، الروم:۸-۹)

تحقیق کرنے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ انسان اپنی فکری کاوش، تحقیقاتی عمل اور سائنسی جستجو کے ذریعہ نئے انکشافات کر سکے اور مفید ومضر اثرات تک رسائی حاصل کر سکے، وہ جان سکے کہ زندہ کائنات کا دائرۂ عمل کیا ہے، اور جامد طبیعیات کی تاثیر کیا ہے؟ اور ہم اسے بطور دوا وعلاج کس طرح استعمال کر سکتے ہیں، انسانوں کے حق میں ان کی منفعت کیا اور کتنی ہے؟

میڈیکل سائنس کے ماہرین نے کافی غور وخوض، بحث وتحقیق، انتھک محنت وجستجو، اور تجرباتی عمل سے گذرنے کے بعد ملیریا کے وائرس کو منتقل کرنے والے مچھر و مکھی کو ختم کرنے کی دوا ایجاد کر لی، پھر اس کا استعمال کرتے ہوئے ان مچھروں و مکھیوں کا خاتمہ کر کے ملیریا پر قابو پانے کا دعویٰ کیا، مگر اس کے بعد ہی انہیں ایک بڑے خلل کا اندازہ ہوا کہ اس کی وجہ سے ایک نہایت خطرناک عدم توازن بھی پیدا ہو رہا ہے، انواع واقسام کے نت نئے بخار منظر عام پر آنے لگے ہیں جو ملیریا سے کہیں زیادہ خطرناک اور انسانوں کے لئے مہلک ثابت ہو رہے ہیں، وجہ یہ ہوئی کہ اس بخار کے وائرس کو وہ مکھیاں و مچھر پھیلاتے اور منتقل کرتے ہیں، جس کو ملیریا وائرس پھیلانے والا مچھر و مکھی اپنی غذا بناتا اور انسان تک پہنچنے اور بخار میں مبتلا کرنے سے روکتا تھا، اس کے بعد میڈیکل سائنسدانوں کو اندازہ ہوا کہ

ملیریا کی مکھی کا بھی صحت کے باب میں ایک نہایت اہم رول تھا، اس لئے کسی کے شر سے تحفظ کا یہی طریقہ نہیں ہونا چاہئے کہ اسے مار کر ختم کر دیا جائے کہ یہ تو اس کی تخلیق کی مصلحت کے بھی خلاف ہے؛ بلکہ اس سے بچاؤ کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ اسے باقی رکھتے ہوئے تحفظ کا سامان کیا جائے، اور جسم انسانی کے اندر مدافعت کی ایسی قوت ٹیکہ وغیرہ کے ذریعہ پیدا کر دی جائے کہ اس کا اثر جسم پر نہ ہو۔(۱)

⊙ ⊙ ⊙

(۱) قرآن اور ماحولیاتی سائنس، ڈاکٹر عدنان شریف۔

قرآن مجید اور فلکیات

عربی تحریر: مرزا یاور بیگ ⊙
ترجمہ: محمد فیاض عالم قاسمی ☆

دورِ حاضر کے علمی حلقوں میں اب اس بات کے انکار کی گنجائش نہیں رہی ہے کہ قرآن Signs (آیات ونشانیوں) کی کتاب ہے، نہ کہ سائنس Science کی، سائنسی انکشافات کا مقصدان لوگوں کو دلائل فراہم کرنا ہے جو کارخانۂ قدرت کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛ چنانچہ انھیں تخلیق کی ان حقیقتوں کا حوالہ دیا جاتا ہے، جن سے صرف ان کا خالق ہی کما حقہ واقف ہے، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ ان حقائق میں سے بعض منکشف ہوکر منظر عام پر آگئے ہیں؛ لیکن سوچنے کا مقام ہے کہ چودہ سو سال پہلے عرب بلکہ ساری دنیا ان حقیقتوں سے نابلد تھی جن کا ذکر قرآن میں ہے؛ بلکہ ان حقیقتوں کا تصور بھی نہیں تھا، اگر یہ خدا کی کتاب نہیں ہے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حقیقتوں کو کیسے بیان کیا؟

قرآن اللہ کی صفتِ کلام کا مظہر ہے، اس کے الفاظ خود اللہ رب العزت ہی کے ہیں، جو اللہ کی مرضی کے مطابق حضرت محمد ﷺ پر ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا؛ چوں کہ اس کا مصنف خود خالق کائنات ہے، اس لئے نزول ہی کے وقت سے بغیر کسی تغیر وتبدل کے محفوظ ہے اور کسی کو اس میں ردوبدل کرنے کا حق بھی نہیں ہے؛ لہٰذا اب میں اپنے موضوع کو قرآن کے اس دعوی سے شروع کرتا ہوں، جس میں قرآن نے اصحابِ عقل ودانش کو تدبر وتفکر کی دعوت دی ہے؛ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ . (حم السجدة:۵۳)

⊙ فاؤنڈر وڈائریکٹر: اسٹینڈرڈ بیرس اکیڈمی، حیدرآباد۔

☆ ریسرچ اسکالر: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں دکھائیں گے اور ان کے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے، کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

قرآنی تعلیمات اور سائنس کے درمیان، کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں ہے؛ بلکہ علوم دینیہ سے سائنسی انکشافات کی تصدیق ہوتی، وہ سائنس داں جو خالق کی نشانیوں کو صحیح معنی میں سمجھتے ہیں، ہر ہر انکشاف پر ان کی ایمانی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس بات کو خاص طور سے ذکر کیا ہے اور اس پس منظر میں علم وفضل اور معرفت خداوندی کو سلسلہ وار درجات میں بیان کیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُوْلِي الْأَلْبَابِ ، الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللهَ قِيَاماً وَقُعُوْداً وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ . (آل عمران:۹۰-۱۹۱)

زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات و دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں، جو اٹھتے، بیٹھتے، اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت پر غور وفکر کرتے ہیں، (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہے) اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

یہ قرآن سائنس داں کو، علم وفضل کے طالب کو اور متلاشی حق کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھیں اور کائنات کی تحقیق کریں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کریں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی نشانیاں دکھاتا رہے گا تا آں کہ وہ قرآن کے الہامی کتاب ہونے کے قائل ہو جائیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ''سمجھ دار لوگوں'' کے چند اوصاف بیان کئے ہیں کہ ایسے لوگوں کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانتے ہیں وہ کسی مخلوق، خیال، تصور، یا توہم کی پرستش نہیں کرتے ہیں، انکا عقیدہ ہوتا ہے کہ کائنات کا وجود کسی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک موجود اور ہر چیز سے باخبر ہستی نے اسے پیدا کیا ہے، یہ لوگ جب کائنات کی تحقیق وتفتیش کرتے ہیں تو خالق کی نشانیوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں اور ان کے دل قرآن کے پیغام کو سمجھنے کے لئے کھل جاتے ہیں اور پکار اُٹھتے ہیں :

رَبَّنَـا مَا خَلَقْتَ هٰذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ . (آل عمران:۱۹۱)

اے ہمارے رب تو نے یہ سب فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس
سے کہ عبث کام کرے، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

اس آیت میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے پہلے حصے یعنی خالق کی معرفت کو آیت کے دوسرے حصے یعنی مخلوقات کی تحقیق کرنے کے ساتھ جوڑنے کے لئے حرف عطف (Preposition) ''اَوْ'' بمعنی یا کے بجائے ''وَ'' بمعنی اور کا استعمال کیا ہے؛ حالاں کہ عربی قواعد کے لحاظ سے دونوں استعمال ہوسکتے تھے؛ لیکن واؤ کا خاص طور پر ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مطلوبہ یقین تک پہنچنے کے لئے آیت کے دونوں حصوں پر عمل ضروری ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے ہمارا علم ناقص اور نامکمل ہے اور اللہ کا علم کامل ہے، وہی ہر چیز کا جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے، مثال کے طور پر جس طرح ایک پانچ سالہ بچے کے لئے موبائل فون کی کارکردگی کی وضاحت کرنا ناممکن ہے، کیوں کہ ابھی اس کی سمجھ پیچیدہ اور تکنیکی مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہے، اسی طرح اکثر و بیشتر قرآن میں فلکیات سے متعلق آیتوں کو پڑھتے وقت کسی کو بہت ساری باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں، تو جس طرح مذکورہ بالا مثال میں پانچ سالہ بچے کے لئے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ وہ اس موبائل سے اپنے والد سے بات بھی نہ کرے، یہی حال قرآن کے ساتھ ہے، اگر ہم یہ نہیں جانتے ہیں کہ دنیا کی تخلیق کیسے ہوئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ہم قرآن سے فائدہ ہی نہ اُٹھائیں، کیوں کہ قرآن کا نزول فلکیات کے مسائل بیان کرنے کے لئے نہیں ہے؛ بلکہ اجرام فلکیہ کے پیدا کرنے والے کے تعارف کے لئے ہے، کہ وہ پیدا کرنے والا ایک ہی ہے، وہی عبادت کے لائق ہے اور اسی کے پاس ہم سب کو جانا ہے، اس تمہید کے بعد اب ہم قرآن میں ذکر کردہ کائنات کی چند نشانیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں :

إِنَّ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ . (الجاثیة:۳)

یقیناً آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لئے۔

ماہرین فلکیات کا کہنا ہے کہ پوری کائنات ابتداء میں دھواں کے ایک گتھم گتھا بادل کی طرح تھی، یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ سائنس دانوں اور ماہرین فلکیات کا اعتماد اٹکل پر ہوتا ہے، پھر تجربات کے ذریعہ اس کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً اربوں سال پہلے اس کا وجود ہوا تو کیسے ہوا؛ جب کہ اس وقت اس مکمل صورت حال کی صحیح تصویر فطری طور پر ممکن نہیں ہے، ہم ان کی کوششوں کو سراہتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ ان کی یہ جولانیاں ابھی بھی محدود ہیں، اصل میں ان کی یہ قیاس آرائیاں اور مفروضات بغیر کسی اختلاف کے بعد میں حقیقت کی تعبیر ہوجاتی ہیں، جب کہ دوسری جانب اللہ رب العزت مکمل علم و آگہی کے ساتھ خبر دیتا ہے؛ کیوں کہ کائنات کی تخلیق

کے وقت صرف اسی کی ذات موجود تھی اور وہی اس کا عینی شاہد ہے؛ کیوں کہ اسی نے ان سب چیزوں کو وجود بخشا ہے؛ چوں کہ اللہ تعالیٰ کی خبر سے ماہرین فلکیات کے انکشافات کی تائید ہوتی ہے، اس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاید ان کی رائے اور قیاس آرائیاں صحیح ہیں، اس تعلق سے پتہ کی بات یہ ہے کہ اگر قرآن میں ان کا تذکرہ نہیں ہوا ہوتا تو یہ حضرات یقیناً ان حقائق سے نابلد رہتے۔

میں پھر یاد دلاتا ہوں کہ فلکیات، نسلیات، ارضیات اور بحریات وغیرہ سے متعلق آیات کا مقصد انہی تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ اس کا اہم مقصد یہ ہے کہ انسان کی توجہ ان کے خالق کی معرفت سے وابستہ ہو جائے اور اسی کے سامنے جھکے؛ بلکہ مکمل طور پر اسی کا بن جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعاً أَوْ كَرْهاً قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ . (حم السجدۃ:۱۱)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا اس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آجاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو دونوں نے کہا ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے :

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ . (الانبیاء:۳۰)

کیا وہ لوگ (جنھوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے) غور نہیں کرتے ہیں کہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انھیں جدا جدا کیا، اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز کو پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ کائنات کی تخلیق دھواں کی طرح ایک قسم کی گیس سے ہوتی ہے، اس کے لئے عربی میں لفظ ''دخان'' بمعنی دھواں استعمال ہوا ہے (دھواں کے لئے لفظ گیس Gas کے استعمال میں بھی ذرا تامل ہے) حال ہی میں سائنس دانوں نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ کائنات کی تخلیق گیس یا دھواں والے ایک ایسے تودے سے ہوئی ہے جو Hydrogen اور Helium سے مرکب تھا اور تودہ زمین سے تین لاکھ گنا بڑا تھا، یہ تودہ ٹوٹ کر ان گنت Galaxies (کہکشاؤں) میں تبدیل ہو گیا، یہی وہ نظریہ ہے جس کے بارے میں سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کائنات کی تخلیق ایک اکائی سے ہوئی ہے جو بعد میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آسمان، زمین، چاند سورج وغیرہ بنے، اصطلاح میں اس پھٹنے کو Big Bang کہتے ہیں، بہر حال بیسویں صدی کے سائنسی انکشافات کو چودہ سو سال پہلے ہی قرآن نے عمومی طور پر بیان کر دیا ہے۔

ہم قرآن کی ان معلومات کی کیسے وضاحت کر سکتے ہیں، اگر ہم اس کو خدائے علیم وخبیر کا کلام نہ مانیں؟!

پروفیسر الفرڈ کرونز جو Johannes Gutenburg یونیورسٹی Mauiz جرمنی میں علوم طبعیہ کے شعبہ ارضیات کے ناظم ہیں، نے مذکورہ آیت کے بارے میں کہا ہے کہ جو شخص ۱۴سو سال پہلے نیوکلیر کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو وہ اپنے ذہن کے بل بوتے پر کیسے کہہ سکتا ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق ایک ہی نقطہ سے ہوئی ہے یا اس طرح بہت سارے وہ سوالات جن پر ہم بحث کر چکے ہیں۔(Rehaili:1995)

زمین کی تفریق اور جاندار کی پانی سے تخلیق

اللہ تعالیٰ تخلیق کے آغاز کے بارے میں کہتا ہے کہ ہم نے زمین اور دوسرے فلکی اجرام کو الگ الگ کیا ہے، یہاں ذرا قرآن کے لب ولہجہ پر غور فرمایئے، اللہ کہتا ہے ''ففتقنا هما'' ہم نے انھیں الگ الگ کیا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو کس قدر وضاحت سے خالق کائنات کہا ہے، یعنی یہ چیزیں خود بخود وجود میں نہیں آئی ہیں؛ بلکہ ایک مدبر حقیقی کے منصوبہ بند نظام کے تحت وجود میں آئی ہیں، یہ بھی واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ ہر جاندار کی اجزاء ترکیبی میں زیادہ تر حصہ پانی ہے، قرآن نے اس سائنسی حقیقت کو اسی وقت بیان کر دیا تھا، جب انسان نے چیزوں کی حقیقتوں کو دریافت کرنے کے لئے آلات واوزار بھی نہیں بنائے تھے۔

اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق کے تعلق سے فرماتا ہے :

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَصِهْراً وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْراً . (الفرقان:۵۴)

اور وہی ہے جس نے پانی سے ہر بشر کو پیدا فرمایا، پھر اسی سے نسب اور سسرال کے دو الگ الگ رشتے چلائے، تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتا ہے :

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِن مَّاءٍ فَمِنْهُم مَّن يَمْشِىْ عَلٰى بَطْنِهِ وَمِنْهُم مَّن يَمْشِىْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُم مَّن يَمْشِىْ عَلٰى أَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ . (النور:۴۵)

اور اللہ نے ہر جاندار کو ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا، کوئی پیٹ کے بل چل رہا ہے تو کوئی دو ٹانگوں پر اور کوئی چار ٹانگوں پر اور جو کچھ وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اب ذرا غور کریں اس زمانے میں عرب کے لئے اس طرح کے انکشافات بے سروپا لگے ہوں گے؛ لیکن آج سائنس کے ذریعے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی ہے کہ ہر جاندار کی پیدائش پانی سے ہوئی ہے؛ چنانچہ ان کے پاس اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے دلائل بھی ہیں، سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ روئے زمین پر سب سے پہلے Algae کی پیدائش ہوئی ہے جو پانی ہی میں ہوتا ہے، اسی طرح یہ حقیقت کہ انسان اور جانوروں کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے، دلائل سے مبرہن ہے؛ چنانچہ Cytoplasm (جاندار کے خلیوں) کے بنیادی مشمولات میں 80% سے زائد پانی ہے، واضح رہے کہ فلکیاتی اور حیاتی حقیقتوں کو ذکر کر کے ہماری توجہ ان کے مقصد اصلی کی طرف مبذول کرائی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم خالق کائنات پر ایمان لائیں اور ان کا انکار نہ کر بیٹھیں۔

اللہ تعالیٰ کائنات کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ یہ ہمیشہ پھیلتی رہتی ہے :

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ . (الذاریات:۴۷)

اور آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کو پھیلاتے رہتے ہیں۔

آج سائنس دانوں کے نزدیک کائنات کی توسیع کا نظریہ معمولی سا بن گیا ہے؛ تاہم آج بھی بہت سارے ایسے لوگ ہیں جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ کائنات پھیلتی ہے؟ کیا آپ نے کبھی اس کا احساس کیا ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ اس معمہ کو سمجھنے اور اس پر یقین کرنے کے لئے علم فلکیات میں مہارت کی ضرورت ہے اور تجربہ کرنے کے لئے ایسے آلات کی بھی ضرورت ہے جس سے ہم توسیع کائنات کا پتہ لگا سکیں اور یہ یقینی بات ہے کہ آپ ﷺ کے زمانے میں نہ تو کسی کو اتنا علم تھا اور نہ ہی ایسے آلات ایجاد ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے چاند و سورج کے مدار اور ان کی گردش کے تعلق سے فرمایا ہے: کہ وہ اپنے اپنے محور میں تیرتے رہتے ہیں :

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ . (الانبیاء:۳۳)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج و چاند کو پیدا کیا یہ سب ایک ایک دائرہ میں تیرتے رہتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ . (الزمر:۵)

اس نے آسمانوں اور زمینوں کو برحق پیدا کیا ہے، وہی دن پر رات کو اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے، اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ان میں سے ہر ایک وقت مقرر تک چلتا رہے گا، یاد رکھو وہ زبردست ہے اور درگذر کرنے والا ہے۔

اس آیت کے عربی اُسلوبِ بیان پر غور فرمایئے اللہ تعالیٰ نے رات و دن کی تبدیلی کو کیا ہی بہترین انداز میں بیان فرمایا ہے کہ دن پر دھیرے دھیرے رات کے پردے لہراتے ہیں اور اسی طرح رات سے دھیرے دھیرے صبح کی کرن پھوٹتی ہے، ایسا نہیں کہ ادھر بٹن دبایا اور اُدھر رات یا دن کا وجود ہوگیا، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ چاند و سورج دونوں کا ایک معیار متعین ہے، دونوں مقررہ مدت اور متعین راستے سفر طے کرتے رہتے ہیں، اس آیت کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ پر ہوتا ہے جو اس سوال کا خود بخود جواب بن جاتا ہے کہ کیا یہ سب سچ ہے؟ تو جواب یہ ہوگا کہ اگر ان حقیقتوں کو قبول کرتے ہیں اور قبول کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تو آپ اپنے آپ کو ان سب چیزوں کے خالق اور مالک کے حوالہ کر دیجئے اور صرف اسی کی پرستش کیجئے۔

اللہ تعالیٰ پھر چاند و سورج کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ دونوں اپنے مدار میں بھی آزادانہ نہیں چل سکتے کہ جس طرح اور جب چاہیں چلیں اور جب چاہیں ٹھہر جائیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفر کی مدت بھی متعین ہے اور طریقۂ سفر بھی مقرر ہے، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ چاند و سورج عبادت کے لائق نہیں ہیں، جب وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کر سکتے، حتیٰ کہ ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہو سکتے تو دوسروں کے لئے جو ان کی عبادت کرتے ہیں کیا کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ، وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ . (یٰسین:۳۸-۳۹)

اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے اور چاند تو اس کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ ان سے گذرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے، نہ سورج کے بس میں ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور یہ دونوں اپنے دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

چاند و سورج کی صفات میں فرق

چاند و سورج دونوں سے روشنی حاصل ہوتی ہے؛ لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے لئے الگ الگ صفات ذکر کی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوْجاً وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجاً وَّقَمَراً مُّنِيْراً ، وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُوْراً . (الفرقان:۶۱-۶۲)

بڑی متبرک ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور اس نے ایک چراغ یعنی آفتاب اور نورانی چاند بنایا، وہ ایسا ہے جس نے رات اور دن کو ایک کے پیچھے آنے جانے والا بنایا یہ دلائل ہیں اس شخص کے لئے جو سمجھنا چاہے یا شکر کرنا چاہے۔

آج ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ سورج سے جو روشنی حاصل ہوتی ہے وہ اس کے مسلسل عمل احتراق سے وجود میں آتی ہے دوسرے الفاظ میں سورج کی روشنی خود اسی کی روشنی ہے اور چاند سے جو روشنی حاصل ہوتی ہے وہ سورج کی روشنی کا عکس ہوتا ہے، چاند میں بذات خود کوئی روشنی نہیں ہوتی، قرآن کریم نے اس امتیازی خصوصیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سورج کو ''سراج'' بمعنی (Lamp) چراغ کہا؛ کیوں کہ چراغ خود روشنی پیدا کرتا ہے، اور چاند کو ''نور'' بمعنی روشنی کہا یعنی جو منور ہو کر روشنی پھیلائے ، یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ سائنسی انکشاف یقیناً غیر معروف تھا۔

ان سب کے بیان کرنے کا مقصد سورۂ فرقان کے آیت نمبر:۶۲ میں بیان کر دیا ہے کہ ان چیزوں سے استفادہ کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور اسی کی عبادت کریں؛ کیوں کہ اسی نے ہمارے فائدے کے لئے چاند وسورج کو بنا کر مسخر کر دیا ہے، کتنی بڑی ناانصافی ہوگی کہ ہم اس ذات عالی کو چھوڑ کر دوسرے جھوٹے خداؤں کی پوجا پاٹ کریں۔

مدار میں گھومتے ہوئے سورج کی اپنے محور پر گردش

سورج کی حرکت ہمارے لئے واضح نہیں ہے اور نہ ہی ہم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں؛ بلکہ اس کے لئے مخصوص آلات درکار ہیں، قرآن کہتا ہے کہ :

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ، وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ . (یٰسین:۳۸-۳۹)

سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ ان سے گذرتا ہوا وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی۔

موجودہ سائنس کی دریافت یہ ہے کہ سورج اپنے مدار میں ۲۶ دن میں ایک چکر لگاتا ہے، قرآن کا کہنا ہے کہ سورج خود بھی گھومتا ہے، جس کو قرآن نے لفظ ''یسبحون'' سے تعبیر کیا ہے؛ لہٰذا قرآن کے مطابق سورج خلا میں صرف چلتا اور تیرتا نہیں ہے بلکہ اپنے محور میں چلنے کے ساتھ ساتھ خود بھی گھومتا ہے، نیز خلا میں سورج کا ایک مستقل اور مسلسل سفر بھی ہے جس میں وہ اپنے اصل ٹھکانے اور مستقر کی طرف گامزن ہے، جیسا کہ قرآن کی سورۂ یٰسین کی آیت نمبر: ۳۸ سے واضح ہے، بہر حال اگر قرآن حضرت محمدا کی ذہنی کاوش ہے تو آپ انے ان حقیقتوں کو کیسے جانا؟

پلسر (Pulsar)

پلسر ایک درخشندہ برقی ستارہ ہے جو اپنی ضوفشانی سے زمین کو منور کرتا ہے Black hole کی طرح یہ کوبکی ارتقاء کا نقطۂ انتہاء ہے، پہلا پلسر ۲۸/ نومبر ۱۹۶۷ء میں دریافت ہوا تھا، ہمارا مشاہدہ ہے کہ پلسر سے نکلنے والی انتہائی طاقتور شعاؤں کی لہروں کی وجہ، برقیہ ستارے اور اس کے مقناطیسی محور ہیں؛ چوں کہ یہ منتشر ہیں اس لئے برقیہ ستاروں کی گردش کی وجہ سے مقناطیسی ستون کا اوپری حصہ دکھائی دیتا ہے تو باہر سے دیکھنے والوں کو شعاؤں کی لہریں نظر آتی ہیں، پلسر کی گردش کی وجہ سے شعائیں اس قدر واضح ہوتی ہیں کہ دور سے دیکھنے والا یوں محسوس کرتا ہے کہ روشنی کا مینارہ جھلملا رہا ہے، یہ ضربیں برقیہ ستاروں کی گردش کی شرح پر واقع ہوتی ہیں اور وقتاً فوقتاً دکھائی دیتی ہیں، ان لہروں کی آواز رات میں ہتھوڑا مارنے کی آواز کی طرح ہوتی ہے اور اس سے نکلنے والی شعائیں اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ ہر چیز کو چیرتی ہوئی زمین تک رسائی حاصل کر لیتی ہے، Cornell University کی ویب سائٹ (۱) نے پلسر کی آواز کو محفوظ کیا ہے جو واضح طور پر سنی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پلسروں کے بارے میں قرآن میں اس طرح کہا ہے:

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ، وَمَا أَدْرَاکَ مَا الطَّارِقُ، النَّجْمُ الثَّاقِبُ. (الطارق:۱-۳)

قسم ہے آسمان کی اور رات کے نمودار ہونے والے کی اور آپ کو کیا معلوم وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے، وہ چمکتا ہوا تارا ہے۔

قرآن کریم ستاروں کے فنا ہونے کے بارے میں کہتا ہے:

إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ، فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ. (المرسلات:۷-۸)

جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے، پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے۔

---

(۱) Http:/www.Ostro.cornell.edu/~deneva/psrsounds/pulsarssound.htm.

دوسری جگہ ارشاد ہے :

إِذَا السَّمَاءُ انفَطَرَتْ ، وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انتَثَرَتْ . (الانفطار:۱-۲)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے بکھر جائیں گے۔

قرآن میں ان معلومات کے پائے جانے پر ماہرین فلکیات دنگ رہ جاتے ہیں؛ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ فلکی اجرام مستقل بالذات ہیں؛ چنانچہ وہ سورج، چاند اور ستاروں کی عبادت کیا کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ یہ سب قادر مطلق اور ہمیشہ ہمیش رہنے والے ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں بتادیا کہ یہ سب نہ تو ہمیشہ رہنے والے ہیں اور نہ ہی کسی چیز پر قدرت رکھتے ہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انھیں پیدا فرمایا اور جب تک وہ چاہے گا، یہ سب باقی رہیں گے اور جب چاہے گا سب فنا ہو جائیں گے، ان کی زندگی کی مدت بھی متعین ہے اور ہمارا یہ سورج بھی ختم ہونے والا ہے۔

مسطح اور ہموار خلاء — کائنات

قرآن نے کائنات کی دوسری خصوصیت اس کا مسطح اور ہموار ہونا بیان کیا ہے، جس کو آج سائنس نے محقق کردیا ہے، اس حقیقت نے سائنس دانوں کو حیران کردیا کہ آخر Big Bang سے کائنات کی تقسیم ایک ہی نہج پر کیسے ہوئی؛ چوں کہ قرآن کو یہ حقیقت معلوم تھی اس لئے اس کو انسانیت کے لئے ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقاً مَّا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِن فُطُوْرٍ ، ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِأً وَّهُوَ حَسِيْرٌ . (الملک:۳-۴)

وہی ہے جس نے تہہ بہ تہہ سات آسمان بنائے، تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی کا قسم کا خلل نہیں پاؤگے، پھر پلٹ کر دیکھو کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نظر ڈال کر دیکھو تمہاری نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی۔

یہاں بھی ذرا قرآن کی طلاقت لسانی اور خالق کائنات کے انداز بیان پر غور فرمائیے، وہ اللہ جس کے پاس ہمیں دوبارہ جانا ہے خواہ اس پر ہم ایمان رکھیں یا نہ رکھیں، اس خدا کا کلام جو اپنی نشانیوں کو دکھاتا ہے، پھر نتیجہ کے طور پر پوچھتا ہے اگر تم واقعی اہل علم وفضل اور صاحب عقل وخرد ہو؛ جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو ان نشانیوں کو دیکھ کر خدا کی دست قدرت پر کیوں نہیں یقین کرتے ہو؟

سیاہ سوراخ(Black holes)

بلیک ہولس خلا کا ایک ایسا فلکی جرم ہے جس میں کوئی چیز حتیٰ کہ روشنی بھی باقی نہیں رہ سکتی ہے، بلیک ہولس کے اردگرد ایک غیر مرئی سطح ہے، جو نقطۂ اختتام کی علامت ہوتی ہے، اس کو Event horizon (اہم افق) کہتے ہیں، اس کو بلیک اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ Thermo dynamics میں مکمل سیاہ جسم کی طرح ہوتا ہے اور اس سے ٹکڑانے والی روشنی کو جذب کر لیتا ہے، اس کے داخلی حصہ کے غیر مرئی ہونے کے باوجود دوسرے کسی چیز کے ٹکرانے کے وقت ایک سیاہ سوراخ دکھائی دیتا ہے، اس بلیک ہول یعنی سیاہ سوراخ کو ان ستاروں کے جھرمٹ کی حرکت کے فوراً بعد دیکھ سکتے ہیں، جو خلا میں راستے بناتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ بلیک ہول تو غیر مرئی ہے؛ لیکن اس کے اردگرد جو کچھ ہوتا ہے اس سے اس کے وجود کا علم ہوتا ہے، ماہرین نظریات کا کہنا ہے کہ بلیک ہولس سے بھی سیاہ شعائیں نکلتی ہیں، جس میں ایک حد تک حرارت بھی ہوتی ہے، مگر یہ حرارت بلیک ہول کے تودے کے ساتھ کم ہوجاتی ہے اور ساتھ ساتھ ستاروں کے بلیک ہولس کے لئے ان شعاؤں کو برداشت کرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔

Black hole کے تعلق سے مشہور نظریہ تو یہی ہے کہ اس کے اندر اردگرد ہر چیز کو جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس کے بیرون کا کشش والا حصہ اسی طرح کے دوسرے تودے کی طرح ہوتا ہے، جس کی وجہ سے جب یہ دائرہ میں آتا ہے تو فلکی ملبہ بالکل جذب ہوجاتا ہے اور Black hole برش کی طرح کام کرتا ہے، یعنی سب کا صفایا کرکے خلاء میں چھا جاتا ہے، یقیناً یہ ایک عام فہم اور واضح مفہوم تھا، جس کو ہم نے اس طرح بیان کیا کہ عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ Black hole کیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ کسی بڑے سائنس داں سے بات ہورہی ہو، اب ذرا غور کیجئے کہ قرآن نے صدیوں پہلے Black holes کے بارے میں کیا کہا؟

قرآن کہتا ہے :

فَلا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ، الْجَوَارِ الْكُنَّس . (التکویر:۱۰)

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو سیدھے چلتے چلتے پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں اور پھر اپنے مطالع میں جا چھپتے ہیں۔

یہاں تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو قابل توجہ ہیں پہلا لفظ ''الخنس'' جس کے معنی ہیں ایسا ستارہ جو غیر مرئی ہو، دوسرا لفظ ''الجوار'' جس کے معنی ہیں ایسا ستارہ جو چپکے سے نکل جاتا ہو، تیسرا لفظ ''الکنس'' ہے جس کے معنی ہیں چھا جانا اور ہر چیز کو اپنے اندر سمیٹ لینا، ان فلکی اجرام کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جو Black holes کے لئے بالکل مناسب اور موزوں ہیں، اس آیت سے اور دوسری قرآنی آیتوں سے یہ واضح

ہو چکا کہ یہ سب اٹکل سے بیان نہیں کئے گئے ہیں؛ بلکہ متعین اور واضح مقصد کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ سمجھ دار لوگ فلکیات کے خالق کو پہچان لیں؛ لیکن عجیب بات ہے کہ یہ سب جاننے کے باوجود کچھ لوگ انکار کر بیٹھتے ہیں۔

اہم سوال

سورج ہم کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے، Pulsars (پلسروں) سے خطرناک شعائیں نکلتی ہیں اور (سیاہ سوراخ) اپنے دائرہ میں آنے والے ہر چیز کو نیست و نابود کر دیتے ہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اب تک زندہ محفوظ ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفاً مَّحْفُوظاً وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُوْنَ. (الانبیاء:۳۲)

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنادیا، مگر یہ ہیں کہ اس کی نشانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

اصل میں زمین کے ارد گرد بہت ہی مضبوط مقناطیسی ڈھال ہے جو سورج سے آنے والے ذرات کو روکتی ہے، یہ شمسی ذرے اس قدر آتش زدہ اور شعلہ زن ہوتے ہیں کہ اگر ان کی رسائی زمین تک ہو جائے تو اس پر بسنے والے سارے جانداروں کو خاکستر کر دے؛ لیکن یہ ڈھال انھیں روک دیتی ہے؛ تاکہ زمین کے باشندے محفوظ رہ سکیں، یہ ڈھال Ahetict علاقے کے Aurora Borealis سے دکھائی دیتا ہے، جو ایک خوبصورت فلکی عجوبہ لگتا ہے، قرآن میں اس ڈھال کے لئے شفق کا لفظ استعمال ہوا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَلا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ، وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ، وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ، لَتَرْكَبُنَّ طَبَقاً عَنْ طَبَقٍ ، فَمَا لَهُمْ لا يُؤْمِنُونَ ، وَإِذَا قُرِءَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لا يَسْجُدُوْنَ .
(الانشقاق:۱۶-۲۱)

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے کہ تم لوگوں کو ضرور ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچنا ہے، تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا کہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے، تو سجدہ نہیں کرتے؟

زمین کا حجم

ہم سمجھتے ہیں کہ زمین بہت بڑی ہے، اس لئے ہم نے The Whole World and-all-it Contanins

(دنیا و مافیہا) Global (عالمی) اور International (بین الاقوامی) وغیرہ اصطلاحیں وضع کر لی ہیں؛ لیکن حقیقت تو کچھ اور ہے، آیئے ذرا سیاروں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔

معلوم ہونا چاہئے کہ مشتری زمین سے تیرہ سو گنا بڑا ہے، ہمارا نظام شمسی جن سیاروں پر مشتمل ہے، ان میں کا صرف مشتری ڈھائی حصہ ہے؛ لیکن سورج کی جسامت مشتری کی جسامت سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے، اسی طرح Antares کا نصف قطر سورج سے آٹھ سو گنا بڑا ہے اور پھر یہ کہ ان میں VY Canis Majoris بھی ہیں، جس کو بھرنے کے لئے 7×10^{15} زمین درکار ہے۔

فرض کریں اگر زمین کا قطر صرف ایک سنٹی میٹر (0.39 انچ) ہوتا اور سورج کا قطر 109 سنٹی میٹر ($3^1/_2$FT) کا ہوتا اور 117 میٹر کی دوری پر ہوتا، اس حساب سے VY Canis Majoris کا قطر تقریباً 2.3 (1.43mi) کلومیٹر کا ہوتا، اس وقت جب اوپر کی حد کا اندازہ اس کے نصف قطر سے لگایا جائے۔

آخری بات :

قرآنی چیلنج کو جس کو اللہ تعالیٰ بار بار بیان کرتا ہے، ہم ''ناقابل تغیر اُصول'' کا نام دیتے ہیں، قرآن کہتا ہے :

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ . (لقمان:۲۰)

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں، اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں، جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم یا ہدایت ہو یا روشنی دکھانے والی کوئی کتاب ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ، وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ . (القمر:۴۹-۵۰)

ہم نے ہر چیز کو ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے اور پلک جھپکاتے وہ عمل میں آجاتا ہے۔

قرآن کی ان آیتوں کا ڈاکٹر پول ڈیویس Paul Davies کے اس نظریہ کے ساتھ موازنہ کیجئے، ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب The accidental universe میں لکھتے ہیں :

عددی اقدار جن کو قدرت نے بنیادی مشمولات میں شامل کیا ہے، جیسے برقیہ کی مقدار برقیہ کا حجم اور مقناطیسی رفتار کی مشمولات پراسرار ہیں؛ لیکن یہ نظام کائنات ہی سے متعلق ہیں، جیسا کہ کہکشاؤں کے مرکز سے طبعیاتی نظام مکمل طور پر سمجھا جا چکا ہے اور سائنس داں کہنے لگے ہیں کہ ان نظاموں کی بہت ساری خصوصیات بنیادی مشمولات کے لئے بہت ہی حساس ہیں، اگر قدرت ان کو ذرا برابر بھی آگے پیچھے رکھتی تو دنیا عجیب معمہ بن جاتی اور ہم اس کو دیکھنے کے لئے یہاں آ بھی نہیں سکتے۔

Big Bang کے تقریباً تین لاکھ سال بعد کائنات کے سارے اجزاء حتیٰ کہ اُفق کے بیں سے زائد مرتبہ جدا ہونے اور مخالفت سمت میں پھیلنے کا اتفاقاً (یعنی بغیر کسی طبعی وجہ کے) الگ الگ ہونے والے حصے ایک شرح اور حرارت کے ساتھ پھیلنا شروع ہوگئے ہیں، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ زوردار دھما کہ یعنی Big Bang اتفاقی طور پر الگ الگ ہونے والے حصوں میں ایک مستقل طرز توسیع پر مخالف سمت میں پھیلتے ہوئے ظاہر ہوا تھا، اندازہ لگایا جاتا ہے کہ جب دنیا کی عمر ایک سکنڈ کے لاکھوں حصوں سے بھی کم تھی اس وقت دنیا کے اتفاقی طور پر جدا ہونے والے حصہ ۱۰ سے ۸۰ کی استطاعت پر مشتمل تھی اور کوئی ایسی طبعی وجہ بھی نہیں تھی، جس سے ایک حصہ دوسرے حصے میں داخل ہوسکتا تھا، تاہم 300,000 سال بعد عالمی شعاؤں کی پس منظر نے ثابت کیا ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی شرح اور ایک حرارت کے ساتھ پھیلنا شروع ہوئے، گویا ان سب نے ایک متعین سمت کی طرف چلنا ٹھان لیا ہے، بہر حال یہ ایسی وضاحت ہے جس سے ساری باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔

قرآن کی اس آیت پر ذرا غور کیجئے:

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَأَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا. (حم السجدة:۱۲)

تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب حکم بھیج دیا۔

یعنی اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے یہ سب کچھ کیا ہے اور پھر ہمیں اس کی خبر دی ہے، اگر ہم قرآن کے اس دعویٰ کا انکار کرتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہے تو ہمیں مذکورہ معلومات پر غور کرنا چاہئے اور یہ بھی سوچنا چاہئے کہ بالآخر قرآن میں ان سب کا ذکر کیسے ہوا اور ہمیشہ صحیح کیسے بتا دیتا ہے، انصاف اور سچ کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قرآن کو خدا کی طرف سے مان لیں ورنہ یہ حماقت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید اور فلکیاتی سائنس

مولانا محمد اعظم ندوی⊙

فلکیات — ایک تعارف

فلکیات (Astronomy) سائنس کے اس شعبہ کا نام ہے، جس میں ستاروں، سیاروں، کہکشاؤں اور دیگر اجرام فلکی سے بحث کی جاتی ہے، طبیعیات (Physics) علم کیمیا (Chemistry) اور ارضیات (Geology) وغیرہ دیگر سائنسی علوم فلکیاتی تحقیق میں معاون ثابت ہوتے ہیں، کائنات کی ابتدا و انتہا سے متعلق معلومات کی فراہمی بھی اسی علم کا حصہ ہے، موسم اور وقت کی تحدید بھی اسی علم کے ذریعہ کی جاتی ہے، یہ علم انتہائی قدیم ہے، ۲۰۰ ق م میں اہل بابل نے اجرام فلکی کی نشاندہی کے لئے نقشے تیار کئے؛ لیکن ان سے ان کا مقصد زمین پر رونما ہونے والے حوادث اور آفات کی پیش گوئی کرنا تھا، اسی پیش قیاسی یا ستاروں کی گردش کی روشنی میں انسانوں کے مستقبل کے حالات کی نشاندہی کو علم نجوم (Astrology) کے نام سے جانا جاتا تھا، یونان و مصر اور روم و عرب کے قدماء نے اس علم میں بڑی مہارت حاصل کی جب کہ آٹھویں صدی میں مسلم ماہرین فلکیات (۱) نے اسے یک قلم ٹھکرا دیا؛ چوں کہ

⊙ استاذ: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

(۱) مسلمانوں میں فلکیات (قدیم علم ہیئت) کی طرف سب سے پہلے ابوجعفر منصور (۷۱۲-۷۷۵ء) نے توجہ کی اور محمد فزاری (م: ۷۹۶ء) سے ''سدھانتا'' (علم ہیئت کی مشہور ہندوستانی کتاب) کا ''کتاب السند ہند الکبیر'' کے نام سے ترجمہ کروایا، جس کی تلخیص محمد بن موسیٰ خوارزمی (۷۸۱-۸۴۷ء) نے ''کتاب السند ہند الصغیر'' کے نام سے تیار کی، مسلمانوں نے دیگر قوموں کی تصنیفات سے بھی فائدہ اُٹھایا اور انھیں عربی میں منتقل کیا، ان کی فروگذاشت کی نشاندہی کی اور اس علم میں بیش قیمت اضافے کئے اور تطبیقی طور پر بہت سے حیرت انگیز ایجادات دنیا کے سامنے لائے، جن میں سب سے زیادہ مقبولیت ''اُصطرلاب'' (Astrolabe) کو حاصل ہوئی جس سے ستاروں کی بلندی، مقام اور رفتار دریافت کی جاتی تھی، (مسلم سائنس دانوں کے کارناموں کے لئے دیکھئے: ابراہیم عمادی ندوی، مسلمان سائنس داں اور ان کی خدمات، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۱۹۹۸ء)۔

یہ عقیدہ اسلامی شریعت کے مغائر تھا، اٹھارہویں صدی تک عام طور سے اس علم کو توہمات پر مبنی سمجھا جانے لگا اور آسمان وزمین اور فضاؤں میں ہونے والے طبعی تغیرات کو طبعیات، کیمیا اور فلکیات وغیرہ کے ذریعہ معلوم کیا جانے لگا، اطالوی ماہر فلکیات گیلی لیوگلیلی (۱۵۶۴-۱۶۴۲ء) نے ۱۶۰۹ء میں پہلی مرتبہ جب دوربین (Telescope) ایجاد کی اور اس کے ذریعہ سے چاند کے پہاڑوں کا مشاہدہ کیا تو اس کے بعد سے یہ علم پہلے سے زیادہ تطبیقی ہوگیا، اس کے بعد ہر دور میں دوربینوں کی مختلف ترقی یافتہ قسمیں وجود میں آتی رہیں اور ان کے ذریعہ فلکیاتی نظام کی تحقیقات میں ترقی ہوتی رہی، نئے نئے سیارے اور ستارے دریافت ہونے لگے، ستاروں سے پھوٹ پھوٹ کر فضاؤں میں بکھرنے والی شعاعوں کی رفتار اور ان کے حجم کا اندازہ لگایا جانے لگا، خوردبین (Microscope) کی ایجاد نے تو کائنات کے چھوٹے چھوٹے اجزاء کا مشاہدہ آسان کر دیا، فلکیات میں انقلاب کا نقطۂ آغاز ۱۵۴۳ء میں چھپنے والی اس کتاب کو مانا جاتا ہے، جو پولینڈ کے ماہر فلکیات نیکولس کوپرنیکس (۱۴۷۳-۱۵۴۳ء) نے کرۂ زمین کی گردش سے متعلق تحریر کی تھی (۱)، اس کتاب میں اس نے زمین کی محوری گردش (Rotation) اور مداری گردش (Revolution) کو ثابت کیا تھا۔

بیسویں صدی میں طبیعیاتی فلکیات (Astro Physics) کو فروغ حاصل ہوا، اسے کاروباری فلکیات بھی غالباً اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ علم اس وقت آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا ہے، کاروباری فلکیات کی دو شاخیں ہیں، مشاہداتی (Observational) اور نظریاتی (Theoretical) اول الذکر کا کام ٹکنالوجی کے استعمال کے ذریعہ اجرام فلکی کی تحقیقات کو قابل مشاہدہ بنانا ہے، جب کہ آخر الذکر کا کام اُصولوں کی روشنی میں فلکیاتی حقائق کا تجزیہ کرنا ہے (۲)، ان تحقیقات کو اور زیادہ یقینی بنانے کے لئے بہت سے طالع آزماؤں نے خلائی سفر کئے، چاند پر کمندیں ڈالیں اور مریخ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا؛ لیکن خلا اور زمین پر موجود اپنے تمام مشینی وسائل کا استعمال کر کے وہ زیادہ سے زیادہ کائنات کے صرف 10% حصے کی جانچ پڑتال کر سکے، 90% کائنات اب بھی ان کی نظروں سے پوشیدہ ہے، اقوام متحدہ نے لوگوں کے ذہنوں کو فلکیات کے کارناموں کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ۲۰۰۹ء کو ''فلکیات کا بین الاقوامی سال'' (International Year of Astronomy) قرار دیا، جس کے لئے اختصار کے طور پر (IYA2009) کا رمز استعمال کیا گیا اور یہ اس لئے کہ ۲۰۰۹ء میں گیلی لیو کے ہاتھوں دوربین کی ایجاد کو چار سو سال مکمل ہو رہے تھے۔ (۳)

(۱) یہ کتاب لاطینی زبان میں "De Revolutionibus orbium coelestium" کے نام سے لکھی گئی تھی، جسے پہلی بار جوہانس پیٹرس (نرمبرگ) نے ۴۰۵ صفحات پر ۱۵۴۳ء میں شائع کیا تھا (en.wikipedia ory/wiki/De revolut ionbus)۔

(۲) Albrecht Unsold, W.D.Brewer (Translator) The new cosmos : An Introduction to Astronomy and Astrophysics, Berlin (2001).

(۳) International year of Astronmy, en.wikipedia.

نزولِ قرآن کا مقصد اور سائنس

ایک طرف فلکیات کی یہ گریز پا ترقی ہے، جس کے لئے دستِ قدرت نے اپنے ہزاروں بندوں کے ذہن و دماغ کے قیمتی سرمایہ کو مصروف کردیا ہے، اور بڑے بڑے سائنس داں ناسا (National Aeronautics and Space administration) امریکہ اور اس جیسے دیگر خلائی اداروں میں سرگرمِ عمل ہیں اور اربوں ڈالر ان تحقیقات پر خرچ ہو رہے ہیں، دوسری طرف قرآن مجید پر ایک نظر ڈالئے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کتاب کو جس پہلو سے دیکھئے اس کی معجزانہ شان آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، فلکیاتی سائنس کے حقائق کو بیان کرنے میں بھی بے شبہ وہ معجز بیاں ہے؛ لیکن کوئی بتائے کہ کیا نزولِ قرآن کا مقصد اس علم کی ترویج تھا، یا انفس و آفاق میں کروڑہا کروڑ نشانیوں کو بکھیر کر ربِ کریم کو اپنی وحدانیت اور کبریائی تسلیم کروانی تھی اور وہ بھی اس مشتِ خاک سے جس کا نام حضرت انسان ہے؛ تا کہ اس کی بے پایاں قدرت کے زندہ کرشموں کو دیکھ کر پیشانی سے پہلے اس کا دل سجدہ میں چلا جائے اور وہ بے اختیار پکار اُٹھے :

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْم. (الجاثیہ:۳۷)

زمین و آسمان میں بڑائی اسی کے لئے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولٰى وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (القصص:۷۰)

اسی کے لئے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، فرماں روائی اس کی ہے، اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔

قرآن مجید کلامِ الٰہی ہے، جو خود ذاتِ خداوندی کی طرح قدیم ہے، اللہ کا علم ساری کائنات کو محیط ہے، اگر اس کی مشیت ہوتی تو کائنات کے ایک ایک ذرہ کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہوتی؛ لیکن اللہ کو منظور یہ تھا کہ ایسے سادہ ترین روشن دلائل سے اپنی وحدانیت کا اقرار کرائے کہ جس کے لئے عقلی موشگافیوں کی ضرورت نہ پڑے، اس لئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورت کے متعلق سوال کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم فرمایا :

قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ . (البقرۃ:۱۸۹)

یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کی تعیین اور حج کی علامتیں ہیں۔

سورج اور چاند کا ذکر آیا تو فرمایا گیا :

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْراً وَّقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ . (یونس:۵)

وہی ہے جس نے سورج کو اجالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں ؛ تا کہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔

یہاں بھی اس سے بحث نہیں کی گئی کہ ماہ و سال کی تعداد جاننے کا طریقہ کیا ہے ؛ بلکہ صرف اسی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ یہ جو کچھ ہے سب ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کا ہے، ان کی خلقت پر غور کرو اور سوچو کہ :

هَلْ من خَالِقٍ غَیْرُ اللهِ . (الفاطر:۳)

کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے۔

کائنات میں غور وفکر کی اس دعوت کا مقصد غیبی طاقت پر ایمان میں پختگی اور نظریہ کو مشاہدہ کی روشنی میں حرف بحرف سچ ہوتا ہوا دیکھ کر یہ تصدیق کرنا ہے کہ :

اللهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ، لَهُ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ . (الزمر:۶۲-۶۳)

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے، زمین اور آسمانوں کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔

لیکن افسوس کہ جن نگاہوں نے کائنات کے پوشیدہ ذرات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا، انھوں نے اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھا اور تھوڑی دیر رک کر یہ غور نہ کیا کہ :

أَنَّ اللهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً .(فصلت:۱۵)

کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے۔

جب کہ :

فَلَوْ صَدَقُوْا اللهَ لَكَانَ خَيْراً لَّهُمْ . (محمد:۲۱)

اگر وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے، تو ان ہی کے لئے اچھا تھا۔

اور خود ان کے سامنے خدا کی کتاب تھی جو اس کا فیصلہ سنا رہی تھی کہ :

سَنُرِیْهِمْ آیَاتِنَا فِی الْآفَاقِ وَفِیْ أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ . (۱)

---

(۱) حم السجدہ:۵۳۔

عنقریب وہ تمھیں اپنی نشانیاں دکھادے گا اور تم انھیں پہچان لو گے۔

ہاں ان میں کچھ ایسے بھی تھے، جن کو اللہ نے توفیق دی اور انھوں نے اس بات کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا کہ جو حقائق اس کتاب میں نبی اُمی پر اُتارے گئے تھے، ہماری ہزار ہا سال کی انتھک کوششیں ویسے ٹھوس حقائق نہ پیش کر سکیں، مثلاً جاپان میں ٹوکیو رصد گاہ کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر یوشی ہیڈی کوزائے (Professor Dr. Yoshide kozai) نے قرآن کے ایک سرسری مطالعہ کے بعد کہا تھا: ''یہ قرآن انتہائی بلند مقام سے کائنات کی وضاحت کرتا ہے، ہر چیز واضح اور صاف ہے، اس نے جو کچھ کہا وہ حقیقت میں موجود ہے، ایسے مقام سے دیکھا ہے، جہاں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، محمد سامی محمد علی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جامعۃ الملک عبدالعزیز (سعودی عرب) میں جب ان کے سامنے فلکیات وارضیات کے حقائق پیش کیے گئے تو انھوں نے مذکورہ اظہار خیال کے بعد فوراً اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

آیاتِ قرآنی کی سائنسی تفسیر

قرآن کی وہ آیات جو کائنات کے حقائق کی جانب اشارہ کرتی ہیں، ان کی جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں تطبیقی تفسیر کے سلسلہ میں علماء کے دو نقاط نظر رہے ہیں، سب سے پہلے بڑے شدومد کے ساتھ امام شاطبی (م:۷۹۰ھ) نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ: بہت سے لوگوں نے قرآن کے سلسلہ میں ہر دعوی کی حد پار کر دی، یہاں تک کہ انھوں نے متقدمین و متاخرین کے سارے علوم کو اس میں شامل کر دیا، مثلاً طبعیات، ریاضی، ہندسہ منطق اور علم الحروف وغیرہ، جب کہ یہ درست نہیں، اس کے بعد امام شاطبی نے دلائل کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے۔(۱)

جدید دور کے اسلامی مصنفین میں مصری عالم ڈاکٹر محمد حسین ذہبی (۱۹۱۵-۱۹۷۷ء) نے اس نقطۂ نظر کی سختی سے مخالفت کی اور سب سے زیادہ تفصیلی جائزہ شیخ محمد طنطاوی جوہری (۱۸۷۰-۱۹۴۰ء) کی تفسیر ''الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم'' کا لیا ہے اور ان کے اس طرز فکر کی وکالت کو نادرست قرار دیا ہے، (۲) واقعہ یہ ہے کہ جوہری نے اپنی پچیس جلدوں کی اس تفسیر میں قرآن کو ایک سائنس کی کتاب بنا کر پیش کیا ہے اور کوئی ایسا موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا جہاں ان کو کسی سائنسی تحقیق کا سرا ہاتھ آ گیا ہو اور اس میں ان کو بڑی کھینچ تان کرنی پڑی ہے، شیخ متولی شعراوی (۱۹۱۱-۱۹۹۸ء) لکھتے ہیں کہ بعض لوگ کسی سائنسی نظریہ کو پا کر فوراً قرآن کی تفسیر اس کی روشنی میں کر دیتے

(۱) دیکھئے: الموافقات: ۲/۱۲۷، دار ابن عفان، ۱۹۹۷ء تحقیق: ابوعبیدہ مشہور بن حسن آل سلمان۔

(۲) دیکھئے: محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون: ۲/۵۱۷ طباعت کی تفصیلات غیر موجود ہیں۔

ہیں، یہ بہت بڑی غلطی ہے مثلاً جب سائنسدانوں نے سات سیارے دریافت کئے تھے، عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، اور یورینس تو، ہمارے بعض مفسرین نے ''سبع سماوات'' (سات آسمان) کی تفسیر انھیں سے کردی تھی، بعد میں نظام شمسی میں آٹھواں سیارہ دریافت ہوا، اس کے بعد نواں سیارہ ''پلوٹو'' اور بعد میں بھی بعض سیارے دریافت ہوئے تو اس تفسیر کی غلطی سامنے آئی، اس لئے جب تک کوئی سائنسی نظریہ مؤکد نہ ہوجائے اس کے مطابق تفسیر میں جلد بازی نہیں کرنی چاہئے، (۱) ذہبی نے بالکلیہ اس فکر کو حرف غلط نہیں ٹھہرایا؛ بلکہ وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کسی آیت کی تفسیر کے لئے جدید سائنسی نظریات معاون ہوں اور اس میں تطبیق ممکن ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور پھر شیخ مصطفیٰ مراغی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کسی آیت کو سائنس کی طرف کھینچ لانا، یا سائنس کو کسی آیت کی طرف کھینچ لانا نامناسب طریقہ ہے، ہاں اگر ظاہر آیت کسی سائنسی تحقیق سے متفق ہو تو ہم اس کی روشنی میں تفسیر کرسکتے ہیں۔

جو علماء اس نقطۂ نظر کے قائل رہے ہیں ان میں مشہور نام یہ ہیں :

شیخ ابوزہرہ (۱۸۹۸-۱۹۷۴ء) شیخ احمد صدیق غماری (م : ۱۹۶۰ء) شیخ محمد عبدہ (۱۸۶۵-۱۹۳۵ء) اوران کے شاگرد شیخ رشید رضا مصری (۱۸۶۵-۱۹۳۵ء) مشہور مصری ادیب مصطفیٰ صادق رافعی (۱۸۸۱-۱۹۳۷ء) نے اس کی پرزور وکالت کی ہے، لکھتے ہیں :

> حتى كانت تلك الآلات حينما توجه لآيات السماء والأرض توجه لآيات القرآن أيضاً . (۲)
>
> گویا جب آسمان وزمین کی آیات (نشانیوں) کی دریافت کے لئے آلات استعمال کئے جاتے ہیں، تو ان کا رُخ قرآنی آیات کی تفسیر کی طرف بھی ہوتا ہے۔

انھوں نے اپنی اسی کتاب '' الإعجاز العلمي '' میں مشہور ماہر فلکیات، ریاضی داں اور ترک قائد غازی احمد مختار پاشا (م:۱۹۱۹ء) کی کتاب ''سرائر القرآن'' کی بھی بڑی تعریف کی ہے، یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی تھی، اس کا عربی ترجمہ ڈاکٹر محب الدین خطیب (۱۸۸۶-۱۹۶۹ء) نے کیا ہے، جس میں انھوں نے قرآن کی ستر آیات کے سائنسی اعجاز کو نمایاں کرکے دکھایا ہے، اس کے عربی ترجمہ پر امیر شکیب ارسلان (۱۸۶۹-۱۹۴۶ء) نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے ''ان هذا الكتاب لم يخدم القرآن بمثله إلى اليوم '' (اس کتاب کے ذریعہ قرآن کی جو

---

(۱) تفسیر شعراوی، سورۂ انبیاء، آیت نمبر:۳۰ کے ذیل میں۔

(۲) مصطفیٰ صادق رافعی، اعجاز القرآن والبلاغه ، النبوية:۱۲۹، دار الكتاب العربي، بیروت، ۱۹۹۰ء۔

خدمت ہوئی ہے، آج تک اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی)، اس کے علاوہ طاہر بن عاشور (۱۸۷۹-۱۹۷۳ء) اور ترکی عالم سعید نورسی (۱۸۷۷-۱۹۶۰ء) وغیرہ کے نام اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں، اُردو تفسیروں میں اس قسم کے مباحث سب سے زیادہ تفصیل سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) کی تفہیم القرآن میں ملتے ہیں۔

رفتہ رفتہ اس نقطۂ نظر کو مقبولیت حاصل ہوگئی اور قرآن وحدیث کے سائنسی اعجاز (الاعجاز العلمي) کے لئے باضابطہ اکیڈمیاں وجود میں آگئیں ہیں، ان میں سب سے پہلے ''ھیئۃ الاعجاز فی القرآن والسنۃ'' مکہ مکرمہ کا قیام عمل میں آیا، قرآن کے اس پہلو کو عالمی پیمانہ پر نمایاں کرنے میں اس کا نمایاں کردار ہے، جامعہ ازہر کی مجلس علمی ''مجمع البحوث الإسلامیہ'' کے زیر انتظام بھی ''لجنۃ إلاعجاز العلمي في القرآن والسنۃ'' قائم ہے، اس سلسلہ میں ہونے والے سیمیناروں میں سب سے زیادہ شہرت ''ھیئۃ الاعجاز في القرآن والسنۃ'' کی جانب سے منعقد ہونے والے اس سیمینار کو حاصل ہوئی جو ۱۹۹۳ء میں ماسکو میں منعقد ہوا، ماسکو میں اسلام کی نشر واشاعت کو بھی اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی تھی (۱) اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ قرآن کی بہت سی آیات کائنات میں اللہ کے اس نظام کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کے بہت سے اسرار آج جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں کھل کر سامنے آگئے ہیں جب کہ اہل علم ان حقائق تک نہیں پہنچ سکے تھے، جب بھی کوئی نئی تحقیق سامنے آتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی فلاں آیت اس حقیقت کو چودہ سو سال پہلے بیان کر چکی ہے، تو قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایک نئی دلیل قائم ہو جاتی ہے، اس پس منظر میں ہم قرآن مجید کی بعض ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جو جدید علم فلکیات سے ثابت ہونے والے حقائق کی جانب واضح اشارہ کرتی ہیں۔

تخلیق کائنات کی ابتدا

قرآن مجید میں کائنات کی تخلیق کی جانب اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَا هُمَا . (۲)

کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے، پھر ہم نے ان کو جدا کر دیا۔

اس آیت میں ''رتق'' اور ''فتق'' کی حقیقت پر غور کیجئے اور بعض سائنسدانوں مثلاً ۱۹۲۹ء میں ایڈون ہبل "Edwin Hubble" (۱۸۸۹-۱۹۵۳ء) کے اس نظریہ سے اس کا موازنہ کیجئے، جو ضرب عظیم یا بڑی چوٹ

(۱) دیکھئے: احمد ابوالوفاء عبدالآخر، تقویم الأعمال التی تناولت الاعجاز العلمی۔ (۲) الانبیاء: ۳۰۔

(Big Bang Theory) کے نام سے مشہور ہے، اور جس کی حقیقت یہ ہے کہ آج سے تقریباً پچاس کھرب سال پہلے ایک مادہ کے اندر زبردست دھماکہ ہوا تھا، اس سے پہلے وہ مادہ نہایت کثیف اور گرم گیس کی صورت میں جامد تھا، یہ گیس بالکل سکڑی ہوئی تھی، سب سے پہلے یہ نظریہ ۱۹۵۰ء میں پیش کیا گیا، اس نظریہ کو سب سے زیادہ تقویت اس وقت حاصل ہوئی جب کائنات میں ہیلیم کے عناصر کو دریافت کیا گیا، یہ وزن میں بالکل ہلکی گیس ہوتی ہے، اس کے لئے سائنس داں (He) کا رمز استعمال کرتے ہیں، کائنات میں اس گیس کے وجود کو Big Bang کے واقعہ کی صداقت کے لئے ایک اہم ترین دلیل سمجھا جاتا ہے؛ چوں کہ سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق اس دھماکہ کے چند منٹوں بعد ہیلیم کے عناصر باقی تھے اور اب بھی سورج، سطح زمین، فضا اور قدرتی گیسوں میں یہ عنصر پایا جاتا ہے، اس سے ہلکی گیس صرف ہائیڈروجن ہے، اس نظریہ کو ماننے کے بعد یہ تسلیم کرنا گزیر ہو جاتا ہے کہ کسی غیبی طاقت نے یہ سب کرشمے دکھائے اور یہ بات غیب پر ایمان کے بغیر کوئی تسلیم نہیں کرسکتا، اس لئے برطانوی ماہر علم کائنات فریڈ ہوئیل "Fred Hoyle" (۱۹۱۵-۲۰۰۱ء) اس نظریہ کی تردید کرنا چاہتا تھا اور اس کے لئے اس نے ایک (Steady State) نظریہ بھی پیش کیا جو انیسویں صدی کے پائیدار کائناتی فلسفہ سے کافی حد تک مشابہت رکھتا ہے؛ لیکن اس نظریہ کا مقصد مادی فلسفہ کی تائید کرنا تھا اور اس طرح خدا کے وجود سے انکار کرنا تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے خود سائنسدانوں کے ذریعہ Big Bang کے نظریہ کو تقویت پہنچائی، ایک تو ۱۹۸۶ء میں ناسا نے "Cabe" نامی سیٹیلائٹ خلا میں بھیجا، Cabe نے اس زبردست دھماکہ کے باقیات کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی جو کائنات کی ابتدا کے موقع پر ہوا تھا، ان باقیات میں ہیلیم اور ہائیڈروجن کا ارتکاز بھی نظر آیا، آج بھی یہ عناصر (ہائیڈروجن اور ہیلیم) کائنات کے اکثر اجزاء میں پائے جاتے ہیں، اس سے دونوں کے درمیان ایک اور مماثلت دریافت ہوئی، ناسا نے دراصل خلا میں یہ سیٹیلائٹ دو محققین آرنو پینزیاز (Arno Penziaz) اور رابرٹ ولسن (Robert Wilson) کی اس تحقیق کی توثیق کے لئے بھیجا تھا، جو انھوں نے ۱۹۶۵ء میں پیش کیا اور جس میں اس حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ بعض تنویری شعائیں (Cosmos Back Ground Radiation) ساری کائنات میں نفوذ پذیر ہیں، دراصل یہ Big Bang دھماکہ کے بعد ابتدائی مراحل کا نتیجہ تھیں، چوں کہ یہ کسی مبدأ سے نہیں نکل رہی ہیں؛ بلکہ کائناتی خلا میں رچ بس گئی تھیں، اس دریافت پر ان دونوں کو نوبل انعام سے بھی نوازا گیا تھا، (۱) حقیقت

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: الموسوعة العربية العالمية، مادہ الانفجار العظیم، ہارون یحییٰ (ترکی) "Allahis Known Through Reason" اُردو ترجمہ: محمد نذیر احمد (حیدرآباد) بنام دلائل و براہین سے اللہ کی پہچان: ۱۴-۱۵، الانفجار العظیم ar. wikepedia. org۔

تو یہ ہے کہ اسی نظریہ سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ کائنات عدم سے وجود میں آئی ہے اور بڑے بڑے ماہرین فلکیات نے برسوں اس نظریہ کی تردید پر غور کیا؛ لیکن اخیر میں اعتراف کرلیا کہ Hoyle کا نظریہ Steady State (ایک ناقابل تبدیل حالت) غلط ہے، اور اس کو خارج از امکان قرار دے دیا۔

مادہ کی شکل

یہ مادہ جسے اُردو میں سحابیہ، عربی میں سدیم اور انگریزی میں (Nebula) کہا جاتا ہے، کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزاء غبار کی طرح فضاء میں پھیلا ہوا تھا، آغاز کائنات کے متعلق سائنس دانوں کا تصور یہ ہے کہ تخلیق سے پہلے یہ مادہ گیس کی شکل میں تھا جسے دخانی (دُھویں کی شکل) یا سحابی (بادل کی شکل) بھی کہا جاتا ہے، قرآن مجید کی ایک آیت اس حقیقت کی تائید کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے سورۂ حم سجدہ میں فرمایا :

ثم استویٰ إلی السماء وھی دخان . (سورۂ دخان:۱۱)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

پروفیسر کوزائے کہتے ہیں کہ ہم اب تک یہ سمجھتے تھے کہ آسمان کہر یا دھند کی شکل میں تھا؛ لیکن جب سیٹلائٹ اور خلائی جہاز فضا میں بھیجے گئے تو یہ حقیقت کھلی کہ یہ کہر نہیں دھواں ہے، چوں کہ کہر میں ٹھنڈک ہوتی ہے اور دھویں میں گرمی ہوتی ہے اور حرکت بھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مادہ بھی دھواں تھا۔

کائنات کی توسیع

اس مادہ کے بارے میں سائنسدانوں کی ایک تحقیق یہ بھی پائی جاتی ہے کہ جب اس میں دھماکہ ہوا تو اس کے ٹوٹے ہوئے اجزاء فضاء میں پھیل گئے اور جب ایک مرتبہ پھیلاؤ شروع ہوگیا تو جیسے جیسے باہمی کشش کم ہوتی گئی ان میں پھیلاؤ بڑھتا گیا، کائنات کے ابتدائی مادہ کا امکانی دائرہ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً ایک ہزار ملین نوری سال (Light Year) ہے (۱)، نور کے معنی روشنی کے ہیں، روشنی کی رفتار فی سکنڈ تین لاکھ کلومیٹر ہے، ایک سال میں روشنی جتنا فاصلہ طے کرتی ہے اس مسافت کو نوری سال کہتے ہیں، کلومیٹر میں اس کی مسافت ۹۴ کھرب ۶۰ ارب ۸۰ کروڑ کلومیٹر ہے، اور اب وہ مسافت کم ہوتی جارہی ہے (۲)، ۱۹۲۹ء میں کیلی فورنیا کے ماؤنٹ وسن رصدگاہ

(۱) نوری سال کے لئے سائنس داں (Ly) کا رمز استعمال کرتے ہیں۔

(۲) (En.vikipedia.org/liki/light-year) شیخ محمد متولی شعراوی، الآیات الکونیہ وودلالتہا علی وجود اللہ تعالیٰ، www.lslami.8m.com، تفصیل کے لئے پڑھئے: وحید الدین خان، علم جدید کا چیلنج: ۱۷۳، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۹۵۔

میں ایک امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل (Edwin Hubble) نے اپنی دیو قامت دوربین سے دیکھا کہ ستاروں سے نکلنے والی روشنی طیف کی سرخ حد کی جانب منعطف ہورہی ہے، جو اس بات کا علانیہ اظہار تھا کہ ستارہ زمین سے دور ہوگیا ہے، یہ قابل حیرت تھا؛ چوں کہ طبیعیاتی مسلمہ قوانین کے مطابق روشنی کی شعاعوں کا طیفی انتشار بجائے بنفشی سمت اختیار کرنے کے سرخ حد کی سمت اختیار کرگیا تھا، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ کائنات کی ہر چیز دوسری چیز سے دور ہی ہورہی ہے (۱) سائنسداں بیلون یا ربر کی طرح کائنات کے پھیلاؤ کو بتاتے ہیں، قرآن مجید نے غالبًا اس حقیقت کی جانب اس آیت میں اشارہ کیا ہے :

وَالسَّمَاء بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ . (الذاریات:۴۷)

اور ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا اور ہم کشادہ کرنے والے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں ''السماء'' کا لفظ ۱۰۷ مرتبہ اور بغیر الف لام کے ''سماء'' کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے؛ لیکن ان سب کے معنی صرف اس نیلگوں آسمان کے نہیں ہیں جو ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں؛ بلکہ یہ اس ساخت کا نام ہے جس میں سینکڑوں بلین کہکشائیں ہماری نظروں سے چھپی ہوئی ہیں، آیت ''وَالسَّمَاء ذَاتِ الْحُبُكِ '' (الذاریات:۷) (قسم ہے جالدار آسمان کی) اس حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے، اور یوں بھی عربی میں جو چیز بھی انسان سے بلند ہو اور اس پر سایہ فگن ہو اسے ''سماء'' کہتے ہیں ''**کل ما علا الانسان فأظله فهو سماء** ''(۲) اس طرح آیت میں ''السماء'' کے پھیلنے سے پوری کائنات کا پھیلاؤ بھی مراد ہوسکتا ہے، واللہ اعلم۔

کائنات کی انتہا

سائنسدانوں نے جہاں کائنات کے پھیلاؤ کو ثابت کیا ہے، وہیں وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ کائنات ایک کھلے ہوئے ورق کی طرح ہے، جس کو ایک دن سمٹ کر فنا ہوجانا ہے؛ اس کا وجود ایک مادہ سے ہوا تھا، اس کے اندر مسلسل توسیع ہوتی جارہی ہے؛ لیکن اس کے باوجود اس کا اصل حصہ اتنا کم ہے کہ تھوڑی سی جگہ میں اسے دوبارہ سمیٹا جاسکتا ہے اور کائنات میں سارے خطوط مستقیم نہیں بلکہ جھکے ہوئے ہیں، اس سے بھی یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ دوبارہ اس کو لپیٹ دیا جائے گا اور ایک دھماکہ کے نتیجہ میں جو مسلسل پھیلاؤ ہوتا جارہا تھا، ابتدائی پھیلاؤ کے مقابلہ اب اس میں کمی آرہی ہے، اب اس میں وہ حرارت نہیں رہی، اس لئے کائنات کے پھیلاؤ کی سرعت رفتار میں

(۱) ہارون یحییٰ، دلائل وبراہین سے اللہ کی پہچان:۱۲، ستاروں اور سیاروں میں پھیلاؤ کی یہ رفتار کبھی کبھی بجلی کی رفتار کے مماثل ہوتی ہے، یعنی فی سکنڈ تین لاکھ کلومیٹر۔

(۲) احمد مصطفیٰ مراغی، مفردات القرآن، زوائد المکتبہ الشاملہ:۱/۴۵۵۔

کمی آنے کی وجہ سے قوت کشش لوٹ رہی ہے اور ایک دن پھر سے یہ پوری کائنات اسی ایک مادہ میں سمٹنے والی ہے، جس سے ابتدا ہوئی تھی، اس کو سائنس داں (Big Bang Theory) کے بالمقابل (Big Crunch Theory) کے نام سے یاد کرتے ہیں، (۱) یا اسے بند کائنات (The Closed universe) بھی کہتے ہیں، گویا دنیا ''فتق'' سے دوچار ہونے کے بعد ایک بار پھر اسی ''رتق'' کی منزل کو پہنچ جائے گی، جو اس کا نقطۂ آغاز تھا، قرآن کریم نے اس حقیقت کو سب سے زیادہ واضح طور پر ان دو آیتوں میں بیان کیا ہے :

يَوْمَ نَطْوِىْ السَّمَاءَ كَطَىِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهُ . (۲)

جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں، جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتداء کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کو لوٹا دیں گے۔

اور دوسری جگہ ہے :

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِىْ السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ . (الدخان:۱۰)

پس انتظار کرو اس دن کا جب آسمان ایک کھلے ہوئے دھویں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔

سورج کی روشنی

قرآن مجید میں ''سورج'' کی صفت ''سراج'' بیان کی گئی ہے، فرمایا گیا :

تَبَارَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِىْ السَّمَاءِ بُرُوْجاً وَجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجاً وَقَمَراً مُّنِيْراً . (۳)

بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ (سورج) اور ایک چمکتا چاند بنایا۔

ایک دوسری آیت سے اس کی تفسیر ہوتی ہے :

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً . (نوح:۱۶)

اور سورج کو چراغ بنایا۔

ایک جگہ اسے روشن چراغ سے تعبیر کیا گیا ہے :

وَجَعَلْنَا سِرَاجاً وَهَّاجاً . (النباء:۱۳)

اور ہم نے ایک چمکتا ہوا چراغ رکھ دیا۔

---

(۱) Dr.Gary, Hinshaw, WMAP, Introduction to cosmology, Nasa (2008)

(۲) الأنبياء:۱۰۴۔ (۳) الفرقان:۶۱۔

کہیں اس کے بارے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے سورج کو روشنی والا بنایا ہے اور اس کی صفت کے لئے ''ضیاء'' کا لفظ استعمال کیا گیا، ضیاء کے معنی روشنی کے ہوتے ہیں، اکثر مفسرین نے اس سے پہلے ''ذات'' (والا) کو محذوف مانا ہے، یعنی روشنی والا، سورۂ یونس کی آیت دیکھئے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاء . (یونس:۵)

اللہ ہی ہے جس نے سورج کو چمکتا (روشنی والا) بنایا۔

''سراج'' عربی زبان میں ''چراغ'' کو کہتے ہیں، اور چراغ کے اندر گرمی اور حرارت کا ہونا لازمی ہے، چوں کہ وہ آتشیں ہوتا ہے، ''ضیاء'' کے معنی ایسی روشنی کے ہیں جو عام روشنی کے مقابلہ میں تیز بھی ہو اور تمازت لئے ہوئے ہو، (۱) اس لئے سورج کی روشنی سے بچنے کے لئے سایہ کی ضرورت ہوتی ہے، سورج کی روشنی کو ایک آیت میں ''آیۃ النہار'' (دن کی نشانی) بتایا گیا ہے، فرمایا گیا:

وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً . (۲) (بنی اسرائیل:۱۲)

اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن کر دیا۔

جدید سائنسی تحقیق سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ سورج ایک ایسے ستارہ (Star) کو کہتے ہیں جو آگ کا گولہ ہے، اور کئی طرح کی گیسوں کا مجموعہ ہے، اس میں ۷۱ فیصد ہائیڈروجن ۵ء۲۶ فیصد ہیلیم اور ۵ء۲ فیصد دوسری گیسیں ہیں، اس کے اندر دس لاکھ ڈگری درجۂ حرارت ہے؛ بلکہ بعض سائنسداں تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے اندر کی گرمی پندرہ لاکھ ڈگری ہے، یہ گرمی اس کے مرکز کی ہے، باہری پرتوں پر کبھی یہ گرمی بڑھ کر پچیس لاکھ ڈگری کو پہنچ جاتی ہے اور کبھی گھٹ کر (۵.۵۰۰) ڈگری تک آجاتی ہے، (۳) اس کی گرمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے ایک گھنٹہ میں جو گرمی نکلتی ہے وہ اکیس سوٹن کوئلہ سے پیدا ہونے والی گرمی کے برابر ہوتی ہے اور یہ مقدار زمین کو کئی مرتبہ پگھلانے کے لئے کافی ہے، سورج کو (Self-Luminous Gaseous Sphere) کہا جاتا ہے، یعنی گیس کا ایک ایسا کرہ جو خود سے تابندہ اور روشن ہے، گویا اس کی روشنی اور حرارت دوسرے سیاروں (Planets) کی طرح

(۱) قدیم ماہرین لغت نے تو صرف اتنا ہی ذکر کیا ہے کہ ''ضیاء'' کی روشنی ''نور'' کے مقابلہ میں زیادہ تیز ہوتی ہے، مثلاً علامہ مرتضیٰ زبیدی زمخشری کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''الضیاء أشد من النور'' (تاج العروس: ۱۴/۳۰۰، مادہ: نور، دار الہدایہ)؛ لیکن بعض معاصر مصنفین نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ اس کی تیزی کا مطلب اس میں ایک قسم کی حرات کا پایا جانا بھی ہے۔

(۲) ''مبصرۃ'' کے اصل معنی اس آیت کے سیاق کے اعتبار سے ہیں: ''آنکھوں کو روشن کر دینے والا'' (قرطبی)۔

(۳) الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ (Global Arabic Encyclopedia) الکٹرانک ایڈیشن ۲۰۰۴ء مادہ: ۱۱۔

مستعار نہیں ؛ بلکہ ذاتی ہیں ، دیگر ستاروں کی طرح سورج بھی ہائیڈ روجن گیس کا بنا ہوا ہے ، سورج کے مرکز میں نیوکلیائی تعامل ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ہائیڈ روجن گیس کے ایٹم مل کر ہیلیئم گیس بناتے ہیں ، اس نیوکلیائی تعامل کے نتیجہ میں جو بے پناہ توانائی خارج ہوتی ہے وہی ہم کو روشنی کی شکل میں ملتی ہے ، (۱) ان سائنسی حقائق کو دیکھئے اور قرآن مجید کے اشاروں پر نظر ڈالئے ، کیا یقین نہیں آجاتا کہ یہ ایک قادر مطلق کی کتاب ہے !!

سورج کی گردش

سائنسداں اس سورج کو جس طرح (Fire Ball) آگ کا گولہ بتاتے ہیں ، اسی طرح اس کی گردش کے بھی قائل ہیں ، سورج ہماری کہکشاں کے مرکز سے ۳۲ ہزار نوری سال کے فاصلہ پر ہے ، اس کہکشاں کو (Milky Way) کہا جاتا ہے ، یعنی دودھیا راستہ یا ''جادۂ شیر'' عرب اسے ''درب اللّبانہ'' کہتے ہیں ، انھوں نے بھی دیگر زبانوں کی طرح ''لبن'' (دودھ) سے یہ لفظ بنالیا ہے ، سورج کا تعلق اسی کہکشاں سے ہے اور ہم جس زمین پر رہتے ہیں ، اس کا تعلق نظام شمسی (Solar System) سے ہے ، اسی لئے ہم اسے اپنی کہکشاں کہہ دیتے ہیں ، سورج اس کہکشاں کے گرد ۲۵۰ کلومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے چکر لگاتا ہے ، اس رفتار سے سفر کرنے پر سورج کو ایک چکر مکمل کرنے میں ۲۵ کروڑ سال لگتے ہیں ، اس عرصہ کو کازمک ایر (Cosmic year) کے نام سے جانا جاتا ہے ، سورج اپنے محور کے اردگرد بھی چکر لگاتا ہے ، جیسے زمین اپنے محور کے گرد بھی چکر لگاتی ہے اور زمین جس طرح سورج کے اِردگرد بھی چکر لگاتی ہے ، سورج اسی طرح ملکی وے کے گرد چکر لگاتا ہے ، سورج اپنے محور کے گرد جو مسافت طے کرتا ہے وہ سورج اور زمین کی مسافت سے دس بلین گنا زیادہ ہے ، سورج سے زمین کا فاصلہ تقریباً ۱۵ کروڑ کلومیٹر ہے ، اور اس گردش میں وہ فی سکنڈ ۱۹ کلومیٹر کی رفتار سے دوڑتا ہے ، (۲) سب سے پہلے ۱۹ ویں صدی کے وسط میں رچرڈ کرنگٹن (Richard Carrington) نے اس کو ثابت کیا ۔ (۳)

قرآن مجید نے سورج کی گردش کے بارے میں آج سے چودہ سو سال پہلے بتادیا تھا ، ارشاد خداوندی ہے :

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا . (یٰسین :۳۸)

اور سورج ، وہ اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلتا رہتا ہے ۔

---

(۱) ڈاکٹر اسلم پرویز ، سائنس نامہ : ۱۳۵ ، کلاسیکل پرنٹرز ، دہلی ۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے : الیاس بھٹکلی ندوی ، بین الاقوامی و اسلامی جغرافیہ : ۲۴ ، مکتبہ ندویہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۔

(۳) نماذج من الآيات المشتملة على الإعجاز (مجموعۂ مقالات) حرکۃ الشمس وجریانہا ، مکتبہ شاملہ ۔

آگے اس نظام کی خوبیوں کا اس طرح ذکر کیا گیا :

لَا الشَّمْسُ يَنبَغِىْ لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ . (یٰس:۴۰)

نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے، اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔

شمس متعدد ہیں

بعض حضرات نے قرآن کریم کی اس آیت: لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَهُنَّ (حم سجدہ:۳۷) ''سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو؛ بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے'' سے یہ استدلال کیا ہے کہ اس سے مراد نظام کہکشاں (Galaxy) یا وہ پچاس کروڑ کہکشائیں ہیں جن کی جانب سائنسدانوں نے اشارے کئے ہیں، چوں کہ یہاں ''خلقهن'' میں ''هن'' کی ضمیر استعمال ہوئی ہے، اور وہ جمع کے لئے ہوتی ہے۔(۱)

سورج کا خاتمہ

NASA کے ماہرین فلکیات کا اندازہ ہے کہ سورج جس مقدار میں ہائیڈروجن گیس استعمال کررہا ہے، اس اعتبار سے وہ مزید پانچ ارب سال تک جگمگا سکتا ہے، چوں کہ وہ اپنا ایندھن مستقل خرچ کررہا ہے، اس لئے ایک دن اسے بجھنا ہے، اور جب یہ قوت وحرارت کھودے گا تو عام تاروں کی صف میں داخل ہوجائے گا، اس کی شکل ایک سرخ گولہ کی ہوجائے گی، اور وہ اپنی جسامت سے تقریباً سو گنا بڑا ہوجائے گا اور زمین پر انسانی زندگی کا امکان کم سے کم ہوتا جائے گا، (۲) اسی طرح سورج کا وزن ہر سکنڈ میں (5,000,000) ٹن وزن کم ہورہا ہے، اب اندازہ کیجئے کہ پانچ ہزار ملین سال (پندرہ ارب سال) میں یہ حجم کتنا کم ہوجائے گا؛ لیکن سائنسدانوں نے اس کے لئے جو میعاد متعین کی ہے اسے وہ اس یقین کے ساتھ نہیں بیان کرتے جیسے دوسرے سائنسی حقائق کو، اور اگر بعض لوگوں نے یہ پیش قیاسی باوثوق لہجہ میں کی بھی ہے تو ہم اسے حرف بحرف صحیح نہیں مان سکتے، چوں کہ اس طرح قیامت کے وقت کی تحدید ہوگی، اور قیامت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

---

(۱) الإعجاز العلمي في القرآن الكريم :۴۰

(۲) الآيات المشتملة على الاعجاز، بعنوان، حركة الشمس وجريانها، مكتبہ شاملہ۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّيْ لاَ يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلاَّ هُوَ . (الأعراف:۱۸۷)

یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟ کہہ دیجئے: اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے، اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا۔

جہاں تک سورج کے فنا ہونے کی بات ہے تو اس کی تائید قرآن مجید سے بڑی وضاحت کے ساتھ ہوتی ہے، فرمایا گیا:

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ . (القیامۃ:۹)

اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

إِذَا لشَّمْسُ كُوِّرَتْ . (التکویر:۱)

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔

چاند کی روشنی

اللہ تعالیٰ نے سورج کی طرح چاند کو گرم اور تابناک نہیں رکھا؛ بلکہ اس کی روشنی میں ٹھنڈک اور ایک قسم کی دلنوازی رکھدی ہے، اسی لئے عربی میں چاند کی روشنی کو ''نورِ حلیم'' (بردبار روشنی) کہتے ہیں، قرآن میں اس حقیقت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوراً (نوح:۱۶) ''اور آسمان میں چاند کو نور بنایا'' اور وَقَمَراً مُّنِيراً (الفرقان:۶۱) ''اور ایک چمکتا چاند (روشن کیا)''۔

اس سے پہلے ہم سورج کی روشنی کے تحت ذکر کر آئے ہیں کہ ''نور'' اور ''ضیاء'' میں کیا فرق ہے، نزول قرآن کے صدیوں بعد ہونے والی سائنسی تحقیق کو دیکھیں تو وہ اپنی تمام تر کوششوں کے بعد بعینہٖ اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ سورج کی روشنی خود اس کے اندر کی گرمی کا نتیجہ ہے؛ جب کہ چاند کی روشنی سورج سے مستعار ہے، خود اس کے اندر کا درجۂ حرارت ۲۴۰ ڈگری کے درمیان ہوتا ہے، جو سورج کے مقابلہ میں انتہائی کم ہے، حقیقت یہ ہے کہ مختلف درجۂ حرارت کی حامل روشنی کو تعبیر کرنے کے لئے عربی زبان کے علاوہ کسی زبان کے پاس ایسے جچے تلے الفاظ نہیں ہیں، سائنس تین زبانوں فرنچ، انگریزی اور جرمن کے واسطہ دوسری زبانوں میں منتقل ہوئی، فرنچ میں ہر قسم کی روشنی کو Lumiere، انگریزی میں Light اور جرمنی میں Licht کہتے ہیں،(۱) قرآن کا ادبی اعجاز سائنسی اعجاز کے پہلو بہ پہلو آشکارا ہو رہا ہے۔

---

(۱) الإعجاز العلمي، عنوان: بہ ضیاء الشمس ونور القمر، مکتبہ شاملہ۔

چاند بھی پہلے شعلہ زن تھا

چاند کے بارے میں سائنس دانوں کا خیال ہے کہ پہلے اس کے اندر بھی تابانی اور حرارت تھی، بعد میں جاتی رہی، یہ بات پہلے خلاباز امریکی نژاد نیل آرم اسٹرانگ کے ۱۹۶۹ء میں چاند پر قدم رکھنے سے پہلے کائنات کے سینکڑوں نامعلوم حقائق میں ایک تھی، امریکی خلائی ایجنسی NASA کی رپورٹ کے مطابق سائنسدانوں نے چاند کی مٹی کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چاند ۴۰۶ملین سال پہلے وجود میں آیا اور اپنی بناوٹ کے مرحلہ میں شہاب ثاقب (Shooting Star) سے ٹکرایا، اور اس کے غیر معمولی درجۂ حرارت نے اس کے اندرونی حصوں کو بالکل گرم کردیا، اسی کے نتیجہ میں اس میں ماریا(Maria) اور کریٹرز (Craters) نامی گڑھے بن گئے اور گرمی سے آتش فشانی لاوے نکلنے شروع ہوئے، جن سے یہ گڑھے بھر گئے اور اس طرح چاند ٹھنڈا پڑ گیا، اس کے آتش فشاں پہاڑ ختم ہوگئے اور لاوے بجھ گئے، اس طرح چاند کی تمازت جاتی رہی، (۱) جب ہم قرآن مجید کی طرف لوٹتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی آیت ملتی ہے، جو غالباً اسی حقیقت کی طرف اشارہ کررہی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً . (بنی اسرائیل:۱۲)

ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے، رات کی نشانی کو ہم نے بے نور بنادیا اور دن کی نشانی کو روشن رکھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تاویل میں فرماتے ہیں :

إن الله خلق شمسين من نور عرشه ، فأرسل جبريل عليه السلام فأمرّ جناحه على وجه القمر ، وهو يومئذ شمس ثلاث مرات ، فطمس عنه الضوء ، وبقي فيه النور ، وذلک قوله تعالىٰ ، فمحونا آية الليل . (۲)

اللہ تعالیٰ نے دو سورج اپنے عرش کے نور سے پیدا کیے، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا، انھوں نے اپنا بازو چاند کے چہرہ پر پھیرا اور چاند اس وقت سورج سے تین گنا زیادہ روشن تھا تو اس سے تیز روشنی ختم ہوگئی اور ہلکی روشنی اس میں باقی رہ گئی، اللہ کے

---

(۱) http:ll Forum: aljayyash. netl1741 html۔

(۲) آلوسی، روح المعانی:۹/۳۹، مکتبہ زکریا، دیوبند سہارنپور۔

اس فرمان: ''فمحونا آية الليل '' (کہ ہم نے رات کی نشانی کو بے نور کر دیا) کا یہی مطلب ہے۔

چاند کا گھٹنا بڑھنا

سورۂ یٰسین کی ایک آیت میں چاند کی روشنی کے گھٹنے بڑھنے کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے، وہ آیت یہ ہے :

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ . (یٰسین:۳۹)

اور چاند، اس کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا، وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر علامہ ابوبکر جزائری (پ:۱۹۲۱ء) اس طرح بیان کرتے ہیں: ''چاند باریک ہلال کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، پھر دھیرے دھیرے نمایاں ہوتا ہے، یہاں تک کہ مہینہ جیسے ہی اپنی آدھی منزل طے کرتا ہے وہ بدر کامل بن کر نمودار ہوتا ہے، پھر ایک عجیب وغریب نظام کے تحت اس کی روشنی ماند پڑتی جاتی ہے، یہاں تک کہ مہینہ کے آخر میں وہ بالکل کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے،(۱) بعض دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ چاند کی ۲۸ منزلیں ہیں جب وہ آخری منزل میں ہوتا ہے تو دیکھنے میں کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح معلوم ہوتا ہے۔(۲)

اب آیئے دیکھیں ماہرین فلکیات اس سلسلہ میں کس نتیجہ پر پہنچے ہیں، ماہرین فلکیات کے مطابق چاند گرہن کے علاوہ چاند کا تقریباً آدھا حصہ سورج کی شعاعوں سے روشن رہتا ہے اور اس کا دوسرا نصف حصہ سورج سے روشنی حاصل نہ کر پانے کی وجہ سے تاریک رہتا ہے، مہینہ کے آخر میں چاند زمین اور سورج کے درمیان ہوتا ہے، روشن حصہ سورج کی طرف اور تاریک حصہ ہماری طرف ہو جاتا ہے، اس لئے ہم اسے نہیں دیکھ پاتے، ہم زیادہ سے زیادہ چاند کا ۵۹ فیصد دیکھ سکتے ہیں، ۴۱ فیصد نہیں دیکھ سکتے ہیں، جب ہم بدر کامل کو دیکھتے ہیں اس وقت ہماری زمین چاند اور سورج کے درمیان مناسب فاصلہ پر ہوتی ہے، اور اس وقت ہم سورج سے روشن ہونے والے چاند کے پورے حصہ کو دیکھ پاتے ہیں،(۳) چاند کی تابانی جب بالکل کم ہو جاتی ہے تو اسے عربی میں ''محاق'' کہتے ہیں، اسی کو فلکیات کی اصطلاح میں (waning Moon)(۴) کہا جاتا ہے، قرآن نے اسی کیفیت کو ''العرجون القديم ''

(۱) جابر ابوبکر الجزائری، أیسر التفاسیر لکلام العلی الکبیر، مکتبۃ العلوم والحکم، مدینہ منورہ:۴/۳۷۹۔

(۲) ابواسحاق ثعلبی، الکشف والبیان عن تفسیر القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت: ۱۲۸/۸

(۳) الموسوعة العربيه العالميه ، ماده : قمر۔

(۴) www.universetoday.com 20317/waning-moon

(کھجور کی سوکھی شاخ) سے تشبیہ دی ہے، جس کی بلاغت کا جواب نہیں، ایک جگہ انسانی زندگی کے دنیوی اور اُخروی مرحلوں کی مختلف کیفیتوں کو چاند کے گھٹنے بڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے :

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ، وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ، وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ، لَتَرْكَبُنَّ طَبَقاً عَن طَبَقٍ . (الانشقاق:۱۶-۱۹)

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور جو کچھ وہ سمیٹ لیتی ہے، اور چاند کی جب وہ ماہِ کامل ہو جاتا ہے، تم کو ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔

چاند کی گردش

چاند ہماری زمین کا اکلوتا ذیلی سیارہ (Satellite) ہے، زمین سے اوسطاً اس کا فاصلہ ۳ لاکھ ۸۴ ہزار چار سو تین کلومیٹر رہتا ہے، یہ تقریباً ساڑھے انتیس دن میں فی گھنٹہ ۳۶۶۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے اور اس طرح زمین کے گرد اس کا ایک چکر مکمل ہوتا ہے، اپنے محور (Axis) پر وہ ایک چکر ۲۷ دن اور ایک تہائی دن میں مکمل کرتا ہے، (۱) چاند کی گردش زمین کی طرح مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے، یہ حقائق اب خلائی اُڑان کے بعد معلوم ہوئے ہیں، قرآن کریم نے اس حقیقت کو اس وقت بتادیا تھا جب شاید کسی کا ذہن بھی اس طرف منتقل نہ ہوا ہوگا، کہ اوپر آسمان میں نظر آنے والا چاند ہماری اس زمین کے اردگرد چکر کاٹ رہا ہے، اور نہ یہ کسی کے وہم و گمان میں آیا ہوگا کہ ہماری یہ زمین بھی اُڑن کھٹولہ کی طرح آفتاب کے دائیں بائیں اُڑی جارہی ہے؛ لیکن خدا کی ذات تو غیب و شہادت سے واقف ہے اور واقف کیا، اسی کے کلمہ ''کن'' سے تمام سیاروں، ستاروں کی یہ تگ و دو، روشنی و حرارت اور عروج و زوال ہے، آفتاب و ماہتاب کے بارے میں رب کریم کی خبر برحق یہ ہے :

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنَ . (ابراہیم:۳۳)

جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جارہے ہیں۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى . (الفاطر:۱۳)

اور سورج اور چاند کو اس نے مسخر کر رکھا ہے، یہ سب کچھ ایک وقت مقررہ تک چلا جارہا ہے۔

چاند کا خاتمہ

قرآن مجید میں سورۂ قمر کی پہلی آیت میں فرمایا گیا :

---

(۱) www.jimloy.com/astro/moon4.htm.(1999) The Moon's Rotation

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَر. (القمر:۱)
قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔

اس آیت میں ''انشقاق قمر'' (چاند کے پھٹنے) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کی مختلف تحقیق رہی ہے، بعض حضرات کہتے ہیں: اس سے مراد ''شق قمر'' (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے اشارے سے چاند کے دوٹکڑے ہونے) کا معجزہ ہے، جب کہ دوسرے مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ''لم یقع انشقاق القمر بعد، وهو منتظر أی اقتربت الساعة وانشقاق والقمر''(۱) (یعنی شق قمر کا معجزہ ظاہر نہیں ہوا تھا؛ بلکہ چاند کے پھٹنے کا انتظار ہے، اس طرح آیت کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت اور چاند کے پھٹنے کا وقت قریب آگیا) آگے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''وأن الساعة إذا قامت انشقت السماء بما فیها من القمر وغیره''(۲) (یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو آسمان پھٹ پڑے گا اور اس میں جو کچھ ہے سب کا یہی حال ہوگا، چاند بھی اسی کا ایک حصہ ہے، اسی لئے وہ بھی پھٹ پڑے گا) ماوردی نے تو اسے جمہور کا قول قرار دیا ہے؛ لیکن بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ عہد نبوی میں چاند دوٹکڑے ہو چکا ہے (۳) اور اس موقع سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار ومنافقین کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: ''اشهدوا'' (دیکھو معجزہ) اسی لئے یہ رائے اختیار کرنا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ شق قمر کا بھی معجزہ پیش آیا ہے اور قیامت کے دن طبعی طور پر چاند کا پھٹ جانا بھی ایک حقیقت ہے، علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۸۸۷-۱۹۴۹ء) فرماتے ہیں: ''شق القمر کا معجزہ ایک نمونہ اور نشانی تھی قیامت کی کہ آگے سب کچھ یوں ہی پھٹے گا''(۴) اور اب تو ناسا نے بھی عہد نبوی میں شق قمر کے معجزہ کو اپنی سائنسی تحقیق کے ذریعہ ثابت کیا ہے اور اس پر ویڈیو تک تیار کیا ہے، (۵) اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان کا اس حقیقت تک پہنچنا کن حقائق پر مبنی ہے، ہم اس معجزہ کو اس تحقیق سے پہلے روایتی تحقیقات کی روشنی میں ہی مانتے آئے ہیں۔

---

(۱) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن: ۱۲۶/۱۷، تحقیق: هشام سمیر البخاری، دار عالم الکتب، الریاض ۲۰۰۳ء۔

(۲) قرطبی، الجامع لأحکام القرآن: ۱۲۶/۱۷۔

(۳) صحیح بخاری، باب سئول المشرکین أن یریهم النبی صلی ﷺ آیة فأراهم انشقاق القمر (امام بخاری نے اپنے ترجمۃ الباب میں ہی یہ وضاحت کردی کہ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معجزہ کا سوال کیا تھا تو آپ نے چاند کے دوٹکڑے ہونے کا معجزہ دکھایا) حدیث نمبر: ۳۴۳۷، صحیح مسلم: ۷۲۵۶۔

(۴) تفسیر عثمانی، سورۂ قمر: ۱۔

(۵) اس ویڈیو کو گوگل سرچ انجن پر "Moonsplit From Nasa-video" لکھ کر اپنے کمپیوٹر اسکرین پر دیکھا جا سکتا ہے۔

جدید دور کے ماہرین فلکیات اپنے خلائی مطالعہ کے نتیجہ میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب چاند زمین کے بالکل قریب آجائے گا، اور دونوں طرف سے ایسی کشش ہوگی کہ پھر وہ پھٹ پڑے گا، چاند کی کشش زمین کے مقابلہ چھ گنا کم ہے، اس لئے چاند پر ایک آدمی بھاری بھر کم بوجھ بھی اُٹھا لے تو وہ خود کو ہلکا محسوس کرے گا؛ لیکن ان دونوں کے درمیان اس وقت اتنا کم فاصلہ رہ جائے گا کہ دوطرفہ کشش پیدا ہوگی اور چاند اس کو برداشت نہ کرسکے گا، بالآخر پھٹ پڑے گا۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب (پ: ۱۹۲۵ء) اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> شق قمر کا یہ واقعہ اسی قانون کشش کے تحت ہوگا جس کا مظاہرہ جوار بھاٹے کی شکل میں سمندروں میں ہوتا رہتا ہے، چاند بالائی فضاء میں ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے، یعنی زمین سے اس کا فاصلہ صرف دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے، اس قربت کی وجہ سے اس کشش کا اثر سمندروں پر پڑتا ہے، اور دن میں دو بار پانی اوپر اُٹھ کر غیر معمولی تموج پیدا کرتا ہے، یہ موجیں بعض مقامات پر ساٹھ فٹ کے قریب اوپر تک اُٹھ جاتی ہیں، اور خشکی کی سطح بھی اس قمری کشش سے چند انچ تک متاثر ہوتی ہے، چاند اور زمین کا موجودہ فاصلہ بہت مناسب مقدار پر ہے اور اس کے بہت سے فوائد ہیں، اس کے بجائے اگر یہ فاصلہ گھٹ جائے مثلاً پچاس ہزار میل پر آجائے تو سمندروں میں اس شدت سے طوفان برپا ہو کہ خشکی کا بیشتر حصہ اس میں غرق ہو جائے اور طوفانی موجوں کے مسلسل ٹکراؤ سے پہاڑ کٹ کر ریزے ریزے ہو جائیں اور زمین اس کی کشش سے پھٹنے لگے۔(۱)

دیگر ستارے اور سیارے

سائنس داں ستارہ کو (Star) اور سیارہ کو (Planet) کہتے ہیں، پہلے کو عربی میں ''نجم'' اور دوسرے کو ''کوکب'' کہا جاتا ہے، ہر ستارہ ایک خاندان رکھتا ہے، اس خاندان کے ہر فرد کو سیارہ کہتے ہیں، سیارہ ستارہ سے روشنی حاصل کرتا ہے، جب کہ ستارہ کا حسن ذاتی ہے اور اس کی روشنی اس کے اندر کی طبعی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوتی ہے، ہم اپنے نظام شمسی کے سیاروں کا سورج سے فاصلہ کلومیٹر میں معلوم کر سکتے ہیں؛ لیکن جب ہم سورج اور دوسرے ستاروں کے درمیان مسافت معلوم کرنا چاہیں تو ملین اور بلین کلومیٹر کی مقدار بھی اس پیائش سے قاصر رہے گی؛ بلکہ

(۱) وحید الدین خان، علم جدید کا چیلنج: ۱۷۴-۱۷۵۔

اس کے لئے نوری سال کا سہارا لینا پڑتا ہے، جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، ہمارے نظام شمسی کے تابع ۹ مشہور سیارے دریافت ہوتے ہیں، بعد میں ایک دو اور دریافت ہوئے ہیں اور کسے معلوم کہ اور کتنے غیب کے تہہ بہ تہہ پردوں میں نہاں ہیں اور ان سائنسدانوں کو ''عشق کے کتنے امتحان'' دینے ہیں کہ :

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

نظام شمسی کے تابع ۹ مشہور سیارے یہ ہیں (۱) عطارد (Mercury) (۲) زہرہ (Venus) (۳) زمین (Earth) (۴) مریخ (Mars) (۵) مشتری (Jupiter) (۶) زحل (Saturn) (۷) یورینس (Uranus) (۸) نیپچون (Neptune) (۹) پلوٹو (Pluto) دسواں سیارہ ۲۰۰۳ء میں دیکھا گیا، ۵/جنوری ۲۰۰۵ء کو مائک براؤن، چیڈ ٹروجیلو اور ڈیوڈ ربیونز کی ایک ٹیم کے ذریعہ باضابطہ اس کی دریافت تحقیق کے مرحلہ سے گذر کر سامنے آگئی، اس دریافت کا اعلان ۲۹/جولائی ۲۰۰۵ء کو ہوا اور ایک عرصہ کے بعد ۱۳/دسمبر ۲۰۰۶ء کو اس کا نام ارلیس (Eris) رکھا گیا اور اس کا متبادل نام 2003BU313 تجویز کیا گیا، اب تک پلوٹو کو سورج سے سب سے زیادہ فاصلہ پر مانا جاتا تھا جب کہ یہ پلوٹو سے تین گنا دور ہے، ۲۰۱۰ء کی ایک تحقیق کے بعد اس کو حجم میں پلوٹو کے برابر بتایا گیا ہے، (۱) اسی طرح ایک گیارہواں سیارہ سرلیس (Ceres) کے نام سے دریافت کیا گیا، خوف طوالت سے ہم اس کی تفصیل قلم زد کرتے ہیں، ۲۴/اگست ۲۰۰۶ء کو بین الاقوامی فلکیاتی اتحاد (International Astronomical Union) نے پہلی بار سیارے کی تعریف اس طرح کی ہے: سیارہ سورج کے گرد مدار میں گردش کرنے والے کسی ایسے جسم کو کہتے ہیں جو درج ذیل خصوصیات کا حامل ہو، اس کی کمیت کم از کم اتنی ہو کہ اپنی کشش ثقل کے باعث ایک کرے کی شکل اختیار کرلے، اپنی کشش ثقل سے اپنے مدار اور اس کے آس پاس کے علاقے سے چھوٹے اجسام کو صاف کر چکا ہو، اس تعریف کے بعد پلوٹو کو سیارہ کی فہرست سے خارج کر دیا گیا اور نو دریافت شدہ ارلیس اور سرلیس کا مسئلہ تو پہلے ہی سے زیر غور تھا، اس طرح ان تین سیاروں کو بونے سیاروں (Dwarf Planet) کے ذیل میں شمار کیا گیا، (۲) عربی داں حضرات کی دلچسپی کے لئے لکھ دوں کہ ان تینوں سیاروں کو عربی میں ''الکواکب القزمة'' کہا جاتا ہے۔

یہ تو تھیں سائنس کی عہد بہ عہد تغیر پذیر تحقیقات، اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے ستاروں اور سیاروں سے متعلق کیا ٹھوس حقائق بیان کئے ہیں —— قرآن مجید میں سورج، چاند، زمین و آسمان، روز و شب اور بے شمار فلکیاتی

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: en.wikipedia.org/wiki/eris-dwarf-p......۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: wikipedia-solar system اور بی بی سی نیوز کی ویب سائٹ، بعنوان: الوداع پلوٹو (by-by ploto)

اجسام یا ان کے نتیجہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی قسم کھائی گئی ہے، ستاروں سے متعلق بھی قسم کھائی گئی ہے :

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ . (الواقعہ:۷۵)

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مقامات کی۔

لیکن صرف اسی پر اکتفاء نہیں کیا گیا؛ بلکہ آگے یہ بھی کہا گیا کہ :

وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ . (الواقعہ:۷۶)

اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔

اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ اس کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ہے، علامہ ابن قیم جوزیہؒ (م:۷۵۲ھ) فرماتے ہیں :

وإقسامه ببعض المخلوقات دليل على أنه من عظيم آياته . (۱)

مولانا حمید الدین فراہیؒ (م: ۱۹۳۰ء) کے مطابق قسم کی اصل استشہاد اور استدلال ہے، یعنی جہاں جہاں قرآن مجید میں اشیاء اور مقامات کی قسمیں کھائی گئی ہیں وہاں اس دعوی کی دلیل کی حیثیت سے آئی ہیں جو قسم کے بعد مذکور ہوا ہے، ہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات یا اس کے شعائر کی قسمیں ہیں وہ عظمت کو بتاتی ہیں ۔(۲)

مقصد خواہ کوئی بھی ہو؛ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ آیت ستاروں کے مقامات ان کی منزلوں اور مدار کی نشاندہی کرتی ہے اور ممکن ہو اس قسم کو عظیم بنانے میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ آئندہ ہونے والی حیران کن تحقیقات کے نتیجہ میں ان کی حقیقت اور زیادہ واضح ہوگی اور اس قسم کا راز اور کھل کر سامنے آجائے گا۔ واللہ اعلم

قرآن کریم میں نجوم وکواکب سے متعلق درج ذیل وضاحت کی گئی ہے :

یہ بڑے دقیق نظم وانتظام کے ساتھ انسانوں کے لئے مسخر کئے گئے ہیں: وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ (النحل:۱۲) ''اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں'' یہ آسمان دنیا (قریب کے آسمان) کے لئے زینت ہیں: إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ (الصافات:۶) ''ہم نے قریب کے آسمان کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے'' اور وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (الملک:۵) ''اور ہم نے قریب کے آسمان کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے'' یہ مسلسل گردش میں ہیں: وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُوْمِ (الطور:۴۹) ''رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی'' اور وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ (یٰسین:۴۰) ''سب ایک ایک

(۱) ابن قیم، التبیان فی أقسام القرآن: ۲، تحقیق: محمد حامد الفقی، دار المعرفہ، بیروت، لبنان۔

(۲) حمید الدین فراہی، إمعان فی أقسام القرآن: ۲۹، www.tafsir.org/books

فلک میں تیر رہے ہیں'' اور بھی بعض تفصیلات تاروں سے متعلق قرآن مجید میں ملتی ہیں؛ لیکن فلکیات سے راست تعلق ان کی روشنی، گردش اور ان کے ختم ہونے کا ہے اور یہ تینوں ہی باتیں قرآن میں انتہائی سادہ مگر معنوی اعتبار سے بڑے ٹھوس الفاظ میں بیان کی گئی ہیں، سارے سیاروں اور ستاروں کے خاتمہ کا ذکر ان تین آیتوں میں دیکھئے: فَـإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ (المرسلات :۸) ''پھر جب ستارے ماند پڑ جائیں گے'' اور: وَإِذَا الـنُّجُومُ انكَدَرَتْ (التكوير:۲) اور جب تارے بکھر جائیں گے'' اس طرح: وَإِذَا الْكَـوَاكِبُ انتَثَرَتْ (الانفطار:۲) ''اور جب تارے بکھر جائیں گے'' کائنات کے ٹوٹ پھوٹ کر فنا ہونے کے لئے کیسی صاف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں کہ کسی کو یہاں بقائے دوام کا شبہ بھی نہ ہو، سائنس داں تمام اجرام فلکی کے خاتمہ کو مانتے آئے ہیں۔

زمین بھی سیاروں میں داخل ہے اور نظام شمسی کے تمام سیاروں میں سورج سے اس کا فاصلہ تیسرے نمبر پر ہے، اس کا اندازہ ۱۵۰ ملین کلومیٹر کی دوری سے کیا گیا اور حق یہ تھا کہ اس پر بھی گفتگو کی جاتی؛ لیکن جہاں یہ دیگر سیاروں کی بہت سی خصوصیات میں مشترک ہے، مثلاً اس کا بیضوی ہونا، حرکت کرنا وغیرہ، بعض چیزوں میں بالکل منفرد ہے، مثلاً زندگی کے لئے نظام شمسی میں تنہا اسی سیارہ کا ماحول سازگار ہے، ہوا میں آکسیجن اور پانی کی وجہ سے اس کے اندر اعتدال پایا جاتا ہے، ورنہ دوسرے سیارے یا تو بہت گرم ہیں یا بہت سرد، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے زمین کی ان خصوصیات کی طرف مختصر طور پر اس آیت میں اشارہ کیا ہے :

وَفِيْ الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ . (الذاريات:۲۰)

زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے۔

قرآن مجید میں زمین کی گولائی، گردش، کشش، اس کے راستوں اور طبقات کی جانب کئی جگہ اشارے ملتے ہیں، اسی طرح اس کے پہاڑوں اور سمندروں سے متعلق بھی بہت سے حقائق بیان کئے گئے ہیں؛ لیکن چوں کہ ارضیات (Geology) فلکیات سے علاحدہ ایک فن کی حیثیت حاصل کر چکی ہے، اس لئے اس پر مستقل روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، اس مقالہ کو فلکیات کے بعض قرآنی حقائق تک محدود رکھتے ہیں۔

بعض حضرات نے فضائی غلاف (Ozone)، کرۂ باد (Atmosphere) اور سیاہ سوراخ (Black Hole) کو قرآن کریم کی بعض آیتوں سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن چوں کہ ان سے آیتوں کی مناسبت پیدا کرنے کے لئے بڑے مفروضے ماننے پڑتے ہیں، اس لئے ہم اس بحث میں پڑنے سے گریز کرتے ہیں۔

آخری بات

قرآن کریم نے جن فلکیاتی حقائق کو بتایا ہے، وہ حتمی اور غیر متبدل ہیں، جب کہ ماہرین فلکیات کی

تحقیقات ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، جیسا کہ متعدد سیاروں کے تعلق سے ذکر کیا گیا، یہاں جو کل افسانہ تھا آج حقیقت ہے اور کسے معلوم کہ آج جس بات کو حقیقت کہنے پر زور دیا جا رہا ہے، کل وہ مضحکہ بن جائے اور کیوں نہ ہو! اس کی بنیاد علم انسانی پر ہے، جس کا حال یہ ہے کہ :

ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے
جانا تو یہ جانا ، کہ نہ جانا کچھ بھی

اور قرآن نے اس کم علمی کا احساس پہلے ہی دلا دیا تھا: وَمَـا أُوتِيتُـم مِّـن الْـعِـلْمِ إِلَّا قَلِيْلاً (بنی اسرائیل:۸۵) ''اور تمہیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے'' جب کہ قرآنی علوم کا مرجع خود ذات الٰہی ہے جس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں: وَعِـنْـدَهُ مَـفَاتِحُ الْغَيْبِ لاَ يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ (الانعام:۵۹) ''اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، جنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔

ہم اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں جو مرزا نوشہ (اسد اللہ خاں غالب) نے کہا تھا :

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

⊙ ⊙ ⊙

علم النفس — قرآنی تعلیمات کے دائرے میں!

ڈاکٹر ضیاء الدین ندیم ⊙

اسلام صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات بھی ہے، اگر انسان روزِ اول سے اس نقطے اور فلسفے کو جان جاتا تو اسے روشنی، ادراک، تعلیم و تربیت، فہم و تفہیم، معرفت، بیماری و علاج، سکونِ قلب و ذہن، سکونِ دماغ کے لئے جستجو کرنے کی اور در بدر ٹھوکریں کھانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی، اور دنیا کے سارے علوم جو اسی نقطے کی تلاش میں وجود میں آئے، ان کی ہمیں سرے سے ہی ضرورت نہ پڑی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ضابطہ حیات والے فلسفے کو سمجھانے کے لئے جو Manual یا سرچشمۂ حیات رہتی دنیا تک قرآن کی شکل میں ہم سب کے لئے جاری کیا، یہ قرآن از خود مطلق علم Absolute Knowledge مہیا کرتا ہے، اس کتاب میں سائنس ہے تو میڈیکل سائنس بھی، طبیعات ہے تو فلکیات بھی، ماحولیات ہیں تو معدنیات بھی اور اقتصادیات ہے تو سماجیات بھی، جب علم النفس کے ذکر کی بات قرآن میں آتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ''الانسان'' قرآن کا موضوع خاص ہے، اس کا اندازہ اس آیت سے لگایا جاسکتا ہے:

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ . (الانبیاء:۱۰)

بے شک ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس میں تمہارا ہی ذکر ہے کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

اسی طرح دوسری آیت:

رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ . (الاسراء:۲۵)

تمہارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے۔

جب یہ کتاب خود مطلق علم کو فراہم کرتی ہے، تو اس کتاب کا لکھنے والا تو اس Absolute Knowledge کا جاننے والا ہی نہیں؛ بلکہ اس کو پیدا کرنے والا بھی ہے، اسی طرح انسانی نفسیات کا جاننے والا اس سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ جس نے انسان کو خود بنایا وہی انسان کی نفسیات نہ جانے تو پھر کون جانے گا! انسان کی عملی وفکری،

⊙ ماہر امراض نفسیات، حیدرآباد۔

علمی وتجربی دنیا کی کامیابی وناکامی کا انحصار نفس پر ہوتا ہے، اسی لئے آج کے اس نفسی نفسی کے دور میں علم النفسیات کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے، ایک ماہر تعلیمی نفسیات جناب عبدالحیٔ علوی لکھتے ہیں :

> موجودہ صدی سائنس اور ٹکنالوجی کی صدی ہے، ایسا معلوم ہوتا کہ نئی تہذیب نے جہاں بے شمار آسانیاں مہیا کی ہیں وہاں انسان کے طرز عمل کو غیر طبعی بنادیا ہے، جو کہ اس کے ذاتی کرب، غیر طبعی طرز عمل کے میدان حقیقت پسندانہ نظریے کے فقدان اور نفسی وجسمانی بے قاعدگیوں میں نظر آتا ہے، بالفاظ دیگر انسان اپنی دماغی صحت اور ذہنی سکون سے محروم ہوگیا ہے۔

فی زمانہ ایک عام نفسیاتی بیماری ہے جیسے ڈپریشن کہا جاتا ہے، ڈپریشن میں انسان کی اندرونی کیفیت سے ہر سمت اداسی چھا جاتی ہے اور سارا ماحول سنسان دکھائی دیتا ہے، بعض اوقات انسان مایوسی، شکست اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہوجاتا ہے، اسے ہر چیز کا تاریک پہلو ہی دکھائی دیتا ہے۔

اس کا علاج انسان ساری دنیا میں کھوجتا ہے، سوائے اللہ سے مانگنے کے، اس میں انسان کا اپنا قصور ہے ورنہ اللہ تعالیٰ تو طلب کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا؛ بلکہ وہ تو انسان کو یہ بتارہا ہے کہ، جس سکون کی، جس خوشی کی، جس تسکین کی، جس خوشحالی کی، جس کامیابی کی تمہیں ضرورت ہے وہ تم کو مل جائیگی؛ لیکن تم کو اللہ کے ذکر نعمت سے استفادہ کرنا پڑیگا :

> الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ أَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ، الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ طُوبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ . (الرعد:۱۸-۲۹)
>
> جولوگ ایمان لاتے ہیں اللہ کے ذکر سے ان کے قلوب مطمئن ہوتے ہیں خوب جان لوکہ ذکراللہ ہی سے دل اطمنان پاتے ہیں، جولوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے ان کے لئے رحمت اور عمدہ انجام ہے۔

ہر انسان ایک ہی نفس کا مظہر ہے، اس حساب سے جتنا قدیم انسان ہے اتنا ہی قدیم اس کا نفس ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ علم النفس کی ابتدا ابا آدم ہی سے ہوگئی، جب انسان بنادیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نفس بھی بنادیا، اس نفس کی تربیت کا سلسلہ شروع ہوا، انسان اور شیطان کے بیچ کی کشمکش، اچھے برے کی پہچان اور اپنے نفس پر قابو پانے کی کوشش، پھر اس میں ناکامی اور سزا کا تصور، پھر آہ وبکاء، گریہ وزاری وندامت اور پچھتاوے کے جذبات یہ ساری چیزیں ہمیں حضرت آدم علیہ اسلام کے اس واقعے میں ملتی ہیں جو قرآن میں موجود ہے، شجر ممنوعہ کی طرف اشارہ

کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اشتہا اور کسی چیز کے پانے کی جستجو کی داغ بیل ڈال دی، اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے بعد شیطان کو جس طرح دھتکارا اور سارے انسانوں کے مسلسل امتحان کا سامان پیدا کر دیا وہیں پر حضرت آدم علیہ اسلام سے شجر ممنوعہ کا پھل کھلوا کر انسانوں کو یہ سبق دیا کہ اے انسانو! یاد رکھو شیطان کے بہکاوے میں آنے سے جب تمہارے بابا آدم نہیں بچ سکے تو تم کس کھیت کی مولی ہو، اسی لئے اپنی اپنی حفاظت کا بندوبست کرلو۔

میری سمجھ میں یہ آتا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان اور شجر ممنوعہ کا سارا انتظام صرف اس لئے کیا کہ ہم اپنی دنیا کی ساری زندگی اچھے اور برے کی تمیز کرنے میں صرف کر دیں اور امید وخوف کی کشمکش میں گذار دیں، کیا اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ شجر ممنوعہ کو جلا کر راکھ کر دینا، یا سرے سے اسے پیدا ہی نہ کرنا، یا حضرت آدم علیہ اسلام کی نظروں سے اوجھل کر دینا کوئی مشکل کام تھا؟

اُمید وخوف کی درمیانی کیفیت میں رہنا نفسیات کا بھی ایک اہم اصول ہے Anxiety یا شدید ہیبت کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کے بارے میں کی گئی ریسرچ بتاتی ہے کہ انسان کے Performance کے لئے درجے کی Anxiety ضروری ہوتی ہے، اگر یہ Anxiety بالکل نہ ہو تو طالبعلم اپنی پڑھائی پوری نہیں کر پاتا۔

جیسے جیسے دنیا بستی گئی ویسے ہی دنیا میں نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے گئے، ابتدائے زمانہ سے اگر نفس انسانی کی تاریخ و کردار کا جائزہ لیا جائے تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غیر نارمل کردار کا تصور معاشرے کا حصہ رہے ہیں، ہابیل کے واقعے سے قرآن ہمیں حسد جلن اور غصہ جیسے انسانی جذبات کا ادراک ہمیں دیتا ہے، کسی کو دیکھ کر سیکھنا اور Observation ہمیں اسی واقعہ میں کوّے سے ملتا ہے، دنیا آگے بڑھتی ہے تو حضرت لقمان علیہ السلام کا دور آتا ہے آپ ایک پیغمبر کے علاوہ حکیم ودانا کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، علاج ومعالجے کا سلسلہ شاید یہیں سے شروع ہوا ہوگا، ابراہیم علیہ السلام کے جذبہ قربانی کا سبق اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی فرمانبداری کا ذکر ہمیں قرآن میں ملتا ہے، نوح علیہ السلام سے ہم نے اقرباء پروری اور اپنے خاندان والوں کی فکر کرنا اور ان کی سلامتی کے لئے تڑپنا سیکھا، پھر حضرت لوط علیہ السلام کے دور سے انسان نے غیر فطری جنسی تعلقات کے بارے میں علم حاصل کیا، آگے چل کر اس کے علاوہ اور دوسرے جنسی مسائل نے علم النفس کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کرلیا، آگے بڑھئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پتہ چلا کہ جادوگری اور ٹونا وغیرہ کیا ہوتے ہیں، اللہ پر کامل بھروسہ کرنا اور اس کے ایک حکم پر بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینا یہ سب انتہائی اہم نفسیاتی دروس ہیں جو ہمیں قرآن میں ملتے ہیں۔

جب انبیاء کی بعثت کا سلسلہ ختم ہونے آیا جو جہاں پر اور جس پر آ کر رسالت اور نبوت کا سلسلہ رکا تو یہاں پر

اللہ تعالیٰ کو انسانی نفسیات مکمل کرنا تھا اوران تک جو نفسیاتی راز و مراحل بچے ہوئے تھے ان کو یکجا کر کے اس تعلیمی سلسلے کو مکمل کرنا تھا، رسالت کا یہ آخری بار اور یہ عظیم سہرہ کس کے سر جائے، اس کے انتخاب کے لئے جب اللہ تعالیٰ نے Norm اور ضابطہ سے ہٹکر صحرائے عرب کے ایک یتیم و یسیر اور اُمی شخصیت کو چنا تو یقیناً اس میں کئی نفسیاتی نقطے موجود ہوں گے اور اس نبی کی بعثت کے لئے جس قوم کو چنا وہ اپنی جہالت میں ساری پچھلی قوموں سے آگے تھی، لڑکیوں کو زندہ دفنانے والی قوم کو جب روشنی ملی تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قوم کیا سے کیا ہوگئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو Role Model کے طور پر اللہ تعالیٰ نے پیش کیا اور علم النفسیات کی تکمیل کر دی۔

صدیوں سے کئے گئے ریسرچ اور تجربات گواہ ہیں اس بات کے کہ آدمی کبھی بھی اس Behaviour اور عادات کو پیدا نہیں کر سکتا جسے اس نے اول سرے سے دیکھا ہی نہ ہو اور جو عادات اس کے اطراف خاندان سماج میں موجود نہ ہوں، اس کی کمزوریاں اور اس کی Limted Capabilities پورے نظام کو بدلنے یا پھر ایک نئے نظام کو لاکر پہلے سے بنے سسٹم کو ختم کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی؛ لیکن جب دنیائے عرب میں حضور اکرم ﷺ کی پیدائش ہوئی اور جب منصب رسالت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیمات کے ذریعے اس جاہل قوم کے برتاؤ Behaviour کو جس طرح ریفارم کیا وہ ساری دنیا کے لئے روشن مثال ہے، Classical Conditioning, Operant Conditioning, Graded Exposure کے بڑے بڑے دروس ہمیں سیرت میں ملتے ہیں، جس قوم کو شراب سے زیادہ مرغوب اور کوئی چیز نہیں اس قوم کو جب شراب کی حرمت کا حکم ملتا ہے اور آہستہ آہستہ نفسیات کے اصولوں کے عین مطابق برتاؤ میں تبدیلی آتی ہے اور جس دن شراب کے حرمت کی آیت نازل ہوتی ہے تو مدینے کی گلیوں میں شراب بہنے لگتی ہے، جس کے ہاتھ میں قیمتی سے قیمتی اور لذیذ ترین شراب تھی وہ اسے پھینک دیتا ہے اور اس وقت جس کے منھ میں تھی اسے تھوک دیتا ہے۔

جان و مال اور زمین کے چھوٹے چھوٹے حصے کے لئے ایک دوسروں کی جان لینے والے اہل عرب کو جب ایمان کی روشنی ملتی ہے تو نصرت کا نمونہ رہتی دنیا تک قائم کر دیتی ہے، مکے والوں کی نصرت جو مدینے والوں نے کی۔

ان نفسیاتی پہلوؤں کو سب سے پہلے قرآن نے اجاگر کیا؛ لیکن قرآن سے بالکل ناواقفیت یا پھر اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے والے ماڈرن مغربی ماہرین امراض نفسیات اپنی اپنی منطق اور فہم و فراست کے حساب سے تھیوری پیش کرتے چلے گئے، قصص الانبیاء میں ہمیں عصری علم النفس کی وہ ساری تھیوریاں اور نکات مل جاتے ہیں جن پر کئی سالوں کے تجربات کے بعد موجودہ شکل میں انسان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، کچھ تھیوریاں ایسی بھی ہیں جو قرآنی تعلیمات سے بالکل میل نہیں کھاتیں، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کو پیش کرنے والے انسان ہی

ہیں اور انسان کا علم تو محدود ہوتا ہے، کچھ تھیوریاں تو جنم لینے کے کچھ سالوں بعد ہی قدرتی موت مر گئیں، بعض کو بعض ماہرین نے اپنی تنقید کا مرکز بنایا، اگر فرائڈ یا Jung یا کوئی اور ماہر نفسیات قرآن کو کھلے ذہن سے پڑھ لیتا تو آج قرآن بھی Psychology کے Syllabus میں ایک اہم کتاب کے طور پر داخل ہوتی۔

جو تھیوری رہتی دنیا تک قائم رہے گی وہ ہے قرآن کا نظریۂ نفس، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن و حدیث میں پیش کئے ہوئے نفسیاتی تصورات اور ان حقائق کے مطالعے پر توجہ دیں جو انسان کی نفسیاتی زندگی سے متعلق ہیں، اس سے شاید ہم انسان کے بارے میں صحیح اسلامی تصور کو مرتب کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور جسے بنیاد بنا کر علم النفس میں نئی تحقیقات کی جائیں اور بالآخر ان تحقیقات و مطالعات کے مجموعے سے علم النفس کا ایک نیا اسکول وجود میں آجائے، جسے ہم علم النفس کا اسلامی اسکول کہہ سکیں۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن کریم اور علم النفس

ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی⊙

قرآن مجید کا بنیادی موضوع انسان کی ہدایت ہے، کہا گیا: إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (سورۃ الاسراء:۹) اور انسان کی ہدایت کا ایک عنصر اس کی شخصیت کی متوازن تشکیل اور بہترین نشوونما ہے، اور اس مقصود کے حصول میں انسان کی نفسیات ایک اہم موضوع بن کر سامنے آتا ہے؛ کیوں کہ نفسیات کے تانے بانے سے ہی انسان کی فکر ونظر کا لباس تیار ہوتا ہے، جو ایمان وعقیدہ کا مرکز بنے، نفسیات ہی انسان کے سلوک وعمل کی راہیں طے کرتی ہیں، جن کی وجہ سے کوئی اچھا یا برا قرار پاتا ہے، نفسیات کے تحت ہی انسان کار گہہ حیات کی سختیوں، مصائب اور غم وآلام کا سامنا کرنے کے انداز سیکھتا ہے اور نفسیات کی بنیاد پر ہی انسان، انسانی سماج کے اندر روابط استوار کرنے کے طور طریقے اپناتا ہے، اس طرح انسان کی زندگی اور اس کے فکر وعمل میں نفسیات کا رول بڑا وسیع اور عمیق ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں انسان سے خطاب کے اندر اس کی نفسیات کو بہت زیادہ مخاطب بنایا گیا ہے اور نزول قرآن کے سماج میں خصوصیت کے ساتھ انسان کی ہمہ جہتی نفسیاتی تربیت پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے۔

نفسیات یا علم النفس کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے، انسان اپنی ذات کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اپنے خالق کے بارے میں اس کی سوچ وفکر کیا ہے؟ خوشی ومسرت کے موقع پر اس کا طرز عمل کیا ہوتا ہے؟ اور غم ومصیبت آن پڑے تو اس سے کس ردعمل کا اظہار ہوتا ہے؟ اپنے افراد خانہ کے ساتھ وہ کس سلوک کو روا رکھتا ہے اور سماج میں وہ کس کردار کے ساتھ سامنے آتا ہے؟ وہ اپنے ظاہر وباطن کے درمیان کس نوع کا ربط رکھتا ہے؟ انسانی خصلتوں جیسے خوشی، محبت، عفو ودرگذر، باہمی تعاون اور اسی طرح غصہ، انتقام اور نفرت وعداوت کے جذبات کے ساتھ وہ کس طور سے عہدہ برآ ہوتا ہے؟ ان جیسے اُمور میں صحیح اور متوازن کردار اختیار کرنے سے ہی انسانی شخصیت کی

⊙ شعبہ اسلامیات: مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

متوازن تشکیل ہوتی ہے اور وہ خوبیوں سے آراستہ ہوکر ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے، قرآن کریم نے انسان کی ہدایت کے لئے ان تمام نفسیاتی مسائل سے تعرض کیا ہے اور وہ راستے تجویز کئے ہیں جن پر چل کر انسان اپنی شخصیت کی نہ صرف بہترین تعمیر کرسکتا ہے؛ بلکہ جو لوگ کسی وجہ سے نفسیاتی عدم توازن یا بیماری کے شکار ہیں، وہ بھی نسخۂ شفا پا سکتے ہیں۔

قرآن کریم کی درج ذیل آیات ان ہی پہلوؤں کی جانب اشارے کر رہی ہیں :

هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ . (الجاثیۃ:۲۰)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ . (یونس:۵۷)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ . (نحل:۸۹)

انسان کو سرگرمیوں پر آمادہ کرنے والی حرکت بخش قوتوں کا نام 'محرکات' ہے، جدید ماہرین نفسیات نے محرکات کی دو بنیادی قسمیں کی ہیں، عضویاتی محرکات، جو فطری محرکات ہوتے ہیں اور انسان کو آمادہ عمل کر کے عضویاتی ضروریات پوری کرتے ہیں، دوسرے نفسیاتی محرکات جو سماجی نشو و نما کے دوران اکتسابی طور پر پیدا ہوتے ہیں، عضویاتی وظائف انسان اور حیوان کے اہم حیاتیاتی کام انجام دیتے ہیں اور انسانی جسم میں اعتدال کو برقرار رکھنے کے لئے سرگرمیوں پر آمادہ کرتے ہیں، قرآن کریم کی متعدد آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایسی مخصوص صفات اور خصوصیات رکھی ہیں جو اپنے مخصوص اعمال کی انجام دہی پر انھیں آمادہ کرتی ہیں؛ چنانچہ سورۂ طٰہٰ کی آیت نمبر:۵۰ میں ہے: ''رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى'' اور سورۂ انفطار میں ہے: ''الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ''۔ (آیت:۷)

عضویاتی محرکات کے ذریعہ دو اہم کام انجام پاتے ہیں، ایک تحفظ ذات کا کام اور دوسرے بقائے نوع کا کام، سورۂ نحل کی آیات ۸۰ و ۸۱ میں تحفظ ذات کے چند محرکات حرارت، برودت اور الم کی جانب سے اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا :

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّن بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَى حِينٍ ، وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ

تَقِيكُم بَأْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ .

اسی طرح سورۂ توبہ (آیت:۱۲۰) سورۂ نمل (آیت:۱۷-۱۸) سورۂ بقرہ (آیت۱۱۵) اور سورۂ نحل (آیت:۱۱۲) وغیرہ آیات میں تحفظ ذات کے دیگر محرکات جیسے بھوک، پیاس، خوف، تکان اور ضرر کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا گیا ہے، تحفظ ذات کا ایک محرک نیند ہے، قرآن کی متعدد آیات جیسے سورۂ روم (آیت:۲۳) سورۂ یونس (آیت:٦٧) سورۂ غافر (آیت:۲۱) سورۂ نمل (آیت:٨٦) وغیرہ میں اس کا ذکر مختلف انداز سے آیا ہے، اسی طرح بقاءِ نوع کے دو اہم محرکات جنسی محرک اور جذبہ مادری ہیں، ان ہی کے ذریعہ معاشرہ اور قومیں وجود میں آتی ہیں اور زمین آباد ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اول محرک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً . (روم:۲۱)

جذبہ مادری کے محرک کا ذکر دیکھئے کہ :

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَاناً حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهاً وَوَضَعَتْهُ كُرْهاً وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْراً . (الأحقاف:۱۵)

محرکات کی دوسری قسم نفسیاتی ہے، اس قسم کے اندر وہ تمام نفسیاتی اُمور اور روحانی محرکات آتے ہیں، جن کی وجہ سے انسان کو جانور سے امتیاز حاصل ہوتا ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ جدید ماہرین نفسیات نے نفسیاتی محرکات کے مطالعہ میں بیشتر اوقات انسان کی ان مختلف ضروریات پر توجہ دی جو اس کے گرد و پیش کے مخصوص ثقافتی اور سماجی ماحولیات سے تعلق رکھتی ہیں؛ لیکن انسان کے روحانی پہلو اور اس سے پیدا ہونے والی بلند و اعلیٰ انسانی ضروریات کے مطالعہ پر توجہ نہیں دی گئی، دورِ حاضر کے ایک مشہور مسلم ماہر نفسیات و مصنف ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی اپنی کتاب ''قرآن اور علم النفس'' میں لکھتے ہیں :

انسان کو اسی نظر سے دیکھا گیا، جس سے حیوان کو دیکھا جاتا ہے؛ بلکہ حیوانی کردار کے مطالعہ کو انسانی کردار کے فہم کا فطری ذریعہ سمجھا گیا، اور بیشتر اوقات اس بڑے فرق کو نظر انداز کر دیا گیا جو روح کی امتیازی صفت سے آراستہ ہونے کی وجہ سے دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے؛ بلکہ روح کا مطالعہ نفسیاتی تحقیقات کے اندر تقریباً مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔(۱)

(۱) دیکھئے: کتاب مذکورہ:۱۸-۱۹، مطبوعہ قاضی پبلیشرز، دہلی، ۲۰۰۴ء۔

نفسیاتی محرکات کے اندر ایک محرک ملکیت ہے، جسے انسان اپنے سماجی نشوونما کے دوران سیکھتا ہے، اس محرک کی جانب بہت سارے مواقع پر قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے، سورہ آلِ عمران میں ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ . (آیت:۱۴)

سماجی نشوونما میں کبھی انسان محرک سرکشی سیکھتا ہے، قرآن نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے واقعہ میں ابلیس کی سرکشی اور واقعہ ہابیل و قابیل میں قابیل کی سرکشی (سورۂ مائدہ: ۲۷-۳۰) کو بیان کرتے ہوئے اس محرک کی جانب اشارہ کیا ہے، اسی طرح مختلف آیات کے اندر ان عملی سرکشیوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، جن کا اظہار غیبت و بہتان، زبان درازی، گالی گلوج اور مذاق و تحقیر جیسے لفظی اُسلوبوں سے ہوتا ہے، اس کی مثالوں کے لئے دیکھئے سورۂ آلِ عمران (آیت: ۱۱۸) سورہ ممتحنہ (آیت: ۲) سورۂ بقرہ (آیت: ۲۱۲) اور سورہ توبہ (آیت ۸۹) وغیرہ آیات۔

نفسیاتی محرکات میں محرک دین داری ایسا محرک ہے جس کی فطری بنیاد انسان کی تکوینی ساخت کے اندر موجود ہوتی ہے، انسان اپنے نفس کے اندر ایسا جذبہ پاتا ہے جو اسے اپنے خالق کی معرفت حاصل کرنے، اس کی عبادت بجالانے اور مصیبت و پریشانی کے وقت اس کی پناہ حاصل کرنے پر اس کو آمادہ کرتا ہے، قرآن مجید نے اس فطری محرک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللهِ . (الروم:۳۰)

زندگی کے مختلف عوامل جیسے مصائب اور خطرات محرک دینداری کو اُبھارتے ہیں، قرآن نے ان عوامل کی جانب بھی اشارے کئے ہیں، دیکھئے سورۂ یونس (آیت:۲۲) اور سورۂ انعام (آیت:۲۳)۔

بسا اوقات انسان کے اندر کئی محرکات کے درمیان کشمکش پائی جاتی ہے، ایسے موقع پر انسان تردد کا شکار ہو کر کوئی قطعی فیصلہ لینے میں دشواری محسوس کرتا ہے، قرآن کریم نے ایسی نفسیاتی کشمکش کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان لوگوں کا حال بیان کیا ہے جو ایمان کے معاملہ میں غیر یقینی موقف اور شک آمیز رویہ سے دوچار ہوتے ہیں:

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ . (التوبۃ:۴۵)

نیز دیکھئے آیات (۱۴۲-۱۴۳) وغیرہ۔

انسان کے نفسیاتی مسائل میں ایک اہم مسئلہ بعض محرکات پر کنٹرول کا ہے، مثلاً عضویاتی محرکات کی تکمیل

ایک فطری تقاضہ ہے، ان کی آسودگی پر ہی زندگی کا تسلسل اور نوع کی بقاء منحصر ہے، قرآن ان محرکات کو ناپسندیدہ نہیں بتاتا ہے، نہ ان کو کچلنے کا حکم دیتا ہے؛ بلکہ وہ خواہشات پر کنٹرول، ان کی نگرانی اور اسراف وتجاوز سے بچتے ہوئے شریعت کے حدود میں ان کی تکمیل کا حکم دیتا ہے، اس طرح گویا ان خواہشات کی تکمیل کے عمل کو منظم بنایا گیا ہے اور ان کی ایسی درست رُخ بندی کی گئی ہے، جس میں فرد اور سماج دونوں کے مفاد محفوظ رہیں، قرآنی تعلیمات کا مطالبہ ہے کہ فرد ان محرکات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھے، نہ کہ خود محرکات وجذبات فرد پر حاوی ہو جائیں، اس نوع کی چند آیات قرآنی ملاحظہ کیجئے، کھانے پینے کے بارے میں قرآن کہتا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلاَلاً طَيِّباً وَلاَ تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ . (البقرۃ:۱۶۸)

جنسی جذبہ کے بارے میں کہا گیا :

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَى مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ . (النور:۳۲)

اور آگے :

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لاَ يَجِدُونَ نِكَاحاً حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللهُ مِن فَضْلِهِ . (النور:۳۳)

عضویاتی محرکات کی طرح نفسیاتی محرکات پر کنٹرول بھی قرآن کریم نے انسان کو ہدایت دی ہے؛ چنانچہ متعدد مقامات پر جذبہ سرکشی پر کنٹرول کا حکم دیا گیا ہے :

وَلاَ تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ . (المائدۃ:۸۷)

اور : وَلاَ تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ . (الانعام:۱۵۱)

جذبہ ملکیت پر کنٹرول رکھنے کا حکم ان آیات میں دیکھئے :

وَأَنفِقُوا مِن مَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ . (المنافقون:۱۰)

اور : وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ . (التوبۃ:۳۴)

حکمت خداوندی نے محرکات کی طرح ایسے تاثرات سے بھی انسان اور حیوان کو نوازا ہے، جو زندگی اور اس کی بقاء میں معاون بنتے ہیں، محرکات اور تاثرات کے درمیان گہرا تعلق ہے، محرکات عام طور پر وجدانی تاثراتی کیفیت لئے ہوئے ہیں، نیز محرک کی طرح تاثر بھی عمل کی رُخ بندی کرتا ہے، جیسے تاثر خوف انسانی کو خطرہ سے بچاؤ پر آمادہ کرتا ہے، غصہ کا تاثر جان کی حفاظت پر آمادہ کرتا ہے اور بسا اوقات سرکشی پر بھی آمادہ کردیتا ہے، محبت کا تاثر

اپنے محبوب کے تقرب پر آمادہ کرتا ہے، خوف، غصہ، محبت، خوشی، ناپسندیدگی، غیرت، حسد، شرم وحیا اور رسوائی جیسے متعدد تاثرات کی باریک تصویر کشی قرآن مجید میں ملتی ہے، خوف انسانی زندگی کا ایک اہم تاثر ہے، وہ جہاں دنیاوی زندگی کے اندر انسان کو درپیش خطرات سے بچاؤ پر آمادہ کرتا ہے، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ مومن کو آخرت میں اللہ کے عذاب سے محفوظ رہنے پر آمادہ کرتا ہے، سورۂ سجدہ میں ہے :

تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفاً وَطَمَعاً وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ . (آیت:۱۶)

قرآن نے خوف کی مختلف قسموں جیسے اللہ کا خوف، موت کا خوف اور فقر وفاقہ کے خوف کے بارے میں ذکر کیا ہے اور ان تاثرات کے ساتھ دینی رہنمائی بھی دی ہے، انسانی کردار پر غصہ کے اثرات کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ میں ملتا ہے، جب سامری کے بہکانے سے بنی اسرائیل کے گاؤپرستی کرنے پر وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام پر غصہ ہوئے، عام حالات میں غصہ پر قابو رکھنے کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا :

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ .

(آل عمران:۱۳۴)

محبت ایک ایسا تاثر ہے جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، جیسے اپنی ذات سے محبت، آل وآولاد سے محبت، لوگوں سے محبت، مال ودولت سے محبت اور گھربار سے محبت وغیرہ، قرآن ان سب میں اعتدال رکھنے کا حکم دیتا ہے :

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهِ . (التوبۃ:۲۴)

محبت کی سب سے اعلیٰ شکل اللہ رب العزت کے ساتھ محبت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہے، قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ . (المائدۃ:۵۴)

اسی طرح خوشی ونفرت، حسد وحیا اور رسوائی وغیرہ تاثرات کے بارے میں قرآن میں جگہ جگہ آیات وارد ہیں، قرآن مجید میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ ان تاثرات کے موقع پر انسانی جسم میں کس قسم کے عضویاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، ایک آیت ملاحظہ کیجئے :

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ، هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالاً شَدِيداً . (الاحزاب:۱۰-۱۱)

لیکن قرآن کی اصلی تاکید ان تاثرات کے معتدل استعمال اور ان پر کنٹرول کی بابت ہے؛ کیوں کہ ان میں اسراف انسان کی جسمانی ونفسیاتی صحت کے لئے ضرر رساں ہے، جسمانی ونفسیاتی طب کی جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی انفعالی کیفیت میں اضطراب بہت سے جسمانی امراض پیدا ہونے کا اہم سبب ہوتا ہے اور ان مریضوں کو کسی طبی علاج کی نہیں ؛ بلکہ درحقیقت نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے اور یہ بات اب صاف ہوگئی ہے کہ ان مریضوں کے لئے سب سے بہترین نسخہ قلق و بے چینی سے گلوخلاصی ہے، اس تناظر میں دیکھئے کہ قرآن مجید نے لوگوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے تاثرات پر کنٹرول رکھیں ، اس میں صحت کے جو بے شمار فوائد ہیں ان کی تفصیلی واقفیت موجودہ دور میں حاصل ہورہی ہے۔

تاثرات پر کنٹرول کے لئے قرآن نے انسان کی ذہن سازی کی ہے اور اس کی ایسی فکری تربیت پر توجہ دی ہے، جس کے بعد انسان کے لئے ان تاثرات کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھنا آسان ہوجاتا ہے، چنانچہ قرآن نے موت کے خوف پر کنٹرول کے لئے بار بار بتایا کہ موت اٹل حقیت ہے وہ اپنے وقت پر آکر رہے گی ،فقر کے خوف سے روکتے ہوئے قرآن نے بہ تاکید بتایا کہ اللہ رزاق ہے (الذاریات: ۵۸) اور اس نے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری لے رکھی ہے (ہود:۱۲) غصہ پر کنٹرول سکھاتے ہوئے قرآن تعلیم دیتا ہے کہ :

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ . (حم السجدۃ:۳۴)

اسی طرح دیگر تاثرات جیسے غرور و گھمنڈ کی ممانعت ، آنے والی آفات ومصائب پر صبر ، نیز شہرت و جاہ اور کامیابی پر خوشی وغیرہ میں اسراف سے بچنے اور اعتدال اختیار کرنے کی تعلیم قرآن نے دی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ پر سچا ایمان ، اس کے قرآنی منہج کی اتباع اور رسول اکرم ﷺ کے طریقہ کی پیروی انسان کے اندر پختہ عزم اور قوت ارادی پیدا کرتی ہے جو تاثرات پر ضبط و کنٹرول میں معاون بنتی ہے، سچا مومن صرف اللہ سے خوف کھاتا ہے، وہ نہ موت سے ڈرتا ہے، نہ خطر سے خوف کھاتا ہے، نہ لوگوں کا اندیشہ کرتا ہے اور نہ کائنات کی کسی اور شئے کا خدشہ اس کے اندر ہوتا ہے، وہ اپنے غصہ کو دباتا ہے، معمولی باتوں پر برانگیختہ نہیں ہوتا ہے، صرف اس چیز پر ناراض ہوتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہو، وہ غم پر ضبط کرتا ہے کہ جو کچھ مصیبت بھی اسے پہنچ رہی ہے، اللہ کے یہاں وہ پہلے سے مقرر ہے، وہ تواضع

پسند ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ اپنی حیثیت سے پوری طرح آشنا ہوتا ہے، نہ غرور و گھمنڈ کرتا ہے، نہ فخر و بڑائی کا اظہار۔

نفسیات کا ایک موضوع ادراک حسی ہے، قرآن کریم میں انسانی حواس کا تفصیلی تذکرہ مختلف سیاق میں کیا گیا ہے، سماعت، بصارت اور جلد حواس کی دقیق باریکیوں کی جانب چشم کشا اشارے ملتے ہیں، دائرہ حواس سے خارج بھی ایک ادراک حسی ہے، جیسے Extra Sensory Perception کا نام دیتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ ارشاد اسی نوع کے ادراک حسی کی ایک مثال ہے :

ولما فصلت العير قال أبوهم اني لأجد ريح يوسف . (یوسف:۹۴)

انسان کی تعلیم و تعلم میں نقل اور تقلید کا اہم رول ہوتا ہے، اس لئے تعلیم کے اندر اسوۂ حسنہ کی بہت اہمیت ہے، قرآن کہتا ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ . (الاحزاب:۲۱)

تعلم کے اندر محرک کی بھی بڑی اہمیت ہے، اگر کسی مخصوص مقصد کے حصول کا محرک موجود ہوتو مطلوبہ جدو جہد صرف کرنے پر انسان تیار ہو جاتا ہے، قرآن نے عقیدہ توحید کی دعوت دیتے ہوئے ترغیب و ترہیب کے ذریعہ محرکات کو اُبھارا ہے، اسی طرح محرک تعلم کو اُبھارنے کے لئے قرآن کریم نے قصوں سے ایک اہم وسیلہ کا نام لیا ہے :

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِيْ الْأَلْبَابِ . (یوسف:۱۱۱)

محرک کو اُبھارنے کے لئے ایسے واقعات اور حوادث کا سہارا لیا ہے جو عبرت پذیری کے لئے پیش آرہے تھے :

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئاً وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِيْنَ . (التوبۃ:۲۵)

اسی مقصد کے لئے قرآن نے تکرار کا اُسلوب بھی اختیار کیا ہے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کے اندر زبردست روحانی قوت ہے، نفس انسانی پر اس کی اثر انگیزی بہت طاقتور ہے، وہ پورے وجود کو جھنجھوڑ دیتا ہے، احساس و شعور میں زلزلہ پیدا کر دیتا ہے، روح کو شفاف بنا دیتا ہے، فکر و ادراک کو بیدار کر دیتا ہے، بصیرت میں جلا پیدا کر دیتا ہے، قرآن کی اثر انگیزی کے بعد ایک نیا انسان سامنے آتا ہے، گویا اس کی نئی تخلیق ہوئی ہو۔

جدید معاشروں کے اندر اچھے شہری تیار کرنے کے لئے تعلیم و تربیت اور رہنمائی کے میدانوں میں باوجودیکہ زبردست کوششیں صرف کی جارہی ہیں؛ لیکن اچھے شہریوں کی تیاری میں ان کوششوں سے مطلوبہ نتائج

سامنے نہیں آرہے ہیں، تمام معاشروں کے اندر بڑھتے ہوئے جرائم اور پھیلتی ہوئی انارکی و بے راہ روی اچھے شہریوں کی تیاری میں جدید اسالیب کی ناکامی کی واضح دلیل ہیں، اسی طرح نفسیاتی امراض کے شکار لوگوں کے نفسیاتی علاج کے میدان میں بھی کافی کوششیں ہورہی ہیں؛ لیکن مطلوبہ نتائج کے حصول میں وہ ناکام ہیں، اسی لئے جدید ماہرین نفسیات نفسیاتی صحت اور نفسیاتی امراض کے علاج میں دین و مذہب کی اہمیت کا اعلان کررہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اللہ پر ایمان کے اندر ایسی غیر معمولی طاقت ہے، جو دین دار شخص کو روحانی طاقت عطا کرتی ہے، جو مشکلات زندگی برداشت کرنے میں معاون بنتی ہے، اور اس اضطراب سے محفوظ رکھتی ہے جو مادیت کے دور دورہ والے اس زمانے میں بیشتر لوگوں کو پیش آتے ہیں، امریکی فلسفی و ماہر نفسیات ولیم جیمس نے اعلان کیا کہ ''قلق و اضطراب کا بلاشبہ سب سے اچھا علاج ایمان ہے'' اس کا جملہ ہے :

> ہمارے اور اللہ کے درمیان نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے، اگر ہم اپنے آپ کو اس کی نگرانی میں دے دیں تو ہماری تمام طاقتیں اور آرزوئیں مکمل ہوجائیں۔(۱)

محلل نفسی (A.A.Brill) کہتا ہے :

> دین دار شخص بلاشبہ کبھی بھی نفسیاتی مرض کا شکار نہیں ہوتا ہے۔(۲)

ماہر نفسیات کے علاوہ عصر حاضر کے بے شمار مفکرین اس بات کا اعتراف کرچکے ہیں کہ موجودہ انسان کا بحران دین اور روحانی اقدار سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

مذاہب کی تاریخ اور بالخصوص دین اسلام کی تاریخ کا مطالعہ پورے دلائل کے ساتھ بتاتا ہے کہ اللہ پر ایمان، امراض نفس سے شفایابی، امن وسکون کا احساس پیدا کرنے اور شعور وقلق سے تحفظ عطا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نفسیاتی علاج عموماً اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب نفسیاتی مرض پیدا ہوچکا ہوتا ہے؛ لیکن ایمان باللہ بچپن کے جس لمحہ سے انسان کے نفس میں آتا ہے، نفسیاتی امراض سے تحفظ اور دفاع کی قوت عطا کردیتا ہے :

> الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا إِيْمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَـئِكَ لَهُمُ الأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُوْنَ . (الانعام:۸۲)
>
> حقیقت میں تو امن ان ہی کے لئے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔

⊙ ⊙ ⊙

---

(۱) دیکھئے: قرآن اور علم النفس:۳۹۲۔ (۲) دیکھئے: قرآن اور علم النفس:۳۹۳۔

قرآن کریم اور ماحولیات

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ⊙

ہم جس زمین پر رہتے بستے ہیں اور چلتے پھرتے ہیں وہ قدرت کا ایک عظیم عطیہ ہے، کائنات کے تمام کروں میں اور نظام شمسی کے جملہ سیاروں میں زمین ہی ایک ایسی تخلیق ہے جس پر عقل مند، باشعور، ذمہ دار اور تعمیر وترقی کا ذہن رکھنے والے جاندار کی دنیا آباد ہے، باقی دوسرے کرے انسانی آبادی؛ بلکہ زندگی سے محروم ہونے کے باعث تعمیر وترقی اور منصوبہ بندی کی نعمتوں سے محروم ہیں اور اس نظام حسن سے بھی عاری ہیں جو روئے زمین کو حاصل ہے،اس زمینی دنیا کوقدرت نے بہت سی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے،سمندر، دریا، جھیل، پہاڑ، صحرا، باغات، جنگلات ،نباتات، پرندے جانور حشرات اوران کی ان گنت تجلیات زمیں کی قدر وقیمت میں اضافہ بھی کرتی ہیں اوراس کے حسن وخوبصورتی اور رنگ ورونق کودوچند بھی کرتی ہیں ،قدرت کی بوقلمونی اورزمین کی رنگارنگی کا تعارف قرآن پاک نے متعدد جگہوں پر دل نشیں اور موثر طریقہ سے کرایا ہے،ایک جگہ ارشاد ہے۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ، تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ . (سورۂق:۷،۸)

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں ہم نے پہاڑ ڈالے اور ہر قسم کی رونق کی چیز جوڑے کی شکل میں اُگائی ،بصیرت اور یاد دہانی کے لئے ہر اس بندے کے واسطے جو رجوع کرنے والا ہو۔

زمین کی روئیدگی، پاکیزگی، بوقلمونی، زرخیزی اور خوبصورتی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرعد میں فرمایا ہے :

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَاراً وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ

⊙ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

يَتَفَكَّرُونَ ، وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ . (الرعد:۳-۴)

وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور ندیاں بنائیں اور ہر طرح کے پھل سے دو قسم کے جوڑے پیدا کئے، وہ دن پر رات کو ڈھانکتا ہے، بے شک اس میں نشانیاں ہیں سوچنے والی قوم کے لئے اور زمین میں قطعات ہیں باہم متصل اور انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ دوسرے سے ملی ہوئی اور بعض مختلف، حالانکہ وہ ایک ہی پانی سے سیراب ہوئی ہیں اور ہم ان میں سے بعض کو بعض پر لذت میں بڑھا دا دیتے ہیں، بے شک اس میں نشانیاں ہیں عقل رکھنے والی قوم کے لئے۔

زمین کو جو چیز زندہ کرتی ہے، اسے سرسبز و شاداب بناتی ہے اور اس میں غلے اناج اور پھل پھول اُگاتی ہے وہ آسمان کا برستا ہوا پانی ہے، بادلوں کی گردش، سفید اور بھورے رنگ کی چادروں کا آسمان میں تیرنا، رم جھم برسنے والا پانی زمین کی حرارت اور گرمی کی شدت کو کم کر کے موسم کو خوش گوار اور ماحول کو معتدل بناتا ہے وہ اپنے آپ میں خود ایک دل فریب اور فرحت بخش منظر رکھتا ہے، انسان اس منظر کو دیکھتا اور نہائے ہوئے درختوں اور مسکراتے ہوئے پودوں کی طرح دل و دماغ میں فرحت انبساط کی لہریں محسوس کرتا ہے، قرآن پاک اس عظیم ماحولیاتی نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ان لفظوں میں دلاتا ہے :

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِن جِبَالٍ فِيهَا مِن بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَن مَّن يَشَاءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ . (النور:۴۳)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کو چلاتا ہے پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے، پھر ان کو تہ بہ تہہ کر دیتا ہے پھر دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل کر برس رہا ہے اور آسمان میں جو ادلوں کے پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے، پھر جس پر چاہتا ہے، برساتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا دیتا ہے اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر کے بینائی کو اُچک لیجاتی ہے۔

انسان کی معاشی ضروریات کی تکمیل میں زمین کے ساتھ دریا اور سمندر بھی جڑ جاتے ہیں انسان زمین سے غلے اور پھل حاصل کرتا ہے تو سمندر سے مچھلیاں اور خورد و نوش کی دیگر اشیا برآمد کرتا ہے، خورد و نوش کے علاوہ جس طرح وہ پہاڑوں اور پتھروں سے ہیرے جواہرات حاصل کرتا ہے، اسی طرح سمندروں سے مونگے اور موتی برآمد کرتا ہے، سمندر کی پناہ فیضی انسان کی رزق رسانی کا ذریعہ بھی ہے اور انسانی ماحول میں زیب و زینت کے اضافہ کا سبب بھی ہے، علاوہ ازیں اس کا نظارہ نہایت ہی حسین اور دل کش ہوتا ہے۔

قرآن پاک اس کی منظر کشی اس طرح کرتا ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوْا مِنْهُ لَحْماً طَرِيّاً وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ . (النحل:۱۴)

اور وہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے قابو میں کر دیا تا کہ اس میں سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ، اور اس سے زیور نکالو جسے تم پہنتے ہو، اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں دریا میں پانی کو پھاڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں، اور اس لئے بھی کہ تم اس کا فضل تلاش کرو تا کہ تم شکر گذار بنو۔

انسانی آبادی میں معاشی اور ماحولیاتی اعتبار سے حیوانات اپنا مستقل افادی نظام رکھتے ہیں، وہ انسانوں کی خوراک اور پوشاک کا بھی ذریعہ ہیں اور نقل و حمل سواری اور بار برداری کے بھی کام آتے ہیں، انسانوں نے جو تیز رفتار گاڑیاں بنائی ہیں ان سے ماحول میں کثافت اور آلودگی پھیلتی ہے، مگر قدرت کی بنائی ہوئی سواریاں کثافت سے پاک ہیں، اس افادی پہلو کے علاوہ حیوانات کا جمالیاتی پہلو بھی حسین ہے، صبح کو چراگاہ میں ہمکتے ہوئے جانور اور شام کو گھر لوٹتے ہوئے مویشی فطری دل کشی اور خاموشی کا سامان رکھتے ہیں، قرآن پاک اس معاشی اور جمالیاتی زندگی کا تعارف یوں کراتا ہے :

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ ، وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُونَ ، وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ ، وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ. (النحل:۵-۸)

اور اللہ نے چوپایوں کو تمہارے لئے پیدا کیا، ان میں تمہارے لئے جڑاول اور بہت

سے فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور جب شام کو جنگل سے انھیں لاتے ہو اور صبح کو چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری رونق اور شان ہے اور وہ تمہارے بوجھ اُٹھا کر لے جاتے ہیں ان شہروں تک جہاں تم مشقت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے ، بے شک تمہارا رب بڑا شفیق و رحیم ہے اور اسی نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے ؛ تا کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہارے لئے زینت بھی ہیں اور وہ دیگر سواریاں بھی پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔

غرضیکہ قدرت نے انسانوں کو زمین پر آباد کیا تو ان کے خورد ونوش ،لباس و مکان اور ضروریات زندگی کا سارا سامان اسی زمین میں رکھ دیا اور ارشاد فرمایا :

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِى الْأَرْضِ جَمِيْعاً ۔ (البقرۃ:۲۹)

اس اللہ نے تمہارے لظم کی تمام چیزیں زمین میں پیدا کردی ہیں۔

انسانوں کا م اپنی محنت اور بصیرت سے ان نعمتوں کو تلاش کرنا ،ان کو استعمال میں لانا اور رب کریم کا شکر ادا کرنا ہے جیسا کہ ارشاد ہے :

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِى الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ ۔

(الاعراف:۱۰)

بے شک ہم نے تم کو زمین میں آباد کیا اور اس میں تمہارا معاش بھی رکھ دیا مگر تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

شیخ سعدی شیرازی نے قدرت کی ان نعمتوں اور ان کے مقاصد کی ،اس طرح وضاحت کی ہے :

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بخوری و بغفلت نہ بری

بادل و ہوا اور چاند و رسورج سب کے سب تمہارے کام میں لگے ہوئے ہیں تا کہ تم روزی کماؤ اور غفلت سے ان کو برباد نہ کرو۔

زمین اور اس کے ماحول کی بوقلمونی ،مناظر قدرت کی رنگا رنگی اور حیاتیاتی تنوع صرف اپنے استعمال کی انسانوں کو دعوت نہیں دیتی ؛ بلکہ ان کے پیچھے پوشیدہ اسرار و رموز کو سمجھنے اور ان کو مظاہر عمل میں لانے کی دعوت دیتی ہے ،موجود کے ذریعہ غائب تک کی رہنمائی کرتی ہے ،ظاہر کے ذریعہ باطن کی کھوج کا سبق سکھاتی ہے اور ایجادات

واکتشافات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے یعنی یہ عالم موجود وشہود عالم غیب کی تسخیر کی تمہید بن جاتا ہے :

ہستی حاضر کند تفسیر غیب
می شود دیباچہ تسخیر غیب

کائنات کے پوشیدہ رازوں کو سمجھنے کی تمنا مخفی خزانوں کی دریافت کی آرزو اور ان کو انسانی دسترس میں کرنے کی امنگ فطری ہے اور ہمیشہ سے انسان کی اس دھن نے فطرت کے عطا کردہ خام مواد کو پختہ مفید اور حسین منظر نامہ میں تبدیل کیا ہے بقول علامہ اقبالؒ :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیانان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

مگر قرآن یہاں تعلیم دیتا ہے کہ قدرت کے عطیات سے استفادہ قوانین فطرت کے مطابق ہی ہونا چاہے، جس طرح انسانوں کی بنائی ہوئی مشینوں اور آلات سے استفادہ کمپنی کے جاری کردہ مینول (ہدایات) کے مطابق کیا جاتا ہے، جب انسان کائنات کے خزانوں سے استفادہ قوانین فطرت کے مطابق کرتا ہے تو اپنی بقا اور ارتقا کے ساتھ زمین کی افادیت، ماحول کی زینت اور کائنات کی ترقی میں اضافہ کرتا ہے، مگر جب وہ قدرت کے قوانین کو نظر انداز کر کے نفس پرستی، استحصال اور بے اعتدالی کا مظاہرہ کرتا ہے تو نہ صرف قدرت کے عطیات کو بگاڑتا ہے؛ بلکہ خود اپنے ماحول کا توازن بگاڑ دیتا ہے جس کا وبال اسے دنیا ہی میں بھگتنا پڑتا ہے، پھر یہی تسخیر اس کے لئے زنجیر بن جاتی ہے اور دریافت مشکلات کا سبب بن جاتی ہے؛ اسی لئے قرآن مطالبہ کرتا ہے کہ انسان ان نعمتوں کا استعمال کرے، استحصال نہ کرے، کائنات کی افادیت اور زینت میں اپنے حسن عمل سے اضافہ کرے، بگاڑ اور فساد برپا نہ کرے، تعمیر پسند بنے، تخریب کاری نہ کرے اور اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کو فراموش نہ کرے، ارشاد ہے :

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْراً لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ . (النحل:۳۰)

جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے قرآن میں کیا نازل کیا ہے، تو کہتے ہیں کہ بہترین چیز، جو لوگ اچھا کام کرنے والے ہیں ان کے لئے اس دنیا میں بھی اچھائی ہے اور آخرت کا گھر تو بہت ہی اچھا ہے، اور متقیوں کا گھر بہت خوب ہے۔

اس وقت دنیا میں جو آفتیں، بیماریاں، ماحولیاتی آلودگی اور حیاتیاتی عدم توازن کی شکل میں نظر آتی ہیں ان میں سے بیشتر خود انسانوں کی بے اعتدالی اور استحصالی ذہنیت کا نتیجہ ہیں جن کو قرآن پاک نے ''فساد فی الارض'' سے تعبیر کیا ہے، فساد فی الارض کی ایک شکل تو وہ ہے جو انسان باہمی جنگ و جدال کے ذریعہ انسانی آبادی میں فساد برپا کرتا ہے، اور دوسری شکل یہ ہے کہ اپنے غیر ذمہ دارانہ عمل سے کائنات کے توازن میں لگاڑ پیدا کرتا ہے، قرآن پاک کہتا ہے :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ . (الروم:۴۱)

خشکی اور سمندر میں فساد برپا ہو گیا لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے تاکہ وہ باز آجائیں۔

فساد کی بعض شکلیں

یوں تو فساد کی بہت شکلیں ہمارے سامنے ہیں جو ماحول میں بگاڑ کا ذریعہ بن گئی ہیں، مگر ان میں صرف چند کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :

آکسیجن گیس لکڑیوں اور دیگر چیزوں کو جلانے اور حیوانات کے سانس لینے میں صرف ہوتی ہے اسے پیڑ پودے خارج کر کے فضا میں منتشر کرتے ہیں، دوسری طرف کاربن ڈائی آکسائڈ حیاتیاتی فضلہ کی شکل میں خارج ہوتی ہے جسے پیڑ پودے جذب کر کے آکسیجن میں منتقل کرتے ہیں اس طرح آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کا گشتی نظام توازن اور فطری رفتار سے انسانی مداخلت کے بغیر ماضی میں جاری رہا، مگر اٹھارہویں صدی میں صنعتی انقلاب کے بعد جو مشینیں ایجاد ہوئیں، کارخانے بنے ان میں خرچ ہونے والے کوئلہ ڈیزل اور پٹرول نے اس توازن کو بگاڑ دیا، آکسیجن میں بتدریج کمی ہونے لگی اور زہریلی کاربن ڈائی آکسائڈ کا اضافہ ہوتا رہا اس کے نتیجہ میں شہروں میں گھٹن کا احساس عام ہو گیا، زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ ہوا ماحولیاتی عدم توازن پیدا ہوا، ان کارخانوں اور مشینوں نے صرف فضا کو ہی آلودہ اور زہرناک نہیں کیا؛ بلکہ دریاؤں، ندیوں اور آس پاس کے پانی کے ذخائر کو بھی زہرناک کر دیا، مثال کے طور پر بھارت کے شہر کانپور میں پانچ ہزار فیکٹریاں اور کارخانے ہیں، جن کے فاسد مادے، فضلات کان پور سے گذرنے والی گنگا ندی کو بھی پوری طرح زہر آلود کر چکے ہیں کان پور میں گنگا کی چوڑائی سب سے کم ہے، فیکٹریوں کے فضلات نے پانی کے بہاؤ اور فطری رنگ و بو کو بدل دیا ہے، اس سے سیراب ہونے والے چرند و پرند، کھیتی غلے سبزیاں پھل پھول میں کثافت سرایت کر رہی ہے، جس کے نتیجہ میں تنفس اور جلد کی متعدد

بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، یہ سب فساد ہی کی شکل ہے اور انسانی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے۔

ماحول اور معاشرہ میں کثافت و آلودگی پیدا کرنے والی موٹر گاڑیاں اور دخانی سواریاں بھی ہیں جس کا زہریلا دھواں شہر شہر اور قصبات تک کو آلودہ کر رہا ہے، ڈیزل پٹرول اور کیروسین کی کثافت نے بہت سے انسانوں کو قلبی اور جلدی امراض کا شکار بنایا ہے، اس کے باوجود گاڑی بنانے والی کمپنیاں ضرورت اور ماحول کا لحاظ کئے بغیر محض صارفیت کے نقطہ نظر سے اور دولت کمانے کے جذبہ سے بے تحاشا گاڑیوں کی پیداوار میں اضافہ کر رہی ہیں، بڑے شہروں میں پٹرول اور ڈیزل سے نکلنے والے دھویں کے نقصانات پر قابو پانے کے لئے ایندھن کی تلاش سی این جی یعنی کاپر لیڈ نیچرل گیس کی شکل میں کی گئی ہے اور بڑے شہروں میں سی این جی کی گاڑیوں کا اژدھام ہے، مگر حالیہ تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ سی این جی سے فضا میں لیڈ یعنی سیسہ کی مقدار بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے دماغ اور جگر کی بیماریوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور بچوں کے ذہنی نشو و نما پر اثر رہا ہے، اس پر قابو پانا از حد ضروری ہے، اسی صارفیت پر مبنی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بھارت میں دواوں کی مارکیٹ میں آج لگ بھگ ۵۰۰ کیمیکل موجود ہیں اور ان کے امتزاج و ترکیب (Combination) سے دوا ساز کمپنیاں پچیس ہزار سے زائد دوائیں پیدا کرتی ہیں اور یہ سب انسانوں کے معدہ اور جگر تک پہونچتی ہیں اور فائدہ سے زیادہ نقصان کا ذریعہ بنتی ہیں، WHO کے تخمینہ کے مطابق ۳۰ تا ۳۵ کیمیکل اور ان کے امتزاج سے بنائی گئی ادویات علاج کے لئے کافی ہیں، ان زائد از ضرورت دواؤں کو مارکیٹ میں لانے کا مالی فائدہ کمپنیاں اُٹھاتی ہیں اور ان کا مالی بوجھ اور جسمانی نقصان انسانوں کو اُٹھانا پڑتا ہے۔

تقریباً یہی معاملہ بین الاقوامی سطح پر نیوکلیر پاور پلانٹ کا بھی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ پلانٹ صاف ستھری توانائی کا ذریعہ ہیں؛ کیونکہ یہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور سلفر جیسے ہلاکت خیز مادے ہوا میں نہیں چھوڑتے، تخمینہ یہ بتاتا ہے کہ نیوکلیر پلانٹ (۱۶۴) ملین میٹرک ٹن کاربن (2,46) ملین ٹن نائٹروجن اکسائیڈ اور (۵) ملین ٹن سلفر آکسائیڈ کی کثافت سے ماحول کو بچا سکتے ہیں؛ لیکن پاور پلانٹ کی وجہ سے جو حادثات رونما ہوئے ہیں ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ۱۹۸۶ میں چرنوبائل نیوکلیر پلانٹ حادثہ اور اس کے تیس کلومیٹر علاقہ کی ماحولیاتی آلودگی کو انسانی زندگی کے لئے بڑا خطرہ سمجھا جاتا ہے، تحقیقات نے عیاں کر دیا ہے کہ CS-137 تابکاری زمین کی تہہ میں پہنچی اور زیر زمین پانی کو آلودہ کر دیا، جس کی وجہ سے Cauiferous پودوں اور جانوروں کا نقصان ہوا، Cesium کے مہلک اثرات نے ۵۰ ملازمین اور ۱۸ سال سے کم کے ۹۰ بچوں کی جان لی UNCSEAR کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۸ ہزار بچوں کو تھائی رائڈ کینسر ہوا، ۲۰۳۶ء تک یہ مرض بارہ ہزار پانچ سو افراد تک بڑھنے کا اندیشہ ہے۔

یہ بات قابل تسلیم ہے کہ تعمیر وترقی کا جو بھی منصوبہ بنایا جائے گا، اس میں دنیا کے مادی وسائل کا استعمال ہوگا، جہاں فائدے ہوں گے وہاں بعض پہلوؤں سے نقصان بھی ہوگا، مگر یہ بات کسی حد تک قابل قبول نہیں کہ انسان اپنی بدنیتی اور بدعلمی کی وجہ سے ایک یا چند ہوشیار افراد کے منافع کی خاطر دوسرے انسانوں کو مہلک بیماریوں میں مبتلا کردے اور خطرات سے دوچار کردے یا مادی وسائل کے استعمال میں اسراف بے اعتدالی اور استحصال سے کام لے کر آسمانی آفتوں زمینی بلاؤں اور جغرافیائی یا موسمی مصیبتوں کو دعوت دے، قرآن نے اس سے ان لفظوں میں روکا ہے :

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ۔ (الاعراف:۵۶)

اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد بگاڑ پیدا نہ کرو۔

انسانی ماحول میں آلودگی پیدا کرنے کا ذریعہ انسانی اعمال کے ساتھ انسانی عقائد اور مذہبی تصورات، سماجی رسوم بھی ہیں، ارض وطن بھارت میں ہندو حضرات ابھی تک اپنے مردوں کی لاشوں کو ٹھکانہ لگانے کا معقول طریقہ اپنا نہیں سکے، وہ روایتی طور پر اپنے مردوں کی لاشوں کو کسی دریا، ندی، تالاب یا جھیل کے کنارے جلاتے ہیں، اس کے بعد جلی ہوئی لاش کے اجزاء اور راکھ کو پانی میں بہادیتے ہیں، مردوں کو جلانے کی وجہ سے فضاء میں آلودگی پیدا ہوتی ہے اور جلی ہوئی لاش کے اجزاء اور راکھ کو پانی میں بہانے کی وجہ سے پانی میں آلودگی ہوتی ہے، مردوں کو جلانے کی رسم دوہری کثافت کے پھیلنے کا موجب بنتی ہے، اس سے پانی اور خشکی کے جاندار متاثر ہوتے ہیں، چند سال پہلے کی بات ہے، ایک شخص نے بازار سے مچھلی خریدی، گھر لاکر مچھلی کو تراشا تو اس کے حلق میں انسان کا پنجہ پھنسا ہوا ملا، یہ مچھلی اس ندی سے شکار کی گئی تھی جس کے کنارے مردوں کو جلادیا جاتا ہے، ادھ جلی لاش ندی میں بہادی گئی جو مچھلیوں کی غذا بنی اور ایسی مچھلیاں انسانوں کی غذا بنیں، اس کے برخلاف قرآن کریم نے انسانی لاش کو دفن کرنے کا جو معقول اور مہذب طریقہ بنایا ہے، اس کی وجہ سے انسانی جسم مٹی میں مل جاتا ہے اور اس کا جز بن کر زمین کی قوت میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

آلودگی کی بدترین شکل جس میں خاص طور پر ہندوستانی سماج مبتلا ہے، وہ روزمرہ کے استعمال اور خوردونوش کی اشیاء میں ملاوٹ کی کثافت ہے، اس آلودگی نے صحت عامہ اور انسانی جانوں کو شدید خطرات سے دوچار کردیا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام حلال، پاکیزہ، صاف اور صحت بخش چیزیں انسانوں کے لئے بنائی ہیں جو انسانوں کی تندرستی اور ترقی کا ذریعہ ہیں، مگر قدرت کی اس پاکیزہ رزق رسانی میں انسان اپنے حقیر ذاتی مفاد اور مالی منفعت کی خاطر مداخلت کرتا ہے اور پاک وصاف غذاؤں میں نقلی اور گھٹیاں چیزوں کی ملاوٹ کر کے ان کو زہرناک اور آلودہ بنادیتا ہے۔

چاول، دال اور چنا میں سنگ ریزوں کی آمیزش، سرخ مرچ میں اینٹ کے سفوس کی آمیزش، سیاہ مرچ میں پپیتے کے بیج کی آمیزش، گھی تیل میں چربی اور زہریلے سیاہ مادے کی آمیزش، شہد میں گڑ کے شیرہ کی آمیزش، دواؤں میں نقلی دوا کی آمیزش، انسانی صحت کے لئے کیا کم خطرناک تھی کہ اب گندی اور ناپاک چیزوں کی آمیزش بھی اجناس اور طعام میں عام ہوگئی ہے، گذشتہ دنوں اتر پردیش کے بلند شہر میں پولیس کے چھاپہ کے ذریعہ مقامی پیٹے کے گودام سے گھوڑے کی لید کوئنٹل سے زیادہ کی مقدار میں پائی گئی، اس لید کو سکھا کر اور کیمیکل کے ذریعہ بدبو ختم کر کے دھنیے میں ملا کر بیچا جاتا تھا، یہی لید انسانوں کے کھانوں میں شامل ہوکر انسانی جسم و جان کا حصہ بنتی تھی، اس طرح کی شکایات ہر شہر میں عام ہیں، چند ہوشیار اور ساہوکار لوگ اس ناپاک دھندے سے جڑے ہیں، اگر آلودگی کو سختی سے روکا نہیں گیا تو اس کا وبال معاشرہ کو مدتوں بھگتنا ہوگا۔

⊙ ⊙ ⊙

ماحولیات سے متعلق قرآن مجید کی تعلیمات

ڈاکٹر محمد شہاب الدین سبیلی ⊙

انسان نے جس تیزی سے اپنے وسائل زندگی میں اضافہ کیا، اس نے اس تیزی سے ان وسائل کو استعمال کرنے کا ہنر نہیں سیکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج انسان کئی ماحولیاتی مسائل میں گھرا ہوا ہے، جو اس کی موجودہ اور آئندہ دونوں زندگیوں کے لئے خطرناک ہیں، ان ماحولیاتی خطرات سے بچنے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے کہ انسان اپنے رویے میں تبدیلی لائے اور خدا کے بنائے ہوئے اُصول زندگی اور قدرتی نظام پر چلے۔

ماحولیات سے مراد وہ تمام قدرتی اور کائناتی حقائق ہیں جن سے انسان متاثر ہوتا ہے یا انسان ان کو متاثر کرتا ہے، ماحولیات کی سب سے زیادہ مشہور تعریف یہ ہے: ''ماحولیات ان حالات، وسائل اور تعاملات کے مجموعہ کا نام ہے، جو اس مقام پر وقوع پذیر ہوتے ہیں جہاں زندگی کا وجود ہے'' قرآن نے ماحولیات کے تمام عناصر پر بڑے جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے؛ چنانچہ قرآن میں سات سو سے زیادہ آیتیں ہیں، جن کا براہ راست یا بالواسطہ ماحولیاتی مسائل سے تعلق ہے اور پھر ان میں سے 199 آیتیں ایسی ہیں جو زمین اور اس سے متعلقہ حقائق سے بحث کرتی ہیں، یہ تو ان آیتوں کا معاملہ ہے جو انسانوں کے سمجھ میں آگئی ہیں، ان کے علاوہ کئی ایسی آیتیں ہیں، جن میں ماحولیات کی طرف اشارہ موجود ہوں گے، مگر ان اشاروں کو سمجھنے کے لئے جن سائنسی حقائق سے واقفیت ضروری ہے، اس کی کمی کی وجہ سے ہم ان اشاروں کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔

قدرتی نظام میں توازن واعتدال

اللہ نے کائنات کی تخلیق ایسے پراسرار انداز میں کی ہے کہ جب کوئی انسان ان سربستہ رازوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو کائنات کے نازک اور متوازن نظام کو جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے، اللہ نے اس کائنات میں ہر چیز کو ایک خاص توازن سے پیدا کیا ہے، مثلاً حرکت میں توازن، حرارت میں توازن، کشش کی قوتوں میں توازن،

⊙ اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی: ای، ایف، ایل یونیورسٹی، حیدرآباد۔

مقناطیسیت اور اس کے اثر میں توازن، برقی تعاملات میں توازن، پانی کی پائی جانے والی مقدار میں توازن، زندگی اور موت کی شرح میں توازن، اسی طرح روئے زمین پر بسنے والی مخلوقات کی جسامت، اُٹھان، نشوونما، شکل وصورت، لمبائی، چوڑائی، قوت، خصوصیات، طرزِ عمل میں توازن، کائنات کے اس توازن اور تناسب کو دیکھ کر ہمارے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ ہم اللہ کی حکمت وقدرت کی گواہی دینے والے بن جائیں اور یہ مان لیں کہ اللہ نے کائنات کی تخلیق ایک خاص منصوبہ کے تحت کی ہے اور کوئی بھی ایسی حرکت نہ کریں، جو اللہ کے منصوبہ سے ٹکراتی ہو، اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ، أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ . (الرحمٰن:۷-۸)

آسمانوں کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کردی، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو۔

کائناتی نظام کے اس توازن واعتدال کا قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ . (القمر:۴۹)

ہم نے ہر چیز ایک حد کے ساتھ پیدا کی ہے۔

دوسری جگہ یہ ارشاد ہوا :

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا . (الفرقان:۲)

وہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کی ایک حد مقرر کردی۔

قرآن میں تیسری جگہ اس کائناتی حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے :

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنْثَى وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ . (الرعد:۸)

اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے، جو کچھ اس میں بنتا ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اس میں کمی یا بیشی ہوتی ہے، اس سے بھی وہ باخبر رہتا ہے، ہر چیز کے لئے اس کے یہاں ایک مقدار مقرر ہے۔

ایک اور جگہ کائنات کے توازن وتناسب کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوجاً وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ، وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ، إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ، وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْئٍ مَّوْزُوْنٍ ، وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِيْنَ ، وَإِنْ مِّنْ شَيْئٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوم . (الحجر:۱۶-۲۱)

یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے ،ان کو دیکھنے والوں کے لئے ستاروں سے آراستہ کیا اور ہر شیطان مردود سے ان کو محفوظ کر دیا،کوئی شیطان اس میں راہ نہیں پاسکتا ،الا یہ کہ کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اس کا پیچھا کرتا ہے،ہم نے زمین کو پھیلایا،اس میں پہاڑ جمائے ،اس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار کے ساتھ اُگائیں اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کئے ،تمہارے لئے بھی اور ان بہت سی مخلوقات کے لئے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو،کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو ہم نازل کرتے ہیں ،ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

سائنسی حقائق بھی بتاتے ہیں کہ کائنات کا نظام ٹھوس اُصولوں کے تحت غیر معمولی ہم آہنگی سے چل رہا ہے، اگر قائم شدہ نظام میں ذرا سی بھی اونچ نیچ ہوجائے تو ساری دنیا تہس نہس ہوجائے گی ،کائنات کے نظام میں کتنا توازن ہے اس کو سمجھنے کے لئے چند سائنسی حقائق ذیل میں ملاحظہ کریں :

(۱) سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہوا میں 78.7% نائیٹروجن اور 20.95% آکسیجن ہے،نائیٹروجن کی مقدار کی زیادتی کی وجہ سے آکسیجن میں جو احتراقی مادہ ہے وہ بے اثر ہوجاتا ہے،اگر ہوا میں نائیٹروجن کی مقدار اس سے کم ہوتی تو کائناتی شعاعیں جو کھربوں کی تعداد میں روزانہ زمین کی طرف گرتی ہیں ،آکسیجن ان کو جلاتا اور اس کی وجہ سے زمین کی درجۂ حرارت میں اتنا اضافہ ہوجاتا کہ یہاں رہنے والی ہر چیز جل کر خاکستر ہوجاتی۔

(۲) اسی طرح سائنس دانوں کا ماننا ہے کہ نائیٹروجن پانی میں تحلیل نہیں ہوتا ہے اور آکسیجن پانی میں تحلیل ہوجاتا ہے،اگر آکسیجن نائیٹروجن کی طرح پانی میں تحلیل ہونا بند کردے یا ہوا اور پانی کے تبادلے کا عمل جس سے آکسیجن کی تجدید ہوتی ہے،اگر یہ عمل رُک جائے تو پانی میں رہنے والی تمام مخلوقات فنا ہوجائیں گی۔

(۳) سائنس دانوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تناسب 0.03% ہے ، یہ گیس

زیادہ تر ’’ٹروپوس فیر‘‘ میں مرتکز رہتی ہے، اس گیس کا کام یہ ہے کہ سورج سے نکلنے والی شعاعوں کو جذب کر کے معتدل درجہ حرارت کو فضاء میں قائم رکھتی ہے۔

ان سائنسی حقائق سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں توازن و تناسب قائم کر رکھا ہے؛ تاکہ کائنات کا نظام سلامتی کے ساتھ چلتا رہے، یہ توازن واعتدال حیوانات کی شرح پیدائش وموت میں بھی کامل طور پر موجود ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ امریکہ کی ایک ریاست ’’اوروزونا‘‘ میں جب شیروں کے شکار پر امتناع ختم کردیا گیا تو اس کے بعد وہاں کئی بیماریاں پھوٹ پڑیں، جب امراض کے اسباب کی تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان وباؤں کا سبب ہرنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے، عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ شیر ایسی ہرنوں کا شکار کرتے ہیں جو زیادہ نہیں دوڑسکتی ہیں اور وہی ہرنیں زیادہ دوڑ نہیں سکتی ہیں جو کسی بیماری میں مبتلا ہوں، شیر بیمار ہرنوں کا شکار کر کے ماحولیات کو پاک وصاف رکھنے میں مدد کرتا ہے، مذکورۃ الذکر ریاست میں شیر کے شکار پر امتناع اُٹھانے کی وجہ سے شیروں کی تعداد کم ہوگئی اور بیمار ہرنوں کی تعداد بڑھ گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ بیمار ہرنوں سے کئی ایسے وائرس پھیلنے لگے جو انسانوں کے لئے ضرر رساں ہیں۔

ماحولیات کے تحفظ کے لئے توازن ہر جگہ مطلوب ہے، یہاں تک کہ جانوروں کی افزائش کے سلسلہ میں بھی توازن کو برقرار رکھنا ضروری ہوگا؛ تاکہ ماحولیات پر زیادہ دباؤ نہ پڑے، اگر اس توازن کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو اس سے ماحولیات کو شدید نقصان پہنچے گا، اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال ملاحظہ کریں: شمالی عراق کی چراگاہ میں ایک چوتھائی ملین بکریوں کو چرانے کی گنجائش تھی، لوگوں نے اپنی دولت میں اضافہ کی غرض سے بکریاں زیادہ پال لیں، جس کی وجہ سے لوگوں کے پاس ایک ملین سے زیادہ بکریاں ہوگئیں؛ چوں کہ چراگاہیں محدود تھیں، اس لئے وہ بکریاں بھی ان ہی چراگاہوں سے غذا حاصل کرتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ان چراگاہوں کی تروتازگی اور ہریالی قلیل عرصہ میں ختم ہوگئی اور بکریوں کے لئے غذا کا بحران پیدا ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ قدرتی نظام میں کوئی بھی مداخلت ماحولیاتی نظام کے توازن کو بگاڑ دے گی، نتیجہ یہ ہوگا کہ ماحولیاتی عناصر جو متوازن ہونے کی صورت میں نفع بخش ہیں، عدم توازن کی صورت میں نقصاندہ بن جائیں گے اور پھر اس سے تمام مخلوقات کی بقا خطرہ میں پڑ جائے گی، قرآن نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

مَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔ (البقرۃ:۲۱۱)

اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے، اللہ اس کو سخت سزا دیتا ہے۔

اللہ نے انسانوں کی بقاء، ان کی حفاظت، رزق رسانی اور بھلائی کے لئے ماحولیات کو پیدا کیا ہے؛ لہٰذا ماحولیاتی وسائل کے استعمال میں اسراف کرنا یا ان کا استحصال کرنا یا ان میں بے جا تصرف کرنا انسانوں کے لئے

بہت خطرناک ہے،اللہ تعالیٰ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً . (لقمان:۲۰)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں۔

قدرتی وسائل کا تحفظ

اللہ تعالیٰ نے اس کرۂ ارض کا انتظام انسانوں کے ہاتھ میں رکھا ہے؛ لہٰذا انسانوں کا فرض ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام صحیح انداز میں چلائیں، ماحولیاتی عناصر اور انسانوں کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ حاکم اور رعایا کا تعلق ہوتا ہے، حاکم کا فرض ہوتا ہے کہ اپنی رعایا کا پورا پورا خیال رکھے، اس کو تکلیف نہ دے، اس کو نقصان نہ پہنچائے، اسی طرح ہر انسان کا فرض ہے کہ ماحولیاتی عناصر کا پورا پورا تحفظ کرے؛ کیوں کہ ماحولیاتی عناصر انسانی ورثہ ہیں، جو ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو ملتے ہیں؛ لہٰذا اس کو آلودگی اور تباہی سے بچانا ہر انسان کا اخلاقی فریضہ ہے۔

قدرتی وسائل کو تباہی سے بچانا انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ضروری ہے؛ کیوں کہ یہ قدرتی وسائل اللہ کی حکمت، رحمت اور قدرت کی نشانیاں ہیں، ان کو دیکھ کر انسان اللہ کو پہچانتا ہے، قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے ہو، انسان کو چاہئے کہ وہ ماحولیات کا اسی طرح تحفظ کرے جس طرح وہ اپنی جان، مال اور اولاد کا تحفظ کرتا ہے، جو لوگ پانی، ہوا اور دوسرے قدرتی وسائل کو برباد کرتے ہیں، وہ اللہ کی نظروں میں مجرم ہیں، انسانی سرگرمیوں کی وجہ سے جو قدرتی وسائل تباہ ہوئے ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ . (الروم:۴۱)

خشکی اور تری میں فساد برپا ہوگیا ہے، لوگوں کی اپنے ہاتھوں کی کمائی سے؛ تاکہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا، شاید کہ وہ باز آجائیں۔

قدرتی وسائل اور ماحولیاتی عناصر کے ساتھ رحم دلانہ سلوک ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ . (القصص:۷۷)

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے، اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کرو اور دنیا میں اپنا
حصہ فراموش نہ کرو، احسان کرو جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے
اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جگہ جگہ مظاہر فطرت جیسے کہ سورج، چاند، زمین، ستارے، وغیرہ کی قسمیں کھائی ہیں، اس کی حکمت یہی ہے کہ انسان ان کی اہمیت وعظمت کو سمجھے اور ان کا پورا پورا حق ادا کرے، مثلاً: زمین کا حق بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تَمْشِ فِیْ الْأَرْضِ مَرَحاً . (لقمان:۱۷)
زمین میں اکڑ کر مت چلو۔

اور مزید فرمایا:

لَا تُفْسِدُوْا فِیْ الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلاَحِهَا . (الاعراف:۵۵)
زمین میں اصلاح ہونے کے بعد فساد مت کرو۔

یہ آیتیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان قدرتی وسائل میں اپنی مرضی سے تصرف کرنے کے بجائے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو ملحوظ رکھے؛ کیوں کہ جن قوموں نے اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا یعنی وہ توازن جو اللہ اس کائنات میں برقرار رکھنا چاہتا ہے، اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اللہ نے ان قوموں کو ہلاک و برباد کردیا، اس سلسلہ میں قوم سبا کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے، ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے قدرتی وسائل میں بے جا تصرف کیا اور اللہ کی ہدایات کو نظر انداز کردیا۔

اللہ تعالیٰ نے قدرتی وسائل دو مقاصد سے پیدا کئے ہیں، پہلا مقصد تو یہ ہے کہ انسان ان قدرتی وسائل کی مدد سے اپنی ضرورتیں پوری کرے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو، اس لئے قرآن نے جہاں انار، زیتون، کھجور، انگور وغیرہ کے فوائد کو بیان کیا ہے وہیں ان کی خوبصورتی کا تذکرہ بھی کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَهُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَیْئٍ فَأَخْرَجْنَا
مِنْهُ خَضِراً نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبّاً مُّتَرَاكِباً وَمِنَ النَّخْلِ مِن طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ
وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهاً وَغَیْرَ مُتَشَابِهٍ انظُرُوْا إِلٰی
ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَیَنْعِهِ إِنَّ فِیْ ذَلِكُمْ لآیَاتٍ لِّقَوْمٍ یُؤْمِنُوْنَ . (الانعام:۹۹)

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اُگائی، پھر اس سے ہرے کھیت اور درخت پیدا کیئے، پھر ان سے تہہ بہ تہہ چڑھے ہوئے دانے نکالے اور کھجور کے شگوفوں سے پھلوں کے گچھے کے گچھے پیدا کیئے جو بوجھ کے بارے جھکے پڑتے ہیں اور انگور، زیتون اور انار کے باغ لگائے، جن کے پھل ایک دوسرے ملتے جلتے بھی ہیں اور پھر ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں، یہ درخت جب پھلتے ہیں تو ان میں پھل آنے اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت ذرا غور کی نظر سے دیکھو، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔

ماحولیات کی تباہی کے اسباب

صنعتی دور سے پہلے ماحولیاتی مسائل نہیں تھے، صنعتی سرگرمیوں اور جدید ٹکنالوجی کے بے جا استعمال نے ماحولیاتی مسائل کو جنم دیا ہے، قدرتی قوانین میں انسانوں کی بے جا مداخلت کا نتیجہ ہے کہ آج انسان طرح طرح کے ماحولیاتی مسائل سے دوچار ہے، انسانوں نے معاشی ذرائع کو ترقی دینے کے لئے قدرتی وسائل کو شدید نقصان پہنچایا ہے، انسانوں نے جنگلات کو کاٹنا شروع کیا؛ تا کہ وہ وہاں فیکٹریاں قائم کرسکیں اور تجارتی سرگرمیاں چلاسکیں، مگر وہ بھول گئے کہ ان کے عمل سے ماحولیاتی توازن بگڑ رہا ہے۔

اللہ نے اس کائنات میں خاص توازن و تناسب رکھا ہے اور اس توازن و اعتدال کو برقرار رکھنے میں حیوانات، نباتات، جنگلات، دریا و سمندر، چرند و پرند اور ہر قسم کے حشرات الارض کا اپنا اپنا رول ہے، ہر ایک کا اپنا اپنا کردار ہے، جو اس روئے زمین میں زندگی کی بقا کی ضمانت ہے؛ لیکن انسان نے اپنی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا اور اللہ کے قائم کیئے ہوئے نظام میں ایسی مداخلت کی جس کا ماحولیات کو ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے، آج کئی حیوانات ناپید ہو گئے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جن کی پیدائش میں کافی کمی محسوس کی گئی ہے، اسی طرح کئی ایسے پرندے ہیں جو صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں اور کئی ایسے ہیں جن کی پیدائش بہت کم ہوگئی ہے، سمندروں میں انسانوں نے ایسی مداخلت کی ہے کہ مچھلیوں کی بقا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے؛ حالاں کہ ابھی بھی دنیا کی ایک اچھی خاصی آبادی کی گذر بسر کا ذریعہ مچھلی کی پیداوار ہی ہے، اگر مچھلیوں کی پیداوار میں زیادہ کمی ہونے لگی تو دنیا میں غذائی بحران پیدا ہو جائے گا، اسی طرح زراعتی سرگرمیاں بہت کم ہوگئی ہیں، جس کی وجہ سے غذائی اجناس جس وافر مقدار میں مہیا ہونی چاہئیں وہ نہیں ہو پارہی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غذائی اجناس کی قیمتیں دن بدن بڑھتی جارہی ہیں اور اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں دنیا میں غذائی بحران پیدا ہو جائے گا، اور اگر زراعت ہو بھی رہی ہے تو پیداوار

بڑھانے کے لئے ایسی جدید ٹکنالوجی استعمال کی جارہی ہے جس سے وقتی طور پر پیداوار میں اضافہ تو ہورہا ہے، مگر آنے والے دنوں میں زمینوں کی زرخیزی کے متاثر ہونے کا شدید اندیشہ ہے، اس لئے دنیا کے کئی دانشوروں کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ جدید ایجادات انسانیت کے مستقبل کے لئے فائدہ مند ہیں یا نقصان دہ؟ اس سے معلوم ہوا کہ صنعتوں کے قیام کے ذریعہ وسیع پیمانے پر معاشی مواقع پیدا کرنے کی کوششوں کے جہاں فائدے ہیں، وہیں مستقبل میں ان سے نقصانات بھی پہنچ سکتے ہیں۔

قدرت کے کارخانے میں کوئی نکما نہیں ہے، اس کارخانہ میں ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہے، مثلاً: عام طور پر اُلّو کو منحوس سمجھا جاتا ہے؛ حالاں کہ ماحولیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اُلو رات میں چوہوں کا شکار کرنا بند کردے تو اس سے کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہوں گی، اسی طرح مکڑیوں سے کئی لوگوں کو نفرت ہے؛ جب کہ ماہرین ماحولیات کا کہنا ہے کہ مکڑیاں ہر سال کئی ملین نقصاندہ کیڑوں کا شکار کرتی ہیں، اگر یہ مکڑیاں نہ ہوں تو ہزاروں قسم کی بیماریاں روئے زمین پر پھیل جائیں گی، جب کہ سائنس دانوں نے نئی نئی ٹکنالوجی ایجاد کر کے وقتی طور پر تو ہمارے لئے راحت کا سامان پیدا کردیا ہے، مگر اس کے دوررَس مضر اثرات سے انسانوں کو کوئی نہیں بچاسکتا ہے؛ کیوں کہ مختصر مدتی ٹکنالوجی کی بہتات ''کلوروفلوروکاربن'' جیسی گیس کے اخراج کا باعث بنی ہے، جس سے اوزون کی سطح میں سوراخ پیدا ہوگیا ہے اور پھر گرین ہاؤس گیسس کے زیادہ اخراج سے سطح زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ ہورہا ہے، جس کے نتیجہ کے طور پر موسمی نظام میں تبدیلی واقع ہورہی ہے، اٹلانٹک کے برفیلے پہاڑ پگھلنے شروع ہوگئے ہیں اور دریاؤں کی سطحیں اونچی ہونے لگی ہیں، اگر کچھ مدت تک یہی رجحان باقی رہا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ مصر، بنگلادیش اور کئی افریقی وایشیائی ممالک زیر آب آجائیں گے، اس صورت حال کا تصور کر کے ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں تو اگر یہ اندیشہ حقیقت میں تبدیل ہوجائے تو ہمارا کیا حال ہوگا! اس لئے ہم کو چاہئے کہ کوئی بھی ترقیاتی منصوبہ تیار کرنے سے پہلے اس بات پر غور کریں کہ مستقبل میں وہ انسانیت کے لئے فائدہ مند ہے یا نقصاندہ، خلاصہ یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر قدرتی وسائل کے استحصال اور بے ہنگم صنعتی سرگرمیوں سے ماحولیاتی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔

ماحولیاتی مسائل اور ان کا حل

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ماحولیاتی مسائل اتنے پیچیدہ اور آپس میں ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے، یہ اتنا بڑا چیلنج ہے کہ اس کا حل اب تک ماہرین ماحولیات نہیں ڈھونڈ سکے ہیں؛ کیوں کہ ماحولیاتی نظام ہزاروں قسم کی مخلوقات اور ان کے آپسی تعلقات پر منحصر ہے، جن کے وجود میں آنے یا فنا ہونے سے ماحولیات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے اور پھر ان میں تبدیلی اتنی تیزی سے آتی ہے

کہ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تمام ماحولیاتی مسائل کا احاطہ اوران کا حل پیش کرنا بہت مشکل ہے، تاہم ذیل کی سطروں میں چند اہم ماحولیاتی مسائل کا قرآن وحدیث کی روشنی میں حل پیش کیا جارہا ہے۔

فضائی آلودگی

جب انسان نے جدید ٹکنالوجی کی مدد سے لوہا، تانبا اور پیتل وغیرہ کے خام مواد کو زمین سے برآمد کرنا شروع کیا اور صنعتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے ہزاروں فیکٹریاں قائم کیں جن سے کاربن ڈائی آکسائیڈ، ہیڈروکاربن آکسائیڈ، نائیٹروجن، سلفر، کیمیائی ذرات اور دھواں پیدا ہونا شروع ہوا، یہ تمام گیسس آپس میں مل کر فضائی آلودگی کا سبب بنیں، ماحولیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ گیسس بنی نوع انسان، حیوانات اور نباتات غرض کہ سب کے لئے خطرناک ہیں؛ کیوں کہ ان سے کائنات کا کیمیائی ڈھانچہ بگڑ سکتا ہے۔

اس بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی آلودگی جس سے قدرتی نظام کو نقصان پہنچتا ہو وہ ایک بڑا جرم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِيَ السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ، يَغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ . (الدخان:۱۰-۱۱)

اچھا! انتظار کرو اس دن کا جب آسمان دھواں لئے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔

آبی آلودگی

انسانوں نے اپنے تمدن کی تعمیر کے لئے جو جدید ثقافتی، سماجی، معاشی، سیاسی نظام بنایا ہے، اس کا بھی قدرتی ماحول پر براہِ راست اثر پڑا؛ کیوں کہ جدید تمدن کے ظہور میں آنے کے بعد انسانوں نے ہر چیز کے فضلات کو زمین میں دفن کرنا شروع کیا، خاص طور پر صنعتی وکیمیکل فضلات کو زیر زمین دفن کیا جانے لگا، جس سے پانی آلودہ ہوگیا، مزید یہ کہ انسانوں نے زمین کی تہوں میں موجود پانی کو قسم قسم کے کیمیکل سے متاثر کردیا ہے، جن سے پانی کی جیالوجیکل سطحیں آلودہ ہوگئیں، اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ بارش کا پانی بھی آلودہ ہو چکا ہے؛ کیوں کہ بارش ان آلودگیوں کو جمع کر لیتی ہے جو فضاء میں ہوتی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ پانی کو آلودہ کرنا گویا کہ زمین میں فساد پھیلانا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ . (البقرۃ:۶۰)

اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

تم لوگ اپنے برتنوں کے ڈھکن اور مشکیزوں کے منھ کو خوب اچھی طرح بند کر لیا کرو؛ کیوں کہ سال میں ایک رات ایسی ہوتی ہے جس میں کھلے ہوئے برتن میں جراثیم پڑ جاتے ہیں۔ (مسلم، کتاب الاشربہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا :

تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے۔ (مسلم)

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہتے ہوئے پانی میں بھی پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی، سایہ اور راستہ میں غلاظت ڈالنے والوں کو ملعون قرار دیا، (طبرانی) پانی میں گندگی ڈالنے سے آکسیجن کی مقدار میں کمی آجاتی ہے، جس کی وجہ سے پانی میں رہنے والی مخلوقات کو آکسیجن حاصل کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے، نیز پانی کی آلودگی کی وجہ سے کئی امراض پیدا ہوتے ہیں۔

پانی کا بحران

انسانوں کو ایک طرف پانی کی آلودگی کا مسئلہ درپیش ہے تو دوسری طرف پانی کی قلت کا سامنا ہے، ماہرین ماحولیات کا کہنا ہے کہ عالمی سطح پر پانی کا صرفہ بڑھ گیا ہے، 1950ء میں پانی کا صرفہ 1360 کیوبک کیلومیٹر تھا، 1990ء تک 4310 کیوبک کیلومیٹر ہو گیا ہے 2000ء تک پانی کا صرفہ 5190 کیوبک کیلومیٹر تک پہنچ گیا ہے، ایک اندازہ کے مطابق پانی کی اس مقدار میں سے زراعت میں 69%، صنعتوں میں 23% اور گھریلو کاموں میں 8% خرچ ہوتا ہے، سائنس دانوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ اکیسویں صدی میں عالمی پیمانہ پر پانی کا شدید بحران پیدا ہوگا، اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مارچ 1980ء پیرس میں کانفرنس ہوئی تھی، جس میں کچھ ایسی عالمی ایجنسیاں بنائی گئیں جن کا کام یہ تھا کہ وہ ڈپلومیٹک اور پرامن طور پر پانی کے تنازعات کو حل کریں اور پانی کے تحفظ اور اس کے منصفانہ تقسیم کو یقینی بنائیں۔

اس معاملہ میں بھی اسلام کا رویہ بہت واضح ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’انسان تین قسم کی چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر استعمال کرتا ہے، وہ تین چیزیں یہ ہیں: پانی، گھاس اور آگ‘‘ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے، وہ وضو میں پانی کا اسراف کر رہے تھے، آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم پانی فضول کیوں خرچ کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ میرے پاس پانی زیادہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم بہتے ہوئے دریا میں بھی وضو کرو تو پانی کا اسراف نہ کرو۔ (ابن ماجہ)

زمینی آلودگی

فضائی اور آبی آلودگی کی وجہ سے زمینی آلودگی بھی پیدا ہوتی ہے؛ کیوں کہ بارش کے پانی سے کھیتوں کی آب پاشی ہوتی ہے، اگر بارش کا پانی آلودہ ہوگا تو اس سے زمین ضرور متاثر ہوگی، اس کے علاوہ کارخانوں کے فضلات، گھریلو فضلات، کیڑے مار دوائیں، کھادوں کا زیادہ استعمال، دھاتوں کے فضلات زمین میں دفن ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے زمینی آلودگی پیدا ہوتی ہے، زمینی آلودگی کی وجہ سے غذائی اجناس بھی آلودہ ہوجاتے ہیں اور پھر غذائی اجناس کے ذریعہ وہ آلودگیاں انسانوں کے جسم میں منتقل ہوتی ہیں، جن سے بہت سے امراض رونما ہوتے ہیں، جیسے کہ کینسر، گُردے کی خرابی اور اعصابی بیماریاں۔

اسلام کسی بھی ایسی سرگرمی سے روکتا ہے جو انسانیت کے لئے نقصان دہ ہے، کوئی ایسا کام جس سے عامۃ الناس کو نقصان پہنچتا ہو وہ اسلام کی نظر میں سنگین جرم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلَى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً . (المائدۃ:۳۲)

اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلہ میں یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا تو گویا کہ اس نے تمام انسانوں کو قتل کردیا۔

اس آیت کے ذیل میں علماء نے فرمایا کہ بلا وجہ قدرتی وسائل کو تباہ کرنے والا بھی قدرتی وسائل کا قاتل کہلائے گا۔

صوتی آلودگی

آواز آپس میں رابطہ کرنے اور اظہار خیال کے لئے ضروری ہے، قرآن میں آنکھوں کے بعد زبان کا تذکرہ ہے، جس سے آواز کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، سائنس دانوں کے نزدیک صوتی آلودگی سے مراد وہ نطقی لہریں ہیں جو مسلسل تبدیل ہوتی ہیں، جب آواز کی مقدار حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو وہ صوتی آلودگی میں تبدیل ہوجاتی ہے؛ چنانچہ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ جو آواز معتدل مقدار سے تجاوز کرتی ہے وہ اعصابی نظام کو متاثر کرتی ہے، صوتی آلودگی سماجی نظام میں آبادی کی کثافت اور صنعتی سرگرمیوں سے پیدا ہوتی ہے، صوتی آلودگی سے سر کا درد، خون کے نظام میں خرابی، اعصابی بیماریاں، قوتِ ہاضمہ میں بگاڑ اور کئی دوسری جسمانی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، صوتی

آلودگی سے انسانوں کے مزاج میں بھی فرق آجاتا ہے؛ کیوں کہ اس سے اعصاب میں کشیدگی، خون میں کولسٹرول کا اضافہ اور قوتِ ہاضمہ میں کمی واقع ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان کی قوت عمل کم ہو جاتی ہے اور بیماریوں کے علاج کے لئے کثیر رقمیں برباد ہوتی ہیں۔

اسلام صوتی آلودگی کے تمام اسباب پر امتناع عائد کرتا ہے، اسی لئے مساجد میں شور وشغب کرنے سے روکا گیا، قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کو فرض قرار دیا گیا اور تلاوتِ قرآن میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَلاَ تَجْهَرْ بِصَلاَتِكَ وَلاَ تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيْلاً .

(بنی اسرائیل:۱۱۰)

اپنی نماز بہت زیادہ بلند آواز سے اور نہ بہت زیادہ پست آواز سے پڑھو، ان دونوں کے درمیان اوسط درجہ کا لہجہ اختیار کرو۔

پیغمبر کے سامنے آواز کو پست رکھنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

إِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُوْلِ اللهِ أُوْلَئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ . (الحجرات:۳)

جولوگ رسولِ خدا کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ کچھ آوازیں ایسی ہیں، جو انسان کی جان لے لیتی ہیں، جیسے کہ قوم ثمود ایک دھماکہ دار آواز سے تباہ ہوگئی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَأَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جَاثِمِيْنَ . (ہود:۶۷)

وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا تھا، ایک سخت دھماکے نے ان کو گھیر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں بے حس و بے حرکت پڑے رہ گئے۔

قرآن میں کئی آیتیں اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہیں کہ جنت میں صوتی آلودگی نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْماً إِلَّا قِيْلاً سَلَاماً سَلَاماً . (الواقعۃ:۲۵-۲۶)

وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہیں سنیں گے، وہاں ہر طرف سلام سلام کی آوازیں ہوں گی۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی اپنی مجلس میں زور سے آواز نہیں نکالتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اذان کے لئے ڈھول کو پسند نہیں فرمایا؛ کیوں کہ اس سے صوتی آلودگی پیدا ہوتی ہے، حضور ﷺ کسی بھی قسم کی صوتی آلودگی کو پسند نہیں کرتے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کچھ ساتھیوں کے ساتھ سفر کررہے تھے کہ ان میں سے کسی ساتھی نے زور زور سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کہنا شروع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! اپنی آواز کو پست رکھو؛ کیوں کہ تم ایسی ہستی کو نہیں پکار رہے ہو جو بہری ہو یا دور ہو، تم لوگ ایسی ہستی کو پکار رہے ہو جو تم سے قریب ہے اور ہر چیز کو سنتی ہے۔

بحری آلودگی

انسان نے اپنے تمدن کی ترقی کے لئے سمندروں کے قدرتی نظام کو بہت متاثر کیا ہے، اس نے سمندروں کو کھود کر تیل نکالنے کی کوشش کی، سمندروں میں پائپ لائن بچھادی، فیکٹریوں کے فضلات سمندروں میں پھینکے اور پٹرول کے فضلات کو سمندروں میں دفن کیا، سمندروں میں جنگ شروع کردی، تیل کے ذخائر میں آگ لگادی، تیل کی آلودگی سے سمندر کے نباتات بری طرح متاثر ہوئے ہیں؛ کیوں کہ جب تیل خارج ہوتا ہے تو یہ پانی کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور روشنی پانی کے اندر نہیں پہنچتے ہیں، جب کہ ان پر نباتات کی بقاء منحصر ہے، اس عمل کو ماحولیات کی زبان میں فوٹوسنتھیس (Photosyntheises) کہا جاتا ہے، یعنی سمندر میں آکسیجن کا پہنچنا اور اس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کا خارج ہونا، تیل کے دھبے سورج کی حرارت کو پانی میں پہنچنے سے روکتے ہیں، نیز تیل میں کچھ ایسے زہریلے مادے ہوتے ہیں، جو کئی ایسے جرثوموں کو ختم کردیتے ہیں جو سمندر میں رہنے والی مخلوقات کی بقاء کے لئے ضروری ہیں، اسی طرح تیل کے دھبے پانی سے خارج ہونے والے بخار کو 20 فیصد تک گھٹادیتے ہیں، جب کہ دریاؤں اور سمندروں ہی سے 90 فیصد پانی بخار بن کر ہوا میں جاتا ہے، پانی کے درجۂ حرارت میں اضافہ کا سبب بھی یہی تیل کے دھبے ہیں جو سمندروں میں پائے جاتے ہیں، اس کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ پانی میں جو حیاتیاتی عمل ہوتا ہے وہ بھی اس سے متاثر ہوجاتا ہے، مزید یہ ہے کہ اس سے پانی کا مزہ خراب ہوجاتا ہے، اس آلودگی سے پرندے بھی متاثر ہوتے ہیں؛ کیوں کہ وہ بھی ان ہی سمندروں سے پانی حاصل کرتے ہیں، خلاصہ یہ ہوا کہ انسانی سرگرمیوں نے بحری ماحولیات کو برباد کردیا ہے۔

اس بارے میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سمندروں کے قدرتی ماحول کو تباہ کرنا اللہ کی نافرمانی ہے، اللہ کا حکم یہ ہے کہ ماحول تحفظ کیا جائے، نہ یہ کہ اس کو برباد کیا جائے، سورۂ روم آیت نمبر: ۴۱، سورۂ مائدہ آیت نمبر: ۱۶۴، اور سورۂ اعراف آیت نمبر: ۱۰۳ میں قدرتی ماحول کو تباہ کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔

کیڑے مار دواؤں سے آلودگی

انسانوں نے کئی ایسی کیڑے کُش دوائیں بنائیں ہیں جن کا مقصد ان کیڑوں کو مارنا ہے، جو زراعتی پودوں کو نقصان پہنچاتے ہیں؛ تاکہ پیداوار کی مقدار بڑھائی جا سکے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل سے وقتی طور پر تو پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے؛ لیکن ان کیڑے مار دواؤں سے زمینی آلودگی پیدا ہوتی ہے جو انسان، حیوانات اور نباتات سب کے لئے نقصان دہ ہے؛ کیوں کہ ان دواؤں کے اثر سے کئی ایسے کیڑے مر جاتے ہیں جن کی پیدائش زمین کی زرخیزی کے لئے ضروری ہے، نیز ان دواؤں سے ان جنگلات کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے جو ہماری بقاء کے لئے ضروری ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر ایسے عمل سے روکا ہے جس سے انسان کی نسل یا فصل برباد ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

> وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ، ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ . (الاعراف:۸۵)
>
> اور زمین میں فساد برپا نہ کرو، جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے، اگر تم واقعی مؤمن ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ کیڑے مار دواؤں کا غیر ضروری استعمال غلط ہے۔

غذائی آلودگی

غذائی آلودگی سے مراد وہ بیکٹر یا اور کیمیائی جراثیم ہیں جو غذا کو مسموم بنا دیتے ہیں، اس بارے میں اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ غذاؤں کو صاف وستھرا رکھنا چاہئے اور ان کو نقصان دہ بیکٹر یا اور پیرا سٹس سے بچانا چاہئے، غذا میں کسی ایسے مادہ کی آمیزش جس سے وہ مسموم ہو جائے، بہت بڑا گناہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

> وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ .
>
> (البقرۃ:۱۹۵)
>
> اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔

اس آیت میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے مراد یہ بھی ہے کہ انسان اپنی غذاؤں کو زہریلی بنا لے، اسی طرح قرآن میں جہاں جہاں فساد نہ کرو کا حکم آیا ہے، اس میں جہاں ناانصافی، ظلم اور شرانگیزی سے روکنا مقصود ہے، وہیں ان تمام کاموں سے بھی روکنا مقصود ہے، جن سے انسان کو نقصان پہنچتا ہے۔

اُوزون کی سطح میں کمی

اُوزون گیس جو اسٹریٹوس فیئر میں ہوتی ہے، انسانی زندگی کے تحفظ کے لئے بہت اہم ہے، سورج سے جو نقصاندہ شعاعیں نکلتی ہیں، وہ ان سے زمین کو بچاتی ہے، اگر وہ شعاعیں زمین پر براہ راست پہنچ جائیں تو روئے زمین پر رہنے والی تمام جاندار چیزیں قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گی، اُوزون گیس ان نقصاندہ شعاعوں کو زمین کی سطح تک پہنچنے نہیں دیتی ہے، تاہم ان شعاعوں کی ایک مختصر مقدار سطح زمین تک پہنچتی ہے جو ہمارے جسموں میں وٹامن ڈی (D) پیدا کرتی ہے، ماحولیاتی آلودگی سے اُوزون گیس کی مقدار ٹروپوس فیئر میں بڑھ رہی ہے، جب کہ اسٹریٹوس فیئر میں اُوزون گیس کم ہو رہی ہے، اگر یہی صورت حال رہی تو روئے زمین پر آباد مخلوقات تباہ ہو جائیں گی۔

سائنسی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''خلیج ہیلے'' کے اوپر والے حصہ میں اُوزون میں سوراخ پڑ چکا ہے، یہ خلیج انٹارٹیکا میں واقع ہے، مزید یہ کہ اُوزون گیس کی کثافت میں کافی کمی آ گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کیمیکل ایزولس کے بنانے سے کلوروفلورو کاربن اور نائیٹروجن آکسائیڈ کا اخراج ہوتا ہے، جو اُوزون کے لئے نقصاندہ ہے، اسی طرح ہوائی جہاز کا دھواں، نیوکلیر دھماکے اور فضائی شٹلس بھی اُوزون کے لئے بہت خطرناک ہیں۔

سورۂ اعراف آیت نمبر: ۵۶، ۷۴ اور ۸۵ میں اللہ تعالیٰ نے زمین میں فساد برپا کرنے سے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ اس میں خلل پیدا مت کرو؛ کیوں کہ اس میں خلل پیدا کرنے کا مطلب انسانیت کو نقصان پہنچانا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

صُنْعَ اللهِ الَّذِیْ أَتْقَنَ كُلَّ شَیْئٍ إِنَّهُ خَبِیْرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۔ (النمل: ۸۸)

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے،
اور وہ خوب جانتا ہے تم لوگ کیا کرتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو تصرف کے اختیارات دے کر دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگ اپنے اختیارات کو کس طرح کرتے ہیں، مگر انسان نے قدرتی ماحول کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بہت افسوسناک ہے۔

اندھا دُھند شکار

اندھا دُھند شکار کرنے سے بھی ماحولیاتی توازن بگڑ رہا ہے، انسان نے ٹکنالوجی کی مدد سے ایسے ہتھیار بنا لئے ہیں جن سے حیوانات کے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے، جب کہ یہ حیوانات ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے میں

اہم رول ادا کرتے ہیں، اسلام میں حدود سے تجاوز کرنے کی سختی سے ممانعت آئی ہے؛ کیوں کہ اندھا دُھند شکار کرنا بھی حدود سے تجاوز کے مفہوم میں ہے، اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنَاهُمْ وَمَنْ نَّشَاءُ وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ . (الانبیاء:۹)

آخر کار ہم نے ان کے ساتھ اپنے وعدے پورے کئے اور انھیں اور جس جس کو ہم نے چاہا بچالیا اور حد سے گذر جانے والوں کو ہلاک کردیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہلاکت ان لوگوں کے لئے یقینی ہے جو اللہ کے حدود کو توڑتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہشات کو لگام لگانے کا حکم دیا، ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا :

جو لوگ اپنی تمام خواہشات کو اس دنیا میں پورا کرنے والے ہیں، وہ آخرت سب سے زیادہ بھوکے ہوں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تفریح طبع کے لئے پرندوں اور جانوروں کے شکار سے روکا ہے اور ان کی خدمت اور نگہداشت کو عظیم خدمت قرار دیا، اس سلسلہ میں اس زناکار عورت کا واقعہ معروف ہے، جس کی مغفرت اس لئے ہوگئی کہ اس نے پیاسا کتا کو پانی پلایا تھا اور اس کے برخلاف ایک عورت مغفرت سے محض اس لئے محروم ہوگئی کہ اس نے ایک بلی کا بھوکا پیاسا رکھا یہاں تک کہ وہ مرگئی، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چیونٹیوں کو جلانے، جانوروں کو مارنے اور ان کے چہروں کو مسخ کرنے سے منع کیا ہے، اس ممانعت کے پیچھے بھی یہی ماحولیاتی حکمت کار فرما تھی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک بار کچھ لوگوں کے پاس سے گذر رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ چند لوگ ایک پرندہ کو تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں، آپ نے ان لوگوں کو اس سے منع فرمایا اور کہا کہ اس قسم کی حرکت اسلام میں حرام ہے۔(۱)

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اسلام حیوانات کے ساتھ حسن سلوک کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، غذائی ضرورت کے تحت جانوروں کو ذبح کرنا تو جائز ہے، مگر اس تاکید کے ساتھ کہ ان کو صحیح سے ذبح کیا جائے؛ چنانچہ شداد بن اوس ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا :

اللہ نے ہر کام کو ٹھیک ٹھیک کرنے کا حکم دیا ہے، اس لئے اگر جانور کو ذبح کرنا ہو تو صحیح سے ذبح کرنا چاہئے، جانور کو ذبح کرنے سے پہلے چھری کو تیز کرنی چاہئے؛ تاکہ جانور کی موت آسانی سے ہوسکے۔

---

(۱) صحیح مسلم، باب النهی عن صبر البهائم.

حدیث میں ایک واقعہ یہ بھی آیا ہے کہ اخنس بن شریق نامی شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا، جب وہ واپس گیا تو واپس جاتے ہوئے اس نے فصلوں کو تباہ کر دیا اور جانوروں کو قتل کر دیا، اس کی اس تخریبی سرگرمی کی مذمت میں یہ آیت نازل ہوئی :

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ، وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ . (البقرۃ:۲۰۴-۲۰۵)

انسانوں میں سے کوئی ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمن حق ہوتا ہے، مگر جب وہ پلٹتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے ، کھیتیوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے ؛ حالاں کہ اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا ہے۔

خلاصۂ کلام

ماحولیات کے تحفظ کا تصور گو دنیا والوں کو ایک جدید تصور نظر آتا ہو، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ تحفظ ماحولیات کے سلسلہ میں سب سے پہلے آواز قرآن نے اُٹھائی ہے، اس کی واضح مثال یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ دونوں شہروں کے وسیع خطوں میں شکار، درخت کی کٹائی اور قدرتی وسائل کو متاثر کرنے والے ہر عمل سے روکا گیا ہے؛ تاکہ حرمین کا قدرتی ماحول قائم رہ سکے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا لَا تَقْتُلُوْا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ . (المائدۃ:۹۵)

یہ آیت بتاتی ہے کہ قدرتی وسائل کے تحفظ کا تصور سب سے پہلے قرآن نے دیا ہے، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تحفظ ماحولیات پر جتنی توجہ دینی چاہئے اتنی توجہ نہیں دی جارہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا دن بدن جنگلات سے محروم ہوتی جارہی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں دنیا میں جتنے جنگلات تھے 1950ء تک، یعنی نصف صدی کے اندر اندر دنیا سے آدھے جنگلات غائب ہوگئے ، جو یقیناً بہت خطرناک علامت ہے؛ لہٰذا اس دھماکہ خیز صورت حال کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح اس صورتِ حال سے نمٹا جائے ؟ یوں تو ماحولیاتی مسائل کو حل کرنے کے لئے اب تک کئی بین الاقوامی کانفرنسیں ہوچکی ہیں، مثلاً: 1972ء میں تبلیسی کانفرنس، 1980ء میں عالمی سطح پر وثائق جاری ہوئے ،

جن کا مقصد ماحول کے تحفظ کے بارے میں غور وفکر کرنا تھا، 1992ء میں اقوام متحدہ نے برازیل میں ماحولیات اور ترقی کے موضوع پر کانفرنس منعقد کی، 1994ء میں مصر میں بڑھتی ہوئی آبادی پر کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، 1995ء میں سماجی ترقیات کے عنوان پر کوپین ہیگن میں کانفرنس منعقد ہوئی، 1997ء میں اقوام متحدہ میں کانفرنس ہوئی، جس میں 53 ملکوں کے سربراہوں نے شرکت کی؛ تاکہ ماحولیاتی مسائل پر تبادلۂ خیال ہو سکے، پچھلے سال یعنی 2010ء میں بھی عالمی حرارت کے موضوع پر کوپین ہیگن میں کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں صدر امریکہ اوباما کے علاوہ دوسرے سربراہان مملکت نے شرکت کی، ان تمام کانفرنس کے باوجود ماحولیاتی مسائل جوں کے توں برقرار ہیں؛ کیوں کہ ملک نہیں چاہتا ہے کہ انرجی کے استعمال میں کمی کرے یا گرین گیسس کے اخراج میں کٹوتی کرے، مفادات کے جھگڑے نے ان کانفرنس کو نشستن، گفتن، خوردن اور برخواستن کا مصداق بنا دیا ہے — تاہم ان کانفرنسوں کی جو قراردادیں منظر عام پر آئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانوں کو ماحولیات کے تئیں اپنے رویے میں تبدیلی لانی چاہئے، ماحولیاتی شعور پیدا کرنا چاہئے، صاف وشفاف ٹکنالوجی استعمال کرنی چاہئے اور حکومتوں کو چاہئے کہ ایسی قانون سازی کریں، جس سے ماحولیات کا تحفظ یقینی ہو سکے، اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں قانون سازی بھی ہوئی ہے اور ماحولیات کی تعلیم کو اسکول اور کالج کے نصاب میں شامل بھی کیا گیا ہے، مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان تمام اقدامات کے باوجود قدرتی وسائل کا استحصال جاری ہے اور صورتِ حال دن بدن بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے — میری رائے میں ماحولیاتی مسائل کے حل کے لئے اس سے بہتر کوئی اور نسخہ نہیں ہوسکتا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات جاگزیں کرائی جائے کہ وہ اس کائنات کے مالک نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں، ان کو بتایا جائے کہ ماحولیات کا تحفظ ان کا اخلاقی، سماجی اور دینی فریضہ ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

چوتھا باب

قرآن مجید کی تعلیمات — عصری افکار کے تناظر میں

قرآن مجید اور سماجی زندگی کے احکام

جناب محمد عبدالرحیم قریشی ⊙

انسان کو سماجی حیوان (Social Animal) کہا جاتا ہے، وہ درندوں اور دیگر اکثر حیوانوں کی طرح اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا اور نہ ایسی زندگی اس کو پسند ہے اس کو اپنی زندگی کا لطف اُٹھانے، اس سے استفادہ کرنے اور اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے لئے سماج یا معاشرہ کا ہونا ضروری ہے، قدیم سے قدیم تاریخ کے مطالعہ میں، پرانی سے پرانی تہذیبوں کی تحقیق میں، جنگلوں اور دور دراز کے علاقوں میں آباد انسانوں میں بھی ایسے انسان کا پتہ نہیں چلا جو صرف اکیلی اور انفرادی زندگی گزارتے رہے ہوں، انسان کا اس زمین پر وجود انسان کی حیثیت اور شکل میں انسانی فطرت اور شعور کے ساتھ ہوا، وہ کسی حیوان سے ارتقاء پائی مخلوق نہیں ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَآءً وَاتَّقُوْا اللهَ الَّذِىْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً ۔ (النساء:۱)

لوگو! اپنے پرودگار سے ڈرتے رہو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا اس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت پیدا کرکے روئے زمین پر پھیلا دیئے، اپنے اللہ سے ڈرو، جس کے نام کو تم حاجت براری کا ذریعہ بناتے ہو اور (قطع مودت) ارحام سے بچو کچھ شک نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس کرۂ ارض پر اس کی زندگی کا آغاز سماجی زندگی سے ہوا، آدم اور حوا کی صورتوں میں بہشت سے پہلے انسانوں کو زمین پر اُتارا گیا جن سے خاندان وجود میں آیا، سماج اور معاشرے بنے، زمانے کے گزرنے کے ساتھ قومیں اور قبیلے وجود میں آئے، علاقہ رنگ ونسل اور زبان کی بنیاد پر انسانوں کے مختلف سماج وجود میں آئے، حقیقت یہ ہے کہ انسان اور سماج ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، انسان سماج کو بناتا اور بگاڑتا ہے اور سماج بھی اپنے

⊙ صدر: کل ہند مجلس تعمیر ملت، حیدرآباد۔

افراد کے مزاج، جذبات و احساسات اور عادتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے، تاریخ کے دھارے کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ سماجوں میں تبدیلی آئی ہے، شکست و ریخت بھی ہوتی رہتی ہے، آپس میں تصادم بھی ہوتا ہے، کمزور سماج رفتہ رفتہ اپنا وجود کھو دیتے ہیں، طاقتور سماج کمزور سماجوں کو ضم کر لیتے ہیں، نئے سماج وجود میں آتے ہیں۔

قوموں کے عروج و زوال کا جائزہ لینے والوں کی بھاری اکثریت اقبالؔ کے اس شعر میں پیش کئے گئے نظریہ کی قائل ہے کہ :

شمشیر و سناں اول طاؤس و ربابِ آخر

یہ حقیقت ہے کہ قوموں اور سماجوں میں جب حالات کی سمت اور اس کے دھارے کے رُخ کو سمجھنے کا شعور نہ ہو اور اس کی سنگینی کا مقابلہ کرنے کا عزم پیدا نہ ہو تو یہ زوال کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ عیش ونشاط کی طرف راغب اور اس میں مبتلا ہو جاتی ہیں، زوال پذیر سماجوں میں راگ رنگ، رقص و سرور اور عیش ونشاط کی رغبت کے ساتھ سماجی رشتہ ناطوں کی اہمیت کم ہونے لگتی ہے اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس وشعور جاتا رہتا ہے اور سماجی نظام بالکل کھوکھلا ہو جاتا ہے۔

خاندان، سماج کی بنیادی اکائی ہے، اس کا استحکام سماج کے استحکام کا ضامن ہے، یہ کمزور اور غیر مستحکم ہو جائے تو سماج کی قوت، صلاحیت اور اس کے موقف پر نقصان دہ اثر پڑتا ہے اور خاندان کے بکھرنے اور ٹوٹنے کے بعد اس سماج کا کمزور ہونا اور ختم ہو جانا بس وقت کی بات رہ جاتا ہے، جو قومیں، تہذیبیں اور سماج کسی زمانے میں غلبہ رکھتی تھیں، اور جن کی آب وتاب دوسروں کی نظروں کو خیرہ کرتی تھیں، صفحۂ ہستی سے ایسی مٹ گئیں جیسے ان کا کبھی وجود نہ رہا ہو، اب یا تو ان کے وجود کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے یا پھر ان کے آثاروں کے کھنڈر ماضی میں وجود کی گواہی دیتے ہیں، یہ قومیں، تہذیبیں اور سماج اگر باقی ہیں تب بھی ان کی وہ قوت وصلاحیت جو پہلے تھی ختم ہو چکی ہے، ان کے زوال کے اسباب کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو آرام کوشی، عیش طلبی کے ساتھ خاندان کی اہمیت کا گھٹ جانا اور اس کا بے معنی ہو جانا بھی ایک اہم سبب ملے گا، اگر کسی سماج میں چاہے اس کی چمک دمک دوسروں کی نظروں کو خیرہ کرتی اور اس کا تمدن دوسروں پر غالب ہو، مگر اس میں خاندان کی حیثیت ختم ہو رہی ہو تو یہ سمجھئے کہ یہ سماج زوال آمادہ ہو چکا ہے اور آج نہیں تو کل اس کا غلبہ داستان پارینہ بننے والا ہے، اگر کوئی سماج اپنا غلبہ کھو دے اور اس کی وہ حیثیت جو پہلے تھی باقی نہ رہے، تب بھی اگر سماجی نظام مضبوط ہے تو یہ وہ طاقت ہے جو اس کو پھر غالب کر سکتی ہے اور پہلا سا مقام دلا سکتی ہے۔

مسلم معاشرے بھی علاقہ، زبان ونسل کی بنیاد پر ایک دوسرے مختلف ہیں، یہ تمام ہی مسلم معاشرے پوری طرح اور مکمل انداز میں اسلامی قدروں پر عمل پیرا نہیں ہیں، انھیں اسلامی معاشرے قرار دینا مشکل ہے، تاہم آج کی دنیا کے تمام ماہرین سماجیات (Sociologists) یہ تسلیم کرتے ہیں اور اعداد وشمار اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ دنیا کے دیگر معاشروں کی بہ نسبت مسلم معاشروں میں خاندانی نظام مستحکم ہے، اس استحکام کی بنیاد پر یہ معاشرے باقی اور قائم ہیں اور اپنی مسلم شناخت کو جاری رکھنے پر مصر ہیں، مغرب کی تہذیب وتمدن نے جہاں دنیا کے بیشتر ممالک اور سماجوں کو متاثر کیا اسی طرح مسلم ممالک اور سماجوں کو بھی متاثر کیا اور ان کو مغلوب بھی کرلیا، مغرب کا یہ ذہن صاف نظر آتا ہے کہ وہ مسلم معاشروں کے خاندانی نظام کو بدل دے اور ان تبدیلیوں کے ذریعہ انھیں کمزور کردے؛ چنانچہ حالیہ عرصے میں جہاں جہاں مغربی استعمار نے اسلامی ملک پر سیاسی اور عسکری غلبہ حاصل کیا ہے، وہاں مغربی تمدن اور کلچر کو فروغ دینے کی کوششیں ہورہی ہیں اور یہاں کے خاندانی نظام کو شکست وریخت سے دوچار کرنے کی کوشش ہورہی ہے، اس گئی گزری حالت میں اگر مسلم معاشروں میں خاندانی نظام کے استحکام کو اغیار محسوس کرتے ہیں تو اس کا اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ فی الواقعی اسلامی معاشرہ اور اس کا خاندانی نظام کتنا مستحکم، مضبوط اور پائیدار ہوگا، یہ معاشرہ ہر سرد وگرم کا مقابلہ کرنے کی طاقت سے عبارت ہوگا جو کسی چمک دمک سے متاثر ہونے کی بجائے، اپنے حسن اور نفع رسانی کی صلاحیت کی بنیاد پر دوسرے معاشروں، دوسری تہذیبوں اور تمدنوں کو اپنی طرف راغب کرے گا۔

خاندان ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان اس تعلق سے وجود میں آتا ہے، جس کا مقصد نسل انسانی کا تسلسل ہے، اس جنس کے تعلق کے علاوہ معاشرے کی تشکیل، تعمیر اور ترقی میں ان دونوں کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہاں آکر عورت کے مقام اور موقف کا سوال پیدا ہوتا ہے، معاشرہ کی تعمیر وترقی میں عورت ایک رول ادا کرسکتی ہے اور وہ معاشرہ میں بگاڑ اور دنیا میں خوں ریزی اور طرح طرح کے فتنوں کا سبب بھی بن سکتی ہے، عورت کے تعلق سے اسلام کی آمد سے پہلے دنیا میں جو تصورات تھے ان میں اس کو انسان کی حیثیت سے گرادیا گیا تھا، عیسائی دنیا میں اس کو گناہ پر اُبھارنے والی مخلوق سمجھا جاتا ہے، ایک عرصہ تک عیسائی مذہبی حلقوں میں یہ بحث چلتی رہی کہ کیا عورت کے اندر روح بھی ہے؟ رومن لا کے تحت جو عیسائی یورپ میں رائج رہا ہے چند سو سال پہلے تک عورت کو انسانی درجہ سے کمتر جانوروں کے درجہ کے برابر (Cattle) قرار دیا جاتا تھا، ہندوستان میں سیتا کی پتی ورتا اور درو پدی کی عصمت کے دیو مالائی قصوں کے باوجود گندی مخلوق سمجھا جاتا تھا، ایک بھائی کی بیوی پر دوسرے بھائیوں کے حق کو تسلیم کرکے لاولدی کی صورت میں 'نیوگ' کی اجازت دے کر شرم وحیا کے دامن کو تار تار کردیا گیا تھا، ایران میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی، عالم عرب میں بھی عورت کی حیثیت اچھی نہیں تھی۔

اسلام نے عورتوں کی انسانیت کا اعلان کیا، انسان چاہے مرد ہو یا عورت دونوں آدم اور بی بی حوا کی اولاد ہیں، دونوں کے انسان ہونے اور بحیثیت انسان ان کے حقوق اور فرائض میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں پر یکساں طور پر اللہ پر ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کی ذمہ داری ہے اور دونوں کو اس کا اجر ملے گا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

أَنِّىْ لاَ أُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثٰى بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ .

(آل عمران:۱۹۵)

میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو، مرد ہو یا عورت، ضائع نہیں کرتا، تم ایک دوسرے کی جنس ہو۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ :

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ . (الروم:۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے؛ تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

اس آیت شریفہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمادیا کہ عورتیں بھی مکمل انسان ہیں، ان میں بھی روح ہے ان میں بھی اچھے اور برے کے فرق کو سمجھنے کی صلاحیت ہے، ان کے بھی حقوق ہیں اور ان پر ذمہ داریاں بھی ہیں، جن کو پورا کرنے کی وہ پابند ہیں، اس آیت میں جوڑے بنانے کا مقصد بھی بتادیا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے تسکین حاصل کریں، یہ صرف جنس جذبہ وخواہش کی تسکین نہیں ہے یہ گھریلو اور خاندانی زندگی کا سکون ہے جو ایک دوسرے کی خواہش کے احترام اور ایک دوسرے پر اعتماد سے پیدا ہوتا ہے، یہی سکون ہے جو دوسری سماجی اور معاشی ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونے اور پرعزم طریقہ پر کشاکش زندگی میں حصہ لینے صلاحیت پیدا کرتا ہے، اور اگر یہ تسکین اور یہ سکون نہ ہو تو زندگی کے دوسرے میدانوں میں صلاحیت کار انتشار اور خلفشار کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ انتشار ہمت، صلاحیت اور کارکردگی کو متاثر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے اس نے شوہر و بیوی کے درمیان آپسی تسکین کا سامان پیدا کرنے کے لئے دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے لئے محبت ڈال دی اور ایک دوسرے کے تعلق سے رحم کا جذبہ پیدا فرمایا، اس بات کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ لفظ رحم کے وسیع معنوں میں ایک دوسرے کو برداشت کرنا بھی شامل ہے، جس کے لئے اُردو لفظ ''نباہ کرنا'' بہت موزوں معلوم ہوتا ہے، شب وروز کی

زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک کا طرز عمل و رویہ دوسرے کو پسند نہ ہو، اگر طرز عمل یا رویہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف نہ ہوتو ایسی صورت میں اپنی ناپسندیدگی پر اصرار نہ کرنا اور اس کو تلخی میں نہ بدلنا یہ بھی رحم ہے جو دونوں میں ایک دوسرے کے تعلق سے ہونا چاہئے، قرآن کریم نے اس آیت میں انسانوں کے ہاتھ میں وہ شاہ کلید تھما دی ہے، جس سے خوشگوار، ہم آہنگ، پُرسکون خاندانی زندگی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

سورۃ روم کی اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن نے مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے لئے تسکین کا ذریعہ قرار دیا ہے، دونوں ایک دوسرے کے حریف نہیں ؛ بلکہ رفیق اور دوست ہیں، لازم وملزوم ہیں، اسلام نے دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق اور ایک دوسرے کے تعلق سے فرائض متعین کر کے دونوں کے درمیان کشاکش اور کشمکش کے امکانات کو بہت کم کر دیا ہے، سترہویں صدی عیسوی اور اس کے بعد مغرب میں عورتوں کی مجبوری اور غلامی کا واویلا مچا تو عورتوں کی تائید کرنے والی تحریکات نے بس عورتوں کے حقوق کی بات کو آگے بڑھانا شروع کر دیا اور عورتوں کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کو بالکل نظر انداز کر دیا، جیسے ایک عورت پر کوئی فرض اس کے شوہر، اس کی اولاد اور اس کے خاندان کے تعلق سے عائد نہ ہوتا ہو، کہا گیا کہ عورت فلاں حق سے محروم رکھی گئی ہے، مرد کی بہ نسبت حق، وقار اور عزت کے معاملہ میں بہت کم تر کر دی گئی ہے، اس کو چہار دیواری میں مقید کر دیا ہے، عورتوں کے حقوق کی بات اتنی بڑھائی گئی کہ اس کی آزادی کے نام پر اس کا لباس اُتار دیا گیا، عریانیت عورتوں کا شعار بن گئی، خاندان کا تصور دھندلا ہو گیا اور انفرادی زندگی مرغوب ہو گئی، یہی آج مغربی تہذیب کا خلاصہ ہے اور اس کو وہ فروغ دینے کی کوشش میں ہے، بات اس حد تک بڑھی کہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں یہ اعلامیے جاری کیے گئے کہ عورت ہی اپنے جسم کی مالک ہے جیسے چاہے استعمال کرے، خاندان کے استحکام اور نتیجتاً سماجی نظم کی مضبوطی کے لئے قرآن شریف میں عورت اور مرد کے موقف اور حقوق کے بارے میں دونوں میں مساوات ملتی ہے:

''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ '' (البقرۃ:۲۲۸) فرائض کے لئے دونوں کے دائروں کا تعین کیا ہے اور ان پر زور دیا ہے، وہیں اللہ تعالیٰ نے جو خالق کائنات اور خالق انسان ہے، انسان کو احسن تقویم قرار دیا، اس خالق نے مرد اور عورت کے فرائض کے دائرے ان کی طبعی خصوصیات اور نفسیاتی حالت کے اعتبار سے الگ الگ اور مختلف مقرر کیے، فرائض اور ذمہ داریوں کے ان دائروں کے حدود کے اندر رہ کر ذمہ داریاں نبھانے سے خاندانی استحکام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے، اگر ایک فریق دوسرے فریق کے دائرہ کار میں دخل دے اور اس کو اختیار کر لے تو خاندان شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے، عورت و مرد کے دائرہ کار و فرائض میں اختلاف ہونے کے باوجود دونوں کا مقصد اور نصب العین ایک ہی ہے، دونوں ایک ہی سمت میں اپنے اپنے دائرے

میں کام کرتے ہیں، اس کے لئے ضرورت ہے کہ دونوں کے درمیان اس طرح ربط وضبط اور تال میل ہو، جس سے خاندانی زندگی کے مقاصد کو قوت ملے اور کبھی دونوں کے دائرہ کار میں تصادم کی کیفیت پیدا نہ ہو، اسی لئے قرآن کریم میں مرد کو خاندان کا سربراہ اور نگران کار قرار دیا ہے، مرد قوام ہیں عورتوں پر، اس میں حاکمیت کا مفہوم بھی شامل ہے، مرد قوام اس لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو بعض فضیلتیں دی ہیں، اس کو گھر کے اور خود عورت کے اخراجات کا کفیل بنایا ہے، یہ حاکمیت، فضیلت اور تفوق صرف اُمور دنیا میں ہے، عورت خلوص ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے تو آخرت میں اپنے مرد سے بڑھ کر مقام حاصل کرسکتی ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان وہ رشتہ جس سے وہ شوہر اور بیوی بنتے ہیں، نکاح یعنی عہد واثق سے قائم ہوتا ہے، جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ''میثاق غلیظ'' گاڑھا قول وقرار قرار دیا ہے، اس طرح قانونی اعتبار سے یہ مختلف صنف کے افراد کے درمیان ایک معاہدہ ہے گو یہ عام کاروباری و دیوانی معاہدوں کی طرح کا معاہدہ نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں زندگی بھر ایک دوسرے سے جڑے رہنے کا ارادہ اور عزم ضروری ہے، یہ دوسرے مذاہب کی طرح عہد مقدس (Sacrament) بھی نہیں ہے، جس سے کسی صورت کوئی باہر نہ نکل سکتا ہو، چاہے گھریلو زندگی جہنم ہی بن جائے، اس میں دونوں کا ادغام اور انضمام بھی نہیں ہے، ایک دوسرے سے نکاح کے رشتہ سے جڑے ہونے کے باوجود دونوں کی اپنی انفرادی شخصیتیں قائم اور باقی رہتی ہیں، عیسائی دنیا میں عورت کو کوئی حیثیت نہیں رہی جب تک ان بیاہی ہے وہ اپنے باپ کی شخصیت کا جز ہے، اسی لئے مس فلاں کہا جاتا ہے، اور جب وہ بیاہ جاتی ہے تو شوہر کی شخصیت کا جز بن جاتی ہے اور اب وہ مسز فلاں ہے، افسوس اور تعجب ہے کہ ساری دنیا میں عورت کے تعلق سے یہی رواج چل پڑا ہے، نکاح یعنی عہد واثق 'کنیادان' بھی نہیں ہے کہ عورت، مرد کو دان کردی جاتی ہو اور اس کے اپنے خاندان سے سارے رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہوں، بیاہ کے رشتہ سے عورت اپنے خاندان سے ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے خاندان کے افراد مفاجاتی صورت حال میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے بری ہوسکتے ہیں، اسلامی تصور نکاح وہ ہے جس میں شوہر اور بیوی نہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی اپنے خاندان سے کٹ جاتا ہے اور نہ ان کے خاندان ان ذمہ داریوں سے بری ہوسکتے جو کسی ناگہانی اور مفاجاتی صورت حال میں ان پر عائد ہوتی ہیں۔

خاندان کے تعلق سے عام طور پر تین شکلیں نظر آتی ہیں، مشترکہ خاندان (Joint Family)، وسیع خاندان اور نیوکلیائی خاندان (Nuclear Family)، مشترکہ خاندان میں عام طور پر ایک دادا کی اولاد ایک گھر میں رہتی ہے، ہندو مذہب میں خاندان کا یہی تصور اور نظام پایا جاتا ہے، ایک گھر میں ایک جد سے چلنے والے لڑکوں

اور لڑکیوں کے درمیان پردہ حجاب کا تصور مشکل ہونے کے ساتھ باہمی اختلاط کے مواقع کافی ہوتے ہیں؛ لیکن اس اختلاط کو جنسی اختلاط میں بدلنے سے جو نقطۂ نظر روکے رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ جنسی تعلق ہو تو تسلسل نسل کے لئے ہو، اس نقطۂ نظر کو مضبوط کرنے کے لئے ہندو مذہب میں ایک گوت یا گوتر یعنی ایک جد کی اولاد کے درمیان بیاہ نہیں ہوسکتا، اسلام میں عم زادوں کے درمیان نکاح منع نہیں ہے؛ لیکن ہندوستان کے مختلف مسلم سماج ہندو رواج میں مبتلا ہیں، پنجاب، ہریانہ، گجرات کے مسلمانوں میں نکاح طے کرنے سے پہلے گوت دیکھی جاتی ہے اور گوت ایک نکلے تو رشتہ نہیں ہوتا، افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر گوت کی یہ تفصیلات ایک برہمن کے پاس ہوتی ہیں، جس سے پوچھے بغیر نکاح کا رشتہ طے نہیں ہوتا، یہ غیر اسلامی رواج ہے، اس کو ختم ہونا چاہئے، دوسری طرف بالخصوص شمالی ہند کے مسلم معاشروں میں برادری کا نظام اتنا ہی سخت ہے جتنا کہ ہندوؤں میں ذات پات کا، جس طرح ہندو جاتیوں کا نظام پیشوں پر مبنی ہونے کے ساتھ اونچ نیچ، اعلیٰ و ادنیٰ کے تصور پر مشتمل ہے، یہی غیر اسلامی تصور مسلم برادریوں میں گھر کر گیا ہے اور برادری کے باہر کوئی نکاح عزت کا سوال بن جاتا ہے اور اس وجہ سے کبھی قتل و غارت گری کا طوفان مچ جاتا ہے۔

جنوبی ہند بالخصوص کیرالا اور لکشادیپ کے بعض مسلم معاشروں میں مادری نظام (Maternal System) کا رواج وہاں کے ہندو طبقات سے وراثت میں چل رہا ہے، جہاں عورت مرد کو بیاہ کر کے اپنی ماں کے گھر لے جاتی ہے، وہی صدر خاندان ہوتی ہے، داعیانِ اسلام اور مصلحین اُمت اسلامیہ کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ان غیر اسلامی تصورات کو اپنے اپنے مسلم معاشروں سے ختم کرنے کی کوشش کریں۔

اسلام ہندو مذہب کے مشترکہ خاندان Joint Family کے تصور اور نظام کو پسند اور قبول نہیں کرتا؛ کیوں کہ اس میں رشتۂ ازدواج کے تعلق سے غیر فطری پابندیاں عائد ہوتی ہیں وہیں عورت ساری زندگی بے سہارگی کی کیفیت میں گزارتی ہے، دوسری شکل جو مغربی تہذیب کی پیداوار ہے، وہ نیوکلیائی خاندانی Nuclear Family جو شوہر و بیوی اور ان کی غیر شادی شدہ اولاد پر مشتمل ہوتی ہے، حقوق و فرائض کو صرف خاندان کے اندر محدود کر دیا جاتا ہے؛ بلکہ بالغ ہونے پر اولاد پر ماں باپ کے احکام کی تعمیل اور ان کی تعظیم و تکریم کی ذمہ داری بھی ساقط ہو جاتی ہے، خاندان کا یہ تصور بھی اسلام میں مطلوب نہیں ہے؛ لیکن مغربی تمدن کے زیر اثر اب یہ عام ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام وسیع خاندان کے تصور اور نظام کو پیش کرتا ہے اور پسند کرتا ہے جس پر آگے لکھا جائے گا۔

نکاح کے سلسلہ میں قرآن مجید ایک اور ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ مرد ہونے والی بیوی کے لئے مہر مقرر کرے، یہ مہر بیوی کا حق ہے جو کسی صورت ساقط نہیں ہوتا، تا آں کہ وہ خود معاف کر دے، قرآن مجید مہر کو خوش دلی

کے ساتھ ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے :

أَن تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيْماً حَكِيْماً . (النساء:۲۴)

تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ اس طرح چاہو کہ بیوی بناؤ، صرف مستی نکالنا نہ ہو، پھر جس طریق سے تم ان عورتوں سے متمتع ہوئے سو ان کو ان کے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے اور مقرر ہوئے بعد بھی جس پر باہم رضامند ہو جاؤ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے بڑے حکمت والے ہیں۔

قرآن مجید نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ نکاح کا مقصد صرف جنسی خواہش کی تکمیل اور ہوس رانی نہ ہو؛ بلکہ جسمانی تعلق خاندان کی ذمہ داریوں کو باہمی اعتماد و اشتراک عمل سے پورا کرنے میں مدد دیتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا :

وَآتُوْا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَن شَيْئٍ مِّنْهُ نَفْساً فَكُلُوْهُ هَنِيْئاً مَّرِيْئاً . (النساء:۴)

اور تم لوگ بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ بیویاں خوش دلی سے چھوڑیں تم کو اس مہر کا کچھ جزو، تو تم اس کو کھاؤ مزیدار اور خوشگوار سمجھ کر۔

مہر بیوی کا حق ہے اور اس کی ادائیگی شوہر کی ذمہ داری ہے، مہر کے مقرر کرنے میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے مرد اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ عورت معاشی و اقتصادی اعتبار سے بھی مرد سے علاحدہ اپنی شخصیت رکھتی ہے، یہیں سے اس کی مال پیدا کرنے والی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے وہ آزادانہ طور پر معاشی سرگرمی اختیار کر سکتی ہے۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ قاضی اور نکاح خواں اصحاب نکاح کے موقع پر مہر کے لئے 'بہ عوض' کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیا یہ صحیح ہے؟ علماء کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس نکتہ پر غور کر کے رہنمائی کریں، مہر عورت کی قیمت خرید نہیں ہے اور عورت قابل خرید و فروخت جنس نہیں ہے۔

جن رشتوں میں نکاح کو حرام قرار دیا گیا ہے، قرآن مجید میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

وَلاَ تَنكِحُوْا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَآءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتاً وَسَآءَ سَبِيْلاً ، حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ

وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا . (النساء:۲۲-۲۳)

اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ دادا یا نانا نے نکاح کیا ہو، مگر جو بات گزر گئی گزر گئی ، بے شک (عقلاً) بھی بڑی بے حیائی اور نہایت نفرت کی بات ہے اور (شرعاً) بھی بہت برا طریقہ ہے، تم پر حرام کی گئی ہیں: تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں، اور تمہاری خالائیں، اور تمہاری بھتیجیاں اور بھانجیاں، اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہے، اور تمہاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے ہیں، اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو کہ پرورش میں رہتی ہیں، ان بیویوں سے کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو، اور اگر تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور ان بیٹوں کی بیویاں جو کہ تمہاری نسل سے ہوں، اور یہ کہ تم دو بہنوں کو ایک ساتھ رکھو؛ لیکن پہلے جو ہو چکا، بے شک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے رحمت والے ہیں۔

اس آیت سے یہ واضح ہے کہ چچازاد بہنوں سے نکاح حرام نہیں ہے، جس کا رواج ہندوستان کے بعض مسلم معاشروں میں پایا جاتا ہے، جن رشتوں میں نکاح کی ممانعت قرآن میں کی گئی ہے تو چار جہتیں سمجھ میں آتی ہیں، ایک جہت تو خونی رشتہ اور باپ دادا اور نانا کے احترام کی ہے دوسری جہت بیوی کے خونی رشتہ داروں کی ہے، تیسری جہت خود نکلنے والی نسل کی ہے چوتھی جہت ان رشتوں کی ہے جو کسی عورت کے دودھ پلانے سے قائم ہوتی ہے۔

یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے، اسلام میں منھ سے نکلنے والے جملے سے صرف ایک رشتہ قائم ہوتا ہے، جو نکاح کا ہے، منھ کے بول سے نہ کسی کو کوئی اپنا بیٹا یا اپنی بیٹی قرار دے سکتا ہے اور نہ ان منھ بولے رشتہ سے وہ پابندیاں عائد ہوتی ہیں، جن کا ذکر متذکرہ آیت میں کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں منھ بولے رشتوں کے تعلق سے فرمایا گیا ہے کہ :

مَّا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰئِيْ تُظٰهِرُوْنَ

مِنۡهُنَّ أُمَّهَاتِكُمۡ وَمَا جَعَلَ أَدۡعِيَاءَ كُمۡ أَبۡنَاءَ كُمۡ ذَٰلِكُمۡ قَوۡلُكُمۡ بِأَفۡوَاهِكُمۡ وَاللّٰهُ يَقُولُ الۡحَقَّ وَهُوَ يَهۡدِي السَّبِيلَ ، اُدۡعُوهُمۡ لِآبَائِهِمۡ هُوَ أَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ فَإِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوا آبَاءَ هُمۡ فَإِخۡوَانُكُمۡ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمۡ . (الاحزاب:۴-۵)

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے ، اور تمہاری بیوی کو جن سے تم ظہار کر لیتے ہو تمہاری ماں نہیں بنادیا اور تمہارے منھ بولے بیٹوں کو تمہارا سچ مچ کا بیٹا نہیں بنایا ، یہ صرف تمہارے منھ سے کہنے کی بات ہے ، اور اللہ تعالیٰ حق فرماتا ہے اور وہی سیدھا راستہ بتاتا ہے تم ان کو ان کے باپوں کی طرف منسوب کیا کرو ، یہ اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے اور اگر تم ان کے باپوں کو نہ جانتے ہو تو وہ تمہارے دین کے بھائی اور تمہارے دوست ہیں۔

اسلام اس کو پسند کرتا ہے اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر بے سہارا اور یتیم بچوں کی پرورش اور کفالت کو عظیم نیکی قرار دیا گیا ہے ، مگر ان کو اپنی ولدیت دینے یا اپنی بیٹی یا اپنا بیٹا قرار دینے کی ممانعت ہے ، تنظیم اقوام متحدہ نے آفات سماوی یا انسانوں کے ہاتھوں برپا آفتوں میں یتیم اور بے سہارا ہونے والے بچوں کے سلسلہ میں ارکان ممالک سے کہا ہے وہ ان کی کفالت کے لئے تبنیت (Adoption) کے قوانین مدون اور نافذ کریں ، تنظیم اقوام متحدہ کی اس قرارداد میں اسلام کے نظام کفالت یعنی نظام نفقات کا ذکر بھی ملتا ہے ، دنیا کے کئی ممالک میں تبنیت (Adoption) کے قوانین بنائے گئے ؛ لیکن کہیں بھی یہ یتیم و بے سہارا بچوں کی کفالت کا ذریعہ نہیں بنا ، ہندو سماج میں بیٹے کا ہونا مذہبی ضرورت ہے اور کسی کو اولاد نرینہ نہ ہو تو اس کو کسی لڑکے کو گود لینے اور اپنا بیٹا قرار دینے کو مذہبی ضرورت قرار دیا گیا ہے ، اس ہندو قانون کو دیگر شہریوں پر بھی عائد کرنے کے لئے قانون سازی کے خلاف مسلمان مزاحمت کرتے رہے ہیں ، اب سپریم کورٹ کے ذریعہ اس تعلق سے حکومت کے نام ہدایت جاری کروانے کی کوشش ہو رہی ہے ، جس کے خلاف آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سپریم کورٹ میں رجوع ہو چکا ہے ، مغربی ممالک میں بھی تبنیت کا رواج ہے ، یہ رشتہ کتنا مصنوعی اور بے اصل ہے ، اس سے واضح ہے کہ امریکہ کی مشہور فلمی شخصیت کی بیوی وہ چینی نژاد لڑکی ہے ، جس کو اس نے گود لیا تھا اور اپنا نام اس کے باپ کی حیثیت سے رجسٹر کروایا تھا۔

قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں کو باہمی امداد و تعاون کی تلقین کے ساتھ ساتھ نفقات یا کفالت اور میراث کا ایک مکمل اور مربوط نظام عطا کیا ہے ، کسی کو گود لینے یا اس کو اپنا بیٹا یا بیٹی بنا لینے سے یہ سارا نظام بکھر جاتا ہے اور ایک شخص غیر کے میراث کا مستحق قرار پانے سے جن کے حصے قرآن نے مقرر کئے ہیں وہ شدید متاثر ہوتے

ہیں، اور وہ رشتے جن کے درمیان قرآن میں مناکحت کی اجازت دی گئی ہے اور رشتہ ازدواج کے لئے حلال قرار دیئے گئے ہیں حرام قرار پاتے ہیں، قرآنی تعلیمات کی رو سے کسی کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ جس کو اللہ نے حلال قرار دیا وہ حرام قرار دے، یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کو بھی نہیں دیا ہے۔

نکاح کے سلسلہ میں قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ شوہر اور بیوی زندگی بھر رفیق اور ساتھی بنے رہیں؛ لیکن اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ دونوں کے درمیان مختلف وجوہات سے اختلاف پیدا ہو سکتے ہیں، ایسی شکل میں اگر اختلاف کی نوعیت شدید نہ ہو تو ان کو برداشت کرنے کی تلقین کی گئی ہے:

> إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا . (النساء:۱۹)
>
> مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شئے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھی ہو۔

اگر اختلافات کی نوعیت شدت اختیار کرلے تو قرآن کی ہدایت یہ ہے کہ دونوں کے بزرگ مصالحت کی کوشش کریں، یہ ہدایت خاندان اور سماج کو دی گئی ہے:

> وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا . (النساء:۳۵)
>
> اور اگر تم کو ان دونوں میاں بیوی میں کشاکشی کا اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے، اور ایک آدمی جو تصفیہ رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے بھیجو، اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق فرمائیں گے، بلا شبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور بڑے خبر والے ہیں۔

یہاں قرآن مجید نے خاندان کو باہمی کشاکشی اور دراڑ سے دور رکھنے کی ذمہ داری سماج اور اہل خاندان پر عائد کی ہے، سماج کا، خاندان کے بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ مسلم خاندان میں دراڑیں پیدا نہ ہونے دیں اور اس میں ہمواری پیدا کریں، دونوں کے خاندانوں کے حکمین مقرر کرکے صلح وصفائی کروائیں۔

اس کے باوجود اگر باہمی کشاکشی اس نوبت پر پہنچ جائے کہ دراڑ گہری ہوتی جائے اور اس کو پاٹنا مشکل ہو تو

قرآن مجید یہ تعلیم نہیں دیتا کہ باقی زندگی اس جہنم جیسے گھر میں گزاریں؛ بلکہ اس سے باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے، مرد کو ایسی صورت میں جب کہ نباہ کرنا تقریباً ناممکن ہو جائے طلاق کے ذریعہ رشتۂ ازواج کو منقطع کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، طلاق کے سلسلہ میں قرآن مجید میں احکامات سورۂ بقرہ و سورۂ طلاق میں بیان کئے گئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مرد طلاق دینے کے بعد عدت کے دوران عورت کو پھر بیوی بنا سکتا ہے، دوسری مرتبہ طلاق دینے پر بھی دوبارہ بیوی بنائی جاسکتی ہے، مگر تیسری مرتبہ طلاق کے بعد وہ عورت اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے؛ تا آں کہ وہ کسی اور مرد سے بیاہ نہ کرلے اور یہ بیاہ ختم ہو جائے، عدت کے دوران نفقہ جس میں کھانا، کپڑا اور رہائش شامل ہے، مرد کی ذمہ داری قرار دی گئی کہ وہ ان کا انتظام کرے، عدت کے ختم ہونے کے بعد یہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور عورت بھی نئی زندگی شروع کرنے کے لئے آزاد ہو جاتی ہے، کسی عورت کی طلاق یا فنگی اسلام میں اس کے لئے عیب نہیں ہے؛ لیکن ہندوستانی مسلم سماجوں میں ہم وطنوں کے اثرات کے تحت اس کو عیب سمجھا جاتا ہے اور مطلقہ کے لئے عقد ثانی مشکل ہو جاتا ہے۔

ہندو شاستر میں طلاق جیسی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ایسی کوئی حرکت بڑا گناہ ہے، اس لئے ہندو ذہن طلاق کو ایک ناقابل برداشت برائی سمجھتا ہے اور طلاق دینے والے شخص کو مجرم اور مستوجب سزا قرار دیتا ہے، یہ بھی بڑی وجہ ہے کہ جب طلاق کے مقدمات ملکی عدالتوں میں جاتے ہیں تو حاکمانِ عدالت ان کو سنوائی اور فیصلہ میں برسوں لگا دیتے ہیں اور فیصلہ تک طلاق کو تسلیم نہیں کیا جاتا، مفتیانِ کرام و علماء عظام کو ملک میں قانون کی اس صورت حال کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے کہ طلاق کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جائے جب تک کہ طلاق سے پہلے مصالحت کے لئے تحکیم کا عمل نہ ہوا ہو، اس فیصلہ کے لئے حکم مقرر کرنے کے تعلق سے سورۂ نساء کی متذکرہ صدر آیت کو بنیاد بنایا گیا ہے؛ لیکن شقاق سے متعلق اس آیت کے بارے میں اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ تحکیم کو قرآن مجید میں طلاق کے لئے شرط قرار نہیں دیا گیا ہے، سپریم کورٹ کے متعدد فیصلے ہیں جن میں مطلقہ عورت کو، خود اس کی کوئی آمدنی نہ ہونے کی صورت میں، تا عقد ثانی ورنہ زندگی بھر سابقہ شوہر سے نفقہ پانے کی مستحق قرار دیا ہے، یہ بھی دراصل ہندو ذہن کی پیداوار ہے کہ طلاق دینے والے مجرم کو یہ مالی سزا دی جائے، دلیل یہ جاتی ہے کہ مطلقہ کا عدت کے بعد گزارہ کیسے ہو؟ اسلام کسی عورت کو زندگی کے کسی مرحلہ میں بے سہارا نہیں چھوڑتا ہے، مطلقہ عورت کا گزارہ اگر اس کی اولاد ہو تو ان کی ذمہ داری بن جاتا ہے، پھر ماں باپ اور پھر بھائی بہن اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور اگر یہ بھی نہ ہوں اور ہوں تو نادار ہوں تو مطلقہ عورت ان تمام رشتہ داروں سے جو اس کے وارث ہو سکتے ہیں وہ وراثت میں اپنے تناسب کی حد تک وہ نفقہ ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، طلاق کے نفاذ اور مطلقہ

کے حقوق کے تعلق سے سپریم کورٹ کے یہ فیصلے ملک کا قانون ہیں اور تمام عدالتیں ان کے مطابق فیصلہ دینے کی پابند ہیں۔

طلاق کے دو نقاطِ نظر پائے جاتے ہیں :

ایک یہ کہ مرد کے اختیار پر پابندی لگائی جائے ، ایک حدیث شریف کے مطابق طلاق ایسا جائز عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے ، اسی لئے قرآن مجید میں شوہر و بیوی کی ناچاقی کو ختم کرنے کی کئی تدابیر بیان کی گئی ہیں ، مگر جب شوہر عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ایک عذاب محسوس کرے تو اس کو یہ اختیار دیا گیا ہے ، طلاق کو منع کرنے ، محدود کرنے یا عدالت کے فیصلے کا پابند کرنے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص عورت کے ساتھ بحیثیت شوہر نہ گزر بسر کرنے کا فیصلہ کرے تو عدالت ان کو ایک چھت کے نیچے تو رکھ سکتی ہے ، مگر مرد کو شوہری کے حق کو ادا کرنے پر دنیا کی کوئی طاقت مجبور نہیں کرسکتی۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عورت کو بھی طلاق دینے کا اختیار دیا جائے ، اس کا مطالبہ کرنے والے اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ دونوں صنفوں کی جسمانی ساخت ہی مختلف نہیں بلکہ دونوں کی نفسیاتی ساخت میں فرق ہے ، علم نفسیات کی جدید تحقیقات اس حقیقت کو واضح کرتی جارہی ہیں ، رحم مادر ہی میں صنفی اختلاف کا آغاز ہوجاتا ہے ، جو عمر کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے ، ایک خاندان میں مرد کی حیثیت دماغ کی ہوتی ہے تو عورت کی حیثیت دل کی ہوتی ہے ، دل جذبات اور احساسات کا مرکز ہے اور یہی دل اور اس کے احساسات جن میں نرمی ، شفقت اور محبت شامل ہیں ، بچوں کی شفقت اور محبت سے پرورش کرنے میں بڑی مدد کرتے ہیں ، عورت دل سے سوچتی ہے اور اس میں زود رنجی شامل ہے ، جو ذری ذری بات پر طلاق کا مطالبہ بن سکتی ہے ، اس لئے خاندان کے استحکام کی برقراری کی خاطر عورت کو طلاق کا اختیار دینا مناسب نہیں ہے ، دوسرے یہ ہے کہ طلاق کی صورت میں مرد پر کئی مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ، اگر مہر ادا نہ کیا ہو تو اس کو ادا کرنا ہے ، عدت کے ایام کے نفقہ کے اخراجات کو برداشت کرنا ہے ، اگر مطلقہ اس کی اولاد کو دودھ پلا رہی ہے تو اُجرت رضاعت ادا کرنا ہے اور جو اس کی حضانت میں ہیں ان کے اخراجات کے ساتھ اُجرت حضانت ادا کرنا ہے ، جب کہ طلاق عورت پر کوئی مالی ذمہ داری عائد نہیں کرتی ، کیا یہ بات فطری انصاف کے خلاف نہ ہوگی کہ کسی ایسے معاہدہ کو توڑنے کا حق اس فریق کو دیا جائے ، جس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ؟!

عورت کے لئے البتہ قرآن مجید نے خلع کی صورت پیش کی ہے :

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضاً فَلاَ جُنَاْحَ عَلَيْهِمَا أَن

يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ . (النساء:۱۲۸)

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر پر غالب احتمال بد دماغی یا بے پروائی کا ہو تو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ دونوں باہم خاص طور پر صلح کرلیں اور یہ صلح بہتر ہے۔

خلع کے سلسلہ میں مرد کی رضامندی کی شرط بھی اس لئے ہے کہ علاحدگی کی صورت میں جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان پر غور کر کے فیصلہ کا موقع ملے۔

بیاہ یا نکاح کے تعلق سے ساری دنیا میں اس کے رجسٹریشن اور اس کا ریکارڈ کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، جہاں تک شوہر اور بیوی کے حقوق کا تعلق ہے رجسٹریشن کے ذریعہ ان کا تحفظ ہوگا؛ لیکن نکاح کے تسلیم کئے جانے کے لئے ایسی شرائط کو عائد کرنا جو قرآن مجید نے عائد نہیں کی ہیں، غلط ہے اور ان کو مسلمان کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا۔

شوہر اور بیوی کے درمیان علاحدگی، نکاح، طلاق یا کسی اور شکل میں، اس کے بارے میں کوشش جاری ہے کہ علاحدگی کو عدالت کے فیصلہ کا پابند کیا جائے اور جب تک علاحدگی کی وجوہات عدالت کے لئے معتبر نہ ہوں، علاحدگی نہیں ہوسکتی۔

قرآن مجید میں ان اُمور کو عدالت یا کسی سرکاری محکمے کے حکم کا پابند نہیں کیا گیا، ان اُمور کو دونوں پر یا پھر مسلم سماج پر چھوڑ دیا گیا ہے، یہ بات مسلم سماج کے لئے قوت کا سبب ہے کہ سیاسی اقتدار حاصل ہو کہ نہ ہو سرکار اور حکومت کی مداخلت سے آزاد یہ انجام پاتے ہیں، جو لوگ علاحدگی کو سرکار یا عدالت کے فیصلے کا پابند بنانا چاہتے ہیں وہ دراصل شریعت اسلامی میں مداخلت کی راہ ہموار کر رہے ہیں، بات اگر طلاق کے واقعات کو کم کرنے کی ہے تو اس کے لئے مسلمانوں کو قرآن کی تعلیمات اور زن وشو کے تعلق سے ان کے حقوق اور ذمہ داریوں سے واقف کرانا اور ان تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کا شعور پیدا کرنا ضروری ہے، جب تک ذہن ودماغ میں، انفس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، باہر کی زندگی میں، آفاق میں تبدیلی نہیں آسکتی، قرآن مجید کی تعلیمات خاندان کی مضبوطی، اس کے استحکام اور اس کی دیرپائی کی ضامن ہیں۔

قرآن مجید میں جن سماجی اقدار کو پیش کیا گیا ہے، ان میں خاندان کے مرکزہ کے اطراف جو شوہر اور بیوی پر مشتمل ہوتا ہے، حقوق اور ذمہ داریوں کے کئی دائرے بنتے ہیں، ان میں اہمیت والدین کے حقوق کی ہے، قرآن مجید میں کئی مقامات پر، ان مقامات پر جہاں گزشتہ اُمتوں کو پیش کی گئی نیکیوں کا ذکر ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ والدین کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا گیا ہے، سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ

الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيمًا ، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْراً . (بنی اسرائیل:۲۳-۲۴)

اور تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اس کے کسی اور کسی عبادت مت کرو اور تم اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی ہاں سے ہوں بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے نرمی سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دُعا کرتے رہنا کہ میرے پروردگار دونوں پر رحمت فرمایئے ؛ جیسا کہ انھوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا۔

سورۂ لقمان میں فرمایا گیا :

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْناً عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيْرُ ، وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفاً وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ . (لقمان:۱۴-۱۵)

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے، تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کرو، میری طرف لوٹ کر آنا ہے اور اگر تجھ پر وہ دنوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو، تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا اور اس کی راہ پر چلنا جو میری طرف رُجوع ہو، پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے، پھر میں تم کو بتلاؤں گا جو کچھ تم کرتے تھے۔

اس آیت شریفہ میں والدین کے مشرک و غیر مسلم ہونے کی صورت میں بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی گئی کہ شرک کے مطالبہ کو ماننے کو چھوڑ کر دیگر معاملات میں ان کی فرماں برداری کرنا اور ان کی ضرورتوں کا خیال کرنا اور ادب و تعظیم کے ساتھ ان سے برتاؤ کرنا۔

قرآن مجید کی تعلیم آج کے دور میں جب کہ جوہری یا نیوکلیائی (Nuclear) خاندان کا نقطۂ نظر عام ہوتا

جارہا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے، ماں باپ سے ادب وتعظیم کا برتاؤ مسلم خاندان کی اہمیت خصوصیت رہا ہے، انھیں ایسے ناموں سے پکارا جاتا تھا جن میں ادب جھلکتا تھا اور تعظیم کا جذبہ نظر آتا تھا؛ لیکن آج کل مغرب میں مروج الفاظ کے رواج کے بڑھنے سے یہ کیفیت ختم ہو رہی ہے۔

حقوق اور ذمہ داریوں کی دوسری جہت اولاد ہے، ماں دودھ پلاتی ہے، باپ ان کی پرورش اور تربیت کا ذمہ دار ہے، یہ محبت کے فطری تقاضوں میں شامل ہے، مگر محبت ومہربانی کے حدود مقرر کئے گئے ہیں، اولاد کو قرآن مجید میں آزمائش بھی قرار دیا گیا ہے؛ کیوں کہ صرف پرورش کرنا ہی ذمہ داری نہیں؛ بلکہ اس کے ساتھ ان کو ایمان والا بنانا اور اسلامی تعلیمات سے آراستہ کرنا بھی ذمہ داری ہے، آج کے ماحول میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے، تعلیم ضروری ہے، پہلی تعلیم دین کی ہے اور پھر دنیاوی علوم کی تعلیم، دنیاوی تعلیم سے قرآن مجید منع نہیں کرتا؛ بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے؛ لیکن پہلی تعلیم دین وایمان کی ہونی چاہئے، آج کل مسلم سماجوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کو تعلیم دلانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے؛ تاکہ پڑھ لکھ کر یہ کھانے کمانے کے قابل بن سکیں اور کسی کے دست نگر نہ رہیں، زیادہ سے زیادہ توجہ تعلیم کے ان شعبوں پر ہے جن میں زیادہ کمانے کے امکانات اور مواقع ہیں، یہ رجحان یکسر غلط نہیں ہے؛ لیکن دین کی تعلیم کو نظر انداز کر دینا بہت بڑی غلطی ہے، جس کے نتیجہ میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کی غیر مسلم لڑکوں سے شادی کے دلدوز واقعات پیش آتے ہیں، ایک اور سماجی مسئلہ پیدا ہو رہا ہے جو کسی وقت بھی بڑی بھیانک شکل اختیار کر سکتا ہے، یہ مسئلہ پیشہ ور طبقات میں نمایاں ہے، لڑکے جب اتنی تعلیم حاصل کر لیتے ہیں کہ وہ پیشہ میں ہاتھ بٹا سکیں اور کاروبار میں شریک ہو جائیں تو ان کی تعلیم چھڑا دی جاتی ہے، جب کہ لڑکیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ان لڑکیوں کے موزوں جوڑا جو تعلیم میں برتر نہیں تو مساوی ہو اور مسلمان ہو کہاں سے آئے، اس مسئلہ پر ملت کے درد وفکر رکھنے والوں کو غور کرنا چاہئے۔

سماجی ذمہ داریوں کی بات صرف والدین اور اولاد پر ختم نہیں ہوتی؛ بلکہ قرابت دار بھی شامل ہیں، قرآن میں اقربا کے تعلق سے ذمہ داریوں کا تذکرہ کئی مقامات پر ملتا ہے، مشہور آیت جس میں قرآن مجید نے نیک اعمال کا ذکر کیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَـٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى
حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي
الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوْا

وَالصَّابِرِيْنَ فِيْ الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ . (البقرۃ:۱۷۷)

کمال اس میں نہیں کہ تم اپنا منھ مشرق کو کرلو یا مغرب کو؛ لیکن اصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتب سماویہ پر اور پیغمبروں پر، اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور بے خرچ مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں، نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کرلیں، اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں، یہ لوگ ہیں جو سچے کمال کے ساتھ موصوف ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی کہے جاسکتے ہیں۔

اسی سورۂ بقرہ کی ایک اور آیت میں فرمایا گیا :

يَسْأَلُوْنَكَ مَاذَا يُنفِقُوْنَ قُلْ مَا أَنفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللهَ بِهِ عَلِيْمٌ . (البقرۃ:۲۱۵)

لوگ (اے پیغمبر) آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں، آپ فرمادیجئے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا اور جو نیک کام کرو گے سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔

ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہے کہ سماجی ذمہ داریوں میں ترجیح ماں باپ، اولاد اور اقارب کو ہے؛ لیکن ان ذمہ داریوں میں یتیم اور محتاج بھی شامل ہیں، یتیموں اور محتاجوں کی مدد، ان کی دستگیری کے بارے میں قرآن مجید کی کئی مقامات پر احکامات ملیں گے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید جس سماجی نظم کو پیش کرتا ہے اس میں سماج کے محروم اور دست نگر افراد کی کفالت بھی شامل ہے، گو نفقہ کا نظام خاندان اور اقربا تک محدود ہے، جو شرعاً قابل نفاذ ہیں، یتیموں کی کفالت اور محتاجوں کی احتیاجات پر توجہ بھی اسلامی سماج کی خصوصیت ہے، اس طرح ایک اسلامی سماج ایک خود کار نظام بن جاتا ہے، جس کو باہر سے کسی تحریک اور دباؤ اور مدد کی ضرورت نہیں ہے، ایسا ہی اسلامی

سماج وجود میں لانے کی کوشش ہونی چاہئے۔

قرآن مجید کے سماجی اقدار کی بات ادھوری رہ جائے گی، اگر اس کے قانون میراث کا ذکر نہ کیا جائے، سورۂ نساء میں میراث کے احکامات بیان کئے گئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کے علاوہ عورتوں کو بھی وراثت میں حق دیا گیا ہے، قرآن مجید میں جس وقت اس کا اعلان کیا گیا دنیا میں کہیں بھی عورت میراث کی حقدار نہیں تھی، ہندو شاستر میں بھی عورت کو کوئی حصہ نہیں دیا گیا، قرآن مجید کی رو سے ماں اور بیٹی کے علاوہ بعض صورتوں میں بہنیں بھی میراث میں حصہ پاتی ہیں، میراث میں حصہ کے تعلق سے بڑا اعتراض اس پر کیا جاتا ہے کہ بیٹی کے مقابلے میں بیٹے کو دو حصے دیئے جاتے ہیں، اگر اس فرق کی وجہ پر غور کیا جائے تو یہ محسوس کرنا مشکل نہیں ہے، یہ بالکل عادلانہ ہے، خاندان کے تعلق سے سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ مرد پر، بیٹے پر ہے جب کہ عورت یا بیٹی پر ایسا کوئی بوجھ نہیں رکھا گیا ہے، اس لئے اُصول یہ ہے کہ جس کی جتنی ذمہ داری اس کا اتنا حق، ذمہ داری زیادہ ہو تو حق زیادہ، ذمہ داری کم ہو تو حق کم، یہ بالکل عدل اور انصاف کی بات ہے، ایک اور یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ کسی شخص کے بیٹے یا بیٹی کا انتقال اس کی زندگی میں ہو گیا ہو تو ان انتقال کرنے والوں کی اولاد کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملتا، یہ بھی اُصولی بات ہے، کسی شخص کی مال و جائیداد جب تک وہ زندہ ہے اس کی اپنی ہے چاہے یہ وراثت میں ملی ہو یا مکسوبہ ہو، یہ مال اس کے انتقال پر ہی میراث بنتا ہے اور دوسروں کے حقوق پیدا ہوتے ہیں، اگر اس میں مرحوم بیٹے یا بیٹی کی اولاد کا حصہ مقرر کیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ والد کی زندگی ہی میں اولاد کا حق پیدا ہو گیا تھا، یہ خلاف اُصول بات ہے، اولاد کی پیدائش کے ساتھ ہی باپ کے مال میں حق کو جن مذاہب نے تسلیم کیا ہے، وہاں اختلافات اُبھرتے رہتے ہیں، ایک شخص سخت ضرورت کے تحت بھی اپنی جائداد فروخت نہیں کر سکتا؛ کیوں کہ اس میں اس کی اولاد کا حق ہے اور اولاد مخالفت کرے تو اس کو زندگی بھر مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

قرآن مجید میں جن سماجی اقدار کو پیش کیا گیا، ان پر عمل کے نتیجہ میں ایک ایسا سماج وجود میں آتا ہے جو زندگی کو خوشگوار بناتا ہے، دردمندی اور غم خواری پیدا کرتا ہے، یتیموں اور محتاجوں کو سہارا دیتا ہے اور اس کی خودکاری اس کو حالات کے سرد و گرم کا مقابلہ کرنے کے قابل بنائے رکھتی ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

سماجی زندگی سے متعلق قرآن مجید کی چند اہم تعلیمات

مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی⊙
omarabedeen@gmail.com

انسان کی تعریف ''سماجی حیوان'' سے کی گئی ہے؛ کیوں کہ دنیا کے بہت سے جاندار ایسے ہیں جو خاندان اور سماج کے بغیر زندگی گزار سکتے ہیں؛ لیکن انسان کو قدم قدم پر انیس وغمگسار کی ضرورت پیش آتی ہے اور تنہا اس کے لئے زندگی بوجھ بن جاتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے سماج کو بڑی اہمیت دی ہے، قرآن نے شعوب وقبائل کو اپنی نعمتوں میں شمار کیا ہے: ''وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا'' (الحجرات:۱۳)، نسبی اور سسرالی خاندان کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے (الفرقان:۵۴)؛ چنانچہ چند خاندان مل کر ہی سماج بنتا ہے، اس لئے قرآن مجید کی نظر میں سماج کی بڑی اہمیت ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں عبادات سے زیادہ سماجی زندگی کے احکام ہیں، نماز کے احکام اتنی تفصیل سے نہیں بتائے گئے ہیں، جتنی تفصیل کے ساتھ نکاح وطلاق کا ذکر آیا ہے اور میراث ووصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز قابل غور بات یہ بھی ہے کہ خاندانی اور سماجی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے متعدد مواقع پر قرآن نے ''تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلاَ تَعْتَدُوْهَا'' (البقرة:۲۲۹) (یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، سوان سے آگے مت بڑھو) ''وَمَن يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللهِ فَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ '' (یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرنا اور جو لوگ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جاتے ہیں وہی ظالم ہیں) (آسان ترجمہ وتشریح:۱۱۳) کی تعبیر یا اس طرح کے ہم معنی الفاظ استعمال کئے ہیں، گویا سماجی زندگی کے احکام ''حدود اللہ'' کے درجہ میں ہیں اور ان سے تجاوز کرنا اللہ کی قائم کی ہوئی سرحدوں کو پھاندنے کے مترادف ہے۔

قرآن مجید کے دیئے ہوئے سماجی زندگی کے احکام نہ صرف اخلاق کے محافظ ہیں؛ بلکہ ان سے دنیا کی فلاح وبہبود بھی متعلق ہے اور یہ خوش گوار زندگی کے لئے کلید کا درجہ رکھتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے بیشتر نظامہائے

⊙ استاذ شعبۂ حدیث وفقہ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

قانون نے کسی نہ کسی درجہ میں شریعتِ اسلامی سے فائدہ اُٹھایا ہے اور جہاں کہیں بھی ان تعلیمات سے انحراف کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں بے حیائی ، اخلاقی پستی ،جنسی انارکی ، خاندانی بکھراو ، خواتین کے ساتھ ظلم و زیادتی اور بچوں کے حقوق کے تئیں لاپرواہی ؛ ہی ہاتھ آئی ہے ، موجودہ مغربی معاشرہ اور ایشیاء و افریقہ کا مغرب زدہ طبقہ اس کی جیتی وجاگتی مثال ہے۔

سماجی زندگی سے متعلق قرآن مجید کی تعلیمات کا دائرہ بہت وسیع ہے ، زیرتحریر مقالہ میں ان کا احاطہ مشکل بھی ہوگا اور طوالت کا باعث بھی ، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سماجی زندگی سے متعلق قرآن مجید کی چند اہم اور بنیادی تعلیمات کا ذکر کیا جائے ، نیز ان سے انحراف کے نتیجہ میں مغرب اور انسانی سماج کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا جائزہ بھی لیا جائے۔

۱- انسان کے لئے سماج اور اجتماعی زندگی کی اہمیت

قرآن مجید نے انسانی سماج کے تشکیلی عناصر اور اجتماعی و معاشرتی زندگی سے انسان کے فطری لگاؤ کو متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے ؛ چنانچہ ارشاد باری ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا . (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت (آدم وحوا) سے پیدا کیا ہے ، ساتھ ہی تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے ؛ تا کہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو۔

مذکورہ آیت میں نسل انسانی کی بنیاد یا بالفاظ دیگر انسانی سماج کے تشکیلی عناصر کی طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ سب کے سب آدم وحوا کی ذریت ہیں۔

یہ بات بھی بتلا دی گئی کہ خود خالق کائنات نے انسان کی فطرت میں شعوب وقبائل سے انتساب اور اجتماعی و معاشرتی زندگی سے لگاؤ رکھا ہے ، آیت میں اس بات کا بھی اظہار ہے کہ مختلف خاندانوں سے مل کر تشکیل پانے والا سماج اللہ کی اہم ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا . (النساء:۱)

اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے
پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور ڈرتے رہو اللہ
سے جس کے واسطے سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے،
بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

اس آیت سے یہ بات واضح طور پر سمجھی جاسکتی ہے کہ بندگان خدا پر اللہ تعالیٰ کے مختلف حقوق ہیں اور ان حقوق کی مکمل پاسداری اسی وقت ممکن ہوگی، جب کہ خود بندگان خدا کے حقوق کی رعایت کی جائے اور رشتہ داروں کے واجبات کی ضمانت دی جائے۔

اس بات کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا کہ جس طرح انسان اپنے خالق سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، اسی طرح وہ رحم کے رشتہ داروں سے بھی بے تعلق نہیں رہ سکتا ہے۔

اس بات کا اظہار بھی ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق سے راہ فرار اختیار کرنے والے اور سماجی ذمہ داریوں سے گریز کرنے والے یاد رکھیں کہ ''اللہ تعالیٰ ہر وقت ان کی نگرانی کررہا ہے''۔

مذکورہ قرآنی مضامین کو ان کی اہمیت کے پیش نظر خود زبانِ رسالت ﷺ سے بھی بیان کروایا گیا ہے؛ چنانچہ اسلام میں اجتماعی زندگی کی اہمیت کا اندازہ، رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بھی لگایا جاسکتا ہے :

المؤمن الذی یخالط الناس ویصبر علی أذا هم ؛ أعظم أجراً من المؤمن الذی لا یخالط الناس ، ولا یصبر علی أذاهم . (۱)

وہ مومن جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی ناگوار چیزوں پر صبر و برداشت سے پیش آتا ہے، وہ زیادہ اجر و ثواب کا حقدار ہے؛ بہ نسبت اس مرد مومن کے جو الگ تھلگ رہتا ہے اور لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت نہیں کرپاتا ہے۔

اور سنن ترمذی کی روایت میں کسی قدر فرق کے ساتھ یہ حدیث اس طرح نقل کی گئی ہے :

المسلم اذا کان مخالطا الناس ویصبر علی أذاهم خیر من المسلم الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی أذاهم . (۲)

---

(۱) سنن ابن ماجه، حدیث نمبر:۴۰۲۲، باب الصبر علی البلاء۔

(۲) سنن الترمذی، حدیث نمبر:۲۴۳۱۔

وہ مسلمان جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف دہ باتوں پر صبر سے پیش آتا ہے وہ کہیں بہتر ہے اس مسلمان سے جو عزلت پسند ہو اور لوگوں سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر نہ کر پاتا ہو۔

ایک اور حدیث میں اجتماعی زندگی کی بڑی مؤثر دعوت دی گئی ہے اور اسے جہانِ آخرت میں کامیابی کی کلید بتلایا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا :

حوسب رجل ممن كان قبلكم، فلم يوجد له من الخير شيئ، الا أنه كان يخالط الناس وكان موسرا، فكان يأمر غلمانه أن يتجاوزوا عن المعسر، قال : قال الله عزوجل : نحن أحق بذلك منه، تجاوزا عنه . (۱)

پچھلی اُمتوں میں سے ایک شخص کا حساب و کتاب کیا گیا، تو اس کے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی و بھلائی نہیں پائی گئی، سوائے اس بات کے کہ وہ شخص لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا تھا، نیز وہ معاشی اعتبار سے خوش حال تھا اور وہ اپنے بچوں کو یہ ہدایت دیتا تھا کہ غریب و تنگ دست لوگوں سے درگذر کیا کریں، پھر رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں : ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا معافی اور درگذر کرنا تو سب سے زیادہ ہمارا کام ہے؛ لہٰذا اس شخص سے بھی درگزر کیا جائے''۔

اجتماعی زندگی کی بنیاد باہم خیر خواہی اور آپسی محبت و اُلفت پر ہوتی ہے، اس کے بغیر پاکیزہ سماج اور مہذب معاشرہ کی داغ بیل نہیں ڈالی جاسکتی، اسلام نے ان بنیادوں کو بھی مضبوط کیا ہے، ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

المؤمن مؤلَف، ولا خير فيمن لا يألف ولا يؤلف . (۲)

مؤمن سراپا اُلفت و محبت ہے اور اس شخص میں کوئی خیر و بھلائی نہیں، جو نہ دوسروں سے محبت کا برتاؤ کرتا ہو اور نہ دوسرے اس سے محبت کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیتوں اور ذخیرۂ احادیث پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو بے شمار تعلیمات و ہدایات نظر آتی ہیں، جن میں عزلت کے بجائے اجتماعیت، رہبانیت کے بجائے مدنیت، انسانیت بیزاری کے بجائے خلق خدا سے

(۱) صحیح مسلم: ۲۹۲۱، باب فضل إنظار المعسر۔

(۲) مسند احمد، حدیث نمبر: ۸۸۳۱، مسند ابی ہریرہؓ، مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۵۸۔

محبت و اُلفت کا درس دیا گیا ہے، ناگوار اور تکلیف دہ باتوں سے نمٹنے کے لئے نفرت و عداوت کے بجائے صبر و برداشت کی تلقین کی گئی ہے، مسائل زندگی سے گھبرا کر کوہ و کہف اور جنگل و صحرا کا رُخ کرنے کے بجائے، ان سے نمٹنے اور برتنے کے شاہکار اُصول دیئے گئے ہیں، انسانوں کے باہم حقوق اور ذمہ داریوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، غرض کہ اجتماعی زندگی کی اہمیت اور اس کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور شاید ہی کوئی ایسا ناحیہ ہو جو تشنہ لب ہو! یہ چند اشارے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں سماجی و معاشرتی زندگی کی کس قدر اہمیت ہے — حیف صد حیف ان زاہدان کج خیال پر ہے جو زہد و تصوف اور احسان و سلوک کے نام پر انسانوں کے بجائے چرند و پرند کے درمیان امن و سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، مسائل زندگی سے نمٹنے کے بجائے ان سے گریزاں نظر آتے ہیں، درد کی ماری انسانیت کے لئے ان کی جبین نیاز پر شکن دیکھائی دے یا نہ دے، مگر خاک صحرا کی دھول ضرور نظر آتی ہے!

۲- نکاح — قرآن مجید میں

ایک ''سماج'' چند افراد اور خاندانوں کے ذریعہ وجود میں آتا ہے، گویا کہ سماج کی بنیاد اور تخم اول ''نکاح'' ہے، اس کے بغیر قانون فطرت پر مبنی سماج اور صالح انسانی معاشرہ کی تشکیل ناممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب اور نظامہائے قانون میں نکاح کو اہمیت دی گئی ہے اور یہ دراصل انسان کی ایک فطری اور طبعی ضرورت کو جائز طریقہ پر انجام دینے کا نام ہے۔

اسلامی شریعت کا ایک بنیادی امتیاز، انسان کی فطرت سے حد درجہ ہم آہنگی اور انسانی مزاج و مذاق کی مکمل رعایت ہے؛ چنانچہ اسلام سے قبل کچھ مذاہب ایسے بھی تھے جو تجرد اور بن بیاہی زندگی کو خدا سے تقرب کا اہم ذریعہ تصور کرتے تھے اور جنسی ضروریات کی تکمیل کو'' روحانی ارتقاء'' میں رکاوٹ جانتے تھے، ایران کا ''فلسفۂ مانی'' اور عیسائیوں کے طریقۂ رہبانیت کی بنیاد اسی نقطۂ نظر پر تھی، نیز ہندو مذہب کے دینی طبقہ اور رُشیوں میں بھی تجرد اور سنیاس کا مزاج عام تھا اور آج بھی یہ تصور پایا جاتا ہے۔

دوسری طرف مغرب کا وہ ''فلسفۂ حیات'' جس نے صنفی تعلقات کو تمام تر اخلاقی حدود سے آزاد رکھنا چاہا ہے اور بے حیائی کی وہ تصویر پیش کی کہ حیوان بھی انھیں دیکھ کر ننگ و عار محسوس کریں، اسلام نے اس افراط و تفریط سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اعتدال کی راہ پیش کی ہے، وہ نہ صرف نکاح اور ازدواجی زندگی کی ترغیب دیتا ہے؛ بلکہ اسے اجر و ثواب کے اعتبار سے ''عبادت'' کے دائرہ میں رکھتا ہے۔

نسل انسانی کی مقدس ترین ہستیاں انبیاء اور پیغمبروں کی ہیں، جو تقویٰ و ربانیت کے پیکر تھے، قرآن نے

ان کے متعلق بھی ذکر کیا ہے کہ وہ شادی بیاہ بھی کرتے تھے اور صاحب اولاد بھی تھے :

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجاً وَذُرِّيَّةً . (الرعد:۳۸)

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپ ﷺ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ان کو ہم نے اہل وعیال والا بنایا۔

گویا کہ نکاح ایک انبیائی سنت ہے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ: ایمان اور نکاح دو عبادتیں ایسی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام شریعتوں کا حصہ رہی ہیں اور جنت تک باقی رہیں گی۔

نکاح کے مقاصد

قرآن مجید نے بڑی باریکی کے ساتھ نکاح کی فطری ضرورت اور اس سماجی قانون کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، ذیل میں ان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :

۱- ذریعہ سکون : قرآن مجید نے مختلف مقامات پر وضاحت کی ہے کہ نکاح باہمی اُلفت ومحبت اور باہمی تسکین وطمانینت قلب کا ذریعہ ہے، ارشاد باری ہے :

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا . (الاعراف:۱۸۹)

وہ اللہ ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا؛ تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

یہی بات سورۂ روم میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کی گئی کہ :

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ . (الروم:۲۱)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے؛ تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی ہے، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے اہل وعیال کو آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحت کا سبب بھی بتایا ہے؛ بلکہ یہ دُعاء سکھائی ہے :

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَاماً . (الفرقان:۷۴)

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیوی اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطاء فرما اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا۔

بلاشبہ ایک انسان کے لئے ''سکون وطمانیت'' حیات عزیز کی سب سے قیمتی متاع ہے اور مال وزر اس کے مقابلہ میں ہیچ و بے قیمت ہیں، ملحوظ رہے کہ یہاں سکون سے مراد محض جسمانی اور صنفی سکون نہیں ہے؛ بلکہ یہ لفظ اپنے وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا؛ چنانچہ ذہنی وفکری، طبعی وقلبی اور صنفی وجسمانی ہر طرح کا سکون شامل ہے اور قرآن کے مطابق یہ سب نکاح کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں۔

۲- جنسی ضرورت کی تکمیل : اللہ تعالٰی کے تخلیقی نقشہ کے مطابق جس طرح انسانی جسم کو ضرورت ہے غذا وپانی کی، آکسیجن اور مختلف جسمانی مکونات کی؛ اسی طرح جسم کی ایک بنیادی ضرورت جنسی خواہشات کی تکمیل بھی ہے، اسلام نے اس فطری ضرورت کا مکمل لحاظ رکھا ہے اور جائز طریقہ سے اسے پورا کرنے کی نہ صرف ترغیب دی ہے؛ بلکہ بسا اوقات اسے واجب بھی قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے :

فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ . (النساء:۲۴)

پھر جس کو کام میں لائے تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دوان کے حق جو مقرر ہوئے۔

۳- عفت و پاکدامنی : نکاح کا ایک اہم ترین مقصد انسانی سماج کو عفت و پاکدامنی سے آراستہ رکھنا اور نسل انسانی کی حفاظت کرنا ہے؛ چنانچہ قرآن مجید نے شادی شدہ مرد وعورت کو ''محصن اور محصنہ'' سے تعبیر کیا ہے، (المائدۃ:۵، النساء:۲۴) اسی کی وضاحت زبان رسالت سے یوں کی گئی کہ: ''فانه أغض للبصر واحصن للفرج''(۱) یعنی نکاح نگاہ کو پست رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔

۴- نسل انسانی کی افزائش : قرآن مجید کے مطابق نکاح کا ایک اہم مقصد نسل انسانی کی افزائش اور انسانی تسلسل کا بقا بھی ہے، ارشاد باری ہے :

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ . (النحل:۷۲)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے (اور) پوتے عطا کئے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔

ایک اور مقام پر قرآن مجید نے افزائش نسل کے اس مقصد کو تمثیلی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے: ''نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ'' (البقرۃ:۲۲۳) ''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں''۔

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر:۱۷۷۲، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۴۸۵۔

چنانچہ بیوی کے صنفی تعلق کو کاشت سے مشابہت دی گئی، جس سے ایک بلیغ اشارہ ملتا ہے کہ انسانی آبادی کی تازگی اور شادابی اور تسلسل و بقاء نکاح سے وابستہ ہے۔

۵-اجتماعی تقارب کی بنیاد : نکاح کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ فرد کے دائرہ کو وسیع کرتا ہے، وہ محض زن وشو کی باہمی محبت کا ذریعہ نہیں ہے؛ بلکہ دو خاندان کو جوڑتا ہے اور ہمدردی و غمگساری، محبت و اُلفت اور تعلقات کو نئے آفاق عطاء کرتا ہے، اس طرح وہ دو خاندانوں اور قبیلوں میں تقارب کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ :

> وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَصِهْراً ۔ (الفرقان:۵۴)
>
> اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلہ چلائے۔

تعدد ازدواج (Polygamy)

قرآن مجید کے قانونِ نکاح کے مطابق مردوں کو ایک سے زائد نکاح کی اجازت دی گئی، نہ کہ ترغیب، اسی طرح قرآن نے اس کے لئے ایک بنیادی شرط بھی لگادی ہے اور وہ ہے ''عدل'' کا برتنا اور اسے قائم رکھنا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

> وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوْا فِیْ الْيَتَامَى فَانكِحُوْا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاء مَثْنٰى وَثُلاَثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ۔ (النساء:۳)
>
> اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو عورتوں میں جو تم کو پسند ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو۔

گویا کہ قرآن مجید نے مرد کے لئے ایک سے زائد نکاح کرنے کی مشروط گنجائش رکھی ہے اور بلاشبہ یہ حکم نسل انسانی کے حق میں مفید اور اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہے، مگر اسیرانِ مغرب اور دشمنانِ اسلام کو اس حکم شرعی سے بھی سخت تکدر ہے، خود ہمارے ملک میں صیہونی اور زعفرانی صحافت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس مسئلہ کو اخبارات وجرائد کی شہ سرخی بنا کر اسلام کے تئیں لوگوں کے قلب و ذہن میں نفرت پیدا کی جائے اور مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام سے برگشتہ و بیزار کیا جائے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت نہ صرف اسلام نے دی ہے؛ بلکہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی گنجائش رکھی گئی ہے، یہودی شریعت میں یہ ایک جائز عمل ہے؛ چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

دو بیویوں کا ذکر ملتا ہے (استثناء:۲۴:۱۰۲، ۲۰۲۴) ، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی چھ بیویاں تھیں (گنتی:۸:۲۷) عیسائیت میں چوں کہ احکام شرع کا مصدر تورات کو سمجھا جاتا ہے، اس لئے ان کے ہاں بھی اس کی گنجائش ہے؛ بلکہ سترہویں صدی تک کلیسا اور حکومت دونوں اسے مباح قرار دیتے تھے (۱) ہندو مذہب کی مقدس ترین شخصیت شری رام جی کے والد راجہ دسرت کی تین بیویوں (کوشلیا، کیکئی، سومترا) سے ہر کس و ناکس آگاہ ہے، ڈاکٹر مالک رام کے مطابق رگ وید (۱۰۸۱۰-۱۰۵) میں مرد کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرنا درست قرار دیا گیا ہے، غرض یہ کہ تینوں آسمانی مذاہب اور دیگر قدیم مذاہب جیسے کہ ہندو، جین اور بدھ دھرم میں بھی تعدد ازدواج کو جائز رکھا گیا ہے؛ بلکہ شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جو اسے ناجائز تصور کرتا ہو۔

دوسری طرف اگر عملی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ خود اس ملک میں تعدد ازدواج کا رواج مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں میں پایا جاتا ہے؛ چنانچہ حکومت ہند کی ''وزارت ترقی انسانی وسائل'' کے ذیلی شعبہ ''قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان'' کے تحت شائع شدہ ''جامع اُردو انسائیکلوپیڈیا'' میں یہ تفصیل کچھ اس طرح ذکر کی گئی ہے :

> 1975ء میں شائع ہونے والی ہندوستانی عورت کی حالت کا جائزہ لینے والی کمیٹی کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں سب سے زیادہ قبائلی رکھتے تھے (15.25 فیصد)، بدھسٹ کا نمبر دوسرا ہے (7.97 فیصد)، جین مذہب کے ماننے والے تیسرے نمبر پر ہیں (6.75 فیصد) ہندو حضرات (5.8 فیصد) حالات میں دو بیویاں رکھتے ہیں؛ جب کہ مسلمان صرف (5.7 فیصد) حالات میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں۔ (۲)

مغربی سماج پر ایک نظر

معاصر دنیا میں انسانی تہذیب وتمدن کا ٹھیکیدار امریکہ اور مغربی اقوام کو تصور کیا جاتا ہے؛ چنانچہ بنیادی انسانی حقوق، آزادیٔ نسواں، اختیار اور اظہار رائے کی لامحدود آزادی، جیسے دلکش اور پرکشش نعروں کے ذریعہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسانیت کے اصل مسیحا اور نجات دہندہ یہی حضرات ہیں، بلاشبہ بصیرت وبصارت سے محروم ہیں وہ لوگ جوان کے اس دام فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(۱) اسلام اور جدید فکری مسائل: ۱۷۷۔

(۲) سماجی علوم: ۳/۳۵۸، شادی۔

نکاح جسے تقریباً کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے تمام مذاہب نے قبول کیا ہے، نیز انسانیت کی داغ بیل اور ترقی جس سے وابستہ ہے؛ اس کے تئیں مغربی نقطۂ نظر ملاحظہ فرمائیے، افلاطون کا قول ہے کہ :

> شادی بیاہ ایک مجبوری کی وجہ سے کیا جاتا ہے، کوئی خوشی کا مقام نہیں، ورنہ عورت ایسی چیز نہیں کہ مرد اس سے شادی کرے۔(۱)

عورت کے مقام وحیثیت کے متعلق یہ چشم کشا تحریر بھی ملاحظہ ہو :

> انگلستان میں صدیوں تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ عورتوں میں روح نہیں ہے، ۱۵۸۵ء میں ایک کمیٹی اس امر کی تحقیقات کے لئے بیٹھی تھی کہ عورتوں میں روح ہے یا نہیں؟ اس کمیٹی نے بعد غور وخوض یہ فیصلہ صادر کیا کہ عورتوں میں روح تو ہے، مگر اس لئے ہے کہ وہ مردوں کی تابعداری کریں۔(۲)

شادی جسے ایشیائی معاشرہ میں ''خانہ آبادی'' تصور کیا جاتا ہے، اسے فرزندانِ مغرب حقیقی معنوں میں ''خانہ بربادی'' خیال کرتے ہیں، اس کا اندازہ ان اعداد وشمار اور تجزیاتی رپورٹس سے کیا جاسکتا ہے؛ جن سے حیرت ناک حد تک شادی بیزاری اور شرح نکاح میں کمی کا اظہار ہوتا ہے؛ چنانچہ ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں 1970ء تک 13% لڑکے ایسے تھے جو شادی شدہ زندگی میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور 2002ء تک یہ شرح 42% تک پہنچ گئی ہے، لڑکیوں کی صورت حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی؛ چنانچہ 1970ء میں ایسی لڑکیوں کی شرح 19% تھی، جب کہ 2002ء تک یہ بڑھ کر 33% تک پہنچ گئی، گویا کہ امریکہ میں صرف ۳۲ سال کے عرصہ میں بن بیاہی زندگی گزارنے کا تصور لڑکوں میں 363% اور لڑکیوں میں 169% تک بڑھ گیا، جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس تیزی کے ساتھ امریکی معاشرہ میں نکاح سے بیزاری کا رجحان پروان چڑھتا جارہا ہے، دوسری طرف شادی شدہ جوڑوں میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح اس کے سوا ہے؛ چنانچہ اس سلسلہ میں امریکہ اور یورپ کا حال یہ ہے کہ وہاں 60 سے 70 فیصد شادیاں طلاق پر منتج ہوتی ہیں، اس طرح شادی بیزاری کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف امریکہ میں 40 لاکھ جوڑے ایسے ہیں جو بغیر شادی کے اکٹھے رہ رہے ہیں اور ان میں سے زائد از ایک تہائی جوڑں کے بچے بھی ہیں، اسے مغرب کی دیدہ دلیری کہئے یا بے حیائی کہ انھوں نے ان ناجائز اور بے نسب بچوں کے لئے ایک دیدہ زیب نام بھی تراش لیا ہے؛ چنانچہ وہ اسے سنگل پیرنٹس فیملی (Single Parents Family) کے عنوان سے یاد کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان ملکوں میں ہزاروں لاکھوں افراد ایسے ہیں، جن کو اسکول وکالج کے داخلہ فارم اور سرکاری دستاویزات میں ''ولدیت'' کا خانہ پر کرنے کے لئے کوئی نام میسر نہیں ہے، جن کو اپنے نسب

(۱) خطبات شبلی: ۱۵۵، مرتبہ: سید سلیمان ندویؒ۔ (۲) حوالۂ سابق۔

وحسب اور خاندان ہی کا علم نہیں ہے، اس طرح مغرب میں خاندانی نظام مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے، جس کے نتیجہ میں آنے والی نسل ذہنی تناؤ اور مختلف نفساتی امراض کا شکار ہوتی جارہی ہے، ڈھلتی عمر کے ساتھ خواتین کے لب ورخسار کی سرخی ''سرخی چشم'' میں تبدیل ہوتی جاتی ہے، بوڑھوں کو سماج میں ناکارہ پرزہ اور بوجھ تصور کرلیا گیا ہے، انسانی ہمدردی، جذبۂ ایثار وقربانی، اخلاقی اقدار زندگی کی دہلیز سے نکل کر قرطاس وتاریخ کا حصہ بن گئے ہیں، گویا کہ ایک ایسا سماج جہاں انسانی لباس و پوشاک میں بھیڑیے اور درندے گزر بسر کر رہے ہوں۔

قرآن مجید نے سماجی زندگی سے متعلق جو تعلیمات دی ہیں، ان میں بنیادی اہمیت نکاح کو حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نکاح کی بھرپور حوصلہ افزائی کی ہے اور اس کے ذریعہ سماج کو پہنچنے والے فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے افزائش نسل کی فطری ضرورت پوری ہوتی ہے، پاکیزہ زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، خاندانی نظام مستحکم ہوتا ہے، اولاد کو ماں کی ممتا اور باپ کا پیار ملتا ہے، اس رشتہ ازدواج میں بندھنے کے بعد عورتوں کو ذریعۂ تفریح کے بجائے باعث ''تسکین'' سمجھا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے ایک ایسا سماج وجود میں آتا ہے، جس کی بنیاد خود غرضی اور لذت پرستی کے بجائے ایمان واخلاق اور عدل واحسان پر ہو!

۳- طلاق اور قرآن مجید

شادی بیاہ اور زن وشو کے رشتے کو جہاں قرآن نے نکاح، زوجین وغیرہ سے تعبیر کیا ہے، وہیں ایک اور عمدہ اصطلاح استعمال کی ہے؛ چنانچہ ایک جگہ قرآن مجید نے اسے ''میثاق غلیظ'' (النساء:۲۱) سے بھی تعبیر کیا ہے، عربی زبان کے مطابق میثاق ایسے عہد و پیماں کو کہتے ہیں کہ جو بہت پختہ اور مضبوط ہو اور فریقین کی طرف سے اس عہد کی پاسداری اور تحفظ کی یقین دہانی کی گئی ہو، اور ''غلیظ'' کہتے ہیں انتہائی مضبوط اور ناقابل شکست امر کو، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح کو نہایت پختہ ومضبوط، دائمی اور ناقابل شکست عہد وپیمان قرار دیا ہے، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ رشتہ نکاح مرد وعورت کے درمیان ایک بار قائم ہو جائے تو اسے برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی جائے؛ بلکہ مہر ومحبت خلوص ویگانگت، ایثار ووفاء اور اعتماد کے ذریعہ اسے مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔

مگر یہ بھی حقیت ہے کہ بسا اوقات ازدواجی رشتہ میں تلخی، نفرت و بے اعتمادی اور بے التفاتی در آتی ہے، پھر ایک دوسرے کے ساتھ گزر بسر مشکل ہو جاتا ہے، معاشرت بالمعروف کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے ہیں، گویا کہ میاں بیوی کی جدائی اور طلاق ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے؛ چنانچہ یہاں بھی قرآن مجید نے اس انسانی ضرورت اور طبیعت کا لحاظ رکھا ہے اور خاص حالات میں طلاق کو ایک ''ناپسندیدہ ضرورت'' کی حیثیت سے جائز قرار دیا ہے، طلاق دراصل دو افراد میں بندھی ہوئی رشتہ کی گرہ کو کھولنے کا نام ہے، یا بالفاظ دیگر نکاح کے بعد

رشتۂ ازدواج کو ختم کرنے کا ذریعہ ہے، اس اعتبار سے یہ ایک حساس اور سنگین سماجی مسئلہ ہے، یہ محض دو افراد کی جدائی نہیں ہے؛ بلکہ دو خاندان کے تعلقات میں کدورت ونفرت کی خلیج کا پیدا ہو جانا ہے، بچوں کا ماں باپ کی محبت ومتا میں سے کسی ایک سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانا ہے اور تجربات بتاتے ہیں کہ طلاق کے نتیجہ میں ان معصوموں کی زندگی تلخی، احساس کہتری اور بے کسی کا شکار ہو جاتی ہے، خود میاں بیوی کی زندگی کرب وابتلاء میں گھر جاتی ہے، غرض یہ کہ طلاق زندگی کا انتہائی سنجیدہ وپیچیدہ مسئلہ ہے، کوئی تفریحی مشغلہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے میاں بیوی میں پیدا ہوئی تلخی وکشیدگی کو ختم کرنے کے لئے آخری حل کے طور پر ''طلاق'' کی اجازت دی ہے اور اس انتہائی اقدام سے پہلے تعلقات کی استواری واصلاح کے لئے چند تدابیر کی بھی نشاندھی کی ہے۔

قرآن مجید کے مطابق میاں بیوی میں اختلافات رونما ہونے کی صورت میں ابتدائی تدبیر کے طور پر وعظ ونصیحت اور افہام وتفہیم سے کام لیا جائے: ''وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ ''، اگر یہ تدبیر سودمند نہ ہو تو اپنی ناراضگی وناگواری کے اظہار کے لئے خوابگاہ وبستر علاحدہ کر لینے کا حکم ہے: ''وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ ''، اگر اصلاح حال کے لئے یہ طریقہ بھی مفید ثابت نہ ہو تو کسی قدر سختی سے پیش آنے کی گنجائش رکھی گئی ہے: ''وَاضْرِبُوهُنَّ '' (النساء:۳۴) مگر اس میں صنف نازک کی طبع نازک کی رعایت ضرور ملحوظ خاطر ہو، ان داخلی کوششوں کے باوجود اگر اصلاح اور آپسی نباہ کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو قبل اس کے کہ معاملہ سنگینی اختیار کر جائے، قرآن نے خاندان اور سماج ومعاشرہ پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ اصلاح کے اس عمل میں شریک ہوں اور دردمندی ودل سوزی اور خدا ترسی کے ساتھ اصلاح اور باہمی مصالحت کی کوشش کریں، اس کے ذریعہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت ومصالحت کی کوئی صورت پیدا فرمادے:

> وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلاَحاً يُوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيماً خَبِيراً . (النساء:۳۵)
>
> اور اگر تمہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا ڈر ہو تو ایک فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان میں سے اور ایک فیصلہ کرنے والا عورت کے خاندان میں سے مقرر کردو، یہ اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا، بے شک خدا کو سب کچھ معلوم ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

آخری حل: طلاق

قرآن مجید کے مطابق اگر یہ مصالحتی کوشش اور ثالثی بھی ثمر آور نہ ہو تو اب آخری حل کے طور پر طلاق کی

گنجائش رکھی گئی ہے، مگر اس مرحلہ میں بھی شریعت نے جوش کے بجائے ہوش اور جذبات کے ہیجان کے بجائے عقل وخرد کے وجدان سے کام لینے کی تاکید کی ہے؛ تاکہ زندگی بھر کی ندامت و پشیمانی سے حضرت آدم کو بچایا جاسکے؛ چنانچہ دو بار وقفہ وقفہ سے طلاق دینے کی اجازت دی گئی اور اب بھی دورانِ عدت اس طلاق سے رُجوع کا حق باقی رکھا گیا، جب تیسری بار بھی طلاق دے دی جائے تو یہ تعلق ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے اور طلاق سے رُجوع کی گنجائش بھی جاتی رہتی ہے :

> الطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ . (البقرۃ:۲۲۹)
>
> طلاق دو بار ہے (اس میں رُجوع ہوسکتا ہے) اس کے بعد یا تو دستور کے مطابق بیوی کو رکھا جائے یا بھلے طریقہ سے اسے چھوڑ دیا جائے۔

نیز فرمایا گیا :

> فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىَ تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ. (البقرۃ:۲۳۰)
>
> پھر اگر اس عورت کو (تیسری بار) طلاق دی تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی، جب تک کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے۔

غرض یہ کہ طلاق انسانی سماج کے لئے ''ناگزیر اور ناگوار ضرورت'' ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اس ضرورت کا لحاظ رکھا ہے؛ لیکن میاں بیوی کے باہمی نزاع کو دور کرنے کے لئے جو تمہیدی تدابیر ذکر کی گئی ہیں، وہ بھی واجب العمل ہیں اور ان سے صرف نظر ہی دراصل خاندانی بکھراؤ، سماجی بگاڑ اور معاشرتی فساد کا ذریعہ ہے اور اگر ان اُصولوں کی پابندی کی جائے تو بہت کم ایسے واقعات رونما ہوں گے، جس میں رشتۂ ازدواج استواری کے بجائے انتشار کا شکار ہو۔

طلاق — غیر اسلامی معاشرہ میں

بلاشبہ اسلامی تعلیمات اعتدال و توازن اور فطرت سے ہم آہنگی پر مبنی ہیں، اور اس کی ایک اہم مثال قرآن میں رشتۂ نکاح کو برقرار رکھے جانے کی تاکید کے ساتھ ساتھ طلاق کی گنجائش کا پایا جانا بھی ہے، اس کے برعکس جب ہم بعض دیگر مذاہب وتہذیب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو صورتِ حال یکسر مختلف نظر آتی ہے؛ چنانچہ عیسائی شریعت میں طلاق کی مطلق اجازت ہی نہیں تھی (متی :۱۹۶۱) اور یہی ہیبت خیز تنگی ہندو مذہب میں بھی پائی جاتی تھی، اس غیر فطری قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود وطن عزیز میں ہزاروں خواتین یا تو ''ستی'' کی مقدس رسم کی بھینٹ چڑھ گئیں، یا انھیں ظالم سماج نے قتل کر دیا اور بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ وہ زندہ لاش بنی اپنی زندگی کا بوجھ اُٹھائے پھرتی؛ تاآں کہ انھیں

موت کی آغوش میں جاکر راحت و آرام کا احساس ہوتا، ظاہر ہے یہ ایک غیر فطری اور نا قابل عمل قانون تھا؛ چنانچہ باضابطہ قانون سازی کے ذریعہ ہندو اور عیسائی مذہب میں تبدیلی لائی گئی اور طلاق کی گنجائش پیدا کی گئی، دوسری طرف مغرب کا وہ حیاء باختہ اور خواتین دشمن سماج ہے، جس نے رشتۂ نکاح کو ریت کے گروندھوں سے بھی ارزاں اور بے حیثیت بنادیا اور ہر نا گوار بات کو بھی طلاق کے لئے وجہ جواز کا درجہ دے دیا۔

پچھلے صفحات میں تفصیل کے ساتھ امریکہ و مغرب میں نکاح کی گھٹتی ہوئی شرح پر گفتگو کی گئی تھی، ذیل میں شرح طلاق سے متعلق مختلف ممالک اور خود ہمارے ملک ہندوستان سے متعلق اعداد و شمار ذکر کئے جارہے ہیں :

ممالک	شرح طلاق	ممالک	شرح طلاق
⊙ جرمنی	39.4 فیصد	⊙ بلجیم	44.0 فیصد
⊙ برطانیہ	42.6 فیصد	⊙ ڈنمارک	44.5 فیصد
⊙ روس	43.3 فیصد	⊙ امریکہ	54.8 فیصد
⊙ چیک جمہوریہ	43.3 فیصد	⊙ سوڈان	54.9 فیصد

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کا شمار آج بھی دنیا کے ان ملکوں میں ہوتا ہے، جہاں شادی بیاہ کو مذہبی تقدس اور معاشرتی تعظیم حاصل ہے، جب کہ طلاق کو بے حد شرمناک عمل تصور کیا جاتا ہے؛ لیکن ان سب کے باوجود اس ملک میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح تشویش کن ہے؛ چنانچہ گذشتہ چند برسوں میں دہلی، ممبئی اور مدراس جیسی ریاستوں میں طلاق کی شرح دوگنا ہوگئی ہے، مثلاً ممبئی میں گذشتہ دس برسوں میں شرح طلاق میں 86% کا اضافہ پایا گیا ہے، ملک کی راجدھانی دہلی کی صورت حال بھی قابل ذکر ہے؛ چنانچہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یہاں طلاق سے متعلق معاملوں کے لئے صرف دو عدالتیں تھیں، جو ۲۰۱۱ء میں بڑھ کر سولہ ہوگئیں، ریکارڈ کے مطابق یہاں ۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۰ء کے دوران سالانہ 9000 ہزار جوڑوں نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑا، اس ضمن میں ریاست پنجاب کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جہاں گذشتہ برسوں میں ازدواجی رشتہ ٹوٹنے کی شرح میں 150% کا اضافہ دیکھا گیا ہے، حیرت ناک بات یہ ہے کہ کیرالہ جیسی ترقی یافتہ اور مسلم اکثریت ریاست میں گذشتہ دس برسوں میں طلاق کے معاملات میں 350% کا اضافہ ہوا ہے۔(۱)

حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں نکاح کی گھٹتی اور طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح اور خود وطن عزیز کی یہ صورت حال، ایک اہم ترین ''انسانی مسئلہ'' ہے، اس سے پہلو تہی نہیں کی جاسکتی ہے، تمام مذہبی قائدین اور بالخصوص علماء اسلام کے لئے

(۱) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: www.divorcemag.com

اس انسانی اور اخلاقی بحران پر خاموشی بنائے رکھنا کسی طرح بھی درست نہیں ہوگا؛ بلکہ یہ انسانیت کے تئیں مجرمانہ خاموشی تصور کی جائے گی، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے عادلانہ سماجی ومعاشرتی نظام کو پوری معقولیت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور مغربی تہذیب کے پنجۂ عفریت سے انسانی سماج کو بچایا جائے۔

سماجی زندگی سے متعلق قرآن مجید کی چند اُصولی ہدایات

۱- افراد وسماج کی اصلاح وتربیت :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَاراً وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ . (التحریم:۶)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاأَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ . (لقمان:۱۷)

اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو، معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو اور جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کرو، بے شک یہ ان کاموں میں سے ہے جو ہمت کے ہیں۔

۲- صلہ رحمی کا حکم :

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَن يُوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْءَ الحِسَابِ . (الرعد:۲۱)

وہ جو ان تعلقات کو جوڑتے ہیں جن کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں، آخرت کے برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

۳- قطع رحمی کی ممانعت :

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوْا فِيْ الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا أَرْحَامَكُمْ . (محمد:۲۲)

اگر تم دین سے پھر گئے اور کفر کی طرف لوٹ گئے تو بعید نہیں کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور قطع رحم کا ارتکاب کرنے لگو۔

۴- رشتوں کا احترام :

وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً. (النساء:۱)

اور ڈرتے رہو اللہ سے، جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو اور رشتوں کا پاس رکھو، بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھ رہا ہے۔

۵- خاندان خدا کی نعمت ہے :

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُم مِّنْ اَنفُسِکُمْ أَزْوَاجاً وَجَعَلَ لَکُم مِّنْ أَزْوَاجِکُم بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً ۔ (النحل:۷۲)

اللہ نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کی اور تمہیں اپنی بیویوں سے بیٹے اور پوتے دیئے۔

۶- اہل وعیال کے حقوق :

لِیُنفِقْ ذُوْ سَعَۃٍ مِّن سَعَتِہِ وَمَن قُدِرَ عَلَیْہِ رِزْقُہُ فَلْیُنفِقْ مِمَّا آتَاہُ اللّٰہُ لا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً إِلَّا مَا آتَاھَا سَیَجْعَلُ اللّٰہُ بَعْدَ عُسْرٍ یُسْراً ۔ (الطلاق:۷)

جس شخص کو وسعت حاصل ہے وہ اپنی وسعت کے مطابق (بیوی پر) خرچ کرے اور جس کو نپی تلی روزی ملتی ہے وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے دیا ہے، اللہ نے جس کو جتنا دیا ہے اس سے زیادہ کی وہ اس پر ذمہ داری نہیں ڈالتا؛ البتہ مشکل کے بعد جلد آسانی پیدا فرمائے گا۔

۷- والدین اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق :

وَاعْبُدُوْا اللّٰہَ وَلاَ تُشْرِکُوْا بِہِ شَیْئاً وَبِالْوَالِدَیْنِ إِحْسَاناً وَبِذِیْ الْقُرْبٰی۔ (النساء:۳۶)

اور ایک اللہ کی پرستش کرو اور اس کے ساتھ کسی کو ساجھی نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہُ ۔ (بنی اسرائیل:۲۶)

اور رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو۔

۸- یتیم کا حق نہ مارا جائے :

إِنَّ الَّذِیْنَ یَأْکُلُوْنَ أَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْماً إِنَّمَا یَأْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ نَاراً وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْراً ۔ (النساء:۱۰)

جو لوگ یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں وہ حقیقت میں اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور جلد ہی جہنم کی دھکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔

۹- میاں بیوی کے باہم حقوق یکساں ہیں :

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ . (البقرة:۲۲۸)

اور عورتوں کا حق ہے مردوں پر، جیسا کہ مردوں کا حق ان پر ہے، دستور کے مطابق۔

۱۰- مرد نگاہیں پست رکھیں :

قُل لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ . (النور:۳۰)

مومنوں سے کہئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

۱۱- خواتین پردہ کا اہتمام کریں :

وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا . (النور:۳۱)

اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، بجز اس کے جو ظاہر ہو جائے۔

۱۲- انسانی اُخوت و باہمی ہمدردی :

یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُم مِّن ذَکَرٍ وَأُنثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاکُمْ . (الحجرات:۱۳)

اے انسانوں! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنا دیں؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو شناخت کرو اور تم میں سب سے زیادہ فضیلت والا خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار اور اس سے ڈرنے والا ہے۔

۱۳- غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک :

لَا یَنْهَاکُمُ اللهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُم مِّن دِیَارِکُمْ أَن تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَیْهِمْ إِنَّ اللهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ . (الممتحنة:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو اس سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے کہ تم ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا طریقہ اختیار کرو، بلاشبہ اللہ انصاف کی راہ چلنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۱۴- پاکی ونظافت کا اہتمام :

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ . (البقرۃ:۲۲۲)

بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک وصاف رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

۱۵- ظلم کی ممانعت :

إِنَّهُ لاَ يُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ . (الانعام:۲۱)

یقیناً ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوں گے۔

۱۶- انصاف کا قیام :

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَان . (النحل:۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ عدل واحسان کا حکم دیتے ہیں۔

غرض کہ سماجی زندگی سے متعلق قرآن مجید کی تعلیمات عدل وانصاف، امن وآشتی کے پیام، ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک، خاندانی نظام کے بقاء، خوشگوار تعلقات کا تحفظ، مردوں اور عورتوں کے درمیان تقسیم کار، اچھے کاموں کی حوصلہ افزائی اور برے کاموں کی حوصلہ شکنی پر مبنی ہیں اور یہ ایسا نظام زندگی ہے، جس کا مدتوں علمی تجربہ کیا گیا ہے اور آج کی بلکتی وسسکتی دنیا کو خاص طور پر اس کی ضرورت ہے، اس کے بغیر آج کی دنیا امن وسکون سے بہرہ ور نہیں ہوسکتی۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآنی معیشت کے بنیادی اُصول

ڈاکٹر اوصاف احمد⊙

یہ تو معلوم و معروف ہے کہ قرآن کریم کتاب رشد و ہدایت ہے، الفاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ کی ابتدا میں ہی ارشاد فرمایا گیا :

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ، اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلاَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ یُنفِقُوْن . (البقرۃ:۲-۳)

اس کتاب کے اللہ کی کتاب ہونے میں کوئی شک نہیں، پرہیز گاروں کو راہ دکھانے والی ہے، جو لوگ غیب پر ایمان لائے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے (مال) میں سے خرچ کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں ہی ایک اور جگہ ارشاد ہوا :

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیَ أُنزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَی وَالْفُرْقَان . (البقرۃ:۱۸۵)

ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا، لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں۔

سورۂ لقمان کی ابتدائی آیات کہا گیا ہے :

تِلْکَ آیَاتُ الْکِتَابِ الْحَکِیْمِ ، هُدًی وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِیْنَ ، اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلاَةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ، أُوْلٰئِکَ عَلٰی هُدًی مِّن رَّبِّهِمْ وَأُوْلٰئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ . (سورہ لقمان:۲-۴)

یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں، نیکوکاروں کے لئے رہبر اور سراسر رحمت، جو لوگ

⊙ نئی دہلی۔

نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

کتاب ہدایت ہونے کی رو سے قرآن پاک میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں کہ قرآن کا اصل موضوع انسان ہے،(۱) انسان کے تعلقات بنیادی طور پر تین گروہوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں، اول: انسان کا تعلق اس کے خالق سے، یہ عبادات کا موضوع ہے، دوم: انسان کا تعلق خارجی دنیا سے، یہ طبیعاتی اور فطری علوم کا موضوع ہے، سوم: انسانوں کا تعلق انسانوں سے، یہ سماجیات اور معاملات کا موضوع ہے، کتاب ہدایت ہونے کی رو سے قرآن میں ان تینوں موضوعات پر ہدایات اور اشارات موجود ہیں، سب سے پہلے تو قرآن انسانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کا اور اس کائنات کا خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں، اس لئے اس کی پرستش واجب ہے، پھر انسان کو اس کی اردگرد کی دنیا کو جاننے اور اس کے بارے میں غور وفکر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، اسی طرح قرآن اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کس نہج پر استوار ہونا چاہئے، ان تمام موضوعات کا احاطہ قرآن پاک میں پورے بسط وشرح کے ساتھ کیا گیا ہے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ نے اس پر اپنے فصیح وبلیغ انداز میں بڑے سلیقے سے روشنی ڈالی ہے:

> وہ (قرآن) زمین وآسمان کی ساخت پر، انسان کی خلقت پر، آثارِ کائنات کے مشاہدات اور گذری ہوئی قوموں کے واقعات پر گفتگو کرتا ہے، مختلف قوموں کے عقائد واخلاق واعمال پر تنقید کرتا ہے، مابعد الطبیعاتی اُمور ومسائل کی تشریح کرتا ہے، ...... مگر اس لئے نہیں کہ اسے طبیعات یا تاریخ، یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے؛ بلکہ اس لئے کہ اسے حقیقت نفس الامر کے متعلق انسان کی غلط فہمیاں دور کرنی ہیں، اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، خلاف حقیقت رویہ کی غلطی وبدانجامی واضح کرنی ہے۔(۲)

مختصر یہ کہ قرآن پاک کتابِ ہدایت ہے، یہ کسی خاص علم کی کتاب نہیں، نہ طبیعات کی، نہ مالیات واقتصادیات کی کہ اس علم کے تمام اُصول وقوانین کا بیان اس میں پایا جائے، ہاں اشارے ضرور ہیں، یہ اشارے اس مقصد سے کئے گئے ہیں کہ انسان کی تطہیر عمل میں آئے، اسے پاک صاف بننے کی تلقین کی جائے، اسے ایک اخلاقی زندگی گذارنے پر آمادہ کیا جائے؛ چنانچہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اشارات ہم کو اس

(۱) ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن: ۱/۲۰، مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور۔ (۲) حوالۂ سابق۔

کتاب مقدس میں مل جاتے ہیں؛ چوں کہ اس وقت ہمارا موضوع قرآن کے معاشی تصورات ہیں، اس لئے ہم اپنی گفتگو اسی موضوع تک محدود رکھیں گے۔

فطرتِ انسانی

جدید معاشیات کا دعویٰ ہے کہ اس کے اُصول وقوانین، ریاضی کے اُصولوں کی طرح، زمان و مکان سے پرے ہیں، معاشیات کے اُصول ہر زمانے میں ہر ملک میں، ہر حال میں، لاگو ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ماہرین معاشیات کے دعاوی مطابق انھوں نے انسانی فطرت کے وہ اُصول دریافت کر لئے ہیں جن کا اطلاق ہر جگہ ہوتا ہے، اسلامی معاشیات ان دعووں کے برعکس اقدار پر مشتمل ہے؛ لیکن قرآن میں انسانی فطرت کے ایسے رویوں کے بارے میں بھی بیانات مل جاتے ہیں جو زمان و مکان کے فرق پر منحصر نہیں ہیں اور نہ اس سے تبدیل ہوتے ہیں، مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے :

وَيَدْعُ الإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الإِنْسَانُ عَجُوْلاً .

(بنی اسرائیل:۱۱)

اور انسان برائی کی دُعائیں مانگنے لگتا ہے، بالکل اپنی بھلائی کی دُعاؤں کی طرح، انسان ہے ہی بڑا جلد باز!

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ، الَّذِىْ جَمَعَ مَالاً وَعَدَّدَهُ ، يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ . (الھمزۃ:۱-۳)

بڑی خرابی ہے ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا اور غیبت کرنے والا ہو، جو مال کو جمع کرتا جائے اور گنتا رہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال سدا اس کے پاس رہے گا۔

اس طرح اگر انسان کی جلد باز فطرت کا اعتراف کیا گیا ہے تو دوسری طرف اس کی مال جمع کرنے کی عادت کو بھی پہچانا گیا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا ایک امتحان گاہ ہے، یہاں تک کہ انسان کی آزمائش اس کے مال ومتاع، اس کے آل واولاد، اس کے بیوی بچوں کے ذریعہ بھی کی جاتی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوّاً لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَإِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ، إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيْمٌ . (التغابن:۱۴-۱۵)

اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض بچے تمہارے دشمن ہیں، پس

ان سے ہوشیار رہنا ، اگر تم معاف کردو ، درگذر کر جاؤ اور بخش دو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، تمہار مال اور اولاد تو سراسر تمہاری آزمائش ہیں اور بہت بڑا اجر اللہ کے پاس ہے۔

چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دنیا کو مزرع الآخرۃ جو کہا گیا ہے تو اسی سبب سے کہ یہ دنیا کارگاہ عظیم ہے، یہاں عمل کرنے کی آزادی اور موقع ہے، اچھے کام کرنے کا بھی اور اچھے کام نہ کرنے کا بھی ، اچھے برے کاموں کی جزا اور سزا آخرت میں ملے گی اور اس کے لئے رب العزت کی یقین دہانی ہے :

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ ، وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَه .

(الزلزال:۷-۸)

پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔

جیسا کہ اوپر تذکرہ کیا گیا کہ قرآن کوئی معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں مختلف تصورات کا منضبط اور مربوط بیان موجود ہو، تاہم اس میں ایسے تصورات ضرور موجود ہیں ،جن کی بنیاد پر ایک صالح معاشرہ اور صحت مند معیشت کی تشکیل کی جاسکتی ہے ، تاہم صرف تصورات اس کے لئے کافی نہیں ، یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان تصورات کو کیسے روبہ عمل لایا جائے تا ہے۔

قرآنی اُصولِ معیشت

۱-اُصولِ اباحت : اسلام میں اشیاء کی اصل اباحت ہے، ہر وہ چیز جو واضح طور پر حرام نہیں کی گئی ،حلال سمجھی جائے گی ، اشیاء بالخصوص استہلاک کے ضمن میں حرام وحلال کا فیصلہ اللہ تعالٰی نے اپنے پاس رکھا ہے، یہاں تک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حق نہیں تھا کہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرادیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شہد والا واقعہ اتنا مشہور ہے کہ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔(۱)

يَـا أَيُّهَـا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَايُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ إِنَّ اللهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْد . (المائدۃ:۱)

اے ایمان والو! عہد و پیمان پورے کرو، تمہارے لئے مویشی چوپائے حلال کئے گئے ہیں ، بجز ان کے جن کے احکام پڑھ کر سنا دیئے جائیں ، مگر حالت احرام میں شکار کو حلال جاننے والے نہ بننا ، یقیناً اللہ جو چاہے حکم کرتا ہے۔

(۱) تفصیل کیلئے دیکھئے: یوسف القرضاوی کی ''الحلال والحرام فی الاسلام'' اس کتاب کا ترجمہ اُردو اور انگریزی دونوں زبان میں دستیاب ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ ... (المائدۃ:۳)

تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جن پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا گیا ہو....۔

اَلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ...... ۔ (المائدۃ:۵)

کُل پاکیزہ چیزیں آج تمہارے لئے حلال کی گئیں اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے......۔

عہد جدید کے بعض ماہرین معاشیات نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایک مسلم صارف کی خریدی گئی اشیاء کی (Consumption Basket) ایک غیر مسلم صارف کی خریدی گئی اشیاء کی تعداد سے کم تعداد ہوں گی؛ کیوں کہ بعض اشیاء مسلم صارف کے لئے حرام ہیں، بادی النظر میں یہ خیال صحیح نہیں لگتا؛ کیوں کہ جدید صنعتی تہذیب صارفین کے لئے بہت بڑی تعداد میں اشیاء صرف مہیا کرتی ہے، اس لئے محض چند اشیاء کے فراہم نہ ہونے کے سبب یہ نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مسلم صارف کی (Consumption Basket) ایک غیر مسلم صارف کی بہ نسبت چھوٹی ہوگی۔

۲- اُصولِ اعتدال : اسلام کی راہ، راہِ اعتدال ہے اس لئے مسلم صارفین کو حکم ہے کہ نہ تو وہ بخل سے کام لیں اور نہ اسراف وتبذیر سے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً۔ (الفرقان:۶۷)

اور جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل؛ بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں۔

وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ. (بنی اسرائیل:۲۹)

اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا نہ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھول دو۔

ان آیتوں میں استعمال شدہ الفاظ: اسراف، تبذیر، بخل وغیرہ اسلامی اصطلاحات ہیں، جن کو خاص معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، اپنی حد سے بڑھ کر خرچ کرنا ''اسراف'' کے ضمن میں آتا ہے اور ناجائز اُمور پر خرچ کرنا ''تبذیر'' ہے، اللہ تعالیٰ مؤمنین کو اعتدال سے کام لینے کی ہدایت کرتا ہے، اس اُصول کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں :

(ان) آیات میں اسراف وتبذیر کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے، اس کے باب میں غلط فہمی سے بچانے کے لئے وضاحت فرمادی کہ منشائے الٰہی یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ضروریات

کے بارے میں بالکل ہی بخیل و خسیس بن کر رہ جائے؛ بلکہ صرف یہ مطلوب ہے کہ وہ اعتدال و کفایت شعاری کا رویہ اختیار کرے نہ اپنے ہاتھ بالکل ہی باندھ لے، نہ ان کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دے؛ بلکہ اعتدال کے ساتھ اپنی ضروریات پر بھی خرچ کرے اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کرے۔ (امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن: ۴۹۸)

۳- **اُصولِ تعاون** : قرآنی تعلیمات کے مطابق معیشت کا نظم تعاون کے اُصول پر ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ . (المائدۃ:۲)

نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہو، اور گناہ وظلم و زیادتی میں مدد نہ کرو۔

تفسیر احسن البیان کے مؤلفین کا خیال ہے کہ اس آیت میں ایک نہایت اہم اُصول بیان کر دیا گیا ہے، جو پوری اجتماعی زندگی میں مسلمانوں کی رہبری کر سکتا ہے۔(۱)

ملحوظ رہے کہ معاصر معاشی زندگی کی اساس تعاون کے بجائے مقابلہ و مسابقہ پر رکھی گئی ہے؛ چنانچہ تمام عاملین معاش (Economic Agents) ایک دوسرے سے مسابقت (Competition) کرتے رہتے ہیں اور مسابقت کے ذریعہ کسی متوازن قیمت کا تقرر کرتے ہیں؛ چنانچہ خریدار اور بیوپاری میں مسابقت ہوتی ہے، مزدور اور آجر میں مسابقت ہوتی ہے، بچت کنندہ اور سرمایہ کار میں مسابقت ہوتی ہے، معیشت کے تمام بازاروں میں مسابقت ایک عام اُصول ہے۔

قرآن مسابقت کے بجائے تعاون کا اُصول پیش کرتا ہے، اگر بازار تعاون کی بنیاد پر منظم ہوں اور عاملین ایک دوسرے سے مسابقت کے بجائے تعاون اور تعامل کا رویہ اپنائیں تو نزاع کے سارے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں اور ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے جو ہر قسم کے نزاع سے پاک ہو۔

نزاع کی ایک اور وجہ حرام آمدنی اور مال کمانے کے باطل طریقے ہیں، اس لئے قرآن میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے پر زور دیا گیا ہے جس میں باطل طریقوں سے مال کمانے کا امکان نہ ہو :

وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . (البقرۃ:۱۸۸)

---

(۱) حافظ صلاح الدین یوسف، تفسیر احسن البیان: ۲۸۸، دار السلام، ریاض۔

ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو، نہ حاکموں کو رشوت پہنچا کر کسی کا کچھ مال ظلم وستم سے اپنا لیا کرو؛ حالاں کہ تم جانتے ہو۔

تعاون اور رضامندی کی اہمیت اس قدر ہے کہ اس کو تجارتی معاہدوں کا ایک جز قرار دیا گیا ہے، ارشادِ خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ . (النساء:۲۸)

اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقے سے نہ کھایا کرو، مگر یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے خرید وفروخت ہو۔

تنگی اور کشادگی دونوں آزمائش کے طریقے ہیں، کسی وقت تنگی میں آزمائش ہے تو کسی وقت فراخی میں، یہ اللہ کو دیئے جانے والے قرض کا پہلو ہی ہے کہ تبرعات کو فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں کیا جانے والا خرچ) قرار دیا گیا ہے۔

۴- **اُصولِ اُخوت** : اجتماعی زندگی کی تنظیم میں اسلام کا ایک اہم اُصول، اُصولِ اُخوت بھی ہے :

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ . (الحجرات:۱۰)

تمام ایمان والے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

لا يؤمن أحد كم حتى يحب لأخيه ما يحب لنفسه . (۱)

تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہے جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو خود اسے اپنے لئے پسند ہے۔

۵- **اُصولِ انفاق** : انفاق بھی قرآن کی اہم معاشی تعلیمات میں سے ایک ہے، ارشاد ہے :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ . (آلِ عمران:۹۲)

جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کروگے ہرگز بھلائی نہ پاؤگے۔

انفاق کی تاکید قرآن پاک میں متعدد بار کی گئی ہے؛ بلکہ سورۂ بقرہ میں تو اس کو مومنوں کی ایک پہچان قرار دیا گیا ہے :

---

(۱) صحیح البخاری:۱۳، عن انسؓ۔

وَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ . (البقرۃ:۳)

اور ہمارے دیئے ہوئے (مال) میں سے خرچ کرتے ہیں۔

مفسرین کا خیال ہے کہ انفاق کا لفظ عام ہے، اس لئے اس میں صدقات واجبہ (جیسے زکوٰۃ) اور صدقاتِ نافلہ دونوں شامل ہیں، اہل ایمان ان میں سے کسی میں بخل سے کام نہیں لیتے؛ بلکہ ایک رائے تو یہ بھی ہے کہ ماں باپ اور اہل وعیال پر بھی صحیح نیت سے کیا جانے والا خرچ بھی انفاق میں ہی شامل ہے اور اجر وثواب کا باعث ہے۔

باہمی رضامندی ''تراض منکم'' کا سلسلہ تمام تجارتی معاہدوں تک وسیع کیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ تمام اسلامی معاہدے مثلاً مرابحہ، مشارکہ، مضاربہ، استصناع، اجارہ وغیرہ جن کو آج کل اسلامی بینکوں نے دوبارہ مقبول بنادیا ہے، فریقین کی رضامندی پر منحصر ہوتے ہیں، اگر کسی معاہدے میں جبر کا عنصر پایا جائے تو اسلامی معیاروں کے مطابق وہ ایک قانونی معاہدہ نہیں قرار دیا جائے گا۔

۶- **اُصولِ شرکت** : قرآنی تعلیمات کے مطابق یہ اُصول بھی نہایت اہم ہے، قرآن نے افراد کو نجی ملکیت کا حق ضرور دیا ہے؛ لیکن یہ کسی بھی صورت میں مطلق نہیں، جیسا کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ہوتا ہے، اسلامی معیشت میں افراد کو مال کے اتلاف کا حق نہیں ہوتا، افراد کا مال صرف افراد کا مال نہیں ہے، وہ پوری جماعت کا مال بھی ہے، اس لئے اس پر جماعت کا حق بھی ہے۔

ملکیت کے اس محدود تصور نے اسلامی اور غیر اسلامی تبرعات (Charities) میں ایک صفاتی فرق (Qualitative Difference) پیدا کردیا ہے، اسلام میں تبرع مالدار کا تبرع نہیں ہے، وہ مالدار کی فیاضی، دریا دلی اور سخاوت کا نتیجہ نہیں ہے، یہ تو اس کے مال میں مستحقین کا حق ہے، جو انھیں دیا جارہا ہے، ارشاد ربانی ہے :

وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ . (الذاریات:۱۹)

اور ان کے مال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کا حق ہے۔

مفسرین نے محروم کی تفسیر اس طرح کی ہے: ضرورت مند دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک سوالی، جو سوال کے ذریعہ اپنا ضرورت رفع کرتے ہیں، دوسرے غیر سوالی، جو ضرورت کے باوجود کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے، محروم سمجھے جائیں گے، وہ محروم سمجھے جائیں گے؛ چنانچہ وہ سفید پوش جو کسی آفت ارضی وسماوی (زلزلہ، سیلاب وغیرہ) کا شکار ہو کر عارضی طور پر محتاج ہو گئے ہوں اس درجہ میں آئیں گے۔

قرآن نے 'التبرعات' کی تعبیر ایک اور طریقے سے کی ہے، تبرع کیا جانے والا مال، مالدار کی جانب سے اللہ کو دیا گیا قرض ہے جو وہ بڑھا چڑھا کر واپس کرے گا :

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللہَ قَرْضاً حَسَناً فَیُضٰعِفَهُ لَهُ أَضْعَافاً كَثِیْرَةً وَاللہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ وَإِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (البقرۃ:۲۴۵)

ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے، پس اللہ اسے بہت بڑھا چڑھا کر واپس کرے، اللہ ہی تنگی اور کشادگی کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تنگی اور کشادگی دونوں آزمائش کے طریقے ہیں، کسی وقت تنگی میں آزمائش ہے تو کسی وقت فراخی میں، یہ اللہ کو دیئے جانے والے قرض کا پہلو ہی ہے کہ تبرعات کو "فی سبیل اللہ" (اللہ کی راہ میں کیا جانے والا خرچ) کہا گیا ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید کی اقتصادی تعلیمات

ڈاکٹر شارق نثار⊙
ترتیب: احمد شفیع الدین رشادی

حرفِ آغاز

الحمد لله و كفى ، وسلام على عباده الذين اصطفى ، اما بعد !

ہر قوم کے پاس ایک مصدر ہوتا ہے جس سے ان کے مسائل کے حل کے لئے رجوع کیا جاتا ہے، قرآن مجید اسلام کا مصدر ہے، اسی سے ہدایت وابستہ ہے :

إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يِهْدِئُ لِلَّتِيْ هِيَ أَقْوَمُ . (الاسراء:۹)

بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِيْن . (النحل:۸۹)

اور اُتار دی ہم نے تجھ پر کتاب، کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت ، رحمت اور خوشخبری حکم ماننے والوں کے لئے۔

قرآن کریم کے بارے میں خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ولا يشبع منه العلماء ولا يخلق على كثرة الرد ولا تنقضي عجائبه . (۱)

قرآن مجید سے نہ علماء کی سیرابی ختم ہوگی اور نہ اس کے زیادہ پڑھنے کی وجہ سے بیزارگی محسوس ہوگی اور نہ اس کی حکمتیں کسی زمانے میں ختم ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں علم اولین وآخرین بیان کردیا ہے، جو جس فن میں غوطہ لگا کر اس کے اُصول تلاش کرے گا، قرآن میں اسے ضرور پائے گا، امام سیوطیؒ نے فرمایا :

⊙ ڈائریکٹر: ''تاسیس'' بنگلور۔

(۱) سنن ترمذی:۲۹۰۶، عن علیؓ۔

فترى كل ذي فن منه يستمد وعليه يعتمد ، فالفقيه يستنبط منه الأحكام ويستخرج حكم الحلال والحرام ، والنحوي يبني منه قواعد إعرابه ويرجع إليه في معرفته خطأ القول من صوابه ، والبياني يهدى به إلى حسن النظام .

ہر ذی فن نے اسی کی طرف اپنا احتیاج ظاہر کیا اور اسی پر اعتماد کیا ہے، فقہاء اسی کو بنیاد بنا کر احکام کا استنباط کرتے ہیں، نحویین نے اس قرآن پر غور وخوض کیا اور نحوی قواعد کے لئے قرآن کو مرجع بنایا، ادب کے ماہرین نے بھی قرآن میں غور کیا اور اسی کو بنیاد بنا کر کلام میں حسن پیدا کرنے کے قواعد مرتب کئے۔

غرض یہ کہ اصحاب فن چاہے وہ کسی بھی فن سے متعلق ہوں قرآن مجید کے ذریعے سے جب رہنمائی حاصل کیے تو کامیابی سے ہمکنار ہوئے، اسی طرح اگر کوئی اقتصادی بنیادوں کو قرآن میں تلاش کرنا چاہے اور یہ جاننا چاہے کہ قرآن میں اقتصادیات سے متعلق کیا اصول ہیں، تو رب ذوالجلال کی ذات اقدس سے قوی اُمید ہے کہ وہ کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کامل ہیں اور انسانوں کی رہنمائی بھی کامل طریقے سے فرماتے ہیں، زندگی کے ہر پہلو میں وہ رہنمائی کام آتی ہے، کسی بھی رہنمائی کی عالمگیریت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرے، اس زاویے سے اگر ہم قرآن پاک کی تعلیمات اور نبی پاک علیہ الصلاۃ والسلام کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دونوں میں کامل رہنمائی نظر آتی ہے۔

انسان کی زندگی کا معاشی پہلو ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، یہ بات خارج از امکان ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی معاشی زندگی کے سلسلے میں رہنمائی نہ کرے؛ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سلسلے کی واضح ہدایات کے بغیر دین پر عمل کرنا ہی مشکل ہے۔

یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے اقتصاد ومعیشت کے خالص دنیوی کام کو روحانی لباس پہنا کر ثواب کا کام بنا دیا، ورنہ کسی بھی مذہب میں معیشت کے احکام اتنی بسط وتفصیل کے ساتھ مذکور نہیں ہیں، اس کا اثر یہ ہوا کہ خیر القرون سے مسلمانوں نے اپنے کردار وافعال، قول وعمل کے ذریعے سے دیگر اقوام پر اپنا رعب قائم رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب کا حال یہ تھا کہ یہودیوں نے باشندگان عرب کو سودی قرض کے ذریعے سے ذہنی غلام بنا رکھا تھا، یہ نبی آخر الزماں کی بعثت کی برکت ہے کہ اقوام عرب میں معاشی استحکام آیا، آپ ﷺ نے انھیں ذہنی غلامی سے نجات دلائی اور ہر انسان کو مساوات کا درس دیا، تجارتی بے قاعدگی کو دور کیا،

جاہلیت کے طور طریقوں پر روک لگائی، قرض کے لین دین کو خالص دینی فعل قرار دیا، جس میں قرض دینے والے کو قرض لینے والے سے کسی بھی دنیوی منفعت کے حصول کو حرام قرار دیا، جس کے سبب ایک ایسا ماحول تیار ہوا جو ہر اعتبار سے پاک اور نورانی تھا۔

جب تدوین حدیث وفقہ کا دور آیا محدثین اور فقہاء نے حدیث وفقہ کی مستقل کتابیں اس عنوان سے لکھیں، تفسیر کی کتابوں میں مفسرین نے آیات کی تفسیر میں معاشی اصول اور لائحہ عمل کا مفصل تذکرہ فرمایا، تاریخ کی کتابوں میں بھی مثلاً مقدمۃ ابن خلدون وغیرہ میں اس فن کا تذکرہ مفصل ملتا ہے، شاہ ولی اللہؒ کی مایہ ناز تصنیف حجۃ اللہ البالغہ بھی اس سلسلہ میں بے حد مفید اور معاون ہے۔

ہندوستان میں علماء نے بہت پہلے ہی معاشی تعلیمات کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے زبان اردو میں اس کی تعلیمی سطح پر کوشش شروع کر دی اور سودی نظام کے خلاف صف آرا ہو کر اپنی قلمی توانائی صرف کرنے لگے، ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے ''اسلام کا اقتصادی نظام'' تحریر فرمائی، اس کے بعد وقفہ وقفہ سے علماء اس میدان میں علمی خدمات انجام دیتے آئے ہیں اور اپنی معرکۃ الآراء تصانیف سے اُمت محمدیہ کو سود کی لعنت سے بچانے کی کامیاب کوشش کی، ان تصانیف میں اسلامی معاشیات (مناظر احسن گیلانی)، اسلامی اصول پر بینکنگ (نعیم صدیقی) وغیرہ آج بھی اپنوں اور غیروں میں یکساں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

ہمارے اکابرین واسلاف نے عملی میدان میں بھی اسلامی اقتصادیات کی ترویج میں اپنے دائرہ میں فرض منصبی نبھایا ہے، تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد کے علماء نے ۱۹۲۳ء میں ایک انجمن قائم کی تھی، جس کا نام ''انجمن امدادِ باہمی قرض بلاسود'' تھا، اس کے بعد سے مسلسل کئی جماعتوں اور تنظیموں نے اپنے علاقوں میں انجمنیں قائم کی جن میں مسلم فنڈ ٹنڈا باولی (۱۹۴۰) اور پٹنہ کو اوپریٹو سوسائٹی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انسان کی تخلیق کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں تخلیق انسانی کا مقصد عبادت قرار دیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ . (الذاریات)

اور ہم نے جن وانس کو عبادت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔

عبادات صرف صوم وصلوۃ تک محدود نہیں ہیں؛ بلکہ زندگی کا ہر شعبہ اور انسان کا ہر فعل اگر اس کو شریعت کے مطابق کیا جائے تو عبادت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، عام انسان ہر دن اپنی پانچ نمازوں کے لئے زیادہ سے زیادہ

سوا گھنٹہ صرف کرتا ہے، نماز جیسی اہم عبادت کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود (کہ نماز کو تمام عبادتوں میں افضل مقام حاصل ہے اور یہ کہ وہ دین کی اساس ہے) یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اگر صرف ان عبادتوں کو ہی عبادات قرار دیا جائے تو مقصدِ زندگی کا حصول محال ہے اس لئے کہ اس صورت میں جس مقصد کے لئے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا اس کو حاصل کرنے کے لئے انسان اپنی زندگی کا صرف ۵% لگا رہا ہے اور جو شخص اپنی زندگی کا ۹۵% مقصد میں نہ لگائے وہ کامیاب کیسے ہوسکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ انسان کا ہر عمل چاہے وہ کسی بھی نوعیت کا ہو عبادت ہونا چاہئے۔

انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بلند مقام عطا فرمایا ہے، خلافت کے عمدہ عہدہ پر فائز فرما کر تمام انسانوں کی حیثیت اور مرتبہ کو بڑھایا ہے، ارشاد ربانی ہے :

وَإِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلاَئِکَةِ إِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْ الْأَرْضِ خَلِیْفَةً ۔ (البقرۃ:۳۰)

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔

خلافت نام ہے متعین امور میں نیابت کا، اطاعت کا، نیابت کی تکمیل اختیار کے بغیر نہیں ہوسکتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک با اختیار مخلوق بنایا، اختیار کے صحیح استعمال کے لئے رہنما اصول کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی تکمیل رب ذوالجلال نے نبی اور کتاب کے ذریعہ سے فرمائی، کتاب اصول بتاتی ہے اور نبی ان اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر انسانیت کو ان اصولوں پر چلنے کا طریقہ سکھاتے ہیں۔

یہ تربیت کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبی آخر الزماں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر چلتا رہا، ہر قوم کے پاس اصولی کتاب ہوتی اور ان اصولوں کے مطابق انبیاء قوم کی تربیت فرماتے، گویا یہ سلسلۂ کتاب ورجال چلتا رہا جب بھی انسانیت راہ سے بھٹک جاتی اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کی بعثت کا مقصد یاد دلانے اور ان کی حیثیت کو اجاگر کرنے کی خاطر انبیاء اور رسولوں کو مبعوث فرماتے اور رہنمائی فرماتے، رسول پاک علیہ الصلاۃ والسلام کو اللہ نے آخری پیغمبر بنا کر اس دنیا میں مبعوث فرمایا اور آپ کی بعثت کا مقصد بھی وہی تھا جو پچھلے پیغمبروں اور رسولوں کا تھا، بھٹکی ہوئی انسانیت کو اللہ سے جوڑنا، قرآن جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، اس کی تلاوت، تعلیم وتفسیر اور انسانوں کے دلوں سے گندگی کو نکال کر اللہ کی محبت کو ودیعت کرنا ہی نبی پاک علیہ الصلاۃ والسلام کا مشن تھا :

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِیْ الْأُمِّیِّیْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَإِن کَانُوْا مِن قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ ۔ (الجمعة:۲)

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب و دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح و نجات کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں سب سے پہلے کتاب اللہ کی تعلیمات کی طرف رجوع ہو جائے اور یہ دیکھے کہ کتاب اللہ کا نظریہ اس سلسلے میں کیا ہے، پھر یہ دیکھے کتاب اللہ کی تعلیمات کی ترویج کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا طریقہ اپنایا ہے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے۔

قرآن مجید کا معاشی نظریہ

ہر انسان اپنی زندگی کا وافر حصہ روزی روٹی کمانے میں صرف کرتا ہے اور مال و متاع کا حصول انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے بے حد ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ جمعہ میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے :

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوْا فِيْ الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِن فَضْلِ اللهِ . (الجمعۃ:۱۰)

پھر جب نماز پوری ہو چکے تو تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک قائم رہنے والے اس دین اور شریعت میں مال کے حصول کو غلط قرار نہیں دیا؛ بلکہ ''وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللهِ'' کہہ کر اس کو حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے اور انسان کی فطرت بھی ایسی ہے کہ وہ مال کو محبوب رکھتا ہے :

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ . (العادیات:۸)

اور وہ مال کی محبت میں بڑا مضبوط ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ضروریات زندگی کی اباحت کے ساتھ ساتھ آسائش و راحت، رفاہیت وزینت وغیرہ کے ساز و سامان تک کے متعلق جواز کو ''زینۃ اللہ'' اور ''الطیبات من الرزق'' جیسے تعمیری الفاظ استعمال فرمایا ہے اور اس کے استعمال سے گریز کرنے والوں کو استفہامی انداز سے خبردار کیا ہے کہ :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ . (اعراف:۳۲)

آپ فرمائیے کہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟

پانی غذا وغیرہ تو بڑی چیزیں ہیں، معاشی لحاظ سے جن کا درجہ ان سے کم تر ہے، مثلاً سونا، چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، مویشیوں وغیرہ چیزوں تک کے متعلق جو قرآن اعلان کرتا ہے وہ یہ کہ جس قدرت نے انسان اور انسان کی فطرت بنائی ہے، اسی قدرت نے آدمی کی جبلت میں ان اُمور کی گورائی پیدائشی طور پر پیدا کی ہے۔

اگر اس بات کا ارادہ کیا جائے کہ قرآن نے تفصیلاً جن چیزوں کے افادی پہلوؤں سے استفادہ کی طرف انسانی فطرت کو ابھارا ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ قرآن کے ایک تہائی حصہ کو نقل کرنا پڑے گا، بحر و بر، سفلیات وعلویات میں آخر کونسی ایسی اہم چیز ہے جس کے افادی پہلوؤں کی طرف قرآن نے صراحتاً یا کنایتاً اشارہ نہیں کیا ہے، انسان ان چیزوں سے اپنی معاشی سہولتوں کے حصول میں جن جن طریقوں سے کام لیتا رہا ہے اور لے رہا ہے اگر غور کیا جائے تو ان طریقوں کی ایک طویل فہرست قرآنی آیات کی روشنی میں بہ آسانی مرتب ہوسکتی ہے۔

زراعت، باغبانی، شکار کی مختلف شکلیں، بری و بحری جانوروں کے مختلف اجزاء (گوشت، کھال، اون، بال، دودھ، شہد وغیرہ) سے استفادہ کی مختلف نوعیتیں، تجارت کے سلسلے میں حیوانی، بری و بحری سواریوں کے ذریعہ مواصلات وحمل ونقل کی سہولتوں کا ذکر، صنعت وحرفت کے مختلف شعبے (جیسے آہن گری، نجاری، ظروف سازی، شیشہ سازی، زرہ سازی، معماری، سنگ تراشی، مزدوری اور اس کی مختلف قسمیں، حکومتی ملازمت، کاروباری تنظیم وغیرہ)، اگر ان کا ثبوت کوئی قرآنی آیات سے پیش کرنا چاہے تو بآسانی کرسکتا ہے، اگرچہ ان امور کی طرف بجائے وحی کے آدمی کی رہنمائی عقل وحواس سے کی گئی ہے اسی لئے ان کا ذکر جہاں بھی آیا ہے ضمناً ہی آیا ہے، تاہم اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ معاشی امور سے قرآن مسلمانوں کو کتنا قریب رکھنا چاہتا ہے۔

ہم غور نہیں کرتے ورنہ سچ یہ ہے کہ سورہ مزمل میں تہجد کی نماز کی فرضیت کا قانون جب عام مسلمانوں سے اٹھالیا گیا تو اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنَ مِنكُمْ مَرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ. (مزمل:۲۰)

اس کو معلوم ہے کہ بعضے آدمی تم میں بیمار ہوں گے اور بعضے تلاش معاش کے لئے ملک میں سفر کریں گے۔

جس کا یہی مطلب ہے کہ اگر شب بیداری سب پر فرض کردی جائے گی تو کچھ لوگ تلاشِ معاش کے فریضہ سے محروم ہوجائیں گے۔

آج کے اس ماڈرن اور تعلیم یافتہ دور میں سائنس دانوں کا یہ کہنا ہے کہ انسان کے دماغ میں ہر لمحہ ہزاروں

خیالات اور مختلف سوچ کی شکلیں پیش آتی رہتی ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق منفیات (Negetive Thinking) سے ہوتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی تدارک قرآن میں فرمادیا اور انسانوں کو محنت پر ابھارتے ہوئے فرمایا :

وَاَنْ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى . (نجم:۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

فقر اور نقصان کے خوف کو خالص شیطانی وسوسہ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ . (بقرہ:۲۶۸)

شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات کا مشورہ دیتا ہے۔

چند انقلابی مصنوعات اور اپنے عہد کے نئے انکشافات کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کی طرف منسوب کیا، جیسے نوح علیہ السلام کی کشتی، داؤد علیہ السلام کی زرہ وغیرہ، حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کو اپنی وحی کا نتیجہ قرار دیا ہے تاکہ مسلمان اس ضمنی اشارے سے اسلام میں معیشت کی اہمیت کا احساس کریں، مذکورہ سطور میں حضرت مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب اسلامی معاشیات سے جو ہم نے اقتباسات پیش کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن پاک نے معاشیات کو کتنی اہمیت سے بیان فرمایا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیمات سے معاشی اُصول کا استدراک

قرآن مجید میں معاشی زندگی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہم معاشی اُصول کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے، قرآن کے معاشی نظریے کو تین اہم اصولوں کی روشنی میں بیان کیا جاسکتا ہے :

(۱) اخلاقی اقدار۔

(۲) انصاف وعدل کا قیام۔

(۳) ثمرہ کی بنیاد خطرات، ذمہ داریوں اور کوششوں پر مبنی۔

اخلاقی نتائج

اس زمرہ میں اپنی بحث کی تکمیل کے لئے ہم دو اہم بنیادوں سے مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں :

(۱) ملکیت۔

(۲) اخلاقی پابندیاں۔

جہاں تک ملکیت کا مسئلہ ہے، یہ جان لیا جانا چاہئے کہ حقیقی مالک صرف اللہ ہے اور زمین وآسمان کی ہر شئے

کا رب ذوالجلال تنہا مالک ہے :

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ . (سورہ مائدہ:۱۲۰)

اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمینوں کی اور ان چیزوں کی جو ان میں موجود ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے :

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ . (سورۃ الحدید:۷)

اور جس مال میں تم کو اس نے دوسروں کا قائم مقام بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

اور ایک جگہ فرمایا :

و آتوهم من مال الله الذی آتاكم . (سورۃ النور:۳۳)

اللہ کے اس مال میں سے ان کو بھی دو جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بندوں سے خرچ کرنے کا مطالبہ کیا ہے، تصرف کا حکم تو وہی دے سکتا ہے جو ملکیت رکھتا ہے، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے حقیقی مالک ہیں، ایک اشکال یہاں یہ ہوتا ہے کہ جب انسان ہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے کائنات بنائی ہے تو ملکیت بھی انسان ہی کی ہونی چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود کہہ دیا ہے کہ :

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِى الْأَرْضِ جَمِيْعاً . (سورۃ البقرہ:۲۹)

وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ملکیت کی دو قسمیں ہیں :

(۱) حقیقی: جو صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔

(۲) تبعی : جو اللہ کی ملکیت کے واسطے سے انسان کو حاصل ہے۔

یعنی ہر شئے میں اصل ملکیت تو اللہ ہی کی ہے اور انسان کی ملکیت اس کی تابع ہے اور انسان کا ہر تصرف اللہ کے حکم کے ساتھ مقید اور اس کا تابع ہے، حقیقی ملکیت والا جس تصرف کو جائز قرار دے گا تو وہ تصرف صحیح ہوگا ورنہ تصرف کرنے والا مالک حقیقی کا نافرمان کہلایا جائے گا۔

اخلاقی پابندیاں

اب رہی بات اخلاقی پابندیوں کی، اللہ تعالیٰ نے انسان کو مال کے حصول سے نہیں روکا، اس لئے کہ اگر اللہ کو کسب مال سے روکنا ہوتا تو انفاق کی آیتیں نہیں اُتارتا، جہاں کہیں انفاق کا تذکرہ ہے وہاں بالواسطہ کسب مال کی

ترغیب بھی پوشیدہ ہے، کمائے گا تبھی تو خرچ کرے گا، جب کمائے گا ہی نہیں تو خرچ کیسے کر پائے گا، ہاں! اللہ تعالیٰ نے کسب مال کے سلسلے میں چند پابندیاں ضرور لگائی ہیں اور رشوت، اکل بالباطل، ربا جیسی مہلک بیماریوں سے ضرور روکا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیماریاں ایسی ہیں جو مال کے ریل پیل کو روک دیتی ہیں اور مال کو صرف سرمایہ دار لوگوں تک محدود کر دیتی ہیں، اللہ تعالیٰ مال کے ایک جگہ جمع ہونے کو پسند نہیں کرتا مال کا پھیلاؤ اور اس کی ریل پیل کو انسانی بھلائی اور بقا کے لئے کارآمد قرار دیتا ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا :

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ . (الحشر:۷)

تا کہ وہ تمہارے تونگروں کے قبضے میں نہ آجائے۔

یعنی مال صرف دولت مندوں اور سرمایہ کار لوگوں کی جاگیر نہیں؛ بلکہ اس میں غرباء کا بھی حق مسلم ہے، کائنات کا استحکام مال کے پھیلاؤ پر منحصر ہے، اگر اخلاقی پابندیوں کی لگام نہ لگائی جائے تو یہ مال صرف اور صرف چند لوگوں کے ساتھ خاص ہو جائے گا، جس کے برے اثرات انسانوں کو راہ راست سے دور کر دیں گے۔

اخلاقی اقدار کے قرآنی نظریے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عدل و انصاف قائم کرنے کی صورت میں اخروی فضائل بیان فرمائے ہیں جو ایک مؤمن کے لئے بہت بڑی کشش کا ذریعہ ہیں، اخلاقی پابندیوں کے سلسلے میں گفتگو فرماتے ہوئے ایک جگہ حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب رقمطراز ہیں :

> مجھے اس سے انکار نہیں کہ غیر اسلامی معاشرہ میں بھی اخلاق کا ایک مقام ہے اور بعض مرتبہ اخلاقی نقطۂ نظر معاشی فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ ان اخلاقی تصورات کی پشت پر آخرت کا مضبوط عقیدہ نہیں اس لئے وہ بحیثیت مجموعی معیشت پر کوئی نمایاں اثرات نہیں چھوڑتے، اس کے برخلاف اسلام اپنی تمام تعلیمات کے ساتھ نافذ العمل ہو تو اس کی اخلاقی تعلیمات کا اثر معیشت پر بہت نمایاں ہوگا؛ لہٰذا اخلاقی پابندیوں کا یہ عنصر ٹھیٹ اسلامی معیشت کے تناظر میں کسی بھی طرح کوئی کمزور عنصر نہیں؛ بلکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔(۱)

عدل وانصاف کا قیام

معاشی استحکام کے اصولوں میں ایک اہم اصل عدل و انصاف کا قیام ہے، اللہ عادل ہیں اور عدل کا حکم دیتے ہیں، اللہ محسن ہیں اور محسنین کو پسند فرماتے ہیں :

---

(۱) اسلام اور جدید معیشت وتجارت۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالاِحْسَانِ وَاِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى . (النحل:۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ بندوں میں یہ عدل کا مادہ باقی رہے، اس لئے کہ عدل جب تک قائم رہے گا ظلم نہیں ہوگا اور جب عدل ختم ہو جائے گا ظلم اس کی جگہ لے لے گا، جہاں ظلم اپنی بھیانک چادر پھیلا لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس قوم کے وجود کو ہی ختم فرما دیتے ہیں۔

قرآن مجید میں سابق انبیاء علیہم السلام کے تاریخی واقعات پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک کہ اس قوم کے سرمایہ داروں میں سرکشی، ظلم وعداوت حد سے تجاوز نہیں کر جاتی :

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوْا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْراً . (اسراء:۱۶)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے پھر ہم اس بستی کو تباہ وغارت کر ڈالتے ہیں۔

شرک وکفر کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار کی پامالی بھی ان قوموں کی ہلاکت کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سورہ روم میں فرمایا :

كَانُوْا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّأَثَارُوْا الْأَرْضَ وَعَمَرُوْهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِن كَانُوْا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ . (الروم:۹)

وہ ان سے قوت میں بھی بڑھے ہوئے تھے اور انھوں نے زمین کو بھی بویا جوتا تھا اور جتنا انھوں نے اس کو آباد کر رکھا تھا اس سے زیادہ انھوں نے اس کو آباد کیا تھا اور ان کے پاس پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے، سو خدا ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا؛ لیکن وہ تو خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ ''کانوا انفسهم يظلمون '' قرآن مجید میں تقریباً آٹھ جگہ آیا ہے ہر جگہ اسی کو بتانے کے لئے کہ لوگ اللہ کے انعامات کی ناشکری کر کے اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور مختلف طریقے سے

انسانی اقدار کی پامالی کرتے ہیں۔

قوم شعیب کا تذکرہ ہو یا قوم عاد کا واقعہ، قوم ثمود کا قصہ ہو کہ قوم موسیٰ کی داستان، ہر ایک قوم کے بارے میں شرک وکفر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی آپسی معاشرتی برائی کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کی بنیاد پر ان کو سزا دی گئی، معلوم ہوا کہ معاشرہ کا ظلم وعدوان کی طرف بڑھنا اس قوم کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ خود کسی پر ظلم نہیں کرتے اور بندوں کو بھی ظلم سے روکتے ہیں۔

اللہ کا عدل واحسان افراد پر بھی ہوتا ہے اور جماعت ومعاشرہ پر بھی، یعنی عدل کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد کو ظاہری طور پر نقصان ہوتا ہوا نظر آتا ہے؛ لیکن اس میں معاشرہ اور Society پر احسان مطلوب ہوتا ہے، اسی احسان کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان مال کو مساوات کے ساتھ تقسیم نہیں فرمایا، خود رب ذوالجلال قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

لَوْ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزْقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوا فِی الاَرْضِ . (الشوریٰ:۲۷)

اور اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لئے روزی فراخ کردیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے۔

یعنی مجموعی حیثیت سے پوری انسانیت مالداری میں یکساں نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ اگر ایسا ہوگا تو زمین باغیوں سے بھر جائے گی، مجموعی اعتبار سے مال کا ہر ایک کو عطا کیا جانا عدل کے خلاف تھا؛ حالاں کہ فردی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ انصاف کے خلاف نظر آتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں افراد پر معاشرہ کو ترجیح دے کر مجموعی اعتبار سے انسانیت پر عدل واحسان فرمایا ہے۔

انسانوں میں سے ہر ایک اگر مالدار ہوتا تو ایک دوسرے کی حاجت کو پورا کرنے کے لئے بے شمار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا، اس لئے کہ کسی کو جب مال کی ضرورت ہی نہیں تو محنت کیوں کرے گا اور جب کوئی محنت مزدوری تجارت پر آمادہ نہیں ہوگا تو انسانوں کی حاجات کس طرح پوری ہوں گی؟ گویا طلب ہی طلب ہے اور رسد کا نام ونشان نہیں، قرآن مجید نے گویا رسد وطلب کے قانون کو تسلیم کیا ہے؛ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُم مَّعِیْشَتَھُمْ فِیْ الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا بَعْضَھُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِیَتَّخِذَ بَعْضُھُم بَعْضاً سُخْرِیّاً . (الزخرف:۳۲)

دنیوی زندگی میں ان کی روزی ہم نے تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے۔

اللہ کے اس نظام عدل کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے اس بات کو ذہن نشین کرلیا جائے کہ صرف مال کے حصول ہی کو کامیابی کا معیار بنانا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے، اس لئے کہ انسانوں کی معاشی حالت اللہ تعالیٰ نے مختلف رکھی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا :

اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ ۔ (رعد:۲۶)

اللہ جس کو چاہے زیادہ رزق دیتا ہے اور تنگی کردیتا ہے۔

اسی طرح مختلف معاشی حالات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے مختلف ذمہ داریاں دے رکھی ہیں، کامیابی کا دارومدار اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات کی پیروی پر رکھ دیا ہے، جس حال میں اللہ نے بندے کو رکھا ہے اسی حال میں اللہ کی رضا کو تلاش کرنا اور حال کے مقتضا پر عمل کرنا ہی انسان کو کامیاب بناتا ہے۔

ثمرات کی بنیاد مشقت برداشت کرنے پر موقوف ہے

مال کے حصول کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں اور اس کے حاصل کرنے میں انسانوں کو مشقت اٹھانا پڑتا ہے، نقصان کا خوف بھی ہوتا ہے اور کبھی نقصان بھی ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی نفع کی بنیاد مشقت ہی پر رکھی ہے، جو جتنی مشقت برداشت کرے گا اور ذمہ داری لے گا اس کے اعتبار سے اس کو نفع ملے گا :

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۔ (النجم:۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

اگر قرآن مجید کی ان تعلیمات پر غور کیا جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے مال کے کمانے کا پاکیزہ طریقہ بتلایا ہے تو آسانی کے ساتھ اس اصول کی طرف رہنمائی مل جاتی ہے کہ ذمہ داری اور خطرات کو برداشت کرنا ہی نفع کی بنیاد ہے، مثلاً تجارت اور اس کی مختلف جائز صورتیں۔

جہاں کہیں اس اہم اصول کی پامالی کا خطرہ لاحق ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے اس عمل پر پابندی لگادی اور اس کی حرمت کو بیان کردیا ہے، مثلاً سود اور اس کی مروجہ صورتیں، میسر، قمار وغیرہ۔

دور حاضر کے معاشی نظام پر غور کیا جائے تو یہ اصول ہر اعتبار سے روندا جاچکا ہے، دور حاضر کے معاشی نظام میں سرمایہ ہی نفع کا محرک کہلایا جاتا ہے، یعنی جس کے پاس جتنا سرمایہ ہوگا اتنا ہی اس کو نفع ملے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مالدار اپنے سرمایہ داری کی وجہ سے مالداری میں بڑھتا چلا جائے گا اور غریب محنت کرنے کے باوجود غریب ہی رہے گا؛ بلکہ غریب تر ہوتا چلا جائے گا۔

اُصول اور لائحہ عمل

ایک بات قابل غور یہ ہے کہ صرف اصولوں کے بن جانے سے کامیاب معاشی نظام وجود میں نہیں آتا؛ بلکہ ان اصولوں پر عمل کرنے کے لئے ایک کامیاب لائحہ عمل کی ضرورت پڑتی ہے، ان اصولوں کی کامیابی اس لائحہ عمل کے اتباع ہی پر منحصر ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ منطقی اصول الگ چیز ہے اور لائحہ عمل یا عملی تدبیر الگ چیز؛ لیکن ان دونوں کے درمیان مضبوط اور مستحکم تعلق ہے، اسی لئے قرآن مجید میں اصولوں کی طرف بھی رہنمائی کی گئی اور ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لائحہ عمل بھی عطا کیا گیا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ اہم اصولوں پر عمل کروانے کے لئے بندوں سے چند چیزوں کے کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور چند محدود اعمال سے بچنے کا حکم دیا ہے، یہ بات واضح ہے کہ واجبات اور مباحات سے محرمات مقدم ہیں۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ انسان کی زندگی کو عبادات و معاملات کا مجموعہ بنایا ہے، عبادات میں فقہاء کے نظریے کے مطابق ''الأصل فيه الحظر'' کا قانون کارفرما ہے، یعنی عبادت وہی قابل قبول ہے جس میں سوائے ان خاص افعال کے جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، تمام اعمال و افعال حرام ہیں، معاملات میں اصل اباحت ہے، یعنی ان افعال اور اعمال کے علاوہ جن سے اللہ نے روکا ہے بقیہ تمام افعال کی اجازت ہوگی، عبادات اور معاملات میں سے ہر ایک میں چند چیزیں وہ ہیں جن کا کرنا ضروری ہے اور حسب مراتب ان کے نام بھی ہیں، جیسے: فرض، سنت، مستحب، بعض چیزیں وہ ہیں جن سے رکنا ضروری ہے اور اس کے بھی مختلف درجات ہیں، جیسے: حرام، مکروہ وغیرہ۔

زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو حرام سے بچ کر حلال کو اپنانے کی پیغمبر نے ہدایت فرمائی، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> الحلال بَيِّنٌ والحرام بَيِّنٌ ، وبينهما أمور مشتبهات لا يعلمها كثيرٌ من الناس ، فمن اتّقى المشتبهات استبرأ لدينه وعرضه ، ومن وقع في الشبهات : كراع يرعى حول الحمى يوشک أن يواقعه ، ألا ، وإنّ لكلِّ ملِكٍ حمًى ، ألا ، إنّ حِمَى الله في أرضه محارمه . (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، ان دونوں کے درمیان چند امور ہیں جو مشتبہ ہیں، جو شخص مشتبہات سے بچنے کا

(۱) بخاری: ۵۲، عن نعمان بن بشیرؓ۔

اہتمام کرتا ہے وہ اپنے دین اور آبرو کی حفاظت کرنے والا ہوتا ہے اور جو شخص ان مشتبہات میں پڑ جاتا ہے اس کی مثال اس چرواہے کی مانند ہے جو سرکاری چراگاہ کے قریب اپنے جانوروں کو چرواتا ہے قریب ہے کہ مویشی اس احاطے میں پہنچ جائیں جہاں چرانا ممنوع ہے، سنو! کہ ہر بادشاہ کے لئے حمی (مخصوص چراگاہ، یہاں حدود مراد ہیں) ہے اور اللہ کا حمی اس کے محارم ہیں۔

بخاری شریف کی اس حدیث کی تشریح میں حافظ بن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے تقوی کی بنیاد حرام سے بچنے میں بیان فرمائی ہے، اوور اسی تقوی سے انسان جہنم سے بچ کر جنت میں جانے والا بنتا ہے، اور جو جنت میں چلا گیا وہی کامیاب ہے :

فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ . (آل عمران:۱۸۵)
جو شخص جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا ہو سو وہ پورا کامیاب ہوا۔

پس حرام سے بچنے کی تدبیر اگر معاملات و عبادات کے ہر پہلو میں انسان ملحوظ رکھے تو تقوی کی روح کو پا سکتا ہے اور انسان کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے اور اس کی ہر اداء پر اللہ تعالیٰ ثواب مرتب فرماتے ہیں، اس رسالہ میں ہم نے اسی لئے محرمات کو مقدم کیا ہے تا کہ اس سے مسلمان بلکہ ہر انسان بچ کر اپنی دنیا وآخرت سنوار سکے۔

اس کے بعد ان اشیاء کا تذکرہ ہے جن کا کرنا فرض ہے، اس لئے کہ بہر حال عمل کی بھی حیثیت اسلام میں مسلم ہے اور اعمال صرف بچنے کا نام نہیں ؛ بلکہ کرنے کا بھی نام ہے اور ہر عمل یا تو انسان کو جنت میں لے جائے گا یا جہنم میں :

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ ، وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ .
(الزلزال:۷-۸)
سو جس نے کی ذرہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اسے، اور جس نے کی ذرہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا اسے۔

اس کے بعد ہم نے مباحات کا تذکرہ کیا ہے (مثلاً تجارت، قرض حسنہ وغیرہ) جس سے کسی بھی قوم کی اقتصادی حیثیت مزید مستحکم ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ مذکورہ نظام اور اصول کو جن کو قرآن مجید سے اخذ کیا گیا ہے اگر دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو قرآن کی معاشی تعلیمات کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

(۱) محرمات وممنوعات: وہ امور وافعال جن کے کرنے سے قطعی طور پر روکا گیا، مثلاً: سود، قمار، میسر وغیرہ۔
(۲) مباحات: وہ اعمال جن کے کرنے کی ترغیب دی گئی اور کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی، مثلاً: تجارت، ملازمت۔
(۳) واجبات: وہ اعمال جن کا کرنا واجب قرار دیا گیا اور نہ کرنے پر سخت دنیوی اور اخروی عذاب کی خبر دی گئی، مثلاً: زکوۃ۔

محرمات

محرمات کی فہرست میں سود ایک اہم باب ہے اور یہی معاشی عدم استحکام کی جڑ ہے؛ کیوں نہ ہو! اللہ تعالیٰ نے جب سودی لین دین کرنے والے سے جنگ کا اعلان کیا:

فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهِ . (البقرۃ:۲۷۹)

تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے سب سے ''اھون'' (ہلکا) سود ماں کے ساتھ غلط تعلقات کے قائم مقام بتایا۔

سود کی حرمت

ربا ایک ایسا گناہ اور ایک ایسا جرم ہے جو شرک کے بعد سب سے زیادہ خطرناک بتایا گیا ہے اس لئے کہ اعلان جنگ جیسی سخت وعید سوائے ربا کے کسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی، اس سے واضح ہے کہ اللہ ربا کے تعلق سے بندہ کو کتنا دور رکھنا چاہتے ہیں، ربا کی حرمت کا ایک اور پہلو اس کا دنیوی نقصان ہے، اس لئے کہ ربا سے مال کی گردش کم ہو جاتی ہے، ربا کے متعلق خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَمْحَقُ اللهُ الرِّبٰو وَيُرْبِى الصَّدَقَاتِ . (البقرۃ:۲۷۶)

اللہ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔

'محق' (۱) اصل میں پوری طرح مکمل نچوڑ دینے کو کہتے ہیں، یعنی مال کا اس طرح ختم ہو جانا کہ اس کی اصل ہی مٹ جائے، آخرت میں تو اس وعدہ اور وعید کا مشاہدہ پوری طرح ہو کر رہے گا کہ سود میں خیر و برکت برائے نام بھی نظر نہ آئے گی اور صدقات کا اجر بے حساب ملے گا؛ لیکن دنیا میں بھی اس کا ظہور کسی نہ کسی حد تک ہوتا ہی رہتا ہے۔

---

(۱) والمحق النقص والذهاب، ومنه محق القمر وهو انتقاصه (قرطبی:۳/۳۶۲)، يذهب ببركته و يهلك المال الذى يدخل فيه (تفسیر ابی سعود:۱/۲۶۷)، ان المحق عبارة عن النقص والاذهاب، قال المفضل: وهو ان يذهب الشى بالكلية حتى لايرى منه شيئ (تفسیر ابی سعود:۲/۹۱)، يعدمه فى الدنيا و يعاقب عليه يوم القيامة (تفسیر ابن کثیر:۱/۴۰۴)، محق: To eradicate, exterminate, wipe out, destroy, crush۔ (قاموس المحدث:۱/۱۹۸۵۵)

سودخوار قوموں کا انجام بارہا آپس کی خون ریزی اور تباہی و بربادی پر ہوا ہے اور افراد میں بھی مشاہدہ ہے کہ سودخواری کی عادت اس کے دل میں روپیہ کو فی نفسہ محبوب بنا دیتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سودخوار 'زر و دولت' سے دنیوی لطف بھی نہیں اٹھا پاتا ، اس کے مقابلے میں صدقہ کی برکتیں ملیّ غمخواری ، ایک دوسرے کی معاونت اور مشارکت اقوام وافراد دونوں میں مشاہدہ کی چیزیں ہیں۔

اگر ظاہری طور پر مال برباد بھی نہ ہو تو اس کے فوائد و برکات سے محرومی تو یقینی اور لازمی ہے؛ کیوں کہ یہ بات کچھ مخفی نہیں کہ سونا چاندی نہ تو مقصود ہے نہ کارآمد، نہ اس سے کسی کی بھوک مٹ سکتی ہے نہ پیاس، نہ اس کو گرمی سردی سے بچنے کے لئے اوڑھا بچھایا جا سکتا ہے نہ کپڑوں اور برتنوں کا کام دے سکتا ہے، پھر اس کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے میں ہزاروں مشقتیں اٹھانے کا منشاء ایک عقلمند انسان کے نزدیک اس کے سوا نہیں ہوسکتا کہ سونا چاندی ذریعہ ہیں ایسی چیزوں کے حاصل ہونے کا جن سے انسان کی زندگی خوشگوار بن سکے اور وہ راحت وعزت کی زندگی گذار سکے، یہی وہ چیزیں ہیں جو مال و دولت کے اثرات کہلا سکتے ہیں، اس کے نتیجے میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا: جس شخص کو یہ فوائد و ثمرات حاصل ہوں، اس کا مال حقیقت کے اعتبار سے بڑھ گیا اگر چہ دیکھنے میں کم نظر آئے ، اور جس کو یہ فوائد و ثمرات کم حاصل ہوں اس کا مال حقیقت کے اعتبار سے گھٹ گیا اگر چہ دیکھنے میں زیادہ نظر آئے۔

سودخور کا مال اگر چہ بڑھتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے جیسا کسی انسان کا بدن ورم (پھوڑا پھنسی) سے بڑھ جائے ، ورم کی زیادتی بھی تو بدن ہی کی زیادتی ہے مگر کوئی سمجھدار انسان اس زیادتی کو پسند نہیں کرسکتا؛ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ زیادتی موت کا پیغام ہے، اسی طرح سودخور کا مال کتنا ہی بڑھ جائے مگر مال کے فوائد و ثمرات یعنی راحت وعزت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے، سامانِ راحت پر تو وہ قدرت رکھتے ہیں مگر حقیقی راحت سے محروم ہوتے ہیں اس لئے کہ راحت نہ کسی بازار میں بکتی ہے نہ کسی فیکٹری میں دستیاب ہے ؛ بلکہ وہ ایسی رحمت ہے جو براہِ راست حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے، جہاں تک انکی عزت کا سوال ہے سودخور کی سخت دلی ، مفلسوں کی مفلسی سے فائدہ حاصل کرنا اور کم مایہ لوگوں کا خون چوس کر اپنا بدن پالنا جیسے اوصاف کی وجہ سے عام لوگوں کے دلوں میں ان کی کوئی عزت باقی نہیں رہتی۔

خلاصہ یہ کہ آیت کا مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے دنیا کے اعتبار سے بھی کھلا ہوا ہے، سرکار دو عالم ﷺ کے ارشاد: ''إن الربا وإن كثر فإن عاقبته تصير إلى قلة'' (۱) یعنی سود اگر چہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر اس کا انجام قلت کے سوا کچھ نہیں ہے، کا یہی مطلب ہے۔

(۱) مسند احمد: ۳۷۵۴، سنن ابن ماجہ: ۲۲۷۹، عن ابن مسعودؓ۔

حرمتِ ربا میں فطرتِ انسانی کی رعایت

قرآن مجید کی ایک جامع خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لازوال کتاب میں احکامات کے نفاذ کے سلسلے میں انسانی فطرت کے طبعی رجحانات اور جبلی عواطف اور میلانات کی مکمل رعایت کرتا ہے؛ چوں کہ ایک بری چیز یا برا رواج معاشرت میں جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا دفعتاً چھڑا پانا انسانی فطرت کے لحاظ سے آسان اور سہل نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نہایت حکیمانہ تدریج سے اولاً قلوب میں اس کی نفرت بٹھا دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ حکم تحریم سے مانوس کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت میں بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا اور سود کے متعلق بھی آیات کا نزول اوقات نزول کے تناظر میں کچھ اسی طرح کا ملتا ہے۔

سود کے متعلق سب سے پہلی آیت سورۃ روم کی ہے :

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلاَ يَرْبُوْا عِنْدَ اللهِ . (روم:۳۹)

اور جو چیز اس غرض سے دوگے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہوجاوے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔

یہ آیت بالاتفاق مکی ہے اگرچہ یہ آیت تحریمی نوعیت کی نہیں ہے مگر یہ اتنا ضرور کہتی ہے کہ ربا اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا یعنی آخرت میں اس کا کوئی ثواب نہیں ہے۔

اس سلسلہ کا دوسرا حکم سورۃ النساء کی آیت ہے :

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ . (النساء:۱۶۱)

اور بہ سبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے؛ حالاں کہ ان کو اس کی ممانعت کی گئی تھی اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھا جاتے تھے (ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال کی تھیں ان پر حرام کردیں)۔

جس میں یہودیوں کی بداعمالیوں کی فہرست کے ذیل میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ وہ ربا لیا کرتے تھے باوجود یہ کہ ان پر پہلے سے حرام تھا، جس سیاق میں یہ آیت نازل ہوئی اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ۴ ہجری سے قبل نازل ہوئی۔

ربا کے متعلق تیسری آیت سورہ ال عمران کی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً . (آل عمران:۱۳۰)

اے ایمان والو سود مت کھاؤ کئی حصے زائد۔

جو ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوئی اس آیت کے سیاق وسباق میں غزوۂ احد کی آیتیں ہیں، یہ آیت حرمت ربا کے سلسلے میں بالکل واضح حکم رکھتی ہے، یہ وہ پہلی آیت ہے جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو حرمت ربا کا واضح حکم ملا، ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ممانعتِ ربا کا اعلان غزوۂ بدر کے آس پاس زمانے میں کیا گیا، اس لئے کہ مکہ کے حملہ آوروں کو سودی قرضے کے ذریعہ سے سرمایہ مہیا کیا گیا تھا، یہ بات مسلمانوں کو بھی اسی طریقے پر لوگوں سے سودی قرضے لے کر اسلحہ جمع کرنے پر ابھار سکتی تھی، مسلمانوں کو اس عمل سے روکنے کے لئے یہ واضح طور پر ممانعت کرنے والی آیت نازل ہوئی اس کے علاوہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۸ اور ۲۷۹ میں بھی ربا کے متعلق احکامات اور اس کی حرمت کی تاکید فرمائی ہے۔

لفظِ ربا کی عمومیت

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ . (روم:۳۹)

اور جو چیز اس غرض سے دوگے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جاوے تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا۔

اس آیت کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ یہاں ربا سے حقیقی ربا مراد نہیں ہے؛ بلکہ مال کا اس نیت سے کسی کو ہدیہ میں دینا کہ میں اس کو دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلے میں اس سے زیادہ دے گا؛ چوں کہ نیت میں کھوٹ اور غرض میں فساد ہے اور بلاعوض مال کے حصول کی نیت ہے اس لئے اس کو بھی لفظِ ربا سے تعبیر فرمادیا گیا، جیسا کہ دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے :

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ . (المدثر:۶)

کسی کو اس غرض سے مت دو کہ زیادہ معاوضہ چاہو۔

سورۂ روم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسانوں کو ربا سے زکوۃ کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، یا تو ھبات الربا سے ھبات الزکوٰۃ کی طرف یا پھر قروض الربا سے قروض الزکوٰۃ کی طرف، مذکورہ وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ ربا چاہے کسی قسم کا ہو اگر چہ مشکوک ہی کیوں نہ ہو حرام ہے، اجتماعی، تنظیمی، تجارتی ربا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح انفرادی اور شخصی ربا حرام ہے، مالدار کا سود لینا بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح غریب کا سود لینا۔

لفظِ ربا ایک عام اور وسیع مفہوم رکھتا ہے، سود ربا کی ایک قسم ہے، ربا کو صرف مروجہ سود ہی میں منحصر کردینا غلط ہے، جاہلیت میں لوگ صرف مروجہ سود (قرض دیکر اس پر نفع لینا) ہی کو ربا سمجھتے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے ربا کے معنی کی وسعت بیان فرما کر بعض ایسی صورتوں کو بھی ربا قرار دیا جن میں اصلا ادھار ہی نہیں ہے۔

قرآن وحدیث میں ربا بغیر کسی قید کے مطلق استعمال ہوا ہے اور اس کو مقید کرنا بغیر کسی معتبر دلیل کے جائز نہیں، اسلامی نظریے کے مطابق ربا کا شک بھی معاملے کی حرمت کے لئے کافی ہے اسی لئے حدیث میں یہ فرمایا گیا کہ:
''فدعوا الربا و الريبة ''۔(۱)

معاشی استحصال بھی ربا ہی کی ایک شکل ہے

ربا کا حکم کبھی معاشی استحصال کی وجہ سے بھی مرتب ہوتا ہے، جیسا کہ ابوداؤد میں حضرت جابر ﷛ کی ایک روایت منقول ہے :

من لم يذر المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله . (۲)

جو شخص مخابرہ نہ چھوڑے اللہ اور اس کے رسول سے اعلانِ جنگ سن لے۔

رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ (زمین دار کاشت کار کو اپنی زمین اس معاہدہ پر دے کہ کاشت کار اس زمین کی پیداوار کا ایک حصہ ہر حال میں دے گا) کو ربا کی ایک شکل قرار دے کر حرام فرمایا ہے، اس میں ربا کا تصور ہماری طالبِ علمانہ نظریے کے مطابق یہ ہے کہ یہاں معاشی استحصال ہو رہا ہے اور کبھی کسی شخص کے حق میں مال گھٹتا ہوا بھی نظر آتا ہو؛ لیکن وہاں معاشی استحصال کا خوف ہو تو وہ بھی حرام ہے، مثال کے طور پر کسی نے ۱۰۰ روپیہ قرض لیا، چند دن بعد اگر قرض دینے والا (دائن) یہ کہے کہ آج اگر دے گا تو ۹۰ روپیہ میں میں مان جاؤں گا اور اگر کل دیا تو ۱۰۰ روپیہ دینا پڑے گا، اس طرح معاملہ کرنا بھی درست نہیں، اس دور میں چٹ فنڈ (Chit fund) اسی پیمانے پر چلتے ہیں، اگرچہ اس میں اس شخص کا مال بڑھا نہیں پھر بھی یہ سود کی قسم میں شمار کیا جائے گا جو کہ حرام ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے يَمْحَقُ اللهُ الرِّبٰوا کی تفسیر میں لکھا ہے: ''وهذا من باب المعاملة بنقيض المقصود''

اس کے بعد علامہ ابن کثیرؒ نے حضرت عمر ﷛ کی روایت نقل فرمائی ہے، فرماتے ہیں :

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ''من احتكر على المسلمين طعامهم ضَرَبَه الله بالإفلاس أو بجُذام'' . (۳)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جو شخص مسلمانوں سے کھانے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرے گا اللہ تعالی اس کو افلاس یا جذام کی بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

---

(۱) مسند احمد: ۲۴۶، سنن ابن ماجہ: ۲۲۷۶، من قول عمر بن الخطابؓ۔

(۲) سنن ابی داود: ۳۴۰۶۔

(۳) مسند احمد: ۱۳۵، سنن ابن ماجہ: ۲۱۵۵، عن عمر بن الخطابؓ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ علماء نے احتکار (ذخیرہ اندوزی کرنا تا کہ مال کی قیمت میں اضافہ ہو) کو بھی سودی معاملات کی جنس میں شامل فرمایا ہے :

عن عائشة ﷺ قالت لما نزلت الأيات من اخر البقرة في الربا خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم الى المسجد فقرأهن فحرم التجارة في الخمر . (۱)

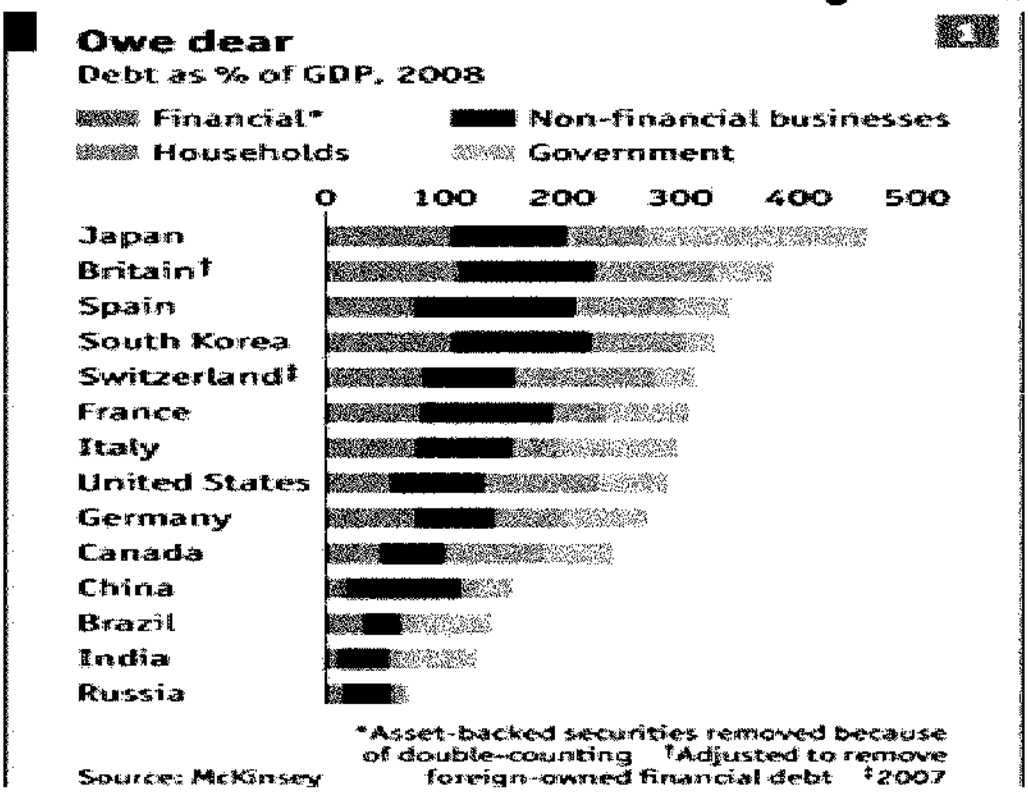
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں جو ربا کے سلسلے میں ہیں نازل ہوئیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی طرف نکلے اور ان آیتوں کی تلاوت فرمائی، شراب کی تجارت کو حرام قرار دیا۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے اس فعل سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ ربا تمام بیوعِ فاسدہ کو محیط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

الربا ثلاثة وسبعون بابا. (۲)

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ربا کے تہتر (۷۳) ابواب ہیں، ظاہر ہے کہ یہ عدد ربا کے اقسام اور اس کی کثرت و درکات کو بتانے کے لئے لایا گیا ہے۔

دنیا کی معیشت کا حال



(۱) صحیح مسلم: ۴۱۳۱۔ (۲) سنن ابن ماجہ: ۲۲۷۵ و شعب الایمان: ۵۵۱۹، عن عبداللہ بن مسعودؓ۔

جس دور میں ہم زندگی بسر کرر رہے ہیں اس کا حال یہ ہے کہ سودی قرض لینا مجبوری نہیں؛ بلکہ عیاشی کا ذریعہ بن چکا ہے، انسان اپنی وسعت سے زیادہ قرض لینے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی معیشت بتدریج گھٹتی گئی، جیسا کہ نقشہ سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے، ملک کی سالانہ پیداوار جسے معاشی اصطلاح میں (Gross Domestic Product: (GDP کہتے ہیں اس کو اگر قرض کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو قرض کا حد سے بڑھ جانا اور پیداوار کا تخمینہ سے کم ہونا واضح ہوتا ہے، اسی کو 'محق' کہتے ہیں کہ انسان بظاہر تو ترقی یافتہ نظر آئے اور اندر سے کھوکھلا ہو جائے، یعنی اس کی تمام ترقیات ایک سراب کی مانند ہیں جو دور سے پیاسے کو پانی کی آس دلا کر مزید پریشانی میں مبتلا کرتی ہے:

كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاء . (النور:۳۹)

ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہے۔

حق کو چھوڑ کر باطل کو اپنانے والا چند دن کی عیاشی کے بعد خود ہی اپنی قبر کھودنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لئے کہ باطل جھاگ کے مانند ہے جو جلد ہی اپنے برے انجام کو پالیتا ہے۔

فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاء . (الرعد:۱۷)

سو جو میل کچیل تھا وہ تو پھینک دیا جاتا ہے۔

مشہور اقتصادی ماہرین کا کہنا ہے کہ معیشت اگر اسی طرز پر اپنا سفر جاری رکھنے لگے تو عدم نقصان کے باوجود اس کو جو حال میں نقصان ہوا ہے اس کے تدارک کے لئے دس سال درکار ہیں، اقتصادی ماہرین کا کہنا ہے کہ آسانی آفتوں سے معیشت کو تیس سال میں اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا کہ ایک سال میں سودی لین دین کی وجہ سے کسی ملک کی اقتصادیت کو نقصان پہنچتا ہے:

- *Worst in 100 years :*
- *Capital Markets lost $30-35 trillions this year.*
- *Real estate lost $30-35 trillions–total $60 trillions.*
- *Financial institutions lost $3+ trillions.*
- *Central banks injected $8+ trillions since start.*
- *For comparison: Insured catastrophe losses. (earthquakes, tsunamis, man-made disasters) 1970-2007: $745 billions.*

غرر کی حرمت

غرر کے لفظی معنی ہیں: غیر یقینی حالت، جس عقد میں تین باتوں میں سے ایک پائی جائے اس میں غرر کا تحقق ہو جائے گا:

(۱) مبیع یا ثمن مجہول ہو: یعنی بیع کے اندر یہ معلوم نہ ہو کہ کس چیز کی بیع ہو رہی ہے جیسے بیع الحصاۃ، اس لئے کہ یہ معلوم نہیں کہ کنکری کس چیز کو لگے گی؛ لہٰذا اس میں مبیع مجہول ہے، یا قیمت معلوم نہ ہو کہ اس چیز کی کیا قیمت ہوگی؟ یہ بھی غرر کے اندر داخل ہے۔

(۲) مبیع غیر مقدور التسلیم ہو: یعنی بائع جس چیز کو فروخت کر رہا ہے وہ اس کو بالفعل مشتری کے حوالے کرنے پر قادر نہیں ہے، جیسے بیع حبل الحبلۃ، حمل کے حمل کی بیع ہو رہی ہے اور بائع اس بات پر قادر نہیں کہ مبیع فی الفور مشتری کے حوالہ کرے۔

(۳) تعلیق التملیک علی الخطر: یعنی تملیک کو کسی ایسے واقعے کے ساتھ معلق کرنا جس کے وجود میں آنے اور نہ آنے دونوں کا احتمال ہو مثلاً بائع مشتری سے کہہ دے کہ تم ثمن مجھے دیدو ابھی، اگر فلاں واقعہ پیش آیا تو میں مبیع تمہارے حوالے کروں گا؛ چوں کہ فلاں واقعہ کے پیش آنے میں دونوں احتمالات ہیں، یہ معاملہ درست نہیں ہے، اسی کو کبھی قمار بھی کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ قمار میں بھی ایک طرف پیسوں کی ادائیگی یقینی ہوتی ہے جب کہ دوسری طرف اس کا عوض یقینی نہیں ہوتا۔ (درسِ ترمذی: ۴/۹۷-۹۸)

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ غرر وجود بیع میں شک کو کہتے ہیں (حاشیہ ابن عابدین: ۵/۲۶)، بیع غرر کی وجہ سے عدوات، آپسی جھگڑے، بغض جیسی مہلک بیماریوں کو پنپنے کا موقع مل جاتا ہے اور معاملات میں جہالت اور اندیشے بڑھ جانے کا خوف غالب رہتا ہے۔

موجودہ دور کی اکثر انشورنس اسکیمیں اسی نوعیت کی ہیں، اس لئے کہ نہ Premium holder کو یہ پتہ ہے کہ اسے کتنی رقم ملنے والی ہے اور نہ کمپنی کو یقینی طور پر کسی مقدار کا علم ہے، اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ بعض حالات میں جیسے Life insurance ہے رقم کا ملنا تو یقینی ہے، اس بات کو قطع نظر کرتے ہوئے کہ اس کی مقدار کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر رقم ملنا یقینی بھی ہو؛ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتنی ملنے والی ہے ہوسکتا ہے دس لاکھ مل جائیں یا ہوسکتا ہے دس ہزار ملیں وہ تو تحقق واقعہ ہی بتائے گا؛ لہٰذا غرر تو پھر بھی پایا گیا، دوسری وجہ یہ ہے کہ اصل رقم سود کے ساتھ ملے گی جو سود کہنا جائز ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ . (النساء:۲۹)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ۔

— کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اکل بالباطل میں وہ تمام بیوع شامل ہو جاتے ہیں جو شرعا حلال نہیں اور جو مقصود کا فائدہ نہیں دیتے، جیسے کہ ربا، غرر وغیرہ۔

اگر قرآن وحدیث میں بیان شدہ تمام بیوع محرمہ پر غور کیا جائے تو حرمت کی دو بنیادی وجوہات ملتی ہیں :

(۱) وصف غرر کا تحقق مثلاً بیع الحصاۃ، بیع الملامسۃ، البیعتان فی البیع وغیرہ۔

(۲) ضرر کا خطرہ جیسے بیع الحاضر للبادی، بیع المعیب، بیع الحر وغیرہ۔

ان دونوں کا اعتبار مختلف شکلوں میں ہوتا ہے :

مثلاً باعتبار عین ضرر وغرر جیسے بیع الدم، بیع الخمر، بیع المیتۃ والخنزیر وغیرہ، باعتبار زمان ومکان بیع فی المسجد، بیع السلاح فی الفتنۃ وغیرہ۔(۱)

اسی لئے رسول اللہ ﷺ سے بیع غرر کی ممانعت صاف الفاظ میں احادیث میں منقول ہے :

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر . (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا۔

قمار و میسر کی حرمت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالأَنْصَابُ وَالأَزْلاَمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ . (المائدہ:۹۰)

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور قرعہ کے تیر، یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو اس سے بالکل الگ رہو تا کہ تم کو فلاح ہو۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ . (البقرۃ:۲۱۹)

لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت فرماتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں۔

(۱) اصول الاقتصادی الاسلامی۔ (۲) ابوداود:۳۳۷۶۔

علامہ ابن سیرینؒ فرماتے ہیں: ''كل شيئ فيه خطر فهو الميسر ''۔(۱)

یعنی ہر وہ چیز جس میں کسی ایک جانب یقینی حرج ونقصان متحقق ہو وہ میسر ہے۔

متقدمین میں سے بہت سے اکابرین وصحابہ نے قمار اور میسر کو ایک ہی حکم میں شامل فرمایا ہے، تفسیر طبری میں ہے :

عن ابن عباس وابن عمر والحسن السدى وقتاده وغيرهم قالوا : ان الميسر : القمار . (۲)

قمار اور جوے کی شکلوں میں بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہارنے والا رضامندی سے اپنا مال جیتنے والے کو دیا؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جوے میں جتنے غصہ اور غضب میں بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ چوروں اور ڈاکوؤں پر بھی ان لوگوں کو نہیں ہوتا جن کا مال چوری جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد فرمایا :

لانه اختطاف لاموال الناس عنهم معتمد على اتّباع جهل وحرص وأمنية باطلة وركوب غرر تبعثه هذه على الشرط ....

فرماتے ہیں کیوں کہ جو لوگوں کے اموال کو اس طرح اُچکتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت، حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی گرفتار ہوجاتا ہے اور دھوکہ پر سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے اور حرص غلط آرزو وغیرہ اس کو ان شرائط کے مان لینے پر آمادہ کرتی ہے جنھیں نہ شہری زندگی کی تعمیر اور نہ باہمی امداد میں دخل ہے، ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے تو اس کی خاموشی، غصہ اور ایسی ناکامی ونامرادی کی چنگاریوں پر قائم ہوتی ہے جن میں وہ اپنے قصد وارادے پر گھسا تھا، یوں ہی جیتنے والا اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے اور اس کاروبار کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور اس کی حرص اجازت نہیں دیتی کہ اس فعل سے باز آجائے بالآخر کچھ ہی دن بعد اس کا تاوان خود ہی اس کے سر پر مسلط ہوجاتا ہے(۳)، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی ایسی بدعات کا رواج ہوجاتا ہے تو اس کا نتیجہ: إفساد للأموال ومناقشاتٌ طويلةٌ وإهمال للارتفاعات المطلوبة ، یعنی ملک کی دولت عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اور باہمی طویل جھگڑوں کے سلسلے کی بنیاد پڑجاتی ہے اور حصول معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں لوگ اس باہمی امداد اور اعانت سے لاپرواہی برتنے لگتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔(۴)

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ:۱۷؍۲۶۱۔ (۲) تفسیر طبری:۴؍۳۲۳۔

(۳) حجة الله البالغة ، باب بيوع المنهي عنها:۲؍۱۶۴۔ (۴) حوالۂ سابق۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے صرف میسر و قمار کی حقیقی شکلوں ہی کو نہیں ؛ بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بھی قماری رنگ پایا جاتا ہے ان کو بھی ممنوع قرار دیا، عرب میں خرید و فروخت کی بعض ایسی صورتیں تھیں جنھیں موجودہ زمانہ میں سٹہ کہا جا سکتا ہے، مثلاً: منابذہ، ملامسہ، وغیرہ، اسلام نے ان سب کو غیر قانونی قرار دیا، مقصود یہی ہے کہ ہر شخص مخلوق کی کچھ خدمت کر کے کمائے اور کھائے تا کہ دولت عامہ کی پیدائش میں ہر شخص اپنی استطاعت کی حد تک حصہ دار ہو۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ جوئے بازی سے سماج کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اصطلاحی طور پر اسے Zero Sum کہا جاتا ہے، اگر لوگ تجارتی کاروبار چھوڑ دیں تو ترقی رک جائے گی اور انسانی تمدن زوال کا شکار ہو جائے اس کے برعکس جوئے سے اجتناب سے مجموعی دولت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ؛ بلکہ اس کے نتیجہ میں سماج میں دولت کی تقسیم پر جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ مال ایک گروہ کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے پھر وہی ''دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ '' (الحشر: ۷) والا حال جو کینسر سے زیادہ معیشت کے لئے خطرناک ہے۔

اکثر معاملات میں منفعت اور مضرت دونوں سے سابقہ پڑتا ہے؛ لیکن جہاں مضرت کا پہلو نمایاں ہو وہاں شریعت معاملہ سے منع کر دیتی ہے، اسی لئے شراب اور جوئے کے بارے میں فرمایا :

فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا . (البقرۃ:۲۱۹)

ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں ؛ لیکن گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔

سفہاء سے مال کو بچانا

تیسرا عمل جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو روکا ہے وہ مال کو نا اہلوں کے حوالے کرنا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

وَلاَ تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَاماً . (النساء:۵)

اور نہ دیا کرو کم عقلوں کو اپنے اموال وہی جسے بنایا ہے اللہ نے تمہارے لئے سہارا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اموال یا سرمایہ کو انسان کے معاشی نظام کے قیام و بقا کا ضامن قرار دیا، اور اس کے خرچ کرنے میں محتاط رہنے کی تاکید فرمائی، ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس درجہ پر فائز ہونے کے سبب سے اللہ نے اس دنیا میں انسان کے ٹھہرنے کا انتظام اور اس کے اسباب مہیا کئے ہیں :

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ . (البقرہ:۳۶)

اورتمہارے لئے زمین ہی پرٹھکانہ اورایک میعادتک نفع اُٹھانا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ . (الاعراف:۱۰)

اور بے شک ہم نے تم کوزمین پر رہنے کی جگہ دی اور ہم نے تمہارے لئے سامان زندگی پیدا کیا۔

اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ معیشت کی حفاظت اور تمکین فی الارض میں استقرار مال وسرمایہ کی حفاظت میں مضمر ہے۔

اسراف کی ممانعت

ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کواسراف کہتے ہیں، اس لئے کہ مال انسان کی بقاء کے لئے ضروری ہے اوراس کوبےتحاشہ، بلاضرورت خرچ کرنے میں انسانی زندگی کے استحکام کوخطرہ لاحق ہے :

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا .

(الفرقان:٦٧)

اور جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچ کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اوران کاخرچ کرنااس کے درمیان اعتدال پرہوتا ہے۔

يٰبَنِيْ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ . (اعراف:۳۱)

اے ابن آدم! تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنالباس پہن لیا کرواورخوب کھاؤاور پیو، اورحد سے مت نکلو، بےشک اللہ تعالیٰ پسندنہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ . (الانعام:۱۴۱)

اوراس میں جوحق واجب ہے وہ اس کے کاٹنے کے دن دیا کرواورحد سے مت گذرو یقیناً وہ حد سے گذرنے والوں کوناپسند کرتے ہیں۔

اسراف کی وجہ سے حق دارتک حق نہیں پہنچ پاتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی شہرایک ہی محلّہ میں رہنے والے دو پڑوسیوں میں سے ایک کروڑپتی ہوتا ہے تو دوسرے کے گھرمیں تین تین دن گذرجاتے ہیں؛ لیکن چولہانہیں سلگتا۔

تبذیر کی ممانعت

تبذیر کے معنی ہیں تخم چھڑکنا، یعنی جس طرح کسان اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے، یہی حال اس شخص کا بھی ہے جو اپنی دولت کو خرچ کرتا ہے اور اس کو پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ایسی جگہ خرچ کر رہا ہے جہاں خرچ کرنا قانونا جرم ہے۔

آیت میں اللہ تعالیٰ نے تبذیر کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے، خدا کی دی ہوئی قوت (مالی طاقت) کو برائی کے حصول میں صرف کرنے ہی کو شیطانی فطرت کہتے ہیں :

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرً . (الاسراء:۲۷)

اور قرابت دار کو اس کا حق دیتے رہنا اور محتاج اور مسافر کو بھی دیتے رہنا اور بے موقع مت اڑانا، بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

پس جب مال کے خرچ کرنے میں لوگ بے لگام ہو جاتے ہیں تو اللہ کی گرفت و پکڑ کا وقت قریب آجاتا ہے :

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوْا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيراً . (اسراء:۱٦)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ لوگ وہاں شرارت مچاتے ہیں، پھر ہم اس بستی کو تباہ اور غارت کر ڈالتے ہیں۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلاً وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِيْنَ . (القصص:۵۸)

اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے سامان عیش پر نازاں تھے، سو یہ ان کے گھر ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے اور آخر کار ہم ہی مالک ہیں۔

ریا سے بچنے کا حکم

ریا دکھلاوے کو کہتے ہیں، یہ اخلاص کی ضد ہے، ریا کاری ایک ایسا مہلک مرض ہے جو انسان کی تمام نیکیوں

کو اللہ کے نزدیک ختم کر دیتا ہے، مطلب یہ کہ اگر کوئی نیکی کے بہترین کام ہی میں کیوں نہ خرچ کرے؛ لیکن اگر اس نے یہ سارا خرچ لوگوں کو دکھانے کے لئے کیا ہے اور اس کے سامنے نہ خدا ہے نہ روز جزا، صرف اپنی بڑائی اور کبریائی مقصود ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس شخص کے ساتھ غلط طاقت یعنی شیطانی قوت کام کر رہی ہے :

وَالَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ رِئَـاءَ النَّاسِ وَلاَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَمَن يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِيْناً فَسَاءَ قِرِيْناً ۔ (النساء:۳۸)

اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھلاوے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن پر اعتقاد نہیں رکھتے اور شیطان جس کا مصاحب ہو اس کا بُرا مصاحب ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (البقرۃ:۲۶۴)

اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ چٹان پر گرد ہو اور اس پر بارش برسے پھر اسے سپاٹ بنا چھوڑے ایسے لوگ جو کچھ کماتے ہیں اس کے کسی حصہ پر قابو نہیں رکھتے اور اللہ ناشکروں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

توزیعات اور انفاق کی فرضیت

اسلام نے تو اولاً آمدنی کے تمام ناجائز ذرائع کا دروازہ بالکل بند کر دیا، اس کے علاوہ سرمایہ داروں سے غریبوں تک دولت پہنچانے کے لئے سرمایہ داروں پر زکوۃ جیسے چند اخراجات واجب کر دیئے ہیں، جو ان کا احسان نہیں؛ بلکہ مال پر واجب ہونے والا حق ہے۔

زکوۃ واجبہ کے علاوہ صدقۂ فطر، قربانی، کفارات، نفقات، وصیت، وراثت جیسی چھوٹی بڑی مدات ہیں، جن کے ذریعہ دولت کے تالاب سے چاروں طرف نہریں نکلتی ہیں اور ان سے پورے معاشرے کی کھیتی سرسبز وشاداب ہوتی ہے۔

قانونی پابندیوں کے ساتھ اسلام بحیثیت مجموعی جس ذہنیت کی تعمیر کرتا ہے، اس کی بنیاد سنگدلی، کنجوسی، بے رحمی اور خودغرضی کے بجائے ہمدردی فراخ حوصلگی، سخاوت اور سب سے بڑھ کر خوف خدا اور فکر آخرت پر استوار ہوتی ہے؛ چنانچہ قرآن کی تعلیمات انفاق فی سبیل اللہ کی ہدایات سے بھری پڑی ہیں اور ان میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ :

يَسْأَلُوْنَکَ مَاذَا يُنفِقُوْنَ ۔ (البقرۃ:۲۱۹)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو۔

اخراجات میں اضافہ کرکے قرآن نے دولت کے بہاؤ کا رخ عام معاشرے کی طرف پھیر دیا ہے اور ایسا بے داغ اور صاف ستھرا نظام اللہ نے ہمیں دیا، جس کا نفاذ آج بھی وہی نتائج وانقلاب لانے کی طاقت رکھتا ہے، جو ابتدائی دور میں اسلامی مملکت میں لایا تھا، جب صدقہ دینے والا ہاتھ میں روپیہ لے کر نکلا کرتا تو کوئی اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

تقسیم دولت کے سلسلے میں قرآن پاک نے جن چیزوں کے کرنے کو لازمی قرار دیا ہے ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) انفاق (۲) توزیع۔

ان دونوں کی مختلف شکلیں، صورتیں اور ان کی ترتیب وجزئیات بیان کرنے کو بھی قرآن نے ضروری سمجھا۔

التوزیع (وراثت)

توزیع اصل میں تقسیم کو کہتے ہیں، جب انسان اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے، اس کی جائداد و وراثت کی تقسیم کا مرحلہ اہم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے وراثت کی تقسیم کو انسانوں کے اختیار میں نہیں دیا؛ بلکہ خود رب ذوالجلال نے وارثین کی فہرست نہایت وضاحت کے ساتھ بتادی اور ہر ایک وارث کے حصہ کو الگ الگ متعین فرمادیا، اللہ تعالیٰ نے میت کے مال سے جس جس کو جس مقدار میں اس کا قائم مقام بنایا ہے وہ بن جائے گا، خواہ مرنے والا اس کو پسند کرے یا نہ کرے اور لینے والا اس پر راضی ہو یا نہ ہو، اس طرز کی تقسیم کی حکمتوں سے تو اللہ ہی واقف ہے انسانی عقل سے ادراک کرنا ممکن نہیں ہے۔

ایک بات تو یقینی ہے کہ وارثین میں سے حقیقی ہمدرد کون ہے اس کی پہچان بھی مشکل کام ہے اور انسان ہمدردی ہی کی بنیاد پر کسی کو زیادہ دینے کی سوچتا ہے، اسی لئے فرمایا اللہ تعالیٰ نے :

لاَ تَدْرُوْنَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعاً ۔ (النساء:۱۱)

تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں کا کونسا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے۔

اگر انسان کے اختیار میں دیا جاتا تو عدل و انصاف سے تقسیم ممکن نہیں اور تنازعات و انتشارات اس کے لازمی اجزاء ہیں، جس کے تدارک کی قرآن مجید میں بہت تاکید آئی ہے۔

فرائض (وراثت) کا علم اور اس پر عمل باعث ہدایت وموجب جنت ہے اور اس سے ناواقف رہنے میں گمراہی کا خطرہ لگا ہوا ہے، اسی لئے سرکار دو عالم ﷺ نے علم وراثت کے حاصل کرنے اور اس کی تعلیم دینے کی نہایت تاکید اور اس پر ترغیب فرمائی اور فرمایا :

تعلموا الفرائض وعلموها ۔ (۱)

علم تقسیم وراثت سیکھو اور لوگوں کو بھی سکھاؤ۔

انفاق

انفاق یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے قرض دینے سے تشبیہ دے کر یہ واضح فرمادیا کہ جس طرح قرض میں کسی شئے کے واپس مل جانے کی اُمید یقینی ہوتی ہے، اسی طرح انفاق میں بھی منفق یعنی خرچ کرنے والے کو اس کا انعام اور بدلہ اس دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں تو ضرور ملتا ہی ہے :

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ۔ (البقرۃ:۲۴۵)

کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا، پھر اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت سے حصے کردیوے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ، اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ (البقرہ:۲۶۱)

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانے کی حالت جس سے سات بالیں جمیں، ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں اور یہ افزونی خدا جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والے ہیں جاننے والے ہیں، جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ ایذا پہنچاتے ہیں، ان لوگوں کو ان کا

(۱) سنن ترمذی:۲۰۹۱، سنن ابن ماجہ:۲۷۱۹، عن ابی ہریرہؓ۔

ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس اور نہ ان پر کوئی خطرہ ہوگا نہ یہ مغموم ہوں گے۔
وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَهُوَ يُخۡلِفُهٗ وَهُوَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ . (سبا:۳۹)
اور جو چیز تم خرچ کرو گے سو وہ اس کا عوض دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

انفاق اسی چیز کا قابل قبول ہے جس کو قرآن ''طیبات'' کہتا ہے یعنی ایسی اشیاء جو ''طیبات'' اور پاکیزہ مال کی فہرست میں آتی ہیں، جو مال ''طیبات'' کی فہرست میں نہیں آتا؛ بلکہ قرآنی طرز کے مطابق ''خبیثات'' میں شمار کیا جاتا ہے، ایسے انفاق سے بھی قرآن میں ممانعت آئی ہے :

وَلَا تَيَمَّمُوا الۡخَبِيۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُم بِآخِذِيۡهِ إِلَّآ أَن تُغۡمِضُوۡا فِيۡهِ .
(البقرۃ:۲٦۷)

اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کردو؛ حالاں کہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ۔
آگے ہم تقسیم کے اسلامی طریقہ کار کو اجمالاً ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

نفقات الاقارب

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ قُلۡ مَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ . (البقرۃ:۲۱۵)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں، آپ فرما دیجیے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو سو ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا اور جونسا نیک کام کرو گے سو اللہ کو اس کی خوب خبر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انفاق کی شروعات والدین سے کرنے کو کہا ہے اور یہ واضح کردیا کہ والدین واقرباء پر خرچ کرنا بھی ثواب ہے اور اس پر بھی اللہ اجر مرتب فرماتے ہیں اور والدین واقرباء پر خرچ کرنا طریق زندگی کے لوازمات میں سے ہے، اقربین سے اگر اصول وفروع اور زوجین کے علاوہ دوسرے رشتہ دار مراد لئے جائیں تب تو یہ حکم انفاق واجبہ اور انفاق نافلہ دونوں کو شامل ہے؛ کیوں کہ اصول وفروع اور زوجین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو زکوۃ بھی دی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

الصدقة على المسكين صدقة ، وهي على ذي رحم ثنتان : صدقة وصلة . (۱)

محتاج رشتہ داروں پر کیا گیا خرچ دیگر مسکینوں پر کیے جانے والے خرچ کے مقابلے میں دوگنا اجر رکھتا ہے، ایک صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا۔

زکوٰۃ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ إِذاً لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الإِنفَاقِ وَكَانَ الإِنسَانُ قَتُوْراً. (الاسراء:۱۰۰)

آپ فرما دیجیے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مختار ہوتے تو اس صورت میں تم خرچ کرنے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور آدمی ہے بڑا تنگ دل۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک انسان پر کوئی ایسا قانون مسلط نہ کیا جائے کہ وہ اس قانون کی وجہ سے خرچ کرنے پر مجبور ہو جائے اس وقت تک فطرت انسانی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی، اسی لئے قرآن میں فرمایا گیا :

وَأُحْضِرَتِ الأَنفُسُ الشُّحَّ . (النساء:۱۲۸)

اور نفوس کو حرص کے ساتھ اقتران ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کا خیال کرتے ہوئے ہر سرمایہ دار جس کے پاس سرمایہ کا ایک متعین نصاب ہو، اس پر اس کے مال کا چالیسواں حصہ واجب کیا ہے۔

ویسے زکوۃ کی فرضیت ہجرت سے پہلے مکہ ہی میں ہو چکی تھی؛ لیکن اکثر علماء کا خیال ہے کہ مقدار زکوۃ اور اس کے تفصیلی احکام مدینہ میں نازل ہوئے، ستر (۷۰) سے زائد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ زکوۃ کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب صاف ہے کہ زکوۃ کو بھی اسلام میں وہی درجہ حاصل ہے جو نماز کو حاصل ہے، یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکاۃ سے جنگ کا اعلان کیا تھا۔

---

(۱) سنن الترمذی:۶۵۸۔

اللہ تعالیٰ نے مقدار زکوۃ کو بھی اپنی جانب سے متعین کیا اور ان افراد کی فہرست بھی خود ہی عنایت فرمادی جو زکوۃ کے مستحق ہیں، اگر انسان کے اختیار میں دیدیتا تو وہ ثمرات مرتب نہیں ہوسکتے جو اللہ تعالیٰ کے خود متعین کرنے میں مرتب ہوتے ہیں، ورنہ کوئی اپنی دولت اور سرمایہ کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتا، باپ اپنے بیٹے کو دیدیتا، شوہر اپنی بیوی کو، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مصارف کی ایک فہرست عنایت فرمادی۔

MPC معاشیات کا ایک اہم اصول ہے، اس اصول کے مطابق مال وزر کی گردش کے لئے ضروری ہے کہ دولت کو غرباء میں تقسیم کیا جائے تو معاشی استحکام میں اضافے کا باعث بنتا ہے، اس لئے کہ جیسے ہی کسی غریب شخص کو ایک روپیہ ملا وہ اس میں سے ۸۰ پیسے ضروری اشیاء خریدنے میں لگائے گا، اس طرح سے وہ دیا ہوا سرمایہ بازار میں گردش کا باعث بنے گا، جس سے معیشت میں ترقی کی راہیں ہموار ہوں گی، اس کے برخلاف اگر مال یا دولت کو کسی مالدار اور سرمایہ دار کے حوالے کیا جائے تو وہ اس کو محفوظ کرنے کی مختلف تدابیر اختیار کرے گا، اور اس کو باندھ کر اپنے پاس ہی رکھ لے گا تاکہ مستقبل میں ضرورت کے وقت استعمال کرسکے، یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جب تک زر کی گردش معاشرے میں عام نہیں ہوجاتی اور مالدار وگداگر، سرمایہ دار وفقیر کے درمیان فاصلہ کم نہیں ہوجاتا اس وقت تک مستحکم معیشت کا خواب کبھی پورا نہیں ہو پائے گا۔

زکوۃ الفطر

عید کا دن اللہ کی مہمان نوازی کا دن ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے صاحب ثروت لوگوں پر ایک مقدار متعین کرکے عید گاہ جانے سے پہلے مستحق تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، یہ بھی ایک ملی ہمدردی کی عمدہ دلیل ہے کہ معاشرے میں معاشی اعتبار سے کمزور لوگوں کی دلجوئی اور ان پر احسان سے ایک ایسا ماحول وجود میں آتا ہے جو ملی مفاد کا حامل اور ایک دوسرے کی خوشی ومسرت میں شرکت کا باعث بنتا ہے، اس کو صدقۃ الفطر بھی کہتے ہیں؛ لیکن قرآن کریم میں اس پر بھی زکوۃ ہی کا اطلاق کیا گیا ہے مثلاً:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى . (الاعلیٰ:۱۴)

بامراد ہوا جو شخص پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔

اس آیت میں بہت سے مفسرین کے قول کے مطابق 'صلوٰۃ' سے مراد نماز عید اور 'تزکی' سے مراد صدقۃ الفطر کی ادائیگی ہے۔

دیگر صدقات واجبہ

اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کے علاوہ بھی بعض حقوق کو واجب قرار دیا ہے، مثلاً محتاج والدین کا نفقہ موسر اولاد پر،

اسی طرح دوسرے اقارب پر، بقدر میراث واجب ہوتا ہے جس کی طرف آیت قرآنی :

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ . (البقرہ:۲۳۳)

اور مثل طریق مذکور کے اس کے ذمے ہے جو وارث ہو۔

میں اشارہ ہے، اسی طرح اگر کوئی اضطراری حالت میں بھوکا یا ننگا ہو یا کوئی میت ہو جس کی تدفین وتکفین کا انتظام نہ ہو تو اس کی فوری امداد ہر مسلمان پر واجب ہے، اسی طرح اگر مسلمانوں پر کوئی عام مصیبت آجائے، مثلاً: دشمن حملہ کر دے یا عام قحط پیش آجائے تو ان مصائب کے دفعیہ کے لئے مسلمانوں پر مالی امداد فرض ہو جاتی ہے۔

صدقاتِ نافلہ

صدقات واجبہ کے علاوہ قرآن نے صاحب ثروت افراد و جمعیت کو صدقات نافلہ پر بھی ابھارا ہے، آیت عفو یعنی: يَسْأَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرۃ:۲۱۹) اس کی واضح مثال ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ضرورت سے زائد کے انفاق کا تذکرہ فرمایا ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

مَا تَصَدَّقَ اَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَيِّبٍ — وَلا يَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّيِّبَ — اِلَّا اَخَذَهَا الرَّحْمٰنُ بِيَمِيْنِهٖ وَاِنْ كَانَتْ تَمْرَةٌ تَرْبُوْ فِيْ كَفِّ الرَّحْمٰنِ حَتّٰى تَكُوْنَ اَعْظَمَ مِنَ الْجَبَلِ . (۱)

ہر وہ شخص جو کسی پاکیزہ چیز کو صدقہ کرتا ہے (اور اللہ تعالیٰ پاک مال ہی قبول فرماتے ہیں) تو اللہ پاک اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے قبول فرماتے ہیں، اگرچہ کہ وہ ایک کھجور کی مقدار ہی کیوں نہ ہو، وہ صدقہ اللہ کی ہتھیلی میں پروان چڑھتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے زیادہ بڑا ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے احیاء میں لکھا ہے کہ جو شخص صرف زکوۃ ادا کرتا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں دیتا، تو وہ درجۂ بخالت سے نہیں نکلتا، اس لئے کہ زکوۃ تو غریب کا حق ہے، حق کو حقدار تک پہنچانا سخاوت نہیں؛ بلکہ اپنا حق دوسروں تک پہنچا کر ہی انسان اسخیاء کی فہرست میں آتا ہے۔

صدقاتِ جاریہ (اوقاف، حبوس)

حدیث میں تین چیزوں کا تذکرہ ہے جو مرنے کے بعد بھی ثواب کا باعث بنتی ہیں :

(۱) سنن الترمذی:۶۶۱۔

صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ وَعِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ وَوَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْ لَه . (۱)

اس حدیث میں صدقہ جاریہ کا ذکر ہے جو عموماً وقف ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے، وقف کے معنی ہیں روک کر رکھنا، یعنی حبس، وقف کو حبس اس لئے کہا جاتا ہے کہ موقوف شئے مثلاً زمین کی ملکیت کو ہمیشہ کے لئے محبوس کردیا جاتا ہے اور اب یہ کسی اور کی ملکیت میں نہیں جائے گی، اس کے منافع تو تقسیم ہوجائیں گے؛ لیکن اس کی ذات اور اصل محبوس رہے گی۔

جب کوئی چیز وقف کی جاتی ہے تو اس میں موقوف علیہم کا فقیر ہونا ضروری نہیں، زکوٰۃ میں تو متصدق علیہ کا فقیر ہونا ضروری ہے؛ لہٰذا اگر موقوف علیہم میں مستطیع لوگوں کو بھی شامل کرلے تو اس میں کوئی حرج نہیں، مثلاً کوئی شخص زمین وقف کرتے ہوئے یہ کہہ دے کہ اس زمین کی پہلی پیداوار میرے رشتہ داروں میں تقسیم کردی جائے، اس کے بعد فقراء کو دی جائے تو یہ جائز ہے؛ لہٰذا اغنیاء کو بھی موقوف علیہم بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس وقف کی آخری مد فقراء ہوں یا کوئی ایسی جہت ہو جو منقطع ہونے والی نہ ہو تو وقف درست ہے۔

ممنوعات اور واجبات کی مختصر تشریح کے بعد مباحات کا تذکرہ ہم ضروری سمجھتے ہیں اس لئے کہ ابتداء تخلیق انسانی سے آج تک کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں انسان کو تبادل مال کی ضرورت پیش نہ آئی ہو، یہی وجہ ہے کہ معاشی قوانین کو ہر دور میں ہر رسول پر نازل فرمایا گیا ہے، ہر رسول کو عبادت بدنیہ کے ساتھ ساتھ معاملات کی باریکیوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے، فرمایا رب خداوند نے :

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجاً . (المائدہ:۴۸)

تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی۔

اسی طرح فرمایا :

وَما أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِيْ الْأَسْوَاقِ . (الفرقان:۲۰)

اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔

قرآن مجید میں بھی تکمیل ضروریات انسانی کے لئے مباحات کو اختیار فرمانے کا حکم دیا گیا ہے اور انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے تبادل مال کے مشہور ذرائع کو حلال فرمایا اور ان سے استفادہ کی ترغیب بھی فرمادی، ذیل میں چند مباحات کا تذکرہ ہے۔

---

(۱) سنن ابی داود: ۲۸۸۲۔

تجارت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَن تَكُوْنَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ . (النساء:۲۹)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ؛ لیکن اگر کوئی تجارت باہمی رضامندی کے ساتھ ہو تو مضائقہ نہیں۔

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں یہاں 'تجارۃ' سے بیع وشراء اور عطایا دونوں مراد ہیں، تجارت کو اللہ تعالیٰ نے غزوہ اور حج میں بھی جائز قرار دیا ہے اور یہ بھی واضح فرمادیا کہ اس کے سبب سے نہ حاجی کے حج کا اجر کم ہوگا اور نہ غازی کے ثواب میں کمی، سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

التاجر الصدوق الامين مع النبيين والصديقين والشهداء . (۱)

وہ تاجر جو سچا اور امانت دار ہو، آخرت میں انبیاء صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

تجارت صرف ذریعہ معاش ہی نہیں ؛ بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کا بھی ذریعہ ہے، اس ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

طلب الحلال فريضة بعد الفريضة . (۲)

رزق حلال کی تلاش فرض نماز کے بعد فرض ہے۔

لیکن وہی تاجر قابل مبارکباد اور اللہ کے نزدیک ثواب کا مستحق ہے جو تجارت کے اصول اور شرعی قوانین سے واقف ہے، جس چیز کی تجارت کرنا چاہتا ہو اس کی شرعی حقیقت معلوم کرنا اور تجارت کو مفاسد سے خالی کرنا ہر تاجر پر واجب ہے، بیع وشرا کے چند اہم فروعیات پر بھی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا ہے، مثلاً: اذان جمعہ کے بعد تجارت جیسا کہ آیت میں ہے :

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوْٓا إِلَيْهَا . (الجمعة:۱۱)

اور وہ لوگ جب کسی تجارت یا مشغولی کی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑنے کے لئے بکھر جاتے ہیں۔

اسی طرح تجارت میں بھی خدا کی یاد کی تلقین، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے کچھ یوں فرمائی ہے :

---

(۱) سنن الترمذی: ۱۲۱۵، عن ابی سعید الخدریؓ۔ (۲) المعجم الکبیر: ۹۹۹۳، عن عبداللہ بن مسعودؓ۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ . (النور:۳۷)

وہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکاۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈال پاتی ہے اور نہ فروخت۔

اس کے علاوہ دیگر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تجارت کو تمثیلاً بیان فرمایا ہے؛ تاکہ نفوس میں طلب پیدا کی جاسکے۔

تجارت کے ثمرات انسانی زندگی پر

(۱) تجارت میں جانبین کو فائدہ ہوتا ہے یعنی مشتری کو ضرورت کا سامان اور بائع کو نقد۔

(۲) سرمایہ گردش میں رہتا ہے، جس کی وجہ سے ایک توازن قائم رہتا ہے جو کامیاب معاشرے کے لئے ضروری امر ہے، ورنہ مال اگر ایک جگہ مرتکز ہو جائے اور اس کی ریل پیل ختم کردی جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں گی، رسد وطلب کا توازن کمزور ہو جائے گا، پھر معاشرہ میں ہر قسم کا بگاڑ وجود میں آئے گا، اخلاقی اقدار بھی پامال ہوں گے اور کسی کی جان محفوظ رہے گی نہ مال محفوظ رہے گا۔

دَین (قرض) کی اباحت

اگر مالدار تجارت کے ذریعہ سے ذاتی منفعت کے حصول پر قدرت کم رکھتا ہے تو قومی منفعت میں استعمال کرنے پر بھی اللہ تعالیٰ اجر مرتب فرماتے ہیں (یہاں قومی منفعت سے آپسی بھائی چارگی، اخوت وہمدردی کا جذبہ، ایک دوسرے کو مدد کرنے کی فکر وغیرہ اخلاق مراد ہیں)، قومی منفعت کی ایک اہم شکل قرض دینا ہے، اس کے چند آداب اور اصول بھی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مفصل بیان فرمائے ہیں۔

انسانی عقل حیرت زدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سب سے بڑی آیت جو سورۃ البقرۃ میں ہے احکام دَین کے بارے میں نازل فرمائی، ایک قانون مسلم ہے کہ الفاظ کی زیادتی معانی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ادائیگی کی ضمانت کے لئے جو ممکنہ صورتیں اس دنیا میں ہوسکتی ہیں ان کو بھی بیان فرمایا ہے، ایک مکمل رکوع ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے رہن اور شہادت ورجسٹری کے تمام اصول وضوابط مفصل بیان کئے ہیں، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ نماز روزہ جیسے اہم عبادات میں صرف کلیات پر اکتفاء کیا گیا ہے اور معاملات کی شق کو جزئی باتوں کے ساتھ ذکر کیا گیا جس سے قرآن کی معاشی تعلیمات کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

آیت دین میں اللہ تعالیٰ نے قرض یا دین کو خالص احساناً عطا کیا جانے والا فعل قرار دیا ہے مطلب یہ کہ قرض دینے والے کو مالی منفعت میں سوائے اصل سرمایہ کے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اصل کی واپسی کے لئے ممکنہ تمام

اخلاقی صورتوں کو قرآ مجید نے بیان کیا ، احادیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے قرض دے کر غریبوں پر احسان کرنے والے کے لئے بشارتیں سنائی ہیں ؛ چنانچہ فرمایا کہ :

رایت لیلة اسری بی علی باب الجنة مکتوبا الصدقة بعشر امثالها والقرض ثمانية عشر . (۱)

صرف یہ نہیں کہ قرض کو صدقہ سے افضل قرار دیا ؛ بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ قرض کو اسلام نے باوجودیکہ خیرات کی مد میں شمار کیا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ اسلام میں بھیک مانگنے کی مذمت بیان کی گئی ؛ لیکن قرض کو اس مکروہ پہلو سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے ، صرف زبان سے نہیں ؛ بلکہ کائنات کی افضل ترین ہستی جس نے صرف اپنے لئے نہیں ؛ بلکہ قیامت تک آنے والی نسل اپنی نسل کے لئے صدقہ کو حرام فرمادیا ہے ، اسی ذات نے خود قرض لے کر اس میں جو بے عزتی کا اندیشہ تھا اس کو مٹادیا ، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں :

ليس القرض بسيئة ، وذلک لأنّ النبيّ صلی الله عليه وسلم کان يستقرض ، ولو کان مکروها کان أبعد الناس منه . (۲)

دوسری جانب قرض لے کر ٹال مٹول کرنے والے کے لئے سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں ، رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ کسی کی نماز جنازہ پڑھانے سے پہلے یہ دریافت فرماتے کہ اس کے ذمہ میں کسی کا قرض تو نہیں ہے؟ اگر یہ جواب ملتا کہ کسی کا قرض اس پر واجب نہیں ہے تو امامت فرماتے ، ورنہ یہ کہہ دیتے کہ " صلوا علی صاحبکم " (۳) جب اس دنیا میں پیغمبر ﷺ نے قرضدار کی شفاعت کرنا پسند نہیں فرمایا تو آخرت میں کیا امید کی جاسکتی ہے؟ ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کی شفاعت سے محروم ہوجائے ، الحاصل اسلامی معاشیات سے سودی نظام کو خارج کردینے کے بعد پسماندہ طبقات کے لئے اسلام نے سرمایہ کے استعمال اور دینی و دنیوی منافع کی راہیں بے روک ٹوک کھلی ہوئی ہیں ۔

یہ بات پہلے بھی کہی جاچکی ہے کہ قرض رسول اللہ ﷺ کے دور میں مجبوری میں لیا جاتا تھا ؛ لیکن آج مجبوری کی وجہ سے نہیں ؛ بلکہ حرص کی وجہ سے لوگ قرضوں کا انبار لگالیتے ہیں ، ان کا مقصد اپنی بدحالی دکھا کر سودی قرضے لینا ہے ، یہ مجبور نہیں بلکہ عیاش لوگ ہوتے ہیں ۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ زید نے ۱۰۰ روپیہ نفع کمایا جس کی وجہ سے ۲۰ روپیہ اس کو ٹیکس ادا کرنا پڑا ، اسی طرح بکر نے بھی ۱۰۰ روپیہ نفع کمایا ؛ لیکن اس نے ۱۵ روپیہ ٹیاکس ادا کیا ، اس کی وجہ یہ ہے کہ بکر نے سودی قرضہ لے رکھا تھا

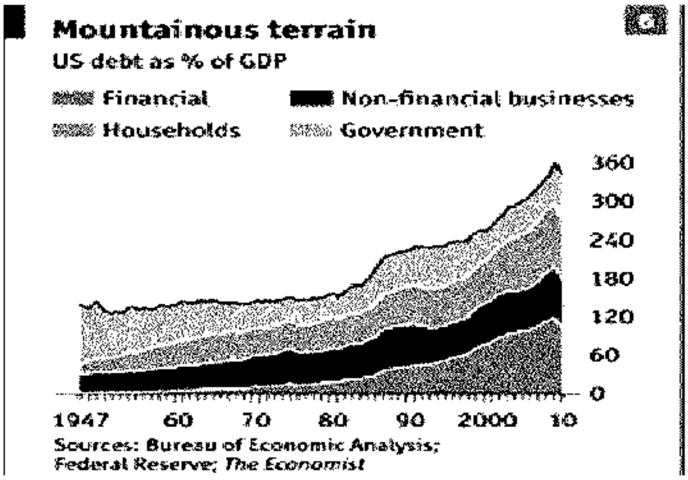
(۱) سنن ابن ماجہ : ۲۴۳۱ ، عن انسؓ ۔ (۲) المغنی : ۳۸۳/۴ ۔ (۳) بخاری : ۲۲۸۹ ، عن سلمة بن الاکوع ﷺ ۔

قرض کی وجہ سے ٹیاکس میں کمی آئی اور قرض کا سودا لگ ملا، یہ طریقہ ہے اس زمانہ کے تاجروں کا جس کی اسلام میں قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری طرف ایسے ادارہ ہیں جو تاجروں کو ترقی کے نام پر سود پر قرض دیتے ہیں ان کا قرض دینے پر آمادہ ہونے کا مقصد ہمدردی نہیں؛ بلکہ سود کا حصول، اس لئے کہ سود پر قرض دینے میں رأس المال بھی محفوظ اور نفع بھی متعین۔

جب بازار میں سرمایہ سے زیادہ قرض بڑھ جائے اور انسان ادائیگی کی فکر کے بغیر قرض لیتا چلا جائے تو پھر معیشت کا گھٹنا اور راستے سے بہت دور بھٹک جانا یقینی ہے، آج جب کریڈٹ کارڈ نے جب سے اپنے پر پھیلائے عام انسان بھی اس کو اپنانے لگے اور محفوظ طریقہ سمجھ کر اس کو اپنانے لگے جس کی وجہ سے سودی لین دین اور سودی قرض کا انبار لگ گیا۔

ماہرین کا کہنا ہے امریکہ جس کو سوپر پاور سمجھا جاتا ہے اس کے قرضی تناسب کا حال یہ ہے کہ اس کے GDP کے مقابلہ اس کا قرض ۳۶۰% زیادہ ہے، جیسا کہ نقشہ سے واضح ہے:



آخری بات

مذکورہ سطور میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کی اقتصادی تعلیمات کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم دلائل پر قائم ہیں، صرف یہی نہیں کہ ان اصول پر چل کر انسان کامیاب ہوسکتا ہے؛ بلکہ یہ بات بھی یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ان اصولوں سے انحراف انسانیت کی تباہی کا باعث بنے گا۔

انسان کی جتنی اقتصادی ایجادات ہیں سب جواب دے چکی ہیں اور ہر ایک کی مدت ختم ہوچکی ہیں، اب کوئی راستہ اگر مستحکم ہے اور تو صرف اسلامی اور قرآنی نظام ہے۔

آخر میں اللہ رب العالمین سے دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآنی تعلیمات کے مطابق عمل پیرا ہوکر اپنی زندگی سنوارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

⊙ ⊙ ⊙

مراجع ومصادر

(۱) القرآن الکریم۔
(۲) صحیح البخاری۔
(۳) سنن ترمذی۔
(۴) سنن ابن ماجہ۔
(۵) حجۃ اللہ البالغۃ۔
(۶) المغنی۔
(۷) شرح العقیدۃ الطحاویۃ۔
(۸) فی الفکر الاقتصاد الاسلامی: رفیق یونس مصری۔
(۹) اصول الاقتصاد الاسلامی: رفیق یونس مصری۔
(۱۰) الجامع فی اصول الربا: رفیق یونس مصری۔
(۱۱) البیوع المنہی عنہا۔
(۱۲) تفسیر طبری۔
(۱۳) حاشیۃ ابن عابدین۔
(۱۴) نظرات اقتصادیۃ فی القرآن الکریم۔
(۱۵) الاقتصاد الاسلامی والقضایا الفقہیۃ المعاصرۃ: علی احمد الساسوس۔
(۱۶) اسلامی معاشیات: مناظر احسن گیلانی۔
(۱۷) درس ترمذی: مفتی تقی عثمانی۔
(۱۸) اسلام اور جدید معاشی مسائل: مفتی تقی عثمانی۔
(۱۹) بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانوی۔
(۲۰) تفسیر ماجدی: عبد الماجد دریابادی۔
(۲۱) مفید الوارثین: مفتی اصغر حسینؒ۔
(۲۲) اسلام اور جدید معاشی مسائل: ڈاکٹر اسرار احمد۔
(۲۳) A Special Report on Debt
(۲۴) Riba interst & practice of islamic economis & Finance
(۲۵) Riba in Quran

اسراف سے اجتناب کے سلسلہ میں قرآنی ہدایات

مولانا اشرف علی قاسمی ⊙

قرآن کریم سرچشمۂ ہدایت ہے، رحمتوں اور برکتوں کا حامل نیز دین و دنیا کی فلاح و کامرانی کا ضامن ہے، سراپا نور اور رضاء حق کے حصول کا ذریعہ ہے، قلب میں نورانیت اور روح میں طمانینت و سکون پیدا کرنے والا اور تمام عظمتوں اور فضیلتوں کا امین ہے، دنیا میں سب سے زیادہ طبع ہونے والی اور پڑھی جانے والی کتاب ہے اور اس سے بڑھ کر وہ مکمل نظام حیات ہے، جس میں زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق احکام و ہدایات ہیں —— عبادت ہوں کہ معاشرت، فوجداری قوانین ہوں کہ معاشی احکام —— ہر جگہ قرآنی ہدایات انسان کی رہبری و رہنمائی کے لئے موجود ہیں، معاشیات کو لے لیجئے، اس باب میں تمام انسانوں کو مساوی حق دیا گیا ہے، اسی میں مومن و کافر، امیر و غریب کا، حاکم و محکوم کا، کاشتکار و زمیندار کا کوئی امتیاز نہیں رکھا اور ہدایت دی کہ مال و دولت اور ضروریات کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے؛ بلکہ اس کی گردش تمام انسانوں میں ہوتی رہے، کوئی بھی فرد بشر ننگا و بھوکا نہ رہے، دو وقت کی روٹی ہر ایک کو ملتی رہے؛ لیکن آج صورت حال بالکل برعکس ہے، جس انسان کے پاس دولت ہے، وہ سوچتا ہے کہ اس مال سے خود فائدہ اُٹھائے، دوسروں کو فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ دے، اس سوچ نے حرص و ہوس، سرمایہ پرستی اور ذخیرہ اندوزی اور دولت کے اکتناز کا غیر انسانی مزاج پیدا کر دیا اور اس کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ گئی، عام انسان اس سے محروم کر دیئے گئے؛ چنانچہ خود دیکھ لیجئے کہ آج دنیا کی دولت چند مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، اور دنیا معاشی بحران کا شکار ہے —— کچھ لوگ ہیں جو اسراف اور فضول خرچی کا ریکارڈ توڑ رہے اور اکثر لوگ بھوک مری کا شکار ہیں —— اسراف اور فضول خرچی صرف عام لوگ ہی نہیں؛ بلکہ مسلمان بھی اس میں مبتلا ہیں؛ جب کہ قرآن کی ہدایات اس سلسلہ میں صاف اور واضح ہیں۔

⊙ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

اسراف کا مفہوم

اسراف کے معنی ''اپنے کام میں حد سے گذر جانے'' کے ہیں، قرآن کریم میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے، کہیں مال کے صرف کرنے اور کہیں حقوقِ واجبہ کی ادائیگی نہ کرنے میں حد سے گذرنے کے معنی میں آیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا . (الفرقان:٦٧)

وہ لوگ جو مال کے خرچ کرنے میں نہ حد سے گذرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں۔

یہاں پر اسراف مال خرچ کرنے میں حد سے بڑھ جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، کہیں پر دوسرے اُمور میں سے حد سے گذر جانے کے معنی میں بھی استعمال ہوا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيْ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْن . (آل عمران:۱۴۷)

وہ بس یہی کہتے رہتے تھے: اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں میں ہماری زیادتیوں کو معاف کردیجئے ، ہمارے قدم کو مضبوط رکھئے اور کافروں کے مقابلہ ہماری مدد فرمایئے۔

اسی طرح قوم لوط کو اللہ تعالیٰ نے ''مسرفین'' کے لفظ سے موسوم فرمایا؛ کیوں کہ وہ جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے فطری راہ اپنانے کے بجائے انھوں نے مردوں سے غیر فطری فعل کا طریقہ اختیار کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے بقا کے لئے عورتوں سے جنسی خواہش کی تکمیل کا طریقہ عنایت فرمایا تھا، اس کی جگہ انھوں نے غیر فطری طریقہ اختیار کر کے حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا تھا، غرض کہ یہ لفظ فضول خرچی کے معنی کے لئے ہی مخصوص نہیں ؛ بلکہ دوسرے معاملات میں حد سے گذرنے کے معنی میں بھی آتا ہے ؛ لیکن چوں کہ اسراف بمعنی مالی فضول خرچی میں زیادہ استعمال ہوتا ہے، اس لئے یہاں پر اسی سے متعلق قرآنی ہدایات درج کی جاتی ہیں اور غور کیا جائے تو مال میں اسراف اور بے موقع و بے محل خرچ ہی کی وجہ سے انسان برائیوں میں مبتلا ہوتا ہے اور احتکار، ذخیرہ اندوزی، جیسے غیر اخلاقی اور انسانی عادتوں کا عادی بنتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور حکم عدولی کرتا ہے — اسراف اور مالی فضول خرچی ہی دراصل اس کی بنیاد ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْراً . (بنی اسرائیل:۱۵)

اور جب ہم کسی بستی کی ہلاکت کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں فسق و فجور کرنے لگتے ہیں اور اس پر ہماری حجت تمام ہوتی ہے، پھر ہم اس کو تباہ کر دیتے ہیں۔

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مالدار ہی سب سے پہلے گناہوں اور اللہ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں؛ کیوں کہ مال کی وجہ سے ان کو اس کی زیادہ قدرت ہوتی ہے، اسی اسراف کے ذریعہ نافرمانی اور سرکشی میں مبتلا ہوتے ہیں، فرعون نے اسی دولت اور حکومت کی وجہ سے سرکشی کی تھی، جس کے بارے میں قرآن نے نقل کیا کہ :

إِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفِينَ . (یونس:۸۳)

بے شک فرعون زمین میں سرکشی کرتا ہے اور وہ بے شک مسرفین میں سے ہے۔

مال کا مقصد

غور کیا جائے تو مال کی تخلیق میں اللہ کی بے شمار حکمتیں، مصلحتیں ہیں، انسان کو اپنی بقا کے لئے کئی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، اسے اگر دھوپ، روشنی، سردی، گرمی اور بارش سے بچنے کے لئے لباس کی ضرورت ہوتی ہے، تو اسے کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور چوں کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے اور فطری طور پر سماج میں رہنے کا مزاج لے کر پیدا ہوا ہے، اس لئے وہ کسی خاندان کا رکن ہوگا، اس کے ذمہ متعلقین کی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری ہوگی، اس لئے اس کو ایک ایسی چیز کی ضرورت تھی جس کے ذریعہ وہ ان ضرورتوں کی تکمیل کر سکے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مال پیدا فرمایا تاکہ انسان اپنے بقا کا انتظام اور اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکے، خود قرآن کہتا ہے :

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَاماً . (النساء:۵)

بے وقوف اور ناسمجھوں کو اپنے مال نہ دو جس کو اللہ نے تمہارے "قیام" کا سبب بنا دیا ہے۔

آیت کریمہ میں بتایا گیا کہ مال سے انسان کے بقا و قیام اور دنیا کے انتظام کی مصلحتیں وابستہ ہیں، اس لئے مال کے سلسلہ میں قرآن نے کچھ ہدایات دیں، مال کے مصارف متعین کر دیئے اور اس کی حفاظت کے اسلامی قوانین دیئے۔

مال کی حفاظت کے احکام

مال کی حفاظت کے تعلق سے قرآن نے سخت تاکید فرمائی اور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں مال دینے سے منع فرمایا، جن سے اسراف اور فضول خرچی کا خطرہ ہو، جو نادانی اور کم عقلی کی وجہ سے مالی مفاد اور مصلحتوں کو نہ سمجھتے ہوں؛ چنانچہ ارشاد ہوا :

وَلاَ تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَاماً ۔ (النساء:۵)

تم اپنا مال نادان، کم عقل لوگوں کے حوالہ نہ کرو جس کو اللہ نے تمہارے لئے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔

اسی طرح یتیموں کے متعلق ان کے اولیاء کو قرآن کی ہدایت ملاحظہ ہو :

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْداً فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلاَ تَأْكُلُوْهَا إِسْرَافاً وَبِدَاراً أَن يَكْبَرُوْا ۔ (النساء:۶)

اور تم یتیموں کو آزمالیا کرو، یہاں تک کہ جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں، پھر اگر ان میں یک گونہ تمیز دیکھو تو ان کے مال ان کے حوالہ کرو، ان اموال کو ضرورت سے زیادہ اور جلدی جلدی اس خیال سے نہ کھاجاؤ کہ وہ بالغ ہوجائیں گے۔

اس ہدایت میں اللہ تعالیٰ کا منشاء یہی ہے کہ تاوقتیکہ وہ سن شعور کو نہ پہنچ جائیں، عقل وتمیز نہ آجائے ان کے حوالہ نہ کرو، مال دینے سے پہلے آزمالیا کرو کہ وہ مالی مفاد کو سمجھتے ہیں یا نہیں؟ غیر ضروری اور لایعنی چیزوں میں خرچ تو نہیں کرتے۔

مال خرچ کرنے سے متعلق قرآنی ہدایات

اب مال کی حفاظت کے حکم کے بعد سوال ہوتا ہے کہ قرآن مال کو کہاں کہاں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے، اس کے خرچ کا کیا طریقہ ہے، اس میں کونسا خرچ مقدم ہے اور کونسا خرچ مؤخر ہے، قرآن نے اس سلسلہ میں بھی ہم کو ہدایات دی ہیں اور اس سلسلہ میں اخراجات کی ایک خاص ترتیب مقرر فرمادی کہ انسان پہلے اپنی ذات پر، اپنے اہل وعیال پر، اس کے بعد دوسرے اقربا پر صرف کرے، زیادہ مالدار ہو تو زکوٰۃ وصدقات کے ذریعہ مسکینوں، معذوروں، بیواؤں، یتیموں اور مسافروں کی مدد کرے، غرض کہ ایک ایسا نظام مقرر کردیا کہ کوئی انسانی قانون اس کی برابری نہیں کرسکتا۔

رشتہ داروں پر خرچ کرنے کا حکم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهُ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلاَ تُبَذِّرْ تَبْذِيْراً ، إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ ۔ (بنی اسرائیل:۲۶-۲۷)

قرابت دار کو اس کا حق اور مسکین و مسافر کو دے اور فضول خرچی مت کرو، بے شک
فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

اس آیت میں ہر شخص کو ہدایت ہے کہ والدین کے بعد اقربا کا حق جیسے صلہ رحمی، ملاقات، حسن معاشرت اور خوشحالی و تنگ حالی میں ان سے اظہار ہمدردی، جیسے اخلاق سے پیش آئے، احادیث میں بھی جابجا اس کی تاکید کی گئی؛ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو قوت عیالداری کے بعد دینے میں اپنے رشتہ دار سے آغاز کرے(۱) اور اسی لئے غیروں میں صدقہ کرنا اور اپنے رشتہ دار کو فراموش کردینے کو اسراف قرار دیا ہے؛ چنانچہ حضرت ثابت بن قیس ؓ نے پانچ سو درخت کے کھجور کا پھل توڑ کر ایک ہی دن میں تقسیم کردیا اور اپنے اہل وعیال کے لئے کوئی چیز نہیں چھوڑی تو آیت نازل ہوگئی :

وَلاَ تُسْرِفُوْا إِنَّهُ لاَ يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ . (الانعام:۱۴۱)

اسراف مت کرو، تحقیق کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ قرآن کی بتائی ہوئی ترتیب کے خلاف خرچ ہوگا تو وہ بھی اسراف میں داخل ہوگا۔

کتنا مال خرچ ہو؟

اب ان مصارف میں کتنا مال خرچ ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں قرآن نے اقتصاد اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے؛ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْماً مَّحْسُوْراً . (بنی اسرائیل:۲۹)

اور تو اپنا ہاتھ نہ گردن ہی سے باندھ لے اور نہ ہی اس کو بالکل کھول دے، جس سے
تو ملامت زدہ اور تہی دست ہوکر بیٹھ جائے۔

یعنی نہ اس قدر ہاتھ روک لو کہ تم پر بخیل کا اطلاق ہو اور نہ دینے میں اتنی زیادتی کرو کہ مسرفین میں تمہارا شمار ہو اور ضروری چیزوں میں خرچ کے لئے تمہارے پاس کوئی چیز نہ رہے، گویا خرچ میں اقتصاد اور درمیانی راہ کی تعلیم دی گئی اور سورۂ فرقان میں تو میانہ روی کو عباد الرحمٰن کے اوصاف میں شمار کیا گیا :

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً. (الفرقان:۶۷)

عباد الرحمٰن وہ لوگ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ
تنگی کرتے ہیں، ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

(۱) سنن نسائی، حدیث نمبر:۲۵۴۵، باب أي صدقة أفضل۔

اسراف سے بچانے کے لئے کچھ ہدایات

اسراف سے بچانے نہ صرف یہ کہ اس سے منع کیا گیا؛ بلکہ سد ذریعہ کے طور پر ایسی چیزوں کی بھی ممانعت فرمادی جو اسراف کا سبب بنتی ہیں، جیسے نمائش، فخر و کبر کا اظہار — چنانچہ سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال کو مرد وعورت ہر ایک کے لئے ممنوع قرار دینا، دیباج کا کپڑا مردوں کے لئے حرام قرار دینا، اسی قبیل سے ہیں — اسی طرح کھانے پینے میں بھی اسراف کے سلسلہ میں قرآن کی ہدایت گذر چکی ہے اور احادیث تو اس سلسلہ میں بے شمار ہیں۔

مال کے خرچ میں اسراف سے بچنے کے لئے یہ قرآنی ہدایات اتنے جامع اور حکمت و مصلحت سے بھرپور ہیں کہ ان کی پابندی سے مسلم قوم کی غربت، مفلوک الحال دور ہوسکتی ہے اور قرآن کے اسی جامع اقتصادی نظام نے قرون اولیٰ کے لوگوں کو معاشی و اقتصادی حالت اسی قدر بہتر تھی کہ کوئی دوسری قوم ان کی برابری نہیں کرسکتی تھی، ان کی دولت وقوت کے آگے دنیا کی تمام دوسری قومیں سرنگوں تھیں؛ لیکن جب مسلمان قانون الٰہی کے خلاف زندگی کے ہر شعبہ میں خاص کر خوراک، پوشاک، معاشرت اور شادی بیاہ میں اسراف اور فضول خرچی کے مرتکب ہوئے، عیش و آرام میں لگ گئے، لا حاصل اور لایعنی کاموں میں مال خرچ کرنے لگے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد سے عمداً مجرمانہ غفلت برتی جانے لگی، تو ان سے مال و دولت اور حکومت و سلطنت سب کچھ چھین لی گئی، کسی زمانے میں ایک عالم ان کے زیر اقتدار تھا، آج چند خطوں کے سوا سب کچھ کھو دیا، مالی حیثیت سے اس قدر کمزور ہو گئے کہ ان کو اپنی حفاظت دشوار ہوگئی اور اب تو اقتصادی کمزوری کے لئے حکومت وقت کے بے توجہی کا رونا روتے ہیں؛ لیکن اگر آج بھی مسلمان قرآن کی اسی ہدایت پر عمل پیرا ہوجائیں اور زندگی کے ہر شعبہ سے اسراف اور فضول خرچی ختم کریں تو پھر ماضی کا روشن دور اب بھی آسکتا ہے اور اُمت مسلمہ کی علمی، اقتصادی مفلوک الحالی دور ہوسکتی ہے۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز .

⊙ ⊙ ⊙

مسلم غیر مسلم تعلقات قرآن کریم کے پس منظر میں!

مولانا محمد کلیم صدیقی ⊙

انسانیت کو اسلام نے جو عروج بخشا ہے تاریخ عالم اس پر شاہد ہے، انسانیت کے لئے مساوات اور حسن اخلاق کا احساس اسلام نے پیدا کیا ما قبل اسلام کی قومیں اس سے یکسر ناواقف تھیں، روئے زمین کا ہر حصہ عصبیت و جاہلیت میں ڈوبا ہوا تھا، آپسی اونچ نیچ رنگ و نسل کے امتیازات، چھوت چھات جیسی گھناؤنی عادتیں ان کی طبیعت بن چکی تھیں، چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کرنا کوئی عیب کی بات نہ تھی۔

دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں کا مطالعہ کرنے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ کرۂ ارض پر بسنے والی تمام تہذیبیں کسی نہ کسی اخلاقی، سماجی، معاشرتی، مذہبی بگاڑ کا ضرور بالضرور شکار تھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند تاریخی حقائق سے ہم اپنی اس بات کو ثابت کریں؛ تاکہ اقوام عالم کا نقشہ سامنے آجائے، اس کے لئے بعض تاریخی نمونے ملاحظہ ہوں:

روم و ایران

یہ دونوں قومیں ہیں جو کہ عہد قدیم میں تہذیب و تمدن شستگی و شائستگی کا گہوارہ تصور کی جاتی تھیں اور جن کی تاریخِ عروج پوری انسانیت کے لئے نقطہ کمال تصور کی جاتی تھی، ان کا یہ حال ہے کہ آپس میں دونوں دست وگریباں رہتے، ہر سلطنت دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنے کو برتر کرنے کی کوشش میں لگی رہتی، ہر ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے آمادہ رہتا؛ چنانچہ خسرو پرویز نے جب قیصر ماریس کا بدلہ لینے کے لئے روم پر حملہ کیا تو اپنے حدودِ مملکت میں مسیحوں کے کلیسا مسمار کروا دیے، نذر کے اموال لوٹ لئے، صلیب پرستوں کو آتش پرستی پر مجبور کیا، اس سے واضح ہوا کہ ایک دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو، مذہب و جذبات کسی چیز کا ایک دوسرے کے یہاں کوئی تصور یا اس کا احساس تک موجود نہ تھا، ہر قسم کی تعلیمات و ہدایات سے وہ بے بہرہ تھے۔

۶۱۰ء میں بیت المقدس فتح کیا تو بطریق اعظم کو گرفتار کرلیا گیا، سینٹ ہلینا اور قسطنطنیہ کے عظیم الشان کنیسوں کو آگ لگادی گئی، وہاں کے برسہابرس کی جمع شدہ مذہبی یادگاروں کو لوٹ لیا گیا اور نوے ہزار عیسائیوں کو قتل

⊙ خادم: جامعہ امام ولی اللہ اسلامیہ، پھلت، مظفر نگر، دہلی۔

و اسیر کرلیا گیا، اس کے جواب میں جب ہرقل نے ایران پر حملہ کیا تو مجوسیوں کے آتش کدوں کو برباد کر دیا، زرتشت کے وطن ارمیاط کو پیوند خاک کر دیا اور مجوسی مذہب کی توہین وتذلیل میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

رومیوں کی دشمنی میں خود ایران کی مسیحی رعایا پر جو برسوں سے وہاں رہتی چلی آ رہی تھی اس پر انتہائی سختی کی گئی؛ حالاں کہ رومی سلطنت کے مسیحی مذہب اختیار کرنے سے پہلے تک ایران کے مسیحی مامون ومحفوظ تھے؛ مگر قسطنطین کے بپتسمہ لیتے ہی ایران کا رویہ اپنی مسیحی رعایا کے ساتھ بدل گیا۔

۳۳۹ء میں شاپور ذوالاکتاف نے بشپ مارشیمون اور ۱۰۵ دوسرے پادریوں کو قتل کرادیا اور بہت سے مسیحی کنیسوں اور صومعوں کو منہدم کرادیا، اس کے بعد چالیس سال تک مسیحیوں پر انتہائی سختیاں جاری رہیں۔(۱)

یہ نقشہ ہے ان قوموں کی تہذیب کا جہاں خسرو پرویز، دارا اور نوشیرواں جیسے بلند پایہ شہنشاہ گزرے ہیں اور جنھیں اپنے تہذیب وتمدن اور رواداری پر فخر تھا۔

یونان

یونانی تہذیب نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک آزاد دوسرے غلام، انسان کہلانے کا حق صرف یونانیوں کو حاصل تھا، جب کہ یونانی کی نگاہ میں غیر یونانی ایک غلام سے زیادہ کچھ اور نہ تصور کیا جاتا تھا، اسی لئے ان سے غلاموں جیسا سلوک اختیار کیا جاتا اور ہر قسم کے تمدنی حقوق سے انھیں محروم رکھا جاتا تھا، قتل وغارت گری عیش کوشی وسرمستی اور لوٹ مار ان کے عام وخاص تک پہنچی ہوئی تھی؛ چنانچہ ”الجہاد فی الاسلام“ میں مذکور ہے :

> حد یہ کہ اس معاملہ میں سکندر اعظم بھی اس عام کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہا، تاریخ کے صفحات اس بات کے شاہد ہیں کہ شام کے قدیم تجارتی مرکز صور کو جب اس نے چھ مہینے کے سخت محاصرہ کے بعد فتح کیا تو شدت غضب میں قتل عام کا حکم دے دیا اور اس وقت جس قوم کو دنیا کا مہذب ترین قوم ہونے کا فخر حاصل تھا، اس نے اسی ہزار بے گناہ انسانوں کو قتل کیا اور تقریباً تیس ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔(۲)

یورپ وامریکہ

یورپ وامریکہ کو آج ترقی یافتہ دور میں تہذیب وتمدن کا امام اور اصلی حقدار تصور کیا جا رہا ہے؛ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تعصب وامتیاز کی لعنت ان کی طبع ثانیہ بنی ہوئی ہے، اہل افریقہ کے ساتھ یورپ کا برتاؤ انتہائی شرمناک رہا ہے، امریکی افریقہ کے ساحلی علاقوں سے گروہ در گروہ حبشی نسل کے لوگوں کو پکڑ کر وہاں سے لے جاتے

(۱) الجہاد فی الاسلام: ۵۷-۵۸۔ (۲) الجہاد فی الاسلام: ۵۷-۵۸۔

اوران کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے تھے اوران سے سخت کام لیتے تھے،کہیں کہیں تو انھیں جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا،جنوبی،شمالی امریکہ میں غلاموں اور ماتحتوں کے ساتھ جابرانہ،ظالمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔(۱)

عرب قبل اسلام

ماردھاڑ قتل و غارت گری،شراب نوشی و جوا بازی عربوں کی عام شناخت اور پہچان بنی ہوئی تھی ، چھوٹی چھوٹی باتوں پر پشت ہاپشت جنگیں چلتیں،مشہور لڑائی ''حرب بسوس'' جو''بنی تغلب''اور''بنی بکر'' کے درمیان ہوئی تھی وہ چالیس سال تک مکمل جاری رہی اور وہ حرب اس بات پر ہوئی تھی کہ بنی بکر کی اونٹنی بنی تغلب کی چراگاہ میں گھس آئی تھی،کلیب نے غصہ میں آکرایک ایک تیر مارا جو اونٹنی کے تھن میں جالگا اونٹنی کے مالک نے جو اس کو زخمی دیکھا تو ''یالذلّ'' ہائے یہ کیسی ذلت ہے کہہ کر دہائی دی،بس پھر کیا تھا،بنی بکر میں آگ لگ گئی اور دونوں قبیلیوں میں ایسی جنگ ٹھن گئی کہ جب تک دونوں تباہ نہیں ہوگئے تلواریں نیام میں نہ گئیں۔

''سوق عکاظ'' میں قبیلہ کنانہ کا ایک شخص بیچ بازار میں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور پکار کہا'' میں عرب کا سب سے معزز آدمی ہوں،جس کسی کو مجھ سے زیادہ معزز ہونے کا دعویٰ ہو وہ میری ٹانگ سکیٹر دے''اس پر بنو دہمان کا ایک منچلا جوان آگے بڑھا اور اس نے اس کے پاؤں پر تلوار ماردی،یہ چنگاری دونوں قبیلوں میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے کافی تھی،یہ جنگ ''حربِ فِجار'' کے نام سے تاریخ میں موسوم ہے،مدتوں تک ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا رہا۔

ہندوستان

قدیم زمانہ میں ہی ہندوستان مختلف قسم کی تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے؛لیکن اس ملک کے باشندوں کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا،ہم نے اوپر مختلف اقوام کی حالتیں تاریخی شوائد سے پیش کی ہے؛ چنانچہ یجروید کے ادھیائے ۲۶/۱۱ میں ہے کہ :

> جن لوگوں سے ہم نفرت کرتے ہیں یا جو ہمیں دکھ دیتے ہیں،ہمیں چاہئے کہ انھیں اس طرح تڑپا کر ماردیں،جس طرح بلی چوہے کو مارتی ہے،ایک شودر اگر دوتیج کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے،اگر وہ ان کا نام لے کر اوران کی ذات کا نام لے کر توہین کرے تو دس انگلی لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سرخ کرکے اس کے حلق میں اُتاردی جائے۔

(۱) الجہاد فی الاسلام،اسلام میں غلامی:٦٦۔

انسانی مساوات کا تصور

درج بالا سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام سے قبل دنیا اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود ایسی ایسی بندشوں میں جکڑی ہوئی تھی، جس میں کسی دوسرے مذہب کسی دوسرے نظام کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، اسلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیمات و ہدایات دیں، ان کی ابتدا ہی اس بات سے کی گئی کہ ساری انسانیت ایک کنبہ و خاندان کی حیثیت رکھتی ہے، بنانے والے کی نگاہ میں بھید بھاؤ نہیں ہوتا ہے، جب کہ کوئی چیز بنائی جاتی ہے تو اس کے ساتھ یکسانیت کا معاملہ کیا جاتا ہے، اگر یکسانیت نہ برتی جائے تو پھر بنانے والے کو ظالم کہا جائے گا عادل نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ جس نے ساری انسانیت کو وجود بخشا ہے اور اشرف المخلوقات انسان کو بنایا ہے اور اس اشرف المخلوقات میں بھی سردار اُمت جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو بنایا ہے، وہ اس کے درمیان اونچ نیچ کو کیسے گوارہ کر سکتا ہے، اسلام نے اپنی تعلیمات کی روشنی سے سارے عالم کو منور کیا ہے، اپنے پاک کلام میں اللہ نے فرمایا :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ . (الحجرات:۱۳)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنی وقیع تصنیف ''تہذیب وتمدن پر اسلام کے احسانات واثرات'' میں دنیا کو اسلام کے دس اہم اور بنیادی عطیات کے ذیل میں ایک زندہ اور درخشندہ دنیا کی تخلیق وتشکیل پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں ''اگر چہ اقوام وممالک کی زندگی اور تمدن میں نمایاں اسلامی اثرات کی تعیین وتحدید نا گزیر ہے، مگر مختصر وانتخاب کے طور پر اس کے دس بنیادی وقیمتی عطایا کو متعین کیا جاسکتا ہے، جن کا نوع انسان کی رہنمائی صلاح وفلاح اور تعمیر وترقی میں نمایاں کردار رہا ہے، ان دس عطیات میں ہم یہاں پر اپنے مقالے سے متعلق صرف دو عطیات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں :

(۱) انسانی وحدت ومساوات کا تصور۔

(۲) انسانیت کے شرف اور انسان کی عزت وبلندی کا اعلان۔

انسانی وحدت ومساوات کا تصور

رسولِ انسانیت کی ایک بڑی عطا اور دنیا پر ان کا باقی رہنے والا احسان، وحدت انسانی کا تصور ہے، اس سے پہلے انسان قبائل واقوام کے اونچے نیچے طبقات اور تنگ نسلی دائروں میں بٹا ہوا تھا اور ان طبقات کا باہمی فرق ایسا اور اتنا تھا جتنا انسان وحیوان، آزاد وغلام اور عابد ومعبود کا فرق ہوسکتا ہے، آپ ﷺ سے پہلے وحدت ومساوات انسانی کا تصور خواب وخیال بن چکا تھا، رسول اللہ ﷺ نے صدیوں کی طویل خاموشی اور چھائے ہوئے اندھیرے

میں یہ انقلابی عقلوں کو جھنجھوڑ دینے والا اور حالات کا رُخ موڑ دینے والا اعلان فرمایا کہ :

یا ایھا الناس ان ربکم واحد وان أباکم واحد کلکم لآدم وآدم من تراب ، ان اکرمکم عند اللہ أتقاکم ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقویٰ . (۱)

اے لوگو! تمہارا رب ایک اور تمہارا معبود اعلیٰ بھی ایک ہے اور تم سب آدم کے ہو اور آدم مٹی سے تھے، تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ شریف سب سے زیادہ متقی انسان ہے اور کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، مگر تقویٰ ہی کے سبب سے ہے۔(۲)

انسانی شرافت وعظمت کا اعلان

اسلام کا نوعِ بشری پر دوسرا احسان، انسان کی شرافت وعظمت اور اس کے علو منزلت کا اعلان ہے، بعثت محمدی سے پہلے انسان ذلت ونکبت کی پستی میں گر چکا تھا اور روئے زمین پر اس سے زیادہ ذلیل وحقیر چیز نہیں رہ گئی تھی، بعض مقدس حیوان اور اشجار جن کے اساطیر روایات اور مقدمات تھے، وہ اپنے پرستاروں کے نزدیک زیادہ مکرم ومحترم تھے اور انسان کے مقابلہ میں انھیں حفاظت کا زیادہ مستحق سمجھا جاتا تھا، خواہ اس کے لئے معصوموں کا خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے، ایسے شجر وحجر کے آگے انسان کا خون اور گوشت بھی بے تکلف اور ضمیر کی خلش کے بغیر پیش کر دیا جاتا تھا، ہم نے اس کی مکروہ تصویریں اس بیسوی صدی میں ہندوستان جیسے بعض ترقی یافتہ مما لک میں بھی دیکھی ہیں۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو اس کی شرافت وعظمت واپس کی اور اس کا کھویا ہوا وقار واعتبار بحال کیا اور یہ اعلان کیا کہ انسان اس کائنات کا سب سے قیمتی وجود اور گرانقدر جوہر ہے اور یہاں اس سے زیادہ باعظمت اور محبت وحفاظت کی مستحق کوئی اور شئے نہیں، آپ ﷺ نے انسان کا درجہ اتنا بلند کیا کہ وہ اللہ کا نائب وخلیفہ قرار پایا، جس کے لئے اس نے دنیا پیدا کی اور اسے اپنے لئے پیدا کیا :

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِیْ الْأَرْضِ جَمِیْعاً . (البقرة:۲۹)

اور وہی خدا ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب۔

الخلق عیال اللہ فأحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیاله . (۳)

---

(۱) مسند احمد: ۲۳۴۸۹، ۲۳۶، ۸۷ـ (۲) تہذیب وتمدن پر اسلام کے احسانات واثرات: ۶۰ـ

(۳) المعجم الأوسط للطبرانی: ۵۵۴۱، عن ابن مسعودؓ۔

خدا کی مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔

یعنی تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، آپس میں خونی رشتے کے بھائی ہیں، سب کا خون ایک جیسا ہے، اللہ کی نازل کردہ آخری کتاب قرآن مجید اور اس کی عملی تفسیر حدیث پاک دونوں ہی میں احترام انسانیت اور کرامت انسانیت سے متعلق بہت تفصیل سے ہدایات ملتی ہیں، قرآن کریم کی آیت میں اللہ فرماتے ہیں :

مَن قَتَلَ نَفساً بِغَيرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً
وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعاً . (المائدۃ:۳۲)

جس شخص نے ناحق کسی کی جان لی گویا کہ اس نے تمام انسانیت کی جان لے لی اور جس نے ایک شخص کی جان بچائی گویا کہ اس نے تمام انسانوں کی جان بچائی ارشاد فرمایا گیا ہے، اور رحمت عالم ﷺ نے پڑوسیوں کے حقوق کے سلسلہ میں تاکید کرتے ہوئے ایک جگہ ارشاد فرمایا'' خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہوسکتا، جس کا پڑوسی اس کے شر سے ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں'' ان دونوں جگہوں میں مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں فرمائی گئی ہے، ناحق خون بہانے والا اللہ کی نظر میں سب سے بڑا مجرم ہے، چاہے وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اور کسی شخص کی جان بچانے والا چاہے غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ کی نظر میں پوری انسانیت کو بچانے والا ہے، اسی طرح جس پڑوسی کو ایذا پہنچائی گئی، چاہے غیر مسلم ہو یا مسلم ایذا پہنچانے والا رسول خدا کے فرمان کی روشنی میں سچا مومن نہیں ہے، غرض یہ کہ اسلام نے انسانی رشتہ ہونے کے سبب غیر مسلم بھائیوں سے سماجی و معاشرتی، معاشی، سیاسی، مذہبی، ہر قسم کے تعلقات رکھنے کی ہدایت وتعلیمات دی ہیں، جس کو مختصراً ہم اس مقالے میں پیش کریں گے۔

غیر مسلموں سے سماجی تعلقات

جب انسان خدا کی اور اس کے رسول کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب اور محترم شئے ہے تو اس کے حقوق بھی نہایت اہم ہیں، اس کو نفع پہنچانا، اس کے کام آنا، اس سے محبت کرنا، اللہ کی محبت میں داخل ہے، اللہ کی رحمت کو قریب کرنے اور برکات سماوی کے نزول کا سبب ہے۔

یہ احکام اس لئے ہیں کہ ایک دوسرے کو (Cooperate) کریں گے تو سماجی ترقیات سے فائدہ اٹھائیں گے ورنہ نہیں؛ البتہ جن لوگوں سے تعلقات رکھنے میں اہل اسلام کو خطرہ ہے تو انھیں آگاہ بھی کیا گیا ہے ورنہ عمومی حکم یہی ہے کہ سب کے ساتھ سماجی تعلقات بنائے رکھیں، اللہ فرماتا ہے :

لَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن

دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ . (الممتحنة:۸)

بنیادی طور پر اس آیت کریمہ میں یہ درس دیا گیا ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں صرف انھیں کے ساتھ تعلقات میں فرق لانا روا ہے، ورنہ عمومی طور پر جن غیر مسلموں سے مسلمانوں کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچ رہا ہے یا وہ مقابلہ پر نہیں ہیں تو پھر ان کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کی بد معاملگی اور ان کا یہ عمل دیکھ کر اسلام اور اس کی تعلیمات سے بدظن ہو جائیں اور ان کا یہ عمل قبولِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن جائے، اسی طرح اگر مسلمان ان سے حسن سلوک کریں گے، معاملات درست رکھیں گے تو ان کا یہ عمل غیر مسلموں کے دین و دماغ پر مؤثر اثر ڈالے گا، جس کے لئے اسلامی تعلیمات کی وسعت ظرفی ان کے سامنے آئے گی اور وہ ہدایت یاب ہوں گے، ویسے بھی ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس نے فرمایا ہے :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ . (البقرة:۲۷۲)

آپ تو کوشش کرتے رہیں، ہدایت تو اللہ دینے والے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ اس آیت پاک میں عام لوگوں کے ساتھ حسن معاشرت اور سماجی تعلقات تو استوار رکھنے کی تلقین کی گئی ہے اور صرف اتنا ہی نہیں؛ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اسلام نے تعلیم دی کہ :

ادْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ .
(حم السجدة:۳۴)

اے نبی تم بدی کو اس کی نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو تم دیکھو گے کہ وہ جس کی تمہارے ساتھ عداوت تھی وہ جگری دوست بن گیا۔

اس آیت میں اہل اسلام کو انسانیت دوستی کا درس دیا کہ اے مسلمانو! جس اللہ پر تم ایمان رکھتے ہو وہ رب العالمین ہے، سب کی پرورش کرنے والا وہی ہے صرف مسلمانوں کا ہی وہ رب نہیں ہے، اسے صرف تمہاری نہیں بلکہ دنیائے انسانیت کی فکر ہے، اس کے احکام پوری انسانیت سے متعلق ہیں، پر افسوس اس داعی اُمت نے قرآن کریم کے اس اُسلوب اور انداز بیان کو نہ سمجھا اور خدا کا تعارف پوری انسانیت کو کرانے سے وہ آج بھی قاصر ہے، اگر پوری انسانیت کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرایا ہوتا تو آج اس عالم کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رہتی دنیا تک کے لئے اسوۂ حسنہ اور آئیڈیل بنا کر بھیجا ہے، آپ ﷺ کے غیر مسلموں سے بہت اعلیٰ اور مضبوط قسم کے تعلقات تھے (اور دعوت دین کے لئے بھی برادرانِ وطن سے عمدہ تعلقات اور خوشگوار تعلقات ہونا ضروری ہیں) اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کے تعلقات کے لئے ہم یہاں مختصراً آپ کی سیرت طیبہ پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت سے قبل اور نبوت کے بعد

جب آپ ﷺ پر غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ کا کیوں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پہلی مرتبہ سامنا اور ملاقات ہوئی تھی اور آپ کے اوپر نہایت عظیم الشان کلام یعنی کلام شریف کے نزول کا آغاز ہوا تھا، اس لئے آپ بے چین سے ہوگئے تھے اور ایک قسم کی گھبراہٹ میں مبتلا ہوگئے تھے؛ چنانچہ آپ پسینے سے شرابور ڈرے اور سہمے اپنے گھر واپس آئے اور حضرت خدیجہ نے آپ ﷺ کو تسلی دی اور عرض کیا کہ :

کلا ، واللہ لا یخزیک اللہ ابدا ، انک لتصل الرحم ، وتحمل الکل ، وتکسب المعدوم ، وتقری الضیف ، وتعین علی نوائب الحق . (۱)

واللہ آپ کو خدا ہرگز ضائع نہیں کرے گا؛ کیوں کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، آپ مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، آپ ہانپتے کانپتے لوگوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، آپ بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرتے ہیں، آپ مصیبت زدہ لوگوں کا تعاون کرتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ بالا صفات آپ کی زوجہ محترمہ آپ کی شب و روز سے واقف اور ہمراز شخصیت بیان کررہی ہیں، ظاہر ہے کہ اس وقت آپ یہ حسن سلوک، انسانی خدمات غیر مسلموں کے ساتھ کرتے تھے؛ کیوں کہ آج پہلی وحی نازل ہوئی ہے اور آج ہی آپ ﷺ نبوت سے سرفراز ہوئے ہیں، اس وقت ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہوا تھا، یہ سلوک آپ غیر مسلموں کے ساتھ برتتے تھے، یہ مثال نبوت سے قبل کی تھی۔

دوسری مثال نبوت کے بعد کی ذکر کرتے ہیں، جب آپ ﷺ کی تیرہ سالہ دعوتی جدو جہد اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے باوجود مکہ کی زمین آپ پر تنگ ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا تو آپ ﷺ نے مدینہ روانہ ہونے سے قبل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر وصیت فرمائی: ہم مدینہ جارہے ہیں تم رات میں ہمارے بستر پر آرام کرنا اور صبح کو کفار و مشرکین کی امانتیں جو ہمارے پاس ہیں ان کو ادا کر کے مدینہ آجانا، ظاہر ہے کہ یہ امانتیں آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کی نہیں تھیں؛ بلکہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھانے والوں اور آپ پر کوڑا کرکٹ ڈالنے والوں اور آپ کو جادوگر، کاہن کہنے والے غیر مسلموں کی تھیں اور کوئی بھی شخص امانت اس شخص کے پاس رکھتا ہے، جس پر اعتماد ہوتا ہے، جسے اپنا خیر خواہ سمجھتا ہے، جس سے تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں۔

تیسری مثال آپ ﷺ کی وفات سے قبل کی ہے، صحیح حدیث میں منقول ہے کہ آپ ﷺ وفات فرماگئے اور آپ کی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی، یہ وقت اسلام کی ترقی اور ہر طرح سے اسلام کے

(۱) صحیح البخاری: ۳، باب کیف کان بدالوحی۔

عروج کا دور تھا، لاکھوں لاکھ افراد اسلام کے پرچم کے نیچے آچکے تھے، مالی حالت بھی ممتاز تھی، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ اوران جیسے سینکڑوں صاحب مروت اور خوشحال صحابہ موجود تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے اپنی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس گروی کیوں رکھی؟ ظاہر ہے کہ اس سے مقصد آپ ﷺ کا تعلقات استوار رکھنا تھا، اس بہانے ایک غیر مسلم بھائی کا، آپ ﷺ کے پاس اور آپ ﷺ کا اس کے پاس آنا جانا رہے گا، نیز اسلام کی دعوت کے بارے میں بھی گفتگو کا موقع ملتا رہے گا، آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کی اس مختصر سی جھلک سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ غیر مسلموں سے از اول تا آخر خوشگوار تعلقات تھے اور پوری دنیائے انسانیت کے لئے اسی کو اسوہ اور نمونہ بنایا گیا ہے، ارشاد ہوا :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (الاحزاب:۲۱)

یقیناً تمہارے لئے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں اسوہ ہے۔

اسلام کی عادلانہ اور مساویانہ تعلیم

معلم انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ر ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت حاضر تھی اپنے فصیح و بلیغ اور تعلیمی خطبہ میں تمام متبعین اور پیروکاران اسلام سے دوٹوک انداز میں انسانیت نوازی اور تحفظ اموال وتحفظ عزت وناموس پر مشتمل ہدایات دیتے ہوئے فرمایا :

ان دماء کم واموالکم حرام علیکم . (۱)

بے شک تمہارے مال تمہاری جانیں ایک دوسرے پر حرام ہیں۔

ہرگز مال اور جان ناجائز مت ختم کرنا تم سب ایک رب کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہو، تمہارے درمیان خاندان، ذات، برادری اور رنگ ونسل کی بنیاد پر ہرگز کوئی تمیز نہیں ہونی چاہئے، سب کے حقوق یکساں ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نمونہ عمل چھوڑا اور قرآن کریم کی جیتی جاگتی جو تصویر کشی ہے اس کو صحابہ کرام ﷺ نے خود سمجھا اور اس پر عمل بھی کیا، انسانیت نوازی کی ایک بہترین مثال صحابہ کرام ﷺ کے یہاں یہ ہے؛ جب مکہ میں شدید قحط پڑا اور دانے دانے کے لئے لوگ ترس گئے تھے حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسی صورت میں مکہ کے سرداران مشرکین کے لئے جو مسلمان کا نام ونشان تک مٹا دینا چاہتے تھے، پانچ سو دینار بھیجے؛ تاکہ ان کی غمگساری ہو سکے۔

---

(۱) صحیح البخاری: ۶۷، عن ابی بکرۃؓ۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کار حقوق کی ادائیگی کے لئے یہ تھا کہ اگر تنازع کے فریق یہودی ہوتے تو عدالت بھی یہودی ہوتی، جج بھی یہودی ہوتے اور قوانین بھی یہود کے مطابق ہی ہوتے، نیز مسلم قوانین کا نفاذ بھی اسی صورت میں ہوتا تھا؛ جب کہ تمام فریق اس پر رضامند ہوں، تاریخ انسانی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی غیر مسلم رعایا پر اپنے قوانین کا نفاذ زبردستی نہیں کیا اور خود ہندوستانی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت کے عرصے میں یہاں مسلم قوانین نہیں؛ بلکہ ہندو قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔

یقیناً اہل اسلام کی اسی فیاضانہ (Policy) پالیسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے تخت و تاج اور ملک پر حکومت نہیں کی؛ بلکہ دلوں پر حکمرانی کی اور دنیا کے سامنے اپنی روشن ضمیری اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو واضح کر دیا۔

املاک کا احترام

اسلامی تعلیمات میں جس طرح عظمت انسانیت اور احترام انسانیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بلا اختلاف مذہب وملت سب انسانوں کی جانوں کو محترم اور قابل امن گردانا ہے، اسی طرح تمام انسانوں کے مال کی حفاظت کا درس تعلیمات اسلامی میں بحسن خوبی دیا گیا ہے، بغیر مالک کی رضامندی کے ایک حبہ بھی لینا جائز نہیں، چاہے مالک مسلم ہو یا غیر مسلم۔

إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۔ (النساء:۲۹)

اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا قرار دیا گیا ہے جو شخص بھی چوری کا مرتکب ہوگا، چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نگاہ میں املاک چاہے مسلم کی ہو یا غیر مسلم کی سب یکساں حفاظت اور احترام کی مستحق ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

دمائهم كدمائنا واموالهم كاموالنا . (۱)

یعنی ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہیں اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں۔

لهم مالنا وعليهم ما علينا .

ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو دارالاسلام میں حاصل ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو ہم پر عائد ہیں۔

چنانچہ اسلام نے حفاظت نفس ودین، حفاظت نسل اور حفاظت مال کے سلسلہ میں جو ہدایات دی ہیں،

---

(۱) نصب الرایۃ: ۳۶۹/۴۔

ان میں اپنوں کی اور غیروں کی تمیز نہیں رکھی ہے؛ بلکہ ہر انسان کے لئے ان امور کا بنیادی حق دیا ہے۔

عزت و ناموس کی حفاظت

جس طرح تمام انسانوں کے مال قابل احترام ہیں، اسی طرح ان کی عزت و آبرو بلا اختلاف مسلم و غیر مسلم قابل احترام ہے، قرآن کریم میں انسانی صفات اور فاضلانہ اخلاق کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے :

اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان کرنے سے اجتناب کرو، اس لئے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور جاسوسی مت کرو اور بعض بعض کی غیبت مت کرو۔ (الحجرات:۱۲)

یہ ہدایات تمام انسانوں کے ساتھ اچھے گمان رکھنا، دوسروں کے بھیدوں کی ٹوہ میں مت پڑنا غیبت سے اجتناب کرنا، چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم سب کے حق یہ ہدایات یکساں ہیں، اسی طرح فقہ اسلامی کی رو سے زنا کیوں کہ ایک سنگین اور گھناؤنا جرم ہے اور معاشرے میں فساد پھیلنے اور اخلاقی بگاڑ کا ذریعہ ہے، اس لئے زانی کی سزا اگر شادی شدہ ہے سنگسار ہونا اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو سو کوڑے لگانا مقرر فرمائی گئی ہے، چاہے فاعل ہو یا مفعول، مسلم ہو یا غیر مسلم، عزت و ناموس کے تمام حقوق یکساں قابل احترام قرار دیئے گئے ہیں، ہر ایک کی جان، مال، عزت و آبرو کا یکساں تحفظ و احترام کیا جائے خواہ وہ کسی بھی نسل سے تعلق رکھتا ہو :

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُونَ مِن دُوْنِ اللهِ. (الانعام:۱۰۸)

اور اے مسلمانو! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو۔

خوشی و غمی کی مجلسوں میں شرکت

انسان کیوں کہ ایک سماجی حیوان ہے اور زندگی متنوع ہے، فرحت و شادمانی اور حزن و ملال، زیست و حیات وغیرہ مختلف قسم کے مراحل سے انسان کو گذرنا پڑتا ہے اور انسان کی فطرت میں یہ بات ودیعت فرمائی گئی ہے کہ اگر اس کو کوئی خوشی یا مسرت حاصل ہوئی یا وہ کسی منصب پر فائز ہوا ہے تو اس کو مبارک باد دی جائے، خوشی کے لمحات وہ اپنے اقرباء، دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ بتائے، اسی طرح اگر وہ مصائب و مشکلات کا شکار ہوا ہے، بیماری یا موت جیسے حالات کسی کے یہاں پیش آئے ہوں تو ان حالات میں اس کی غمگساری کی جائے، اسے تسلی دی جائے، ہمت افزاء گفتگو کی جائے؛ چنانچہ شریعت اسلامی میں اس کی اجازت دی گئی ہے کہ اگر کسی غیر مسلم کو کوئی تمغہ ملا ہے یا اس کے گھر شادی ہے یا کوئی اور نعمت دنیوی اسے حاصل ہوئی ہے تو اس کو مبارک باد دی جائے، اس کی دعوت قبول کی جائے اور اسی طرح اگر وہ بیمار ہے تو اس کی عیادت کی جائے؛ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر مسلم کی

عیادت کرنا منقول ہے،آپ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء اسلام نے غیر مسلموں کے متعلق جو احکامات دیئے ہیں، چند یہاں ذکر کئے جاتے ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان کا مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہو جائے تو اس کے عزیز سے تعزیت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :
  ''أخلفک اللہ خیرا منہ ، وأصلحک''۔(۱)

میدانِ علم کے سلسلہ سے متعلق تعلقات

غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ تعلیم وتعلم بھی اسی طرح درست ہے، جس طرح ایک مسلم کے ساتھ درست ہے؛ علم کیوں کہ ایک نہایت اعلیٰ اور عمدہ خصلت ہے، جس کے ذریعہ انسان کا شعور نکھرتا ہے، انسان تہذیب کے مراحل طے کرتا ہے؛ کیوں کہ خدا نے انسان کو علم وادراک کی جو صلاحیت عطا کی ہے، اس سے دنیا میں نیکیوں کے قائم کرنے اور برائیوں کو مٹانے کا کام لینا مومن کا اولین فریضہ ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے حصول کو فرض قرار دیا ہے، جہاں تک غیر مسلموں سے حصولِ علم کی بات ہے تو اس سلسلہ میں ہمیں ایک نہایت عمدہ مثال بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں ملتی ہے، آپ ﷺ نے قیدیوں کا فدیہ دس انصاری بچوں کو پڑھانا لکھانا طے فرمایا تھا؛ لہٰذا غیر مسلم سے علم حاصل کرنا درست ہے؛ البتہ ان تمام تعلقات میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ہماری تہذیب اور شناخت متاثر نہ ہو، ہر لحظہ ہمارے پیش نظر یہ بات رہنی چاہئے کہ ہم داعی اُمت کے فرد ہیں نہ کہ مدعو اُمت کے۔

ذمیوں کے حقوق

اسلام نے مکمل طور پر پوری انسانیت کے لئے تعلیمات دی ہیں ، انہی میں سے ذمیوں سے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں ، ذمی ومعاہدین سے متعلق ہم علاحدہ علاحدہ بھی گفتگو کرتے رہیں گے ؛ البتہ بعض حقوق کے سلسلہ میں یہاں کچھ تحریر کیا جاتا ہے؛ تاکہ ان کے حقوق کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں بے غبار ہو جائیں۔

---

(۱) جامع الترمذی:۲۶۸۷،عن ابی ہریرۃؓ،غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات:۲۰۔

عربی زبان میں ''ذمہ'' کے معنی عہد کے ہیں، ذمی اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے؛ چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت لسان العرب میں ہے ''رجل ذمی ، معناه له عهد '' ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔(۱)

اسی طرح علامہ ابن اثیر نے اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے، رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین و أمانتهم .

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے مسلم ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق اور رعایتوں کے سلسلہ میں انتہائی سیر چشمی اور فراخ دلی سے کام لیا ہے اور مسلمانوں کی طرح ان کو کافی مراعات دی ہیں، ملک العلماء علامہ کاسانی نے اس مضمون کی ایک حدیث نقل کی ہے :

فان قبلوا الذمة فأعلمهم أن لهم ما لمسلمین وعلیهم ما علی المسلمین .

اگر ذمی ہونا قبول کرلیں تو ان کو بتادو کہ جو حقوق اور رعایتیں مسلمانوں کو حاصل ہیں، وہی ان کو بھی حاصل ہوں گی اور جو ذمہ داریاں (سماج اور حکومت سے متعلق) ان مسلمانوں پر عائد ہیں، وہی ان پر بھی عائد ہوں گی۔(۲)

بعض حقوق تو انسانیت کے ناطے ہی واجب ہو جاتے ہیں، گو وہ مسلمان نہ ہوں، مثلاً بے گناہ کسی کو جانی یا مالی تکلیف نہ دے، کسی کے ساتھ بدزبانی نہ کرے، اگر کسی کو مصیبت، فاقہ اور مرض میں مبتلا دیکھے تو اس کی مدد کرے۔

اسلامی سلطنت میں ذمیوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلامی تصور پیش کرتے ہوئے حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں :

(۱) ذمیوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا جائے۔
(۲) جو عہد بھی ان سے لیا گیا ہو اسے پورا کیا جائے۔
(۳) مملکت کے دفاع کی ذمہ داری ان پر نہیں؛ بلکہ مسلمانوں پر ہوگی۔
(۴) ان کی طاقت سے زیادہ ان پر جزیہ اور مال گزاری کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔

---

(۱) غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات:۱۱، اسلام اور رواداری:۳۵۔
(۲) غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات:۱۱، اسلام اور رواداری:۳۵۔

جزیہ کا قانون

پھر وہ فرماتے ہیں کہ مسکین، اندھے، بوڑھے اور راہب، عابد، عبادگاہوں کے کارکن، عورتیں اور بچے جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گے، ذمیوں کے اموال اور مویشیوں پر کوئی زکوٰۃ نہ ہوگی..... محتاج ذمیوں کی پرورش حکومت کے خزانے سے کی جانی چاہئے۔(۱)

سیاسی تعلقات

اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے؛ کیوں کہ سیاست کا مقصد ہے کہ حکمرانی قائم ہو اور ملک مستحکم ہو، اور اس کی بنیاد الٰہی ہدایات پر رکھی گئی ہے، اللہ ہی اس کا قانون ساز ہے اور وہی حاکم اعلیٰ ہے، پھر جو کوئی ذمہ دار بنے تو اللہ اور رسول کی طرف سے جو ہدایات اس کو ملی ہیں ان کو نافذ کرتا رہے، اپنی مرضی نہ چلائے نہ افراط وتفریط سے کام لے؛ بلکہ عدل وانصاف سے کام لے، اس لئے کہ عدل کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ . (النساء:۵۸)

اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

آیت پاک سے معلوم ہوا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ منصب عطا کیا ہے اس کی ذمہ داری ہوگی کہ انصاف سے کام لے، کسی بھی قسم کے تعصب سے کام لے کر نا انصافی نہ کرے۔

سیاست کا نیا رُخ

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو دنیا میں دو نظام حکومت رائج تھے، ایک بادشاہت کا نظام، دوسرا آمریت کا، پسماندہ طبقے استعماریت واستبداد کے شکار تھے اور مفتوحہ قوموں کو کسی طرح کے سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے۔

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تھا کہ دنیا کے ہر انسان ہر فرد اور ہر قوم کو آزادی سے سانس لینے کا موقع ملا، آپ نے جو نظام قائم کیا وہ شخصی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ دستوری بنیاد پر تھا اس میں نہ شہنشاہیت کے لئے کوئی گنجائش تھی نہ آمریت کے لئے اس پر نہ خاندان پرستی کا اثر تھا نہ شخصیت پرستی کا؛ بلکہ حاکمیت کے اصل اختیارات خدا کو حاصل تھے۔

عدل پرور سیاسی نظام

اس نظام عدل کی داغ بیل اس وقت پڑی جب نبوت ملنے کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی

(۱)　کتاب الخراج، از امام ابو یوسفؒ:۲۰٦۔

اور دیکھا کہ لوگ بدنظمی اور شورش کا شکار ہیں، متمدن زندگی گذارنے سے محروم ہیں، تو آپ ﷺ نے ایک عمومی اجلاس بلایا، جس میں مسلمانوں کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی شریک ہوئے تھے، ان کے سامنے ایک ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی؛ تاکہ اندرون ملک نظم ونسق اور امن وامان کی فضا قائم کی جائے، اسے قبول کرنے والوں نے ایک دستاویز تیار کی، جس میں حکمران اور عام لوگوں کے حقوق وفرائض کا باقاعدہ تعین کیا، مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہؒ لکھتے ہیں :

> یہ دستاویز مکمل شکل میں ہم تک پہنچا ہے اور یہ دنیا میں پہلی تحریری ریاستی آئین کی دستاویز ہے، جو کسی حکمران نے پیش کی، جس میں سیاسی زندگی کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس میں خودمختاری اور آبادی کے مختلف طبقات کے لئے مذہبی آزادی، نظام انصاف، سماجی تحفظ، دفاع، سفارت کاری، قانون سازی سمیت تمام معاملات شامل کئے گئے، غیر مسلم رعایا کو نہ صرف ذاتی معاملات میں آزادی حاصل تھی؛ بلکہ انصاف، قانون اور قانون سازی کے معاملے میں بھی وہ خودمختار تھے۔(۱)

دومشترک بنیادیں

دھیرے دھیرے حالات سنورتے گئے اور سیاست کے پنجے جمتے گئے، رسول اکرم ﷺ نے اپنی قوم کے لوگوں میں نہ صرف تعاون کا معاملہ بیدار کیا؛ بلکہ آپ ﷺ اس میں پیش پیش رہے؛ کیوں کہ مقصد انصاف قائم کرنا اور ظلم کا قلع قمع کرنا تھا، درحقیقت جب مسلمانوں کے غیر مسلمانوں کے ساتھ تعلقات وابستہ ہوں گے تو اس کی اجازت اسی وقت دی جاسکتی ہے؛ جب کہ قیام انصاف اور دفع ظلم اس کے بنیادی مقاصد میں داخل ہوں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے سلسلہ میں بھی اسلام بہت ہی وسیع القلب واقع ہوا ہے، اس کی تعلیمات نشاندہی کرتی ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ معاشی تعلقات اپنانے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں اور نہ ہی ان میں کوئی تفریق ہے، مسلمانوں کا کسی غیر مسلم سے معاشی تعلقات بڑھانا، کسی کے یہاں مزدوری و ملازمت کرنا یا ان کو اپنے یہاں موقع فراہم کرنا درست ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں ایک یہودی کا مزدوری کرنا ثابت ہے اور خود رسول اکرم ﷺ کا فتح خیبر کے بعد یہودیوں کے پاس زمین رکھوانا اور بٹائی پر معاملہ کرنا ثابت ومروی ہے،(۲) اس زمانہ میں بطور خاص کوئی معاملہ خواہ ادنیٰ درجہ کا ہو بغیر کسی غیر مسلم کے طے پانا ممکن نہیں ہے، ایسے میں اسلامی تعلیمات ہمارے لئے رہبری کا کام

(۱) رسول ﷺ کی حکمرانی وجانشینی: ۱۵-۱۶۔ (۲) بخاری، حدیث نمبر: ۴۲، ص: ۳۴۸۔

کرتی ہیں کہ غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ کس طرح معاشی مسائل کو حل کیا جائے اور ان کے طریقوں سے استفادہ کیا جائے، نیز اسلامی ہدایات سے انھیں متاثر اور متعارف کرانے کا یہ زریں موقع ہے۔

درحقیقت ایک داعی اُمت کے فرد ہونے کی وجہ سے یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اس کے طریق کار سے دنیا کو واقف کریں، معاشی معاملات اسلام کا تعارف کرانے کے لئے اس زمانہ میں نہایت درجہ مفید و موثر ثابت ہو رہے ہیں، ایک مسلمان جب قرآنی اُصول وضوابط کے متعلق معاملہ کرتا ہے تو غیر مسلموں کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں ان کی فطرت کے مطابق کتنی جگہ موجود ہے اس حقیر کے ساتھ کئی ایسے معاملات پیش آئے ہیں کہ معاشی میدان میں لین دین کرتے ہوئے قرآنی ہدایات پر عمل کیا اور اپنے غیر مسلم رفیق کو گرویدہ بنا کر حلقہ بگوش اسلام ہونے پر مجبور کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں ہماری ذرا سی توجہ نہ صرف ہماری دنیا وآخرت کی خیر وفلاح کی ضامن ہے؛ بلکہ دوسروں کے لئے ذریعہ ہدایت بننے کے امکانات موجود ہیں اور اگر اس طرح ہم قرآنی ہدایات کو چھپاتے رہے تو یقیناً کل قیامت میں ہم سے اس کی باز پرس ہوگی۔

مذہبی تعلقات

اقوام عالم پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو قوم غالب اکثریت رکھتی ہے یا برسر اقتدار ہوتی ہے، وہ اپنی مفتوح قوموں کے لئے نہ احترام کا جذبہ رکھتے ہیں نہ ان کو عزت وناموس دیتے ہیں، نہ ضمیر کی آزادی، نہ مذہبی آزادی دی جاتی ہے؛ بلکہ وہ محکوم بنا کر رکھتے ہیں، اس کے علاوہ اسلام میں ان تمام باتوں کا خوب سے خوب پاس ولحاظ رکھا گیا ہے، اسلام نے مسلمانوں کو یہ درس دیا کہ وہ مسلم اکثریت ملک میں ہوں یا غیر مسلم اکثریت ملک میں مسلمان برسر راہ اقتدار ہوں یا ان کے ہاتھوں میں اقتدار نہ ہو، بہر صورت انھیں اپنے علاوہ دیگر اقوام کے ساتھ تعلقات استوار رکھنے ہیں اور عدل ومساوات جو باہم مسلمانوں کے لئے شرط ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی اختیار کرنے کی تعلیم ہے۔

ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دین پر استقامت کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام کرے، یہ نہ ہو کہ ان کے مذہبی اُمور میں مداخلت کرے یا ان کی تحقیر وتذلیل کرے۔

عقیدہ وفکر کی آزادی

ہر انسان کی دلی تمنا وخواہش ہوتی ہے کہ وہ عقیدہ وفکر وخیال میں بالکل آزاد ہو، کوئی اس کا معارض نہ ہو کوئی زبردستی نہ کر سکتا ہو، وہ اللہ جس نے انسان کو پیدا کیا، اس نے ایسی اعلیٰ ظرفی اور وسیع اُمور کی تعلیم اپنے بندوں کو دی

ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی ؛ چنانچہ اسلام نے مسلمانوں کو آزاد رکھا ہے کہ وہ عقیدہ اختیار کرنے میں پابند نہیں ہیں ، اسی لئے اسلام کی تعلیم میں داخل ہے کہ کسی شخص کو کسی خاص مذہب قبول کرانے میں کوئی زبردستی کا راستہ نہیں اپنایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لاَ اَكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ . (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں ،ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

یعنی ہر شخص فطرتاً آزاد ہے جو عقیدہ و مذہب چاہے اختیار کرے، اپنے عقیدہ اپنے فکر و خیال کے مطابق جس طریقہ پر چاہے عبادت کرے، اپنے عقیدہ اور نظریہ اور عمل کا اعلان و اظہار بھی کرسکتا ہے، اللہ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کی زبان پر کہلوایا ''لکم دینکم ولی دین ''(تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین) یعنی اسلام انھیں مجبور نہیں کرتا کہ وہ اپنا عمل ترک کریں ؛ بلکہ ان کو آزادی دیتا ہے کہ جیسے چاہے کرو ؛ البتہ صحیح و غلط دونوں راہیں کھول کر واضح انداز میں بتادیتا ہے۔

نیز رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ ''اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ''(یونس:۹۹) ''کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیں گے کہ وہ ایمان لے آئیں'' یقیناً مجبور کرنے سے کسی کا ظاہر تو بدل سکتا ہے ؛لیکن اس کا قلب و باطن نہیں اور اسلام کی اثر پذیری یہ ہے کہ وہ انسان کے ظاہر کے ساتھ ساتھ اس کے قلب و باطن پر حکمرانی کرتا ہے۔

حضرت عمر ﷛ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی وہ اسلام لے آئے ، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی ذمہ داری سونپوں گا ؛لیکن وسق اس میں انکار کرتے رہے ،حضرت عمر ﷛ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے تھے ''لا اکراہ فی الدین ''یہاں تک کہ وفات کے قریب آپ نے ان کو آزاد کردیا۔(۱)

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا: ''اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ''(الغاشیۃ :۲۱-۲۲) ''آپ بس نصیحت کرنے والے ہیں ان پر داروغہ نہیں'' نبی کریم ﷺ کے یہاں اس کا بہت پاس و لحاظ تھا، آپ ﷺ نے کبھی کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا ؛ بلکہ مہلت دی کہ آدمی غور و فکر کرے اور بہ طیب خاطر اس اعزاز سے مشرف ہو ؛ چنانچہ کسی انصاری صحابی نے اپنے بیٹوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا چاہا تو آپ نے ان سے منع کیا۔

اسلام کی انھیں روشن ضمیر تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے پیروکاروں نے ہمیشہ غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ

---

(۱) رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی و جانشینی :۵۸۔

ہمیشہ نہایت سیر چشمی و اعلیٰ ظرفی کا نمونہ پیش کیا، چاہے وہ کسی مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں فاتح بن کر وہاں داخل ہوتے ہوں یا حاکم کی حیثیت سے موجود ہوں، انھوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ مذہبی حقوق کی پاسداری کی، رواداری سے ان کے ساتھ پیش آئے ان کے عقائد و افکار کا لحاظ رکھا غرض یہ کہ ان کی عبادت گاہوں کا احترام کیا، اور ہر قسم کی خورد برد سے محفوظ رکھا اور بچایا، تاریخ میں سینکڑوں واقعات ایسے مل جائیں گے جو ان مذکورہ باتوں کی گواہی دینے کے لئے کافی ہوں گے، ایک مثال نمونہ کے طور پر یہاں پیش کرتے ہیں، جو آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدات کے وقت اختیار کئے؛ چنانچہ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں :

(۱) کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی مدافعت کی جائے گی۔

(۲) ان کو ان کے مذہب سے ہرگز برگشتہ نہ کیا جائے گا۔

(۳) ان سے جو ٹیکس لیا جائے گا، اس کے لئے ان کو محصل کے پاس خود نہیں جانا پڑے گا۔

(۴) ان کے جانوروں کی حفاظت کی جائے گی۔

(۵) ان کا مال محفوظ رہے گا۔

(٦) ان کے قافلے اور ان کی تجارتیں محفوظ رہیں گی۔

(۷) جو چیزیں ان کی ملکیت میں ہیں، ان کو بحال رکھا جائے گا۔

(۸) ان کی زمینیں ان کے قبضہ میں رہیں گی۔

(۹) پادری اور گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہ کئے جائیں گے۔

(۱۰) صلیبوں اور عمارتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

(۱۱) ان سے غلہ کی پیداوار اور عشر نہیں لیا جائے گا۔

(۱۲) ان کے ملک میں فوج نہیں بھیجی جائے گی۔

(۱۳) پہلے سے جو ان کا مذہب اور عقیدہ تھا اس کو بدلوایا نہیں جائے گا۔

(۱۴) ان کا کوئی حق جو پہلے ان کو حاصل تھا، زائل نہیں کیا جائے گا۔

(۱۵) جو لوگ اس وقت نہیں، ان احکامات میں وہ بھی شامل ہوں گے۔(۱)

مذکورہ بالا دستاویزات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ کئے گئے ان معاملات میں مذہبی رواداری کو ایک خاص مقام حاصل ہے؛ جب کہ دنیا کا حال ایسا ہو چکا ہے کہ اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود

(۱) مقالاتِ شبلی: ۹۹۔

اپنے کو متمدن رکھنے کے باوجود کوئی فاتح قوم اپنے مفتوح کو ایسی کشادہ دلی اور فیاضانہ عمل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی؛ جب کہ اسلام نے اپنے متبعین کو اس کا پابند کیا ہے، اس قسم کی سینکڑوں مثالوں کے لئے تاریخ وسیرت کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، جس کا اعتراف غیر مسلم مؤرخین بھی کئے بغیر نہ رہ سکے۔

ایک اور مثال

۹ ھ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ منورہ حاضر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے طور پر اپنے رسوم وعبادات ادا کرنے کی مسجد نبوی میں اجازت دے دی اور پھر معاہدہ کیا کہ جس کو دیکھ کر سر میور جیسا متعصب شخص بھی سراہے بغیر نہ رہ سکا وہ آپسی رواداری نیز فراخ دلی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

سر میور کا قابل قدر بیان :

> پیغمبر نے بشپوں، پادریوں اور راہبوں کو یہ تحریر دی کہ ان کے گرجاؤں اور خانقاہوں میں ہر چھوٹی بڑی جیسی چیز تھی، ویسی ہی برقرار رہے گی، خدا کے رسول نے یہ عہد کیا کہ کوئی اپنے عہد سے اور کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور نہ کوئی پادری اپنے منصب سے برطرف کیا جائے گا۔(۱)

ایک اور مؤرخ مسٹر جیسن لکھتا ہے :

> آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اسلامی مملکت میں آباد عیسائیوں کی جان ان کی تجارت ان کے مال واسباب اور مذہبی اُمور کی ادائیگی اور ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت دے دی تھی اور رواداری کے اس اُصول پر نہ صرف خلفاء راشدین نے پوری سختی سے عمل کیا؛ بلکہ عرب حکمراں بھی رواداری کے اس اُصول پر کاربند رہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے عروج کی تاریخ رواداری اور ان کی اعلیٰ قدروں کو اُجاگر کرنے کی تاریخ ہے، اس دور کے مسلمانوں کی سلطنتیں ستم رسیدہ یہودیوں اور دوسرے عقائد رکھنے والے عیسائیوں کی پناہ گاہ تھیں اور ان کے مذہبی عقائد سے اختلاف رکھنے کے باوجود مسلم ممالک میں انھیں پناہ لینے کی کھلی آزادی تھی؛ بلکہ انھیں مذہبی فرائض کی ادائیگی اور اپنی عبادت گاہوں کو تعمیر کرنے کی آزادی بھی حاصل تھی۔(۲)

---

(۱) اسلام اور رواداری: ۱۵۸۔
(۲) سہ روزہ ''دعوت'' دہلی ۱۳ ستمبر ۱۹۸۳ء۔

یہ اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیمات کا اثر تھا کہ بڑے سے بڑے مؤرخ نے اس کی تعلیمات کا لوہا مانا اور اس کے عادلانہ ومنصفانہ نظام کی تعریف وتوصیف جو حقیقت پر مبنی تھی، بیان کئے بغیر نہ رہ سکا۔

دوسروں کی عبادت گاہوں کا احترام

اسلام نے نہ صرف یہ کہ انسانوں کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کا حکم دیا؛ بلکہ تمام اہل مذہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللهِ كَثِيراً۔ (الحج:۴۰)

اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے، تو ڈھائے جاتے، نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بہت زیادہ ذکر کیا جاتا ہے۔

جتنے دین و مذاہب دنیا میں ایسے ہوئے ہیں کہ کسی زمانہ میں ان کی اصل بنیاد اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ قائم ہوتی تھی، پھر وہ منسوخ ہوگئے اور ان میں تحریف ہوکر کفر وشرک میں تبدیل ہوگئے، مگر اپنے وقت میں وہی حق تھے ان سب کی عبادت گاہوں کا اس آیت میں ذکر ہے۔(۱)

مذکورہ بالا آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ نے عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت بیان کی ہے اور مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، معلوم ہوا کہ عبادت گاہ خواہ کسی مذہب کی ہو ان کا احترام ملحوظ رکھا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں اور ان کے مذہبی اُمور میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔(۲)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے مذہبی اور رواجی مسائل میں بہت کشادہ قلب سیر چشم اور روادار ہے؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کو جو تعلیمات غیر مسلموں کے متعلق دی گئیں انھیں اس کے لئے اُصول وضوابط بھی مقرر کئے گئے ہیں، اس لئے کہ اسلام اپنے متبعین کے تئیں اتنا ہی حساس بھی ہے، جتنا کہ دیگر کے لئے وسیع القلب۔

تعلیمات اسلامی پر عمل

مذہبی تعلقات کا یہ دوسرا پہلو ہے کہ مسلمانوں کو اسلام نے جو تعلیمات دی ہیں، انھیں اس نے کافی حساس بھی

---

(۱) معارف القرآن:٦/۲۷۔ (۲) تفسیر مظہری:۳/۵۸۔

بنایا ہے، یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی شناخت اور شعار تمام تر قربان کردیں، اس امر کے متعلق مولانا خالد سیف اللہ رحمانی رقمطراز ہیں :

> مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانون شریعت کا احترام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔
>
> (۱) اعتقادات: اس سے مراد مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے توحید، رسالت آخرت کا یقین وغیرہ۔
>
> (۲) عبادات: اس سے مراد وہ احکام ہیں جن کا تعلق براہ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے نماز روزہ وغیرہ۔
>
> (۳) احوالِ شخصیہ: سے مراد (Personal law) ہے اس میں نکاح، طلاق کے علاوہ میراث، مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔
>
> (۴) معاملات: سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات و معاہدات ہیں، تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آجاتے ہیں اور سود جوا جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔(۱)

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک اور کلیدی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو، مسلمانوں کے لئے ان قوانین میں شریعت اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں یا جرم وسزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظام ملک وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگ واقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دیت برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کئے جاسکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ کی تفسیر معقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

البتہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی شناخت قائم ودائم رکھیں، اس میں کسی نوعیت کا فرق نہ آنے پائے، خواہ کسی بھی اعتبار سے ہو، اہل اسلام کے لئے جو ہدایات ہیں، انھیں ان پر کاربند رہنا چاہئے، اپنے تشخص کو پامال نہ کریں، آپ ﷺ نے فرمایا :

---

(۱) غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات: ۴۸۔

لیس منا من تشبه بغیرنا لا تشبهوا بالیهود ولا بالنصاریٰ . (۱)

جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

جن اشیاء کا ذکر آپ ﷺ نے فرمایا اس میں چار درجے محدثین و فقہاء کی آراء سے نقل کر سکتے ہیں :

۱- غیروں کے مذہبی شعار میں تشبہ اختیار کیا جائے، مثلاً مسلمان ان کے شعائر کا استعمال کرنے لگیں، جیسے: زنار و صلیب وغیرہ پہننا شروع کر دیں، یہ باعث کفر ہیں؛ کیوں کہ ہرگز اس کی گنجائش نہیں۔

۲- مذہبی تہواروں میں شرکت اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضامندی کا اظہار، تائید و تحسین مقصود ہو تو یہ کفر ہے؛ کیوں کہ کفر پر راضی ہونا خود کفر ہے۔

۳- تہذیبی تشبہ، وضع قطع جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اس کو اختیار کرنا اگر وہ مذہبی اُمور میں داخل ہے تو پھر مکروہ تحریمی ہے، اس سے بھی اہل اسلام کو بچنا چاہئے، مثلاً دھوتی باندھنا، جس سے صرف ایک ہندو ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

۴- جو چیزیں کسی خاص مذہب کی پہچان نہ ہوں یا انتظام و انصرام سے متعلق اُمور ہوں تو ایسی شکل میں غیر مسلموں کے طرز سے استفادہ کرنا درست ہے، مثلاً طرز تعمیر وغیرہ سے استفادہ کرنا۔

مذکورہ تعلیمات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اپنے متبعین میں حساسیت پیدا کرنا چاہتا ہے، اپنے تشخص اور شناخت کا جذبہ اُبھارنے اور دیگر اقوام سے ممتاز کرانا چاہتا ہے، اس لئے کہ یہ شناخت قائم رکھنا ایک فطری عمل ہے، ہر انسان کے اندر یہ جذبہ رہتا ہے کہ وہ اپنے کو دوسروں سے ممتاز کرے اور حقیقت یہی ہے کہ ہر تہذیب کو اپنانے والے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں اس پر قائم رہتے ہیں؛ چنانچہ یہ کوئی مذموم عمل نہیں ہے، نہ ہی اس میں تنگ نظری کا پہلو ہے، اس لئے کہ اسلام دوسروں کی آزادی میں بھی تو مخل نہیں ہوتا۔

ایک حقیقت

قرآن کریم کی بعض سورتوں مثلاً سورۂ توبہ میں جابجا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے رفاقت وعنایت کا رشتہ نہ رکھو اگرچہ وہ تمہارے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں؛ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ترکِ موالات اس طرح کے تمام احکام جنگ کے احکام میں سے ہیں اور یہ بات قرآن کریم کی انھیں آیات میں بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے؛ کیوں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے، اس لئے اس قسم کی آیات سے اجتناب کیا گیا ہے؛

(۱) ترمذی: ۲۶۹۵۔

البتہ بطورِ نمونہ ایک آیت اور اس کی مختصر تفسیر و تشریح بیان کر دی جاتی ہے؛ تاکہ یہ احکام بھی واضح ہو جائیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّن دُوْنِكُمْ لاَ يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالاً وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءَ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُوْن ۔ (آل عمران:۱۱۸)

اے ایمان والو! نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنے سوا، وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں، بس تم قدر رہے تکلیف میں رہو، نکل پڑتی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو کچھ مخفی ہے ان کے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے، ہم نے بتا دیئے تم کو پتے اگر تم کو عقل ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ مدینہ کے اطراف میں جو یہود آباد تھے، ان کے ساتھ اوس و خزرج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آرہی تھی، آپس میں انفرادی و اجتماعی دوستیاں و تعلقات پائے جاتے تھے، جب یہ اوس و خزرج مسلمان ہو گئے تو یہ اپنے تعلقات ویسے ہی نبھاتے رہے؛ لیکن یہود جو کہ آپ ﷺ اور آپ کے دین کے حریف تھے، بس انھیں اب یہ بات گوارہ نہ تھی کہ وہ ایسے افراد سے پرخلوص تعلق رکھیں جو اپنا دین بدل چکا ہو؛ چنانچہ یہودی ان انصار سے بظاہر ملتے رہتے اور اندرونی طور پر اس بات کی جستجو میں رہتے کہ کسی طرح مسلمانوں کے قریب جا کر ان میں آپس میں فتنہ و انتشار مچا دیں اور ان کے اجتماعی راز معلوم کر کے دشمنوں کے ہاتھ دے دیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی اس منافقانہ حرکت سے باخبر کیا ہے اور فرمایا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّن دُوْنِكُمْ ۔ (آل عمران:۱۱۸)

یعنی اے مسلمانو! اپنے بھائیوں کے علاوہ کسی کو گہرا اور راز دار دوست نہ بناؤ۔(۱)

'بطانة' کے معنی دلی دوست، راز دار، بھیدی، کپڑے کا باطنی استر جو جسم سے ملا رہے، وہ 'بطانۃ' کہلاتا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں :

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ملت والوں کے سوا کسی کو اس طرح کا معتمد اور مشیر نہ بناؤ کہ اس سے اپنے اور اپنی حکومت کے راز کھول دو، اسلام نے اپنی عالمگیری رحمت کے سایہ میں جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی، خیر خواہی، نفع رسائی اور مروت کی غیر معمولی ہدایات فرمائیں، اور نہ صرف زبانی ہدایات؛

---

(۱) تفسیر مظہری: ۳۴۵۔

بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عالمگیر رحمت کے سایہ میں اس کو عملی طور پر رواج دیا ہے، وہیں عین حکمت کے مطابق مسلمانوں کی اپنی تنظیم اور ان کے مخصوص شعائر کی حفاظت کے لئے یہ احکام بھی صادر فرمائے کہ قانون اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت مسلمانوں کو نہیں دی جاسکتی، اس سے فرد اور ملت دونوں کے لئے ضرر اور خطرے کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ ایسا صریح معقول مناسب اور ضروری انتظام ہے جس سے فرد اور ملت دونوں کی حفاظت ہوتی ہے۔(۱)

آخری بات

گلوبلائزیشن کے اس دور میں جب کہ پوری دنیا نے ایک گاؤں کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور برادرانِ وطن اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت کی بنیاد پر اسلام اور مسلمانوں کو دقیانوس اور آؤٹ آف ڈیٹ سمجھ رہے ہیں اور یہ ہماری دعوتی کوتاہی کا نتیجہ ہے، جب کہ احکم الحاکمین خدائے برحق نے اُمتِ مسلمہ کے افراد کو داعی اور پوری غیر مسلم انسانیت کو ہمارا مدعو بنایا ہے، بقول میرے حضرت والا مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ:

''داعی کی حیثیت طبیب کی اور مدعو کی حیثیت مریض کی، یا داعی کی حیثیت معلم کی اور مدعو کی حیثیت متعلم کی ہوتی ہے''

اس شفاخانہ انسانیت اور مدرسہ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس شفاخانہ کے طبیب اور درسگاہ انسانیت کے معلم اپنا عہدہ، اپنا منصب، اپنا مشغلہ اور پتہ بھول گئے ہیں، ہمارے مریضوں کے ساتھ، ہمارے متعلمین کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے، وہ بھی یاد نہیں رہا، خیرِ اُمت کے افراد ہونے کی حیثیت سے ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اسلام کی صحیح تعلیمات پورے عالم کے سامنے لائیں اور اس کے تصورات جو فراخدلی، مساوات، رواداری اور وسعت ظرفی پر مبنی ہیں، ان سے انسانیت کو آگاہ کرائیں، نیز ہم اپنے کردار، اخلاق، معاملات، معاشرت سے یہ بات ثابت کردیں کہ اسلام واقعی بڑی نعمت ہے اور سسکتی اور بلکتی انسانیت کے دود کا درماں اللہ نے اسلام کو بنایا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی ذات رحیمی و رحیم سے بعید نہیں کہ جوق در جوق لوگ اسلام و ایمان کے سایہ میں آجائیں اور ہم اللہ کے رسول کی اس بشارت کے مستحق بن جائیں :

من أسلم على يديه رجل واحد وجب له الجنة .(۲)

جس شخص کے ہاتھ پر ایک شخص نے اسلام قبول کرلیا اس کے لئے جنت واجب ہے۔

---

(۱) معارف القرآن: ۲/۷ ۱۵-۱۵۸۔

(۲) باوجود بحث کے یہ حدیث ہمیں نہ ملی، مرتب۔

آسمان ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

⊙ ⊙ ⊙

فہرست مراجع

(۱) القرآن الکریم
(۲) موسوعۃ الحدیث الشریف
(۳) معارف القرآن: مفتی محمد شفیع صاحبؒ (ربانی بک ڈپو، لال کنواں، دہلی)
(۴) تفسیر ابن کثیر (اُردو): علامہ ابن کثیرؒ (اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئیوالان، دہلی)
(۵) تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (ندوۃ المصنفین، اُردو بازار جامع مسجد، دہلی)
(۶) اسلام اور غیر اسلامی تہذیب: شیخ الاسلام ابن تیمیہ (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)
(۷) مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام: شمس تبریز خان (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)
(۸) تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)
(۹) غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (فرید بک ڈپو، دہلی)
(۱۰) قرآنی آیات: ابومسعود اظہر ندوی (مکتبہ اشاعت القرآن، دہلی)
(۱۱) اسلام اور رواداری: ماسٹر متین طارق باغپتی (مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی)
(۱۲) اسلام امن وآشتی کا علمبردار: سہ ماہی حرا کا خصوصی شمارہ (ناشر: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)
(۱۳) رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی وجانشینی: ڈاکٹر محمد حمید اللہ (فرید بک ڈپو، نئی دہلی)
(۱۴) اسلام اور مسلمان بادشاہوں کی غیر مسلموں کے ساتھ رواداری: محمد شاہد صاحب علی گڑھ (ناشر: محمد شاہد، سید واڑہ، علی گڑھ)
(۱۵) السیرۃ النبویۃ: حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (دار الشروق، جدہ)
(۱۶) نصب الرایہ: امام زیلعیؒ (المکتبۃ المدینۃ، دیوبند، الہند)
(۱۷) مقالات شبلی: علامہ شبلی نعمانیؒ (دار المصنفین، اعظم گڑھ)
(۱۸) دعوت: مجلّہ (۱۳ر ستمبر ۱۹۸۳ء)
(۱۹) اسلامی تعلیمات قرآن کے آئینہ میں: مرتب عزیر احمد محمد اسرائیل (اسلامی فہم ٹرسٹ نظام الدین، دہلی)
(۲۰) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات: محمد قطب (مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی)

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط

مولانا شاہد علی قاسمی ⊙

موجودہ علمی حالات کے پس منظر میں مسلم اور غیر مسلم تعلقات کا موضوع بہت ہی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈہ عام ہے کہ یہ دہشت گردی کا علمبردار ہے، اس کے اندر دوسرے مذاہب وادیان کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات اپنے ماننے والوں کو تشدد پر آمادہ کرتی ہیں، اس پروپیگنڈہ کا جواب تفصیل کا متقاضی ہے، قرآن، احادیثِ رسول اور تاریخ وواقعات کی روشنی میں مدلل اور محقق گفتگو کی ضرورت ہے، اس وقت اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب تحریر کیا جاتا ہے، ذیل کی تحریر سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات کس حد تک رواداری پر مبنی ہیں اور مسلم وغیر مسلم تعلقات میں اسلام کس قدر فراخ دل ہے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

اللہ تعالیٰ نے بلاتفریق مذہب وملت انسانیت کی تکریم وشرافت کا اعلان فرمایا، سورۂ بنی اسرائیل میں ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً ۔ (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا فرمائیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فوقیت دی۔

اس آیت میں مسلمانوں کو خاص نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ تمام اولاد کی کرامت وشرافت کا ذکر ہے۔

تمام انسان — ایک کنبہ

قرآن نے یہ بھی بتایا کہ تمام انسانوں کو ایک نفس سے پیدا کیا گیا ہے: خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ(النساء:۱) پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پیدا کئے: ''وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاءً ''(النساء:۱) گویا اسلام وحدتِ انسانیت کا تصور پیش کرتا ہے، نہ کہ تفریق کا، نیز یہ بھی کافی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

⊙ استاذ: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

اُمتِ مسلمہ کو ایک داعی اُمت قرار دیا ہے: ''کُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' (البقرۃ:۱۱۰) اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ بھٹکے ہوئے ہر انسان کے پاس پہنچے اور اسے پیغام حق سنائے، ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے، جب اُمت داعی کے اُمت مدعو سے تعلقات بہتر ہوں، مدعو سے نفرت کے بجائے محبت کی جائے، ان کو دور رکھنے کے بجائے قریب کیا جائے۔

عام حسن سلوک

اس لئے قرآن نے واضح ہدایت دی کہ جن غیر مسلموں نے مسلمانوں سے جنگ نہیں کی اور نہ گھروں سے نکالا ایسے غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور ان کے ساتھ انصاف کیا جائے :

لَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ . (الممتحنۃ:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا، جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

اگر والدین یا ان میں سے کوئی ایک کافر ہو تو قرآن نے ہدایت دی ہے کہ کفر کے باوجود ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے؛ البتہ ماں باپ کفر کی طرف بلائیں تو ان کی بات نہ مانی جائے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْناً وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ . (العنکبوت:۸)

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا اور (اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ) اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس (کے معبود ہونے) کی کوئی (صحیح) دلیل تیرے پاس نہیں ہے تو ان کا کہنا نہ ماننا، تم سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے، پس میں تم کو تمہارے سب کام بتلا دوں گا۔

اسلام میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی اور بہ حیثیت بیوی اس کے وہی حقوق رکھے گئے جو ایک مسلمان بیوی کے ہیں، گوکہ بعض مصالح کی بنیاد پر اہل کتاب عورت سے نکاح کرنا کراہت سے خالی نہیں، حضرت عمرؓ کے بارے میں ثابت ہے کہ انھوں نے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، امام مجاہدؒ فرمایا کرتے تھے کہ

مشرک رشتہ داروں کا قرض معاف کرنا باعث اجر وثواب ہے، اُم المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے یہودی رشتہ داروں میں تیس ہزار درہم تقسیم فرمائے تھے، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے ایک یہودی کا جنازہ گذرا تو آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، بعض اصحاب نے آپ ﷺ کے کھڑے ہونے پر عرض کیا کہ یہ تو یہودی کا جنازہ ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو انسان تھا: ''أليس نفساً''(۱) ایک موقع پر نجران کے عیسائیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا، آپ نے انھیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور ایک صاحب کو اپنے گھر لے گئے، کھانا کھلایا، اس بندہ خدا نے گھر کا پورا کھانا کھالیا؛ چنانچہ آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو فاقہ کرنا پڑا؛ لیکن آپ نے برا نہیں مانا، بعض یہودی شرارت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو ''السام علیکم'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے، جو ایک بددُعائیہ جملہ تھا، صحابہ کو اس طرح کی بات سن کر طیش آجاتا تھا؛ لیکن آپ کبھی بھی خوش اخلاقی کا دامن نہیں چھوڑتے اور جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہنے پر اکتفاء فرماتے، یہ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں، جن سے اسلام کی رواداری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مالی اعانت

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ مدینہ منورہ کے بعض انصاری صحابہ کے تعلقات بنوقریظہ اور بنو نضیر کے بعض یہودیوں سے تھے، انصار ان پر اس لئے صدقہ نہیں کرتے تھے کہ جب وہ ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کرلیں گے، پھر ان کی اعانت کریں گے، اللہ تعالیٰ نے انصار کے اس رویہ کو پسند نہیں فرمایا؛ چنانچہ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَـٰكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُوْنَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لاَ تُظْلَمُوْنَ . (البقرۃ:۲۷۲)

ان کافروں کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ نہیں؛ البتہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں ہدایت پر لے آئیں اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو اور تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے سوائے ذاتِ خداوندی کی رضاجوئی کے اور جو کچھ مال خرچ کررہے ہو یہ سب (یعنی اس کا ثواب) پورا پورا تم کو مل جائے گا اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہیں کی جائے گی۔

---

(۱) بخاری: ۱/۱۰۲، کتاب الجنائز۔

اسی طرح قرآن نے نیک لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے جہاں بعض اور اوصاف حمیدہ کا ذکر فرمایا، وہیں ایک وصف یہ بھی بیان کیا کہ نیک لوگ قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں: ''وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِيْناً وَيَتِيْماً وَأَسِيْراً'' (الدہر:۸) —— ظاہر ہے کہ یہ قیدی عام طور پر غیر مسلم ہوا کرتے تھے۔

عدل وانصاف

اگر زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو تو تمام رعایا کے ساتھ خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، قرآن نے عدل وانصاف کی تعلیم دی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِیْ الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ . (النحل:۹۰)

قرآن نے مزید کہا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان کے ساتھ انصاف نہ کرو :

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى . (المائدۃ:۸)

انسانی جان کی حفاظت

جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادہ جنگ و جدال نہ ہوں ان کی جان اور خون کی اسلام کی نگاہ میں وہی قیمت ہے جو مسلمانوں کی جان کی ہے، قرآن نے بلا تفریق مذہب حکم دیا ہے: ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِيْ الْقَتْلٰى'' (البقرۃ:۱۷۸) یعنی قاتل کو مقتول کے عوض قتل کیا جائے؛ تا کہ انسانی جانیں مزید ہلاکتوں اور تباہی سے بچ سکیں، اسی طرح قرآن نے مطلقاً کہا ہے کہ نفس کے بدلے نفس ہے: ''إِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ'' (المائدۃ:۴۵) یعنی مذہب ودین کی تفریق کے بغیر یہ حکم ہے کہ جانی عوض میں قصاصاً جان لے لی جائے، اس لئے عہد رسالت میں اور عہد صحابہ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ مقتول کافر کے بدلے قاتل مسلمان کو بہ طور قصاص قتل کیا گیا؛ چنانچہ پیغمبر اسلام ﷺ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مقتول کافر کے بدلے قاتل مسلمان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

آج کے جمہوری دور میں خون اور خون کی قیمت میں فرق کیا جاتا ہے، خود ہمارے ملک کا یہ حال ہے کہ پنجاب اور کشمیر کے علاقے میں کسی ہندو کی جان جائے تو اس کے خون کی قیمت لاکھ دو لاکھ روپے ہوتی ہے اور جب فساد میں مسلمان مارا جائے تو اس کی قیمت بہ مشکل ساٹھ ہزار روپے ہوتی ہے؛ بلکہ بہت سے اولیاءِ مقتول ایک روپیہ سے بھی محروم رہتے ہیں، جب کہ اسلام میں ایسی کوئی تفریق نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''دمائهم كدمائنا'' ۔(۱)

---

(۱) موسوعۃ فقہ علی بن ابی طالب: ۲۶۵۔

یعنی دارالاسلام میں رہنے والے کافروں کے خون کی قیمت مسلمانوں کے خون کی طرح ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے ذمی کافر کے قتل پر وعید بھی سنائی ہے: ''من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة''۔(۱)

نیز قرآن مجید میں کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً. (المائدة:۳۲)

یعنی جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گیا اس نے پوری انسانیت کو قتل کردیا۔

اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لاَ تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالحَقِّ. (بنی اسرائیل:۳۳)

یعنی کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

مال و جائیداد کا تحفظ

شریعت کی نگاہ میں غیر مسلموں کے اموال و جائیداد بھی قابل احترام ہیں اور ان کے اموال بھی مسلمانوں کے اموال کی طرح ہیں، چنانچہ اگر دارالاسلام میں جس طرح کافر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کا مال چوری کرلے تو اس میں مسلمان چور کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے گا؛ چنانچہ قرآن کریم میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق کے بغیر کہا گیا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللهِ. (المائدة:۳۸)

چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کا ہاتھ کاٹ دو کہ یہ ان کے عمل کا بدلہ ہے، اللہ کی طرف سے یہ عبرتناک سزا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھایا کرو؛ چنانچہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ. (النساء:۲۹)

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۳۲۱۶۶، کتاب الجزیہ۔

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ؛ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں۔

بعض اموال شریعت کی نگاہ میں حرام ہیں، جیسے شراب، اگر کسی مسلمان کے پاس شراب ہو اور دوسرا مسلمان اسے ضائع کر دے تو ضائع کرنے والے مسلمان پر کوئی تاوان واجب نہیں ہوگا؛ لیکن اگر وہی شراب کسی غیر مسلم کی ہو اور مسلمان اسے ضائع کر دے تو مسلمان پر اس کا تاوان واجب ہوگا؛ کیوں کہ اس کافر کے نزدیک شراب بھی مال ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں مسلمان اور غیر مسلم کے اموال کا تحفظ واحترام کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔

عزت وآبرو کا تحفظ

جس طرح مسلمانوں کی عزت وآبرو کا تحفظ اہمیت کا حامل ہے، اسی طرح غیر مسلم کی بھی عزت وآبرو کا مسئلہ ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بلا تفریق مذہب ارشاد فرمایا:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ، وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ. (النور: ۳۰-۳۱)

اے نبی! (ﷺ) مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے، بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں، (اور اسی طرح) مسلمان عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے، بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومن مرد وعورت کو مطلقاً حکم دیا ہے کہ اپنی نگاہ پست رکھا کریں اور شرمگاہ کی حفاظت کیا کریں، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، یعنی عفت وعصمت کو مجروح کرنے والی جو چیزیں حرام ہیں خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، دونوں صورتیں حرمت میں برابر ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت وآبرو کی حفاظت کا وہی حق مسلم ریاست میں آباد غیر مسلم لوگوں کو بھی حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلم وغیر مسلم کی تفریق کے بغیر فرمایا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے،

ممکن ہے کہ وہ مذاق اُڑانے والے سے بہتر ہو اور نہ ایک دوسرے پر طعن کرے اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَكُوْنُوْا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰى أَنْ يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ . (الحجرات:۱۱)

یہ مسئلہ بہت اہم ہے، اسلام کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں واضح ہے: لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین'' اور ایک جگہ قرآن میں ہے: وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ان دونوں آیات سے یہ واضح ہے کہ اسلام مذہبی عقائد، مذہبی اعمال اور مذہبی تشخصات میں رواداری کا قائل نہیں، یعنی دوسرے مذاہب والوں کو خوش کرنے یا ان کے جذبات کی رعایت میں بعض احکام اسلامی سے کوئی مسلمان دستبردار ہو جائے، یا غیر مسلموں کے باطل عقیدہ اور مذہبی تقریبات میں شرکت کرے اس کی اجازت نہیں ہوگی؛ البتہ رواداری کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے اپنے افکار و خیالات پر چلنے کی آزادی دی جائے اور اس معاملہ میں کسی جبر و دباؤ سے کام نہ لیا جائے تو اسلام کا یہ پہلو انتہائی رواداری اور حد درجہ فراخدلی پر مبنی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے بقاء باہم کے اُصول سے زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھایا ہے، قرآن کا واضح اعلان ہے: لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرۃ:۲۵۶) یعنی ''دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے'' اسلام کی پوری تاریخ اس پر شاہد عدل ہے، شاید ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں کیا جاسکتا ہے کہ کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان بنایا گیا ہو، قرآن نے تو یہاں تک کہا کہ معبودانِ باطلہ کو برا بھلا بھی نہ کہو: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِن دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۰۸) قرآن نے یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی اور پیغمبر بھیجا ہے اور ان ہی کی زبان میں اللہ کا کلام نازل ہوا: وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (الفاطر:۲۴)، وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ (ابراہیم:۴) یہ عقیدہ اور ہدایت قرآنی مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ دوسرے مذاہب کی شخصیات کا احترام کیا جائے؛ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ نبی ہوں اور لوگوں نے ان کی تعلیمات بھلا کر ان کی پرستش شروع کر دی ہو، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ رواداری کے اس مفہوم میں کوئی اور مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔

مذہبی مقامات کا احترام

دوسرے مذاہب اور مذہبی شخصیات کے احترام کے ساتھ ساتھ اسلام دوسرے مذاہب کے مقاماتِ مقدسہ جیسے گرجا گھر، مندر وغیرہ کے تئیں تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دیتا ہے؛ چنانچہ جہاں قرآن

مجید نے عبادت گاہوں کو منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر کیا ہے :

وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللهِ كَثِيراً . (الحج:۴۰)

اور اگر (یہ بات نہ ہوتی کہ) اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو (اپنے اپنے زمانوں میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے۔

اس آیت سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی نہ کی جائے کہ اس سے جذبات مجروح ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نجران سے جو معاہدہ فرمایا تھا اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے: سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ان ہی ہدایات کی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ غصب اور زبردستی لی ہوئی زمین پر مسجد تعمیر کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں اور فلاں مسجد زبردستی اور چھین کر بنائی گئی ہے، وہ محض غلط بیانی اور پیروپیگنڈہ پر مبنی ہے۔

کلمہ آخریں

اس مختصر سی تحریر سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام میں مسلم اور غیر مسلم تعلقات کی بنیادیں کتنی مضبوط ہیں اور اسلام میں کس حد تک وسعت رواداری اور فراخی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی وسعت و ہمہ گیری اور رواداری سے واقف کرائیں اور خصوصی طور پر اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور بے اعتدالی کا شکار مذہب نہیں ہے؛ بلکہ انسانیت پرور، آدمیت نواز، رحم دل، حد درجہ روادار اور سیر چشم و فراغ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لئے مسکن رحمت ہے۔

ان الدین عند الله الاسلام .

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید کا تصور جرم وسزا

ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی⊙

اللہ تعالیٰ نے اس وسیع وعریض کائنات کو بے مقصد اور بے کار نہیں پیدا فرمایا اور کائنات کے اس حصہ کو جو انسانی آبادی کا مسکن اور اس کی جولانیوں وسرگرمیوں کا مرکز ہے، یعنی کرۂ ارض کو بے غرض وغایت آباد نہیں فرمایا؛ بلکہ انسان کو حسن وجمال دیکر، علم وعمل کی بے پناہ صلاحیتوں سے مالا مال کر کے خلافت ارضی عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا :

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ، فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۔ (المومنون:۱۱۵-۱۱۶)

کیا تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو یونہی بیکار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے؟ اللہ حقیقی ملکیت والا ہے، وہ بڑی بلندی والا ہے، اسکے سوا کوئی معبود نہیں وہی عرش کریم کا مالک ہے۔

اس آیت نے تخلیق انسانی کے جس مقصد کو اجاگر کیا وہ آخرت کی حقانیت سے عبارت ہے، یعنی انسان اس دنیا میں آخرت کی تیاری کے لئے بھیجا گیا، اس عالم فانی کے نشیب وفراز سے گذرتے ہوئے اس کو اپنا مقصد یعنی عبادت واطاعت اور اپنا منہج یعنی شریعت وخلافت اور اپنی منزل یعنی آخرت کو ہرگز فراموش نہیں کرنا ہے، اس کے بعد اس کو اپنی ضروریات کی تکمیل، اپنی ترقی کی کوشش اور اپنے معاشرے کی فلاح وبہبود کی جدوجہد کی نا صرف اجازت ہے بلکہ اس پر اجر وثواب بھی مقرر ہے؛ لیکن بسا اوقات انسان اپنی خواہشات کی تکمیل میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل اور اپنی ہوس کی تسکین کے لئے ان اعمال کا ارتکاب کرتا ہے جس سے اپنے مالک حقیقی کی نافرمانی، بنی نوع انسان کی حق تلفی اور آخرت کی فراموشی کا سودا کر لیتا ہے، قرآن مجید کی روشنی میں ایسے ہی اعمال کو جرم سے تعبیر کیا گیا، چنانچہ شریعت اسلامی کی رو سے ہر وہ عمل جرم قرار پائے گا جس میں مذکورہ بالا اسباب

⊙ ای، ایف، ایل یونیورسٹی، حیدر آباد۔

پائے جاتے ہوں؛ لیکن یہ بھی ایک عظیم الشان حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جن اعمال کو موجب سزا قرار دیا اور ان کے ارتکاب سے باز رہنے کی تاکید فرمائی، وہ سب اس قبیل کے اعمال ہیں جو بیک وقت حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بھی برباد کر دیتے ہیں اور مقصد تخلیق و آخرت کی سرخروی کو بھی ستیاناس کر دیتے ہیں۔

رشوت ستانی

۱- اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی ہے، جس نے فرمایا:

لَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقاً مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرۃ:۱۸۸)

۲- بندوں کے حقوق کی پامالی ہے کہ اکثر و بیشتر حقدار کو حق نہیں ملتا۔

۳- مال کی ہوس جہاں راشی کو سہل نگاری میں مبتلا کرتی ہے وہیں یہ ہوس انجام سے غافل کر دیتی ہے، جس کے بارے میں ارشاد ہے:

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ، حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ. (التکاثر:۱-۲)

مذکورۃ الصدر تشریح سے یہ حقیقت ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی رو سے ہر وہ عمل جرم کے صیغے میں آجاتا ہے جس سے مالک حقیقی کی نافرمانی ہوتی ہے، بنی نوع انسانی کا نقصان ہوتا ہے، یا پھر انسان کی آخرت تباہ و تاراج ہو جاتی ہے، قرآن مجید میں کسی عمل کے جرم ہونے کے لئے ان تین اسباب کو مختلف الفاظ کا پیراہن دیا گیا، عام طور پر حقوق اللہ کی کوتاہی کے لئے 'اثم' یا 'معصیت' کا لفظ آیا ہے، بندوں کی حق تلفی کو 'بغی' یا 'عدوان' سے تعبیر کیا گیا ہے جب کہ آخرت فراموشی 'نسیان، غفلت و لھو' جیسے الفاظ سے نمایاں کی گئی۔

اور یہ تمام جرائم کے لئے ''فساد'' کی جامع قرآنی اصطلاح دی گئی؛ چنانچہ ناشکری اور کفران نعمت جو حقوق اللہ کی پامالی ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

فَاذْكُرُوْا آلاءَ اللهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ. (الاعراف:۷۴)

پس اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

بندوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

وَلَا تَبْخَسُوْا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ. (ہود:۸۵)

اور لوگوں کی چیز کم کر کے نہ دو اور زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوّاً فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَاداً وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. (القصص:۸۳)

یہ وہ آخرت کا گھر ہے جو ہم ان لوگوں کے لئے بناتے ہیں جو دنیا میں بغاوت وفساد نہیں چاہتے، اور انجام کار اہل تقویٰ کے لئے ہی ہے۔

رہا لفظ جرم کا استعمال جو قرآن مجید میں مختلف صیغوں میں متعدد بار وارد ہوا تو اس کا مفہوم واضح کرتے ہوئے راغب اصفہانی کہتے ہیں :

أصل الجرم قطع الثمرة من شجر، وأجرم : صار ذاجرم، واستعير ذلک لکل اکتساب مکروہ . (۱)

جرم کا یہ لغوی مفہوم اور قرآنی استعمال اس حقیقت کا غمازی کرتا ہے کہ یہ وہ اعمال ہیں جو شجر برکت سے کٹ چکے ہیں؛ لہٰذا انکا صحیح بندوبست نہ کیا جائے تو سڑن اور تعفن کا سبب بنے گے؛ لہٰذا مناسب وقت پر ان کو ٹھکانے لگانا از حد ضروری ہو جاتا ہے؛ چنانچہ جرم کی بیخ کنی کے لئے سزا کا نظام مشروع کیا گیا، جس کے مطالعہ سے پہلے مختصراً اسباب جرائم کا تذکرہ اہم ہے تا سزاوں کی نوعیت نیز ان کی ضرورت بھی نمایاں ہو جائے۔

اسبابِ جرائم

تمہید میں اس نکتہ کو محور سخن بنایا گیا تھا کہ جرم زمین پر فساد کا نام ہے، جس پر شیطان ہر ایسے انسان کو برانگیختہ وآمدہ کرتا ہے جو بآسانی اس کا آلہ کار بن سکتا ہے، وہ کونسے اسباب ہیں جن سے ایک انسان شیطان کا شکار بن کر مجرم بن جاتا ہے! ان اسباب کا تذکرہ اس لئے بے محل نہیں ہوگا کہ ان سے سزاؤں کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے؛ چنانچہ جرم کے محرکات واسباب پر ہم غور کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ نفسی میلانات، مجبوریوں کے علاوہ بغاوت وسرکشی کا عنصر ارتکاب جرائم کا سبب بنتا ہے، اس اجمال کی تفصیل ذیل میں سپرد قرطاس کی جاتی ہے۔

۱- حالتِ اضطرار : بسا اوقات ایک انسان کسی جرم کا ارتکاب محض مجبوریوں کی وجہ سے کر بیٹھا ہے، بھوک و پیاس کی شدت کبھی کبھی پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے حد قانون توڑنے کا سبب بن جاتی ہے، فقر وفاقہ کی کیفیت بعض مرتبہ انسان کو غلط راہ پر ڈال دیتی ہے، اُلجھنوں و مسائل کا شکار انسان صحیح فیصلوں کی صلاحیت بسا اوقات کھو دیتا ہے اور بعض ناروا اعمال کا مرتکب بن جاتا ہے، یہ ایسی صورتحال ہوتی ہے کہ اس میں جرم کے ساتھ نرمی کا برتاؤ واجبی معلوم ہوتا ہے؛ چنانچہ فقر وتنگدستی میں حرام خوردنی اشیاء کے استعمال کو قرآن مجید میں گوارا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ . (المائدۃ:۳)

---

(۱) مفردات القرآن للراغب فی مادۃ: ج، ر، م۔

قرآن مجید میں ایسے جرائم میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تقصیرات میں فرق کرتے ہوئے حقوق اللہ میں نرمی کی گئی اور اس کی عفو و درگذری کی دہائی دے کر توبہ کی تلقین کی گئی؛ لیکن بندوں کے حقوق اور مملکت کے حقوق کو بہر صورت نا قابل معافی سمجھا گیا، جس کی مثال حد سرقہ میں نظر آتی ہے، جس کی تفصیل آئندہ سطور میں پیش جائے گی۔

۲- نفس کا طغیان : جرائم کے ارتکاب پر آمدہ کرنے والے اسباب میں نفس کی شوریدگی کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے؛ کیوں کہ انسان کا نفس برائی کا خوگر ہوتا ہے، جس کا تذکر قرآن مجید نے یوں کیا :

وَمَا أُبَرِّءُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ . (یوسف:۵۳)

اور دوسری جگہ فرمایا :

فَأَمَّا مَن طَغَى ، وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ، فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوَى .

(النازعات:۳۷-۳۹)

اس مغلوبیت کی کیفیت میں انسان بعض ان اعمال کا مرتکب ہو جاتا ہے جو اس کو اپنے مالک کی نگاہوں میں معتوب اور بندوں کے درمیان مبغوض کر دیتے ہیں، اس مغلوبیت کی حالت میں جب کوئی فرد جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو قرآن میں اس کے لئے اصلاح و راست روی کی دعوت دی گی اور اس وقت تک اس کے جرم کو قابل مواخذہ نہیں سمجھا گیا جب تک کہ وہ اخلاقی و دینی حدود کو پھلاند کر ظلم کی آخری و انتہائی شکل کو نہ اختیار کر گیا ہو؛ چنانچہ فرمایا :

فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيْمٌ . (المائدۃ:۳۹)

۳- بغاوت و سرکشی : بعض انسانوں کی فطرت اس قدر مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ روئے زمین پر ناپاک بوجھ بن جاتے ہیں، درندگی و بہیمیت ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، بے راہ روی و آوارگی ان کا شعار و کردار بن جاتی ہے، دین و مذہب ان کے پاس بے معنی ہو جاتے ہیں، قانون و دستور بے کار سے الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں، آخرت کا تصور بھی نہیں رہ جاتا ہے، نہ اللہ تعالیٰ کا پاس و لحاظ رہتا ہے اور نہ ہی بندوں کا حق، یہ ایسے خود سر انسان ہوتے ہیں جو حقیقت میں انسانیت کی جبین پر بدنامی کی کلنک اور عار کا داغ ہوتے ہیں، جن سے زمین و زمان کو چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے، قرآن مجید میں ایسے بدقماش مجرمین کے لئے سخت فہمائش وارد ہوئی اور ان کی سزائیں عبرتناک مقرر کی گئی ہیں۔

سزا کی قسمیں

قرآن مجید کا مطالعہ جرائم کی سزاؤں کی انواع و اقسام کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیتا ہے، جس کا

لب لباب و حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے سزاؤں کا اجمالی تذکرہ فرماتے ہوئے ان کی حد بندی فرمادی جو حسب ذیل ہے :

۱-قصاص : قرآن مجید میں قصاص اس بدلے کو کہتے ہیں جو ایک بندے پر ظلم وستم کے بعد لیا گیا ہو؛ چوں کہ اس جرم میں غالب حق بندے کا رہتا ہے؛ لہٰذا مظلوم کو معاف کرنے کا اختیار بھی دیا گیا؛ چنانچہ جان کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے گی؛ لیکن مقتول کے ورثہ خوں بہا پر معاملہ کر کے جان بخشی کرتے ہیں تو یہ شکل قابل قبول ہوگی، علاوہ ازیں بے معاوضہ بھی معاف کرنے کا اختیار مقتول کے ولی کو حاصل رہتا ہے۔

۲-حدود : اس میں بندوں کے حقوق کے ساتھ مملکت اور مالک حقیقی کا حق بھی شامل ہو جاتا ہے، اسی صورت میں فیصلہ کا اختیار حَکَم (جج) یا مظلوم کا نہیں رہ جاتا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو سزا مقرر فرمادی وہ جاری ہوتی ہے، جیسے حد سرقہ کہ چوری مملکت کے اجتماعی نظام کو بھی بگاڑتی ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے حکم سے روگردانی بھی ہے؛ لہٰذا فقہی شروط کی موجودگی پر حد سرقہ ہی جاری ہوگی اور چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا، ارشاد ہے :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللهِ .

(المائدۃ:۳۸)

۳-تعزیرات : ان سزاؤں کو کہتے ہیں جن کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اسلامی عدالت اور مملکت کو دیا، جو حالات کے اعتبار سے جرائم پر قدغن لگانے کے لئے جاری کی جائے گی جن کی فہرست طویل بلکہ لا متناہی ہے، جیسے رشوت خوری کے جرم پر عدالت ومملکت مقدار وصورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب سزا تجویز کرسکتی ہے۔

سزاؤں کی ضرورت

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بعض جرائم اور ان کی سزاؤں کا تذکرہ فرما کر بنیادی واُصولی وہ مواد فراہم کیا جس پر جامع قوانین کی تدوین ہوجاتی ہے، ان سزاؤں کے تذکرے کے ساتھ اکثر و بیشتر قرآن مجید میں ان سزاؤں کی غرض وغایت ان کے دوراس نتائج کا بھی تذکرہ فرمایا جو فی الواقع مقاصد شریعت کا موضوع ہیں؛ لیکن اس مختصر مقالے میں اس قرآنی تصور کو نمایاں کرنا بھی ضروری ہے تا کہ سزاؤں کے بارے میں قرآن مجید کا موقف نکھر کر آجائے؛ چنانچہ قرآن مجید میں سزاؤں کی ضرورت کو جن نکات میں منحصر کیا گیا وہ حسبِ ذیل ہیں :

۱-مجرم کی اصلاح : یہ وہ اہم مقصد ہے جس کے حصول کے لئے سزا کا وجود ضروری ہوتا ہے، ورنہ مجرم شتر بے مہار بن کر چھٹے پھیریں گے اور سوسائٹی کا جینا حرام کردیں گے، ان کی ناجائز سرگرمیوں پر روک لگانے اور غلط کاریوں کو قابو میں کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہ جائے گا، درندہ صفت خون کی ہولی کھیلتے رہیں گے، حرص وہوس کے

بندے لوٹ مار کا بازار گرم کرتے رہیں گے ، خواہشات نفس کے غلام بے حیائیوں کے اڈے آباد کرلیں گے اورانسانی آبادی میں شیطانیت کا راج ہو جائے گا،معصوم و نیک صفات شعار انسانوں کا دھرتی پر جینا دوبھر ہو جائے گا؛ لہٰذا انسانی معاشرے کی امن وآشتی ،سکون وسلامتی ،حیاء و پا کیزگی اور آپسی بھائی چارہ ودوستی کے لئے ان مجرموں سے دنیا کو پاک کرنا ضروری ہو جاتا ہے،جس کی دو ہی شکلیں ہیں ،یا تو وہ جرم سے کلی طور پر باز آ جائیں یا پھر ان سے دنیا کو پاک کردیا جائے جیسا کہ آیت محاربہ کے اختتام میں فرمایا :

ذٰلِکَ لَهُمْ خِزْیٌ فِیْ الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِیْ الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ . (المائدۃ:۳۸)

۲-ظلم کا مداوا : سزا کا ایک اہم مقصد ظلم کا تدارک کرنا اور مظلوم کی فریادرسی کرتے ہوئے اس ظلم کا مداوا کرنا ہوتا ہے جو اس پر ڈھایا گیا ،اگر مملکت یہ اہم فریضہ انجام نہ دے تو ممکن ہے کہ جذبہ انتقام کو فرو کرنے کے لئے مظلوم خود کوئی کاروائی کرے اور اس طرح جرائم کا لا متناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا جس سے انسانی جان و مال اورعزت وآبرو کی اہمیت وحرمت ختم ہو جائے گی اور دنیا سنگین جرائم کا اڈہ بن جائے گی ،اسی مقصد کا اشارہ کرتے ہوئے قصاص کے بارے میں فرمایا :

وَلَکُمْ فِیْ الْقِصَاصِ حَیَاةٌ یَا أُوْلِیْ الأَلْبَابِ . (البقرۃ:۱۷۹)

۳-تازیانہ عبرت : مجرم کو جرم سے روکنے اور سوسائٹی کو جرائم کے برے اور ناپسندیدہ انجام وعواقب سے عامۃ الناس کو روشناس کرنے کے لئے بھی سزا کا اجراء اہم وناگزیر ہو جاتا ہے؛ چنانچہ سزا سے اجتماعی اصلاح کا پہلو بھی نکل آتا ہے نیز مجرم کا حشر دیکھ کر وہ طبیعتیں جن میں جرم کا میلان ہے وہ متنبہ بھی ہو جاتی ہیں ،پھر عام آدمی کو ایک تسلی بھی ملتی ہے کہ مجرم بہرحال خمیازہ بھگتے گا؛ لہٰذا سزا تازیانہ عبرت ہونے کی وجہ سے مثبت ومنفی ہر دو پہلو سے معاشرے کو فائدہ ہوتا ہے جس کا تذکرہ خود اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے :

جَزَاءً بِمَا کَسَبَا نَکَالاً مِّنَ اللهِ وَاللهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ . (المائدۃ:۳۸)

سزا یا جزاء

قرآن مجید میں جرم اور ان کی سزاؤں کا جو اجمالی ذکر ہے اور جس پر اسلامی قانون کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اس نظام پر کچھ خامہ فرسائی بھی ہوتی رہی ،ابتدائی عہدوں میں معتزلہ نے کچھ اعتراضات کئے تھے ،موجودہ زمانے میں تجدد پسند دانشوروں اور بزعم خویش روشن خیال مفکروں نے اپنی تحریروں وتقریروں سے اس نظام کے چند گوشوں کو نشان ہدف بنانے کی کوشش کی ،جن میں اہم اور بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں :

۱-مجرم نفسیاتی مریض ہوتا ہے : وہ ہمدردی وعلاج کا مستحق ہوتا ہے نہ کہ سزاؤں کا؛ لہٰذا اس کی مجرمانہ

ذہنیت تبدیل کرنے کے لئے کونسلنگ concelling ہونی چاہئے اور مروت و ہمدردی کے ساتھ راہ راست پر لانا چاہئے، ظاہر ہے کہ مفروضہ اس قدر بودا اور خام ہے کہ ساری دنیا نے اس کو مسترد کردیا، پھر یہ کہ دنیا کے کسی بھی نفسیاتی طبیب نے کوئی ایسا نسخہ ایجاد نہیں کیا جس سے مجرم کو جرم سے باز رکھا جائے، اس پر مستزاد یہ کہ مجرم صاحب اپنے آپ کو نا صرف مریض تصور نہیں کرتے؛ بلکہ پورے ہوش وحواس کے ساتھ تادم اخیر جرائم میں مبتلا رہتے ہیں، اور جرم کا سبب نفسیاتی و ہیجانی کیفیت نہیں ہوتی؛ بلکہ پورے انشراح کے ساتھ اپنی مکروہ خواہشات کو پورا کرنے کا داعیہ ہوتا ہے؛ لہٰذا یہ خام خیالی ان حضرات کے لئے تو خوبصورت ہے جو خوابوں کے شیش محل میں زندگی بسر کرتے ہیں؛ لیکن جو حقیقت کو سمجھتے اور اس کا سامنا کرتے ہیں ان کے لئے یہ صرف سراب ہے، تشنگی دور کرنے والا پانی نہیں۔

۲-سختی وشدت کی شکایت : بعض حضرات سزاؤں کی سختی کا رونا روتے ہیں؛ لیکن ان کی یہ شکایت شریعت کے نظام سے عدم واقفیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، شریعت نے سزاؤں کے اجرا کو جن سخت شروط پر موقوف کیا ہے اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سزا کا مستحق اکثر وہ عادی اور پیشہ ور مجرم ہی بنتا ہے جو جرائم پر بہت جری ہو چکا ہو، ہر وقت جرم کی تلاش میں لگا رہتا ہو اور چھوٹی موٹی سرزنش سے ہرگز باز نہ آتا ہو، مثلاً حد زنا میں چار عاقل بالغ گواہوں کی شرط یہ بتلاتی ہے کہ اس گناہ میں مجرم اتنے جری ہو چکے تھے کہ عام لوگوں کی موجودگی کے امکانات کو بھی نظر انداز کررہے تھے؛ لہٰذا جب کوئی مجرم جرم کا اس قدر خوگر و عادی ہو جائے تو اس کی جڑ کاٹ دینا اور مجرمانہ سرگرمیوں کو اُکھاڑ پھینکنا ایک صالح مناسب اور انسانیت کی بہی خواہ مملکت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید اور جرم وسزا کا تصور

مولانا محمد مصطفیٰ عبد القدوس ندوی ⊙

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على رسوله الكريم ، وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد !

عالی قدر صدر جلسہ، حضرات علماء گرامی اور دیگر معزز سامعین کرام، آج کی اس مؤقر مجلس میں ہمارا موضوع مقالہ ہے: ''قرآن کا تصور جرم وسزا''۔

حضرات گرامی قدر ! میں نے اس عنوان سے متعلق پہلے آیاتِ قرآنیہ جمع کی ہیں، اس کے بعد نزولِ قرآن سے پہلے عرب میں ہونے والے جرائم کا سرسری جائزہ لیا ہے، پھر قرآن نے عرب کے بگڑے ہوئے سماج میں ساحرانہ انقلاب کس طرح برپا کیا؟ اس نے جرم وسزا کی بابت کیا تصورات پیش کئے؟ کو پیش کرنے کی حقیر کوشش کی ہے، سرمایہ دارانہ واشتراکیت کے افراط وتفریط نظامہائے جرم وسزا اور اسلام کے معتدل ومنصفانہ نظریہ جرم وسزا کا ایک خاکہ بشکل موازنہ پیش کیا ہے، اس کے بعد اس وقت جو مختلف ترقی یافتہ ممالک میں جرائم ہورہے ہیں، کے تازہ اعداد وشمار جمع کئے ہیں، آخر میں ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کے نظام جرم وسزا پر عمل آوری نہ ہونے کی وجہ سے دنیا میں اس کثرت سے جرائم ہورہے ہیں، جس دن سے قرآن کے تصور جرم وسزا پر عمل شروع ہوجائے اور جس ملک میں عمل کا آغاز ہو اس دن سے وہاں امن وامان بحال ہوجائے گا — اب آیئے اسی ترتیب سے تھوڑی دیر آپ حضرات کے سامنے لب کشائی کرنے کی جرأت کرتا ہوں، اُمید کہ بغور سماعت فرمائیں گے۔

حضرات سامعین ! اسلام کا آفتاب طلوع ہونے سے پہلے پوری دنیا ہر اعتبار سے تباہی وبربادی کے دہانے پر تھی، خود عرب کا سماج نہایت جرائم پیشہ سماج تھا، جہاں عصمت ریزی، دختر کشی بلا روک ٹوک ہوتی تھی، شراب نوشی لوگوں کی گھٹی میں پڑی تھی، بے حیائی اور فحاشی اس عروج پر تھی کہ لوگ اپنی بدکرداریوں کو لکھ کر غلافِ کعبہ سے آویزاں کردیتے تھے اور بے تکلف اپنے اشعار میں اس کا ذکر کرتے تھے، قتل وغارت گری، ڈاکہ زنی اور جنگ وجدال تو گویا ان کی طبیعت ثانیہ تھی، ان حالات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے

⊙ استاذ: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

جرم و گناہ کے اس جنگل کو صدق و صفا اور محبت و وفا کی بستی بنادیا، مولانا حالیؒ نے اسلام سے پہلے عربوں کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے
جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی
جُوا اُن کی دن رات کی دل لگی تھی شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی
بہت اس طرح ان کو گزری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں(۱)

حضرات شرکاءِ جلسہ ! قرآن نے جن جرائم کا ذکر کیا ہے اور ان کی سزائیں متعین کی ہیں، وہ یہ ہیں: شراب نوشی، زنا، قذف، چوری، رہزنی و بغاوت، قتل انسان، ارتداد اور جادو۔

شراب نوشی

اللہ تعالیٰ نے شراب نوشی کو حرام قرار دیا ہے؛ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ . (مائدۃ:۹۰)

اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، مورتیاں اور فال نکالنے کے تیر، گندی باتیں ہیں اور شیطانی کام ہیں، ان سے بچو؛ تاکہ تمہارا بھلا ہو۔

جو چیزیں انسان کے اخلاق کو بگاڑتی ہیں، اس کے کردار کو بدنما کرتی ہیں اور معاشرے میں فساد برپا کرتی ہیں،

(۱) انتخاب حالی، ص:۱۵۸-۱۵۹۔

ان میں سرفہرست شراب ہے؛ کیوں کہ جب نشہ چڑھتا ہے تو انسان ہوش وحواس کھودیتا ہے، جب گالی گلوج مغلظات بکنے پر اُترتا ہے تو اپنی ماں بہن اور بیٹی کو بھی نہیں بخشتا ہے، اس حالت میں قتل و غارت گری کرنا آسان ہوجاتا ہے، بدکاری، چوری، ڈکیتی بلکہ وہ اس حالت میں ہر بُرا کام کرسکتا ہے؛ اسی لئے اللہ کے رسول نے شراب نوشی کو برائیوں کی جڑ و بنیاد قرار دیا ہے(۱) اور اللہ تعالیٰ نے خود شراب نوشی سے لوگوں کو روکنے کی حکمت بیان فرمائی کہ اس سے آپس میں دشمنی پیدا ہوتی ہے اور بغض وعناد کی آگ بھڑکتی ہے اور انسان اپنے رب کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے؛ چنانچہ ارشاد فرمایا :

> إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِيْ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللهِ وَعَنِ الصَّلاَةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُوْنَ ۔ (المائدۃ:۹۱)
>
> شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعہ دشمنی اورنفرت پیدا کردے، نیز تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے باز رکھے، تو کیا تم (شراب اور جوئے سے) باز آؤگے؟

اہل خانہ، اہلیانِ محلّہ اور سماج کو فاسد عناصر سے پاک کرنے کے لئے اسلام نے ایسے لوگوں پر حد مقرر کی ہے، ابتداء اسلام میں باضابطہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں تھی، لوگ ہاتھوں، جوتے اور کھجور کی ٹہنیوں سے شراب پینے والے کو مارتے تھے، بعض دفعہ آپ ﷺ نے چالیس کے قریب چھڑی مارنے کا فیصلہ کیا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں چالیس کوڑے لگایا کرتے تھے، جب عہد فاروقی آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور اسّی کوڑے لگانا طے پایا(۲)، کیوں کہ لوگ شراب پینے میں کچھ زیادہ ہی سرکش اور جری ہوگئے تھے، اس لئے ایسے لوگوں کی سرزنش اسی اعتبار سے کچھ سخت ہونی ناگزیر ہوگئی(۳)، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسّی کوڑے لگانے کا مشورہ دیتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ عام طور پر نشہ میں بدمست ہذیان گوئی کرتا ہے اور اُسی ہذیان گوئی میں لوگوں پر تہمت بھی لگادیتا ہے؛ لہٰذا قذف کی سزا اسّی (۸۰) کوڑے اس جرم پر بھی لگائے جائیں (۴)،

---

(۱) سنن ابن ماجه ، باب الخمر، حدیث نمبر:۳۳۱۷۔

(۲) صحيح بخاري ، كتاب الحدود، حدیث نمبر:۶۷۷۳، ۶۷۷۶، ۶۷۷۹، صحیح مسلم، باب حد الخمر، حدیث نمبر:۴۴۵۲

(۳) حتى كان آخر إمرة عمر ، فجلد أربعين ، حتى إذا عتوا وفسقوا جلد ثمانين، رواه البخاري عن السائب بن يزيد في صحيحه ، كتاب الحدود ، باب الضرب بالجريد و النعال، حدیث نمبر:۶۷۷۹۔

(۴) موطا امام مالک ، باب ماجاء في الحد في الخمر:۳۵۷۔

اور یہی جمہور فقہاء کی رائے ہے۔(۱)

زنا

کنواری آزاد عورتیں یا غیر شادی شدہ مرد اگر زنا میں مبتلا ہو جائیں تو ان کی سزا سو کوڑے لگانا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَةٍ . (النور:۲)

زنا کار عورت اور زنا کار مرد، سو (دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں ہر ایک کو سو سو درے مارو۔

اور جو آزاد نہیں (غلام، باندی، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ) ان کی سزا اس کی نصف ہے، یعنی پچاس کوڑے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ (۲) . (النساء:۲۵)

پس اگر وہ قید نکاح میں آجائیں تو پھر بے حیائی کی مرتکب ہوں تو ان کی بہ مقابلہ آزاد عورتوں کے آدھی سزا ہے۔

قذف (زنا کی تہمت لگانا)

اور جو لوگ پاکباز عورت یا مرد پر بے حیائی وزنا کاری کی تہمت لگائیں تو اس کی سزا اسّی کوڑے لگانا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

---

(۱) والجمهور على القول بالثمانين، الموسوعة الفقهيه (مطبوعہ کویت):۵/۲۳،نیز دیکھئے: ردالمحتار:۵/۲۸۹، الفواكه الدواني:۲/۲۹۰،مغنى المحتاج:۴/۱۸۷،المغني:۸/۳۰۶،نيل الأوطار:۷/۱۴۶۔

(۲) اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے مفسرین اور فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر باندی شادی شدہ ہو اور زنا کا ارتکاب کرے، تو اس کی سزا بھی پچاس کوڑے ہے؛ کیوں کہ رجم (سنگ ساری) تنصیف ممکن نہیں ، (تفسیر نسفی :۱/۲۲۷) گو غلاموں کی بےحیائی یعنی زنا کاری کی سزا قرآن مجید میں صریح اور واضح الفاظ میں مذکور نہیں ؛ تاہم فقہاء نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے غلاموں (خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ) کے لئے حد زنا پچاس کوڑے لکھا ہے؛ کیوں کہ باندی کی سزا میں وجہ تخفیف و تنصیف رقیت ہے اور یہ وجہ غلام میں بھی پائی جاتی ہے، إذ كان المعنى الموجب لنقصان الحد معقولا من الظاهر وهو الرق ، وهو موجود في العبد ۔ (أحكام القرآن للجصاص:۲/۲۱۳)۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً . (النور:۴)

اور جو لوگ تہمت لگائیں پاکدامن عورتوں کو اور پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو انھیں اسّی درے لگاؤ۔

واضح رہے کہ یہ حکم پاکباز عورتوں پر زنا کی تہمت لگانے کی حد تک محدود نہیں؛ بلکہ پاکباز مردوں پر تہمت زنا لگانا بھی اسی دائرے میں آتا ہے۔(۱)

چوری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللهِ وَاللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ . (مائدۃ:۳۸)

چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ ان کے کرتوت کی سزا ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت کے لئے ہے۔

فقہ اسلامی کی اصطلاح میں چوری: مکلّف جو دانا و بینا اور گویائی پر قادر ہو، اس کا دس درہم (۲) یا مالیت میں اس کی مقدار کے بقدر ایسے چیز کا لے لینا ہے جو شریعت اور عرف میں مال متصور ہو، قصداً لیا گیا ہو، مقام محفوظ سے چھپا کر کھلے طور پر باہر لے جایا گیا ہو، جس شخص سے لیا گیا ہو، اس کا اس پر جائز طریقہ پر قبضہ ہو، ایسی چیز ہو جو جلدی خراب نہ ہونے والی ہو، دارالاسلام (مملکت اسلامیہ) میں یہ سامان لیا گیا ہو، جو مال لیا گیا ہو، وہ محفوظ رہا ہو اور لینے والے کے لئے اس مال میں نہ ملکیت کا شبہ ہو اور نہ تاویل کی گنجائش۔(۳)

---

(۱) ولا خلاف بين المسلمين ان المحصنين مرادون بالآية ، وأن الحد واجب على قاذف الرجل المحصن كوجوبه على قاذف المحصنة ۔ (أحكام القرآن للجصاص:۳/۳۴۸، ط: دارالكتب العلمية، بيروت)

(۲) دس درہم پر ہاتھ کاٹے جانے کی روایت حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ سے منقول ہے، (مصنف ابن ابی شیبہ:۱۴/۱۱/۳۷، باب، من قال: لاتقطع فی الخ، نیل الاوطار للشوکانی: ۷/۲۹۸)، موجودہ اوزان کے اعتبار سے دس درہم ۶ ۳۰ء۳۰ گرام چاندی کے برابر ہوتا ہے، (دیکھئے: الفقہ الواضح، از: ڈاکٹر محمد بکر اسماعیل: ۲/۲۴۴، قاموس الفقہ، از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: ۴/۱۴۸)۔

(۳) درمختار مع الرد: ۳/۹۳-۱۹۴۔

قانون اسلامی کی رو سے چوری ثابت ہو جانے کے بعد چور کا دایاں ہاتھ اس کے گٹے سے کاٹا جائے گا، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ایک چور کا ہاتھ اس کے گٹے سے کاٹا ہے۔(۱)

ظاہر ہے کہ چور پر چوری کی حد (ہاتھ کاٹنے) جاری کرنے کا بنیادی مقصد لوگوں کے مال کا تحفظ ہے، جب دوسرے لوگ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ چوری کرنے پر اتنی سخت سزا ہے کہ ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، تو وہ چوری کے اقدام سے باز رہیں گے، اس طرح لوگوں کے مال محفوظ رہیں گے اور زمین پر امن قائم ہوگا۔

رہزنی اور بغاوت

رہزنی اور نظام اسلامی سے بغاوت کی سزا کی طرف اللہ تعالیٰ نے خود اشارہ فرمایا:

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَاداً أَنْ يُقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ . (المائدۃ:۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برسر پیکار ہیں اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں، یا انھیں سولی دے دی جائے، یا اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے، یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

یہاں چار سزاؤں کا ذکر آیا ہے، مفسرین اور فقہاء کے نزدیک یہ ڈاکوؤں کے چار الگ الگ گروہوں کے لئے ہے، قتل اس کے لئے جو قتل کا مرتکب ہو، ''سولی'' اس شخص کے لئے جس نے قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا، ''ہاتھ پاؤں کاٹ دیا جانا'' مال لوٹنے والوں کی سزا، اور اُلٹے کاٹنے سے مراد دایاں پاؤں کاٹنا ہے اور جلاوطنی اس ڈاکو کی جس نے قتل کرنے اور مال لوٹنے کا ارادہ تو کیا؛ لیکن کیا نہیں، یا کرنے پر قادر نہیں ہوا۔(۲)

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہوسکتا ہے، جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے، جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔(۳)

---

(۱) سنن بیہقی، باب السارق یسرق أولا الخ: ۸/۲۷، حدیث نمبر: ۱۷۲۵۰، نیز دیکھئے: نصب الرایہ: ۳/۳۷۔

(۲) آسان ترجمہ وتشریح قرآن مجید: ۱/۲۹۰۔

(۳) تفہیم القرآن: ۱/۴۶۵۔

قتل انسان

اللہ تعالیٰ نے ناحق قتل انسان کو حرام قرار دیا ہے اور آخرت میں سخت عذاب کی دھمکی بھی سنائی، ارشاد ہے :

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً ، يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَاناً . (الفرقان:۶۸-۶۹)

اور جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس (انسان) کی جان کو اللہ نے محفوظ قرار دے دیا ہے، اسے قتل نہیں کرتے، مگر ہاں حق پر اور نہ زنا کرتے ہیں، اور جو کوئی یہ (حرکتیں) کرے گا اس کو سزا اسے سابقہ پڑے گا، قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا جائے گا اور اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر پڑا رہے گا۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيْماً . (النساء:۹۳)

اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے، اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کی لعنت ہوگی اور اللہ نے ان کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس کے باوجود کوئی شخص کسی پر ناحق قتل کے ارادہ سے کسی دھاردار ہتھیار سے حملہ کر کے اس کو عمداً قتل کر دیتا ہے، تو اس کے لئے قصاص کا قانون ہے (۱) یعنی قاتل بھی بر سر عام قتل کیا جائے گا؛ تاکہ دوسروں کے لئے عبرت ثابت ہو اور قتل کے واردات تھم جائیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثٰى بِالْأُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ، وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ . (البقرة:۱۷۸-۱۷۹)

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے بارے میں ''قصاص'' فرض کیا گیا ہے، آزاد نے

---

(۱) التقریر والتحبیر:۲/۱۰۴، ۱۱۱، کشف الأسرار:۲/۱۳۶، التلویح علی التوضیح:۲/۱۵۱۔

قتل کیا ہو تو اس آزاد سے، غلام نے قتل کیا ہو تو اس غلام سے اور عورت نے قتل کیا ہو تو اس عورت سے بدلہ لیا جائے، پس جس (قاتل) کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو مناسب طریقہ (مقتول کے ورثہ کو (خون بہا کا) مطالبہ کرنا چاہئے اور (قاتل کو بھی) بہتر طریقہ پر ادا کر دینا چاہئے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے، پھر جو اس کے بعد بھی زیادتی کرے، تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے اور اے اصحابِ دانش! قصاص میں (درحقیقت) زندگی ہے؛ تا کہ تم (دنیا میں قتل اور آخرت میں عذاب سے) بچ سکو۔

اوپر ذکر کی گئی قتل کی صورت کو قتل عمد کہا جاتا ہے، جس میں قاتل کو قصاص کے طور پر قتل کیا جاتا ہے اور اگر مقتول کے ورثہ میں کسی نے قصاص معاف کر دیا اور اس کے بدلہ دیت لینے پر راضی ہو گیا، تو سو اونٹنیاں یا اس کی قیمت بہ طور دیت قاتل پر لازم ہوگی؛ جیسا کہ اوپر ذکر کی گئی آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قتل کی ایک صورت شبہ عمد کی ہے، جس میں دیت ہی لازم ہوتی ہے قصاص نہیں ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مقتول پر حملہ قتل کے ارادہ سے کیا گیا ہو؛ لیکن ایسی چیز سے حملہ کیا گیا ہو، جو عام طور پر قتل کا سبب نہیں بنتی ہے۔

قتل کی تیسری صورت قتل خطا کی ہے اور وہ یہ ہے کہ غلطی سے مقتول کی جان چلی جائے، ورنہ اس کی جان لینے کا ارادہ نہ ہو، اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ سمجھنے میں غلطی واقع ہو جائے، جیسے دور سے جانور سمجھ کر اس پر گولی چلائی اور اس کو گولی لگ گئی، جب قریب گیا تو معلوم ہوا وہ انسان تھا، دوسری صورت یہ ہے نشانہ لگانے میں غلطی ہو جائے، اس طور پر کہ نشانہ لیا شیر کا اور اتفاق سے لگ گیا انسان کو اور وہ مر گیا، (۱) ان دونوں صورتوں میں دیت لازم ہوگی، جس کی تعداد سو اونٹ ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے قتل خطاء کی دیت سو اونٹ مقرر کی ہے۔ (۲)

ارتداد

اسلام کو چھوڑ کر کفر والحاد کی طرف جانا ''ارتداد'' کہلاتا ہے اور جو بدنصیب ایسا کرے اس کو ''مرتد'' کہا جاتا ہے، مرتد کی سزا قتل ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (التوبۃ:۵)

---

(۱) دیکھئے: الفقہ الاسلامی وأدلتہ، از: ڈاکٹر وہبہ زحیلی: ۶/ ۲۲۲۔

(۲) ابوداود، کتاب الدیات، باب الدیۃ کم ھي؟ حدیث نمبر: ۴۵۴۱۔

پھر اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے۔

نیز آگے ارشاد ہے :

فَإِن تَابُوْا وَأَقَامُوْا الصَّلاَةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَنُفَصِّلُ الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ، وَإِن نَّكَثُوْا أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لاَ أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنتَهُوْنَ . (التوبۃ:۱۱-۱۲)

لیکن اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہوجائیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے بھائی ہوجائیں گے دین میں، اور ہم آیتوں کو علم والوں کے لئے تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور اگر یہ لوگ اپنی قسموں کو اپنے عہد کے بعد توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو قتال کرو (ان) پیشوایانِ کفر سے کہ (اس صورت میں) ان کی قسمیں باقی نہیں رہیں؛ تاکہ یہ لوگ باز آجائیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: من بدل دينه فاقتلوه ،(۱) ''جو مسلمان اپنے دین اسلام کو بدل دے اسے قتل کردو''۔

عہد اسلام میں اس پر تواتر سے عمل ہوتا رہا ہے، حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے مرتدین سے باضابطہ جہاد کیا اور اسلام کی طرف دوبارہ عود نہ کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اُتروایا، اس پر ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء کا اتفاق ہے(۲)؛ البتہ فوری قتل نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ پہلے اسے گرفتار کیا جائے گا، اس کے بعد اس سے تین روز تک توبہ استغفار کا مطالبہ کیا جائے گا اور اسلام کی طرف دوبارہ لوٹنے کے لئے کہا جائے گا، اگر وہ ان تین دنوں میں اسلام قبول کرلیتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ فوری اسے قتل کردیا جائے گا۔(۳)

اسلام نے دین کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا ہے :

لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِن بِاللهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ . (البقرۃ:۲۵۶)

---

(۱) صحيح بخاري ، كتاب استتابة المرتدين والمعاندين وقتالهم ، باب حكم المرتد، حدیث نمبر:۶۹۲۲۔

(۲) الميزان الكبرىٰ للشيخ عبد الوهاب الشعراني:۲/۱۷۱۔

(۳) درمختار وردالمحتار:۶/۳۶۰-۳۶۱، ط: مکتبہ زکریا، دیوبند۔

دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں، گمراہی کے مقابلہ ہدایت آشکارا ہوچکی ہے، تو جس نے ''طاغوت'' کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا، اس نے مضبوط ڈوری تھام لی جو ٹوٹ نہیں سکتی اور اللہ خوب سننے والے، خوب جاننے والے ہیں۔

لہٰذا اگر کوئی اس کوچہ میں آنا چاہے تو خوب سوچ سمجھ کر آئے؛ کیوں کہ آنے کے بعد جانے کا دروازہ بند ہوجاتا ہے؛ اس لئے اسلام کوئی افسانوی مذہب نہیں ہے؛ بلکہ مکمل دستورِ حیات ہے، فکر وعقیدہ سے لے کر سماج ومعاشرت، سیاست اور معیشت تک ایک پورا ٹھوس نظامِ حیات ہے، یہ الٰہی نظام ہے، انسان کا خود ساختہ نظام نہیں ہے، اسی وجہ سے اسلام سے بیزاری کا اظہار دراصل اسلام سے بغاوت کے مترادف ہے، اس لئے ایسے لوگوں کی سزا سخت ہونی چاہئے، دنیا کا کونسا ملک ہے جو اپنے ملک کے باغیوں کو اپنی آستین میں جگہ دیتا ہو؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جو اپنے باغیوں کو ایک لمحہ کے لئے برداشت کرسکے، اسی لئے اسلام نے ایسے لوگوں کو دنیا سے لے کر آخرت تک نہیں بخشا ہے، دنیا میں دارالاسلام میں رہتے ہوئے جو لوگ مرتد ہوں ان کی سزا قتل ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے، اور آخرت میں بھی نامراد اور جہنم رسید ہوتے ہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ. (البقرۃ:۲۱۷)

اور (یادرکھو کہ) تم میں سے جو دین سے مرتد ہوجائے اور کفر کی حالت میں مرے، تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے (نیک) اعمال غارت ہوجائیں گے، ایسے لوگ دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔

جادو

جادو کا عمل حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور اس کو جائز وحلال خیال کرنا کفر ہے اور حلال سمجھنے والا کافر (۱) اور اس کی سزا قتل ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: حد الساحر ضربة بالسيف، (۲) ''ساحر کی سزا تلوار سے اس کا

---

(۱) شرح صحیح مسلم للنووی، باب السحر: ۲۲۱/۲، درمختار وردالمحتار، کتاب الجهاد، باب المرتد: ۳۸۱/۶-۳۸۲۔ (۲) اس حدیث کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم مکی ہے، جسے نقاد محدثین نے حفظ واتقان کی رُو سے ضعیف قرار دیا ہے: یضعف فی الحدیث من قبل حفظه، (سنن ترمذی، حدود، باب ماجاء حد الساحر، حدیث نمبر: ۱۴۶۰، مزید دیکھئے: تهذیب التهذیب: ۳۴۰/۱-۳۴۱، ط: دارالفکر ۱۴۱۵ھ-۱۹۹۵ء) امام ترمذی نے اس حدیث کو حضرت جندب ﷜ سے موقوفاً درست قرار دیا ہے، والصحیح عن جندب موقوف، (حوالہ سابق)، اور ظاہر ہے کہ حدود کا معاملہ عقلی واجتہادی نہیں ہے، اس وجہ سے اُصولی طور پر یہ حدیث حکم کے اعتبار سے مرفوع ہوجائے گی (تیسیر مصطلح الحدیث للدکتور محمود الطحان: ۱۳۱)۔

خاتمہ ہے، آپ ﷺ کا یہ فرمان کلمات کفریہ کے ساتھ مربوط ہے، یعنی اگر کسی مسلمان جادوگر نے جادو کے لئے کفر کے کلمات استعمال کیے، تو وہ زندیق کی طرح ہو گیا، اسے قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور علامہ قرطبی نے اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے اور مزید دوسرے تابعین کا قول بھی اس کے موافق ذکر کیا ہے، (۱) اور چوں کہ قرآن نے بھی سحر کو کفر سے تعبیر کیا ہے :

وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلاَ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلاَ تَكْفُرْ . (البقرۃ:۱۰۲)

یعنی اور وہ دونوں فرشتے کسی کو جادو کی تعلیم اس وقت تک نہ دیتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی ایک آزمائش ہے؛ اس لئے تو کفر کا راستہ اختیار نہ کر۔

جرم کا تصور

حضرات گرامی ! انسانیت سے بھرپور، شرافت سے معمور صالح معاشرہ کے خلاف کسی زیادتی کے ارتکاب کا نام جرم ہے؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جرم وسزا کے تصور، فرد اور گروہ کے باہمی تعلق کے متعین کرنے میں معاشرے کے اجتماعی نظریہ کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ (۲)

ترقی یافتہ مغربی ممالک کے یہاں فرد کے تقدس واحترام میں زیادہ مبالغہ ہے، جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کا طرۂ امتیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مجرموں کو قابل رحم سمجھا جاتا ہے؛ کیوں کہ وہ ان کے خیال میں بگڑے ہوئے ماحول، نفسیاتی اُلجھنوں اور اعصابی عوارض میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان پر قابو پانا ان کے بس ہی میں نہیں ہوتا، اسی لئے ان ممالک میں جرائم کی سزاؤں کا خصوصاً اخلاقی جرائم کی سزاؤں میں کمی کا رجحان ملتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات تو انھیں سرے سے کوئی ایسا جرم ہی نہیں سمجھا جاتا، جس پر کسی سزا کا مستحق قرار پائے۔ (۳)

اسلام، سرمایہ دارانہ نظام — جہاں فرد کا تقدس مبالغہ کے حد تک ہے — انفرادیت پسند اور اشتراکیت پسند نظریات — جہاں اجتماعیت کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور فرد کا استحصال ہوتا ہے — کی خوبیوں کا جامع؛ لیکن ان کی خرابیوں سے پاک ہے۔

اسلام کا طریقہ

اسلام اندھادھند سزائیں تجویز نہیں کرتا اور نہ بغیر سوچے سمجھے انھیں نافذ کرتا ہے؛ بلکہ جرم کی سزا دینے سے پہلے

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۲/ ۳۳-۳۴۔

(۲) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، از محمد قطب، ص: ۲۲۳۔

(۳) حوالۂ سابق، ص: ۲۳۴، نیز دیکھئے: سزائے رجم، از: پروفیسر ساجد الرحمٰن صدیقی، ص: ۴۲۔

ان تمام حالات اور اسباب وعلل کا جائزہ لینے کا حکم دیتا ہے، جن کا ارتکاب جرم سے تعلق رکھتا ہے، واضح رہے کہ اسلام محض حدود کے نفاذ اور جرموں کی سزاؤں کے اجراء پر انحصار نہیں کرتا؛ بلکہ اس سے پہلے وسیع اور ہمہ جہت اصلاحی تدابیر اختیار کرتا ہے اور ایسے انسدادی اقدامات کرتا ہے کہ قانونی تعزیرات محض آخری چارۂ کار کے طور پر رہ جاتی ہیں؛ چنانچہ اسلام جرائم کی روک تھام کے لئے سب سے پہلے دلوں کا تزکیہ، نفس کی اصلاح اور لوگوں کی فکر اور سوچ میں انقلاب، اور ان کے اندر کی دنیا میں تبدیلیاں لاتا ہے، قانونِ الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پروان چڑھاتا ہے، دوسری طرف جرم و گناہ کی سنگینی و شناعت ان کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش ہوتی ہے، خشیت الٰہی، خوفِ آخرت پر اُبھارا جاتا ہے، یہی خوف خدا اور عذاب آخرت کا شدید احساس حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کو دربار رسالت میں کشاں کشاں کھینچ کر لایا اور ان کے دل کی آواز ان کی زبان پر آئی اور یہ جانتے ہوئے کہ اس جرم (زنا) کی سزا نہایت ہی سخت اور عبرت انگیز ہے، (۱) اعتراف جرم فرمایا، اس طرح اسلام ایسا صالح معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں جرم کے ارتکاب کے مواقع کم سے کم باقی رہتے ہیں۔

اسی طرح جرائم کے اثبات کے جو ذرائع ہیں ان ذرائع کے پائے جانے کے بعد ہی جرائم ثابت ہوں گے، تب ان جرائم کی سزائیں قابل نفاذ ہوں گی، مثلاً زنا کے ثبوت میں چار عینی شاہدین کا ہونا ضروری ہے، قصاص ثابت ہونے کے لئے جہاں قاتل کا اقرار، یا گواہان کا ہونا ضروری ہے وہیں قتل کا واقعہ بر بناء ظلم، عمداً، اور آلۂ قتل تلوار یا اس جیسی چیز ہو جس میں کاٹنے کی صلاحیت ہو۔ (۲)

بعض اوقات بعض عوارض کی وجہ سے حدیں کبھی مؤخر ہو جاتی ہیں اور کبھی ساقط بھی ہو جاتی ہیں، جیسے عورت حاملہ ہو تو اس پر زنا کی حد فوری جاری نہیں ہوگی؛ بلکہ مؤخر کر دی جائے گی، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ غامد کی ایک خاتون صحابیہؓ —— جن کے اقرار جرم کی وجہ سے حد زنا ثابت ہوئی تھی اور وہ حاملہ تھیں —— کی حد مؤخر کر دی، بچہ کی پیدائش کے بعد ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کے بچہ کی کفالت کے بعد حد جاری فرمائی (۳)، اسی طرح اگر دورانِ جنگ یا دشمن کی سرزمین میں فوج مقیم ہو تو وہاں حد سرقہ نافذ نہیں ہوگی؛ چنانچہ ایک بار جنگ کے موقع پر ایک فوجی نے حضرت بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کی ڈھال چرا لی، اسے جب گرفتار کر کے حضرت بسر رضی اللہ عنہ کے سامنے لایا گیا

---

(۱) ابوداود، باب رجم ماعز بن مالک، حدیث نمبر: ۴۴۱۹، ۴۴۲۷، ۴۴۳۴۔

(۲) تقریر وتحبیر: ۱۰۴/۲، ۱۱۱، کشف الأسرار: ۱۳۶/۲۔

(۳) ابوداود، حدیث نمبر: ۴۴۴۰، ۴۴۴۲۔

تو انھوں نے فرمایا:لو لا أني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول '' لا تقطع الأيدي في السفر '' ولو لا ذلک لقطعته،(۱)ابو محمد مقدسی کا بیان ہے کہ اس پر صحابہ ﷺ کا اجماع ہے،اسی طرح امام اوزاعی اور دیگر ائمہ فقہ نے اسی حدیث کی روشنی میں لکھا ہے:''إن الحدود لا تقام في أرض العدو ''(دشمن کی سرزمین میں حدود جاری نہ کی جائیں)۔

اسی طرح قحط کے موقع پر چوری کرنے پر چور پر چوری کی حد جاری نہیں ہوگی،جیسا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب ﷺ کے زمانہ میں جب قحط پڑا تو آپ نے چوری کے جرم میں کسی کو قطع ید یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی(۲)؛ کیوں کہ اس بات کا امکان موجود تھا کہ لوگ چوری بھوک سے مجبور ہو کر کرتے ہوں،اس لئے چوری کی تعریف پورے طور پر صادق آنے میں شبہ پیدا ہو گیا اور شبہ کی بنیاد پر حدود ساقط ہو جاتی ہیں''الحدود تدرأ بالشبهات''(۳) اسی اُصول پر دیگر حدود زنا،قصاص وغیرہ بھی شبہات کی موجودگی میں ساقط ہو جاتے ہیں،اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ''شبہات کی موجودگی میں حدود ساقط کردو''(۴)اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''إدرؤا الحدود في المسلمين ما استطعتم''۔(۵)

اس طرح اسلامی تعلیم یہ ہے کہ حتی الامکان حدود کے اجراء سے بچا جائے،نہ کہ حدود بغیر سوچے سمجھے فوری نافذ کئے جائیں،مزید مذکور بالا تصریحات،اُصول اور مراحل طے کرنے کے بعد قانونی تعزیر آخری چارۂ کار ہے، بالفاظ دیگر جرم کی روک تھام کے لئے آخری تدبیر قانون ہے اور یہ انسانیت کو امن وآشتی کے گود میں رکھنے کی آخری تدبیر ہے،جیسا کہ قرآن نے بھی قصاص کے باب میں اس طرف اشارہ کیا ہے:''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا

---

(۱) ابوداود،حدود،باب السارق يسرق في الغزو أيقطع؟حدیث نمبر:۴۴۰۸۔

(۲) المغني:۱۲/۴۶۲،معجم فقه السلف:۸/۲۲۷۔ (۳) الأشباه والنظائر لابن نجيم:۱/۱۲۷۔

(۴) مصنف ابن ابي شيبة:۱۱/۷۔ (۵) ترمذی،حدود،باب فی درء الحدود،حدیث نمبر:۱۴۲۴، مستدرک حاکم:۴/۳۸۴،حاکم کا بیان ہے:حدیث صحیح الاسناد ہے،حافظ ذہبی نے حاکم کی موافقت نہیں کی اور مزید امام نسائی کے حوالہ سے نقل کیا کہ اس حدیث کی سند میں''یزید بن زیاد شامی''راوی متروک ہے — گو اس سلسلہ میں جتنی احادیث وارد ہوئی ہیں وہ تقریباً سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں؛لیکن تمام فقہاء نے ان ہی احادیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا:''شبہات کی وجہ سے حدود ساقط ہو جائیں گی اور جس حدیث کو فقہاء اُمت بالاتفاق قبول کرلیں،تو وہ حدیث گو ضعیف ہو؛لیکن سند اعتبار کو پہنچ جاتی ہے؛بلکہ معنوی تواتر کے درجہ کو حاصل کر لیتی ہے اور احکام کے باب میں قابل حجت ہو جاتی ہے،(الاشباه والنظائر لابن نجيم:۱/۱۲۷،الأجوبة الفاضلة عن الأسئلة العشرة الكاملة،للعلامة عبد الحئ الكنوى:۵۱-۵۲)۔

أُولِـيْ الْأَلْبَـابِ ''(البقرۃ:۱۷۹)حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی بحالی ،اللہ کی زمین پر امن وامان کا قیام ،لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور انسانوں کی عزت و ناموس کی صیانت اور فطری آزادی ،اسلامی طریقہ پر جرائم کی سزاؤں کے نفاذ میں مضمر ہے ،بقول حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم :

> بعض انسانی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ کتنی ہی محبت کی زبان استعمال کرلیں اور نصح وہمدردی کے ساتھ دل کے بند دروازوں پر دستک دیں ،قانون کی تلوار کے سوا کوئی چیز ان کو سرخمیدہ نہیں کر پاتی ،ایسے لوگوں کے لئے سخت قانون بھی ایک ضرورت ہے ۔(۱)

حضرات سامعین کرام ! نظریات کا اثر عملی زندگی پر یقیناً پڑتا ہے ،قرآن کریم کی نظر میں ،زنا شرک اور قتل کے بعد سب سے بدترین اور قبیح جرم ہے اور فطرتِ سلیمہ کے خلاف بغاوت ہے ،اس جرم سے انسانیت کس قدر ہولناک اخلاقی تباہی ، دین کی بربادی ، اجتماعی زوال ، خاندانی انحطاط اور جسمانی بیماریوں سے دوچار ہوتی ہے اور جس کا اندازہ ہر ذی ہوش انسان کرسکتا ہے اور سر کی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہے ، اس کے برخلاف یہود اور عیسائی اقوام جس قدر فطرت سے دور ہوتی گئیں اور ان میں زنا کی کثرت ہوتی گئی ،اسی قدر ان کے ذہن سے اس جرم کی سنگینی کا احساس کم ہوتا گیا ،آج بھی مذہب بیزار ترقی یافتہ مغربی ممالک اور امریکہ میں اخلاق سوز کلچر ،بے حیا تہذیب وثقافت اور فواحش ومنکرات کا دور دورہ ہے ،جس کی وجہ سے اس جرم کی شناعت اور ہیبت ناکی کا تصور محو ہو چکا ہے ،جانبین کی رضامندی سے زنا ان کے یہاں کوئی جرم نہیں ہے ،چہ جائیکہ وہ قابل سزا ہو ،ہاں اسی وقت جرم ہے جب کہ عورت سے زنا بالجبر ہو اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ زنا بذات خود کوئی برا فعل ہے ؛ بلکہ اس لئے کہ مرد نے اس صورت میں ایک بااختیار عورت کے ارادے پر تعدی کی اور اسے اپنے آزادانہ اختیار کے استعمال کا موقع نہیں دیا (۲) —— اس کے برعکس اسلام کے تصور جرم زنا اور سزا کا وہ اثر پڑا کہ عہد رسالت میں اور خلفاء راشدین کے پورے دور میں گنتی کے چند واقعات نظر آتے ہیں ،اسی طرح دیگر جرائم کا بھی حال ہے ؛لیکن موجودہ دور میں جو ممالک ترقی یافتہ کہلاتے ہیں وہاں جرائم کے اعداد وشمار بہت ہیں ؛ چنانچہ نیشن ماسٹر ڈاٹ کام کے حوالہ سے ۲۰۱۰ء کی جاری کردہ فہرست میں سے بعض ترقی یافتہ ممالک میں ہونے والے جرائم کے اعداد وشمار درج ذیل ملاحظہ ہو :

صرف امریکہ میں قتل وعصمت ریزی کے جرائم :۱۱,۸۷۷,۲۱۸۔

---

(۱) روزنامہ منصف ،مینارۂ نور ایڈیشن :۲۴ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ ،مطابق ۳۱ ردسمبر ۲۰۱۰ء ۔

(۲) پروفیسر ساجد الرحمٰن صدیقی :سزائے رجم ،ص:۴۲-۴۴۔

عصمت ریزی کے واقعات

☆ جاپان : ۳۵۷ ☆ بھارت : ۶۳۰ ☆ برطانیہ : ۳۹۵۔
☆ فرانس : ۴۵۸ ☆ جرمن : ۶۱۵ ☆ روس : ۹۷۸۔
☆ سعودی عرب : ۵۹ ☆ ترکی : ۲۵۳ ☆ قطر : ۱۲۔

قتل کے واردات

☆ بھارت : ۳۷,۱۷۰ ☆ روس : ۲۸,۹۰۴ ☆ جرمن : ۹۱۴۔
☆ برطانیہ : ۱,۳۰۱ ☆ فرانس:۱,۰۵۱ ☆ جاپان:۶۳۷۔

یہ تو صرف قتل اور عصمت ریزی کے اعداد وشمار ہیں، اسی پر چوری، رہزنی، دہشت گردی وغیرہ دیگر جرائم کو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کتنے ہوسکتے ہیں؛ یہ سب قرآنی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہورہے ہیں اوراسی طرح لوگ تباہ و برباد ہوتے رہیں گے، حکومتیں گو وہ دوسرے میدانوں میں ترقی کے بام عروج پر پہنچ جائیں، جرائم کی روک تھام میں ناکام ہیں اور ناکام رہیں گی، یہاں تک قرآن کا تصور جرم وسزا روبہ عمل لایا جائے؛ کیوں کہ اسلام سے پہلے بھی اسی طرح کے حالات تھے؛ لیکن جب قرآن نازل ہوا، اسلام کا آفتاب فاران کی چوٹی پر طلوع ہوا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتدریج قرآنی نظام کو نافذ کیا اور عرب کے چرواہوں کو بامِ کمال تک پہنچادیا اور پورے عرب کو محبت ووفاء اور صدق وراستی کی بستی میں تبدیل کردیا، آج بھی جرائم کی روک تھام اور دنیا میں امن وامان قائم کرنے کے لئے وہی اُصول اور طریقۂ کار اپنانے پڑیں گے، جو قرن اول میں اختیار کیے گئے تھے اور کامیابی ملی تھی۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید کی روشنی میں شخصیت سازی

مولانا اختر امام عادل قاسمی ⊙

قرآن مجید دین کامل کی ایک نمائندہ کتاب ہے، یہ ایسی کتاب ہدایت ہے جو انسانیت کو سب سے سیدھی اور معتبر راہ دکھاتی ہے :

إِنَّ هَـذَا الْقُرْآنَ يِهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ أَقْوَم . (الإسراء:۹)

بے شک یہ قرآن سب سے سیدھے اور مضبوط راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔

یہ روشنی کا پیغامبر ہے، ایک مینارۂ نور ہے جس سے سارا عالم رہتی دنیا تک تاریکی سے نجات پاتا رہے گا :

قَدْ أَنْزَلَ اللهُ إِلَيْكُمْ ذِكْراً . رَّسُوْلاً يَتْلُوْ عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ . (الطلاق:۱۰-۱۱)

اللہ نے تمہارے لئے قرآن نازل کیا، رسول تم پر اللہ کی واضح آیات پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔

یہ ایک نسخۂ کیمیا ہے جو خاک کو کیمیا اور ذرہ کو آسمان بنا دیتا ہے، اس میں بیماروں کے لئے شفاء اور صحتمندوں کے لئے سامان سکون ہے، یہ خدا کا ایسا قیمتی اور عظیم الشان عطیہ ہے کہ اگر مضبوط اور بلند و بالا پہاڑوں پر اتارا جاتا تو وہ اس کا وزن برداشت نہیں کر پاتے اور ہیبت سے ریزہ ریزہ ہو جاتے :

لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً . (الحشر:۲۱)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ لرزہ براندام ہے اور ہیبت الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔

قرآن آج بھی تمام طاقتوں کا سرچشمہ اور ساری مشکلات کا حل ہے، جس طرح قرآن نے صدیوں پیشتر ایک حد سے زیادہ گری ہوئی قوم کو بلندیوں کے آسمان پر پہنچا دیا تھا اور اسی کتاب ہدایت کی بدولت ایک انتہائی پچھڑا

⊙ مہتمم: جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور، بہار۔

ہوا معاشرہ دنیا کے سب سے ترقی یافتہ اور مہذب معاشرہ میں تبدیل ہوگیا، جن لوگوں کو کسی مہذب اور شریف آدمی کی نقل اتارنے کا سلیقہ نہیں تھا وہ ساری مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا کے لئے آئیڈیل بن گئے، جن کو اپنا چھوٹا سا گاؤں چلانے کی لیاقت نہیں تھی ان میں پوری روئے زمین پر حکمرانی کی اہلیت پیدا ہوگئی، جن کو ایک چھوٹی سی سوسائٹی پر کنٹرول نہیں تھا اور جو ساری دینا میں اپنی خانہ جنگی اور سر پھٹول کے لئے بدنام تھے، ان کو ایسا قانون مل گیا جس نے ساری انسانیت کو ایک لکڑی میں پرو دیا...... یہ سب اسی کتاب مقدس کا اعجاز تھا...... اس کی معجزانہ قوتیں آج بھی زندہ ہیں ان کو برتنے اور استعمال میں لانے کی ضرورت ہے، آج اس کتاب ہدایت کو ہم نے سرد خانہ میں ڈال دیا ہے اور اس ہدایت و انقلاب والی کتاب کو صرف برکت والی کتاب میں تبدیل کر دیا ہے۔

ضرورت ہے کہ جائزہ لیا جائے کہ وہ کیا چیزیں تھیں جن کو برت کر ایک گئی گذری قوم اتنی آگے بڑھ گئی اور وہ کیا باتیں تھیں جن کو چھوڑ کر آسمان کی بلندیوں سے باتیں کرنے والی قوم پستی کی گہرائیوں میں چلی گئی؟ بقول ڈاکٹر اقبالؒ :

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

قرآن آج بھی قوموں اور افراد کو بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے، شخصیتوں کی تعمیر کا نسخہ آج بھی پوری طرح کارکرد ہے، قرآن کا دامن اس قسم کے شہ پاروں سے بھر پڑا ہے ہم ان میں سے بطور نمونہ چند کا تذکرہ کرتے ہیں۔

قوت ایمانی

جہاں تک میں نے قرآن کو پڑھا ہے قرآن نے سب سے زیادہ زور ایمان و یقین پر دیا ہے، کسی فرد یا قوم کی تعمیر میں سب سے بڑا رول اسی قوت ایمانی کا ہے، ایمان کا درجہ فرد یا قوم کی زندگی کے لئے روح کا ہے، یہ شخصیت کو زندگی اور زندگی کو توانائی بخشتا ہے، اس کے بغیر دنیا میں نہ کوئی پنپ سکتا ہے اور نہ ابھر سکتا ہے، شخصیت بنتی ہے اسی بنیاد پر، اس کو ہٹا کر کی جانے والی ہر کوشش خسارہ کا سودا ہے، جس کا تجربہ ہر دور میں چشم فلک اور سارے زمانے نے کیا ہے اور جس پر ماہ و سال کی گردشیں گواہ ہیں، قرآن کریم نے صدیوں کے اسی تجربہ پر تصدیق کی مہر لگائی ہے :

وَالْعَصْرِ . إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ . إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ . (العصر:۱-۳)

قسم ہے زمانے کی ، بے شک انسان گھاٹے میں ہے ،سوائے ایمان والوں کے
جنھوں نے نیک اعمال کئے ،ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی تلقین کی ۔

یہ سورت شخصیت سازی کے مسئلے میں سب سے مرکزی حیثیت رکھتی ہے ،اس سورہ کا موضوع ہی انسانیت کی تعمیر اور نفع ونقصان کے معیار کا تعین ہے ،قرآن پورے یقین کے ساتھ (اور قرآن کا ہر بیان یقینی ہوتا ہے) اور ہر قسم کے شک وشبہ کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو لوگ ایمان والے نہیں ہیں وہ گھاٹے میں ہیں اگر چہ کہ وہ بظاہر نفع میں دکھائی دیں اور اگر کوئی صاحب ایمان گھاٹے میں دکھائی دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اسے اپنے ایمان پر محنت کرنی چاہئے ،قرآن کریم نے ایسے ایمان والوں کو ہدایت کی ہے :یا ایھا الذین اٰمنوا آمنوا (النساء:۱۳۶) ''اے ایمان والو! تجدید ایمان کرو''۔

قرآن اور صاحبِ قرآن نے نزولِ قرآن کے آغاز سے پوری مکی زندگی صرف ایمان کی محنت پر گذاری اور عمل کی جگہ پر نماز اور تلاوت قرآن کے علاوہ کوئی حکم شرعی بندوں کو نہیں دیا گیا ، بندوں میں یہ یقین بنایا گیا کہ اصل چیز اللہ کی رضا ہے ،ساری محنت اسی لئے کی جانی چاہئے کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے ،اس لئے زندگی کے ہر مسئلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اللہ کی مرضی کیا ہے ،اللہ کی مرضی اور اس کا حکم جان لینے کے بعد پھر اپنی کوئی مرضی باقی نہیں رہ جاتی ،ارشاد باری تعالیٰ ہے :

إِنِ الْـحُـكْـمُ إِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ . (یوسف:۶۷)
فیصلہ صرف خدا کا چلے گا ،اسی پر میرا بھروسہ ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے ۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فأولئک ھم الفاسقون . (المائدۃ:۷)
اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق جو لوگ فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق ہیں ۔

مَـا كَـانَ لِـمُـؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُـولُـهُ أَمْراً أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ . (الاحزاب:۳۶)
جب اللہ اور اس کے رسول نے کسی قضیہ میں فیصلہ سنا دیا تو پھر کسی مؤمن مرد یا عورت کے لئے اختیار باقی نہیں رہ جاتا ۔

نماز اور تلاوتِ قرآن بھی اگر چہ کہ عمل کے درجہ کی چیز ہے؛ لیکن یہ بھی ایمان ہی کا تکملہ ہیں ،ایمان کو غذا ان ہی کے وسیلہ سے ملتی ہے ،خدا سے رابطہ کا یہی ذریعہ ہیں ،بندہ ان ہی واسطوں سے اپنے پروردگار سے ہم کلام

ہوتا ہے، یہ دونوں چیزیں عبد و معبود کے رشتے کو مضبوط کرتی ہیں، اس طرح گویا یہ بھی ایمان و یقین ہی کا حصہ ہیں۔

ایمان نام ہے دل سے مان لینے کا اور اسلام نام ہے سر تسلیم خم کر دینے کا، جس کو قرآن اتباع، اطاعت اور انقیاد وغیرہ کی اصطلاحات سے یاد کرتا ہے، قرآن اپنے ماننے والوں کا شروع سے یہ ذہن بناتا ہے کہ رب کے سامنے اپنے کو ہر طرح سرینڈر کر دینا ہی بندگی ہے، ایسے لوگوں کو قرآن رضوان الٰہی کا پروانہ دیتا ہے: رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ۔ (البینۃ:۸)

قرآن نے یہ فکر دی ہے کہ قوتوں کا سرچشمہ رب العالمین ہے، موت و حیات کے تمام مسائل کی ڈور اسی کے ہاتھ میں ہے، مال و اسباب صرف ظاہری ذرائع ہیں، نہ یہ کسی کو زندگی دے سکتے ہیں اور نہ کسی مسئلے کو بنا سکتے ہیں، فیصلے تمام تر احکم الحاکمین کے دربار سے ہوتے ہیں:

أَيَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ، كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ۔ (ہمزہ:۳-۴)

کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ہرگز نہیں یہ سارا مال جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

إِن يَنصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ۔ (آل عمران:۱۶۰)

اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر اللہ تمہیں رسوا کریں تو پھر اس کے بعد تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا، پس بھروسہ صرف اللہ پر کرنا چاہئے۔

اس طرح کی بے شمار آیات ہیں جن میں قرآن نے بندہ کا رشتہ پروردگار سے جوڑنے پر زور دیا ہے، اور جب بندہ کا تعلق اپنے رب سے ہو جاتا ہے تو دنیا کے سارے رشتے اس کے زیر سایہ چلے آتے ہیں، انسان میں خدا اعتمادی سے خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے، انسان کے دل میں اپنے پروردگار کی بنائی ہوئی ایک ایک چیز سے پیار جاگ جاتا ہے اور تمام وہ اچھی باتیں جو اللہ کو پسند ہیں وہ ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ہر ایسے کام سے ڈرتا ہے جس سے پروردگار ناراض ہوتا ہے، اس طرح انسان فضائل اخلاق کا پیکر، امن و محبت کا پیامبر اور خدا شناسی اور خود شناسی کا سنگم بن جاتا ہے، اس کو دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے، اس کی پیشانی میں خدا کا نور جھلکتا ہے، اس کے پاس بیٹھنے کو جی کرتا ہے، اس کی باتیں دل میں اترتی چلی جاتی ہیں، اس طرح ایک معیاری اور تعمیر پسند سوسائٹی کی بنیاد پڑتی ہے، تو انسان کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے بڑا حصہ ایمان و یقین کا ہے یہ نہ ہو تو ساری چیزیں کھوکھلی ہیں۔

حسن عمل

انسان کی شخصیت کی تعمیر میں دوسرا اہم ترین درجہ عمل صالح کا ہے، قرآن کریم نے سورۂ عصر میں اس کو دوسرے مقام پر رکھا ہے، جولوگ آرزوؤں اور خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں اور کام سے زیادہ منصوبے بنانے پر اپنے اوقات صرف کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا میں ان کی تعریف ہو، قرآن ان کو متوجہ کرتا ہے کہ اچھے کاموں کے بغیر دنیا یا آخرت میں کوئی اچھا انسان نہیں بن سکتا، اچھی شخصیت اچھے کاموں سے بنتی ہے، پھر اچھے اعمال کی ایک طویل فہرست ہے جو قرآن میں بکھری پڑی ہے، اہل علم ان سے بخوبی واقف ہیں، بطور نمونہ ایک دو آیات کا حوالہ دیتا ہوں :

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ،الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْن ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْن ...... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ . (المؤمنون:۱-۹)

بے شک وہ ایمان والے کامیاب ہیں جو اپنی نمازیں خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں، جو بیکار باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، جو زکوۃ ادا کرتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ...... جو اپنی امانتوں اور وعدوں کو پورا کرتے ہیں اور جو نماز کے پابند ہیں۔

سورہ بقرہ میں ہے :

لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَـكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِيْ الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِيْ الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوْا وَالصَّابِرِيْنَ فِيْ الْبَأْسَاءِ والضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولَـئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُولَـئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ . (البقرۃ:۱۷۷)

نیکی یہی نہیں ہے کہ اپنا رخ مشرق ومغرب کی جانب کرو؛ بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب اور نبیوں پر ایمان ہو اور (اعمال میں) مال

سے بے پناہ محبت کے باوجود اس کو اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں کے آزاد کرانے کے لئے خرچ کرے، نماز ادا کرے، زکوٰۃ دے، وعدہ کریں تو اس کو پورا کریں، مصیبت و تکالیف اور جنگ میں صبر و ثبات کا مظاہرہ کریں، یہی لوگ راست باز اور تقویٰ والے ہیں۔

سورہ فرقان میں ہے :

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً ، وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً ، وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً ، إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً ، وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَاماً ، وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللهِ إِلَٰهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً ، وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً ، وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمّاً وَعُمْيَاناً ، وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَاماً . (الفرقان:۶۳-۷۴)

اور اللہ کے نیک بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان کو مخاطب کرتے ہیں تو سلام کہہ کر گذر جاتے ہیں، جو راتوں میں اُٹھ کر پروردگار کے حضور سجدہ و قیام کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، جو کہتے ہیں: اے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور فرما، اس کا عذاب تو تاوان ہے اور وہ برا ٹھکانہ اور مقام ہے، جو خرچ میں نہ بخل کرتے ہیں اور نہ فضول خرچی کرتے ہیں؛ بلکہ اعتدال سے کام لیتے ہیں، جو اللہ کے علاوہ کسی معبود کو نہیں پکارتے، جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے، جس کو خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں اور جو ایسا کرے گا وہ بہت بڑا گنہگار ہوگا، اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے، اور جب کبھی لغویات سے گذرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہیں اور جب خدا کی آیات ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو جائیں اور یہ دُعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو

ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیز گاروں کا پیشوا بنا۔

اسی طرح سورہ شوریٰ، آل عمران، قصص، دہر، وغیرہ میں اعمال خیر کی تفصیل دی گئی ہے۔

موافق ماحول

تیسرا اہم ترین محرک اچھا ماحول ہے، جس کو قرآن نے "وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر" (اور ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی تلقین کریں) سے تعبیر کیا ہے اس لئے کہ جس سوسائٹی میں حق بات کہی اور سنی جاتی ہو اور جس کی بنیاد محض جذباتیت اور اشتعال کے بجائے صبر وتحمل اور ایک دوسرے کے لئے برداشت کے جذبہ پر ہو اس سے بہتر سوسائٹی دنیا میں کیا ہوسکتی ہے۔

انسان کی ذہنی تشکیل اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا حصہ ہے، انسان کو اگر اچھا ماحول اور موافق گردو پیش میسر آجائے تو اس کی شخصیت بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کرتی ہے بہتر ماحول علم وعمل کی کمی کی بھی مکافات کردیتا ہے، یعنی علم وعمل میں انسان نسبتاً کمتر ہو لیکن اسے موافق ماحول اور اچھی صحبت مل جائے تو علم وعمل کی کمی کے باوجود وہ اپنا مقام بنالیتا ہے، انسان کے آگے بڑھنے کے لئے ماحول سے بڑھ کر کوئی مددگار نہیں ہوتا علم وعمل کی تمام خوبیوں کے باوجود اگر انسان کو موافق ماحول اور بہتر مواقع میسر نہ ہوں تو اس کی ترقی وتعمیر میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی، علم وعمل کو ماحول ہی پروان چڑھاتا ہے، اسی لئے نماز، روزہ اور دیگر عبادات میں اللہ نے ماحول بنانے پر زور دیا ہے، یہ نماز باجماعت، رمضان کا اجتماعی روزہ، حج کا اجتماع، عید، جمعہ، کسوف، استسقاء وغیرہ کا اجتماع، یہ سب اسی لئے ہے کہ عمومی ماحول میں کوئی بڑا سے بڑا کام بھی آسان ہوجاتا ہے، اس طرح سوسائٹی کے اکثر افراد کو نیک کاموں کی توفیق ہوجائے تو ایک شاندار معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، قرآن کریم نے درج ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ. (آل عمران:۱۱۰)

تم ایک بہتر امت ہو جو اچھائیوں کی تلقین کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔

قرآن زندگی کے تمام معاملات میں اسی طرح کی وحدت کو پسند کرتا ہے، اور معاشرہ کی انارکی اور انتشار کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، آیت کریمہ ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعاً وَلاَ تَفَرَّقُوا. (آل عمران:۱۰۳)

اور خدا کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے پکڑلو اور باہم انتشار مت پیدا کرو۔

ایک جگہ ارشاد ہے :

وَأَطِيْعُوْا اللهَ وَرَسُوْلَهُ وَلاَ تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ . (انفال:۴۶)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ ہمت ہار بیٹھو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

قرآن چاہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ باہم محبت واخوت کی بنیاد پر ترقی کرے اور سب بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے مددگار رہوں :

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ. (الحجرات:۱۰)

سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں اس لئے اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔

قرآن حسب ونسب سے زیادہ دینی اخوت کا وکیل ہے :

فَإِن لَّمْ تَعْلَمُوْا آبَاءَ هُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ . (الاحزاب:۵)

اگر تم کو ان کے خاندان کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے بھائی اور اہل تعلق ہیں۔

حضور ﷺ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :

سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔(۱)

آج یہی چیز مسلم سوسائٹی سے ختم ہوگئی اور وہ رنگ ونسل، خاندان، علاقہ اور زبان کی تنگ نظریوں میں مبتلا ہوگئی اور انسان کی ترقی اور اس کی شخصی تعمیر کا راستہ مشکل ہوگیا۔

حسن ادب

اسلام میں ادب کی بڑی اہمیت ہے، ادب سے شخصیت میں نکھار ووقار اور زندگی میں جاذبیت اور محبوبیت پیدا ہوتی ہے، اگر بچہ میں شروع سے ادب کی عادت ڈالی جائے اور اچھے آداب اسے سکھائے جائیں تو وہ بڑا انسان بن سکتا ہے اور قوم وملت کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے، زندگی کے ہر مرحلے کے لئے قرآن نے ادب کا درس دیا ہے ہم بطور نمونہ دو تین چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں :

⊙ انسان جب ایک ساتھ رہتا ہے تو ایک دوسرے کے یہاں آنے جانے کی بھی ضرورت پڑتی ہے ایسے موقعہ پر اگر انسان حدود کی رعایت نہ کرے تو بہت سے فتنے پیدا ہوں گے، اس لئے قرآن نے اس کے لئے کچھ

---

(۱) صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ ج:۲/۳۸۹ مصر۔

حدود وآداب مقرر کئے ہیں ،مثلاً : اجازت لے کر جاؤ، نیز اجازت کا طریقہ یہ ہے کہ دروازہ سے باہر سلام کرو، دیکھئے آیتِ ذیل :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى أَهْلِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ . (النور:۲۷)

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں مت جاؤ مگر اجازت لے کر اور گھر والوں کو سلام کر کے ، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے تا کہ تم سبق حاصل کرو۔

⊙ اگر دوسرے کے گھر کی عورتوں سے کچھ لینا ہو تو اس کا ادب یہ بتایا گیا :

وَإِذَا سَأَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعاً فَاسْأَلُوْهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ . (الاحزاب:۵۳)

جب ان گھر والیوں سے کچھ مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو، اسی میں تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے پاکی ہے۔

⊙ آپس میں سلام کا ادب قرآن نے یہ بتایا کہ سلام کا جواب سلام سے بہتر ہونا چاہئے :

وَإِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا . (النساء:۸۶)

جب تم کو سلام کیا جائے تو اس کا جواب اور بہتر پیرایے میں دو، یا کم از کم اسی کو دہرادو۔

⊙ حضور ﷺ سے خصوصی ملاقات کے آداب پر روشنی ڈالتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ فَإِن لَّمْ تَجِدُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ . (المجادلۃ:۱۲)

اے ایمان والو! جب تم رسول سے اکیلے میں ملنا چاہو تو پہلے صدقہ کرو، اس میں تمہارے لئے خیر اور پاکیزگی ہے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اللہ بخشنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

اس حکم کا ایک مخصوص پس منظر تھا جو کچھ دنوں کے بعد ختم کر دیا گیا؛ لیکن فی الجملہ اس سے بڑوں کے دربار میں جانے کے آداب پر روشنی پڑتی ہے اور چھوٹوں کو کیا تیاری کرنی پڑتی ہے اس کی حسیت جھلکتی ہے، اوراس سے چھوٹوں میں کچھ کرنے کا جذبہ بھی بیدار رہتا ہے۔

⊙ حضور ﷺ سے گفتگو کے آداب پر قرآن نے بتایا کہ آپ سے عام لوگوں کی طرح گفتگو نہ کرو بلکہ اس

کا دھیان رکھو کہ تمہاری آواز نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ ہونے پائے :

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ ۔ (الحجرات:۲)

اے ایمان والو! اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز سے اونچی نہ کرو۔

آپ کو مخاطب کرنے کا ادب قرآن نے یہ بتایا کہ عام لوگوں کی طرح نام لے کر نہ آواز دو؛ بلکہ آپ کے شایان شان القاب کا استعمال کرو :

لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضاً ۔ (النور:۶۳)

رسول ﷺ کو اس طرح نہ پکارو جس طرح باہم لوگوں کو پکارتے ہو۔

⊙ کسی مجلس میں ہو تو آپس میں کانا پھوسی کرنے کو خلاف ادب قرار دیا گیا ارشاد باری تعالیٰ ہے :

إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّیْطَانِ ۔ (المجادلۃ:۱۰)

کانا پھوسی کرنا شیطان کا کام ہے۔

⊙ عائلی زندگی میں ایک ساتھ رہتے ہوئے بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں اور کبھی ایک کی بات دوسرے کو پسند نہیں آتی، اس تعلق سے قرآن نے ادب کی تلقین کی :

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰی أَنْ تَكْرَهُوْا شَیْئاً وَیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْراً كَثِیْراً ۔ (النساء:۱۹)

بیویوں کے ساتھ معروف طریقے پر زندگی گذارو، اگر تم کو وہ پسند نہ آئیں تو یہ بھی ممکن ہے کہ ایک چیز تم کو اچھی نہ لگے اور اللہ نے اس میں بہت خیر رکھی ہو۔

اسی بات کو ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا :

اپنی بیویوں میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری بات اچھی نکل آئے گی۔(۱)

⊙ زمین پر چلنے کا ادب بتایا گیا :

وَلَا تَمْشِ فِی الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلاً ۔ (بنی اسرائیل:۳۷)

زمین میں اکڑ کر نہ چل کہ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری و مسلم، کتاب النکاح، باب الوصیۃ بالنساء۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَلَا تَمۡشِ فِی الۡأَرۡضِ مَرَحاً إِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ۔ (لقمان:۱۸)

زمین میں اکڑ کر نہ چل بیشک اللہ کسی مغرور اور متکبر کو پسند نہیں کرتا۔

⊙ گفتگو کا سلیقہ بتایا گیا کہ نرمی اور ملائمت کے ساتھ اور سامنے والے کی عزت نفس کا خیال کرتے ہوئے بات کی جائے، ارشاد ہے :

فَقُوۡلَا لَہٗ قَوۡلاً لَیِّناً ۔ (طٰہٰ:۴۴)

ان سے نرمی کے ساتھ بات کرو۔

وَاغۡضُضۡ مِن صَوۡتِکَ إِنَّ أَنکَرَ الۡأَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ ۔ (لقمان:۱۹)

پست آواز میں بات کرو اس لئے کہ سب سے بری آواز گدھے کی ہے۔

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَمَغۡفِرَۃٌ خَیۡرٌ مِّن صَدَقَۃٍ یَتۡبَعُھَا أَذًی ۔ (البقرۃ:۲۶۳)

اچھی بات کہنا اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

اس طرح قرآنی آداب کی بے شمار مثالیں ہیں، یہاں صرف بطور نمونہ چند چیزیں پیش کی گئی ہیں۔

تزکیہ

شخصیت کی تعمیر کے لئے تزکیہ کی بھی شدید ضرورت ہے، قرآن کریم نے ایسے شخص کی کامیابی کی ضمانت دی ہے جس نے اپنا تزکیہ کیا :

قَدۡ أَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰھَا ۔ (الشمس:۹)

جس نے اپنا تزکیہ کیا وہ یقیناً کامیاب ہو گیا۔

قرآن کریم نے فرائض رسالت میں اس کو شمار کیا ہے :

یَتۡلُوۡ عَلَیۡھِمۡ آیَاتِہٖ وَیُزَکِّیۡھِمۡ ۔ (آل عمران:۱۶۴)

رسول ﷺ ان کو خدا کی آیات سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔

تزکیہ کا مطلب ہے اصلاح قلب اور اصلاح باطن، جب تک انسان کا باطن درست نہیں ہوتا ظاہری وضع داری سے کچھ نہیں ہوتا؛ بلکہ باطن کے فساد کے ساتھ دکھاوے کا تقوی نفاق کو جنم دیتا ہے، اور اس سے شخصیت بننے کے بجائے اور بگڑ جاتی ہے، دورخاپن انسانیت کے لئے بدترین لعنت ہے، قرآن اور صاحب قرآن نے اصلاح باطن پر بہت زیادہ توجہ دی ہے، اور ایمان کو دل ونگاہ میں راسخ کرنے کی تلقین کی اور اس کے لئے خوف خدا، آخرت کی

جواب دہی، جہنم کا ڈر اور دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی کے حوالے دیئے ہیں اور دکھاوے کے ہر عمل پر وعید سنائی ہے، نماز بہت بڑی عبادت ہے؛ لیکن غفلت و ریا کے ساتھ ادا کی جائے تو ثواب کے بجائے گناہ بن جاتی ہے :

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ، الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ، الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَاۤءُوۡنَ ، وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ . (الماعون:۴-۷)

ان نمازیوں کے لئے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں اور محض دکھانے کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔

إِنَّ الۡمُنَافِقِيۡنَ يُخَادِعُوۡنَ اللهَ وَهُوَ خَادِعُهُمۡ وَإِذَا قَامُوۡا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوۡا كُسَالَى يُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَلَا يَذۡكُرُوۡنَ اللهَ إِلَّا قَلِيۡلاً. (النساء:۱۴۲)

منافقین خدا کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ خود دھوکہ میں مبتلا ہیں، یہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، محض لوگوں کو دکھانے کے لئے اور اللہ کو بس برائے نام ہی یاد کرتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيۡنَ آمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقَاتِكُم بِالۡمَنِّ وَالأَذَى كَالَّذِيۡ يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِاللهِ وَالۡيَوۡمِ الآخِرِ . (البقرۃ:۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر یا ایذا پہنچا کر ضائع مت کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔

- دورخاپن کو قرآن نے منافقوں کی خاص عادت قرار دیا ہے :

وَإِذَا لَقُوۡا الَّذِيۡنَ آمَنُوۡا قَالُوۡا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوۡا إِلَى شَيَاطِيۡنِهِمۡ قَالُوۡا إِنَّا مَعَكُمۡ إِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِئُوۡنَ . (البقرۃ:۱۴)

اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور جب اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے لئے احادیث میں بھی شدید وعیدیں آئی ہیں :

ایک حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن خدا کے نزدیک سب سے بدتر دورخے شخص کو پاؤ گے جو کچھ

لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور (۱) ایک اور حدیث میں ہے: ''دنیا میں جس شخص کے دورخ ہونگے قیامت کے دن اس کے منھ میں دو زبانیں ہوں گی'' (۲) ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ ہم لوگ امراء و حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور وہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں، بولے: ہم لوگ عہد رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔ (۳)

⊙ انسان کے باطنی امراض میں بدگمانی خطرناک مرض ہے، ایسے شخص کو کبھی سکون نہیں ملتا اور نہ دوسروں کو سکون سے رہنے دیتا ہے، قرآن اس کو بڑا گناہ قرار دیتا ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ . (الحجرات:۱۲)

اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی سے بچا کرو بیشک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح بدگمانی سے بچنا ضروری ہے، اسی طرح بدگمانی کے مواقع سے خود کو بچانا بھی ضروری ہے، ایک دفعہ حضور ﷺ اعتکاف میں تھے، رات کو ازواج مطہرات میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں، آپ ﷺ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری صحابی آ گئے، وہ آپ کو دیکھ کر واپس پھرنے لگے، آپ نے فوراً آواز دی اور فرمایا: ''یہ میری بیوی فلاں ہیں'' انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر مجھے بدگمانی ہی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا: ''شیطان انسان کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے''۔ (۴)

⊙ باطنی بیماریوں میں ایک بڑی بیماری بخل ہے، قرآن نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے، ارشاد فرمایا:

وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْراً لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ . (آل عمران:۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے روکے رکھتے ہیں وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے، جس مال کو بچانے کے لئے وہ بخل کے شکار ہیں وہ ان کے گلے میں طوق بنا کر لٹکا دیا جائے گا۔

---

(۱) بخاري، كتاب الادب، باب ماقيل في ذي الوجهين۔

(۲) ابوداؤد، كتاب الادب، باب ذي الوجهين۔

(۳) صحيح بخاري، باب ماقيل في ذي الوجهين۔

(۴) صحيح مسلم، باب انه يستحب لمن رؤى خالياًبامرأة يقول هذه فلانة۔

اس مضمون کی بہت سی آیات قرآن میں موجود ہیں طوالت کے خوف سے ترک کرتا ہوں۔

اسی طرح حرص وطمع ،حسد و بے ایمانی ،غیظ وغضب ،بغض وکینہ ،فخر وغرور ،خود بینی وخود نمائی اور خود رائی وغیرہ بہت سے اندرونی امراض ہیں ،جن کا تعلق انسان کے دل ودماغ سے ہے ،جن کا قرآن نے خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے اور انکی اصلاح پر زور دیا ہے ،طوالت کے ڈر سے صرف آیات کے حوالے پر اکتفا کرتا ہوں۔

دیکھئے : نساء :۹،حشر :۱،حجر :۶،نساء :۵،کہف :۱۰،بقرہ :۳۲،نساء :۱،اعراف :۲۴،حشر :۱،حجر :۴ ،اعراف : ۲،۴-۵ ،ابراہیم :۳،مومنون :۳،ہود :۳،مومن :۴،نحل :۳ ،بنی اسرائیل :۴،لقمان :۲،نساء :۸،بقرۃ :۱۳،وغیرہ۔

تعلیم

شخصیت سازی کے لئے جس طرح عملی زندگی میں ادب واخلاق ،صلاح وتقویٰ ،کردار کی بلندی ،دل ونگاہ کی پاکیزگی اور لب ولہجہ کی شائستگی ضروری ہے ،وہیں تعلیم وتربیت اور فکری بالیدگی کی بھی شدید ضرورت ہے ،کہ اس سے زندگی میں دوام اور شخصیت میں آفاقیت پیدا ہوتی ہے ،اور انسان دوررس نتائج کے حامل کارناموں کو انجام دینے کے قابل ہو جاتا ہے ،اسی لئے قرآن پاک نے جہاں نبی کریم ﷺ کے فرائض منصبی پر روشنی ڈالی ہے وہاں ایمان واخلاق کے بعد تعلیم کا تذکرہ کیا گیا ہے :

> لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوْا مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلالٍ مُّبِين . (آل عمران:۱۶۴)
>
> خدا نے اہل ایمان پر بڑا احسان کیا کہ ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں ،کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں ،جبکہ پہلے یہ لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

یہ آیت کریمہ فرائض رسالت اور کارہائے نبوت کے سلسلے میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اس میں قرآن کریم نے کار نبوت کی تمام تفصیلات کو صرف تین عنوانات کے تحت سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

(۱) تلاوت آیات۔

(۲) تزکیۂ اخلاق وعمل۔

(۳) تعلیم کتاب وحکمت۔

⊙ تلاوت آیات میں : بنیادی تعلیم (جس کو قرأت بھی کہہ سکتے ہیں)اور ایمان ویقین کی آبیاری

اور محنت کی ساری تفصیلات داخل ہیں، اس لئے کہ شخصیت کی ابجد قرأت سے شروع ہوتی ہے اور اسی راستے سے قلب وروح میں ایمان اور عقیدہ کا تخم پڑتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں رسوخ حاصل ہوتا ہے؛ اسی لئے وحی کا پہلا سبق اس طرح شروع کیا گیا :

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ (العلق:۱-۲)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا۔

عبد اور معبود کے درمیان رابطہ اور تعلق کی جتنی تفصیلات ہیں وہ بھی تلاوت آیات کے ضمن میں آتی ہیں، اس لئے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور خدا کا کلام پڑھنا گویا اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرنا ہے، رابطہ کی ابتدا بھی یہی ہے اور انتہا بھی یہی؛ اسی لئے پوری مکی زندگی میں جس کو ہم مختصر لفظوں میں ایمانی دور کہہ سکتے ہیں، اس میں کلمۂ ایمان اور نماز اور تلاوت کے ماسوا کوئی حکم شرعی (اعمال کی قبیل سے) ہم کو نہیں ملتا، اور یہ سب رابطۂ الٰہی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا آیت بتاتی ہے کہ ایمان یعنی اللہ اور بندے کے تعلق پر محنت فرائض نبوت کی پہلی منزل ہے، اور انسان کی شخصیت کی تعمیر میں بھی اس کا درجہ اولین ہے، جیسا کہ گذشتہ سطور میں ہم عرض کر چکے ہیں۔

⊙ دوسرا مرحلہ تزکیہ ہے، اس کی اہمیت پر ہم پچھلے صفحات میں گفتگو کر چکے ہیں۔

⊙ تیسرا اور آخری مرحلہ تعلیم و تفکیر ہے، یہی چیز نبی آخر الزماں ﷺ کو تمام نبیوں اور رسولوں میں امتیاز بخشتی ہے، یہی آپ کا نسخۂ انقلاب ہے، یہی بات اس آخری امت کو امت وسط بناتی ہے، یہی دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ کا حاصل ہے، یہ ختم نبوت کی علامت ہے، اسی سے حضور خاتم النبیین ﷺ کے بعد اس امت کی بقا وابستہ ہے اور یہی چیز افراد و اقوام کو زندگی کی ضمانت فراہم کرتی ہے، کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور اس میں خدا کی وہ کتاب بھی شامل ہے جو وسیع کائنات میں چہار طرف پھیلی ہوئی ہے، خود قرآن کریم بھی بار بار انسانوں کو خدا کی اس کھلی کتاب کی طرف متوجہ کرتا ہے اور عہد گذشتہ کے واقعات سے عبرت آموز تأثر پیدا کرتا ہے :

أَفَلَا یَنظُرُوْنَ إِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ، وَإِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ،
وَإِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ، وَإِلَی الْأَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ، فَذَکِّرْ إِنَّمَا
أَنتَ مُذَکِّرٌ ، لَّسْتَ عَلَیْهِم بِمُصَیْطِرٍ ۔ (الغاشیۃ:۱۷-۲۲)

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کیسے پیدا کئے گئے، آسمان کس طرح اٹھائے گئے، پہاڑ کس طرح نصب کئے گئے، اور روئے زمین کیسے پھیلائی گئی، آپ ان کو سمجھائیں، آپ ناصح اور سمجھانے والے ہیں، ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔

اس طرح کی بیشمار آیات قرآن کریم میں موجود ہیں، بطور نمونہ یہ ایک کافی ہے، قرآن اس نئے دور میں علم وعرفان اور فکر وفلسفہ کا بانی ہے، پہلے کبھی علم کو وہ درجہ نہیں دیا گیا جو اسلام میں دیا گیا، اسی لئے پہلے کی تاریخوں میں وہ آفاقی شخصیتیں بھی نہیں ملتیں جو عہد اسلامی کے آغاز کے بعد ملتی ہیں، قرآن نے دنیا کو نیا ذہن اور نئی فکر دی، اشیاء کے حقائق اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کی طرف ذہنوں کو متوجہ کیا، اور ان کو علم وعرفان اور ظلم وجہل کا فرق بتایا، علم کے نور سے شخصیتوں میں چار چاند لگائے، اور انسانوں کو ایک نئے علمی دور کے لئے تیار کیا، یہ قرآن کا وہ معجزانہ کارنامہ ہے جو اسلام سے قبل کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

ہم اس موقع پر قرآن کے انداز تربیت، ذہنی ارتقا کے مراحل اور کچھ علمی نکات کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جس سے اندازہ ہوگا کہ قرآن علم کی بنیاد پر افراد واقوام کو کس طرح تیار کرتا ہے، اور قرآنی تعلیمات کی بدولت ایک عام انسان کس طرح بڑے کارناموں کے لائق ہو جاتا ہے۔

ذہن سازی

قرآن نے ایمان وعمل کے بعد انسان کو علم وجہل، نور وظلمت اور تمدن ووحشت کا فرق سمجھایا، اس لئے کہ ذہنی تیاری کے بغیر کوئی نصب العین پورا نہیں ہوسکتا، جب تک انسان کو خیر وشر میں امتیاز نہ ہوگا وہ شعوری طور پر خیر کو نہیں اپنا سکے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوْا الْأَلْبَابِ . (الزمر:۹)

اے نبی ! آپ کہہ دیجئے کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو نہیں رکھتے ہیں ، برابر ہو جائیں گے؟ عقل والے ہی بات سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن نے اس قوم کی ترقی کی ضمانت دی جو علم ومعرفت کے راستے پر گامزن ہو :

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوْا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ . (مجادلۃ:۱۱)

اللہ تم میں سے ایمان والوں کے اور اہل علم کے درجات بلند کرتے ہیں۔

قرآن نے عقل وفکر سے جاہلانہ جمود ختم کرنے کے لئے آفاق وانفس میں غور کرنے کی دعوت دی :

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُوْلِي الْأَلْبَابِ ، الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَاماً وَقُعُوْداً وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ

فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ . (آل عمران:۱۹۰،۱۹۱)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور شب و روز کی گردش میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے ، جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے ،اور کروٹ پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی خلقت میں ، (پھر بول اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب !تو نے یہ سب بلاوجہ پیدا نہیں کیا ،تو ہر عیب سے پاک ہے ،ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

دعوت انقلاب

جب قرآن نے محسوس کیا کہ اب اس قوم کی حسیت جاگ اٹھی ہے اور اس کی قوت فکریہ اپنی پرواز کے لئے کسی وسیع خلا کو ڈھونڈ ھ رہی ہے ،تو فوراً اس نے انقلاب اور حرکت وعمل کی دعوت دی ،اور اس کو سمجھایا گیا کہ دنیا میں انقلابات عدم کے پیٹ سے وجود میں نہیں آ جاتے ، بلکہ اس کے لئے زبردست محنت کرنی پڑتی ہے ،زندہ قوم اپنی تقدیر کے فیصلے اپنے عزم کے ہاتھوں لکھتی ہے ،وہ امکانات اور وسائل کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا گوارا نہیں کرتی ؛ بلکہ ناممکنات سے امکانات اور مشکلات سے آسانیوں کو فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے ،وہ حالات کے بدلنے کا انتظار نہیں کرتی ؛ بلکہ دست ہمت سے وہ حالات کا رخ پلٹ دیتی ہے اور اندھیریوں سے ڈر کر وہ اپنا سفر موقوف نہیں کرتی ؛ بلکہ احکام الٰہی کے چراغ اندھیرے راستوں پر جلاتی ہوئی چلی جاتی ہے :

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْءً ا فَلاَ مَرَدَّ لَهُ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهِ مِنْ وَالٍ . (الرعد:۱۱)

بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل ڈالے ، اور جب اللہ کسی قوم کو برے دن دکھانے کا ارادہ فرماتا ہے تو پھر اسے کوئی ٹال نہیں سکتا ،اور اللہ کے سوا ایسوں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوسکتا :

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

قرآن نے قوموں کے خیر وشر کا مدار خود اس کے اپنے اعمال پر رکھ دیا ہے، جو قوم یہ کہتی ہو کہ کیا کریں حالات اور قسمت نے ہمیں پیچھے کر دیا؟ وہ درحقیقت اپنی بزدلانہ کم ظرفی کا اظہار کرتی ہے، قرآن کہتا ہے کہ جو قوم جیسا عمل کرتی ہے اس کے ساتھ قدرت کا فیصلہ اسی کے مطابق ہوتا ہے :

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ ، وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ . (الزلزال:۷-۸)

جو ذرہ برابر بھی نیک عمل کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بُرا عمل کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

قرآن نے صاف طور پر اس قوم کو خسارہ کا سودا کرنے والی قرار دیا ہے، جس میں نور باطنی کے ساتھ ساتھ اخلاق وعمل کی اسپرٹ موجود نہ ہو اور قرآن اس کے لئے تاریخ عالم اور حوادث روزگار کو بطور شہادت پیش کرتا ہے جیسا کہ سورۃ العصر کے حوالہ سے پچھلے سطور میں عرض کیا گیا۔

انقلابی ہدایات

یہ کسی قوم کو تدریجی انقلاب کی طرف لانے کے لئے قرآن کے طرز تعلیم کا دوسرا مرحلہ تھا فکر وعمل کی پیہم تاکیدات کے بعد جب یہ قوم کسی عمل کے لائق ہوگئی اور علم وفن، تہذیب وتمدن اور تجارت وسیاست کے میدان میں اترنے کے قابل ہوگئی تو اس کو کچھ اشارات دیئے گئے، ہدایات واحکام سے نوازا گیا، اسرار عالم سے پردہ اٹھایا گیا، عقل وخرد اور فکر وفن کے وہ راز بتائے گئے جو آج تک کسی مصلح قوم نے اپنی قوم کو نہ بتائے تھے اور خود خالق کائنات نے اپنی دنیا کے بعض حقائق وعلل کی نشاندہی کی جس کی روشنی میں چل کر آج دنیا فلسفۂ جدید اور سائنٹفک دور تک پہنچی، حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے جس کتاب الٰہی نے فکر وفلسفہ کی بنیاد ڈالی اور لوگوں کو آسمان وزمین اور مخلوقات عالم میں غور کرنے کی دعوت دی وہ قرآن تھا، قرآن سے قبل کسی بڑے سے بڑے آشنائے راز نے بھی ان حقائق کا پردہ چاک نہ کیا جو خدا کے خزانۂ غیب میں مستور تھے، اس طرح گویا قرآن ہی کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ فکر وفن کی بھی پہلی کتاب ہے...... مگر افسوس کہ خود ہم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اور غیروں کے کاسہ گیر ہو کر رہ گئے :

دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہوگیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

زبان وقلم کی ضرورت

قرآن نے عہد جدید کی تخلیق کے لئے زبان وقلم پر زور دیا، اس لئے کہ عالم الغیب والشہادۃ خوب جانتا تھا کہ اب جو دور آنے والا ہے وہ سائنٹفک دور ہوگا، وہ خود اس نئے دور کی بنیاد رکھ رہا تھا، اور سائنٹفک دور زبان وقلم پر تعمیر ہوگا، ...... چنانچہ سب سے پہلی وحی جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی اس کے الفاظ یہ تھے :

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ، الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ . (العلق:۱-۴)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو بستہ خون سے، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔

قرآن میں ایک پوری سورت ہی قلم کے نام سے ہے اس سورہ کی ابتدا ہی میں اللہ نے قلم اور لکھنے کی قسم کھائی ہے، جو قرآنی اسلوب میں قلم کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَایَسْطُرُوْنَ (القلم:۱) ''قلم کی قسم اور اس کی جو لوگ لکھتے ہیں''۔

ایک طرف قرآن نے مسلمانوں کو زبان وقلم کی جانب متوجہ کر کے ان کو ذرائع ابلاغ وترسیل سے نوازا، تو دوسری طرف رموز کائنات کے تعلق سے بعض ایسے اشارات دیئے جن سے قوت فکر کو مہمیز ملتی ہے، مثال کے طور پر میں چند آیات کا تذکرہ کرتا ہوں۔

ظواہر طبیعی

قرآن نے بعض آیات میں ان اسباب طبعی کی کرشمہ سازیوں کا ذکر کیا ہے جو اکثر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں، مگر جمود یا غفلت کی بنا پر وہ ان میں غور نہیں کرتے اور نہ ان سے کوئی سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں :

أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَداً رَّابِياً وَمِمَّا يُوقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ . (الرعد:۱۷)

آسمان سے پانی اس نے برسایا، پھر ندی نالے اپنی اپنی گنجائش کے مطابق بہہ نکلے، اور پانی کے ریلے نے ابھرتے ہوئے جھاگ کو اوپر اٹھالیا اور آگ میں تپا کر زیور

بناتے وقت یا کام کی دوسری کوئی دھات کو بھٹی میں پگھلایا جاتا ہے اس میں بھی ایسا ہی جھاگ اٹھ کر اوپر آجاتا ہے، اسی طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کرتے ہیں، تو جو کوڑا کرکٹ ہوتا ہے وہ سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے اور لوگوں کے نفع کی چیز زمین میں رہ جاتی ہے اسی طرح اللہ سچی مثالیں بیان کرتا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْئٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ . (الانبیاء:۳۰)

کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین دونوں بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے؟

اس آیت میں زمین و آسمان کی ابتدائی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جس کو موجودہ زمانے میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے، جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق زمین و آسمان کا تمام مادہ ایک بہت بڑے گولے (سپر ایٹم) کی شکل میں تھا، معلوم طبیعاتی قوانین کے تحت اس وقت اس کے تمام اجزاء اپنے اندرونی مرکز کی طرف کھینچ رہے تھے اور انتہائی شدت کے ساتھ باہم جڑے ہوئے تھے، پھر نامعلوم اسباب کی بنا پر اس گولے کے اندر ایک دھماکہ ہوا اور اس کے تمام اجزاء بیرونی سمتوں میں پھیلنے لگے، اس طرح بالآخر یہ وسیع کائنات وجود میں آئی، جو آج ہمارے سامنے ہے:

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجاً سُبُلاً لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ، وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفاً مَّحْفُوظاً وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ . (الانبیاء:۳۱،۳۲)

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے کہ وہ ان کو لیکر جھک نہ جائے اور اس میں ہم نے کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پائیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا، اور وہ اس کی نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں۔

اس آیت میں زمین کی چند نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں ایک پہاڑوں کے سلسلے ہیں جو سمندروں کے نیچے کے کثیف مادہ کو متوازن رکھنے کے لئے سطح زمین پر ابھر آئے ہیں، اس سے مراد غالباً وہی چیز ہے جس کو سائنس جدید میں ارضی توازن (Isostasy) کہا گیا ہے، اسی طرح زمین کا اس قابل ہونا بھی ایک بڑی نشانی ہے کہ اس میں انسان اپنے لئے راستے بنا سکتا ہے، زمین کہیں ہموار ہے تو کہیں پہاڑی درے اور کہیں دریائی شگاف ہیں۔

اسی طرح آسمان کا محفوظ چھت ہونا بھی بہت بڑی نشانی ہے کہ آسمان اور اس کے ساتھ پھیلی ہوئی پوری فضا

کی ترکیب اس طور پر ہے کہ وہ ہم کو سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے بچاتی ہے اور شہاب ثاقب کی یورشوں سے محفوظ رکھتی ہے :

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنَ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ، وَآتَاكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللهِ لاَ تُحْصُوْهَا إِنَّ الإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ . (ابراہیم:۳۳-۳۴)

اور سمندر میں کشتیاں تمہارے تابع کردیں جو اس کے حکم سے چلتی ہیں اور بہتی ہوئی ندیوں اور نہروں کو تمہارے لئے کام میں لگادیا اور سورج اور چاند کو تمہاری ضرورتوں کی تکمیل کے مقرر کیا جو ایک ضابطہ پر مسلسل چل رہے ہیں، اور رات اور دن کو بھی تمہارے کام میں لگادیا اور تمہاری ضرورتوں کے ہر ایک سوال کو اس نے پورا کیا، اور اللہ کی نعمتوں کو اگر تم گننا چاہو تو گنتی کا شمار پورا نہ کرسکو گے، بیشک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

اس آیت میں قرآن نے تسخیر کائنات کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے اور پہلی بار اس راز سے پردہ اٹھایا کہ دنیا کی یہ تمام چیزیں انسان کی خدمت گذار ہیں، ان کا درجہ انسانوں سے بالاتر نہیں بلکہ فروتر ہے، اسلام سے قبل انسان نادانی کی بنا پر وسیع کائنات کی عظیم الشان مخلوقات سے اتنا مرعوب تھا کہ ان کی پرستش میں اپنی خیر محسوس کرتا تھا، سب سے پہلے قرآن نے اس مرعوبیت کا خاتمہ کیا اور انسان کو اس کا مقام یاد دلایا :

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوْهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِيْنَ . (الحجر:۲۲)

بوجھل اور رس بھری ہوا کے جھونکے بھیج کر ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر تم کو خوب سیراب کیا جبکہ تم اپنی ضرورت کے مطابق پانی کا خزانہ جمع نہیں رکھ سکتے تھے۔

اس آیت کی کسی دقیق علمی تفسیر سے گریز کرتے ہوئے اگر ظاہری معنی ہی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ظواہر طبیعی کے چند مہمات پر روشنی پڑتی ہے، آیت میں تو بظاہر ہوا کا فائدہ بیان کیا گیا ہے کہ ہواؤں کے چلنے سے ابر باراں کا نزول ہوتا ہے، مگر قدرتی طور پر یہاں ابر و باد کے رشتہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ہوا چلنے سے بادلوں کا سفر

شروع ہوتا ہے، اس سفر کے دوران بادلوں کے درمیان تصادم ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں کڑک اور اس کے ساتھ ہی بجلی پیدا ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد بارش کی فیاضی شروع ہوتی ہے...... اس طرح صرف اس ایک آیت سے کڑک، بجلی کی چمک اور بارش کے نزول کے بارے میں کتنے سائنسی نکتے معلوم ہو جاتے ہیں...... بلکہ یہیں سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ بجلی کی تخلیق مثبت اور منفی اثرات کے آپس تصادم سے ہوتی ہے، اس انکشاف سے انسانی عقل اس حقیقت تک پہنچی جو آج ہمارے پاس الیکٹرک نظام کی شکل میں موجود ہے۔

چند علمی حقائق

قرآن میں جہاں ظاہر بینوں اور عام عقل والوں کی ہدایت و روشنی کے لئے ظواہر طبیعی سے استدلال کیا گیا ہے، وہیں اہل نظر اور ارباب علم و عقل کے لئے دقیق علمی و تکوینی نکات سے بھی بحث کی گئی ہے،...... صحیح ہے کہ قرآن کوئی فلسفہ و سائنس اور فنون لطیفہ کی کتاب نہیں؛ بلکہ یہ اصل میں کتاب ہدایت ہے، جس کا مقصد ساری انسانیت کو محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر جمع کرنا ہے مگر چونکہ یہ ایک کامل و مکمل کتاب ہے اور ہر دور کے لئے کافی رہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہے، اس بنا پر اس میں عام عقلی و بدیہی استدلالات سے لیکر دقیق سائنسی حقائق سے بھی تعرض کیا گیا ہے؛ تاکہ ہر قسم کا مذاق رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہتر غذا مہیا کر سکے، ہمارے محققین نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے، اس لئے تفصیل کے لئے ان ہی کی طرف مراجعت کی جائے...... میرا مقصد صرف کرگسوں میں پلے ہوئے شکست خوردہ شاہینوں کو یہ بتانا ہے کہ جس علم وفن کی تلاش اور جس آب حیات کی جستجو میں وہ مغرب کے بتکدوں کی خاک چھان رہے ہیں وہ خود ان کے گھر میں موجود ہے، مغرب انہیں علم وفن کی بعض جزئیات سے آگاہ کر سکتا ہے اور آب حیات کے چند قطرات فراہم کر سکتا ہے...... جب کہ خود ان کے گھر میں علم وفن کی کلیات پر مشتمل کتاب (قرآن) موجود ہے، وہ ایک قطرۂ آب کے لئے پریشان ہیں حالانکہ خود ان کے مذہب کی سلسبیل سے چشمۂ حیات بہہ رہا ہے وہ یورپ کے آشیانوں میں شاہبازی کے آداب سیکھنے جا رہے ہیں، جب کہ قرآن ان کو اس سے بدرجہا بہتر طور پر سکھانے کو تیار ہے، بشرطیکہ وہ اس پر توجہ دیں:

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ ورسم شاہبازی

اس ضمن میں چند نمونے پیش کرتا ہوں۔

سورج کے بارے میں قرآنی تصور

سورج کے بارے میں قرآن کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنے مدار میں گردش کرتے ہوئے اپنی مقررہ منزل کی

جانب رواں دواں ہے :

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ، وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ، لَا الشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَهَا أَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَکُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَسْبَحُوْنَ . (یٰسین:۳۸-۴۰)

اور سورج اپنے ٹھکانہ کی طرف چل رہا ہے، یہ عزیز وعلیم پروردگار کا مقرر کردہ نظام ہے اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کردی ہیں یہاں تک کہ وہ لوٹ کر کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہوجاتا ہے، نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے، سب آسانی سمندر میں تیر رہے ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے سورج کی حرکت کے بارے میں کتنا دوٹوک نظریہ دیا ہے .....مگر سائنس کی حیرانی وپریشانی دیکھئے کہ ایک زمانہ میں سائنس یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ سورج اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے اور زمین اپنے محور پر گردش کررہی ہے اور اسی سے لیل ونہار وجود میں آرہے ہیں، مگر کچھ ہی دنوں کے بعد حقائق نے یہ ثابت کردیا کہ یہ نظریہ غلط تھا اور صحیح نظریہ یہ ہے کہ سورج بھی اپنے مدار پر گردش کررہا ہے.....مغربی سائنس دانوں نے اس انکشاف کو جو اہمیت دی اس کا اندازہ ایک مشہور ماہر فلکیات محقق ''سیمون'' کی کتاب کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے :

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ سب سے اہم ترین حقیقت کیا ہے جس کا انکشاف انسانی عقل نے کیا ہے تو میں اس کے جواب میں سورج، چاند اور ستاروں کے نام لوں گا جن کے بارے میں یہ انکشاف کیا گیا کہ یہ سب بسیط فضا میں گول گنبد کی طرح بڑی تیزی کے ساتھ گردش کررہے ہیں جو ہمارے احساس سے بالاتر ہے۔(۱)

کواکب کے بارے میں قرآنی نظریہ

کواکب وسیارات کے بارے میں قرآنی نظریہ یہ ہے کہ وہ آسمان کی نچلی سطح کو خوبصورت بھی بناتے ہیں اور مضر اثرات اور طاغوتی یورشوں سے حفاظت کا کام بھی کرتے ہیں :

إِنَّا زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْکَوَاکِبِ ، وَحِفْظاً مِّنْ کُلِّ شَیْطَانٍ مَّارِدٍ ،

(۱) مضمون جریان الشمس، عبدالرحمٰن فرتاس، مجلّہ العلم والایمان ۱۹۷۶ء۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ، دُحُوْراً وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ، إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ . (الصافات:۶-۱۰)

ہم نے آسمان دنیا کو زرق برق ستاروں سے سجایا، اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کیا، وہ ملأ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگا سکتے اور ہر طرف سے مارے جاتے ہیں تاکہ ان کو بھگایا جائے اور ان کے لئے ایک دائمی عذاب ہے، مگر جو شیطان کوئی بات اچک لے تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔

زمین کے متعلق قرآنی تصور

قرآن نے آج سے چودہ صدی پیشتر ہی زمین کی خلقت، اس کی تشکیل اور اس کی حرکت کے متعلق مباحث دنیا کے سامنے رکھ دیئے تھے جس پر سائنس جدید ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں کر سکی ہے۔

⊙ زمین کی خلقت کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ زمین انسانی آبادی کے قابل چھ مرحلوں کے بعد ہو سکی :

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ . (الحدید:۴)

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْأَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهُ أَنْدَاداً ذٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ، وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَا أَقْوَاتَهَا فِيْ أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ . (حم سجدۃ:۹،۱۰)

اے نبی! کہہ دیجئے کیا تم لوگ اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں بنایا، اور تم اس کے لئے ہمسر ٹھہراتے ہو، وہ رب ہے تمام جہان والوں کا اور اس نے زمین کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں اور اس کی غذاؤں کا نظام چار دنوں میں بنایا ضرورت مندوں کی تکمیل کے لئے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان اور کائنات کو اللہ نے چھ یوم میں پیدا کیا، اس کے بعد ہی زمین انسانی آبادی کی متحمل ہو سکی، مگر یوم سے مراد یہاں لیل و نہار کے دو مدار نہیں ہیں جو سورج کی چوبیس گھنٹے کی گردش سے مکمل ہوتا ہے اور نہ قطب ارضی مراد ہے جو عموماً چھ ماہ کی گردش کے بعد دن یا رات کی صورت میں پیدا ہوتا ہے؛ بلکہ یوم سے مراد وہ قرآنی مدت ہے جس کو قرآن کی دوسری آیات میں بیان کیا گیا ہے :

وَإِنَّ يَوْماً عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ . (الحج:۴۷)

بے شک ایک دن تیرے رب کے نزدیک تمہارے شمار کے ہزار سال کے برابر ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ . (المعارج:۴)

فرشتے اور روح الامین وہاں تک ایک دن میں چڑھ کر پہونچتے ہیں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

اس طرح ان آیات سے وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زمین انسانوں کے رہنے کے قابل اصطلاحی طور پر چھ یوم یا چھ مرحلوں کے بعد ہوئی جو ایک طویل ترین مدت ہے، آغاز کے وقت سے تکمیل تک کے درمیانی مراحل کیا تھے؟ قرآن اس کے بارے میں خاموش ہے اور سائنس کی بھی مجال نہیں وہ اپنی طرف سے ایک حرف بھی بتا سکے۔

زمین کا ابتدائی مادہ

قرآن زمین کے ابتدائی مادہ کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ پہلے پانی میں پوشیدہ تھا اور پانی ہی اس کی اصل علت ہے، زمین اس کے اندر سے نمودار ہوئی :

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً . (ہود:۷)

اور وہی ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا؛ تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں کون بہتر عمل کرتا ہے۔

علم زولوجی کی رسائی بھی اس سے آگے تک نہیں ہوسکی ہے، اس کا نظریہ بھی یہ ہے کہ :

زمین کو اس کی ابتدائی حالت میں بخارات نے ڈھانپ رکھا تھا، جو بعد میں پانی سے تبدیل ہوگیا، پھر وہ پانی نشیب میں اترنے لگا اور اس سے نہریں اور سمندر بنتے چلے گئے۔(۱)

درمیانی مراحل

عمل تخلیق کے آغاز کے بعد زمین جن مختلف مراحل سے گذری، قرآن ان کو اشاراتی طور پر زمانی ترتیب کے ساتھ بیان کرتا ہے :

(۱) احمد محمود سلیمان، مضمون القرآن والعلم، مجلہ العلم والایمان، شمارہ ۱۷ نومبر ۱۹۸۱ء۔

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحَاهَا ، أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَ هَا وَمَرْعَاهَا ، وَالْجِبَالَ أَرْسَاهَا . (النازعات:۳۰-۳۲)

اور زمین کو اس کے بعد پھیلایا، اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو قائم کر دیا۔

اس آیت سے زمین کے عمل تخلیق کے درمیانی مراحل پر روشنی پڑتی ہے کہ زمین کا مادہ جو عالم آب میں مستور تھا وہ ظاہر ہونے کے بعد پھیلنا شروع ہوا اور پھر سطح ارض کے نشیبی حصوں میں پانی اترنے لگا جس سے نہریں اور سمندر بنتے چلے گئے، اس کے بعد اس کے اندر سے پہاڑی چٹانیں برآمد ہوئیں جو بتدریج اونچے پہاڑوں کی شکل میں تبدیل ہو گئیں ۔

زمین کا قالب

قرآن نے زمین کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ زمین کی شکل وصورت کیسی ہے؟ آج کے جدید سائنسی دور میں یہ مشہور سی بات ہے کہ زمین کرہ (گیند) کی طرح گول ہے یعنی خط استواء سے دیکھا جائے تو وسیع ترین نظر آتی ہے اور اس کے قطبین سے دیکھا جائے تو وہ چھوٹی اور معمولی نظر آتی ہے، مگر سائنس کا بیان قرآن کے بیان پر اضافہ نہیں ہے، قرآن نے بھی زمین کے قالب کا یہی نقشہ اپنے الفاظ میں کھینچا ہے :

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لاَ مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَاب . (الرعد:۴۱)

کیا انھوں نے غور نہیں کیا ؟ کہ زمین کو ان پر ہم اس کے کناروں سے کم کرتے ہیں، حکم صرف اللہ کا رہے گا، کوئی اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتا اور حساب لینے میں اسے کچھ بھی دیر نہیں لگے گی۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰؤُلاءِ وَآبَاءَ هُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ أَفَلا يَرَوْنَ أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا أَفَهُمُ الْغَالِبُوْنَ . (الانبیاء:۴۴)

بلکہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ داداؤں کو ایک مدت تک برتنے کو سامان زندگی دیا، اور طویل عمر گذرنے پر بھی حق بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی، کیا وہ نہیں دیکھتے کہ زمین کو ہم چاروں طرف سے ان پر کم کرتے ہیں، تو کیا اب بھی کچھ امکان رہ گیا ہے کہ یہ غالب آجائیں گے۔

''نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا'' کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ زمین اپنے کناروں سے چھوٹی معلوم ہوتی ہے تو زمین کا کروی قالب ہونا صاف ثابت ہوتا ہے، اس لئے کہ ہر گول جسم خط استواء سے وسیع اور طرفین سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

خلقت انسانی کے بارے میں قرآنی نظریہ

اسی طرح قرآن سے انسانی تخلیق اور اس کے درمیانی مراحل پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے، قرآن کے بیان کے مطابق جب مرد کا نطفہ عورت کے رحم میں جاتا ہے تو کچھ مدت کے بعد وہ بستہ خون بن جاتا ہے، اس کے بعد یہ خون بستہ گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کے بعد اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس پر گوشت کی موٹی تہیں جم جاتی ہیں اور کچھ دنوں رحم مادر میں تربیت اور نشو ونما پا کر ایک نئی صورت میں دنیا کی کھلی فضا کے اندر وہ آجاتا ہے، جس کو ہم ولادت کہتے ہیں :

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ . (المومنون:۱۴)

پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا، پھر ہم نے پانی کی بوند کو بستہ خون کی شکل دی، پھر بستہ خون کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا، اس کے بعد لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کر کھڑا کیا، پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

یہ چند نمونے ہیں جو قرآن کے جدید علمی حقائق کے تعلق سے پیش کئے گئے۔

علم کی طلب

قرآن کریم کی ان تعلیمات نے مسلمانوں میں حصول علم اسپرٹ پیدا کی اور وہ اس راہ میں بڑھتے چلے گئے، ان کے جذبۂ صادق پر حضور ﷺ کے الفاظ نے مہمیز کا کام کیا، آپ ﷺ نے علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا :

إن العلماء ورثة الأنبياء وإن الأنبياء لم يورّثوا ديناراً ولا درهماً ، وإنما ورثوا العلم ، فمن أخذهٗ أخذ بحظّ وافر . (۱)

(۱) سنن ابی داود:۳۶۴۱، سنن الترمذی:۲۶۸۲، سنن ابن ماجہ:۲۲۳، عن ابی الدرداءؓ۔

بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کی وراثت درہم و دینار نہیں ہے؛ بلکہ ان کی وراثت علم ہے، پس جس نے علم حاصل کیا اس نے بڑا وافر حصہ پایا۔

پھر یہ کارواں بڑھتا گیا اور علمی طور پر ساری دنیا پر چھا گیا اور پوری روئے زمین ان کے زیر نگیں آ گئی، اس لئے کہ علم تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے، علم کے ساتھ صدیوں کا سفر لمحوں میں طے ہوسکتا ہے اور علم کے بغیر دس قدم بھی پہاڑ ہوجاتا ہے۔

عہد ماضی کی ایک جھلک

ہم اگر اپنے ماضی کا جائزہ لیں تو ہم کو نظر آئے گا کہ مسلمان علم وفن کے میدان کے کیسے شہسوار تھے، اور ساری دنیا میں امامت کا مقام ان کو کس طرح حاصل ہوا؟...... یہ تاریخ کی ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اس موقعہ پر میں کسی مسلم مؤرخ کا حوالہ دینے کے بجائے ایک غیر مسلم مؤرخ کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں، ایک انگریز مؤرخ جارج سارٹن نے اپنی کتاب "**مقدمة في تاريخ العلم**" (جو پانچ ضخیم جلدوں میں ہے) میں علوم وفنون کی تاریخ، ان سے متعلق تجدیدی کارناموں کی تفصیل اور تجدیدی کام کرنے والی اقوام وشخصیات کا جائزہ پیش کیا ہے، اس نے تاریخی حوالوں کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر نصف صدی کے بعد حالات اور تقاضے بدل جاتے ہیں اور نئے حالات کے مطابق علوم وفنون کی تجدید واصلاح کا کام کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی مرکزی شخصیت ضرور پیدا ہوتی ہے اس طرح اس نے ہر نصف صدی پر ایک مجدد کی تلاش کی ہے۔

وہ ۴۵۰ قبل مسیح سے لے کر ۴۰۰ قبل مسیح کے وقفہ کو "عہد افلاطون" (ولادت ۴۲۷ وفات ۳۴۷ قبل مسیح) کہتا ہے، اس کے بعد کی صدیوں میں یکے بعد دیگرے ارسطو (ولادت: ۳۸۴ وفات ۳۲۲ قبل مسیح) پھر اقلیدس (۳۰۰ قبل مسیح)، پھر ارخمیدس (ولادت ۲۸۷ وفات ۲۱۲ قبل مسیح) نے علوم کی تجدید واصلاح کا کام کیا، ...... اس کے بعد چھٹی صدی عیسوی کے آغاز سے ساتویں صدی کے آغاز تک کا زمانہ اس کے نزدیک چین کے علمی ارتقاء وتجدید کا زمانہ ہے، اس کے بعد ۷۵۰ء سے لے کر ۱۱۰۰ء تک کا ساڑھے تین سو (۳۵۰) سالہ طویل عہد خالص مسلمانوں کا عہد ہے، اس پوری مدت میں علوم وفنون کی تمام تر خدمات مسلمانوں نے انجام دیں، یکے بعد دیگرے ان میں مجددین علوم آتے رہے اور علوم کی خدمت انجام دیتے رہے، جابر بن حیان (۸۱۵ء) سے لے کر خوارزمی (۸۴۹ء)، رازی (۸۶۴-۹۳۲ء)، تاریخ داں سیاح مسعودی (۹۵۶ء)، البیرونی (۹۷۳ء - ۱۰۴۸ء) اور عمر خیام (۱۱۳۲ء) تک مجددین وخدام علوم کی لمبی فہرست ہے، جنھوں نے علم کیمیا، الجبراء، طب، جغرافیا، ریاضیات، الفیزیا اور فلکیات کے

میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں، جن میں کوئی عربی ہے تو کوئی ایرانی، کوئی ترکی ہے تو کوئی افغانی، خطہ ورنگ ونسل سے گذر کر محض اسلامیت نے ان سب کو خدمت وتجدید علوم سے جوڑ رکھا تھا، جارج سارٹن کی نگاہ میں اتنے طویل عرصے تک یورپ میں کوئی قابل ذکر آدمی نظر نہیں آتا، گیارہویں صدی کے بعد ہی جرارڈ کرموِنی اور روجر بیکن جیسے کچھ مفکرین پیدا ہوئے اور علم وعقل میں مقام حاصل کیا، درمیان کی صدیاں بھی اسلامی مفکرین سے خالی نہیں رہیں؛ بلکہ علامہ ابن رشد (۱۱۲۶ء-۱۱۹۸ء)، نصیر الدین محمد موسیٰ (۱۲۰۰ء-۱۲۷۳ء)، ابن النفیس مصری (۱۲۸۸ء) اور ابن خلدون (۱۳۳۲ء-۱۴۰۶ء) جیسے عبقری علماء نے علم وفن کی وہ خدمات انجام دیں جن کے سامنے یورپی علماء کے کارنامے پھیکے نظر آتے ہیں۔(۱)

یہ تو وہ علوم ہیں جن کو علوم جدیدہ کہا جاتا ہے اور جن پر نئی دنیا فخر کرتی ہوئی نہیں تھکتی، رہ گئے علوم اسلامی، ادب وبلاغت، فنون لطیفہ آرٹ تعمیر وغیرہ، علوم اخلاق، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ تاریخ، سیر وتراجم، سلوک وروحانیت، فقہ وقانون، زراعت وتجارت اور سیاست وقیادت وغیرہ تو ان کے خادموں اور مجددوں کی بہت لمبی فہرست ہے، جن میں کوئی قوم وملت مسلمانوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔

یہ ہے اس کتاب مقدس کا اعجاز جو ہر زمانے میں اور ہر محاذ پر شخصیات اور افراد کی کھیپ تیار کرتی رہی ہے اور اس کی یہ صلاحیت آج بھی اسی طرح قائم ہے، فقط ہمیں اس سے کام لینے اور فائدہ اُٹھانے کی ضرورت ہے:

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

⊙ ⊙ ⊙

(۱) مضمون: امة العلم من اجل نهضة علمية في العالم الاسلامي، الاستاذ: عبد السلام رسالہ الیونسک، آب — ایلول ۱۹۸۱ء، ص: ۵۱۔

شخصیت سازی — قرآن مجید کی روشنی میں

سید بشارت علی انجینئر ⊙

کائنات میں ایسا کوئی علم نہیں جسے خالق کائنات نے بنی نوع انسان کو ودیعت نہ کیا ہو، آدم نے ابتداء ہی سے اپنی ضرورت کے مطابق اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ کئی ایک علم دریافت کئے ہیں، انسانی جبلت میں تلاش وجستجو کو کلیدی اہمیت رہی ہے، یہ جذبہ ہی تھا بیسویں صدی کے انسان نے چاند پر اپنی کمندیں پھینکتے ہوئے خود اپنے آپ کو دم بخود کر دیا تھا، تسخیر کائنات کے اس انسانی سفر میں ہم بحیثیت مسلمان لمحہ بھر کے لئے بھی یہ نہیں سوچ سکتے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر انسان نے کوئی علم حاصل کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کی فکر اور اس کی منصوبہ بندی کے مزاج نے ہر دریافت شدہ علم کو ایک نئی تہذیب دی ہے۔

دور حاضر میں شخصیت سازی اور تنظیم سازی کا علم بالکلیہ ایک نئے شعبہ کے طور پر ابھرا ہے، اس پر تحقیق، تجزیہ اور تربیت کا کام سائنسی بنیادوں پر کیا جا رہا ہے؛ لیکن ہم جب غور وفکر کرتے ہیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ علم بھی اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، بچہ اپنی ماں کی گود سے ہی سیکھنا شروع کرتا ہے؛ لیکن جب وہ بات نہیں کر سکتا تب وہ ماں کو اپنی طرف متوجہ کرنے رونے لگتا ہے، ترسیل کا یہ فن، بے زبان بچے کو قدرت کا ایک تحفہ ہے، تحقیق کی بنیاد پر یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ رہنمایانہ یا قائدانہ صلاحیتیں صرف پیدائشی نہیں ہوتیں؛ بلکہ انھیں تربیت اور تجربہ کی بنا پر شخصیت کے اندر بہتر طور پر ابھارا بھی جا سکتا ہے، اس مقالہ میں ہم قران کریم کی روشنی میں موجودہ شخصیت سازی کے تصور کا، جو ساری دنیا میں وسیع اور منظّم پیمانے پر وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے، جائزہ لیں گے، ساتھ ہی اس پس منظر میں ہم غور کر غور کریں گے کہ قرآن کریم، احادیث اور اسلامی عقائد کی روشنی میں کس طرح شخصیت سازی کے عمل کو زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے؛ تا کہ عالم اسلام میں فلاح و بہبود کے لئے بہتر طور پر اس سے استفادہ کیا جا سکے۔

⊙ حیدرآباد۔

جدید دور میں شخصیت سازی میں فرد کے مختلف پہلوؤں پر توجہ دی جاتی ہے، سب سے پہلے شخصیت کے انفرادی پہلوؤں کو نکھارنے پر توجہ دی جاتی ہے؛ تاکہ وہ اس کے ذریعہ ایک بہتر انسان بن کر خود اپنے لئے اور اپنے اہل خاندان اور اقرباء کی فلاح کے کام آسکے، دوسرا پہلو اس کی قائدانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی سعی ہے، اس کا مقصد معاشرہ میں قیادت کے خلا کو پر کرنا ہے، چوں کہ بہتر قیادت کسی قوم کی ہمہ جہتی ترقی میں بے حد اہمیت رکھتی ہے، دوسری جانب تنظیم کو فعال اور اس کی کارکردگی کو موثر بنانے کے لئے تنظیمی اُمور میں مہارت کی تربیت پر توجہ دی جاتی ہے، اس تربیت میں شخصیت کے انفرادی اور اجتماعی طرز عمل پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے، تنظیمی مسائل کی نوعیت علاحدہ ہوتی ہے، یہ مسائل نہ صرف پیچیدہ ہوتے ہیں؛ بلکہ ان میں معمولی کوتاہی کا اثر تمام قوم اور معاشرہ پر پڑتا ہے۔

عام طور پر شخصیت سازی کی تربیت کے دوران شرکاء کی ذہن سازی، ایسے فن اور ہنر؛ بلکہ حربے سکھانے پر مرکوز رہتی ہے جنھیں بروئے کار لا کر فرد مقررہ دنیاوی مقاصد کی تکمیل کر سکے، ساری توجہ اس فن یا ہنر کو سکھانے پر مرکوز ہوتی ہے جس کی بنیاد پر متعلقہ فرد مسابقت میں دوسروں کو پیچھے کر سکتا ہے، تاہم اقدار اور اصولوں کی پابندی فرد کی صواب دید پر چھوڑ دی جاتی ہے، اس کے نتیجہ میں اس سارے نظام میں جس سے وہ منسلک رہتا ہے ہمیشہ بگاڑ کا خدشہ لاحق رہتا ہے؛ چوں کہ مطمح نظر اپنے ادارے یا قوم کے خود غرضانہ مقاصد کا حصول ہوتا ہے؛ لہٰذا معاشی فوائد کا حصول، سیاسی مقصد براری اور مواقع کے ناجائز فوائد کا حصول مقاصد عین بن جانے کا ڈر لگا رہتا ہے، ان فوائد کے لئے ہر قسم کے جائز اور ناجائز حربوں کا استعمال بھی بلا تامل کیا جاتا ہے، ضرورت پڑنے پر بنیادی انسانی اخلاق اصول اور اقدار کو بھی بالائے طاق رکھ دینے سے گریز نہیں کیا جاتا، 2008ء میں دنیا نے جس کساد بازاری (Recession) کو دیکھا اس کی ذمہ دار مشہور اداروں سے وابستہ ایسی شخصیتیں تھیں جو گو کہ Leadership Skills میں ماہر تو تھیں؛ لیکن اُصول اور قدروں سے عاری تھیں، اس لئے انھیں بڑے سے بڑے گھوٹالے کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا نتیجتاً دنیا کی بڑی سے بڑی معاشی مملکتیں بشمول امریکہ اور یورپ تباہی کے دہانے پر پہنچ گئیں اور آج تک بھی سنبھل نہیں پائی ہیں، کروڑوں عام لوگ ان کی شاطرانہ چالوں میں آکر اپنی تمام عمر کی کمائی گنوا بیٹھے، اس کے برعکس ہر اہل ایمان کو یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر عمل سے، چاہے وہ ظاہر ہو کہ پوشیدہ، خوب واقف ہے اور اسے اس کا حساب دینا ہے، اسی وجہ سے انھیں اپنی ہر حرکت کے مواخذہ کا خوف دامن گیر رہتا ہے؛ لہٰذا وہ حتی الامکان کسی بھی غلط حرکت سے اجتناب کی کوشش میں لگا رہتا ہے، کاش یہی اُصول اور اقدار ان حضرات کی تربیت کا حصہ ہوتے تو وہ یقیناً اتنی آسانی سے ایسی گھناؤنی حرکات میں ملوث نہیں ہوتے، جیسا کہ قرآن میں ذکر ہے :

تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا۔ (سورہ بقرہ، آیت:284)

یقیناً وہ (اللہ تعالیٰ) ظاہر اور پوشیدہ کو جانتا ہے۔ (سورہ اعلیٰ، آیت: 7)

یوم جزاء کے حساب کا خوف ہر صاحب ایمان کو یقیناً غلط عمل چاہے وہ ظاہر ہو کہ چھپا ہوا، کرنے سے روک دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان رشوت خوری، گھوٹالوں اور دھوکہ دہی میں بہت کم ملوث ہوتا ہے۔

قرآن کریم کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت حاصل ہے، صرف اسی کی بنیاد پر تمام دنیا کی اچھائیوں کا دار ومدار تا قیامت باقی رہے گا، اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم دور جدید کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن وحدیث کی قدروں پر شخصیت سازی کے جدید Concepts پر عمل پیرا ہوں؛ کیوں کہ اس کی بنیاد پر جو شخصیت ابھرے گی وہ اعلیٰ اور مکمل ہوگی، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک مکمل اور کامیاب شخصیت کی خصوصیات کا جگہ جگہ ذکر فرمایا ہے، انسانیت کی سربلندی کے لئے ضروری اقدار کی پاسداری جس کی قرآن کریم تعلیم دیتا ہے، اس کے بغیر کوئی بھی تعلیم، تربیت و ہنر نامکمل بے سود رہیں گے اور انسانیت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں گے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سچائی، انصاف، حلال پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وعدہ خلافی، جھوٹ، مکر وفریب، دھوکہ دہی، خیانت، غیبت، حرام اور استحصال کرنے کے خلاف تاکید کی ہے، رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں مکمل رہنمایانہ اور قائدانہ شخصیت کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں وہ ہمارے لئے نمونہ ہیں، جو کسی بھی طرح کے خود غرضانہ مقاصد سے پاک ہیں، نیز آپ ﷺ کے اخلاق، دوسروں سے برتاؤ، چاہے وہ بادشاہ ہو کہ فقیر، یا ایک ان پڑھ بدو، عمدہ انسانی تعلقات (Human Relations) کی ایک بہترین اور جیتی جاگتی مثال ہیں، ہجرت کے بعد آپ ﷺ اور دیگر مہاجرین کو جس قسم کے مصائب اور بحرانی کیفیات (Crisis) کا سامنا کرنا پڑا اور جس کا آپ ﷺ نے نہایت استقلال اور خوش اُسلوبی سے مقابلہ کیا وہ بحران سے نپٹنے کی عملی ترکیب (Crisis Management) کی ایک اعلیٰ مثال ہے، اسی طرح مدینہ کے دیگر یہودی اور نصرانی قبیلوں کے ساتھ آپ ﷺ نے معاہدات کئے، جس کی بنا پر مسلمانوں کو ایسے مشکل حالات میں اپنے قدم جمانے اور انھیں اپنے مشن کو آگے بڑھانے کا موقع ملا، یہ Strategy Planning کی ایک بے نظیر مثال ہے، اس بے سروسامانی کے دور میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی قابلیت کے اعتبار سے مختلف ذمہ داریاں سونپیں اور اپنی رہنمائی میں تربیت اور ہدایات کے ذریعہ ایک مضبوط جماعتی نظام تشکیل دیا، یہ دنیا کے سامنے حضور اکرم ﷺ کی Team Building اور Leadership Development کا ایک بہترین نمونہ تھا، اگر ہم غور سے جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ سیرت طیبہ شخصیت سازی اور تنظیم سازی کے تمام شعبوں کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔

عام تاثر تو یہ ہے کہ سائنس، ٹکنالوجی، کمپیوٹر اور انفارمیشن کے شعبے جات کا تعلق عصر جدید کی تعلیم سے ہے؛ لیکن

مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ Behavioural Science (انسانی طرزِ عمل کا علم) کی فیکلٹی کے تحت مینجمنٹ اور لیڈر شپ ڈیولپمنٹ کی تعلیم کے حصول کا رجحان آج تعلیم کے کئی شعبوں پر حاوی ہو چکا ہے، یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اب Skill Development کے یہ مواقع ہر کسی کو دستیاب ہونے لگے ہیں جو پہلے کافی تجربہ کی بنیاد ہی پر حاصل کئے جا سکتے تھے، ان سب کا مقصد یہ ہے کہ کس طرح شخصیت کو موثر بنایا جائے اور شخصیت سازی کے ذریعہ Organisation Development پر توجہ مرکوز کی جائے؛ چوں کہ فعال اداراجات ہی ملک اور قوم کی ترقی کی ضمانت ہوتے ہیں، ایک حقیقت ہے کہ جن تعلیمی اداروں میں اس کا انتظام کیا جا رہا ہے وہ عصری تعلیم کے میدان اور دیگر شعبہ ہائے علوم کے مقابلہ میں سب سے اونچے مقام پر ہیں اور اس کی تعلیم بھی سب سے گراں ہے، شخصیت سازی (Personality Development) کا تصور عموماً کسی فرد کی قائدانہ صلاحیتوں کے فروغ (Leadership Skills Development) کو اُجاگر کرنے کے حوالے سے جانا جاتا ہے، اسی تصور کی بنیاد پر ساری دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں اور خصوصی طور پر قائم کردہ اعلیٰ اداروں میں قابل ترین نوجوانوں کو ان کی عملی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے ہی خاص کورسس اور پروگراموں کے ذریعہ شخصیت سازی کے ان علوم سے روشناس کیا جا رہا ہے؛ تاکہ ابتداء ہی سے اُنھیں اہم اُمور کی انجام دہی کے لئے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جا سکے، دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس کی ابتداء کارپوریٹ اداروں نے کی تھی؛ لیکن اب بیشتر حکومتوں نے بھی اس پر عمل کرنا شروع کیا ہے، ہم جن قائدانہ صلاحیتوں (Leadership Skills) کا تذکرہ کر رہے ہیں، اس کا تعلق سیاسی لیڈر شپ سے نہیں؛ بلکہ سماجی اور ملی لیڈر شپ سے ہے۔

شخصیت سازی کے پروگراموں میں (Leadership Skills Development) سکھانے پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے، ان پروگراموں میں جن چند اہم امور کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہیں :

Leadership Skills :

1. *Communication skills.*
2. *Team building and team eff.*
3. *Negotiations and marketing.*
4. *Goal/target setting.*
5. *Interpersonal relationships.*
6. *Time management.*
7. *Motivation.*
8. *Managing change.*
9. *Organisation behaviour.*

10. *Developing self esteem & confidence.*
11. *Overcoming difficult situations.*
12. *Strategy planning.*
13. *Positive thinking & positive approach.*
14. *Committment.*
15. *Crisis management.*

آج دنیا بہت تیزی سے سمٹ رہی ہیں اور اسے عالمی گاؤں (Global Village) کہا جانے لگا ہے، علوم میں بے پناہ ترقی کی ہے، بہت سی نئی نئی اصطلاحات وجود میں آ گئی ہیں جب کہ ان اصطلاحات سے آج سے 40، 50 سال پہلے کوئی واقف بھی نہیں تھا، اس لئے ان اصطلاحات اور ان سے منسلک تصورات کا بغور مطالعہ ضروری ہے، اصطلاحات جیسے globalisation، organisation behaviour، cross culture issues، strategy planning، communication اور internet پر موجود tools جیسے twitter، facebook، You tube وغیرہ کا استعمال بہت تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے اور یہ تمام Developed Personality کے اہم عناصر کے طور پر شمار کئے جانے لگے ہیں، ان تمام سے مکمل واقفیت اور ان کا موثر استعمال اور ساتھ میں ماہرین کو تیار کرنا یقیناً ہماری تنظیموں اور ان میں کام کرنے والی شخصیتوں کی استعداد میں اضافہ کرے گا؛ تا کہ عصر جدید کے تقاضوں سے انھیں ہم آہنگ کیا جا سکے، بہر حال اس کی بنیاد قرآن اور حدیث کے اُصولوں اور اقدار پر ہی ہوگی۔

زمانہ حال میں شخصیت سازی (Leadership Development) میں انسانی شخصیت کے جن اُمور پر توجہ دی جا رہی ہے یوں تو اس کی فہرست بہت طویل ہے، اس لئے ان میں سے صرف چند کا اختصار پیش کیا جا رہا ہے، ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن اور حدیث نے بہترین شخصیت کے لئے جن اُمور کا احاطہ کیا ہے وہ موجودہ حال کے Focus سے کہیں زیادہ ہے اور یقیناً اسے بروئے کار لانا شخصیت کی عملی زندگی میں کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

تبدیلی کے لئے تیار رہیے *(Keep Ready for the Change)*

یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ کسی تبدیلی کی ابتداء اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ فرد یا قوم اس کے ضرورت محسوس نہ کرے، اور خود کو اس کے لئے تیار کرے، اور اس کی راہ میں بے نظیر قربانیوں کے لئے آمادہ نہ کرے، ہمیں خود کو حالات کے جائز تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے، گزشتہ چند دہوں کے دوران تبدیلی کی جس رفتار سے انسان سوچ رہا ہے اس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی، اب تو تبدیلیوں کی رفتار کا یہ عالم ہے کے سب اس بات پر متفق ہونے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں کہ دنیا میں صرف ایک چیز ہی مستقل رہے گی اور وہ ہوگی تبدیلی (Change)!

ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کہتا ہے کہ وہ اپنی حالت کے لئے خود ذمہ دار رہیں گے، اپنے حالات کی بہتری کی طرف تبدیلی ہی ان کی کامیابی اور نصرت کی ضمانت رہے گی :

یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ کسی قوم پر کوئی نعمت انعام فرما کر پھر بدل دے جب تک کہ وہ خود اس حالت کو نہ بدلے جو کہ ان کی اپنی تھی اور یہ کہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ (سورہ انفال، آیت:53)

کسی قوم کی حالت اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر سے نہ بدلے۔

(سورہ الرعد، آیت:11)

مندرجہ بالا آیات کو شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے بھی بڑی خوبصورتی سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے :

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

جماعت اور قیادت کی اہمیت *(Organisation and Leadership)*

مسلمانوں کے لئے یہ بات بڑی اہم ہے کہ اسلام نے جماعت کی تنظیم اور اس کی موزوں قیادت کے لئے جتنی اہمیت دی ہے وہ دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں ملتی، نماز امام کی قیادت میں ادا کرنے کی تاکید اس بات کی دلیل ہے، اس طرح یہ بات ثابت ہے کہ مسلمانوں کو بہ حیثیت ایک اُمت اپنے رہنما کے تحت مختلف اُمور انجام دینا عین اسلام کی روح کا تقاضہ ہے؛ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ہم میں سے سب سے قابل شخص کو قیادت کی ذمہ داری سونپنے کی تاکید کی ہے اور یہ اس حد تک بھی ہے کہ اگر ہم دو بھی ہوں تو ہم میں سے بہتر کو رہنما اور دوسرے کو تابع بنانے کا حکم دیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ رہنمائی کے لئے شخصیت کے اہم عناصر اور اس کی ذمہ داریوں کا بھی تعین کر دیا گیا ہے —— قران اور حدیث کی روشنی میں تم میں سے جو بہتر ہوگا وہی قیادت کا مستحق ہوگا، ایک بات ہمیں ذہن نشین کرنی چاہئے کہ وقت اور موقع کے لحاظ سے شخص کا رول کبھی رہنما تو کبھی تابع میں بدلتا رہے گا، اس لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جب تک شخصیت ایک بہترین Follower نہیں بنتی وہ موثر رہنما نہیں بن سکتی۔

اپنی صلاحیتوں کو پہچانیے *(Know Yourself)*

کسی بھی سفر کے آغاز سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہ پتہ چلے کے ہم کہاں ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں، ساتھ میں اس مہم کے دوران ہمیں کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی ہم اس پر بھی دھیان دیتے ہیں؛ تا کہ انھیں ساتھ رکھیں، شخصیت سازی کی شروعات میں ہم اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہمارا تعلق خدائے برتر سے مضبوطی سے قائم ہے

اور رہے گا، اس سلسلہ میں قران اور حدیث سے بہتر کوئی رہنمائی نہیں ہوسکتی، انسان میں یہ بنیادی کمزوری ہوتی ہے کہ اپنے بارے میں اکثر خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے اور اپنی خامیوں کی جانب دیکھنے سے اجتناب کرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم خود کا محاسبہ کریں اور ساتھ میں یہ بھی دیکھیں جو ہماری جائز خواہشیں اور خواب ہیں ان کی راہ میں کون کونسی رکاوٹیں درپیش ہیں اور انھیں کس طرح اور کس کی مدد سے دور کر سکتے ہیں۔

مصمم ارادہ، صبر وتحمل اور ثابت قدمی

ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی جد وجہد میں اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں اور ثابت قدمی کے ساتھ تمام نا مساعد حالات کا مقابلہ کریں، صحیح لیڈر کی یہ پہچان ہے کہ وہ حوصلہ مندی سے مقابلہ کرتا ہے اور ہمیشہ مثبت سوچ رکھتا ہے، قران مجید میں اللہ تعالیٰ نے صبر کے لفظ کو بار بار دہرایا ہے؛ لیکن اگر ہم خود پر اور ہمارے معاشرہ پر نظر ڈالیں تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم کیا واقعی اللہ تعالیٰ کے اس اہم حکم کی تعمیل کر رہے ہیں؟

قرآن کریم میں جابجا انبیاءِ کرام کا ذکر آیا ہے، ان کے واقعات میں ہمیں صبر (Patience) ثابت قدمی اور استقامت (Steadfastness and Perseverance) مثبت سوچ (Positive thinking) کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثال کے طور پر جب حضرت داود علیہ السلام طالوت جالوت کے ساتھ جنگ کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو راستہ میں اللہ تعالیٰ ان کی فوج کو نہر کے پانی کی آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، ان کی فوج کا ایک بڑا حصہ اس آزمائش میں کامیاب نہیں اترتا جس کی وجہ سے ان کی تعداد جالوت کے مقابلہ میں بہت قلیل ہو کر رہ جاتی ہے، ان بچے کھچے ایمان والوں میں سے کئی نا اُمید ہو کر کہتے ہیں کہ ہم کیسے جالوت کی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں، تب ان میں سے کچھ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رہتا ہے کہہ اُٹھتے ہیں :

> اللہ سے ملاقات رکھنے والوں نے کہا: بسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پا لیتی ہیں، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت نمبر: 249)

ایک نئے حوصلے سے جنگ میں وہ اللہ کی مرضی سے کامیاب ہوتے ہیں اور حضرت داوٗد علیہ السلام جالوت کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، یہ مثبت سوچ عزم و استقلال کی بہترین مثال ہے، جو قرآن کریم ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اولاد کی خوش خبری سنانے کے لئے فرشتوں کو بھیجتے ہیں تو اپنے بڑھاپے کی وجہ سے وہ تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہیں، اس پر فرشتے کہتے ہیں کہ وہ انھیں بالکل سچی

خوشخبری سناتے ہیں اور یہ کہ آپ مایوس لوگوں میں شامل نہ ہوں، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں :

کہا (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے): اپنے رب تعالیٰ کی رحمت سے نا اُمید تو صرف گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ (سورہ حجر، آیت نمبر:56)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف حیرت اور تعجب کا اظہار کیا تھا اور ہمیں اس سے یہ درس ملتا ہے کہ نا اُمید تو صرف گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگ ہوتے ہیں، اسی طرح قرآن مجید کی حسبِ ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ صبر اور استقلال کا حکم فرماتا ہے۔

اے ایمان والو! صبر اور استقلال میں ثابت قدم رہو اور ایک دوسرے کو تھامے رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب رہو۔ (سورہ آل عمران، آیت نمبر:200)

ٹیم بلڈنگ *(Team Building)*

اللہ تعالیٰ نے پھوٹ اور تفرقہ ڈالنے کے خلاف سخت تاکید کی ہے اور عذاب کی وعید سنائی ہے، کسی بھی رہنما کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر لوگوں کے ساتھ مل کر اور ان کو جوڑ کر کام کرنے کی قابلیت پیدا کرے۔

اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو۔ (سورہ آل عمران، آیت:103)

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آجانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا، ان ہی لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔

(سورہ آل عمران، آیت:105)

اجتماعیت اسلام کا ایک اہم عنصر ہے، اس فن کو حاصل کرنے کے لئے نہ صرف خوش مزاجی درکار ہے؛ بلکہ لوگوں کا مزاج، ان کی ضروریات اور ان کی جائز خواہشوں اور اُمنگوں کی پہچان بھی ضروری ہے، اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں سینکڑوں؛ بلکہ ہزاروں ایسے واقعات ملیں گے جہاں صرف وہی رہنما کامیابی حاصل کر سکے جنھوں نے اپنے ساتھیوں کو متحد رکھا اور ان میں ٹیم اسپرٹ اجاگر کی۔

تواضع، انکساری اور میانہ روی

سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 23 تا 39 میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے ارشادات میں تواضع اور انکساری کا بھی خصوصی طور پر ذکر ہے، نیز سورہ لقمان آیت نمبر 17 تا 19 میں بھی انکساری اور میانہ روی کی تاکید کی گئی ہے، بدقسمتی سے ہمارے معاشرہ میں یہ عمل شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے، صحیح رہنما کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ منکسر المزاج ہوتا

ہے؛ تا کہ لوگ اس سے بلاتکلف ربط پیدا کر سکیں، شخصیت کا یہ عنصر اپنے حلقے سے باہر بھی اچھا اثر ڈالتا ہے اور یہ اس شخصیت کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتا ہے، شخصیت کا یہ پہلو ہمیں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کی ساری زندگی میں ہمیشہ نمایاں ملتا ہے، میانہ روی شخصیت سازی کا ایک اہم رُخ ہے، زندگی کے نشیب وفراز میں، حادثات اور مشکلات کی صورت میں میانہ روی مصائب کو کافی حد تک کم کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتی ہے، رفتار جتنی تیز ہوتی ہے حادثات میں نقصانات کا خدشہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔

سورہ الاعراف آیت:146 میں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ :

میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں ، جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں۔

غرور اور تکبر انسان کو نہ صرف اللہ تعالیٰ سے دور کرتا ہے؛ بلکہ اس کی شخصیت میں ایک ایسا نقص پیدا کر دیتا ہے کہ لوگوں کی نظر میں اس کی وقعت گر جاتی ہے اور لوگ اس سے دوری اختیار کرتے ہیں۔

تنظیم وقت *(Time management)*

قرآن مجید میں بار ہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کسی بھی شئے کو ضائع کرنے والے کو پسند نہیں کرتا ، وقت کا غلط استعمال بھی اس کو ضائع کرنے کی تعریف میں آتا ہے ، وقت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک بہت بڑی نعمت ہے ، اللہ تعالیٰ نے امیر ہو کہ غریب ، مسلمان ہو کہ کافر، چھوٹا ہو کہ بڑا، سب کو برابر دن میں چوبیس گھنٹے کا وقت دیا ہے، اس میں نہ کسی کو ایک سیکنڈ کا اضافہ ہے اور نہ ایک سیکنڈ کی کمی ، اب یہ ہر کسی کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اسے کیسے استعمال کرتا ہے، جس نے بھی اس کا صحیح استعمال کیا وہ کامیاب رہا اور جس نے نہ کیا وہ ناکام رہا، اللہ تعالی نے ہر ایک فرد کو اس دنیا میں ایک وقت معینہ کے لئے بھیجا ہے ، یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جس کا صحیح استعمال ہماری زندگی کو بدل دیتا ہے، خاص کر موجودہ زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ والدین جن کے پاس تعلیم تھی نہ سرمایہ، ان کی اولاد نے وقت کے صحیح استعمال کے ذریعہ تعلیم حاصل کی اور اپنے لئے خود مواقع فراہم کئے ، یہاں تک کہ وہ اعلیٰ عہدے حاصل کئے اور کاروبار میں داخل ہو کر بڑی بڑی کمپنیوں کے مالک بن گئے ، اپنے وقت کا استعمال اسی طرح کیجئے جس طرح ایک گھریلو خاتون کم آمدنی میں گھر کا سارا خرچ خوش اُسلوبی سے چلاتی ہے ، وقت کا برباد کرنا نہ صرف دنیا میں بربادی کا باعث بنے گا؛ بلکہ آخرت میں دردناک عذاب کا باعث بنے گا۔

کمیونیکیشن میں مہارت *(Communication Skills)*

قرآن کریم میں بار ہا اپنی بات کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرنے کی تاکید کی گئی ہے؛ تا کہ نہ صرف اپنی بات صحیح

اور مکمل مفہوم کے ساتھ پہنچے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی غلط فہمی اور دل آزاری نہ ہو، زندگی میں کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی بات کو درست کرنے کے لئے دوسرا موقع نہیں ملتا اور ہم پچھتاتے رہ جاتے ہیں :

نرم بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا رسانی ہو۔
(سورہ بقرہ، آیت:263)

اور میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بہت ہی اچھی بات منھ سے نکالا کریں؛ کیوں کہ شیطان آپس میں فساد ڈلواتا ہے۔ (سورہ بنی اسرائیل، آیت:53)

یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم تک پہنچنے والی اطلاع یا خبر پر اپنے ردعمل سے پہلے ذریعے کے بارے میں تحقیق کرلیں اور خاص طور پر ان ذرائع سے خبردار رہیں جن کے بارے میں شک کی گنجائش ہو۔

اے ایمان والو اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچاؤ اور اپنے کئے پر پشیمانی اُٹھاؤ۔
(سورہ الحجرات، آیت نمبر:6)

موجودہ حالات کے پس منظر پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ دنیا کی تیز رفتاری میں موثر ثابت ہونے کے لئے کمیونیکیشن میں مہارت سب سے اہم ترین ذریعہ ہے، شخصیت کی کامیابی کے لئے اس کے تمام پہلو یعنی verbal, non verbal, writing کے علاوہ Listening پر عبور حاصل کرنا نہایت ضروری ہے، اس کے بنا آپ اپنی بات نہ دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں اور نہ دوسروں کی بات خود ٹھیک سے سمجھ سکتے ہیں، ان کی غیر موجودگی میں آپ بے اثر ثابت ہوں گے، جب اللہ تعالیٰ کے حکم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف جاتے ہیں تو اللہ سے التجا کرتے ہیں :

میرے کام کو مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ بھی کھول دے؛ تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ سکیں۔ (سورہ طہٰ، آیات:26تا28)

گو کہ اس التجا کا تعلق آپ علیہ السلام کی زبان کی لکنت سے تھا؛ لیکن اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کام میں آسانی کے لئے اپنی بات کو نہ صرف آسانی سے دوسروں تک پہنچانا؛ بلکہ اس طرح پہنچانا کہ لوگ ٹھیک اور صحیح طور پر سمجھ بھی سکیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بات پر میں توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہمیں کم از کم ایک غیر ملکی زبان سیکھنی چاہئے، دنیا بہت تیزی سے پھیل رہی ہے اور دنیا کے ایک کونے کی بات آناً فاناً سارے کرہ ارض پر پھیل جا رہی ہے، بدقسمتی سے مسلمان اس دوڑ میں کسی قدر پیچھے رہ گئے اور اپنی بات دوسروں تک موثر طریقے سے نہیں پہنچا پا رہے ہیں۔

عمل کی اہمیت

بسا اوقات ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم بہت بات کرتے ہیں، بڑے بڑے پلان بناتے ہیں اور دوسروں کو تاکید کرتے ہیں؛ لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے ، اس بات سے سب اچھی طرح واقف ہیں کہ بنا عمل کے ہمارے سارے خواب، خواہشیں اور پلان ادھورے رہ جاتے ہیں اور ہمیں ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملتا، قرآن کریم کی حسب ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ صاف طور پر ہمیں تنبیہ فرماتا ہے :

اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ،تم جو کرتے نہیں اس کا کہنا اللہ کو سخت ناپسند ہے۔(سورہ الصّف، آیت نمبر: 2،3)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ تنبیہ خاص کر مومنین کے لئے ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہمارے فرائض میں داخل ہے، جہاں تک کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا اطلاق ہمارے ہر جائز عمل پر لاگو ہوگا چاہے وہ عمل خالص دینی ہو کہ دنیاوی۔

جیسا کے شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے مشہور شعر میں کہا ہے :

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

میں اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے آپ سب سے یہ التماس کرتا ہوں کہ ہم سنجیدگی سے اس بات پر غور کریں کہ کس طرح ہم اپنے تعلیمی اور تربیتی اداروں میں شخصیت سازی اور تنظیم سازی کے ان جدید علوم سے استفادہ کر سکتے ہیں؛ تا کہ ملت اسلامیہ موثر طور پر اس نئے دور کا مقابلہ کر سکے۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید کے سیاسی تصورات

ڈاکٹر سید اسلام الدین مجاہد ⊙

خالق کائنات نے دنیا میں انسان کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام فرمایا ہے، جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، وہ زمین و آسمان میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں، انسان کی مادی ضرورتوں کی تکمیل سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے اس کی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور تہذیبی ترقی کے لئے وہ ہدایت و رہنمائی اپنی کتابوں اور انبیاء کے ذریعے فراہم فرمائی، جس پر عمل پیرا ہو کر انسان دنیا و آخرت میں انتہائی بلندیوں کو حاصل کر سکتا ہے، زمین پر آدم کے سفر کے آغاز ہی میں اسے اس نعمت سے فیض یاب کر کے کامیابی کے راستے کی نشاندہی فرمادی کہ جو اس ہدایت کے مطابق زندگی گذارے گا وہی کامیاب رہے گا:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ ، وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۔ (البقرۃ:۳۸-۳۹)

پھر میری طرف سے جو ہدایت تمہارے پاس پہنچے جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لئے کسی خوف و رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ہدایت و رہنمائی کا یہ نظام ازل سے جاری ہے اور ابد تک قائم رہے گا، قرآن مجید وہ آخری اور مکمل ترین ہدایت نامہ ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تا قیامت انسانیت کے لئے رہنمائی کا سامان فراہم کر دیا، قرآن مجید روشنی کا ایک ایسا مینار ہے جو زمین پر انسانی زندگی کے آخری لمحہ تک تابندہ رہے گا اور جس کے ذریعہ سے انسان دنیا میں سرخروئی اور آخرت میں نہ ختم ہونے والے کامیابی حاصل کرے گا، قرآن ہی ہدایت کا وہ سرچشمہ ہے جو زندگی کی پوری شاہراہ کو تابناک کر کے صراط مستقیم پر انسان کی پیش قدمی کو یقینی بناتا ہے۔

⊙ صدر: شعبۂ سیاسیات، اُردو آرٹس ایوننگ کالج، حیدرآباد۔

اللہ رب العزت نے اپنی مشیت کے تحت جب قرآن مجید کے نزول کا فیصلہ کیا تو اس نے اپنے اس صحیفے کو کسی خلا میں اُتارنے کا فیصلہ نہیں کیا؛ بلکہ یہ کتاب اس نے ایک زندہ ماحول میں، ایک زندہ معاشرے میں اور ایک ایسے وقت نازل کی جب اللہ کے رسول ﷺ کی سربراہی میں دین کی تبلیغ کرنے، دین کو قائم کرنے اور دین کو پھیلانے کی منظم جدو جہد کا آغاز ہونے والا تھا، اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید ایک انقلابی انداز کی وحی یعنی (Revolutionary Revelation) ہے، واضح رہے کہ یہاں ''انقلابی'' کا لفظ عام سیاسی مفہوم میں استعمال نہیں کیا جارہا ہے؛ بلکہ یہاں انقلاب سے مراد ایک ایسی ہمہ گیر تبدیلی ہے جو ایک صالح انقلاب کی نقیب ہے، جو اس کتاب حکیم اور فرقان حمید کے نزول کے نتیجے میں پیدا ہوئی، جوں ہی اس کتاب کے نزول کی تکمیل ہوئی ویسے ہی اس ہمہ گیر تبدیلی اور انقلاب کی بھی تکمیل ہوگئی، گویا یہ انقلاب جو قرآن مجید کے ذریعہ وجود میں آیا ایک مبنی بروحی انقلاب تھا یہی وجہ ہے کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ، (المائدۃ:۳) ''یعنی آج کے دن ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کردیا، تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور اسلام کو بطور ایک طرز زندگی تمہارے لئے پسند کرلیا'' اس آیت کی نزول کے ساتھ ہی؛ بلکہ اسی لحمہ صحابہ کرام ؓ نے یہ سمجھ لیا کہ تکمیل نزول قرآن، تکمیل انقلاب، فراہمی امانت اور تکمیل دین سب ایک ساتھ پائے تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔

قرآن مجید اپنی ترتیب، نفس مضمون اور اُسلوب بیان کے اعتبار سے ایک منفرد کتاب ہے، یہ اس مفہوم میں محض قانون یا آئین کی کتاب نہیں ہے، جس طرح کہ قانون کی کتابیں عدالتوں میں ہوتی ہیں، اگرچہ قرآن میں قانون کے بہت سے احکام وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں، قرآن مجید محض فلسفہ کی کتاب بھی نہیں ہے؛ لیکن اس میں فلسفیانہ نوعیت کی بہت سی ہدایات بھی ہیں، قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر اس پہلو سے متعلق ہدایات موجود ہیں جہاں انسانی عقل، تجربہ اور مشاہدہ ناکام ہوجاتے ہیں اور جہاں انسان رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس لئے زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں انسان کو رہنمائی اور ہدایت کی ضرورت ہو اور قرآن مجید اس میں رہنمائی نہ کرتا ہو۔

قرآن مجید کا مرکزی موضوع انسان کی ہدایت ہے، اسی لئے قرآن کو ''الہدیٰ'' کہا گیا: ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرۃ:۲) ''یہ اللہ کی کتاب ہے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، ہدایت ہے پرہیز گاروں کے لئے''۔

اس عظیم کتاب کی بنیادی دعوت یہ ہے کہ انسان اللہ کا بندہ بن جائے، اس کے سوا کسی کو الٰہ نہ بنائے، کسی

دوسرے کی بندگی نہ کرے، عبادت اور اطاعت کو صرف اللہ کے لئے خالص کرے، قرآن انسانوں کو یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ وہ کشمکش حیات سے گریزاں نہ ہوں اور حق و باطل کی جنگ میں حق کے علمبردار بن کر اُٹھیں، قرآن کی دعوت کا اصل ہدف اللہ کے بندوں کو صرف اللہ کی بندگی کی طرف بلانا ہے اور اطاعت اور بندگی کے ان تمام سلسلوں کو پاش پاش کرنا ہے، جن میں انسان گرفتار ہے، خواہ وہ نفس اور اپنی ہی خواہشات کی بندگی ہو یا دوسرے انسانوں کی، یا اقتدار کے سرچشموں اور ''ارباباً من دون اللہ'' کی اطاعت اور ان کے آگے خود سپردگی ہو، قرآن کا پیغام بہت صاف اور واضح ہے، حکم، بندگی اور اطاعت صرف اللہ کے لئے ہے، کوئی اور کسی درجہ میں بھی اس کا مستحق نہیں ہے کہ اس کا حکم مانا جائے، اللہ کی بندگی کا دعویٰ اور غیر اللہ کی اطاعت اور اللہ کے باغیوں کے طریقوں، قوانین اور روایات کی پیروی ساتھ ساتھ نہیں چلتے ہیں، یہی وہ انفرادیت ہے جو یہ ثابت کرتی ہے، قرآن میں جو سیاسی تصورات بیان کئے گئے وہ دیگر تمام ادیان باطلہ سے ہر لحاظ سے ممتاز اور منفرد ہیں، قرآن تاریخ انسانی کی وہ واحد کتاب ہے جس نے انسان کا ایک نیا نمونہ ہی تیار نہیں کیا؛ بلکہ عقیدے کی بنیاد پر، ایک معاشرہ، ایک ریاست اور ایک نئی تہذیب کو بھی برپا کیا، جس نے انسانی تاریخ کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن محض ایک کتاب نہیں —— ایک دعوت اور پیغام ہے، نبی کریم ﷺ نے اس کتاب کی بنیاد پر ایک اُمت برپا کی، جو تا قیامت اس مشن کے لئے جدوجہد کرتی رہے گی، جو قرآن کا مقصد نزول ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً . (البقرۃ:۱۴۳)

قرآن کا پیغام رب کی بندگی، رب کی رضا کے لئے اس دین کے غلبے اور اس کے بندوں کو طاغوت کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے دعوت و جہاد ہے، قرآن نے انسانیت کو ایک نیا راستہ دکھایا اس نے قبیلے، نسل، رنگ، خاک و خون اور جغرافیائی تشخص کے بتوں کو پاش پاش کر دیا، اس نے یہ اعلان کیا ہے کہ پوری انسانیت ایک گروہ ہے اور اس میں انسانوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جا سکتا :

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ . (الحجرات:۱۳)

قرآن نے اس اُمت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بھی صورت گری کی ہے اور اسے باقی انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا علمبردار بنایا ہے، یہی وہ چیز ہے جس نے چھٹی صدی عیسوی کی ظلم و تاریکی سے بھری دنیا کو تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل کیا، جس نے عرب کے اونٹوں کے چرانے والوں کو انسانیت کا حدی خواں بنا دیا، جس

نے ریگستان کے بدوؤں کو تہذیب وتمدن کا معمار بنادیا، اسی قرآن کو لے کر مفلسوں اور فاقہ کشوں میں سے وہ لوگ اُٹھے جو انسانیت کے رہبر بنے، جنھوں نے وہ نظام قائم کیا جس کو دیکھنے کے لئے دنیا قیامت تک ترستی رہے گی۔

قرآن دنیا میں کس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کا پسندیدہ معاشرہ کونسا ہے، اس کے تعلق سے قرآن مجید کی متعدد آیات انسانوں کی رہنمائی کرتی ہیں، یہاں ان سب کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے، ہم صرف اس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لئے واحد عالمگیر اور دائمی نظام ''اسلام'' کی شکل میں دنیا کو دیا ہے، اس کے سوا کوئی اور نظام اللہ تعالیٰ کے پاس قابل قبول نہیں ہے، قرآنی آیات جابجا اس بات کو دہراتی ہیں، قرآن کا یہ واضح اعلان ہے کہ ''إِنَّ هَـٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ'' (بنی اسرائیل:۹) یعنی درحقیقت یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے، اس لئے کوئی بھی نظام اس وقت تک اللہ کے نزدیک قابل قبول نہیں قرار دیا جاسکتا، جب تک وہ اسلام کے اعتقادی تصور پر مبنی نہ ہو، قرآن کے تصورات میں سب سے اہم تصور یہ ہے کہ اس نظام کے چلانے والے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور آقائیت کے سامنے سر تسلیم خم کردیں اور خود اپنے لئے قانون سازی اور نظام زندگی وضع کرنے کے اختیارات کے دعوے سے دستبردار ہوجائیں؛ کیوں کہ یہ حق صرف خدا کے لئے مخصوص ہے :

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ . (یوسف:۴۰)

فرمارَوائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے، اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیک اور سیدھا طریقہ زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اس قاعدے کی رو سے اسلامی نظام حکومت بنیادی طور پر انسانوں کے بنائے ہوئے سارے نظاموں سے مختلف ہے، خواہ یہ نظام حکومت کے لئے وضع کئے گئے ہوں یا پوری انسانی زندگی کے لئے۔

ذاتِ واحد کی الوہیت اور حاکمیت تسلیم کرنے کے بعد قرآن نظام حکومت کو چلانے کے لئے ان اُصولوں پر عمل آوری کو ناگزیر قرار دیتا ہے، جس کے ذریعہ سے معاملاتِ زندگی اور انسانوں کے باہمی تعلقات میں توازن پیدا ہوسکتا ہے، حکام کی جانب سے عدل، محکومین کی جانب سے اطاعت اور حاکم اور محکوم کے درمیان مشاورت پر قرآن نے کافی زور دیا ہے، لوگوں کے ساتھ عدل کے معاملے میں یہ حکم صریح قرآن میں موجود ہے کہ :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ . (النحل:۹۰)

اللہ تم کو عدل کا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَ إِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ . (النساء:٥٨)

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى .

(المائدة:٨)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ عدل حقیقی کی وہ سچی ترازو ہے کہ بغض و عداوت اور دوستی و دشمنی اس کے قواعد و ضوابط کو بدل نہیں سکتے ہیں، یہ وہ عدل ہے جو افراد یا قوموں کے باہمی بغض و عناد سے متاثر نہیں ہوتا ہے، اس میں نہ حسب و نسب اور مال و جاہ کو پیمانہ عدل بنایا گیا، آج تک نہ دنیا کا کوئی بین الاقوامی قانون اور نہ ملکی قانون قرآن کے تصور عدل کو چھو سکا اور نہ اس کے قریب پہنچ سکا، آج قوموں میں طاقتور اور کمزور گروہوں کے درمیان جنگ و پیکار کا ماحول پایا جا رہا ہے اور اس کی بنیاد پر دنیا میں جو سیاست چل رہی ہے اس سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں، آج بھی امریکہ میں سفید فام اقوام سرخ اور سیاہ قوموں کے ساتھ بدترین سلوک کرتی ہیں، اس سے یہ اشارے ملتے ہیں کہ دنیا میں انصاف اور مساوات کے نام پر دنیا کے قوانین انسانوں کا استحصال کرتے رہے۔

حکمرانی کا حق جہاں صرف اللہ کا حق ہے، وہیں قرآن مجید نے محکومین کو صاحب امر کی اطاعت کی تاکید کی ہے:

يٰـا اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَنُوْا اَطِيْعُوْا اللهَ وَاَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ .

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔

آیت میں اللہ، رسول اور اولی الامر کو ایک ساتھ جمع کرنا اس اطاعت کی حدود اور اس کے مزاج کی تشریح وتوضیح کا کام کرتا ہے، معلوم ہوا کہ صاحب امر کی اطاعت اس کی ذات کی خاطر نہیں ہوتی؛ بلکہ اس کی اطاعت اس لئے کی جاتی ہے وہ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کا پاسبان بن کر رہتا ہے، یہ حق کہ اس کی اطاعت کی جائے اسے خدائے واحد کی حاکمیت کے اعتراف اور اس کی شریعت کی نفاذ سے حاصل ہوتا ہے، اب اگر وہ اس اعتراف یا نفاذ سے پہلو تہی کرے تو اس کی اطاعت کا حق ساقط ہو جائے گا۔

قرآن کے اس حکم سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہاں حکمران کے احکام کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت نہیں ہے، سمع واطاعت اس وقت ہونی چاہئے جب تک حکمراں قرآن پر عامل ہو، اگر حکمران اللہ اور رسول ﷺ کی شریعت کو پس پشت ڈال دے تو اس کی اطاعت سے نکل جانا اسلام کا تقاضا ہے۔

قرآن مجید نے حکام اور محکومین کے مابین مشاورت کی بھی تاکید کی: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ، (آل عمران:۱۵۹) ''معاملات میں ان سے مشورہ کرلیا کیجئے''۔ أَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ ، (الشوریٰ:۳۸) ''ان کے معاملات آپس کے مشوروں سے طے ہوتے ہیں''۔

اس طرح شوریٰ اسلام میں طرز زندگی کا ایک بنیادی اُصول قرار پاتی ہے، اس کا دائرہ اثر حکومت سے زیادہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ جیسا کہ آیت بتاتی ہے کہ یہ اُمت مسلمہ کی زندگی کا اُصول ہے، مشاورت کس نوعیت اور کس مرحلے پر کی جائے اس کے لئے کوئی لگا بندھا ضابطہ قرآن نے مقرر نہیں کیا ہے، احوال وظروف اور ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر عمل کیا جاتا رہا ہے، چنانچہ جن اُمور میں وحی کے ذریعہ رہنمائی نہ کردی جاتی، ان میں رسول اکرم ﷺ مسلمانوں سے مشورہ کرتے تھے اور ان کے دینوی معاملات سے جن سے وہ بخوبی واقف ہوتے تھے ان ہی کی رائے پر عمل فرماتے تھے، مثلاً میدان جنگ اور اُمور جنگ کے متعلق حضور اکرم ﷺ نے صحابہ ؓ سے مشورہ کیا، غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے صحابہ ؓ کی رائے مانی اور چشمہ بدر پر آکر ڈیرے ڈالے؛ حالاں کہ اس سے قبل آپ ﷺ اس سے کچھ دور پہلے ہی پڑاؤ کر چکے تھے، اسی طرح آپ ﷺ نے خندق کھودنے کے معاملے میں صحابہ ؓ کی رائے قبول کی، خلفاء راشدین بھی مسلمانوں سے مشورہ کی ہی پالیسی اختیار کئے تھے۔

واضح رہے کہ حضور اکرم ﷺ محض حاکم ہی نہ تھے، آپ ﷺ ہی قانون کو نافذ کرنے والے تھے؛ چنانچہ اسلام کے عطا کردہ حقوق کے دائرہ میں حاکم کو جن حدود کی پابندی کرنی ہے، ان کی آپ ﷺ نے عملی طور پر نشان دہی کردی ہے، پھر آپ ہی کے اسوہ پر خلفاء راشدین بھی چلتے رہے، آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ خود اپنی ذات سے بھی قصاص لیتے تھے، الا یہ کہ جس کا حق ہو خود ہی معاف کردے، ایک بار ایک قرض خواہ آیا اور آپ ﷺ سے کچھ سختی کے ساتھ پیش آیا، اس پر کچھ مسلمان اس کی طرف لپکے، آپ ﷺ نے انھیں اشارہ کیا کہ اسے چھوڑ دیں؛ کیوں کہ حق دار کو کہنے سننے کا پورا پورا حق ہوتا ہے، قرآن نے اتنے واضح اور مطلق احکام کے ذریعہ روح، جسم اور مال وناموس کے تحفظ کی ضمانت دی ہے کہ ان کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قرآنی تعلیمات امن وآشتی اور سب کے لئے باعزت زندگی کے مواقع فراہم کرتی ہیں، قرآن کی رو سے اقتدار پر فائز افراد حدود شرعی یا اموال ریاست میں کوئی خصوصی مراعات کے حقدار نہیں ہوتے ہیں، حکمرانوں اور ان کے گھر والوں کو ان اموال میں ان حقوق سے زائد کوئی

حق حاصل نہیں ہے، جو عام مسلمانوں میں سے کسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں، وہ عام لوگوں پر نہ کسی قسم کی زیادتی کر سکتا ہے اور نہ کسی حیثیت میں ان کا استحصال کر سکتا ہے، جب حکمران حدود شرعی قائم کر چکا اور فرائض کو نافذ کر چکا تو بس یہاں آ کر اس کے اختیارات ختم ہو گئے اور اس سے آگے سے لوگوں پر کوئی اقتدار حاصل نہیں رہا، اللہ تعالیٰ نے اس دائرے سے آگے ان کو اس کے اقتدار کی دسترس سے باہر اور محفوظ رکھا ہے۔

قرآن مجید جہاں حاکم یا امام کو اس کی اپنی ذات سے متعلق اُمور میں اس کے اختیارات کو محدود کر دیتا ہے، وہیں اُمت کے مصالح کے سلسلے میں اس کے اختیارات کو انتہائی حد تک وسعت دیتا ہے؛ حالاں کہ تبدیلی اور زمانے کے تغیرات کے ساتھ اصلاح فرد و جماعت اور ساری انسانیت کی درستی احوال کے خاطر وہ پیش آمدہ مشکلات کے حاصل کے لئے قرآن مقررہ حدود اور اُصولوں کی روشنی میں نئے فیصلے کر سکتا ہے؛ لیکن یہ حق اس شرط پر اسے دیا جاتا ہے کہ وہ عدل و انصاف کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

یہ بڑے وسیع اختیارات ہیں جو زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر حاوی ہیں، مثلاً مالی شعبہ میں حاکم کو یہ حق حاصل ہے کہ فریضہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس بھی عائد کرے؛ تاکہ مختلف طبقات کے درمیان توازن پیدا ہو اور معاشرہ میں عدل قائم ہو سکے، نیز محروم طبقات کے دلوں میں پرورش پانے والے حسد اور کینہ کے جذبات زائل ہوں، اُمت سے وہ تمام برے اثرات دور ہوں جو عیش پرستانہ ٹھاٹ باٹ، یا حد سے زیادہ تنگی و افلاس یا اشیاء واموال کے چند ہاتھوں میں سمٹ آنے سے پیدا ہوتے ہیں؛ لیکن یہ مقاصد اسے اس طرح حاصل کرنے چاہئیں کہ نہ تو کسی نص قرآن کی خلاف ورزی ہو نہ اسلامی طرز زندگی کے بنیادی اُصولوں میں سے کوئی اُصول مجروح ہو۔

چنانچہ اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ عوام سے ان کا سارا مال چھین کر انھیں مفلس بنا دے، یا ان کے رزق کے تمام ذرائع و سائل اپنے ہاتھوں میں لے لے؛ تاکہ ان کے گردنیں اس کے آگے جھکی رہیں اور انھیں اپنا غلام بنا کر رکھ دے اور وہ انھیں آزادانہ نصیحت، مخلصانہ احتساب و نگرانی اور بے خوف ہو کر ہر برائی کو، خواہ وہ کسی سے صادر ہو، مٹانے کے فرائض کی ادائیگی کی صلاحیت سے محروم کر دے۔

قرآن مجید جن چیزوں کو بہر حال قائم رکھنا چاہتا ہے وہ بنیادی اُصول ہیں، جو اس کی ربانی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہیں، قرآن کی مختلف آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اللہ کی حاکمیت کا اقرار کئے بغیر نہ اسلام معتبر ہے اور نہ ایمان، قرآن کا مطالبہ ہے کہ انسان حاکمیت الٰہ کی طرف رُجوع ہو اور زندگی کے تمام اُمور صرف اسی کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصل کئے جائیں اور قانون سازی کے معاملے میں کسی اور جانب نگاہ نہ اُٹھے یہی ''دین قیم'' ہے اور یہی سپردگیٔ کامل ہے اور اللہ کو انسانوں سے مطلوب ہے۔

جب ہم دین اور اسلام کے اس مفہوم کی روشنی میں جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعے متعین فرما دیا ہے، آج کی دنیا کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کہیں بھی اس دین کا ''وجود'' نظر نہیں آتا، جب سے مسلمانوں کا آخری گروہ اس دنیا سے گیا، جو پوری انسانی زندگی میں حاکمیت کو صرف اللہ کے لئے مخصوص کرتا تھا، اس وقت سے مسلمان دیگر ادیان باطلہ کی پگ ڈنڈیوں میں گھومتے رہے، یعنی اس وقت سے جب سے مسلمانوں نے اپنی زندگی کے تمام معاملات میں صرف اللہ کی شریعت کے مطابق عمل کرنے کا طریقہ ترک کردیا ان کی اصل حیثیت ختم ہوگئی۔

اس المناک حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری ذمہ داری ہے کہ اسلامی زندگی کی از سر نو شروعات کریں مسلم معاشرہ کو اسلامی معاشرہ بنایا جائے، جس میں اسلامی عقیدہ راسخ ہو اور اسلامی تصور زندگی رائج ہو، ساتھ ہی اسلامی شریعت نافذ ہو اور اسلامی نظائم قائم ہو، قرونِ اولیٰ کے انداز کی اسلامی زندگی اس زمین کے مختلف گوشوں میں ایک طویل عرصے سے مفقود ہے، یہی نہیں؛ بلکہ ایسا ہونے کی بنا پر خود اسلام کا وجود بھی ٹھٹھر کر رہ گیا اور مسلمان ساری دنیا میں اندیشوں اور خطرات سے بھری زندگی گذارنے پر مجبور ہیں، اس وقت قرآن کے سیاسی تصورات کو عام کرنا اور اسلام کے احیاء کی جدو جہد وقت کا ایک تقاضا ہے، جس سے مفر ممکن نہیں، جب تک انسان اس بات کو گواہی نہ دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، یعنی حاکمیت صرف اللہ ہی کے لئے ہے، وہ حاکمیت جو قضا اور احکام وشریعت دونوں صورتیں اختیار کرتی ہے اسلام عملی زندگی میں دین کے طور پر قائم نہیں کیا جاسکتا، اللہ کی شریعت سے ماخوذ قانون سازی وہ ہوگی جس میں شریعت کے قوانین کو بعینہٖ اختیار کرلیا جائے اور جن اُمور کی بابت قرآن وحدیث میں کوئی واضح اور متعین حکم نہ ملے ان میں اسلام کے عام اور بنیادی اُصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے اجتہاد کیا جائے، قرآن اس معاملے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْئٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ . (النساء:۵۹)

پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزع پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

ایک اور جگہ قرآن نے متنبہ کیا کہ :

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ . (المائدۃ:۴۵)

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

ان آیات کی روشنی میں یہی حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ دین کے مفہوم کو خود اللہ تعالیٰ نے واضح انداز میں

بیان فرما دیا ہے، جو اس دین کا الٰہ اور اسلام کا رب ہے، انسان کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ حاکمیت الٰہ جیسے اہم مسئلہ میں کوئی دوسری تاویلات پیش کرے، اس دین کے دشمنوں نے صدیوں سے اس بات کی کوشش کی ہے اور آج بھی اس مکروفریب میں مشغول ہیں کہ قرآنی تعلیمات کو مسخ کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور مسلمانوں کو ہمیشہ اس مغالطہ میں مبتلا رکھا جائے کہ اسلام کو سیاست اور معاشرت، معیشت اور دیگر اُمور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس مکروفریب کا جال اتنا پھیل چکا ہے کہ خود مسلمانوں نے بھی قرآن کو محض ایک مذہبی کتاب مان کر اس کی رسمی حیثیت کو جان لیا اور تلاوت کو ذریعہ نجات سمجھ لیا، قرآنی احکامات پر تدبر و تفکر کی ذمہ داری اپنے علماء اور مشائخ پر ڈال دی، اُمتِ مسلمہ کے قرآن کے تئیں اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب یہ سوچ ذہنوں میں جڑ پکڑنے لگی کہ انسان اپنے اوپر اس دین کے قانون کو نافذ کئے بغیر بھی ''مسلمان'' رہ سکتا ہے؛ بلکہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ حاکمیت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے، مشہور مستشرق ولفرڈ کینٹول اسمتھ نے ایک پوری کتاب ''اسلام دورِ حاضر میں'' بنیادی طور پر یہ ثابت کرنے کے لئے لکھی کہ ترکی کا وہ سیکولرزم جس کا علمبردار اتاترک تھا ''اسلامی'' ہے؛ بلکہ یہی سیکولرزم دورِ حاضر کی تاریخ میں واحد کامیاب اسلامی تحریک ہے، جو مسلمان اسلام کا وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کو اس کے نقش قدم پر چلنا چاہئے؛ کیوں کہ یہی واحد صحیح طریقہ کار ہے، آج کی استعماری طاقتیں اس دین کی دشمنی کے سلسلہ میں اپنی سوچی سمجھی روش پر پورے اتفاق واتحاد کے ساتھ چل رہی ہیں، اس حقیقت کا مشاہدہ مغربی اقوام کی حکمت عملیوں سے واضح ہوتا ہے، استعمار کو روح اسلام سے جو خطرہ لاحق ہے اس کے تحت اسلام کی قوت کو کچل دینے کی کوشش نے سارے اہل مغرب کو اسلام کی خلاف متحد کر رکھا ہے، عالمی صہیونی تحریک اسلام دشمن عناصر کو متحد کرنے میں مسلسل لگی ہوئی ہے، حالات کے اس تناظر میں ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کر ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ کا بندہ بنانے کے لئے کس قدر صبر آزما اور ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے، قرآن جو ایک کامل آفاقی نظام رکھتا ہے، جس میں عقیدہ بھی ہے، قانون بھی ہے اور انسانوں کے سماجی سیاسی اور معاشی حقوق کو قرآن نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے، قرآن جو انسانوں کی زندگی کی بنیاد ایک جامع تصور زندگی پر رکھتا ہے، وہ زندگی کو پست مقامات کی غلامی سے نکال کر بلند مقامات پر لے جاتا ہے اور کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ہمہ گیر اور ہم آہنگ فکر کو پروان چڑھاتا ہے اور جو انسانی معاشرے میں کشمکش اور نزع کی جگہ باہمی تعاون اور تکافل کی فضاء پیدا کرتا ہے، اس کے زیر سایہ انسانیت کی تعمیر نو ہوسکتی ہے، آج بلا کسی جھجک کے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے سارے نظام ہائے باطل چاہے وہ اشتراکی ہوں کہ سرمایادارانہ، یا پھر مسیحیت ہو کہ ہندوازم ہر آن بدلتی دنیا کے قدم بہ قدم چلنے میں ناکام ہوگئے ہیں؛ کیوں کہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ عملی زندگی کے بارے

میں کوئی جامع نظریہ نہیں رکھتے، اس کے برعکس آج اسلام ایک بار پھر سیلاب کی طرح اُمڈ رہا ہے؛ کیوں کہ اسلام کے پاس قوت کا اتنا سرمایہ موجود ہے کہ ایک اسلامی زندگی کا آغاز وہ کسی بھی وقت کر سکتا ہے، ایسی زندگی جو صرف آرزوؤں اور تمناؤں کے سہارے ہی نہ رہے؛ بلکہ ایسی ٹھوس اور عملی بنیادوں پر قائم ہو، جن کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، عرصہ دراز تک نظام حکومت اور روح اسلامی کے درمیان جو بعد رہا ہے، اس کے سبب اسلامی طرز حکمرانی کو اپنانا بظاہر مشکل کام نظر آرہا ہے؛ لیکن یہ بات غیر مشروط یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اسلام صرف چند ممالک کا نہیں؛ بلکہ دنیا کا نظام بن جانے کی صلاحیت آج بھی اپنے اندر رکھتا ہے، مغربی دنیا جس سے ہمارے مسلم حکمرانوں کے بہت سے مفادات وابستہ ہیں، ہم سے زیادہ طاقتور ہے ہمارے پاس اتنی قوت نہیں کہ ہم اس کا مقابلہ کر سکیں، وہ کسی بھی طرح گوارہ نہیں کرتی کہ قرآن کے سیاسی تصورات کی بنیاد پر انسانیت کی تعمیر نو ہو اور دنیا میں حقیقی اسلام کی بازیافت ہو، ان طاقتوں کو قابو میں لانا یقیناً ایک بہت ہی عظیم اور دشوار ترین کام ہے اور اس کے لئے غیر معمولی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، اگر اُمتِ مسلمہ پر مشقت اور ان تھک کوششوں کی خوگر ہو جائے اور اس بات کا یقین کامل ہو جائے کہ آج ساری انسانیت کو اس نظام کی شدید ضرورت ہے تو موجودہ نظام میں جوڑ اور پیوند لگا کر کام نہ چلانا چاہئے؛ بلکہ از سر نو ایک مکمل جدید نظام قائم کرنے کا عزم ہو، آج جب کہ ہر طرف اضطراب و بے چینی عام ہے، دنیا کے ایک بڑے حصے میں فقر و فاقہ اور افلاس کا دور دورہ ہے، دنیا کا نظم متزلزل ہوتا جا رہا ہے اور وہ اپنی تعمیر نو کے لئے نئی بنیادیں تلاش کر رہی ہے، اس کو کسی ایسی نئی روحانی طاقت کی ضرورت ہے جو ایک بار پھر دنیا میں عدل وقسط کے نظام کو قائم کرے دنیا کو امن وسکون کا گہوارہ بنا سکے، یہ عظیم کارنامہ انسانیت کے لئے نازل کردہ آخری نسخہ کیمیا یعنی قرآن مجید کے پیغام سے روشناس ہو کر کیا جا سکتا ہے۔

قرآن طاقت کا ایک خزانہ ہے، اس لئے جس طرح ساڑھے چودہ سو سال پہلے اس نے انسانوں کی ہیئت بدل کر رکھ دی اور ان کے ہاتھوں سے ایک نئی دنیا تعمیر کر دی تھی، اسی طرح آج بھی اکیسویں صدی کے اس دور میں جب کہ دنیا فساد سے بھری ہوئی ہے، قرآنی تعلیمات کے ذریعہ سے ہی دنیا کو تباہی کے راستہ سے ہی نکال کر صراط مستقیم پر گامزن کیا جا سکتا ہے، قرآن اپنے ماننے والوں کو بشرطیکہ وہ اس کا حق ادا کریں، انسانیت کا رہنما اور تاریخ کا معمار بنا سکتا ہے؛ کیوں کہ قرآن کا اعلان ہے کہ ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا''۔

⊙ ⊙ ⊙

ذرائع ابلاغ اور قرآن کریم

مولانا اعجاز ارشد قاسمی ⊙

چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلام ﷺ کو غارِ حرا میں جو قانون ہدایت انسانی دنیا کے لئے ملا تھا، وہی دراصل انسانوں کو جوہر انسانیت سے آشنا اور ایک معبودِ حقیقی کی بندگی کا راستہ دکھانے کی فکر کا نقطۂ آغاز تھا، اس کتاب الٰہی نے اُمت مسلمہ کو تمام قوموں پر فوقیت بخش دی اور زندگی کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کی یہ جماعت سبقت لے گئی، خواہ اس کا تعلق صنعت وحرفت سے ہو، یا معیشت وتجارت سے، قانون وسیاست سے ہو یا معاشرت وتمدن سے، زبان وصحافت سے ہو یا تہذیب وثقافت سے، پوری انسانی دنیا کے لئے اسلامی زندگی آئیڈیل بن گئی اور جوق در جوق لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو کر اپنی دنیا و آخرت کو سنوارنے لگے، اُمت کی یہ زبردست کامیابی اور عظمت وشوکت کی صرف ایک ہی وجہ تھی: ''قرآن کریم کی حقیقی تفہیم اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا مکمل نفاذ'' جس کے لئے بندگانِ خدا کی ایک جماعت تیار ہوتی ہے اور ایک مخصوص فکر لے کر آگے بڑھتی ہے اور تمام تر رکاوٹوں کے باوجود بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، مکہ مکرمہ میں اپنے اس خاص فلسفۂ زندگی کو پروان چڑھانے کے لئے حالات سازگار نہیں ملتے ہیں، تو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر جانے میں دریغ سے کام نہیں لیتی ہے اور اپنے پاکیزہ افکار وخیالات سے دنیا کو روشناس کرانے کے لئے اس قدر جدوجہد کرتی ہے کہ صرف دس سال کے عرصہ میں پورے عرب کو زیر نگیں کر لیتی ہے، پھر دو دہائی کے اندر ہی میں طوفان کی طرح ایران، عراق، شام اور مصر وغیرہ کے باشندوں کو اسلامی نظام حیات سے آشنائی ہو جاتی ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد خلفاء راشدین کے زمانے میں اسلامی سلطنت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور خدائی قانون کو دنیا میں جاری کرنے کے عظیم مقصد کو لے کر مکہ سے چلنے والے اس کارواں کا دائرہ اتنا پھیل گیا کہ ایشیاء سمیت یورپ وافریقہ میں اسلام کی صدائیں گونجنے لگیں اور مجاہدین اسلام کی تلواروں کی جھنکار سے ایوان کفر میں زلزلہ برپا ہونے لگا، راہ حق کے ان مسافروں کا قدم جس زمین پر پڑا، وہاں اپنی عظمت وپاکیزگی کے انمٹ نقوش ثبت کر گئے، زندگی کے ہر شعبہ میں انھوں نے اصلاحات کیں، اور انسان کو اس کی زندگی کا

⊙ جنرل سکریٹری: اسلامک پیس فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔

مقصد بنا کر ایسا انقلاب برپا کیا کہ انسانی دنیا پر اسلامی تعلیمات کی گہری چھاپ پڑ گئی، پیروان اسلام کا یہ عمل دراصل ان کے افکار و خیالات اور دینی و مذہبی فلسفہ کا خارجی پیکر تھا۔

اسلامی تاریخ کے یہ زندۂ جاوید کارنامے ہماری قومی و ملی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں، جس کی روشنی میں ہم اپنی قومی فکر و عمل کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہیں اور اپنی تاریخ کے عروج و زوال کے اسباب سمجھ سکتے ہیں، ملت اسلامیہ کے ذہن و فکر کی بنیادی اساس ''قرآن کریم'' ہے، جس کی تعلیم خود کائنات کے خالق کی تعلیم ہے، جس کو لے کر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر پیغمبر اسلام ﷺ تک اس دنیا میں آئے اور انسانوں کی فطرت میں اس تعلیم کو ودیعت کر گئے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اس الٰہی تعلیم کے ذریعہ ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جس کے اخلاق و عادات اور نظام زندگی میں اس تعلیم کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کئے جا سکتے تھے، جس کے لئے مشعل راہ قرآنی تعلیم اور سنت نبوی ﷺ تھی؛ چوں کہ خود معلم انسانیت ﷺ نے اس جماعت کی کردار سازی کی تھی، اس لئے اس کے اندر ایسی علم و آگہی اور فکر و نظر میں بالیدگی پیدا ہوگئی کہ خود اس کا اسوہ پوری دنیا کے لئے نمونہ بن گیا۔

اسلامی سلطنتیں جیسے جیسے وسیع ہوتی گئیں، نت نئے مسائل پیدا ہوتے چلے گئے اور یہیں سے اجتہادی عمل کا آغاز ہوا، قرآن فہمی کے لئے تفسیریں لکھی گئیں، سنت کی تشریح کے لئے اُصول مرتب کئے گئے، قرآن و حدیث کے احکام و مقاصد کو سمجھنے اور عقل سے قریب تر کرنے کے لئے علم کلام اور علم فقہ کی تدوین عمل میں آئی؛ چوں کہ یہ دور مسلمانوں کے لئے اقبال کا تھا، فکر و عمل میں زندگی اور پختگی تھی، وسائل کی کمی نہیں تھی؛ اس لئے اہل علم و فن نے نئے علوم و فنون کی تخلیق کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، دوسروں کے کار آمد علوم کو حاصل کیا اور ان میں موجود غلطیوں کی اصلاح کر کے دنیا کے لئے قابل استفادہ بنایا، اس کے بعد جب ملت اسلامیہ کے عروج و اقبال کا سورج ڈھلنے لگا اور نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا کہ مسلمانوں کے حصہ میں ذلت و پستی کے سوا کچھ نہیں بچا تو ہماری ملی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تو یہ رہا کہ ایک عرصہ تک زوال کا احساس نہیں ہوا، چند خدا شناس بزرگوں کو جب ملت کی تباہی کا ادراک ہوا، تو انھوں نے پہلے اسباب و عوامل پر غور کرنا شروع کیا اور پھر تجدید و اصلاح کے مقدس جذبہ کے ساتھ اپنی تحریک شروع کر دی، ایک جماعت تو اس طرف گئی کہ ماضی کی تاریخ کو فراموش کر کے از سر نو مسلمانوں کی فکری و عملی تنظیم ہونی چاہئے، اس خیال میں تقویت اس وجہ سے نہیں تھی کہ ماضی کو نظر انداز کر کے مستقبل کا لائحہ عمل قطعاً مستحکم نہیں ہوسکتا اور فکر و عمل میں جو توانائی تاریخ سے ملتی ہے وہ کسی اور طریقہ سے آنہیں سکتی، جس کا لازمی نتیجہ فکری سطحیت اور پھر وقتی و جوش و خروش کے بعد جمود و تعطل ہوتا، دوسری جماعت نے اسلام کے عروج و زوال کے اسباب و عوامل پر غور و خوض کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک مسلمانوں کا رشتہ قرآن و سنت سے مضبوط تھا اور ان کے فکر و عمل

میں قرآنی تعلیم کے سوا کچھ نہیں تھا، وہ کامیابی و سربلندی سے ہم کنار ہوتے چلے گئے؛ لیکن جب ان کی زندگی کا رشتہ قرآن وسنت سے ٹوٹنے لگا اور اسوۂ نبوی ﷺ پیش نظر نہیں رہا تو پھر ذلت و پستی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا؛ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ سب سے پہلے مسلمانوں کو قرآن کریم سے قریب کیا جائے؛ تاکہ ان کی زندگی کا نظام قرآن و حدیث کے قائم کردہ خطوط سے الگ نہ ہو اور ان کے اندر قرآنی تعلیم کی روح پیوست ہو جائے، مسلمانوں کو بتایا جائے کہ قرآن کریم کا نصب العین کیا ہے، قرآن کریم کا نزول کن مقاصد کے تحت ہوا ہے اور قرآنی نظامِ حیات کو تمام ادیان پر فوقیت حاصل کیوں ہے؟ ان سوالوں کے جوابات اطمینان بخش اسی وقت مل سکتے ہیں؛ جب قرآن کا نصب العین ہمارے پیش نظر ہو، جب قرآن کے مقاصد اور نصب العین کا علم ہوگا تو یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ قرآن اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہے اور اس طرح کی وضاحت کے بعد قرآن کریم کی حکمت بھی اساسی طور پر متعین ہو جائے گی، محدث اعظم حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس طرف خاص طور سے توجہ دی ہے؛ تاکہ قرآن کا حقیقی مقصد دنیا کے سامنے واضح انداز میں آسکے، آپؒ نے اپنی وقیع تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے باب ''الحاجة الی دین تنسیخ الادیان'' اور باب ''إقامة ارتفاقات'' میں قرآنی مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ازالۃ الخفاء میں ''هُوَ الَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ '' (التوبۃ:۳۳) کی تفسیر میں بھی اس موضوع پر آپؒ نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے، قرآن کریم کے مقاصد کا تعین آپؒ نے جس محققانہ انداز میں کیا ہے، وہ صرف آپؒ ہی کا حصہ ہوسکتا ہے، اس سلسلے میں ''بدور بازغہ'' اور ''تفہیمات الٰہیہ'' میں بھی تفصیلات موجود ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے جہاں کہیں بھی قرآن کے مقصد کا تعین کیا ہے؛ وہاں اس امر کی بھی وضاحت فرمادی ہے کہ قرآن کی بنیادی حکمت کیا ہے، یہ اتنا بڑا علمی کمال ہے کہ جس کا شرف حضرت شاہ صاحبؒ کے علاوہ متقدمین میں بھی کسی مفسر کو حاصل نہیں ہے، آپ کی اس حکمت کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو قرآن فہمی میں پھر کوئی دشواری نہیں ہوسکتی اور جب قرآن کریم تحت اللفظ سمجھ میں آجائے گا تو اس کا مقصد اور نصب العین بھی خود بخود واضح ہوتا چلا جائے گا۔

قرآن کریم اپنے عظیم پیغام کے ذریعہ پوری انسانیت کو ایک نقطہ پر جمع کرنا چاہتا ہے، جس کے لئے ایک عالمگیر انقلاب کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور وہ انقلاب ہے پوری انسانیت کا ''دین حق'' پر آجانا اور سبھی مذاہب وادیان پر اس دین کا غلبہ، قرآن کریم کا یہ نصب العین اس آیت سے واضح ہے:

هُوَ الَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۔ (التوبۃ:۳۳)

روئے زمین پر بے شمار قومیں آباد ہیں اور ہر ایک کے قومی افکار و اعمال ہیں، جو کسی مذہب کے اختیار کرنے سے پیدا ہوئے ہیں، اب قرآن کریم تمام مذاہب و ادیان پر دین حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے، جس کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں: پند و نصائح اور جنگ و جدال، ظاہر ہے کہ ہر قوم اپنے آباء و اجداد کے عقیدہ کو اتنا آسانی سے نہیں چھوڑ سکتی؛ اس لئے وعظ و ارشاد کے ذریعہ دین حق کا غلبہ ممکن نہیں ہے، اب دوسری صورت ''جہاد'' کی ضرورت پڑے گی قرآن کریم نے ''وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ'' سے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ مشرکوں کے لئے دین حق کا غلبہ باعث کراہت ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ عالمگیر انقلاب کے لئے کسی قوم کی رغبت و رضا کا اگر خیال رکھا جائے تو پھر عالمی سطح پر تحریک کی کامیابی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

اس عالمگیر انقلاب کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ پہلے مطمح نظر کا تعین ہو، اس کے بعد پروگرام مرتب ہو اور پھر اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ورکنگ کمیٹی ہو، قرآن کریم نے ان چیزوں کی طرف واضح طور پر رہنمائی فرمائی ہے ''لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ'' کے ذریعہ نصب العین کا تعین ہوتا ہے اور اسی آیت کے ذریعہ پروگرام کا بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کے ذریعہ جو دین حق دنیا میں آیا، اس کا کیا پروگرام ہے، اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے قرآن کریم نے جس جماعت کا انتخاب کیا ہے، اسے ''یا ایھا الذین آمنوا'' سے خطاب کیا ہے اور ''وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ'' (التوبۃ:۱۰۰) سے اس جماعت کے افراد کا تعین کیا ہے، اس کاز کو آگے بڑھانے اور کسی زمانہ یا عہد کی بندشوں کو ختم کرنے کے لئے ''وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ'' (التوبۃ:۱۰۰) فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام کی یہ تحریک اسی وقت مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھ سکتی ہے، جب صحافت اور ذرائع ابلاغ کے تعلق سے ہمارے پاس مکمل رہنمائی ہوگی اور اس کے لئے جب ہم قرآن مجید کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمیں صحافت کا ایک مکمل ضابطہ اخلاق نظر آتا ہے، جس کے ذریعہ اسلامی نصب العین کی تکمیل اور انسانیت کی فلاح و بہبود، امن وخوش حالی اور ترقی و کامرانی کی راہیں آسان ہو سکتی ہیں، قرآن کریم ہمیں ایک مکمل اطلاعاتی نظام پیش کرتا ہے، جس سے غفلت نے ہمیں اسلامی سلطنت کے ایک مضبوط ترین ستون سے محروم کر دیا ہے اور پروپیگنڈوں کے اس دور میں قرآن کریم کی آفاقی تعلیم اس کے حقیقی پس منظر میں پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں، اس وقت ۹۰ فیصد ذرائع ابلاغ پر یہود و نصاریٰ کی اجارہ داری ہے، جس کی وجہ سے مسلم دنیا کی تصویریں مضحکہ خیز طریقہ سے دنیا کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے، دنیا میں اس وقت پانچ بڑے خبر رساں ادارے ہیں، جن میں مسلمانوں کی کوئی حصہ داری نہیں ہے، یونسکو کے سابق ڈائریکٹر جنرل جناب امدو مہتار نے

ایک کانفرنس میں ان خبر رساں اداروں کے بارے میں کہا تھا :

ترقی یافتہ ملکوں کے یہ خبر رساں ادارے اپنی اجارہ داری کو ہوشیاری سے ایسی خبریں منتخب کرنے میں استعمال کرتے ہیں، جن سے ترقی پذیر ممالک میں صرف نفاق، تناؤ، کشیدگی، پس ماندگی، ماردھاڑ، تشدد اور بدنظمی ظاہر ہو، یا ایسی خبریں جن سے اچنبھا ظاہر ہو اور وہاں کے حکمراں عجوبۂ روزگار نظر آئیں، وہ مثبت قسم کے واقعات، اخبار و احوال اور ترقی کے میدان میں ان کی تگ و دو کو قطعی نظر انداز کر دیتے ہیں اور چوں کہ غیر ترقی یافتہ ممالک میں علم و خبر کا رابطہ ان ہی خبر رساں اداروں سے قائم ہے اور ایک دوسرے کی سرگرمیوں کے متعلق علم ان ہی کی ارسال کردہ خبروں سے ہوتا ہے، جو اکثر و بیشتر صحیح نہیں ہوتا؛ لہٰذا جب وہ ان ناہموار آئینوں سے ایک دوسرے کا آئینہ دیکھتے ہیں تو انھیں اپنی شکلیں مسخ شدہ دکھاتی دیتی ہیں اور وہ انھیں سچ سمجھنے لگتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے پاس ان کی تصدیق کا کوئی اور ذریعہ یا پیمانہ نہیں ہوتا۔(۱)

اس کے برعکس قرآن کریم ہمیں ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری نصب العین سے متعلق یہ رہنمائی کرتا ہے کہ ہمارے پیش نظر رضائے الٰہی کا حصول ہو، آخرت کی نجات اور کامیابی کے لئے انسانوں کو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے روکتے رہیں، شہادت کو نہ چھپائیں، بھلائی کی سفارش کریں، حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہیں، ظالم حکمرانوں کے سامنے حق و انصاف کی بات کہنے میں دریغ سے کام نہ لیں اور کسی قیمت پر بھی برائیوں کی تائید اور جھوٹ کی تصدیق نہ کریں، یہاں تک کہ جان سے ہاتھ دھونا کیوں نہ پڑ جائے، قرآن کریم بھی ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے :

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ. (آل عمران:۱۱۰)

دنیا میں اب تم وہ بہترین جماعت ہو، جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ. (البقرۃ:۲۸۳)

(۱) نوائے وقت: ۲۷؍دسمبر ۱۹۸۴ء۔

اور ہرگز شہادت نہ چھپاؤ، جو ایسا کرتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے، اور اللہ
تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

مَّن يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُن لَّهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَن يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً
يَكُن لَّهُ كِفْلٌ مِّنْهَا ۔ (النساء:۸۵)

جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا، اور جو برائی کی سفارش
کرے گا، وہ اس میں حصہ پائے گا۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۔ (العصر:۳)

اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہو۔

''ذرائع ابلاغ''مملکت اسلامیہ کی ایک عملی ضرورت ہے، جس کے ذریعہ سلطنت کے احوال وکوائف کا علم ہوگا، ظاہر ہے کہ اطلاعات مثبت بھی ہوسکتی ہیں اور منفی بھی، جھوٹ بھی ہوسکتی ہیں اور سچ بھی، حقائق پر مبنی ہوسکتی ہیں اور پروپیگنڈوں سے آلودہ بھی؛ لیکن اسلامی صحافت وہی ہے، جو انسان کو تاریکی سے روشنی کی طرف لائے ''یخرجھم من الظلمات الی النور'' کی عملی تصویر ہو، لوگوں کو حالات وواقعات کی ٹھیک خبریں دے، اس حقیقت کی خوبصورت عکاسی مشہور صحافی محمد صلاح الدین نے اپنے مقالہ بعنوان''اسلامی معاشرہ میں ذرائع ابلاغ کا کردار''میں کی ہے :

> روشنی درحقیقت خبر ہی کا دوسرا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے ذریعے ہمیں اندھیرے سے نکال کر جس روشنی میں پہنچایا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کے جملہ صفات، آخرت میں اس کے حضور پیشی اور پھر جزا وسزا کے طور پر جنت اور جہنم کی زندگی سے متعلق ''خبر'' ہی تھی، جو ہمیں پہنچائی گئی اور اس مصدقہ خبر سے محرومی کی صورت میں ہم اندھیرے میں تھے، صحیح خبر پہنچانے ہی کی بناپر خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام مخبر صادق بھی ہے، خبر روشنی ہے اور بے خبری اندھیرا، اور یہ بھی ذہن نشیں کرلیجیے کہ روشنی انسداد جرائم کا سب سے بڑا اور موثر ذریعہ ہے، اندھیرا ہر مجرم کی بنیادی ضرورت، اس کا سب سے بڑا سہارا اور اس کا مضبوط ترین محافظ ہے، ہر مجرم خواہ وہ رشوت خور ہو، خائن اور چور ہو، زانی اور شرابی ہو، ملاوٹ، اسمگلنگ اور کم تولنے کا مرتکب ہو، تخریب کار، وطن دشمن اور بیرونی ایجنٹ

ہو، ان سب کی مشترکہ ضرورت اخفاء اور اندھیرا ہے، خبر اور روشنی ان کی موت ہے۔

اسلامی حکومت صحافت اور ذرائع ابلاغ کی آزادی کی پابند ہے؛ لیکن مطلق آزادی اسلام میں نہ فرد کو حاصل ہے اور نہ جماعت کو، نہ حاکم کو حاصل ہے اور نہ محکوم کو، اسلامی دائرے میں رہتے ہوئے جو آزادی حاصل ہے، وہ ہر کسی کا بنیادی حق ہے، صحافت کو اگر اپنی جائز حد سے تجاوز کا اختیار نہیں ہے تو حکومت کی جانب سے اس پر کوئی ناروا پابندی بھی نہیں لگائی جاسکتی، قرآن کریم کا ایک طرف واضح اعلان ہے :

وَلاَ يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلاَ شَهِيدٌ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ .

(البقرۃ:۲۸۲)

کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے، ایسا کرو گے تو گناہ کا ارتکاب کرو گے، اللہ کے غضب سے بچو۔

اس قرآنی اعلان میں اظہار رائے کی آزادی کو جہاں بنیادی حقوق قرار دیا گیا ہے، وہیں ایک جگہ یہ بھی ہدایت دی گئی ہے کہ بات کہنے میں حکمت وسنجیدگی اور وقار وشائستگی اختیار کی جائے، خبر کو سنسنی خیز بنانے کی قطعاً کوشش نہ کی جائے اور زرد صحافت سے گریز کیا جائے، یہی ایمانی تقاضا ہے، ارشاد ربانی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَقُولُوا قَوْلاً سَدِيداً . (الاحزاب:۷۰)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صاف سیدھی بات کیا کرو۔

صحافی کے لئے ضروری ہے کہ حرص وطمع سے اوپر اُٹھ کر کام کرے اور کسی ذاتی مفاد کی وجہ سے حق بات کو پس پردہ نہ ڈال دے، کسی مخصوص نظریہ کے تحت کوئی بات نہ کہی جائے؛ بلکہ غیر جانب دار ہو کر خبر رسانی کا فریضہ انجام دے، پاکیزہ اور اسلامی صحافت کے لئے یہ ناگزیر ہے، قرآن اس سلسلے میں ہمیں رہنمائی کرتا ہے :

وَلاَ تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللهِ ثَمَناً قَلِيلاً إِنَّمَا عِندَ اللهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ . (النحل:۹۵)

اللہ کے عہد کو تھوڑے سے فائدہ کے بدلے نہ بیچ ڈالو، جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم جانو۔

بخاری شریف کی روایت ہے، پیغمبر اسلام ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت سے جن باتوں پر بیعت کرتے ہیں، ان میں ایک یہ ہوتی ہے کہ کسی اچھی بات میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی نہ کرو گے؛ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو بات اچھی نہ ہو اس میں اللہ اور اس کے رسول نے اپنی اطاعت کو بھی جائز نہیں رکھا،

جب کہ اللہ اور اس کے رسول کسی غلط بات کا حکم دے ہی نہیں سکتے ، یہ حدیث ہمیں رہنمائی کرتی ہے کہ کسی صحافی کو ہرگز کوئی ایسی بات نہیں لکھنی چاہئے ، جو اس کے ضمیر کی آواز کے خلاف اور دین اسلام کے مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی ہوتی ہو، مشہور اسلامی اسکالر سید عبید السلام زینی لکھتے ہیں :

> عملی صحافت میں ایسے کئی سخت مقام آتے ہیں ، جہاں ایک عامل صحافی کو یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق عمل کرے یا وہ کچھ کرنے کے لئے تیار ہوجائے ، جس کی تائید اس کا ضمیر نہیں کرتا ، یہ سوال کبھی کسی شخص یا گروہ کی حمایت اور مخالفت کے معاملے میں سامنے آتا ہے ، کبھی کسی مضمون یا خبر کو چھاپنے کے سلسلے میں پیش ہوتا ہے اور کبھی کسی اخبار کی پالیسی کے مطابق کام کرنے یا نہ کرسکنے کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے پیدا ہوتا ہے ، ان میں سے ہر صورت دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتی ، ایک طرف ضمیر کے مطابق کام کرنے میں ملازمت کے چلے جانے سے لے کر جان جانے تک خطرات ہوتے ہیں ، اور دوسری طرف گونا گوں مالی اور مادی مفادات کا سبز باغ لہلہارہا ہوتا ہے ، اس امتحان و آزمائش میں صرف وہی صحافی پورے اُترتے ہیں ، اُتر سکتے ہیں ، جو با اُصول اور صاحب کردار ہوں ، جن کا اپنے نظریے پر پختہ یقین ہو اور جنھیں احساس ہو کہ بے اُصولی کے صلے میں حاصل ہونے والے مادی اور دنیوی فائدے دنیا ہی میں رہ جائیں گے اور صرف اس کا وبال نامۂ اعمال کا حصہ بن کر تا قیامت جائے گا۔(۱)

ذرائع ابلاغ کی بنیاد "قلم" پر ہے ، جس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ نے خود انسان کو قلم کے زور سے لکھنا پڑھنا سکھایا :

> اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ . (اقراء:۴-۵)
>
> جس نے قلم کے زور سے علم سکھایا ، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

قلم کا فن جب خود خالق کائنات نے انسان کو سکھایا ہے تو ظاہر ہے اس کے صحیح استعمال اور آداب کی طرف بھی مکمل رہنمائی کی ہوگی ، جس طرح قرآن وسنت کی تعلیمات اسلامی زندگی کے لئے مشعل راہ ہیں ، اسی طرح ایک قلم کار کے لئے قرآن وحدیث کا اُسلوب نگارش اور طرز تحریر معیار ونمونہ ہے ، جملہ معائب سے پاک اور ہر طرح کے

---

(۱) اسلامی صحافت :۸۱۔

محاسن سے آراستہ قرآن وحدیث ہر صاحبِ قلم سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کی تحریر زبان و بیان کی خوبی کے ساتھ اخلاقی خوبیوں کی بھی حامل ہو، اسلامی اُصول وآداب کی آئینہ دار اور بامقصد ہو، ایک قلم کار کی تحریر کا مقصد خلق خدا کی ہدایت ورہنمائی اور دنیا میں خیر وصداقت کا فروغ ہونا چاہئے، نیز قلم سے ہرگز ایسی بات نہیں نکلنی چاہئے، جو فتنہ وفساد کا سبب بن جائے، اس سلسلے میں قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے :

وَقُل لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوْا الَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّیْطَانَ یَنزَغُ بَیْنَهُمْ ۔ (بنی اسرائیل:۵۳)

اور اے محمد (ﷺ) ! میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں، جو بہترین ہو، دراصل یہ شیطان ہے، جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک مومن کی تحریر کا مقصد کیا ہونا چاہئے، خلق خدا کی ہدایت واصلاح اور فوز وفلاح جب پیش نظر ہوگی، تو پھر قلم کار دنیا میں بھی سرخرو ہوگا اور آخرت میں تو ثواب کا مستحق ہوگا ہی؛ اس لئے نیت بھی صاف ہونی چاہئے، جذبہ میں صداقت اور خلوص ہو اور ذاتی شہرت پیش نظر نہ ہو تو زبان وقلم بھی جہاد ہی ہوگا، پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی''۔(۱)

حمایت ومخالفت کے لئے بھی اسلام نے ایک پیمانہ مقرر کیا ہے کہ محبت وعداوت میں صرف خوشنودی رب پیش نظر ہونی چاہئے، حمایت ومخالفت کے تعلق سے قرآن کریم کی ان آیتوں سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے :

مَّن یَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَكُن لَّهُ نَصِیبٌ مِّنْهَا وَمَن یَشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَكُن لَّهُ كِفْلٌ مِّنْهَا ۔ (النساء:۸۵)

جو بھلائی کی سفارش کرے گا، وہ اس میں حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا، وہ اس میں سے حصہ پائے گا۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلاَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۔ (المائدۃ:۲)

نیکی اور خدا ترسی کے کاموں میں سب سے تعاون کرو اور گناہ وزیادتی کے کاموں میں کسی سے تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

نیکی میں تعاون کے ساتھ ہی یہ اُصول بھی پیش نظر ہونا چاہئے کہ کسی کی محبت یا دشمنی عدل وانصاف کی بات کہنے میں رکاوٹ پیدا نہ کردے، اس سلسلے میں قرآن یہ ہدایت دیتا ہے :

(۱) باوجود بحث کے یہ حدیث نہ مل سکی، مرتب۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى . (الانعام:۱۵۲)

اور جب بات کہو، انصاف کی کہو، خواہ اپنے رشتہ داروں ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو۔

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا . (المائدۃ:۸)

کسی طبقہ کی دشمنی تم کو انصاف سے پھر جانے پر مشتعل نہ کردے۔

انصاف کا تقاضا سچی شہادت اور حق کا اظہار ہے، حق بات کو اس طرح مسخ نہ کردیا جائے کہ وہ لوگوں کی نگاہ میں مشتبہ ہوجائے، جیسا کہ آج کی میڈیا کا وطیرہ بنا ہوا ہے، اس بارے میں قرآنی فکر واضح ہے :

وَلاَ تَلْبِسُوْا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُوْنَ . (البقرۃ:۴۲)

اور باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِيْنَ إِن يَكُنْ غَنِيّاً أَوْ فَقَيْراً فَاللّٰهُ أَوْلٰى بِهِمَا فَلاَ تَتَّبِعُوْا الْهَوٰى أَن تَعْدِلُوْا وَإِن تَلْوُوْا أَوْ تُعْرِضُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْراً . (النساء:۱۳۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو، اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو، فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی، یا سچائی سے پہلو بچایا، تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو اس کی خبر ہے۔

جب انسان عدل سے پہلوتہی اور کتمان شہادت کا ارتکاب کرتا ہے، تو اسے بہت سی جگہوں پر تحریف سے کام لینا پڑتا ہے، جو کہ صریح بددیانتی ہے، آج کل اسٹنگ آپریشن کو کامیاب بنانے کے لئے میڈیا کے لوگ اپنے مقصد کا اقتباس لیتے ہیں اور سیاق وسباق یا آگے پیچھے کی تحریروں کو حذف کردیتے ہیں، جو کہ صحافت کی روح کے منافی ہے، قرآن مجید میں آیا ہے :

مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ . (النساء:۴۶)

جو لوگ یہودی بن گئے ہیں، ان میں کچھ لوگ ہیں، جو الفاظ کو ان کے محل سے

پھیر دیتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا . (حٰم السجدۃ:۴۰)

جو لوگ ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں، وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

اگر اکثریت کی پسند خلاف حق ہو، تو ایسا نہیں ہے کہ حق بات سے انحراف کی گنجائش ہوگی، ایک صحابی کو وہی کہنا چاہئے، جس کی درستگی پر اسے مکمل یقین ہو، اس بارے میں قرآن مجید کہتا ہے :

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِيْ الْأَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَن سَبِيْلِ اللهِ إِن يَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُوْنَ . (الانعام:۱۱۶)

اور اے محمد (ﷺ)! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں، تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

اکثریت کے خلاف جانا اتنا آسان نہیں ہوگا، اس کے لئے فنی بصیرت کا مظاہرہ کرنا ہوگا اور حکمت و مصلحت کے ساتھ اپنی بات کہنی ہوگی، اسلام میں کوئی زور و زبردستی نہیں ہے، قرآن کریم میں درجنوں آیتیں ایسی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دعوت میں زور و زبردستی کرنے سے منع فرمایا ہے، اسلام کا یہ واضح اعلان ہے :

لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ . (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی زور و زبردستی نہیں ہے۔

فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ . (الکہف:۲۹)

جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کردے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اپنے نبی ﷺ کو ہدایت دی ہے کہ کسی بھی معاملہ میں اُلجھیں نہیں، پریشان نہ ہوں، آپ کسی کے پاسبان نہیں ہیں، آپ صرف خوش اُسلوبی کے ساتھ نصیحت کئے جائیں، کسی پر زور وزبردستی نہیں ہے اور نہ ہی جبراً آپ اپنی بات منوا سکتے ہیں، جو کوئی بھی ہم سے اعراض کرتا ہے اسے اپنے حال پر چھوڑ دو، جس کے پاس عقل و شعور اور فہم و بصیرت ہوگی وہ خود ہی حق کو پہچان لے گا، آپ کا کام صرف حق بات پہنچانا ہے، ارشاد باری ہے :

أُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ . (النحل:۱۲۵)

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو، ایسے طریقے پر جو بہترین ہو۔

صحافی کے لئے ضروری ہے کہ کہیں سے کوئی خبر ملے تو اسے بغیر تحقیق کے یقین نہ کرلے اور نہ ہی فوراً مسترد کردے؛ بلکہ اس کی تحقیق کے بعد ہی قبول یا رد کرنا چاہئے، اس سلسلے میں یہ آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے :

حَتّٰی إِذَا جَاؤُوْا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِيْ وَلَمْ تُحِيطُوْا بِهَا عِلْماً أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ . (النمل:۸۴)

یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے تو (ان کا رب ان سے) پوچھے گا کہ تم نے میرے آیات کو جھٹلا دیا؛ حالاں کہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا، اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کررہے تھے؟

آج کے مسابقاتی دور میں ایک دوسرے پر الزام تراشی بھی میڈیا والوں کے درمیان خوب چلتی ہے، آپسی رنجش اور چپقلش اس حد تک ہوتی ہے کہ ہر آدمی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کرتا ہے، اگر ایک میڈیا گروپ کسی ایک سیاسی جماعت سے وابستہ ہے تو دوسرا کسی اور سیاسی جماعت کا دامن تھام لیتا ہے، اس طرح سے خبر اور تجزیہ جانب دارانہ بن کررہ جاتا ہے اور خبر کے ساتھ جو انصاف ہونا چاہئے وہ نہیں ہو پاتا ہے، ارشاد ربانی ہے :

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلاَّ تَعْدِلُوْا . (المائدۃ:۸)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔

ایک صحافی کے لئے ضروری ہے کہ وہ عالی ظرفی اور بلند اخلاقی کا مظاہرہ کرے، کسی کی دشمنی اشتعال انگیزی پر مجبور نہ کردے، صبر کا دامن تھامتے ہوئے مخالف کا بھی احترام کرے، خواہ وہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو؛ کیوں کہ بحث وتکرار صحافت کے اُصول اور اس کی شائستگی وسنجیدگی کے منافی ہے، قرآن کہتا ہے :

وَلاَ تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِن دُوْنِ اللهِ فَيَسُبُّوْا اللهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ . (الانعام:۱۰۸)

اور اللہ کے سوا یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں، انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

ہاں! صحافت میں اتنی گنجائش اسلام میں بھی ضروری ہے کہ ظالموں کے خلاف آواز بلند کی جائے اور اسے لعن طعن کیا جائے، گرچہ اسلامی معاشرہ میں ہر کسی کو مکمل تحفظ حاصل ہے؛ لیکن ظالم نے خود اپنے کردار سے اس حصار کو توڑ دیا ہے؛ اس لئے اسے برا کہنے کی مکمل گنجائش ہے، قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے :

لَّا يُحِبُّ اللهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَن ظُلِمَ . (النساء:۱۴۸)

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔

آج جدید ذرائع ابلاغ کی دنیا میں یہ بات بہت پسندیدہ ہوگئی ہے کہ عالمی شہرت یافتہ لوگوں کی نجی زندگی میں تاک جھانک کیا جائے اور پھر نمک مرچ لگا کر ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے، کرکٹرز اور فلمی دنیا کے لوگوں کو یہ عام شکایت رہتی ہے کہ میڈیا کے لوگ ان کی نجی زندگی میں مداخلت کرتے ہیں اور خواہ مخواہ کا ٹوہ میں لگے ہوتے ہیں، اس طرح سے غیبت اور بدگمانی کی فضا قائم ہوتی ہے، ایسا کرنا صاف ستھری صحافت کی روح کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہے، اس بارے میں قرآن کا موقف بہت سخت ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوْهُ . (الحجرات:۱۲)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے، جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا، دیکھو! تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔

معیاری صحافت وہی ہے، جس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو، کسی کی تحقیر یا طعنہ زنی کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں ہے، اس سلسلے میں قرآن کریم میں واضح ارشاد موجود ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسٰى أَن يَكُوْنُوْا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسٰى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ . (الحجرات:۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو، ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے، جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں، وہی ظالم ہیں۔

صحافت میں انٹرویو کرتے وقت کبھی کبھی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت سے تلخ حقائق پر لوگ ناراض ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ رپورٹنگ کرنے والوں یا انٹرویو لینے والوں کو برا بھلا بھی کہہ دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں

سختی کا بدلہ نرمی سے دیا جانا چاہئے، جہالت کے سامنے مشتعل ہوکر سلیقہ مندی اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہئے، اگر ایسے افراد سے گفتگو کرنی مشکل ہو تو پھر سلام کرکے واپس آجانے ہی میں بھلائی ہے، ارشاد باری ہے :

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ . (الاعراف:۱۹۹)

اے نبی (ﷺ)! نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کئے جاؤ اور جاہلوں سے نہ اُلجھو۔

موجودہ صحافت میں پاکیزگی کا فقدان ہے اور بے حیائی اتنی عام کردی گئی ہے کہ اب اس میں کوئی برائی ہی نظر نہیں آتی، خواہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، ہر جگہ فحاشی کا بول بالا ہے، جس کی وجہ سے شرم وحیا اب ختم ہوچکی ہے، ایسی باتیں کرنے والوں کے لئے زمین تنگ کردی جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فحاشی کی مخالفت کرنے والا اس دنیا کا انسان ہی نہیں ہے، ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کے لئے یہ انتہائی خطرناک بات ہے، معاشرہ کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں پڑھا جانے والا اخبار غیر اخلاقی مضامین، جنسی معاملات کی ہیجان انگیز تفصیلات اور فحش تصویروں سے پاک ہو، اگر کوئی اخبار صرف سماجی برائیوں کو غیر معمولی طور پر اہمیت دے کر شائع کرے اور اس میں معاشرہ کی ہمہ جہتی ترقی کی کوئی خبر نہ ہو اور تعمیری مضامین کا بھی فقدان ہو تو قارئین میں اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس اخبار سے فطری طور پر دوری ہونے لگتی ہے، اخبار گھر میں جاتا ہے، جس پر چھوٹے بڑے ہر فرد کی نگاہیں پڑتی ہیں، اگر اس میں غیر اخلاقی مضامین یا فحش تصویریں ہوں، تو قارئین کو خفت اُٹھانی پڑسکتی ہے، اسی طرح الکٹرانک میڈیا میں ٹی وی چینلوں پر فحش مناظر آتے ہیں، خواہ وہ اشتہار ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہوں، تو ان سے بے حیائی پروان چڑھتی ہے اور معاشرہ میں اخلاقی قدریں پامال ہوتی ہیں، قرآن کریم نے فحاشی کی سختی سے مذمت کی ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے ذرائع ابلاغ میں بھی فحش و بے حیائی کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے :

إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ . (النور:۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے، وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوْا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ . (الانعام:۱۵۱)

اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔

اس وقت عالمی سطح پر صحافت کا جو ضابطۂ اخلاق مقرر ہے اور تعمیری صحافت کے لئے جو زریں اُصول بنائے گئے ہیں، وہ دراصل وہی ہیں، جو قرآن کریم نے انسانی دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں، اوپر قرآن کریم کے جن

احکامات کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہی عصر حاضر کے ذرائع ابلاغ کے لئے بھی زریں اُصول کی حیثیت رکھتے ہیں، یہاں ہمیں بتانا صرف یہ ہے کہ قرآن کریم جس طرح زندگی کے تمام شعبوں میں پوری انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے، اسی طرح ذرائع ابلاغ کے لئے ایک مکمل مستحکم نظام پیش کرتا ہے۔

ذیل میں ہم مروجہ ضابطۂ اخلاق کا تذکرہ کرر ہے ہیں؛ تا کہ اسے قرآنی احکامات کی روشنی میں سمجھا جا سکے، ڈاکٹر مسکین علی حجازی اپنی تصنیف ''فن ادارت'' میں ضابطہ اخلاق کے لئے مندرجہ ذیل اُصول پیش کرتے ہیں، ایک صحافی کے لئے ضروری ہے کہ :

- اپنا کام مشنری کے جذبہ کے ساتھ کرے۔
- دیانت داری کے ساتھ سچی اور صحیح معلومات دے۔
- خبروں اور دوسرے مواد میں اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق رنگ آمیزی نہ کرے۔
- کسی خاص نقطۂ نظر کی تشہیر کے لئے اطلاعات کو مسخ نہ کرے۔
- سنسنی خیزی کے لئے واقعات کی صحت کو مجروح نہ کرے۔
- قارئین کو گمراہ نہ کرے۔
- آزادی کے ساتھ کام کرے، خوف اور طمع کو قریب نہ پھٹکنے دے۔
- وسیع تر قومی وملکی مفادات کو ملحوظ رکھے۔
- صحافت کے مسلمہ فرائض کی ادائیگی کو مقصود نظر سمجھے۔

اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کو چھپانے یا اس پر اصرار کے بجائے اس کا اعتراف کرے اور اس کا ازالہ کرے۔

یہ ایسے اُصول ہیں جن کے گرد آج کی صحافت گھومتی ہے؛ لیکن عملی زندگی میں یہ اُصول کتنے کارفرما ہوتے ہیں اور موجودہ صحافت کس نہج پر کام کر رہی ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان دوستی اور بنی نوع انسان سے محبت و ہمدردی کے جذبات صحافی کے لئے مایہ بے بہا ہیں، صحافت اپنے میدان کے شہسواروں کو ایسے اُصولوں پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے، جو انھیں جوہر انسانیت سے آشنا کر سکیں، ظاہر ہے یہ سب جو اُصول ہیں، ان سے کہیں آگے بڑھ کر قرآن کریم ہمیں ایسے اُصول پیش کرتا ہے، جن پر چل کر ہم میں کا ہر فرد انسانی مجد و شرف سے ہم آغوش ہو جائے گا، اسلام کی نگاہ میں صحافت کا مقصد رضاء الٰہی کا حصول ہے، آخرت کی نجات ہے، بھلائی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا ہے، شہادت کو نہ چھپانا اور بھلائی کی سفارش کرنا ہے، حق کی

نصیحت، صبر کی تلقین اور ظالم حکمرانوں کے سامنے حق وانصاف کی بات کرنی ہے، برائیوں کی تائید اور جھوٹ کی تصدیق نہ کرنا ہے، حق کی خاطر جان کی بھی پرواہ نہ کرنا اور فحاشی وعریانیت سے مکمل اجتناب کرنا ہے۔

امریکہ میں مقرر کردہ ضابطۂ اخلاق میں بنیادی طور پر پریس کی آزادی اور خبر کی صحت پر توجہ دی گئی ہے، جس کی طرف اسلام نے خود بہت زور دیا ہے، خبر کی صحت کو یقینی بنانے کے لئے قرآن کریم یہ فارمولہ پیش کرتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ . (الحجرات:٦)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیماں ہو۔

یہ آیت کریمہ صحت خبر کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے، آج دنیا میں ابلاغ کے جتنے ذرائع موجود ہیں، ان کے یہاں بنیادی طور پر سب سے زیادہ اہمیت خبر کی صحت اور اخلاقی قدروں کا تحفظ ہے، جس کی طرف اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے اور قرآن کی بہت سی آیتیں ہمارے لئے رہنما اُصول پیش کرتی ہیں؛ لیکن بدقسمتی سے آج کی ترقی یافتہ صحافت اپنے اُصول ومنہج سے الگ ہوکر اخلاق باختگی کی شکار ہوچکی ہے، جس کی وجہ سے فحاشی ومنکرات فروغ پارہے ہیں، اسلام برائی کے فروغ کو قطعی طور پر حرام قرار دیتا ہے اور ان راستوں کو بند کرتا ہے، جو بے حیائی وفحاشی کی طرف لے جاتے ہیں، قرآن کریم ہمیں جن ذرائع ابلاغ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اگر انھیں اپنا لیا جائے، تو پورا معاشرہ صالحیت اور پاکیزگی کی عطر بیزی سے مہک اُٹھے گا اور اسلامی تعلیمات کی ضیاء پاش کرنوں سے پورا عالم منور ہوجائے گا۔

⊙ ⊙ ⊙

کتابیات

(١) بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانویؒ۔
(٢) تفہیم القرآن: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔
(٣) اسلامی سیاست: مولانا گوہر رحمانی۔
(٤) اسلامی صحافت: سید عبید السلام زینی۔
(٥) رہبر اخبار نویسی: ڈاکٹر سید اقبال قادری۔
(٦) فن ادارت: ڈاکٹر مسکین علی حجازی۔
(٧) ابلاغ عامہ: پروفیسر مہدی حسن۔
(٨) تصویر کے شرعی احکام: مولانا مفتی شفیع۔
(٩) حجۃ اللہ البالغہ: حضرت شاہ ولی اللہ۔
(١٠) رحمۃ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ: مفتی سعید پالن پوری۔
(١١) التفہیمات الالٰہیہ: حضرت شاہ ولی اللہ۔
(١٢) البدور البازغۃ: حضرت شاہ ولی اللہ۔

قرآن مجید اور ذرائع ابلاغ کے آداب

جناب صفی اختر⊙

آج سائنس اور تکنیکی ترقی کی انتہا کا دور ہے، گلوبلائزیشن (عالمگیریت)، انڈسٹریالائزیشن (صنعت کاری) اور Privatization (نج کاری) نے دنیا کو سمیٹ کر ایک گلوبل ولیج (Global Village) بننے پر مجبور کر دیا ہے، سائنس وٹکنالوجی کے زمانے میں تہذیب کی قدروں کو سنبھالتے ہوئے زندگی کے نئے پن کے ساتھ قدم بہ قدم ملا کر چلنا بھی ضروری ہے، الیکٹرانک اپلائنس یا وسائل تو ہماری معلومات بڑھانے کے لئے ہیں، ان سے لازماً فائدہ اُٹھانا چاہئے، انھیں چھوڑ کر مذہب یا قدیم تہذیب کی آڑ میں چھپ جانے میں نہ تو انسانیت کی بھلائی ہے اور نہ ہی ملک وقوم کی، آج Tele-Conferencing کا زمانہ بھی ہے، جس سے ساری دنیا کے لوگ جڑتے ہیں، انٹرنیٹ کے Chat-room سے ایک ہی وقت میں بہت سے ممالک کے لوگوں سے باتیں کی جاسکتی ہیں، دنیا کے کونے کونے سے خیالات کا جس انداز میں تبادلہ ہو رہا ہے، چھوٹے چھوٹے بچے تک اس سے جڑ گئے ہیں، پہلے ذریعۂ ترسیل صرف پرنٹ میڈیا ہی تھا، مگر آج ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ کی وجہ سے کوئی بات اگر غلط ہوتی بھی ہے، تو اتنی ہی تیزی سے اس کو روکا جاسکتا ہے، سکنڈوں میں اس کا پروٹسٹ ہوتا ہے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں ٹیکنالوجی کی ترقیات سے غیر معمولی فائدے ہیں، وہیں اس کا دوسرا منفی پہلو بھی ہے، یعنی ہم تہذیب کش دور سے گزر رہے ہیں، صورتِ حال یہ ہے کہ ہم کیبل، ٹی وی، موبائل فون اور کمپیوٹر کے اس دور میں ٹی وی چینلوں اور انٹرنیٹ موبائل سے عریانیت کو دور نہیں کر سکے، کسی قوم کی اخلاقی قدروں اور اُصولوں کی اساس اور بنیاد اس کا عقیدہ اور نظریۂ زندگی ہوتا ہے، جس کے بدل جانے سے پورا نظام اخلاق بدل جاتا ہے، صحافت اور ذرائع ابلاغ بھی جدید معاشرے کا نہ صرف اہم شعبہ ہیں؛ بلکہ یہ دوسرے تمام شعبوں پر اثر انداز ہو کر ان کی صورت گری کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں، اسی صحافت سے خواص کی فکریں منظم ہوتی ہیں، فاصلے سکڑ

⊙ اسسٹنٹ ایڈیٹر: ماہنامہ ملی اتحاد، نئی دہلی۔

جاتے ہیں، دور دراز کی قوم ایک دوسرے سے قریب آ جاتی ہے، اسی سے تاریخ مرتب ہوتی ہے اور اسی سے بڑے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں، ابلاغ وصحافت وہ قوت محرکہ ہے جس سے دنیا کے مختلف معاشروں میں مختلف ادوار میں سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور تمدنی انقلاب رونما ہوتے ہیں، اس لئے اس شعبہ کا اسلامی بنیادوں پر استوار ہونا نہایت ضروری ہے، اگر ہم شعوری طور پر صحافت کے اسلامی اُصولوں پر عمل کرنے لگیں تو بہت سی اخلاقی خرابیاں دور ہو سکتی ہیں اور صحافت کے ذریعہ سے ملک میں پاکیزہ ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملکوں میں دانستہ یا نادانستہ بڑی حد تک صحافت کے مغربی ضابطۂ اخلاق پر عمل ہو رہا ہے؛ حالاں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم صحافت کے شعبے میں رہنمائی کے لئے بھی قرآن وسنت سے رُجوع کریں، عصر حاضر میں قرآن اور اس کی تعلیمات کے تناظر میں ہی زندگی کے مختلف شعبہ جات کے لئے بھی طریق کار وضع کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ قرآن کریم کی روشن تعلیمات، انسانیت کی فوز وفلاح اور تحفظ حقوق انسانی کی ضامن ہیں، اس میں مسائل ومشکلات کی عقدہ کشائی کا وافر سامان موجود ہے، اسے پوری انسانیت کے لئے نسخۂ شفا ہونے کا شرف حاصل ہے اور قیامت تک اس کے مالک نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، یہ کتاب ان تمام لوگوں کے لئے چشمۂ صافی ثابت ہوتی ہے، جو متلاشیِ حق اور جویائے ہدایت ہیں، مسلمانوں کے مذہبی افکار میں بہت سی مشکلات اس لئے حائل ہوگئی ہیں کہ براہ راست قرآن سے استفادہ نہیں کیا گیا، حالات متقاضی ہیں کہ اہل صحافت کو صحافت کے اسلامی اُصولوں سے روشناس کرایا جائے؛ تاکہ اگر وہ اس خاص شعبہ میں بھی اسلام کے مطابق عمل کرنا چاہیں تو انھیں آسانی ہو، بایں معنی کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ پر گامزن ہونے کی صورت میں صحافت یا ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اسلام کے نظریۂ ابلاغ کو پوری صراحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

اسلام کا نظریۂ ابلاغ دوسرے تمام نظریات سے الگ اور منفرد ہے، ایک صحیح اسلامی معاشرے میں صحافت کو ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی روشنی اپنانا ہوگی اور یہ کام ایک فریضہ کے طور پر کرنا ہوگا، نیز صحافت اور ابلاغ عامہ کے بنیادی وعصری مسائل کو اسلامی نظریۂ حیات اور اُصول وتعلیمات کی روشنی میں آگے بڑھانا ہوگا، اسلام سے قبل کے دور میں ایران کے بادشاہوں کو مملکت کے ہر حصے کی خبریں مہیا کرنے کے لئے خبر ناموں کی اشاعت کی ضرورت ہوتی تھی، اس مقصد کے لئے مختلف مقامات پر تعینات کئے جانے والے پرچہ نویس ''اخبار نویس'' کہلاتے تھے، اس ضرورت کو جناب نبی کریم ﷺ کے عہد میں اور بعد میں خلفائے راشدین ؓ کے دور سعادت میں بھی محسوس کیا گیا، آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ بھی حالات وواقعات سے باخبر رہنے کا اہتمام فرماتے تھے، حضرت عمر ؓ تو خود راتوں کو گشت کرکے عامۃ المسلمین کا حال جاننے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ مجدد دین حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رسالہ ''اخبار بنی'' سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی ایک تحریر'' آداب الاخبار''میں یوں رقمطراز ہیں :

حضور سرور کائنات ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اپنی اسلامی برادری کے اخبار واحوال پر مطلع ہونے اور کرنے کا اہتمام اس لئے فرماتے تھے کہ مطلع ہوکر مظلوم کی دادرسی، بیمار کی عیادت، ضعفاء کی اعانت محتاجوں کی امداد کرنے کے لئے ہر قسم کے مادی اور روحانی ذرائع استعمال کئے جائیں اور اگر کسی کی مادی اعانت پر قدرت نہ ہوتو کم از کم دُعا سے اس کے غم میں شریک ہوجائیں۔

جہاں صحافت، حالات کی ترجمانی نیز انسانی آدرشوں اور جمہوری قدروں کی تعمیر وتشکیل میں اہم رول انجام دیتی ہے، وہیں صحافتِ اسلامی، معاشرے اور رائے عامہ کی تشکیل اور تطہیر کا فریضہ انجام دینے کے علاوہ ایک اور پہلو سے بھی اس کی ایک بنیادی اور ناگزیر ضرورت کو پورا کرتی ہے اور وہ پہلو اسلامی نظام حکومت کی یہ عملی ضرورت ہے کہ اسلامی مملکت کے تمام شہری حالات اور واقعات اور اس کے پس منظر سے کما حقہ واقف وآگاہ ہوں؛ تاکہ وہ قرآن مجید کے مطابق اپنے اولی الامر کو مفید اور باصواب مشورے دے سکیں، جس آدمی کو کسی درپیش مسئلہ کی اہمیت اور پس منظر کا علم نہ ہو، جو کسی پیش آمدہ واقعہ کے سیاق وسباق کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو، وہ اس کے بارے میں کیسے کوئی رائے قائم کرسکتا ہے اور کس طرح کوئی مفید مشورے دے سکتا ہے؛ جب کہ اسلام میں مشورہ لینے اور مشورہ دینے کو لازم قرار دیا گیا ہے۔

سورہ آل عمران کی آیت نمبر:۱۵۹ میں خود رسول کریم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ '' دین کے کام میں (انتظامی اُمور میں مسلمانوں) کو بھی شریک مشورہ رکھو، سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر:۳۸ میں اہل ایمان کی بہترین صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ ''(وہ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں)، مشاورت کی اسی اہمیت ہی کی بنا پر اسلام کے نظام خلافت کو نظام شورائیت بھی کہا جاتا ہے، قرآن کے اس ارشاد میں مشورے سے معاملات چلانے کا مطلب مشورہ لینا ہی نہیں، مشورہ دینا بھی ہے، معاملات کو چلانے کے ذمہ دار شخص یا اشخاص پر جہاں مشورہ لینے کی پابندی لگائی گئی ہے، وہیں شریک مشورہ لوگوں پر بھی لازم کیا گیا ہے کہ وہ بھی پورے اخلاص اور احساس ذمہ داری کے ساتھ مشورہ دیں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے یا غلط مشورہ دیتے ہیں تو نہ صرف ''شُوْرٰى بَيْنَهُمْ '' کا مقصد پورا نہ ہوگا؛ بلکہ وہ ایسا کرکے اللہ کے نزدیک قابل مواخذہ بھی ٹھہریں گے۔

اس ''شوریٰ بینهم'' کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ جس معاملے کا جتنے زیادہ لوگوں سے تعلق ہو، ان سب کو شریک مشورہ کیا جائے اور اگر زیادہ تعداد ہونے کی وجہ سے سب سے مشاورت ممکن نہ ہو، تو جو ان کے معتمد علیہ ہوں اور انھیں تمام حالات و واقعات سے، مسائل و معاملات سے پوری طرح باخبر کرنے اور رکھنے کا اہتمام کیا جائے، صحافت اسی ضرورت کو بطریق احسن پورا کرتی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اسلام سے قبل عرب معاشرے میں اکثر تنازعات و منافسات —— جو صدیوں کی دشمنیوں پر محیط تھے —— کی اساس و بنیاد جھوٹی خبروں کی اشاعت و تشہیر تھی، جس پر اسلام نے قدغن لگا دی اور قرآن کریم نے صاحب قرآن جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے توسل سے آنے والی نسلوں کو جن میں سے کچھ افراد جنھوں نے پیشۂ ابلاغ اختیار کیا، انھیں ایک مکمل ضابطۂ اخلاق اور اُصول بھی دیا، پیغام حق ہے کہ :

إِن جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ . (الحجرات:٦)

جب تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اچھی طرح چھان بین کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں ندامت اُٹھانی پڑے۔

جس طرح غلط مشورہ دینا، غلط اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے، اسی طرح خلاف حقیقت، گمراہ کن اور تہذیب و شائستگی کے منافی اطلاعات و خیالات جن سے ''فساد في الأرض'' کا اندیشہ ہو، پھیلانا بھی صحیح نہیں ہوسکتا، حالات و واقعات اور حقائق کی خبر بلاشبہ ذہنوں کے لئے روشنی کی مانند ہے؛ لیکن جن اطلاعات سے ذہنوں میں اُجالے کی بجائے اندھیرا چھا جاتا ہو، ان کو عام کرنا بھی کوئی اچھا فعل نہیں ہوسکتا، صحافت یہ دونوں کام کرتی اور کرا سکتی ہے؛ لیکن اچھی اور اسلامی صحافت وہی ہے، جو ذہنوں میں اُجالا کرے، روشنی سے محروم کو روشنی مہیا کرنا ایک عظیم الشان کام ہے، جو اللہ تعالیٰ خود بھی کرتا ہے، ارشاد ربانی ہے :

اللهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا أَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُوْنَهُم مِّنَ النُّوْرِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُوْلَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ . (البقرة:٢٥٧)

جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جانے والے لوگ ہیں،

یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لانے اور راہ ہدایت دکھانے کا فریضہ نبی کریم ﷺ کے سپرد بھی کیا گیا ہے:

الٓرٰ کِتَابٌ اَنزَلْنَاہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّھِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ . (ابراہیم:۱)

الف، لام، را، اے محمد (ﷺ)! یہ ایک کتاب ہے، جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے؛ تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ، ان کے رب کی توفیق سے، اس خدا کے راستے پر، جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔

صرف اللہ اور رسول ﷺ ہی نہیں، قرآن مجید بھی اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لانے والی کتاب ہے، فرمایا گیا:

قَدْ جَاءَ کُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْراً مِّمَّا کُنتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتَابِ وَیَعْفُوْ عَن کَثِیْرٍ قَدْ جَاءَ کُم مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَکِتَابٌ مُّبِیْن .

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں، سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اُجالے کی طرف لاتا ہے اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ (المائدہ:۱۵-۱۶)

کتاب اللہ کی علمی عظمت پر یہ ارشاد نبوت شاہد عدل ہے کہ:

لا تنقضي عجائبه ، ولا يخلق عن كثرة الرد . (۱)

یہ قرآن وہ ہے جس کے عجائبات علمی کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں اور نہ ہی یہ کتاب کبھی پرانی پڑنے والی ہے۔

یعنی آپ ﷺ کی سیرت کے عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں اور آپ ﷺ کی سیرت کبھی پرانی پڑنے والی نہیں ہے۔

سیرت النبیؐ (۶/۲۴) میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں کہ:

محمد رسول اللہ ﷺ کی درسگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ایک عمومی جامعہ ہے، خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے، جس کے اندر علم وفن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر

(۱) سنن الترمذی:۲۹۰۶، عن علیؓ۔

قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔

حالات پر نظر رکھنے والے یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج پوری دنیا اور امریکی ذرائع ابلاغ کی اساس ہی کذب وافتراء اور دروغ گوئی پر ہے، وہ جھوٹی خبریں گڑھتے ہیں اور اس ملمع کاری سے ان کی اشاعت وتشہیر کرتے ہیں کہ عام لوگ ان کے دام میں آجاتے ہیں اور آپس میں خواہ مخواہ دست وگریبان ہونے لگتے ہیں، آج جتنے بھی بین الاقوامی یا بین المملکتی نزاع ہیں، وہ سب کے سب ان ہی جھوٹے پروپیگنڈوں کے ہی مرہون منت ہیں۔

ابتدائے اسلام سے آج تک کوئی بھی دور ایسا نہیں گزرا، جس میں ان سازشیوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش نہ رچی ہو، ڈنمارک میں رسول اکرم ﷺ کی شان میں قابل مذمت کارٹون کی اشاعت کے بعد ایک طوفان کھڑا ہو گیا اور جگہ بہ جگہ مظاہرے اور احتجاج ہوئے، اس پر بعض عناصر نے یہ ردعمل ظاہر کیا کہ انھوں نے اپنی معلومات کے حساب سے یہ کام کیا ہے اور یہ ان کی رائے کا بس ایک اظہار ہے، علامہ یوسف قرضاوی نے قابل مذمت کارٹونوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یورپی زبانوں میں اسلامی تاریخ اور سیرت کو پیش کیا جائے، اس خالی جگہ کو پر ہونا چاہئے اور اسے اولیت دی جانے چاہئے، یورپی زبانوں میں سیرت کی کتابوں کو منتقل کیا جائے اور سیرت کی کتابوں کو لکھتے وقت مغربی ذہن کو سامنے رکھا جائے اور ایسا علمی اُسلوب اختیار کیا جائے جس سے ذہنوں میں موجود شکوک وشبہات رفع ہوں اور یورپ خاموش ہی نہ ہو؛ بلکہ اس کا دل پوری طرح مطمئن بھی ہو جائے اور ان ساری معلومات کا ذریعہ آج کا ذرائع ابلاغ نیز الیکٹرانک میڈیا ہی ہے؛ لہٰذا مخالفین کا توڑ بھی ان ہی راستوں سے ممکن ہوگا، عالم اسلام اور مغرب کے تعلقات گذشتہ قدیم تاریخ پر قائم ہیں؛ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اب نئے سرے سے زمانۂ حال کے مطابق تعلقات استوار ہوں جس کے لئے ذرائع ابلاغ کی سطح پر ہمیں بھی مستعد اور الرٹ رہنے کی ضرورت ہوگی۔

کسی واقعے یا بیان یا اطلاع کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ آیا وہ خبر بھی ہے اور خبر ہے تو کس اہمیت کی ہے، ایک صحافی (نامہ نگار، معاون مدیر اور نیوز ایڈیٹر) کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے؛ کیوں کہ جب تک یہ معلوم نہ کہ کس واقعہ یا اطلاع میں خبر کی کونسی بات ہے، خبر لکھی ہی نہیں جاسکتی، یہ بھی مطمح نظر رہے کہ کس خبر کی اشاعت سے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور کس کی اشاعت اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔

ایک مسلمان صحافی کا فرض ہے کہ وہ قومی یکجہتی اور ملی اتحاد کو فروغ دے، اس کی تحریریں قومی اتحاد کا سبب بنیں، نہ کہ قوم میں انتشار وافتراق اور دیگر قسم کے فسادات کا سبب بنیں، ایک صحافی کو چاہئے کہ اپنے زور قلم سے عدل

واحسان اور صلہ رحمی کی خوبیوں کو لوگوں کے ذہنوں میں زیادہ سے زیادہ راسخ کرے؛ تاکہ معاشرے میں محبت، اُخوت اور بھائی چارے کی فضا پروان چڑھے، صحافت کے اُصول میں ایک چیز یہ بھی ہے کہ مخالف خواہ کیسی ہی غلیظ اور اشتعال انگیز زبان استعمال کرے، کیسے ہی غلط الزامات لگائے، ایک مومن صحافی کو بہر حال عدل واحسان سے ہی کام لینا چاہئے، قرآن کریم کی تعلیمات کی رو سے مومن کی حرمت کا خیال بے حد ضروری ہے، ''کنز العمال'' میں تحریر ہے کہ ''مسلمان، وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں''(۱) آج حالات یہ ہیں کہ ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنا دینے کے واقعات بکثرت ظہور میں آرہے ہیں؛ چنانچہ ہماری منصبی ذمہ داری ہے کہ ہم آخرت کی جوابدہی کا ادراک کریں اور کسی کے حقوق پر اگر قدغن لگائی جارہی ہے اور حق کو ناحق بنانے کا سلسلہ ہے تو اس کے خلاف ہم اپنی صحافتی ذمہ داری ادا کریں؛ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی فکر رکھنے والے نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیشۂ صحافت اختیار کریں اور بے جا پروپیگنڈوں کا مثبت جواب دیا جائے، پابند اسلام صحافت کے لئے ضروری ہے کہ جو بھی اہمیت رکھنے والی خبر یا مواد شائع کیا جائے اس کی صحت، افادیت اور پس پردہ غایت کے بارے میں ہر ممکن طریقے سے اطمینان کرلیا جائے اور ایسی کوئی بات شائع نہ کی جائے جو درست نہ ہو، جو اسلامی احکام وعقائد کے منافی ہو، جس سے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچ سکتا ہو، جس سے حقوق العباد کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو، جس سے عصبیت پھیلنے اور فتنہ کھڑا ہونے کا احتمال ہو اور جس سے کسی کی رسوائی اور دل آزادی ہوسکتی ہو، اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا کوئی صحافی تو یہ حرکت کبھی نہیں کرسکتا۔

رپورٹر (وقائع نگار) چوں کہ خبر کی فراہمی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، اس لئے اس کو خبر کی صحت کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھنا چاہئے، خبر کی صحت کا تقاضا ہے کہ جو بھی اطلاع ملے، اسے خوب چھان پھٹک لیا جائے، سورۂ نمل، آیت نمبر:۸۴ کے مطابق :

> حَتّٰی إِذَا جَاؤُوْا قَالَ أَكَذَّبْتُم بِآيَاتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْماً أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُوْنَ .
>
> یہاں تک کہ جب سب آجائیں گے، تو (ان کا رب ان سے) پوچھے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا؛ حالاں کہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟ اگر نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟

---

(۱) صحیح بخاری: ۱۰ عن عبداللہ بن عمروؓ۔

یعنی جب کوئی خبر یا اطلاع یا نظریہ پیش کیا جائے تو اسے خود بھی خوب غور و فکر اور تحقیق و تجزیے کے بعد قبول کیا جائے اور اس کے بعد ہی دوسروں کے سامنے پیش کیا جائے، ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے کہ جہاں کوئی بات پتہ لگی، بس اسے لے اُڑے۔

رپورٹر یا اخباری نمائندے کا کام یہ ہے کہ وہ اطلاع یا پیغام کو کسی رنگ آمیزی کے بغیر معروضی انداز میں پیش کرے اور اس میں اپنی طرف سے کوئی تبصرہ یا حاشیہ آرائی نہ کرے؛ کیوں کہ اس پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے، رپورٹنگ کرنے والوں کو اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے اس بات کو بھی اُصول کے طور پر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ خبر میں منکرات اور معصیت کی باتوں کا ذکر اس طرح نہ آئے جس سے لوگوں کو برائی کی ترغیب ہو، یا وہ کسی برے فعل کے مرتکب شخص کو ہیرو سمجھ بیٹھیں، گو کہ صحافت آج ایک کاروبار بنتا جارہا ہے، تاہم ضرورت متقاضی ہے کہ نظریہ اور جد و جہد کی کشمکش بھی زندہ رہنی چاہئے اور تجارت کو ثانوی درجے میں آنا چاہئے، تمام انحطاط کے باوجود الحمدللہ اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں، جو بنجر زمین کو بھی کشت زار میں بدل سکتے ہیں اور بلاشبہ ضمیر کی آواز حق سے وہ کسی بھی لمحہ غافل نہیں ہیں، آج کا ذرائع ابلاغ جس طرح گھٹیا اور غیر ذمہ دارانہ رول ادا کرنے میں لگا ہے، نیز سنسنی، بے چینی، افراتفری اور نفاق و تفریق پھیلانے کو ہی اپنا مقصد ابلاغ قرار دے دیا ہے، اشد ضرورت ہے کہ صحافت کے قبلہ کو صحیح سمت دی جائے، ہم قوم کو سیاسی اور جمہوری شعور و آگہی دیں؛ تاکہ ہمارے لئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عظیم فریضہ بھی انجام دینا ممکن العمل ہو سکے۔

⊙ ⊙ ⊙

پانچواں باب

قرآن مجید اور غلط فہمیاں

علت القتال کیا ہے؟ کفر، شوکت کفر، یا محاربہ؟
جہاد کی آیات اور ان کے پس منظر کی روشنی میں!

مولانا یحییٰ نعمانی⊙

تمہید وخلاصہ

اس مضمون میں قرآن وسنت وسیرت نبوی کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ (’فتنہ‘ اور ظلم کے علاوہ) محاربہ علت القتال ہے، اسلام نے (بشرط قدرت) دفاعی جنگ کا بھی حکم دیا ہے اور اقدامی کا بھی؛ لیکن بامعنی صلح کی خواہش مند غیر مسلم ریاست سے جنگ کی اجازت نہیں ہے۔

مقالہ نگار کے نزدیک جہاد کی یہ تعبیر وتشریح کہ مسلمانوں کو مشرق ومغرب کے ہر کالے اور گورے غیر مسلم ملک پر، چاہے وہ جنگجو ہو یا صلح جو، جنگ کرنے کا حکم ہے، اسلام دشمن لابیوں کی خدمت انجام دینا ہے کہ وہ ساری دنیا کو مسلمانوں کی دشمنی پر متحد کریں۔

مقالہ کا ایک خاص محرک حالات کا ایک نیا لیکن فوری تقاضہ بھی ہے جس کی وضاحت مقالے کے بالکل آخر میں کی گئی ہے، اجمالاً وہ ضرورت یہ ہے کہ ہم اب ایک ایسے دور کی دہلیز پر ہیں جس میں دنیا کی قیادت مغرب سے مشرق کی نئی قوموں کو منتقل ہورہی ہے، مستقبل میں یقیناً بین الاقوامی پالیسیوں کا محور نئے مسائل ومصالح اور نئے افکار ہوں گے؛ لہٰذا فوری ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے بارے میں ’’خطرہ‘‘ کے اس تأثر کو ختم کرنے کی کوشش کریں جو اس وقت موجود ہے اور مسلم دشمن لابیز کے نہایت کام کی چیز ہے۔

⊙ صدر: المعہد العالی للدراسات الاسلامیہ، لکھنؤ۔

اسلامی جہاد کے بارے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اس کا مطلب مسلمانوں کو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ کی تعلیم وترغیب ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان کے لئے ممکن ہو تو وہ ضرور غیر مسلموں سے جنگ کریں، اُصولی طور پر سوال یہ ہے کہ کیا ظلم وجارحیت اور ''فتنہ'' یعنی مذہبی جبر کے خاتمہ کے علاوہ ''کفر'' علت القتال ہوسکتا ہے؟ یا اگر کفر نہیں تو کیا صرف غیر مسلم حکومت کے وجود کو جنگ کے لئے کافی جواز اور سبب قرار دیا جاسکتا ہے؟

ہمارے محدود مطالعے کی حد تک قدیم علمی وفقہی سرمایے میں اس طرح اُصولی سوال قائم کر کے مسئلہ پر گفتگو نہیں کی گئی ہے؛ لیکن اجمالی طور پر نصوص سے استنباط کر کے لوگوں نے تین رائیں قائم کی ہیں :

(۱) علت القتال کفر ہے، اس کی دلیل: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لاَ تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ ، (سورۂ انفال:۳۹) ''ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ بچے اور دین سب کا سب اللہ کے لئے خالص ہو جائے'' واضح رہے کہ ہماری کتب تفسیر میں فتنہ کی تفسیر شرک سے بھی کئے جانے کی روایت موجود ہے اور ''وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ'' تو ظاہر ہے ہی۔

(۲) علت القتال کفر نہیں ہے؛ بلکہ کفر کی حکومت ہے، اس رائے کے حاملین کی اصل دلیل مندرجہ بالا آیت ہی ہے، یہ حضرات اس میں دین کو اطاعت اور قانون کے معنی میں لیتے ہیں۔

(۳) علت القتال دفاع ہے، یہ حضرات قرآن کی آیت :وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا، (البقرۃ:۱۹۰) ''اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو ان سے جو تم سے جنگ کریں اور زیادتی نہ کرنا'' سے استدلال کرتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ تینوں ہی موقف اشکالات سے خالی نہیں ہیں۔

دوضروری باتیں جن سے ان آیات کے صحیح فہم میں مدد ملتی ہے

(۱) ان اشکالات کے حل کے لئے قرآن مجید کی ان آیات کے گہرے مطالعے اور تدبر کی ضرورت ہے جو جہاد سے متعلق نازل ہوئیں، ان کے سلسلے میں یہ اہم بات بطور اُصول جان لینا بہت ضروری ہے کہ قرآن میں آیات جہاد کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو مسلمانوں پر جہاد کے فرض قرار پانے کے بعد سابق میں دیئے ہوئے حکم کی تاکید، وضاحت یا تحریض وترغیب کے لئے آئی ہیں، ان کا مقصد نئے احکام دینا نہیں تھا؛ بلکہ ان کو جنگ پر ابھارنا اور سستی وبزدلی سے بچا کر دشمن کے خلاف جوش جنگ پیدا کرنا تھا؛ لہٰذا یہ آیتیں قانون جہاد کا بیان نہیں بلکہ تحریض اور ترغیب کی آیات ہیں اور اہل علم واقف ہیں کہ قانونی اور رزمیہ زبانوں میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح نصوص اور خصوصاً حدیث کے نصوص میں ترغیب اور زجر وتوبیخ کے لئے جو زبان اور اُسلوب استعمال کیا جاتا ہے اس

کو خالص اور ٹھیٹھ قانونی معنے میں سمجھنے کے بجائے ترغیب وتحریض اور زجر وتوبیخ کے فطری اسلوب کے طور پر سمجھا جاتا ہے، اس کم علم کو ایک لمبے غور وفکر کے بعد پورا اطمینان ہوگیا ہے کہ اس اصول کو مدنظر رکھا جائے تو بہت سے اشکالات اور تضاد کی غلط فہمیاں دور ہوجاتی ہیں۔

(۲) اسی طرح قرآنی آیات کا مدعا اوران میں دیے گئے احکام کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر اوران حالات کو جاننا بھی ضروری ہے جن کے درمیان وہ نازل ہوئیں۔ کسی کلام کو اگر اس کے پس منظر سے کاٹ دیا جائے یا ان حالات کو نظر انداز کر دیا جائے جن میں وہ صادر ہوا ہے تو کچھ کا کچھ مطلب ہوجانا عین ممکن ہوجاتا ہے۔

قرآن مجید کے سلسلے میں اس اصول کو مدنظر رکھنا اس لئے مزید ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ کسی تحریر کردہ کتاب کی طرح لکھا نہیں گیا کہ مصنف اس کے سیاق وسباق کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرتب بات کرتا ہے اور قیود وشروط اور وضاحتیں یکجا لکھتا جاتا ہے، اور نہ وہ قانون کی کسی کتاب کی طرح دفعات کی زبان میں نازل ہوا ہے، اس کا نزول تو حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ اس طرح ہوتا تھا کہ جب جس رہنمائی، ترغیب وتحریض، ترہیب یا زجر وتوبیخ کی ضرورت پڑی وہ آگئی، اس کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہے کہ ان واقعات کی کھوج کی جائے جن میں کوئی خاص مجموعۂ آیات نازل ہوا تھا اور ذہن وتصور کو اس ماحول میں پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے۔

جہاد کے سلسلے میں یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی ہے کہ سلف وخلف کے یہاں بڑی حد تک عام تصور یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت غیر مسلموں سے صلح صرف مجبوری کی حالت میں (یعنی مقابلہ سے عاجزی، یا ایسی صورت میں جب کہ مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہوتو) ہی کرسکتی ہے۔ مثلاً فقہ حنفی کی اہم کتاب ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ :

> صلح کے جائز ہونے کی شرط ضرورت ہے، یعنی یہ کہ مسلمان اس لئے صلح کریں کہ جنگ کی تیاری کریں گے، اور یہ ایسی صورت میں ہی ہوسکتا ہے کہ مسلمان کمزور ہوں اور کفار کو قوت حاصل ہو، لہٰذا بغیر اضطرار کے صلح جائز نہیں ہوگی، اس لئے کہ صلح کا نتیجہ فریضۂ جنگ کا ترک ہے۔ اس لئے یہ اس وقت ہی جائز ہوگی جب یہ جنگ کے وسیلہ کے طور پر ہو، اس لئے کہ ایسی صورت میں صلح درحقیقت جنگ ہی مانی جائے گی کہ وہ جنگ کی تیاری کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَلاَ تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ'' (محمد:۳۵) (یعنی کمزوری مت دکھاؤ کہ صلح کی دہائی دینے لگو، اور تم ہی برتر ہوگے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے) ہاں مجبوری

میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے ''وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ '' (الانفال:٦١) (یعنی، اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جانا اور اللہ پر بھروسہ کرنا)۔(١)

بعض فقہاء نے صلح کے جواز کے لئے اضطرار اور مجبوری کی سخت شرط نہ لگاتے ہوئے ذرا نرم لفظ مصلحت یا مسلمانوں کے مفاد کا خیال النظر للمسلمین، جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔(٢)

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ :

فإذا لم يكن في الموادعة مصلحة فلا يجوز بالإجماع . (٣)

اگر صلح میں مسلمانوں کی مصلحت نہ ہو تو بالاجماع ناجائز ہے۔

تقریباً تمام ہی مسالک کی کتابوں میں اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں؛ بلکہ یہ مزید وضاحت بھی فقہاء کرتے ہیں کہ اگر دوسرا ملک صلح کی پیشکش بھی کرے تو حاکم دیکھے گا کہ اگر مسلمانوں کی مصلحت ہوگی تو قبول کر سکتا ہے اور اگر مسلمانوں کا فائدہ نہ ہو تو قبول نہیں کرے گا۔(٤)

بہر حال اس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ عموماً علماء وفقہاء کے نزدیک قتال کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مخالف کی طرف سے جارحیت وظلم یا مذہبی جبر (جسے قرآن نے فتنہ کہا ہے) پایا جائے؛ بلکہ مقدور ہو اور کوئی نقصان یا مضرت نہ ہو تو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ ہی کی جائے گی۔

علت القتال کیا ہے؟

اب اس پر سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ جنگ جو اصلاً خونریزی ہے اور قرآن اس کو شر ہی کہتا ہے، کہیں اس کو ''البأساء'' (خرابی) کا نام دیتا ہے اور کہیں اس کو شر مانتے ہوئے بڑے شر یعنی ظالمانہ مذہبی جبر کے لئے ایک ناگزیر اقدام بتاتا ہے، ایسی صورت میں اس جنگ کا سبب اور علت کیا ہے؟ کیا صرف کفر ہے؟ یا کفر تو نہیں بلکہ ''شوکت کفر'' یا غیر اسلامی حکومت ہے؟

اگر چہ فقہاء امت کی تصریحات کے تجزیے سے یہ بات تو غلط ہی ثابت ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک قتال کی

---

(١) نیز ملاحظہ ہو: الأم ، باب المهادنة ، شرح السير الكبير ، باب الموادعة۔

(٢) ملاحظہ ہو: الأم للشافعي ، كتاب الجهاد ، باب المهادنة على النظر للمسلمين ، نیز شرح السير الكبير للسرخسي۔

(٣) شرح فتح القدير ، كتاب السير ، باب الموادعة۔

(٤) الأم : باب مهادنة من يقوى على قتاله ، المبسوط باب صلح الملوك والموادعة ۔

علت کفر ہے؛ لیکن اس کے باوجود علماء کے یہاں استثنائی طور پر اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں کہ قتال کی علت کفر ہے، مثلاً امام قرطبی سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ ''وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

> یہ مطلقاً قتال کا حکم ہے، اس میں کفار کے حملہ میں ابتداء کرنے کی شرط نہیں ہے، اس کی دلیل ''وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ'' (یہاں تک کہ دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے) ہے اور یہ حدیث بھی کہ ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ ''لا إله إلا الله'' پڑھ لیں'' اس آیت اور حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ قتال کا سبب کفر ہے۔

البتہ یہ اُصول جمہور علماء وفقہاء کے قول سے مطابقت نہیں رکھتا؛ اس لئے کہ ان کے نزدیک اگر غیر مسلم اپنے کفر پر باقی رہتے ہوئے مسلم حکومت کے تابع ہو کر جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لیں تو یہ معاہدہ قبول کرنا لازم ہوگا، اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ''کفر'' بطور ایک نظریہ ومذہب دنیا میں قابل برداشت چیز ہے، اور اس کا خاتمہ جنگ کی غایت نہیں، اگر قتال کی علت کفر ہوتی تو اس وقت تک جنگ جاری رہنی چاہئے جب تک تمام کفار مسلمان ہو جائیں اور یہ جائز نہ ہوتا کہ جزیہ پر صلح کر لی جائے، یہاں تک کہ ہتھیار ڈالنے والوں کے لئے بھی بس دو ہی راہیں ہوتیں: یا اسلام قبول کریں یا قتل کیے جائیں، اس طرح یہ نظریہ قرآن کے بیان کردہ بنیادی اُصول ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' (دین میں کوئی زبردستی نہیں) کے صریح منافی قرار پاتا ہے؛ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ نفس کفر جنگ کا سبب یا علت قتال ہے تو کفر تو جنگ کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس کا خاتمہ تو جنگ کے بعد بھی نہیں ہوتا۔

اس تجزیاتی غور وفکر کے بعد متقدمین فقہاء وعلماء کے نقطۂ نظر کے اُصول کے طور پر ہمارے سامنے یہ نظریہ آتا ہے کہ قتال کی اصل علت شوکت کفر یا غیر مسلم حکومت کا وجود ہے، اس نظریے کی رو سے کفر جنگ کا سبب نہیں ہے، غیر مسلم بطور مسلم ریاست کے شہری (ذمی) کے اپنے کفر پر باقی رہ سکتے ہیں، ہاں اگر مسلمانوں کو قدرت ہوگی تو وہ جنگ کر کے غیر مسلموں کی حکومت کو بے دخل کر کے عوام پر اسلام اور مسلمانوں کی حکومت ضرور قائم کریں گے۔

(ہم آگے اس موقف کی مدلل حمایت کر کے اپنا یہ نقطۂ نظر ظاہر کریں گے کہ یہ (اپنے زمانے اور ماحول میں) ایک بالکل برحق اور منصفانہ موقف تھا)۔

سب سے اہم سوال

مگر یہاں سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم قوم کو کس جواز کی بنا پر اپنے اس حق سے محروم کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے اوپر اپنے لوگوں کی اور اپنے پسندیدہ اصولوں اور نظریات کے مطابق حکومت قائم کرے؟ اس سوال کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، عام انسانی اخلاقی حس کے مطابق یہ موقف ایک اشکال کا باعث بنتا ہے کہ مسلم ریاست صلح صرف اپنی مصلحت اور ضرورت کے تحت ہی کرسکتی ہے، قدرت وطاقت ہو تو اس کو ہر مملکت سے جنگ ہی کرنی ہے چاہے وہ کیسی ہی بے ضرر اور صلح جو ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا مودودی کا نظریہ

اب سے دو صدیوں پہلے جب مغرب کی فوجی یورش کے پہلو میں مسلمان اور اسلامی عقائد واحکام بھی فکری یلغار کا نشانہ بنے، تو جو دلیر اسلام کے دفاع کے لئے سب سے پہلے کھل کر سامنے آئے ان میں شبلیؒ ومودودیؒ کا نام نمایاں ہے، مؤخر الذکر کی کتاب اپنی شہرت اور اپنے پر اعتماد انداز کے اعتبار سے ممتاز ہے اور مصنف کی محنت اور مآخذ کی کثرت کی شاہد بھی؛ لیکن کتاب میں آبشار کا جوش اور فکر وخیال کی روانی تو ہے، مگر فاضل مصنف اس وقت نہایت کم عمر بھی تھا اور اس کو کتاب ہفتہ وار اخبار (الجمعیۃ) کی متواتر قسطوں میں پیش کرنی تھی، اس لئے اس کے پاس غور وتدبر کے لئے وقت بھی کم تھا۔

موصوف کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ ایک طرف تو قرآن مذہب کے معاملے میں جبر واکراہ کی کھلی نفی کرتا ہے تو پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے کہ صدیوں پر مشتمل اسلامی فکر کا حاصل یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو مسلمان ریاست جنگ ہی کرے گی، صلح صرف مصلحتاً ہی کی جائے گی، موصوف کی عبقری ذہانت نے اس کا جو حل دریافت کیا وہ بہت سے لوگوں کے لئے اسلامی فلسفہ بن چکا ہے، مولانا مرحوم کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام انفرادی طور پر ہر فرد بشر کو مذہبی آزادی تو دیتا ہے؛ لیکن وہ اسلام کے مخالف عقیدہ وفکر کو حکومتی طاقت اور شوکت رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے کہ (ان کے بیان کے مطابق) قرآن میں جن چیزوں کو فتنہ اور فساد کہا گیا اور جن کے خاتمے کو جہاد وقتال کا مقصد اور غرض وغایت بتلایا گیا ہے وہ ''سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس اور بد اصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں''۔(۱)

عالم عرب میں مولانا کے ایک خاص خوشہ چیں انقلابی مفکر سید قطبؒ ہوئے، جو اپنے انقلابی فکر اور جوش

---

(۱) الجہاد فی الاسلام: ۱۱۷۔

تحریر میں مولانا مودودیؒ سے کہیں آگے تھے، مصر میں ناصر کے آمرانہ استبداد کے زمانے میں جب عموماً اسلام پسند حکومت کی مغرب پرستی سے سخت نالاں تھے اور دین دشمن حکم رانوں کی مخالفت کی پاداش میں اخوان پر سخت مظالم کا سلسلہ جاری تھا، سید قطب کا شعلہ بار قلم (جس کے جوش وزور کی کوئی نظیر معاصر عربی ادب میں نہیں پائی جاتی) اسلامی انقلاب کی ندا لگا رہا تھا، سید قطب نے مولانا مودودی کے دیگر تحریکی نظریات کی طرح اس فلسفے کو بھی اخذ کیا اور اپنی تفسیر میں اور (دیگر تصنیفات میں بھی) مولانا مودودی سے کہیں زیادہ قوت اور تفصیل وتکرار سے بیان کیا، یہاں تک کہ یہ ایک حد تک مقبول نظریہ بن گیا۔

مولانا نے بھی فقہاء کی بیان کردہ تفصیلات کا خلاصہ اور حاصل یہی اخذ کیا کہ مسلمانوں کے لئے یہ بات شرعی فریضہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اگر حالات اجازت دیں تو وہ ہر غیر مسلم قوم سے حکومت چھین لیں اور ان پر مسلمانوں کی (بلکہ مولانا کے الفاظ میں اللہ کے صالح بندوں کی) حکومت قائم کریں۔

یہ کم علم اپنی کم علمی کے احساس کے باوجود پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ اس موقف کی کیسی ہی مؤثر ترجمانی کی جائے؛ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ (کم سے کم اِس زمانے میں) یہ اشکال کا باعث ہے، اگر کوئی حکومت نہ اپنے عوام پر کسی سخت ظلم کی مرتکب ہے اور نہ دوسری قوموں پر کسی جارحیت کی مجرم، ساتھ ہی وہ اپنے یہاں بسنے والے مسلمانوں کو اللہ کے دین پر چلنے کی مکمل اجازت دیتی ہے اور اللہ کے دین کی دعوت کے سامنے رکاوٹ بھی نہیں بنتی اور مسلمانوں کی حکومت کی طرف صلح وآشتی کا ہاتھ بھی بڑھاتی ہے تو کس اخلاقی جواز کے تحت اس حکومت پر جنگ تھوپی جاسکتی ہے؟ اور کیسے کسی قوم کو اس فطری حق سے محروم رکھا جاسکتا ہے کہ اس کا سیاسی نظام اس کے اپنے لوگوں کے ہاتھ میں ہو؟ کسی قوم سے خودمختاری سلب کرلینا انسانی عرف میں یقیناً ظلم ہے۔

مولانا مودودیؒ اس اشکال کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے، انھوں نے وکیل کی حیثیت سے اپنے موقف کے دفاع میں یہ نظریہ پیش کیا کہ قرآن نے فتنہ کے خاتمہ کو قتال کا مقصد کہا ہے، اب ایک نظر ڈالی جائے کہ قرآن میں کن کن برائیوں کو ''فتنہ'' یا ''فساد'' کہا گیا ہے، ان برائیوں اور خرابیوں کو گنانے کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

> اب اگر ان تمام برائیوں پر ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ وفساد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس اور بداصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں، اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو کم از کم اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا تو یقیناً اسی حکومت کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے۔(۱)

(۱) الجہاد فی الاسلام: ۱۱۷۔

اسی وجہ سے مولانا کے بقول اسلام نے بدی کے خاتمے کے لئے حکم دیا کہ ایک منظّم جدوجہد (جہاد) کے ذریعہ اور اگر ضرورت پڑے اور ممکن ہو تو جنگ کر کے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے اور اس کی جگہ وہ عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جو خدا کے خوف اور اور اسی کے نازل کردہ ضابطوں پر مبنی ہو اور جو انسانوں کے مفاد کی خدمت کرے۔(۱)

اس نظریہ کے خلاف تین طاقت ور دلائل

(۱) اس نظریہ کے خلاف سب سے پہلے جو چیز جاتی ہے وہ یہ کہ اسلام کی ایک بنیادی تعلیم دین کے معاملے میں آزادی اور انصاف ہے، کسی قوم کو اپنی حکومت سے بے سبب محروم کرنا اور اس پر دوسری قوم کی حکومت قائم کرنا فطری طور پر انصاف کے خلاف نظر آتا ہے، اسلامی دعوت کے لئے ضروری ہے کہ اسلام اپنے زمانے میں سب سے برتر اور متوازن اخلاقی معیار پر قائم نظر آئے، اگر ایسا نہیں ثابت ہوتا تو اسلام کا اکیلے محفوظ ہدایتِ ربانی اور قانونِ الٰہی ہونے کا دعویٰ مشتبہ ہو جائے گا؛ لہٰذا علماءِ اسلام کا اہم ترین فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ ہر زمانے میں پوری بیدار مغزی سے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیں اور بلا خوف لومۃ لائم قرآن وسنت پر مبنی اسلامی قوانین کا اظہار کریں، اس میں ان کو نہ باطل کی یورش کا خوف ہو نہ کسی قسم کی بدنامی کا اور نہ اپنوں یا غیروں کی ملامت کا۔

(۲) دوسری جو چیز اسی نظریہ کے خلاف جاتی ہے، وہ یہ آیت قرآنی ہے: ''وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ'' (الانفال:۶۱) یعنی اگر یہ خدا اور مسلمانوں کے دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہو جانا۔

یہ آیت غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی، اس سے صلح کا کس درجہ مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کے لئے صرف سادہ سا مطلب جان لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ اس کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کس درجہ اس کو اہمیت دیتا ہے کہ فریق مخالف اگر آمادۂ صلح ہو تو صلح کر ہی لی جائے، اس آیت میں غور سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا حکم مجبور و کمزور کی دبی کچلی صلح کا نہیں ہے، نہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ صلح میں ہمارا فائدہ ہے کہ نہیں، یہ سورۂ انفال کی آیت ہے، اس سورت میں مسلمانوں کو مکہ کے مشرکین سے جنگ کے احکام دیئے گئے اور ایک طویل سلسلۂ آیات میں مسلمانوں کے اندر قتال کے لئے جوش وحمیت پیدا کی گئی ہے، یہی سلسلۂ بیان جب اپنے عروج پر یہاں پر پہنچا کہ :

(۱) الجہاد فی الاسلام: ۱۱۷-۱۱۸ با ختصار۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ . (الانفال:۶۰)

اوران دشمنانِ خدا کے مقابلے کے لئے جو ہو سکے وہ اسلحہ تیار کرو (اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو) اور گھوڑے جنگ کے لئے تیار رکھو، جس سے تمہارا رعب اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن کے دل میں بیٹھے۔

اور اس کے بعد اس جہاد وقتال کی تیاری میں اپنا مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی، جہاد وقتال پر آمادہ کرتے ہوئے اور جہاد وقتال کے لئے جوش دلانے والے اسی ولولہ خیز سلسلۂ کلام میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللهُ . (الانفال:۶۱-۶۲)

اگر یہ (خدا و مسلمانوں کے دشمن، اپنی دشمنی کے باوجود) مصالحت کی طرف جھکتے ہیں، تو تم بھی اس کی طرف جھک جانا اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک وہ (سب) سننے اور جاننے والا ہے، اگر ان کی نیت تم کو دھوکہ دینے کی ہوگی تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔

کلام کے سیاق وسباق پر غور کیجئے، یہ موقعہ مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے اور ان میں اس کی تیاری کے لئے جوش وحمیت پیدا کرنے کا ہے، پھر بھی کہا جاتا ہے کہ دشمن اگر صلح پر آمادہ ہوتا ہے تو صلح کرنے کا حکم ہے، کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ دشمن صلح کے بہانے دھوکہ نہ دے دے، سو اس کی پیش بندی کے طور پر پہلے تو کہا کہ صلح کرنے میں توکل علی اللہ کا مظاہرہ کرو، پھر مزید صراحت کی کہ اگر ان کے دھوکہ دینے کا اندیشہ ہو تو جان لو کہ اللہ پر توکل ہی تمہارا سرمایہ ہے، یعنی اس سلسلے میں اندیشہ ہائے دور دراز کا زیادہ خیال نہ کرو۔

کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟

سید قطب مرحوم نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس رائے کی تائید کی ہے کہ صلح کر لینے کا یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے، ان حضرات کو جو اس آیت کو غیر منسوخ قرار دیتے ہیں سید قطب ان کو ''المهزومون روحيا وعقليا'' (عقلی اور روحانی اعتبار سے شکست خوردہ) قرار دیتے ہیں، سادگی اور حماقت سے موصوف کرتے ہیں اور اسلام کے مزاج ومنہاج سے بے خبر بتاتے ہیں۔

حالاں کہ سچی بات یہ ہے کہ اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے، مفسرین اور فقہاء کی ایک تعداد اگرچہ یہ کہتی ہے کہ سورۂ توبہ کی یہ آیت اس کی ناسخ ہے :

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ . (التوبۃ:۵)

اور جب اشہر حرم گذر جائیں تو جہاں پاؤ ان مشرکین کو قتل کرو ان کو پکڑو، گھیرو اور ہر جگہ ان کے (قتل کے لئے) گھات لگا کر بیٹھو۔

یقیناً سورۂ انفال کی وہ آیت جو دشمن کے آمادۂ صلح ہونے پر صلح کا حکم دے رہی ہے، وہ پہلے نازل ہوئی ہے اور سورۂ توبہ کی آیت بعد میں، مگر جنگ کا حکم دینے والی سورت توبہ کی ان آیات کے سیاق وسباق پر ذرا غور کرنے سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ احکام مشرکین عرب (جو قریش کی قیادت میں ایک ملت اور سیاسی اتحاد کا درجہ رکھتے تھے) کے لئے نازل ہو رہے تھے، آپ اول سورت سے آیت نمبر ۲۸ تک پڑھ جایئے قطعی طور پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سورۃ عرب کے مشرکین سے متعلق ہی گفتگو کر رہی ہے، یہ گفتگو جن مشرکین کے متعلق کی جارہی ہے دورانِ کلام ان کے جو حالات اور صفات بیان کی گئی ہیں، اس سے کسی ذی شعور کے لئے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس سلسلۂ کلام میں صرف مشرکین عرب مراد ہیں، مثلاً کہیں کہا جا رہا ہے کہ ''جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا'' (آیت نمبر:۱) پھر آگے ان کی صفت یہ بھی (آیت نمبر:۱۳) میں بتائی جارہی ہے کہ :

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْماً نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَؤُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ .

کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کروگے جنھوں نے عہد توڑ ڈالا، رسول کو در بدر کرنے کا ارادہ کیا اور انھوں نے ہی تمہارے خلاف جنگ چھیڑی ہے۔

ظاہر ہے معاہدہ مشرکین عرب سے ہی ہوا تھا، ''المشرکین'' سے مراد مشرکین عرب ہی ہیں اس کو مزید مؤکد کرنے والی آیات آگے اور ہیں جن میں ان کے مسجد حرام (کعبہ) سے رشتہ کا ذکر کرکے کہا جارہا ہے کہ اب ان سے اس کی تولیت چھینے جانے کا وقت آگیا ہے (۱۷-۲۲)، پھر (آیت نمبر:۳۶) نے تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی، ارشاد ہوتا ہے :

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً .

تمام مشرکین سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کر رہے ہیں۔

سورۂ انفال میں پہلے ان ہی مشرکین کے بارے میں حکم دیا گیا تھا کہ ''اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جانا''، مگر قرآن خود بتارہا ہے کہ اس حکم کی تبدیلی کا سبب ان کی لگاتار جارحیت، ظلم وعدوان اور عہد شکنی کی

تاریخ ہے، جیسا کہ ابھی ذکر کی گئی آیتوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ان کے سینوں میں عداوت کی جہنم ہے، وہ کسی رشتہ وقرابت اور معاہدے تک کا لحاظ نہیں کر رہے لہٰذا اب بس، ان کو تہِ تیغ کرو، یہاں قرآن ان کو بدعہدی اور ظلم واعتداء کا مرتکب بھی بتا رہا ہے: ''لَا یَرْقُبُونَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلاَ ذِمَّةً وَاُوْلٰٓئِکَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ'' (التوبۃ:۱۰) لہٰذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کو ہر حال میں تہِ تیغ کرنے کے حکم کا سبب ان کی بے اعتباری اور یہ اعتداء تھا۔

قرآن کی کسی آیت کو اس معنی میں منسوخ قرار دینا کہ وہ معطل کردی گئی ہے اور اب اس پر عمل نہیں کیا جائے گا ایک بڑی بھاری بات ہے، اتنی پرخطر بات کہنے کے لئے کوئی یقینی بنیاد ہونی چاہئے، جو یہاں ہرگز نہیں ہے، صلح کا حکم دینے والی آیت بالکل الگ قسم کے حالات اور الگ دشمن کے لئے ہے اور سورۂ توبہ کی آیات الگ صورت حال میں ایک متعین دشمن سے جنگ کرنے اور اس کے لئے زمین تنگ کردینے کے حکم پر مشتمل ہے۔

صلح کا حکم قرآن نے اس صورت میں دیا ہے جب دشمن صلح جو ہو، کہا گیا اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی مائل بہ صلح ہوجانا اور اس پر یہ اضافہ کیا گیا کہ دشمن سے اگر عہد شکنی کا اندیشہ ہو تب بھی اللہ کے بھروسے پر صلح کر ہی لی جائے اور سورۂ توبہ کی آیت جو دشمن سے بھرپور جنگ کرنے کا حکم دے رہی ہے وہ بتا رہی ہے کہ جن ''المشرکین'' کے بارے میں یہ حکم ہے وہ یہی نہیں کہ صلح جو نہیں؛ بلکہ تم سے جنگ کر رہے ہیں اور ایسے عہد شکن ہیں کہ اب ان کی صلح پر آمادگی کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، اسی سلسلۂ آیات میں آگے کہا گیا:

وَقَاتِلُوْا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّةً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّةً. (التوبۃ:۳۶)

اور تمام مشرکین سے جنگ کرو جس طرح وہ سب کے سب تم سے جنگ کرتے ہیں۔

سورۂ انفال کی یہ (آیت:۶۱) دوسرے فریق کے صلح پر (یقیناً بامعنی اور منصفانہ صلح پر) راضی ہونے کی صورت میں اس کو نہ صرف قبول کرنے؛ بلکہ کشادہ قلبی کے ساتھ قبول کرنے کی ترغیب دیتی ہے، اس لئے کہ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ اصلاتو گفتگو مسلمانوں کو آمادۂ جنگ کرنے کی چل رہی تھی مگر پھر بھی مسلمانوں میں صلح پر آمادگی پیدا کرنے کے لئے یہاں تک ارشاد ہوا:

وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، وَاِنْ یُّرِیْدُوْا اَنْ یَّخْدَعُوْکَ فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰہُ هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ. (الانفال:۶۱-۶۲)

اور (اس سلسلہ میں) اللہ پر بھروسے سے کام لو، وہ سب سننے جاننے والا ہے، اور اگر وہ تم کو دھوکہ دینا چاہیں گے تو اللہ کافی ہے تمہارے لئے، اسی نے تو اپنی مدد اور مؤمنین

کی جماعت کے ذریعہ تمہاری تائید کی ہے۔

اس کی تشریح میں ابن کثیر کہتے ہیں کہ ''مطلب یہ ہے کہ اگر وہ صلح کر کے دھوکہ دینا چاہیں تا کہ اسی مدت میں تیاریاں کرلیں تو جان لو کہ اللہ تمہارے لئے کافی ہے''۔

اس پوری تفصیل نے یہ بات واضح کردی کہ سورۂ توبہ کی آیات صلح کی آیت کو منسوخ نہیں کررہی ہیں، نسخ کی کوئی دلیل نہیں ہے، دونوں آیات قطعی طور پر الگ حالات اور الگ دشمنوں سے متعلق ہیں، کوئی اگر خود قرآن میں غور کرے اور اگر اپنے ذہن میں قائم خیالات اور کسی مخصوص نظریے کے تاثرات سے آزاد ہوکر سوچے تو وہ اسی نتیجے تک پہنچے گا، اور کتاب اللہ کی آیات کو مصحف میں موجود ہوتے ہوئے اور تلاوت کرتے ہوئے بلا قطعی دلیل کے ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ وہ منسوخ اور معطل ہیں؛ جیسا کہ امام طبری جو سرخیل مفسرین ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث وفقہ میں بھی امامت کے مقام پر فائز تھے اس آیت کے منسوخ ہونے کی بات بالکل بے بنیاد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

لا دلالة علیه من کتاب و لا سنة و لا فطرة و لا عقل .

اس کی کتاب وسنت اور عقل وفطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

ہاں سورۂ محمد کی ایک آیت میں کمزوری دکھاتے ہوئے دشمن سے صلح کی دہائی دینے کو منع کیا گیا ہے؛ لیکن یہ ایک بالکل دوسری بات ہے اور دشمن کے ساتھ باعزت صلح ایک دوسری چیز ہے۔

(۳) تیسری ایک بات اور ہے جو قطعی طور پر اس کا فیصلہ کردیتی ہے کہ خود ہمارے فقہاء کے نزدیک غیر مسلم حکومت خود اپنی ذات میں ایسی چیز نہیں ہے جس کو برداشت ہی نہیں کیا جاسکتا اور مسلمانوں پر اس کو ختم کرنا دینی فریضہ ہے، فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر غیر مسلم حکومت کی طرف سے کچھ مال دے کر صلح کی پیش کش کی جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے لئے جائز ہے کہ وہ اس مال کو قبول کر کے غیر مسلم حکومت کو باقی رہنے دے اور صلح کرلے، فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ یہ ''جزیہ'' والی صورت نہیں ہوگی بلکہ غیر مسلم حکومت اپنی پوری آزادیوں اور کفر کے قوانین کے نفاذ کے ساتھ باقی رہے گی۔

اب اگر مولانا مودودیؒ کی بات کو تسلیم کرلیا جائے تو بات یہ ہوگی کہ یوں تو اگر چہ ایک غیر مسلم حکومت سارے فتنہ وفساد کی جڑ اور خرابیوں کا منبع ہے اس لئے اس کو اکھاڑ پھینکنا اور اس کی جگہ اہل حق کی حکومت قائم کرنا ضروری ہے؛ لیکن اگر مال ملے تو پھر سب قابل برداشت ہوسکتا ہے، ذرا غور فرمائیں! یہ تو کوئی اخلاقی پوزیشن نہیں ہوئی، اللہ کا دین یقیناً اس سے بری ہونا چاہئے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ائمہ اور فقہاء متقدمین کے موقف کی جو یہ توجیہ اور تشریح کی جاتی ہے کہ

''شوکت کفر علت قتال ہے'' یا یہ کہ غیر مسلم حکومت کا وجود فی نفسہ اس بات کا مکمل سبب ہے کہ اگر قدرت ہو تو اس کو ختم کرنے کے ہدف سے اس کے خلاف جنگ کی جائے اور مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ غیر مسلم حکومت کا خاتمہ ضرور کریں، یہ صحیح توجیہ نہیں ہے، فقہاء کا یہ متفقہ مسئلہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک نہ کفر قتال کا سبب ہے نہ نظام کفر نہ حکومت کفر، کیوں کہ وہ سب مال کے عوض غیر مسلم حکومت سے صلح کرنے کو جائز کہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم حکومت مال دینے پر اسی وقت راضی ہوگی جب مسلمانوں کی طاقت کا پلہ بھاری ہو، یعنی یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ ہمارے فقہاء نے اس کی اجازت اسی صورت میں دی ہے جب مسلمان کمزور ہوں یا خود ان کی مصلحت کا تقاضہ ہو کہ جنگ سے بچا جائے۔

بعض قدیم علماء کی صراحتیں کہ جنگ کا سبب محاربہ ہے

اگر چہ ہمارے قدیم فقہاء کے یہاں یہ تصور ناپید نہیں ہے کہ نفس کفر جنگ کا سبب نہیں ہوسکتا، جنگ کا سبب محاربہ یعنی جارحیت ہے، امام ابن تیمیہ کا تو اس مسئلے پر مستقل رسالہ ''قاعدة مختصرة في قتال الكفار ومهادنتهم'' بھی ہے، جس میں انھوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جنگ صرف اسی سے کی جائے گی جو خود آمادۂ پیکار ہو۔(۱)

بعض علماء اس رسالہ کی ابن تیمیہ کی طرف نسبت مشکوک قرار دیتے ہیں؛ مگر ''نیل الأوطار'' میں ایک جگہ شوکانی کے قلم سے اس رسالہ کا تذکرہ دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شوکانی کے پاس غالباً اس کا نسخہ تھا، علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ :

> وكون قتال الكفار لكفرهم هو مذهب طائفة من أهل العلم، وذهبت طائفة أخرى إلى أن قتالهم لدفع الضرر ...... ومن القائلين بهذا شيخ الإسلام ابن تيمية وله في ذلك رسالة . (۲)
>
> اور کفار سے قتال کا سبب ان کا کفر ہے، یہ بعض اہل علم کی رائے ہے اور ایک دوسری جماعت کا موقف یہ ہے کہ قتال ان کے ضرر کو دفع کرنے کے لئے ہے ...... اس دوسری رائے کے حاملین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ بھی ہیں اور ان کا اس موضوع پر ایک رسالہ بھی ہے۔

اس رسالہ کا تذکرہ شوکانی سے پہلے علامہ امیر صنعانی کے یہاں بھی ملتا ہے؛ بلکہ انھوں نے اس کی تائید

---

(۱) قاعدة مختصرة في قتال الكفار :۱۲۱۔ (۲) نیل الأوطار۔

کرتے ہوئے اپنے ایک رسالہ میں اس کی تلخیص بھی کی ہے، جو ''ذخائر علماء الیمن'' نامی کتاب میں شائع ہو چکی ہے۔

ابن تیمیہ نے اپنی دوسری کتاب ''النبوات'' میں بھی اس رائے کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے؛ بلکہ اس کو جمہور علماء کا مسلک قرار دیا ہے، کہتے ہیں :

الکفار إنما یقاتلون بشرط الحراب ، کما ذھب إلیه جمھور العلماء ، وکما دل علیه الکتاب والسنة . (۱)

کفار سے جنگ اسی شرط پر کی جائے گی کہ وہ محاربہ کریں، جیسا کہ جمہور علماء کا مسلک ہے اور اسی پر کتاب وسنت کی دلیل قائم ہے۔

ابن تیمیہ اور شوکانی کی ان عبارتوں سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک ماضی میں بھی اہل علم کی ایک تعداد اسی کی قائل رہی ہے کہ قتال صرف ظلم وجارحیت کے خلاف ہی کیا جاسکتا ہے اور اس کی اصل علت محاربہ (یا فتنہ وغیرہ) ہی ہے، ابن تیمیہ اپنی کتاب ''الصارم المسلول'' میں آیت کریمہ: ''اور اللہ کے راستہ میں قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی مت کرنا، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا'' (البقرۃ:۱۱۹) کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں :

فأمر بقتال الذین یقاتلون ، فعلم أن شرط القتال کون المقاتَل مقاتِلا . (۲)

اللہ نے جنگ کرنے والوں سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قتال کے لئے یہ شرط ہے کہ جس کے خلاف جنگ چھیڑی جائے وہ جنگ کر رہا ہو۔

ابن قیمؒ اپنی کتاب ''ہدایۃ الحیاری'' میں کہتے ہیں :

إنما کان (صلی اللہ علیه وسلم) یقاتل من یحاربه ، وأما من سالمه وھادنه فلم یقاتله . (۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسی سے جنگ کرتے تھے جو خود جنگ کرتا تھا، جو صلح کرتا تھا آپ ﷺ اس سے جنگ نہیں کرتے تھے۔

ابن جریر طبری

اس موقف کا اظہار ہمیں طبری کے یہاں بھی ملتا ہے، جنھوں نے اسی آیت صلح کی تفسیر کرتے ہوئے پہلے

(۱) النبوات: ۱۴۰۔ (۲) الصارم المسلول: ۲۸۲۔ (۳) ھدایۃ الحیاری: ۱۲۱۔

تو یہ غیر معمولی بات لکھی کہ :

وان مالوا الی مسالمتک ومتارکتک الحرب ، اما بالدخول فی الاسلام واما باعطاء الجزیة واما بموادعة ونحو ذلک من اسباب السلام والصلح فاجنح لها ، یقول : فمل الیها وابذل لهم ما مالوا الیه من ذلک وسألوک .

یعنی اگر وہ (دشمن) تمہارے ساتھ صلح اور جنگ بندی پر آمادہ ہو جائے چاہے اسلام قبول کر کے یا جزیہ دے کر یا صلح کر کے، چاہے وہ کسی قسم کی اور کسی انداز کی بھی صلح ہو تو تم بھی صلح پسندی کا ثبوت دینا اور وہ جو چاہیں وہ کر دینا اور دے دینا۔

پھر آیت کی اس اجمالی وضاحت کے بعد قتادہؒ اور بعض دیگر حضرات کے اس قول پر کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی بعد میں اجازت نہیں رہی ، وہ تبصرہ کرتے ہیں جو پیچھے گذر چکا کہ، اس کی کتاب وسنت اور عقل وفطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

دلائل پر ایک نظر

جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو بشرط قدرت ساری غیر مسلم حکومتوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے، ان سے بھی جو محاربہ یا ظلم کے مرتکب ہوں اور ان سے بھی جو کسی قسم کے محاربہ کے مرتکب نہ ہوں، ان حضرات کے اہم دلائل حسب ذیل ہیں :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ . (البقرۃ:۱۹۳)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ''فتنہ'' باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔

اس آیت میں قتال کا جو دوسرا مقصد ''اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے'' بتایا گیا ہے، اس میں بعض مفسرین نے ''دین'' کے معنی اطاعت کے بیان کیے ہیں (طبری)، یہیں سے یہ حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ آیت مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ تا حد مقدور اسلام کی حکومت کے قیام کے لئے قتال کریں، تا کہ قانون صرف اسلام کا باقی رہے۔

مولانا مودودیؒ اس استدلال کی وضاحت یوں کرتے ہیں :

اس مقام پر ''فتنے'' سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے

لئے ہو، اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ ''فتنہ'' ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو، پھر جب ہم لفظ ''دین'' کی تحقیق کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی ''اطاعت'' کے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام وقوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے، پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرماں روائی قائم ہو، اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے، اور اسلامی جنگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔(۱)

مولانا کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ ''فتنہ'' یہ ہے کہ اللہ کے قانون کے علاوہ کوئی دوسرا قانون نافذ ہو اور ''دین کل کا کل صرف اللہ کے لئے ہو جائے'' کا مطلب یہ ہے کہ ''بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں'' اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ پر دوبارہ غور کریں تو یہ استدلال کمزور نظر آئے گا؛ اس لئے کہ چاہے دین اپنے اصطلاحی معنوں میں ہو یا آیت کے معنی یہ ہوں کہ اطاعت خالصۃً اور کل کی کل اللہ کی ہو جائے، اس سے یہ مراد لینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے؟ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی احکام کا قانونی نفاذ ہو بھی جائے تو بھی کفار اپنے شرک وکفر اور اللہ کی نافرمانی اور غیر اللہ کی اطاعت وبندگی پر قائم رہیں گے، ان کے احبار ورہبان ان کے لئے ناحق حلال وحرام کے فتوے دیتے رہیں گے اور اسلامی حکومت ان کے بہت سے معاصی وقبائح ومنکرات کا خاتمہ نہیں کرے گی۔ پھر اس آیت سے استدلال کے کیا معنی؟ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی قانون کے نفاذ اور جزیہ کی تحصیل کے بعد بھی نہ دین اپنے معروف معنی میں اللہ کے لئے خالص ہوتا ہے اور نہ اطاعت، مشرکین کا شرک اور یہود ونصاریٰ کی اطاعت رہبان واحبار بھی باقی رہے گی اور کفار کے معاصی بھی، کوئی جہاد دنیا میں دین یا اطاعت کو اللہ کے لئے خالص نہیں کرتا، پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جنگ کی غایت ''دین کا یا اطاعت کا اللہ کے لئے خالص ہو جانا'' ہے، جہاد کے نتیجے میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگی تب بھی دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہوگا نہ اطاعت اللہ کے لئے خالص ہوگی، یعنی نہ دین اللہ کے لئے خالص ہوگا اور نہ اطاعت۔

سادہ سے لفظوں میں آپ اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جہاد کے نتیجے میں جو اسلامی حکومت قائم ہوگی وہ زمین

---

(۱) تفہیم القرآن: ۱/۱۵۱۔

پر کفر کو بھی باقی رہنے دے گی اور (غیر مسلموں کے ذریعے) اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں کو بھی؛ لہٰذا جنگ کا ہدف دین یا اطاعت کا اللہ کے لئے خالص ہو جانا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بعض محترم علماء نے اس آیت میں دین کے معنی قہر و غلبہ کے لئے ہیں، جو یقیناً غلط فہمی ہے، ہم بصد ادب وضاحت کرتے ہیں کہ دین کے معنی عربی زبان میں قانون، اطاعت بدلہ وغیرہ کے تو آسکتے ہیں، قہر و غلبہ اور حکومت کے نہیں آتے۔

پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟

اس مشکل کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ :

دراصل یہ آیت صرف مشرکین عرب کے سلسلہ کا حکم بیان کر رہی ہے، آپ ذرا اس کے سیاق پر غور کیجئے :

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا إِنَّ اللهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ، وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَأَخْرِجُوْهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلاَ تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَإِنْ قَاتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِيْنَ ، فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ، وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لاَ تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِيْنَ . (البقرۃ:۱۹۰،۱۹۳)

اور اللہ کے راستے میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کر رہے ہیں، اور زیادتی مت کرنا اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے اور ان کو قتل کرو جہاں پاؤ، اور وہاں سے ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اور ''فتنہ'' قتل سے سنگین تر ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ مت کرنا جب تک وہ وہاں تم سے جنگ نہ کریں، اگر وہ مسجد حرام میں تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کرو، کافروں کا یہی بدلہ ہے، تو اگر وہ باز آجائیں (شرک سے) تو اللہ غفور و رحیم ہے اور ان سے جنگ کرو اس وقت تک جب تک کہ فتنہ نہ ختم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے ، اگر وہ باز آجائیں (جنگ) سے تو کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی سوائے ظالموں کے (کسی پر)۔

آیات کا سیاق قطعی طور پر ان مشرکین مکہ کے ساتھ خاص ہے، جنھوں نے اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی، جن کے خلاف مسلمانوں میں جوش حمیت پیدا کرنے کے لئے قرآن نے کہا تھا ''وھم بدؤوکم أول مرۃ''

(انھوں نے ہی لڑائی کی ابتدا کی تھی) ان مشرکین کے سلسلے میں یہ سلسلۂ آیات شروع ہی یہاں سے ہوا ہے کہ: ''اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں'' اس سلسلۂ بیان میں حکم دیا گیا ہے کہ ان مشرکین سے تم کو جنگ شروع کرنے کا جو حکم دیا جارہا ہے، اس کی عملی غایت اور انتہا یہ ہے کہ ان کا فتنہ ختم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے، اس سیاق وپس منظر میں دین کے اللہ کے لئے اصل ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین جس علاقے یعنی جزیرۂ عرب کے باسی ہیں اس کے بارے میں یہ طے ہے کہ یہاں دین صرف اللہ کا ہی رہے گا، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض وفات میں وصیت فرمائی کہ: ''مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا جائے''(۱) اور یہی محمل ہے، آپ ﷺ کے اس مشہور ارشاد کا:

أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله ......

مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔

اس معنی کو حتمی طور پر طے کرنے والی یہ بات ہے کہ متفقہ طور پر لوگوں سے زبردستی اسلام قبول کروانا جنگ کی غایت ہرگز نہیں ہے، اگر اس حدیث کو (مذکورہ بالا آیت کی طرح) جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص نہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے اور قتل وقتال کرنے کا حکم ہے الا یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔

تقریباً یہی الفاظ سورۂ انفال (آیت: ۳۹) میں بھی آئے ہیں، وہاں بھی سیاق یقینی طور پر مشرکین مکہ کو متعین کرنے والا ہے، (۲-۳) اس موقف کے اہم دلائل میں سورۂ توبہ کی دو آیتیں بھی ہیں:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُوْلُهُ وَلاَ يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوْا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ . (التوبۃ:۲۹)

جنگ کرو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور دین حق کی اتباع نہیں کرتے، یعنی اہل کتاب سے، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں ہاتھ سے اور تابع بن کر رہیں۔

دوسری آیت اسی سورت کی یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَاتِلُوْا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً . (التوبۃ:۱۲۳)

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب جوائز الوفد۔

اے ایمان والو! اپنے پاس کے کفار سے جنگ کرو اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں۔

ان دونوں آیتوں سے استدلال اس طور پر ہے کہ پہلی آیت میں قتال کے حکم کے ساتھ اس حکم کی غایت یہ بتادی گئی کہ یہ اہل کتاب کفار مسلمانوں کے تابع ہوکر جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں؛ تاکہ ان کی بالادستی اور خودمختاری ختم ہوجائے، وہ زمین میں صاحب امر اور حاکم بن کر نہ رہیں؛ بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور امامت وفرماں روائی کے اختیارات دین حق کی اتباع کرنے والوں کے ہاتھوں میں آجائیں؛ دوسری آیت بھی مطلقاً کفار سے جنگ کرنے کا حکم دیتی ہے اور اس میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ وہ دعوت حق کا راستہ روکیں، یا اللہ کے بندوں پر ظلم کریں یا مسلم حکومت کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوں۔

دراصل ان آیتوں کا مدعا اوران میں دیئے گئے حکم کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر اوران حالات کو جاننا ضروری ہے، جن کے درمیان وہ نازل ہوئیں، یہ آیات غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی ہیں، یہ بیزنطینی روم کے خلاف ایک مہم تھی جو سن نو ہجری میں انجام دی گئی، اس وقت ہرقل عظیم رومن سلطنت کے فرماں روائے اعظم قیصر کی حیثیت سے سریر آرائے سلطنت ہوچکا تھا اوراسی لئے اسلامی مآخذ اس کو کبھی قیصر اور کبھی ہرقل کہتے ہیں، رومن حکومت کی کچھ عمل داریاں عرب سرزمین میں حدود شام اور شام کے اندر قائم تھیں، شمال عرب میں غسانیوں کی مشہور حکومت تو مستقل طور پر ان کی تابع تھی ہی، اس کے علاوہ اسی علاقہ کی کچھ دیگر قبائلی طاقتیں بھی رومیوں کی عمل داری میں تھیں اور عیسائی ہوچکی تھیں، گویا یہ پورا خطہ رومی سلطنت عظمیٰ کا حصہ تھا۔

رومی سلطنت سے کشمکش کا آغاز ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہوچکا تھا، روم جیسی توسیع پسند جابر طاقت کو، جس نے جاگیرداری کے ظالم نظام میں غریب عوام کو جکڑ رکھا تھا، اپنے بالکل پڑوس میں ایک ایسی ابھرتی ہوئی طاقت کیسے برداشت ہوسکتی تھی جو اپنے جلو میں دلوں کو فتح کرنے والی ایک ایسی دعوت رکھتی تھی جس کا اعلان تھا: ''بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں'' اور ''اللہ کی بندگی میں داخلہ، بندوں کی غلامی سے آزادی'' ابتداء ایسے ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ۱۵/ آدمیوں کی ایک جماعت ان علاقوں میں بھیجی، انھوں نے وہاں دعوت اسلام دی، مگران سب کو ذات اطلاح نامی مقام پر قتل کردیا گیا، ان کے امیر حضرت کعب بن عمیر نہایت زخمی حالت میں بچ کر مدینہ واپس آئے اوراس سنگین واقعہ کی اطلاع دی۔(۱)

ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ رومی حکومت کی ایک اور جارحیت اوراسلام دشمن حرکت سامنے آئی، رسول اللہ ﷺ نے شمال کے ان عرب علاقوں میں مستقل دعوتی مہمیں بھیجی تھیں، ان کے نتیجہ میں فروۃ بن عمرو (یا ابن نفاثہ) نامی ایک عرب حاکم نے جو رومیوں کی جانب سے عرب قبائل پر متعین تھا اسلام قبول کرلیا اور رسول اللہ ﷺ کو خیرسگالی کے

---

(۱) سیرت ابن اسحاق، البدایہ والنہایۃ۔

طور پر کچھ ہدایا بھی بھیجے، رومیوں نے اس کو مرکز طلب کیا اور قتل کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ (۱)

اسی زمانے میں رسول اللہ ﷺ نے فرماں روایان ممالک کو دعوت اسلام کے خطوط بھیجے تھے، ان میں ایک خط بصریٰ کے حاکم کے نام بھی تھا، راستے میں غسانی بادشاہ شرحبیل بن عمرو نے، جو رومی حکومت کا علاقے میں نائب تھا اور عیسائی تھا، آپ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر کو پکڑ کر قتل کر دیا، جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یہ پورا خطہ رومی سلطنت میں داخل اور عیسائی حکومتوں کے تابع تھا، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان طاقتوں کی تادیب ضروری سمجھی۔

اب غزوۂ موتہ ہوتا ہے، آپ ﷺ کا غالباً اندازہ تھا کہ روم کی تابع ان عرب ریاستوں کے لئے ایک مختصر فوج (۳/ہزار) کافی ہونی چاہئے، مگر ادھر براہ راست قیصر (ہرقل) حرکت میں آ چکا تھا، اسلامی لشکر علاقے میں پہنچا تو پتہ چلا کہ رومی زبردست لشکر کشی کرنے کی تیاری کر چکے ہیں، غسانی عیسائی عرب قبائل کی بڑی تعداد لے کر سامنے ہیں اور ایک بڑی کمک لے کر ہرقل کا بھائی تھیوڈور آ رہا ہے، خود قیصر روم حمص میں پڑاؤ ڈالے ہے، بہرحال اللہ کی نصرت اور مجاہدین کی جانبازیوں کی بدولت لشکر اسلام بحفاظت واپس آ گیا، رومی مرعوب ہوئے اور ان کو اندرون عرب لشکر کشی کی جرأت نہیں ہوئی۔

اس اثناء میں خود مدینے کے اندر سے ایک فتین شخص ابو عمرو راہب عیسائی ہو کر غسانیوں کے یہاں بھاگ گیا تھا، اور مستقل اس سازش میں مصروف تھا کہ وہاں سے ایک بڑی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کرے، مدینہ میں منافقین مستقل اسی کے رابطے میں تھے، آخر جب یہ سازش اپنے عروج کو پہنچی تو انھوں نے عین مدینہ میں مسجد کے نام پر اپنا ایک مستقل مرکز بھی بنالیا جہاں بیرونی حملہ آور افواج کی مدد کے منصوبے تیار ہوتے تھے، قرآن نے اسی پوری سازش کا پردہ چاک کیا کہ یہ مرکز دراصل رومی حملہ کی سازشوں کا گڑھ ہے۔ (سورۂ توبہ: ۱۰۷)

اب سن ۹ ہجری آتا ہے، رومیوں کی حرکتیں اس درجہ بڑھ گئی تھیں کہ صحابہ کرام ﷺ کو ہر دم رومی حملے کا اندیشہ لاحق تھا، ایلاء کے سلسلۂ واقعات میں آتا ہے کہ جب حضرت عمر ﷺ کے ایک پڑوسی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نہایت بے چینی کے ساتھ کہا کہ: ارے! بڑا حادثہ ہو گیا'' تو حضرت عمر ﷺ نے دفعتاً پوچھا: کیا ہوا؟ کیا غسانیوں نے حملہ کر دیا؟ خود حضرت عمر ﷺ بیان کرتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ خبریں آرہی تھیں کہ غسانی حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ (۲)

اب تاجروں اور مسافروں نے آ آ کر خبریں دیں کہ رومی اپنے حلیف عیسائی عرب قبائل اور ریاستوں کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں، فوجوں کو ایک سال کی تنخواہیں پیشگی بانٹی گئی ہیں، اور کچھ

(۱) سیرت ابن ہشام۔ (۲) صحیح بخاری۔

دستے بلقاء تک پہنچ رہے ہیں، (۱) روایات بتاتی ہیں کہ عیسائی قبائل نے اپنے آقا قیصر روم کو خط لکھ کر یہ خبر دی کہ عرب میں اس سال شدید قحط ہے، حملہ کرنے کے لئے یہ موقعہ اچھا ہے تو اس نے اپنی طرف سے ایک بڑی فوج تیار کر کے عرب پر لشکر کشی کے لئے بھیجی۔ (۲)

یہ وہ حالات تھے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کا فوری حکم دیا اور باوجود اس کے کہ موسم سخت گرم تھا اور مسلمانوں کو سخت غربت اور تنگ حالی کا سامنا تھا، لہٰذا جنگ کے لئے یہ وقت نہایت مشکل اور نامناسب تھا؛ لیکن کوئی تاخیر اس لئے ممکن نہیں تھی کہ خطرہ نہایت سنگین تھا اور فوری تھا، خطرہ اس لئے بھی نہایت سنگین تھا کہ فتح مکہ کے بعد عرب قبائل کا اسلام ایسا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ اگر رومی اندرون عرب گھس کر حملہ کرتے تو ان سے استقامت کی امید کی جاتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ان قبائل کی بڑی تعداد کے ارتداد اور بغاوت نے ثابت کر دیا کہ اگر روم جیسی طاقت کا حملہ ہوتا تو یہ قبائل یقیناً بغاوت کر دیتے اور اسلامی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے، اس لئے آپ ﷺ نے سرحد پر جا کر ہی دشمن کو روکنا اور مسلمانوں کی قوت کا رعب قائم کرنا ہر حال میں ناگزیر جانا۔

ان حالات میں یہ دونوں آیتیں مسلمانوں کو رومی طاقتوں سے جنگ کے لئے حکم دینے اور اس پر ابھارنے کے لئے نازل ہوئیں۔

ایک اہم نکتہ جس پر ان آیات کا صحیح فہم موقوف ہے

اس دراز تفصیل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ واضح کیا جاسکے کہ یہ آیات دراصل اہل کتاب سے جنگ کے فقہی مسئلہ کو بیان کرنے یا ابتداءً اس کا حکم دینے کے لئے نازل نہیں ہوئیں، اہل کتاب سے اور رومی عیسائی طاقتوں سے کشمکش پہلے سے جاری تھی، یہ جنگ پہلے سے فرض ہو چکی تھی، اب یہ آیات مسلمانوں میں اس جنگ کے لئے ہمت و جوش پیدا کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں اور رومیوں کی یہ صفات کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، دین حق کے منکر ہیں، اور اللہ و رسول کے محرمات کو حرام نہیں سمجھتے، فوجوں کے اندر جوش اور ان کے خلاف غیظ و غضب پیدا کرنے کے لئے بیان کی گئی ہیں، یہ رومیوں سے قتال کی علت نہیں ہیں، قتال کی علت رومیوں کا صدعن سبیل اللہ (اللہ کے راستے سے روکنا) ایک مسلمان کو اسلام قبول کرنے کی پاداش میں قتل کرنا (فتنہ) اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں (محاربہ) کرنا تھا۔

(۱) المواهب اللدنيه، مع شرح زرقانی: ۶۳/۳، ابن سعد: ۱۶۵/۲۔

(۲) المعجم الكبير للطبرانی: ۲۳۱/۱۸

بہر حال اس سے پتہ چلتا ہے کہ شمال عرب کی ان ساری مہموں کی اصل علت ''محاربہ'' اور ''فتنہ'' تھی، رومیوں سے جنگ کا حکم دینے والی ان ہی آیات کے سلسلہ میں آگے جا کر وہ آیت آتی ہے جو اس موقف کی ایک دلیل کے طور پر پہلے ذکر کی گئی ہے :

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا قَاتِلُوْا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُم مِّنَ الْکُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَةً . (التوبة:۱۲۳)

اے ایمان والو! ان کافروں سے، جو تمہارے قریب ہیں، جنگ کرو اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔

گذشتہ تفصیل کی روشنی میں آیات کا سیاق بالکل یقینی طور پر واضح کرتا ہے کہ آیت کے نزول کے وقت اصلا ''الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُم مِّنَ الْکُفَّارِ'' سے مراد یہی رومی طاقتیں ہیں جو عرصے سے محاربہ کر رہی تھیں اور جن کے خلاف جنگ پہلے سے چلی آرہی تھی، درمنثور میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے یہی فرمایا تھا کہ اس سے مراد روم والے ہیں، مفسرین نے اسی کے اصل معنی یہی لیے ہیں، یہ کوئی ایسا اصول نہیں بتایا جارہا تھا جس کی رو سے مسلمانوں پر اپنے قریب کی غیر مسلم حکومتوں سے جنگ کرنا ہمیشہ اور بغیر کسی سبب کے ضروری قرار پائے، ہاں اگر کوئی اس سے اور ان دونوں آیتوں سے قیاس کے طور پر یہ استدلال کرے کہ جو علت روم والوں سے جنگ کرنے کی موجب بنی تھی وہ علت جن ''کفار'' میں بھی پائی جائے گی اور جب بھی پائی جائے گی ان سے جنگ مسلمانوں پر فرض ہوگی تو یہ قیاس بالکل صحیح ہوگا، پھر ان اسباب کی تحقیق میں تاریخی طور پر یہ طے ہے کہ روم کی حکومت اور اس کی تابع ریاستیں صرف محارب ہی نہیں تھیں؛ بلکہ اسلامی ریاست کے لئے ایسا شدید خطرہ بنی ہوئی تھیں کہ اگر ان کو ذرا نظر انداز کیا جاتا تو اسلام اور اسلامی ریاست کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا۔

(۴) اس موقف کے حامل حضرات کثیر تعداد میں ان نصوص کو بھی پیش کرتے ہیں جن میں کفار یا مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم آیا ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان نصوص پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ تأثر یقیناً قائم ہوتا ہے کہ سارے کفار و مشرکین سے جنگ کا حکم دیا جارہا ہے؛ مگر اگر قرآن مجید کے سیاق وسباق میں غور کیا جائے اور یہ اُصول مدنظر رہے کہ قرآن مجید کی آیات جنگ کے حالات میں نازل ہوا کرتی تھیں جب کہ کفار و مشرکین کے مخصوص گروہوں یعنی مشرکین مکہ، دیگر عرب قبائل اور یہود مدینہ اور نصارائے شام و روم میں سے کسی کے خلاف جنگ قائم ہوتی تھی تو یہ سمجھ لینے میں دقت نہیں پیش آئے گی کہ ان نصوص کا مقصد لوگوں میں ان دشمنوں سے قتال کے لئے جوش وآمادگی پیدا کرنا ہوتا تھا۔

مثلاً رسول اللہ ﷺ جب فوجوں کو روانہ کرتے تو جو ہدایات دیتے تو ان میں یہ بات بھی فرماتے: اغزوا باسم اللہ قاتلوا من کفر باللہ، (۱) اللہ کے نام پر جنگ کو جاؤ، اللہ کا انکار کرنے والوں سے جنگ کرو، اب اگر اس کے صرف ظاہری الفاظ کو دیکھیں تو کفر علت قتال نظر آتا ہے، جو کسی کے نزدیک مراد نہیں ہے، یا جیسے قرآن میں کہا گیا :

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً . (التوبۃ:۳۶)

تمام مشرکوں سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کرتے ہیں۔

اس آیت میں تمام مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا، مگر آگے اس کا سبب یہ بیان کیا گیا کہ ''وہ سب کے سب تم سے برسر پیکار و جنگ ہیں، اس لئے تم بھی ان سب سے جنگ کرو'' اس سبب کے بیان سے خود بخود مراد طے ہو گئی کہ اس آیت سے صرف مشرکین عرب مراد ہیں۔

(۵) مولانا مودودیؒ نے اس نقطۂ نظر کو کہ مسلمانوں کو بشرط مقدور غیر مسلم حکومتوں سے ہر حال میں جنگ کرنی ہے، نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس کے دلائل مرتب کیے ہیں، مولانا اس کو مصلحانہ جنگ کا نام دیتے ہیں ، موصوف نے ایک نہایت طولانی بحث کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا اصل مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، یہ امت اسی فریضہ کی انجام دہی کے لئے قائم کی گئی ہے، پھر مولانا فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف تو طاقت کے زور سے انجام دیے جانے والا فریضہ نہیں ہے، وہ تو وعظ و نصیحت کے ذریعہ انجام دیا جائے گا؛ البتہ منکر کی مولانا نے دو قسمیں قرار دی ہیں، (۱) قلب و ذہن کی اور خیال و رائے کی گندگی اور ناپاکی، اس کو دور کرنے کے لئے وعظ و تلقین کا حکم دیا گیا ہے اور (۲) فعل و عمل کی برائی، مولانا کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت نے اس کو بزور طاقت مٹانے کو مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا ہے، اس کے لئے مولانا نے ان احادیث کا حوالہ دیا ہے جن میں منکر سے اگر قدرت ہو تو طاقت کے زور سے روکنے کا حکم آیا ہے ''فلیغیرہ بیدہ '' پھر مولانا فرماتے ہیں کہ ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ :

اگر مسلمانوں میں اتنی قوت ہو کہ تمام دنیا کو منکر سے روک کر اسے قانون عدل کا مطیع بنا دیں تو ان کا فرض ہے کہ اس قوت کو استعمال کریں اور جب تک اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا نہ دیں چین نہ لیں۔(۲)

---

(۱) صحیح مسلم ، کتاب الجهاد ، باب تامير الإمام الأمراء۔

(۲) الجهاد فی الإسلام۔

یقیناً احادیث میں اس کا حکم آیا ہے کہ ''تم میں سے جو کوئی برائی (منکر) دیکھے تو اس کو اگر قدرت ہو تو ہاتھ سے مٹادے'' مگر باتفاق علماء یہ حکم مسلم امت کے داخلی دائرے کے اندر کا ہے، کسی نے اس کا مطلب یہ نہیں سمجھا ہے کہ جو غیر مسلم ان منکرات کو منکر ہی نہیں جانتا مثلاً شراب خوری، محرمات اکل وشرب، ہر مسلمان ان کو بھی بزور وطاقت مٹانے کا (بشرط قدرت) ذمہ دار ہے؛ بلکہ یہاں بھی وہی اشکال سامنے آتا ہے کہ کوئی اس کا قائل نہیں کہ جہاد کے نتیجے میں ''منکر'' کا خاتمہ ہو جائے گا؛ بلکہ جہاد کے بعد اہل ایمان کو جب فتح نصیب ہوگی تو ''فعل وعمل کی برائی'' والا وہ منکر (جس کے خاتمے کو مولانا جہاد کا مقصد بتاتے ہیں) باقی رہے گا، اہل ذمہ شراب بنائیں گے، پئیں گے، مردار کھائیں گے، حرام کام کریں گے اور عملی طور پر مشرکانہ اعمال ورسوم پر کاربند رہیں گے، جہاد اور اسلامی حکومت ان چیزوں کا خاتمہ نہیں کریں گے، یہیں سے مولانا کا استدلال بے محل ثابت ہو جاتا ہے۔

پھر مولانا نے ''وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ'' (الانفال:۳۹) والی آیت کے علاوہ کچھ اور آیات بھی پیش فرمائی ہیں جن کے بارے میں مولانا کا کہنا یہ ہے کہ ان میں ''بزور شمشیر'' جہاد کر کے ''فتنہ وفساد'' کو مٹانے کا حکم دیا گیا ہے؛ مگر مجھے سخت حیرت ہے کہ اس مقام پر مولانا ایسی آیات بھی کیسے اور کیوں کر ذکر کر گئے ہیں جن کا موضوع جہاد وقتال سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں، مثلاً قرآن نے ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل پر واضح کر دیا گیا تھا کہ جس نے کسی جان کو قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو تو گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا، مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً، (المائدۃ:۳۲) ایک جگہ قرآن نے منافقین کے بارے میں کہا کہ وہ پہلے بھی مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کرنا اور ان کو رسول اللہ ﷺ کے احکام سے روگرداں کرنا چاہتے تھے، ان کے اس عمل کو قرآن نے ''فتنہ پروری'' سے تعبیر کیا اور کہا ''لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ'' (التوبۃ:۴۸) مولانا رحمۃ اللہ نے یہاں یہ دونوں آیتیں بھی نقل فرمائی ہیں جو بے محل ہیں، یقیناً دونوں مقامات پر جن اعمال اور کرداروں کو فساد یا فتنہ کہا گیا ہے وہ خطرناک قسم کے منکر ہیں، مگر قرآن نے ان کے خلاف نہ جنگ کا حکم دیا ہے اور نہ ان کا استیصال جنگ کے ذریعہ ممکن ہے۔

ایک عجیب بات

آگے چل کر مولانا مرحوم نے ایک مرتبہ پھر تفصیل سے واضح کیا ہے کہ قرآن نے کن کن جرائم کو فساد قرار دیا ہے، تفصیل کا یہ موقع نہیں ورنہ ہم مولانا کی یہ پوری بحث نقل کرتے تاکہ قارئین کو اندازہ ہوتا کہ مولانا کی اس تشریح نے ساری ہی برائیوں اور خرابیوں کو اپنے دائرہ میں لے لیا ہے، مولانا مرحوم کے یہاں اس منکر کا دائرہ کتنا وسیع ہے

جس کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ''الاثم'' (گناہ) کو بھی مولانا نے اس فساد کا مصداق قرار دیا ہے کہ جو کسی قوم میں اگر پایا جائے تو اس کے خلاف جنگ ضروری ہو جائے گی، اب اس پر کیا رائے زنی کی جائے؟

فتنہ کی تشریح

مولاناؒ کے اس موقف کی شاید اہم ترین بنیاد ''فتنہ'' کی وہ خاص تشریح ہے جو انھوں نے جنگ کی غایت اور انتہا بتانے والی آیت: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ، (الانفال:۳۹) ''ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ باقی رہے'' کے ذیل میں کی ہے، مولاناؒ نے منکر کی دو قسمیں: (۱) قلب وذہن کی گندگی، (۲) فعل وعمل کی برائی بیان کرنے کے بعد کہا ہے:

> منکر کی اس دوسری قسم کو جس کے خلاف اسلام میں قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے پہلی قسم سے ممتاز کرنے اور اس کی نوعیت کو اور زیادہ واضح کر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور فساد کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، چنانچہ ان تمام آیات میں جن میں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے، یا جنگ کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے، یا اسے بزورِ شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے، آپ کو منکر کے بجائے ہی فتنہ وفساد کے الفاظ ملیں گے۔(۱)

مگر پھر مولانا نے فتنہ کو اللہ کے دین سے روکنے کے لئے زور، زبردستی اور تعذیب وامتحان کے معنی میں لیتے ہوئے اس کو تقریباً Persecution (یعنی مذہبی جبر، یحییٰ) کے ہم معنی قرار دیا ہے، واضح رہے کہ اوپر مولانا کی وہ عبارت آچکی ہے جس میں مولانا نے فتنے کی یہ تشریح کی تھی کہ اس سے مراد ہے ''سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرماں روائی قائم ہو اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے'' گویا مولانا خود تذبذب کے شکار نظر آتے ہیں اور ان کے یہاں اس اصطلاح کی تین مختلف تشریحات ملتی ہیں۔

فتنہ فعل وعمل کی برائی نہیں ہے

ہم پورے ادب سے عرض کرتے ہیں کہ قتال وجنگ کی علت کے طور پر جن دو مقامات پر قرآن نے ''فتنہ''

---

(۱) الجہاد فی الاسلام، ص:۱۰۴۔

کا تذکرہ کیا ہے ان میں یہ ''فعل وعمل کی برائی'' کا مفہوم نہ کسی کوشش سے پیدا کیا جا سکتا ہے نہ آج تک کسی عالم نے پیدا کیا ہے، یہ سراسر ایک علمی جدت ہے، حقیقۃً یہاں صرف ظلم وجبر اور تعذیب کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے روکنا ہی مراد ہے اور خود مولانا بھی اسی کتاب میں فتنہ کی یہی حقیقت بیان فرماتے ہیں۔(۱)

اب یہ لاینحل معمہ پھر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ پہلے تو مولانا نے یہ ارشاد فرمایا کہ فعل وعمل کی برائی وہ منکر ہے جس کو قرآن فتنہ اور فساد کا نام دے کر اس کے خلاف جنگ کا حکم دیتا ہے اور آگے ''فتنہ کی تحقیق'' کے زیر عنوان رقم فرماتے ہیں کہ اس مؤخر الذکر مفہوم میں فتنہ کا لفظ تقریباً انگریزی لفظ (Persecution) کے ہم معنی ہے، ان دونوں باتوں میں کیسے جوڑ پیدا کیا جائے، مولانا نے ''فتنہ'' کے جو قرآنی استعمالات نقل کئے ہیں، ان میں کہیں بھی فتنہ سے مراد فعل وعمل کی برائی والا منکر نہیں ہے جیسا کہ مولانا نے پہلے دعوی فرمایا تھا۔

فساد کی تشریح

البتہ مولانا نے ''فساد'' کی جو تشریح فرمائی ہے، اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کی منشا تمام مفسد اخلاق گناہوں کو قرآن میں ''فساد'' کا مصداق قرار دینا ہے، موصوف نے فساد کے علت قتال ہونے پر دو آیتیں پیش فرمائی ہیں :

(۱) وَلَوْلاَ دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ، (البقرۃ:۲۵۱) ''اگر اللہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا''۔

(۲) مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً، (المائدۃ:۳۲) ''جس نے کسی کو قتل کیا بغیر کسی قتل یا فساد کی سزا کے تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا''۔

کسی معمولی سے علم رکھنے والے کے لئے بھی یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس میں سے دوسری آیت تو کسی طرح جہاد وقتال سے متعلق ہے ہی نہیں، اس کو جو کچھ تعلق ہے وہ حدود وتعزیرات سے ہے، مولانا جیسے ذہین شخص نے اس کو کیسے یہاں ذکر کیا اس پر حیرت ہے۔

جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے وہ یقیناً جنگوں کا یہ نتیجہ بتا رہی ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دنیا کو بگاڑ سے بچاتا ہے، تفصیل کا موقع نہیں ورنہ ہم آیات کا سیاق پورا ذکر کرتے کہ یہاں قرآن بنی اسرائیل پر ظلم وستم کرنے والی طاقت کی شکست کا تذکرہ کر رہا ہے، اس کے بعد کہہ رہا ہے کہ اسی طرح جنگوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ظلم سے باز رکھتا ہے ورنہ دنیا تباہ ہو جائے۔

---

(۱) الجہاد۔

ذرا سے غور وفکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں فساد سے مراد وقت کے کفار کی وہ ظلم وسرکشی ہے، جس کا سامنا بنی اسرائیل کرتے آرہے تھے اور جس کا تذکرہ بنی اسرائیل کے قائدین کی زبانی ان الفاظ میں کیا ہے کہ ہمارے دشمنوں نے عرصے سے ہم کو اپنے وطن سے نکال دیا ہے اور ہمارے بچوں (اور عورتوں) کو قیدی بنالیا ہے: ''وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا '' (البقرۃ:۲۴۶) بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس واقعہ کے بیان سے پہلے جو (آیات:۲۴۳ تا ۲۴۵) ہیں، وہ مسلمانان مدینہ کو مکہ کی ظالم طاقت کے خلاف جنگ کرنے اور اس کی تیاری کے لئے مال خرچ کرنے کا حکم دینے والی آیات ہیں۔

اس سیاق میں بنی اسرائیل کی اسی حالت مظلومیت کا تذکرہ یقیناً مسلمانوں کو ان کی اپنی حالت یاد دلاتا تھا، اس ماحول اور سیاق کو ذہن میں رکھنے کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں ''فساد'' سے کیا مراد ہے یقیناً ''فعل وعمل کی برائی''، جس کے دائرے میں مولانا آگے جا کر وہ تمام گناہ داخل بتاتے ہیں جو آدمی کے ذاتی اخلاق کو غارت کرتے ہیں، ہرگز یہاں مراد نہیں ہے، جس موقع اور زمانے کی یہ آیت ہے، اس میں مسلمانوں کو صرف اور صرف مکہ والوں کی تعدی اور ظلم وجبر سے لڑنے کا حکم دیا جارہا تھا۔

قرآن نے فساد کے خلاف کہیں قتال کا حکم نہیں دیا ہے

بلکہ قرآن نے کسی جگہ بھی ''فساد'' کے خلاف جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے، قرآن مجید میں مسلمانوں کو جہاد پر اُبھارنے اور جنگ کے لئے جوش اور حمیت پیدا کرنے والی آیات نہایت کثرت کے ساتھ ہیں؛ لیکن کہیں بھی ان کو ''فساد'' کو مٹانے کے لئے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

فساد فی الأرض کے معنی

ہاں! اللہ تعالیٰ نے یہ ضرور کہا ہے کہ اگر زمین اہل حق کے جہاد سے خالی ہوگی تو ''زمین میں فساد'' رونما ہوگا: وَلَوْلاَ دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الأَرْضُ، (البقرۃ:۲۵۱) فساد اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے تو بڑا عام لفظ ہے، ہر بگاڑ اور صلاح کی ضد پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے اور مولانا مرحوم نے اس کو اسی معنی میں لیتے ہوئے قرآن کی بہت سی آیات میں ''فساد'' کے معانی ومصداقات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، یہاں تک کہ ''الاثم'' (یعنی بقول مولاناؒ ذاتی اخلاق بگاڑنے والے گناہ) کو بھی فساد کا مصداق قرار دے دیا ہے، کوئی شک نہیں کہ ہر گناہ بگاڑ ہے؛ مگر جب فساد کے یہ معنی اس سیاق میں بتلائے جائیں کہ ہر فساد وفتنہ کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اخلاقی خرابی فساد ہے، تو یہ تشریح بڑی محل نظر ہو جاتی ہے اور ''لا إكراه في الدين'' کے قرآنی اصول سے سیدھی جا ٹکراتی ہے۔

قرآن مجید میں فساد اور اس کے مشتقات Derivatives پچاس جگہ پر آئے ہیں، اور نہایت قلیل مواقع کے استثناء کے ساتھ عموماً ہر جگہ اس سے ناجائز خونریزی، بدامنی، حق تلفی اور ظلم وقہر کے معنی ہی مراد ہیں، جو حضرات اس کی تفصیل جاننا چاہیں وہ ایسے مواقع کو ان کے سیاق وسباق پر غور کے ساتھ دیکھ لیں، ان شاء اللہ اطمینان حاصل ہو جائے گا۔

مولانا مرحوم نے جو دو آیتیں اپنے خیال کے مطابق اس مقصد سے پیش کی ہیں کہ قتال کی ایک علت ''فساد'' ہے، ان میں ''فساد ارض'' یا فساد فی الأرض کے الفاظ ہیں، صرف فساد لغت کے اعتبار سے کسی بھی بگاڑ اور خرابی کے لئے آسکتا ہے؛ اگرچہ قرآن عموماً فساد کو اور خصوصاً باب افعال کے صیغے ''افساد'' کو خونریزی، ظلم وحق تلفی اور بدامنی کے معنی میں ہی استعمال کرتا ہے، مگر ''فساد فی الأرض'' کے بارے میں عربیت کے ذوق اور اس تعبیر کے مواقع استعمال سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ صرف گناہ برائی یا مولانا کے الفاظ میں ذاتی اخلاق کو بگاڑنے والے گناہ ''الإثم'' پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا، فساد فی الأرض کے معنی میں لازمی طور پر ظلم وزیادتی، خونریزی، اور طاقت کے زور پر لوگوں کو مقہور ومجبور بنانا ضرور داخل ہے، قرآن کے استعمالات پر گہری نظر رکھنے والے مشہور امام عربیت علامہ جار اللہ زمخشری نے اس طرف اشارہ فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''والفساد في الأرض: هيج الحروب والفتن'' فساد فی الارض کے معنی جنگیں بھڑکانا اور فتنہ (قتل وخونریزی) پھیلانا ہے۔(۱)

بالکل یہی الفاظ ہمیں صاحب مدارک التنزیل علامہ نسفی اور ابوالسعود کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

عجیب وغریب طریق استدلال

یہاں مولانا کے استدلال کا یہ پہلو بڑا محل نظر ہے کہ قرآن نے اگر کسی جماعت کو ایک جگہ مفسد کہہ دیا تو اب پورے قرآن میں اس کے کردار وعمل کی جن خرابیوں کا بھی تذکرہ آیا ہے، مولانا کہتے ہیں کہ یہ قرآن کی اصطلاح میں فساد کا مصداق ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی کسی کو کہے کہ وہ نہایت خائن ہے، پھر کسی دن کہے کہ وہ شراب پیتا ہے، اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کروں کہ متکلم کے نزدیک شراب پینا خیانت کا مصداق ہے، مذکورہ طریقۂ استدلال بعینہٖ اسی قسم کا ہے۔

اس سے بھی عجیب بات

بہر حال مولاناؒ کی اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ ''مصلحانہ جنگ'' کا سبب قرآن کے بموجب ''فتنہ

(۱) تفسیر سورۂ بقرہ:۱۱۔

اور فساد' ہیں اور ان دونوں کے دائرے میں مولانا کی تشریح کے مطابق تمام ہی تمدنی اور اخلاقی خرابیاں آجاتی ہیں، بحث کے اس نقطہ پر پہنچ کر (جب ایک سادہ ذہن قاری ''فتنہ وفساد'' کو اسلامی نقطۂ نظر سے جنگ کا اصلی سبب جاننے لگتا ہے اور ان کے وہی معانی اس کے ذہن میں بیٹھ جاتے ہیں، جو مولانا نے ذکر فرمائے ہیں اور وہ یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ ہر طرح کے اخلاقی اور تمدنی فساد کو مٹانے کے لئے اسلام نے جنگ کو فرض کیا ہے) تو اب مولانا یہ فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ ''فتنہ وفساد'' بھی جنگ کا سبب نہیں ہے؛ بلکہ جنگ کا اصل سبب غیر مسلم حکومت ہے اور وہ اس جواز کی بنیاد پر کہ وہی ان ساری برائیوں کا سرچشمہ یا ان کا محافظ ہوتی ہے۔

بحث کا یہ پہلو چوں کہ مولانا کے استدلال کا مرکزی حصہ ہے، اس لئے ہم اسے مکمل مولانا کے الفاظ میں نقل کریں گے، مگر سردست ذہن میں اٹھنے والے اس سوال کا تذکرہ ضرور کردیں کہ پہلے تو مولانا ''فعل وعمل'' کی برائی ''منکر'' کو فتنہ وفساد کا مصداق قرار دے کر قتال کو ضروری قرار دیتے ہیں اور مولانا کے یہاں اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ''گناہ'' اور الاثم بھی جنگ چھیڑ دیئے جانے کے لئے ایک سبب قرار پاتا ہے، مگر اچانک یہ کیا ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ مولانا ان جرائم اور گناہوں کو نہیں بلکہ ''غیر مسلم حکومت'' کو قتال کا اصل سبب قرار دینے لگتے ہیں، وجہ مولانا ہی کے الفاظ میں پڑھئے :

> اب اگر ان تمام برائیوں پر ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ وفساد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس اور بداصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں، اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو کم از کم اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا تو یقیناً اسی حکومت کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے، اول تو ایسی حکومت فی نفسہ ایک فتنہ ہے؛ کیوں کہ وہ حکومت کے منشأ اصلی کے خلاف ہوتی ہے، پھر اس کی برائی کسی ایک دائرے تک محدود نہیں رہتی ؛ بلکہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور فتنہ وفساد کے تمام اصول فروع کا منبع بن جاتی ہے، اسی سے صدعن سبیل اللہ ہوتا ہے، اسی سے حق وانصاف کا سر کچلا جاتا ہے، اسی سے بدکاروں اور ظالموں کو اپنے برے اعمال کی قوت حاصل ہوتی ہے، اسی سے اخلاق کو تباہ کرنے والے اور عدل اجتماعی (Social Justice) کو غارت کرنے والے قوانین نافذ ہوتے ہیں، وہی بنی آدم کی جمعیت میں نفاق وشقاق کی تخم ریزی کرتی ہے، اسی کی بدولت

جنگ وخونریزی کی آگ دنیا میں بھڑکتی ہے، اسی سے قوموں اور ملکوں پر بلائیں نازل ہوتی ہیں، اور خلاصۂ کلام یہ کہ یہی وہ چیز ہے جس کی قوت کسی نہ کسی حیثیت سے ہر بدی و بدکاری کا وسیلہ یا اس کے قائم یا باقی رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔(۱)

مولانا مودودیؒ کی کتاب اس موضوع پر ایک کارنامہ سے کم نہ تھی، اس کی اس تاریخی اہمیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں کہ وہ ایسے وقت سامنے آئی جب الزامات کے شور نے کانوں کے پردے پھاڑ دیے تھے، پورے ماحول میں ایک طرح کی سراسیمگی طاری تھی، بہت کسی سے بن پڑتا تھا تو وہ نہایت نحیف آواز اور سہمے سہمے انداز میں کچھ معذرت خواہانہ صفائیاں پیش کرلیا کرتا تھا۔ اس ذہین نوجوان نے پورے اعتماد کے ساتھ جہاد کی وکالت کی اور دوسرے مذاہب اور مغرب کے مدعیانِ تہذیب کے کارناموں کی تصویر سامنے رکھ کر نہ صرف تصور جہاد کی عظمت ظاہر کی؛ بلکہ بہت سوں کو شبہات کے دلدل سے نکال لیا۔

مولاناؒ کی کتاب کی اس افادیت اور اہمیت کے پورے اعتراف کے باوجود ایک غیر جانبدار قاری مولانا کے نظریۂ ''مصلحانہ جنگ'' سے مطمئن نہیں ہوسکتا، غیر مسلموں کو تو چھوڑیے، خود مسلمان اہل دین اس نظریہ سے (جو اصطلاحات اور تعبیرات کے فرق کے ساتھ ایک مشہور نظریہ ہے) دلوں میں خلش پاتے ہیں، ہمارے برصغیر میں چوں کہ مولانا نے ہی اس نظریہ کی جدید تفہیم کی ہے اور اس کے دلائل بڑی تفصیل سے پیش کیے ہیں، اس لئے ہم نے ان کا مفصل جائزہ لینا ضروری سمجھا۔

رسول اللہ ﷺ کی جنگوں کی نوعیت

قرآن ہی نہیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت وسنت اور آپ کی دس سال مدنی زندگی کی جنگوں کا حال دیکھ لیجیے آپ نے کسی صلح پر آمادہ طاقت سے جنگ نہیں کی، مکہ والوں کے بارے میں قرآن نے بارہا صراحت کی کہ انھوں نے جنگ چھیڑ رکھی ہے: وَهُمْ بَدَؤُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ، (التوبۃ:۱۳) ''انھوں نے ہی جنگ کی ابتداء کی ہے'' یہ بھی کہا کہ وہ زیادتی اور ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں: ''وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ'' (التوبۃ:۱۰) تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ مکہ میں مظالم اور مذہبی جبر کے اس دور کے بعد، جس کے نتیجے میں مسلمانون کو گھربار، مال اور اولاد چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی، وہ مدینہ پر حملے میں بھی ابتدا کر چکے تھے، ان کے حملہ آور مدینہ پر شب خون اور لوٹ کی کاروائیاں کرتے رہتے تھے، مزید انھوں نے، سنن ابوداؤد (باب في خبر بني النضير) کی صحیح روایت کے مطابق، مدینہ میں یہود کو اور غیر مسلم عربوں کو بھی مسلمانوں سے لڑانے اور ان کے اخراج پر آمادہ کرنے کے لئے دھمکی آمیز خطوط

(۱) الجہاد،ص:۱۱۷۔

لکھے، تیسرا یہ کہ انھوں نے عرب کی زمین مسلمانوں پر ایسی تنگ کر رکھی تھی کہ غریب مہاجرین تجارت کے لئے، جس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، مدینہ سے نکل تک نہیں سکتے تھے، اس طرح مسلمان ایک طرح کی جیل میں اور معاشی حصار میں زندگی گذارنے پر مجبور تھے، (البقرۃ:۲۷۳) اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع فرمائیں۔

اس کے باوجود ان سے صلح پر آپ کی آمادگی کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ یہ تک فرمایا:

لا يسألوني خطة يعظمون فيها حرمات الله إلا أعطيتهم إياها .

یعنی قریش مجھ سے جو بھی صلح کی شرط رکھیں گے اگر اللہ کی حرمات کا خیال رکھا جائے گا تو میں اسی کو ضرور قبول کرلوں گا۔(۱)

مدینہ کے یہودی قبائل کو رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کے معزز اور باحیثیت شہریوں کی طرح رکھا، ریاست کا جو دستور لکھا گیا اس میں یہود کے قانونی امتیازات حقوق وفرائض کا پورا تذکرہ کیا گیا تھا، یہود نے اس کو قبول کرکے اسلامی ریاست اور اس کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کو قبول کیا تھا، مگر سب سے پہلے بنی قینقاع نے علانیہ معاہدہ توڑا، بغاوت کی اور جنگ کا اعلان کیا، (۲) پھر بنونضیر نے غداری کی انتہا یہ کی کہ رسول اللہ ﷺ کو (معاذ اللہ) دھوکہ سے قتل کرنا چاہا، سازش کا انکشاف ہوگیا مگر آپ ﷺ نے بھی تحمل کی انتہا کردی، ان کو سزا دینے کے بجائے مہلت دینے کا ارادہ فرمایا اور ان سے کہا کہ اب تم پر اس کے بغیر اطمینان نہیں کیا جاسکتا کہ تم ازسرنو معاہدہ لکھو، مگر وہ تو آمادۂ جنگ تھے، معاہدۂ صلح پر آمادہ نہیں ہوئے، جب کہ بنی قریظہ نے معاہدہ کی تجدید کی، پھر آپ نے ان پر لشکرکشی فرمائی، (۳) بنی قریظہ کی عہد شکنی؛ بلکہ غزوۂ خندق کے نازک ترین موقع پر حملہ آور فوجوں کا ساتھ دینا اور حملہ میں شرکت معروف ہے۔

دیگر عرب کے مشرک قبائل کے بارے میں قرآن کی صراحت اور تاریخ کی تصدیق ہے کہ وہ سب مسلمانوں کے خلاف آمادۂ پیکار تھے اور قریش کے اتحادی تھے، قرآن نے ان کے بارے میں کہا ہے: ''وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً'' اور تمام مشرکین سے جنگ کرو اس لئے کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کررہے ہیں۔

نجد کے قبائل عکل وعرینہ اور بنوسلیم کی سنگین غداریاں اور خونچکاں حرکتیں معروف ہیں، بنومصطلق جن پر آپ نے اچانک حملہ کیا تھا، وہ پہلے سے محارب تھے، انھوں نے احد میں اہل مکہ کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کیا تھا،

(۱) بخاری، باب الشروط فی الجہاد۔ (۲) سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد۔

(۳) سنن ابی داود، باب خبر بنی النضیر، بسند صحیح۔

پھر ان کے سردار کے بارے میں یہ اطلاع آئی کہ وہ مدینہ پر حملے کے لئے فوجیں جمع کر رہا ہے، آپ نے بریدہ بن الحصیب الاسلمیؓ کو تصدیق کے لئے بھیجا، وہ خود سردار قبیلہ حارث ابن ابی ضرار سے ملے اور اسی سے تیاریوں کی تصدیق کر لی، جب تحقیق ہوگئی تو آپ نے حملہ فرمایا۔(۱)

شمال عرب کی مہمات کی تفصیل پیچھے غزوۂ تبوک اور غزوہ موتہ کے حوالے سے گذر چکی ہے، ہم نے ان مہمات کا پورا تاریخی پس منظر ذکر کر دیا ہے، اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان طاقتوں کے خلاف جو جنگ کی تھی وہ ان کے محاربہ کے نتیجہ میں تھی، آپ نے کسی صلح جو اور امن پر آمادہ طاقت کے خلاف قطعاً جنگ نہیں کی۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم کی صراحتیں

امام ابن تیمیہ اپنے رسالہ ''قاعدة في قتال الكفار'' میں کہتے ہیں:

وكانت سيرته (صلى الله عليه وسلم) أن كل من هادنه من الكفار لا يقاتله ، وهذه كتب السيرة والحديث والتفسير والفقه والمغازي تنطق بهذا ، وهو متواتر من سيرته .

آپ ﷺ کی سیرت کی شہادت ہے کہ آپ سے جن کفار نے صلح کی آپ ان سے جنگ نہیں کرتے تھے، یہ سیرت کی کتابیں ہیں، یہ حدیث وتفسیر اور فقہ وتاریخ کی کتابیں ہیں، سب یہی بتلاتی ہیں اور یہ چیز آپ ﷺ کی سیرت سے متواتر اور قطعی طور پر ثابت ہے۔(۲)

علامہ ابن قیمؒ اپنی کتاب ''ہدایۃ الحیاریٰ'' میں کہتے ہیں:

من تأمّل سيرة النبي (صلى الله عليه وسلم) تبين له ...... أنه إنما قاتل من قاتله ، وأما من هادنه فلم يقاتله .

جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں غور کرے گا اس کو پتہ چل جائے گا کہ...... آپ نے صرف ان لوگوں سے جنگ کی جو آپ سے جنگ کرتے تھے، رہے وہ جنھوں نے آپ سے صلح کی آپ نے ان سے جنگ نہیں کی۔(۳)

---

(۱) طبقات ابن سعد:۲/۶۳، وسیرت ابن ہشام۔ (۲) کتاب مذکور صفحہ:۱۳۴۔

(۳) جلد اول،ص:۱۱۲۔

عہد نبوی کی جنگوں کے لئے صحیح تعبیر

عہد نبوی کی جنگوں کو جن بزرگوں نے ''دفاعی'' جنگوں کا نام دیا ہے، غالباً یہ لفظ اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے یہ خیال قائم ہوتا ہے کہ آپ نے دوسروں کے حملوں کا صرف دفاع کیا، حالاں کہ واقعہ یہ تھا کہ آپ محاربہ کا ارادہ اور تیاری کرنے والوں کے خلاف خود بھی اقدامات فرمایا کرتے تھے، جنگ بدر ایسے ہی ایک اقدام کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئی، موتہ اور تبوک کی یہی کہانی ہے، اور بنو مصطلق اور دیگر کئی مہموں کی یہی حقیقت ہے، آج کی اصطلاح میں آپ ان جنگوں کو (Preemptive wars) کہہ سکتے ہیں، بہر حال آپ ﷺ نے دفاعی جنگیں بھی لڑیں ہیں، اور محاربہ کرنے والوں کے خلاف اقدامی جنگیں بھی، مگر آپ کی ہر جنگ صرف محارِب طاقتوں کے خلاف تھی اور اسی لئے قطعی طور پر منصفانہ تھی اور اس ''اعتداء'' اور زیادتی سے پاک تھی جس سے دور رہنے کا حکم قرآن نے مسلمانوں کو عین اس وقت دیا تھا جب ان پر جنگ کرنا واجب قرار دیا جارہا تھا: ''وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا إِنَّ اللهَ لاَ یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ''۔ (البقرۃ:۱۹۰)

علت القتال محاربہ ہے

اسی لئے راقم سطور کی رائے میں جہاد کو صرف دفاع کی حد تک محدود کہنا صحیح نہیں ہے، جہاد اقدامی بھی ہے اور دفاعی بھی، اس لئے کہ دفاع کے لفظ سے یہ مترشح اور محسوس ہوتا ہے کہ حملے میں پہل ناجائز ہوگی، حالاں کہ ظلم اور ''فتنہ'' کی مرتکب طاقت کے خلاف قرآن نے جنگ کی ابتدا کرنے کا حکم دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام ﷢ نے ایسا کیا ہے، نیز ایک اہم بات یہ ہے کہ کسی طاقت نے اگر جنگ کی ابتدا نہیں کی ہے؛ لیکن وہ صلح پر اور اسلام کی دعوت کے امکانات کھولنے پر راضی نہ ہو اور اس کی طرف سے حملے کا خدشہ قائم ہو تو اس پر پیش قدمی کر کے حملہ اگرچہ دفاع نہیں کہا جاسکتا؛ لیکن مسلم عرف انسانی میں یقیناً وہ ایک جائز حملہ ہوگا اور رسول اللہ ﷺ نے ایسی متعدد جنگیں کی ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ جب کسی طاقت سے جنگ چھڑ جائے، اور دشمن کسی بامعنیٰ صلح پر راضی نہ ہو؛ لیکن دونوں فریق بغیر کسی معاہدے کے عملاً قتال اور لڑائی روک کر اپنے مورچوں میں واپس چلے گئے ہوں، پھر ایک فریق حملے میں ابتدا کردے تو یہ، دفاعی جنگ نہ ہونے کے باوجود، اس پہلے سے چلی آرہی جنگ کا تسلسل ہونے کی وجہ سے جائز اور معقول جنگ ہوگی، اس میں آپ حملہ آور فریق کو ظالم نہیں کہہ سکتے، رسول اللہ ﷺ نے قریش کے تجارتی قافلوں پر جو حملے کئے، جن میں وہ مشہور حملہ بھی تھا جس کے بعد غزوۂ بدر پیش آیا، وہ اسی نوعیت کے معرکے تھے، اس کے علاوہ متعدد جہادی مہمات یہی نوعیت رکھتی تھیں۔

قرون اولیٰ کی جنگی مہمات

صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کے دور میں فارس وروم کی مقبوضات فتح کی گئیں، اس دور میں ہم کو ان دونوں سلطنتوں کے خلاف ایران کی سرحدوں سے لے کر شام ومصر اور الجزائر تک جنگوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے، جلد بازی اور سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والے ان جنگوں کی علت یہ بتاتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جب عرب کے دائیں بائیں نظر اٹھائی کفار کو حکمراں دیکھا، تو ان کو اپنے دین کا یہی حکم نظر آیا کہ ان کے سروں پر تلوار لے کر پہنچ جائیں اور صاف کہہ دیں یا اسلام قبول کرو یا مسلمانوں کے لئے تخت چھوڑ دو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگیں دراصل عہد نبوی کی جنگوں کا امتداد ہیں، رسول اللہ ﷺ کی جب وفات ہوئی تو شام کے حدود پر رومن امپائر کے ساتھ جنگ شروع ہو چکی تھی اور متعدد معرکے ہو چکے تھے، قیصر اور اس کی ماتحت طاقتیں اپنے پڑوس میں ایک انقلابی اور نہایت جاذب ومؤثر دعوت پر قائم ریاست کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے لاکھوں کے لشکر جمع کر چکی تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی پیش بندی کے لئے اقدامات بھی فرمائے تھے؛ لیکن نہ رومیوں کا زور ٹوٹا تھا نہ ان کے ارادے بدلے تھے؛ لہٰذا بعد میں بھی اس قسم کے اقدامات کرنے ضروری تھے، تاکہ اس خطرے کا سدباب ہو سکے، یہ کام خلافت راشدہ کے دور میں انجام پایا۔

سلطنت فارس دوسری بڑی طاقت تھی، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں زیر ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے اس کے فرماں روا کسریٰ کو دعوت اسلام کا خط لکھا، جو اس نے نہ صرف نہایت رعونت کے ساتھ پھاڑ ڈالا؛ بلکہ اپنے ایک گورنر کو (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کرکے اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا، یمن کے گورنر نے دو سپاہیوں کو رسول اللہ ﷺ کے لئے اس پیغام کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ اپنی اور عرب کی خیر چاہتے ہو تو گرفتاری قبول کرکے کسریٰ کے دربار میں حاضر ہو جاؤ، ورنہ تم کسریٰ کی طاقت وجبروت کو جانتے ہو، وہ تمہارے پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

بہرحال اس پس منظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تصور سراسر سطحی مطالعہ پر مبنی ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں جو جنگیں ان ممالک کے ساتھ ہوئیں قصہ کی ابتداء وہیں سے ہوتی ہے، نہ ان کے ساتھ کوئی کشمکش جاری تھی اور نہ یہ حکومتیں اس کے علاوہ کسی اور جرم کی مرتکب تھیں کہ وہ غیر مسلم تھیں اور صاحب شوکت تھیں، افسوس! کس قدر سادگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ لوگ جو خلافت راشدہ کی ان جنگوں کے پورے تاریخی پس منظر کے ریکارڈ ہونے کے باوجود ان ظالم وخونی حکومتوں کو اور ان کے دشمن حق حکمرانوں کے خلاف جنگ کا سبب صرف غیر مسلم حکومت کا خاتمہ قرار دے دیتے ہیں؟ کوئی شخص جو ایک طرف ان سلطنتوں کی توسیع پسندی کی ہوس اور خونی تاریخ کو جانتا ہو

اور دوسری طرف وہ نوخیز اسلامی ریاست اور ان طاقتوں کے ابتدائی تعلقات کے اس پس منظر پر بھی نظر رکھتا ہو جس کو ہم نے اوپر ذکر کیا، کیا وہ اس غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بالکل پڑوس میں واقع ان عالمگیر طاقتوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا؟ اگر شدید خطرہ تھا اور یقیناً تھا، تو ان جنگوں کا حقیقی سبب اس سنگین خطرے کی پیش بندی اور اسلامی ریاست کا تحفظ تھا۔

ان دونوں حکومتوں سے جنگ کو مسلمانوں پر فرض کرنے والی ایک دوسری اہم چیز یہ بھی تھی کہ ان طاقتور حکومتوں کے باقی رہتے ان کے عوام تک اسلام کی دعوت پہنچنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا اوپر ہم ذکر کرآئے ہیں کہ اسلام کے اولین داعیوں کا کیا انجام رومن امپائر کی تابع ایک عرب ریاست میں ذات اطلاح کے مقام پر ہوا، دعوت اسلام دیتے ہی پندرہ میں سے چودہ داعیوں کو قتل کردیا گیا، صرف ایک نہایت زخمی حالت میں...... مدینہ پہنچ سکا، ان ریاستوں کے ایک معزز امیر نے اسلام قبول کرلیا تو ہرقل (بیزنطینی رومن سلطنت کے فرمانروا) نے اس کو بلا کر سولی پر لٹکا دیا کہ دوسروں کے لئے عبرت کا سامان بنے۔

نامۂ نبوی پر کسریٰ کے رعونت بھرے ردعمل نے صاف بتادیا تھا فارسی علاقوں میں دعوت اسلام کا نام بھی نہیں لیا جاسکتا، ان حکومتوں کے مذہبی جبر، اور قرآنی اصطلاح میں ''فتنہ'' اور ''صدعن سبیل اللہ'' نے یقیناً ایسی صورت حال پیدا کردی تھی کہ اللہ کے سپاہی اٹھیں اور ان کے غرور کو، بحکم خدا، خاک میں ملادیں۔

ان حکومتوں کا یہی جرم دراصل صحابۂ کرام ؓ کی جنگوں کا اصل سبب تھا، دراصل اس زمانہ کی صورت حال ہی ایسی تھی کہ کوئی حکومت اپنی قلم رو میں دوسرے دین کو اور خصوصاً اسلام جیسی دعوت کو ہرگز نہیں پنپنے دے سکتی تھی، یہ چیز اس زمانے کی صورت حال میں بالکل قطعی اور طے تھی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان حکمرانوں کو جو خطوط لکھے تھے ان میں کہا تھا کہ اگر تم اسلام نہیں لائے تو پوری قوم کے کفر کے تم ہی ذمہ دار ہوگے، آپ ﷺ نے کسریٰ کو لکھا: فإن أبيت فعليك إثم المجوس ''(۱) مقوقس شاہ مصر کو آپ نے لکھا: ''فإن أبيت فإن إثم القبط عليك ''(۲) قیصر کو آپ نے لکھا: ''فعليك إثم اليريسيين ''(۳) یریسیین یا أرلسیین سے مراد کاشتکاروں پر مشتمل وہ کثیر تعداد کی رعایا تھی جو رومی مقبوضات (شام و مصر اور افریقہ وایشیاء) کے وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی اور جن کی حیثیت تاریخ کی واضح شہادتوں کی روشنی میں مقہور و مجبور غلاموں کی سی تھی۔

ایک اور استدلال

جو حضرات بوقت قدرت تمام غیر مسلم حکومتوں سے، چاہے وہ صلح کرنے پر آمادہ ہی کیوں نہ ہوں، جنگ کے

(۱) تاریخ طبری: ۲/۱۲۳۔ (۲) زاد المعاد: ۳/۶۰۰۔ (۳) صحیح بخاری۔

فرض ہونے کی رائے رکھتے ہیں، ان میں سے بعض بزرگ اسی استدلال کے لئے جو مولانا مودودی کے حوالے سے اوپر گذرا ہے ایک نسبۃً زیادہ معقول تعبیر اختیار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ غیر مسلم حکومت جب اپنی حربی طاقت، مادی وسائل اور اپنے نظریات کے ساتھ موجود رہے گی تو اس کی یہ شوکت خود اس کے عوام کے لئے اسلامی دعوت قبول کرنے سے ایک نفسیاتی رکاوٹ پیدا کرے گی، کفر کی ایسی شوکت وعزت کے ساتھ لوگ آزادانہ غور وفکر نہیں کرسکیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی قوم کی شوکت وطاقت اس کے نظریہ کے لئے ایک مددگار وسازگار ماحول پیدا کرتی ہے اور اس ماحول میں کسی دوسری اجنبی دعوت کے لئے ایک درجہ کی نفسیاتی رکاوٹ پیدا ہونا یقیناً فطری امر ہے، مگر مجھے یہ بتایئے کہ کیا اگر کوئی دوسری قوم یہ کہے کہ ہمارے نظریات پر مسلمان غیر جانبداری کے ساتھ اس وقت تک غور کر ہی نہیں کرسکتے جب تک مسلمانوں کی حکومت وشوکت ختم نہیں کی جائے؛ لہٰذا ہم مسلمانوں کے ملک پر اس لئے حملہ کررہے ہیں؛ تاکہ وہ آزادانہ ہماری دعوت پر غور کرسکیں، تو ایسی شکل میں ہم کیا کہیں گے؟

اگر ہم مذہب وعقیدہ اور نظریہ کے سلسلہ میں آزادانہ انتخاب کے اُصول کے قائل ہیں تو آزادی کے لئے ساری ملتوں کے حق میں ایک ہی معیار اپنانے کا پابند ہونا ضروری ہے۔

نیز یہ بھی سوچئے کہ دنیا میں کون انصاف پسند اس قوم وملت کے بارے میں اچھی رائے رکھ سکے گا جو یہ کہے کہ چوں کہ ہم کو اپنے دین کی تمہیں دعوت دینی ہے اور تمہاری حکومت اور طاقت ایسی نفسیاتی رکاوٹ بن رہی ہے، جس کے رہتے ہوئے تمہارے لئے ہماری دعوت پر پورے طور پر غیر جانبدار ہوکر غور کرنا ممکن نہیں ہے، اس لئے ہم تم سے جنگ کرکے پہلے اپنی حکومت تم پر قائم کریں گے اور تمہاری طاقت ختم کریں گے، ہم بصد ادب ونیاز اپنے بزرگوں سے گذارش کریں گے کہ یہ منطق اسلام کی دعوت کے سامنے کسی بھی غیر مسلم حکومت سے بڑی نفسیاتی رکاوٹ بنے گی اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں یہی تاثر قائم کرے گی کہ یہ باتیں سب بہانے اور دھوکے ہیں اور ان کی آڑ میں ہم کو غلام بنانے اور دباؤ اور لالچ کے ذریعہ ہمارا دین بدلنے کا منصوبہ ہے۔

اصل بات کیا ہے؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علماء سلف کی اکثریت کی تحریروں اور تشریحات سے غالب تاثر یہی نہیں قائم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت اور غیر مسلم حکومت کے درمیان اصل صلح ہے، اور صلح پر آمادہ قوم کے خلاف جنگ کی گنجائش نہیں ہے، ماضی کی طویل تاریخ پر محیط اسلامی فکر کا عمومی رجحان اسی طرف محسوس ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے پاس قدرت وطاقت ہو تو وہ کسی غیر مسلم طاقت سے صلح نہیں کریں گے، چاہے وہ کسی ''فتنہ'' یا زیادتی کی مرتکب نہ ہو اور صلح کی پیش کش بھی کرے۔

پھر کیا یہ رائے غلط تھی؟ کیا علمائے سلف اور ائمہ اسلام اتنی لمبی مدت تک ایک غلط بات کہتے آئے؟ ہرگز نہیں، اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ قیامت تک مکمل محفوظ رہے گا اور یہ بھی کہ اس امت کے اہل علم اجتماعی طور پر کسی غلطی میں نہیں پڑیں گے، جو لوگ اپنے علم وفہم کی بنیاد پر اسلاف امت اور ائمہ کرام کے مجموعی موقف کو غلط سمجھتے ہیں وہ بے شمار گمراہیوں کے دروازے کھولتے ہیں۔

ہمیں پورا اطمینان ہے کہ جس دور میں اور جن حالات میں یہ رائے ظاہری کی گئی تھی وہ بالکل برحق رائے تھی، ان حالات کے لئے وہی شرعی حکم تھا، پہلے کے زمانوں میں ہر ریاست واضح مذہبی شناخت رکھتی تھی، بادشاہتیں مذہب سے اپنی حکومت کے استحکام کا کام لیتی تھیں، بادشاہ یا تو خدا کا اوتار بنتا تھا یا مذہبی قیادت کے ساتھ اس کا یہ سمجھوتہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے، اس لئے اس کا نہ کوئی امکان ہوتا تھا اور نہ ہی تصور کہ کوئی طاقتور حکومت اور منظم ریاست اپنے قلم رو میں اسلام کی نشر واشاعت ودعوت اور اللہ کی عبادت وبندگی کی اجازت دے سکتی ہے۔

اسی لئے مسلمانوں نے جن ریاستوں سے جنگ کی ان میں سے کسی نے کبھی اس کا جھوٹا دم بھی نہیں بھرا تھا کہ وہ اسلامی دعوت کے لئے راستہ کھولنے کو تیار ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سلاطین عالم کو خطوط لکھے تو ان میں صاف لکھا کہ اگر تمہاری حکومت اسلام قبول نہیں کرتی تو عوام کی گمراہی کا گناہ بھی تم پر ہی ہوگا، یہ اسی صورت حال کی طرف اشارہ تھا، اس صورت حال میں چاہے وہ ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں شرعی حکم یہی ہوگا کہ قدرت ہو تو ضرور جنگ کی جائے اور اللہ کے دین کے سامنے سے رکاوٹیں ہٹادی جائیں۔

واضح رہے کہ ہماری اس بات کا تعلق محض اس مفروضے سے ہے کہ کوئی حکومت عملاً دعوت اسلام کے سامنے رکاوٹ نہیں بن رہی ہو اور صلح پر آمادہ ہو، بہت سے معاصر علماء واہل دانش کی طرح ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ اس زمانے میں کہیں ''فتنہ'' باقی نہیں ہے، دعوت اسلام کے سامنے سارے راستے پوری ایمان داری کے ساتھ کھول دیئے گئے ہیں، موجودہ زمانہ عیاری اور دجل کے اماموں کا ہے، اس لئے بالکل ممکن ہے کہ کسی حکومت کو جب اسلام کی دعوت اپنے نظام سیاست اور مفادات کے سامنے رکاوٹ یا خطرہ بنتی نظر آئے تو وہ اس سے علانیہ جنگ کرے، اور اس کا منھ بند کرنے اور اس کے حاملین پر ظلم کرنے کے لئے جھوٹے بہانے گھڑے؛ لیکن اگر دنیا کی کوئی حکومت عملاً دعوت اسلام کے سامنے رکاوٹ نہیں بن رہی ہو اور صلح پر آمادہ ہو تو یقیناً اس سے جنگ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

واقعہ میں کون سی حکومت کس کے لئے کیسی ہے ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ رہے؛ لیکن اس زمانے میں

نظریاتی سطح پر ضرور یہ سوال ہم سے کیا جا رہا ہے اور خود مسلمانوں کے ذہنوں میں آ رہا ہے کہ کیا مسلمانوں کو ان کے دین کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ دنیا کی ساری قوموں سے جنگ کریں اور ان کے اوپر مسلمانوں کی حکومت قائم کریں؟ ہم بس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام صلح چاہنے والی اور اسلامی دعوت کا راستہ نہ روکنے والی حکومت سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

جاہلانہ غلو کی ایک مثال

ہمارے یہاں دینی حمیت کے نام پر کس قدر جہالت آمیز غلو کے شکار''اہل علم وقلم'' پائے جاتے ہیں اس کی ایک مثال اس وقت میرے سامنے ہے، سرٹی، ڈبلیو، آرنلڈ سے برصغیر کے اہل دانش ناواقف نہیں، جب دنیا اسلام کے تلوار کے زور پر پھیلنے کے پروپیگنڈے سے گونج رہی تھی، شور تھا کہ مسلمانوں نے تلوار کی دھار پر قوموں کو زبردستی مسلمان بنایا ہے اور یہ سب اس لئے تھا کہ استعماری طاقتوں اور عیسائی مشنریز کے لئے عجم کی مسلم اقوام کو اسلام سے برگشتہ کرنا اور ان میں قومی عصبیتوں کو افروختہ کرنا آسان ہو جائے، اس وقت اس غیر مسلم حق گو کی آواز اُٹھی کہ: سب جھوٹ ہے، ایک شاندار کتاب The preaching of Islam کے نام سے ایسی شائع کی کہ اس کی افادیت آج بھی مسلم ہے، ایسے منصف مزاج اور مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہونے والے غیر مسلم دانشور کے بارے میں ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ان جیسوں کو تہ تیغ کر دینا چاہئے۔ لاحول و لاقوة إلا بالله.

ہم آپ مزید شرمندہ و حیران اور مضطرب ہوں گے جب آپ ان صاحب کو دیا گیا علمی مرتبہ جانیں گے، قصہ یہ ہے کہ آرنلڈ کی کتاب کا دنیا کی مختلف اسلامی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا، عربی کے مترجم نے مصنف کے تعارف میں یہ لکھ دیا کہ''حق یہ ہے کہ ہم مصنف کی قدر نہیں کر سکتے''بس کیا تھا ایک برخود غلط نادان''دکتور'' نے تبصرہ فرمایا:

> اس کی قدر یہ ہے کہ تلوار سے سر قلم کر دیا جائے، الا یہ کہ وہ اسلام کے سامنے سر جھکا دے یا جزیہ دے۔
>
> قلت: إنّ قدره لو يعلم هؤلاء هو الضرب بالسيف حتى يبرد، أو يخضع للإسلام أو يدفع الجزية. (۱)

معاف کیجئے گا جو شرمندگی ہو کہ ہمارے درمیان دین و شریعت میں اسی قدر کج فہمی کے شکار بھی پائے جاتے ہیں، یہی نہیں، حیرانی و شرمندگی کی انتہا نہیں رہتی جب معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اس تحریر پر جامعہ اُم القریٰ، سعودی عرب سے ڈاکٹریٹ کی سند پاتے ہیں اور ان کو ممتاز کا گریڈ دیا جاتا ہے۔

---

(۱) أهمية الجهاد للعلياني:۲۶۲، بحواله: فقه الجهاد، شيخ يوسف القرضاوي:۱/۲۵۳۔

کیسے عرض کیا جائے کہ سعودی عرب میں علم دین کے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے!!

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے غیر مسلموں کے لئے یہ خیالات رکھنے والے نہ قرآن کو سمجھتے ہیں نہ حدیث کو، کاش ان کی نظر جاتی کہ بدر کے قیدیوں کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پرانا غیر مسلم محسن مطعم بن عدی یاد آتا ہے، جس نے آپ ﷺ کو طائف سے واپسی پر پناہ دی تھی، آپ ﷺ فرماتے ہیں: اگر مطعم حیات ہوتے اور ان کو چھوڑنے کی سفارش کرتے تو میں ان کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔(۱)

اس ذہنیت کے لوگوں کی نفسیات کا یہ محض ایک نمونہ ہے، اس کو ایک دو افراد کا مسئلہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے، مسلمانوں کی مظلومیت اور مغرب کی لگاتار اور بے حیا چیرہ دستیوں نے ایک عجیب قسم کی برخود غلط سوچ پیدا کردی ہے، جو ہمارے لئے ایک مشکل مسئلہ بن رہی ہے، اسلام کے یہ نادان دوست اسلاموفوبیا پھیلانے والوں اور صیہونیت اور صلیبیت کی نہایت بیش بہا خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اسلاموفوبیا کی خدمت

کچھ لوگ دینی حمیت وصلابت کے نہایت پسندیدہ جذبے سے ایسی تعبیرات پر اصرار کرتے ہیں، جو اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچانے والی ہوتی ہیں، آپ ذرا سوچئے! یہ بات کہ اگر ہمارے پاس قدرت ہوگی تو ہم دنیا کی ہر قوم کو اس حق سے محروم کردیں گے کہ وہ اپنے اوپر اپنی پسند اور اپنی قوم کی حکومت قائم کرے، وہ یا تو اسلام قبول کرے ورنہ اس کو ہماری حکومت کے تحت رہنا ہوگا غیر مسلموں کے لئے کیسا خوف زدہ کرنے والا تصور ہے، جہاد کی یہ تعبیر مشرق ومغرب کی تمام قوموں کو اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متحد کررہی ہے اور مختلف مسلم دشمن لابیوں کو اس کا سامان فراہم کررہی ہے کہ وہ دنیا کی مختلف قوموں کو یہ باور کرائیں کہ مسلمان واقعۃً ایسا خطرہ ہیں کہ ان کو ویسے ہی دبا کر رکھنا ضروری ہے جس طرح امریکہ واسرائیل کے زیر قیادت دنیا میں اِس وقت ان کو رکھا جارہا ہے۔

آخری بات

اس خاص پہلو پر فوری غور کی اس لئے شدید ضرورت ہے کہ بظاہر دنیا میں قیادت اور پالیسی کی بڑی تبدیلیاں قریب ہیں؛ بلکہ مغرب پورے طور پر آگاہ ہے کہ ان تبدیلیوں کی قوت اور رفتار ایسی ہے کہ اب ان کو روکنا کسی کے لئے ممکن نہیں، جدید دنیا کی قیادت اور سیاسی ثقل کا مرکز امریکہ اور مغربی یورپ سے جنوبی ایشیاء (چین اور شاید ہندوستان) منتقل ہو رہا ہے، نئی قیادت اپنے مصالح کے مطابق یقیناً نئی پالیسیاں بنائے گی، اس نئے دور

---

(۱) بخاری۔

میں جس کا تڑ کا نمودار ہو چکا ہے، نئے مسائل و مصالح اور نئے افکار دنیا کی صف بندیوں کے عنوان ہوں گے، امریکہ اور اسرائیل اس وقت جدید قیادت کو اسلام سے خوف دلا کر اپنی پالیسیوں کی بقا اور مفادات کے تحفظ کے لئے کوشش کر رہے ہیں، ان کی کوشش ہوگی کہ وہ دنیا کی نئی قیادت کو پھر سے مسلمانوں سے اسی طرح متنفر کر دیں، جس طرح جانے والی قیادت کو لگاتار ایک خاص نفسیاتی کیفیت میں مبتلا رکھا گیا، اگر اس کروٹ بدلتی دنیا میں اور اس کے نئے سیاسی ذہن میں بھی وہی اسلام فوبیا اور اسلام دشمنی باقی رہی تو یقیناً ہم اگلی نئی دنیا میں دعوت اور امن و انصاف دونوں کے امکانات کو کھو دیں گے :

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں میری بات

اللہ سے دُعا ہے کہ یہ باتیں وہاں پہنچ جائیں جہاں ان کے پہنچنے سے اصل فائدہ ہو سکے۔

⊙ ⊙ ⊙

آیاتِ جہاد اور اس کا پس منظر!

مولانا محمد شوکت ثناء قاسمی ⊙

قرآن وسنت میں جہاد کی تعلیم امن وسلامتی، انسانی جانوں کے تحفظ اور آزادی کی حفاظت کے لئے دی گئی ہے، اور اسلام کی یہ مقدس جنگ نہ اسلامی سلطنت وحکومت کی وسعت اور نہ ہی غیر مسلموں کو بہ زور شمشیر مسلمان کرنے کے لئے ہے، ذاتی عداوت، انتقامی جذبہ، مال و دولت کی ہوس یا اقتدار کی خاطر قتل وقتال کو جہاد نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ اسلام ایک واحد مذہب ہے جس نے جنگ کو معصیت اور عام حالات میں اس کو ناجائز قرار دیا، اسلام میں انسانی جانوں کا جو تقدس واحترام ہے دیگر مذاہب میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے؛ چنانچہ قرآن کریم میں ناحق کسی ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا :

مَـن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً ۔ (المائدۃ:۳۲)

جو کوئی کسی کی جان لے، بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد کیا ہو، تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔

دینِ حق میں انسانی جان کے تقدس واحترام کو قلبی شعور کی گہرائیوں میں اُتارنے کی کوشش کی گئی ہے، دنیا کے سیاسی قوانین تو اس احترامِ حیاتِ انسانی کو صرف سزا کے خوف اور قوت کے زور سے قائم کرتے ہیں، مگر ایک سچے مذہب کا کام دلوں میں اس کی صحیح قدر و قیمت پیدا کردینا ہے؛ تاکہ جہاں انسانی تعزیر کا خوف نہ ہو اور جہاں انسانی پولس روکنے والی نہ ہو، وہاں بھی بنی آدم ایک دوسرے کے خونِ ناحق سے محترز رہیں، اس نقطۂ نظر سے احترامِ نفس کی جیسی صحیح اور مؤثر تعلیم اسلام میں دی گئی ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں ملنی مشکل ہے، خدا اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :

⊙ استاذ: جامعہ عائشہ نسوان، حیدرآباد۔

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً ۔ (الفرقان:٦٨)

وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے، بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ کئے کی سزا پائے گا۔

احادیث میں کثرت سے اس قسم کے ارشادات پائے جاتے ہیں، جن میں بے گناہ کا خون بہانے کو بدترین گناہ بتایا گیا ہے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا :

أكبر الكبائر الإشراك بالله ، وقتل النفس ، وعقوق الوالدين ، وقول الزور ۔ (۱)

بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے، اور قتل نفس، اور والدین کی نافرمانی، اور جھوٹ بولنا۔

انسانی جان کا یہ تقدس واحترام ہر مسلم وغیر مسلم کی جان کو حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل واضح طور پر اعلان فرمایا کہ اگر کسی نے ایسے غیر مسلم کو قتل کیا جس کے ساتھ علانیہ جنگ نہیں تھی یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کا معاہدۂ امن تھا تو اس پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے :

من قتل معاهداً لم يرح رائحة الجنة ، وإن ريحها توجد من مسيرة أربعين عاماً ۔ (۲)

جہاد کے بارے میں بعض لوگوں کو ایک بڑی غلط فہمی یہ ہوئی کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی جہاد کا لفظ آیا، اس سے جنگ وقتال مراد لے لیا؛ حالاں کہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر جہاد لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے؛ چنانچہ قرآن کریم، جہد پیہم، سعی مسلسل اور مصائب وآلام سے نبرد آزما ہونے کو بھی جہاد سے تعبیر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۔ (العنکبوت:٦)

اس آیت میں خواہشات نفس کے خلاف لڑنے اور طاعات بجالانے کو جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (العنکبوت:٦٩)

---

(۱) بخاری ، باب قول اللہ تعالیٰ:ومن أحیاھا:٦٣٦٣۔

(۲) بخاری ، باب اثم من قتل معاھداً بغیر جرم:٢٩٣٠۔

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں، ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھائیں گے۔

اس آیت میں اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ دنیا بھر سے کشمکش کا خطرہ مول لینے کو جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے، نبی اکرم ﷺ نے ایک جہاد سے واپسی پر صحابہ ؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف واپس ہوئے ہو، جب آپ ﷺ سے اس جہاد اکبر کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: وہ اپنے نفس پر دباؤ ڈالنا اور اس کو قابو میں رکھنے کی جی توڑ کوشش کرنا ہے۔(۱)

اس کے علاوہ قرآن وسنت میں متعدد مثالیں موجود ہیں، جس سے یہ بات بالکل واضح ہے، قرآن وحدیث میں جہاں کہیں بھی جہاد کا لفظ آیا، اس سے جنگ وقتال مراد نہیں ہے۔

اسی طرح جہاد کے بارے میں سب سے بڑی اور سب سے عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی قومی جنگ ہے، قومی جنگ یعنی وہ جنگ جو کوئی قوم اپنی طاقت بڑھانے اور دیگر قومی مقاصد کے لئے لڑتی ہے، اسلام ایسی جنگ کو فساد فی الارض قرار دیتا ہے، اس لئے مسلمانوں کی ہر جنگ جہاد نہیں ہوسکتی، قرآن وسنت نے جنگ کے جہاد کا درجہ پانے کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ متعین مقاصد کے لئے متعین اُصولوں اور ضابطوں کے ساتھ لڑی جائے، یہاں تک کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ سفر جہاد میں لوگوں نے راستے پر اس طرح پڑاؤ ڈالا کہ راستے تنگ ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کروایا کہ جو راستے کاٹ کر بیٹھ جائے یا لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہو اس کا جہاد نہیں۔(۲)

ان مقاصد اور قوانین کے خلاف جو بھی جنگ ہوگی، قرآن اور اسلام کی نظر میں وہ فساد ہی ہوگی اور اللہ کو سخت غضبناک کرنے والی ہوگی۔

البتہ اسلام ومسلمان کی تلوار ایسے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے لئے تیز اور پیش پیش ضرور ہے جو اسلام ومسلمانوں کو تباہ وبرباد اور مٹانے کی کوشش کرتے ہیں یا اللہ کی اس سرزمین پر فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتے ہیں —— اور کوئی بھی ادنیٰ عقل وشعور رکھنے والا شخص یہ نہیں کہہ سکتا، اس تیزی میں وہ حق بجانب نہیں ہے —— لیکن جو لوگ ظلم کے خوگر نہیں ہیں، بدکاری کے عادی نہیں ہیں، جو لوگوں کو اللہ کے راستے سے نہیں روکتے، جو دین حق کو مٹانے اور دبانے کی کوشش نہیں کرتے، جو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کے درپے نہیں رہا کرتے، جو خلق خدا کے

(۱) بیہقی، کتاب الزہد:۳۷۳، کنز العمال:۹:۱۱۷۷۔

(۲) سنن ابی داود، باب ما یؤمر من انضمام العسکر وسعته:۲۶۰۔

امن واطمینان اور سکون و راحت کو غارت نہیں کرتے، وہ لوگ خواہ کسی ملک وشہر اور قوم وقبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں، ان کے دینی عقائد وخیالات چاہے کتنے ہی باطل وفاسد کیوں نہ ہوں، اسلام ان کی جان و مال سے ہرگز کچھ بھی تعرض کرنے کی اجازت نہیں دیتا؛ بلکہ اسلام کی نظروں میں ان کا خون حرام ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد آیاتِ جہاد پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آیاتِ جہاد کا پس منظر

پوری آیات جہاد اور اس کے پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالنا تو اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں ہے؛ اس لئے چند آیات جہاد اور اس کا پس منظر پیش خدمت ہے :

۱- أُذِنَ لِلَّـذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ، الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللهُ . (الحج:۳۹-۴۰)

اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے (کہ وہ بھی جنگ کریں) کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے ،صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔

جمہور مفسرین کے نزدیک قرآن کریم میں کفار کے خلاف جہاد کے بارے میں یہ پہلی آیت ہے، جس میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی گئی ہے :

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتالِ کفار کے بارے میں نازل ہوئی۔ (۱)

حالاں کہ مفسرین کی تشریح کے مطابق اس سے پہلے ستر سے زیادہ آیتوں میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔(۲)

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ مکرمہ میں دعوتِ توحید کا اعلان کیا اور کفر وشرک کے ماحول میں اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو باتوفیق لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے اور روز بروز مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا جس کی وجہ سے کفر وشرک کے ایوان میں زلزلہ برپا ہوگیا اور مکہ کے کافروں نے اسلام کی اس دعوت کو دبانے اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکنے کی جو کوشش ہوسکتی تھیں کرنے لگے؛ لیکن اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد کم نہ ہوسکی تو بالآخر ظلم وتشدد پر اُتر آئے اور اسلام لانے والوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے لگے

(۱) نسائی ، باب وجوب الجهاد:۳۰۳۵،الحاكم:۲۳۳۷۔

(۲) البحر المحيط:۲۳۴/۸،الرازی:۱۲۳/۱۱،التفسير المنير:۲۲۵/۱۷۔

اور کفار کے مظالم کا یہ حال تھا کہ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ جس میں کوئی مسلمان ان کے دست ستم سے زخمی اور چوٹ کھایا ہوا نہ آتا ہو، خاص طور پر غرباء اور وہ صحابہ جن کا تعلق غلاموں یا ان لوگوں سے تھا، جن کا کوئی خاندان وقبیلہ وہاں موجود نہ تھا، ان پر مکہ کے ظالموں اور سنگ دلوں کی حقیقی داستان پڑھنے سے ہی کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے، حضرت بلال، یاسر، سمیہ اور زبیرہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ پیش آئے ظلم وجور اور تشدد کے واقعات سے کون مسلمان واقف نہ ہوگا۔

مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کے کونسے طریقے ایسے تھے، جنھیں نہ آزمایا گیا ہو مال ودولت سے دست برداری اور ترک وطن تک پر مجبور کیا گیا۔

قیام مکہ کے آخری دور میں مسلمانوں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہوچکا تھا اور مشرکین کا جور وستم کافی بڑھ چکا تھا، روز کوئی نہ کوئی مسلمان ان کی زیادتی کا شکار ہوتا تھا، صحابہ کفار کے ظلم وجور کی شکایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاتے اور آپ سے مدافعانہ قتل وقتال کی اجازت مانگتے تھے، آپ ان کو تسلی دلاتے اور فرماتے صبر کرو، مجھے ابھی تک قتال کی اجازت نہیں دی گئی اور یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔(۱)

ظلم وستم کا سلسلہ اتنا آگے بڑھا کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی پوری تیاری کرلی گئی، جس کی وجہ سے آپ مکہ چھوڑنے اور ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے اور بالآخر آپ نے مکہ مکرمہ کو چھوڑ دیا، مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت آپ کے رفیق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ جملہ نکلا ''انا للہ وانا الیہ راجعون''ان لوگوں نے اپنی نبی کو نکالا ہے، اب ان کی ہلاکت کا وقت آگیا ہے، اس پر مدینہ طیبہ پہنچنے کے بعد یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی :

عن ابن عباس قال : لما أخرج النبي صلى الله عليه وسلم من مكة قال أبوبكر : أخرجوا نبيهم إنا لله وإنا إليه راجعون ، ليهلكن فنزلت : ''أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ '' فعرفت أنه سيكون قتال ، قال ابن عباس : فهي أول آية نزلت في القتال . (۲)

اس آیت کے پس منظر میں غور وفکر کرنے والا انصاف پسند خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ اسلام عفو ودرگذر کی تعلیم دیتا ہے اور بدرجہ مجبوری ہی ظلم وبربریت کے خلاف قتل وقتال کا حکم دیتا ہے، اس آیت میں جن لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی علت وسبب یہ نہیں کہ ان کے پاس مال ودولت کی فروانی، سرسبز وشاداب ملک کے مالک، کفر وشرک کے داعی وپیروکار ہیں؛ بلکہ قتل کی علت وسبب اور ان کا جرم واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ لوگوں پر ظلم کرتے ہیں :

(۱) روح المعانی:۱۳/۷۵، قرطبی:۱۲/۶۸۔

(۲) سنن نسائی، باب وجوب الجہاد:۳۰۸۵، ترمذی:۳۰۹۵، باب ومن سورۃ الحج۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ، اَلَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللهُ .

لوگوں کو بے قصور ان کے گھروں سے نکالتے ہیں اور اس قدر متعصب ہیں کہ محض اللہ کو پروردگار کہنے پر تکلیفیں پہنچاتے ہیں اور مصیبتیں توڑتے ہیں۔

ساری دنیا کے قانونوں ؛ بلکہ انسانی ضمیر نے ہر مظلوم ملک کا حق اور ہر غیرت مند قوم کا فرض قرار دیا ہے کہ وہ حملہ آور کو جواب دے، جنگ تھوپے جانے پر نبرد آزما ہو اور آسانی سے غلامی کی زنجیریں نہ پہنے، اللہ تعالیٰ نے بھی اس آیت میں اس اجازت کا اعلان کیا ہے کہ: '' أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا '' اجازت دی جاتی ہے، ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے (کہ وہ بھی جنگ کریں) اس لئے کہ ان پر ظلم ہوا ہے :

۲- وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا إِنَّ اللهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ، وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَأَخْرِجُوْهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ . (البقرۃ:۱۹۰-۱۹۱)

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں ، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا، ان سے لڑو جہاں بھی تمہارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، اس لئے کہ قتل اگر چہ برا ہے، مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔

ہجرت مدینہ سے پہلے جب مسلمان کمزور اور منتشر تھے ان کو صرف دعوت و تبلیغ کا حکم تھا، جہاد و قتال ممنوع تھا، اس وقت کی تمام آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو کفار کی ایذاؤں پر صبر اور عفو و درگذر کی ہدایت کی جاتی تھی ، ہجرت مدینہ کے بعد جب شہر مدینہ مسلمانوں کے لئے محفوظ پناہ گاہ بن گیا تو مسلمانوں کو باضابطہ یہ حکم دیا گیا، اگر چہ کہ قتال کی اجازت '' أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا '' میں دی جاچکی تھی کہ جو لوگ دعوتِ اصلاح کی راہ میں مسلح مزاحمت کرتے ہیں ان کو تلوار کا جواب تلوار سے دو، اس کے بعد ہی غزوہ بدر پیش آیا اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والوں سے جہاد کا سلسلہ شروع ہوگیا :

۳- وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنْكَ وَلِيّاً وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنْكَ نَصِيْراً . (النساء:۷۵)

اور تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے جو فریاد و دُعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور اکثر مسلمانوں کے ہجرت کرنے کے بعد بھی مکہ مکرمہ میں کچھ ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو جسمانی کمزوری اور اسباب کی عدم فراہمی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے تھے، بعد میں کافروں نے ان کو ہجرت کرنے سے روک دیا، یہ لوگ نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے اور خدا کے ان دشمنوں نے اللہ کے کمزور اور مظلوم بندوں بچوں، عورتوں اور مردوں خواہ بوڑھے یا جوان کی جانوں کے درپے ہو گئے تھے اور انھوں نے ان کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور ان پر ایسی زیادتیاں کیں کہ مظلوموں کے دلوں سے آہ و فغاں کے جگر خراش نالے نکلنے لگے اور وہ لوگ سراپا دعا و استغاثہ بن گئے تھے کہ کوئی نجات دہندہ آئے اور ان کو اس عذاب سے آزاد کرائے اور یہ جبر و تشدد صرف اس لئے تھا کہ وہ لوگ اسلام سے پھر جائیں؛ لیکن وہ لوگ ایمان کی پختگی و استقامت کی وجہ سے ان کے ظلم و ستم کو جھیلتے اور سہتے رہے اور اسلام پر بڑی مضبوطی سے قائم رہے اور اللہ تعالیٰ سے ان مصائب سے نجات کی دُعائیں مانگتے رہے، مکہ والوں کے خلاف جب جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، تو اہل ایمان کو جہاد پر اُبھارنے اور ان میں حمیت و غیرت پیدا کرنے کے لئے مکہ کے دبے کچلے مسلمانوں کی آہ و زاریوں اور عورتوں اور بچوں کی بے بسی اور بے کسی کا حوالہ دے کر کہا گیا کہ وہ بے چارے رات دن دُعا کر رہے ہیں کہ اللہ کسی نجات دہندہ کو بھیجے جو انھیں ان ظالموں کے چنگل سے آزاد کرائے، کیا ان مظلوموں کی آہ و فغاں تم میں قتال کے لئے جوش پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟(۱)

مذکورہ بالا ناگفتہ بہ حالات میں دنیا کا کونسا آسمانی دین ہوگا جو مظلوموں کے درد و کرب اور آہ و زاری اور مظلومیت کی دہائی اور فریاد پر بھی ان کو تڑپتا اور سسکتا ہوا چھوڑ کر اپنے عیش و راحت میں مست رہنے کی اجازت دیتا ہو؟؟

۴- يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفاً مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ . (الانفال:۶۵)

اے نبی! ایمان والوں کو قتال پر آمادہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم

(۱) الرازی:۲۸۴/۵، قرطبی:۲۷۹/۵۔

رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو ایک ہزار منکرین پر بھاری رہیں گے؛ کیوں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر غزوۂ بدر کے میدان میں جنگ شروع ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہے :

هذه الآية نزلت بالبيداء في غزوة بدر قبل القتال ، وهذا هو الراجح . (۱)

اور یہ پوری سورت ہی زیادہ تر غزوۂ بدر کے واقعات اور اس واقعہ سے متعلق شرعی احکام پر مشتمل ہے، غزوۂ بدر ان حالات میں ہوئی کہ مسلمان ظلماً مکہ سے نکال دیئے گئے تھے، بہت سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے قریب ترین اعزہ کو جبراً مکہ میں روک لیا گیا تھا، اہل مکہ کے مقابلہ میں مسلمان تعداد میں کم تھے، اسلحہ اور دوسرے وسائل کے اعتبار سے بھی مکہ کے حملہ آوروں کا پلڑا بھاری تھا، اس پس منظر میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی تعداد کی کمی پر نظر نہیں رکھیں؛ بلکہ اپنے مقصد پر نگاہ رکھیں اور اپنے مقابل کی بھاری تعداد اور بھاری سامان سے مرعوب نہ ہو جائیں کہ مکہ کے لوگ تو بن سمجھے بوجھے محض اُکسانے پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ایک خاص مشن کے تحت ہے، اس لئے اگر تم کم بھی ہو تو زیادہ لوگوں پر غالب آسکتے ہو۔

اس آیت کے پس منظر پر غور کیا جائے کہ اس میں کن غیر مسلموں سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کو ترغیب دی جارہی ہے، ان غیر مسلموں کے خلاف جو نہ تھمنے والے تلاطم کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کر رہے تھے اور ان کے جان و مال کے درپے تھے، تو کیا حملہ آوروں کے مقابلہ پر اُبھارنا کوئی ناواجبی اور غلط بات ہے؟ اگر ہمارے ملک پر دشمن حملہ آور ہوں تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہوگا کہ ہم اہل وطن کو ان سے مقابلہ کی ترغیب دیں، ظلم کرنا مذموم ہے، یا ظلم کا جواب دینا؟ مظلوموں کو ظلم کا جواب دینے کے لئے اُبھارنا کسی مذہب میں معیوب نہیں۔

۵- وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔ (النساء:۸۹)

وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ؛ تاکہ تم ایک جیسے ہو جاؤ؛ لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ، جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آجائیں، اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں تو انھیں جہاں کہیں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت اہل مکہ نے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچائی تھی، یہاں تک کہ وہ

(۱) التفسير المنير:۵۴/۱۰۔

ان کے قتل کے درپے ہوگئے تو مسلمانوں کو مجبور ہو کر ترک وطن کرنا پڑا اور انھوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی، پھر یہاں بھی مسلمانوں کا چین وسکون انھیں پسند نہیں آیا اور انھوں نے بار بار مدینہ پر اپنی یلغار جاری رکھی، ظاہر ہے جو لوگ مسلمانوں کی جان کے درپے ہیں تو اپنی مدافعت کے طور پر وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل تھا کہ وہ ان کی زیادتیوں کا جواب دیں، اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے تبدیلی مذہب اور ارتداد سے کم کسی اور بات پر رضامند نہیں تھے، جو ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ظلم ہے۔

اور اس آیت میں قتال کا حکم، ان لوگوں سے ہے، جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں، جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں، یا مسلمانوں کے حلیف کسی غیر مسلم گروہ کے حلیف ہوں، یا غیر جانبدار رہوں، نہ مسلمانوں سے جنگ چاہتے ہوں اور نہ ان لوگوں سے جو لوگ مسلمان سے جنگ کی حالت میں ہوں، تو ان تینوں طرح کے لوگوں سے مسلمانوں کے لئے قتال درست نہیں؛ بلکہ قرآن نے صاف طریقہ پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ صلح وامن کا راستہ اختیار کریں، مسلمانوں کو ضروری ہے کہ ان کے اس رویہ کا جواب صلح اور امن سے دیں اور کوئی زیادتی نہ کریں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا. (النساء:۹۰)

البتہ وہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے، یا وہ تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں، نہ اپنی قوم سے؛ حالاں کہ اگر اللہ چاہتے تو ان کو تم پر مسلط کر دیتے، پھر وہ تم لوگوں سے جنگ کرتے، تو اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، جنگ نہ کریں اور صلح پیش کریں تو اللہ نے تمہارے لئے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

۲- فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (التوبۃ:۵)

جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو تم ان مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو، انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم

کریں اور زکوۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ معاف کرنے والے مہربان ہیں۔

اس آیت کے مضمون ہی سے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان اہل مکہ کے بارے میں ہے جو حرام مہینوں کا احترام کرتے تھے، جو بہت سے مسلمانوں کے قاتل تھے، بہت سے مہاجرین کے رشتہ داروں کو انھوں نے روک رکھا تھا، جہاں کہیں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ آجاتا تھا، اسے گرفتار کر لیتے تھے اور اسے قتل کر کے یا قاتلوں کے ہاتھ بیچ کر ہی دم لیتے، اس سلسلہ میں حضرت زید بن دثنہ ﷺ اور حضرت خبیب ﷺ کا واقعہ بہت مشہور ہے، جنھیں بنولحیان کے لوگوں نے گرفتار کر کے اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور حضرت زید اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہما کو انھوں نے غزوۂ بدر میں ہلاک ہونے والے اپنے مورث کے بدلہ نہایت بے دردی اور سفاکی کے ساتھ شہید کر دیا، (۱) انھیں مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لے سکتے ہو۔

آیت کے سیاق وسباق میں غور کیا جائے اور اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد جو آیتیں آرہی ہیں، اگر انھیں پڑھ لیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ: "فَاقْتُلُوْا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ...... الخ" (التوبۃ:۵) سے روئے زمین کے تمام مشرکین مراد نہیں؛ بلکہ مشرکین کا ایک خاص گروہ مراد ہے، اور وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی، مسلمانوں کو وطن سے بے وطن کرنے پر کمربستہ رہے اور نقصان پہنچانے اور حملہ کرنے میں پہل کی؛ چنانچہ علامہ آلوسی نے اوپر (آیت نمبر:۵) میں جن مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ اس سے یہی عہد شکنی کرنے والے مشرکین مراد ہیں:

المراد بالمشركين في قوله سبحانه " فاقتلوا المشركين" الناكثون . (۲)

اللہ تعالیٰ سورۂ توبہ میں ارشاد فرماتا ہے:

أَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْماً نَّكَثُوْا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِإِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُم بَدَؤُوْكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ . (التوبۃ:۱۳)

کیا تم ایسے لوگوں سے قتال نہیں کرو گے جنھوں نے اپنے عہد توڑ دیئے، رسول کو جلا وطن کرنے کی ٹھان لی اور انھوں نے تمہارے مقابلہ میں خود ہی پہل کی ہے، کیا تم لوگ ان سے ڈرتے ہو، اللہ تعالیٰ زیادہ اس لائق ہیں کہ تم ان سے ڈرو، اگر تم ایمان والے ہو۔

---

(۱) بخاری، باب غزوۃ الرجیع ورعل وذکوان وبئر معونۃ: ۷۷۷-۳۔ (۲) روح المعانی: ۷/۱۵۶۔

بطور نمونہ ومثال کے آپ کے سامنے چند آیات اوران کا مختصر پس منظر ذکر کیا گیا، اگر ان آیات اوران جیسی مزید آیات جس میں جنگ وجدال اور قتل وقتال کا حکم دیا گیا ہے، کے سیاق وسباق میں بنظر غائر، عدل وانصاف کی نگاہوں سے غور کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگی کہ اسلام کی مقدس جنگ، جہاد صرف ان لوگوں سے ہوگا جو مسلمانوں کو دین وشریعت پر عمل کرنے سے روکتے ہیں اور جو مسلمانوں کی جان و مال عزت وآبرو کے درپے رہا کرتے ہیں، جو اسلام ومسلمانوں کو تباہ وبرباد اور مٹانے کی کوشش کرتے ہیں یا اللہ کی اس سرزمین پر فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتے ہیں، جو لوگ خود امن وسکون سے رہتے ہیں اور خلق خدا کے امن واطمینان اور سکون وراحت کو غارت نہیں کرتے، اسلام ایسے لوگوں سے جہاد کی ہرگز اجازت نہیں دیتا ہے۔

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری انسانیت کو ہدایت اور صحیح فکر وعمل سے نوازیں اور ہم مسلمانوں کو عقیدہ صالح اور عمل صالح کے ساتھ تلاوتِ قرآن اور فہم قرآن عطا فرمائیں۔ آمین

⊙ ⊙ ⊙

غیر مسلموں کے ساتھ دوستی — قرآن واحادیث کی روشنی میں

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ⊙

اللہ رب العزت نے بنی نوعِ انسان کے لئے دین اسلام کا انتخاب کیا اور اس کا آخری اور مکمل ایڈیشن آقا ومولا فخر موجودات سرور کونین ﷺ پر نازل کیا اور اعلان فرما دیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ آخری نبی اور رسول ہیں، ان کے بعد نہ تو کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی رسول، ارشاد ربانی ہے :

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام ۔ (آل عمران:۱۹)

دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اور فرمایا :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (المائدہ:۳)

آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارے دین کے طور پر پسند کرلیا۔

زبانِ رسالت نے اعلان فرمایا ''لا نبی بعدی'' اور اس بات کا بھی اعلان کروایا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ سارے جہاں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے، علاقوں قبیلوں کی تفریق باقی نہیں رہی اور ہر قبیلہ اور ہر علاقہ کے لوگ اللہ کے رسول ﷺ کی اُمت قرار پائے، ارشاد ربانی ہے :

قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ۔ (الأعراف:۱۵۸)

اعلان کر دیجئے کہ اے لوگو! میں تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آپ ﷺ سے قبل جتنے بھی انبیاء ورسل بھیجے گئے، انھیں کسی خاص علاقہ اور خاص قوم کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری دی گئی اور انھیں محدود وقت کے لئے احکام دیئے گئے اور یہ سارے احکام آپ ﷺ کی بعثت کے بعد

⊙ نائب ناظم: امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

منسوخ ہو گئے، اب مدار نجات اللہ کے رسول ﷺ کو خاتم النبین ماننے، قرآن کریم پر عمل کرنے اور رسول خاتم کے طریقوں کو اپنانے میں مضمر ہے، بغیر اس کے نجات ممکن نہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا :

وكان النبي يبعث إلى قومه خاصة ، وبعثت إلى الناس عامّة . (۱)

انبیاء صرف اپنی قوم کے لئے بھیجے جاتے تھے، لیکن میں پوری دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

پھر چوں کہ اس اُمت کو قیامت تک باقی رہنا ہے اور طاغوتی طاقتیں راہ راست سے انسانوں کو بھٹکانے میں ہمیشہ لگی رہتی ہیں اور ابتدائے آفرینش ہی سے ابلیسی حربے کام کرتے رہے ہیں، اسی لئے دعوت وتبلیغ اور اُمت کو قیامت تک صحیح رُخ اور سمت قائم رکھنے کا نبوی کام علماء کے ذمہ کیا گیا اور زبان نبوت نے علماء کے بارے میں انبیاء کے وارث ہونے کا اعلان کیا اور علماء کو زمین کا چراغ کہا گیا، ''العلماء ورثة الأنبياء'' اور ''العلماء مصابيح الارض ''(۲) کہہ کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ قیامت تک علماء اُمت وہ کام کرتے رہیں گے جو ماضی میں کار نبوت رہا ہے۔

دورِ رسالت میں اور اس کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا، ان کی حیثیت اُمت اجابت یعنی اللہ کی وحدانیت اور رسول کے رسالت کو قبول کرنے والے کی ہوگئی، یہ سب مسلمان کہلائے، قرآن پاک میں انھیں خیر اُمت اور وسط اُمت کا لقب دیا گیا، ایک گروہ جس نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا، ان کی حیثیت اُمت دعوت کی رہی، یعنی یہ وہ لوگ ہیں، جن تک دعوت پہنچانے کا کام ہر دور میں داعیان اُمت کا رہا ہے اور علماء اور مصلحین اس فریضے کی ادائیگی میں غیر معمولی تندہی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔

اس طرح دیکھیں تو تمام غیر مسلم خواہ وہ کسی مذہب کو مانتے ہوں، ان کی حیثیت مدعو قوم کی ہے، اور مسلمانوں سے ان کا رشتہ داعی اور مدعو کا ہے، حضور ﷺ کی اُمت ہونے میں وہ بھی شریک ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اللہ کے آخری دین کی دعوت ہمیں ان تک پہنچانی ہے۔

داعی اور مدعو کا یہ رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے، اس کی اساس اور بنیاد اس محبت اور تڑپ پر ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ لوگ دعوتِ دین قبول کر لیں، یہ محبت، یہ تڑپ اور یہ بے چینی کبھی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ لگتا ہے کہ آدمی اس فکر میں اپنے کو ہلاک کر ڈالے گا، قرآن کریم میں اللہ کے رسول ﷺ کا حال نقل کیا ہے :

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى آثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا .

(الکھف:۶)

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۳۳۵۔ (۲) باوجود بحث کے یہ حدیث ہمیں نہیں ملی، مرتب۔

سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون (قرآن) پر ایمان نہ لائے تو غم سے
اپنی جان دے دیں گے۔

مسلمان اسی انداز کا تعلق غیر مسلموں سے رکھتا ہے، اس کی ہدایت یابی کے لئے کڑھتا رہتا ہے، وہ اپنے مدعو سے نفرت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ نفرت کی بنیاد پر دعوت کا کام نہیں کیا جا سکتا، اگر کوئی کسی غیر مسلم سے نفرت کرتا ہے تو وہ دعوت کے کام کو صحیح طور پر نہیں کر سکتا، نفرت کی چیز کفر و شرک ہے، کافر و مشرک نہیں، بالکل اسی طرح جس طرح مریض قابل نفرت نہیں ہوتا، مرض قابل نفرت چیز ہوا کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ غیر معمولی برتاؤ کیا اور انھیں مختلف موقعوں پر عزت و اکرام سے نوازا، یہاں پر ہمیں اس بڑھیا کو یاد کرنا چاہئے، جو اللہ کے رسول کے ڈر سے بھاگی جارہی تھی اور اُسے گٹھری ڈھونے کے لئے کسی مزدور کی تلاش تھی، اللہ کے رسول ﷺ نے اس بڑھیا کی گٹھری اُٹھا کر منزلِ مقصود تک پہنچادی، آپ کے اس حسن اخلاق نے بڑھیا کو اسلام سے قریب کر دیا اور وہ کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' پڑھ کر مسلمان ہوگئی۔(۱)

یہ اور اس قسم کے بہت سارے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ داعی کے حسن اخلاق نے دین کی دعوت کے کام کو لوگوں کے دلوں تک پہنچانے کا کام کیا، یہ کام خوف و جبر سے نہ اس زمانے میں کیا جا سکتا تھا اور نہ آج یہ ممکن ہے، آخر قرآن کریم نے یوں ہی اعلان نہیں کر دیا :

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ . (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں زبردستی (کا فی نفسہ کوئی موقع) نہیں۔

اسلام نے داعی اور مدعو کے اس رشتے کی بنیاد کو پائیداری بخشی اور ان لوگوں کے لئے جو مسلمانوں کے درپئے آزار نہیں ہوئے اور مسلمانوں کے لئے مسائل نہیں کھڑے کئے ان کے لئے واضح حکم دیا کہ :

لَا يَنْهٰـكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ .

(الممتحنۃ:۸)

اللہ تم لوگوں کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

(۱) باوجود بحث کے یہ واقعہ ہمیں نہیں ملا، مرتب۔

اسلام کا یہ حکم رحمت ورافت اور حسن اخلاق کی تعلیم پر مبنی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان بر و احسان کا تعلق نہ صرف جائز؛ بلکہ مستحسن ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کی والدہ حالت شرک میں ان کے پاس پہنچیں، انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا ماں کے ساتھ اس حالت میں وہ حسن سلوک کرسکتی ہیں، تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ: ہاں! اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

خود حضور ﷺ کا حال یہ تھا کہ کفار ومشرکین مکہ کے ایذائیں پہنچانے اور دعوت دین کے کام میں غیر معمولی رکاوٹیں ڈالنے کے باوجود جب مکہ میں قحط پڑا اور لوگوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تو آپ ﷺ نے مکہ مال بھجوایا تاکہ وہاں کے فقراء اور ضرورت مندوں میں اسے تقسیم کیا جائے، اس معاملے میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معمول بھی اپنے مشرک پڑوسیوں سے حسن سلوک کا تھا، ملک شام کی طرف جاتے ہوئے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا بیت المال سے نصاریٰ کوڑھیوں کی مدد کرنا ثابت ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ قربانی کا گوشت یہودی پڑوسیوں کو بھی دیا جائے، اس لئے کہ پڑوسیوں کا حق بہت ہے اور اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں کی گئی ہے، اسی طرح اسلام نے یتامی کی خبر گیری کے لئے مسلم اور غیر مسلم کی قید نہیں لگائی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کی مالی معاونت کی جاسکتی ہے، قرآن کریم میں اللہ رب العزت بلا تخصیص مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو محض اللہ کی رضا کے لئے کھانا کھلانے کو بہتر عمل اور اپنی رضا کا سبب بتایا ہے، ارشاد فرمایا:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا . اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا. (الدھر:۸،۹)

اور وہ لوگ (محض) خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں نہ ہم اس کا (فعلی) بدلہ چاہتے ہیں اور نہ (قولی) شکریہ۔

ایک دوسری جگہ یتیموں کی ناقدری اور مسکینوں کے معاملات سے صرف نظر کرنے کو اپنی ناراضگی کا سبب بتایا:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ . وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ .

(الفجر:۱۷-۱۸)

تم لوگ یتیم کی کچھ قدر نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے۔

ایک اور موقع سے بالعموم یتیموں پر عتاب کرنے اور سائلوں کو جھڑکنے سے منع کیا گیا اور شریعت نے اس میں بھی مسلم اور غیر مسلموں کی تفریق نہیں کی، ارشاد فرمایا :

فَاَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ (الانشراح:۱۰،۹)

اور جو یتیم ہو اس کو مت دبا اور جو مانگتا ہے اسے مت جھڑک۔

حسن سلوک کا ہی ایک طریقہ مریضوں کی عیادت کا ہے، اسلام میں مریضوں کی عیادت کا حکم مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے ہے، امام بخاری نے روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی غلام اللہ کے رسول کے پاس خدمت میں رہتا تھا، جب وہ بیمار ہوا تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کی عیادت کی، اسی طرح آپ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کی عیادت کی اور ان پر اسلام پیش کیا، ابن حجرؒ نے ان روایتوں سے مشرکین کی عیادت کے جواز پر استدلال کیا ہے، صاحبؒ بحر الرائق نے اسے بر و احسان کے ذیل میں رکھتے ہوئے جواز کے قول کو ترجیح دی ہے، امام احمد بن حنبلؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

حسن سلوک کے ذیل میں ہی تعزیت کا معاملہ آتا ہے، فقہاء نے اسے جائز قرار دیا ہے؛ البتہ ایسے کلمات سے اجتناب کا حکم دیا ہے، جس سے شرک کی عظمت کسی درجہ میں بھی سامنے آئے، بعض فقہاء نے اسے بعض شرطوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بر و تقویٰ کی عمومیت سے حکم عام ہی نکلتا ہے۔

ہم ہندوستان میں رہتے ہیں اور بہت سارے ممالک وہ ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان حالات میں غیر مسلموں سے تجارتی لین دین ایک سماجی اور معاشی ضرورت ہے، اس ضرورت کے تحت مشرکین و کفار کے ہر اس معاملات میں شرکت کی جاسکتی ہے، جو حلال ہو اور سود نیز دوسرے ممنوعات سے پاک ہو، روزمرہ کی خرید وفروخت، اجارہ، رہن اور اس قسم کے دوسرے اُمور مالیہ حضور ﷺ کے زمانے سے غیر مسلموں سے کئے جاتے رہے ہیں اور آج بھی ان کی اجازت ہے؛ البتہ سود، دھوکا دہی، خمر و خنزیر کے معاملہ میں ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا اور ان معاملات میں شریک ہونا مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہوگا، مسلمان غیر مسلموں سے عاریت کا معاملہ بھی کر سکتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر اس کے پاس امانتیں رکھی جاسکتی ہیں اور جان و مال کی سلامتی کا یقین ہو اور احوال اس کے متقاضی ہوں تو بعض صورتوں میں ان سے پناہ بھی چاہی جاسکتی ہے، فقہاء نے غیر مسلم والدین کا نان ونفقہ بھی مسلمانوں کے لئے ضرورتاً دینے کو جائز کہا ہے، بعضوں کا قول اس مسئلے میں وجوب کا بھی ہے۔

صفوان بن اُمیہ سے یوم حنین کے موقع پر اور بنی قینقاع کے یہود اور خزاعہ کے ایک فرد سے آپ ﷺ کا اعانت طلب کرنا، احادیث وسیر میں مذکور ہے، اسی بنیاد پر احناف اور شوافع کے یہاں اس کے جواز کا قول منقول ہے

اور مالکیہ میں ابن عبد البر اور حنابلہ کی رائے اسی کے مطابق ہے، تاریخ کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ مدینہ ہجرت کے بعد آپ نے یہودیوں سے معاہدہ کیا اور نبوت سے قبل کی جانے والی حلف الفضول میں اپنی شرکت پر نہ صرف اطمینان کا اظہار کیا؛ بلکہ فرمایا کہ اگر آج بھی مجھے اس قسم کے معاہدہ کے لئے بلایا جائے تو میں اس کے لئے راضی ہوں، اس قسم کے واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ مصالح کے پیش نظر آج بھی اس قسم کے معاہدے کئے جاسکتے ہیں۔

تعلقات کی اُستواری اور مدارات ومواسات میں ہدیہ کے لین دین کی بھی اپنی اہمیت ہے، اس سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے''تهادوا تحابوا '' کہا گیا ہے، اس سلسلے میں اسلام میں اتنی وسعت ہے کہ ہدیے دیئے بھی جا سکتے ہیں اور قبول بھی کئے جاسکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے ملک ایلہ کا ہدیہ قبول کیا اور مقوقس کو آپ ﷺ نے باندی کا ہدیہ دیا، حسن سلوک ہی کے طور پر اسلام نے اس بات پر زور دیا کہ غیر مسلم مہمانوں کا اکرام بھی کیا جائے، خود حضور ﷺ کا اس بارے میں عمل غیر معمولی تھا، وہ واقعہ تو تاریخ کا سبھی کو یاد ہے کہ ایک غیر مسلم آپ کے یہاں مہمان ہوا، آپ نے ضیافت کا غیر معمولی اہتمام فرمایا، کھانا بھی اس نے بھرپور کھایا اور بستر کو گندہ کردیا، آقا ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اسے دھویا، اسی اثناء میں وہ اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے آیا تو بھی آپ نے کچھ نہیں فرمایا اور اُسے شرمندگی سے بچالیا، اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اکرام ضیوف کا کتنا خیال تھا۔

غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کا سلوک انھیں مسلمانوں سے قریب کرے گا، ان کی تالیف قلب ہوگی، جس سے دفع ضرر بھی ہوگا اور دین کا قبول کرنا بھی ان کے لئے آسان تر ہو جائے گا، شریعت چاہتی ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے آپسی تعلقات کو بڑھایا جائے اور دنیاوی مفاد اور مال ودولت کے حصول سے بے نیاز ہوکر محض دینی بنیادوں پر اسے تقویت دی جائے، فقہاء نے ان مقاصد کو شرائط کے طور پر ذکر کیا ہے؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مدارات ومواسات کے قبیل کے ان کاموں کا لازمی نتیجہ وہی ہوگا، جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔

ایک مسئلہ سیاسی شرکت کا بھی ہے، حکومتیں اب جمہوری انداز میں تشکیل پارہی ہیں، ان حکومتوں کا مزاج یقیناً غیر اسلامی ہے، چاہے ملوکیت ہو یا جمہوریت، دونوں حکومتِ الٰہیہ کی فکر اسلامی سے متصادم ہیں اور یقینی طور پر وہاں اللہ کی حاکمیت کا تصور ہر سطح پر ناپید ہے، ایسے میں کیا مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ اس طاغوتی نظام کے دست وبازو بنیں۔

اس سلسلے میں ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہماری نمائندگی جس قدر عوامی اداروں میں بڑھے گی، امکانات اس بات کے قوی سے قوی تر ہوں گے کہ ہم حکومت میں اپنی باتیں منواسکیں اور سارا کچھ تو نہیں، بہت کچھ منظور کروالیں، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کی بقا اور دستوری لڑائی میں ہماری کامیابی کا راز بھی یہی ہے، ان موقعوں پر پارلیمنٹ

میں ہمارے ایسے نمائندے موجود تھے، جنھوں نے ہماری بھرپور وکالت کی اور باہر میں ہم نے عوامی دباؤ بنایا اور حکومت کو اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

پس اس معاملہ میں ہمیں قواعد فقہیہ ''الضرر یزال ، الضرورات تبیح المحظورات ، المشقة تجلب التیسیر '' وغیرہ کو سامنے رکھنا چاہئے اور ہمارے نمائندوں کو استطاعت بھرپوری قوت کے ساتھ ایوان نمائندگان میں ان صالح قدروں کی ترویج و بقا کے لئے کوشش کرنی چاہئے جو اسلام کو مطلوب ہیں، اس سلسلے میں اسلام نے جو یسر کا فلسفہ پیش کیا ہے اور تشدید و تغلیظ سے اجتناب کی تلقین کی ہے، اس سے ہماری اس رائے کو تقویت ملتی ہے، نصوص کی حد تک دیکھیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کا وزیر خزانہ بننا ؛ بلکہ اس کا مطالبہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ غیر مسلم حکومت میں ضرورت کی وجہ سے عہدے بھی قبول کئے جاسکتے ہیں، فقہاء نے بعض حالات میں منصبِ قضا کے قبول کرنے کی بھی اجازت دی ہے؛ تا کہ ظلم وشرک وعدوان سے عوام الناس کو بچایا جاسکے، یہ دراصل 'أهون البلیتین' کو قبول کرنے کے مترادف ہے اور بڑے ضرر وشر کے مقابلے چھوٹے ضرر کو قبول کرنے کا فطری اور فقہی عمل ہے۔

مسلمانوں کے اس قسم کے معاملات کی بنیاد نہ تو تقیہ ہے اور نہ منافقت ؛ بلکہ یہ سب اسلام کی ان تعلیمات کا حصہ ہیں، جو اکرام واحترام آدمیت کے ذیل میں آتے ہیں اور جن کے بغیر مذہب اور عمرانیت کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی ؛ لیکن ہماری اس تحریر کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ جو قومیں مسلمانوں سے متحارب ہیں اور جو لوگ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے، ان کے ساتھ بھی یہی سب سلوک کیا جائے، دنیا کی تاریخ میں ہر دور اور ہر مذہب میں ایسے لوگوں کا معاملہ جدا رہا ہے، جو متحارب رہے ہیں، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے لئے اعلان کیا :

> لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَن يَّفْعَلْ ذَالِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِيْ شَيْئٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ وَ اِلَى اللهِ الْمَصِيْرُ . (آل عمران:۲۸)
>
> ایمان والوں کو چاہئے کہ کفار کو دوست نہ بنائیں، مسلمانوں (کی دوستی) سے تجاوز کرکے جو شخص ایسا کام کرے گا سو وہ شخص اللہ کے ساتھ (دوستی رکھنے) کے کسی شمار میں نہیں، مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

اس قسم کی اور دوسری آیات بھی ہیں، جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالاً. (آل عمران:۱۸)

اے ایمان والو! اپنے ساتھ کسی کو صاحب خصوصیت مت بناؤ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْا آبَائَهُمْ اَوْ اَبْنَائَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ. (المجادلۃ:۲۲)

جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے برخلاف ہیں، گو وہ ان کے باپ، بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہوں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءَ بَعْضٍ. (المائدہ:۵۱)

اے ایمان والو! تم یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بنانا وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَا اَخْفَيْتُمْ وَمَا اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ. (الممتحنۃ:۱)

اے ایمان والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو حالاں کہ تمہارے پاس جو دین حق آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں رسول کو اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے شہر بدر کر چکے ہیں، اگر تم میرے رستہ پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی ڈھونڈنے کی غرض سے (اپنے گھروں سے) نکلے ہو تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو؛ حالاں کہ مجھ کو سب چیزوں کا خوب علم ہے تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے

ہو (اور آگے اس پر وعید ہے کہ) جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہ راست سے بھٹکے گا۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم سے تعلقات کی ایک خاص قسم جسے موالاۃ کہتے ہیں وہ جائز نہیں ہے، موالاۃ کے مختلف معنی مفسرین نے لکھے ہیں، ان میں ایک معنی یہ بھی ہے مسلمان اپنے اس تعلق میں غیر مسلم کے کفر اور اعمالِ کفریہ سے راضی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر کی تصویب بھی کفر ہے اور کفر سے راضی رہنا بھی کفر کے مترادف ہے تفسیر کبیر میں موالاۃ کے معنی لکھا ہے :

ومعنى" لا تتخذوهم أولياء " أي : لا تعتمدوا على الاستنصار بهم ولا تتوددوا اليهم . (المائدہ:۵۱)

ان کو دوست نہ بناؤ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مدد پر اعتماد نہ کرو اور ان سے دوستی نہ کرو۔

امام طبری نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جو مؤمنین کے مقابلے میں یہود و نصاریٰ کی مدد کرتے ہیں، ایسوں کا شمار انھیں لوگوں میں ہوگا :

فإنّ من تولّاهم ونصرهم على المؤمنين فهو من أهل دينهم وملتهم . (۱)

تو جس نے مؤمنین کے مقابلے ان سے موالاۃ کیا اور ان کی مدد کی تو ایسے مسلمان انھیں کے دین و ملت میں ہیں۔

حضرت قتادہؓ نے فرمایا: "**لا يحلّ لمؤمن أن يتخذ كافرا أولياء في دينه**" مومن کے لئے دینی معاملات میں کافر کو ولی بنانا جائز نہیں ہے، حضرت سدی سے مروی ہے :

أما أولياء : فيواليهم في دينهم و يظهرهم على عورة المؤمنين ، فمن فعل هذا فهو مشرك . (۲)

اولیاء وہ لوگ ہیں جو ان کے دین میں مدد کرتے ہیں اور مؤمنین کے رازوں کا ان پر افشاء کرتے ہیں، جو ایسا کرے وہ مشرک ہے۔

سید قطب شہید نے فی ظلال القرآن میں سورہ مائدہ کی آیت "**يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوْا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارىٰ اَوْلِيَاء**" کے تحت لکھا ہے :

هذا النداء موجّه إلى الجماعة المسلمة في المدينة ، ولكنه في

(۱) تفسیر طبری:۲۷۷/۶۔ (۲) تفسیر الطبری:۲۲۸/۶۔

> الوقت ذاته موجّه بكل جماعة مسلمة تقوم في ركن من اركان الأرض إلى يوم القيامة ...... موجه لكل من ينطق عليه ذات يوم صفة "اَلَّذِيْنَ آمَنُوْ".
>
> یہ خطاب مدینہ منورہ کی مسلم جماعت سے ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ یہ خطاب قیامت تک کے لئے ہر اس مسلمان جماعت کی طرف متوجہ ہے جو روئے زمین کے کسی خطے میں پائی جائے، ہر اس شخص کی طرف متوجہ ہے جو صفت ایمان سے متصف ہو۔

ان ابحاث کا حاصل یہ ہے کہ غیر مسلموں کی مدد مسلمانوں کے مقابل کرنا اور ان سے ایسا تعلق قائم کرنا جس سے مسلمانوں کے ملی راز ان تک پہنچ جائیں اور ملی کاز کے لئے نقصان دہ ہو، مطلقاً درست نہیں ہے۔

لیکن جو محارب نہیں ہیں، بچے بوڑھے اور عورتیں ان کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یہ انسانیت کے خلاف ہے کہ جو آپ سے نہیں لڑ رہا ہے اور خاموشی سے گوشہ نشیں ہے اس کو قتل کر دیا جائے؛ کیوں کہ انسان کا خون معصوم ہے اسے دفع ضرر اور رفع شر کے علاوہ نہیں بہایا جا سکتا، اسی لئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ کافر محض کافر ہونے کی وجہ سے محل قتل نہیں ہے اور صرف کفر قتال کی علت نہیں ہے؛ بلکہ یہ فتنہ کے ختم کرنے کے لئے ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

غیر مسلموں سے دوستی کا مسئلہ — قرآن مجید کی روشنی میں

مولانا تنظیم عالم قاسمی ⊙

بلا کسی شک وشبہ خدا ایک ہے، وہ اکیلا سارے نظام عالم کو چلا رہا ہے، ذات اور وصف کے اعتبار سے وہ واحد ہے اور وحدانیت کو پسند کرتا ہے، اس کی ذات یا صفت میں کسی کو شریک کرنا قرآن کی اصطلاح میں ظلم عظیم ہے اور یہ جرأت خدا کے لئے ناقابل برداشت ہے، قرآن کہتا ہے :

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ . (النساء:۱۱۶)

اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں کرے گا اور اس کے علاوہ تمام خطائیں جو چاہے گا در گذر کردے گا۔

مومنین یعنی خدا کو ایک ماننے والے، احکامِ الٰہیہ کے پیروکار اللہ کی نظر میں محبوب ہیں، ان کو جنت اور آخرت کی کامیابی کی بشارت دی گئی ہے اور اللہ کے ساتھ شریک کرنے والے خدا کی نظر میں مبغوض اور ناقابل معافی جرم کے مرتکب ہیں، آخرت میں ناکام اور نامراد ہوں گے، اس لئے کہ انھوں نے اپنے حقیقی رب کو فراموش کردیا، اس کے احسانات سے استفادہ کرتے ہیں، مگر احسان فراموشی کرکے اپنے رب سے آنکھیں موند لیتے ہیں، دنیا کے اس زبردست نظام اور خود اپنی جسمانی ساخت اور مختلف نظام پر غور کرتے تو معبودانِ باطلہ کو چھوڑ کر حقیقی معبود تک رسائی ہو جاتی، مگر غفلت سے کام لیتے ہوئے اپنے حقیقی فرائض کو چھوڑ بیٹھے اور شرک جیسے گناہ عظیم کے مرتکب ہوئے، اسلام جو انسان کو ابدی راحت فراہم کرتا ہے اور جو محسن حقیقی کی پہچان کراتا ہے، اس سے وہ دور رہے، اس طرح بنی نوعِ انسانی کے دو گروہ ہو گئے : ایک مسلم اور دوسرا غیر مسلم، اسلام قبول کرنے والا گروہ مقدس اور پسندیدہ ہے، اور غیر مسلم گروہ ناپسندیدہ اور مبغوض ہے۔

قرآن مجید میں تفصیلی طور پر دونوں کے الگ الگ احکام بیان کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ غیر مسلم اللہ کے دشمن ہیں، اس لئے ان سے دوستی، قلبی محبت، رازدارانہ تعلقات نہ رکھے جائیں، اس سلسلے میں درج ذیل آیات نازل کی گئیں :

⊙ استاذ حدیث: دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

۱- لَّا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً . (آلِ عمران:۲۸)

مومنین اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں، ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ۔

۲- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ . (الممتحنہ:۱)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو؛ حالاں کہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے، اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔

۳- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ . (المائدة:۵۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر ان ہی میں ہے۔

۴- لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ . (۱)

(المجادلۃ:۵۸)

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں، جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہلِ خاندان۔

۵- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ . (التوبۃ:۲۳)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے، وہی ظالم ہوں گے۔

اس مضمون پر مشتمل اور بھی متعدد ایسی آیات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ کفر و شرک اختیار کرنے والوں سے کسی طرح کی دوستی نہیں کی جائے گی اور نہ ان سے کوئی سمجھوتہ کیا جائے گا، خواہ ان سے خونی رشتہ ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ یہ لوگ خدا کی نازل کردہ چیزوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے منھ موڑتے ہیں، وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان سے محبت کا معاملہ کیا جائے اور ان سے قربت اختیار کی جائے — لیکن قرآن کی دوسری آیات، احادیث مبارکہ، رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان خواہ کافر اور غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اس کو بعض بنیادی حقوق حاصل ہیں، ان کو زندہ رہنے معاشی جدوجہد کرنے، اپنا مال اور جائیداد رکھنے اور اس میں تصرف کرنے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق سب سے نمایاں ہے، اسلام ان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی تعلیم دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ انسانیت کے اعتبار سے جو ان کے حقوق ہیں، ان کا مکمل احترام کیا جائے، اس لئے کہ غیر مسلم بھی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد اور انسان ہیں، انسانیت کے لحاظ سے وہ بھی قابل تکریم ہیں، علامہ شامیؒ نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: والآدمی مکرم شرعاً وان کان کافراً،(۱) ''آدمی شرعی اعتبار سے محترم ہے خواہ وہ کافر ہو'' — غیر مسلم عقیدے کے اعتبار سے ناپاک اور ناقابل التفات ہیں، مگر دوسرا پہلو آدمیت کا ہے، اس لحاظ سے وہ قابل احترام ہیں۔

غیر مسلم کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اہل علم و تحقیق اور فقہاء کرام نے ان سے تعلقات کی درج ذیل تین قسمیں کی ہیں:

۱- موالات: اس سے مراد قلبی اور دلی محبت ہے، یہ صرف ہم عقیدہ یعنی مسلمانوں کے ساتھ جائز ہے، کفار و مشرکین سے رازدارانہ تعلق، قلبی محبت، ان کا حقیقی احترام کہ جس سے کفر کا احترام لازم آئے جائز نہیں ہے۔

۲- مواسات: اس کے معنی ہمدردی، خیر خواہی اور نفع رسانی کے ہیں، ایسے غیر مسلم جو برسر پیکار اور مسلمانوں سے جنگ کے درپے نہیں ہیں، وہ ہماری ہمدردی، خیر خواہی کے مستحق ہیں، سورۂ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی وضاحت ملتی ہے:

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ. (الممتحنة:۸)

(۱) شامی: ۲۴۵/۷۔

اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔

ایسے لوگوں سے حسن سلوک، ہمدردی وغم خواری میں کوئی حرج نہیں ہے؛ بلکہ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام سے قریب ہوں گے، مسلمانوں کے حسن اخلاق سے متأثر ہوں گے اور آپسی فاصلہ کم ہوگا۔

۳- **مدارات** : اس سے مراد ظاہری خوش خلقی اور ادب واحترام ہے، یہ تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، خاص طور پر جب اس سے مقصد دینی نفع رسانی، اسلام کی دعوت، اسلامی اخلاق و برتاؤ پیش کرنا ہو، یا وہ ہمارے مہمان ہوں اور مہمانوں کا احترام بہر حال لازم ہے، یا ان کے شر وضرر رسانی سے حفاظت مقصود ہو، علامہ سیوطیؒ سورۂ نساء آیت: ۱۳۹ کے ذیل میں لکھتے ہیں :

أي : تخافوا مخافة ، فلكم موالاتهم باللسان دون القلب وهذا قبل عزة الإسلام ويجري في بلد ليس قويا فيها . (۱)

تمہیں ان سے خوف واندیشہ ہو تو زبان سے بظاہر دوستانہ رویہ، رواداری درست ہے، قلبی دوستی جائز نہیں، یہ حکم اسلام کے غلبہ سے قبل تھا؛ لیکن آج بھی ایسے علاقے میں جہاں مسلمان کمزور ہیں، یہ درست ہے۔

بیسویں صدی کے مشہور محقق مولانا اشرف علی تھانویؒ خلاصۂ بحث اس طرح تحریر فرماتے ہیں :

کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں: (۱) موالات: یعنی دوستی، (۲) مدارات: یعنی ظاہری خوش خلقی، (۳) مواسات: یعنی احسان و نفع رسانی، ان معاملات میں تفصیل یہ ہے کہ موالات تو کسی حال میں جائز نہیں اور آیت ''لاَ تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ'' اور ''لاَ تَتَّخِذُوْا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ '' میں یہی مراد ہے اور مدارات تین حالتوں میں درست ہے، ایک دفع ضرر کے واسطے، دوسرے اس کافر کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے، تیسرے اکرام ضیف کے لئے، اور اپنی مصلحت ومنفعت مال یا جاہ کے لئے درست نہیں اور بالخصوص جب کہ ضرر دینی کا بھی خوف ہو تو بدرجۂ اولیٰ یہ اختلاط حرام ہوگا۔ (۲)

---

(۱) جلالین: ۱/۴۹۔ (۲) بیان القرآن: ۱/۲۰۴۔

رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام ؓ کی رواداری

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ ظاہری رواداری، حسن اخلاق، شیریں زبانی وغیرہ درست ہے اور جب اسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے اخلاق پیش کرنا مقصود ہو تو بہتر اور مستحب ہے، اس پر انھیں اجر بھی دیا جائے گا — سیرت نبوی سے اس بات کی تائید ہوتی ہے؛ چنانچہ فتح مکہ کا وہ تاریخی دن بھی تاریخ میں محفوظ ہے، جب مکہ فتح ہو چکا تھا، دشمنانِ اسلام سہمے ہوئے تھے، ہزاروں تلواریں اشارۂ نبوی ﷺ کی منتظر تھیں، سارے مشرکین صحن کعبہ میں موجود ہیں، آپ چاہتے تو ان کے ایک ایک جرم کا بدلہ لے سکتے تھے، مگر ان جانی دشمنوں کو معافی کا پروانہ دے دیا گیا، ارشاد فرمایا: إذھبوا فأنتم الطلقاء ''جاؤ! تم سب کے سب آزاد ہو'' — اسی طرح مکہ سے مایوس ہو کر طائف کی وادی میں اسلام کی دعوت دینے پہنچے، اوباش لڑکوں نے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا، بظاہر ناکام اور مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے، راستے میں اللہ کی طرف سے دو فرشتے آئے اور کہا کہ آپ ﷺ کا حکم ہو تو اس بستی والوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دیا جائے؛ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، ایسا نہ کریں کیا پتہ ان کی آئندہ نسلیں دعوتِ حق کے اس پیغام کو قبول کر لیں۔

غزوۂ خندق کے موقع پر ایک مشرک فوجی خندق عبور کر کے مسلمانوں کی طرف آگیا اور حضرت علی ؓ کے ہاتھوں مارا گیا، کفارِ مکہ نے لاش کی قیمت ادا کر کے لاش حاصل کرنی چاہی؛ لیکن آپ ﷺ نے قیمت نہیں لی اور یوں ہی ان کی لاش ان کے حوالہ کر دی، اس طرح کے بیشتر رواداری اور حسن اخلاق کے ایسے واقعات ہیں کہ تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، حیرت اس لئے بھی ہے کہ یہ رواداری اس صورتِ حال میں تھی جب کہ آپ ﷺ ان کفار سے برسرِ پیکار تھے اور ہر وقت ان سے ضرر رسانی کا خطرہ رہتا تھا، ایسے وقت لوگ جذبات میں حسن سلوک اور ظاہری خوش خلقی سے عموماً متصف نہیں رہ سکتے؛ بلکہ ایسے حالات میں انسانیت کا بھی احترام ختم ہو جاتا ہے۔

یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ حسن اخلاق اور رواداری بہر حال پیش نظر رکھنی چاہئے، اس سے صرفِ نظر مسلمانوں کا وصف نہیں ہو سکتا، اس لئے صحابۂ کرام ؓ بھی اسی تعلیم پر عمل پیرا تھے، حضرت عمر فاروق ؓ جو کفار کے حق میں نسبتاً سخت سمجھے جاتے ہیں، ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے کہ ایک نصرانی فقیر کو دیکھا، بھیک مانگ رہا ہے، فاروق اعظم اس کے پاس گئے اور حال دریافت کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا کہ تیری جوانی اور قوت کے زمانہ میں ہم نے تجھ سے ٹیکس وصول کیا اور جب تو بوڑھا ہو گیا تو اب ہم تیری امداد نہ کریں، اس وقت حکم دیا کہ بیت المال سے اس کو تاحیات گذارہ دے دیا جائے۔(۱)

(۱) جواہر الفقہ: ۵/۷۰۔

غیر مسلم پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک

اسلام اپنے متبعین کو بلند اخلاق اور اعلیٰ ظرفی کی تعلیم دیتا ہے، اسلامی شریعت یہ نہیں چاہتی کہ بد اخلاقی اور نامناسب زبان استعمال کی جائے، یا کسی بھی معاملے میں تنگ ذہنی برتی جائے؛ چنانچہ اسلام نے مسلمانوں کو باہمی اخلاقیات کی جو تعلیم اور ہدایات دی ہیں، ان کا راست مصداق تو مسلمان ہیں، تاہم غیر مسلم افراد بھی اس میں شامل ہیں، جیسے اسلام میں پڑوسیوں کی بڑی اہمیت بتائی گئی ہے، ان کے ساتھ حسن سلوک، حسن اخلاق کی تعلیم دی ہے اور ان کو اپنے شر سے حفاظت کی ہدایت دی ہے، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره**، (۱) ''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے اپنے پڑوسی کو اذیت نہیں پہنچانی چاہئے'' — ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس وقت تک بندہ مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک اپنے بھائی اور پڑوسی کے لئے وہی چیزیں پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لئے پسند کرتا ہے'' (۲) آپ ﷺ نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ جب سالن پکایا جائے تو اس میں اتنا پانی بڑھا دیا جائے کہ پڑوسیوں میں تقسیم کیا جاسکے۔ (۳)

پڑوسیوں سے متعلق اس طرح کے جو بھی احکام ہیں ان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں داخل ہیں، یعنی جس طرح مسلمان پڑوسی کو تکلیف سے محفوظ رکھا جائے گا اور اسے خوشی و راحت میں شامل کیا جائے گا، اسی طرح غیر مسلم پڑوسی کا بھی حق ہے کہ اسے امن فراہم کیا جائے اور حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے، صحابۂ کرام ﷺ نے اس پر سختی سے عمل کیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک بار ایک بکری ذبح کرائی، غلام کو ہدایت کی کہ وہ سب سے پہلے پڑوسی کو گوشت پہنچائے، ایک شخص نے کہا حضور! وہ تو یہودی ہے، آپ نے فرمایا یہودی ہے تو کیا ہوا، یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کا حوالہ دیا کہ جبرئیل نے مجھے اس قدر اور مسلسل وصیت کی کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ پڑوسیوں کو وراثت میں حصہ دار بنادیں گے۔ (۴)

اس حدیث کے حوالے سے علامہ رشید رضا مصری لکھتے ہیں :

> **هذا دليل علىٰ أن ابن عمر فهم من الوصايا المطلقة في الجار أنها تشمل المسلم وغير المسلم ، وناهيک بفهمه وعلمه .** (۵)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے پڑوس کے ساتھ حسن سلوک کے

---

(۱) صحیح مسلم۔ (۲) مسند احمد۔ (۳) صحیح مسلم۔

(۴) ابوداؤد، کتاب الادب۔ (۵) تفسیر المنار: ۹۴/۵۔

سلسلے میں جو مطلق تاکیدیں آئی ہیں، ان سے یہ سمجھا کہ ان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، عبداللہ بن عمرؓ کا علم وفہم تمہارے لئے کافی ہونا چاہئے۔

سورۂ نساء آیت:۳۶ میں مختلف پڑوسیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس میں ایک قسم "الجار الجنب" بھی ہے، بعض لوگوں نے اس سے غیر مسلم پڑوسی مراد لیا ہے، علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں :

فالوصاة بالجار مأمور بها مندوب إليها مسلماً كان او كافراً . (۱)

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم، یہ مندوب اور پسندیدہ ہے، پڑوسی مسلم ہو یا کافر۔

کچھ صفحات کے بعد لکھتے ہیں :

قال العلماء : الأحاديث في اكرام الجار جاء ت مطلقة غير مقيدة حتى الكافر . (۲)

علماء نے کہا ہے کہ پڑوسی کے اکرام واحترام میں جو احادیث آئی ہیں وہ مطلق ہیں، اس میں کوئی قید نہیں ہے، کافر کی بھی قید نہیں۔

ایک پڑوسی پہلو کے ساتھی کو بھی بتایا گیا ہے، جس کو "الصاحب بالجنب" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے مراد ہم نشیں دوست بھی ہے، اور ایسا شخص بھی جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے، جیسے بازار جاتے آتے ہوئے کارخانہ یا دوکان اور فیکٹری میں کام کرتے ہوئے یا کسی اور طرح ایک دوسرے کی صحبت حاصل ہو وہاں بھی حکم دیا گیا ہے کہ نیک برتاؤ کرے اور تکلیف نہ دے، اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے، ایسے ہی پڑوسی کی جتنی بھی صورتیں ہوسکتی ہیں، سب میں مسلمان کے ساتھ غیر مسلم بھی داخل ہیں۔

غیر مسلموں سے تحائف کا تبادلہ

سماجی زندگی میں تحائف اور ہدایا کے لین دین کی بڑی اہمیت ہے، اس سے دوستی بڑھتی ہے، باہمی فاصلے کم ہوتے ہیں اور دلوں سے تکلیف ورنج کے آثار دور ہوتے ہیں، اس راز کو بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: "تهادوا تحابوا" (ہدایہ کا لین دین کرو محبت میں اضافہ ہوگا)۔

یہ حکم بھی عام ہے، اس سے غیر مسلم خارج نہیں؛ بلکہ ان سے بھی ہدایا کا تبادلہ کیا جانا چاہئے، احادیث میں غیر مسلموں کو تحفے دینے اور ان کے تحفے قبول کرنے کا ثبوت موجود ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں :

إن كسرىٰ أهدى له ، فقبل ، وإنّ الملوك أهدوا إليه فقبل منهم . (۳)

(۱) قرطبی :۱۸۴/۵۔ (۲) قرطبی:۱۸۸/۵) (۳) ترمذی ، ابواب السیر۔

کسریٰ (شاہ ایران) نے آپ کو ہدیہ پیش کیا، آپ نے قبول کیا، دیگر بادشاہوں نے بھی آپ کو ہدیے دیئے، آپ ﷺ نے قبول فرمائے۔

ہدایا میں خچر، کپڑے، باندی، غلہ اور عطر وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے، جو آپ ﷺ کو بھیجے گئے اور تالیف قلب کے لئے انھیں آپ ﷺ نے قبول کیا اور بسا اوقات آپ ﷺ نے خود بھی انھیں تحفے عنایت کئے، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے بعض غیر مسلم کے تحفے کو رد فرما دیا، اس بارے میں یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں ہدایا کے قبول کرنے میں تالیف قلب اور اسلام کی طرف میلان کی اُمید تھی وہاں دینی مصلحت کے پیش نظر قبول فرما لیا اور جہاں یہ اُمید نہیں تھی یا ان کی طرف سے ہدایا کے ذریعے دباؤ ڈالنا مقصد تھا، آپ ﷺ نے ارادے کو بھانپ لیا ہوگا، اس لئے بعض اوقات تحائف کو رد بھی کر دیا، یہی فرق آج بھی ہوگا، فاصلے کی کمی یا کسی اور سماجی ضرورت سے ہدایا و تحائف کے تبادلے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(۱)

غیر مسلموں کی دعوت قبول کرنا

سماج میں خوشگوار زندگی گذارنے کے لئے مہمانوں کی آمد و رفت اور دعوت کھانے اور قبول کرنے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دعوت دے تو اسے قبول کرنا پسندیدہ ہے، بلا وجہ اسے رد کرنے سے شریعت نے منع کیا ہے، اسی طرح غیر مسلم کے ساتھ بھی جائز مقاصد کے لئے کھانا پینا مباح ہے، وقت ضرورت اسے دعوت دی جاسکتی ہے اور اس کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے، رسول اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

إن يهوديا دعا النبي صلى الله عليه وسلم إلى خبز شعير وإهالة سنخة ، فأجابه . (۲)

ایک یہودی نے نبی اکرم ﷺ کو جو کی روٹی اور بدبودار چربی کی دعوت دی، آپ ﷺ نے قبول فرمائی۔

جنگ خیبر کے اختتام کے بعد ایک یہودی عورت نے آپ ﷺ کے پاس بکری کا گوشت بھجوایا، آپ کی دعوت کی، آپ نے قبول فرمایا، اس میں زہر ملا ہوا تھا، جس کا اثر اخیر تک باقی رہا۔(۳)

رسول اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کے کھانے پینے کا بھی اہتمام فرمایا ہے؛ چنانچہ قبیلۂ ثقیف کے وفد کو جو ابھی

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے: فتح الباری: ۵/۲۳۱۔ (۲) مسند احمد: ۳/۲۱۱۔

(۳) صحیح بخاری، کتاب المغازی۔

اسلام نہیں لایا تھا، آپ ﷺ نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا، حضرت خالد بن سعید آپ کے حکم سے اس کے کھانے پینے کا نظم فرماتے تھے۔(۱)

غیر مسلم کی عیادت

اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور مزاج پرسی کی تعلیم دی گئی ہے، اس سے ہمدردی کا اظہار اور مریض سے یگانگت ہوتی ہے، اس کے بڑے فضائل آئے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم کی عیادت کا بھی یہی حکم ہے، حضرت انس ﷺ کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اکرم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ بیمار ہوا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لئے گئے (۲) اسی طرح بنونجار کے ایک شخص کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے جو غیر مسلم تھا، (۳) ان ہی روایات کی روشنی میں صاحب ہدایہ نے لکھا ہے :

ولا بأس بعيادة اليهودي والنصراني ، لأنه نوع بر في حقّهم ، وما نهينا عن ذلک . (۴)

یہودی اور نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ان کے حق میں ایک طرح کی بھلائی اور حسن سلوک ہے، اس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا ہے۔

غیر مسلم پر انفاق

ضرورت مندوں اور محتاجوں پر خرچ کرنا، ان کی ضرورت پوری کرنا، بڑے اجر و ثواب کا موجب ہے، اس میں عقیدہ اور دین و مذہب کا فرق نہیں رکھا گیا ہے، محتاج شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم، مشرک ہو یا اہل کتاب، رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار، ہر ایک پر خرچ کرنے کا جذبہ نیک اور باعث اجر ہے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تصدقوا علی أهل الأ ديان ،(۵)''تمام اہل مذاہب پر صدقہ وخیرات کرو'' اس میں انسانیت کا احترام ہے، اس لئے کہ بھوک و پیاس ہر ایک کو لگتی ہے، غیر مسلم بھی اللہ کے بندے اور مخلوق ہیں، ان کے ساتھ ہمدردی کی جانی چاہئے، بحیثیت انسان وہ بھی ہمارے حسن اخلاق اور رحم دلی کے مستحق ہیں۔

غیر مسلم قیدی کے ساتھ حسن سلوک

قیدیوں کے ساتھ ظلم وستم کا عام رجحان ہے، وہ چوں کہ کمزور اور ناتواں بن کر ماتحتی میں آتے ہیں، اس لئے

(۱) ابن ہشام: ۱۹۶/۴۔ (۲) صحیح بخاری۔ (۳) مسند احمد: ۱۵۲/۳۔

(۴) هدایه: ۴۷۲/۴۔ (۵) ابن ابی شیبه۔

ان کے ساتھ نازیبا سلوک کیا جاتا ہے، اسلام نے اسے سختی سے منع کیا ہے، سورۂ دھر آیت: ۸ میں مسکینوں اور یتیموں کے ساتھ قیدیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، عہد نبوی میں قیدی صرف غیر مسلم ہوا کرتے تھے، اس لئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدی خواہ غیر مسلم ہو، اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا۔

صحابۂ کرام ؓ نے اپنے قیدیوں کے ساتھ جو حسن سلوک کیا، تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، جنگ بدر میں جب ستر قیدی ہاتھ میں آئے اور آپ ﷺ نے مختلف صحابۂ کرام کے درمیان ان کو دیکھ بھال کے لئے تقسیم کیا اور بہتر سلوک کی ہدایت دی تو صحابۂ کرام ؓ نے ان کے ساتھ حیرت انگیز حسن سلوک کا معاملہ کیا، خود بھوکے رہے یا روکھا سوکھا کھایا مگر انھیں اچھا کھلایا پلایا، ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھا، خود تکلیف اُٹھا کر اپنے قیدیوں کو راحت پہنچائی جب کہ وہ حالت جنگ تھی اور ان ہی کفار کے ہاتھوں یہ ستائے گئے تھے یہاں تک ان کے مظالم کے سبب صحابۂ کرام کو اپنا وطن چھوڑ دینا پڑا، ان سب کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ یہ رواداری اور بہتر سلوک سارے مسلمانوں کے لئے ایک آئیڈیل ہے، جس کے نقش قدم پر چلنا ہمارا نصب العین ہونا چاہئے۔

غیر مسلم کو دُعا دینا

دوسروں کے لئے دُعا قلبی سخاوت اور وسعت ذہنی کی مثال اور آئینہ ہے، اس میں اظہار ہمدردی اور خیر خواہی بھی ہے کہ دوسروں کے لئے ایک شخص وہی چاہتا ہے جو اپنے لئے چاہتا ہے، دوسروں کی ترقی، راحت اور خوشحالی کی تمنا کرنے اسلام کی ہدایت ہے، یہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے اور غیر مسلم کے لئے بھی، حضرت انس ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے پینے کی کوئی چیز طلب کی اس نے وہ پیش کی تو آپ ﷺ نے اسے دُعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں حسین وجمیل رکھے؛ چنانچہ مرتے وقت تک اس کے بال سیاہ رہے، (۱) تاہم بہتر یہ ہے کہ پہلے غیر مسلموں کی ہدایت کے لئے دُعا کی جائے، یہی اصل ہمدردی اور خیر خواہی ہے، اس لئے کہ اس سے وہ ہمیشہ کے عذاب سے محفوظ رہیں گے، رسول اکرم ﷺ بھی اکثر ہدایت کی دُعا فرماتے۔

غیر مسلم کے ساتھ عدل وانصاف

عدل وانصاف کی شریعت نے بہت سخت تاکید کی ہے؛ بلکہ یہ اسلام کا امتیازی وصف ہے کہ انسان کسی بھی حال میں ہو وہ عدل وانصاف کو ترک نہ کرے، اسلام اپنے متبعین کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی فرد یا گروہ پر دست تعدی دراز کریں، چاہے اس سے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں اور اس نے کتنے ہی زیادتی کیوں نہ کی ہو، ارشاد ربانی ہے :

(۱) مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۳۹۲۔

يَـا أَيُّهَـا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُونُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَـدَاء بِـالْقِسْطِ وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوْا . (المائدة:۸)

اے ایمان والو ! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔

عدل سے کام نہ لینا ظلم ہے اور ظلم کبھی اللہ تعالی کو برداشت نہیں ہے، خواہ وہ کسی جانور کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، آپ ﷺ نے مظلوم کی بدد عا سے بچنے کی تاکید کی ہے، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں داخل ہیں۔

حضرت عبید اللہ بن فاروقؓ نے دو کافروں کو اس شبہ میں قتل کر دیا کہ وہ قتل عمر میں شریک تھے، حضرت عثمان ؓ مسند خلافت پر پہنچے تو انھوں نے مہاجرین وانصار سے رائے لی، حضرت علی ؓ نے فتویٰ دیا گردن اُڑادی جائے، مہاجرین نے بالاتفاق کہا، عمر کے بیٹے کو قتل کر دینا چاہئے، حضرت عثمان غنی ؓ نے اپنے پاس سے خون بہا ادا کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔(۱)

غیر مسلموں کے حق میں صحابۂ کرام ؓ نے عدل وانصاف کا جو نمونہ پیش کیا ہے، دوسرے اقوام عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی، مسلمان اپنی زندگی میں اگر یہ کردار شامل کرلیں تو سماج میں پائے جانے والے اختلافات بڑی حد تک ختم ہو سکتے ہیں۔

غیر مسلم کا مسجد میں قیام

مسجد ایک مقدس جگہ ہے، اس کو پاک رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، وہاں مسلمان عبادت کرتے ہیں، اس لئے ہر طرح کی آلودگی، بچوں کی آمد و رفت، شور و شرابہ، ناپاک لوگوں کے داخلے سے حفاظت ایمان کا حصہ ہے، اس کے باوجود غیر مسلم اقوام کے مسجد میں داخلہ اور قیام کا ثبوت ملتا ہے، وفد ثقیف جب رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کے لئے مسجد میں خیمہ لگوایا؛ تاکہ وہ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھیں، آپ ﷺ سے عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسول، آپ انھیں مسجد میں ٹھہرا رہے ہیں، جب کہ وہ مشرک ہیں، آپ نے فرمایا زمین نجس نہیں ہوتی، نجس تو ابن آدم ہوتا ہے،(۲) غیر مسلم کو عقیدے کے اعتبار سے قرآن نے ناپاک کہا ہے؛ تاہم جسمانی اعتبار سے اگر وہ پاک صاف رہیں تو مسجد میں داخلے کی ممانعت نہیں ہوگی، بالخصوص اس نیت سے کہ مسلمانوں کے طریقۂ عبادت، ان کی اجتماعیت اور سیرت واخلاق کو دیکھ کر ان کے دل نرم پڑیں اور اسلام کی طرف وہ مائل ہوں؛ جیسا کہ آپ ﷺ نے مختلف وفود اور اشخاص کو مسجد میں قیام کی اجازت اسی مقصد کے تحت دی تھی، علامہ خطابی لکھتے ہیں :

---

(۱) اسلامی رواداری: ۲۴۱۔ (۲) نصب الرایہ: ۴/ ۲۷۰۔

وفي هذا الحديث من العلم أن الكافر يجوز له دخول المسجد لحاجة له فيه أو للمسلم إليه . (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کو اگر مسجد میں کوئی حاجت ہو یا مسلمان کی اس سے کوئی حاجت ہو تو وہ وہاں جاسکتا ہے۔

غیر مسلم جنازہ کا احترام

خوشی اور غم خواہ غیر مسلم کو ہی کیوں حاصل نہ ہو، وہ انسان ہیں، اس لئے ان کی خوشی اور غم میں شمولیت حدود میں رہتے ہوئے جائز ہے، جنازہ وہ تصور و خیال کو آخرت کی طرف لے جاتا ہے اور انسان کو چونکا دیتا ہے، اس لئے کہیں سے کوئی جنازہ گذرے تو انسان کو کھڑا ہو جانا چاہئے، اگر یہ جنازہ غیر مسلم کا بھی ہو تو بھی یہی حکم ہے، ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ گذرا تو رسول اکرم ﷺ کھڑے ہو گئے، صحابہ نے عرض کیا یہ تو یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: آخر وہ بھی تو انسان تھا''إن فيه لنفساً'' (۲) یعنی ہم نے انسانیت کا احترام کیا ہے اور انسان ہونے میں تمام نوع بنی آدم یکساں ہیں۔

غیر مسلم کی تعزیت

موت ایک خوفناک حادثہ ہے، یہ حادثہ مسلمانوں کو ہو تو وہ یقیناً لمحۂ فکر ہے؛ لیکن غیر مسلم کے گھر میں بھی یہ حادثہ پیش آئے تو اس کی بھی تعزیت کی جانی چاہئے اور انسانی ہمدردی کا اظہار کیا جانا چاہئے، یہ ایک سماجی تقاضا ہے اور عین اسلام کی تعلیم پر عمل ہے، امام ابو یوسفؒ کا بیان ہے کہ حضرت حسن بصری کے پاس ایک نصرانی آتا اور آپ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس کے بھائی سے تعزیت کی اور فرمایا: تم پر جو مصیبت آئی ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا وہ ثواب عطا کرے جو تمہارے ہم مذہب لوگوں کو عطا کرتا ہے، موت کو ہم سب کے لئے برکت کا باعث بنائے اور وہ ایک خیر ہو جس کا ہم انتظار کریں، جو مصیبت آئی ہے، اس پر صبر کا دامن نہ چھوڑو۔ (۳)

غیر مسلم سے کاروباری تعلقات

کاروبار، خرید و فروخت، لین دین انسانی زندگی کا لازمی جز ہے، یہ چیزیں جس طرح مسلمانوں کے ساتھ درست ہیں اسی طرح غیر مسلم افراد کے ساتھ بھی جائز ہیں، غیر مسلم طبقے سے تجارتی تعلقات شرعی حدود میں رہتے ہوئے کئے جاسکتے ہیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں :

---

(۱) معالم السنن: ۲/ ۳۵۔ (۲) صحیح بخاری، بحوالہ مشکوٰۃ: ۱۴۷۔ (۳) غیر مسلموں سے تعلقات: ۹۳۔

إن النبي اشترى طعاما من يهودي إلى أجل ورهنه درعه من حديد . (۱)

رسول اکرم ﷺ نے ایک یہودی سے ایک مدت کے لئے غلہ خریدا اور اس کے پاس اپنے لوہے کی ذرہ رہن رکھی۔

علامہ دقیق العید فرماتے ہیں :

هذا الحديث دليل على جواز معاملة الكفار وعدم اعتبار الفساد في معاملتهم .

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کفار سے معاملہ کرنا جائز ہے اور یہ کہ ان کے آپس کے معاملات کے فساد کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ (۲)

خلاصۂ بحث

ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانیت میں ساری قوم شامل ہیں، جہاں انسانیت کی بات آئے گی وہاں ان کے ساتھ ہمدردی، خیر خواہی رواداری وغیرہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی جائے گی، اچھے اخلاق کے ذریعہ ہم ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دیں گے؛ تاکہ اسلام کی اچھی تصویر ان کے ذہن میں بیٹھے اور کم از کم اسلام اور مسلمانوں کے تئیں نرم گوشہ ان کے دل میں پیدا ہو، تاہم شریعت اسلامی کے ہم پابند ہیں، اسلامی امتیاز ہر وقت باقی رہے، عقائد یا مسائل میں اس کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہ ہوگی، ایک مسلمان کو رواداری کے نام پر ذرہ برابر دین کے معاملے میں مداہنت یا کسی ردوبدل اور ترمیم کی اجازت نہیں ہے، مخالفین کی خواہشات کے سامنے جھک جانا بڑے خسارے کا سودا ہوگا، عہد نبوی میں بعض کفار کی خواہش تھی کہ آپ ﷺ ان کے مذہب کو قبول کرلیں، بنی اسرائیل آیت ۷۳-۷۵ میں آپ ﷺ کو ہدایت دی گئی کہ رواداری یا اخلاق کی آڑ میں ان کے مذہب کی طرف جھکنا دنیا و آخرت دونوں کو تباہ کردے گا، یہ دراصل اُمت کو سبق دینا ہے ورنہ آپ ﷺ کے بارے میں اس کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

شریعت کے خلاف ہر مطالبے کو رد کر دیا جائے گا؛ اس لئے کہ ایک مسلمان شریعت اسلامی کا پابند ہوتا ہے، مگر رواداری، ظاہری حسن اخلاق، معاملات وغیرہ کے دائرے میں جو چیزیں آتی ہیں، حدود میں رہتے ہوئے انھیں اختیار کیا جاسکتا ہے اس کے بہتر نتائج ہمیشہ حاصل ہوتے ہیں، اس بارے میں ڈاکٹر محمد احمد فلاحی کی کتاب ''ہندو مسلم تعلقات کی خوشگوار یادیں'' مطالعہ کے قابل ہے، اس سے موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، آج کے حالات میں جب کہ منصوبہ بند طریقے پر اسلام اور مسلمانوں سے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں، رواداری اور ان کے ساتھ بہتر تعلقات کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری۔ (۲) احکام الاحکام: ۱۹۶/۳۔

طلاق — قرآن کریم کے آئینہ میں!

مولانا نورالحق رحمانی⊙

طلاق کے لغوی واصطلاحی معنی

طلاق کے لغوی معنی چھوڑنے اور قید ختم کرنے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں نکاح کی قید کو ختم کرنے کا نام طلاق ہے۔(۱)

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :

أصل الطلاق التخلية من الوثاق ، يقال : أطلقت البعير من عقاله وطلقته ، ومنه استعير " طلقت المرأة " . (۲)

یعنی طلاق کی اصل قید سے چھڑانا ہے، کہا جاتا ہے: ''أطلقت البعير من عقاله وطلقته ''یعنی میں نے اونٹ کو اس کی رسی کھول کر آزاد کر دیا، عورت کو چھوڑنے کے لئے اسی لفظ کو استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔

علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں :

رفع قيد النكاح في الحال أو المآل بلفظ مخصوص . (۳)

مخصوص لفظ کے ساتھ قید نکاح کو اُٹھانا خواہ فوری طور پر ہو، جیسے ''طلاق بائن'' میں ہوتا ہے یا کچھ عرصہ کے بعد جیسا کہ ''طلاقِ رجعی'' میں ہوتا ہے، طلاق ہے، اور مخصوص لفظ سے مراد ایسا لفظ ہے جو مادۂ طلاق سے مشتق ہو یا اس کے معنی میں ہو۔

طلاق کی مشروعیت

طلاق کی مشروعیت : قرآن ، حدیث ، اجماع اور عقل و قیاس سب سے ثابت ہے، قرآن کریم کی ایک

⊙ استاذ: المعہد العالی امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

(۱) معجم لغة الفقهاء:۲۹۱۔ (۲) مفردات القرآن مادہ طلق ۔ (۳) الدرالمختار:۲/۴۰۵۷۔

مستقل سورت ''سورة الطلاق '' ہے، جس میں طلاق کے احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں، سورت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ . (الطلاق:۱)

اس آیت میں نبی ﷺ اور اُمت کے مردوں سے خطاب کر کے فرمایا گیا: ''اگر بیویوں کو طلاق دینے کا ارادہ ہو تو ان کی عدت کی رعایت کرتے ہوئے طلاق دو'' اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں — جو صحیحین وغیرہ میں مروی ہے — اس کی وضاحت اس طرح کی گئی کہ طہر کی حالت میں عورت کو طلاق دی جائے اور ایسے طہر میں جس میں شوہر نے اس سے وطی نہ کی ہو اور اس کی حکمت یہ ہے کہ طلاق وقتی اشتعال اور غیظ و غضب کے نتیجے میں نہیں ہوگی؛ بلکہ واقعی ضرورت اور دانشمندانہ فیصلہ کی بنیاد پر ہوگی اور پھر مطلقہ کی عدت طویل نہ ہوگی، اسی طرح سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء وغیرہ میں طلاق کے احکام ذکر کیے گئے ہیں۔

بہت سی احادیث سے بھی طلاق کی مشروعیت ثابت ہے، ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حفصہ بنت عمر کو طلاق دی، پھر (وحی الٰہی کی بنا پر) رجعت فرمالی۔(۱)

اسی طرح عہد رسالت سے لے کر اب تک اُمت کا اس کی مشروعیت پر اجماع ہے اور اُمت میں اس کا تعامل چلا آرہا ہے، صحابہ کرام میں حضرت عمر فاروق، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت مغیرہ بن شعبہ، نواسۂ رسول حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنی بیویوں کو طلاق دی۔

طلاق کی حکمت

اسی طرح عقل و قیاس کا بھی تقاضا ہے کہ طلاق کی اجازت ہو؛ کیوں کہ کبھی کبھی زوجین کے درمیان ایسا اختلاف رونما ہو جاتا ہے کہ نباہ کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور دونوں کا اللہ کے حدود پر قائم رہنا، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، اس صورت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ نکاح کے بندھن کو کھول کر دونوں کو آزاد کر دیا جائے، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں :

لا يمكن سد هذا الباب والتضييق فيه ، فإنه قد يصير الزوجان متناشزين ؛ إما لسوء خلقهما ، أو لطموح عين أحدهما إلى حسن إنسان آخر ، أو يضيق معيشتهما ، أو لخرق واحد منهما ونحو ذلك من الأسباب ، فيكون إدامة هذا النظم مع ذلك بلاءً عظيماً وحرجاً . (۲)

---

(۱) ابوداود، عن عمرؓ۔ (۲) حجة الله البالغة:۲/۱۳۸۔

یعنی طلاق کے دروازہ کو بند کرنا اور اس میں تنگی پیدا کرنا ممکن نہیں ہے؛ اس لئے کہ کبھی زوجین میں سے ہر ایک کو دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے یا اس بنا پر کہ ان دونوں کے اخلاق اچھے نہیں ہیں، یا اس بنا پر کہ دونوں میں سے کسی ایک کی نظر کسی دوسرے آدمی پر پڑ جاتی ہے اور اس کا حسن و جمال اس کو اپنی طرف مائل کر لیتا ہے، یا وہ دونوں گذران میں تنگی محسوس کرتے ہیں، یا اس لئے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک احمق ہوتا ہے اور اس طرح کے دوسرے اسباب ہیں؛ لہٰذا ان اسباب کے ہوتے ہوئے نکاح کے نظام کو برقرار رکھنا ایک بڑی مصیبت اور حرج کا باعث ہے۔

اس وقت تمام اقوام عالم نے طلاق کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے اور اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ بعض صورتوں میں طلاق ایک ناگزیر سماجی ضرورت بن جاتی ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں، یہ اسلام کے محاسن اور تفاخر میں شمار کیا جائے گا کہ اس کی شریعت نے بوقت ضرورت طلاق کی اجازت دی ہے اور بعض وہ مذاہب جن میں طلاق کی اجازت نہیں تھی، مثلاً عیسائیت، ہندومت اور بدھ مت انھوں نے اسلامی قانون سے خوشہ چینی کی اور طلاق کا تصور اسلام سے اخذ کیا ہے۔

طلاق کا تصور دیگر ادیان و مذاہب میں

موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے قبل حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی شریعت میں طلاق کی اجازت تھی؛ چنانچہ بخاری شریف کی وہ روایت جس میں اس کا تذکرہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام برابر اپنے اہل و عیال کو دیکھنے (فلسطین سے مکہ) آتے رہتے تھے ایک مرتبہ تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہیں تھے، ان کی اہلیہ سے دریافت کیا کہ کیسی گذر رہی ہے؟ تو وہ کہنے لگی کہ سخت مصیبت اور پریشانی میں ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا: اسماعیل سے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر دیں، اسماعیل علیہ السلام نے واپسی پر جب بیوی سے اپنے والد کا پیغام سنا تو فرمایا:

ذاک أبي وقد أمرني أن أفارقک، ألحقي بأهلک فطلقها وتزوج منهم أخرىٰ. (۱)

یہودی شریعت میں مرد کو طلاق دینے کی کھلی اجازت ہے؛ چنانچہ استثناء، باب ۲۴ فقرہ ۱ تا ۴ میں ہے:

---

(۱) بخاری، کتاب الانبیاء، باب: ۲، ص: ۱۱۵۔

اگر کوئی مرد کسی عورت سے بیاہ کرے اور پیچھے اس میں کوئی ایسی بے ہودہ بات پائے جس سے اس عورت کی طرف اس کا التفات نہ رہے تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کر اس کے حوالہ کردے اور اسے اپنے گھر سے نکال دے اور جب وہ اس کے گھر سے نکل جائے تو وہ دوسرے مرد کی بیوی ہوسکتی ہے، پھر اگر دوسرا شوہر بھی اس سے ناخوش رہے اور اس کا طلاق نامہ لکھ کر اس کے حوالہ کردے اور اسے اپنے گھر سے نکال دے، یا وہ دوسرا شوہر جس نے اس سے بیاہ کیا ہو، مرجائے تو اس کا پہلا شوہر جس نے اس کو نکال دیا تھا، اس عورت کے ناپاک ہوجانے کے بعد پھر اس سے بیاہ نہ کرپائے؛ کیوں کہ ایسا کام خداوند کے نزدیک مکروہ ہے۔

اور توریت کے شارحین نے تو توریت کی اس اجازت سے بات بات پر طلاق کا جائز بلکہ مستحسن ہونا ثابت کیا ہے؛ چنانچہ ان کے یہاں اگر کھانے میں نمک تیز ہوجائے یا اپنی بیوی سے زیادہ خوبصورت بیوی ہاتھ آجائے تو بے تکلف بیوی کو طلاق دی جاسکتی ہے۔(۱)

اور جہاں تک دین مسیحی کا تعلق ہے تو موجودہ انجیل کی تصریحات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس میں طلاق ممنوع ہے، ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اس نے (مسیح نے) ان سے جواب میں کہا کہ موسیٰ نے تم کو کیا حکم دیا ہے، انھوں نے کہا کہ موسیٰ نے تو اجازت دی کہ طلاق نامہ لکھ کر چھوڑ دیں، مگر یسوع نے ان سے کہا کہ اس نے تمہاری سخت دلی کے سبب تمہارے لئے یہ حکم لکھا تھا؛ لیکن خلقت کے شروع سے اس نے انھیں مرد اور عورت بنایا، اس لئے مرد اپنے باپ سے اور ماں سے جدا ہوکر اپنی بیوی کے ساتھ رہے گا اور وہ اور اس کی بیوی دونوں ایک جسم ہوں گے، پس وہ دو نہیں؛ بلکہ ایک جسم ہیں، اس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے، اسے آدمی جدا نہ کرے۔(۲)

عیسائیوں میں رومن کیتھولک فرقہ تو طلاق کو بالکلیہ ممنوع اور حرام قرار دیتا ہے؛ لیکن آرتھوڈاکس اور پروٹسٹنٹ فرقوں نے بیوی کے زنا میں مبتلا ہونے کی صورت میں طلاق کی اجازت دی ہے، ان کی دلیل انجیل کے درج ذیل فقرات ہیں:

(۱) عائلی قوانین — شریعت کی روشنی میں: ۲۴۳۔ (۲) انجیل متی: ۱۱، فقرہ: ۳-۶، انجیل مرقس: ۱۰، فقرہ: ۳-۶۔

لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے
چھوڑ دے، وہ اس اس سے زنا کراتا ہے۔(۱)

خلاصہ یہ کہ بعض مسیحی فرقوں کے یہاں طلاق بالکلیہ ممنوع اور حرام ہے اور جو لوگ طلاق کی اجازت تسلیم کرتے ہیں وہ بھی اسے بیوی کی بدکاری تک ہی محدود رکھتے ہیں، زنا کے علاوہ کسی اور جرم یا عذر کی بنا پر طلاق کی اجازت نہیں دیتے، پھر طلاق کا اختیار شوہر کو نہیں؛ بلکہ عدالت کو ہے، پھر یہ کہ اگر فرضی شہادتوں کی بنیاد پر عدالت نے طلاق کا فیصلہ کر بھی دیا تو طلاق حاصل کرنے والے شوہر اور اس کی مطلقہ کو نئی شادی کی اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ مسیحی شریعت میں جس طرح طلاق ممنوع ہے اسی طرح تعدد ازدواج بھی ممنوع ہے؛ چنانچہ انجیل متی باب ۵، فقرہ ۳۲ میں ہے:

اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔

اور انجیل مرقس فقرہ: ۱۰، ۱۱، ۱۲ میں ہے:

اور گھر میں شاگردوں نے اس سے اس کی بابت پھر پوچھا، اس نے ان سے کہا کہ جو
کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری بیاہ کرے وہ اس پہلی کے برخلاف زنا کرتا ہے
اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے۔

جب عدالت میں بیوی کے زنا کا کیس ثابت ہو جانے کے بعد بھی زوجین میں سے کسی کو طلاق کے بعد دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے تو پھر اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ دونوں ہی اپنی فطری خواہش کی تسکین کے لئے زنا کاری پر مجبور ہوں گے۔

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی تکملہ فتح الملہم میں تحریر فرماتے ہیں:

دین عیسوی میں طلاق ممنوع تھی؛ لیکن اہل کلیسا نے بعض مخصوص حالات میں اس کی
اجازت دی، مثلاً اگر شوہر نامرد ہو، یا بیوی زانیہ ہو، یا دونوں میں سے کوئی ایک دین
نصرانیت کا انکار کردے، تو زوجین کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ کلیسا کی عدالت سے
رُجوع کر کے طلاق حاصل کرلیں؛ لیکن یہ اختیار خود زوجین کے سپرد نہیں کیا گیا؛ بلکہ
ان کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ کلیسا کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کریں
اور وہاں معاملات کی تحقیق کے بعد طلاق کی ڈگری جاری ہوگی، یہ قانون ۱۸۵۷ء

(۱) انجیل متی باب: ۵، فقرہ: ۳۱۔

> تک جاری رہا، اس وقت تک طلاق کا اختیار کلیسا کے ہاتھ میں تھا، پھر اس کے بعد انگلینڈ میں یہ اختیار عام شہری عدالتوں کے سپرد کر دیا گیا اور اسبابِ طلاق کے دائرہ کو زیادہ وسیع کر دیا گیا حتیٰ کہ زوجین میں سے ہر ایک کو محض دوسرے سے نفرت کی بنیاد پر بھی عدالت سے طلاق کے مطالبہ کا حق دیا گیا اور یہ دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ آج طلاق زوجین کے ہاتھ کا کھلونا ہے، وہ جس طرح چاہیں اس سے کھیلیں اور معمولی اسباب کی بنا پر بھی عدالت سے طلاق کی ڈگری جاری کی جانے لگی، اس افراط وتفریط پر عبرت کی نگاہ ڈالی جائے۔(۱)

اسی طرح ہندو مذہب اور بدھ مذہب میں پہلے طلاق کی اجازت نہیں تھی، ہندو مذہب کے مشہور قانونی وکیل منوجی نے ویدوں میں طلاق کی اجازت کا زور شور سے انکار کیا ہے، ہنود نکاح کے بندھن کو پہلے جنم کا بندھن تصور کرتے تھے اور زوجین کا باہمی اختلاف خواہ کیسی ہی شدید نوعیت کا ہو انھیں ایک دوسرے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی، مگر ۱۹۵۵ء میں جب ہندو مصلحین نے اپنے قوانین میں حالات کے اعتبار سے ترمیم کی تو ہندو کوڈ ۱۹۵۵ء کے ذریعہ ہندو مرد وعورت کو پہلی مرتبہ طلاق حاصل کرنے کا حق دیا گیا، طلاق کا یہ تصور ہندو مصلحین نے اسلام ہی سے لیا ہے، گوکہ اس میں ان کے یہاں اب بھی ایسے حدود وشرائط ہیں کہ طلاق کا حصول زوجین کے لئے مشکل ہے۔

طلاق بہر حال انسانی سماج کی ایک ناگزیر اور بنیادی ضرورت ہے اور آج کی متمدن دنیا میں یہ ضرورت تسلیم شدہ ہے، طلاق کی اجازت کا نہ ہونا انسانی فطرت کے خلاف ہے، اسی بنا پر ایک مشہور انگریز محقق (Bentham) اپنی کتاب ''اُصولِ قانون'' میں طلاق کے سلسلے میں مسیحی مذہب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

> کلیسا جب میاں بیوی سے کہتا ہے کہ شادی کے بعد تم دونوں ایک ایسے قید خانہ میں داخل ہو گئے ہو جس کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے، میں تم دونوں کو اس سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتا، اب تم اسی قید خانہ میں بغض وعداوت کے ہتھیاروں سے لڑتے رہو۔

آگے لکھتا ہے :

> شادی کی گرفت سے نکلنے کی سبیل اگر صرف موت ہے تو اس کے لئے قتل کی نئی نئی صورتیں نکلیں گی، مسیحی معاشرہ کو اس کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔(۲)

---

(۱) تکملہ فتح الملہم: ۱/۱۴۲۔ (۲) بحوالہ الطلاق فی الاسلام: ۸۹۔

اسلامی شریعت نے بوقتِ ضرورت طلاق کی اجازت دی ہے؛ لیکن طلاق میں اصل ممانعت بلاضرورت طلاق دینا حرام ہے؛ کیوں کہ نکاح اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے، جس کے ساتھ بہت سے دینی و دنیوی مصالح وابستہ ہیں اور جسے اللہ نے اپنی قدرت کی عجیب وغریب نشانی قرار دیا ہے اور طلاق کی وجہ سے وہ نعمت ختم ہوتی ہے، اس لئے اسے اصلاً ممنوع ہونا ہی چاہئے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

أبغض الحلال إلى الله الطلاق . (۱)

یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔

نیز ارشاد ہے :

أيما امرأة سألت زوجها الطلاق من غير بأس فحرام عليها رائحة الجنة . (۲)

یعنی جو عورت بلاضرورت اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔

طلاق کا اختیار مرد کو

اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے، قرآن کریم میں طلاق دینے کی نسبت مردوں ہی کی طرف کی گئی ہے، اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا: ''انما الطلاق لمن أخذ بالساق ''(۳) یعنی طلاق کا اختیار مردوں کو ہے، عورتیں بالعموم زود رنج، مشتعل مزاج اور ناعاقبت اندیش ہوتی ہیں، جیسا کہ خود حدیث پاک میں اس کا ذکر ہے :

لو أحسنت إلى احداهن الدهر ثم رأت منک شيئا قالت : ما رأيت منک خيرا قط . (۴)

(مردوں سے مخاطب ہوکر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) اگر تم ان کے ساتھ زندگی بھر احسان کرو اور کبھی ذراسی کمی ہوجائے تو فوراً کہہ دے گی کہ ہمیں تو تمہارے پاس کبھی خیر اور سکون نہیں ملا۔

طلاق کا حق مرد کو دینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں عقل و دانش، صبر وتحمل، دور بینی اور عاقبت اندیشی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، وہ عورت کی طرح جذباتی نہیں ہوتا؛ بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ذریعہ حالات کا مقابلہ کرتا ہے،

(۱) ابوداود، عن ابن عمرؓ:۱-۳۱۲۔ (۲) ترمذی، ابوداود۔

(۳) ابن ماجہ، عن ابن عباسؓ۔ (۴) بخاری، کتاب الایمان، فتح الباری:۱/۷۸۔

دوسرے یہ کہ شریعت کی رو سے نکاح میں مالی اخراجات مرد کے ذمہ ہوتے ہیں ،مہر وہ ادا کرتا ہے، بیوی بچوں کی کفالت اس کے سر ہوتی ہے،اس لئے اس رشتے کو ختم کرنے اور حقوق زوجیت سے دستبردار ہونے کا اختیار بھی اسی کے سپرد کیا گیا۔

تیسرے یہ کہ طلاق کے بعد مرد پر کچھ مالی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں ،اگر اس نے بیوی کا مہر ابتک ادا نہیں کیا تو اسے فوراً مہر ادا کرنا ہوگا اور کچھ دے چکا ہے کچھ باقی ہے تو باقی ماندہ حصے کی فوری ادائیگی اس پر لازم ہوگی ، عدت کا نفقہ اس پر واجب ہوگا ،بعض صورتوں میں طلاق کے بعد متعہ دینا بھی اس کے ذمہ ہوتا ہے،اس لئے کہ وہ کسی معقول سبب کے بغیر وہ طلاق کا استعمال نہیں کرسکتا کہ اس میں اس کا نقصان ہے؛ بلکہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اور عاقلانہ فیصلے ہی کے نتیجہ میں طلاق دے گا۔

اگر طلاق کا اختیار عدالت کے سپرد کیا جائے

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مرد کے حق طلاق کے بیجا استعمال سے بعض دفعہ بڑے مسائل کھڑے ہوتے ہیں ، اس لئے اگر شوہر کے بجائے یہ اختیار عدالت کے سپرد کردیا جائے ، جیسا کہ مغربی مما لک میں ہے ،تو طلاق کا تناسب گھٹ جائے گا اور بہت سے گھر تباہ ہونے سے بچ جائیں گے ؛لیکن یہ تجویز شرعی ،عقلی اور تجرباتی طور پر صحیح نہیں ،شرعی لحاظ سے تو اس لئے درست نہیں کہ طلاق کا اختیار مرد کو شریعت نے سپرد کیا ہے اور قرآن وحدیث میں مسئلہ منصوص ہے اور شریعت کے جو احکام مقرر اور منصوص ہیں ان میں ترمیم کا حق کسی مرد یا جماعت یا قانون ساز مجلس کو حاصل نہیں ہے ، ہاں یہ صحیح ہے کہ شوہر حق طلاق کو کسی اور کے سپرد کرسکتا ہے،اس لئے یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شوہر اپنے طلاق کا اختیار کسی قاضی کے سپرد کردے ،کسی عدالت کے سپرد کردے ؛لیکن کسی کے سپرد کردینے سے بھی اس کا اختیار ختم نہیں ہوگا ؛ بلکہ جب بھی وہ اپنے اس حق کا استعمال کرے گا اور بیوی کو طلاق دے گا وہ واقع ہوجائے گی اور عدالت کے فیصلہ کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

دوسری طرف اگر حالات وواقعات اور تجربات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ تجویز کس طرح سودمند نہیں ہے ،اس لئے کہ مغربی مما لک جہاں یہ تجربہ رائج ہے ،وہاں طلاق وتفریق کے واقعات سب سے زیادہ پیش آرہے ہیں ؛ چنانچہ امریکہ میں ۱۹۷۹ء میں صرف ایک سال کے دوران بارہ لاکھ لوگوں نے طلاق حاصل کی اور اب حال یہ ہے کہ وہاں پر ہر دو نکاحوں میں سے ایک طلاق پر منتج ہورہا ہے ،یعنی طلاق کی تعداد پچاس فیصد کو پہنچ گئی ہے۔(۱)

---

(۱) دیکھئے :کتاب کورٹ شپ ،میرج اینڈ فیملی :۳۳۲،مطبوعہ امریکہ۔

جب کہ برطانیہ میں چالیس فیصد شادیاں طلاق پر منتج ہورہی ہیں (۱) کی کوئی رپورٹ نہیں ہے، اسلامی جمہوریہ مصر کی راجدھانی قاہرہ میں جہاں تمام مسلم ممالک سے زیادہ طلاقیں واقع ہوتی ہیں، وہاں بھی طلاق کی تعداد دو فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔(۲)

پھر یہ کہ اسلام میں زوجین کے درمیان قاضی اور عدالت کو ثالث بنانے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں ہے کہ شریعت میں نظام تحکیم موجود ہے کہ اگر زوجین کا اختلاف ونزاع شدت اختیار کرجانے اور زوجین خود سے اس کا ازالہ نہ کرسکیں تو خاندان کے باا‌ثر اور صالح افراد کو بیچ میں پڑ کر مصالحت کرائیں، پھر یہ کہ طلاق کے اسباب کا اظہار قاضی یا عدالت کے سامنے مناسب نہیں ہوتا؛ بلکہ زوجین کی مصلحت اس میں ہوتی ہے کہ انھیں پوشیدہ رکھا جائے اور عدالت میں جانے کے بعد لازماً ان کی تشہیر ہوگی اور سارے واقعات درج رجسٹر ہوں گے، جس میں زوجین کی بدنامی ہے۔

طلاق تک رسائی کے لئے شرعی حدود

اگر زوجین کے درمیان کسی بنا پر اختلاف رونما ہوجائے تو شریعت نے مرد کو صبر وتحمل سے کام لینے کا حکم دیا اور طلاق کے سلسلے میں جلد بازی سے منع کیا گیا، نافرمان بیوی کو راہِ راست پر لانے کے لئے یہ حکم دیا گیا کہ وہ پہلے افہام وتفہیم سے کام لے، وعظ ونصیحت کرے، نافرمانی کے نقصانات سے آگاہ کرے، اگر اس سے کام نہ چلے اور سرکشی سے باز نہ آئے تو ترک تعلق کرے، اپنا بستر اس سے الگ کرے اور اسے اس کی خواب گاہ میں تنہا چھوڑ دے، اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو تیسرے مرحلہ میں ہلکی پھلکی جسمانی سزا کی بھی اجازت دی گئی؛ کیوں کہ کچھ لوگ ایسے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں کہ وہ مار ہی کی زبان سمجھتے ہیں، زبانی فہمائش اور ترکِ تعلق کی سزا وہاں کارگر نہیں ہوتی، اگر ان تین تدبیروں سے بیوی کی اصلاح ہوجائے تو آگے حکم دیا گیا کہ انھیں تنگ کرنے کے لئے شوہر بہانے تلاش نہ کرے:

وَاللاَّتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِیْ الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. (النساء:۳۴)

لیکن اگر ان تدابیر سہ گانہ سے بھی باہم صلح صفائی نہ ہوسکے تو پھر چوتھے مرحلہ میں اہل خاندان کو بیچ میں پڑ کر مصالحت کرانے کا حکم دیا گیا، جیسا کہ ذکر کیا گیا، ارشاد باری ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِنْ يُّرِيْدَا إِصْلاَحاً يُّوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا. (النساء:۳۵)

اور اگر تم کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (کہ اس کو وہ باہم

(۱) صدق جدید لکھنؤ جلد۲۳، شمارہ:۸، ص:۲۔ (۲) مدی حریۃ الزوجین:۲/۱۰۰۶۔

نہ سلجھا سکیں گے) تو ایک منصف مردوالوں میں سے ایک منصف عورت کے خاندان سے بھیجو، اگر ان دونوں منصفوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ ان کے درمیان اتفاق پیدا کردے گا۔

کیا مار پیٹ کی سزا غیر اخلاقی ہے؟

مار کی جو اجازت شوہر کو دی گئی ہے اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سزا غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی ہے، اس سے عورت کی تذلیل و توہین ہوتی ہے، ایسے لوگوں کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ اسلام تمام انسانی طبقات کی رہنمائی کے لئے ہے، وہ جس طرح ترقی یافتہ ملکوں اور متمدن قوموں کے لئے آیا ہے، اسی طرح ناخواندہ، وحشی اور غیر متمدن اقوام کے لئے بھی آیا ہے، اس کے مخاطب جس طرح نرم دل، معتدل مزاج اور ترقی یافتہ لوگ ہیں، اسی طرح سخت دل، تند مزاج اور افریقہ کے صحراؤں میں رہنے والی وحشی اور تمدن نا آشنا قومیں بھی ہیں، انسانی معاشرہ خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے، پھر بھی اس میں ایسے غیر متمدن طبقات کا ہونا بھی لازمی ہے، کیا آج ان پڑھ، ناخواندہ، وحشی اور تہذیب و تمدن سے آشنا لوگ اس دنیا میں نہیں ہیں، یقیناً ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، تو ظاہر ہے کہ سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا، کچھ اُصول اور ضابطے وہ ہیں جو متمدن قوموں کے لئے ہیں؛ لیکن وحشی اور غیر متمدن قوموں میں وہ کارگر نہیں ہیں اور کچھ قوانین اور اُصول غیر متمدن اقوام کے لئے ہیں، ان کی ضرورت متمدن قوموں کو نہیں ہے، شریر اور نافرمان بیوی کی اصلاح کے لئے یہ اُصول سہ گانہ بیان کئے گئے ہیں، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ ہر شخص لازمی طور پر انھیں اپنائے؛ بلکہ اس کے برخلاف پیغمبر علیہ السلام شوہروں کو ہدایت دیتے ہیں کہ تم میں سے شریف لوگ ایسا نہیں کریں گے "لن یضرب خیارکم "یعنی بیوی کو نہیں ماریں گے، خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو کبھی نہیں مارا؛ بلکہ غلاموں اور باندیوں کو بھی نہیں مارا، جہاد کے علاوہ کہیں کسی پر آپ کا ہاتھ اُٹھانا ثابت نہیں ہے، اسی طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی بیوی کو مارنے کی سزا منقول نہیں ہے، اس لئے اس کا ناپسندیدہ ہونا خود ظاہر ہے، طلاق بھی ایک ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن بربنائے ضرورت اس کی اجازت دی گئی ہے، پھر یہ کہ اس مار کی تحدید و تعیین کردی گئی ہے، مثلاً رومال یا مسواک وغیرہ سے مارنا، ظاہر ہے کہ اس کا مقصد محض تنبیہ اور تادیب ہے، تذلیل و توہین اور ایذاء رسانی نہیں، پھر احادیث میں اس کے تفصیلی احکام بیان کئے گئے، ایک یہ کہ چہرہ پر نہ مارا جائے: "ولا تضرب الوجه "(۱) اور دوسرے یہ کہ مار "ضرب مبرح" نہ ہو، یعنی ایسی مار نہ ہو کہ جسم پر

(۱) سنن أبي داود: ۲۱۴۲، عن معاویة القشیری ؓ۔

نشانات اُبھر آئیں؛ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے جو خطبہ دیا اس میں مردوں کو خاص طور پر عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں اللہ سے ڈرنے کی تلقین فرمائی اور اگر مارنے کی ضرورت ہوتو ہدایت فرمائی کہ یہ ضرب مبرح نہ ہو: ''فاضربوھن ضرباً غیر مبرح ''(۱) اب اگر کوئی شوہر ظالمانہ طریقے پر بیوی کو زد و کوب کرے تو اس ظلم کی بنا پر عورت بذریعہ عدالت نکاح فسخ کرا سکتی ہے۔

طلاق کا مسنون اور مستحسن طریقہ

بہر حال اگر زوجین کا اختلاف کسی طرح ختم نہ ہو اور دونوں کے درمیان نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو آخری چارۂ کار کے طور پر طلاق کی اجازت دی گئی، اور اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ بتلایا گیا کہ وہ طہر کی حالت میں بیوی کو صرف ایک طلاق دے اور ایسے طہر میں جس میں اس نے بیوی سے جماع نہ کیا ہو اور عدت گذرنے تک انتظار کرے، دوسری طلاق نہ دے، عدت گذرتے ہی رشتہ نکاح بالکلیہ ختم ہو جائے گا اور بیوی بائنہ ہو جائیگی، اس کو طلاق احسن اس لئے کہا گیا کہ اس میں ندامت اور پشیمانی نہیں ہوگی، ایک طلاق کے بعد عدت کے دوران اسے غور وفکر کا پورا موقع ہے، اگر عورت کے رویے میں تبدیلی آجائے اور وہ طلاق کی تلخی اور شوہر کی جدائیگی کے اندیشے سے اپنی اصلاح کرلے اور مصلحت نظر آئے تو رجعت کرسکتا ہے اور عدت گذرنے کے بعد دونوں کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، اس کو طلاق احسن اس لئے کہا گیا کہ اس میں ندامت نہیں ہے، صحابہ کرام ﷺ اسی طریقہ کو پسند فرماتے تھے :

أجمع العلماء على أن المطلق للسنة في المدخول بها هو الذي يطلق امراته في طهر لم يمسها فيه طلقة واحدة . (۲)

تین طلاق اور اس کا حکم

طلاق کے بارے میں سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا: ''الطلاق مرتان ''(آیت: ۲۳۰) یعنی ایسی طلاق جس کے بعد شوہر کو رجعت کا حق باقی رہتا ہے وہ دو ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ یہ دو طلاقیں دو مرحلوں میں یعنی دو الگ الگ طہروں میں دی جائیں، اس کے بعد اگر شوہر نے تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے دی تو گرچہ یہ طلاق بھی سنت کے مطابق ہے؛ لیکن اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جائے گی اور بغیر حلالۂ شرعی کے زوجین ایک دوسرے کے لئے حلال نہ ہوسکیں گے اور حلالہ شرعی کا مطلب یہ ہے کہ تین طلاق کے بعد اس کی عدت گذر جائے اس کے بعد دوسرے مرد سے مطلقہ نکاح کرے اور یہ نکاح، نکاح صحیح ہو، یعنی رکھنے کے ارادے سے کرے، پھر دونوں میاں

(۱) مسلم: ۱۲۱۸، عن جابرؓ۔ (۲) بداية المجتهد لأبی الولید: ۵۲/۲۔

بیوی کی طرح ایک ساتھ رہیں، دوسرا شوہر اس سے جنسی تعلق قائم کرے، پھر کسی بنیاد پر دونوں میں تفریق یا طلاق ہو جائے یا دوسرے شوہر کی وفات ہو جائے تو عدت طلاق یا عدت وفات گذرنے کے بعد اس کا نکاح پہلے شوہر سے ہوسکتا ہے، تین طلاق کے بعد زوجین کے ایک دوسرے کے لئے حلال ہونے کے واسطے ان پانچ مذکورہ بالا شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

آگے ارشاد ہے :

فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّى تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا . (البقرۃ:۲۳۰)

یہ حکم تو سنت کے مطابق تین الگ الگ طہروں میں تین طلاق دینے کا حکم ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص سنت کے خلاف ایک مجلس میں یا ایک جملے ایک ساتھ تینوں طلاق دیدے تو ائمہ اربعہ، جمہور فقہاء اور اکثر علماء سلف اور خلف کے نزدیک اس سے بھی تین طلاق پڑ جائے گی، باوجو یکہ یہ طریقہ حرام ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر سخت برہمی کا اظہار فرمایا اور اسے اللہ کی کتاب کے ساتھ کھلواڑ کرنا قرار دیا؛ لیکن آپ ﷺ نے ایسی طلاقوں کو نافذ فرمایا ہے، عہد رسالت کے متعدد واقعے، صحابہ و تابعین اور خلفائے راشدین کے فیصلے اس پر شاہد ہیں اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانہ میں اس پر اجماع صحابہ ہو چکا ہے، اس کے خلاف طاؤس، ظاہریہ اور شیعہ حضرات کے بعض فرقوں کا قول شاذ ہے جس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا اور علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی قاضی اور حکم ایک مجلس کی تین طلاق کے ایک ہونے کا فیصلہ کرے تو یہ فیصلہ نافذ نہ ہوگا۔(۱)

کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ شریعت نے طلاق تک رسائی کے لئے جو حدود متعین کئے ہیں وہ اپنی جگہ بہت معقول ہیں اور ان پر عمل کرنے سے مشکلات اور مسائل کھڑے نہ ہوں؛ لیکن جو لوگ ان تمام حدود اور شرعی ہدایات کو نظر انداز کر کے اور اشتعال میں آکر ایک ساتھ تین طلاق دیدیں اور بیوی بچوں کو بھی پریشانی میں ڈالیں ان کے لئے شریعت نے کیا سزا مقرر کی ہے تو غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے لوگوں کے لئے یہ سزا کم نہیں ہے، انھیں شریعت نے بیوی کی نعمت سے محروم کر دیا اور ایسی جدائی ڈال دی کہ وہ بیوی اب کسی دوسرے مرد کا منھ دیکھے بغیر اور اس کی فراش بنے بغیر اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی اور یہ سوال کہ اس میں بیوی بچوں کا کیا قصور کہ انھیں سزا دی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب شوہر نے بیوی کے ساتھ غداری اور بے وفائی کی تو پھر اس کی غیرت کا بھی تقاضا ہے وہ ایسے ناقدرے اور ظالم شوہر سے بے تعلقی کا اظہار کرے اور شریعت کے حکم کے خلاف اس سے چمٹی نہ رہے؛ بلکہ عدت گذار کر اپنی زندگی کا دوسرا ساتھی تلاش کرلے جو وفادار بن کر اسے عزت و احترام کے ساتھ رکھے۔

(۱) فتح القدیر: ۱۴۹/۲۔

عورت کے لئے ناموافق شوہر سے رہائی حاصل کرنے کی صورت

یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے براہِ راست طلاق کا حق عورت کو نہیں دیا اور اس میں دونوں کی مصلحت ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں عورت کے لئے علاحدگی کا دروازہ بالکل بند ہے؛ بلکہ وہ بوقت ضرورت اپنے ناموافق اور ظالم شوہر سے چھٹکارا حاصل کرسکتی ہے، اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ بیوی بوقت نکاح ہی یہ شرط رکھے کہ فلاں فلاں ضرورت کے وقت اسے شوہر کی طرف سے اپنے اوپر طلاق واقع کرنے کا اختیار رہوگا تو اسے شرط کے مطابق یہ حق حاصل ہوجائے گا اور بوقت عقد ایسی کوئی شرط نہیں تھی تو وہ اپنے شوہر سے خلع کراسکتی ہے، مثلاً وہ شوہر کے حق میں اپنے مہر سے دستبردار ہوجائے اور اگر وہ مہر ادا کرچکا ہے تو اسے واپس کردے اور اگر شوہر اس کے لئے رضامند نہیں تو عدالت میں درخواست دے کر قاضی سے نکاح فسخ کراسکتی ہے، شوہر کے غائب یا مفقود الخبر ہونے کی صورت میں یا اس کے جیل میں زیادہ عرصہ کے لئے قید ہونے کی صورت میں، یا حقوق زوجیت سے محروم ہونے کی صورت میں یا اس کے بے جا ظلم وستم کا نشانہ بننے کی صورت میں نکاح فسخ کراسکتی ہے، امام مالکؒ نے صراحت فرمائی ہے کہ بیوی کو خلع کا حق مرد کے حق طلاق کے مقابلہ میں ہے، جس طرح شوہر محض نفرت کی بنا پر بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح بیوی محض نفرت کی بنیاد پر خلع کراسکتی ہے :

> والفقه أن الفداء إنما جعل للمرأة في مقابلة ما بيد الرجل من الطلاق ، فإنه لما جعل الطلاق بيد الرجل إذا فرك المرأة جعل الخلع بيد المرأة إذا فركت الرجل . (۱)

اور حدیث سے اسی اسی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے، خلع کے سلسلے میں سب سے پہلا اور مشہور واقعہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی جمیلہ بنت ابی بن سلول کا ہے، ثابت کالے کلوٹے، پست قامت اور بدصورت تھے اور یہ ان کے مقابلہ میں اسم بامسمی حسن وجمال کا پیکر تھیں، اس لئے انھیں شوہر سے نفرت ہوگئی اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں دینی اور اخلاقی لحاظ سے ثابت میں کوئی عیب نہیں پاتی؛ لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں، یعنی اگر طبعی نفرت کی بنا پر ان کے ساتھ رہوں تو خطرہ یہ ہے کہ شرعی حدود پر قائم نہیں رہ سکوں گی اور ان کے ازدواجی حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ٹھہروں گی، رسول اللہ ﷺ نے ان کا عذر قبول فرما کر اور شوہر کا مہر واپس فرما کر شوہر سے انھیں طلاق دلوادی، معلوم ہوا کہ محض نفرت کی بنا پر بھی خلع ہوسکتی ہے۔ (۲)

⊙ ⊙ ⊙

---

(۱) بداية المجتهد: ۶۸/۲، الباب الثالث فی الخلع۔ (۲) بخاری جلد دوم، باب الخلع۔

تعددِ ازواج پر اعتراضات کا حقیقت پسندانہ جائزہ

مولانا سید احمد ومیض ندوی⊙

اسلام دین فطرت

اسلام دین فطرت ہے، جس کی ساری تعلیمات اور قوانین انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہیں، اس لئے کہ یہ خالق فطرت کا دین ہے، اس نے اپنے بنائے ہوئے دستورِ حیات میں فطرتِ انسانی کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے، اسلامی احکام انسانی زندگی کے کسی بھی شعبہ سے کیوں نہ متعلق ہوں فطرت کے عین مطابق ہیں، عبادات واخلاقیات اور معاملات ومعاشیات کی طرح معاشرتی اور عائلی زندگی سے متعلق قوانین بھی انسانی فطرت کوملحوظ رکھ کر بنائے گئے ہیں؛ لیکن جب انسان کی فطرت مسخ ہوجاتی ہے اور ربانی ہدایت سے محروم ہوکر دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے لگتا ہے، تو پھر اس کو فطرت انسانی پر مبنی روشن تعلیمات وقوانین میں بھی کیڑے نظر آنے لگتے ہیں اور انتہائی معقول اور سادے احکام کو نامعقول اور انسانیت کے لئے ظلم سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام کے خلاف مغرب کی سازش

مغربی تہذیب اور اس کا طریقۂ زندگی فطرت سے دور ہے، وہ ایک غیر انسانی اور غیر فطری تہذیب ہے، اس کی غیر معمولی مادی ترقی نے سارے انسانوں پر اپنا سکہ جمادیا ہے، آج پوری دنیا میں اس تہذیب کو سکہ رائج الوقت سمجھا جاتا ہے، اس کے انتہائی نامعقول ہونے کے باوجود لوگ مرعوبیت کے نتیجہ میں اس کے گن گاتے ہیں، مشرقی ممالک جو پہلے سے مذاہب کا گہوارہ رہ چکے ہیں اور جن کی اپنی مستقل تہذیب ہے، مغرب سے متاثر ہوگئے؛ چنانچہ یہاں بھی ایسے لوگ کثرت سے پائے جانے لگے جنھوں نے شدت کے ساتھ مغربی تہذیب کی برتری کا نعرہ لگایا اور اس کے لئے خطرہ بننے والے مذاہب کا سختی سے مقابلہ کیا، جن میں سرفہرست اسلام تھا، اسلام چوں کہ

⊙ استاذ حدیث: دارالعلوم حیدرآباد۔

عبادات کے علاوہ اپنا مستقل دستورِ حیات اور مستقل تہذیب رکھتا ہے، اس لئے وہ مغرب کے لئے سب سے بڑا چیلنج تھا؛ چنانچہ مغرب نے اسلام کے قوانین و تعلیمات کو غیر معقول اور انسانیت مخالف قرار دینے کے لئے زبردست پروپیگنڈہ کیا، اس کے لئے مستشرقین کی ایک جماعت تیار کی گئی جن کا کام ہی یہ تھا کہ اسلامی شریعت کا مطالعہ کر کے اپنی کج فہمی سے اس میں کیڑے نکالیں اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے بدگمان کریں، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اسلام میں عورت کی مظلومی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا اور باور کرایا گیا کہ اسلام عورت پر ظلم کرتا ہے، اس کی معاشرتی اور عائلی تعلیمات عورت کو ہر طرح کے حقوق سے محروم رکھتی ہیں، اسلام کی ظالمانہ تعلیمات میں ایک تعددِ ازدواج کا قانون ہے، جس کو وہ روا سمجھتا ہے، جس میں عورت پر صریح ظلم ہوتا ہے، تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں مغرب نے حقائق سے کم اور پروپیگنڈہ سے زیادہ کام لیا ہے۔

تعددِ ازدواج کیا ہے؟

مطلوبہ شرائط کے ساتھ ایک سے زائد چار بیویوں کو نکاح میں رکھنا تعددِ ازدواج کہلاتا ہے، تعددِ ازدواج کی گنجائش چوں کہ قرآن کریم کی سورۂ نساء میں مذکور ہے، اس لئے اس کو بنیاد بنا کر اہل مغرب نے قرآن کو ہدف تنقید بنایا، ہندوستان جیسے ملک میں یہ مسئلہ اپنے اندر انتہائی نزاکت اور حساسیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس کا تعلق براہِ راست مسلم پرسنل لاء سے ہے، یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد اس مسئلہ کو مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے ایک حصہ کے طور پر بار بار اُٹھایا جاتا رہا ہے۔

تعددِ ازدواج کی معقولیت کے سلسلہ میں ہمارے علماء اور مفکرین نے اطمینان بخش مواد فراہم کر دیا ہے اور اس پر کئے جانے والے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، دشمنانِ اسلام نے اس مسئلہ میں زیادہ تر پروپیگنڈہ کا سہارا لیا ہے، گو کہ اس بارے میں ہمیں دفاعی انداز اختیار کرنے کی چنداں ضرورت نہیں؛ تاہم پروپیگنڈہ کو سمجھنے کے لئے چند حقائق پر توجہ دینی ضروری ہے۔

تعددِ ازدواج دیگر مذاہب میں

عام طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تعددِ ازدواج صرف اسلام میں ہے اور دیگر مذہب اور اقوام میں اس کا کوئی تصور نہیں، جب کہ یہ بات خلافِ واقعہ ہے، تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں دیگر مذاہب بھی برابر کے شریک ہیں، قدیم تمام مذاہب و اقوام میں تعددِ ازدواج کا نظام ملتا ہے، اسی طرح قدیم متمدن و غیر متمدن اقوام میں بھی تعددِ ازدواج کا رواج تھا؛ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

> ایک دستور کی حیثیت سے تعددِ ازواج دنیا کے تمام علاقوں میں پایا جاتا ہے، قدیم قبائل میں ایسے قبائل بہت کم ہیں، جن کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان میں مرد کو استطاعت ہوتے ہوئے ایک سے زائد رشتۂ ازواج کی اجازت نہیں دی گئی، تعددِ ازواج یا داشتہ عورتیں رکھنے کی رسم جسے اصل تعددِ ازواج سے بہ مشکل ہی ممتاز سمجھا جاتا ہے، قدیم تہذیب کے اکثر لوگوں میں پائی گئی ہے، چین میں قانونی خاص بیوی کے علاوہ کچھ اور عورتیں بھی بیویاں کہلائی جاتی تھیں، جو خوش اخلاقی کے تحت رکھ لی جاتی تھیں یا قانونی داشتائیں ہوتی تھیں، جاپان میں چینی ٹائپ کی داشتہ عورتیں رکھنے کا رواج ایک قانونی نظام کی حیثیت سے ۱۸۸۰ھ تک موجود تھا۔(۱)

یہ تو قدیم تہذیبوں کا حال تھا، جدید تہذب کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

> تعددِ ازواج مسیحی یورپ میں بھی پایا گیا ہے، ان ملکوں میں جہاں بت پرستی کے دور میں تعددِ ازواج کا رواج تھا، مسیحی فرمانرواؤں کی طرف سے تعددِ ازواج کی راہ میں موانع حائل کئے گئے، چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں آرلینڈ کے فرمانروا ڈائرمیٹ کی دو ملکہ اور دو داشتائیں تھیں، شارلمین کی دو بیویاں اور دو داشتائیں تھیں اور اس کے ایک قانون سے معلوم ہوتا ہے کہ تعددِ ازواج کا رواج پادریوں میں بھی بھی غیر معروف نہ تھا، بعد کے زمانوں میں حسا کے فلپ اور پروشیا کے فریڈرک ولیم دوم نے لوتھر کو ماننے والے پادریوں کی اجازت سے ایک سے زائد شادیاں کیں۔(۲)

آسمانی مذاہب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہودیت وعیسائیت میں بھی تعددِ ازواج ممنوع نہ تھا،توریت سے تعددِ ازواج کا جواز ملتا ہے، جس کے خلاف انجیل نے کوئی آواز نہیں اُٹھائی، آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک یعنی شارکمانی شاہ فرانس کے زمانے تک مسیحی یورپ میں تعددِ ازواج کی باقاعدہ رسم تھی اور کلیسا اس کی مخالفت نہیں کرتا تھا؛ لیکن اس بادشاہ کے زمانے میں کلیسا کے حکم سے پورے یورپ کے اندر یہ مسئلہ منسوخ قرار دیا گیا، اسی طرح پچھلے انبیاءِ کرام میں بھی جن کو یہود ونصاریٰ بھی مانتے ہیں، تعددِ ازواج کا سلسلہ جاری تھا؛ چنانچہ مشہور سیرت نگار

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا:۱۸۶/۴۔

(۲) انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا:۱۸۶/۱۸، بہ حوالہ تعددِ ازواج۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ نے تورات، انجیل وزبور اور دیگر قدیم تاریخی آخذ کے حوالہ سے اس کی تفصیل درج کی ہے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی چار بیویاں تھیں، اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی نو بیویاں تھیں۔(۱)

آسمانی مذاہب اور حضرات انبیاء کے علاوہ ہندوستان کی قدیم مذہبی شخصیتوں اور اوتاروں میں بھی تعدد ازواج تھا؛ چنانچہ سری رام جی کے والد مہاراجہ دسرت کی تین بیویاں تھیں، سری کرشن کی جو اوتاروں میں سولہ کلاں سپوت تھے، سینکڑوں بیویاں تھیں، جس کی صداقت میں قاضی سلیمان صاحب نے لالہ لاجپت رائے آنجہانی کی کتاب کرشن جی کا حوالہ دیا ہے، جس میں انھوں نے کرشن جی کی ۱۸ رانیاں تسلیم کی ہیں۔(۲)

ان حقائق کو سامنے رکھ کر جائزہ لیجئے کہ تعددِ ازواج کے مسئلہ میں کس قدر پروپیگنڈہ سے کام لیا گیا ہے، آج بھی عملاً غیر مسلموں میں کثرت سے تعددِ ازواج کا رواج ہے، ۱۹۷۵ء میں ایک کمیٹی نے اسلام میں عورتوں کے مقام کا جائزہ لینے کے بعد ایک رپورٹ شائع کی، جس کے صفحہ ۶۶ پر لکھا ہے کہ ۱۹۵۱ء-۱۹۶۱ء میں ہندوؤں میں کثرت ازواج کی شرح مسلمانوں سے زیادہ تھی، لوگوں کا عمومی ذہن بھی یہی ہے کہ تعددِ ازواج کا صرف اسلام ہی قائل ہے، دیگر مذاہب یا اقوام اور تہذیبوں میں اس کا چلن نہیں ہے، اس حقیقت کے عیاں ہونے کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسلام کو مطعون کرے۔

اسلام میں تعددِ ازواج کی حقیقت

تعددِ ازواج کے سلسلہ میں دوسرا پروپیگنڈہ یہ کیا گیا کہ تعددِ ازواج اسلام میں واجب اور ضروری ہے، جس طرح نماز روزہ اور دیگر دیگر ارکان ضروری ہیں، اسی طرح تعددِ ازواج بھی فرض ہے اور اس کا ہوا اس لئے کھڑا کیا گیا؛ تاکہ لوگوں کو یہ باور کرایا جاسکے کہ اسلام ایک شہوت پرست جنسی مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو ہر طرح کی عیاشی اور شہوت رانی کی نہ صرف اجازت دیتا ہے؛ بلکہ ضروری قرار دیتا ہے، جب کہ اسلام میں تعددِ ازواج کا مسئلہ ایک ناگزیر صورتِ حال کے تدارک کے طور پر ہے، نہ ہر شخص پر واجب ہے نہ ہی تعددِ ازواج کے معاملہ میں مرد اپنی مرضی کا مختار ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص معاشی لحاظ سے ایک سے زائد بیویوں کے نفقہ کی صلاحیت رکھتا ہو اور عدل وانصاف کی بھی قدرت ہو تب بھی اس کے لئے ایک سے زائد بیوی رکھنا واجب اور فرض نہیں ہے؛ بلکہ شرائط کی عدم تکمیل کی صورت میں قرآن ہی وہ واحد مذہبی کتاب قرار دی جاسکتی ہے جس میں یہ کہا گیا کہ ایک ہی شادی کرو، دوسری کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جہاں مردوں سے کہا گیا ہو کہ ایک بیوی رکھو، وید ہو کہ رامائن، گیتا ہو کہ بائبل،

(۱) رحمۃ للعالمین: ۲/ ۱۴۸۔ (۲) رحمۃ للعالمین: ۲/ ۱۴۷۔

ان کتابوں کے مطابق ایک شخص بے شمار شادیاں کرسکتا ہے، بعد میں ہندو اور عیسائی رہنماؤں نے عورتوں کی تعداد کو ایک پر محدود کیا، قرآن مجید کی جس آیت سے تعددِ ازواج کی اجازت ملتی ہے وہ سورہ نساء کی آیت: ''وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامٰى فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً'' (النساء:۳) ہے، اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر دوسرے واقعہ کے ساتھ یہ بات بھی ذکر کی جاتی ہے کہ یہ آیت غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوئی، غزوۂ احد میں ۷۰ مسلمان شہید ہوگئے تھے، جس کی وجہ سے اچانک مدینہ کے ۷۰ گھر مردوں سے خالی ہوگئے تھے، نتیجتاً یہ صورتِ حال پیدا ہوئی کہ بہت سے بچے یتیم اور بہت سی عورتیں بیوہ ہوگئیں، اس نو پیدا شدہ معاشرتی مسئلہ کے حل کے طور پر یہ حکم نازل کیا گیا کہ جو مرد ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرسکتے ہوں وہ بیوہ عورتوں سے نکاح کر کے یتیم بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیں، گو کہ آیت کا نزول خاص صورتِ حال کے پس منظر میں ہوا؛ لیکن حکم عام ہے، اس لئے کہ ایسی صورتِ حال عموماً پیش آتی رہے گی، جس میں مردوں کی تعداد عورتوں کی بہ نسبت کم ہوجاتی ہے، مختصر یہ کہ تعددِ ازواج اسلام کا کوئی فرض یا واجب کے درجہ کا حکم نہیں ہے، جس پر عمل کرنا سب کے لئے ضروری ہو، جیسا کہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔

تعددِ ازواج کے شرائط

اول تو تعددِ ازواج فرض یا واجب نہیں قرار دیا گیا، صرف اس کی گنجائش رکھی گئی، اس گنجائش کے لئے بھی مرد کو چند شرائط کا پابند بنایا، اگر وہ شرائط نہ پائی جائیں تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا، مثلاً یہ کہ ایک سے زائد عورت سے نکاح اسی وقت جائز ہوگا جب کہ تمام بیویوں کے درمیان پوری طرح انصاف کرسکتا ہو، ایک سے زائد بیویوں کے درمیان انصاف کے جو نازک احکام شریعت نے رکھے ہیں ان کی روشنی میں ذرہ برابر شوہر کے ظلم کا خدشہ نہیں رہتا، اسی طرح تعددِ ازواج پر عمل کے لئے معاشرہ میں عورتوں کی تعداد کا مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہونا ضروری ہے، اگر عورتوں کی تعداد کم یا مردوں کے برابر ہو تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کو ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا پڑے گا، علاوہ ازیں ایک سے زائد شادی کا معاملہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر نہیں ہے؛ بلکہ وہ جس دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے اس کا راضی ہونا بھی ضروری ہے، غیروں کی طرف سے جب اسلام کے تعددِ ازواج کے مسئلہ پر بات ہوتی ہے تو عموماً ان تمام شرائط کو نظر انداز کر کے اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام بس کسی بھی شکل سے شہوت کی تکمیل کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا اسلام سے قبل لوگ اپنے پاس لاتعداد بیویاں رکھا کرتے تھے، کثرتِ ازواج کی کوئی حد نہ تھی، بہت سے دیگر مذاہب میں بھی تعدد کی کوئی حد نہ تھی، اسلام نے تعددِ ازواج کے سلسلہ میں حد مقرر کردی کہ

ایک شخص مطلوبہ شرائط کے ساتھ بیک وقت صرف چار بیویاں ہی رکھ سکتا ہے، اس طرح اسلام نے ایک ضرورت والے معاملہ کو ضرورت کی حد تک محدود کر دیا، اسلام کے قانون تعدد کے سلسلہ میں ان حقائق کو سامنے نہ رکھا جائے تو آدمی بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہوتا جاتا ہے۔

تعددِ ازواج کی ناگزیر وجوہات

مذکورہ بالا حقائق کے ساتھ اس حقیقت کا بھی انکار ممکن نہیں کہ انسانی معاشرہ کے لئے تعددِ ازواج ایک ناگزیر ضرورت ہے؛ چوں کہ مختلف اسباب کی وجہ سے مردوں کی تعداد عورتوں سے کم ہوتی ہے، اگر یک زوجگی کا لزوم ہوجائے تو پھر عورتوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے شوہر سے محرومی کے نتیجہ میں معاشرتی زندگی وبالِ جان بن جائے گی، مردوں کی تعداد کی کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثلاً جنگوں میں لاکھوں کی تعداد میں صرف مرد مارے جاتے ہیں، پہلی عالمی جنگ میں آٹھ ملین فوجی مارے گئے، دوسری عالمی جنگ میں ساڑھے چھ کروڑ آدمی ہلاک یا جسمانی طور پر ناکارہ ہوگئے، جن میں زیادہ تر مرد ہی تھے، اسی طرح قید و بند اور جیل کی وجہ سے بھی معاشرہ میں مردوں کی تعداد کم ہوجاتی ہے، اکثر و بیشتر جرائم وغیرہ کی پاداش میں مرد ہی جیل کی سزا کاٹتے ہیں، پھر یہ کہ جدید صنعتی نظام نے حادثات کی شرح میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے، حادثات کی موت اب روز کا معمول بن گئی ہے، سڑک حادثے، ہوائی حادثے، کارخانوں اور مشینوں کے حادثے دنیا کے ہر خطہ میں ہوتے رہتے ہیں، جن میں عموماً مرد ہی شکار ہوتے ہیں، نیز پیدائش کے بعد کم سنی میں لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکے زیادہ انتقال کرجاتے ہیں، ایک بچی میں بچہ کے مقابلہ جراثیم اور بیماریوں سے لڑنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے، اسی وجہ سے چھوٹے بچوں کی شرح اموات چھوٹی بچیوں کے مقابلہ زیادہ ہوتی ہے، ہندوستان اور اس کے پڑوسی ممالک میں مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ اس لئے ہے کہ یہاں اسقاطِ حمل کثرت سے ہوتا ہے، رحم مادر ہی میں بچہ کی شناخت کرکے لڑکی ہونے کی صورت میں اسقاطِ حمل کردیا جاتا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ہر سال دس لاکھ سے زائد بچیوں کی شناخت کر کے اسقاط کردیا جاتا ہے، مغربی ملکوں کے اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی شرح زیادہ ہے، امریکہ میں اٹھتر لاکھ عورتیں مردوں سے زائد ہیں، صرف نیویارک شہر میں دس لاکھ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں، پورے امریکہ میں دو کروڑ پچاس لاکھ مرد لواطت کی لعنت میں مبتلا ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ کسی صورت سے عورتوں سے شادی نہیں کریں گے، برطانیہ میں مردوں کے مقابلہ چالیس لاکھ عورتیں زائد ہیں، جرمنی میں مردوں کے بہ نسبت پچاس لاکھ عورتیں زائد ہیں، روس میں مردوں کے مقابلہ میں ۹۰ لاکھ عورتیں زائد ہیں، اس طرح مردوں

اور عورتوں میں نابرابری ہمیشہ سے دنیا کا ایک مستقل مسئلہ رہی ہے، ہر زمانہ میں مردوں کی تعداد مذکورہ بالا وجوہات کی بناپر عورتوں سے کم رہی ہے، سوال یہ ہے کہ جو عورتیں بڑی تعداد میں بیوہ ہو جائیں یا جنھیں مردوں کی کمی کی وجہ سے سرے سے شوہر نہ مل پائے وہ ایک باعزت معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے کیا کریں؟ اگر یک زوجگی کے قانون کو لازم کردیا جائے تو ظاہر ہے کہ عورتوں کی ایک بڑی تعداد شوہروں سے محروم رہے گی، اس صورت میں پورے امریکہ میں تین کروڑ عورتوں کے لئے شوہر دستیاب نہیں ہوں گے؛ چوں کہ امریکہ میں دو سے پانچ کروڑ لوگ لواطت کا شکار ہیں، اسی طرح برطانیہ میں چالیس لاکھ، جرمنی میں پچاس لکھ اور روس میں نوے لاکھ عورتیں ایسی ہوں گی جنھیں شوہر نہیں مل پائیں گے، اب مسئلہ کے حل کے لئے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو تعددِ ازواج کو ممنوع قرار دے کر ان عورتوں کو بے کسی وعصمت فروشی کی زندگی پر مجبور کرتے ہوئے انھیں مختلف مردوں کی غیر منکوحہ وغیر قانونی داشتائیں قرار دیا جائے یا پھر تعددِ ازواج کی اجازت دے کر کسی ایک مرد کے نکاح میں باعزت زندگی گذارنے کا موقع دیا جائے، جن قوموں اور ملکوں نے تعددِ ازواج کے اُصول کو ناپسند کیا اور اسے عورتوں کے لئے ظلم قرار دے کر ممنوع قرار دیا وہاں اس سے خطرناک صورتِ حال پیدا ہوئی، یعنی ان عورتوں کو غیر قانونی طور پر استعمال کیا جانے لگا، زنا کاری عام ہوگئی، جس تعدد سے اس لئے فرار اختیار کیا گیا تھا کہ یہ عورت کے لئے ظلم ہے اس نے عورتوں کو ذلت کے انتہائی گہرے گڈھوں میں ڈھکیل دیا، لوگ ان کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کا ناجائز استحصال کرنے لگے، مثلاً دوسری عالمی جنگ میں بڑی تعداد میں مرد مارے گئے تو مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی بے شوہر عورتوں کے گھروں کے سامنے اس قسم کے بورڈ لکھے ہوئے نظر آنے لگے کہ رات گذارنے کے لئے ایک مہمان چاہئے۔(۱)

اخلاقی انارکی اور معاشرتی آوارگی کا ایک طوفان کھڑا ہوگیا، جس نے پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، پھر ان داشتاؤں اور محروم القسمت عورتوں کو مرد اپنی ہوس رانی کا شکار بنا کر کنارہ کش ہوگئے، انھیں گردشِ زمانہ کے حوالہ کردیا، ہر طرح کی ذلت اُٹھانے کے باوجود انھیں نہ رہنے کے لئے گھر مل سکا، نہ ان کے نان ونفقہ کا مسئلہ حل ہوسکا، حیرت کی بات ہے کہ دورِ جدید کی تہذیب کو عورت کا کسی شوہر کے پاس رہ کر باعزت زندگی گزارنا تو ظلم معلوم ہوتا ہے؛ لیکن قانونِ نکاح سے محروم رہ کر اس کا جسم فروشی پر مجبور ہونا اور دَر دَر کی ٹھوکریں کھانا ظلم نہیں معلوم ہوتا، بقول ایک مفکر:

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ تعددِ ازواج کو اختیار کیا جائے یا نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کی

(۱) تعددِ ازواج:۹، از: مولانا وحید الدین خان۔

غیر متناسب تعداد کو کھپانے کے لئے قانونِ تعددِ ازدواج کا طریقہ اختیار کیا جائے یا غیر قانونی تعددِ ازدواج کا، اسلام میں تعددِ ازدواج کا مسئلہ دراصل عورت کو اس بھیانک انجام سے بچانے کے لئے ہے، جس سے وہ تعدد کے نہ ہونے کی صورت میں دوچار ہوتی ہے، سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو تعددِ ازدواج کا حکم مردوں کی موافقت میں معلوم ہوتا ہے؛ لیکن عورتوں کی تعداد کے پس منظر میں سماج کی عملی صورتِ حال کو دیکھا جائے تو یہ مسئلہ خود عورتوں کی موافقت میں معلوم ہوتا ہے، عموماً اسلام کی شبیہ بگاڑنے کے لئے تعددِ ازدواج کے مسئلہ کو جنسی خواہش کی تکمیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ اسلام میں تعدد دراصل مسئلہ کے حل کرنے کی عملی تدبیر ہے۔

تعددِ ازواج عورت کے لئے ظلم نہیں

تعددِ ازدواج کی قرآنی گنجائش کے بارے میں سب سے طاقتور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے پہلی بیوی پر ظلم ہوتا ہے؛ حالاں کہ طبقۂ نسواں پر ظلم تعدد کے امتناع میں ہے، اس لئے کہ عورتوں کے لئے سوکنوں کا برداشت کرنا تکلیف دہ ہے تو مرد کی متعدد محبوباؤں اور داشتاؤں کو برداشت کرنا اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے، پہلی بیوی پر ظلم کا سوال اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ اسلام تعدد کی اجازت اسی وقت دیتا ہے جب کہ وہ پائی پائی میں عدل کرنے پر قادر ہو، اگر بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرسکتا ہو تو اس کے لئے ایک سے زائد شادیوں کی اجازت ہی نہیں، بیویوں کے درمیان میں عدل وانصاف قائم رکھنے کے سلسلہ میں اسلام نے جو ہدایات دی ہیں، وہ انتہائی نازک ہیں، پھر سوال یہ ہے کہ کیا ایک بیوی کی صورت میں اس بات کی یقینی ضمانت دی جاسکتی ہے کہ شوہر اس پر ظلم نہیں کرے گا؟ اگر ایک سے زائد بیویوں کا ہونا ہی ظلم کی اصل وجہ ہے تو جن مردوں کے پاس صرف ایک ہی بیوی ہے وہاں ظلم نہیں ہونا چاہئے، جب کہ ہم آئے دن ایک بیوی رکھنے والے شوہروں کے ظلم کے واقعات سنتے رہتے ہیں، ظلم کی بات جیسے ایک سے زائد میں ہے، اسی طرح ایک بیوی کی صورت میں بھی ہے، یہ تو شوہر کی اخلاقی اور دینی حالت کا معاملہ ہے کہ اگر وہ دین دار، خوف خدا کا حامل شخص ہوگا تو وہ جیسے ایک بیوی پر ظلم نہیں کرتا تھا اسی طرح ایک سے زائد بیویوں پر ظلم نہیں کرے گا، علاوہ ازیں ایک سے زائد بیویوں کی صورت میں ظلم کا جو ہوا کھڑا کیا جاتا ہے وہ کسی باقاعدہ سروے کی بنیاد پر نہیں ہے؛ بلکہ محض پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، پھر یہ کہ جو گنجائش معاشرہ کے ایک اہم ناگزیر مسئلہ کے حل کے طور پر اپنائی گئی ہے، کیا اسے محض اس لئے ختم کردیا جائے کہ لوگ اس سلسلہ میں اپنی اخلاقی ذمہ داریاں نبھا نہیں پارہے ہیں؟ تعددِ ازدواج پر امتناع عائد کردیا جائے اور بیوہ اور شوہروں سے محروم عورتوں کو قحبہ گری

پر مجبور کر دیا جائے؟ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی یوں کہنے لگے کہ چوں کہ مرد بیویوں پر ظلم کر رہے ہیں، اس لئے نکاح ہی پر پابندی لگا دی جائے، جیسے یہ بات نامعقول ہے اسی طرح ظلم کی بنا کر پر تعدد پر روک لگانے کا مشورہ بھی نامعقول ہے، ظلم تو ایک بیوی پر بھی ہو رہا ہے، پھر یہ کہ ظلم کا دائرہ نکاح ہی تک محدود نہیں، آج ہر جگہ ظلم عام ہے، ریاستی اداروں میں ظلم، آفسوں میں ظلم، مختلف اقوام کے طرز زندگی میں ظلم ہے، مثلاً ذات پات کی تفریق میں ظلم، ستی کی رسم ظلم ہے، نکاح بیوگان کی ممانعت ظلم ہے، سودی لین دین، رشوت سب ظلم ہے، تو کیا ان سارے اداروں کو ختم کر دیا جائے گا؟ آج ظلم دنیا میں کہاں نہیں ہو رہا ہے، ہر شعبہ میں ظلم ہی ظلم ہے، تو کیا ان سارے شعبوں کو نیست و نابود کر دیا جائے گا؟ یا پھر انسانوں کی اخلاقی گراوٹ کو ختم کرنے کے لئے کچھ اصلاحی کوشش کی جائیں گی، اگر کچھ افراد ایک سے زائد بیویوں کی صورت میں ظلم کرتے ہوں تو کیا ان کی وجہ سے تعدد ازدواج ہی پر امتناع عائد کیا جائے گا؟ جہاں تک تعلقات کے بندھنوں میں ظلم وستم کی بات ہے تو یہ صرف میاں بیوی کے تعلقات ہی میں نہیں؛ بلکہ اولاد اور والدین کے تعلقات میں بھی ظلم کی شکلیں ہیں، اسی طرح مختلف قرابتی تعلقات میں بھی ظلم عام ہے، اس طرح ظلم کو بنیاد بنایا جائے تو سارے تعلقات ختم کرنے پڑیں گے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایک سے زائد بیویوں کی صورت میں سب سے یکساں محبت عملاً ناممکن ہے، اس لئے تعددِ ازدواج کی اجازت دے کر بیویوں کے درمیان انصاف کا مطالبہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ تعددِ ازدواج ہی پر امتناع لگایا جائے، بظاہر یہ بات بڑی وزن دار معلوم ہوتی ہے؛ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو یہ بھی ایک پروپیگنڈہ ہی ہے، یہ صحیح ہے کہ مختلف بیویوں سے یکساں محبت ممکن نہیں، آدمی کی طبیعت اور میلان کا کسی ایک کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے؛ لیکن قلبی محبت میں تفاوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق کی ادائیگی میں زیادتی یا ناانصافی سے کام لے، بہت ممکن ہے کہ ایک شخص سب سے برابر محبت نہ کرے؛ لیکن اگر وہ اخلاق اور دینی اعتبار سے حساس ہو تو حقوق میں ضرور سب سے برابری کا سلوک کرے گا، یہ معاملہ صرف شوہر اور بیویوں کا ہی نہیں ہے؛ بلکہ آدمی کو اپنے والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے محبت میں بھی تفاوت ہوتا ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ والدین کے حقوق میں کوتاہی کرے یا دوسرے پر ظلم کرے، باپ کو اپنی ساری اولاد سے یکساں محبت نہیں ہوتی؛ لیکن اس تفاوت کی وجہ سے حقوق میں تفریق نہیں کی جاتی۔

واقعہ یہ ہے کہ جو حضرات عورت کے مظلومی کی دہائی دے کر تعددِ ازدواج کی ممانعت کی بات کرتے ہیں، وہ اپنی ایک بیوی کا محدود اور سطحی مفاد مدنظر رکھتے ہیں، جب کہ تعددِ ازدواج کے قانون میں سارے طبقۂ نسواں کی بھلائی ہے، جس کے ذریعہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں خواتین جسم فروشی اور بے کسی کی زندگی سے محفوظ ہوتی ہیں

اور کسی کی حریم میں آ کر باعزت زندگی گزار سکتی ہیں، آج پوری دنیا میں مختلف اسباب کی وجہ سے بے شمار خواتین شوہروں سے محرومی کے نتیجہ میں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، پھر یہ کہ جو لوگ پہلی بیوی کی راحت اور سکون کا خیال کرتے ہوئے تعدد کو مناسب نہیں سمجھتے، حالات آنے پر اسے طلاق دینے یا ستانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے، طلاق کی کثرت کی صورت میں اگر تعددِ ازواج بھی ممنوع رہے تو آخر یہ مطلقہ خواتین کدھر جائیں گی، ان کا کون پرسانِ حال ہوگا؟

اسلام میں تعددِ ازواج کا مقصد

تعددِ ازواج کی اسلامی اجازت کا تعلق اسلام کے جامع نظام عفت سے ہے، جس کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ کو ہر طرح کی جنسی بے راہ روی سے پاک وصاف رکھنا چاہتا ہے، معاشرہ کو پاکدامنی اور عفت وعصمت سے آراستہ کرنے کے لئے اسلام صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا نہیں کرتا؛ بلکہ ان تمام چور دروازوں کو بند کر دیتا ہے، جہاں سے جنسی بے راہ روی گھس آتی ہے، ایسے میں اگر تعددِ ازواج کی اجازت نہ دی جائے تو پھر عورتوں کی بڑی تعداد کا جسم فروشی میں مبتلا ہونا یقینی ہے، ہاں! جن معاشروں میں عفت وعصمت کی سرے سے کوئی اہمیت نہ ہو، اس کے افراد یہی چاہیں گے کہ تعددِ ازواج پر پابندی ہو؛ تاکہ انھیں مختلف عورتوں سے ان کی مجبوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہوس رانی کی تکمیل کا موقع مل سکے، تعددِ ازواج کی صورت میں جب ساری خواتین اپنے جائز شوہروں کے ساتھ عفت کی زندگی گزارنے لگیں تو ان ہوس پرست انسانوں کے لئے جنسی تسکین کے لئے کوئی شکار ہاتھ نہ لگے گا۔

تعددِ ازواج عقل وانصاف کی روشنی میں

تعددِ ازواج جس طرح عورتوں کی کثرت کے اعتبار سے ناگزیر ہے، اسی طرح مردوں کے اعتبار سے بھی ناگزیر ہے، آدمی میں جنسی خواہش ہر وقت رہتی ہے، بعض افراد کے لئے تھوڑا سا وقفہ بھی ناقابل برداشت ہوتا ہے؛ جب کہ عورت ماہواری اور ولادت کے ایام میں جنسی خواہش کے تکمیل کے قابل نہیں رہتی، ایسے میں اگر ایک ہی بیوی کو لازم کر دیا جائے تو پھر مرد کی بے راہ روی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، بسا اوقات عورت کسی ایسے مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ اس سے جنسی اختلاط ہلاکت کا ذریعہ بن جاتا ہے، ایسے میں اگر اس کو طلاق دے دی جائے تو وہ بے سہارا ہو جاتی ہے، بجائے اس کے کہ اس کو اپنے نکاح میں رکھ کر دوسری سے بھی نکاح کر لیا جائے تو اس میں میاں بیوی دونوں کے مسئلہ کا حل ہے، یک زوجگی کی صورت میں یا تو عورت بے سہارا ہو کر معاشرہ پر بوجھ بن جاتی ہے یا پھر مرد ایک بیوی پر اکتفا کر کے جنسی بے راہ روی کو اپنا لیتا ہے، بسا اوقات عورت بانجھ نکل جاتی ہے اور مرد فطری طور پر اولاد کا خواہش مند ہوتا ہے، اس صورتِ حال کا قابل قبول حل یہ ہے کہ بجائے اس کو طلاق دینے کے

مرد دوسری عورت سے شادی کر لے؛ تا کہ تولید کی اس کی فطری خواہش بھی پوری اور بانجھ عورت بے سہارا بھی نہ رہے، بسا اوقات بیوی اس قدر سخت مزاج واقع ہوتی ہے کہ مرد کا سکون غارت ہو جاتا ہے، مرد کی جانب سے ہزار راحتوں اور رعایتوں کے باوجود اس کی سختی میں تبدیلی نہیں آتی، ایسے میں مرد یا تو طلاق دے دے یا پھر اس کو اپنے نکاح میں رکھ کر دوسری شادی کر لے، ظاہر ہے کہ طلاق کی صورت سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ دوسرا نکاح کر لیا جائے، علاوہ ازیں تعددِ ازدواج کی صورت میں بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے، ورنہ سماج میں بڑی تعداد میں عورتیں اور یتیم بچے بچیاں بے سہارا رہ جائیں گی، ایسا تو ممکن نہیں کہ مطلقہ یا بیوہ عورتیں دوشیزہ لڑکیوں کے برابر ہو جائیں؛ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک دوشیزہ بیوی کے ہوتے ہوئے آدمی کسی بیوہ یا مطلقہ کو بھی اپنے نکاح میں لے، پھر یہ کہ اگر معاشرہ کے افراد مختلف اسباب کی بنا پر فقر و فاقہ سے دوچار ہو جائیں اور مالداروں کو کئی شادیاں کرنے کا حق حاصل نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شادی بیاہ کا توازن بگڑ جائے گا؛ چوں کہ مالدار، عورتوں میں عدل و انصاف برت سکتے ہیں، ان کو غریب عورتوں سے شادی کرنے کا حق نہیں اور غریب بے چارہ شادی نہیں کر سکتا، پھر ایسی صورت میں کتنی ہی عورتیں بن بیاہی رہ جائیں گی، یہ اور اس قسم کے متنوع مسائل کا حل تعددِ ازدواج ہی کی شکل میں ممکن ہے۔

ایک سے زائد مردوں سے شادی منع کیوں؟

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ عورتوں کو ایک سے زائد مردوں سے نکاح کی اجازت کیوں نہیں دی گئی، تو اس کی ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے اولاد کی شناخت اور نسب کی مشکل پیش آئے گی، مرد اگر ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرے تو ہونے والی اولاد باپ کی طرف منسوب ہوگی اور والدین کا اپنی اولاد کا پہچاننا آسان ہوگا، اس کے برخلاف اگر عورت ایک سے زائد مردوں سے نکاح کر لے تو اولاد کی ماں تو پہچانی جائے گی؛ لیکن اس کا باپ کون ہے جاننا مشکل ہو جائے گا، نسب کا تعلق باپ سے ہوتا ہے، نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسے بچے جو اپنے والدین بالخصوص اپنے والد نہیں جانتے زبردست ذہنی انتشار سے دوچار ہو جاتے ہیں، پھر یہ کہ فطری طور پر عورتوں کے مقابلہ میں مرد ایک سے زائد عورتیں رکھنا چاہتا ہے، نیز حیاتیات کی رو سے مرد کے لئے ایک سے زائد بیویاں رکھتے ہوئے ذمہ داریوں کو نبھانا آسان ہوتا ہے؛ جب کہ کئی شوہر ہوتے ہوئے عورتیں ذمہ داری نہیں نبھا سکتیں، نیز کئی مردوں سے جنسی تعلقات رکھنے والی عورتوں کو مہلک جنسی بیماریوں کا خطرہ ہوتا ہے جو بعد میں شوہروں میں بھی منتقل ہو سکتی ہیں؛ لیکن ایک سے زائد بیویاں رکھنے والے مردوں میں یہ خطرہ نہیں ہوتا ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

’’اِنما المشرکون نجس‘‘ — ایک طبی اور سائنسی نقطۂ نظر

پروفیسر انیس چشتی ⊙

کہتے ہیں کہ حدودِ حرم میں؛ جہاں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہے، اگر کوئی کافر یا مشرک داخل ہو جائے تو عرب بدوؤں سے سونگھ کر پتہ لگا لیتے ہیں کہ یہ شخص مسلمان نہیں ہے، تحقیق کرنے پر ان کی بات صحیح ہوتی ہے، جب ایک مسلمان نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور ’’انی وجهت وجهي للذي فطرت السموات والارض حنيفاً وما انا من المشركين‘‘ کہہ کر ہاتھ باندھ لیتا ہے تو اس کے جسم میں ایک عجیب قسم کی حرارت پیدا ہوتی ہے اور وہ گرمی محسوس کرنے لگتا ہے، اسی لئے مخیّر حضرات مسجدوں میں پنکھے، کولر اور ایئر کنڈیشن کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

سعودی عرب نے ہندوستان کی ایک بہت بڑی کمپنی کے گوشت کے کنسائن منٹ کو یہ کہہ کر واپس بھجوا دیا کہ یہ گوشت زیادہ سے زیادہ دو دنوں تک فریج میں رکھا نہیں جا سکتا؛ کیوں کہ یہ ذبیحہ صحیح نہیں تھا؛ حالاں کہ گوشت کو صحیح طور پر حلال کئے ہوئے جانور سے حاصل کیا گیا تھا، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ کمپنی کے سلاٹر ہاؤس میں ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کیا جاتا تھا، جس کے نتیجے میں ذبح کیا جانے والا جانور دہشت زدہ ہو جاتا تھا، ڈر اور خوف کے اس ماحول میں اس کا جسم اپنے بچاؤ کے لئے ایسی رطوبتیں خارج کرتا تھا، جس کے نتیجہ میں اس کا گوشت ٹھٹھر جاتا تھا اور وہ خطرناک رطوبتیں (Hormones) بجائے خون کے ساتھ بہہ جانے کے جانور کے گوشت میں سرایت کر جاتی تھیں اور فریج میں رکھنے کے باوجود چند دنوں میں ہی اس کی رنگت مزا اور تازگی کا احساس ختم ہو جاتا تھا اور گوشت سڑاند کے قریب پہنچ جاتا تھا۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسانی جسم اور اس کا قیافہ مختلف ذہنی، قلبی اور ماحولیاتی کیفیات سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور یہ تمام کیفیات اس کے سراپا سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں، میں اہل اللہ کی بات نہیں کرتا ایک عام آدمی بھی کسی شخص کو دیکھ کر اس کے کردار، ذکاوت، علمیت، عزت یہاں تک کہ اس کی نسل و وطن کا بھی

⊙ پونے، مہاراشٹرا۔

اندازہ لگا سکتا ہے، غصے، خوف، نشاط، سکون اور تحیر وغیرہ میں انسان کے چہرے کا رنگ ڈھنگ الگ الگ ہوتا ہے، جب انسان شرک میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ دراصل ایک ایسی حقیر شئے کے سامنے سجدہ ریز ہو رہا ہوتا ہے جس کا انسان کو خود احساس ہے کہ اس شئے کی کوئی حیثیت نہیں، میں نے ہی اُسے اپنے ہاتھ سے گھڑا ہے اور اس کے آغاز و انجام سے میں خود واقف ہوں، اس لئے اس کے دل میں ایک ایسا باغیانہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اُسے بے راہ روی کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے خوف اور گوشت میں ایسے ذرات شامل کر دیتا ہے جو اسے کہیں بھی کچھ بھی کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں، آج دنیا میں بڑے بڑے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی اسکینڈلوں میں اور قتل و غارت گری کی وارداتوں میں مسلمانوں کا نہ پایا جانا اس بات کی گواہی ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی کو پوجتے ہیں جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی اور جسے اونگھ ہے نہ نیند!

اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ نجاست دو قسم کی ہوتی ہے؛ ایک روحانی اور دوسری طبعی، یعنی ایک ظاہری اور دوسری باطنی، باطنی نجاست ظاہری نجاست سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اور وہ انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے جہاں جانور بھی پہنچنے سے کتراتا ہے، بڑے بڑے جنسی اسکینڈل بڑے بڑے مذہبی اور نام نہاد روحانی مراکز میں ہوئے اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو گرفتاریوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان سے بڑے پیشواؤں کو میڈیا کے سامنے آکر بین الاقوامی سطح پر معافی مانگنی پڑی۔

مشرک کس حد تک ظالم و جابر ہوسکتا ہے اس کا اندازہ محض اس بات سے لگالیں کہ جنوبی بھارت کے ایک آشرم میں مستقبل کے بننے والے نوجوان مٹھا دھیش سے پتھر پر روزانہ کئی سو کے حساب سے ناریل صرف اس لئے پھڑوائے جاتے ہیں کہ جب موجودہ مذہبی پیشوا کو موت کے بعد سمادھی بٹھایا جائے گا تو لاش کے سر پر اتنی زور سے ناریل مارے کہ ایک ہی وار میں اس کی کھوپڑی پھٹ پڑے اور اس کا بھیجا دکھائی دینے لگے؛ تاکہ اسے نروان نصیب ہو۔

ہمیں الحمدللہ رات دن غیر مسلموں سے مخاطبت کا موقع ملتا رہتا ہے، سوالات کے وقفے میں ان کے بہت سارے اعتراضات میں جو سب سے بڑا اعتراض ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ لوگ ہمیں بیت اللہ شریف تو دور کی بات حدودِ حرم میں بھی داخل نہیں ہونے دیتے، ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ آپ کیوں داخل ہونا چاہتے ہیں؟

دیکھنے کے لئے، دیکھنا ہی چاہتے ہیں تو ٹیلی ویژن پر حرم شریف کی سرگرمیاں Live ٹیلی کاسٹ ہوتی ہیں دیکھ لیجئے۔

نہیں! ہم کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں، آپ کے کسی عزیز کا بڑا آپریشن ہو رہا ہو اور آپریشن تھیٹر سے

باہر CC کیمرے سے وہ آپریشن، اسکرین پر بتایا جار ہا ہو تو کیا کوئی آپ کو آپریشن تھیٹر میں داخل ہونے دے گا؟

نہیں! وہاں جراثیم اور Disturbance کا خطرہ رہتا ہے۔

جی! بالکل یہی کیفیت حرم شریف کی ہے، یہاں لاکھوں عقیدت مندوں کے اژدہام کا سوال ہے، اس میں کسی اجنبی کا پہنچ جانا، جو وہاں کے آداب اور عقیدت سے واقف نہ ہو، بھگدڑ مچانے کا باعث بن سکتا ہے، آپ نیک انسان ہیں؛ لیکن کوئی شریر آدمی جان بوجھ کر سیکوریٹی کے لئے مسائل پیدا کرسکتا ہے، اس لئے بہتر ہے کہ حکم کی پابندی کی جائے اور ذلیل ہونے سے بچا جائے۔

ذلت؟ اتنے سے جرم کے لئے ایسی Punishment؟۔

جی ہاں! چوں کہ آپ سے کیپٹل کرائم سرزد ہوا ہے، اس لئے آپ گرفتاری، جیل، اخراج جیسی Punishment کے سزاوار ہیں؛ کیوں کہ آپ نے داخل ہو کر اسٹیٹ اور اللہ کے حکم کو چیلنج کیا ہے۔

اللہ کا حکم! وہ کیسے؟ جی ہاں! خدا کے حکم سے کوئی اسلامی ریاست سرمو انحراف نہیں کرسکتی، قرآن کی سورۂ توبہ آیت نمبر ۲۸ میں صریح ارشاد ہے کہ :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوْا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـٰذَا . (التوبۃ:۲۸)

اے ایمان والو! مشرک جو ہیں پلید ہیں، سو نزدیک نا آنے پائیں مسجد الحرام کے، اس برس بعد۔

چنانچہ جہاں اسٹیٹ کا سیکوریٹی سسٹم اور خدائی حکم، دونوں کے خلاف ورزی ہوتی ہو تو یہ سزائیں ایک عام سی بات ہے اور سارے ملکوں کے دستور میں داخل ہے؛ لیکن کیا یہ سزائیں بہت زیادہ نہیں ہیں؟

لاکھوں لوگوں کی جان بچانے کے لئے ایک کو سزا اور آئندہ ایسی غلطی کرنے والوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے، امیر یا امام کے حکم سے بعض حالات میں یہ سزا معاف بھی ہوسکتی ہے۔

ہم پھر آگے چل کر یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک بیت اللہ شریف پر ہی کیا موقوف ہے، دنیا میں لاکھوں جگہیں ایسی ہیں جہاں مخصوص عملے کے سوا کوئی داخل نہیں ہوسکتا، نیپال کے پشوپتی ناتھ مندر میں کوئی مسلمان داخل نہیں ہوسکتا، پارسیوں کے آتش کدوں میں کوئی غیر پارسی داخل نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ اندرا گاندھی ایک پارسی کی بیوی اور راجیوں گاندھی ایک پارسی کی اولاد ہونے کے باوجود پارسی اگیاری میں داخل نہیں ہو سکے، بھارت کے لاکھوں مندروں کے گربھ گرہ (Sanctum Sanctorum) میں کوئی مسلمان تو کیا کوئی نچلی ذات کا ہندو بھی داخل نہیں

ہوسکتا، یہودی صومعوں اور دیوارِ گریہ کے مخصوص مقامات، پشکر میں موجود برہما کا مندر، ہر ملک کی فوجی نیز سیکوریٹی اور انٹلی جنس سے متعلق تنصیبات، ایٹمی اور دیگر اسلحہ جاتی تحقیقات اور پیداوار سے متعلق لیباریٹریاں اور فیکٹریاں ہر شخص کی پہنچ سے باہر ہیں اور اگر یہاں داخل ہونے نہیں دیا جاتا تو ہمیں برا ماننے کی کوئی ضرورت نہیں، ان کے اپنے اُصول وضوابط ہیں اور یہ قوانین آپ ہی کی فلاح کے لئے ہیں۔

اتنا سب کچھ بتا دینے کے باوجود بھی غیر مسلم ہم سے پوچھتے ہیں کہ آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ عرب بدو صرف سونگھ کر مشرک اور مومن کا فرق بتا دیتے ہیں؟

ہم جواب دیتے ہیں کہ ہمیں اس کا تجربہ نہیں؛ لیکن ایک عالم اس روایت سے واقف ہے، انسانی جسم اور اس سے خارج ہونے والی رطوبات پر ابھی تحقیقی کام جاری ہے، جسم کا ہر ذرہ اور ہر خلیہ رطوبتوں میں گھرا رہتا ہے اور اس سے رطوبتیں خارج ہوتی رہتی ہیں، وہ ہر لمحہ ٹوٹتا پھوٹتا اور بنتا سنورتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ہر سات برسوں میں ایک نیا انسان وجود میں آتا ہے، غصہ، ڈر، خوف، خوشی، انبساط، انتظار، نشاط، بھوک، شکم سیری، جنسی آسودگی وغیرہ ایسی لاتعداد کیفیات ہیں، جس میں انسانی جسم لاتعداد اور متنوع رطوبتیں خارج کرتا رہتا ہے اور اس کے اثرات جسم اور چہرے پر نمایاں ہوتے رہتے ہیں، مثلاً غصے اور خوف کے وقت گردے کے اوپر پایا جانے والا غدہ کلاہِ گردہ (Adrenal Cortex) اپنی رطوبت (Adrenaline) کو یکسر خارج کردیتا ہے، اس سے جسم میں خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، جسم پسینے میں شرابور ہوجاتا ہے، جس سے جسم کی حدت پر قابو رکھا جاتا ہے، اور انسان کانپنے لگتا ہے، اسی دوران اسی غدے سے جو دوسری رطوبت نکلتی ہے وہ Nor Adrenaline کہلاتی ہے، یہ دونوں رطوبتیں جسم میں ایک عجیب وغریب کیفیت پیدا کردیتی ہیں، 'جو کینن کا نظریۂ فرار ومبارزت' (Fight and Flight Theory of Canon) کہلاتا ہے، رطوبتوں کا یہ پورا ڈھانچہ (Catachola Mines) کہلاتا ہے، نظریۂ فرار ومبارزت میں ہوتا یہ ہے کہ آدمی کسی خوفناک اور طاقتور چیز کو دیکھ کر رطوبتوں کے اخراج سے جب خوف اور ڈر محسوس کرنے لگتا ہے تو پست ہمت لوگ پہلی فرصت میں Surrender ہوجاتے ہیں اور بجائے راہِ مبارزت اختیار کرنے کے اس کی پوجا کرنے لگتے ہیں اور اس طاقتور شئے سے متعلق لاتعداد کہانیاں مشہور ہوجاتی ہیں، یہیں سے بت پرستی کی ابتداء ہوتی ہے اور شرک وجود میں آتا ہے، مشرک کی چوں کہ کوئی شریعت نہیں ہوتی اس لئے اسے ہر چیز مباح ہے، وہ آسمانی احکامات سے یکسر نابلد اور آزاد ہوتا ہے، اس لئے اس کے پاس روحانی اور جسمانی طہارت کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا اور چوں کہ حرمین شریفین دنیا کے مقدس ترین مقامات ہیں، یہاں ایسے نجس افراد کا داخلہ ممنوع قرار پایا کہ پہلے روحانی اور جسمانی طور پر پاک ہوجاؤ،

پھر داخل ہو سکتے ہو، یعنی اللہ اور اس کے رسول اور ان کے احکامات پر ایمان لاؤ، ایمان کی یہ سعادت حاصل کرنے کے بعد تمہیں نہ بادشاہ کا خوف ہوگا، نہ سانپ، بچھو، آندھی، پتھر، طوفان، آگ، ہوا، پانی، سمندر، مرحومین، سیلاب، پہاڑ، دریا، ہتھیار، جانور وغیرہ یہ سب خوف کھانے اور ان کے بت بنا کر پوجنے کی چیزیں نہ رہیں گی؛ بلکہ تمہارے لئے یہ مظاہر قدرت مادہ تحقیق (Object for Research) کی حیثیت اختیار کر لیں گی اور تمہارے جسم سے مشرکانہ اور نجس بو کے بجائے ایک مانوس مہک پیدا ہوگی۔

مشرکانہ خوف اور لایعنی چیزوں کی عبادت، بدکاروں کے Neuro Transmitters کے ذریعے ان کے جسم میں پنج نامیاتی مرطوبات (5 HT-Five Hydroxy Tryptamine) کے ترشح میں اضافہ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کا میلان بدکاری کی طرف ہوتا ہے، اس کے برعکس جب باکردار، مومن، نمازی، روزہ دار اور نیکوکار لوگوں کے خون کا تجزیہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان کے خون میں Dopamin کی مقدار زیادہ ہے، یہ رطوبت چہرے اور جسم کو پرسکون بناتی ہے، فرد کو نیکی کی طرف آمادہ کرتی ہے، رمضانوں میں اہل ایمان کے خون کا تجزیہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان کے خون میں Dopamin کی مقدار اور دِنوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

جسم میں پیدا ہونے والی ان تمام رطوبتوں کا تعلق دماغ کے مرکزی حصے میں پائے جانے والے دو غدوں یعنی Petutary اور Hypothelamus غدودوں سے ہے، گویا یہ جسم میں پائے جانے والے غدودوں کے بادشاہ اور شہنشاہ ہیں، ان ہی کے احکامات پر سارے غدود کام کرتے ہیں اور ان تک یہ ساری خبریں حواسِ خمسہ یعنی قوتِ لامسہ، سامعہ، باصرہ، ذائقہ اور شامہ کے ذریعے پہنچتی ہیں، جو منظر سامنے ہوگا یہ بادشاہان جسم کے تمام غدوں کو اسی کے مطابق رطوبتوں کے اخراج کا حکم دیں گے اور انسانی جسم پر اسی کے مطابق اثرات مرتب ہوں گے اور اسی کی مطابقت سے عزتِ نفس، پاس ولحاظ، رحمدلی اور سفاکی، ناپاکی اور نظافت، جوابدہی اور ظلم وظلمت جیسی کیفیات کے نتیجے میں جسم سے پسینے کے اخراج میں پائی جانے والی مہک اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ پاک اور Secured جگہوں پر ایسے شخص کا قرب اختیار کیا جائے یا نہیں؟

> اے ایمان والو! مشرک جو ہیں پلید ہیں، سو نزدیک نہ آنے پائیں مسجد الحرام کے اس
> برس بعد۔ (قرآن حکیم)

نوٹ :

اس مقالے کی تیاری میں قرآن حکیم اور احادیث، تراجم اور تفاسیر کے علاوہ علم الابدان، اناٹامی، یونانی اور ایلو پیتھک کی لاتعداد کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کے علاوہ آرمڈ فورسیس میڈیکل کالج (A.F.M.C) کی

تجربہ گاہوں میں رطوبتوں (Hormones) پر جاری جدید ترین تحقیقاتی رپورٹوں سے استفادہ کیا گیا ہے، جو ہنوز نظریاتی (Hypothesis) مراحل میں ہیں اور جلد یا بدیر ان کی اشاعت عقیدۂ توحید کی نظریہ سازی میں ممد و معاون ثابت ہوگی، ان رپورٹوں کے سلسلے میں ہم بریگیڈیر ڈاکٹر عالم (سبکدوش) کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

تشریحات

- گڑبڑ، اُلجھن، پریشانی:Disturbance
- رطوبتیں:Hormones
- سزا:Punishment
- گربھ گرہ:Sanctum Sanctorum
- غدہ کلاہِ گردہ:Adrenal Cortex
- دماغ میں پایا جانے والا غدہ:Petutary
- کلاہِ گردہ سے نکلنے والی رطوبت:Nor Adrenaline
- سپردگی:Surrender
- نظریہ فرار و مبارزت:Fight and Flight Theory of Canon
- مادۂ تحقیق:Object for Research
- رطوبتوں کا پورا ڈھانچہ:Catachola Mines
- فوجی طبی کالج، آرمڈ فورسیس میڈیکل کالج:A.F.M.C
- نظریاتی:Hypothesis
- دماغی رطوبات:Neuro Transmitters
- دماغی غدہ:Hypothelamus
- صالح رطوبت کا نام:Dopamin
- محفوظ:Secured
- پنج نامیاتی مرطوبات:Five Hydroxy Tryptamine [5 HT]

⊙ ⊙ ⊙

''اِنما المشرکون نجس'' سے مراد

جناب فضل الرحمٰن ⊙

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِکُونَ نَجَسٌ . (التوبۃ:۲۸)

اس آیت سے متعلق بہت سارے برادران وطن اعتراض کرتے ہیں کہ ہمیں قرآن نے ناپاک کہا ہے، کسی بھی لفظ کو سمجھنے کے لئے وہ کس معنی (Context) میں کس عمل کی وجہ سے کہا گیا ہے دیکھے بغیر اس کا صحیح معنی ومطلب نہیں سمجھ میں آتا، کئی خداؤں کو پوجنے والوں (مشرکوں) کے لئے، اسی طرح کے الفاظ کو قرآن سے قبل کے مذہبی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

ہندو مذہبی کتابوں میں: '' گیتا:۱۹:۱۶(۱)، گیتا:۳۳:۱۸(۲)، زبور:۳۹:۱۰۶(۳)، متیٰ:۳۹:۱۲(۴)'' قرآن: ''یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِکُونَ نَجَسٌ ''(التوبۃ:۲۸) ویدوں اور اپنشد مغذ کہلانے والے گیتا میں ''اسبھاو'' اور ''اوبیھیحانیی'' کہہ کر، بائبل میں ''نجس وزانی'' کہہ کر اور قرآن میں ناپاک (نجس) مشرکین کو کہا گیا، یہ ان کی بدعقیدگی اور عمل کی وجہ سے کہا گیا۔

حقیقت میں خدا کی مرضی اور نظام زندگی (اسلام) کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے ہی انبیاء آئے ہیں، خدا کی مرضی کے مطابق کیسے زندگی گزاریں انبیاء نے اپنے قول وعمل سے واضح کیا، اسی کو انبیاء کی سنت یا انبیاء کی زندگی کا طریقۂ کار کہتے ہیں، تمام انبیاء کی بنیادی دعوت ایک ہی رہی، اسی سلسلے کے آخری نبی ﷺ جو تمام انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے آئے تھے وہ حضرت محمد ﷺ تھے۔

⊙ داعی اسلام: سنٹر فار پیس اینڈ ٹرو میسیج، حیدرآباد۔

(۱) تَانَھَمْ دِوشَتَه کُرُوْ لَا نَمُسَارےْ شُ نَرَادَھُمَان کِھُشِیَا میاجَسَرْ آ مَسبُھَا نَاسُ ری شوے وَیونِشُ . (گیتا:۱۹:۱۶)

(۲) یوگے نَوی بِھیُچَارِنُیَا دُرُوتِسَّا پَارُتَھُ سَاتْوِکِیُ . (گیتا:۳۳:۱۸)

(۳) یوں وہ اپنے ہی کاموں سے آلودہ (ناپاک) ہوئے اور فعلوں سے بے وفا بنے۔ (زبور:۳۹:۱۰۶)

(۴) ......اس نے جواب دیکر ان سے کہا اس زمانہ کے بُرے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں۔ (متیٰ ۳۹:۱۲)

آپ ﷺ کے تعلیمات ،مسواک کیسے کریں؟غسل کیسے کریں؟ جیسے عام زندگی کے اُصولوں سے لے کر فرد کی اصلاح کیسے ہو؟ایک بہتر سماج کی تشکیل کیسے ہوسکتی ہے؟ان تمام معاملات کی آپ ﷺ نے اللہ کے احکام کے مطابق صرف قول سے ہی نہیں بلکہ عملاً رہنمائی بھی کی ،جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں آپ ﷺ کی اتباع کرے اپنی زندگی کے کسی بھی پہلو کو سنت نبی ﷺ سے بالاتر نہ سمجھے۔

اگر ہم سیرت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے مختلف کاموں میں سب سے اہم کام جو تھا وہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانا،اس سلسلے میں آپ ﷺ اتنے غمگین رہا کرتے تھے کہ اپنے آپ کو اس کام میں گھلا دیا،آپ کے اس تڑپ کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا :

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا . (الكهف:٦)

جس نے میری سنت سے گریز کیا وہ ہم میں سے نہیں ”فمن رغب عن سنتی فلیس منی “(۱) جس طرح اس حدیث کا تعلق نکاح جیسے احکام سے ہے اسی طرح اس دعوت دین سے بھی اس کا تعلق ہے،رسول اللہ ﷺ کا طریقۂ کار یہ رہا کہ لوگوں کے اعمال کی درستگی کے لئے آپ ﷺ نے تدریجی اُصول کو اپنایا،یعنی لوگوں کے مزاجوں کے اعتبار سے آپ ﷺ نے لوگوں کی اصلاح کی ،آپ کا انقلاب تدریجی تھا،اس کا اشارہ ہمیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول سے ملتا ہے،جس میں آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا قرآن مجید کی مفصل سورتیں ابتدائی دور میں نازل ہوئیں،ان میں زیادہ تر توحید کا ذکر، جنت وجہنم کا ذکر ہے،لوگوں کے دل اسلام کے طرف مائل ہونے لگے بعد میں چل کر حرام وحلال کے احکام والی آیتیں نازل ہوئیں،اگر شراب کی حرمت والی آیات ابتدائی دور میں ہی نازل ہوتیں تو لوگوں کے منہ پھر جاتے۔

۸رہجری ماہ رمضان میں مکہ فتح ہوا،اس وقت کعبہ کے پاس ادا کئے جانے والے عبادت ورسومات ایک ہی وقت میں نہیں بدلے گئے ؛ بلکہ بتدریج تبدیلی لائی گئی،فتح مکہ کے بعد ۸ہجری میں جو حج ادا کیا گیا وہ پرانے طریقہ پر ہی تھا،۹ ہجری میں مسلمان اسلامی طریقہ پر اور مشرکین اپنے پرانے طریقہ پر حج ادا کئے،۱۰ ہجری جو حج میں ادا کیا گیا وہ مکمل طور پر رسول کی رہنمائی میں اللہ کے احکام کے مطابق ادا کیا گیا، یہ نبی ﷺ کا پہلا اور آخری حج تھا جس کو حجۃ الوداع کہتے ہیں۔

(۱) بخاری:۵۰۶۳،کتاب النکاح،باب الترغیب فی النکاح۔

مشرکین کا خانۂ کعبہ پر مشرکانہ انداز میں حج ادا کرنا رسول ﷺ کو ناگوار تھا؛ لیکن آپ ﷺ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی تبدیلی نہیں لاتے تھے، شرعی احکام نافذ کرنے کے لئے آپ ﷺ جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے؛ بلکہ حکمت کے ساتھ بتدریج نافذ کرتے تھے، فتح مکہ کے بعد دو سال آپ ﷺ کے حج نہ ادا کرنے کا سبب یہ بھی تھا کہ مشرکین خانۂ کعبہ پر ننگے عبادت کے رسومات ادا کرتے تھے یہ رسول ﷺ کو پسند نہیں تھا، فتح مکہ کے بعد عام مسلمانوں نے حج ادا کیا؛ لیکن محمد ﷺ تشریف نہیں لے گئے، بعد والے سال آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حج کے قافلے کو روانہ کیا، اسی سال حرمت والے احکام نازل ہوئے، کہا گیا کہ: مشرکین ''نجس'' ناپاک ہیں؛ اس سال کے بعد وہ حدود حرم میں داخل نہ ہوں'' اِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلاَ يَقْرَبُواْ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـذَا '' (التوبۃ:۸۲) اس حکم کو لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے اور اعلان کیا کہ آئندہ سال سے مشرکین حج کے لئے نہ آئیں اور جو لوگ استطاعت (مالی) نہ رکھتے ہوں وہ حج کی تیاری نہ کریں، یہ اعلان حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حج کے ایام میں چاروں طرف کئے۔

اس طرح آپ ﷺ نے بتدریج مشرکین کو حج سے دور کیا، اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کس طرح احکام کو بتدریج نافذ کرتے تھے، آپ ﷺ کو اقتدار حاصل ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے تدریجی کام کو ہی اہمیت دی آپ ﷺ خود حج کرنے سے رُک گئے مگر مشرکین کو فوراً نہیں روکا اور مناسب وقت کا انتظار کیا، عام طور پر جسے لوگ سنت کہتے ہیں ان میں یہ بھی ہے، جسے اکثر لوگ نظر انداز کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اصلاح کا کام بتدریج کیا جائے، جو ہمیں آپ ﷺ کے مکی دور کے ۱۳ سال کے واقعات سے ملتے ہیں، خانۂ کعبہ کے پاس کئے جانے والے برہنہ طواف و دیگر رسومات کو جبراً آپ ﷺ نے روکنے کی فوراً کوشش نہیں کی۔

اسی طرح مکہ سارا کا سارا اپنے اقتدار میں آنے کے باوجود آپ ﷺ نے جلد بازی سے کام نہیں لیا؛ بلکہ آپ ﷺ نے دو سال انتظار کیا اور تیسرے سال اس کی اصلاح کی، یعنی ان تین سال کے اندر آہستہ آہستہ اصلاحی جد جہد چلتی رہی۔

اسی طرح بتدریج کام کرنے کے بہت سے فوائد ہیں:

(۱) اس کی اہم خوبی یہ ہے کہ منتخب نشانہ تک پہنچنے میں آسانی ہوگی، بتدریج کام کرنے سے ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر آگے بڑھانے میں آسانی ہوگی، ایسا شخص جلد بازی سے جذبات کا شکار ہوئے بغیر حالات حاضرہ کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے مقصد کی طرف آگے بڑھ سکتا ہے۔

(۲) اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آدمی نقصانات سے دور رہ سکتا ہے، اچانک کسی میدان کار میں کود پڑنے

سے اپنے سے زیادہ طاقتور مد مقابل کا سامنا نہیں کرسکتا جس کی وجہ سے صدیوں کے نا قابل تلافی جانی و مالی نقصانات ہو سکتے ہیں۔

نجس (ناپاک) کے متعلق امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ وہ دو طرح کے ہیں: ایک جسمانی اور دوسرا روحانی، خاص طور سے قرآن نے جس نجس (ناپاکی) کا ذکر کیا وہ روحانی نجاست سے تعلق رکھتا ہے، یہ ہمیں صحابۂ کرام ؓ کے سیرت کے مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے، ایک مرتبہ حضرت ابوسفیان ؓ جب اسلام قبول نہیں کئے تھے، آپ ﷺ کے گھر تشریف لائے اور آپ ﷺ کے بستر پر بیٹھنا، چاہا تو آپ ﷺ کی بیٹی اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا (اُم المومنین) نے انھیں کہا: تم مشرک ناپاک ہو؛ لہٰذا آپ ﷺ کے بستر پر نہیں بیٹھ سکتے۔

حضرت عمر ؓ کے قبولِ اسلام کے واقعہ میں جب کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت خطاب سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کررہی تھیں، حضرت عمر ؓ نے پڑھنے کے لئے پوچھا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تم شرک کی وجہ سے ناپاک ہو......۔(۱)

سورۂ توبہ آیت نمبر: ۲۸ کے مطابق خالق کائنات کے خانہ کعبہ کے طواف کا حق اس کے مومن بندوں کو ہی ہے، دیگر باطل معبودں کی پرستش کرنے والوں کو یہ حق کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ خانۂ کعبہ کا طواف کریں، انسان اور اس کی روح کے خالق کی محبت جو دل میں ہونا چاہئے اس کی جگہ کسی اور باطل معبود کی محبت دل میں بسانے والے ناپاک نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوں گے، ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض وقت سخت الفاظ استعمال کئے جانے کے باوجود جب ہم حقیقت پر نظر ڈالتے ہیں تو مشرکین ان حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے سچائی کی طرف پلٹتے ہیں، تاریخ اسلام میں اس طرح کے بہت سارے واقعات ہمیں ملتے ہیں۔

جہنم ایک جان لیوا حقیقت ہے اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان شرک سے اپنے آپ کو باز رکھے اور توحید و رسالت کے راستہ کو اپنائے، اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اس حقیقت کو تسلیم کرنے والا بنائے۔ آمین

⊙ ⊙ ⊙

(۱) سیرت ابن اسحاق۔

جمع قرآن اور مستشرقین — مختصر جائزہ

مولانا عمیر الصدیق ندوی⊙

مستشرقین کا لفظ اب خواص ہی نہیں، مذہب اور علم سے وابستہ عام انسان کے لئے بھی نامانوس نہیں، یورپ کے اہل علم کی اس خاص شاخ کی تاریخ میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مثلاً یہ کہ اُٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ اسلام اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لئے ایک نیا شعبہ وجود میں آیا، جس کو استشراق یا اوریئنٹلزم کا نام دیا گیا، یہ کہنا بھی حق ہے کہ یورپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا اور اپنے لٹریچر کو نئے اُسلوب میں شائع کیا، وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف کو اپنی طرف مائل کیا اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم وادب کی حفاظت واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا، یہ ایک نظریہ ہے؛ لیکن اس میں صرف عربی علوم وادب ہی نہیں، اسلامی علوم وادب کی تعبیر زیادہ صحیح اور کامل ہے کہ ان مستشرقین کے سرمایہ علم وفن میں بیشتر حصہ صرف قرآن وسنت، فقہ اور اسلامی تاریخ وادب ہی کا ہے، ان مستشرقین نے جس طرح اسلامی علوم وفنون سے اعتناء کیا، کتابوں کو شائع کیا، اس کا اعتراف بڑے کھلے دل سے کیا گیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک جگہ لکھا ہے: مستشرقین کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریے کی مستحق ہیں، سید صاحب سے پہلے ان کے استاذ علامہ شبلی نعمانی نے ان مستشرقین کی قابل قدر سرگرمیوں پر نظر ڈالتے ہوئے آگاہ کیا تھا کہ استشراق کا آغاز اٹھارہویں یا انیسویں صدی میں تلاش کرنے کی بجائے اسلام کے دور آغاز سے مسیحیوں کی اسلام نفرت کے رویہ سے کیا جائے اور یورپ تو اسلام کے بارے میں ہمیشہ مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ہاں سترہویں صدی میں یہ ضرور ہوا کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کی بجائے کسی قدر تاریخ اسلام کی بنیاد عربی تصانیف پر قائم کی گئی، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اسی بنیاد پر استشراق کی عمارت قائم کی گئی، علامہ شبلی نے ان مستشرقین کو تین قسموں میں بیان کیا کہ ایک تو وہ ہیں جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں،

⊙ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

ان لوگوں کا سرمایہ معلومات دوسروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، دوسری قسم میں وہ ہیں جو عربی زبان اور علم و ادب اور تاریخ و فلسفہ اسلام کے ماہرین ہیں؛ لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں، ساخو، نولدیکی وغیرہ اسی دوسری قسم میں شامل ہیں، انسائیکلوپیڈیا میں نولدیکی نے قرآن مجید پر جو آرٹیکل لکھا، علامہ شبلی کے الفاظ میں جابجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے، تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، ان میں پامر اور مارگوتھ جیسے اہل فن شامل ہیں، بقول علامہ شبلی اس قسم سے ہم بہت کچھ اُمید کرسکتے تھے؛ لیکن باوجود عربی دانی کثرت مطالعہ اور تفحص کتب، ان کا یہ حال ہے کہ :

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

اس اجمال کی تشریح علامہ سید سلیمان ندوی نے یوں کی کہ :

> ظاہر ہے یہ علوم ان کے نہ تھے، اس لئے وہ ہمدردی اور محبت جو مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہوسکتی ہے، ان مستشرقین کو نہیں ہے، یہ گروہ اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب وتمدن پر بے پناہ حملے کررہا ہے، قرآن مجید، حدیث، تصوف، سیر ورجال، کلام وعقائد سب ان کی زد میں ہیں۔

مستشرقین کی تاریخ ان کے مقصد اور ان کے طریقۂ کار کا یہ مختصر ترین خلاصہ اس لئے پیش کیا گیا کہ ان سے متعلق کسی بھی گفتگو سے پہلے حقیقت کا استحضار ضروری ہے۔

علامہ شبلی ومولانا سید سلیمان ندوی کے یادگار ادارے دارالمصنفین نے اس سلسلے میں اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے ایک پوری سیریز تیار کردی ہے، اس کے مطالعہ سے اور دوسری اور کتابوں کو پڑھنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ مستشرقین کی علمی کاوشوں میں اصل رنگ وہاں کھلتا ہے، جہاں وہ رسول اکرم ﷺ کی سیرت کو موضوع بحث بناتے ہیں، ان کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ سیرت طیبہ کے مطالعہ اور پیشکش میں ہر طرح کی تدلیس، تلبیس اور دروغ بیانی اور خلاف واقعہ ترجمانی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں، سیرت اسی لئے ان کا خاص موضوع ہے، حامل قرآن علیہ الصلاۃ والسلام میں شکوک وشبہات کے بعد اسلام کو ہدف طعن بنانا ان کے لئے آسان ہوسکتا ہے، اسی مقصد سے انھوں نے خود قرآن مجید کو بھی اپنے ہدف میں شامل کیا، قرآن مجید پر حملہ آور ہونے میں ان کے ترکش کا سب سے پہلا تیر یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید، الہامی یا آسمانی کتاب نہیں؛ بلکہ یہ تصنیف محمدی ہے، یہ کہنا نولدیکی کا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس نے لکھا کہ چوں کہ حضور ﷺ کو عرب سے تو واقفیت تھی؛ لیکن بیرون عرب سے وہ بے خبر تھے، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصۂ قرآنی میں جہاں مصر میں

قحط کی پیشین گوئی کی گئی اور کہا گیا کہ ’’فیہ یغاث الناس وفیہ یعصرون ‘‘(یوسف:۴۹) تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ مصر کی زرخیزی تو نیل کی وجہ سے ہے، وہاں بارش تقریباً ہوتی نہیں ،نولد یکی کے نزدیک ’’یغاث‘‘ کا مطلب ہے خوب بارش ہوگی،اس لئے مصر میں بارش کا ذکر،اس کے نزدیک صاحب قرآن ﷺ کی بے خبری کی دلیل ہے اور اس لئے یہ اللہ کی کتاب نہیں؟

نولد یکی کی اس بوالعجبی پر عقل بھی حیران رہ گئی ،نولد یکی کی اس تحقیق کا رد علماء نے جس طرح کیا اس سے نولد یکی اور اس کے عقیدت مندوں کو ان کے مبلغ علم کا اندازہ ہو گیا ہوگا ،اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ،مختصر طور پر حقیقت یہ ہے کہ ’’یغاث‘‘ کے معنی صرف پانی برسنے کے نہیں ہیں کہ یہ ’’غیث‘‘ یعنی بارش سے مشتق نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مادہ ’’غوث‘‘ ہے،جس کے معنی فریاد رسی کے ہیں،یعنی اس قحط کے بعد ایسا سال آجائے جس میں لوگوں کی فریادرسی ہوگی اور قحط دور ہوگا،دوسرے اگر بارش ہی کے معنی لئے جائیں تو بھی نولد یکی کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بالکل بارش نہیں ہوتی ،غلط ہے،بارش کم سہی لیکن اس کا مطلقاً انکار خلاف واقعہ ہے اور پھر یہ بھی کہ نیل کا پانی اور وہ چھوٹے دریا جو نیل کا سرچشمہ ہیں وہ بارش ہی کے پانی سے ہیں ،نولد یکی کے سامنے یہ واضح حقائق تھے؛ لیکن استشراقی پردہ آنکھوں پر تھا اس لئے بڑی دیدہ دلیری سے ایک دلیل دے کر اس نے قرآن مجید کو تصنیف محمدی ثابت کرنے کی کوشش کی ،قرآن اور حامل قرآن ﷺ کے تعلق سے یہ صرف ایک مثال ہے، ورنہ قرآن مجید کے متعلق مستشرقین کی ساری تگ و دو صرف اس نقطہ تک محدود اور مرکوز ہے کہ قرآن مجید اس لئے مستند نہیں کہ اس کے جمع وتدوین میں ان کو شبہ ہے،یعنی پورا قرآن مجید حضور ﷺ کے زمانے میں مدون نہیں ہوا،اس مفروضے کو بڑی مہارت؛ بلکہ جسارت سے بار بار دہرایا جاتا ہے،انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد پنجم میں قرآن مجید پر ایک مستشرق ولش نے چند برس پہلے ایک مضمون لکھا اور اس میں وہی اعتراضات جمع کئے گئے جو کئی صدیوں سے یورپ میں دہرائے جاتے رہے ہیں کہ قرآن مجید کو حضور ﷺ کے زمانے میں کامل مدون نہیں کیا گیا،اس اعتراض کا جواب بھی وہ اپنے مفروضات اور قیاسات سے دیتے ہیں جیسے یہ کہ کاتبین وحی کی کمی تھی ،ایک سوال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کا جامع اول کون ہے،اس اعتراض میں یہ کہانی بھی شامل ہے کہ جمع وتدوین قرآن کے مشورے میں عام مسلمانوں کو شامل نہیں کیا گیا؛ بلکہ یہ تمام تر حضرات ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ کی ذاتی دلچسپی اور جدوجہد کا نتیجہ تھا،موجودہ زمانے کے ولش ہوں یا ان سے بہت پہلے سرولیم میور ہوں ،نولد یکی ہوں ، ریورنڈ ہارن ہوں ، گاڈفری ہیگنز ہوں یا گبن اور جارج سیل ہوں ،ان سب کے اعتراضات بلکہ قرآن مجید پر حملوں کا رویہ بھی ایک ہے اور روش بھی یکساں ہے اور جمع وتدوین قرآن کے متعلق ان کی تحقیقات کا نصب العین بھی ایک ہے اور یہ تحقیقات آخر کار دو بحثوں میں سمٹ جاتی ہیں: ایک قرآن مجید کی کتابت اور تالیف ،دوسرے قراءتوں کا فرق۔

کتابت اور تدوین کے متعلق فرانسیسی مستشرقین بلاشیر نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نزول آیات کے وقت وحی کو تحریر میں لے آنے کی شدید خواہش پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار جس طرح کیا اس کا اندازہ ملاحظہ ہو، وہ لکھتا ہے:

کہ چوں کہ پہلی بار نزول وحی کے موقع پر رسول اللہ (ﷺ) سخت خوف و اندیشے میں مبتلا ہو چکے تھے، اس لئے ممکن نہ تھا کہ آپ (ﷺ) وحی لکھ لیا کرتے۔

مدینہ کے یہود تحریر و کتابت کے وسائل پر قابض ہو چکے تھے اور ان سے مسلمانوں کی کشمکش جاری رہی اس سے بلاشیر نے یہ نتیجہ نکالا کہ دورِ نبوت میں پورے قرآن کی کتابت نہیں ہو سکی تھی اور حافظہ کی مدد سے بھی قرآن کا تحفظ نہیں ہو سکا تھا، اس لئے ممکن ہے کہ قرآنی نص کے ساتھ وہ معمولی اضافے بھی خلط ملط ہو گئے ہوں، جن کو آئندہ زمانوں میں قرآن میں شامل کر لیا گیا ہو۔

تونس کے ایک فاضل ڈاکٹر التہامی نے اس سوچ کا جواب دیا کہ تحریری وسائل میں کمی و دشواری کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے قرآن کو یادداشت کے ذریعہ محفوظ کیا؛ لیکن وحی کو ضبط تحریر میں لانے پر بھی آپ نے اسی قدر توجہ دی، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے خلفاء راشدین اور حضرت ابی بن کعب، حضرت زید ثابت اور حضرت معاویہ ﷺ وغیرہ، جیسے نمایاں ترین صحابہ کرام سے کتابت وحی کا کام لیا، حدیث نبوی سے وحی قرآن کے اختلاط کے اندیشے اور تنہا قرآن ہی کے لئے تحریری وسائل کو استعمال کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ابتداء میں حدیث نبوی کو ضبط تحریر میں لانے سے منع فرمادیا تھا ''لا تکتبوا عنّي غير القرآن، ومن كتب عنّي غير القرآن فليمحه، وحدّثوا عنّي ولا حرج'' ڈاکٹر التہامی نے اور بھی بحث کی ہے، جس کو دار المصنفین کے سلسلہ اسلام اور مستشرقین'' میں دیکھا جا سکتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ اعتراضات اگر واقعی علمی ہوں اور حقیقت کی تلاش کی غرض سے ہوں تو ان کو قابل اعتناء سمجھا جا سکتا ہے؛ لیکن جب جمع قرآن کے سلسلے میں اس قسم کی توجیہات ہوں کہ ''چوں کہ آنحضرت ﷺ کو قربِ قیامت کا حد درجہ شدید احساس تھا اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ یہ تمام علوم قیامت کے آنے کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے، اسی لئے آپ ﷺ نے قرآن کو جمع کرنے کی ضرورت پر سرے سے زور ہی نہیں دیا'' یا یہ کہ ''کاتبانِ وحی کی قلت تعداد اس میں مانع ہوئی'' تو پھر اس فکر اور لاعلمی کا کیا کیا جائے، ذرا سی تلاش کے بعد یہ سچائی سامنے آجاتی ہے کہ کاتبین وحی کی تعداد ۴۴ کے قریب تھی خود بلاشیر نے ایک جگہ چالیس کا اعتراف کیا ہے، یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں حضور ﷺ کاتبین کے ذریعہ قرآن مجید کا املا کراتے تھے اور آیتوں کا محل

ومقام بھی متعین فرماتے تھے؛ جیسا کہ حضرت زید بن ثابت کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ ''کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع ''ایک جگہ بلاشیر نے قربِ قیامت والے خیال کی تردید بھی کی کہ '' کازانوف کی اس رائے کا نہ تو علمی حلقوں میں کوئی وزن ہے اور نہ ہی اس کا علم سے تعلق ہے'' لیکن پھر جو جملہ لکھا وہ ہی استشراقی روح کا سچا نمونہ ہے کہ :

> یوم آخرت کا انذار اور دھمکی صرف مکی دور تک محدود تھی ، مدنی عہد میں جو اسلامی شریعت کی ترقی کا دور تھا یہ چیز مفقود تھی۔

اب یہ اعتذار ہے یا ذہن میں بسی ہوئی گمراہی کے اخراج کا عیارانہ طریقہ، اس کا کیا جواب ہو؟ ہم نے ابھی عرض کیا کہ قرآن مجید کے سلسلے میں مستشرقین کو چند ہی پہلو ایسے ملے جن سے وہ شک وشبہ کی فضا بنا سکیں، ان میں سب سے پرزور اور پرشور اعتراض یہی ہے کہ اس کا جامع اول کون؟ اس سلسلے میں انسائیکلو پیڈیا کا مضمون نگار لکھتا ہے کہ :

> ایک روایت میں ہے کہ کسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی آیت دریافت کی تو ان کو بتلایا گیا کہ وہ فلاں صاحب کو یاد تھی جو غزوہ یمامہ میں شہید ہو گئے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت افسوس ہوا اور انھوں نے قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا؛ چنانچہ اس حکم کے مطابق سب سے پہلے قرآن مجید ایک مصحف میں جمع کیا گیا ؛ لیکن بعض دوسری روایتوں کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کام شروع کیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے جمع قرآن کا کام انجام دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تدوین کی۔

اس پوری عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ بعض ناقابل اعتبار اور متضاد روایتوں کو بڑی مہارت اور چابک دستی سے یکجا کر کے اپنے مفاد میں استعمال کیا گیا، اول تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کو حافظ ابن حجرؒ نے منقطع قرار دیا اور یہ تصریح بھی بدلائل کردی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اس کام کا مشورہ دیا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا کہ بالآخر مجھ کو سورۂ توبہ کے آخر کی آیت ''لقد جاء کم رسول الخ '' حضرت ابوخزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملی جو اور کسی کے پاس نہ تھی ،یعنی جمع قرآن کا کام عہد صدیقی ہی میں پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا

اور یہ بھی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے کمال احتیاط کی دلیل ہے کہ انھوں نے صرف اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں کیا؛ بلکہ لکھی ہوئی آیت کی تلاش جاری رکھی، اصل بات یہ ہے کہ مستشرقین نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بھی متہم کیا اور یہ کہہ کر کہ وہ مختلف عوامل سے متاثر تھے جن کے اثرات کی کارفرمائی لامحالہ اس کام یعنی جمع قرآن پر بھی اثر انداز ہوئی، اب یہ مختلف عوامل کیا تھے، اثرات کی کارفرمائی کیا تھی؟ اس کی کوئی دلیل نہیں، اس بحث میں ایک دسیسہ کاری کا نمونہ یہ بھی ہے اور جسے بڑے بڑے شد و مد سے یہ مستشرقین بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے دوسرے تمام نسخوں کو جلا دیا اور صرف سرکاری نسخوں کو باقی رکھا اور یہی حکم تمام شہروں میں نافذ کر دیا؛ البتہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نواؤں نے اس کی پرزور مزاحمت کی، اس سلسلے میں حقیقت یہ بیان کی گئی کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقے نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس علاحدہ مصحف کا ذکر عادت کے مطابق مبالغہ آرائی سے کیا اور اس کو بنیاد بنا کر مصحف عثمانی کی صداقت وصحت کو مجروح کرنے کی کوشش کی؛ حالاں کہ تصویر بالکل واضح ہے کہ یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جمع وتدوین قرآن کے خلاف تھے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مصحف سے اختلاف کے بارے میں بہت سے بہت یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس معاملہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو اس کے لئے زیادہ مناسب سمجھتے تھے، مگر جب ان کو حقیقت حال معلوم ہوئی تو انھوں نے اپنی رائے سے رُجوع کیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ روایتیں ہیں کہ انھوں نے معوذتین سے انکار کیا؛ لیکن تمام محققین اس کو افترائے محض سمجھتے ہیں، امام نووی نے صاف لکھا کہ اس قول کی نسبت قطعی صحیح نہیں، ابن حزم نے لکھا کہ یہ اتہام ہے، سیوطی نے یہ تمام اقوال جمع کر دیئے ہیں؛ لیکن بقول علامہ شبلی یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ سورتیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک داخل قرآن نہیں تو اس سے قرآن مجید کے تواتر اور قطعیت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، اس سے صرف اس قدر نتیجہ نکل سکتا ہے کہ انھوں نے یہ سورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھیں اور اپنے سماع کے سوا وہ اوروں کے سماع کو قطعی نہیں سمجھتے تھے۔

اس پوری بحث کا مطالعہ کرنے میں مستشرقین کا یہ رویہ بڑا دلچسپ نظر آتا ہے کہ انھوں نے چند باتوں کو مسلسل دہرانے کا عمل جاری رکھا، ابھی حال ہی میں محمد مصطفیٰ الاعظمی کی انگریزی کتاب ''دی ہسٹری آف دی قرآن ٹیکسٹ'' سامنے آئی، اس کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۳ء میں چھپا، ہمارے سامنے ۲۰۰۸ء میں چھپنے والا ایڈیشن ہے، اس کے حصہ سوم میں استشراقی تحقیق پر الگ سے بحث کی گئی ہے، اس میں برگس ٹریزر Bergstrasser، جیفری، منگانا،

پرٹزل Pretzl، ٹُس ڈال وغیرہ مستشرقین کے اعتراضات نقل کئے گئے ہیں، یہ وہی اعتراضات ہیں کہ اگر واقعی قرآن مجید نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں جمع و مدون تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جنگ یمامہ میں حفاظ کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے قرآن کے غیر محفوظ ہو جانے کا خدشہ کیوں ظاہر کیا تھا، حضور ﷺ کے تحویل میں پورا مدون قرآن کیوں نہیں تھا اور اگر یہ تھا تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مصحف کی تیاری میں اس کو استعمال میں لانے میں ناکامیاب کیوں ہوئے؟ مصطفیٰ اعظمی نے جو جواب دیا وہ ان کے الفاظ میں یوں ہے کہ :

A lack of knowledge, intentional ignorence or a disregard for Muslim educational policies are the central culprits here.

یہی جواب پوری تفصیل سے روز اول سے دیا جاتا رہا، ہم یہاں سارے جوابوں کو نقل نہیں کر سکتے، مثلاً مولانا تقی عثمانی نے اپنی کتاب علوم القرآن میں صرف حفاظت قرآن کی تاریخ کا باب ہی نہیں باندھا، ایک پورا باب حفاظت قرآن سے متعلق شبہات اور ان کے جواب کا بھی وقف کر دیا، انھوں نے جن مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا ان میں ایف بہل Buhl، مارگولیوتھ، منٹگمری واٹ، نولدیکی، آرتھ جیفرے، گولڈزیہر وغیرہ ہیں، مولانا عثمانی کے جوابات شرح وبسط سے ہیں اور اس قدر مدلل ہیں کہ ان اعتراضات کی کوئی بنیاد نہیں رہ جاتی، ان سے پہلے مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے تدوین قرآن لکھ کر مستشرقین کے اعتراضات کو مضحکہ خیز بنادیا، مولانا گیلانی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وحضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فکر اور پھر جمع قرآن کے لئے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے درخواست کے معاملے میں جس خوبی سے صورت حال واضح کی اس کے بعد پھر کسی جواب کی ضرورت ہی نہیں رہتی، انھوں نے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ رسول اللہ ﷺ ہر آیت کے نزول کے ساتھ ہی اس کو لکھوا دیا کرتے تھے، لکھا کہ ''پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ جس کام کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا اس کام کو میں کیسے کروں'' کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور ایک ہی سائز پر لکھ کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا کام اور وہ بھی حکومت کی طرف سے اس کام کو انجام دینا، یہی ایسا کام تھا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی خدمت کو حکومت کی طرف سے انجام دینے کا مطالبہ کیا اور یہ کام حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سرگردگی میں انجام پایا، مولانا گیلانی کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جامع قرآن ہونے کی بات یہ ہے کہ آپ کے دور میں کتابت اور لکھاوٹ کی حد تک تلفظ اور لب ولہجہ کے اختلافات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس قول کہ ''أری أن نجمع الناس علی مصحف واحد'' کا یہی مطلب ہے کہ مقامی

لب ولہجہ کے اختلافات اب باقی نہ رہیں۔

مولانا گیلانی سے پہلے مستشرقین کے ان ہی اعتراضات پر علامہ شبلی نے جو تحریریں سپرد قلم کیں، وہ مختصر اور جامع ہونے کے لحاظ سے بے نظیر ہیں، مقالات شبلی میں اس موضوع پر ان کی دو تحریریں ہیں، ایک یورپ اور قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ اور دوسرے قرآن کی تدوین کی کیفیت کے عنوان سے ہے، اس میں انھوں نے مستشرق منگانا کے اس دعویٰ کا رد کیا ہے کہ قرآن مجید کے چند ایسے نہایت قدیم اجزا ہاتھ آ گئے ہیں جو موجودہ قرآن شریف سے مختلف العبارۃ ہیں اور جن کی صحت پر موجودہ قرآن سے زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ہے، پہلے مضمون کے متعلق علامہ شبلی نے لکھا کہ :

> قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو سب سے بڑا طعنہ دیا تھا وہ اس کا شیوہ تحریف تھا، جس کی بدولت توراۃ اور انجیل ہمیشہ تغیر وتبدیل کے مختلف قالب بدلتی رہی اور جس کی بدولت آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ آسمانی صحائف کے لحاظ سے زمینی کتابوں کے ساتھ بھی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد انھوں نے منگانا کی تحقیق کا جس طرح چیلنج کیا اور جس کا جواب آج تک منگانا یا ان کے پیروکاروں سے بن نہ آیا، اس کو مفصل مقالات شبلی میں دیکھا جا سکتا ہے، یہاں ہم تدوین وجمع قرآن سے متعلق ان کی بحث کے اہم نتائج کو ضرور بیان کریں گے اور وہ بھی ان ہی کے الفاظ میں کہ :

(۱) قرآن مجید خود آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بہت سے صحابہ کو زبانی یاد تھا۔

(۲) قرآن مجید کا ایک جملہ بھی ایسا باقی نہیں رہا جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں قلم بند نہ کر لیا گیا ہو۔

(۳) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اہتمام سے قرآن مجید کا جو نسخہ مرتب کرایا وہ تحریری نوشتوں سے مرتب ہوا تھا جس کی تصدیق ان لوگوں سے بھی کرائی جاتی تھی جو قرآن کے کلاً یا جزءً حافظ تھے۔

(۴) آنحضرت ﷺ کے زمانے میں سورتیں مرتب ہو چکی تھیں اور ان کے الگ الگ نام قائم ہو چکے تھے۔

(۵) جو نسخے ایسے تھے جن میں کاتبوں کی غلطی سے تغیر ہو گیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سب کو جلوا دیا۔

اب جب کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف ابتدا سے آج تک بہ تواتر محفوظ آیا تو کیا ایک ڈاکٹر منگانا کا بلا دلیل استنباط تمام عظیم الشان شہادتوں کے مقابلے میں ایک ذرہ بھی وقعت رکھتا ہے، علامہ شبلی کا یہ سوال آج بھی قائم ہے اور ان کا یہ دعویٰ بھی کہ مستشرقین کے ہزاروں دلائل سے بھی قرآن مجید، انجیل نہیں بن سکتا۔

اسی جملے پر اس گفتگو کو یہیں روکا جا سکتا ہے، ورنہ سرسید اور دوسرے اور علماء کی کاوشیں ہمارے سامنے ہیں،

جنھوں نے مستشرقین کی تحقیقات بلکہ تدلیات کا اصل چہرہ بے نقاب کر دیا ہے، مولانا گیلانی کا یہ جملہ بہت کچھ کہتا ہے جس کو انھوں نے مقبول شیعہ عالم علامہ طبرسی سے نقل کیا ہے کہ :

> تواتر و توارث کی جس راہ سے قرآن مجید منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اس کا مقابلہ بھلا یہ خود تراشیدہ افسانے کہاں تک کر سکتے ہیں۔

⊙ ⊙ ⊙

کتابیات

(۱) مقالات شبلی جلد اول۔
(۲) اسلام اور مستشرقین سات جلدیں۔
(۳) علوم القرآن: مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی۔
(۴) تدوین قرآن: مولانا مناظر احسن گیلانی۔
(۵) دی ہسٹری آف دی قرآنک ٹیکسٹ: ایم، ایم، الاعظمی۔
(۶) تاریخ القرآن: یعقوب علی عرفانی الاسدی۔

جمع قرآن اور مستشرقین

ڈاکٹر شاہد علی عباسی ⊙

مستشرقین نے مشرقی تہذیبوں، ثقافتوں، ادیان و مذاہب، علوم وفنون، قوانین وعادات، نسلوں، زبانوں، روایات ونظریات، طرز ہائے فکر وحیات وغیرہا کا مطالعہ مختلف مقاصد سے کیا، مشرقی ادیان میں اسلام کے مطالعہ کو صلیبی جنگوں نے ایک خاص جہت دے دی جوان کے معروضی تحقیق کے دعوی کے باوجود، باستثناء چند، ذہنی تحفظ وتعصب سے عبارت رہا، آج بھی یہ مخصوص رنگ تلبیسات، تدلیسات، تحریفات اور تغلیطات سے پُر بے شمار نام نہاد تحقیقات میں مختلف درجوں میں نظر آتا ہے، بائبل کے متون کی تقابلی تحقیق نے ان کے عقائد کی جڑوں کی سطحیت عیاں کردی، ہزار سالہ نفرت کے باوجود تلاش حق کے جذبہ نے جس انقلاب کا آغاز کیا اس نے مستشرقین کے عزائم مضبوط کردیئے، نئے منصوبوں میں سیاسی، تہذیبی وثقافتی اہداف سے قطع نظر، آج قرآن مجید ان کے خاص نشانے پر ہے، کام اگرچہ کوئی چار سو سال پیشتر شروع کردیا گیا؛ لیکن اُمتِ مسلمہ کب ہوش میں آئے گی ہنوز کوئی علم نہیں۔

جمع قرآن کے بارے میں مستشرقین میں *F.Schwally, Wensinck, Blachire (Ge'schichte de, Qorans) Noldeke Montogomary Watt, Alfred Guillaume, Caetani* اور *J.D. Pearson* کی تحریروں سے ان کے مندرجہ ذیل موقف ظاہر ہوتے ہیں :

۱- زبانی نسخہ رسول اکرم ﷺ کے عہد میں یا آپ ﷺ کی وفات کے کچھ ہی مدت بعد جمع ہوا جسے لکھا بھی گیا۔

۲- قابل قراءت نسخہ حضرت کے عہد خلافت میں جمع ہوا۔

۳- صوتی نسخہ چوتھی صدی ہجری میں جمع ہوا۔

۴- قرآن مجید کا کوئی مکمل تحریری متن رسول اکرم ﷺ کے حین حیات نہیں تھا۔

۵- قرآن مجید میں سے بعض مستشرقین کی صراحت کے مطابق کوئی حصہ بھی ضائع نہیں ہوا۔

۶- قرآن مجید اصلاً زبانی طور پر محفوظ تھا اور تحریری قطعات مختلف اشیاء پر موجود تھے۔

⊙ پروفیسر: اسلامک اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔

۷- خلیفہ اول کے دور میں پہلی مرتبہ سرکاری (کذا) نسخہ جمع یا مرتب ہوا۔

۸- مستشرقین لکھتے ہیں کہ راسخ العقیدہ گروہ کے پاس یہ تفصیل تاریخی لحاظ سے مقبول ہے؛ لیکن دیگر روایات میں موجود بکثرت تضادات اس کو قبول کرنے میں مانع ہیں؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار ایک آیت کی بابت دریافت کیا تو انھیں بتایا گیا کہ یہ آیت جس صحابی کے پاس محفوظ تھی وہ جنگ یمامہ میں شہید کر دیئے گئے؛ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کا حکم دیا، قرآن اولاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے جمع کیا، بعض روایات میں ہے کہ جمع تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں ہوا؛ لیکن تدوین کا حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں دیا، یہ اور بات ہے کہ تدوین مکمل ہونے سے پہلے ہی آپ کی وفات ہوگئی، 'کتاب المصاحف' اور 'اتقان' میں ایسی روایات موجود ہیں جن میں خلفاء اربعہ میں سے ہر ایک کو شرف اولیت سے منسوب کیا گیا۔

۹- کائتانی (Caetani) اور شوالی (Schwally) نے جنگ یمامہ کو جمع قرآن کا محرک ہونے پر شبہات ظاہر کئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جنگ یمامہ میں بہت کم حفاظِ قرآن شہید ہوئے، شوالی نے ان کی تعداد کل دو بتائی ہے اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار پیرسن (J.D.Pearson) نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ کسی ایک مسلمان نے بھی اس نسخہ کو مستند مانا ہے؟ مزید برآں وہ لکھتا ہے کہ اس قصہ میں عہد رسول کے تحریری قطعات سے استفادہ کا کہیں تذکرہ نہیں۔

۱۰- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں عراقی اور شامی فوجیوں کے معرکہ آذر بائجان میں ایک دوسرے سے اختلاف قراءت پر اُلجھنے کے باعث حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی توجہ دہانی پر چار یا پانچ نسخے عہد ابی بکر والے نسخہ کی بنیاد پر نقل کئے گئے، ایک نسخہ مدینہ ہی میں رہا اور دوسرے نسخے کوفہ، بصرہ، دمشق اور مکہ مکرمہ، اس ہدایت کے ساتھ روانہ کئے گئے کہ ان کے علاوہ تمام نسخوں کو تلف کر دیا جائے؛ لیکن کوفہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۱- مستشرقین شوالی (Schwally) کے اس استدلال کو اب تسلیم کرتے ہیں کہ مصحف عثمانی اور قراءت قریش میں کوئی مطابقت نہیں۔

۱۲- شوالی (Schwally) نے عہد عثمانی میں قائم کردہ کمیشن کے ارکان اور دیگر نسخ قرآن کے تلف کرنے کے حکم کے بارے میں بھی تحفظات وشبہات ظاہر کئے ہیں، وہ کہتا ہے کہ اگر واقعتاً ایسا ہوتا تو نمازوں میں قرآن کی تلاوت کے وقت ہی ہنگامہ کھڑا ہو جاتا جو کہ نہیں ہوا؛ لہٰذا اس کے قوی امکانات ہیں کہ یہ قصہ بھی وضع کیا گیا اور اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نام عہد ابی بکر رضی اللہ عنہ اور عہد عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ میں جمع کئے گئے نسخوں میں

تسلسل لانے کی غرض سے شامل کر دیا گیا۔

۱۳- عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، ابوموسیٰ الاشعری، ابوبکر، عمر بن الخطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب، حفصہ، عائشہ، اُم سلمہ، زید بن ثابت، انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، سالم مولی ابوحذیفہ، عبید بن عمیر، عبداللہ عمرو بن العاص اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے مصاحف کا مبینہ اختلاف مستشرقین کے نزدیک حفاظت قرآن کے خلاف ایک مضبوط دلیل ہے، ابن ندیم کی 'الفہرست' میں مندرجہ یہ عبارت ان کو بڑی محبوب ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مصحف نذر آتش کر دیا گیا، جس میں زمانی ترتیب ملحوظ رکھی گئی تھی اور یہ کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف سے مستعار تھا، جس میں دوسورتیں زائد تھیں۔

۱۴- حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب کے مصاحف میں کثرت سے اختلاف قراءت تھا؛ لیکن تاریخوں میں اسے کم سے کم کر کے بتایا گیا ہے۔

۱۵- جیفری (Jeffery) نے اسود بن یزید، علقمہ، حطان، سعید بن جبیر، طلحہ، عکرمہ، مجاہد، عطاء بن رباح، ربیع بن خثیم، اعمش، جعفر الصادق، صالح بن کیسان اور حارث بن سوید کے اختلاف مصاحف جمع کئے ہیں اور پیرسن (Pearson) کا کہنا ہے کہ جیفری (Jeffery) ثانوی مصاحف کے اولین ماخذ متعین کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

۱۶- عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں سورہ فاتحہ اور معوذتین شامل نہیں تھیں اگرچہ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ تقریباً دوسو سال قدیم ابن مسعود سے موسوم مخطوطہ میں اس نے سورہ فاتحہ کو پایا ہے۔

۱۷- عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ترتیب قرآن بھی مصحف عثمانی سے مختلف تھی۔

۱۸- ابن ندیم اور سیوطی کی مرتب کردہ سورتوں کی فہرست میں قدرے اختلاف ہے، ایک میں غیر موجود سورت کا نام دوسری میں موجود ہے۔

منسوخ آیات

۱۹- بیئر معونہ کے شہداء کے متعلق آیت ''ہماری طرف ہمارے قبیلہ کو خبر دے دو کہ ہم اپنے رب سے ملے، وہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوا اور اس نے ہماری خواہشات پوری فرما دیں''۔(۱)

۲۰- محصن کی سنگساری سے متعلق آیت ''الشیخ والشیخة إذا زنیا فارجموها'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ''رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رجم کیا اور میں نے رجم کیا، میں کتاب اللہ میں ''کوئی اضافہ'' کرنے آمادہ نہیں ورنہ مصحف میں آیت رجم درج کر دیتا؛ کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ آگے ایسے لوگ آئیں گے جو اس کو کتاب اللہ

---

(۱) برٹن [Burton]، ص:۴۹۔

میں نہ پاکر اسے قبول کرنے سے انکار کردیں گے۔(۱)

۲۱- ''الشیخ و الشیخة إذا زنیا فارجموھا ''قول عمرؓ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر نے کتاب اللہ میں اضافہ کردیا تو میں اس آیت کو مصحف کے حاشیہ میں لکھ دیتا،(۲) دوسری روایت میں ہے کہ اس آیت کو قرآن مجید کے اخیر میں لکھ دیتا،(۳) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آیت رجم بھی نازل ہوئی تھی؛ لیکن جنھیں یہ یاد تھی وہ یمامہ میں شہید ہوگئے۔

۲۲- ''اگر ابن آدم کے پاس دو وادی بھر مال ہو تب بھی اسے تیسری وادی کی خواہش ہوگی، صرف خاک ہی ابن آدم کے منھ اور پیٹ کو بھرے گی؛ لیکن اللہ توبہ کرنے والوں کو ہی معاف کرے گا''(۴) اور برٹن آگے لکھتا ہے کہ انس نے ابی کعب سے نقل کیا کہ ہم گمان کرتے رہے کہ یہ جملہ آیت قرآنی ہے، تاوقتیکہ سورۂ تکاثر نازل ہوئی۔(۵)

۲۳- آیت متعہ: ''امتعوھن ...... الی اجل مسمی ''۔(۶)

قرآن مجید کے موجودہ متن کے باب میں مستشرقین کی مزعومہ تحقیق

۱- قرآن کا موجودہ متن (مصحف) مسلمانوں کے اجماع کے مطابق نامکمل رناقص ہے۔(۷)

۲- مسلمانوں کا اس پر بھی اجماع ہے کہ پہلے مرحلہ میں [؟] متن قرآن کے متعدد نسخے صحابۂ رسول میں رائج تھے، جن کے متون ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہ تھے۔(۸)

۳- مسلمانوں نے اجماعی طور پر اس کی بھی صراحت کی ہے کہ قرآن اور سنت میں باہمی تضادات ہیں۔(۹)

دیگر نتائج بنام تحقیق

۱- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ میں نے سارا قرآن حاصل کرلیا، وہ کیا جانے کہ سارا قرآن ہے کیا؟ قرآن کا بہت سارا حصہ تو جاچکا، اس کو چاہئے کہ اس کے بجائے کہے، جو باقی بچا

---

(۱) برٹن Burton:۷۷، بحواله السنن الکبریٰ للبیهقی۔

(۲) حواله سابق ، بحواله : المبسوط للسرخسی۔

(۳) حواله سابق ، بحواله : حلیة الاولیاء۔

(۴) حواله سابق:۸۴، بحواله اتقان ، جواب للباجی، روح المعانی للآلوسی۔

(۵) حواله سابق:۸۴، بحواله المسند للأبی داود الطیالسی۔

(۶) حوالہ سابق۔ (۷) برٹن:۱۱۷ (۸) حوالۂ سابق۔ (۹) حوالہ سابق۔

میں نے وہ حاصل کیا۔(۱)

۲- سورہ توبہ کی آخری دو آیات ابوخزیمہ'' اور'' خزیمہ کے پاس ملیں۔

۳- نولدیکے (N?--ldeke) نے اس پر شبہ کا اظہار کیا ہے کہ نزول وحی کے ابتدائی دور میں رسول اکرم ﷺ نے وحی کی کتابت ونقل وحفاظت کا انتظام کرلیا تھا، اگر آپ ﷺ نے یہ انتظام نہیں کیا تھا تو یہ قطعی ممکن ہے کہ قرآن کا اولین/ابتدائی حصہ ضائع ہو چکا ہو۔(۲)

۴- قرآن کا غیر متلو حصہ مصحف میں درج ہونے سے رہ گیا۔(۳)

۵- برٹن سرخسی سے منسوب کرتا ہے کہ معاون قراءات درحقیقت قرآن کے مدرج حصہ میں مشتمل ہیں۔(۴)

۶- سورہ انفال کے بعد سورہ براءت حضرت عثمان ؓ کے ذاتی اجتہاد اور مضامین کی مشابہت کے سبب رکھی گئی۔(۵)

۷- اس امر کی کوئی شہادت نہیں کہ عہد عثمانی میں جمع قرآن کے بعد قراءت میں یکسانیت رائج ہوگئی، اس کے برخلاف کتب فقہ اور تفاسیر یہ بتاتی ہیں کہ اختلاف قراءت بڑھ گیا، (۶) یہ بات قابل توجہ ہے کہ فقہ میں کل دو کتابیں اور تفسیر میں کل سات کتابیں فاضل مؤلف کے پیش نظر رہیں۔

۸- دوسرے مقام پر یہی محقق لکھتا ہے: بلکہ اختلاف قراءات چوتھی صدی ہجری میں نمودار ہوا۔

۹- یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ مصحف عثمانی کے علاوہ کہیں کسی مقام پر [Dead Sea Scrolls کی طرح] کسی وقت دیگر مصاحف مل جائیں، بالخصوص جب کہ [عبداللہ] ابن مسعود ؓ نے اپنے تلامذہ کو اپنے نسخہ قرآن (کذا) کی نقلوں کو چھپا کر رکھنے کی تاکید کردی تھی۔(۷)

۱۰- جس طرح مصحف عثمانی کو مصحف رسول ﷺ (متن قرآن) سے ممتاز اور الگ رکھا گیا، اسی طرح مصحف عثمانی سے قراءات مختلفہ کو ممتاز اور علاحدہ رکھا گیا۔(۸)

۱۱- مصحف عثمانی ایک طرف دیگر صحابہ کے متون قرآن سے مختلف ہے تو دوسری طرف متن محمدی سے بھی مختلف ہے۔(۹)

۱۲- قرآن منزل کے مقابلہ میں مصحف عثمانی نامکمل اور ادھورا ہے۔(۱۰)

---

(۱) برٹن: ۱۱۷، بحوالہ اتقان۔ (۲) برٹن: ۱۲۹ (۳) ایضاً ص: ۱۳۰ (۴) ایضاً ص: ۱۶۱

(۵) ایضاً ص: ۱۶۴ (۶) ایضاً ص: ۱۶۹ (۷) ایضاً ص: ۱۷۸

(۸) ایضاً ص: ۱۸۳ (۹) ایضاً ص: ۱۸۴ (۱۰) ایضاً ص: ۱۸۴

۱۳- احادیث اس پر متفق ہیں کہ [حضرت] محمد[ﷺ] نے اپنے متبعین کے لئے کوئی محقق متن قرآن (Edited Text)[کذا؟] نہیں چھوڑا۔

۱۴- مسلمان باقاعدہ کبھی ایسا طریقہ نہیں وضع کر سکے، جس کی بنیاد پر حدیث کے مشمولات کی سچائی معلوم کر سکیں، سوائے اس کے کہ اخبار موضوعہ عقل کے پیمانہ پر صراحتاً موضوع و کذب ثابت ہو جائیں۔

ان دعووں میں اکثر کے جواب آگے آتی تحریر میں انشاء اللہ تعالیٰ قارئین کو مل جائیں گے، محققین کی نظر میں نہ کتاب المصاحف لابن ابی داوٗد، بوجہ ضعف مؤلف قابل اعتماد ہے نہ الاتقان فی علوم القرآن لعبد الرحمٰن السیوطی؛ کیوں کہ علامہ سیوطی کے پیش نظر اسلاف کے چھوڑے ہوئے خزانہ کا تحفظ رہا، صحت وضعف روایت سے انھوں نے تقریباً کلی طور پر صرف نظر فرمایا، دوسری کتابوں میں ماخوذ مواد ہمہ اقسام کے ضعف رکھتا ہے، ان پر مستزاد مستشرقین کا مشکوک رویہ ہے جو انتخاب روایات میں ان کے مفروضات کے تائیدی مواد ہی سے فائدہ اُٹھانے کے باعث ناقابل اعتبار ہے۔

اب آیئے ایک نظر صحیح، حسن روایات سے ثابت راسخ العقیدہ مسلمانوں کے موقف پر بھی ڈال لیں :

۱- رسول اکرم ﷺ پر قرآن مجید تقریباً ۲۲ سال چھ ماہ (جسے کبھی ۲۳؍سال سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے) کے عرصہ میں حسبِ موقع وحسبِ ضرورت تدریجاً قطعات کی صورت میں نازل ہوا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلاً ۔ (الفرقان:۳۲)

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا :

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْآنَهٗ ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهٗ ۔ (القیامۃ:۱۶-۱۸)

اور تیسرے مقام پر فرمایا :

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۔ (الحجر:۹)

بعض سورتیں مکمل یکبارگی نازل ہوئیں (مثلاً: سورۃ الکوثر، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفاتحہ، سورہ براءت) اور بعض سورتوں کے اجزاء وآیات مختلف موقعوں پر نازل ہوتے رہے، مکی ومدنی (ماقبل ہجرت ومابعد ہجرت) دور میں یہ بھی ہوا کہ منشاء الٰہی کے مطابق بعض سورتوں کا کچھ حصہ مکی دور میں نازل ہوا اور مابقی مدنی دور میں، بہر حال قرآن مجید نازل ہوتا رہا اور رسول امی ﷺ (روحی فداہ) مختلف قلم آشنا افراد صحابہ کو نازل شدہ آیات نزول وحی کے

فوری بعد لکھواتے رہے، لکھوانے کے بعد بالالتزام کاتب وحی سے لکھا ہوا حصہ سنتے رہے؛ تاکہ کتاب تصحیف ساعت وتصحیف کتابت وتصحیف بصارت وتصحیف قراءت سے محفوظ رہے، اطمینان صحت کے بعد متعلقہ کاتب وحی کو تلقین کرتے رہے کہ وہ تازہ نازل شدہ آیات دوسروں تک پہنچا دے؛ تاکہ دیگر اصحاب اگر لکھ سکتے ہوں تو لکھ لیں ورنہ کم از کم یاد کرلیں، معروف روایت کے مطابق قبیلہ قریش میں لکھنے پڑھنے کا رواج کم ہونے کے سبب کوئی سترہ (۱۷) افراد ہی فن کتابت سے واقف تھے، اوران میں سے چند افراد دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے؛ چنانچہ ان ہی افراد نے ابتداءً کتابت وحی کی خدمت انجام دی، جن اشیاء پر کتاب اللہ پہلے مرحلہ میں لکھی گئی ان میں پتلے مسطح پتھر، کھجور کی شاخیں، اونٹ کی محمل، گھوڑے کی زین، اونٹ، بکری، بھیڑ وغیرہ کی شانے کی ڈھلی ہوئی ہڈیاں، ان ہی کی دباغت شدہ پاک کھال، باریک چمڑہ، مہرق (حریر) اور تختیاں شامل تھیں، قرآن مجید میں کتاب، صحف، رق منشور، قراطیس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

۲- قرآن مجید کا جتنا حصہ لکھا لیا جاتا، اسے یاد کرلیا جاتا، کثرت سے تلاوت کیا جاتا، نمازوں میں پڑھا جاتا، ایک دوسرے کو سنایا جاتا؛ تاکہ غلطیوں کی فی الفور تصحیح ہوجائے اور حفظ پختہ تر ہوجائے، مختلف اوقات میں مختلف سورتیں یا مختلف آیات پڑھنے کے فوائد وفضائل ذوق تلاوت کو مہمیز دیتے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا استحضار صحابہ کرامؓ کو چوکنا رکھتا، ان کی خوش الحانی اور خشیت قلبی میں اضافہ کرتا اور قرآن مجید کی تلاوت کی کشش کوئی بھی موقع گنوانے سے انھیں دور رکھتی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَاماً وَّقُعُوْداً وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (آل عمران:۱۹۱)

قرآن مجید کی آیات پر عمل ان کا مقصد، معانی قرآن پر تفکر وتدبر ان کا مزاج بن گیا تھا۔

۳- قرآن مجید کی تازہ نازل شدہ آیات کو کس سورت میں، کن آیات سے پہلے یا کن آیات کے بعد درج کیا جانا ہے، اس کی بھی ہدایت فرمادیتے؛ تاکہ کسی قسم کے اشتباہ کو راہ نہ ملے۔

۴- قرآن مجید کے حفظ کے فضائل بیان فرماتے، مسند امام احمد بن محمد بن حنبل، سنن ترمذی، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں روایت نقل کی گئی ہے کہ:

يقال لصاحب القرآن: اقرء، وارتق، ورتل كما كنت ترتل في الدنيا فإنّ منزلك عند آخر آية تقرؤ ها.

صحیح بخاری میں ہے :

إن أفضلكم من تعلّم القرآن وعلّمه .

صحیحین میں روایت کی گئی ہے :

تعاهدوا القرآن ، فو الذي نفسي بيده هو أشد تفصّياً من الإبل في عقلها .

چنانچہ صحابہ کرام ﷺ کا معمول رہا کہ قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوتا اسے فوراً حفظ کر لیتے ، بیئر معونہ کے سانحہ میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے بھیجے گئے ستر (۷۰) حفاظ قرآن صحابہ ﷺ شہید کر دیے گئے ، اس ایک واقعہ کثرت حفاظ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۵- جیسے جیسے نئے نئے قبائل اور نئے نئے قریے مشرف بہ اسلام ہوتے یا اسلام کے بارے میں جاننے کی دلچسپی ظاہر کرتے ، ان کے پاس حفاظ قرآن روانہ کئے جاتے ؛ تا کہ اسلام کی بنیادی کتاب ان تک پہنچ جائے۔

۶- مخصوص سورتوں کو خاص خاص موقعوں پر (مثلاً سونے سے پہلے سورہ اخلاص ومعوذتین) تلاوت کرنے کے دنیوی (مثلاً سورہ واقعہ سے فاقہ کشی دور ہونے) و اخروی (مثلاً سورہ فاتحہ کے نصف قرآن ، سورۂ اخلاص کے ثلث قرآن ، سورہ یٰسین کی تلاوت کے دس مرتبہ قرآن ختم کرنے کے اجر کے برابر) فوائد ارشاد فرماتے اور صحابہ کرام فوراً عمل پیرا ہو جاتے۔

۷- قرآن مجید دیکھ کر پڑھنے کی فضیلت بیان فرماتے ، جس کے لئے لکھا ہونا ضروری ہوتا۔

۸- قرآن مجید نماز میں کثرت سے پڑھنے کی ترغیب دیتے اور خود بھی اس پر عمل فرماتے۔

۹- کم خواندہ افراد کو اٹک اٹک کر پڑھنے کے دہرے ثواب سے آگاہ فرماتے ؛ چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں حضرت عائشہ ﷺ سے روایت نقل کی گئی ہے :

مثل الذى يقرء القرآن وهو حافظ له مع السفرة الكرام ومثل الذى يتعاهده وهو عليه شديد فله اجران .

بخاری ، مسلم ، ابوداؤد ، ترمذی ، نسائی اور ابن ماجہ ہی نے حضرت عائشہ ﷺ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے :

قال رسول الله ﷺ : "الماهر بالقرآن مع السفرة ، الكرام البررة والذي يقرء القرآن ويتتعتع فيه وهو عليه شاق له أجران" .

۱۰- مختلف صحابہ کرام ﷺ کو تلاوت قرآن کا حکم فرماتے اور ان کے حسن قراءت کی تعریف فرماتے ، بعض

خوش الحان صحابہ ؓ سے قرآن سن کر ان کو تلاوت کے موقع پر بڑی حکمت سے خشیتِ قلبی و اشکباری کی طرف توجہ دلاتے۔

۱۱- قرآن مجید کی سورتوں کے ناموں سے صحابہ کرام ؓ کو مطلع فرماتے تاکہ سورتوں میں باہم تمیز ہو سکے، بعض سورتوں کے متعدد نام خاکسار کے نزدیک ان سورتوں کے متعدد اوصاف کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

۱۲- بعض سورتوں کی تلاوت کا اجر خصوصی یا فائدہ بیان فرماتے، ان میں سورہ یٰسین، فاتحہ، اخلاص، کافرون، زلزال، تکاثر، زہراوین، ملک، معوذتین شامل ہیں۔

۱۳- قرآن مجید کا جتنا حصہ نازل ہو چکا، اسے ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ماہِ رمضان میں سناتے، عرضہ اخیرہ میں قرآن مجید دو مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سنایا، اس موقع پر حضرت زید بن ثابت کو بھی مکمل قرآن دو بار سننے کی سعادت ملی۔

۱۴- قرآن مجید سیکھنے اور سکھانے والے کی بابت فرمایا: ''**خیرکم من تعلم القرآن و علمہ**'' کیا اس میں سماعت، کتابت، قراءت، تلقین، تحفیظ، تبلیغ، تفہیم، تدریس، توضیح، تفسیر، تبیین، تفکر و تدبر، باہمی مذاکرہ، مزاولت و ممارست سب نہیں آ گئے؟ اور کیا صحابہ کرام ؓ سے لے کر اخلاف تک یہ سب اُمور ثابت نہیں؟

۱۵- مدینہ طیبہ تشریف آوری کے کچھ عرصہ کے بعد آپ ﷺ نے حکم دیا: جس نے بھی کتاب اللہ کے ساتھ کوئی لفظ یا عبارت (توضیحی، تفسیری، ارشادِ نبوی ﷺ) لکھا ہو اور اس کو مٹا دے '**فلیمحہ**' پھر جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اب کلامِ الٰہی اور کلامِ بشری میں کسی قسم کا خلط ملط نہیں ہو گا، لکھنے کی اجازت دے دی۔

۱۶- جزیرۃ العرب میں مختلف قبائل آباد تھے، جن کے لہجے، لغات، روزمرہ، محاورے اور طریقہ تلفظ جدا جدا تھے اور قرآن مجید عربی مبین میں نازل ہو رہا تھا، اس کے مخاطب اول بلحاظ تاریخ قبیلہ قریش اور مخاطب دوم دیگر قبائل تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**انزل القرآن علی سبعۃ احرف**'' (علامہ سیوطی نے '**الأزھار المتناثرہ**' میں اسے متواتر احادیث میں شمار کیا ہے) قرآن مجید کی متنی و لغوی تحقیق کے ماہر علماء جانتے ہیں کہ اس سے قرآن مجید کے لسانی و معنوی فوائد کا دائرہ کتنا وسیع ہو گیا۔

۱۷- قرآن مجید کی جو آیات منسوخ تلاوت ہو جاتیں ان پر خط تنسیخ پھیرنے کا حکم فرما دیتے (مسئلہ نسخ پر اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے توفیق ملی تو علاحدہ ایک مضمون لکھا جائے گا)۔

ممتاز حفاظ صحابہ و صحابیات

(۱) حضرت ابوبکر صدیق (۲) عمر بن الخطاب (۳) عثمان بن عفان (۴) علی بن ابی طالب (۵) عبداللہ

ابن عمرو بن العاص (٦) عبداللہ بن مسعود (۷) عبداللہ بن عمر (۸) ابی بن کعب (۹) معاذ بن جبل (۱۰) زید بن ثابت (۱۱) ابوزید (۱۲) ابوالدرداء (۱۳) قیس بن صعصعہ (۱۴) سعد بن منذر (۱۵) عقبہ بن عامر الجہنی (۱٦) تمیم الداری (۱۷) معاذ بن حارث (۱۸) عبداللہ بن سائب (۱۹) سعد بن عبید بن نعمان (۲۰) مسلمہ بن مخلد (۲۱) سالم مولی ابی حذیفہ (۲۲) طلحہ (۲۳) سعد بن ابی وقاص (۲۴) حذیفہ بن الیمان (۲۵) ابوموسیٰ الاشعری (۲٦) ابوہریرۃ (۲۷) عبادۃ بن صامت (۲۸) ابوحلیمہ معاذ (۲۹) مجمع بن حارثہ (۳۰) فضالہ بن عبید (۳۱) عمرو بن العاص (۳۲) سعد بن عبادہ (۳۳) عبداللہ بن عباس (۳۴) ابوایوب انصاری (۳۵) عبید بن معاویہ (۳٦) سلیمان بن ابی حثمہ (۳۷) عبداللہ بن عبدتہم بن عفیف ذوالبجادین (۳۸) اُم المومنین عائشہ (۳۹) اُم المومنین حفصہ (۴۰) ام المومنین اُم سلمہ (۴۱) اُم ورقہ رضی اللہ عنہا۔ (۱)

صحیح بخاری کی ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابی بن کعب، معاذ، زید اور ابوزید رضی اللہ عنہم کی بابت جمع قرآن کی صراحت ملتی ہے اور دوسری روایت میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نام کی جگہ ابوالدرداء کا نام ملتا ہے، بعض لوگوں کو جمع قرآن سے صرف حفظ قرآن کا دھوکا ہوا ہے اور بعض دوسرے لوگوں نے اس کو حصر پر محمول کیا؛ حالاں کہ سیاق پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کلمہ فخر ہے نہ کہ کلمہ حصر، جو اوس اور خزرج کے درمیان ہوئے ایک مباحثہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اوس پر خزرج کی فضیلت بتانے کے لئے ارشاد فرمایا تھا، مزید برآں خزرج سے مکمل قرآن کو قید کتابت میں لانے والے مراد تھے نہ کہ حفظ کرنے والے، ورنہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے امراء سے حفاظ قرآن کی فہرستیں طلب کی تھیں تو ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے علاقہ کے تین سو (۳۰۰) سے زائد افراد کی فہرست روانہ کی تھی، جس سے دوسرے علاقوں میں حفاظ کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور فن کتابت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو فن کتابت سے بخوبی واقف تھے ان میں خلفاء اربعہ اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے علاوہ (۱) عبداللہ بن ارقم (۲) حنظلۃ بن ربیع (۳) عمرو بن رافع (۴) اوس بن خولی (۵) ابوعبس عبدالرحمٰن (٦) ابی بن کعب (۷) اُم المومنین حفصہ بنت عمر (۸) سعد بن ربیع (۹) شہر بن سعد (۱۰) عبداللہ بن زید (۱۱) ابوخزیمہ خزیمہ بن ثابت (۱۲) منذر بن عمرو (۱۳) اسید بن حضیر (۱۴) سعد بن عبادہ (۱۵) رافع بن مالک

(۱) طبقات ابن سعد، صحیح بخاری، فتح الباری للعسقلانی، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، کنز العمال، الاستیعاب لابن عبدالبر، اسد الغابہ لابن اثیر، مفتاح السعادۃ، لطاش کبری زادہ، تہذیب الکمال، تذکرۃ الحفاظ للذہبی، تہذیب التہذیب للعسقلانی، الاصابۃ للعسقلانی)

(۱۶) زید بن ثابت (۱۷) ابوزید (۱۸) ابوالدرداء (۱۹) معاذ بن جبل (۲۰) عبداللہ بن رواحہ (۲۱) ابویونس مولی اُم المومنین عائشہ (۲۲) عبدالرحمٰن بن حر (۲۳) عبداللہ بن سعید (۲۴) نافع بن طریب (۲۵) زبیر بن العوام (۲۶) سعید بن العاص (۲۷) علاء الحضرمی (۲۸) خالد بن ولید (۲۹) محمد بن مسلمہ (۳۰) عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول (۳۱) مغیرہ بن شعبہ (۳۲) شرحبیل بن حسنہ (۳۳) عبداللہ بن ابی سرح (۳۴) خباب بن الارت ﷺ کے نام ملتے ہیں، جن میں متعدد صحابہ نے کتابت وحی میں بھی حصہ لیا، غزوۂ بدر کے بعد تعداد غیر معمولی تیزی سے بڑھی، اس فہرست میں مندرج بعض افراد مثلاً زید بن ثابت نے غزوۂ بدر کے بعد مکی قیدیوں سے ہی فن کتابت وقراءت سیکھا۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کے عہد خلافت میں جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کی فوج کے ہاتھوں ستر (۷۰) حفاظ قرآن کی شہادت، حضرت عمر ﷺ کا اضطراب اور حضرت ابوبکر ﷺ پر جمع قرآن کے لئے بار بار اصرار، حضرت ابوبکر ﷺ کا انکار پھر بالآخر رضامندی، زید بن ثابت کا تقرر، اسلامی ریاست میں عہد رسول ﷺ میں آپ ﷺ کے حکم پر لکھی گئی، رسول ﷺ کو سنائی گئی اور رسول اکرم ﷺ کے اطمینان کے بعد دوسروں تک پہنچائی گئی آیات دار الخلافہ لانے اور زید بن ثابت کو دو گواہوں کے ساتھ ان آیات کو دینے کا عام اعلان، سورہ توبہ کی آخری دو آیتوں کی ابوخزیمہ خزیمہ بن ثابت انصاری ﷺ کے پاس دستیابی، المصحف الامام کی تیاری اور خلیفہ سوم حضرت عثمان ذوالنورین ﷺ کے زمانہ خلافت میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما کی توجہ دہانی پر قرآن مجید کے سات یا آٹھ نسخوں کا اہتمام اور دیگر نسخوں کا احراق ایسے موضوعات ہیں جن پر بعض محقق علماء نے بہت سخت جرح کی ہے؛ لیکن خاکسار ان روایتوں کو رد کرنے کی بوجوہ ضرورت نہیں محسوس کرتا؛ کیوں کہ ان سے تحفظ قرآن پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

۱- رسول اکرم ﷺ سے منقول قوی یا ضعیف کوئی ایسی روایت نہیں ملی جس میں آپ ﷺ کو صراحتاً بتادیا گیا ہو کہ آخری آیت نازل ہو چکی؛ لہٰذا قرآن مجید کو یکجا لکھوا دیجئے، یعنی عقلاً اس کا امکان باقی تھا کہ مزید کوئی سورت یا کوئی آیت نازل ہوتی۔

۲- قرآن مجید مختلف اشیاء پر لکھا جمع تھا؛ لیکن ترتیب کے بارے میں صرف حفاظ قرآن یا کاتب وجامع ہی جانتے تھے، اگر ان سب کے گذر جانے کے بعد ترتیب بگڑ جاتی یا توضیحی وتفسیری عبارت کو جامع وکاتب کے ورثہ قرآن کا جزء ماننے لگتے تو اختلاف کی یکسوئی کیسے ہوتی؟

۳- روایات کے بعض اجزا سے قطع نظر جو جزء حاصل روایات ہے، وہ ہے قرآن مجید کا بین الدفتین جمع کیا جانا، اگر کوئی قوی شہادت ایسی مل جاتی ہے جس کی رو سے رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں آپ ﷺ کے حکم پر قرآن مجید کو مجلد شکل دے دی گئی ہو تو راقم اپنے موقف سے رُجوع کرے گا۔

۴- صحابہ کرام ﷺ نے رسول اکرم ﷺ سے سنا، آپ کو قرآن سنایا، اپنے اپنے نسخے تیار کیے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی رسول اکرم ﷺ سے دریافت کر کے یا آپ ﷺ کے خطاب میں قرآنی لغات وآیات پر توضیحی یا تفسیری اہم نکات سن کر اپنے اپنے نسخوں میں حاشیہ میں یا بین السطور، خاص اپنی رہنمائی کے لئے درج کر لئے، اس کا اندیشہ بہر حال تھا کہ صحابہ کے ورثہ میں سے کوئی فرد تحریر کی یکسانیت کے باعث اشتباہ میں پڑ جاتا اور یہ اشتباہ منافقین ومفسدین کی شرارت سے اختلاف میں اور اختلاف تفرقہ میں بدل جاتا، جب بیبا کی اور قصور فہم کے سبب ایک فرقہ وجود میں آ سکتا تھا تو سبائی فتنہ تحریری شہادت کو بآسانی تفریق کو ہوا دینے مضبوط بنیاد بنا سکتا تھا، ایسا نہ ہونا قرآن کی صحت پر قوی دلیل ہے۔

۵- یہ ممکن ہے کہ روایات میں ادراج ہوا ہو؛ لیکن سرے سے ان روایات یا واقعات کا انکار کر دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

۶- رہی بات عبد اللہ بن مسعود ﷺ، سورۃ الفاتحہ اور معوذتین کی، یا ابی بن کعب ﷺ اور دُعاء قنوت کی، یا مزعومہ ترتیب عثمانی کی تو بتواتر سے ثابت روایات کے مقابلہ میں ان اخبار احاد وضعاف کی کوئی اہمیت نہیں، پھر قراءات متواترہ سے امام عاصم کوفی، امام کسائی، امام حمزہ اور امام خلف سے جو قراءات اور نسخے ہم تک پہنچے ہیں، ان میں سورہ فاتحہ اور معوذتین شامل ہیں، دُعاء قنوت شامل نہیں اور ترتیب وہی ہے جو عرضہ اخیرہ میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سنائی تھی اور جو تواتر سے بفضل اللہ ہم تک پہنچی، تواتر لفظی اور تواتر طبقہ کے ہوتے غریب روایات کو ترجیح دینا تحقیق نہیں فریب اور کج فہمی ہے۔

۷- ڈاکٹر سید وحید الدین (پروفیسر شعبۂ فلسفہ: جامعہ عثمانیہ و دہلی یونیورسٹی و جامعہ ہمدرد) دوسری جنگ عظیم کے موقع پر جرمنی میں بغرض تحصیل دکتورہ موجود تھے، انھوں نے ایک مرتبہ خاکسار سے ایک نجی ملاقات میں بتایا کہ جرمنی میں ایک مرکز برائے تحقیق کتب آسمانی قائم کیا گیا تھا، جس میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید کے قدیم مخطوطات کے متون کی تقابلی تحقیق جاری تھی، ابتدائی نتائج نے محققین کو پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا کہ یہودیت ونصرانیت کی بنیادی مخطوط کتابوں میں دو لاکھ سے زائد نا قابل حل اختلافات پائے گئے تھے، پھر انھوں نے قرآن مجید کی طرف توجہ کی اور ہزاروں قدیم مخطوطات اور ان کی فلمیں بنوا کر ان کا تقابلی مطالعہ کیا تو ابتدائی نتائج نے انھیں حیران کر دیا؛ کیوں کہ انھیں چند سو سے اختلافات نہ ملے اور ان اختلافات کی نوعیت ایسی تھی کہ بآسانی حل کر لئے جاتے، تحقیق کا کام آگے بڑھ رہی رہا تھا کہ اتحادی افواج کی جانب سے داغے گئے بم اس مرکز کی عمارت پر گرے

اور وہ عمارت اپنے اس بے بہا خزانہ کے ساتھ مکمل تباہ ہوگئی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے 'خطبات بہاولپور' سے اس بیان کی توثیق ہوتی ہے۔

خاکسار کو اس کا احساس ہے کہ یہ مقالہ تشنہ ہے، ممکن ہے یہ تشنگی کسی کو تفصیلی تحقیق کے لئے آمادہ کردے، اگر کوئی فاضل اس سلسلہ میں سامنے آتا ہے یا کوئی مرکز تحقیق اس موضوع پر منصوبہ بند طریقہ پر آگے بڑھتا ہے تو خاکسار سمجھے گا کہ اس نے اپنا فرض ادا کردیا۔

وللہ الحمد واللہ أعلم، وعلمه أتمّ وأحکم.

⊙ ⊙ ⊙

چھٹا باب

ہندوستانی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم

شمالی ہند کی زبانیں اور خدمتِ قرآن مجید

ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی ⊙

قرآن مجید وہ انقلابی کتاب ہے، جو انسانی زندگی کے لئے ایک مکمل دین اور جامع نظام فکر وعمل فراہم کرتا ہے، جو قابل عمل بھی ہے اور دین و دنیا کی فلاح وسعادت اور بلندی کا ضامن بھی، انسانی زندگی کا کوئی انفرادی یا اجتماعی شعبہ ایسا نہیں، جس کے لئے قرآن نے واضح ہدایات اور اُصولی احکام نہ دیئے ہوں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے عرب سرزمین پر وہ عظیم الشان ثقافتی وتہذیبی انقلاب برپا کیا، جس کی نظیر چشم عالم نے آج تک نہیں دیکھی۔

قرآن مجید کی اسی عظمت واہمیت کے پیش نظر، ملت کبھی بھی اس کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہیں رہی، دین کا تصور خواہ جو بھی رہا ہو، مگر تاریخ کے ہر دور میں بہر حال کچھ نہ کچھ افراد انفرادی یا اجتماعی طور پر موجود رہے ہیں، جنھوں نے قرآن کا علم بلند رکھنے کے لئے بیش بہا قربانیاں دی ہیں، جو تاریخ کے صفحات میں سنہرے حرفوں میں محفوظ ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب اسلام جزیرۂ عرب سے نکل کر باہر دنیا کے کونے کونے میں پہنچنے لگا تو اسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور عرب سے باہر دنیا کے جس حصہ کو عجم کہا گیا، سمرقندی و بخارا، اندلس و ہندوستان میں ایسے بڑے بڑے اور جید علماء پیدا ہوئے، جنھوں نے دین کی خدمت عربی زبان ہی میں کی اور قرآن وسنت پر ایسی ایسی گراں قدر تصنیفات، تفسیریں وتشریحات ودیگر مکتوبات چھوڑیں جو آج بھی زندہ ہیں اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، امام بخاریؒ اور شاہ ولی اللہؒ کا شمار ایسے ہی عظیم علماء میں ہے جو عربی نہیں، عجمی تھے۔

جب اسلام دنیا کے دیگر ملکوں میں پہنچا اور ضروری بات تھی کہ عربی زبان تمام دنیا میں بولی اور سمجھی نہیں جاتی تھی تو مسلمانوں نے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ وہ قرآن وحدیث کے ترجمے مقامی زبانوں میں پیش کریں؛ تاکہ وہ لوگ بھی اس سے مستفید ہوسکیں، جو عربی نہیں جانتے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، قرآن مجید کو اپنی زبان میں سمجھ سکیں اور اس سے واقف ہوسکیں۔

⊙ ڈائریکٹر: القرآن انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ۔

تراجم کی تاریخ میں غالبًا سب سے پہلے مشہور و معروف صحابی حضرت سلمان فارسی ؓ نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ اپنے ہم وطن نومسلموں کے لئے فارسی میں کیا تھا، ترجمۂ قرآن کی تاریخ کا تعین خود نبی کریم ﷺ کی سنت سے ہوتا ہے، آپ ﷺ نے جو دعوت نامہ خسرو پرویز شاہ فارس اور قیصر روم ہرقل کے نام بھیجے ہیں، ان میں قرآن کے الفاظ بھی نقل فرمائے ہیں؛ چنانچہ کسریٰ کے نام اپنے مکتوب گرامی میں آپ ﷺ نے قرآن کے یہ الفاظ ''مَن کَانَ حَيّاً وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِيْنَ '' (یٰسین:۷۰) اور قیصر کے نام اپنے نامۂ مبارک میں یہ الفاظ نقل فرمائے :

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ . (آل عمران:۶۴)

اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی سیدھی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی چیز کو اس کا شریک قرار دیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ سے ہٹ کر باہم ایک دوسرے کو اپنا رب بنائے پھر اگر وہ منھ موڑیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم ہیں۔

ظاہر ہے قیصر و کسریٰ کی زبان عربی نہ تھی، انھوں نے ترجمان ہی کے ذریعہ آپ ﷺ کے مکتوب کو سمجھا، ترجمان نے نبی ﷺ کے الفاظ کے ساتھ قرآنی الفاظ کے مفہوم و معنی کو بھی مخاطب کی زبان میں ادا کیا، نبی کریم ﷺ اس بات سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے کہ قرآن کے وہ الفاظ جو آپ ﷺ اپنے مکتوب میں نقل فرما رہے ہیں، لازماً ان کا ترجمہ کیا جائے گا؛ لیکن دینی ضرورت کے تحت آپ ﷺ نے اس میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی، یہ دینی ضرورت آج بھی باقی ہے، یہاں یہ شک و شبہ یا بعض حضرات کا تامل بھی ختم ہو جانا چاہئے جو آج تک قرآن مجید کے ترجمے پڑھنے اور اسے عام کرنے کے سلسلے میں ہے۔

الحمد للہ اس وقت دنیا کی 149 زبانوں میں 367 تراجم و تفاسیر کا کام ہو چکا ہے؛ حالاں کہ تعداد کوئی یقینی اور حتمی تعداد نہیں ہے، اس سے کہیں زیادہ یہ تعداد ہو سکتی ہے اور دن بدن اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

مزید تفصیلات جاننے کے لئے درج ذیل کتابیں مفید و معاون ہو سکیں گی :

(۱) القرآن فی کل لسان : ڈاکٹر حمید اللہ، پیرس۔

(۲) جائزۂ تراجم قرآن : مولانا محمد سالم قاسمی و مولانا سید عبد الرؤف، دیوبند، مجلس معارف القرآن ۱۹۶۸ء۔

(۳) قرآن کریم کے جملہ تراجم کی مکمل ببلوگرافی ۱۵۱۵ء-۱۹۸۰ء (مرکز الابحاث للتاریخ والفنون والثقافۃ الاسلامیۃ، ترکی)۔

(۴) قرآن کریم کے اُردو تراجم، کتابیات: ڈاکٹر احمد خاں، نظر ثانی: سید عبدالقدوس ہاشمی (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)۔

شمالی ہند کی معروف ومشہور زبانیں، ہندی، کشمیری، پنجابی، سندھی، گجراتی، آسامی، اُڑیہ، منی پوری، نیپالی، بھوجپوری اور آدی باسی سنتھالی وغیرہ ہیں جو کشمیر، پنجاب، راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، بہار، جھارکھنڈ، چھتیس گڑھ، اُڑیسہ، آسام، بنگال، منی پور، میزورم وغیرہ ریاستوں میں بولی جاتی ہیں، اس کے علاوہ بھی دیگر زبانیں ہوسکتی ہیں جو علاقائی طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔

ان زبانوں میں بعض جیسے گجراتی، بنگالی، کشمیری، سندھی، پنجابی زبانیں ایسی ہیں جن میں قرآن مجید کا ترجمہ اور دیگر قرآنی لٹریچر کی تیاری کا کام تقریباً صدیوں پہلے کیا گیا؛ البتہ بعض زبانیں جیسے آسامی، اُڑیہ، منی پور، نیپالی، بھوجپوری وغیرہ وہ زبانیں ہیں جن میں غالباً بیسویں صدی میں کام شروع ہوا ہے، تمام کاموں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک طویل مدت بھی درکار ہے اور وقت وسرمایہ بھی۔

اپنی محدود کوشش کے نتیجے میں جو مختصر سی معلومات حاصل کرسکا ہوں وہ درج ذیل ہیں :

ہندی

قدیم ترین ہندی ترجمہ ۸۸۳ء میں ایک ہندو راجہ مہروک نے کرایا جو کشمیر اور پنجاب کا حکمراں تھا، سولہویں صدی میں بھی ایک ترجمہ ہوا جس کی تفصیل نہیں ملتی، پادری ڈاکٹر احمد شاہ مسیحی نے القرآن کے نام سے ۱۹۱۵ء میں مکمل ہندی میں ترجمہ شائع کیا، شیخ محمد یوسف نے ایک ہندی ترجمہ قرآن شریف کا ''हिन्दी अनुवाद'' شائع کیا، خواجہ حسن نظامی نے ''قرآن مجید کا ہندی ترجمہ وتفسیر'' کے نام سے ترجمہ مع تفسیر دو جلدوں میں شائع کی، مولانا احمد بشیر فرنگی محلی نے ''قرآن شریف'' کے نام سے ہندی ترجمہ کیا جو بغیر متن کے شائع ہوا، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے کچھ آیتوں کا ترجمہ کیا اور ان کا درس مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ہندی میں ترجمہ کیا، مولانا بوسلیم محمد عبدالحیٔ نے مولانا محمد فاروق خاں کا ترجمہ بہت پہلے رام پور سے شائع کیا، مولانا محمد فاروق خاں ہی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی کا ہندی ترجمہ کیا، مولانا مطیع الرحمٰن کوثر ندوی نے تفسیر تفہیم القرآن کی تلخیص از مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کا ہندی میں دو جلدوں میں ترجمہ کیا جو ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا فتح محمد جالندھری کے علاوہ دیگر معروف ومشہور اُردو کے قرآنی ترجموں کے ہندی ترجمے دن بدن شائع ہورہے ہیں۔

سندھی

پاک و ہند میں قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ سندھی زبان میں ہوا تھا، منصورہ (سندھ) کے ایک عالم دین نے الور کے راجہ مہروق بن رائق کی اسلامی تعلیمات کے لئے ہندی میں ترجمہ کیا، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ترجمہ مقامی زبان سندھی میں تھا یا سنسکرت میں، سندھی ترجمہ عزیز اللہ مغلوی نے کیا جو ۱۸۷۰ء میں گجرات سے شائع ہوا، مولانا تاج محمود امروٹی، مولانا محمد مدنی، قاضی عبدالرزاق روہری، احمد ملاح (منظوم) نے مکمل ترجمے کئے، ایک سہ ترجمہ بھی ہوا، جس میں فارسی، اُردو اور سندھی ترجمے تھے جسے شیخ عبدالعزیز محمد سلیمان نے شائع کیا، سندھی تفاسیر میں تفسیر ہاشمی (تبارک الذی اور پارۂ عم) جو مخدوم محمد ہاشم بن عبدالغفور ٹھٹوی نے لکھی، اسی طرح مولانا ابوالحسن ٹھٹوی کی تفسیر ابوالحسن، مولانا رشید الدین کی تفسیر مفتاح رشداللہ، مولوی محمد عثمان لوزنگ زادہ کی تفسیر تنویر الایمان، پیر مردان علی شاہ پیر پگاڑا کی تفسیر کوثر اور مولانا جان محمد بھٹو کا مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کا ترجمہ قابل ذکر ہے۔

بنگلہ

بنگالی میں پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ کے اُردو ترجمے کی مدد سے ۱۳۴۹ھ میں طبع ہوا، ۱۸۹۹ء میں نعیم الدین کا بنگالی ترجمہ شائع ہوا، ۱۹۰۱ء میں ابن محمد عبدالحق کا ترجمہ اور ۱۹۰۸ء میں نمولا ساک اور آسٹریلیا کی بپٹسٹ سوسائٹی کے ایک مشنری ریورنڈ ولیم گولڈ ٹیک نے شائع کیا، قدیم دور میں قرآن مجید کے بنگلہ زبان میں کل ۴۲ تراجم شائع ہوئے، ان میں ۱۵ مکمل اور ۲۷ جزئی شکل میں تھے، ان میں دو ترجمے عیسائی پادریوں کے اور ایک برہمی دھرم کے پنڈت کے قلم سے تھے، تفسیر اشرفی کے نام سے مولانا نورالرحمٰن نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کا ترجمہ کیا، مولانا محمد اکرم خاں کی تفسیر قرآن، مولوی عبدالحکیم اور مولوی حسن علی نے بنگانو باد قرآن شریف کے نام سے ترجمہ کیا، خان بہادر عبدالرحمٰن خان، کلیم عبدالمنان اور علی حیدر چوہدری نے بھی ترجمے کئے، مولانا شمس الحق فرید پوری اور مولانا عزیز الحق نے حقانی تفسیر (نامکمل) لکھی، القرآن کے نام سے اسلامک اکیڈمی ڈھاکہ کی طرف سے ترجمہ قرآن شائع ہوا، ان کے علاوہ مولانا مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن کا بنگلہ زبان میں مولانا عبدالرحیم نے ترجمہ کیا۔

ہندی، گجراتی، بنگالی، سندھی اور پشتو زبانوں میں قرآن اور قرآنیات پر جو کام ہوا ہے، اس کی بڑی حد تک تفصیل کا احاطہ مدیر سیارہ نعیم صدیقی مرحوم نے سیارہ کے قرآن نمبر میں جو تین جلدوں میں شائع ہوا تھا۔

اسی طرح دیگر زبانوں میں قرآن کے ترجمے ہو چکے ہیں، منی پوری، آدی باسی زبانوں میں کام تکمیل کے مرحلہ میں ہے، آسامی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

اس موقع پر یہ واقعہ اور اس کا اظہار کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ آج سے ۳۰ سال قبل اسی شہر حیدرآباد کی وادیٔ ہدیٰ میں ۱۹۸۱ء میں جماعت اسلامی ہند کا اجتماع عام منعقد ہوا تھا اور اس اجتماع میں ہندوستان کی مختلف ۱۶ زبانوں میں قرآن کے ترجموں کا رسم اجراء انجام پائی تھی، جس میں اُردو، ہندی، انگریزی، تلگو، تمل، کنٹر، ملیالی، پنجابی اور دیگر علاقائی زبانیں شامل تھیں۔

فکر قرآن کی آبیاری اور اس کے ارتقاء کی کوششوں کے علاوہ قرآن مجید کے تراجم اور قرآنیات پر ایک ذخیرہ تیار کرنے میں جماعت اسلامی ہند کو بڑا نمایاں مقام حاصل ہے، اس کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی پیش کیا اور اُجاگر کیا کہ اسلام کوئی جامد مذہب نہیں ہے؛ بلکہ وہ زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے، اس نے قرآن وسنت کی بنیاد پر ملک کی تمام اہم علاقائی اور مقامی زبانوں میں قرآن کے ترجمے اور صالح لٹریچر پیش کیا، قرآنیات پر سلیس اور عام فہم انداز بیان میں عہد حاضر کے مسائل اور اُلجھنوں کا سائنٹفک حل پیش کیا، ایسے اُسلوب میں پیش کیا جو اپنے حقیقی رنگ میں ہے اور دل کی گہرائیوں میں اُتر جانے والا ہے۔

ہم نے جماعت اسلامی کے تمام علاقائی زبانوں کی پبلی کیشنز سے رابطہ کیا اور مختلف زبانوں میں جو قرآنیات پر لٹریچر وغیرہ کی فہرست پر نظر ڈالی تو دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بہت عظیم کام ہوا ہے جو جماعت اسلامی کے کمزور کارکنوں نے اپنے محدود وسائل و ذرائع کے باوجود کر ڈالا ہے، قرآنیات اور اسلامیات پر مختلف زبانوں میں پانچ سو سے زیادہ کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں، مزید کام جاری ہے، مختلف زبانوں میں لٹریچر کی تیاری اور طباعت کے علاوہ اس کی اشاعت بھی ایک عظیم خدمتِ قرآن ہے۔

قرآن مجید ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جو دلوں کو مسخر کر لیتا ہے، اعجاز قرآن کا ذکر کرتے ہوئے مشہور مؤرخ گبن نے لکھا ہے:

> قرآن کے بارے میں بحر اٹلانٹک سے لے کر دریائے گنگا تک نے تسلیم کر لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کی روح اور اساسی قانون ہے اور صرف اُصول مذہب ہی کے لئے نہیں؛ بلکہ احکام تعزیرات اور قوانین کے لئے بھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی شریعت سب پر حاوی ہے، یہ شریعت ایسے دانشمندانہ اُصول اور اس قسم کے قانونی انداز پر مرتب ہے کہ ساری دنیا میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔(۱)

(۱) سلطنت روما کا انحطاط و زوال: ۵۔

حاملین قرآن کا اولین فرض ہے کہ وہ قرآن کو اپنا لائحہ عمل بنائیں اور دنیا میں اسے غالب کرنے کی جدوجہد کریں، ضلالت اور گمراہی میں بھٹکتی ہوئی دنیا کو راہ پر لانے کی اس کے سوا اور کوئی شکل نہیں ہے کہ اس سے قرآن کے پیغام سے روشناس کرایا جائے، قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْراً ۔ (الفرقان:۱)

نہایت متبرک ہے جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر اُتارا ہے کہ سارے جہاں کے لئے وہ خبردار کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :

فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيْدِ ۔ (ق:۴۵)

بس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کرو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔

اسلامی دعوت کو عام کرنے کا مؤثر ترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو عام کیا جائے، قرآن کے پیغام کا ترجمان قرآن سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، قرآن کو عام انسانوں تک پہنچانے کی فکر سے غفلت برتنے کا مطلب نزولِ قرآن کے عظیم مقصد کو نقصان پہنچانا ہے، یہ قرآن کریم کی حق تلفی ہے جو نا قابل معافی جرم ہے، قرآن کریم وہ عظیم کتاب ہے کہ اس سے صحیح اور کامل ہدایت اخذ کرنے کے بعد نہ تو کوئی قوم ذلیل ورسوا ہوسکتی ہے اور نہ اسے ترک کرکے کوئی قوم ذلت اور رسوائی کی مار سے بچ ہی سکتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

إن الله يرفع بهذا الكتاب أقواماً ، ويضع به آخرين ۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ سے کتنی ہی قوموں کو بلند کرتا ہے اور کتنی ہی دوسری قوموں کو پست وذلیل کرتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس قرآن نے انسانی مزاج اور اخلاق میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا، اس کتاب نے صحرا نشینوں کو امام عالم اور معلم بنایا، اس نے حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ جیسے عادل حکمراں پیدا کئے جو اپنی مثال آپ ہیں، یہ قرآن ہی کا کرشمہ ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو دنیا کی مہذب ترین اُمت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا؛ لیکن جب ہم اس کتاب کے حق کو فراموش کر بیٹھے تو اس کا جو انجام ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

قرآن کے پیغام کو عام کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کے تراجم، لوگوں کی ان کی اپنی زبان میں پیش کئے جائیں، ترجمہ اصل کا بدل نہیں ہوسکتا؛ لیکن لوگوں کو قرآن سے بالکل بے خبر رکھنے کے مقابلے میں اسے بہر حال ترجیح حاصل ہے کہ قرآن کی تعلیمات سے لوگوں کو واقف کرایا جائے۔

تجاویز

(۱) نوجوان علماء اور عصری درسگاہوں سے وابستہ افراد پر مشتمل مختلف گروپ تشکیل دیئے جائیں، جو مختلف ریاستوں میں جاکر براہِ راست تراجم وغیرہ سے متعلق صورتِ حال معلوم کریں۔

(۲) مختلف زبانوں میں ترجمہ کے کام میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنے کے لئے یہ کمیٹی مترجمین سے تبادلۂ خیال کرے، ان کی میٹنگ کرے اور ترجموں کا تقابلی جائزہ لے۔

(۳) کتابت وطباعت کا معیار بلند رکھا جائے، عربی متن کے بغیر قرآن کے ترجمے شائع کیا جائے یا نہ کیا جائے، اس پر اتفاق رائے کی کوشش کی جائے۔

(۴) زندگی کے تمام کاموں میں بالعموم مگر قرآن مجید سے متعلق تمام کاموں میں بالخصوص جائز رقم خرچ کی جائے اور ہر قدم پر کفایت شعاری کی روش اختیار کی جائے، ایسا کوئی کام نہ کیا جائے، جس سے غریب اور کمزور عوام الناس پر کسی طرح کا بوجھ پڑے یا کسی نہ کسی پہلو سے ان کی حق تلفی ہو۔

(۵) عموماً لوگ جلسہ، جلوسوں پر بے انتہا روپے خرچ کرتے ہیں اور قرآن مجید اور علوم اسلامیہ کی خدمت کرنے والوں کو معمولی تنخواہیں دیتے ہیں، اس مزاج کو بدلنے کی ضرورت ہے، ترجیحات کا تعین ہونا چاہئے۔

(۶) قرآن مجید اور تمام دینی خدمات میں اقربا پروری کے رجحانات کو ختم کرنا چاہئے اور ایسے نوجوانوں کو موقع دینا چاہئے جو باصلاحیت اور باکردار ہوں، خواہ وہ کسی خاندان اور کسی علاقہ کے رہنے والے ہوں۔

(۷) جو لوگ قرآن مجید کی خدمت یا دعوت دین کا کام کررہے ہیں، انھیں شہرت و ناموری کے جذبات سے اجتناب کرنا چاہئے اور ایسے لوگوں کی پیروی نہیں کرنی چاہئے جو کام سے کہیں زیادہ پروپیگنڈہ، پبلسٹی کرتے ہیں اور غریب اُمتِ مسلمہ کے روپے پیسے بلاضرورت اپنے معیار اور ذوق کی بلندی کے نام پر خرچ کرتے ہیں۔

خودی نہ بیچ ، غریبی میں نام پیدا کر

⊙ ⊙ ⊙

جنوبی ہند کی چار زبانوں میں قرآن مجید پر کام

مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری ⊙

قرآن مجید اللہ تبارک وتعالیٰ کی مبارک ومقدس کتاب ہے، جواس کے آخری رسول، انبیاء ورسل کے سردار، قیامت تک کے لئے انسانوں اور جنات کی طرف مبعوث کئے گئے جناب محمد بن عبداللہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ پر ۲۳ سال کی مدت میں وقفے وقفے سے وحی الٰہی کے ذریعے ملائکہ کے سردار جبرئیل امین کی وساطت سے مکمل کی گئی، اس کتابِ ہدایت کی حفاظت کا ذمہ نازل کرنے والی ذات نے خود ہی لے لیا ہے، اس لئے قیامت تک وہ اپنی اصلی حالت میں رہے گی اوراس کے اطراف باطل اور تحریف کا گزر محال کردیا گیا :

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُون . (الحجر:۹)

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ .

(حم السجدۃ:۴۲)

یہ عظیم کتاب ایسے تاریک دور میں نازل ہونا شروع ہوی جہاں مخلوق اپنے خالق کو بھول کر گمراہیوں کی بھول بھلیوں میں حیران و پریشان شجر وحجر سے اپنا سر ٹکرارہی تھی، انسان اندھیروں سے چمگاڈر کی طرح اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ حق کی روشنی دیکھ کر بوکھلا گیا اوراسے بجھادینے کے لئے اپنی ساری طاقت جھونک دی، نزولِ قرآن کے ابتدائی دور میں قرآن پڑھنا پڑھانا، سننا سنانا ناقابل معاف جرم تھا، پڑھنے والے کا منھ بند کیا جاتا، اس کا گھلا گھونٹنے کی کوشش کی جاتی، چلنے پھرنے والوں کو کانوں میں روئی ٹھونس لینے کا حکم دیا جاتا، شوروغل اور چیخ وپکار سے اس کی آواز کچلنے اور دبانے کی تدبیر کی جاری تھی۔

اس سے متنفر اور خوف زدہ کرنے کے لئے بدنام زمانہ سارے برے نام اوروحشت ناک الزام ڈھونڈھ لئے گئے تھے، ایسے مخالف ماحول میں کس نے سوچا ہوگا کہ کبھی یہ کتاب دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی پڑھائی جانے والی،

⊙ استاذ: جامعہ دارالسلام، عمرآباد۔

سمجھی جانے والی، چھپنے والی، تلاوت کی جانے والی اور عمل میں لائی جانے والی دستورِ حیات بن کر ابھرے گی؟ دنیا دیکھتی آرہی ہے کہ ہمیشہ حق وصداقت کی قوت وطاقت مخالفتوں کے طوفان میں قافلۂ سخت جان کی طرح اپنی دنیا آپ پیدا کر کے کڑی دھوپ میں جھلسنے والے انسان کے سر پر سائبان بن کر اپنے حصار میں محفوظ کر لیتی ہے۔

تمہید شاید کچھ طویل ہوگئی، میں تو صرف اتنا کہنا چاہتا تھا کہ جس عربی کتاب کو اہل زبان کے کچھ نادانوں نے ابتدائے اسلام میں خاموش کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیئے تھے آج وہ عرب میں اُتاری جانے والی فصیح وبلیغ کتاب دنیا کی ہر لکھی اور پڑھی جانے والی زبان میں اپنے وجود کا اور موضوع کا سر چڑھ کر اعلان کر رہی ہے، ڈاکٹر حمید اللہؒ کی کتاب ''القرآن فی کل لسان'' سے آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے، یورپ وامریکہ کی متمدن زبانوں کی تو بات ہی نہیں، افریقہ کی پسماندہ زبانوں میں بھی قرآن کے بے شمار تراجم موجود ہیں، چالیس سال قبل نائیجیریا کے قیام میں ہوسا اور یوربا زبان کے قرآنی تراجم ہزاروں کی تعداد میں خود میں نے اپنے ہاتھوں سے تقسیم کئے ہیں، میرا موضوع چوں کہ صرف جنوبی ہند کی چار زبانوں ٹمل، ملیالم، کنڑا اور تلگو کے تراجم سے متعلق ہے تو اپنی حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس کی ایک اجمالی فہرست آپ کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں، مجھے اپنے موضوع کے احاطے کا دعویٰ تو ہرگز نہیں؛ کیوں کہ ہم اہل علم مذہب ومسلک کے اتنے خانوں میں تقسیم ہو چکے ہیں کہ ہر ایک اپنے ہی خول میں بند ہو کر اپنی ہی جماعت اور تنظیم کی کاوشوں سے واقف ہے، دوسروں کو وہ جانتا نہیں ہے، یا جان کر بھی انجان بنتا ہے، بہر حال میں نے سب کو جاننے کی خاطر مختلف طبقۂ خیال اور مکتبِ فکر کے واقف کاروں سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا، اللہ کے جن نیک بندوں نے میرا تعاون فرمایا ان سب کا نہاں خانۂ قلب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے تراجم کا ایک نامکمل اور ناتمام مقالہ پیش کرنے جارہا ہوں مجلس کے لائق حضرات سے معذرت چاہتے ہوئے اپنے قصورِ علم کا بغیر کسی انکسار کے صدقِ دل سے اعتراف کرتا ہوں۔

قرآنِ مجید کے ترجمے کے معاملے میں علمائے ہند کو شرحِ صدر نہیں تھا، جواز اور عدمِ جواز کے درمیان صدیاں بیت گئیں، اٹھارہویں صدی میں بڑی جرأت سے بعض اہل علم نے ہمت کی تو مخالفتوں کا انھیں سامنا کرنا پڑا، عدمِ جواز کے قائلین فتوؤں سے آگے بڑھ کر سب وشتم اور جسمانی ایذا رسانی میں بھی پیچھے نہیں رہے، رفتہ رفتہ ترجمے کی ضرورت ناگزیر ہوگئی تو یہ طے کر لیا گیا کہ ترجمے کو اللہ کا فرمان اور قرآن کا نام اور حکم نہ دیا جائے اور بہت حد تک یہ صحیح فیصلہ ہے کہ عربی مبین میں نازل شدہ کتاب ہی اللہ کے احکام وفرمان کا مجموعہ ہے، کسی بھی زبان کے ترجمے میں کہیں بھی تسامح اور فروگزاشت کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا، اس لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ترجمے کو اللہ کے فرمان کا نام دینے کی بجائے ترجمانی ہی کے حدود میں رکھا جائے، کچھ ایسے ہی حجابات تھے کہ جنوبی ہند

کی زبانوں میں جن کے بولنے اور پڑھنے پڑھانے والے کروڑوں کی تعداد میں تھے، انیسویں صدی سے پہلے اپنی زبانوں میں قرآن حکیم کے ترجمے کی ہمت نہ کر سکے، جنوبی ہند کے چار صوبوں میں سے تمل ناڈو، آندھرا اور کرناٹکا کے مسلمانوں کی بڑی تعداد اُردو سے اپنا کام چلا لیتی ہے، مگر کیرالا کے عام مسلمانوں کی مادری زبان ملیالم ہی ہے۔

اپنی بات تمل زبان سے شروع کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں میرے پاس کچھ مستند معلومات ہیں، یہاں مسلمانوں کی تعداد ستر لاکھ سے اوپر ہے، مزید برآں سری لنکا کے مسلمانوں کی زبان بھی تمل ہے، مگر انیسویں صدی کے اواخر تک قرآن کا تمل ترجمہ نہیں ہوا تھا، اس کے اسباب وہی ہیں جن کا اشارہ ہو چکا ہے کہ قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں کہلائے گا اُردو مترجمین کے درمیان ترجمے کا اختلاف قرآن کی حیثیت کو محل نظر بنا دے گا اور قرآن کا اعجاز اس کی عربی زبان ہی میں ہونے سے ہے، ایک خیال یہ بھی تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن وحدیث سے واقفیت براہِ راست عربی زبان ہی سے لازمی ہے، بڑی ردو کد اور بحث ونظر کے بعد ترجمۂ قرآن پر اتفاق ہوا اور غالباً قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۸۷۸ء میں ظہور میں آیا، ترجمہ کا نام ''الفتوحات الربانیۃ فی الکلام الربانی'' تھا، مترجم تھے، حبیب محمد عالم، ترجمہ عرب تمل زبان میں ہونے کی وجہ سے مقبولِ عام نہیں ہو سکا اور طباعت کی نوبت بھی نہیں آئی ''عرب تمل'' تمل ناڈو اور سری لنکا کے مسلمانوں کی ایجاد کردہ ایک نوزائیدہ زبان تھی، جس کا رسم الخط عربی مگر تلفظ اور معانی تمل کے ہوتے تھے، کسی دور میں مذہبی گھرانوں میں یہ زبان عام تھی، پھر یہ صرف کتابوں میں رہ گئی۔

۱۹۱۰ء میں کائل پٹنم کے نوح لبے عالم صاحب نے ''فتح الکریم'' کے نام سے ترجمہ شروع کیا، دو جلدوں کے بعد یہ تفسیر بھی گمنام ہوگئی۔

۱۹۲۳ء میں خطیب سید محمد عالم صاحب نے پانچ جلدوں میں ترجمہ کی تکمیل کی، یہ بھی عرب تمل میں ہونے کی وجہ سے کچھ مدت بعد گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔

۱۹۳۷ء میں مولانا ایس، ایس، محمد عبدالقادر باقوی نے ''تفسیر الحمید فی تفسیر القرآن المجید'' کے نام سے سات جلدوں میں ترجمہ اور تفسیر کا کام کیا، مگر یہ بھی بازار میں دستیاب نہیں ہے۔

لائق بزرگ شیخ عبدالحمید صاحب باقوی نے ۱۹۲۶ء میں بڑی عرق ریزی کے ساتھ ترجمۂ قرآن کا کام شروع کیا اور ۱۹۴۶ء میں اس کی تکمیل فرمائی، ۱۹۴۸ء میں شہر مدراس کے ''دار النشر الباقوی'' نے اسے شائع کیا، ترجمے کا نام ''ترجمۃ القرآن بألطف البیان'' ہے، ابتداء میں یہ ترجمہ قرآنی متن کے بغیر شائع ہوا تو ہر طرف سے تنقید کی بوچھاڑ ہونے لگی اور فتویٰ تک صادر کر دیا گیا کہ ایسے ترجمے کا پڑھنا پڑھانا صاف حرام ہے، اس کے بعد نصوص قرآنی کے ساتھ اشاعت کا اہتمام ہونے لگا اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں مولانا کے، محمد ابراہیم صاحب باقوی نے خالص تمل میں ترجمہ کیا اور سورۃ البقرہ کی ۱۴۱ آیتوں کی تفسیر بھی کی، جس کا نام "تفسیر البیان فی ترجمۃ معانی القرآن" تھا، یہ ترجمہ اب نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

ترنلویلی کے ایک عالم شیخ عبدالقادر نے انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ترجمہ اور تفسیر کا کام کیا، جس کی چھ جلدیں خود ان ہی کے ذاتی پریس "نور الاسلام" سے شائع ہوئی تھیں۔

اسی دور میں کچھ اور اہل علم نے بھی ترجمے کا کام کیا؛ لیکن منتخب سورتوں پر اکتفا کرلیا، جیسے مولانا قادر محی الدین نے صرف تیسویں پارے کا انتخاب کیا، شیخ محمد طاہر عالم نے فاتحہ، بقرہ اور آل عمران تک کے ترجمے پر بس کرلیا۔

تمل ناڈو کے شہر ویلور میں قدیم اور مشہور مدرسہ "باقیات صالحات" ہے، وہاں ترجمۂ قرآن کے لئے لائق علماء کی ایک جماعت متعین ہے، جس کے سربراہ مولانا محمد خاں صاحب باقوی ہیں، ترجمہ مع تفسیر کا نام "جواہر القرآن" ہے، تصحیح کا کام جاری ہے، ۱۹۹۲ء میں سورۃ الفاتحہ اور بقرہ کی تفسیر طبع ہوچکی ہے، بقیہ کام اُمید ہے جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا — انشاء اللہ — مطبوعہ حصہ ۶۸۵ صفحات پر مشتمل ہے، طویل مقدمہ میں قرآنی علوم پر سیر حاصل بحث ہے، اس کام کی تمل کے تمام حلقوں سے بڑی تعریف ہوئی اور ہر جگہ اس کی ہاتھوں ہاتھ پذیرائی ہوئی۔

۱۹۸۴ء میں مولانا بی، ایس، علاء الدین منبعی نے سید قطب رحمہ اللہ کی تفسیر "فی ظلال القرآن" کا مکمل ترجمہ کیا، ۱۹۹۶ء میں چنئی کے ایک پریس نے اس کی اشاعت کا کام انجام دیا، مترجم موصوف کو عربی اور تمل دونوں زبانوں پر کمال تھا، اس لئے ان کا ترجمہ تعریف و تحسین سے نوازا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ تمل ناڈو کی "توحید جماعت" کے سربراہ جناب پی، زین العابدین صاحب نے بھی پانچ چھ سال پہلے قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے، جو مدراس سے شائع ہوا ہے۔

حاجی جان محمد ٹرسٹ

مدراس کے ایک متدین اور مخیّر تاجر ڈاکٹر جان محمد انگلینڈ میں ایک مدت گزار کر مدارس واپس ہوئے تو ان کے دل میں قرآن کی تعلیم کو گھر گھر عام کرنے کی فکر ہوئی، جیسا کہ وہ یورپ میں انجیل کی اشاعت و تقسیم دیکھ چکے تھے، ڈاکٹر صاحب نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے نامور علماء کی خدمات حاصل کیں اور ایک ادارہ "حاجی جان محمد ٹرسٹ" کے نام سے قائم کیا اور مولانا صدقۃ اللہ باقوی جیسے قابل مترجمین کی مدد سے اور مولوی عبدالوہاب صاحب کی نظر ثانی سے ترجمہ قرآن کریم کے کام کا آغاز کیا، ۹۳۵ صفحات کا یہ ترجمہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا، اس کا ہدیہ برائے نام ہونے کی وجہ سے ہر شخص کے دسترس میں ہے اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر گھر گھر اور مساجد و مدارس میں پہنچ چکے ہیں۔

جماعتِ اسلامی تمل ناڈو نے مولانا مودودیؒ کی ''تفہیم القرآن'' کے تمل ترجمے کے لئے قابل اہل علم کو مدعو کیا، سب کی برسوں کی مجموعی کاوش سے ۱۹۹۲ء میں بڑی تقطیع کے ۱۲۲۷ صفحات میں یہ ترجمہ شائع ہوا اور آج تک اس کے دسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں، مترجمین کی جماعت میں ایک نمایاں نام جامعہ فردوسیہ ناگر کوئل کے پرنسپل مولانا سید محمد مدنی صاحب کا ہے۔

ملیالم زبان کے قرآنی تراجم

پہلا ترجمہ شیخ محی الدین بن عبدالقادر نے ۱۸۵۵ء میں پندرہ سال کی محنت سے چھ جلدوں میں ''تفسیر جلالین'' کی روشنی میں مکمل کیا، یہی اس زبان کا پہلا ترجمہ تھا جو آج کل نایاب ہے۔

اس کے ایک سو سال بعد شیخ کے، عمر مولوی نے ۱۹۵۱ء میں ترجمان القرآن کے نام پر ۲۵۰۰ صفحات پر مشتمل چھ جلدوں میں ایک تفسیر تیار کی، یہ بھی پہلی تفسیر کی طرح نایاب ہے اور اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دونوں تفسیریں عربی ملیالم رسم الخط میں تھیں، اس کی ایک ملیالم تلخیص کے، محمد مدنی کی کوشش سے ایک جلد میں دستیاب ہے۔

ملیالم رسم الخط میں سی، این، احمد مولوی نے ''تفسیر القرآن الحکیم'' کے نام سے ۱۹۵۱ء میں کام شروع کیا، ۱۹۶۳ء میں اس کی تکمیل ہوئی، دو جلدوں کی یہ تفسیر مرکزی حکومت کی مدد سے شائع ہوئی اور اسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

۱۹۶۰ء میں یم، کویا کٹی مولوی نے قرآن مجید کے نام پر ملیالم ترجمہ کیا، ۱۹۶۷ء میں لیکا پبلی کیشن نے پہلی بار اور دوسری بار مورل بکس نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

۱۹۶۰ء ہی میں جناب کے ایم مولوی کی خواہش پر تین بڑے علماء مولوی محمد امانی، مولوی پی، کے، موسیٰ اور مولوی اے، علوی کی کوششوں سے سترہ سالوں میں ترجمہ و تفسیر کی تکمیل ہوئی، کیرالہ ندوۃ المجاہدین کی سرپرستی میں یہ تفسیر شائع ہوئی ہے، ۱۴ معتبر تفاسیر کی گویا یہ تلخیص ہے، اس کا مقدمہ قرآن پر کام کرنے والوں کے لئے ایک ماخذ اور مرجع کی حیثیت رکھتا ہے، اب تک اس کے چالیس ہزار نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔

۱۹۷۲ء میں ٹی، کے، عبداللہ صاحب، ٹی، اسحاق صاحب، مولوی وی، کے، علی اور ٹی، کے، عبید وغیرہ کی محنتوں سے مولانا مودودیؒ کی ''تفہیم القرآن'' کے ترجمہ کا کام شروع ہوا اور ۱۹۹۸ء میں مکمل ہوا، اس کے بعد سے اب تک ۳۸۰۰۰ نسخے قارئین کے ہاتھوں پہنچ چکے ہیں۔

کے، وی، محمد مصلیار کی ایک تفسیر ''فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن'' کے نام سے پانچ جلدوں میں موجود ہے، الحاج کے، محمد مصلیار کا بھی دو جلدوں میں ''بیان القرآن'' کے نام سے ایک ترجمہ مشہور ہے۔

ڈاکٹر محی الدین آلوائی صاحب کی سرپرستی میں وی، ایس، سلیم صاحب اور کنجی محمد بولاوٹ نے سید قطب کی ''فی ظلال القرآن'' کا مکمل ترجمہ کیا، جسے آلوائی کا مناس فاؤنڈیشن نے شائع کیا ہے۔

سی، عبدالحمید مدنی اور سی، کنجی محمد پراپور نے ۱۹۹۱ء میں قرآن مجید کا جو ترجمہ کیا ہے، وہ شاہ فہد پریس مدینہ منورہ سے شائع ہو کر تقسیم ہو رہا ہے۔

۱۹۹۴ء میں مصطفیٰ الفیضی نے تفسیر قرآن کے نام سے عربی تفاسیر کی روشنی میں ایک ترجمہ کیا ہے، جسے ''دبئی اسلامک سنٹر'' نے شائع کیا ہے۔

حافظ عبدالغفار القوسری کا بھی ''القرآن'' کے نام پر ایک ترجمہ ہے، ڈی سی بکس اس کی اشاعت کرتی ہے۔

''وشا ساہتیا مالا'' کے نام سے کے، عبدالرحمٰن، پی، عبدالکریم اور کے، عبدالرؤف کی مشترکہ کوششوں سے چار جلدوں میں ایک تفسیر تیار کی ہے، جو ڈی، سی، بکس سے شائع ہوئی ہے، ۱۹۹۶ء میں اس کی تلخیص ایک جلد میں شائع ہوئی ہے۔

کالی کٹ کے قاضی سید احمد شہاب الدین اپچی کویا نے ''البیان فی معانی القرآن'' کے نام سے ایک ترجمہ کیا، جس کی طباعت ''نکالا ترو رنغاڑی اشرفی بک ہاؤس'' سے ہو رہی ہے۔

ملیالم زبان کی جدید ترین تفسیر ''انوار القرآن'' ہے، جس کے مترجم مشہور عالم عبدالسلام سلمی ہیں، تین جلدوں کی اس تفسیر میں عربی الفاظ کی تحقیق بھی شامل ہے۔

اس سے بھی ایک تازہ تفسیر کالی کٹ کے ایک پروفیسر ٹی، کے، عبید صاحب کی ہے، اس کی اب تک چار جلدیں ''اسلامک پبلک ہاؤس'' سے اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

نثر کے علاوہ نظم میں بھی ملیالم زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ آپ کو ملے گا، ضلع پالکاڑ کے راگون نایر کا ''امرت وانی'' نام کا شعری ترجمہ ۱۹۹۷ء میں ''اسلامک پبلک ہاؤس'' سے طبع ہو چکا ہے۔

ضلع پاٹنم تیٹا کے ''کونیورراگون نایر'' نے ''دیوادپتی'' کے نام سے ترجمہ کیا ہے، ۲۰۰۰ء میں ''کالی کٹ کاساما یم بک'' نے اسے شائع کیا ہے۔

یہ سب مکمل تراجم اور تفاسیر کی فہرست ہے، ان کے علاوہ منتخب سورتوں کا ترجمہ کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے، کیرالہ کے مشہور فلسفی ''شری ناراینا'' کے شاگرد ''گرونتیا چید نیایتی'' نے قرآن کے کئی ایک حصوں کا اچھے انداز میں ترجمہ کیا ہے، استاذ وی محمد، مولوی کے ایم محمد، مولوی اڈشیری پی محمد، مولوی باقوی سید ثناء اللہ مکتی تنغل جیسے اہل علم نے قرآن کی مختلف سورتوں کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔

تلگو زبان کے قرآنی تراجم

تلگو زبان میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ ۱۹۳۰ء ایک غیر مسلم، ہندو ''ڈاکٹر چلکوری نارائنا راؤ'' نے کیا، جو فی الحال ناپید ہے، یہ ترجمہ چوں کہ انگریزی ترجمۂ قرآن کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا اس لئے اس میں کافی غلطیاں رہیں، جس کی وجہ سے مقبولِ عام نہیں ہوسکا۔

مولوی عبدالغفور بن شیخ قاسم نے ''قرآن مجید'' کے نام سے ترجمہ اور مختصر تفسیر لکھی ہے، یہ پہلا ترجمہ ہے جو براہِ راست عربی متن سے تلگو زبان میں کیا گیا ہے، اس ترجمہ کا آغاز ۱۹۲۹ء میں مملکت آصف جاہی حیدرآباد کی ایما پر نواب حکیم مقصود جنگ کی سرپرستی میں ہوا اور ۱۹۴۵ء میں اس کی تکمیل ہوئی اور اس کی اشاعت بھی مملکت آصف جاہی حیدرآباد کی جانب سے ہوئی، فی الحال حسامی بک ڈپو حیدرآباد سے یہ شائع ہورہا ہے۔

جناب ابوالعرفان صاحب نے بھی انگریزی اور اُردو تراجم کو سامنے رکھ کر ایک ترجمۂ قرآن تیار کیا ہے، ترجمہ کے ساتھ مختصر تشریح بھی ہے، اس کی تکمیل جنوری ۲۰۰۴ء میں ہوئی، اس کی اشاعت اسلامک رِی سروس سنٹر حیدرآباد سے ہورہی ہے۔

۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر عبدالرحیم محمد مولانا نے مختلف اُردو تراجم کی مدد سے قرآن کا ایک عام فہم ترجمہ مختصر فٹ نوٹس کے ساتھ کیا، جو شاہ فہد پرنٹنگ پریس مدینہ منورہ سے شائع ہوا ہے۔

۱۹۳۵ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ترجمان القرآن کو تلگو میں منتقل کرنے کا آغاز ہوا، مترجم کا نام قاسم خان ہے؛ لیکن یہ کوشش پندرہ پاروں سے آگے نہیں بڑھ سکی، فی الحال یہ ترجمہ بھی ناپید ہے۔

دسمبر ۱۹۸۱ء میں شیخ حمید اللہ شریف (حال مقیم حیدرآباد) نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن کا تلگو میں ترجمہ شروع کیا، ۱۹۹۶ء میں اس کی تکمیل ہوئی، اس کا نام ''دِوْیا قرآن'' ہے، جو ''گیٹو رائے'' حیدرآباد سے شائع ہورہا ہے۔

جناب یس، یم، ملک صاحب (ڈائریکٹر گیٹو رائے، حیدرآباد) نے بھی تفہیم القرآن کا پورا ترجمہ کیا ہے، بیس پارے منظرِ عام پر آچکے ہیں، باقی دس زیر طبع ہیں۔

فتح محمد جالندھری صاحب کے ترجمۂ قرآن کو بھی شیخ حمید اللہ شریف نے تلگو میں منتقل کیا ہے، جو ابھی غیر مطبوعہ ہے، ۲۰۰۹ء میں عزیز الرحمن بن محمد یونس حیدرآباد نے ''تفسیر احسن البیان'' کو تلگو میں منتقل کیا، اس میں مولانا محمد جوناگڑھی صاحب کا ترجمہ اور حافظ صلاح الدین یوسف پاکستان کی مختصر تفسیر ہے، حافظ یس، یم، رسول شرفی صاحب نے اسے ایڈٹ کیا ہے اور عربی متن قرآن کو سامنے رکھ کر اس پر نظر ثانی کی ہے، اس معاملے میں

جامعہ دارالسلام کے شیخ التفسیر مولانا حافظ سید عبدالکبیر صاحب عمری نے اپنے رائے اور مشوروں سے ان کا بھرپور تعاون کیا، نظر ثانی کا کام ڈاکٹر سعید احمد عمری مدنی، مولوی منظور احمد عمری اور عطاء الرحمٰن قریشی عمری نے کیا۔

جامعہ دار السلام عمر آباد کے ایک فارغ مولانا عبد السلام عمری (حال مقیم حیدرآباد) ہیں، انھوں نے ''آسان ترجمۂ قرآن'' کے نام سے ایک عام فہم ترجمۂ قرآن مع مختصر تشریح تیار کیا، جسے مولوی ذاکر عمری نے تلگو میں منتقل کیا ہے، یہ ترجمہ اور تفسیر ''ادارۂ فکر آخرت، حیدرآباد'' سے شائع ہو رہی ہے۔

قادیانی حضرات کی جانب سے ''دیویا قرآن'' کے نام سے ۱۹۵۰ء میں ایک ترجمۂ قرآن منظر عام پر آیا، جس کی اشاعت انٹرنیشنل اسلامک پبلی کیشنز لندن سے مسلسل ہو رہی ہے۔

جناب عبدالستار صاحب وشاکھا پٹنم نے بھی پورے قرآن کا ترجمہ کرلیا ہے، صرف سورۂ فاتحہ شائع ہوئی ہے، اس کے علاوہ جناب برہان خان صاحب وجے واڑہ نے تقریباً پندرہ پاروں کا ترجمہ مکمل کرلیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمہ مع مختصر حواشی کو تلگو میں منتقل کیا گیا ہے۔

کنڑا زبان کے قرآنی تراجم

کنڑا زبان میں پہلا ترجمۂ قرآن ''دیویا قرآن'' کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا، جس کا ترجمہ ایک سات نفری جماعت نے کیا ہے، اس ترجمۂ قرآن کی اشاعت ''اسلامی ساہتیہ پراکاشا بنگلور'' سے ہوئی ہے۔

۱۹۹۱ء میں سید عبدالغفار سولیا نے تلخیص تفہیم القرآن کا ترجمہ ''قرآن وِیا کانہ'' کے نام سے کیا، اس کے بعد ان ہی کے قلم سے تفہیم القرآن کا مکمل ترجمہ ''پوترا قرآن'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں شانتی پراکاشنا، ہدایت سنٹر، منگلور سے شائع ہوا۔

''پوترا قرآن'' کے نام ہی سے ایک اور ترجمۂ قرآن جناب سید محمد حبیب اللہ صاحب کا ہے، جو بریلوی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں، یہ ترجمہ ''المدینہ بک اسٹال منگلور'' سے شائع ہوا ہے۔

جناب خان صاحب علیگ نے تین جلدوں میں ترجمہ وتفسیر لکھی ہے، جو بیجاپور سے شائع ہوئی ہے۔

۲۰۱۰ء میں کنڑا زبان کا تازہ ترین ترجمۂ قرآن ''پوترا قرآن'' کے نام سے ''مرکن پبلی کیشنز منگلور'' سے شائع ہوا ہے، جس کے مترجم سید حبیب اللہ سنگل ہیں۔

اس کے علاوہ جامعہ دارالسلام عمر آباد کے شعبۂ دعوت سے وابستہ ایک داعی بشیر احمد میسوری نے اپنے دو رُفقاء جناب انصاف اللہ اور عمر فاروق کے ساتھ قرآن کا مکمل ترجمہ کرلیا ہے، ہاؤس آف پیس بنگلور سے صرف تیسویں پارے کی اشاعت ہوئی ہے، مولوی عبدالسلام عمری کے ''آسان ترجمۂ قرآن'' کو کنڑا میں بھی منتقل کیا جارہا

ہے،صرف دو پارے ''ادارۂ فکر آخرت حیدر آباد'' سے شائع ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ ملیالم زبان سے بھی کچھ ترجمے کنڑ ازبان میں ہوئے ہیں، امانی مولوی کا ترجمہ ابراہیم خلیل مسجد کمیٹی منگلور کی جانب سے تیار ہوکر شائع ہوا ہے، اس کے علاوہ حمزہ پتور نے بھی ملیالی سے ایک ترجمہ کیا ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔

مولانا محمد جونا گڑھی صاحب کا ترجمہ منگلور سے جناب عمر فاروق نے اُردو میں منتقل کیا ہے، ترجمہ مکمل ہے؛ لیکن ابھی تک اس کی اشاعت عمل میں نہیں آسکی۔

قادیانی حضرات کا ترجمۂ قرآن ''دیویا قرآن'' ہی کے نام سے کنڑا میں بھی شائع ہوا ہے، جس کی اشاعت انٹرنیشنل اسلامک پبلیکیشنز، لندن سے ہورہی ہے۔

غیر مسلم حضرات میں برگور بُڑن صاحب نے ترجمہ شروع کیا ہے، اب تک پانچ پارے گدک سے شائع ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ قرآن مجید کی منتخب سورتوں اور پاروں کے ترجمے مختلف اہل علم نے کیے ہیں، قرآن مجید کی ایک ہزار آیتوں کا ترجمہ عبدالسلام پتگے (مدیر اعلیٰ روزنامہ واردھا بھارتی) نے کیا ہے، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اکیڈمی بھٹکل سے شائع ہوا ہے۔

جنوبی ہند کی چار زبانوں میں تراجم قرآن سے متعلق یہ چند معلومات تھیں، ملیالم اور تمل کے سلسلے میں میں کسی حد تک مطمئن ہوں کہ موضوع کا احاطہ ہوا ہے؛ لیکن تلگو اور کنڑا کے سلسلے میں احساس ہے کہ میں موضوع کا احاطہ کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکا، اللہ ہم سب کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ہماری لغزشوں کو درگزر فرمائے۔ آمین

⊙ ⊙ ⊙

نیپالی زبان میں قرآن مجید کی خدمات

مولانا خالد حسین صدیقی ⊙

خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ریگ زار عرب میں، خالص عربی زبان نازل ہونے والی آفاقی والہامی کتاب ''قرآن'' اللہ کی طرف سے حقیقتاً انسانی زندگی کا دستور ہے، یہ کتاب گرچہ عربی زبان میں نازل ہوئی اور براہ راست کلام خداوندی ہونے کی وجہ سے زبان وادب، فصاحت وبلاغت زور بیان اور انشاء کے نقطۂ نظر سے معجز اور ساری کائنات کے لئے ایک زبردست چیلنج ہے؛ لیکن دوسری جانب یہ بھی ایک زمینی سچائی ہے کہ قرآن کریم صرف عربوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لئے راہِ عمل اور منشور حیات ہے، قرآن کریم کے عربی میں ہی نازل ہونے کی مستند اور معقول وجوہات ہیں (جو اس وقت ہمارا موضوع بحث نہیں)؛ لیکن یہ کتاب غیر عرب کے لئے بھی اسی درجہ رحمت وبرکت، باعث فوز وفلاح اور نجات اخروی کا واحد ذریعہ ہے، جتنی کہ عربوں کے لئے!

اسی پس منظر میں قرآن کے ہمہ گیر، ابدی، سرمدی اور عالمی پیغام کو عام کرنے کے لئے دنیا کے گوشہ گوشہ، چپہ چپہ کے لوگوں تک ہر زبان اور ہر عصر وزمانہ کے مخصوص انداز میں حاملین قرآن کو مطالب ومعانی قرآن کے منتقل کرنے کی ضرورت تھی؛ چنانچہ ۸۸۴ء سے الور کے راجہ مہروک کی درخواست اور حضرت عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کی ایما پر اس مبارک ومسعود فریضہ کو انجام دینے کے سلسلہ کا آغاز ہوا، اس وقت سے آج تک بہت سے مسلم اور غیر مسلم اہل علم نے اس عنوان کو اپنی قلمی جدوجہد کا مرکز بنایا، فرنچ زبان میں الگزنڈر روس، ڈچ میں ہنڈرک گلاس ماکر، پولش میں چون مرزا تراک بسکی، بنگالی میں گریش چندر سین، بوسنیائی زبان میں جمال لدین کوسف، حبرو میں جوزف ریبلن، ہنگری میں ریبورٹ سائمن، چترالی میں قاری سعید بزرگ شاہ، ہندی میں حضرت مولانا ارشد مدنی و پروفیسر سلیمان محمد فاروق، چینی میں یوسف ماڈیکسن، محمد ما، جیان، جرمن میں روڈی پارٹ، انڈونیشی میں عبدالرؤف، ملیشیائی زبان میں ہاشم، ایم جسٹی صدیقی، ترکی میں شیخ محمد بن ادریس، جاپانی میں اوکاراسکوکی، تیلگو میں

⊙ جنرل سکریٹری: جمعیۃ علماء، نیپال۔

ڈاکٹر عبدالرحیم مولانا، فلپینی میں فاطمہ جوزاما، اُردو میں حضرت شیخ الہند، حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت تھانوی، مولانا احمد صاحب، مولانا مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا دریابادی، حضرت مفتی محمد شفیع، مولانا محمد جوناگڑھی اور انگریزی میں پکتھال، عبداللہ یوسف کا نام قابل ذکر ہے، جون ۲۰۱۰ء کے ریکارڈ کے مطابق اب تک دنیا کی ۱۱۴ زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم منتقل ہو چکے ہیں۔

دنیا بھر میں بولی جانے والی متداول زبانوں میں جغرافیائی اور عددی لحاظ سے ہم نیپالی زبان کو بھی شمار کر سکتے ہیں، تیس ملین آبادی والے ملک نیپال کی ۵۰ فیصد لوگوں کی مادری زبان نیپالی ہے، یہ زبان نیپال کے علاوہ بھارت کے سکم، مغربی بنگال، شمال مشرقی صوبوں، آسام، منی پور، اروناچل پردیش، میگھالیہ اور اترا کھنڈ میں آباد بہت سے لوگوں کی مادری زبان ہے، جب کہ بھوٹان، تبت، برما کی معتد بہ تعداد کی یہ زبان ہے، پانچ کروڑ افراد یہ زبان بولتے ہیں اور نو کروڑ افراد تک اس کا حلقہ اثر ہے، دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی اس زبان نے عالمی ادب وانشاء اور شعر وسخن کے باب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے، نامی گرامی قلم کاروں میں: بالا کرشن سم، سدھارتھ ٹرلشیٹھ، بشیشہ پرساد کوئرالا، لیکھ ناتھ پوڈیل، مادھو پرساد گھیرے، لیلا بہادر چھتری، بھانو بھکت، پرشودھان، تاراناتھ شرما، اندر بہادر رائے وغیرہ کے رشحات قلم، عالمی ادب کے بیش بہا ورثہ میں شامل کئے جانے کے قابل ہیں، ابھی کچھ سال قبل میرے دوست، سابق وزیر مواصلات جناب جے پی گپتا کی تحریر کردہ ''احتساب کی حراست اور میری یادیں'' مولانا آزاد کی ''غبارِ خاطر'' کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

نیپالی زبان میں مختلف علوم وفنون اور دنیا کے مشہور ومعروف قلم کاروں کے شاہکار منتقل ہوتے رہے ہیں اور اس سرمایہ کو نیپالی معاشرہ میں عزت واحترام اور رفعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے، مگر بڑے افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ اکیسویں صدی کی اس دہائی کے آغاز سے قبل اس میدان میں کسی باضابطہ، منظم، مربوط، مسلسل کاوش اور نتیجہ خیز محنت کا پتہ نہیں چلتا۔

راقم الحروف نے ۱۹۹۰ء کی دہائی کا تقریباً پورا وقت دارالحکومت کاٹھمنڈو میں گذارا ہے، اس دوران مختلف موضوعات پر متعدد کتابوں کے نیپالی زبان میں تراجم، تالیف اور طباعت کے مرحلہ سے گذرنے کے دوران شدت کے ساتھ یہ داعیہ پیدا ہوا کہ سب کچھ ہو رہا ہے؛ لیکن براہِ راست قرآن کریم کی خدمت نہیں ہو پا رہی ہے؛ چنانچہ میں نے اس عظیم کاز کے لئے پانچ رکنی ایک کمیٹی بنائی، جس میں اس عاجز کے علاوہ پروفیسر ابواللیث مرحوم، جناب پروفیسر زاہد پرویز، جناب صابر حسین صاحب اور جناب محمد نصیر صدیقی صاحب ایڈوکیٹ شامل تھے۔

''عـم یتساء لون '' سے ترجمہ شروع کیا گیا، ایک پارہ ترجمہ مکمل کرنے کے بعد جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ ترجمہ میں خامیاں ہیں اور ہم لوگ معانی قرآن کے تراجم کے حق کی ادائیگی میں قاصر رہے ہیں، اس کی اصلاح یا نظر ثانی کئے بغیر، کام موقوف کر دیا گیا اور کئی سال تک موقوف ہی رہا۔

اکیسویں صدی کی آمد آمد تھی، جب میں ایک وفد کے ساتھ فقیہ النفس، شریح ثانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، دیگر مسائل کے ساتھ جب میں نے نیپالی زبان میں ترجمہ کی ضرورت کی جانب توجہ دلائی، تو حضرت قاضی صاحب نے بے ساختہ ارشاد فرمایا: ''خالد! اس کام کو ہونا ہی چاہئے''۔

حضرت قاضی صاحبؒ کی ذات گرامی، ان کی طبیعت، مزاج، قوت کار اور طریقہ کار سے واقف حضرات بہ خوبی جانتے ہیں کہ انھیں جو منصوبہ پسند آجاتا تھا، اسے عمل میں لائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے تھے، انھوں نے تقریباً ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر فرمایا کہ ''اس دن امارت آجانا، میں کچھ اور لوگوں کو بلاؤں گا''۔

معینہ تاریخ پر حضرت قاضی صاحبؒ امارت میں تشریف رکھتے تھے، میرے علاوہ نیپال سے جناب ماسٹر شکر اللہ صاحب شاکر، محترم حسن انصاری صاحب، جناب ہاشم انصاری صاحب، جناب مولانا طیب صاحب، جناب نسیم شیخ صاحب بھی آئے ہوئے تھے، حضرت قاضی صاحبؒ نے ایک میٹنگ کی شکل میں مشاورت فرمائی اور یہ طے پایا کہ اس کام کا ذمہ اس بندۂ عاجز کے سپرد کیا جائے! ترجمہ کی ایک کمیٹی بنائی گئی، اصلاح، نظر ثانی اور نظر نہائی کا ایک خاکہ تیار کیا گیا اور حضرت قاضی صاحبؒ کی نگرانی میں باضابطہ اس مبارک و مسعود کاز کا آغاز کر دیا گیا۔

کئی ایک بار نیپالی مسودہ لے کر حضرت قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اگرچہ آپ کی زبان نیپالی نہیں تھی؛ لیکن حیرت انگیز اور کرشماتی انداز میں بعض جگہ پر غلطیوں کی نشاندہی فرماجاتے تھے، نیپالی زبان میں مروجہ الفاظ و اصطلاحات کے اصل مصادر کی بھی تعیین فرمادیتے تھے، تراجم میں مترادف الفاظ کے انتخاب کے وقت موزوں لفظ کا فیصلہ کس طرح کیا جائے؟ اس سوال پر ایک بار بحث کے دوران میں نے ''ڈرنے'' کے لئے دو لفظ بتایا: ''डराउनु'' اور ''तर्सनु'' حضرت قاضی صاحبؒ نے بلا تامل فرمایا کہ: ''نیپالی کا لفظ तर्सनु فارسی کے ترسیدن سے ماخوذ ہے''، میں عش عش کر اُٹھا، کہ اتنے زمانے سے عام بول چال اور لکھنے کے باوجود میرے ذہن نے اس جانب سبقت نہیں کی۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے علالت کے بعد مستقلاً دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، ترجمہ کے بڑے حصہ کا کام ہونے کے باوجود، اس پر نظر ثانی اور نظر نہائی کے مرحلہ سے نہیں گذرا جاسکا، میری اپنی دیگر مصروفیات و مشاغل اور کچھ اسباب مانع رہے، اسی دوران حضرت قاضی صاحبؒ خالق حقیقی سے جا ملے۔

۲۰۰۶ء میں ترجمہ کے سورہ فاتحہ، سورہ بقرہ پر مشتمل ایک حصہ پر نظر ثانی کی گئی، مختصر حواشی لکھے گئے اور نیپال کے مشہور و معروف ادارہ ''دار التعلیم والتربیت، سرہا'' نے اس کی طباعت کا فریضہ انجام دیا، ترجمہ میں حضرت قاضی صاحبؒ کی ہدایت کے مطابق بہت زیادہ حزم و احتیاط سے کام لیا گیا تھا، اُردو میں حضرت شیخ الہند اور انگریزی میں عبداللہ یوسف وپکتھال کے ترجمہ کو استفادہ کے لئے پیش نظر رکھا گیا تھا، زبان بالکل سادہ، آسان، الفاظ سہل تعبیر قابل فہم اور زیادہ مشکل الفاظ کے لئے انڈکس کا استعمال کیا گیا تھا، اس لئے اہل علم اور خود نیپالی زبان کے ماہرین اور نیپالی قارئین نے اسے خوب پسند کیا۔

میں انتہائی افسوس اور احساس ندامت کے ساتھ عرض گذار ہوں کہ تاہنوز اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا، **واللہ ولي التوفیق** .

میرے اور میرے رفقاء کار کے علاوہ جمعیۃ اہل حدیث نے بھی نیپالی ترجمہ کا کام کیا ہے، مولانا عبدالخالق سلفی عرصہ سے اس اہم فریضہ کو انجام دینے میں مصروف ہیں، میں نے معائنہ بھی کیا ہے، ان لوگوں نے پہلے پارہ کی طباعت بھی کی ہے، مکمل ترجمہ میری نظر سے نہیں گذرا۔

ابھی حال میں قرآن کا مکمل ترجمہ مولانا علاء الدین صاحب نے کیا ہے اور اسے ''اسلامی سنگھ'' نے شائع بھی کیا ہے، ترجمہ چوں کہ ایک خاص فکر اور مکتب سے متاثر ہے، اس لئے اسے ''معروضی ترجمہ'' کہنا میرے لئے بے حد مشکل ہے، ترجمہ کے لئے آسان، سادہ الفاظ کو چھوڑ کر مشکل الفاظ اور مغلق تعبیر استعمال کی گئی ہے، اس لئے عام قاری کے لئے استفادہ قدرے دشوار ہے۔

حقیقتاً نیپالی زبان میں قرآنیات کے باب میں مذکورہ کاوشوں کے باوجود بہت بڑا خلا پایا جاتا ہے، اگر آپ اس ذیل میں ایمان، عقائد، قرآن پر اعتراضات اور ان کے جوابات کے موضوعات پر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کرلیں تو ایک طویل فہرست تیار ہوسکتی ہے، خود راقم الحروف نے اسلام پر اور قرآن کریم کی آیات پر وارد اعتراضات کے جواب میں: ''इस्लाम धर्मगरे भर्म रवास्तविक्ता'' شائع کی ہے، نماز کے موضوع پر دار التعلیم والتربیت نے پاکٹ سائز کتابچہ طبع کیا ہے، جناب حفظ الرحمٰن خان صاحب نے قرآن وحدیث کی روشنی میں عورتوں سے متعلق اسلام پر عائد اعتراضات کا شافی جواب دیا ہے، عقائد پر محمد بن ابراہیم التیمی کی کتاب کا ترجمہ ہوا ہے، حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ کے کتابچہ ''شناخت'' کا ترجمہ کرا کر میں نے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

نیپالی زبان میں قرآنی خدمات کے ذیل میں شاید اس کا ذکر بے محل نہ ہو کہ جمعیۃ علماء نیپال نے مختلف پروگراموں، جلسوں، سیمیناروں، دانشوروں کی نشستوں اور ملاقاتوں میں نیپالی داں طبقہ میں قرآن کے پیغام کو پہنچانے کی مؤثر کوشش کی ہے اور جمعیۃ آئندہ بھی اس کا عزم رکھتی ہے۔

قرآنی خدمات کے باب میں نیپالی زبان میں جو بھی کام ہوا ہے وہ یقیناً ناکافی ہے؛ لیکن یہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے اگر آپ اسے غنیمت سمجھیں، تو شاید یہ قرین انصاف ہی ہوگا۔

اس عاجز اور اس کے رفقاء کار نے جو حقیر سی خدمات اس میدان میں انجام دی ہیں اس کے لئے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے بانی وناظم، استاذ محترم، فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ادام اللہ فیوضہم کی رہنمائی، بیش قیمت مشوروں، توجہات، ذاتی دلچسپی اور دُعاؤں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید کی خدمت میں ہندوؤں کا حصہ

ڈاکٹر مظفر عالم ⊙

عالم اسلام میں اکثریت غیر عربوں کی ہے جن کا تعلق قرآنِ کریم سے ایمان وعقیدہ کی بنیاد پر ہے، ان میں کی اکثریت قرآن کریم کی تلاوت مفہوم ومطلب کے سمجھے بغیر صرف عبادت کے طور پر کرتی ہے، گنتی کے چند لوگ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا فہم عطا کیا ہے اور ان کی وابستگی عربی زبان وادب سے کسی نہ کسی درجہ میں ہے، قرآن کے تراجم غیر عربوں کی اہم ترین ضرورتوں میں ہے؛ تاکہ یہ کلام الٰہی کو براہِ راست سمجھ سکیں اور اس کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہوسکیں نیز خالق ومالک سے قربت حاصل کرسکیں، ان کے علاوہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک بڑی تعداد ہمارے غیر مسلم ہم وطنوں کی بھی ہے جو قرآن کریم کو علمی مذاکرہ ومباحثہ کے لیے سمجھنا چاہتے ہیں، ان ہی ضرورتوں کے پیش نظر کلام الٰہی کا دنیا کی اکثر وبیشتر زبانوں میں عام طور پر اور ہندوستانی زبانوں میں خاص طور پر ترجمہ ہوچکا ہے اور چوں کہ ہمارا موضوع بحث سردست صرف ہندوؤں کی خدمات ہیں، اس لئے ان چند صفحات میں ان ہی تراجم کا تذکرہ کیا جائے گا، جو ہمارے ہم وطنوں نے کیا ہے اور جن تک ہماری رسائی بھی ممکن ہے۔

سرزمین ہند میں قرآن کریم کا سب سے پہلا ترجمہ سندھ میں ۸۸۳ء میں معرض وجود میں آیا، بزرگ بن شہر یار کی تحریر کی روشنی میں یہ ترجمہ ایک ہندو عالم نے پنجاب وسندھ کے راجہ مہروک بن رائق کے لئے کیا تھا قرآن کریم کا یہ مکمل ترجمہ نہیں تھا؛ بلکہ مترجم صرف سورہ یٰسین تک ہی پہنچ سکا، ترجمہ کی زبان کا تعین نہیں کیا جاسکا، بقول پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی عہد عالمگیری میں زیب النساء کے ایماء پر جو ہندی میں ترجمہ کیا گیا اس کا مترجم بھی ایک ہندو تھا جس کا نام معلوم نہ ہوسکا۔

ہندی کے مشہور شاعر بھارتیندو ہریش چندر نے قرآن کا ترجمہ شروع کیا تھا، یہ ترجمہ رسالہ ہریش چندر میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا مگر مکمل نہیں ہوسکا، کنہیالال لکھداری کا ایک ترجمہ دھرم سبھا لدھیانہ سے

⊙ استاذ شعبۂ عربی: ای، ایف، ایل، یونیورسٹی، حیدرآباد۔

۱۸۸۲ء میں شائع ہوا تھا، جو ۱۵۴۱ صفحات پر مشتمل تھا، اپنے ترجمہ میں انھوں نے شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ سے مدد لی تھی، یہ ترجمہ سردار جگجوت سنگھ تو یرا اور رنجیت سنگھ کی فرمائش پر کیا گیا تھا، اسی طرح سندھ کے وشنداس کا بھی ایک ترجمہ مشہور ہے، وشنداس کا تعلق گلاب داس پنت سے تھا جو ایک صوفی سلسلہ ہے، وینوا بھاوے، تحریک بھودان کے محرک نے بھی قرآن کی ایک ہزار آیات سے زیادہ کا انتخاب ''روح القرآن'' کے نام سے مرتب کیا تھا جس کا ہندی ترجمہ ''قرآن سار'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

جناب ونے کمار اوستھی نے تفسیر ماجدی کو اپنا محور بنا کر قرآن کا ہندی ترجمہ کیا ہے، تفسیر ماجدی ''مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ہے اور زیر بحث ترجمہ ''قرآن شریف —تفسیر ماجدی'' کے نام سے لکھنؤ کے کتاب گھر نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا ہے، اس کی پہلی جلد ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس جلد میں صرف پانچ سورتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ ترجمہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے گرانقدر اور مفصل مقدمہ کے ساتھ چھپا ہے اور یہی مقدمہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہے، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تعریف وتوصیف کی ہے اور ان کی تفسیر کو اُردو کی ممتاز تفاسیر میں شمار کیا ہے، بقول ان کے یہ تفسیر قرآنی نظریات کا ایک آئینہ ہے اور سنی (غیر شیعی) مکتبِ فکر کو سمجھنے کا ایک بہترین ذریعہ، شاید یہ اس لئے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ان خوش نصیب مفسرین میں ہیں، جنھیں عربی اور انگریزی دونوں مصادر سے براہِ راست استفادہ کا موقع ملا اور دونوں زبانوں پر انھیں یکساں عبور حاصل تھا، علاوہ ازیں مستشرقین کے بہت سارے شکوک کا انھوں نے ازالہ بھی کیا ہے اور اخیر میں علی میاں ندویؒ نے اوستھی صاحب کی کوششوں کی ستائش کی ہے۔

ونئے کمار اوستھی صاحب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر سے کافی متاثر تھے اور شاید اس لئے ہندی ترجمہ کے لئے انھوں نے اس تفسیر کا انتخاب کیا، خاندانی اعتبار سے بھی قرآن کریم سے لگاؤ اوستھی صاحب کو ورثہ میں ملا تھا، ان کے والد نند کمار اوستھی نے قرآن کریم کا ہندی نسخہ ۱۹۴۹ء میں شائع کیا تھا جس میں متن کو عربی کے علاوہ ہندی دیوناگری میں بھی لکھا گیا تھا، اس ترجمہ میں انھوں نے اردو اور انگریزی کی مستند تفاسیر سے استفادہ کیا تھا، غرض یہ کہ اپنے والد کی کوششوں اور ان کی تعریف وتوصیف کو دیکھتے ہوئے ونئے کمار اوستھی نے بھی ترجمہ قرآن کی طرف قدم بڑھایا، اس ترجمہ کے مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل خصوصیات اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔

(۱) قرآن عربی متن کے ساتھ ساتھ ہندی دیوناگری رسم الخط میں ہے۔

(۲) تلاوتِ کلام پاک کے لئے رہنمایانہ اُصول تحریر کئے گئے ہیں؛ تاکہ ایک ہندی داں صحیح طور پر اس کی تلاوت کر سکے۔

(۳) قرآن کی ایک موضوعاتی فہرست اس سے ملحق کردی گئی ہے۔
(۴) عربی قواعد پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

غرض یہ کہ مترجم نے ایک اچھی کوشش کی ہے، ایسی عام فہم زبان میں ترجمہ کیا ہے جسے ایک اوسط درجہ کا ہندی داں بھی سمجھ سکتا ہے اور جو اردو الفاظ ہندی میں استعمال ہوتے ہیں ان کو بعینہ ان ہی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کے جتنے تراجم ہندی میں ہوئے ہیں ان میں یہ ترجمہ شاہکار ترجمہ کی حیثیت رکھتا ہے تو شاید مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔

ماسٹر رام چندر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، انیسویں صدی ہندوستان میں ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، آریہ سماج قائدین میں ان کا شمار ہوتا ہے عربی زبان وادب کے اسکالر سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے قرآن کے ایسے چند اجزاء کا ترجمہ کیا ہے جن کا ترجمہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی بدنام زمانہ تصنیف ''ستیارتھ پرکاش'' کے نام سے کیا تھا شاید انھوں نے یہ ترجمہ مسلمانوں کے تالیف قلب کے لئے کیا؛ کیوں کہ ''سیتارتھ پرکاش'' قرآن کا ایک ایسا مہمل اور ناقص ترجمہ تھا، جس کو اس وقت کے دانشوروں نے کوڑے دان کے نذر کردیا تھا اور وہ ترجمہ اپنا علمی، ادبی اور تحقیقی وقار بحال کرنے میں ناکام ہوگیا تھا، اس ترجمہ کو ''ستیارتھ پرکاش'' کا تصحیح شدہ نسخہ سمجھا جاسکتا ہے، اپنے گرو کے ترجمہ کے نقائص کا اعتراف خود ماسٹر رام چندر نے ایک محتاط انداز میں کیا ہے اور ڈھکے چھپے انداز میں اس کے دفاع کی کوشش بھی کی ہے، بقول پنڈت رام چندر ''ستیارتھ پرکاش'' شاہ رفیع الدین دہلویؒ کے اُردو ترجمہ کے روشنی میں لکھی گئی تھی۔

ماسٹر رام چندر کا ترجمہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہو، اس میں پبلیشر کا نام نہیں ہے پورا ترجمہ صرف ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا گیا ہے، قرآنی آیات کو عربی متن کے علاوہ ہندی دیوناگیری رسم الخط میں بھی لکھا گیا ہے، خالص ہندی اور سنسکرت الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے، اس کا نسخہ آریہ سماج لائبریری واقع دریا گنج، دہلی اور پنڈت کنیا سبھا ودیا کالج، بنارس میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ قرآن کا ہندی ترجمہ پریم سرن پرنت نے کئی جلدوں میں کیا؛ لیکن صرف دوجلدیں پہلی اور تیسری آریہ سماج لائبریری، بنارس میں موجود ہیں، پہلی جلد سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ پر مشتمل ہے اور تیسری جلد میں سورہ مائدہ اور سورۂ انعام کا احاطہ کیا گیا ہے، مقدمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مترجم کو کچھ نامساعد حالات کے سبب صرف تین جلدوں پر اکتفا کرنا پڑا اگرچہ مقدمہ میں مترجم نے اس بات کی آرزو اور تمنا کی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ پورے قرآن کا ترجمہ مختلف جلدوں میں شائع کرے گا، پہلی اور تیسری جلد کے علاوہ کسی اور کا پتہ ہندوستان کی کسی

آریہ سماج لائبریری میں ملتا ہے اور نہ ہی ان کی فہرست کتب میں کوئی تذکرہ ہے، دوسری جلد جو دستیاب نہیں ہے شاید مختصر تعداد میں چھپی تھی جن کے ختم ہونے کے بعد دوبارہ ان کی طباعت کا انتظام نہ ہوسکا، ترجمہ پریم پستکا لے آگرہ سے شائع ہوا، سن طباعت کسی نسخہ میں مذکور نہیں ہے، تا آں کہ مقدمہ کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس کیا گیا ہے، مترجم نے اس کا انتساب سیٹھ جگل کشور جی برلا کی طرف کیا ہے اور مقدمہ سے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ مترجم گاندھی جی اور سوامی برہمانند سرسوتی کے نظریات سے متاثر تھا، بقول مترجم اس ترجمہ کا مقصد ہندوؤں میں قرآنی تعلیم کو عام کرنا تھا، پہلی جلد ۱۶۰ صفحات پر اور تیسری جلد ۱۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

اسی طرح پنڈت رگھوناتھ پرساد مشرا بھی اس میدان کے شہسواروں میں ہیں آپ کا تعلق ضلع اٹاوہ، اترپردیش سے ہے، عربی زبان کے بڑے اسکالرس میں شمار کئے جاتے ہیں اور غالب گمان یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ انھوں نے براہ راست عربی سے کیا ہے ۔اس ترجمہ کا مقدمہ اختلافات وتناقضات سے بھرا ہوا ہے اور مذہب اسلام کے خلاف ان کے دل میں جو نفرت تھی وہ ترجمہ کے مقدمہ کی عبارت سے بالکل عیاں ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ علمی اور ادبی لحاظ سے کوئی قدر ومنزلت حاصل نہ کرسکا، دوران مطالعہ قاری کو صاف محسوس ہوتا ہے کہ مترجم کا مقصد صرف قرآن کریم کا ایک خاص نظریاتی پس منظر میں مطالعہ کرنا ہے، انھوں نے اپنے مقدمہ میں قارئین سے خواہش کی ہے کہ اس ترجمہ کے پڑھنے سے قبل قرآن سے متعلق ان کی تصنیف ''قرآن کا آدرش'' کا مطالعہ ضرور کریں۔

قرآن کے جزوی ترجمہ نگاروں کی فہرست میں ستیہ دیو جی کا بھی نام آتا ہے، انھوں نے قرآن کی کچھ منتخب آیات کا ترجمہ کیا ہے اور جن آیات کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ بھی تسلسل کے ساتھ نہیں ہے، پہلی جلد سورہ فاتحہ مکمل اور سورہ بقرۃ کے منتخبہ آیات پر مشتمل ہے اور یہ نسخہ کنیا مہاودیالیہ لائبریری بنارس میں موجود ہے، باقی جلدوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے، خالص ہندی زبان کا استعمال کیا گیا ہے یہ ترجمہ ۱۹۱۴ء میں تاراینترالیہ بنارس سے چھپا ہے۔

پنڈت کیلاش ناتھ برہست نے امام الدین رام نگری کے ساتھ مولانا صدرالدین اصلاحی کے اُردو ترجمہ کو ہندی کی شکل دی تھی، یہ ترجمہ ۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی رامپور سے شائع ہوا تھا اور اس کا صرف پہلا پارہ ہی شائع ہوا، ۱۹۹۴ء میں حکومت ہند کے سابق کیبنیٹ سکریٹری وینود چند پانڈے نے قرآن کا ترجمہ کیا ہے، ان مذکورہ ناموں کے علاوہ فروری ۲۰۰۰ء میں دہلی کے کتاب میلہ میں ''پوتر قرآن درشن'' کے نام سے قرآن کا ایک منظوم ہندی ترجمہ بھی نمائش کے لئے رکھا گیا تھا جس کے مترجم دھن پرکاش ایڈوکیٹ سپریم کورٹ ہیں، اسے مطبع آلوک پرکاش نے شائع کیا ہے۔

سنسکرت جو ہندوستان کی تمام زبانوں کی ماں ہے، اس زبان میں پہلی قابل قدر کوشش ستیہ دیو ورما کی ہے،

جنھوں نے قرآنِ کریم کا ترجمہ "Sanskiritam Quranam" کے نام سے کیا ہے اور یہ ۱۹۹۰ء میں دلی سے چھپا ہے، اپنے مقدمہ میں جناب ورما صاحب نے مختلف مذہبی موضوعات کی ایک فہرست دی ہے مثلاً وحدتِ الٰہی، صفاتِ باری تعالیٰ، مذہب کا ارتقا، ضلالت کی انتہا، عذاب کا اخلاقی پہلو، انتقالِ ارواح وغیرہ، بقول ان کے یہ ایسے موضوعات ہیں جو اسلام اور دوسرے مذاہب میں قدرے مشترک ہیں ؛ لہٰذا وید اور قرآن کی تعلیمات ان موضوعات سے متعلق ملتے جلتے ہیں، انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی یہ کوشش دراصل محمد فاروق خان رامپوری کے ترجمہ قرآن پر مبنی ہے، علاوہ ازیں ایم، ایم، پکتھال کے انگریزی ترجمہ سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے۔

ان کے علاوہ جناب راگھون نائر کا منظوم ترجمہ قرآن ''دیویا دیپتی'' ۲۰۰۰ء میں سملیم پبلیکیشنز نے شائع کیا ہے ان کا تعلق صوبہ کیرالا سے ہے، ان کے ہم نام اور ہم وطن کا بھی مکمل منظوم ترجمہ ''وشووانی'' کے نام سے آئی، پی، ایچ، بک اسٹال نے چھاپا ہے، یہ ترجمہ بھی ۲۰۰۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

ڈاکٹر چیلوکوری نارائنا راؤ نے قرآن کا ترجمہ تلگو زبان میں ۱۹۳۰ء کیا ہے یہ گورنمنٹ کالج انتاپور میں لسانیات کے پروفیسر تھے، ترجمہ کے اسباب وعوامل پر انھوں نے مقدمہ میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے، ۱۹۱۵ء میں انھوں نے ترجمہ کا آغاز کیا جو ۱۹۳۰ تک اختتام پذیر ہوا پہلی بار ۱۹۳۰ء میں اور دوسری بار ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا، اس ترجمہ میں انھوں نے اسلامی اسکالرس اور عربی داں حضرات کی مدد بھی لی ہے یہ پورا ترجمہ ایک جلد میں ہے جو ۵۴۷ صفحات پر مشتمل ہے، علاوہ ازیں ۲۶ صفحات کا مقدمہ بھی ہے۔

ان کے علاوہ ام تھلا کیشو راؤ نے بھی ۱۰۶۵ قرآنی آیات کا ترجمہ تیلگو میں کیا ہے، اس ترجمہ کو دینووابھاوے کے ''قرآن سار'' میں شامل کردیا گیا ہے جو ۱۹۷۴ میں چھپا تھا، اس ترجمہ کا تلگو نام ''قرآن سائیرامو'' ہے گاندھی ساہتیہ پراچارانالا ایم حیدرآباد سے یہ شائع ہوا، ۱۰۶۵ آیتیں چار سو عناوین اور ذیلی عناوین میں تقسیم کی گئی ہیں، مسٹر وینکٹا جو مراٹھی زبان کے اسکالر تھے اور مدراس کے رہنے والے تھے نے بھی قرآن کا ترجمہ تلگو میں کیا ہے؛ لیکن یہ ترجمہ چوں کہ دستیاب نہیں ہے اس لئے اس پر روشنی ڈالنا مشکل ہے۔

مسٹر ایس این کرشنا راؤ نے قرآن کا ترجمہ ملیالم میں کیا ہے، یہ ''سدگرو'' ماہ نامہ کے ایڈیٹر تھے اور کوچین سے تعلق رکھتے تھے، یہ ترجمہ بھی دستیاب نہیں ہے، قرآن کا ملیالم میں دوسرا ترجمہ کونیور راگھون نائیر نے کیا ہے، انھوں نے براہ راست عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ سے استفادہ کیا ہے، آپ ملیالم اور سنسکرت زبان کے اسکالر تھے، عربی سے براہ راست انھوں نے استفادہ نہیں کیا، اس لئے ترجمہ میں کمی وکوتاہی کا انھیں خود اعتراف ہے۔

گریش چندر سین (۱۸۳۴-۱۹۱۰ء) سے کون واقف نہیں ان کے ہاتھوں قرآن کریم کا پہلا بنگالی ترجمہ منظر عام پر آیا، انھوں نے قرآن پاک کا ترجمہ تین جلدوں میں کیا جو ۱۸۸۱ سے ۱۸۸۶ء کے درمیان چھپا، اس ترجمہ میں عربی متن موجود نہیں ہے، آپ برہمو سماج کے ایک مبلغ تھے، اصلاً مشرقی پاکستان سے آپ کا تعلق تھا، وحدت ادیان کے قائل تھے، آپ اس کام پر اپنے مصلح اور رہنما ''کیشب چندر سین'' جو موڈرن بنگال کے معمار سمجھے جاتے ہیں ان کے ذریعہ مامور کئے گئے تھے، آپ کی تعلیم ڈھاکہ کے ایک مدرسہ میں ہوئی تھی آپ ایک فاضل مدرسہ تھے، اس لئے قرآن وحدیث پر آپ کی بڑی اچھی نظر تھی، آپ کو عام طور پر مولوی گریش چندر سین کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ بنگال میں کچھ ایسی بھی شخصیتیں ہیں، جنھوں نے قرآن کریم کے منتخبہ آیات یا منتخبہ سورتوں کا ترجمہ کیا ہے، منتخبہ سورتوں میں سورہ یٰسین سورہ ملک اور سورہ رحمٰن کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے، بعض مترجمین نے ان مترجمہ سورتوں کو ان کی تفسیر کے ساتھ اور بعض دوسروں نے بغیر تفسیر کے شائع کیا ہے، اس قسم کے مترجمین میں جناب تاراچرن بنرجی کا نام سرفہرست ہے، آپ کی کوششیں ۱۸۸۲ء میں منظر عام پر آئیں۔

آپ کے علاوہ ۱۹ویں صدی میں کسی اور مترجم کا سراغ نہیں ملتا ہے، بیسویں صدی کے اوائل سے اخیر تک اس قسم کے مترجمین کی کوششیں بارآور ہوئیں ہیں؛ چنانچہ جناب دوبج داس دتا کا ترجمہ ۱۹۲۶ء میں جناب بسفتا کمار بنرجی کا ترجمہ ۱۹۳۷ میں، جناب فلیپ بسواس کا ترجمہ ۱۹۹۱ میں اور جناب راجندر ناتھ مترا کا ترجمہ ۱۹۹۷ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

مذکورہ تمام مباحث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اکثر وبیشتر مترجمین نے قرآن کے انگریزی واردو تراجم سے استفادہ کیا ہے اور چند کے علاوہ عام طور پر مترجمین عربی سے واقف نہ تھے، اور چوں کہ قرآن کا عربی زبان وادب سے گہرا رشتہ ہے اس لئے ان تمام تراجم میں جا بجا غلطیاں موجود ہیں، ان مترجمین کے خلوص نیت اور والہانہ شغف وانہماک سے قطع نظر یہ بات کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ تراجم براہ راست اگر عربی زبان سے کئے جاتے تو بہت بہتر ہوتا اور زبان وبیان نیز مفہوم ومطالب کی ادائیگی کی غلطیوں سے پاک ہوتا۔

تراجم قرآن کے علاوہ ہمارے ہندو ہم وطنوں کی کچھ ایسی تصنیفات بھی ہیں جن کا براہ راست قرآن کریم سے تعلق ہے اسی قسم کی ایک تحریر بھارتیندو ہریش چندر کی 'Khuda Quranic Philosophy' کے نام سے ہے، اس میں انھوں نے قرآن کے مختلف تصورات کا جائزہ لیا ہے، مثلاً روح، خدا کی نوعیت، عقل، علم، وحدتِ الٰہی اور خدا کے صفات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، ان تمام مفاہیم کی تشریح قرآنی آیات کی روشنی میں کی ہے، مصنف کے مطابق قرآن

کسی قدامت پسند نظام کی وکالت کرتا ہے، نہ اس میں دقیانوسیت ہے؛ بلکہ ہرزمانہ اور ہرقوم کے لئے اس کی معنویت مسلم ہے، وہ قوم چاہے مہذب ہو یا غیر مہذب قرآن کا پورا فلسفہ معقولیت پسندی پرمبنی ہے، اس کی اخلاقی قدریں مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں، ہر وہ چیز جو بنی نوع انسان کے لئے نقصان دہ ہے، وہ قرآن کی نگاہ میں اخلاق کے منافی ہے، جن قرآنی آیت کے تراجم کو انھوں نے حوالہ کے طور پر پیش کیا ہے، پالمراینڈسیلس کے انگریزی ترجمہ سے لیا ہے، موصوف کی یہ کتاب پرپچر یہ او ورسیز ریتا پریس دلی نے ۱۹۷۹ء میں چھاپی ہے، یہ کتاب ۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

پنڈت سندر لال کی تصنیف 'گیتا اور قرآن' اصلاً ہندی میں ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی اس کی اشاعت Institute of Indo Middle-East Cultural Studies-Hyderabad سے ۱۹۷۵ء میں ہوئی، اصلاً ہندی زبان میں لکھی گئی، بعد میں سید اسد اللہ نے اس کا انگریزی ترجمہ "The Gita and the Quran" کے نام سے شائع کیا، زیر بحث کتاب میں مصنف نے گیتا اور قرآن کی تعلیمات میں ایک گونہ مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے، بلاشبہ دومختلف مذاہب کو قریب لانے کی ایک اچھی اور مثبت کوشش ہے، انگریزی ترجمہ شاید قارئین کی کثرت اور اس کی افادیت کو سامنے رکھتے ہوئے شائع کیا گیا، یہ پوری کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، وحدت ادیان اور تناسخ ارواح کا تصور پوری کتاب پر غالب ہے اور اس وحدت ادیان اور تناسخ ارواح کو انھوں نے گیتا کے اقتباسات اور قرآن وحدیث کے منتخب آیات کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، خود بقول مصنف ''بنی نوع انسان کی زندگی میں مذہب ہی وہ عامل ہے، جو پوری انسانیت کو مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، دونوں کتابوں کے سماجی ثقافتی اور تاریخی پس منظر کا بھی جائزہ لیا ہے، اپنے نقطۂ کو مزید تقویت دینے کے لئے مشائخ، متصوفین اور ہندو سادھو سنتوں کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔

یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے نہ صرف اس لئے کہ اس میں دو مذاہب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے؛ بلکہ اس لئے بھی اہم ہے کہ مصنف نے قرآن اور قرآنی تعلیمات کے سلسلہ میں جو ہندوؤں میں شکوک وشبہات اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کے ازالہ کی بھی ہرممکن کوشش کی ہے، خاص کر جہاد اور قتل ناحق پر مدلل بحث کی ہے، یقیناً اس تصنیف کا قومی یکجہتی کو بحال کرنے میں ایک اہم حصہ ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور کوشش ''مکوندن جی'' نے کی ہے جن کا کتابچہ "Congruencies of Fundamentals in the Quran and Bhagwat Gita" سمکالین پرکاشن نئی دلی سے ۱۹۹۰ء میں چھپا ہے، صاحب کتاب نے قرآن اور گیتا کے درمیان مماثلت اور مشابہت تلاش کرنے کی کوشش ہے، دراصل

دونوں کتابوں کا مقصد تقریباً ایک ہے، یعنی انسانی سماج میں بالعموم مذہب کی بالا دستی اور لا مذہبیت کا مکمل خاتمہ تاکہ انسانی معاشرہ میں امن وسکون قائم ہوسکے، دونوں کے اخلاقی تعلیمات ہر زاویہ سے مشابہہ ہیں، اس مماثلت کی جولکیر ہے وہ دونوں کتابوں کے اہم مفاہیم تک پہنچتی ہے، مثلاً وحدانیت، روح کا تصور، نجات کا طریقہ، تخلیق کائنات، موت، موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کا وقوع یہ ایسے مفاہیم ہیں، جن میں بقول مصنف دونوں کتابوں کی تعلیمات کے درمیان کافی ہم آہنگی ہے، آج کے بدلتے ہوئے سماج اور بدلتی ہوئی انسانی قدروں میں اس کتاب کی اہمیت اور معقولیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے، یہ تحریر صرف ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

پنڈت ونو بھاوے جن کا تذکرہ ترجمہ قرآن کے ضمن میں گذر چکا ہے نے بھی قرآن کی منتخبہ آیات کا ترجمہ ''روح القرآن'' کے نام سے کیا ہے، اسی ''روح القرآن'' کا ترجمہ کچھ حذف واضافہ کے ساتھ "The Essence of Quran" کے نام سے اکھیل بھارت سیوا سنگھ بنارس نے ۱۹۶۲ء میں چھاپا ہے، انھوں نے قرآن کا مطالعہ تقریباً پچیس سال تک کیا. زیر بحث کتاب اسی فکر کا نتیجہ ہے، اس کے مواد کا انتخاب عربی قرآن کریم سے کیا گیا، اور M.M. Picthall کے انگریزی ترجمہ کو اس میں شامل کیا گیا، ان تمام قرآنی منتخبہ آیات کو مصنف نے مختلف عناوین کے تحت پرو دیا ہے؛ تاکہ قرآن کا پیغام واضح ہوسکے، یہ سارے عناوین مراٹھی میں لکھے گئے، جو مصنف کی مادری زبان تھی جس کے نیچے انگریزی ترجمہ دیا گیا، اس تحریر کا مقصد مصنف کے الفاظ میں صرف اور صرف تالیف قلب ہے، یہ تحریر ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

پوری کتاب نو اجزاء پر مشتمل ہے اور ہر جز مختلف موضوعات میں منقسم ہے، مؤلف نے منتخبہ قرآنی آیات کی کوئی تشریح نہیں کی ہے، انھوں نے صرف ان قرآنی خیالات کا اظہار کیا ہے، جن سے وہ متاثر ہوئے اور جسے پوری انسانیت کے لئے مفید سمجھا اور جن آیات کے بارے میں ان کی یہ رائے رہی کہ ہر انسان کے لئے انھیں جاننا ضروری ہے، قرآن کا پیغام اور اس کی تعلیمات کو مطمح نظر انھوں نے اس لئے بنایا؛ تاکہ دنیا میں امن وسلامتی قائم ہوسکے جو ملک وقوم کی وحدت کی ضمانت ہے، Selections From the Quran جناب او پی گھئی کی تصنیف ہے، یہ کتاب Institute of Personal Development Sterling Publisher- New Delhi کے ذریعہ ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آئی، اس کتاب کا مقدمہ پروفیسر رشید الدین نے لکھا، جس میں انھوں نے مذہبی اور فلسفی خیالات کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے مطالعہ کی اہمیت کو اجاگر کیا، بقول مقدمہ نگار موجودہ سماج میں علم ودانش کی ترقی کے لئے عصری علوم کا حصول ناکافی ہے اور اس کی پابجائی قدیم ادب، سائنس، فلسفہ، مذہب کا تنقیدی اور معقولیت پسندی کیساتھ مطالعہ کے ذریعہ کیا جانا ضروری ہے اور بدلتے ہوئے عالمی معاشرہ کے تقاضوں کی تکمیل

کے لئے مذہبی کتابوں کی سائنسی تشریح بھی ضروری ہے، انھوں نے مختلف تہذیب اور مختلف مذاہب کے درمیان باہمی مفاہمت پر بہت زور دیا ہے اور خاص کر ہندوستان میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے؛ کیوں کہ یہ پوری دنیا میں مشترک تہذیب کا مرکز رہا ہے اور اس اشتراک کا اظہار صوفی اور بھگت تحریک میں کیا جاچکا ہے، اس مقدمہ کے بعد سید اوصاف علی کی تحریر کردہ ایک تقریظ ہے جو انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ہمدرد یونیوسٹی کے ڈائریکٹر رہے ہیں، انھوں نے بھی مصنف کی کوششوں کو حتی الامکان سراہا ہے، اس کے بعد ایک پیش لفظ خود مصنف نے بھی تحریر کیا ہے اور اس کتاب کی تصنیف کے پیچھے جو محرکات کارفرماں رہے ہیں ان کا بھی مختصر تذکرہ کیا ہے، کتاب کی ابتداء آپ ﷺ کی سیرت طیبہ سے کی ہے، وحی نزول اور اس کی کیفیت کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے، ترتیب وحی پر ایک جدول بھی ہے، جس میں قرآنی سورتوں کو بالترتیب سجایا گیا ہے؛ لیکن انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس ترتیب میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، اس کے بعد اسلام اور اس کے بنیادی عناصر پر مبسوط بحث ہے، بقول مصنف آپ ﷺ کی سیرت طیبہ اور آپ پر کتاب اللہ کا جو نزول ہوا اس نے کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا ہے اور مسلم عقیدہ کے مطابق تا قیامت یہ دونوں چیزیں انسانیت کو متاثر کرتی رہیں گی، مذکورہ موضوعات کے علاوہ قرآن کے محرمات جیسے نشہ آور چیزیں شراب، اصنام پرستی وغیرہ کا بھی احاطہ کیا ہے اور اپنے پیش لفظ کا اختتام یہ کہتے ہوئے کیا ہے کہ اسلام دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح ایک عالم غیر مرئی کی حقیقت کا معترف ہے، خدائے پاک کی قدرت اس کی ہر جگہ موجودگی اور اس کی مرضی کی تابعداری کی وکالت کرتی ہے، پیش لفظ کے بعد قرآن کی منتخبہ آیات کا تذکرہ ہے، جن کا انتخاب شروع سے آخر سورت تک سے کیا گیا ہے، یہ آیات انسان کی روزمرہ زندگی، اللہ کی ربوبیت توحید، عدل، سلامتی، محبت اور اخوت سے متعلق ہیں، اور کتاب کے اخر میں اصغر علی انجینئر کی تحریر کردہ ایک نوٹ ہے جسے پس نوشت کہا جاسکتا ہے، آپ نے مصنف کی کوششوں کی ستائش کی ہے، خاص کر ان کی غیر جانبدارانہ تحریر کی جو کہ ایک ایسے وقت میں منظر عام پر آئی جب ہندوستاں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا شیرازہ بکھر رہا ہے، یہ تحریر یقیناً بین المذاہب تفاہم میں مددگار ثابت ہوگی۔

جناب بندی سری نواس راؤ کی تصنیف "Christ in the Quran and Bible" مطبع بندی برادرس، ضلع گوداوری، آندھرا پردیش سے ۱۹۷۵ء میں چھپی ہے یہ قرآنی آیات کی روشنی میں عیسائیت کی صداقت کو ثابت کرنے کی ایک کوشش ہے، مصنف نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس تحریر سے ان کا مقصد دونوں مذاہب کے درمیان قربت کو اجاگر کرنا ہے اور اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ بائبل کی موجودگی کے باوجود قرآن کریم کے نازل کرنے کی ضرورت؛ کیوں پڑی، بقول مصنف عیسائیت کی تثلیث کا عقیدہ قرآنی آیات سے بھی

ثابت ہے اور قرآن کا نزول اس لئے ہوا؛ تاکہ ماسبق آسمانی کتابوں کی تصدیق ہوسکے اس کتاب کا ایک بڑا حصہ عیسیٰ مسیح کے تعارف پر مشتمل ہے۔

C.E. Modiraj نے اپنی تصنیف ''قرآن شریف کی عظمت'' کے ذریعہ ہندوؤں کے درمیان قرآن کی عظمت کو بحال کیا ہے، یہ کتاب Abulkalam Azad Oriental Researach Institute Hyderabad سے چھپی ہے جو صرف ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے یہ بھی قرآن کی منتخبہ آیات کا مجموعہ ہے مقدمہ میں مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عام طور پر قرآن شریف کے سلسلے میں عوامی رائے بغیر اس کے مطالعہ کے قائم کی گئی ہے؛ لہٰذا عوام اس کی عظمت سے واقف نہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن زندگی کے تمام شعبوں پر روشنی ڈالتا ہے، اس کلام ربانی نے انسان کو عقل وبصیرت کے استعمال کرنے کی بار بار دعوت دی ہے، اور اس کی تعلیمات کائناتی اور آفاقی ہیں کسی خاص جماعت اور کسی خاص خطے سے اس کا تعلق نہیں، مقدمہ کے بعد کتاب کا آغاز قرآن کی ان آیات سے ہوتا ہے، جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی گئی ہے، جن میں توحید کا واضح تصور پیش کیا گیا ہے، جن میں خدا کی لامتناہی قدرت کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کچھ مباحث فوجی قوانین، سماجی رفاہ عامہ اور ضابطہ اخلاق سے متعلق ہیں، جن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے، اس طرح مصنف نے مذکورہ چار موضوعات پر روشنی ڈال کر قرآن کی عظمت کو ثابت کیا ہے۔

چندر بالی پانڈے کی تصنیف ''قرآن میں ہندی'' سرسوتی مندر بنارس سے ۱۹۴۵ء میں چھپی ہے، یہ کتاب ہندی میں لکھی گئی ہے، اپنے مقدمہ میں مصنف نے آپ ﷺ کا سرزمین ہند سے والہانہ لگاؤ پر روشنی ڈالی ہے قرآن اور ہندوؤں کے مذہبی کتابوں کے درمیان تشابہ اور اختلاف کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور بقول مصنف اصل مقصد تو دومختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ایک دوسرے سے قریب لانا ہے۔

مصنف نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تصنیف ''عرب وہند کے تعلقات'' کا حوالہ دیا ہے، جس میں علامہ نے کافور مشک اور زنجبیل جیسے ہندی کلمات کا قرآن میں موجودگی کا اعتراف کیا ہے، بقول مصنف ان کے علاوہ اور بہت سے دوسرے الفاظ قرآن میں موجود ہیں جو براہ راست سنسکرت سے لئے گئے ہیں اور ان الفاظ کا استعمال سنسکرت کی پرانی کتابیں جیسے ''شروتی'' اور ''اپنشد'' میں کثرت سے ملتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں لفظ توبہ، نمارق، استبرق اور اس جیسے بہت سارے دیگر الفاظ سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔

مصنف نے دہرودیا اور سورہ دہر میں بھی مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے، دھرودیا کا تعلق اپنشد سے ہے اور سورہ دہر کا تعلق قرآن سے، بقول مصنف کے اگرچہ دونوں الفاظ دومختلف معانی میں استعمال ہوئے ہیں؛ لیکن

اگر ان کی تفصیلات پر گہری نظر ڈالی دائے تو دونوں کم وبیش یکساں ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک قرآن کے مضامین میں کوئی جدت ہے نہ ندرت؛ بلکہ بعینہٖ یہ اپنشد سے لئے گئے ہیں اور جو کچھ تھوڑے بہت اختلافات ہیں بھی وہ جغرافیائی اختلافات کے سبب ہیں؛ کیوں کہ قرآن کا تعلق سرزمین عرب سے ہے اور اپنشد کا تعلق ہندوستان سے۔

اسی طرح انھوں نے لفظ ''عرش'' اور اپنشد کا لفظ ''اسندی'' کے درمیان بھی مماثلت تلاش کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسندی براہمہ کا تخت ہے، جیسا کہ اتھروید میں آیا ہے اور دونوں کتابوں میں اس بات کی تفصیلات ملتی ہیں، کہ اس تخت کو آٹھ فرشتوں کے ذریعہ اٹھایا جاتا تھا، اس مماثلت کو انھوں نے ایتر یا براہمن اور سورۂ حاقہ کی ۱۷ویں آیت کی روشنی میں تلاش کی ہے۔

بظاہر عنوان سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مصنف کی کوشش شاید قرآن کریم میں ہندی اور سنسکرت الفاظ کے تلاش کی ہے اور کتاب کا آغاز بھی کچھ اس انداز سے ہوتا ہے؛ لیکن بعد میں ان کی پوری ریسرچ اپنشد اور قرآن کے درمیان تقابل مطالعہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

"Ethics of the Quran" ماگن لال اے، بوچ کی تصنیف ہے، جس کی اشاعت خود مصنف نے بڑودرہ سے ۱۹۷۷ء میں کی ہے، ۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہے، ادیان کا انھیں گہرا مطالعہ ہے، اس تحریر کے ذریعہ انھوں نے اسلام کے بنیادی عناصر کو سمجھنے کی کوشش کی، یہ کتاب دو اجزاء پر مشتمل ہے، پہلا جز قرآن کے فلسفیانہ پہلو پر روشنی ڈالتا ہے اور دوسرا جز سات موضوعات پر مشتمل ہے، اس کتاب سے مصنف کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے خاص کر قرآن کے اخلاقی پہلو پر ان کی گہری نظر ہے اور ان اخلاقی پہلوؤں کا انھوں نے بہت دقت نظری سے جائزہ لیا ہے، ان اخلاقیات کا نہ صرف عملی پہلو سامنے رکھا ہے؛ بلکہ فکری پہلوؤں پر بھی بحث کی ہے، جس کا تعلق براہ راست عقیدہ سے ہے اور ہر نقطہ کی وضاحت انھوں نے مصادر ومراجع کی روشنی میں کی ہے، اس لئے کہیں بھی شک وشبہ، یا غموض کی گنجائش نہیں بچی ہے، اپنے پیش لفظ میں ہی انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ قرآن کے تمام اخلاقی پہلوؤں پر ان کا ایقان ہے۔

مذکورہ بالا صفحات میں ہندوستان میں قرآن مجید کی خدمت میں ہندوؤں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، اس آسمانی صحیفہ سے ان کا لگاؤ زمان ومکان کی قید وبند سے ہمیشہ آزاد رہا ہے، مذکورہ دانشوروں میں سے کسی نے بھی اسلام قبول نہیں کیا، ایک وہ زمانہ تھا جب غیر مسلم قرآن کی آیتوں کو سن کر اسلام قبول کرتے تھے اور ایک آج کا زمانہ ہے، جس میں غیر مسلم پورے قرآن پاک کو سمجھ کر بھی اسلام قبول نہیں کرتا، شاید یہ اس لئے کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی

عملی زندگی تھی جو قرآن وحدیث کی تعلیمات کا پیکر ہوتی تھی نبی رحمت کی صحبت تھی اور عربی زبان سے مادری نسبت اوران جیسے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں، جس کا جائزہ علماء کرام اور دانشوران عظام کو لینا چاہئے اوران اسباب وعلل کو تلاش کرنا چاہئے اور آج کے غیر مسلم دانشوروں کے سامنے مذکورہ اسباب میں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

کتابیات

(1) پروفیسر شیث محمد اسماعیل اعظمی، دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات، کتابی دنیا، نئی دہلی ۲۰۰۲ء۔

(2) *Dr. Vazeer Hasan, The Study of the Quran by Non-Muslim Indian Scholars, Adam Publisher New Delhi 2006.*

(3) *Dr. Muzaffar Alam, Contribution of Hindu Scholars to Arabic language and lilerature in India, the English and Foreign languages university press, 2010.*

ساتواں باب

دینی مدارس وجامعات میں قرآن مجید کی تدریس

درسِ نظامی کا مروجہ تفسیری نصاب — تعارف و جائزہ

مولانا محمد جمال الدین قاسمی ⊙

نحمده ونصلي على رسوله الكريم ، أما بعد !

محترم اساتذہ کرام اور علماء ذی احترام!

افراد و اُمم کی ترقی کا راز قرآنی تعلیمات اور اس کی حکیمانہ نظم و ترتیب میں مضمر ہے، قرآن حکیم بنی نوع انسانی کی فلاح و فوز کے جملہ اجزاء و عناصر پر مشتمل ہے، یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآنی تعلیمات کی تعمیل قرآن کے فہم و تدبر کے بعد ہی ممکن ہے، قرآن عزیز جس رشد و ہدایت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس کا معجزانہ اُسلوب جن حکمتوں کا جامع ہے، جب تک ان سے آگاہی حاصل نہ کی جائے تب تک اس کی پیروی کا کوئی امکان نہیں، یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم قرآنی الفاظ کے معانی و مطالبات کو سمجھنے کی کوشش کریں، علم تفسیر اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوتا ہے، علم تفسیر کی اسی اہمیت کے پیش نظر ہمارے برصغیر کے تمام مدارس میں تفسیر کو داخل نصاب کیا گیا ہے۔

اس علمی، دینی اور فکری مجلس میں میرے مقالہ کا موضوع ہے: ''درسِ نظامی کا مروجہ تفسیری نصاب — تعارف و جائزہ'' اس موضوع پر گفتگو کے لئے ضروری ہے کہ اولاً درسِ نظامی کے مروجہ تفسیری صاحب کی نشاندہی کی جائے، پھر ان کتابوں کا تعارف پیش کیا جائے اور اس کے بعد ان کا جائزہ لیا جائے، ذیل میں ترتیب وار ان تینوں اُمور کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

ہم جب ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے دینی مدارس کے تفسیری نصاب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں جلالین، تفسیر کشاف، تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک، تفسیر ابی السعود، تفسیر ابن کثیر، تفسیر فتح القدیر، تفسیر روح المعانی، احکام القرآن للجصاص، تفسیر مظہری، تفسیر فی ظلال القرآن جیسی اہم تفسیری کتابیں نظر آتی ہیں۔

جلالین شریف

اس تفسیر کو دو جلیل القدر ائمہ جلال الدین محلی اور جلال الدین سیوطی نے مرتب کیا ہے، جلال الدین محلی نے

⊙ استاذ حدیث: دار العلوم حیدر آباد۔

اس تفسیر کا آغاز سورۂ کہف سے کیا اور سورۃ الناس تک پہنچ کر سورۂ فاتحہ کی تفسیر مکمل کر ہی پائے تھے کہ خالق حقیقی سے جا ملے، اس کے بعد جلال الدین سیوطی نے اس تفسیر کی تکمیل کی؛ چنانچہ سورۃ بقرہ سے شروع کر کے سورۃ اسراء پر ختم کیا، سورۃ فاتحہ کی تفسیر چوں کہ جلال الدین محلی کی تحریر کردہ تھی، اس واسطے اس کو سورۃ ناس کے بعد لگا دیا گیا ہے، محلی نے قرآن کریم کے نصف ثانی کی تفسیر نہایت دلکش اور عمیق عبارت میں تحریر کی ہے، اس کے بعد علامہ سیوطی ان کے نقش قدم پر چلے اور تفسیر کو زیادہ وسعت نہ دی؛ کیوں کہ انھوں نے محلی ہی کے طرز و انداز پر اس کی تکمیل کا التزام کیا تھا (مقدمہ تفسیر جلالین)، آپ خود اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے جلال الدین محلی کی تفسیر سے استفادہ کیا ہے، آیاتِ متشابہات کی تفسیر میں بھی ان پر اعتماد کیا ہے، سیوطی نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ محلی کی تحریر کردہ تفسیر ہماری تفسیر کے مقابلہ میں بدرجہا افضل ہے(۱)، اور یہ واقعہ ہے کہ قاری دونوں تفسیروں میں نمایاں فرق و امتیاز محسوس نہیں کرسکتا؛ البتہ چند مقامات پر قدرے اختلاف محسوس ہوتا ہے؛ لیکن ایسے مقامات کی تعداد دس تک بھی نہیں پہنچتی ہے، قاری اس کا اعتراف کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ یہ تفسیر اپنے باب میں عدیم النظیر ہے اور حد درجہ مختصر و موجز ہے، حاجی خلیفہ نے ایک یمنی عالم سے نقل کیا ہے کہ میں نے شروع سے لے کر سورۃ مزمل تک قرآن کریم اور تفسیر جلالین کے حروف گنے تو دونوں کو برابر پایا، پھر آگے سورۃ مدثر سے لے کر آخر تک تفسیر کے حروف قرآن کریم کے حروف سے زیادہ ہیں، (۲) ہندوستان کے اکثر و بیشتر مدارس میں یہ تفسیر داخل درس ہے۔

تفسیر کشاف

یہ تفسیر علامہ زمخشری کی ہے، جو اعتقاداً معتزلی اور مسلکاً حنفی تھے، آپ کی پیدائش ماہ رجب ۴۶۷ھ میں بمقام زمخشر ہوئی، جو علاقہ خوارزم کا ایک حصہ ہے، اگر معتزلی نظریات سے صرف نظر کرلیا جائے تو کشاف ایک ایسی تفسیر ہے کہ جس سے پہلے اس قسم کی تفسیر مرتب نہیں ہوئی تھی، اس میں قرآن کریم کے وجوہ اعجاز اور قرآنی عبارت و بلاغت پر نہایت عمدہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، تفسیر کشاف ہی کا دین ہے کہ بعد میں آنے والے مفسرین خواہ وہ اہل سنت ہی کیوں نہ ہوں اس تفسیر سے بڑی حد تک مستفید ہوئے اور زمخشری کے بیان کردہ استعارات و مجازات اور دیگر بلاغی صورتوں کو اپنی کتب تفسیر میں جگہ دی، تفسیر کشاف میں فقہی مسائل کا بھی بیان ہے؛ لیکن مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کو اس سے خصوصی دلچسپی نہیں ہے، مصنف اگر چہ مسلکاً حنفی ہیں؛ لیکن اس میں وہ تعصب سے کام نہیں لیتے، اس تفسیر میں اسرائیلی روایات بہت کم ہیں اور جہاں ذکر کرتے ہیں وہاں ''روی'' بصیغہ مجہول ذکر

---

(۱) جلالین: ۱/۲۴۷۔ (۲) کشف الظنون: ۱/۲۳۶۔

کرتے ہیں اور اس طرح اس کے ضعف اور عدم صحت کی جانب اشارہ کردیتے ہیں، یا اللہ اعلم کہہ کر متنبہ کردیتے ہیں؛ البتہ جو روایات دین سے مربوط و متعلق ہوتی ہیں، وہاں ان کی صحت کا درجہ یا ان کا ضعف بیان کرکے اس کی عدم صحت واضح کردیا گیا ہے، اس تفسیر کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ اسرائیلی قصص و روایات کے ذکر سے تفسیر کشاف کا دامن داغدار نہیں ہے، تفسیر کشاف کی یہ خوبیاں اپنی جگہ مسلم ہیں؛ لیکن مفسر نے اس میں چند ایسی باتوں کا التزام کرلیا ہے، جن کی وجہ سے اس کا حسن و جمال داغدار ہوئے بغیر نہ رہ سکا، مثلاً :

۱- مؤلف جب ایسی آیت کی تفسیر کرتا ہے جو اس کے مسلک کے خلاف ہوتی ہے تو وہ تکلف و تعسف سے کام لے کر اس کی معنوی تحریف کرتا ہے اور وہ حسبِ ضرورت ہی اس سے کام نہیں لیتا؛ بلکہ ایسی تاویلات کی انھوں نے تو بھرمار کردی ہے۔

۲- مؤلف صالحین و اولیاء پر زبان طعن دراز کرتا ہے، امام رازی نے تفسیر کبیر میں مؤلف کو ہدف تنقید بنایا ہے کہ وہ گستاخی اور سوء ادبی کا مرتکب ہوتا ہے۔

۳- تفسیر میں بکثرت ایسے اشعار درج کئے گئے ہیں جو تمسخر اور مزاح پر مبنی ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان کو تفسیر قرآن میں جگہ دی جاتی۔

۴- مؤلف فرقہ ناجیہ اہل سنت کا ذکر اکثر نفرت و حقارت کے انداز میں کرتا ہے، کہیں ان کو جبریہ اور کہیں کفار و ملاحدہ سے تعبیر کرتا ہے، یہ طرز و انداز علماء کے شایانِ شان نہیں۔(۱)

مؤلف نے اگرچہ اسرائیلی روایات سے اپنی تفسیر کو پاک رکھا ہے؛ لیکن بعض فضائل سور کے ذیل میں احادیث موضوعہ کو بڑی کشادہ دلی سے جگہ دی ہے، ان ہی وجوہ سے ابوحیان نحوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

> زمخشری اگرچہ تفسیر قرآن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، تاہم ان کی تفسیر میں قابل تنقید باتوں کی بھرمار ہے، ان باتوں سے احتراز ضروری ہے۔(۲)

اور علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں :

> تفسیر کشاف تفسیر کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، مگر اس کا منصف معتزلی ہے اور اپنے فاسد نظریات کے حق میں دلائل و شواہد پیش کرتا ہے، اس لئے محققین اہل سنت اور جمہور اس کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔(۳)

---

(۱) کشف الظنون:۲/۱۷۶۔ (۲) البحر المحیط:۷/۸۵۔

(۳) مقدمہ ابن خلدون:۴۹۱۔

تفسیر بیضاوی

یہ تفسیر عبداللہ بن عمر بیضاوی کی ہے، جو مسلکاً شافعی ہیں، آپ کی یہ تفسیر متوسط الحجم اور تفسیر و تاویل دونوں کی جامع ہے، یہ عربی زبان کے اُصول وضوابط پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب میں امام رازی اور راغب اصفہانی کی تفسیر سے بھر پور فائدہ اُٹھایا گیا ہے، اس کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار سے بھی استدلال کیا گیا ہے اور عقل خداداد کی مدد سے طبع زاد نکات ولطائف بھی شامل کئے گئے ہیں، بعض جگہ عبارت حد درجہ دقیق و عمیق ہے، جس کی غواصی ایک ذہین وفطین آدمی ہی کرسکتا ہے، بعض اوقات وہ مختلف قرأتوں کو ذکر کرتے ہیں، بعض جگہوں پر نحوی مسائل کا بھی بیان ہے، آیات احکام کی تفسیر کے دوران فقہی مسائل کی تفصیلات کا بھی ذکر ہے اور اس دوران امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید میں دلائل و براہین کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، حاجی خلیفہ لکھتے ہیں :

> تفسیر بیضاوی مدح وتوصیف سے بالاتر اور عظیم الشان کتاب ہے، اس میں جو مباحث اعراب اور معانی و بیان سے متعلق ہیں وہ تفسیر کشاف سے ماخوذ ہیں، حکمت و کلام سے وابستہ معلومات تفسیر کبیر سے لی گئی ہیں، اشتقاق سے متعلقہ مسائل راغب اصفہانی کی تفسیر سے مستفاد ہیں اور جو نکات ودقائق بیضاوی نے اپنے فکرِ رساں سے اختراع کئے ہیں وہ اس پر مزید ہیں؛ چوں کہ بیضاوی متبحر عالم تھے اس لئے آپ نے جملہ علوم وفنون میں شہسواری کے جوہر دکھائے ہیں، وہ کہیں تو حسین وجمیل اشارات واستعارات کو بے نقاب کرتے ہیں اور کہیں معقولات کے اسرار و رموز کی پردہ دری کرتے ہیں۔(۱)

البتہ جس طرح صاحبِ کشاف ہر سورت کے آخر میں ایسی احادیث نقل کرتے ہیں، جس سے سورت کی عظمت وفضیلت ثابت ہوتی ہے، اسی طرح بیضاوی نے بھی ان کی تقلید کی ہے، حالاں کہ یہ احادیث بالاتفاق محدثین کے یہاں موضوع ہیں، قاری یہ دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ بیضاوی جیسا صاحبِ علم وفضل شخص اس باب میں صرف زمخشری کی اندھادھند پیروی کیسے کرلیا۔

تفسیر مدارک

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی کی تصنیف ہے، آپ نے اس کتاب کو تفسیر بیضاوی اور کشاف سے اخذ

---

(۱) کشف الظنون:۱/۱۷۲۔

کیا ہے؛ البتہ کشاف میں جو معتزلی عقائد تھے ان سے آپ نے احتراز کیا ہے اور مسلک اہل سنت پر گامزن رہے، یہ ایک متوسط حجم کی تفسیر ہے، نہ بہت طویل نہ زیادہ مختصر، تفسیر کشاف میں جو بلاغی نکات اور محسنات بدیعہ تھے، ان کو بھی آپ نے اس میں سمولیا ہے، سورتوں کے فضائل کے سلسلے میں جو احادیث موضوعہ کشاف و بیضاوی میں مذکور ہیں وہ اس میں مندرج نہیں ہیں، یہ گویا تفسیر کشاف و بیضاوی کے محاسن کی جامع اور ان کی نقائص سے پاک تفسیر ہے، اس تفسیر میں اس بات کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جن اسرائیلی واقعات وقصص سے عقائد پر اثر پڑسکتا تھا ان کی تردید پر خاصی توجہ دی گئی ہے اور جو عقائد پر اثر انداز نہ ہوں ان کو بلاتنقید ذکر کرنے میں وہ مضائقہ نہیں سمجھتے، بشرطیکہ اس واقعہ میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہو، علاوہ ازیں وہ عقل وشرع سے بھی متصادم نہ ہوں، آیات احکام کی تفسیر کرتے ہوئے آیت سے متعلق فقہی مذاہب ومسالک بھی بیان کرتے ہیں، امام نسفی بڑی سرگرمی سے حنفی مسلک کی حمایت کرتے ہیں اور دوسرے مسالک کی پرزور تردید کرتے ہیں، امام نسفی قرأت سبعہ کا ذکر کرکے ہر قرأت کو اس کے قاری کی جانب منسوب بھی کرتے ہیں، اعراب اور قرأت کے مختلف وجوہ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، تاہم اس میں نحوی مباحث دیگر تفاسیر کے مقابلے میں کم ہیں۔

تفسیر ابی السعود

یہ تفسیر ابوالسعود محمد بن محمد بن مصطفیٰ کی تصنیف ہے، آپ ۸۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور وفات ۹۵۱ھ میں ہوئی، آپ مسلکاً حنفی تھے، یہ ایک بے مثال تفسیر ہے، حسن تعبیر اور طریق ادا میں کوئی تفسیر اس کی حریف نہیں ہوسکتی مؤلف نے قرآن کے بلاغی اسرار ورموز پر اس طرح قلم اُٹھایا ہے کہ آج تک کوئی اس طرح بیان نہیں کرسکا، مولانا عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں :

> میں اس تفسیر کے مطالعہ سے بہرہ مند ہوا ہوں، یہ بہترین تفسیر ہے، نہ اتنی طویل کہ بیزار کردے اور نہ اس قدر مختصر کہ معنی ومفہوم ہی سمجھ میں نہ آسکے، ان گنت لطائف ونکات اور فوائد و اشارات کی جامع ہے، حسن تعبیر کی بناء پر ابوالسعود کو خطیب المفسرین کہا جاتا ہے، یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ کشاف اور بیضاوی کے بعد کوئی تفسیر اس مرتبہ کو نہیں پہنچی۔(۱)

یہ واقعہ ہے کہ مؤلف نے عبارت کی دل آویزی ودلکشی پر خصوصی توجہ دی ہے اور مقدور بھر قرآن حکیم کے نظم واُسلوب کے سرّ اعجاز اور بلاغی پہلو کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، خصوصاً فصل ووصل، ایجاز واطناب، تقدیم وتاخیر

(۱) الفوائد البہیہ :۸۲۔

اور اعتراض وتذییل کا بہت خیال رکھا ہے، قرآنی ترکیب جن دقیق وعمیق معانی کو سموئے ہوئے ہوتی ہے، اس کے اظہار و بیان کا خصوصی اہتمام کیا ہے، یہ ایک ایسا وصف ہے جو اسی شخص کو حاصل ہوسکتا ہے، جو عربی زبان کی باریکیوں سے پوری طرح آگاہ وآشنا ہو، اس میں شک نہیں کہ مؤلف اس لحاظ سے اور مفسرین سے آگے نظر آتے ہیں، اس تفسیر میں ربط آیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے، بعض اوقات وہ مختلف قرأتوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، اس میں اسرائیلیات کا ذکر بہت کم ہے اور جہاں ذکر ہے تو اسے ''روی'' یا ''قیل'' کہہ کر اس کے ضعف کی جانب اشارہ کر دیا گیا ہے اور مزید نقد و جرح نہیں کی ہے، جب کوئی آیت مختلف وجوہ اعراب کی محتمل ہوتی ہے تو اس وقت مؤلف اس کی نحوی پوزیشن واضح کرتے ہیں اور ان وجوہ اعراب میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کی دلیل ذکر کرتے ہیں؛ البتہ وہ فقہی احکام وفروع اور براہین و دلائل سے بہت کم تعرض کرتے ہیں؛ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ زمخشریؒ و بیضاویؒ نے قرآنی سورتوں کے فضائل میں جس طرح موضوع احادیث کو درج کیا ہے، مؤلف بھی اس میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، جب کہ یہ احادیث باتفاق محدثین موضوع ہیں۔

تفسیر ابن کثیر

یہ تفسیر علامہ ابوالفداء اسماعیل بن عمرو بن کثیر بصری کی تصنیف ہے، یہ تفسیر قرآن کریم کی تفسیر ماثور پر مشتمل کتب میں حد درجہ شہرت رکھتی ہے، اس کا درجہ کتب تفسیر میں تفسیر ابن جریر کے بعد ہے؛ بلکہ اسے اس کا خلاصہ کہنا چاہئے، اس میں سلف صالحین کے تفسیری اقوال کو یکجا کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، آیات کی تفسیر احادیث مرفوعہ اور اقوال وآثار کی روشنی میں کی گئی ہے، دور حاضر میں تفسیر کی جس قدر کتب متداولہ ہیں ان سب میں ابن کثیر قرآنی آیات کی تشریح اور دوسری آیات سے استدلال کرنے میں پیش پیش ہیں، آیات کی تشریح کرنے کے بعد ابن کثیر اس سے متعلق احادیث مرفوعہ ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ نشاندہی کرتے جاتے ہیں کہ ان میں سے کونسی حدیث قابل احتجاج ہے اور کونسی نہیں، اس کے بعد تائید میں صحابہ، تابعین اور دیگر علماء سلف کے اقوال تحریر کرتے ہیں، ابن کثیر متقدمین کی تفاسیر مثلاً ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عطیہ وغیرہم سے بھی استفادہ کرتے ہیں، ابن کثیر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تفسیر ماثور میں جو اسرائیلی واقعات مندرج ہیں وہ اجمالاً اور بعض اوقات تفصیلاً اس پر نقد و جرح کرتے ہیں، اسی طرح احکام پر مشتمل آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فقہی احکام اور علماء کے اقوال و دلائل ذکر کرتے ہیں، مگر دوسرے مفسرین کی طرح اس میں حد سے تجاوز نہیں کرتے؛ بلکہ اعتدال کی راہ پر گامزن رہتے ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ روایتی لحاظ سے یہ تفسیر سب سے محتاط اور مستند تفسیر ہے۔

تفسیر فتح القدیر

یہ تفسیر علامہ محمد بن علی شوکانیؒ کی ہے، آپ ۱۱۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی، علامہ شوکانیؒ کا تفسیری منہج یہ ہے کہ وہ آیت تحریر کرنے کے بعد اس کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو عقلاً بھی قابل قبول اور پسندیدہ ہو، پھر اس کی تائید میں علماء سلف کے اقوال نقل کرتے ہیں اور پہلے کے مفسرین کی تفاسیر کے اقتباسات بھی ذکر کرتے ہیں، ان کے یہاں ربط آیات وسور کا بھی اہتمام ہے، وہ الفاظ کے لغوی حل کی جانب خصوصی توجہ مبذول کرتے ہیں اور ائمہ لغت مثلاً مبرد اور فراء کے اقوال ذکر کرتے ہیں، آپ قرأت سبعہ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، اس کے ساتھ آپ معتزلی نظریات کی شدید تردید بھی کرتے ہیں، فقہی مذاہب ومسالک کا ذکر دلائل و براہین کی روشنی میں کرتے ہیں اور خود کو کسی مجتہد سے کم تر نہیں سمجھتے، اس لئے اپنی رائے آزادی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور حسب مرضی بعض اقوال کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس تفسیر میں بکثرت موضوع اور ضعیف روایات کا ذکر ہے اور ان پر نقد و جرح بھی نہیں ہے، اسی طرح جن آیات میں مشرکین کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ اپنے آباء واجداد کی پیروی کرتے تھے اس کا مصداق اس تفسیر میں ائمہ ثقہ کے مقلدین کو ٹھہرایا گیا ہے اور مقلدین پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ کتاب اللہ کے تارک اور سنت رسول اللہ ﷺ سے انحراف کرنے والے ہیں، علامہ شوکانیؒ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ شہداء کو خداوند کریم کے نزدیک حقیقی زندگی حاصل ہے اور انھیں وہاں رزق دیا جاتا ہے، شہداء کی زندگی مجازی قسم کی نہیں ہے، اس عقیدہ کا اظہار بھی انھوں نے اس تفسیر میں کیا ہے، اس کے ساتھ وہ انبیاء واولیاء کے ساتھ توسل کرنے کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے قائلین کی تردید کرتے ہیں، اسی طرح وہ چوں کہ سلفی المشرب ہیں، اس لئے قرآن کریم میں جہاں ایسے الفاظ آتے ہیں، جن سے خداوند کریم سے مشابہت کا مفہوم نکلتا ہے تو وہ ان کو ظاہری معنی پر محمول کرتے ہیں اور اس کی کیفیت خداوند کریم کے تفویض کرتے ہیں۔

روح المعانی

یہ تفسیر علامہ سید محمود آلوسی کی ہے، آپ ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی، آپ مسلکاً حنفی تھے، علامہ آلوسی کی روح المعانی تفسیر قرآن کا بیش قیمت گنجینہ ہے جو سابقہ مفسرین کے اقوال و آراء پر مشتمل ہے، آپ سابقہ تفاسیر کے اقتباسات پیش کرکے ان کو جوں کا توں قبول نہیں کرتے؛ بلکہ ان پر محاکمہ کرتے اور آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں، آپ اکثر ابوسعودؒ، بیضاوی، ابوحیان اور دیگر مفسرین کو ہدف تنقید بناتے ہیں، فقہی

مسائل میں امام رازی پر شدید نقد و جرح کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو مدلل کرتے ہیں، منقولہ افکار و آراء میں سے جس کو مبنی بر صواب سمجھتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں، الغرض علامہ آلوسی نے اپنی اس تفسیر کو روایۃً و درایۃً اقوالِ سلف و خلف کی جامع بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے، اگر اس کو سابقہ کتبِ تفسیر کا خلاصہ کہا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس میں معتزلہ، شیعہ اور دیگر فرق و مذاہب کے نظریات و معتقدات کا ابطال بھی ہے، آپ فلکیات کے باب میں کھل کر لکھتے ہیں، علماء ہیئت و حکمت کا کلام نقل کر کے بعض جگہ اس کو قبول کرتے ہیں اور گاہے اس کی تردید کرتے ہیں، آپ نحوی مسائل سے بھی خوب دلچسپی لیتے ہیں اور اس جگہ مفسر کے بجائے آپ نحوی نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ اسرائیلیات اور جھوٹے واقعات کو شدید نقد و جرح کا نشانہ بناتے ہیں؛ بلکہ بعض اوقات ان کا مذاق اُڑاتے ہیں؛ حالاں کہ دیگر مفسرین نے ان کو صحیح قرار دے کر اپنی تفاسیر کو ان سے بھر دیا ہے، آپ نے مختلف وجوہ قرأت بھی بیان کیا ہے، مگر اس میں قرأتِ متواترہ کا التزام نہیں کیا ہے، آپ آیات و سور کے ربط و تعلق اور اسبابِ نزول پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، لغوی معانی بیان کرتے ہوئے عربی اشعار سے احتجاج و استشہاد آپ کے یہاں بہت عام ہے، آپ نے آیات قرآنیہ کا ظاہری معنی و مفہوم بیان کرنے کے بعد ان کے باطنی اور صوفیانہ معانی پر بھی اظہار خیال کیا ہے، مگر اس کی حیثیت ثانوی اور ضمنی ہے۔

احکام القرآن للجصاص

یہ کتاب ابوبکر احمد بن علی رازی جصاصؒ کی تصنیف ہے، آپ بغداد میں ۳۰۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۷۰ھ میں وفات پائی، علماء احناف کے نزدیک یہ کتاب فقہی تفسیر کی اہم کتب میں شمار ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کی اساس حنفی فقہ کی حمایت و تقویت اور اس کے دفاع پر رکھی گئی ہے، اس تفسیر میں قرآن کریم کی تمام سورتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، مگر جن آیات کا فقہی احکام سے کچھ تعلق نہیں ان سے تعرض نہیں کیا گیا ہے، اس کی تبویب فقہی ترتیب کے مطابق کی گئی ہے، ہر بات کا ایک عنوان مقرر کیا گیا ہے اور اس کے ذیل میں عنوان سے متعلق احکام و مسائل ذکر کئے گئے ہیں۔

تفسیر مظہری

یہ تفسیر قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی تصنیف ہے، آپ نے اپنی اس تفسیر کا نام اپنے شیخ مرزا مظہر جانِ جاناں کے نام پر رکھا ہے جو آپ کی بڑی قدر کرتے تھے، آپ کی یہ تفسیر بہت معتدل اور متوازن ہے، جس میں قدیم مفسرین کے اقوال، جدید تاویلات اور فقہی مسائل کا استنباط ہے، صوفیا کے مزاج و مذاق کی بھی اس میں رعایت کی گئی ہے، سابقہ تفاسیر کے اقتباسات بھی ہیں، جسے درج کرنے کے بعد آپ اس پر محاکمہ کرتے ہیں، مسائل

احناف کی وجہ ترجیح بھی بیان کرتے ہیں، اس تفسیر میں روایت و درایت کا حسین امتزاج ہے، الفاظ قرآن کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی گئی ہے، یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے اور اختصار کے ساتھ آیاتِ قرآن کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید ہے۔

تفسیر فی ظلال القرآن

یہ تفسیر سید قطب شہیدؒ کی ہے، جس میں قرآن پاک کے فنی حسن و جمال کو بڑے ہی جاذب و دلکش طرز میں بیان کیا گیا ہے، اس تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کے فکر و نظر کا محور وہ قرآنی الفاظ ہیں جن کو تعبیر و بیان اور اظہار مطالب کے لئے اختیار کیا گیا ہے، پھر ان کا شاعرانہ بلکہ ساحرانہ طرز بیان سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے، آپ نے اپنے مخاطب کی ذہنی سطح کی بھی خوب رعایت کی ہے اور اس کے شعور و جدان کو خوب خوب جھنجھوڑا ہے اور ان کے جذبات و احساسات میں تلاطم پیدا کرنے پر خاص توجہ دی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کے معاصر عربوں کو سب سے پہلے قرآنی اُسلوب ہی نے مسحور و مخمور کیا تھا، اسی پہلو کو اس میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ تفسیر درس وعبرت اور مؤلف کی پختگی فکر و نظر میں یکتا و منفرد ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نصابِ تعلیم کو زمانے کے مسائل وضروریات کے تابع ہونا چاہئے، لوگوں کے معاملات و مسائل سے الگ تھلگ ہو کر اسے جمود و تعطل کا شکار نہیں ہونا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ تفسیری نصاب میں بھی غور و خوض ہوتا رہا ہے اور بہتر سے بہتر کتاب کو نصاب میں جگہ دی گئی ہے، اکثر بڑے مدارس میں قرآن فہمی کے لئے چار سالہ نصاب رکھا گیا ہے، جس میں ابتداء کے دو برسوں میں قرآن پاک کا واضح ترجمہ اور ضروری تشریح شامل ہوتی ہے، پھر تیسرے سال میں تفسیر جلالین مکمل پڑھائی جاتی ہے، جس کے ذریعہ مختصر الفاظ سے آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر سے طلبہ کو آگاہ کرنا پیش نظر ہوتا ہے، اس طرح اس سال پھر پورے قرآن پاک کا ترجمہ و تفسیر نظر سے گذر جاتی ہے اور چوتھے سال بیضاوی کے کچھ حصے پڑھائے جاتے یں، جس کے ذریعہ طلبہ کے اندر الفاظ قرآنی میں تعمق و تفقہ پیدا ہوتا ہے اور وہ قرآنی بلاغت اور دقیق معانی تک رسائی حاصل کرتے ہیں، بعض مدارس میں اس کے ساتھ فتح القدیر للشوکانی، فتح البیان لنواب صدیق حسن خان، تفسیر مظہری اور تفسیر مدارک کے بھی کچھ حصے زیر درس ہیں۔

اور بعض مدارس میں صرف تین سالہ نصاب جاری ہے، جس میں پہلے سال پارہ عم کا ترجمہ پڑھایا جاتا ہے

اور دوسرے سال میں جلالین اور تیسرے سال میں تفسیر بیضاوی وتفسیر مدارک کے کچھ حصے پڑھائے جاتے ہیں۔

اور بعض مدارس میں پانچ سالہ نصاب جاری ہے، خود ہمارے دار العلوم حیدر آباد میں بھی یہی پانچ سالہ نصاب ہے، جو درسِ نظامی کے آٹھ سالہ نصاب میں تیسرے سال سے چھٹے سال تک دو بار قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر مکمل کرائی جاتی ہے؛ چنانچہ تیسرے سال آخر کے دس پارے، چوتھے سال میں درمیان کے دس پارے اور پانچویں سال میں ابتدائی دس پارے ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھائے جاتے ہیں، پھر چھٹے سال پوری جلالین دس دس پارے تقسیم کرکے سال بھر تین گھنٹوں میں پوری پڑھائی جاتی ہے، اس طرح اس سال پھر پورے قرآن پاک کا ترجمہ وتفسیر نظر سے گذر جاتی ہے اور ساتویں سال تفسیر بیضاوی داخل درس ہے، یوں یہ پانچ سالہ نصاب ایک طالب علم کو ایک بار نہیں دو بار قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کے مرحلے سے گذار دیتا ہے۔

اور بعض مدارس میں چھ سالہ نصاب بھی ہے، بعض مدارس میں ماثور تفسیر میں تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری اور عقلی ونقلی تفسیر کی جامع تفسیر بیضاوی، کشاف اور مدارک، اسی طرح احکام القرآن کا بھی کچھ حصہ پڑھایا جاتا ہے۔

ان تمام تفسیری نصاب پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ تفسیر قرآن کا پانچ سالہ نصاب معتدل اور متوازن ہے؛ لیکن اس میں ایک ایسی تفسیری کتاب کے اضافے کی ضرورت ہے، جو متاخرین مفسرین کی تفسیری کتابوں کے اقتباسات پر مشتمل ہو، جیسے تفسیر رازی، تفسیر روح المعانی، تفسیر الجواہر للطنطاوی، تفسیر المنار اور تفسیر فی ظلال القرآن وغیرہ، نیز اس میں ایسے تفسیری اقتباسات ہوں جو موجودہ دور کی تحقیقات کو نیہ اور سائنسی انکشافات کی تطبیق پر مشتمل ہوں؛ تاکہ طلباء کو دیگر تفسیری مناہج سے واقفیت ہو سکے۔

والله تعالىٰ أعلم ، وعلمه أتم وأحكم .

⊙ ⊙ ⊙

ندوہ، اصلاح اور فلاح میں قرآنیات کا نصابِ تعلیم

جائزہ اور تجاویز

مولانا منور سلطان ندوی⊙

دارالعلوم ندوۃ العلماء اور تحریک ندوۃ العلماء کے زیر اثر قائم اداروں کے نصابِ تعلیم میں قرآنیات کے حصہ کا جائزہ لینے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ تحریک ندوۃ العلماء کے قیام سے پہلے کونسا نصابِ تعلیم رائج تھا، اس میں قرآن مجید کو کیا حیثیت دی گئی تھی اور تفسیر و اُصولِ تفسیر کے موضوع پر کون کون سی کتابیں داخل نصاب تھیں؟

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نے ہندوستان میں رائج نصابِ تعلیم اور اس کے تغیرات کی تاریخ کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اس موضوع پر سب سے مبسوط کتاب ان ہی کی ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریک ندوۃ العلماء کے قیام سے پہلے اکثر مدارس میں مولانا نظام الدین سہالویؒ کا مرتب کردہ نصاب درس جزوی ترمیم کے ساتھ رائج تھا، اس نصاب میں فن تفسیر میں صرف دو کتابیں شامل تھیں، جلالین اور بیضاوی (۱) مولانا مزید لکھتے ہیں کہ اس نصاب میں تاریخ جغرافیہ، علم اعجاز القرآن اور ضروری علوم بالکل نہیں ہیں۔ (۲)

اس نصابِ تعلیم میں تفسیر کے حصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں :

> فن تفسیر اس قدر عظیم الشان اور مہتم بالشان فن ہے؛ لیکن اس میں صرف دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جلالین اور بیضاوی، جلالین کے اختصار کا یہ حال ہے کہ اس کے الفاظ کی تعداد قرآن مجید کے الفاظ کے برابر ہے اور بیضاوی کے تیس پاروں میں

⊙ دارالافتاء: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

(۱) ہندوستان کا نصابِ درس اور اس کے تغیرات: ۱۶، از مولانا سید عبدالحی حسنیؒ۔

(۲) ہندوستان کا نصابِ درس اور اس کے تغیرات: ۱۶، از مولانا سید عبدالحی حسنیؒ۔

صرف ڈھائی پارے درس میں ہیں۔(۱)

ایک دوسرے موقع پر علامہ نے اس طرح اظہار خیال فرمایا :

ایک بہت بڑا اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں قرآن مجید کے ساتھ بہت کم اعتناء کی گئی ہے اور تفسیر و ملحقاتِ تفسیر کی بہت کم کتابیں رکھی گئی ہیں، کل دو کتابیں تفسیر میں داخل ہیں، بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں اور جلالین پوری پڑھائی جاتی ہے، مگر اس کے اختصار کا یہ حال ہے کہ اس کے الفاظ اور حروف قرآن مجید کے الفاظ کے برابر ہیں، قرآن مجید کے ساتھ خصوصی اعتناء بہت ضروری ہے۔(۲)

اب دیکھنا یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے بابصیرت علماء نے جب اصلاحِ نصاب کی پرزور تحریک چلائی تو انھوں نے نصابِ تعلیم میں قرآن مجید کو کیا مقام دیا اور اس فن کے سلسلہ میں کیا خاکہ پیش کیا، اس کے تفصیل کے لئے ایک بار پھر تاریخ کے صفحات اُلٹنے ہوں گے۔

۱۳۱۲ھ میں جب تحریک ندوۃ العلماء کے اجلاس میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ اصلاحِ نصاب کی تحریک اس وقت زیادہ مؤثر اور مفید ہوگی، جب ندوۃ العلماء ایک نمونہ کا دارالعلوم قائم کرے، اس تجویز کی منظوری کے بعد بانی ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری نے دارالعلوم کے نظام اور نصابِ تعلیم کا ایک مفصل خاکہ مسودہ دارالعلوم کے نام سے پیش کیا، اس مسودہ میں نصاب کا پورا خاکہ اور نظام سے متعلق جزوی مسائل تک موجود ہیں، اس مجوزہ نصاب میں قرآنیات سے متعلق جو بنیادی فکر پیش کی وہ اس طرح ہے :

سب سے مقدم فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن مجید کے ساتھ زیادہ اعتناء ہوگی، تفسیروں کے علاوہ وہ کتابیں درسِ نصاب ہوں گی، جس میں عام طور پر علوم القرآن سے بحث ہے اور بالخصوص وہ جس سے قرآن مجید کا اعجاز ثابت ہے، جیسے اعجاز القرآن باقلانی وغیرہ۔(۳)

مولانا کی اس تحریر سے صاف واضح ہے کہ وہ تفسیر کے موجودہ نصاب سے مطمئن نہیں تھے، وہ تفسیروں میں بھی تبدیلی چاہتے تھے اور علوم القرآن اور اعجاز القرآن کی جو کمی تھی اس کو پورا کرنا چاہتے تھے۔

---

(۱) روداد دارالعلوم ندوۃ العلماء: ۵، بابت: ۱۳۲۵ھ۔

(۲) ہمارا نصابِ تعلیم کیا ہو؟: ۱۱۵، از مولانا سید سلمان حسینی ندوی۔

(۳) دستور العمل دارالعلوم ندوۃ العلماء: ۸، بحوالہ تاریخ ندوۃ العلماء: ۱/۱۴۷۔

مولانا کا مرتب کردہ نظام ونصاب ملک کے مقتدر علماء واہل دانش کے پاس استصواب رائے کے لئے بھیجا گیا، اس کے جواب میں بہت سے خاکے موصول ہوئے، ان سب کو سامنے رکھ کر ایک نصاب مرتب کرنے سے متعلق متعدد نشستیں ہوئیں، پھر مدرسہ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۰۳ء میں یہ طے ہوا کہ مولانا عبدالقیوم حیدرآبادیؒ، مولانا سید عبدالحی حسنیؒ اور مولانا شبلی نعمانیؒ مل کر یہ نصاب بنائیں، یہ نصاب تیار ہوا، اس نصاب میں قرآنیات سے متعلق درج ذیل تفصیلات ملتی ہیں :

(الف) تفسیر بیضاوی کے پندرہ پارے داخل کئے گئے، مصر میں اس زمانہ میں ایک نہایت مفید کتاب تالیف کی گئی تھی، جس کا نام الصراط المستقیم ہے، اس میں قرآن مجید کی وہ آیتیں جمع کرکے اس کی مختصر تفسیر لکھی ہے، جو فقہ وکلام اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، اس سے خاص قرآن کی نصوص فقہ اور اخلاق کے مسائل معلوم ہوجاتے ہیں، یہ کتاب بھی درس میں داخل کی گئی۔

(ب) دلائل الاعجاز اور اعجاز القرآن باقلانی درس میں داخل کی گئیں۔(۱)

دارالعلوم کے نصاب میں قدیم تفاسیر میں سے بیضاوی، جلالین اور کشاف کا ذکر ملتا ہے، اس کے علاوہ متن قرآن پڑھانے پر خاص توجہ دی گئی اور پورے قرآن کا ترجمہ اور مختصر تفسیر کو درس میں شامل کیا گیا؛ تاکہ طلبہ کا تعلق براہ راست سے قائم ہو، متن قرآن کو نصاب میں شامل کرنے کا اعزاز ندوۃ العلماء کو حاصل ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں :

> دارالعلوم میں تفسیر کی قدیم اور مستند کتابیں (جلالین، بیضاوی، کشاف) داخل نصاب تھیں؛ لیکن اس کا شروع سے اہتمام کیا گیا کہ قرآن مجید کا مکمل متن درجوں کے معیار اور طلبہ کی استعداد کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف درجوں میں پڑھادیا جائے اور قرآن مجید کا کوئی حصہ چھوٹنے نہ پائے، مکمل متن قرآن کی تدریس وتفہیم کا انتظام غالباً دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اولیات وخصوصیات میں سے ہے۔(۲)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں قرآن مجید کی تدریس وتفہیم پر خاطر خواہ توجہ دی گئی، قدیم تفاسیر کے ساتھ متن قرآن کا اضافہ کیا گیا، اُصولِ تفسیر، علوم القرآن اور اعجاز القرآن پر مستقل کتابیں شامل کی گئیں، جن کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

---

(۱) دینی مدارس کا نصاب تعلیم: ۵۴، ترتیب: مولانا سید سلمان حسینی ندوی۔

(۲) مطالعہ قرآن کے اُصول ومبادی: ۱۰، از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

ندوۃ العلماء کی بنیاد ہی اصلاح کی دعوت پر رکھی گئی ہے؛ چنانچہ اس کے نصاب میں جزوی تبدیلی ہوتی رہی ہے، ہر درجہ کے لئے موضوعات متعین ہیں، مگر ان موضوعات سے متعلق کتابوں کے انتخاب میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس وقت جو ترمیم شدہ نصاب رائج ہے، اس میں تفسیر اور اس فن کی متعلق کتابیں اس طرح ہیں :

دار العلوم ندوۃ العلماء کا موجودہ قرآنی نصاب

(الف) یہاں ثانویہ سادسہ سے تفسیر کا آغاز ہوتا ہے، تفسیر میں سب سے پہلے متن قرآن یعنی قرآن کا ترجمہ اور مختصر تفسیر پڑھائی جاتی ہے، ثانویہ سادسہ سے عالیہ رابعہ تک پانچ سالوں میں اس طرح پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے کہ طلبہ کے سامنے معری قرآن مجید ہوتا ہے، اساتذہ طلبہ کے معیار کے اعتبار سے مختلف تفاسیر دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں اور اپنے مطالعہ کا نچوڑ کلاس میں پیش کرتے ہیں، اس طرح درجہ کے اعتبار سے تدریس کا معیار بھی بڑھتا رہتا ہے۔

(ب) عالیہ ثالثہ میں ترجمہ وتفسیر کے علاوہ فن اُصولِ تفسیر میں الفوز الکبیر (شاہ ولی اللہ دہلویؒ)، التفسیر المفسرون، عالیہ رابعہ میں تفسیر بیضاوی اور علوم القرآن کے موضوع پر مباحث فی علوم القرآن (مناع القطان) اور علیا اولیٰ ادب میں دلائل الاعجاز (عبدالقاہر جرجانی) نصاب میں شامل ہیں، یہ ساری کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، صرف التفسیر المفسرون مطالعہ میں ہے۔

(ج) اختصاص فی علوم القرآن سال اول میں کشاف (منتخب سورتیں)، مباحث فی علوم القرآن (صبحی صالح)، الاتقان فی علوم القرآن (علامہ سیوطیؒ) اور سال دوم میں احکام القرآن (جصاص رازی) النکت فی اعجاز القرآن (رومانی) اور اُصول التفسیر ومناہجہ (درفہد بن عبدالرحمٰن بن سلیمان الرومی) پڑھائی جاتی ہیں۔

(د) اختصاص سال دوم میں فن سے متعلق کسی موضوع پر استاذ کی نگرانی میں ایک تحقیقی مقالہ لکھنا ہوتا ہے، جس کا نمبر اس کے نتیجہ میں شامل کیا جاتا ہے۔

(ہ) عالیہ ثانیہ میں تیسواں پارہ (عم پارہ) اور عالیہ ثالثہ میں انتیسواں پارہ حفظ کرایا جاتا ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے طرز پر جو ادارے قائم ہوئے یا جنھوں نے بنیادی طور پر اصلاح نصاب کی دعوت کو قبول کیا، ان میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ دار السلام عمر آباد اور جامعۃ الفلاح بلیریا گنج اہم ہیں، ان اداروں کے نصاب میں قرآن کا حصہ اس طرح ہے :

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر

(الف) عربی چہارم سے تفسیر شروع ہوتی ہے اور عربی ہشتم تک ہر درجہ میں کچھ کچھ سورتیں کرکے مکمل

متن قرآن پڑھایا جاتا ہے۔

(ب) عربی ہشتم میں تفسیر کے ساتھ اسالیب القرآن (فراہی) داخل نصاب ہے۔

(ج) فضیلت اول میں البرہان للزرکشی، التکمیل فی أصول التاویل للفراہی اور فضیلت دوم میں دلائل النظام للفراہی اور الفوز الکبیر للشاہ ولی اللہ دہلوی داخل نصاب ہیں۔

(د) أصولِ تفسیر و علوم القرآن سے متعلق ساری کتابیں مطالعہ میں شامل ہیں، یہ مطالعہ اساتذہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔

جامعۃ الفلاح، بلیریا گنج

(الف) عربی سوم سے تفسیر شروع ہوتی ہے اور فضیلت سوم تک ہر درجہ میں کچھ کچھ سورتیں کر کے مکمل قرآن مع ترجمہ و تفسیر ختم کیا جاتا ہے۔

(ب) عربی چہارم میں مقدمہ أصولِ تفسیر (ابن تیمیہؒ)، عربی ہفتم میں مقدمہ نظام القرآن (فراہیؒ)، فضیلت اول میں مباحث فی علوم القرآن (مناع القطان) اور الفوز الکبیر (شاہ ولی اللہؒ)، فضیلت دوم مناہل العرفان اور دلائل النظام (فراہیؒ)، فضیلت سوم میں الاتقان (سیوطی) اور اسالیب القرآن (فراہیؒ) داخل نصاب ہیں۔

(ج) قدیم تفاسیر میں فضیلت اول میں تفسیر ابن کثیر، فضیلت دوم میں فتح القدیر اور فضیلت سوم میں کشاف کا خصوصی مطالعہ شامل ہے۔

(د) عربی سوم سے فضیلت سوم تک ہر درجہ میں کچھ کچھ سورتیں حفظ کے لئے متعین ہیں۔

(ہ) ترجمہ و تفسیر قرآن کی باضابطہ تدریس ہوتی ہے، اس کے علاوہ قدیم تفاسیر اور أصولِ تفسیر و علوم القرآن سے متعلق ساری کتابیں مطالعہ میں شامل ہیں، یہ مطالعہ اساتذہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔

عمومی تجزیہ و تبصرہ

مذکورہ بالا تینوں اداروں کے نصاب میں قرآنیات کے حصہ پر ایک نظر ڈالنے سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

۱- دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پیش کردہ طریقۂ متن قرآن کی تعلیم کو سبھوں نے قبول کیا ہے، یہ طریقہ ہر جگہ رائج ہے، اس طریقہ تدریس سے طلبہ براہ راست قرآن کریم سے جڑتے ہیں اور اساتذہ طلبہ کے استعداد

اور درجات کے اعتبار سے مختلف کتب تفاسیر کے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے ہیں، اس طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدرسۃ الاصلاح میں عالمیت تک اور جامعۃ الفلاح میں فضیلت تک طلبہ کو ایک بار استاذ سے پورا قرآن پڑھنے کا موقع مل جاتا ہے؛ البتہ ہر جگہ پڑھانے کا منہج الگ الگ ہے، جو ان کی بنیادی فکر کا عکاس ہے، اسی طرح سورتوں کے انتخاب میں بھی فرق ہے۔

۲- ان اداروں میں اُصول تفسیر، علوم القرآن اور لغات القرآن سے متعلق جو کتابیں نصاب میں داخل ہیں ان میں اکثر معروف ومشہور ہیں اور اپنے موضوع پر وقیع شمار کی جاتی ہیں؛ مگر اہل علم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ان میں باستثناء چند اکثر کتابیں اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں ہیں؛ بلکہ خاص خاص موضوعات ان کتابوں میں بیان ہوئے ہیں؛ حالاں کہ نصاب کے لئے ایسی کتابیں زیادہ مفید ہوتی ہیں جو اپنے موضوع کے تمام گوشوں کو شامل ہوں۔

۳- مدرسۃ الاصلاح اور جامعۃ الفلاح میں عالمیت تک علوم القرآن کی کوئی کتاب داخل نصاب نہیں ہے، جس کی وجہ سے ان مدارس سے عالمیت کرنے والے طلبہ علوم القرآن سے متعلق موضوعات سے ناآشنا رہتے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ کمی پوری کی جاچکی ہے، اب عالیہ ثالثہ میں اس موضوع پر مستقل کتاب داخل نصاب ہے۔

۴- قدیم تفاسیر میں سے تفسیر بیضاوی، جلالین، کشاف، ابن کثیر، فتح القدیر نصاب میں شامل ہیں، ان میں سے ہر ایک کتاب الگ الگ منہج کی ترجمانی کرتی ہے، قدماء کی تفاسیر کے منہج سے روشناس کرانے کا مقصد اس سے پورا نہیں ہوتا ہے۔

۵- ندوہ اور اصلاح میں فضیلت دو سالوں پر اور فلاح میں تین سالوں پر مشتمل ہے، مگر اس مدت میں مادہ اختصاص کو بہت کم وقت دیا جاتا ہے، دیگر تمام فنون کے ساتھ روزانہ ایک یا دو گھنٹے ہی اس فن کو مل پاتے ہیں، اس مختصر وقت میں کسی موضوع میں اختصاص بھلا کیسے ممکن ہے؟

انفرادی تجزیہ وتبصرہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء : یہاں عالمیت تک ترجمہ وتفسیر قرآن کی تکمیل کے ساتھ قدماء کی تفاسیر میں سے بطور نمونہ بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھایا جاتا ہے، اُصولِ تفسیر اور علوم القرآن کی ایک ایک کتاب پڑھائی جاتی ہے، جس سے طلبہ ان دونوں موضوعات کے اہم مباحث سے واقف ہو جاتے ہیں، عالیہ ثالثہ میں التفسیر والمفسرون مطالعہ میں ہے، جس سے اس فن کی تاریخ، مختلف تفسیری مناہج، مشہور مفسرین اور مختلف انداز کی تفاسیر سے واقفیت ہوتی

ہے، اختصاص فی علوم القرآن میں علوم القرآن کی دو کتابیں، اُصولِ تفسیر کی ایک، اعجاز القرآن کی کتاب اور قدماء کے تفسیری سرمایہ میں سے جصاص رازیؒ کے احکام القرآن کا کچھ حصہ پڑھایا جاتا ہے، ان ساری کتابوں سے بڑی حد تک موضوع کے اہم مباحث سے واقفیت ہوتی ہے، اس طرح قرآنیات سے متعلق دارالعلوم کا نصاب بہت جامع اور متوازن ہے۔

مدرسۃ الاصلاح : یہ ادارہ علامہ فراہی کے علوم وافکار پر قائم ہے، جن کا امتیاز قرآن مجید رہا ہے، آپ کی نسبت سے اس ادارہ کا امتیازی عنوان یہی موضوع ہے، اس لئے یہاں علامہ فراہی کے علوم وافکار کو ہی بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس کے علاوہ اس موضوع پر دوسری اہم کتابوں کو قابل اعتناء نہیں سمجھا جاتا ہے، علامہ فراہی کے آراء وافکار کے ساتھ اس موضوع کی اہم کتابیں بھی نصاب میں شامل کی جائیں تو شاید طلبہ کو مزید فائدہ ہوتا، پھر جو کتابیں داخل نصاب ہیں وہ پڑھائی نہیں جاتی ہیں؛ بلکہ مطالعہ میں ہیں، طلبہ اساتذہ کی نگرانی میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں، مطالعہ کرنے اور استاذ سے سبقاً سبقاً پڑھنے میں جو فرق ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، ان موضوعات کی کچھ کتابیں ضرور پڑھائی جانی چاہئیں۔

جامعۃ الفلاح : اس کے نصاب میں قرآن کا ترجمہ وتفسیر فضیلت میں مکمل ہوتا ہے، جس کی وجہ سے صرف عالمیت کرنے والے طلبہ قرآن کا بڑا حصہ پڑھنے سے محروم رہ جاتے ہیں، تفسیر کے علاوہ دو کتابیں: مقدمہ اُصولِ تفسیر اور مقدمہ نظام القرآن داخل نصاب ہیں اور فضیلت کے تین سالوں میں کل پانچ کتابیں: مباحث فی علوم القرآن، مناہل العرفان، دلائل النظام، الاتقان اور اسالیب القرآن داخل نصاب ہیں، اس طرح سب سے زیادہ کتابیں یہاں کے نصاب میں داخل ہیں، ان کتابوں سے نصاب کا بڑا اچھا خاکہ نظر آتا ہے، مگر اصلاح کی طرح یہاں بھی یہ کتابیں پڑھائی نہیں جاتی ہیں؛ بلکہ طلبہ اساتذہ کی نگرانی میں مطالعہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے کما حقہ ان کتابوں کا فائدہ نہیں پہنچ پاتا ہے، ان میں سے کچھ کتابیں ضرور پڑھائی جانی چاہئیں۔

تجاویز

اس مختصر جائزہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ مدارس کے ترجمہ وتفسیر پر توجہ دی جاتی ہے اور پورا قرآن پڑھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، مگر اس فن کا لازمی جزء اُصول اور علوم القرآن جن کی روشنی میں ہی قرآن کا صحیح فہم آتا ہے، اس پر اتنی توجہ نہیں دی جاتی، جتنا اس کا حق ہے، یہ موضوعات اہل مدارس کی توجہ کے مستحق ہیں۔

۱- عالمیت کے کورس میں ان دونوں موضوعات میں سے ایک ایک کتاب ایسی ضرور پڑھائی جانی چاہئے، جس میں اس کے اکثر مسائل کا احاطہ ہو۔

۲- قدیم تفاسیر کے مختلف نمونے شامل کئے جائیں، اس سے متقدمین کی تفاسیر سمجھنے اور ان سے استفادہ کرنے میں سہولت ہوگی۔

۳- اس فن میں اختصاص کے لئے دو یا تین سال بالکل ناکافی ہیں، اگر کل مدت زیادہ ہونے کی وجہ سے سال نہیں بڑھا سکتے تو اختصاص کے سالوں کا اکثر وقت ان ہی موضوعات کے لئے خاص ہونا چاہئے؛ تاکہ اس فن کے اکثر موضوعات سے واقفیت ہو سکے۔

۴- اُصولِ تفسیر، علوم القرآن اور تفسیر سے متعلق بعض اہم موضوعات پر محاضرات کا اہتمام کیا جائے۔

۵- قرآن مجید، اس کی تعلیمات، اس کی تاریخ اور اس سے متعلق موضوعات پر ہونے والے جدید اعتراضات اور اس کے جوابات پر مشتمل کوئی کتاب مطالعہ میں شامل کی جائے، نیز ان موضوعات پر محاضرات کا بھی اہتمام کیا جائے۔

۶- اُصولِ تفسیر اور علوم القرآن سے متعلق موضوعات پر جدید کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، ان علمی تحقیقات سے بھی فائدہ اُٹھایا جائے، طلبہ کو ان کتابوں کی نشاندہی کی جاتی رہے؛ تاکہ ان سے استفادہ کر سکیں۔

۷- عالمیت اور فضیلت کے نصاب میں مختلف کتابوں سے ابواب کا اس طرح انتخاب کیا جائے کہ اکثر مباحث کا احاطہ ہو جائے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

درجات	ترجمہ وتفسیر قرآن	اُصولِ تفسیر وعلوم القرآن	حفظ قرآن	دیگر
ثانویہ سادسہ	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں			
عالیہ اولیٰ شریعہ	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں			
عالیہ ثانیہ شریعہ	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں		پارہ عم	
عالیہ ثالثہ شریعہ	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	الفوز الکبیر (شاہ ولی اللہ دہلویؒ)	۲۹ رواں پارہ	مطالعہ: التفسیر والمفسرون
عالیہ رابعہ	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں تفسیر بیضاوی (سورۂ فاتحہ)	مباحث فی علوم القرآن (مناع القطان)		
اختصاص فی علوم القرآن اول	کشاف (سورۂ آلِ عمران)	الاتقان سیوطی (منتخب ابواب) مباحث فی علوم القرآن (صبحی صالح)		
اختصاص فی علوم القرآن دوم	احکام القرآن للجصاص	کتاب النکت فی اعجاز القرآن (رمانی) اصول التفسیر ومناہجہ (د۔ فہد بن عبد الرحمن)		قرآنیات سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر

درجات	ترجمہ وتفسیر قرآن	اُصول تفسیر وعلوم القرآن	حفظ قرآن	دیگر
عربی چہارم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں			نوٹ:- اُصول تفسیر وعلوم القرآن سے متعلق ساری کتابیں مطالعہ میں ہیں۔
عربی پنجم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں			
عربی ششم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں			
عربی ہفتم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	مفردات القرآن (فراہی)		
عربی ہشتم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	اسالیب القرآن (فراہی)		
فضیلت اول		البرہان للزرکشی، التکمیل فی اصول التاویل، فراہی		
فضیلت دوم		دلائل النظام، فراہی، الفوز الکبیر، شاہ ولی اللہ دہلوی		

جامعۃ الفلاح، بلیریا گنج

درجات	ترجمہ وتفسیر قرآن	اُصول تفسیر وعلوم القرآن	حفظ قرآن	دیگر
عربی سوم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں		صف، جمعہ، منافقون، مزمل، مدثر، قیامۃ۔	نوٹ:- اُصول تفسیر وعلوم القرآن سے متعلق ساری کتابیں مطالعہ میں ہیں۔
عربی چہارم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	مقدمہ اُصول تفسیر (ابن تیمیہؒ)	فتح، حجرات، رحمٰن، واقعہ	
عربی پنجم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	مقدمہ نظام القرآن (فراہی)	مریم، یٰسین، سجدہ۔	
فضیلت اول (تفسیر)	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	مباحث فی علوم القرآن مناع القطان، الفوز الکبیر	یوسف، ابراہیم	
فضیلت دوم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	مناہل العرفان، دلائل النظام (فراہی)	سورۂ توبہ	
فضیلت سوم	ترجمہ وتفسیر قرآن: متعین سورتیں	الاتقان (سیوطی)، اسالیب القرآن (فراہی)	پہلا پارہ، تجوید	

⊙ ⊙ ⊙

سعودی عرب کی جامعات میں علومِ قرآن کے مباحث اور ان کا طریقۂ تدریس

مولانا نعمت اللہ محمد ناظم قاسمی ⊙

قرآن مجید اللہ جل شانہ کی طرف سے ہدایت ربانی کا وہ آخری ایڈیشن ہے کہ جس کے بعد کسی دوسری آسمانی کتاب کا نزول بند کر دیا گیا، قرآن کریم ہی وہ تنہا آسمانی کتاب ہے، جس کی مکمل حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اس کے حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر رکھی ہے، یہی ایک ایسا عامل ہے جسے ''علومِ قرآن'' کے وجود کا سبب کہا جا سکتا ہے، علماء کرام نے ہر دور اور ہر زمانہ میں قرآن کریم کی مختلف ناحیوں سے خدمت کی ہے، متقدمین نے حفاظت قرآن مجید کے وہ تمام اُسلوب وطریق کار اختیار کئے جو ایک انسانی ذہن کے پہنچ کی آخری حد ہو سکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن سے متعلق علوم کی ایک طویل فہرست ہے، جن پر متقدمین و متاخرین کی سینکڑوں تصانیف بہترین گواہ ہیں۔

قرآنی علوم سے واقفیت دینی علوم کے حاملین کا ایک اہم فریضہ ہے، ان علوم کی تفصیل، اس سے متعلق کتابیں، اس فن کے مراجع ومصادر، ان جیسی معلومات سے طلبۂ دینی مدارس کا واقف ہونا بھی ضروری ہے، قرآن کریم سے متعلق ان مختلف علوم سے طلبہ کو کس طرح واقف کرایا جائے، اس سلسلہ میں سعودی عرب کی جامعات میں جاری منہج تعلیم وتدریس پر اس مضمون میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

منہج تدریس سے مکمل طور پر واقف ہونے کے لئے اس فن کے مضامین ومشمولات سے واقف ہونا نہایت اہم ہے، اس لئے ذیل میں سعودی عرب کی جامعات میں گریجویشن کی سطح تک علوم قرآن سے متعلق عام طور پر جو مباحث ومضامین شامل نصاب ہیں، ان کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

⊙ اُم القریٰ یونیورسٹی، مکہ مکرمہ۔

علوم قرآن کے مرکزی عنوان کو گریجویشن کے مختلف دورانیوں (سمسٹرس) پر چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :

۱- ابتداء وتاریخ: اس فن کی اہمیت اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کا تعارف۔

۲- قرآن کریم کا نزول: وحی اور اس کی تعریف، وحی کے اقسام، قرآن کی پہلی اور آخری آیت، سنت نبوی اور قرآن۔

۳- قرآن کا بتدریج نزول: بتدریج نزول کا مطلب، اس کے فوائد، مسلمانوں کی زندگی میں اس کا قابل استفادہ پہلو۔

۴- اسبابِ نزول: سببِ نزول کا مطلب، اس کا فائدہ، اس فن سے علماء کا تعلق، سببِ نزول کے سلسلہ میں معتمد علیہ اقوال، ایک ہی آیت کے بارے میں مختلف اسبابِ نزول، اس فن کی اہم کتابوں کا تعارف۔

۵- مکی ومدنی: تعریف، اس سے واقفیت کے فوائد، اس سلسلہ میں علماء کی کوششیں۔

۶- جمع قرآن اور اس کے مراحل: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حفظ قرآن مجید، آپ کے عہد میں تدوین قرآن، جمع قرآن اور عہد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، جمع قرآن اور عہد عثمان رضی اللہ عنہ، اس سلسلہ میں پھیلائے جانے والے شبہات کا دفاع۔

۷- تفسیر قرآن: تفسیر کا مطلب، ابتداء وتاریخ، اقسام تفسیر، ہر قسم کی تفاسیر پر مشتمل اہم کتابیں۔

۸- قرآن کریم کا ترجمہ: ترجمہ سازی کا حکم، اس کی ابتداء وتاریخ، اس کے شروط۔

☆ بنیادی کتابیں :

مناہل العرفان للزرقانی، لمحات في علوم القرآن: محمد صالح۔

☆ مراجع مصادر :

البرہان في علوم القرآن: بدر الدین زرکشی۔

الاتقان في علوم القرآن: جلال الدین سیوطی۔

حجیۃ السنہ: عبد الغنی عبد الخالق۔

علوم القرآن (۲)

قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل۔

صحابہ کرام اور قرآن کریم۔

تابعین اور قرآن کریم۔

۲-تلاوت قرآن کریم کے آداب۔

تلاوت قرآن کریم کی اہمیت۔

تلاوت کے شرائط و آداب۔

ختم قرآن کی مدت۔

تلاوت قرآن اور سلف کا معمول۔

ختم قرآن کی دعا۔

۳-ممنوعات تلاوت۔

نادر طریقہ قراءت پر قرآن کریم کی تلاوت۔

ایک سورہ کا دوسرے سے ملانا۔

بلاضرورت حرف کاٹ کر تلاوت کرنا۔

۴-قرآن کریم کو سننے کے آداب۔

۵-قرآن کریم سے متعلق چند اہم مسائل واحکام۔

۶-قرآن کریم کی بلاغت سے نثر و نظم میں استدلال۔

۷-انزل القرآن علی سبعة أحرف :

اس حدیث کا ثبوت۔

أحرف سبعہ اور اقوالِ علماء۔

حکمت نزول قرآن علی سبعة أحرف۔

اس موضوع پر لکھے جانے والے اہم مقالات۔

☆ بنیادی کتابیں :

التبیان فی آداب حملة القرآن علامہ نووی۔

الاتقان فی علوم القرآن جلال الدین سیوطی۔

☆ مصادر ومراجع :

البرہان فی علوم القرآن: بدرالدین زرکشی۔

التعریف بالقرآن والحدیث: محمد زفران۔

علوم القرآن (۳)

۱- قرآن کریم اور عام و خاص :

تعریف، اہمیت، اقسام۔

قرآن کی تخصیص آیت قرآنی سے۔

قرآن کی تخصیص سنت متواترہ سے۔

قرآن کی تخصیص خبر واحد سے۔

اجماع۔

قیاس اور مفہوم مخالف سے آیت قرآنی کی تخصیص، عموم لفظ کا اعتبار کیا جاتا ہے، نہ کہ کسی مخصوص سبب کا۔

۲- قرآن کریم اور مطلق و مقید۔

۳- قرآن کریم اور اس کا منطوق و مفہوم مخالف :

تعریف، اہمیت، نص، ظاہر، مؤول، مشترک، دلالۃ الاقتضاء و دلالۃ الاشارۃ، مفہوم موافق اور اس کے اقسام، مفہوم مخالف اور اس کے اقسام۔

۴- قرآن کریم اور نسخ :

تعریف، نسخ کے اقسام، نسخ اور تخصیص میں فرق، نسخ اور اس سلسلہ میں پیدا کئے جانے والے شبہات کا ازالہ، جن آیات کے بارے میں منسوخ الحکم ہونا مشہور ہے، اس فن کی اہم تالیفات اور ان کے مؤلفین کا تعارف۔

۵- امثال قرآن :

تعریف، امثال قرآن اور اس کے اقسام، امثال قرآن کا تکرار اور اس کی حکمت، مکی آیات اور امثال قرآن، مدنی آیات اور امثال قرآن، اس فن کی اہم تصنیفات اور اس کے مصنفین۔

۶- اقسام قرآن :

قرآنی قسموں کی تعریف، خصائص، اقسام، تکرار قسم کی حکمت، مکی آیات اور قسم، مدنی آیات اور قسم، مکی اور مدنی آیات کے اقسام کی خصوصیات، اقسام قرآنی اور مسلمانوں کی تربیت پر اس کا اثر۔

۷- قصص قرآن :

قرآنی قصوں کی تعریف، شروط، عناصر ترکیبی، مقاصد، اقسام، اہمیت، مسلمانوں کی زندگی میں

ان کی اہمیت، قرآنی قصے اور دوسرے قصوں میں بنیادی فرق، مکی آیات اور قصص قرآنی، مدنی آیات اور قصص قرآنی، مکی اور مدنی آیات کے قصص قرآنی کے خصائص، اسرائیلی روایات اور قرآنی قصوں کی تفسیر میں اس کا اثر، تکرار قصص کی حکمت، اس موضوع پر تالیفات کے اسباب، اس فن کی اہم کتابیں اور اس کے مصنفین۔

☆ موضوع سے متعلق بنیادی کتابیں :

امثال القرآن: ابن قیم جوزی۔

اقسام القرآن: ابن قیم جوزی۔

الاتقان فی علوم القرآن: جلال الدین سیوطی۔

مباحث فی علوم القرآن: مناع القطان۔

الامثال فی القرآن الکریم: منصور بن عون العبدلی الشریف۔

☆ مراجع ومصادر :

البرہان فی علوم القرآن: بدرالدین الزرکشی۔

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: شاہ ولی اللہ دہلوی۔

بحوث فی قصص القرآن: السید عبد الحافظ۔

معالم القصہ فی القرآن الکریم: محمد خیر محمود العدوی۔

علوم قرآن (۴)

۱- علم المناسبات :

تعریف، ظہور اور اس کے مراحل، اس میں علماء کا موقف، اصول علم مناسبات، اس فن کے خصائص، اہم تالیفات اور مؤلفین۔

۲- جدل القرآن :

تعریف، اقسام، اس فن کے اُصول وقواعد، خصوصیات، مقاصد، یہود اور جدل قرآنی، نصاریٰ اور جدل قرآنی، منافقین اور جدل قرآنی، اس فن میں تالیف کا آغاز، اہم کتابیں اور ان کے مصنفین۔

۳- قرآن کریم اور حصر واختصاص :

تعریف، اقسام، طریقے، فوائد۔

۴- مفسرین کے لئے چند اہم الفاظ قرآنی :

الف، اذا، اَو، اَی، بل، ثم، حتی، فاء، باء، قاف، کاف، لعل، عسی، وغیرہ کی تفسیر۔

۵- مفسرین کے لئے چند اہم اُصول قواعد :

جمع کا جمع سے تقابل، جمع کے بمقابلہ مفرد، ضمائر اوران کی اہمیت، ضمائر اوران کا مرجع، تقدیم وتاخیر، واحد، تثنیہ، اور جمع، معرفہ، نکرہ، اوران کے فوائد ودلائل۔

۶- قرآن کریم اوروجوہ ونظائر :

تعریف، اہمیت، وجوہ ونظائر کے بارے میں علماء کا موقف، قرآن کریم میں اس کے چند نمونے، اس فن کی تالیفات، قرآن کریم اورعطف مفرد، عطف جملہ، اسم کا اسم پر عطف، اسم کا فعل پر اوراس کا عکس عطف، عطف کا فائدہ۔

☆ بنیادی کتابیں :

تصاریف: یحیٰی بن سلام۔

الاتقان فی علوم القرآن: جلال الدین سیوطی۔

النباء العظیم: محمد عبداللہ دراز۔

جدل القرآن: زاہر بن عواض الالمعی۔

☆ مراجع ومصادر :

الوجوہ والنظائر: ابن جوزی۔

معترک الاقران: سیوطی۔

نظم الدرر: علامہ بقاعی۔

الجدل فی القرآن: طوفی۔

مشکل القرآن الکریم

۱- لغوی اوراصطلاحی تعریف، اہمیت، مشکل اور متشابہ میں فرق، قرآن کریم میں اس کے وجود کی حکمت، اس سلسلہ میں علماء کی خدمات۔

(الف) دو یا دو سے زیادہ آیتوں میں ظاہری تعارض اوراس سلسلہ میں علماء کے یہاں رائج طریقۂ کار :

(۱) جمع (۲) ترجیح (۳) نسخ۔

(ب) لفظ قرآنی اور مشکل کی بحث :

۲- علامہ ابن قتیبہؒ کی کتاب تاویل مشکل القرآن کی روشنی میں چند آیات کا تطبیقی مطالعہ۔

☆ بنیادی کتابیں :

تأویل مشکل القرآن: ابن قتیبہ۔

البرہان فی علوم القرآن: بدرالدین زرکشی۔

☆ مراجع ومصادر :

مشکل الآثار: علامہ طحاوی۔

وضح البرہان فی مشکلات القرآن: نیساپوری۔

اُصولِ تفسیر اوراس کے مدارس

تعریف (لغوی اور اصطلاحی)

تفسیر اور تاویل میں فرق۔

تفسیر بالماثور۔

تعریف، ظہور اور ترقی کے مراحل، خصوصیات، مناہج ومصادر، ضرورت، اس طریقۂ تفسیر کے چند مشہور مفسرین، مشہور اہم تفاسیر۔

❖ تفسیر بالماثور اوراس کے اقسام :

۱- قرآن سے قرآن کی تفسیر۔

۲- قرآن کی تفسیر حدیث سے۔

۳- اقوالِ صحابہ سے قرآنی تفسیر :

تفسیر صحابی کی اہمیت وحجیت۔

عصر صحابہ میں تفسیر قرآن کے مصادر۔

مشہور مفسرین صحابہ (عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، حضرت علی، حضرت ابی بن کعبؓ)

۴- اقوال تابعی سے قرآن کی تفسیر :

تفسیر تابعی کی اہمیت وحجیت۔

عصر تابعی میں تفسیر قرآن کے مصادر۔

عہد تابعین میں مناہج تفسیر۔

حدیث کی وہ اہم کتابیں جنھوں نے تفسیر ماثور کو اہمیت دی ہے۔

❖ تفسیر بالمعقول :

تعریف، ظہور اور مراحل، اس بارے میں علماء کا موقف، جواز اور عدم جواز کے قائلین اور ان کے دلائل، تفسیر بالمعقول کا صحیح منہج، اس منہج کی اہم تصانیف اور ان کے مصنفین۔

❖ تفسیر اشاری :

تعریف، ظہور اور اس کے اسباب، اس منہج تفسیر کے چند نمونے، اہم تصانیف اور مصنفین۔

❖ آیات احکام کی تفسیر :

تعریف، ظہور اور اس کے اسباب، اس منہج تفسیر کے چند نمونے، اہم تصانیف اور مصنفین۔

❖ تفسیر باطنی :

تعریف، ظہور اور اس کے اسباب، اس فن کی اولین تصانیف، ترقی کے مراحل، خصائص، مذاہب اربعہ کے ظہور کے بعد اس منہج تفسیر کا اس سے متاثر ہونا، آیات احکام اور اس کی صحیح تعداد۔

❖ عصری علوم کے پس منظر میں قرآن کی تفسیر :

مفہوم، اس کے اسباب، اہمیت، اس طریقۂ تفسیر کے شروط وضوابط، چند وہ تفاسیر جن میں ان شروط کی رعایت نہیں کی گئی، اہم تفاسیر کا تعارف۔

❖ تفسیر موضوعی :

تعریف، اسباب، ظہور، ترقی کے مراحل، منہج، اقسام، موضوعات، خصائص، ضوابط، اہمیت، فوائد، اہم تفاسیر اور ان کا تعارف۔

❖ مختلف فنون کے ماہرین کی تفاسیر :

محدثین، متکلمین، ادباء اور فن نحو کی اہم شخصیات کی چند تفاسیر اور ان کا تعارف۔

☆ بنیادی کتابیں :

التفسیر والمفسرون: للشیخ الذہبی۔

احکام القرآن: لابن العربی۔

المدخل الی التفسیر الموضوعی: عبدالستار فتح اللہ۔

الاسلام فی عصر العلم: دکتور غمراوی۔

☆ مراجع ومصادر :

تأویل مشکل القرآن: ابن قتیبہ۔

اعلام الموقعین عن رب العالمین: ابن قیم۔

الاتقاق فی علوم القرآن: سیوطی۔

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر: شاہ ولی اللہ دہلوی۔

اعجاز القرآن

معجزہ: تعریف، شرائط، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معنوی وحسی معجزے اعجاز قرآنی کا مطلب۔

قرآن سب سے بڑا معجزہ، قرآن کا چیلنج، فصحاء اور بلغاء کا اعتراف، اعجاز قرآنی کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر شہادت۔

☆ اعجاز قرآنی کے اقسام :

۱- الفاظ قرآنی اوراس کی تراکیب کی فصاحت، اُسلوب قرآن کی بلاغت، اُسلوب قرآن کی خصوصیت اور انسانی قوت سے اس کا ماوراء ہونا، قرآن کے اُسلوب بیان کی خصوصیت،۔

۲- غیب کی باتوں سے باخبر کرنا (ماضی، حال اور مستقبل سے متعلق غیب کی باتیں بتانا)۔

۳- قرآنی وعدے۔

۴- قرآن کریم کا تشریعی اعجاز۔

۵- قرآن کریم کا ادبی اور سماجی اعجاز۔

۶- قرآن کریم کا سائنسی اعجاز۔

☆ بنیادی کتابیں :

مناہل العرفان: محمد عبدالعظیم زرقانی۔

الاسلام فی عصر العلم: غمراوی۔

الزام القرآن للمادیین: سید احمد المسیر۔

التبیان فی اعجاز القرآن: صالح الخالدی۔

☆ مراجع ومصادر :

اعجاز القرآن: باقلانی۔

معترک الاقران فی اعجاز القرآن: جلال الدین سیوطی۔

علوم قرآن پر مشتمل ان موضوعات کی تدریس کے منہج پر سعودی عرب کی جامعات کے پس منظر میں اگر ہم غور کریں تو مندرجہ ذیل بنیادی اُمور سامنے آتے ہیں :

ہر فن کی تدریس کے لئے اس فن کے متخصص اساتذہ کا انتخاب

کسی بھی فن کی تدریس کے لئے اساتذہ کا انتخاب بنیادی کردار ادا کرتا ہے، جدید طریقہ تدریس میں اس بات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، سعودی عرب کی جامعات میں بھی اسے برتنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے؛ چنانچہ علوم قرآن کی تدریس کی ذمہ داری بھی انھیں اساتذہ کو سونپی گئی ہے، جن کا تخصص یہی فن رہا ہو۔

بتدریج فن کی تدریس

سعودی یونیورسٹیز میں علوم قرآن سے متعلق مباحث پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں ان علوم قرآنی کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک کی حیثیت بنیادی اور تعارفی کی ہے، دوسرے کی تحقیقی اور تخصصی کی، پہلے مرحلہ میں طالب علم کو اس فن سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور پھر اس فن کے مشمولات، مراجع، مصادر بتائے جاتے ہیں، اس کا اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کے ذہن میں اس فن کا بنیادی خاکہ تیار ہو جاتا ہے، دوسرا مرحلہ علوم قرآن سے متعلق مضامین کے تحقیقی تدریس کا ہوتا ہے، اس مرحلہ میں طالب علم کو اس فن کے مشمولات کا گہرائی سے مطالعہ کرایا جاتا ہے، اور پھر بوقت ضرورت ان سے واجب (Home Work) بھی طلب کیا جاتا ہے؛ تاکہ وہ لائبریریوں سے استفادہ کر کے کسی خاص موضوع پر اپنی مختصر تحقیق پیش کریں۔

مفردات منہج سے واقفیت

علوم قرآن کا موضوع اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھا ہے، عام طور پر تعلیمی دورانیہ کے شروع میں اساتذہ طلبہ کو مفردات منہج سے واقف کراتے ہیں کہ پورے دورانیہ میں انھیں کن کن مضامین وعناوین کو پڑھنا ہے اور ان کے مشمولات کیا ہیں؟ اور اس درمیان وہ کن کن کتابوں سے استفادہ کریں گے، اس کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ پڑھائے جانے والے مضامین سے پہلے سے ہی واقف ہو جاتے ہیں اور پھر وہ اسی لحاظ سے موضوع کا مراجع کی مختلف کتابوں سے استفادہ کر کے درس میں حاضر ہوتے ہیں اور درمیان درس علمی مباحث میں حصہ لیتے ہیں۔

موضوع کی تدریس نہ کہ کتاب کی

سعودی عرب کی جامعات میں دوسرے علوم کی طرح علم قرآن کی تدریس میں بھی فن اور موضوع اور مفردات منہج کی تدریس کو اہمیت دی جاتی ہے، کسی خاص کتاب کی تدریس اور اسی پر اپنی مکمل محنت صرف کرنے سے گریز کیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی اہم اور جامع کتاب کو طلبہ کی تدریس کے لئے مقرر نہ کیا جاتا ہو؛ بلکہ عام طور پر اس فن کی تدریس میں مفردات منہج پر مشتمل متقدین یا متاخرین یا معاصر علماء میں سے کسی عالم کی کتاب کو مقرر کیا جاتا ہے، تاکہ طلبہ موضوع کے فہم، اس کے مشمولات اور اہم بنیادی معلومات کے لئے اس کی طرف رجوع کر سکیں، اگر مفردات منہج پر مشتمل کوئی جامع کتاب نہ ہو تو اساتذہ خود ایسا نوٹ (مذکرہ) تیار کرتے ہیں، جن میں متقدین کے علوم سے استفادہ کے ساتھ ساتھ معاصر علماء کی تحریروں، نیز عصر حاضر تک اس فن کی خدمات جیسی اہم بحثیں شامل ہوتی ہیں۔

خصوصی اور عمومی مراجع ومصادر کی وضاحت

کسی بھی موضوع کی تدریس کے وقت اساتذہ اس موضوع سے متعلق بنیادی کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس طرح موضوع سے متعلق مراجع ومصادر کے ضمن میں جو کتابیں آسکتی ہیں ان سے بھی طلبہ کو واقف کراتے ہیں، مثلاً اگر سبق کا موضوع ''مدنی آیات'' ہے، تو اساتذہ جس طرح مدنی ومکی آیات کی تعریف، ان دونوں کے درمیان فرق، مکی ومدنی آیات کی خصوصیات، مکی ومدنی آیات کی علامات وغیرہ جیسی بحثیں کرتے ہیں، وہیں خاص اس موضوع پر جو اہم کتابیں اب تک منظر عام پر آئی ہیں ان کا بھی تعارف کراتے ہیں نیز اس موضوع کا ذکر علوم قرآن کی جن قدیم کتابوں میں ہے طلبہ کو ان سے بھی آشنا کراتے ہیں؛ تاکہ طلبہ خصوصی مراجع سے واقفیت کے ساتھ ساتھ مرجع کی عمومی کتابوں سے بھی واقف ہوسکیں۔

درس کا مراجعہ

درس وتدریس میں گذشتہ سبق کا مراجعہ بہت اہمیت رکھتا ہے، اس لئے اساتذہ پچھلے سبق کا خلاصہ یا خود بیان کرتے ہیں یا پھر طلبہ سے مجموعی یا علاحدہ علاحدہ طور پر ان کے متعلق سوالات کرتے ہیں۔

دوران درس طلبہ کی مشارکت

یونیورسٹیز میں نظام تدریس کا عام پہلو یہ ہے کہ یہاں طالب علم اور اساتذہ میں خطیب اور سامعین کی

حیثیت نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ ایک محاضر اور طلبہ کی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اساتذہ دوران درس طلبہ کو علمی بحثوں میں مکمل شریک کرتے ہیں، ان سے مختلف قسم کے سوالات کرتے ہیں، طلبہ بلا جھجک اپنا معقول سوال رکھتے ہیں، کسی مسئلہ میں اساتذہ کی رائے سے اختلاف کی بھی گنجائش رہتی ہے، اساتذہ سبق میں طلبہ کی اس مشارکت کی قدر بھی کرتے ہیں، جس سے ممتاز طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے اور دوسرے طلبہ میں شوق کی چنگاری بھی جلنے لگتی ہے۔

سبق میں علمی مشارکت کی اہمت کے پیش نظر بعض اساتذہ ان ممتاز طلبہ کو کچھ نمبرات بھی دیتے ہیں، جو ان کے سالانہ امتحان کے نمبرات میں شامل کیے جاتے ہیں۔

مختصر علمی مضامین لکھنے کی تربیت

علوم قرآن سے متعلق ایک اہم موضوع مختلف مناہج پر مشتمل تفاسیر کا تعارف بھی ہے، اس موضوع کی تدریس میں اساتذہ طلبہ کو تفسیر بالماثور، تفسیر بالمعقول وغیرہ تفاسیر پر مشتمل چند اہم تفاسیر کا مختصر تعارف لکھ کر پیش کرنے کا مکلّف بناتے ہیں، جس سے طلبہ کے اندر لائبریری سے استفادہ اور معلومات کے استخراج کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

تطبیقی تدریس کا اہتمام

علوم قرآن سے متعلق بعض موضوعات ایسے ہیں جن میں تطبیقی تدریس کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے علم المناسبات کا موضوع، اساتذہ اس موضوع کی تدریس میں طلبہ سے دوسورتوں یا دو آیتوں یا ایک صفحہ کی چند آیتوں میں مناسبت تلاش کراتے ہیں جس سے طلبہ میں علم مناسبت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے اور ان کے اندر تلاش وجستجو اور جدوجہد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ علوم قرآن کی تدریس کا جو منہج سعودی عرب کی یونیورسیٹیز میں جاری ہے، اس سے طلبہ کے اندر علوم قرآن کا ایک وسیع مفہوم سامنے آتا ہے اور وہ اس فن کے اہم مباحث اور ہر موضوع سے متعلق اہم خصوصی وعمومی مراجع سے واقف ہو جاتے ہیں، جن سے مستقبل میں ان کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید کا طریقۂ تدریس — جائزہ اور تجاویز

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی ⊙

قرآن ایک زندہ و تابندہ کتاب ہے، دنیا و آخرت کے ہر معاملہ میں بہترین رہنما ہے، زندگی کے راز سے پردہ اُٹھاتی ہے اور انسان کے حقیقی وجود سے آشنا کرتی ہے، سسکتی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کے لئے زندگی کا پیام ہے، خوارگی، درماندگی، مصیبت و مشکلات، رنج و الم اور فکر و غم سے نجات کے لئے نسخۂ شفا ہے، دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لئے شاہ کلید ہے، جنھوں نے اسے تھاما اور اس کے مطابق زندگی گذاری وہ دنیا میں سربلند ہوئے اور آخرت کی جیت بھی یقینی ہے، فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی، (طٰہ:۱۲۳) اور جس نے اس سے منھ موڑا اور پس پشت ڈالا وہ ہر جگہ ناکام و نامراد ہوا، وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا۔ (طٰہ:۱۲۴)

قرآن حکیم کو سیکھنا اور سکھانا، پڑھنا اور پڑھانا، ہر کام سے اچھا اور ہر عمل سے بہتر ہے اور جو لوگ اس عمل میں مشغول ہیں وہ یقینی طور پر دنیا کے بہترین لوگ ہیں — اس لئے کہ کوئی کام تین باتوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے افضل اور اشرف قرار پاتا ہے، موضوع اشرف ہو، مقصد اعلیٰ ہو، یا اس کی شدید ضرورت ہو، قرآن سیکھنے اور سکھانے میں بیک وقت یہ تینوں چیزیں پائی جاتی ہیں، اس کا موضوع اللہ کا کلام ہے، جو تمام حکمتوں کا سرچشمہ اور تمام فضائل کا گنجینہ ہے، اس میں ماضی کی خبر بھی ہے اور مستقبل کے لئے رہنمائی بھی، اس کا مقصد اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا اور حقیقی سعادت سے ہم کنار ہونا ہے اور ضرورت کی شدت اس قدر ہے کہ تمام شرعی علوم کا انحصار اللہ کی کتاب پر ہے، یہ وہ مرکز اور محور ہے جس کے ارد گرد تمام علوم گردش کرتے ہیں۔ (۱)

قرآن کا حق

قرآن کی برکت سے اسی وقت فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، جب کہ اللہ کی دی ہوئی اس عظیم ترین نعمت کی اہمیت پہچانی جائے اور اس کی قدر کی جائے، اس کے جو حقوق ہیں وہ ادا کئے جائیں، قرآن حکیم کے جو حقوق ہیں ان میں تجوید، تحفیظ اور تدبر کو خصوصی اور بنیادی اہمیت حاصل ہے، قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہوئے ان چیزوں کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

⊙ جامعۃ الفلاح، بلیریا گنج، اعظم گڑھ۔

(۱) دیکھئے: الإتقان للسیوطی: ۱۷۵/۲۔

۱- تجوید

قرآن مجید کا سب سے پہلا حق اور تعلیم قرآن کی سب سے پہلی سیڑھی اسے صحیح طریقے سے پڑھنا ہے، قرآن مجید کی تلاوت، اسے صحیح طور پر پڑھنا ہے، جس کے لئے علم تجوید سے واقفیت ضروری ہے؛ کیوں کہ صحت کے ساتھ حروف کی ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں معنی اور مفہوم بدل جاتا ہے اور کبھی مفہوم کی یہ تبدیلی اس درجہ خطرناک ہوتی ہے کہ کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

۲- تحفیظ

قرآن سے محبت اور اس کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اسے شوق کے ہاتھوں لیا جائے، ذوق کی نگاہوں سے پڑھا جائے اور دل کے آئینے میں بسایا جائے، بہتر ہے کہ ایک صاحب ایمان کے سینے میں پورا قرآن محفوظ ہو اور ایک عالم دین کے لئے کم از کم اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ نماز میں مسنون سورتیں پڑھ سکے، روزمرہ کی زندگی میں رہنمائی حاصل کر سکے، مسائل کے استخراج اور استنباط میں مدد اور وعظ ونصیحت کے موقع پر اسے پڑھ سکے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے :

ان الذي ليس في جوفه شيء من القرآن كالبيت الخرب . (۱)

جس کے سینے میں قرآن کا کوئی حصہ محفوظ نہ ہو، وہ ویران گھر کی طرح ہے۔

۳- تدبرِ قرآن

قرآن کے نزول کا مقصد ہے اس سے رہنمائی حاصل کرنا اور یہ قرآن کے مفہوم اور معنی سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے، نبی ﷺ کی بعثت اس لئے ہوئی تھی کہ وہ قرآن کا پڑھنا سکھائیں اور اس کی تعلیمات سے آگاہ کریں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ سے قرآن کے الفاظ بھی سیکھتے تھے، معانی بھی اور عمل بھی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: فتعلمنا القرآن والعمل جميعا، ''ہم نے قرآن اور اس پر عمل کو ایک ساتھ سیکھا'' اور جو لوگ قرآن کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ان کے متعلق خود قرآن میں کہا گیا ہے کہ :

أفلا يتدبّرون القرآن أم على قلوب أقفالها . (سورۂ محمد:۲۴)

کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں؟

---

(۱) رواہ الترمذی وقال حسن صحیح وقال الحاکم صحیح الاسناد، الترغیب: ۵۹۲/۲۔

آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام ؓ، تابعین عظام اور اس اُمت کے علماء نے اس زریں سلسلہ کو جاری رکھا اور ہر دور میں درسِ قرآن کی محفل سجتی رہی، یہاں تک کہ جب تعلیم وتربیت کے لئے باقاعدہ درسگاہیں بننے لگیں تو ان میں بھی فہم قرآن کو ایک نمایاں مقام دیا گیا۔

مدارس کے نصابِ تفسیر پر ایک نظر

چنانچہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں آج جو بیداری اور سرگرمی پائی جاتی ہے وہ انھیں مدارس کا دین ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس اسلامی علوم اور تہذیب ثقافت کی حفاظت کے لئے مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کی آہنی دیواروں سے ٹکرا کر ہر مخالفانہ کوشش پاش پاش ہوجاتی ہے، حضرت علی میاں ندویؒ کے الفاظ میں :

> مدرسہ وہ مقام ہے جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، مدرسہ عالم اسلام کا وہ بجلی گھر ہے جہاں سے انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، یہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں۔(۱)

ہر مدرسہ کے نصابِ تعلیم میں ''علم تفسیر'' ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل ہے؛ بلکہ فقہ اور حدیث کے بھی پڑھانے کا مقصد طالب علم کو فہم قرآن سے قریب کرنا ہے، تمام مدارس کے نصاب میں قرآن کو ایک محور اور مرکز کی حیثیت حاصل ہے، اس لئے یہ کہنا کہ فلاں مدرسہ کا ''نصب العین'' ''فہم قرآن'' ہے اور سب سے پہلے نصابِ تعلیم میں قرآن کو مرکزیت کا درجہ دینے کا آوازہ اس نے بلند کیا، ایک بے جا اور تعصب پر مبنی بات ہے —— اس لئے مدارس کے نصابِ تفسیر کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ یہ مدارس اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہیں اور کہاں کمی محسوس ہورہی ہے اور حالات کی وجہ سے کس درجہ تبدیلی کی ضرورت ہے؟

ہندوستان میں پھیلے ہوئے تمام مدارس کے نصابِ تفسیر کا جائزہ لینا ایک دشوار گذار اور دقت طلب کام ہے، اس وقت ان مدرسوں کا نیا اور جاری نصاب میرے سامنے ہے، انھیں کی روشنی میں جائزہ پیش کیا جارہا ہے :

۱- دارالعلوم دیوبند

تعلیم قرآن کے پہلے مرحلے سے متعلق یہاں ایک مکمل شعبہ موجود ہے، جہاں حفص اور قراءت سبعہ وعشرہ کا نظم ہے —— اس کے علاوہ ابتدائی جماعت ہی سے قرآن مجید کو صحت کے ساتھ پڑھنے کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اسی

(۱) دعوتِ اسلامی اور مدارس دینیہ مجموعہ مقالات :۳۷۔

طرح سے عربی درجات میں بھی پہلے اور دوسرے سال اس کے لئے ایک گھنٹی رکھی گئی ہے اور پارۂ عم حفظ کرایا جاتا ہے، بعد کے درجات میں داخلہ لینے والے طلباء کے لئے خارجی اوقات میں اس کی تعلیم اور امتحان کا نظم ہے۔

عربی سوم سے قرآن مجید کا ترجمہ کرایا جاتا ہے اور تین سالوں میں حل لغات اور نحو وصرف کی ضروری چیزوں کے ساتھ پورے قرآن کا ترجمہ مکمل کر لیا جاتا ہے — عربی ششم میں جلالین اور اُصول تفسیر میں الفوز الکبیر پڑھائی جاتی ہے، سال ہفتم اور ہشتم میں تفسیر کی کوئی کتاب درس میں شامل نہیں ہے — عربی سوم سے پنجم تک اس کے لئے ایک گھنٹہ اور عربی ششم میں دو گھنٹہ مختص کیا گیا ہے۔

اس نصاب کے مرتبین کو یہ احساس تھا کہ :

> ان کتابوں کی تعلیم سے قرآن فہمی میں اس قدر مناسبت اور استعداد تو ضرور پیدا ہو جاتی تھی کہ طالب علم فراغتِ تحصیل کے بعد ذاتی مطالعہ سے مزید بصیرت حاصل کر سکتا ہے، نیز ضرورت کے وقت آیاتِ قرآنیہ سے فی الجملہ استفادہ کر سکتا ہے، مگر چوں کہ سب لوگوں کو بالعموم ایسے حالات میسر نہیں آتے کہ وہ زمانہ تحصیل علم کے بعد علوم سے مزاومت باقی رکھ کر اپنے علم و معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں، اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ زمانہ تعلیم ہی میں تفسیر کے متعلق تفصیلی معلومات کا ذخیرہ طالب علم کے لئے مہیا کر دیا جائے؛ تاکہ بعد میں اگر مطالعہ کتب کا موقع میسر نہ آئے تو محفوظ شدہ معلومات سے اس کی تلافی ہو سکے۔(۱)

اس کے لئے ''تکمیل تفسیر'' کے نام سے ایک سالہ کورس شروع کیا گیا ہے، جس میں تفسیر ابن کثیر سورۂ صافات سے سورۂ ناس تک، تفسیر بیضاوی سورۂ بقرہ سے اعراف تک اور مناہل العرفان کے منتخب حصے پڑھائے جاتے ہیں۔

اس نصاب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تدریس قرآن کے ایک پہلو یعنی تجوید پر خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے؛ لیکن ''تحفیظ'' کا پہلو قابل توجہ ہے، اسی طرح قرآن فہمی اور اس سے مناسبت، شغف اور لگاؤ کے اعتبار سے بھی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے، مذکورہ نصاب کے ذریعہ طلباء میں نہ تو قرآن سے مسائل کے استنباط کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی دورِ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے، قرآن پر بعض حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات اُٹھائے جاتے ہیں نہ تو ان سے آگاہی ہوتی ہے اور نہ ہی تسلی بخش جواب دینے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، قرآنی علوم، تاریخ قرآن اور اس کے جغرافیہ سے ناواقف ہوتے ہیں۔

---

(۱) تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/۲۸۱۔

تکمیل تفسیر کے ذریعہ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے؛ لیکن یہ شعبہ ذمہ داران کی بے توجہی اور طلباء کی عدم دلچسپی کا شکار ہے، تکمیل ادب اور افتاء کی طرح اس شعبہ میں داخلہ کے لئے ان میں شوق اور آمادگی نہیں پائی جاتی اور نہ ہی ان کی کوئی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، ''شیخ الحدیث'' کی طرح ''شیخ التفسیر'' سے عظمت واحترام وابستہ نہیں ہے، جس کی وجہ سے اساتذہ میں بھی اس فن میں مہارت کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔

شیخ الہندؒ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی پستی اور زوال کے اسباب دو ہیں: کتاب اللہ سے دوری اور آپسی اختلاف، اور مالٹا سے واپسی کے بعد انھوں نے آپسی اختلاف دور کرنے اور اللہ کی کتاب سے تعلق جوڑنے کی قابل قدر کوشش کی؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ خود اپنوں میں ان کی اس کوشش کو خاطر خواہ پذیرائی نہ مل سکی۔

۲- دارالعلوم ندوۃ العلماء

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصابی چارٹ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی تجوید کے لئے قابل قدر کوشش کی گئی ہے؛ چنانچہ درجہ پرائمری میں جو پانچ سال پر مشتمل ہے، صحت مخارج کے ساتھ قرآن پڑھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اسی طرح ثانوی درجات میں (جس کی مدت چھ سال ہے) بھی تجوید کا نظم ہے — تحفیظ کا پہلو یہاں قدرے غنیمت لیکن ناکافی ہے کہ صرف پرائمری میں ''جزء عمّ'' اور ۲۹ پارہ میں سورۂ نوح سے آخر تک کے حفظ کا اہتمام ہے، عربی درجات میں اس کا کوئی نظم نہیں ہے۔

درجات عالیہ کے چار سالوں میں قرآن حکیم کے زیادہ تر حصے کی تفسیر کی جاتی ہے، عالیہ سوم میں اُصل تفسیر کے لئے الفوز الکبیر داخل ہے اور مراجع میں ابن کثیر، کشاف، روح المعانی، احکام القرآن، ابن عربی وجصاص کا ذکر ہے۔

پہلے سال میں ہفتہ میں چھ، دوسرے میں پانچ، تیسرے میں چھ اور چوتھے سال میں تین گھنٹی تفسیر کے لئے خاص کی گئی ہے۔

فضیلت کے درجات میں جو طلباء تفسیر میں اختصاص چاہتے ہیں، ان کے لئے پہلے سال میں تفسیر کشاف، ہفتہ میں تین گھنٹی اور علوم القرآن مناع قطان اور اتقان، ہفتہ میں نو گھنٹی رکھی گئی ہے، دوسرے سال میں اعجاز القرآن، اُصولِ تفسیر ومناھجہ اور احکام القرآن پڑھائی جاتی ہے اور ہفتہ میں تین گھنٹی اس کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔

قرآن فہمی کی صلاحیت پیدا کرنے کے اعتبار سے تو دیکھا جائے تو یہ نصاب بھی دیوبند کی طرح ناکافی ہے، عالمیت میں رواں ترجمہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے، مراجع میں مذکور قدیم اور ضخیم کتابوں سے استفادہ کی کیا شکل ہوگی، کیا تھوڑے سے وقت میں ان تفسیروں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے اور کیا ان سے حالات کے تقاضوں کی تکمیل ہوسکتی ہے، عام طور پر طلباء عالمیت کے بعد دیگر اداروں کی طرف رُخ کرتے ہیں اور صورتِ حال یہ ہے کہ عالمیت کے درجات

میں اُصولِ تفسیر کے طور پر صرف الفوز الکبیر پر اکتفاء کیا جاتا ہے، ان درجات میں علوم قرآن کی کوئی کتاب داخل نہیں ہے، علاوہ ازیں جن طلباء کا مادہ اختصاص تفسیر نہیں ہوتا ہے وہ فضیلت میں بھی ان چیزوں سے محروم رہتے ہیں۔

۳- جامعہ اشرفیہ مبارکپور

جامعہ اشرفیہ میں بھی تجوید سکھانے کی اچھی اور کامیاب کوشش کی گئی ہے؛ چنانچہ عربی درجات (جس کی مدت آٹھ سال ہے) کے پہلے اور تیسرے اور چوتھے سال میں تجوید کی چار کتابیں درس میں شامل ہیں اور عملی طور پر اچھے خاصے حصے کی مشق کرائی جاتی ہے ؛ لیکن تحفیظ کے اعتبار سے یہاں بھی کمی محسوس ہوتی ہے، صرف پارہ عم حفظ کرانے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، جو لائق توجہ ہے۔

اور تفہیم قرآن کا پہلو اور بھی تشویشناک ہے، آٹھ سالہ طویل مدت میں بھی پورے قرآن کے ترجمہ وتفسیر کا کوئی نظم نہیں ہے، چوتھے سال سے ''درسِ قرآن'' کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور پارہ ۲۸-۳۰ کے ترجمہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور ہفتہ میں صرف دو گھنٹی اس کے لئے خاص کی گئی ہے، پانچویں سال میں سورۂ شعراء سے جاثیہ تک کے ترجمہ کا نظم ہے اور ''تدوین قرآن'' مطالعہ میں شامل ہے، چھٹے سال میں تفسیر کے عنوان سے جلالین درس میں شامل ہے اور سورۂ بقرہ سے انعام تک پڑھایا جاتا ہے اور زبدۃ الاتقان سے ۸۴ صفحہ تک کی تعلیم ہوتی ہے، ساتویں سال میں تفسیر مدارک سورۂ کہف سے ''فرقان'' تک اور آٹھویں سال میں تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصہ اور مطالعہ قرآن کے عنوان سے ''کنز الایمان'' داخل نصاب ہے اور اس کی روشنی میں سورۂ اعراف سے یونس تک کے مطالعہ کو لازم قرار دیا گیا ہے —— اور ان تمام درجات میں تفسیر قرآن کے لئے ہفتہ میں ایک گھنٹی رکھی گئی ہے۔

۴- جامعہ سلفیہ بنارس

اس کے نصابی چارٹ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پرائمری، متوسط (مدتِ تعلیم تین سال) اور ثانویہ (مدتِ تعلیم دو سال) میں تجوید اور تحفیظ کے پہلو پر خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے؛ لیکن عربی درجات میں اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے؛ چنانچہ عالمیت (مدتِ تعلیم دو سال) اور فضیلت (مدتِ تعلیم تین سال) میں حفظ وتجوید کا کوئی نظم نہیں ہے۔

متوسطہ سال سوم سے قرآن مجید کے ترجمہ کی ابتداء ہوتی ہے اور ثانویہ سال دوم یعنی تین سال تک یہ سلسلہ چلتا ہے، اس دوران پارہ ۲۹-۳۰ سورۂ شوریٰ سے تحریم تک، فرقان سے حم سجدہ تک، ترجمہ کرایا جاتا ہے اور ہفتہ میں چار یا پانچ گھنٹی اس کے لئے مخصوص ہے۔

عالمیت سال اول سے فضیلت سال دوم یعنی چار سال تک تفسیر پڑھائی جاتی ہے اور تفسیر ''جلالین'' فاتحہ سے اعراف تک ''تیسیر العلی القدیر'' سورۂ انفال سے طٰہ تک ''فتح القدیر'' انبیاء سے شعراء تک اور تفسیر بیضاوی، رازی، محمد عبدہ اور اضواء البیان کے منتخبات نصاب میں داخل ہیں۔

عالمیت سالِ دوم میں اُصولِ تفسیر کے موضوع پر ''الفوز الکبیر'' اور فضیلت سال دوم میں علوم القرآن کے موضوع پر ''فتح المنان'' اور سالِ سوم میں التفسیر والمفسرون کے منتخبات داخل نصاب ہیں، تفسیر کے لئے چار یا پانچ اُصول تفسیر کے لئے ایک، علوم القرآن کے لئے چار اور تاریخ تفسیر کے لئے پانچ گھنٹے ہفتہ میں رکھی گئی ہے۔

جامعہ سلفیہ میں تفسیر قرآن کے لئے ایک حد تک بہتر نصاب مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے؛ لیکن اس کے لئے وقت بہت کم رکھا گیا ہے، نصاب میں مذکورہ تفسیری کتابوں کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدر کم وقت میں یا تو کورس پورا نہیں ہوتا ہوگا یا بہت روا روی میں پڑھایا جاتا ہوگا۔

۵- مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

> یہ مدرسہ قرآن مجید کی محققانہ تعلیم میں پورے ملک میں شہرت رکھتا ہے، یہاں کے نصاب تعلیم میں قرآن مجید کو وہی مقام دیا گیا ہے، جس کا وہ بجا طور سے مستحق ہے، یہاں پورے قرآن کی باقاعدہ تعلیم کا اہتمام ہے، دینی علوم میں قرآن، حدیث اور فقہ کو جو اہمیت ہے اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؛ لیکن ان تینوں میں جو فرق مراتب ہے کم ہی نصابوں میں اس کی رعایت ملے گی، مدرسۃ الاصلاح میں سب سے زیادہ ۹ ریپریڈ قرآن مجید کو ۶ ریپریڈ احادیث مبارکہ کو اور ۳ ریپریڈ فقہ کو دیئے گئے ہیں۔(۱)

مدرسۃ الاصلاح سے تعلق رکھنے والوں کی طرف سے عام طور پر اس طرح کے دعوے کئے جاتے ہیں؛ لیکن نصابی چارٹ پر نظر ڈال کر دیکھنے سے اس دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی ہے؛ چنانچہ مکتب سے لے کر فضیلت تک کے پندرہ سالہ دورانیہ میں صرف مکتب کے پانچ سال میں تجوید کے ساتھ ناظرہ پڑھنے کا ذکر ہے، عربی درجات میں تجوید سیکھنے کا کوئی نظم نہیں ہے، تحفیظ کا حال اس سے بھی برا ہے کہ ''حفظ'' کے نام پر ایک سورہ بھی یاد کرانے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، مولانا صدر الدین اصلاحی نے اسی پہلو پر نقد کرتے ہوئے ایک موقع پر کہا تھا :

> ہم لوگ ایسے ادارے کے پڑھے ہوئے ہیں، جہاں قرآن مجید عربی میں نہیں، اُردو میں پڑھا جاتا ہے۔(۲)

(۱) مقالہ محمد عمر اسلم اصلاحی، بموقع دوروزہ قومی سیمینار، بعنوان: تدریس قرآن کا منہاج، جون ۲۰۱۰ء۔

(۲) ماہنامہ زندگی نو، جون ۲۰۱۰ء۔

اس وقت سے لے کر آج تک اس صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

عالمیت (مدت تعلیم آٹھ سال) کے چوتھے سال سے تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور چار سالوں میں پورے قرآن کی تفسیر مکمل کر لی جاتی ہے، عالمیت کے ساتویں اور آٹھویں سال میں علوم فراہی کی دو کتابیں (مفردات القرآن اور اسالیب القرآن) داخل نصاب ہیں۔

فضیلت (مدتِ تعلیم دو سال) سال اول میں علامہ زرکشی کی البرہان اور علوم فراہی کی التکمیل فی اصول التاویل اور دوسرے سال میں الفوز الکبیر اور علامہ فراہی کی کتاب دلائل النظام داخل درس ہے، ان دونوں سالوں میں ''تفسیر قرآن'' داخل نصاب نہیں۔

تفسیر کا طریقہ یہ بیان کیا جاتا ہے:

> قرآن پاک کی تعلیم ابتداء میں سادہ یعنی نحو وصرف، ادب، ترجمہ مطلب اور نظم کی رعایت سے ہوتی ہے، پھر بتدریج عمود، نظام وحج، اسالیب و معانی، اسرار وحقائق، قانون وحکمت اور تطبیق کتاب وسنت کے ساتھ محققانہ ہوتی ہے۔(۱)

وہاں کے ذمہ داروں کا احساس ہے کہ ''مدارس و جامعات میں پورے قرآن مجید کی باقاعدہ تدریس کا اہتمام نہیں ہے، بیش تر مدارس میں قرآن کم بعض مفسرین کی تفسیریں زیادہ پڑھائی جاتی ہیں، (۲) اس لئے یہاں کسی تفسیری کتاب کا سہارا لئے بغیر براہ راست قرآن فہمی کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اور براہ راست قرآن سمجھنے کا مفہوم یہ ہے کہ حدیث، صحابہ کرامؓ کے آثار اور فہم سلف سے بے نیاز ہو کر لغت، جاہلی شعراء اور نظام قرآن کے ذریعہ تفسیر کی جائے؛ چنانچہ علامہ فراہی لکھتے ہیں:

> قرآن مجید بالکل قطعی الدلالہ ہے، ہر آیت میں مختلف معانی کا احتمال محض ہماری قلت علم اور تدبر کا نتیجہ ہے، (۳) یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن اپنی تفسیر کے لئے ان فروع (یعنی حدیث، تاریخ، گذشتہ انبیاء کے صحیفے) کا محتاج نہیں ہے۔(۴)

ان کے نزدیک پورے قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن کے ذریعہ کی جاسکتی ہے بایں طور پر کہ عرب، قدیم شعراء کے کلام، سیاق وسباق، نظم اور نظائر کے ذریعہ اس کے مفہوم کو متعین کیا جائے گا — اس طریقے سے کی گئی تفسیر کے نادر ونایاب نمونے دیکھنے ہوں تو نظام القرآن اور تدبر قرآن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) مدرسۃ الاصلاح کی ابتداء اور اس کا نصب العین: ۳۷۔ (۲) کلیدی خطاب: دوروزہ قومی سیمینار، جون ۲۰۱۰ء۔

(۳) مقدمہ نظام القرآن: ۳۵۔ (۴) حوالۂ سابق: ۴۰۔

۶- جامعۃ الفلاح

جامعۃ الفلاح میں تعلیم کے پانچ مراحل ہیں :

(۱) ابتدائی: مدتِ تعلیم پانچ۔

(۲) ثانوی: مدت تعلیم تین سال، ان دو مرحلوں میں تجوید کے ساتھ ناظرہ اور پارۂ عم حفظ کرایا جاتا ہے۔

(۳) مولوی: مدت تعلیم تین سال، اس میں پہلے اور دوسرے سال میں جزءِ عم کے حفظ کا نظم ہے اور تجوید کے لئے ''جمال القرآن'' داخل نصاب ہے اور ہفتہ میں دو یا تین گھنٹی اس کے لئے مخصوص ہے، مولوی سال سوم سے فضیلت کے آخری سال تک مختلف سورتوں کا حفظ کرایا جاتا ہے اور امتحان لیا جاتا ہے، مولوی سالِ سوم میں ہفتہ میں تین گھنٹی، سورۂ ملک سے سورۂ ناس تک کے ترجمہ کے لئے خاص کی گئی ہے۔

(۴) عالمیت: مدتِ تعلیم دو سال، پہلے سال میں سورۂ سبا سے واقعہ تک اور دوسرے سال میں مریم سے احزاب تک کی تفسیر کی جاتی ہے اور ہفتہ میں نو گھنٹیاں اس کے لئے رکھی گئی ہیں، اُصولِ تفسیر کے لئے مقدمہ اُصولِ تفسیر، ابن تیمیہ اور مقدمہ نظام القرآن فراہی داخل نصاب ہے۔

(۵) فضیلت: مدتِ تعلیم تین سال، پہلے سال میں یونس سے کہف تک، دوسرے میں مائدہ سے توبہ تک اور تیسرے سال میں فاتحہ سے نساء تک کی تفسیر کی جاتی ہے اور ہفتہ میں نو گھنٹی اس کے لئے رکھی گئی ہے۔

ان تین سالوں میں خصوصی مطالعہ کے لئے بالترتیب تفسیر ابن کثیر، فتح القدیر، کشاف، مباحث فی علوم القرآن (مناع قطان) الفوز الکبیر، مناہل العرفان، دلائل النظام فراہی، الاتقان، اسالیب القرآن، فراہی نصاب میں شامل ہے۔

اس ادارے کے نصابِ تعلیم میں تحفیظ قرآن کے لئے ستائش اور قابل قدر کوشش کی گئی ہے، ایک معیاری اور آئیڈیل نصاب مرتب کیا گیا ہے، دیگر مدارس کو بھی اس سمت میں پیش رفت کرنا چاہئے، تجوید کی حالت یہاں بھی باعث تشویش ہے؛ لیکن مدرسہ اصلاح کی بہ نسبت قدرے غنیمت ہے اور ذمہ دارانِ جامعہ کو اس کمی کا احساس ہے اور اس کی تلافی کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اللہ کرے ان کی کوشش بارآور ہو، قرآن فہمی کے اعتبار سے بھی یہاں کا نصاب قدرے معیاری اور طریقۂ تدریس لائق ستائش ہے، معقول اور منقول دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی وجہ سے طلباء میں قرآن کا ذوق اور اس سے شغف پیدا ہوتا ہے؛ البتہ اس اعتبار سے کمی محسوس ہوتی ہے کہ عالمیت؛ بلکہ فضیلت تک کے نصاب میں پورے قرآن کی تفسیر کا کوئی نظم نہیں ہے؛ حالاں کہ عام طور پر طلباء عالمیت کے بعد عصری جامعات کا رُخ کرتے ہیں، اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ عالمیت تک لغت اور نحو وصرف کی ضروری چیزوں پر اکتفاء کرتے ہوئے ضروری تشریحات کے ساتھ پورے قرآن پر نظر ہو جائے۔

عمومی جائزہ

تدریس قرآن کے تجویدی پہلو پر دیوبند، ندوہ، سلفیہ اور اشرفیہ میں ایک متوازن نصاب ترتیب دینے کی قابل قدر کوشش کی گئی ہے، فلاح میں قدرے اس کی رعایت کی گئی ہے تو ''اصلاح'' میں بالکل نہیں، تحفیظ کے پہلو سے بھی اصلاح بالکل صفر ہے؛ جب کہ فلاح نے اس سلسلہ میں اچھی پیش رفت کی ہے، دیوبند، ندوہ، اشرفیہ کے نصاب میں اس سلسلہ میں کمی محسوس ہوتی ہے، سلفیہ کا نصاب قدرے غنیمت؛ البتہ توجہ کی ضرورت ہے۔

قرآن فہمی کے لئے اصلاح اور فلاح کے علاوہ دیگر مدارس میں، نحوی، صرفی مشکلات اور حل لغات کے ساتھ رواں ترجمہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے، جس کا طریقہ محاضراتی ہوتا ہے، استاذ اپنے مطالعہ کا نچوڑ طلباء کے سامنے رکھ دیتا ہے اور طلباء کسی جلسہ کے سامعین کی طرح اسے سن لیتے ہیں، تدریس کے عمل میں ان کی عدم شمولیت کی وجہ سے ان میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اس طریقۂ تدریس کے بعد دیوبند میں ''جلالین'' کے پڑھانے پر اکتفاء کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ علامہ سیوطیؒ کے بارے میں اہل علم جانتے ہیں کہ وہ زود نویس تھے، جس کی وجہ سے ان کی کتابوں میں تحقیق و تدقیق نہیں پائی جاتی — جلالین کے بارے میں خود انھوں نے لکھا ہے کہ اسے چالیس دن میں مکمل کرلیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ غور وفکر اور تحقیق کا جو حق ہے وہ ادا نہیں کیا گیا، یہی حال ان کے استاذ علامہ محلی کا بھی ہے، ان کی تحریروں میں بھی تحقیق کی کمی محسوس ہوتی ہے — اور اس کے ساتھ ہی یہ تفسیر حد درجہ مختصر ہے، کہا جاتا ہے کہ تفسیر اور قرآن کے الفاظ تقریباً برابر ہیں، اس لئے اپنی کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے کتاب تفسیر کے تقاضے پورے نہیں کرتی۔

ندوہ، اشرفیہ اور سلفیہ میں رواں ترجمہ اور ہلکی پھلکی تشریح کے بعد بعض تفسیروں کو پڑھایا یا مطالعہ کرایا جاتا ہے، جو قدیم ہونے کی وجہ سے جدید تقاضوں کا کوئی حل پیش نہیں کرتیں اور ضخیم ہونے کی وجہ سے پوری کتاب پر نظر نہیں ہو پاتی۔

فلاح اور اصلاح میں کسی تفسیر کی مدد کے بغیر براہ راست قرآن سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس عمل میں طلباء کو بھی شریک کیا جاتا ہے، یہ ایک مفید اور بہتر طریقہ ہے؛ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کی تفسیر کے مسلمہ اُصولوں کی پابندی کی جائے اور استاذ کسی خاص مکتبہ فکر کا نمائندہ نہ ہو، نیز وہ تحقیق اور مطالعہ کا ذوق رکھتا ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ اپنے نقطۂ نظر کی کسی تفسیری کتاب کے مطالعہ پر اکتفاء کرے گا اور انفرادیت اور پسندیدہ شخصیت کی نمائندگی کے شوق میں اور قرآن کے مسلمہ اُصولوں کو نظر انداز کردینے کی وجہ سے قرآن کو بازیچہ اطفال بنالینے کا خطرہ ہے، اسی طرح کے لوگوں کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا :

ز اجتہاد عالمان کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
اجتہاد اندر زمان انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط

اُصولِ تفسیر کے لئے عام طور پر مدارس میں ''الفوز الکبیر'' داخل ہے، یہ کتاب بہت وقیع، قیمتی اور معلوماتی ہے؛ لیکن اُصولِ تفسیر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اُصول حدیث اور فقہ کی طرح کوئی جامع کتاب داخل کی جائے، فہد الرومی کی کتاب ''اُصول التفسیر ومناھجہ'' ایک جامع اور مفید کتاب ہے، اسے نصاب میں داخل کیا جانا چاہئے۔

اصلاح کے نصاب میں علامہ فراہی کی کتاب مفردات القرآن اور اسالیب القرآن داخل ہے، جن کا براہ راست اُصولِ قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی حیثیت کسی مرتب کتاب کی نہیں؛ بلکہ اشارات وافادات کی ہے، جن میں بعض اُصولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دیوبند اور اصلاح میں فضیلت تک، ندوہ، سلفیہ اور فلاح میں عالمیت تک ''علوم القرآن'' پر کوئی کتاب موجود نہیں ہے، جو ایک بہت بڑی کمی ہے، اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، اسی طرح قرآن میں مذکور جگہوں اور ملکوں کے جغرافیہ پر بھی کوئی کتاب داخل نصاب نہیں ہے اور نہ ہی درس میں اس کی طرف توجہ دی جاتی ہے؛ حالاں کہ قرآن فہمی میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے، اس لئے اس کمی کی تلافی کی ضرورت ہے۔

تجاویز اور مشورے

قرآن حکیم ایک زندہ و جاوید کتاب ہے اور زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے، قرآن مجید کی تدریس میں اس کا لحاظ رکھا جانا بہت ضروری ہے، الفاظ قرآنی کی تشریح کے ساتھ دورِ حاضر کے تقاضوں اور چیلنجوں اور مسائل کا حل کرنا ضروری ہے، قرآن کا درس اس انداز سے ہونا چاہئے کہ وہ ہماری زندگی میں شامل ہو جائے اور ہر مسئلہ کے حل کے لئے اسی کی طرف رُجوع کیا جائے، اس سے ایسا شغف اور شعوری تعلق پیدا ہو جائے کہ ہر قدم اسی کی روشنی میں اُٹھے اس کے لئے درج ذیل طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

۱- ابتداء ہی سے صحت مخارج اور تجوید کی رعایت کرتے ہوئے قرآن مجید کی تعلیم دی جائے اور ابتدائی ثانوی و عالمیت کے درجات میں اس کے لئے ایک گھنٹی خاص کی جائے، جس میں تجوید اور وقف کے قواعد پڑھائے جائیں اور حدر کے ساتھ پورا قرآن پڑھایا جائے۔

۲- ابتدائی سے فضیلت تک حفظ قرآن کا اہتمام کیا جائے اور اس کے لئے ایک معیاری نصاب مرتب کیا جائے۔

۳- بچے کے ہاتھ میں مترجم قرآن دیا جائے اور ناظرہ کے ساتھ ترجمہ بھی پڑھایا جائے؛ تاکہ شروع ہی سے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ یہ سمجھ کر پڑھنے کی کتاب ہے۔

۴- کسی تفسیری کتاب کا سہارا لئے بغیر براہ راست قرآن سمجھنے اور سمجھانے کی کوش کی جائے اور تدریس کے عمل میں طلباء کو بھی شامل کیا جائے، لکچر اور محاضرہ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے —— براہ راست سے مراد یہ ہے کہ تفسیر کی کوئی کتاب پڑھانے کے بجائے قرآن مجید کو خود قرآن حکیم، حدیث صحیح، آثارِ صحابہ و تابعین، لغات عرب، عقل سلیم (رائے محمود) اور نظم قرآن کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کی جائے اور علم اسبابِ النزول، علم ناسخ و منسوخ، علم غریب القرآن جیسے معاون علوم سے مدد لی جائے، اس طرح تفسیر کرتے ہوئے تین سال کی مدت میں پورے قرآن مجید کو پڑھا دیا جائے۔

۵- فضیلت کے درجات میں مشہور اور مستند تفسیروں کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے۔

۶- تدریس کا طریقہ تحقیقی، تطبیقی اور استنباطی ہو۔

۷- عالمیت کے درجات میں اُصولِ تفسیر سے متعلق جامع کتاب نصاب میں شامل کی جائے اور علوم القرآن کی مختصر اور آسان کتابیں پڑھائی جائیں، نیز قرآن میں مذکور جگہوں اور ملکوں کے جغرافیہ سے بھی باخبر کیا جائے، فضیلت کے درجات میں اُصول تفسیر اور علوم قرآن سے متعلق تفصیلی کتابیں نصاب میں داخل کی جائیں۔

۸- قرآن مجید کے لئے گھنٹوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، ہفتہ میں کم از کم نو گھنٹی اس کے لئے رکھی جائے اور فضیلت کے آخری سال تک قرآن مجید کی تفسیر کرائی جائے۔

۹- علم تفسیر کے لئے ماہرین تیار کئے جائیں، ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، حدیث کے استاذ سے زیادہ انھیں عزت واحترام دیا جائے۔

۱۰- استاذ و طالب دونوں کو قرآنی تعلیمات کا پیکر ہونا چاہئے، قرآن پڑھنے کے ساتھ اس کے سانچے میں خود کو ڈھالنا بھی چاہئے کہ یہی اصل مقصد ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو قرآن ان پر لعنت کرتا ہے: ''رب قارئ یقراء القرآن و القرآن یلعنه ''(۱) شارحین کہتے ہیں کہ اس سے مراد بے عمل قاری یا غلط قرآن پڑھنے والا ہے۔

⊙ ⊙ ⊙

(۱) مسند احمدؒ۔

مدارس کے نصاب میں شامل
اُصولِ تفسیر اور علومِ قرآن کی کتابیں

مولانا عبید اللہ اسعدی ⊙

ہمارے دینی مدارس جو ایک مکمل نظام اور جامع مقصد کے تحت کام کرتے ہیں، جن کا حاصل یہ رہا کہ اُمت کو واقعی و حقیقی نائبین انبیاء علیہم السلام اور وارثین رسول اکرم ﷺ کا مقام و شان رکھنے والے فراہم کیے جاسکیں، جو اُمت کو ہر زمان و مکان میں درپیش مسائل و مشاکل بالخصوص جو عصری خصوصیات کے حامل ہوں ان کو حل کرسکیں، اور ان کے لئے کتاب و سنت اور ان کی روح کے مطابق رہنمائی دے سکیں، جس کے لئے ظاہر ہے کہ ضرورت اس کی ہے کہ کتاب و سنت کو پورے طور پر اور صحیح طور پر سمجھا جائے۔

اس کے لئے ایک ترتیب و تدریج کے ساتھ پڑھا پڑھایا جانے والا نصاب و نظام درکار ہے، جس کے تحت عربیت و شریعت سے متعلق متعدد علوم پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، نصاب میں شامل وہ علوم شریعت جو بنیادی و اساسی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں اُصولِ فقہ و اُصولِ حدیث کے ساتھ ایک علم و فن اُصولِ تفسیر کا بھی ہے، جس کو ''علوم القرآن'' کے نام و عنوان سے بھی ذکر کیا جاتا ہے، جیسے کہ علم اُصولِ حدیث کو علوم حدیث و مصطلح الحدیث وغیرہ کا عنوان دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مروج نصاب و نظام میں بھی اس علم و فن کو اہمیت دی گئی اور اس کو شامل رکھا گیا ہے اور عالمیت و فضیلت کے نصاب میں عموماً اور تفسیر و علوم قرآن سے متعلق تخصصات کے نصاب میں خصوصاً اس فن کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

اگر چہ اظہار حقیقت کے طور پر —— معذرت کے ساتھ —— یہ کہنے پر آدمی مجبور ہے کہ اصل نصاب و تخصص دونوں مراحل میں اس کے فن کا بہت تھوڑا ہی حصہ شامل ہے، جس کو دیکھتے ہوئے اہمیت کے باوجود بے اعتنائی کی بات کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

⊙ شیخ الحدیث: جامعہ عربیہ، ہتھورا باندہ، یوپی۔

صورت یہ ہے کہ ہندوستان میں مروج عمومی نصاب میں خواہ کسی نام وعنوان سے ہو، ایک ہی کتاب شامل ہے اور وہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کا رسالہ جو ''الفوز الکبیر'' کے نام سے معروف ومشہور ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے لئے مستقل گھنٹہ عموماً نہیں ہوتا؛ بلکہ جلالین کے کسی حصے کے ساتھ اس کو جوڑا جاتا ہے اور جمعرات یا جمعہ کے حساب ونظام سے اس کو پڑھایا جاتا ہے، اس طرح ایک چیز اور وہ بھی ضمنی در ضمنی ہوکر ایسی ہو جاتی ہے کہ طلباء کو اس فن کی نسبت سے کوئی خاص بات ومعلومات کا حصول نہیں ہوتا، اسی طرح اُصولِ حدیث کے ساتھ بھی بڑی اعتنائی برتی جارہی ہے، اس کے لئے صرف نخبہ ونزھہ پڑھائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے طلباء کو اس فن سے بھی کوئی خاص مناسبت نہیں ہوتی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح اُصولِ فقہ کو باقاعدہ وقت دیا جاتا ہے اور اس کی کتابوں کو مستقل گھنٹوں میں پڑھایا جاتا ہے، اسی طرح اس علم وفن کے لئے بھی اہتمام ہونا چاہئے، ایک ہی کتاب ہو، مگر اس کے لئے اہتمام سے وقت وگھنٹے کی تجویز ہو، اس کے بغیر نہ خاطر خواہ فائدہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی طلبہ کے دل میں فن کی واقعی حیثیت واہمیت آسکتی ہے۔

بہر حال ہمارے یہاں اس سلسلے کی سب سے معروف اور عام کتاب ''الفوز الکبیر'' ہے جو مصنف کی عظمت کے مطابق ایک خاص شان کی حامل ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات ہندوستان کے علمی حلقے کے لئے محتاجِ تعارف نہیں، حق تعالیٰ نے ان پر علوم ومعارف کے جو ذخائر کھولے ان میں قرآنیات کا ایک خاص مقام ہے، انھوں نے طلباء کو اس کا درس دینے کے ساتھ عوام کے لئے بھی درس کا آغاز کیا، جس کا سلسلہ باقاعدہ ان کی درسگاہ میں اور ان کی مسند پر ان کے آخری جانشین شاہ محمد اسحاقؒ کی ہجرت تک جاری رہا اور اسی سے دہلی میں پھیلا اور پھر ملک میں عام ہوا، اور ساتھ ہی عوام کے لئے ترجمہ کی تحریر وتصنیف کا بھی سلسلہ شروع کیا، خود انھوں نے ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے بزبان فارسی مختصر تشریح کے ساتھ ترجمہ تیار کیا اور ان کے اخلاف نے اس کام کو اُردو میں کرنے کا بیڑہ اُٹھایا جو بعد میں ہونے والے معتبر کاموں کی اساس وبنیاد قرار پایا۔

شاہ صاحب نے ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اور اپنے خاص مجددانہ ومجتہدانہ ذوق کے مطابق اُصولِ تفسیر وعلوم قرآن پر بھی ایک رسالہ لکھا؛ تاکہ فہم قرآن سے دلچسپی رکھنے والے اس سے مستفید ہوسکیں۔

یہ رسالہ اصلاً فارسی میں ہے اور ابتداءً اس کی فارسی میں ہی اشاعت ہوئی ہے؛ مگر اس کی فارسی زبان شاہ صاحب کے اس معمول کے مطابق ہے، جس کو انھوں نے اپنی کئی تصانیف میں اختیار کیا ہے کہ فارسی کے ساتھ

حسبِ موقع عربی زبان اور لمبی لمبی عبارتیں آئی ہیں؛ بلکہ کتاب کا پانچواں باب پورا ہی عربی زبان میں ہے، احقر کے سامنے ایک فارسی نسخہ ہے، جس کی اشاعت ۱۲۴۸ھ میں ہگلی (کلکتہ بنگال) سے ہوئی، جو درمیانی سائز کے ۹۲ صفحات پر مشتمل ہے اور بظاہر یہ اس کی اولین اشاعت ہے، ایک دوسرا نسخہ دہلی کا طبع شدہ ہے —— یہی نسخہ عربی ترجمہ اور ایڈیشن کے بالمقابل زیادہ مشہور ہے، عربی ترجمہ وایڈیشن سے، عربی میں اس کا پہلا ترجمہ کہئے یا اصل، اس کی نسبت ایک عرب شامی عالم منیر دمشقی کی طرف کی جاتی ہے اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ صرف نسبت ہے، درحقیقت یہ ترجمہ کسی ہندوستانی عالم کا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ سے بھی ایسا نقل کیا جاتا ہے اور اس بابت مزید معلومات کے تحت خیال یہ ہے کہ یہ شیخ محسن بن یحییٰ ترہٹی کا کیا ہوا ترجمہ ہے اور یہی ترجمہ عموماً ہندوپاک میں مروج رہا ہے، جس کی اشاعت لیتھو پر ہوتی رہی اور بعد میں کمپیوٹر ٹائپ پر بھی ہوئی؛ البتہ اس میں اصل مطابقت میں کچھ کمی کا احساس کر کے مولانا محمد سلمان صاحب ندوی نے اور بعد میں مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری نے اصلاح و درستگی کا کام کیا ہے، مفتی سعید صاحب نے اس کی عربی میں اور ان کے برادر محترم مفتی محمد امین صاحب نے اُردو میں اس کی شرح لکھی ہے، مولانا سلمان صاحب کے نسخہ وترجمہ کی اشاعت بیرونِ ہند بھی ہوئی ہے؛ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ بلادِ عرب میں اس کا تعارف ہوا ہے، اُردو میں اس کا ایک ترجمہ بہت پہلے مکتبہ برہان دہلی سے بھی شائع ہوا ہے، جس کے مصنف کی حیثیت سے مولانا رشید احمد صاحب انصاری کا نام لکھا گیا ہے، اُردو وعربی میں ان کاموں کے علاوہ بھی کچھ کام ہوا ہے۔

شاہ صاحب نے یہ رسالہ قرآن فہمی میں سہولت اور کمال پیدا کرنے کی غرض سے بالخصوص طلباء کے لئے تحریر فرمایا اور اس کو پانچ ابواب میں رکھا؛ لیکن تحریر میں اس کو یوں دو حصوں میں کردیا کہ اولین چار ابواب کو ایک حصہ میں رکھا، جس میں اصلاً فارسی زبان کا اور حسبِ موقع عربی زبان کا استعمال فرمایا اور پانچواں باب مکمل عربی میں ہے اور اس میں غرائبِ قرآن و اسبابِ نزول کا مختصراً از اول تا آخر بیان ہے اور شاہ صاحب نے اس حصے کو مستقل حیثیت یوں بھی دی ہے کہ اس کا نام ''فتح الخبیر'' تجویز کیا ہے؛ جب کہ اصل رسالہ کا نام ''الفوز الکبیر'' خود ہی رکھتا ہے اور فرق و تقسیم کا یوں بھی لحاظ فرمایا کہ پانچویں باب کا الگ سے ایک مقدمہ تحریر فرمایا اور اس کو ایک مستقل ومفید رسالہ بنایا؛ جب کہ باب چہارم کے اواخر سے اختتام کا احساس ہوتا ہے۔

فارسی اشاعت یعنی اصل اشاعت تو مکمل پانچوں ابواب کی ہوتی رہی، جیسا کہ احقر کے سامنے موجود دونوں نسخوں میں ہے؛ البتہ عربی ترجمہ کی اشاعت اور رواج ونصاب میں یہ حصہ شامل نہیں رہا اور نہ مترجمین وشراح نے لیا ہے؛ بلکہ عربی ترجمہ میں اولین مترجم نے چوتھے باب کی آخری فصل کو بھی شامل نہیں کیا، جس میں حروف

مقطعات کو موضوع بنایا گیا ہے، یہ ترجمہ بعد میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے کیا، جس کو بعض حضرات نے اشاعت میں شامل کیا اور بعض نے نہیں؛ بلکہ برہان کے اُردو ترجمہ میں یہ شامل نہیں ہے، نہ مفتی امین پالن پوری کی اُردو شرح میں، مفتی سعید صاحب پالن پوری نے بھی اپنے نسخہ میں اس کو شامل نہیں کیا ہے؛ البتہ عربی شرح میں انھوں نے اس کو شامل کیا ہے۔

اور پانچویں باب کو کسی مترجم یا شارح نے اپنے کام میں شامل نہیں کیا ہے، اس طرح گویا اس وقت اس کتاب کی جو اشاعت ہو رہی ہے، ایک طویل عرصہ سے وہ صرف چار ابواب میں محدود ہے اور پانچویں کو اس طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔

کتاب سے متعلق خدمات میں جو مختلف چیزیں میرے سامنے ہیں، افسوس کہ ان میں سے کسی میں کتاب کا مکمل تعارف نہیں آیا ہے، ضرورت ہے کہ کتاب کو ایک مکمل تعارف کے ساتھ اور جملہ ابواب کے ساتھ شائع کیا جائے، یہ اس وقت علوم ولی اللہی میں سے ایک وقیع علم کی اشاعت وخدمت ہوگی۔ ویرحم الله عبداً قال آمينا .

نصاب میں شامل دوسری کتاب جو بعض اداروں میں تخصص کے مرحلے میں اور بعض میں اس سے قبل زیر درس رہتی ہے، وہ علامہ سیوطیؒ کی ''الاتقان'' ہے، علامہ سیوطیؒ نویں دسویں صدی ہجری کے ان علماءِ اسلام میں ہیں، جنھوں نے اپنی تصانیف کے واسطے سے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی اور تفسیر میں جلالین کی طرح یہ کتاب یعنی ''الاتقان'' جو کہ اُصولِ تفسیر سے متعلق ہے اور اس کا پورا نام ہی ہے ''الاتقان فی علوم القرآن'' اس کی قدیم اشاعت دو حصوں میں مگر ایک ہی جلد میں اور بعض دوسری کتابوں کے ساتھ ہوتی رہی ادھر اس کا ایک تحقیقی نسخہ چار جلدوں میں آیا ہے، جس پر تحقیق وتعلیق کا کام محمد ابوالفضل ابراہیم نے کیا ہے، جس کو شرکۃ ابناءِ شریف الانصاری نے اور قطر کی وزارۃ الاوقاف نے شائع کیا ہے، قطر کی اشاعت بڑے عمدہ کاغذ وجلد میں ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے اس کتاب کو بڑے اہتمام اور اشتیاق واستخارہ کے بعد ترتیب دیا ہے، کتاب کے آغاز میں تالیف کی تفصیل، بنیادی موضوعات —— جن کو انواع کا عنوان دیا ہے اور کل اسّی انواع ہیں اور ضمنی تو بہت ہیں —— کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی کتاب کے محتویات ومندرجات کے مآخذ کا بھی تذکرہ کیا ہے، جو مختلف علوم وفنون سے تعلق رکھتی ہیں اور واقعی یہ ایک نہایت جامع تالیف ہے، اس طرح مؤلف یعنی امام سیوطیؒ نے اپنی اس کاوش کے حق میں جو فرمایا ہے بیجا نہیں کہا :

(الكتب السابقة التي ذكرها تمثيلا) بالنسبة إلى نوع من هذا الكتاب
كحبة رمل في جنب رمل عالج ، ونقطة قطر في حيال بحر زاخر .

یہ دو کتابیں تو جیسا کہ ذکر کیا گیا، عمومی طور پر رائج رہی ہیں، ان کے علاوہ بعض دوسری کتابوں کی تدریس کا بھی سلسلہ رہا ہے، جن میں نئی کتابوں میں ڈاکٹر مناع قطان کی ''علوم القرآن'' ہے جو متوسط درجہ کی اور مفید مباحث پر مشتمل کتاب ہے، اس میں فن کے ضروری چند پہلو لئے گئے ہیں، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ادھر چند دہائیوں میں منظر عام پر آنے والی کتابوں میں کافی عمدہ اور اہمیت کی حامل ہے۔

ایسے ہی ''مناہل العرفان فی علوم القرآن'' ہے جو محمد عبدالعظیم الزرقانی کی تصنیف ہے اور دو حصوں میں ہے اور یہ بھی منتخب موضوعات تحقیقی گفتگو پر مشتمل ہے، بالخصوص تفسیر و علوم قرآن کے بڑے اہم و معروف مسئلہ سبعۃ احرف پر اس میں بڑی منقح اور تحقیقی بحث ہے۔

اس فن سے متعلق چودہویں صدی ہجری کی مفید و مختصر کتابوں میں تلخیص الاتقان بھی ہے، یہ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے نائب امیر شریعت اور وقت کے مایہ ناز فاضل و محقق مولانا عبدالصمد رحمانی علیہ الرحمہ کی ہے، جس میں علامہ سیوطی کی مبسوط کتاب الاتقان کے ضروری و اہم مباحث کو ملخص کر کے مفید انداز میں پیش کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ الاتقان تو ایک تفصیلی چیز ہے، اس کی نسبت سے نصاب میں اس کتاب سے استفادہ زیادہ مناسب و مفید ہے۔

احقر نے دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی عہد میں دورۂ حدیث کے بعد تکمیل دینیات سے استفادہ کیا اس وقت اس شعبۂ تخصص میں یہ کتاب بھی شامل تھی۔

یہ فن اُصولِ تفسیر و علوم قرآن سے متعلق نصابیات کی بابت ایک مختصر جائزہ و تعارف ہے، جس کے تحت یہ تاثر بھی شامل ہے کہ یہ فن ہمارے اصل نصاب (یعنی عالمیت وفضیلت کے نصاب) میں اور مرحلۂ تخصص دونوں میں توجہ وعنایت کا طالب ہے، بالخصوص اصل مروج نصاب میں؛ تاکہ ہمارے مدارس کے فضلاء کو اس فن سے متعلق مناسب واقفیت ہو اور وہ مقصد کے مطابق اس سے مستفید ہوں اور قرآن فہمی میں فائدہ اُٹھائیں۔

⊙ ⊙ ⊙

اُصولِ تفسیر کا نصاب — ایک جائزہ

مولانا محمد عارف باللہ قاسمی ⊙

علمِ تفسیر کی اہمیت وفضیلت

علمِ تفسیر علومِ اسلامیہ میں افضل اور اعلیٰ علم ہے؛ یہ وہ علم ہے جس کا کلامِ الٰہی سے تمام علوم کے بالمقابل سب سے زیادہ گہرا تعلق ہے، اسی کے ذریعہ قرآن کا صحیح فہم حاصل ہوتا ہے اور یہ علم اپنے وابستگان کو مرضی رب سے واقف کراکر کبھی نہ فنا ہونے والی سعادت حقیقی کا مستحق بناتا ہے، اس علم کی فضیلت کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کا موضوع کلام اللہ ہے اور کلام اللہ کے صحیح مفہوم ومراد سے واقفیت حاصل کرکے مرضی رب کو پانا اور پھر دائمی سعادت سے ہمکنار ہونا اس کی غرض وغایت ہے اور یہ انسان کی دینی اور دنیوی کمال کا ایسا زینہ جس کے بغیر کمال کی منزل تک رسائی نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ کوئی کمال علومِ شرعیہ اور دینی معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اور علومِ شرعیہ اور دینی معرفت کتاب اللہ کے علم کے بغیر ناممکن ہے اور کتاب اللہ کا صحیح علم علمِ تفسیر کے بغیر نہیں ہوسکتا، اسی لئے اس علم کی طرف سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے توجہ مبذول کی اور اس طرح اس علم کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ شخصیت اس کی موجد بنی، جن پر یہ کلامِ والٰہی نازل ہوا؛ بلکہ قرآن کریم سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ خود اللہ نے اپنے کلام کی تفسیر وتوضیح کو رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلاً ثَقِيلاً''۔ (المزمل:۵)

مفسرین اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کلام الٰہی کے معانی ومفاہیم اور ان پر عمل کرنا ہے۔

نیز اس علم کی فضیلت یہ ہے کہ یہ علم علومِ مقصودہ میں سے ہے اور اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں اس سے وابستگی اور اس کے حصول کا حکم دیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: '' أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا''۔ (سورۂ محمد:۲۴)

اسی لئے صحابہ کرام ﷺ میں اس علم کے حصول کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ حفظ کلام اللہ کے ساتھ اس کے

⊙ استاذ: جامعہ عائشہ نسوان، حیدرآباد۔

معانی و مطالب کے بحر عمیق کی غواصی کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور جب تک اس کے معانی و مفاہیم کا صحیح ادراک نہ ہو جاتا اس کی طلب وجستجو میں لگے رہتے اور آگے نہ بڑھتے ،حضرت زید بن خالد ﷺ فرماتے ہیں :

حدثنا من كان يقرئنا من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم أنهم كانوا يقترئون من رسول الله صلى الله عليه وسلم عشر آيات ، فلا يأخذون في العشر الأخرى حتى يعلموا ما في هذه من العلم والعمل .

اسی طرح امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ آٹھ سال تک سورۂ بقرہ کا علم حاصل کرتے رہے ،ظاہر ہے کہ صرف سورۂ بقرہ میں اتنا طویل لگنے کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ اس کی آیتوں کے الفاظ میں چھپے ہوئے معانی و مطالب کی تہہ میں اُترتے ہوئے اس کو سیکھ رہے تھے ،ورنہ صرف عربی عبارت کو تو سیکھنے کی انھیں ضرورت ہی نہیں تھی ؛ کیوں کہ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ،پھر صحابہ کرام ﷺ کی طرح تابعین اور تبع تابعین اور بعد کے محدثین وفقہاء اور مفسرین نے بھی اس علم سے اپنی وابستگی رکھی اور کلام اللہ کے صحیح فہم کی خاطر انھوں نے اس علم کے حصول میں اپنی محنتوں کو صرف کیا اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کی یہ علمی وراثت قرآن کریم کے ساتھ ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتی رہی اور انشاء اللہ قیامت تک منتقل ہوتی رہے گی۔

علوم القرآن اور علم اُصولِ تفسیر

علم تفسیر کی اس اہمیت کی وجہ سے اس علم میں معاون و مددگار علم ،علوم القرآن اور علم اُصولِ تفسیر کی تدوین عمل میں آئی ہے ؛ تاکہ میدان علم تفسیر کی بادیہ پیمائی کرنے والا اس کی مدد سے صحیح راہ پر قائم رہتے ہوئے اصل مقصود اور مراد الٰہی تک پہنچ سکے ،عہد نبوی اور عہد صحابہ ﷺ اور تابعین میں تو اس معاون علم کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ؛البتہ تیسری صدی ہجری میں اس علم کے بعض مباحث پر تالیف وتدوین کا کام ہوا ؛ چنانچہ امام بخاری علیہ الرحمہ کے استاذ علی ابن مدینی علیہ الرحمہ نے اسباب نزول کے موضوع پر کتاب لکھی اور ابوعبید قاسم بن سلامؒ نے ناسخ اور منسوخ کو اپنا موضوع بنایا ، یہ دونوں حضرات تیسری صدی ہجری کے ہیں اور چوتھی صدی ہجری میں علامہ ابوبکر بجستانیؒ نے ''غریب القرآن'' کے موضوع پر کتاب لکھی ، پانچویں صدی ہجری کے ایک بڑے عالم علامہ علی بن ابراہیم بن سعید صوفیؒ نے علوم قرآن پر ایک کتاب ''البرہان فی علوم القرآن'' تیس جلدوں میں تحریر کی ،جن میں سے صرف پندرہ جلدیں دارالکتب العلمیہ مصر میں مخطوطے کی شکل میں موجود بتائی جاتی ہیں ،ابن حزم اندلسیؒ بھی پانچویں صدی کے ہیں ،انھوں نے بھی ناسخ اور منسوخ کے موضوع پر ''الناسخ والمنسوخ'' نامی کتاب لکھی ؛ بلکہ ناسخ اور منسوخ کے موضوع پر سب سے پہلے کتاب ''الناسخ والمنسوخ في كتاب الله تعالى'' بتائی جاتی ہے ،جو کہ حضرت قتادہ بن دعامہ

سدوسی (م: ۱۱۹) سے منقول ہے، اس کتاب کا مخطوطہ دار الکتب الظاہریہ میں موجود ہے، جہاں سے نقل کر کے یعسوب نامی ویب سائٹ نے اس کو عام کیا ہے، اسی صدی میں علامہ ابوالحسن علی بن احمد نیسا پوری نے اسبابِ النزول کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی، چھٹی صدی میں علامہ ابوالقاسم عبد الرحمٰن نے ''مبہمات القرآن'' کو موضوع تالیف بنایا اور علامہ ابن الجوزیؒ نے ''المصفی بأکف أھل الرسوخ من علم الناسخ والمنسوخ '' کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو تقریباً ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، اسی طرح ساتویں صدی میں علامہ ابن عبد السلام نے ''مجاز القرآن'' کو اور علامہ علم الدین سخاویؒ نے تجوید و قرأت قرآنی کو موضوع تحریر بنایا اور اسی طرح ہر دور میں مختلف تصنیفات علومِ قرآن سے متعلق تحریر کی گئیں اور اس کی باریکیوں کو ان میں بیان کیا گیا اور تفسیر کی راہ کو آسان کر کے قرآن کے مطالب تک رسائی کو آسان کرنے کی کوشش کی گئی۔

بعد کے دور میں بھی اس اہم علم پر علماء نے تحریر و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور انھوں نے اپنی قیمتی تصنیفات کے ذریعہ کتاب اللہ کی خدمت کی سعی مقبول کی؛ چنانچہ آٹھویں صدی میں علامہ ابن تیمیہؒ نے ''مقدمہ فی اُصول التفسیر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی اور علامہ ابن القیم جوزیؒ نے ''الامثال فی القرآن'' کے نام سے ایک مختصر کتاب تحریر کی اور علامہ زرکشیؒ نے ''البرہان فی علوم القرآن'' لکھی، علامہ زرکشیؒ نے جملہ ۴۷؍ انواع میں اس کتاب کو تقسیم کر کے علوم القرآن کے تمام تر مباحث کو مفصل ذکر کیا ہے، اس کی اہمیت اور اس کی جامعیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد سے اس کو مرجع کی حیثیت حاصل ہے اور بعد کے مصنفین علوم القرآن بالخصوص علامہ سیوطیؒ وغیرہ نے اس کو سامنے رکھا ہے، یہ کتاب ۴ جلدوں پر مشتمل ہے، علامہ سیوطیؒ نے دسویں صدی میں ''الاتقان فی علوم القرآن'' کے نام سے مفصل کتاب تحریر کی، علامہ سیوطی کی یہ کتاب ایک مفصل کتاب ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، علامہ سیوطی نے اس کتاب کو ۸۰؍ انواع پر تقسیم کر کے تمام مضامین علومِ قرآن کو اس میں جمع کیا ہے اور ہر ایک موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، یہ کتاب اپنی سابقہ کتاب البرہان کی طرح مقبولیت کے مقام پر فائز ہے اور بعد کے مصنفین و معلمین کے لئے مرجع اور محور ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مختلف ادوار میں علوم القرآن کے تحت جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں، ان میں اُصول تفسیر کے تمام تر قواعد کے ذکر کا اہتمام نہیں کیا گیا؛ بلکہ اکثر کتابیں علوم القرآن کے عمومی مضامین پر یا ان میں سے کسی خاص موضوع سے متعلق لکھی گئیں؛ لیکن علوم القرآن کا ایک اہم شعبہ علم اُصول التفسیر، علم اُصول الحدیث اور علم اُصول الفقہ کے طرح جامعیت کے ساتھ مرتب نہ ہوسکا، مثلاً :

علامہ ابن تیمیہؒ کی ''مقدمہ فی اُصول التفسیر'' اس موضوع پر ایک قدیم ترین کتاب ہے؛ لیکن اس کتاب

میں فہم قرآن میں معاون بہت سے اُصول قواعد کے مذکور ہونے کے باوجود اُصولِ تفسیر کے سارے قواعد جمع نہیں ہیں، اس لئے کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس کتاب میں اس کا اہتمام ہی نہیں کیا؛ کیوں کہ انھوں نے اس کتاب کو اپنے ایک شاگرد کے سوالات کے جواب میں لکھی ہے، ہاں یہ حقیقت ہے کہ جن مضامین کو انھوں نے اس میں موضوع بنایا ہے، اس کو مدلل اور وافی وشافی تحریر کیا ہے، اس کتاب میں علامہ نے ابتداء اس بات کو محقق کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا سے رحلت فرمانے سے پہلے اپنے صحابہ سے قرآن کے الفاظ ومعانی مکمل بیان کردیئے اور صحابہ کی تعلیم براہ راست رسول اللہ ﷺ سے ہونے کی وجہ ان میں اختلاف بہت ہی کم تھا اور پھر تابعین پر بھی اس کا اثر پڑا اور ان میں بھی تفسیری اقوال میں بہت کم اختلاف ہوا، انھوں نے صحابہ اور تابعین کے اختلاف کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی واضح کیا کہ تفسیر کے سلسلہ میں ان سے منقول جو مختلف اقوال ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے سے متعارض نہیں ہیں اور ان کے درمیان اختلاف تعارض نہیں ہے؛ بلکہ وہ اختلاف تنوع ہے، ابن تیمیہؒ نے اس کتاب میں سبب نزول کی معرفت کی اہمیت کو ذکر کیا ہے اور بعض مصلحات حدیث پر بھی گفتگو کی ہے اور ان کو اپنا موضوع بنایا ہے اور مفسرین کے اختلاف میں ان مصطلحات کے اثرات کو واضح کیا ہے، اسی طرح انھوں نے معتزلہ کے تفاسیر پر بھی گفتگو کی ہے اور ان کے ان اعتقادی اُصولوں کو ذکر کیا ہے، جن پر انھوں نے اپنی تفسیروں کی بنیاد رکھی ہے اور اسی کے ساتھ روافض، فلاسفہ اور قرامطہ کے غلط نظریات اور رکیک تاویلات کو ذکر کرکے اس کی تردید کی ہے، پھر تفسیر کے طریقوں کو بیان کرتے ہوئے تفسیر القرآن بالقرآن، تفسیر القرآن بالسنۃ النبویۃ، تفسیر القرآن باقوال الصحابہ کے مباحث کو ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں صحابہ بالخصوص حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کا مقام ومرتبہ اور اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور پھر تفسیر بالرائی کی حرمت و مذمت کو بیان کرکے اس کے باطل ہونے کے سلسلے میں بہت سی روایات واقوال کو ذکر کیا ہے۔

درسِ نظامی اور ہندوپاک میں مروج نصابِ تعلیم میں زیرِدرس اُصولِ تفسیر اور علوم القرآن کی کتابیں

درسِ نظامی اور ہندوپاک کے مدارس میں مروج نصابِ تعلیم میں اُصول تفسیر کی ایک کتاب ''الفوزلکبیر فی اُصول التفسیر'' داخل نصاب ہے اور دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج پر قائم اداروں میں تکمیل اور اختصاص فی التفسیر کے شعبہ میں ''مناہل العرفان'' پڑھائی جاتی ہے، یہ کتاب چودہویں صدی کے بڑے متبحر عالم محمد عبدالعظیم زرقانیؒ کی تصنیف ہے، جو دو جلدوں پر مشتمل اپنے موضوع پر تفصیلی کتاب ہے، اس کتاب میں جملہ سترہ مباحث کے تحت علوم قرآن کے تمام انواع کو ذکر کیا گیا ہے اور اس کے اُصول وضوابط کو ذکر کیا گیا ہے، اس کتاب میں مصنف نے علم اُصول تفسیر کی تاریخ تدوین اور عہد بہ عہد اس کی تدریج کو ذکر کیا ہے، متکلمین و اُصولیین اور فقہاء کے نزدیک لفظ

قرآن کے مدلول کی قدیم علمی بحث کو اچھے پیرائے پر تحریر کیا ہے، علوم قرآن کے اقسام اور اس کے موضوع وغرض وغایت، نزولِ قرآن کے مفہوم کی تشریح، اس کیفیت ومدت اور ایک بارگی نزولِ کے بجائے تدریجی نزول کی حکمت، اسبابِ نزول اور سات لغات میں قرآن کے نزول کی تفصیل، اس کی حکمت اور اس حوالے سے پیدا کردہ شکوک وشبہات کے جواب، مکی اور مدنی اصطلاحات کی تفصیل اور اس کی معرفت کی اہمیت اور مکی ومدنی آیات کے انداز وترتیب کو بنیاد بنا کر اسلام دشمن افراد کے شکوک وشبہات کے مسکت جواب، جمع قرآن اور اس کی تفصیلی تاریخ، نسخ کی تفصیل، محکم ومتشابہ کی تفصیل، اُسلوب قرآنی اور اعجاز قرآنی کی عمدہ تشریح وتفصیل وغیرہ کو مصنف نے اس کتاب میں اپنا موضوع بنایا ہے اور تفصیل کے ساتھ علومِ قرآن کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔

یہ کتاب چوں کہ ایک مفصل کتاب ہے، اس لئے جن اداروں میں یہ داخل نصاب ہے، وہاں اس کے صرف چند ابواب کا درس دیا جاتا ہے، اس سے واضح نقصان یہ ہوتا ہے کہ تفصیلی کتاب کے چند مباحث سے واقفیت ساتھ بہت سے علوم القرآن کے مباحث اور اُصول تفسیر کے قواعد سے ناواقفیت ہی رہتی ہے۔

نیز بعض اداروں میں اختصاص فی التفسیر کی شعبہ میں علامہ ابن تیمیہ کی ''مقدمہ فی اُصول التفسیر'' بھی نصاب میں شامل ہے، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شعبۂ اختصاص فی التفسیر میں علامہ سیوطیؒ کی ''الاتقان فی علوم القرآن'' اور مناع القطان کی ''مباحث فی علوم القرآن'' کے منتخب ابواب پڑھاتے ہیں، مناع القطان کی یہ کتاب علوم القرآن کے چند مباحث پر مشتمل ہے، اس میں اسباب نزول، ناسخ منسوخ، محکم ومتشابہ، جمع قرآن اور احکام تجوید وغیرہ مضامین علوم القرآن پر بحث کی گئی ہے، یہ کتاب علوم القرآن کے مباحث اور اُصول تفسیر کے قواعد کو محیط نہیں ہے، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے شعبۂ اختصاص فی التفسیر میں مناہل العرفان کے منتخب ابواب کے ساتھ، علامہ سیوطیؒ کی ''الاتقان فی علوم القرآن'' اور ابن قیم جوزیؒ کی ''التبیان فی اقسام القرآن'' کی تعلیم دی جاتی ہے، اسی طرح دکتور فہد بن عبدالرحمٰن رومی کی تصنیف کردہ ''بحوث فی اُصول التفسیر ومناھجہ'' کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک نئی کتاب ہے اور مختصر ہونے کے ساتھ اُصولِ تفسیر کے تمام ابواب اور اس کے متعلقات کو محیط ہے، اس لئے تدریسی نقطۂ نظر سے انتہائی مفید ہے۔

زیر درس یہ چند کتابیں ہیں، ان میں سے اکثر اختصاص فی التفسیر کے شعبہ میں داخل نصاب ہیں؛ لیکن اختصاص کے شعبہ سے پہلے جو آٹھ سالہ یا سات سالہ نصابِ تعلیم جو اصل نصاب ہے، جس سے سارے ہی طلبہ مستفید ہوتے ہیں اس میں صرف اور صرف ''الفوز الکبیر'' ہے، ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیف ہے اور آپ کی انقلابی تجدیدی صلاحیت کا علمی شاہکار ہے، جسے حضرت شاہ صاحب نے

خواص اور اہل علم کے حلقہ میں تدبر قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے ذریعہ اُمت کی اصلاح کا جذبہ بیدار کرنے کی غرض سے لکھی ہے، یہ کتاب اگر چہ مختصر ہے؛ لیکن پوری کتاب سراسر نکات اور کلیات ہے اور در حقیقت ایک جلیل القدر عالم کی (جس کو فہم قرآن کے مشکلات کا علمی تجربہ ہے) ایک قیمتی اور نادر بیاض ہے، اس کتاب میں بعض بعض اُصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیئے ہیں، دوسری کتابوں کے سینکڑوں صفحات کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے ،حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں خود ہی اس کا اظہار فرمایا ہے۔

قرآن کے مضامین و مقاصد، اس کے طرز اُسلوب کی خصوصیت اور انسانی تالیفات خصوصاً متاخرین کی کتب درسیہ سے اس کے اختلاف و امتیاز اور شانِ نزول کے متعلق شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً ان کے نئے خیالات تھے؛ بلکہ شانِ نزول کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی تحقیق و تنقیح اتنی عمدہ ہے کہ اس سے قرآن کریم کا جمال جہاں آرا سامنے آجاتا ہے اور اس سے شانِ نزول کے سلسلہ میں روایات کی کثرت اور اس کے تعارض کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید میں جن فرقوں کی تردید کی گئی ہے، ان کے اصلی خیالات وعقائد اور کمزوریوں کا بیان، ان کی گمراہیوں کے حقیقی اسباب ،نفاق کی تشریح اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں پر اس کی تطبیق کو شاہ صاحب نے چند لفظوں میں جس وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ ان کا ایک انوکھا انداز ہے، جس سے بڑی بڑی کتابیں خالی ہیں۔

اسی طرح نسخ میں متقدمین و متاخرین کے اصطلاحی فرق کی توضیح ،ناسخ ومنسوخ آیات میں تطبیق اور صحابہ ؓ وتابعین کے تفسیری اختلافات کا حل ، نیز نحو کے مشہور اور ظاہری قواعد کی بعض آیات سے بظاہر عدمِ مطابقت کی مقبول توجیہ شاہ صاحب کی عمدہ تحقیقات میں سے ہے، یہ وہ چند خوبیاں ہیں ،جن کی وجہ سے یہ کتاب اُصول تفسیر کے عنوان کے تحت لکھی جانے والی کتابوں میں ممتاز ہے اور اُمت میں قبولیت کے مقام پر فائز ہے۔

مدارس کے نصاب کا جائزہ

اس فن سے متعلق یہ چند کتابیں عموماً مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں ، ان میں الفوز الکبیر کے علاوہ ساری کتابیں صرف اور صرف اختصاص کے شعبہ میں پڑھائی جاتی ہیں ،اختصاص کے شعبہ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد مدارس سے فارغ التحصیل فضلاء کے بالمقابل بہت ہی کم ہے ؛ بلکہ نہ کہ برابر ہے ،اس اعتبار سے دارالعلوم دیوبند میں فضیلت اور ندوۃ العلماء میں عالمیت تک کا نصاب ہی وہ نصاب ہے جس سے تمام طلبہ استفادہ کرتے ہیں اور اس نصاب میں صرف اور صرف الفوز الکبیر فی اُصول التفسیر داخل نصاب ہے اور یہی حال علم تفسیر کی تعلیم کا بھی

ہے کہ آٹھ سالہ یا سات سالہ نصاب میں تفسیر کی صرف اور صرف ایک کتاب جلالین پڑھائی جاتی ہے، وہ بھی اکثر اداروں میں صرف چند پاروں تک ہی تکمیل ہو پاتی ہے۔

اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ان کے نہج پر قائم اداروں کے مروجہ نصاب میں علم تفسیر اور اُصول تفسیر کی تعلیم پر توجہ بہت ہی کم مبذول کی جارہی ہے، ایک طرف نصاب میں دیگر غیر مقصود لذاتہ معاون علوم کی تعلیم کا یہ حال ہے کہ کئی سالوں تک اس فن کو متعدد کتابوں کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے، مثلاً علم نحو، علم صرف، عربی ادب اور علم منطق کی کتابیں ہمارے نصاب میں بڑی کثرت کے ساتھ موجود ہیں؛ تاکہ بار بار کے تکرار اور اختصار کے بعد تفصیل سے وہ فن ذہن میں اچھی طرح اُتر جائے اور اس میں اچھی مہارت حاصل ہو جائے، علم منطق ہی کو لیجئے عربی اول سے عربی پنجم تک تیسیر المنطق، مرقات، شرح تہذیب، قطبی اور سلم العلوم جملہ پانچ کتابیں نصاب میں موجود ہیں، علم نحو کی بھی تقریباً چار یا پانچ مختصر اور مفصل کتابیں نصاب میں شامل ہیں، جو ضروری ہیں، کچھ اسی طرح علم صرف بھی ہے، عربی ادب کی بھی تقریباً چھ سے زائد بلکہ بعض اداروں میں دس سے زائد کتابیں نصاب میں ہیں۔

اسی طرح دیگر علومِ اسلامیہ کی کتابیں بھی کم از کم دو تین ہیں؛ تاکہ تکرار سے اس میں اچھی صلاحیت پیدا ہو جائے؛ لیکن تمام علوم کے برخلاف اس اہم علم — علم اُصولِ تفسیر — کی تعلیم کے لئے صرف ایک مختصر کتاب ہے اور اس کو بھی صرف چند دنوں میں مکمل کرلیا جاتا ہے، ظاہری بات ہے کہ چند ماہ کی سرسری تعلیم اس علم کی صلاحیت اور مہارت سے ہمکنار نہیں کرسکتی، مزید یہ کہ موجودہ زمانہ کے طلبہ کی صلاحیت اور ذہانت کے لحاظ سے ''الفوز الکبیر'' اپنے موضوع پر ایک دقیق کتاب ہے، اس کتاب سے پہلے اُصول تفسیر کی کوئی مختصر اور آسان کتاب نہ پڑھے ہونے کی وجہ سے اس سے وہ فائدہ مکمل حاصل نہیں ہو پاتا، جو اس کتاب سے حاصل ہونا چاہئے تھا، اس لئے عموماً فضلاء کا یہ حال ہوتا ہے کہ مہارت تو درکنار وہ اُصول تفسیر کی بنیاد معلومات سے ناواقف ہوتے ہیں، ہاں اُصولِ فقہ اور اُصول حدیث کے مباحث میں اس کے جو مباحث ہیں وہ ان سے ضرور واقف ہوتے ہیں، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ عالمیت تک کے نصاب میں کم از کم علوم قرآن اور اُصولِ تفسیر کی دو تین کتابیں شامل کی جائیں اور الفوز الکبیر سے پہلے اس فن کی کوئی مختصر اور آسان کتاب ضرور پڑھائی جائے؛ تاکہ اس فن میں بھی طلبہ کو وہ صلاحیت پیدا ہو سکے جو دیگر فنون میں پیدا ہو جاتی ہے، نیز اختصاص کے شعبہ میں علوم القرآن کی مفصل کتابوں کے منتخب ابواب کے ساتھ کوئی ایسی کتاب بھی ضرور داخل نصاب ہو جس میں اختصار کے ساتھ تمام اُصولِ تفسیر موجود ہوں (جیسا کہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے نصاب میں ہے) اور نصاب میں پڑھانے کے لئے ایسی کتابیں منتخب کی جائیں جو مختصر ہونے

کے ساتھ جامع ہوں؛ تاکہ اس فن کے تمام مضامین پر نظر پڑ جائے، ورنہ مفصل کتابوں کے منتخب ابواب کے درس کی وجہ سے چند ابواب اور مباحث نظر سے اوجھل ہی رہ جاتے ہیں؛ جب کہ نصاب کی تعلیم ہی وہ تعلیم ہے، جس پر آئندہ کی علمی ترقی کی بنیاد پڑتی ہے؛ بلکہ مطالعہ سے بیزاری کے اس دور میں تو نصاب کی تعلیم ہی اصل سرمایہ ہے، نصاب میں اُصولِ تفسیر کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ کتابیں مفید ہوسکتی ہیں :

(۱) تفسیر القرآن الکریم أصوله وضوابطه، تالیف: علی بن سلیمان العبید۔

(۲) فصول فی أصول التفسیر، تالیف: مساعد بن سلیمان الطیار۔

(۳) بحوث فی أصول التفسیر ومناهجه، تالیف: فہد بن عبدالرحمٰن بن سلیمان رومی۔

(۴) المحرر فی علوم القرآن، تالیف: مساعد بن سلیمان الطیار۔

(۵) أصول التفسیر وقواعده، تالیف: الشیخ خالد عبدالرحمٰن (یہ کتاب قدرے مفصل ہے)۔

(۶) القواعد الحسان فی تفسیر القرآن، تالیف: عبدالرحمٰن بن سعدی۔

نیز حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہ کی کتاب علوم القرآن کو نصاب میں شامل کر کے اس کے مطالعہ کا لزوم اور پھر اس کا امتحان بھی اس میں مددگار ہوگا، نیز کسی خاص موقع پر محاضرہ کا اہتمام کیا جائے اور اُصولِ تفسیر کی تفصیل، علوم القرآن کی تدوین اور عہد بہ عہد اس کے تدریجی مراحل کی تفصیل، تفسیر میں مفسرین کے اختلاف اور اس کے اسباب کی تفصیل، مصادر تفسیر کی تفصیل، مناہج تفسیر کی توضیح اور اہم کتب تفسیر اور ان کے مصنفین کا تعارف اور تفسیر وعلوم القرآن کے دیگر اہم گوشوں کو اس محاضرہ میں پیش کیا جائے، اس سے بھی طلبہ اس اہم اور مطلوب علم سے اچھی طرح واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم اور اس کے معانی ومطالب کے بحر عمیق کی تہہ تک ہم طالب علموں کی رسائی آسان کرے اور اس پروگرام کو منعقد کر کے ایک اہم مسئلہ کی طرف ہم سبھوں کو متوجہ کرنے پر اللہ تعالیٰ ہمارے مربی ومحسن حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ اور اس پروگرام کے انعقاد میں ان معاونین کو اپنے شایانِ شان اجر عظیم عطا فرمائے اور اس سیمینار کو قبولیت عطا فرمائے۔ آمین

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین .

⊙ ⊙ ⊙

تخصص فی القرآن کا نصاب — جائزہ اور تجویز

مولانا محمد علاء الدین ندوی ⊙

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہشیار ہوگا

نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم کی چوں کہ کوئی منصوص شرعی حیثیت نہیں ہے، اس لئے ہر دور کے تقاضے اور ضروریات کے لحاظ سے ان میں اصلاح وتغیر کا عمل ہونا ہی چاہئے؛ لیکن تعلیم القران یا تخصص فی القران کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ تو اللہ کا وضع کردہ فطری نصابِ تعلیم ہے، جو قیامت تک کے انسانوں کے لئے وضع ہوا ہے، جو تغیر زمان ومکان کی پابندیوں سے ماورا ہے، خدائے حکیم ودانا کا یہ وضع کردہ نصاب اس کے بندوں کے لئے اتنا ہی فطری اور ضروری ہے، جس قدر فطری اور ضروری ان کے لئے ہوا، پانی اور غذا ہے، ان اشیاء کی ضرورت اگر انسان اور جاندار کے لئے یکساں اہمیت کی حامل ہے، تو پھر قرآنی ہدایت کی ضرورت بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس خدائی نصاب اور اس میں تخصص کی ضرورت کا انکار کسی دور میں کسی سمجھدار مسلمان نے نہیں کیا، پھر قرآن کے ربانی نصاب ہونے، اس کے زندہ، پائندہ، تر وتازہ اور دائمی کتاب ہدایت ہونے کا اعتراف تو دشمنوں تک نے کیا ہے؛ لہٰذا مسلمانوں کی زندگی کے لئے نصب العین اور دستور العمل ہونے کے معاملے میں ''جدید دور کے تقاضے'' اور ''قدیم دور کے تقاضے'' کی باتیں کرنا بھی کم فہمی کی دلیل ہے؛ کیوں کہ اس کو وضع کرنے والا وہ اللہ ہے، جو نہ صرف انسانوں کی فطرت، ضرورت اور مزاج کا خالق ہے؛ بلکہ اس کی نظر میں ماضی حال اور مستقبل کے پوشیدہ حقائق سب عالم مشہود ہیں: أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ . (الملک:۱۴)

زمانہ ایک ، حیات ایک ، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

تاہم مجوزہ عنوان کے مدنظر ہم برصغیر کے دو اداروں کے نصابِ تعلیم کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں :

⊙ استاذ: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

دار العلوم دیو بند

یہاں اطفال، اُردو اور فارسی کے چار سالہ تعلیم اور عربی درجات کے آٹھ سالہ نصابِ تعلیم کو ملا کر کل ۱۲ سالہ تعلیمی نظام ترتیب پایا ہے :

پانچویں اور چھٹے سال یعنی درجہ عربی اول اور درجہ عربی دوم میں قرآن کے ضمن میں تجوید کی مشق رکھی گئی ہے، تیسرے سال: میں سورۂ بقرہ کا ترجمہ ہے، چوتھے سال: میں آلِ عمران تا سورہ مریم کا ترجمہ، سال پنجم: میں قرآنیات کے متعلق کوئی چیز نہیں نظر آتی، سال ششم: میں جلالین اور اُصولِ تفسیر میں الفوز الکبیر ہے، سال ہفتم: میں بیضاوی سورۂ بقرہ سوا پارہ، دورۂ حدیث: میں تفسیر پہ کوئی چیز نہیں رکھی گئی، ایک سالہ تکمیل تفسیر (جو لازمی نہیں ہے) میں مندرجہ ذیل تفسیر کی کتابیں ہیں :

تفسیر مدارک: پارہ ۱ تا ۱۰، تفسیر مظہری: پارہ ۱۱ تا ۲۰، تفسیر بیضاوی: پارہ ۲۱ تا ۳۰، تلخیص الاتقان فی علوم القرآن۔(۱)

ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کے ۱۷ سالہ نصابِ تعلیم میں ساتویں سال سے لے کر دسویں سال تک پورے ۴ سالوں میں تجوید ہے، گیارہویں سال درجہ پنجم عربی (میٹرک) میں قرآن سے متعلق کوئی چیز نہیں ہے، بارہویں سال میں ان منتخب سورتوں کا ترجمہ وتفسیر شامل نصاب ہے، جن میں قصص کا عنصر حاوی ہے، مراجع کی حیثیت سے تفسیر کا معیار جلالین اور مدارک کو قرار دیا گیا ہے، روزانہ تفسیر کے لئے ایک گھنٹہ مختص ہے، تیرہویں سال میں منتخب سورتیں ہیں، مرجع کی حیثیت سے تفسیر اَبی السعود شامل ہے، چودہویں سال میں چند طوال سورتوں کے علاوہ، سورۃ ق تا سورۃ الناس کی سورتیں داخل نصاب ہیں، مراجع میں فتح القدیر اور تفسیر مظہری شامل نصاب ہے، پندرہویں سال (عالمیت) میں سورۃ الفاتحہ تا سورۃ النساء کی تفسیر نصاب کا حصہ ہے، مراجع میں تفسیر ابن کثیر، تفسیر کشاف، تفسیر روح المعانی، احکام القران از جصاص اور احکام القرآن از قرطبی، ہفتہ میں پانچ گھنٹے، سولہویں سال (فضیلت اول) میں اختصاص فی التفسیر میں کشاف، علوم القرآن ہفتے میں تین تین دن، الاتقان فی علوم القرآن ہفتے میں چار دن، (فضیلت دوم) میں کشاف، اعجاز القرآن اور اُصول التفسیر ومناھجہ، ہفتے میں تین تین یوم۔

ہم نے تخصص فی القرآن کے علاوہ پورے نظام تعلیم کے قرآنی نصاب کا ذکر اس لئے کیا؛ تاکہ ہمیں معلوم

(۱) ہمارا نصابِ تعلیم کیا ہو؟ از مولانا سلمان حسینی ندوی: ۱۲۳۔

ہو جائے کہ ہمارے نصاب تعلیم میں کتابِ الٰہی کا حصہ کتنا ہے؟ اور اس کی تفہیم و تدریس کا اہتمام کس قدر ہے؟ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں دو سالوں میں ترجمۂ قرآن اور ایک سال جلالین اور ایک سال بیضاوی کے سوا پارے پر اکتفا کیا گیا ہے، ایک سالہ تکمیل تفسیر میں مدارک، تفسیر مظہری اور تفسیر بیضاوی کے دس دس پارے ہیں، الاتقان کو بھی اختصاص کے نصاب میں جگہ دی گئی ہے۔

ندوۃ العلماء میں عالمیت کے سال میں مراجع کے طور پر متعدد اُمہات التفاسیر شامل مطالعہ ہیں؛ مگر اس سندی سال کے دیگر کثیر موضوعات کے ساتھ ان تفسیری کتب سے خاطر خواہ استفادہ ممکن نہیں ہے، اختصاص فی التفسیر اور اختصاص فی الحدیث، فضیلت اول و دوم کے دو سالوں میں اختیاری مضمون کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے علاوہ حدیث فقہ، شریعت، ادب عربی وغیرہ کے مضامین طلباء کو پڑھنے ہوتے ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح کے تعارف نامے میں مدرسے کا امتیازی وصف بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ یہاں قرآن مجید کی تعلیم محققانہ ہوتی ہے اور یہ کہ قرآن کریم پر براہ راست غور وفکر پر توجہ مبذول کی جاتی ہے، جامعۃ الفلاح مدرسۃ الاصلاح ہی کا خوشہ چیں ہے؛ البتہ نصابِ تعلیم میں تفسیری اور قرآنی موضوعات پر نصابی کتب کی تعداد مدرسۃ الاصلاح کی نصابی کتب سے زیادہ ہے۔

تخصص فی القرآن کے لئے جو بھی طریقۂ تعلیم اپنایا جائے اور کسی کو عمر نوح بھی دے دی جائے، تب بھی قرآن کے علوم و معارف کا احاطہ ممکن نہیں ہے، قرآن کریم چوں کہ خدا کا آخری کلام ہے اور وحی ربانی کی آخری وحتمی شکل ہے، اس لئے قیامت تک کے وقوع پذیر حقائق علم کا وہ گنجینہ ہے، وہ ایک جامع دستاویز اور رہنما کتاب ہے :

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْئٍ . (النحل:۸۹)

مَّا فَرَّطْنَا فِيْ الْكِتَابِ مِن شَيْئٍ. (الانعام:۳۸)

'شئ' کا اطلاق کائنات کے ہر مادی اور روحانی وجود پر ہوتا ہے، ہر مخلوق 'شئ' ہے اور 'ہر شئ' کی تفصیل قرآن میں ہے، کائنات ارض وسماء کا کوئی وجود رطب اور یابس سے خارج نہیں: ''ولا رطب ولا یابس إلا في کتاب مبین'' گویا ہر چیز کا ذکر اور ہر شئے کا علم قران میں موجود ہے، امام سیوطیؒ فرماتے ہیں :

مامن شيئ الا يمكن استخراجه من القرآن لمن فهمه الله . (۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

لو ضاع لي عقل بعير ، لوجدته في كتاب الله .

(۱) الاتقان:۲/۱۲۶۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں :

سلوني عما شئتم ، أخبركم عنه في كتاب الله . (۱)

امام بیہقیؒ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے :

جمع القرآن علوم الأولين والآخرين بحيث لم يحط بها علما حقيقةً إلا المتكلمُ ثم رسولُ الله .

ان علوم وحقائق کا احاطہ اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی نہیں کر سکا ہے، نہ کر سکتا ہے۔

پروفیسر قدرۃ اللہ حسینی فرماتے ہیں :

قرآن کریم کلام الٰہی ہے جو تمام ممکنات اور موجودات سے معمور ہے...... قرآن کریم کے دائمی اور آفاقی نشانیوں کا انکشاف ان پر ہوتا ہے، جن کا نگار خانۂ دل علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کی بصیرت افروز کرنوں سے منور ہے، اس سے شرح صدر ہوتا ہے، اس سے ذہنی دروازے کھل جاتے ہیں ، جن سے انسانیت کی انفرادی ، اجتماعی ، اخلاقی ، روحانی ، معاشی ، معاشرتی ، علمی ، ادبی ، فنی ، صنعتی ، اقتصادی اور سیاسی جہتوں کے کارآمد رموز اُبھر آتے ہیں اور اس اشرف المخلوقات کے عروج کے لئے تدریجی منازل کی نشاندہی ہوتی ہے، جہاں اسے ترقی کا زادِ راہ بھی نصیب ہوتا ہے، ہدایت ملتی ہے، حکمت کے ساتھ بصارت وبصیرت کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے، تفکر کی روشنی میں اضافہ ہوتا ہے، تدبر کو علمی قوت میسر آتی ہے اور علمی وشعوری انکشافات کے لئے نئے نئے زاویۂ نظر آنے لگتے ہیں۔(۲)

قاضی ابوبکر بن عربیؒ نے اپنی کتاب ’’قانون التاویل‘‘ میں ابتدائی طور پر قرآنی علوم کی تعداد (۷۷،۴۵۰) بتائی ہے، یہی تعداد قرآن کریم کے کل الفاظ کی بھی ہے اور الحمد سے لے کر الناس تک ہر کلمہ یقیناً کسی علم یا فن کی بنیاد ہے اور دنیا کا ہر علم وفن اور سائنس وٹکنالوجی کی ہر راست دریافت اور علوم قدیمہ اور جدیدہ سب کا ذکر قرآن میں ہے، جب صورت واقعہ یہ ہے تو بھلا بتائیے وہ کون ہے جو جملہ قرآنی علوم میں تخصص کا دعویٰ کر سکے گا...... تاہم یہ امر اپنے آپ میں بے حد مسرت آگیں اور اُمید افزا ہے کہ دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے علاوہ دوسرے دینی اداروں میں پچھلی دو دہائیوں سے مختلف علوم وفنون میں اختصاصات کے شعبے قائم ہو رہے ہیں ؛ البتہ سابقہ سطور کی

(۱) الاتقان: ۲/۱۲۶۔ (۲) فنون القرآن: ۴۴۵-۴۴۶۔

روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج ایک ایک علم نے جو پھیلاؤ اور وسعت اختیار کر لی ہے، ایک دو سال کے عرصے میں کسی ایک علم یا فن کا استقصاء کر پانا، اس کے مالہ اور ماعلیہ پہ حاوی ہو جانا اور ملکہ پیدا کر لینا کیوں کر ممکن ہے؟ ایک دو سال کے عرصے میں کسی پیش نظر علم یا فن کے مصادر و مآخذ کا تعارف تک حاصل کر پانا بھی شاید ممکن نہ ہو سکے، ظاہر ہے کسی موضوع سے ذوق و رجحان کی بنیاد پر اشتغال پیدا کر لینے اور سرسری معلومات بہم پہنچا لینے کو تو تخصص نہیں کہتے۔

قرآن کریم اُمتِ مسلمہ کے نصابِ تعلیم ؛ بلکہ ان کی کل زندگی کی اصل الاصول ہے، ان کے سارے علوم ومعارف، ان کی زندگی کی ساری مادی و روحانی سرگرمیاں اسی قرآنی تعلیمات کے اِرد گرد گردش کرتی ہیں یا کرنی چاہئیں، اس قرآن کی تفہیم و تدریس مختلف نقطہ ہائے نظر سے کی جاتی ہے، اس تفہیم و تدقیق میں اختلاف آراء کا ظہور بھی ہوتا ہے، یہیں سے فقہی اور کلامی مسائل کی گونا گوئی سامنے آتی ہے، یہ سب مباح بھی ہیں اور مطلوب بھی ؛ مگر صحابہ کرام کی نگاہ میں اس کا سب سے اعلیٰ اور برتر مقام یہ تھا کہ وہ کتاب ہدایت ہے، اس لئے وہ حضرات ہر دعوت سے پہلے دین کی دعوت دیا کرتے تھے، فقہی و کلامی مباحث ان کی دعوت کا لب لباب نہیں ہوتے تھے، ان کی نگاہ میں دین کی حفاظت اسلام کے سیاسی نظام کی بالا دستی اور اس کے آئین و قانون کی حکمرانی میں مضمر تھا، ہم ایسے ماحول میں سانسیں لیتے ہیں جو اسلام کے سیاسی نظام کی بالا دستی اور آئین و قانون اسلامی کی حکمرانی سے یکسر محروم ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ کہ ہمارا دین کا کلیت پسندانہ تصور ناقص اور ادھورا رہ گیا ہے، ہر لحہ ہمیں اپنی شناخت کے تحفظ کی فکر ستاتی رہتی ہے اور پھر حفاظت اسلام کا مسئلہ دامن گیر رہتا ہے، ہماری قربانیوں اور سعی و جہد کا بڑا حصہ اسلام کے دفاع اور تحفظ میں صرف ہو جاتا ہے۔

اسلامی خلافت کا نظام جب تک اور جیسا بھی ڈھیلا ڈھالا رہا ہو اُس کو اور اُس کے عوام کو براہ راست مقابلہ اسلامی فرقوں سے رہا، مگر غیر اسلامی ماحول کے سائے میں رہنے والوں کو دہریت اور اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات پر حملہ کرنے والوں سے مقابلہ ہوتا ہے، مزید برآں یہ کہ ہم ایک ایسی دجالی تہذیب اور اخلاق باختہ معاشرت سے نبرد آزما ہیں جسے خدا بیزار یورپ کے فکر و فلسفے نے جنم دیا ہے اور جس کی گرفت میں دور حاضر کا انسان خوب اچھی طرح جکڑا جا چکا ہے؛ لہٰذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کا مرکز ومحور قرآن کریم ہو، دیگر ضروری علوم وفنون اس کے خادم ہوں، اس نصاب کا مقصد وہ رجالِ کار پیدا کرنا ہو جو مسلمانوں کی ذہنی، فکری صلاحیتوں کو قرآن کے رنگ میں رنگ دینے اور اسلام کی خاطر جینے اور مرنے کا جذبہ پیدا کرنے کو مقصودِ زندگی بنالیں، ان مدارس کا بنیادی نصب العین وہ علمائے راسخین و ربانیین کی تیاری ہو، جو ایک طرف تو اسلام کی عملی

ترجمانی کے ذریعہ دور جدید کے جاہلانہ ماحول کو نبویانہ طرز پر تبدیل کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، تو دوسری طرف انسان کو انسان کی غلامی سے آزادی دلانے اور خدا پرستی کی چوکھٹ پر جھکانے کا عزم لے کر اُٹھنے والے ہوں۔

قرآنی نصاب پڑھنے اور پڑھانے والوں کو ایک لمحہ کے لئے یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ خدا کی نگاہ میں ایک انسان کا نصب العین انسانِ مرتضٰی بننا ہے، انسان مرتضٰی بننے کے لئے یقین محکم اور عمل پیہم اور سر بکف زندگی کی ضرورت ہوتی ہے، خواہشات کو ضبط و انقیاد کا پابند کرنا ہوتا ہے، ایمان و یقین کے موانع سے لڑنا ہوتا ہے، پھر ہر قدم پر حکم خداوندی اور امر الٰہی کو معیار بنا کر اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوتا ہے، وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (المائدہ :۴۵) انسان مرتضٰی بننے کے لئے لائحۂ عمل کی وضاحت پیغمبرانہ وظیفے کی شکل میں موجود ہے؛ تلاوت آیات، تزکیۂ نفس، تعلیم کتاب وحکمت اور تعلیم :مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۔(البقرۃ:۱۵۱)

اجتماعی زندگی کے نصب العین کا حصول؛ معاشرت، معیشت اور سیاست کے پہلوؤں کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں ہے، نہ ہی اس کے بغیر صحت مند معاشرہ منظر عام میں آسکتا ہے، صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لئے حصول حقوق کے بجائے ایتائے حقوق کو اور وطنیت وقومیت کے بجائے کلمۂ طیبہ کی بنیاد پر معاہدۂ عمرانی کی تشکیل کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہئے:هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔(التوبۃ:۳۳)

قرآن کریم کلاس روم کے محدود ماحول کا نصابِ تعلیم ہی نہیں ہے؛ بلکہ وہ ایک مسلمان انسان کی کتابِ زندگی اور دستور العمل ہے، اس نصاب کا عملی پیکر رسول اللہ (ﷺ) کی کل زندگی میں جھلکتی ہے:کان خلقه القرآن، اس نصاب کے آئینے میں ہمارے مدارس کے ذمہ داروں کو بارہا سوچنا چاہئے کہ حقیقت علم تک ہماری رسائی کیسے ہو؟ اخلاق نبویہ کا پرتو ہماری زندگی کے کل گوشوں میں کیسے پڑے؟ معاشرہ ایک اخلاقی نظام میں کیسے ڈھلے؟ مسلم معاشروں میں دینی تقاضوں کو بروئے کار کیسے لایا جائے؟ ان الحکم الا للہ کے حدود سے سر مو تجاوز نہ کر سکنے کی کیا شکلیں ہوں؟ قوموں کے معاندانہ کشمکشوں سے نبرد آزما کیسے ہوا جائے؟ انسانی برادری کو انتہا پسندیوں اور غیر عادلانہ نظام کے چنگل سے کیسے نکالا جائے؟ مسلم نوجوانوں کی وہ مبارک نسل آخر کس طرح وجود میں آئے، جن کی رگ و پے میں قرآنی تعلیمات رچ بس جائیں، جو اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرام کی انقلاب انگیز جدوجہد کے نور سے مستنیر ہو کر قرن اول سے اقرب ہو جائیں! آخر ایمان کی وہ برقی رو اور دل کا وہ سوز وگداز کیسے پیدا ہو کہ قرآن وسنت کے پیغام کو لے کر بندگانِ خدا کی آزادی وہدایت کے لئے بے تابانہ نکل پڑیں؟

مدارس دینیہ اور اسلامی جماعتوں اور تحریکات کے نظام تعلیم وتربیت میں قرآن کا ناتمام نصاب اور تخصص فی التفسیر کے لئے ایک دو سالہ نصاب وضع کرنے والے ذمہ داروں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ آج کے طالبان علوم

نبوت قرآن کریم کو مرکز ومحور کیوں نہیں بنا پاتے ؟ آج کا نظام تعلیم اور نصابِ تعلیم دونوں ہی زندگی کو نئی روح سے سرشار کر دینے میں کیوں قاصر ہیں؟ اس سے انکار نہیں کہ یہ مدارس ہی ہیں، جو مسلمانوں کو دینی نفع پہنچا رہے ہیں، غیر اسلامی افکار اور خدا باغیانہ نظام کی گاڑی جواُن کی نسل کو خطرناک ڈھلوان کی طرف لے جا رہی ہے تو اس میں بریک لگانے کا کام یہی کر رہے ہیں، مگر وہ ولولۂ تازہ اور بے پناہ یقین کی طاقت جو زندگی میں انقلاب پیدا کر دے، وہ حاملین دین اور بندگان خدا کی اصلاح و ہدایت میں جان گھلانے والے اور جسم و جان کی بازی لگانے والے کثرت سے کیوں نہیں پیدا ہوتے؟

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد سے لے کر اب تک اسلام کا مقابلہ براہ راست کفر و الحاد، مشرکانہ عقائد کی دراندازی اور غیر خدائی آئین وقوانین سے رہا ہے، اس لئے اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات کی حفاظت ہمارے لئے سب سے بڑا چیلنج بنا ہوا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ مغربی فکر و فلسفہ اور اس کی ثقافت اور طرز معاشرت اور اب عالمگیریت کا حملہ اور اس کی چھاپ اتنی گہری ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کا حال اس قدر افسوسناک ہے کہ جو عقائد، افکار، احکامات اور قرآنی تعلیمات ان کی زندگی میں بدیہی حقیقت ہونی چاہئے تھیں وہ صرف نظری اور خیالی اور بہتوں کے نزدیک مشکوک بن کر رہ گئی ہیں، مسلمانوں کا اس طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونا، یا دین کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا یا اس کے لئے جان و مال کی قربانیاں نہ دینا ان کی اپنے نظریۂ حیات سے بے وفائی کی دلیل ہے! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن سے بے پناہ عقیدت کے باوجود وہ آج مسلمانوں کی زندگی کا نصب العین اور ہدایت کا مکمل سر چشمہ نہیں بن سکا، آج بھی ان کا نظام تعلیم ثنویت (دوئی) کا شکار ہے اور عمل کی دنیا میں وہ غیر خدائی نظام وآئین کے پھندے میں گرفتار ہیں :

آج کا مسلمان اپنے توحید کے تصور سے گریزاں اور عمل میں کوتاہ ہے!

وہ نفاق عملی میں مبتلا اور قول وفعل کے تضاد کا شکار ہے!

وہ دنیا کی محبت میں غرق ہے اور اپنی آخرت کو اپنی فانی دنیا پر ترجیح نہیں دیتا!

وہ قرآن کی صریح تعلیمات پر نہیں چلتا اور حب رسول (ﷺ) کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا!

وہ ایمان میں کمزور، نماز میں کوتاہ، ذکر سے غافل، دعوت وتبلیغ کے کاموں سے دور، جذبۂ جہاد سے عاری، مشرکانہ طور طریقوں کا شکار، بدعات میں مبتلا، اور معاملات میں بددیانت واقع ہوا ہے، غریبوں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کے ساتھ حسن سلوک کے معاملے میں مکمل اسلامی اُخوت کا ثبوت نہیں دیتا، اتحاد بین المسلمین کے معاملہ میں وہ گفتار کا غازی تو ہے، کردار کا غازی نظر نہیں آتا!

اس کے حکمرانوں کو مسلم رائے عامہ کے احترام کی پرواہ نہیں، عوام کے اندر اپنے حکمرانوں کی اطاعت کا جذبہ نہیں!

وہ صنعت، تجارت، زراعت، سائنس وٹکنالوجی، علم وتحقیق، محنت و جفاکشی، منصوبہ بندی و پلاننگ اور احتساب نفس واحتساب کائنات میں دوسروں سے پیچھے ہے!

اس کے یہاں شرح خواندگی میں زبردست کمی ہے، اس کے نوجوانوں کے بڑے طبقے کی دینی معلومات نہایت ناقص، اس کے غریبوں اور امیروں میں بعد بہت زیادہ اور وہ احساس زیاں اور خودشناسی کے بحران کا شکار ہے!

وہ تزکیۂ نفس، اس کی اہمیت اور اس کی اثر انگیزی سے ناواقف، وہ حسن اخلاق کی طاقت سے تہی دست، وہ عدل وانصاف میں کمزور، قوامین للقسط ، شھداء لله کے فرائض منصبی کی ادائیگی سے عاجز ہے، وہ ہر نوع کی برائیوں کا دلدادہ ہے، اس میں حرام خوری، اس میں رشوت ستانی، اس میں قتل و غارت گری، اس میں منشیات کا چلن، وہ دین کے فہم سے نا آشنا، وہ غیر اسلامی تہذیب کی تقلید کا خوگر، وہ آراء اور مسلکوں کو دین بنا لینے میں پیش پیش، اور مفسدوں، طاغوتوں اور ظالموں کے دروازوں پر کاسۂ گدائی لے کر کھڑا نظر آنے والا، غرضیکہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے دور اور اچھے مسلمان کی صفات سے عاری!!

تخصص فی القرآن کے نصاب کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تین مقاصد میں سمودیا ہے :

۱- تھذیب نفوس البشر : انسانی نفوس کو مہذب، شائستہ اور مزکی و مصفی بنا کر عظیم ترین ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنا۔

۲- دفع العقائد الباطلة : تمام باطل عقائد کی تردید اور غیر اسلامی عقائد کی بیخ کنی۔

۳- نفی الأعمال الفاسدة : غلط رسوم وروایات، باطل خیالات اور غلط تصورات پر مبنی غلط اعمال کو مٹانا اور صحیح اعمال کو رواج دینا۔

تخصص فی القرآن کے لئے آپ خواہ جیسا بھی نصاب ترتیب دیں، علم و دانش کا ذوق لے کر جن جن جہتوں سے چاہیں آپ اس میں فکر و تدبر کریں، جن جن اغراض و مقاصد کی خاطر آپ اس کے بحر مواج میں غواصی کرنا چاہیں کریں! ہر حیثیت سے اشتغال بالقرآن مبارک ومسعود اور مطلوب ومحبوب عمل ہے، مگر تخصص فی القرآن کا بنیادی اور اولین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ گہرے قلبی اور روحانی تعلق کے ساتھ اُس سے مربوط ہوا جائے، پورے تقدس اور عظمت کے ساتھ اُس کے ربانی بول کو رگ وریشے میں سرایت ہونے دیا جائے، اس کو اس جذبہ سے پڑھا جائے کہ یہی تنہا راہ حق کا سرچشمہ اور سعادتوں کا خزانہ ہے :

تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

آخر میں تین خاص باتیں طالبان قرآن وسنت کی خدمت میں عرض کرنی ہے :

(۱) اساتذۂ فن کی اہمیت: زمانہ تغیر پذیر ہے، اس نے نصابی کتب کو زمانے کے تعلیمی اور تربیتی تقاضوں کے مطابق تحسین واخراج واصلاح کی کسوٹی سے گزرنا ہی چاہئے، نصابی کتابوں کی اہمیت کا انکار نہیں، تاہم کتابیں معلمین اور مرتبین کا بدل نہیں ہوسکتیں، کتابیں علم وآگہی سے مالا مال کرسکتی ہیں، ذہن سازی اور مردم گری کا وہ کارنامہ انجام نہیں دے سکتیں جو کارنامے اصحاب فضل وکمال اور صحبت صالحین انجام دے پاتے ہیں؛ لہٰذا جہاں مفید اور نتیجہ خیز نصابِ تعلیم مرتب کرنے کی فکر ہوتی ہے، وہیں اس کے پڑھانے والے ایسے باکمال اساتذہ کی تلاش وتقرری کی بھی فکر ہونی چاہئے، جن کے علم کی تپش طلباء کے دلوں کو گرمانے کی صلاحیت رکھتی ہو، ایک اعلی درجہ کا نصابِ تعلیم، باکمال انسانوں کا مکمل گروہ تیار کرنے کی ضمانت نہیں لے سکتا، مگر مخلص باکمال اور کردار ارباب علم وفضل کا ایک اسٹاف باکمال انسانوں کی تیاری کی ضمانت دے سکتا ہے۔

(۲) تخصص فی القرآن کا پانچ سالہ نصاب: عالمیت کے بعد تخصص فی القران کا پانچ سالہ نصاب مرتب ہونا چاہئے، اس پانچ سالہ نصاب کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا مرحلہ: تین سالہ اس مرحلے میں تفسیر القرآن ،اسباب النزول، ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، تاریخ تدوین القرآن، اقسام القرآن، اعجاز القرآن، دعوۃ القرآن، تربیت القرآن، اخلاق القرآن، اسلوب القرآن، فقہ القرآن، قصص القرآن وغیرہ مضامین کو درس کا حصہ بنایا جائے، اس مرحلے میں ایک مرتبہ پورے قران کی تفسیر سے تخصص فی القرآن کے طالب کو گزر جانا چاہئے، تفسیر میں تفسیر القرآن بالقرآن، تفسیر القرآن بالماثور والمنقول اور تفسیر القرآن بکلام العرب کی فطری ترتیب اور طریقہ کار کو اپنایا جانا چاہئے، مفسرین کے مختلف اقوال میں تطبیق، یا پھر راجح طریق کی طرف توجہ دی جانی چاہئے، مختلف قرانی موضوعات پہ ہفتے میں کئی محاضرات (لیکچرس) کا انتظام کیا جانا چاہئے، دوسرا مرحلہ: دو سالوں کا ہو، اس مرحلے میں اعلی درجے کے مطالعے کے ذریعے سے قرانی بصیرت اور تفقہ حاصل کرنی ہوگی، اس مرحلے میں بایں طور اسلام کے اصول ونظریات پہ دستگاہ پیدا ہوجانی چاہئے کہ زندگی کے جملہ جدید مسائل قرانی بصیرت، سنت نبویہ اور دینی تفقہ کے ذریعہ حل کرنے کی محققانہ صلاحیت پیدا ہوجائے، ماہرین فن کے محاضرات سے فائدہ اُٹھانے کا اہتمام یہاں بھی ہونا چاہئے، تخصص فی القرآن کے طالب علم (متخصص) کے ذہن میں ابتدا سے علوم قرانیہ کے کسی پسندیدہ شعبے کو اپنا موضوع بنانے کا رجحان ہونا چاہئے؛ تاکہ پہلے مرحلے کے ابتدائی تین سالوں میں اس کا ذہن موضوع کے معاملے میں بیدار اور مواد کی تلاش میں

رہے، آخری دو سالوں میں اس موضوع پر ایک ایسا تحقیقی اور علمی مقالہ تیار کرنا چاہیئے، جو اسلام کے حق میں ایک ذہنی اور فکری انقلاب کی راہ ہموار کرنے یا کم سے کم ذہنوں کو اپیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

پانچ سالہ نصاب کا ایک سرسری خاکہ :

سال اول :

(۱) تفسیر: از سورہ عنکبوت تا الناس (۱۰ پارے)، روزانہ دو گھنٹے۔
معاون تفسیریں: تفسیر ابی السعود، تفسیر شوکانی، تفسیر ابن کثیر و دیگر۔

(۲) علوم القرآن: مناہل العرفان للزرقانی (درس)، روزانہ ایک گھنٹہ۔
مباحث فی علوم القرآن لصبحی صالح (معاون)۔

(۳) اعجاز القرآن: التصویر الفنی فی القرآن لسید قطب، ایک گھنٹہ۔

(۴) تعارف: التفسیر والمفسرون لمحمد حسین الذھبی، ایک گھنٹہ۔

(۵) مطالعہ: الفوز الکبیر۔
الدستور القرآنی لمحمد عزت دروزہ۔
مع اللہ فی السماء لدکتور احمد زکی۔
علوم القرآن مولانا تقی عثمانی۔
ارض القرآن علامہ سید سلیمان ندوی۔

سال دوم :

(۱) تفسیر: از سورۃ انفال تا سورۃ عنکبوت (۱۰ پارے)، روزانہ دو گھنٹے۔
تفسیر کشاف، روح المعانی، کتاب التفسیر (بخاری و مسلم)، احکام القرآن للجصاص، احکام آیات، القرآن محمد صابونی وغیرہ۔

(۲) علوم القرآن: کتاب البرہان للزرکشی، روزانہ ایک گھنٹہ۔

(۳) اعجاز القرآن: اعجاز القرآن للرافعی، روزانہ ایک گھنٹہ۔

(۴) محاضرات: از اہل اختصاص، روزانہ ایک گھنٹہ۔

(۵) مطالعہ: دستور الاخلاق فی القرآن لعبداللہ دراز، فی ظلال القرآن سید قطب، بقیہ التفسیر والمفسرون، اُردو تفاسیر کا تعارف۔

سال سوم :

(۱) تفسیر: از سورۃ فاتحہ تا سورۃ انفال (۱۰ پارے)، روزانہ دو گھنٹے۔

تفسیر قرطبی، احکام القرآن للجصاص، روح المعانی وغیرہ، روزانہ دو گھنٹہ۔

(۲) علوم القرآن: الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی، روزانہ ایک گھنٹہ۔

(۳) اعجاز القرآن: دلائل الاعجاز للجرجانی/النکت فی اعجاز القران للرمانی، روزانہ ایک گھنٹہ۔

(۴) محاضرات: از اہل اختصاص۔

(۵) مطالعہ: رسالۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فی اصول التفسیر۔

سال چہارم و پنجم :

قرانیات پہ کم از کم تین سو صفحات پر مشتمل عربی یا اردو زبان میں ایک علمی مقالہ تیار کرنا جو تحقیق کے اعلیٰ معیار پر ہو۔

(۳) قرآنی مزاج: دوسری بات مقصد اور مزاج سے متعلق ہے، یقیناً قرآن سرچشمۂ علم و معرفت ہے، مگر علوم و معارف اپنے آپ میں مقصود نہیں ہیں، قرآن تو راہ حق سے بھکے ہوئے انسانوں اور بیمار دلوں کے لئے کتاب شفا ہے، تخصص فی القرآن کا مقصود و منتہا صرف دانش قرآن کے حاملین پیدا کرنا نہیں ہے؛ بلکہ علم و آگہی میں کمال و رسوخ کے ساتھ ساتھ قرآنی مزاج رکھنے والے اسلام کے وہ خدمت گار پیدا کرنا مقصود ہے، جس کی شخصیت موزوں تعلیم اور تزکیہ نفس کے نتیجہ میں ایک متوازن اور یکسو (حنیفی) اسلامی شخصیت میں ڈھل گئی ہو، جو قرآن کے رنگ میں اپنے باطن تک کو رنگ چکا ہو، صبغة الله ومن احسن من الله صبغة، جو اپنے اخلاق کی پاکیزگی اور سیرت کی مضبوطی میں بہت ممتاز ہو، جو اپنے مقصد اور نصب العین کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار رہتا ہو، جس کی زندگی کا مطمح نظر صرف وہ کام اور پروگرام ہو جس کام کے لئے انبیاء کرام کی بعثت ہوئی تھی، دنیا کے ہر انسان اور ہر نظریہ حیات سے تعلق موالات و براءت کے اسلامی تصور اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی اساس پر ہو۔

فی زماننا درس قران میں علمی نکتہ آفرینیاں کرنے والے اہل علم اور قرآن فہمی کی جولان گاہ میں فراٹے بھرنے والے اہل دانش کم نہیں ہیں، علوم قران میں اختصاص پیدا کرنے والوں کی گنتی بھی مشکل ہے، تاہم قرآنی معلومات ایک شئے ہے اور قرآن میں تفقہ، بصیرت اور قرآنی مزاج کو پالینا چیزے دیگر است، دور حاضر میں

سیکولرازم اور جمہوریتوں پر مبنی نظام ہائے حیات کی موافقت وہم نوائی اور ان کے غیر خدائی آئین وقوانین کی تائید وتوثیق کرنے والے ارباب دانش اور اصحاب علم کہے جاسکتے ہیں، مگر یہ لوگ قرآن وسنت کے مزاج آشنا ہرگز نہیں ہو سکتے، ہمیں وہ ''متخصص علماء'' درکار نہیں ہیں، جو کسی جاہلانہ نظام کا کل پرزہ بننے کے لئے ہمیں دلائل فراہم کریں! ہمیں وہ بالغ نظر، خدارسیدہ اور پیکرِعمل میں ڈھلے ہوئے علماء درکار ہیں جو دنیا کے موجودہ نظاموں کو درہم برہم کر دینے کا حوصلہ رکھیں اور زندگی کی تعمیر خالص اسلامی بنیادوں پر کرنے کے لئے جی جان کھپا دیں۔

ہمیں وہ بصیرت مند علماء کی رہنمائی کی ضرورت ہے، جو جاہلیت جدیدہ وقدیمہ سب سے کاٹ کر مدینہ منورہ میں برپا ہونے والے اسلامی معاشرے سے فکری وعملی طور پر ہم آہنگ کرنے والے راستے کی طرف لے چلیں۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے، قرآن

⊙ ⊙ ⊙

تفسیر موضوعی اور نصابی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت

مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی⊙

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام علىٰ محمد بن عبد الله الأمين وعلىٰ آله وصحبه ومن تبعهم باحسان الىٰ يوم الدين ، وسلم تسليما كثيرا ، أما بعد !

قرآن مجید کلام الٰہی اور معجزۂ ربانی ہے، وہ وحی الٰہی پر مرتب محیر العقول ایک کامل ومکمل نظام زندگی و دستور حیات ہے، وہ ہدایت کا صحیفہ بھی ہے اور قیام عدل ومیزان کی شمشیر آبدار بھی، فتن و دجالیت سے حفظ وامان کی ضمانت بھی ہے اور گنجینۂ علم ومعرفت بھی، زبان نبوت نے ایک موقع پر فرمایا تھا :

عن علي رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : انها ستكون فتن . قلت ما المخرج منها يا رسول الله ؟ قال : كتاب الله ، فيه نبأ ما قبلكم ، وخبر ما بعدكم ، وحكم ما بينكم ، هو الفصل ليس بالهزل ، من تركه من جبار قصمه الله ، ومن اتبع الهدى بغيره أضله الله ، وهو حبل الله المتين ، وهو الذكر الحكيم ، هو الصراط المستقيم ، وهو الذي لا تزيغ به الأهواء ، ولا تلتبس به الألسن ، ولا تنقضي عجائبه ، ولا يشبع منه العلماء ، من قال به صدق ، ومن عمل به أجر ، ومن حكم به ، عدل ومن دعا إليه هدي إلى صراط مستقيم . (۱)

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، عنقریب فتنے رونما ہوں گے، میں نے عرض کیا ان سے نکلنے کا راستہ کیا ہے، آپ نے فرمایا، کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلے لوگوں کے واقعات اور آئندہ کی پیشین گوئیاں ہیں، وہ تمہارے درمیان معاملات کا حَکَم ہے، وہ

⊙ مدیر: معہد الامام أبی الحسن الندوی للدعوۃ والفکر الاسلامی، لکھنؤ۔

(۱) رواہ الترمذی۔

فیصلہ کن ہے،کوئی مذاق نہیں ، جو اس کو کبر وغرور سے چھوڑے گا اللہ اس کو توڑ کر رکھ دے گا ، جو اس کے بغیر ہدایت کو تلاش کرے گا اللہ اسے گمراہ کردے گا ،وہ ذکر حکیم ہے،وہ صراط مستقیم ہے،وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے،وہ ایسی کتاب ہے،جس کے ذریعہ خواہشات زیغ وضلال کا شکارنہیں ہوتیں ،جس کے ذریعہ زبانیں دروغ گوئی نہیں کرتیں ،جس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے ،جس کے ذریعہ اہل علم کو سیرابی نہیں ہوتی ، جو اس کے ذریعہ کہتا ہے وہ صادق ہے، جو اس پر عمل کرتا ہے وہ مستحق اجر ہے، جو اس کے ذریعہ فیصلہ کرتا ہے وہ اس کا فیصلہ عین انصاف ہے، جو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی توفیق ملتی ہے۔

آج تمام اقوام عالم کے درمیان امت اسلامیہ کا یہ امتیاز ہے کہ اس کے پاس خدا کی آخری کتاب اسی طرح بے کم وکاست محفوظ ہے جس طرح وہ نازل ہوئی تھی ،اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خداوند قدوس نے لی ہے ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ''(الحجر:۹) قرآن مجید کی نوع بہ نوع پہلوؤں سے بے شمار خدمات ہوئی ہیں،لاتعداد تالیفات وکتب قرآن کریم اور اس سے متعلق علوم پر وجود میں آئیں،تفسیری خدمات ہوئیں۔

تفسیر قرآن کے مختلف مناہج واسالیب رہے ہیں،جن میں بنیادی طور پر ''تفسیر ماثور'' اور ''تفسیر بالرائ'' معروف ہیں،تفسیر کے باب میں زیادہ صحیح ،درست اور محفوظ طریقہ ''تفسیر ماثور'' ہی ہے یعنی قرآن پاک کے معانی، شرح وتفسیر کے لئے خود قرآن کریم حضور ﷺ کے اقوال واحادیث ،اقوال صحابہ وتابعین اور اقوال ائمہ کی طرف رجوع کیا جائے؛لیکن اس منہج کی مشکل یہ رہی ہے کہ صحیح وثابت روایات کا ذخیرہ کم اور اسرائیلیات وضعیف وموضوع روایات نے خوب شہرت حاصل کی ہے،جس کے مختلف اسباب رہے،علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں :

وصار التفسير على صنفين : تفسير نقلي مستند إلى الآثار المنقولة عن السلف ، وهي معرفة الناسخ والمنسوخ وأسباب النزول ومقاصد الآي ، وكل ذلک لا يعرف إلا بالنقل عن الصحابة والتابعين ، وقد جمع المتقدمون في ذلک و أوعوا ، إلا أن كتبهم ومنقولاتهم تشتمل على الغث والسمين والمقبول والمردود ، والسبب في ذلک أن العرب لم يكونوا أهل كتاب ولا علم ، وإنما غلبت عليهم البداوة والأمية ، فإذا تشوّقوا إلى معرفة شيئ مما تتشوق إليه النفوس البشرية في أسباب المكونات وبدء الخليقة

وأسـرار الـوجـود ، فإنما يسألون عنه أهل الكتاب قبلهم ويستفيدونه منهم ، وهم أهل التوراة من اليهود ومن تبع دينهم من النصارى ، وأهل التوراة الذين بين العرب يومئذ بادية مثلهم لا يعرفون من ذٰلك إلا ما تعرفه العامّة من أهل الكتاب ، ومعظمهم من حمير الذين أخذوا بدين اليهودية ، فلما أسلموا بقوا على ما كان عندهم ، مما لا تعلق له بالأحكام الشرعية التي يحتاطون لها ، مثل أخبار بدء الخليقة وما يرجع إلى الحدثان والملاحم وأمثال ذٰلك ، وهؤلاء مثل كعب الأحبار ووهب بن منبه وعبد الله بن سلام وأمثالهم ، فامتلأت التفاسير من المنقولات عندهم في أمثال هذه الأغراض ، وأخبارا موقوفة عليهم ، وليست مما يرجع إلى الأحكام فيتحرّي في الصحة التي يجب بها العمل ، وتساهل المفسرون في مثل ذٰلك وملأوا كتب التفسير بهذه المنقولات. (۱)

تفسیر بالرأی کی علماء نے دو قسمیں کی ہیں ''تفسير بالرأي المحمود'' اور ''تفسير بالرأي المذموم''

اگر قرآن کریم کی تفسیر رائے واجتہاد سے کی جائے تو لازم ہے کہ اس میں ظواہر نصوص سے عدول نہ ہو، قواعد لغت اور منہج سلف سے انحراف اور نصوص قرآن وسنت سے ٹکراؤ نہ ہو، اگر ایسا نہیں ہے اور اگر وہ شرائط — جو علمائے اُصول نے رائے کے معتبر ہونے کے ذکر کئے ہیں — مفقود ہوں تو وہ رائے مذموم ہے، ایسی ہر رائے اور اجتہاد سے تفسیر بیان کرنا جائز نہیں ہے، فرمان نبوی ﷺ ہے: ''من قال في القرآن برأيه وأصاب فقد أخطأ'' (۲) جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے اور اجتہاد سے کوئی بات کہی اور اتفاق سے وہ صحیح بھی ہو تو وہ غلط ہے، اس لئے کہ اس نے غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔

بہر حال تفسیر کے مختلف مناہج قدماء کے یہاں ملتے ہیں، مجھے یہاں ان سب کا ذکر مقصود نہیں، یہاں مختصر تفسیر موضوعی کا تعارف، واہمیت مقصود ہے، جو ذیل کی سطور میں ذکر کیا جا رہا ہے۔

تفسیر موضوعی

قرآن مجید کی تفسیر کے مختلف مناہج میں ایک منہج تفسیر موضوعی بھی ہے، اس کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

''تفسیر موضوعی'' یہ اصطلاح دو کلمات سے مرکب ہے، ایک ''تفسیر'' دوسرے ''موضوعی'' ان کا مطلب کیا ہے؟

تفسیر کے لغوی معنی ''توضیح وبیان'' کے ہیں:

(۱) مقدمۃ ابن خلدون: ۳۴۸-۳۴۹۔ (۲) سنن الترمذی: ۲۹۵۲، عن جندب بن عبداللہؓ۔

التفسير من الفسر وهو الكشف والبيان ، قال الراغب : اظهار المعنى المعقول . (۱)

تفسیر کی اصل "فسر" ہے جس کے معنی وضاحت و بیان کے ہیں، راغب اصفہانی کہتے ہیں، کسی معنی معقول کے اظہار کا نام تفسیر ہے۔

مفسرین کی اصطلاح میں تفسیر کہتے ہیں :

علم يكشف به عن معاني آيات القرآن و بيان مراد الله تعالىٰ منها حسب الطاقة البشرية .

لفظ "موضوع" کی اصل "وضع" ہے جس کے معنی ہیں "الوضع : جعل الشئ في مكان ما" یعنی کسی شئے کو کسی جگہ رکھنا، موضوع اسم مفعول کا صیغہ ہے، یعنی: "رکھا ہوا، وضع کیا ہوا" اسی معنی میں ایک شاعر کا شعر ہے :

بادشاہی کے بھی سامان کو درکار ہیں داغ
مورچھل کے لئے موضوع ہوئے مور کے پر

موضوع کا مطلب "مدعا یا مضمون" بھی ہوتا ہے، اسی طرح "اصل مقصود جس سے کسی علم بحث کریں، یا وہ شئے جس کا ذکر اس علم میں ہو موضوع کہلاتا ہے، علم تفسیر وقرآنیات کے باب میں موضوع سے مراد ہے :

قضية أو أمر متعلق بجانب من جوانب الحياة في العقيدة أو السلوك الاجتماعي أو مظاهر الكون تعرضت لها آيات القرآن الكريم . (۲)

یعنی کوئی ایسا معاملہ یا کوئی ایسا قضیہ جس کا تعلق حیات انسانی کے کسی گوشے عقیدہ یا معاشرت واخلاق یا مظاہر کائنات سے ہو اور قرآنی آیات نے ان سے تعرض کیا ہے۔

موضوعی مطالعہ Objective Studies سے مراد وہ تحقیقات ہوتی ہیں ، جن میں کسی خاص مضمون وعنوان سے بحث وتحقیق ہوتی ہے، اس روشنی میں معاصر مفکرین نے تفسیر موضوعی کی جو تعریفات ذکر کی ہیں، ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں :

۱- هو بيان ما يتعلق بموضوع من موضوعات الحياة الفكرية أو الاجتماعية أو الكونية من زاوية قرآنية للخروج بنظرية قرآنية بصدده .

تفسیر موضوعی سے مراد یہ ہے کہ فکری ، معاشرتی موضوع ، یا کائنات سے متعلق مضامین کا قرآنی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے؛ تا کہ اس کے بارے میں قرآن کا نظریہ واضح ہو :

(۱) مفردات القرآن:۱/۵۷۔ (۲) مباحث فی التفسیر الموضوعی، ڈاکٹر مصطفیٰ مسلم:۱۶۔

٢- هو جمع الآيات المتفرقة في سور القرآن الكريم المتعلقة بالموضوع الواحد لفظا أو حكما وتفسيرها حسب المقاصد القرآنية .

قرآن مجید کی مختلف سورتوں سے ان آیات کو جمع کرنا جو لفظی یا حکمی لحاظ سے متحد ہوں اور ان کی تفسیر قرآنی مقاصد واہداف کے مطابق کرنا۔

٣- هو بيان موضوع ما من خلال آيات القرآن في سورة واحدة أو في سور متعددة .

کسی خاص موضوع کی تشریح قرآنی آیات کی روشنی میں کرنا، خواہ ایک سورت میں ہوں یا متفرق سورمیں۔

٤- هو علم يبحث في قضايا القرآن الكريم المتحدة معنى أو غاية عن طريق جمع آياتها المتفرقة والنظر فيها على هيئة مخصوصة بشروط مخصوصة لبيان معناها واستخراج عناصرها وربطها برباط جامع .

تفسیر موضوعی سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعہ ان مضامین قرآن کا مطالعہ جو بلحاظ معنی ومقصد متحد ہوں، مختلف آیات کو جمع کر کے، ان میں مخصوص طریقہ سے، تفسیر کے مخصوص شرائط کے ساتھ کیا جائے، آیات کے مضامین وعناصر کا استخراج اور ان کے مابین ربط وہم آہنگی کو بیان کیا جائے۔

٥- هو علم يتناول القضايا حسب المقاصد القرآنية من خلال سورة أو أكثر .

اس تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔(١)

یہ تفسیر موضوعی کی مختلف تعریفات ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ :

١- ایک موضوع سے متعلق آیات قرآن کو جمع کرنا اور ان آیات کے مابین ربط وانسجام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنی مقاصد کی روشنی میں ان کی تفسیر کرنا۔

٢- قرآن کریم کی کسی ایک سورت کے اساسی مضمون محور وہدف کی روشنی میں اس سورت کی تفسیر کرنا اور ان تمام مضامین ومشتملات کی تفسیر اس محور اساسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کرنا، خواہ سورت مختصر ہو جن کے اندر عموما ایک ہی محور ومضمون ہوتا ہے، یا طویل سورت ہو جن میں ایک سے زائد مضامین ومحاور ہوتے ہیں۔

٣- کسی ایک عنوان کے تحت آیات قرآن کا جمع وتتبع، ان کی تشریح وتفسیر، مفردات وکلمات کا تتبع اور مختلف آیات وسور میں ان کی مختلف دلالتوں کا مطالعہ بھی تفسیر موضوعی کی قسم ہے۔

---

(١) المدخل إلى التفسير الموضوعي: ٢٠، ودراسات في التفسير الموضوعي: ٧، د/عواض زاهر۔

وہ تفاسیر جن کا تعلق آیات احکام کی تشریح سے ہے، بالفاظ دیگر فقہی تفاسیر بھی "تفسیر موضوعی" ہی کی ایک قسم ہیں؛ کیوں کہ ان میں قرآن مجید کے خاص مضامین کی تشریح ہوتی ہے۔

تفسیر موضوعی پر ایک نظر

تفسیر موضوعی کا منہج و اُسلوب اور اس کے عناصر و مؤلفات اگر دیکھا جائے تو زمانۂ قدیم سے ہی معروف ومتداول ہیں، تاہم یہ اصطلاح عصر قدیم میں رائج نہیں تھی، باقاعدہ اس اصطلاح کا استعمال اس وقت رائج ہوا جب چودھویں صدی میں جامعہ ازہر قاہرہ کے کلیۃ اصول الدین کے شعبۂ تفسیر میں "تفسیر موضوعی" کا نصاب شامل کیا گیا۔(۱)

اگر ہم تاریخ تفسیر اور مؤلفات تفسیر کا جائزہ لیں تو تفسیر موضوعی کا مواد قدماء کے یہاں بھی مختلف مراحل ومختلف اسالیب میں ملتا ہے، جس کی قدرے وضاحت ذیل کی سطور میں پیش کی جارہی ہے :

۱- ایک مضمون یا موضوع سے متعلق آیات کا تتبع اور ان کے مختلف معانی ودلالات پر غور وتدبر، بالفاظ دیگر ایک آیت کی روشنی میں دوسری آیات کے مضامین کی معرفت وفہم شرح وتفسیر بھی موضوعی تفسیر کی ایک قسم کہی جاسکتی ہے، یہی وہ منہج وقسم ہے جس کو علماء نے "تفسیر القرآن بالقرآن" کہا ہے، یہ منہج عہد نبوی ﷺ وعہد صحابہ میں معروف تھا، بعض آیات کی شرح وتفسیر کے فہم میں جب دشواری ہوئی تو حضور ﷺ نے صحابہ کے لئے قرآن کریم کی دوسری آیت کے ذریعہ شرح فرما کر اس اشکال کو رفع فرمادیا، صحیحین کی روایت میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے :

> **عن عبد الله بن مسعود : لما نزلت هذه الآية : " الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم " شقّ ذٰلك على الناس ، فقالوا : يارسول الله ! أينا لم يظلم نفسه ؟ قال : " إنه ليس الذي تعنون ، ألم تسمعوا ما قال العبد الصالح : إن الشرك لظلم عظيم " . (۲)**
>
> حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت "**الذين آمنوا ولم يلبسوا ايمانهم بظلم**" نازل ہوئی، لوگوں پر یہ بات بڑی شاق ہوئی، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم میں سے کون ہے، جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا، آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، یہاں ظلم سے وہ مراد ہے جو اللہ نے نیک بندے لقمان نے کہا تھا "**إن الشرك لظلم عظيم**" آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے۔

---

(۱) محاضرات فی التفسیر الموضوعی ص:۱۷۔ (۲) رواہ الشیخان۔

اسی طرح صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ''مفاتح الغیب'' کے بارے میں جس کا ذکر قرآن کی آیت ''وعندہ مفاتح الغیب'' میں ہے فرمایا :

مفاتح الغيب خمس : إن الله عنده علم الساعة وينزل الغيث ويعلم ما في الأرحام ، وما تدري نفس ما ذا تكسب غدا ، وما تدري نفس بأي أرض تموت إن الله عليم خبير .

علمائے اصول نے یہ قاعدہ لکھا ہے کہ تفسیر قرآن کا اولین مآخذ خود قرآن ہی ہے ''القرآن یفسر بعضه بعضا'' اگر قرآن میں ایک جگہ کسی موضوع پر اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل ، اگر اطلاق ہے تو تقیید موجود ہے ، امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :

ان أصح الطرق في ذلک — أي في تفسير القرآن — أن يفسر القرآن بالقرآن ، فما أجمل في مكان فانه قد فسر في موضع آخر ، وما اختصر في مكان فقد بسط في موضع آخر .

چنانچہ تفسیر القرآن بالقرآن جس میں کسی آیت کی تفسیر کے لئے اسی مضمون کی آیات کی طرف رجوع ہو یہ بھی تفسیر موضوعی ہی کی ایک شکل ہے۔

۲- اسی طرح عصر قدیم میں فقہاء نے آیات احکام کا تتبع اور ایک موضوع سے متعلق آیات کو اپنی فقہی کتب میں یکجا جمع و استنباط کا اہتمام کیا ہے ؛ چنانچہ بعض فقہاء نے فقہی ابواب طہارت عبادت معاملات و فرائض وغیرہ سے متعلق آیات احکام اور ان کی تشریح کو علاحدہ علاحدہ متعلقہ ابواب میں ذکر کیا ہے ، اس اُسلوب کو بھی ہم ''موضوعی'' کہہ سکتے ہیں۔

۳- تاریخ تفسیر میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن سے متعلق موضوعی تحقیقات کا ایک اور طرز و اُسلوب قدماء کے یہاں تھا ، وہ الفاظ قرآن کی لغوی بحث و تحقیق اور مفردات قرآن کے مختلف معانی و دلالت کی تحقیق سے متعلق تھا ؛ چنانچہ ایک ہی لفظ کی مختلف آیات و سور میں سیاق کے لحاظ دلالت مختلف ہے ، الگ الگ سیاق میں اس کے معنی و دلالت کی تحقیق بھی موضوعی تفسیر ہی کی ایک شکل تھی ، اس فن پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

سب سے پہلے مقاتل بن سلیمان (متوفی : ۱۵۰ھ) نے ''الاشباہ والنظائر فی القرآن الکریم'' لکھی اس میں ان کلمات قرآن کو جمع کیا جن کی اصل ایک ہے مگر سیاق کلام کے لحاظ سے دلالت مختلف ہے ، ان کے بعد یحییٰ بن سلام (متوفی : ۲۰۰ھ) نے ''کتاب التصاریف'' لکھی ، مفردات القرآن پر سب معروف و متداول تصنیف راغب اصفہانی (متوفی : ۵۰۲ھ) کی ہے ، جس میں قرآنی مفردات کے مادے کا تتبع اور مختلف آیات میں اس کی دلالت

ومعنی کا جامع بیان ہے۔

اسی طرح ابن الجوزی (متوفی:۵۹۷ھ) کی ''نزهة الأعين النواضر فی علم الوجوه والنظائر'' دامغانی (متوفی:۴۷۸ھ) کی ''اصلاح الوجوه والنظائر فی القرآن الکریم'' فیروز آبادیؒ (متوفی:۸۱۷ھ) کی ''بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز'' ابن العماد (متوفی:۸۸۷ھ) کی ''کشف السرائر فی معنی الوجوه والأشباه والنظائر'' اسی فن کی چند تالیفات ہیں، ان تمام کتب میں لغوی بحث وتحقیق کا رنگ غالب ہے۔

ان کے علاوہ قدماء کی تالیفات میں قرآنیات سے متعلق ایک طرز ان آیات کے جمع وتفسیر کا تھا جن کے مابین کوئی موضوعی ربط وہم آہنگی ہے، مثلاً ابوعبید قاسم بن سلام (متوفی:۲۷۶ھ) کی ''تأویل مشکل القرآن'' جصاص رازی حنفیؒ کی ''احکام القرآن'' الماوردیؒ (متوفی:۴۵۰ھ) کی ''أمثال القرآن'' عز بن عبد السلامؒ (متوفی:۶۶۰ھ) کی ''مجاز القرآن'' ابن القیم (متوفی:۷۵۱ھ) کی ''أقسام القرآن وأمثال القرآن'' ہیں یہ وہ کتب ومؤلفات تھیں جن میں ان آیات کے جمع وتفسیر وتشریح کا اہتمام کیا گیا تھا جن میں کسی پہلو سے موضوعی یکسانیت تھی۔

عصر جدید کے مادی انقلاب نے جب چودھویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھا تو سائنس وٹکنالوجی کے میدانوں میں نئی اکتشافات کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کے نئے ابواب بھی کھلے، جدید اسالیب وجود میں آئے، تمدن ومعاشرت کے جدید مسائل سامنے آئے، ایسے میں اسلام سے شکست کھائی ہوئی صلیبیت کے انتقامی جذبہ نے علم وتحقیق کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے عقیدہ اور ان کے مصادر پر ان کے یقین میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے میدان کارزار میں قدم رکھا؛ چنانچہ ''استشراق'' کے خوبصورت عنوان سے اسلام دشمن عناصر نے قرآنی مفاہیم، اخلاق واقدار، سیرت نبوی واسلامی روایات پر اپنے تیر ونشتر استعمال کئے، مستشرقین کی معاندانہ فکر گستاخ اور مکر وفتنہ نے اسلامی ذخیرہ کا مطالعہ برائے تشکیک کیا، اس طرح ایک زبردست فکری وثقافتی جنگ کا بگل بجایا گیا، اس جنگ میں عصر جدید میں برق ودخان کے علو کا کلمہ پڑھنے اور فضائے بسیط کو تسخیر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام دشمن عناصر کی کوششیں تیز ہوئیں، تو دوسری طرف علمائے حق جن کا طریق بقول اقبال یہ رہا ہے:

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

انھوں نے فکر اسلامی کی بالادستی اور کتاب وسنت کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لئے کمر کس لی، اور معاندین

کی فکر وتحقیق کے تار و پود بکھیر دئے ،قرآنیات کے موضوع پر ان حالات میں نئے اسالیب وجدید طرز میں آیات آفاق وانفس کی تفسیریں اور قرآن کے اعجاز کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ، بے شمار موضوعات پر قرآنی ہدایات کو بیان کر کے یہ ثابت کیا گیا کہ قرآن مجید ہر دور کے لئے ہدایت کا صحیفہ اور خزینہ علم ومعرفت ہے ،اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ انسانی زندگی کے مسائل اور کائناتی موضوعات کے چشم کشا حقائق اس میں موجود ہیں ،ڈاکٹر نور الدین عتر اپنی کتاب علوم القرآن میں لکھتے ہیں :

وكـان مـن الـطبيـعـي أن تتـجـه أنـظـار الـجميع الى القرآن ، توجـه الـمـنـحرفون الحادا وتشكيكا ، وتوجه العلماء اظهارا للحق وهداية للقرآن ، وتفسيرا صحيحا لآياته واعجازه .

ایسے ماحول میں فطری بات تھی کہ سب کی نظر قرآن کی طرف اٹھتی ؛ چنانچہ منحرفین نے الحاد وتشکیک کے لئے قرآن کو موضوع بنایا ، اور علمائے حق نے اظہار حق ،قرآنی اعجاز وہدایت کی صحیح تفسیر وتوضیح کے لئے اپنی کوششیں صرف کیں ۔(۱)

ان حالات میں ان علمائے حق کی جانفشانیوں کے نتیجہ میں ایسے تفسیری منہج واسالیب وجود میں آئے ،جن میں مضامین قرآن کو پیش کرنے میں جدت وابتکار بھی تھا ،اسلاف کے منہج کی رعایت کے ساتھ عصر جدید کے تقاضوں سے مطابقت بھی تھی ،ڈاکٹر عتر مزید لکھتے ہیں :

حتـى إذا كـان الـربـع الأخير من القرن الرابع عشر نشطت الدراسات الـقـرآنية نشـاطـا عـظيـما وظهرت دراسات تفسيرية لبعض السور أو الجوانب كما ظهرت تفاسير متنوعة ذات مناهج مبتكرة متعدده ، فيها تـجـديـد في عرض معاني كتاب الله يعتمد أصول التفسير ويعول على الـمـصـادر الـقـديمة ، ويلا ئم حاجة القارى المعاصرفي ضوء استقراء الـحـقـائق العلمية ، وانجلاء الغبار عن أخطاء السابقين ، وإن كان تأثر بعضهم بأخطاء الآخرين لكن الجملة يعتمد عليها . (۲)

ان جدید ومبتکر اسالیب میں ایک اسلوب ''تفسیر موضوعی'' کا بھی ہے،قرآن گنجینۂ معرفت وخزانۂ علم الٰہی ہے ، بنیادی طور اس میں جو مضامین ہیں ،علمائے اصول نے ان کو منضبط کرنے کی کوشش کی ہے ،خود حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم بنیادی طور پر پانچ مضامین پر مشتمل ہے ،عصر جدید کے علمی انقلاب میں زندگی کے

(۱) علوم القرآن د رعتر :ص ۱۱۰ ۔ (۲) علوم القرآن ص :۱۱۳ ۔

مختلف گوشوں کے بارے قرآنی ہدایات کو جاننے کی طرف توجہ مبذول ہوئی اور تہذیب وتمدن ، معاشرت واقتصادیات ، ساجیات و سائنس کے بہت سے موضوعات پر قرآنی دراسات وجود میں آئیں ، زندگی کے مختلف گوشوں کے بارے قرآنی ہدایات کے موضوعی مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا، تو بہت سی تالیفات متفرق موضوعات پر وجود میں آئیں ،مثلاً :

المرأة في القرآن ، الانسان في القرآن ، الالوهية من خلال الآيات القرآنية ، الصبر في القرآن ، السيرة النبوية في القرآن ، اليهود في القرآن ، الحيوان في القرآن ، السماء في القرآن .

مشہور فرانسیسی مفکر ''جون لابوم'' نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے ''**تفصیل آيات القرآن الكريم** '' اس نے اپنی اس کتاب میں اٹھارہ ابواب قائم کیے ہیں ، اور ہر باب کے تحت ذیلی عناوین قائم کرکے موضوع کی ترتیب کے لحاظ قرآنی آیات کو جمع کیا ہے، اس کتاب کا عربی ترجمہ فواد عبدالباقی نے کیا ہے، اس کے اٹھارہ ابواب اس طرح ہیں :

(۱) تاریخ۔	(۲) محمد ﷺ۔	(۳) تبلیغ۔
(۴) بنی اسرائیل۔	(۵) التوراۃ۔	(۶) النصاریٰ۔
(۷) مابعد الطبیعۃ ۔	(۸) التوحید۔	(۹) القرآن۔
(۱۰) الدین۔	(۱۱) العقائد۔	(۱۲) عبادات۔
(۱۳) شریعت۔	(۱۴) معاشرتی نظام۔	(۱۵) علوم وفنون۔
(۱۶) تجارت۔	(۱۷) علم تهذيب الأخلاق۔	(۱۸) النجاح۔

اس کتاب کے بعض پہلوؤں پر تنقید کی گئی ہے ، تاہم یہ کتاب موضوعی مطالعہ میں ایک مفید قدم تھا، آئندہ سطور میں تفسیر موضوعی کے مختلف اقسام پیش خدمت ہیں۔

تفسیر موضوعی کے مختلف اقسام

تفسیر موضوعی اور اس فن کی مؤلفات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مختلف انداز و اسالیب رہے ہیں، اس کی تفصیل کو ہم تین اقسام کے تحت شمار کرسکتے ہیں۔

۱- مفردات قرآن کا مطالعہ اوران آیات کا جمع وتتبع جن میں وہ مفرد کلمہ یا اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے، آیات کے جمع واستقراء کے بعد سیاق کلام کے لحاظ سے مختلف معانی ودلالت کی تشریح وتفسیر موضوعی مطالعہ کی ہی

ایک شکل ہے، قرآن مجید کے بعض مفردات مستقل اصطلاحات کی حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً ''الأمۃ، الزکاۃ، الجھاد'' وغیرہ، قدیم مؤلفین جنھوں نے مفردات القرآن یا ''الاشباہ والنظائر'' پر کتابیں لکھی ہیں، ان میں الفاظ قرآن کا موضوعی مطالعہ ہے؛ لیکن قدماء کی کتابیں صرف الفاظ و مفردات قرآن کی لغوی تشریح اور مختلف آیات کے سیاق میں اس کی مختلف دلالتوں کے ذکر تک ہی محدود ہیں، ان کتابوں میں الفاظ کی مختلف دلالتوں کی تشریح کے ساتھ ساتھ ان کے مابین ربط و انسجام کے بیان کا اہتمام نہیں ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مثلاً لفظ ''خیر'' قرآنی مفرادت میں ایک اہم جامع اصطلاح ہے، علامہ دامغانیؒ نے ''اصلاح الوجوہ والنظائر'' میں مادہ: (خ ی ر) کے تحت لکھا ہے ''خ ی ر: علی ثمانية أوجه، المال، الايمان، الاسلام، أفضل، العافية، الأجر، الطعام، الظفر، الغنيمة''(۱) اس کے بعد دامغانی نے ان آیات کا ذکر کیا جن کے اندر یہ مفرد مذکورہ معانی میں استعمال ہوا ہے؛ لیکن کلمۂ ''خیر'' کے اصل معنی اور دیگر معانی کے ساتھ اس کا ربط و تعلق اور انسجام و ہم آہنگی کا بیان نہیں ہے یہی طرز راغب الاصفہانی کا مفردات القرآن میں ہے، لفظ ''اُمۃ'' کے تحت وہ فرماتے ہیں :

والأمة : كل جماعة يجمعهم أمرما إما دين واحد أو زمان واحد أو مكان واحد، وسواء كان ذٰلك الأمر الجامع تسخيرا أو اختيارا، وجمعها أمم، وقوله تعالٰى : " ومامن دابة في الأرض ولاطائر يطير بجناحيه إلا أمم أمثالكم " أى كل نوع منها على طريقة قد سخرها الله عليها بالطبع، فهى من بين ناسجة كالعنكبوت، وبانية كالسرفة، ومدخرة كالنمل، ومعتمدة على قوت وقته كالعصفور والحمام، إلٰى غير ذٰلك من الطبائع التي تخصص بها كل نوع، قوله تعالىٰ : "كان الناس أمة واحدة " أي صنفا واحدا وعلى طريقة واحدة فى الضلال والكفر، وقوله : " ولوشاء ربك لجعل الناس أمة واحدة " أى في الإيمان، وقوله " ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير " أي : جماعة يتخيرون العلم والعمل الصالح يكونون أسوة لغيرهم، وقوله : " إنا وجدنا آبائنا على أمة " أى على دين مجتمع، قال :

وهل يأثمن ذو أمة وهو طائع

وقوله تعالٰى : " وادكر بعد أمة " أي : حين، وقرئ بعد أمة بعد

(۱) ص: ۱۶۷-۱۶۸۔

نسیان ، وحقیقة ذلک بعد انقضاء أهل عصر أو أهل دین ، وقوله : "إن إبراهیم کان أمة قانتا لله " أي قائما مقام جماعة في عبادة الله ، نحو قولهم : فلان في نفسه قبیلة ، وروي أنه یحشر زید بن عمرو بن نفیل أمة وحدة ، وقوله تعالٰی : " لیسوا سواء من أهل الکتاب أمة قائمة " أي : جماعة ، وجعلها الزجاج ههنا للاستقامة ، وقال : تقدیره ذو طریقة واحدة ، فترک الإضمار . (۱)

۲- تفسیر موضوعی کا دوسرا طرز و اُسلوب جس میں کسی خاص موضوع سے متعلق قرآنی آیات کا جمع وتتبع کرنا اور مقاصد قرآن کو ملحوظ رکھتے ہوئے تفسیر کرنا اور اس موضوع کے بارے میں قرآنی ہدایات وتوجیہات کو پیش کرنا ، یہ تفسیر موضوعی کا بڑا وسیع میدان ہے؛ بلکہ مطلقاً تفسیر موضوعی سے مراد اہل علم کے نزدیک یہی طرز ہوتا ہے، قدماء کے یہاں بھی یہ طرز رائج رہا ہے ،مثلاً ''اعجاز القرآن ، مجاز القرآن ، أمثال القرآن ،أحکام القرآن'' جیسی تصانیف اسی نوع کی ہیں ،عصر حاضر میں اس نوع پر بڑا کام ہوا ہے ،فکر ونظر کے نئے گوشوں اور حیات انسانی وتہذیب وتمدن کے جدید تقاضوں سے متعلق قرآنی ہدایات وتوجیہات کے موضوعی مطالعہ کی بے شمار تصانیف وجود میں آرہی ہیں ،مثلاً ''السماء فی القرآن ،الحیوان فی القرآن ،الأرض فی القرآن'' دکتور خلیل حدری کی ''منهجیة التفکیر العلمي في القرآن ''ضیاء الدین عتر کی'' السیرة النبویة في القرآن ''سید قطب کی''مشاهد القیامة في القرآن الکریم ''وغیرہ بے شمار تصانیف ہیں ،راقم السطور نے بھی''الأمة في القرآن '' اور''أخلاق الیهود من خلال القرآن'' کے موضوع پر طالب علمانہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

۳- تفسیر موضوعی کا ایک طرز و اُسلوب یہ ہے جس میں ایک سورت کے ہدف اساسی کو سامنے رکھتے ہوئے موضوعی مطالعہ ہوتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ ہر سورت کا کوئی نہ کوئی محور یا ہدف اساسی وبنیادی مضمون ہوتا ہے، چھوٹی سورتوں میں عموماً ایک ہی محور ہوتا ہے ،جب کہ طویل سورتوں میں یہ محاور مختلف ہوسکتے ہیں ،سورت میں موجود دیگر مضامین اور قصص ومباحث کا بڑا گہرا ربط اس کے بنیادی مضمون سے ہوتا ہے ،اسی طرح مکی آیات کے خاص مضامین الوہیت ،رسالت ونبوت اور عقیدۂ آخرت وغیرہ ہوتے ہیں ،خاص اُسلوب ہوتا ہے ،جب کہ مدنی آیات وسور کے مضامین و اُسلوب مختلف ہیں؛ چنانچہ کسی سورت کے ہدف اساسی کی تشریح اور دیگر مضامین ومباحث کا اس کے ساتھ ربط ملحوظ ہوئے تفسیر بیان کرنا بھی تفسیر موضوعی کی ہی ایک شکل ہے۔

---

(۱) المفردات فی غریب القرآن للاصفهانی ۔

قدماء نے اپنی تفاسیر میں سور قرآن کی اساسیات یا اہداف ومحور مستقل ابتدائے سورت میں بیان کرنے کا باقاعدہ اہتمام نہیں کیا ہے؛ البتہ درمیان کلام بعض اشارات اس جانب ضرور ملتے ہیں، جدید مؤلفین میں سید قطب شہیدؒ نے فی ظلال القرآن میں ہر سورت کی تفسیر سے قبل اس کی اساسیات کو ذکر کرنے کا اہتمام کیا ہے، اسی طرح اُردو میں اس کا اہتمام مولانا اصلاحیؒ نے تدبر قرآن میں کیا ہے۔

کسی سورت کے بنیادی مضمون یا اس سورت کی روشنی میں کسی خاص مضمون کے موضوعی مطالعہ کی مثال دکتور ابراہیم زید الکیلانی کی کتاب ''تصور الألوهية كما تعرضه سورة الأنعام '' یا ان ہی کی ''قضية الرسالة كما تعرضها سورة الأنعام '' دکتور محمد البہی کے رسائل بعنوان: ''التفسير الموضوعي لسور القرآن الكريم '' یا دکتور عبدالحمید طہماز کی ''العواصم من الفتن في سورة الكهف '' در مصطفیٰ مسلم کی ''القيم في سورة الكهف '' اسی نوع چند تصانیف ہیں، راقم السطور نے اس موضوع پر ''الآداب الاجتماعية في سورة النور '' اور ''الصراع بين أهل الكفر الجارين وأهل الايمان الممتحنين'' لکھنے کی کوشش کی ہے، جو انشاء اللہ تکمیل کے مرحلے میں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کے محاور واہداف پر نظر اور غور وتدبر توجیہات ربانیہ سے استفادہ کے نئے آفاق کھولتا ہے، موضوعی تفسیر کے سلسلے میں کسی سورہ کے ہدف کو جاننے کے لئے علماء نے مختلف طریقے لکھے ہیں، سورت کے نام پر بسا اوقات غور کرنے سے اس کے ہدف تک رسائی ہوتی ہے؛ کیوں کہ قرآن کی بعض سورتوں کے نام موضوعی ہیں، علامہ بقاعی نظم الدرر میں لکھتے ہیں :

أن اسم كل سورة مترجم عن مقصودها ، لأن إسم كل شئي تظهر المناسبة بينه وبين مسماه وعنوانه الدال إجمالا على تفصيل ما فيه . (۱)

اساسیات سورت کے فہم میں اس سورت کے اہم واقعات ومشتملات قصص ومسائل کے تدبر سے بھی مدد لی جاسکتی ہے؛ لیکن ''یہ رتبۂ بلند'' ہر کس وناکس کے بس میں نہیں، اس کے لئے گہری نظر، سلامت ذوق، فہم وبصیرت اور قرآنی لطافت کا شعور وادراک، فراست ایمانی ونور تقوی کی ضرورت ہے، یہ ملکہ ان کو نصیب ہوتا ہے جن کے لئے ''نہ رازی گرہ کشا'' ہوتا ہے ''نہ صاحب کشاف'' بلکہ ان کے قلب ونظر کی شفافیت پر ''نزول کتاب'' ہوتا ہے۔

اسی طرح سورت کے اہداف ومقاصد تک رہنمائی زمانہ نزول کی معرفت سے بھی ہوتی ہے؛ کیوں کہ مکی ومدنی سورتوں کے محاور وموضوعات اُسلوب وطرز الگ الگ ہیں، علمائے اُصول نے اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

---

(۱) نظم الدرر: ۱/۱۷-۱۹۔

علم نظم قرآن یا علم المناسبات القرآنیۃ کا بڑا گہرا ربط تفسیر موضوعی سے ہے، اس علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، امام رازیؒ فرماتے ہیں :

أكثر لطائف القرآن مودعة في الترتيبات والروابط . (۱)

سورۂ بقرہ کی تفسیر کے آخر میں فرماتے ہیں :

ومن تأمل لطائف نظم هذه السورة وفي بدائع ترتيبها علم أن القرآن معجز بحسب فصاحة ألفاظه وشرف معانيه ، فهو أيضا معجز بحسب ترتيبه ونظم آياته ، ولعل الذين قالوا : إنه معجز بحسب أسلوبه أرادوا ذلك ، إلا أني رأيت جمهور المفسرين معرضين عن هذه اللطائف غير منتهجين لهذه الأمور ، وليس الأمر في هذا الباب إلا كما قيل :

والنجم تستصغر الأبصار رؤيته
والذنب للطرف لا للنجم في الصغر(۲)

علامہ بقاعیؒ فرماتے ہیں :

وبهذا العلم يرسخ الإيمان في القلب ويتمكن من اللب ، وذلك أنه يكشف أن للاعجاز طريقين : أحدهما : نظم كل جملة على حيالها بحسب التركيب ، والثاني : نظمها مع أختها بالنقل إلى الترتيب ، والأول أقرب تناولا وأسهل ذوقا ، فإن كل من سمع القرآن من ذكي وغبي يهتز لمعانيه ، وتحصل له عند سماعه روعة بنشاط ورهبة مع انبساط لا تحصل عند سماع غيره ، وكلما دقق النظر في المعنى عظم عنده موقع الاعجاز ، ثم إذا عبر الفطن من ذلك إلى تأمل ربط كل جملة بما تلته وما تلاها خفي عليه وجه ذلك ، ورأى أن الجمل متباعدة الأغراض متنائية المقاصد ، فظن أنها متنافرة ، فحصل له من القبض والكرب أضعاف ما كان حصل له بالسماع من الهز والبسط ، ربما شككه ذلك وزلزل إيمانه وزحزح إيقانه ...... فإذا استعان بالله

(۱) البرہان فی علوم القرآن: ۱/۳۶۔ (۲) التفسیر الکبیر: ۷/۱۳۹۔

وأدام الطرق لباب الفرج بإنعام التأمل وإظهار العجز والوقوف بأنه في الذروة من أحكام الربط كما كان في الأوج من حسن المعنى ...... فانفتح له ذلك الباب ولاحت له من ورائه بوارق أنوار تلك الأسرار ، رقص الفكر منه طربل وشكر الله استغرابا وعجبا ، وشاط لعظمة ذلك جنانه ، فرسخ من غير مرية ، ايمانه . (۱)

دکتور مصطفیٰ مسلم تفسیر موضوعی کے لئے نظم قرآنی کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

علم المناسبات وثيق الصلة بالتفسير الموضوعي وبخاصة التفسير الموضوعي للسورة . (۲)

تفسیر موضوعی کی اہمیت

قرآن مجید حیات انسانی کے لئے صحیفۂ ہدایت ہے، جو زندگی کے ہر موڑ پر کامل ومکمل رہنمائی کرتا ہے، قیامت تک اب کوئی دوسری آسمانی کتاب نازل نہیں ہوگی، ہر دور میں تمام مسائل وانسانی مشکلات کا حل اس کتاب کے نصوص میں موجود ہے، یہ حقیقت ہے کہ حیات انسانی میں جمود نہیں ہے، وہ ہر لمحہ جواں اور ہر دم رواں ہے، ہر روز کا سورج نئے علمی، تمدنی، تہذیبی، معاشرتی، اجتماعی مسائل کے ساتھ طلوع ہوتا ہے، ان کے حلول یا ان کے بارے میں ہدایت ربانی، وحکم الٰہی کی معرفت قرآن وسنت کے نصوص پر گہری نظر واجتہاد اور موضوعی مطالعہ کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے، مسائل حیات انسانی کے لئے قرآن کریم کی آیات میں غور وتدبر اور نصوص کا موضوعی مطالعہ وتحقیق سب سے اہم ذریعہ ہے، تفسیر موضوعی کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے، اسی طرح تفسیر موضوعی کے ذریعہ قرآن مجید کے وجوہ اعجاز کے متعدد پہلوؤں کو مزید اُجاگر کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر ہر فن کے اہل اختصاص قرآن کریم کی آیات کے موضوعی مطالعہ کے ذریعہ اس حقانیت کا عین الیقین حاصل کرسکتے ہیں کہ کتاب الٰہی میں ہر تشنگی کے لئے آب زلال موجود ہے اور قرآن مجید ہر پہلو سے گنجینۂ علم وحکمت ہے۔

تفسیر موضوعی کی اہمیت اس پہلو سے بھی ہے کہ آج مغرب نے اجتماعی، نفسیاتی، تربیتی اور تمدنی علوم ومعارف میں خوب ترقی کی ہے، جدید سے جدید تحقیقات ان مضامین پر وجود میں آرہی ہیں، جدید علوم ومعارف کے میدانوں میں ان مضامین کا موضوعی مطالعہ قرآن وسنت کے نصوص کی روشنی میں انتہائی اہم ہے، قرآن کریم سے

(۱) نظم الدرر: ۱/۱۱۔ (۲) مباحث فی التفسیر الموضوعی: ۵۷۔

متعلق مثلاً ان موضوعات ''أصول التربية القرآنية'' یا ''أصول الاعلام الاسلامی'' اور ''علم الحضارة القرآنية'' کا مطالعہ موجودہ علمی میدانوں میں جدید و مبتکر اُسلوب کے ساتھ ایک اہم قدم ہوگا، اسی طرح مقدمہ ابن خلدون کی طرح علمی سنجیدہ علوم و معارف کی تحقیق نصوص کی روشنی میں اگر کی جائے تو ہر منزل پر ہدایت قرآنی کی مشعل فروزاں نظر آئے گی۔

مدارس اسلامیہ اور تفسیر موضوعی

مدارس اسلامیہ ہندیہ میں تفسیری مواد کی بہت کمی اور ایک قسم کی بے اعتنائی پائی جاتی ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں:

> ایک بہت بڑا اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں قرآن مجید کے ساتھ بہت کم اعتنائی کی گئی ہے اور تفسیر و ملحقات تفسیر کی بہت کم کتابیں رکھی گئی ہیں، کل دو کتابیں تفسیر میں داخل ہیں، بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں اور جلالین پوری پڑھائی جاتی ہے؛ لیکن اس کے اختصار کا حال یہ ہے الفاظ اور حروف قرآن مجید کے الفاظ وحروف کے برابر ہیں، قرآن مجید کے ساتھ خصوصی اعتناء درکار ہے۔(۱)

اگر چہ اس قدیم نصاب کے علاوہ بعض دوسرے نصابات بھی وجود میں آئے جن کے اندر کچھ تغیر وتبدل بھی تھا، ندوۃ العلماء کے نصاب میں متن قرآن کی تفسیر داخل نصاب کی گئی؛ لیکن آج بھی موجودہ صورتحال ہم سے اس کی متقاضی ہے کہ ہم محاسبہ سے کام لیں، قرآنیات کے بارے مدارس اسلامیہ ہندیہ کا کردار کیا ہے؟ اس کا اندازہ ہم فارغین مدارس کے ''تفسیری ذوق'' اور اس بارے میں ہوئی پیش رفت سے لگا سکتے ہیں۔

میں اس ''تلخ نوائی'' میں معافی کا خواستگار ہوں کہ ہمارے مدارس سے فارغ ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد وہ ہوتی ہے جن کے اندر فکر اسلامی کے بنیادی سرچشمے قرآن وسنت سے استفادہ واستنباط کی صلاحیت تو درکنار —— بالخصوص قرآن کریم سے —— عام آیات کے محض ترجمے کی استطاعت بھی نہیں ہوتی، مدارس کے فضلاء میں عربی ادب کا ذوق، فقہ وافتاء کی صلاحیت کسی درجہ میں پیدا ہو جاتی ہے، حدیث کا تخصص اور اس کا ذوق بھی ہے؛ لیکن علم تفسیر وقرآنیات کا اعتناء دال میں نمک کے برابر بھی نہیں، ہمارے دارالعلوموں میں ''دالافتاء'' و ''دارالحدیث'' کا جتنا

---

(۱) بحوالہ: ہمارا نصابِ تعلیم کیا ہو: ۱۵۵۔

اہتمام ہے کیا گیا ہے وہی اہتمام کہیں ''دارالقرآن'' کا بھی ہے؟ بہر حال قرآنیات کی حالت مدارس اسلامیہ میں بہت ناگفتہ بہ ہے، اس کی وجہ صرف دوٹوک الفاظ میں یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو ایک ایسی کتاب کی حیثیت سے پڑھاتے ہیں جو صرف ''ابن کثیر و زمخشری رازی و بیضاوی'' کے ہی فہم کی چیز تھی، اس کا تدبر صرف ''اسلاف'' کے لئے مقدر تھا، اس کی ترجمانی و تفسیر میں صرف ان کے اقوال کو یاد رکھنا کافی ہے، زندگی کی ترقی اور روز افزوں نئے نئے فکری، تمدنی، اجتماعی، تعلیمی، تربیتی مسائل کا حل اس میں نہیں ہے، یا کم از کم ہمارے ادراک وشعور فہم و ذوق سے بالا ہے، یہ وہ صورت حال ہے جس نے جس قرآن کریم سے بے اعتنائی کے ساتھ ناامیدی وقنوطیت کو بھی پیدا کیا ہے اور قرآن کریم کے راست فہم وتدبر پر جمود و تعطل کے دبیز پردے ڈال دئے ہیں۔

قرآنیات اور علم تفسیر پر اگرچہ نمایاں خدمات میں ''فراہی'' و ''اصلاحی'' مکتب فکر کا بڑا حصہ ہے، مگر ''وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ'' وہاں بھی ایک نسل کے بعد صرف ''ذوقِ نظر'' باقی رہ گیا ہے، ہمارے مدارس سے علوم القرآن یا علم تفسیر یا بالفاظ دیگر وہ حضرات کیوں پیدا نہیں ہو رہے ہیں، جن کے اندر کچھ ''ولی اللہی'' تب وتاب جاودانہ، فکر ونظر کی بلندی، قرآن وسنت پر گہری نظر ہو، قرآنی ذوق، فہم نصوص کی صلاحیت ہو، ہر مسئلہ کا حل صرف کتاب وسنت ہو؛ بلکہ ان بنیادی مصادر سے راست استفادہ واستنباط کی صلاحیت اور تدبر آیاتِ آفاق وانفس کا ذوق ہو، یقیناً قرآنیات کے اعتناء اور مباحث ومضامین قرآن کے موضوعی مطالعہ سے اس جمود کا کچھ مداوا ہوسکتا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

⊙ ⊙ ⊙

قرآن کریم کی تدریس میں عصری وسائل سے استفادہ

مولانا سید محمد سعد قاسمی ⊙

قرآن پاک کا تعارف

قرآن مقدس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے، یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اللہ قادر مطلق نے اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر پوری ترقی ہوئی انسانیت کے لئے پیغام ہدایت بنا کر نازل فرمائی اور تا قیامت یہ پیغام اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ زندہ و جاوید رہے گا، قرآن مجید اول سے لے کر آخر تک ابدی اور قطعی ہے، اس میں انسانوں کے تغیر پذیر نظریات اور ان کی تحقیقات وتجارب شامل نہیں ہیں، دنیا کے علوم وفنون جس قدر ترقی کریں، طبیعیات اور فلکیات میں انسانوں کے نظریات جو شکل بھی اختیار کریں، زمین مرکز کائنات ثابت ہو یا آفتاب، زمین مسطح ثابت ہو یا کروی الشکل، سیاروں پر آبادی اور عوالم کا تعدد ثابت ہو یا نہ ہو، قرآن کے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا، انسانوں کے علوم آپس میں ٹکرائیں گے اور ٹکرا سکتے ہیں، ان میں سے ایک غلط ہوگا اور ایک صحیح اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں غلط ہوں؛ لیکن خدا کی محفوظ کتاب کے حقائق اور بیانات اور صحیح علم میں کوئی تصادم ممکن نہیں، جو علم اس سے ٹکرائے گا وہ صحیح علم نہیں ہوسکتا، سورۂ کہف (آیت: ۲۷) میں خود قرآن کریم اپنے بارے میں یوں مخاطب ہے:

وَاتْلُ مَا اُوْحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ.

اور اپنے پروردگار کی جانب سے نازل کردہ کتاب میں سے آپ پڑھئے۔
کوئی بھی شخص اس کے کلمات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی نہیں کرسکتا۔

یہ وہ کتاب ہے جس کی شان وعظمت اور قدر و قیمت کا بیان تو کجا، کما حقہ اس کا ادراک بھی انسان کے بس میں نہیں، اس کے اصل مقام ومرتبے کا علم صرف اس شاہ ارض وسماوات کو ہے جس کا یہ کلام ہے اور اس کی حقیقی قدر وقیمت سے آگاہ صرف وہ ذات بابرکت ہے جس پر یہ نازل ہوا۔

⊙ صدر شعبۂ اسلامیات: اذان انٹرنیشنل اسکول، حیدرآباد۔

جدید سائنس سے قرآن پاک کا تعلق

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول ایک سلیم الطبع اور منصف مزاج طالب علم جو بیک وقت جمود اور علم جدید کی مرعوبیت سے پاک ہے، مطالعۂ قرآنی کے وقت یہ حقیقت معلوم کر کے حیران وششدر رہ جاتا ہے کہ اگر چہ یہ کتاب ایک اُمی پر آج سے زائد از چودہ سو برس پہلے عرب کے محدود اور علمی دنیا سے منقطع ماحول میں نازل ہوئی تھی اور اس میں بڑی تعداد میں ان حقائق واشیاء کا تذکرہ آیا ہے جن کا تعلق تاریخ جغرافیہ، طبعیات، فلکیات، علم الحیاۃ، طب، انسان کی خلقت اور اس کے جسم کی تکوین وترکیب اور ایسے بہت سے علوم سے بہت گہرا ہے جن کے بارے میں ان پچھلی صدیوں میں حقائق ومعلومات کا ایک نیا عالم منکشف ہوگیا ہے اور علم انسانی کے زمین وآسمان بدل گئے ہیں، اس میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے، جسے علم جدید نے خلاف واقعہ ثابت کر دیا ہو؛ بلکہ اس سلسلے میں بہت سے ایسے حقائق ومضمرات آ گئے ہیں جن کی علم جدید نے ابھی حال میں نقاب کشائی کی ہے اور اس کو ان تک ابھی حال میں رسائی حاصل ہوئی ہے، اس اجمال کی تفصیل ایک کتاب نہیں؛ بلکہ کتابوں کے ایک سلسلہ کی طالب ہے۔

ہم یہاں پر ایک فرانسیسی فاضل ومحقق مورس بوکائی کی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کا ایک اقتباس بطور شہادت پیش کرتے ہیں، محقق موصوف اس کتاب میں لکھتے ہیں :

> ان علمی پہلوؤں نے جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں، ابتداء ہی میں مجھے ششدر وحیران بنا دیا، میرے ذہن میں کبھی بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک ایسی کتاب میں، جس پر تیرہ سو برس سے زیادہ مدت گذر چکی ہے، اتنی بڑی تعداد میں مختلف موضوعات سے تعلق رکھنے والے دعوے اور اعلانات ہوں گے، جن میں شدید تنوع پایا جاتا ہے اور وہ جدید علمی تحقیقات سے پورے طور پر مطابق پائے جائیں گے۔

مصنف موصوف نے اس سلسلہ میں آسمانوں، زمین کی پیدائش، کائنات کے وجود، اجرام فلکی، ماہیت آسمانی، فلکی دنیا کے ارتقاء، فضاء آسمانی، پانی اور سمندروں کے حیات انسانی میں بنیادی کردار ادا کرنے، سطح زمین اور پہاڑوں، نباتات اور حیوانات کی دنیا، زندگی کے مبداء وآغاز، انسانی توالد وتناسل، تربیت جنین، نیز اہم تاریخی واقعات مثلاً: طوفان نوح، مصر میں بنی اسرائیل کا زمانہ قیام، مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خروج، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون اور اس کی کیفیتِ موت وغیرہ پر علاحدہ علاحدہ بحث اور طبعیات، فلکیات، علم الحیاۃ، طب اور تاریخ کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآن مجید اور بائبل کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ: توراۃ

وانجیل کی ان تصریحات کے مقابلے میں قرآن مجید کی تصریحات علم وتحقیق کے جدید ترین نتائج سے مطابقت میں بالکل منفرد اور ممتاز ہیں۔

وہ اپنی فاضلانہ کتاب کو ان سطروں پر ختم کرتے ہیں: علوم ومعارف کی اس سطح کو سامنے رکھتے ہوئے جو محمد ﷺ کے زمانہ میں پائی جاتی تھی، انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ کثیر التعداد بیانات ودعاوی جو خالص علمی انداز کے ہیں، کسی انسان کی تصنیف ہو سکتے ہیں، اس لئے یہ نتیجہ نکالنا ہر طرح قرین انصاف وعقل ہوگا کہ یہ قرآن وحی خداوندی پر مبنی ہے اور اس کو ہر لحاظ سے خصوصی مقام دیا جانا چاہئے کہ اس کی صحت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایسے علمی نتائج اور مضامین پر مشتمل ہے، جن کا عصر حاضر میں پورے طور پر مطالعہ اور ان کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے، پھر بھی ان کی صحت ثابت ہوئی۔

عصری وسائل اور ترقی

انسان کی فطرت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تحقیق وریسرچ اور تلاش وجستجو رکھی ہے اور بارہا قرآن کریم کبھی سخت تو کبھی نرم انداز میں اپنے پڑھنے والوں کو غور وفکر کرنے کی ترغیب دیتا ہے، کہیں پر قرآن سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے :

أَ فَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ أَقْفَالُهَا ۔ (سورہ محمد:۲۴)

کیا وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں۔

اور کہیں پر قرآن حکم دیتا ہے کہ :

فَسِيْرُوْا فِيْ الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۔ (آل عمران:۱۳۷)

زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

اپنی اسی تلاش وجستجو کی فطرت کی وجہ سے انسان صدہا سال سے میدان علم وفن میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نت نئی ایجادات سے دنیا کو حیرت زدہ کرتا رہا ہے اور ہر زمانہ میں وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق علوم وفنون میں ترقی کرتا رہا ہے، گزشتہ چند دہائیوں میں انسان نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے، حیرت انگیز ایجادات اور دم بخود کردینے والے انکشافات کئے ہیں، ان جدید ایجادات کی وجہ سے انسانی زندگی میں بہت سی سہولتیں فراہم ہوئیں، بطور خاص ابلاغ وترسیل کے ایک سے زائد آسان ترین اور سہولت بخش طریقے حاصل ہوئے، الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ یہ انسان ایک لمحہ میں اپنا پیغام ساری دنیا کو سناتا ہے، اس کے لئے مشرق ومغرب، شمال وجنوب کی دوریاں بے معنی ہوگئیں، تجارتی معاملات وتعلقات کا دائرہ ایک مخصوص علاقہ

اور ملک سے نکل کر عالمی حیثیت اختیار کرگیا ہے، سرمایہ کاروں کے لئے دنیا کی تمام کمپنیوں کی تفصیلات، اسکیمیں اور شرائط انگلی کے ایک اشارے پر ہیں، مال وزر کے تبادلے کے اخراجات اور صعوبتیں ختم ہوگئیں اور مال کے ہلاک یا ضائع ہونے کا اندیشہ بھی نہ رہا، انسان ایک مقام پر بیٹھ کر انٹرنٹ کے ذریعہ ویب سرور پر موجود دنیا کی تمام لائبریریوں کی کتابوں کا مطالعہ کرسکتا ہے، انٹرنٹ کی ترقی کا عالم یہ ہے کہ آج ساری دنیا میں باہمی رابطے، پیغام کی ترسیل، تعلیم وتربیت، بین الاقوامی سطح پر بزنس، بینکوں وتجارتی اداروں کا باہم ربط وضبط اوران کی کارکردگی کی نگرانی کے لئے اس کا استعمال عام طور پر زیادہ موثر اور تیز رفتار سمجھا جاتا ہے۔

آج ہم ٹکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں ہیں جہاں ہر چیز انٹرنٹ پر صرف ایک انگلی کے اشارے پر حاضر ہوسکتی ہے، ہم اس کے ذریعہ قرآن، حدیث، تفسیر، تاریخ، منطق وفلسفہ، جغرافیہ اور سائنس دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ باوضو ہوکر قرآن پاک کو ہاتھ میں لے کر پڑھنا زیادہ اجر وثواب ہے؛ لیکن وہ ممالک جہاں مذہبی اُمور پر سخت ترین پابندی عائد کردی گئی ہے یا کسی نہ کسی طرح پابندی کے حق میں ہیں، جہاں قرآن پاک کونعوذ باللہ دہشت گردی کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت کرکے مسلمانوں کو ہراساں وپریشاں کیا جارہا ہے، ایسے ممالک میں قرآن کے حفظ وتجوید، اس کے مفاہیم ومعانی کو سمجھنے اور سمجھانے کا بہترین ذریعہ انٹرنٹ ثابت ہوسکتا ہے، اس بات سے قطعی انکار نہیں کہ جدید ٹکنالوجی کا استعمال اچھائی اور برائی دونوں کے لئے یکساں طور پر کیا جاسکتا ہے، یہ استعمال کرنے والے کے اپنے فعل پر منحصر ہے، اسی جدید ٹکنالوجی کے ایک بٹن سے میزائل داغ کر ہزاروں بے قصور افراد کی جان بھی لی جاسکتی ہے اور اسی کے ذریعہ انسان کی تاریک زندگی کو روشنی بخشی جاسکتی ہے، حوادثِ زمانہ کی ٹھوکر کھائے ہوئے لوگوں تک مدد کی فراہمی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے، آن لائن قرآن پاک کی تعلیمات سے ان ہزاروں افراد کی پیاس بجھائی جاسکتی ہے، جو حقیقی معنوں میں صحیح علم اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں اور اپنے بچوں کے مستقبل کے تعلق سے فکرمند ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آن لائن قرآن کریم کو پڑھنے، سمجھنے اور حفظ کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز ترقی ہورہی ہے۔

کائنات کے عجائبات

صدیوں سے انسان حقائق کائنات سے متعلق قرآن پاک کے نظریے کو سمجھنے سے صرف اس وجہ سے قاصر تھا کی اس کے پاس جدید سائنسی آلات اور مشینیں نہیں تھیں، یہ تو آج کی اس روز افزوں ترقی کے نتیجہ میں قرآن پاک کی ان آیات کی باریکیوں اور اس کے پوشیدہ علمی ذخائر سے استفادہ کرنے میں ہمیں کامیابی ملی، قرآن کریم کی پرانی تفاسیر اور تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مترجم اور مفسر خواہ کتنے ہی قابل کیوں نہ

رہے ہوں، ان آیات کی جتنی درست، واضح اور حقیقت سے قریب تر ترجمانی آج ممکن ہو سکی ہے وہ اس سے قبل نہیں تھی؛ بلکہ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ سائنس کی موجودہ ترقی اور روز افزوں نت نئے انکشافات کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی بھی انسان کے لئے قطعیت کے ساتھ یہ کہنا ممکن ہی نہیں کہ وہ قرآن پاک کے ان نظریات کو پوری طرح سمجھ چکا ہے، یہ تو علم کا ایسا سمندر ہے جس میں جتنی گہرائی میں انسان جائے گا اتنے ہی موتی ہاتھ آئیں گے، کائناتِ خداوندی میں موجود مخلوقات تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں، اس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے، بے وزن جوہری ذرات سے لے کر بڑی بڑی کہکشاؤں تک، گرم ترین ستاروں سے لے کر سرد ترین خلاؤں تک، سمندر کے چھوٹے جانوروں سے لے کر دیو ہیکل مچھلیوں تک، زمین پر بسنے والی چیونٹیوں سے لے کر قوی اور مضبوط جانوروں تک، دریاؤں سے لے کر پہاڑوں تک ہر ہر شئے اور ہر ہر ذات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طاقت، عظمت، قدرت اور علم کے کھلے ہوئے مظہر ہیں، یہ اللہ کی نشانیاں ہیں اور یہ تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کی جانب سے متعین کردہ راہوں پر محو سفر ہیں۔

کائنات کی تخلیق ''بگ بینگ''

اللہ تعالیٰ کائنات کی تخلیق کا راز کھولتے ہوئے سورۂ انبیاء (آیت:۳۰) میں فرماتے ہیں:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَا هُمَا .

کیا ان کافروں کو معلوم نہیں کہ آسمان اور زمین بند تھے، پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا۔

کائنات کی تخلیق کا مقبول عام سائنسی نظریہ ''بگ بینگ'' کہلاتا ہے، اس نظریے کے مطابق دنیا آغاز میں ستاروں کا ایک جھرمٹ تھی، پھر اس سے کہکشاؤں کا وجود عمل میں آیا، اس کے بعد یہ دنیا ستاروں، سیاروں، سورج اور چاند وغیرہ کی شکل میں تبدیل ہوگئی، اس امر پر تمام سائنس داں متفق ہیں کہ کہکشاؤں کی تخلیق سے پہلے کائنات گیسوں اور دھویں سے پر تھی، جس کو قرآن کریم نے سورۃ حم السجدۃ (آیت:۱۱) میں لفظ 'دخان' سے تعبیر کیا ہے، قرآن کہتا ہے:

ثُمَّ اسْتَوَى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ .

پھر وہ آسمان کی جانب متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

قرآن پاک کی یہ آیت بعینہٖ اسی نظریے کو چودہ سو سال قبل بیان کر چکی ہے، جس کو آج کی ترقی یافتہ سائنس نے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا۔

سمندر میں میٹھے اور تلخ پانی کا وجود

دریاؤں کے تعلق سے قرآن مجید میں سورۂ رحمٰن (آیت:۱۹-۲۰) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ .

اس سے نے دوسمندررواں کیئے جو باہم ملتے ہیں ، ان کے درمیان ایک پردہ ہے، وہ اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتے۔

ایک دوسری جگہ سورہ فرقان میں ارشاد ہے :

وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخاً وَحِجْراً مَّحْجُوراً . (الفرقان:۵۳)

اور وہی تو ہے جس نے دوسمندروں کو ملا رکھا ہے ، جن میں سے ایک کا پانی لذیذ وشیریں ہے اور دوسرے کا کھاری وکڑوا اور ان کے درمیان ایک پردہ اور سخت روک کھڑی کردی ہے۔

''مــرج'' کا لغوی معنی دو چیزوں کو اس طرح ملانا یا ان کا آپس میں اس طرح ملنا ہے کہ ان دونوں کی انفرادی حیثیت اور خواص برقرار رہیں ، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ایک نہایت محیر العقول نشانی بتلائی ہے۔

جدید سائنس نے اکتشاف کیا ہے کہ دومختلف سمندر جہاں آپس میں ملتے ہیں وہاں ان کے درمیان ایک ایسا پردہ حائل ہوتا ہے، جو ان کو ایک دوسرے سے علاحدہ رکھتا ہے اور ہر سمندر کا درجہ حرارت ، کھاری پن اور اس کی کثافت مختلف ہوتی ہے ، یہ کیفیت ہر اس جگہ رونما ہوتی ہے ، جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آکر گرتا ہے ، اس کے علاوہ سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں ، جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس قائم رکھتا ہے ، ترکی کے امیر البحر سید علی رئیس اپنی کتاب 'مرآۃ الممالک' میں جو سولہویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے ، ایسے ہی ایک مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہاں کھارے پانی کے نیچے میٹھے پانی کے چشمے ہیں ، جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لئے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں ، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یہ کرشمہ دنیا میں کئی جگہ پر رونما ہوا ہے ، مثلاً 'جبل طارق' کے مقام پر جہاں بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس ملتے ہیں ، اس کے علاوہ کیپ پوائنٹ ، کیپ پینسولا اور ساؤتھ افریقہ کے ان مقامات پر ، جہاں بحر اوقیانوس اور بحر ہند ملتے ہیں اور مصر کے اس مقام پر جہاں دریائے نیل بحیرہ روم میں جا کر گرتا ہے ، یہی عمل ظہور میں آتا ہے ، بحیرہ روم کا پانی بحر اوقیانوس کے پانی کے مقابلہ گرم ، کھارا اور کم کثیف ہوتا ہے ، جب بحیرہ روم جبل طارق پر سے بحر اوقیانوس میں داخل ہوتا ہے تو یہ بحر اوقیانوس کے دہانے پر سے تقریباً ایک ہزار میٹر کی گہرائی تک اپنی گرمی ، کھارا پن اور کثافتی خصوصیات کے ساتھ کئی سو کلومیٹر دور تک بہتا چلا جاتا ہے اور بحیرہ روم کا پانی اپنی گہرائی پر مستحکم رہتا ہے ، تاہم یہ قدرتی رکاوٹ بڑی

بڑی لہروں، طاقتور موجوں اور مدوجزر کو آپس میں ملنے یا حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیتی، قرآن مجید میں اسی بات کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ دو سمندروں کے پانی جہاں آپس میں ملتے ہیں تو ان کے درمین ایک قدرتی اور انسانی آنکھ کو نظر نہ آنے والی ایک رکاوٹ حائل ہوتی ہے، جو ان دونوں پانیوں کو آپس میں ملنے اور گڈمڈ ہونے سے روکتی ہے اور بظاہر ملے ہوئے ہونے کے باوجود دونوں سمندروں کے پانیوں کے خواص اپنی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔

یہاں ایک بات اور قابل غور ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سورۂ رحمٰن میں جب دو سمندروں کے آپس میں ملنے ذکر فرماتے ہیں تو ان کے درمیان رکاوٹ کو صرف ایک لفظ 'بــرزخ' سے ظاہر فرماتے ہیں، مگر سورۃ الفرقان میں جب میٹھے اور کھارے پانی کا ذکر فرماتے ہیں تو ان کے درمیان رکاوٹ کے لئے تین الفاظ ''بـرزخاً وحجراً محجوراً'' استعمال فرماتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محل وقوع کے لحاظ سے رکاوٹوں کی قسموں اور نوعیت میں فرق ہوتا ہے، اسی چیز کو جدید سائنس نے ابھی حال ہی میں معلوم کیا ہے کہ سمندر کے مدجزر والے دہانوں میں جہاں میٹھے اور نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں صورت حال اس جگہ سے مختلف ہوتی ہے جہاں دو سمندر ملتے ہیں، تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ دریاؤں کے دہانوں میں تازہ پانی اور کھارے پانی کے درمیان ایک گاڑھے پانی کا حجاب ہوتا ہے، جو تازہ پانی اور کھارے پانی کی پرتوں کو ملنے نہیں دیتا، یہ پردہ تازہ پانی اور کھانے پانی کے انفرادی خواص سے مختلف کھارے پن کا حامل ہوتا ہے، انسانی آنکھ جس طرح دو سمندروں کے ملاپ کے فرق کو نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح مدوجزر کے دہانے میں تین اقسام کے پانی کو نہیں دیکھ سکتی، سبحان اللہ! اس مسئلہ میں بھی قرآن اور جدید سائنس میں زبردست مماثلت پائی جاتی ہے، جب کہ قدرت کے اس کرشمے کو قرآن پاک کے نزول کے صدیوں بعد بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔

چاند کی روشنی منعکس ہے

ایک دوسری جگہ موجودہ سائنس قرآن پاک کے سورج اور چاند سے متعلق اس نظریہ کو تقویت دے رہی ہے کہ چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں؛ بلکہ سورج کی روشنی کو زمین پر منعکس کرتا ہے، قرآن پاک سورۂ فرقان (آیت:۶۱) میں کہتا ہے:

تَبَارَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِىْ السَّمَاءِ بُرُوْجاً وَجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجاً وَقَمَراً مُّنِيْراً .

وہ ذات بہت عالی شان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور اس میں ایک چراغ اور نورانی چاند بنایا۔

قرآن کریم میں سورج کے لئے عربی لفظ ''شمس'' کا استعمال ہوا ہے اور یہاں اس کو سراج یعنی چراغ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ شدید حرارت اور گرمی پیدا کرتا ہے، اس کے بالمقابل چاند جس کو عربی میں ''قمر'' کہتے ہیں اس کو یہاں منیر یعنی نورانی اور روشنی کا عکس دینے والا کہا گیا ہے، یہاں قرآن کریم کا فرمان مبارک ایک مرتبہ پھر انتہائی جامعیت کے ساتھ چاند کی حقیقی نوعیت کو بیان کر رہا ہے۔

آخری پیغام اُمت کے نام

میرا مقصد کوئی سائنسی حقائق و ایجادات بیان کرنا نہیں ہے اور نہ ہی قرآن پاک کی آیات کا سائنسی ایجادات سے موازنہ کرنے کی میری جرأت ہے؛ کیوں کہ قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے، اس میں جدید علمی حقائق کو تلاش کرنے اور ایک طرف اس کے بعض اشارات اور اجمالی بیانات اور دوسری طرف جدید تحقیقات واکتشافات میں تطبیق بڑا نازک اور کسی حد تک پرخطر کام ہے، اس لئے کہ اس کا قوی امکان ہے کہ علم تحقیق کے یہ نتائج جو اس وقت بالکل بدیہی اور ثابت شدہ حقائق سمجھے جا رہے ہیں، بالکل بدل جائیں یا ان کا ثبوت وقطعیت مجروح ومشکوک ہو جائے۔

ان سائنسی ایجادات واکتشافات کے ذریعہ میں آپ تک اور آپ کے توسط سے پوری مسلم قوم تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ موجودہ دور کی ترقی کو ہم اپنی اور اپنے نونہالوں کی تعلیم میں معین و مددگار بنائیں، اسکولوں اور مدارس اسلامیہ میں ان جدید عصری وسائل، کمپیوٹر، انٹرنٹ، پراجکٹر اور سائنسی لیباریٹریز کا استعمال کر کے قرآن کریم کی ان تعلیمات پر جو آج سے قبل اتنی وضاحت اور اتنی گہرائی کے ساتھ ہم تک نہیں پہنچ سکیں یا ان کی تحقیق تشنہ رہ گئی، مزید تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے؛ تا کہ ہمارے یہ طلبہ قرآن عظیم کی باریکیوں، اس کی وسعتوں اور اس کی گہرائیوں کا صحیح اندازہ لگا سکیں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ تعلیم و تدریس کے مقاصد کی تکمیل کی خاطر ہم جدید آلات اور عصری وسائل سے لیس ہو کر میدان عمل میں آئیں، اشاعتی اسباب پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ تعلیم اتنی عام کر دی جائے کہ ان وسائل اور اسباب میں تعلیم و تدریس کا استعمال کثرت سے ہونے لگے، جس نظم وضبط کے ساتھ ریڈیو، ٹی وی چینلس اور ہزاروں ویب سائٹس کا استعمال اخلاق و کردار کو بگاڑنے اور فحاشی کو پھیلانے کے لئے ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ بہتر اور منظم طریقے سے دینی تعلیم کو فروغ دینے اور اصلاحی مقاصد کی تکمیل کے لئے اخلاقی گندگیوں سے پاک چینلس اور فحاشی سے محفوظ ویب سائٹس کا قیام عمل میں لیا جائے، ہر چینل، ہر ویب سائٹ اور ہر ذریعہ ابلاغ و ترسیل کی غیر معمولی تشہیر ہو؛ تا کہ اس کی وجہ سے فوراً نہ سہی آہستہ آہستہ مقاصد کی تکمیل

ہو سکے، اس سلسلے میں مستشرقین کی جانب سے اسلام پر ہونے والے نت نئے اعتراضات کے ٹھوس عقلی و سائنسی بنیادوں پر جواب کے لئے 'جدید علم کلام' کو باقاعدہ فروغ دینے کی بھی ضرورت ہے، اس سے نہ صرف مغربی افکار کی یلغار کی وجہ سے مسلم نوجوانوں میں اپنے عقائد و نظریات کے بارے میں جنم لینے والی تشکیک سے نجات ملے گی؛ بلکہ غیر مسلم اقوام پر بھی اسلام کی حقانیت عیاں ہوگی۔

عالم اسلام کے موجودہ زوال و انحطاط کا بنیادی سبب جہالت، علمی روش سے کنارہ کشی اور صدیوں کی غلامی کے بعد ملنے والی آزادی کے باوجود جاہل حکمرانوں کا اپنی قوم کو حقیقی علم انسانی کے حصول میں پس ماندہ رکھنا ہے، نئی نسل کی ذہانت صدیوں سے مسلط عالمی محکومی کے زیر اثر دب کر رہ گئی ہے، دور حاضر کے مسلم نوجوان کے تشکیک زدہ ایمان کو سنبھال دینے کی واحد صورت یہ ہے کہ اسے اسلامی تعلیمات کی عقلی و سائنسی تفسیر و تفہیم سے بھی آگاہ کرتے ہوئے سائنسی دلائل کے ساتھ مستحکم کیا جائے، قومی سطح پر چھائے ہوئے احساس کمتری کے خاتمے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ نئی نسل کو مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں سے روشناس کرایا جائے؛ تاکہ ان کی سوچ کو مثبت راستہ ملے اور وہ جدید سائنسی علوم کو اپنے لئے کارآمد سمجھتے ہوئے اپنے اسلاف کی پیروی میں علمی و سائنسی روش کو اپنا کر پختہ علمی بنیادوں کے ساتھ احیاء اسلام کا فریضہ انجام دے سکیں۔

⊙ ⊙ ⊙

آٹھواں باب

عصری تعلیمی اداروں اور عوام الناس میں قرآن کی تعلیم

عام لوگوں تک قرآن مجید کی رسائی

ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالرحیم ⊙

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء والمرسلين نبينا محمد و على آله وصحبه أجمين .

1. تعارف

قرآن کریم 'ھدی للناس ' ہے،یعنی سارے انسانوں کے لئے ہدایت کی کتاب ہے،اس لئے اللہ تعالیٰ نے یقیناً اس کو آسان کیا ہے،اللہ تعالیٰ نے سورۃ القمر میں بار بار فرمایا ہے :

ولقد یسرنا القرآن للذکر . (آیت:۱۷،۲۲،۳۲،۴۰)

اور البتہ تحقیق ہم نے قرآن کو آسان کیا ہے ذکر کے لئے۔

اس لئے ہماری زبان پر یہ بات کبھی نہیں آنی چاہئے کہ قرآن مشکل ہے، کیا ہم قرآن کو جھٹلانے والے بنیں گے؟

قرآن ذکر کے لئے آسان ہے، ذکر کے دو معنیٰ مفسرین نے لکھے ہیں :

(۱) یاد کرنا۔

(۲) سمجھنا اور نصیحت حاصل کرنا۔

آسانی کے اس پہلو کا تعلق سمجھنے اور نصیحت حاصل کرنے سے ہے، ایک انسان قرآن پڑھ کر یہ جان سکتا ہے کہ ایمان اور عمل کے کون سے پہلو ہیں جن سے اللہ خوش ہوتا ہے،قرآن کی آیتوں سے احکام بھی اخذ کئے جاسکتے ہیں اور فتاویٰ بھی دیئے جاسکتے ہیں ؛ لیکن اس کام کے لئے ایک انسان کو علماء کرام کے پاس کئی سال ؛ بلکہ کئی دہے گزارنے ہوں گے ؛ تاکہ وہ مختلف علوم سیکھے جو فتاویٰ دینے کے لئے ضروری ہیں۔

⊙ استاذ: جامعۃ الملک فہد، دہران، سعودی عرب۔

اس مقالے میں ہم عام لوگوں تک قرآن مجید کا معجزۃ التیسیر اور قرآن کو پڑھانے اور سمجھانے کے چیلنجز پیش کریں گے اور ہی ساتھ اس میدان میں اپنے تجربات کو بھی۔

2. معجزۃ التیسیر

قرآن کو اللہ نے آسان کیا ہے اور یہ بھی قرآن کا ایک زبردست معجزہ ہے، وہ کتاب جس نے تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، ایک عام آدمی کے لئے نصیحت حاصل کرنے کے پہلو سے انتہائی آسان ہے، اس آسانی کے بڑے عجیب اور دلچسپ پہلو ہیں، جن میں سے بعض کو یہاں بیان کیا جائے گا۔

2.1 الفاظِ قرآن کے پہلو سے آسانی

حافظی مدنی مصحف کے یعنی وہ جس کو حفاظ استعمال کرتے ہیں، 600 صفحات ہیں، ہر صفحہ پر 15 سطور آتی ہیں اور سطر میں 9 الفاظ، اس طرح سے قرآنی مصحف کے ہر صفحے پر تقریباً 130 الفاظ بنتے ہیں اور قرآن میں تقریباً 78,000، اگر اس میں تکرار کو نکال دیا جائے تو یہ تعداد گھٹ کر 17,000 ہو جاتی ہے، اگر ایک طالب علم ایک مادے سے فعل کے مختلف صیغے بنانا سیکھ لے مثلاً ''عَلِمَ سے یعلمون ، علمتم ، عالم ، معلوم'' وغیرہ تو یہ تعداد 17,000 سے گھٹ کر 4,500 ہو جاتی ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں صرف 1,850 مادے ہیں؛ لیکن ایک غیر عرب کے لئے مادے کے ثلاثی مجرد والے افعال کے صیغے جاننا کافی نہیں؛ بلکہ اس کے ثلاثی مزید فیہ کے ابواب کو بھی سیکھنا پڑے گا؛ کیوں کہ ایک ہی مادے سے جو الفاظ نکلتے ہیں، وہ بعض وقت معانی کے لحاظ سے بالکل مختلف بھی ہوتے ہیں، مثلاً: عَلِمَ کا مطلب ہے جاننا، مگر عَلَّمَ کا سکھانا اور تَعَلَّمَ کا مطلب سیکھنا ہے، اس لئے ایک غیر عرب کو 1,850 کے بجائے 4,500 الفاظ سیکھنے کی ضرورت ہے۔

یاد رہے کہ فعل کے ساتھ جب مختلف حروفِ جر آتے ہیں تو اس فعل کے معنی بدل جاتے ہیں، اس طرح سے تعداد تھوڑی سی زیادہ ہوسکتی ہے، ایک اُردو داں کے لئے 4500 الفاظ کو جاننا ضروری نہیں؛ کیوں کہ قرآن کے سینکڑوں الفاظ کو وہ پہلے ہی سے جانتا ہے، مثلاً: اللہ، رب، رحیم، ایمان، عمل، شکر، صبر، زکوۃ، حج، وغیرہ۔

2.2 نماز و اذکار کے پہلو سے آسانی

صرف سورۂ فاتحہ کے الفاظ قرآن میں سات ہزار 7000 بار آئے ہیں، یعنی قرآنی الفاظ کے تقریباً دس فیصد بالفاظ دیگر قرآن کا تقریباً ہر دسواں لفظ سورۃ الفاتحہ سے ہے، بنیادی قواعد کے ساتھ ساتھ اگر آپ صرف

سات سورتیں سیکھ لیں، مثلاً: سورۃ الفاتحہ، العصر، النصر، الکافرون، الاخلاص، الفلق اور الناس اور اس کے ساتھ تشہد، درود، رکوع وسجود کی تسبیحات اور سلام سے پہلے وبعد کی دُعائیں سیکھ لیں تو تقریباً ایک سو پچیس الفاظ بھی سیکھ لیں گے، جو قرآن کریم میں تقریباً چالیس ہزار 40,000 بار آئے ہیں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کا ہر دوسرا لفظ اذکار نماز سے ہے، جو ایک عام مسلمان روزانہ دہراتا رہتا ہے، اس کو ہم نے ایک کورس کی شکل میں ترتیب دیا ہے جو www.understandquran.com پر مفت دستیاب ہے، واضح رہے کہ اس کورس میں ثلاثی مجرد کے اہم افعال کی گردانوں کو بھی سکھایا جاتا ہے؛ تاکہ فعل کے ہر صیغے کو الگ الگ سیکھنے کے بجائے ایک طالب علم ایک مادے سے یہ سارے صیغے بنانا سیکھ لے، علم صرف کے ان پہلوؤں کو سکھانے کے لئے الحمدللہ ایک نیا طریقہ ایجاد کیا گیا ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اوپر کی سات سورتوں کے علاوہ مزید چھ سورتیں اور اکثر پڑھی جانے والی آیات اور دُعائیں سیکھ لی جائیں اور ساتھ میں صَرف کے مزید قواعد بھی، خاص کر ثلاثی مزید فیہ کے ابواب، تو مزید 150 الفاظ بھی سیکھے جاسکتے ہیں، جو قرآن کریم میں تقریباً 15,000 بار آتے ہیں، یہ ہمارا دوسرا کورس ہے، جو کوئی مقامات پر پیش کیا گیا ہے، دونوں کورسس کے بعد ایک طالب علم 275 الفاظ جو قرآن میں 55,000 بار آتے ہیں، سیکھ لیتا ہے، یہ 275 الفاظ قرآن کے مجموعی الفاظ کا 70 فیصد بنتے ہیں۔

قرآنی تعلیم کی ان کورسس کے ساتھ ابتداء کرنے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک عام طالب علم کو اس کے فوری فائدے نظر آتے ہیں، اس کو نماز واذکار سمجھ میں آنے لگتے ہیں، متن اس کے لئے مانوس ہوتا ہے، پریکٹس کرنے کا بھرپور موقع ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خوشی کا ایک عظیم احساس کہ اس نے اتنے سارے قرآنی الفاظ جان لئے ہیں۔

ان دو کورسس کے بعد قرآن مجید کے عربی متن کو سمجھنا بہت ہی آسان ہوجاتا ہے، یہ بات ٹیبل نمبر: 1 میں دیئے گئے ہر صفحہ پر آنے والے نئے الفاظ کی تعداد سے بالکل واضح ہوجاتی ہے، یادرہے کہ اس طریقہ تعلیم میں سارا قرآن مجید معتبر ترجمے کی مدد سے پڑھایا جاتا ہے۔

ٹیبل نمبر: 1 قرآن کریم میں ہر صفحے پر نئے الفاظ (20 گھنٹے کے کورس کے بعد):

- پارہ : 1 : 20 نئے الفاظ ہر صفحہ پر۔
- پارہ : 2 سے 5 : 12 نئے الفاظ ہر صفحہ پر۔
- پارہ : 6 سے 28 : 6 نئے الفاظ ہر صفحہ پر۔
- پارہ : 29 اور 30 : 12 نئے الفاظ ہر صفحہ پر۔

قرآن کریم کے حافظی مصحف میں ہر صفحہ پر تقریباً 130 الفاظ ہوتے ہیں، ان میں نئے الفاظ الفاظ اگر 20 بھی ہوتوں تو 110 الفاظ پُرانے ہوتے ہیں، یعنی پُرانے الفاظ کا بھرپور موقع ہر صفحے پر دستیاب ہے۔

اس طریقۂ تعلیم میں ہر صفحے کی تعلیم کے لئے صرف آدھا گھنٹہ چاہئے، اس طرح سے پورا قرآن کریم سیکھنے کے لئے صرف 300 گھنٹوں کی ضرورت ہے، ایک عام اسکول میں پانچویں جماعت سے قرآن پڑھانا شروع کیا جائے تو 600 پیریڈس میں سارا قرآن ختم کیا جاسکتا ہے۔

3. قرآن فہمی اور عربی زبان سیکھنا

مدرسوں اور اسکولوں میں ابتداء عام طور پر عربی زبان کی تعلیم سے کی جاتی ہے، مثلاً: ''بَيْتٌ كَبِيرٌ ، تِلْكَ حَدِيقَةٌ جَمِيلَةٌ'' یہ طرز عام لوگوں کے لئے جو غیر عرب ماحول میں رہتے ہوں مناسب نہیں، اس کے بجائے اگر نماز اور عام اذکار سے تعلیم شروع کی جائے تو اس کے کئی فائدے ہیں، ایک مسلمان پانچوں نمازوں میں ایک گھنٹہ لگاتا ہے، گویا اس کو زبان کی پریکٹس کرنے کا بھرپور موقع ملتا ہے، یہ چیز ہر مسلمان کے لئے مفید ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا بچہ؛ کیوں کہ سبھی نماز پڑھتے ہیں۔

4. عربی قواعد کی تعلیم

ان مسائل سے مؤثر طور پر نمٹنے کے لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ قرآن فہمی کے کورس کو اتنا دلچسپ اور مؤثر بنا کر پیش کیا جائے کہ لوگ خود اس کی طرف کھنچتے چلے آئیں، اس دور کا یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے، جس پر مسلسل کام کی ضرورت ہے۔

4.1 مصطلحات کا ڈر

کوشش کی جائے کہ عربی قواعد کی مصطلحات سے شروع میں جہاں تک ہو سکے پرہیز کیا جائے، عام آدمی کے لئے نئے الفاظ سیکھنا ہی چیلنج ہے، اگر اس میں مصطلحات کی بھرمار بھی کردی جائے تو طلباء کی حاضری آہستہ آہستہ کم ہوجاتی ہے، جن اساتذہ نے عربی زبان مدرسہ یا کالج میں سیکھی وہ بعض اوقات اس کو اسی طرح اور ان ہی کتابوں سے پڑھاتے ہیں، جس طرح انھوں نے سیکھا، پچھلے سالوں میں کئی جگہ اس روایتی طریقۂ تعلیم کو عام لوگوں پر آزمایا گیا، وہ کلاس جو 50 یا 75 طلباء سے شروع ہوتی، پانچ چھ دروس کے اندر ہی گھٹ کر 5 / 10 طلباء تک محدود ہوکر رہ جاتی تھی، اس مایوس کن نتیجہ پر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ لوگوں میں شوق نہیں؛ حالاں کہ پہلی کلاس میں 50 کی حاضری اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں میں شوق موجود ہے، ہم کو عوام الناس میں پڑھانے کے لئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ لوگوں پر لا پرواہی کا الزام دھرنے کی۔

4.2 فعل کے مختلف صیغوں کی تعلیم، کامل جسمانی تعامل (Total Physical Interaction) یاTPI کے ذریعے :

عربی زبان میں ایک ہی مادے سے سینکڑوں الفاظ بنائے جاسکتے ہیں اور ایک ہی فعل کو بتانے کے لئے حاضر، غائب، مذکر، مؤنث، واحد، جمع وغیرہ ہر ایک کے لئے الگ الگ صیغے استعمال ہوتے ہیں، ان کی تعلیم ایک بڑا چیلنج ہے، صرف ٹیبل کی صورت میں اس کو پیش کرنے سے یا محض رٹانے سے یہ کام آسان نہیں ہوتا، عام لوگ ان صیغوں کی بہتات کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں، اس کو آسان کرنے کے لئے ہم نے TPI کے طریقہ کا ایک خاص اُسلوب ایجاد کیا ہے، TPI کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے سارے جسمانی وجود کا استعمال کرے، یعنی سنے، دیکھے، پڑھے، سمجھے، زبان سے دہرائے، اشارے کرے، شوق سے پڑھے اور دوسروں کے ساتھ مل کر پڑھے، ان میں اشاروں کا بہت اہم ہے، سیدھے ہاتھ کا اشارہ سیدھی طرف غائب کے لئے، سامنے حاضر کے لئے اور خود کی طرف متکلم کے لئے استعمال ہوتا ہے، ایک انگلی واحد کے لئے اور چار انگلیاں جمع کے لئے استعمال ہوتی ہیں، ماضی کے لئے ہاتھ کی سطح نیچے اور مضارع کے لئے نسبتاً اوپر رکھی گئی ہے، اسی طرح بائیں ہاتھ کے سارے اشارے مؤنث کے لئے مختص کئے گئے ہیں، اس طریقے میں ایک سبق میں تقریباً چھ الفاظ سکھائے جاتے ہیں، بطور نمونہ چند اسباق نیچے دیئے جارہے ہیں :

- ⊙ پہلے سبق میں ضمائر منفصلہ : هُوَ ، هُمْ ، أَنْتَ ، أَنْـتُمْ ، أَنَـا ، نَحْنُ ۔
- ⊙ تیسرے سبق میں ضمائر متصلہ : ـهٗ ، ـهُمْ ، ـكَ ، ـكُمْ ، ـِيى ، ـنَا ۔
- ⊙ آٹھویں سبق میں فعل ماضی : فَعَلَ ،فَعَلُوْا ،فَعَلْتَ ،فَعَلْتُمْ ،فَعَلْتُ ،فَعَلْنَا ۔
- ⊙ نویں سبق میں فعل مضارع : يَفْعَلُ ،يَفْعَلُوْنَ ،تَفْعَلُ ،تَفْعَلُوْنَ ،أَفْعَلُ ،نَفْعَلُ۔
- ⊙ دسویں سبق میں امر ونہی : اِفْعَلْ ، اِفْعَلُوْا ، لَا تَفْعَلْ ، لَا تَفْعَلُوْا ۔

اس طرح صرف 10، 10 منٹ کے ان اسباق میں بنیادی گردانیں سکھائی جاتی ہیں، سبق کے اختتام پر طلباء کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ الفاظ قرآن میں کتنی بار آتے ہیں، مثلاً ''هُوَ ، هُمْ ، أَنْتَ ، أَنْتُمْ ، أَنَـا ، نَحْن '' قرآن میں 1295 بار آتے ہیں، یہ تعداد قواعد کی خشک پریکٹس کے لئے بہت ہمت افزائی کا کام دیتے ہیں اور اس کو دلچسپ کام بنادیتے ہیں۔

4.3 دلچسپ مثالوں سے تعلیم

عربی قواعد میں کئی چیزیں ہیں، جن کو دلچسپ مثالوں سے سمجھایا جاسکتا ہے، اس میدان میں پہلے بھی یقیناً کئی کام ہوئے ہیں، یہاں پر ہم اپنے کچھ تجربات ومشورے پیش کررہے ہیں۔

⊙ فعل کے ابواب کو یاد کروانا : فعل ثلاثی کے چھ ابواب ہیں، جن میں سے صرف چار کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے: "فَتَحَ ، نَصَرَ ، ضَرَبَ ، سَمِعَ " ان چاروں کو یاد دلانے کے لئے یہ جملے ترتیب دیئے گئے ہیں: قرآن کھولو گے (فَتَحَ) تو اللہ مدد کرے گا (نَصَرَ) ورنہ مار پڑے گی (ضَرَبَ)، اس لئے سن لو (سَمِعَ)۔

⊙ ثلاثی مزید فیہ : اس کو بھی اُردو کی مثالوں سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، اُردو میں بھی مزید فیہ کے مختلف ابواب ہیں، جیسے اُترنا سے اُتارنا اور اُتروانا، گرنا سے گرانا اور گروانا، کھانے سے کھلانا اور کھلوانا، پینا سے پلانا اور پلوانا وغیرہ۔

⊙ جمع مکسر : قواعد کے اعتبار سے واحد مؤنث ہوتی ہے، یہ قاعدہ ایک اُردو دان کے لئے بہت ہی مشکل سے ہضم ہوتا ہے، اس کو بہت آسانی سے یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ اُردو میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے! مثلاً ہم کہتے ہیں: میری اولاد پڑھتی ہے، اس مثال میں ولد کی جمع اولاد ہے، جو کہ جمع مکسر ہے، اُردو میں ہم اولاد کے ساتھ واحد مؤنث استعمال کرتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ میرے اولاد پڑھتے ہیں، عربی میں یہ قاعدہ ہر جمع مکسر کے لئے استعمال ہوتا ہے، جیسے جبال اونچی ہے، بیوت اچھی ہے وغیرہ۔

⊙ جدید طریقوں کا استعمال : جدید تحقیقات کے مطابق اگر دماغی نقشوں (Mind map) کو استعمال کیا جائے تو کئی قواعد کو آسانی سے یاد کروایا جا سکتا ہے، علم النحو کے اعتبار سے اسماء کی مختلف حالتوں کو سمجھانے کے لئے اس قسم کا ایک نقشہ شکل نمبر: (1) میں دیا گیا ہے۔

5. بعض اہم چیلنجس

عام لوگوں کو قرآن سکھانے کے لئے کئی چیلنجس سامنے آتے ہیں، جن میں سے بعض کو یہاں بیان کیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے تجربات کو بھی پیش کیا ہے، اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس طرح کے کئی تجربات کیئے جائیں؛ تا کہ بہتر اُسلوب کو ترتیب دیا جا سکے۔

5.1 مدرسہ یا اسکول کے ماحول کی کمی

ایک مدرسہ یا اسکول میں طالب علم کو تعلیم کا ماحول ملتا ہے، ساتھی موجود ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر ہمت بڑھتی ہے، اساتذہ کا مسلسل ساتھ رہتا ہے اور دن کا اکثر وقت سیکھنے میں گزرتا ہے، عام لوگوں کے لئے ان چیزوں کے فقدان کی وجہ سے قرآن کی تعلیم اتنی رفتار سے اور اتنی مؤثر نہیں ہو سکتی جتنی کہ ایک مدرسہ میں ہو سکتی ہے۔

5.2 مفت کورس کے مسائل

ہندو پاک میں یہ رجحان غالب ہے کہ دین کی تعلیم کو مفت ہونا چاہئے ،مشکل سے لوگ اس بات کے لئے آمادہ ہوتے ہیں کہ وہ قرآن سیکھنے کے لئے مالی قربانی دیں، اگر ان کورسس کے لئے فیس رکھی جائے تو بہت کم لوگ سیکھنے کے لئے آمادہ ہوں گے اور اگر مفت رکھا جائے تو دیگر مسائل سامنے آتے ہیں، مثلاً حاضری میں ہوم ورک میں لاپرواہی ،معمولی مصروفیات کو کورس پر ترجیح وغیرہ۔

5.3 دیگر مصروفیات کا غلبہ

مدرسہ کے طالب علم کی بہ نسبت ایک عام آدمی اپنے کام یا تجارت میں زیادہ مصروف رہتا ہے ،اس کے پاس مدرسہ کے طالب علم کی طرح اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اس تعلیم پر مسلسل توجہ دے سکے؛ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ہر انسان کے پاس ایسے کئی لمحات ہوتے ہیں، جن کو وہ استعمال کرسکتا ہے، یہ بات معلم پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح ان کو اس بات پر آمادہ کرسکتا ہے کہ لوگ اپنے فارغ اوقات کو استعمال کریں ،مصروفیات کے دوران ہی سلسلۂ تعلیم و جاری رکھنے کے لئے ہم نے مندرجہ ذیل سات بالکل ہلکے ہوم ورکس تجویز کئے ہیں :

1- کم از کم پانچ منٹ مصحف (قرآن) دیکھ کر تلاوت کرنا۔

2- کم از کم پانچ منٹ بغیر دیکھے اپنے حافظہ سے ،جو بھی یاد ہو، تلاوت کرنا۔

3- کم از کم پانچ منٹ پچھلے اور اگلے سبق کا اس کتاب سے مطالعہ کرنا، معانی کو اور گرامر کے صیغوں کو لکھتے ہوئے۔

4- کم از کم تین بار ہوسکے تو نمازوں سے پہلے یا بعد میں یا جیسا بھی موقع ملے، صرف آدھے منٹ کے لئے الفاظ و معانی کے ورق سے مطالعہ کرنا۔

5- ٹیپ ریکارڈ یا سی ڈی (CD) یا موبائیل سے ان آیات واذکار کے لفظی ترجمہ کو سننا۔

6- دن میں کم از کم ایک منٹ اپنے اس کلاس کے دوستوں سے سبق کے تعلق سے بات کرنا۔

7- جو سورتیں یاد ہوں، ان کو نمازوں میں معانی پر دھیان دیتے ہوئے پڑھتے رہنا۔

5.4 شوق کو قائم رکھنا

عوام الناس میں قرآن کو پڑھانے کا سب سے اہم ترین چیلنج حاضری کو برقرار رکھنا اور ساتھ ہی ساتھ ان

کے شوق کو زندہ رکھنا ہے، ہر کلاس میں ان کو یہ مسلسل احساس دلایا جاتا رہا ہے کہ ان کو کتنا فائدہ ملا، قرآن میں کتنی بار آنے والے الفاظ سیکھے وغیرہ، اس کام کے لئے ترغیب وترہیب کے مختلف پہلوؤں کو نئے نئے انداز سے مسلسل پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

6. اختتامی بات

مختلف اصحاب نے اس میدان میں مختلف طریقوں کو رواج دیا ہے، اس کے باوجود آج بھی مسلمانوں میں تقریباً 90 فیصد لوگ قرآن کو نہیں سمجھتے، اس محاذ پر شدید محنت کی ضرورت ہے؛ تا کہ ایک عام مسلمان قرآن کے پیغام کو سمجھ سکے اور پھر دوسرے غیر مسلم بھائیوں اور بہنوں کو پہنچانے کے قابل ہو، اس پیغام کو انٹرنیٹ اور موبائیل فونس، ای میلس، Ipods، فیس بک، ٹویٹر، Animation، گرافکس اور کمپیوٹر گیمس کے بھرپور استعمال کرتے ہوئے نئے طریقوں اور اُسلوب کو تیار کرنا ہے؛ تا کہ ہر وسیلہ سے نئی نسل میں قرآن کی تعلیم کو عام کیا جا سکے۔

وما علينا إلا البلاغ المبين .

⊙ ⊙ ⊙

عام لوگوں کو قرآن مجید سے کیسے جوڑا جائے؟

جناب حیدر محی الدین غوری⊙

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم ، اما بعد ، فأعوذ بالله من الشیطن الرجیم ، بسم الله الرحمن الرحیم .

صدر محترم اور شہ نشیں پر تشریف فرما علماء کرام، ومعزز سامعین !

اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اُس نے اپنا کلام (قرآن مجید) بنی نوع انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل فرمایا؛ لیکن موجودہ حالات میں ایک منظّم طریقہ سے اس کتاب ہدایت کے خلاف بڑے پیمانہ پر شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں اور عالم انسانی کو اس سے متنفر کیا جارہا ہے؛ جب کہ ساری انسانیت کی کامیابی اسی کتاب سے وابستہ ہے، ان حالات میں قرآن کانفرنس کا انعقاد انتہائی خوش آئند اقدام ہے آج اس موقع پر مجھے ''عام لوگوں کی قرآن مجید تک رسائی'' کے عنوان پر کہنے کا موقع دیا گیا ہے موجودہ حالات میں یہ عنوان انتہائی اہمیت کا حاصل ہے۔

اگر ہم نصف صدی قبل کے دور پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وہ ایک مشینی دور رہا ہے، اسےMechanical Age (میکانیکل ایج) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اُس دور میں لوگوں تک ذریعہ رابطہ محدود ہوا کرتا تھا؛ لیکن آج انسان ان تمام زنجیروں کو توڑ کر تحقیق اور کاوشوں سے اس دنیا کو Global village (گلوبل ویلیج) میں تبدیل کردیا ہے، اس سے استفادہ کرنا اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داری ہے، جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہم عام لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچا سکتے ہیں، ''انٹرنیٹ'' اس میں خیر وشر کے دونوں پہلو موجود ہیں، شر سے خیر کے پہلو کو اُجاگر کرنا موجودہ حالات میں اُمت مسلمہ کی ذمہ داری ہے؛ لیکن ہم سابقہ طریقہ کار پر ہی اکتفا کرتے آرہے ہیں اور اغیار ہر قدم پر نئے نئے حربہ استعمال کرتے ہوئے اسلام دشمن پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عام لوگوں کو قرآن سے متعارف کرنے کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال کریں، ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے لاکھوں نہیں کروڑوں عوام الناس تک اپنی رسائی کریں، یہ ایک ایسا انقلاب ہے کہ صرف کمپیوٹر تک محدود نہیں؛ بلکہ ہر فرد کے موبائیل فون تک پہنچ چکا ہے،

⊙ ڈائریکٹر: قرآن فاؤنڈیشن، مانصاحب ٹینک، حیدرآباد۔

اس خصوص میں مشترکہ ادارہ کا قیام ضروری ہے، آج کے دور میں ٹیلی ویژن کی بڑی اہمیت ہے، قرآنی آیات کی تفسیر وتوضیح اور دینی معلومات کو اصلاحی چیانل کے ذریعہ عوام الناس تک پہنچایا جاسکتا ہے، نیز ائمہ حضرات وعلمائے کرام بھی اپنے خطابات کے ذریعہ اُمتِ مسلمہ کو قرآن سے قریب کرسکتے ہیں اور قرآن کے طرف رجوع ہونے کی دعوت دے سکتے ہیں، جمعہ کے خطابات کے علاوہ تفسیر قرآن کے حلقوں کے ذریعہ بھی علماء عوام کو قرآن سے قریب کریں، ائمہ حضرات عوام سے مربوط رہتے ہیں ان کے لئے یہ کام بہت آسان ہے اسی طرح انگلش میڈیم اسکول وکالج کے طلبا میں (دینی معلومات) ایمان ویقین پیدا کرنے کے لئے ورک شاپس کا انعقاد Debate Quiz اور مختلف کامپٹیشن کے ذریعہ نئی نسل کو قرآنی تعلیمات سے واقف کرانے کی ضرورت ہے، اسی طرح دعوت وتبلیغ کے میدان میں SMS اور SNS نیٹ ورک شروع کرنے اور اس کا بھرپور استعمال کرنے کی ضرورت ہے، خصوصاً خواتین کو قرآن سے قریب کرنے کی اشد ضرورت ہے، اس لئے کہ خواتین میں دین کا علم نہ ہونے کی وجہ سے معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہورہا ہے، اگر خواتین کے لئے دروس وتعلیم القرآن کورس پروگرام منعقد کیے جائیں تو نہ صرف ان کا ایمان ویقین پختہ ہوگا؛ بلکہ وہ اپنی اولاد اور افرادِ خاندان کی صحیح تعلیم وتربیت کرسکیں گی اور صالح معاشرہ کا عملی نمونہ بن سکیں گی، دور حاضر میں شہروں میں کچھ نہ کچھ قرآنی شعور نظر آتا ہے؛ لیکن قریہ جات اور دیہاتوں میں مسلمان قرآن سے بالکل ناواقف ہیں، اس سب کے لئے منظم منصوبہ بندی ضروری ہے، حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوا لاکھ کے مجمع کو خطاب فرمایا کہ:

اے اللہ! تو گواہ ہے کہ تو نے جو احکامات دیئے میں نے اس امانت کو من وعن پہنچادیا۔

اور وصیت فرمائی کہ قیامت تک آنے والی اُمت اس امانت اور فرض منصبی کا حق ادا کرتے رہیں، مجھے اُمید ہے کہ یہ سیمینار قرآنی پیغام کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا، دُعاء ہے کہ اے اللہ! قرآن حکیم کو ہمارے لئے نور وہدایت اور رحمت کا ذریعہ بننے کے لئے عمل کی توفیق عطا فرمائے، علامہ اقبال کے اس شعر پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

⊙ ⊙ ⊙

عصری تعلیمی اداروں میں قرآن مجید کی تعلیم

ڈاکٹر محمد افتخار الدین ⊙

قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اللہ نے اس کتاب کو ہدایت کے لئے نازل کیا ہے،...... زندگی کے ہر شعبہ کے لئے واضح ہدایت اور روشن رہنمائی موجود ہے اور اس سے ہدایت اسی کو مل سکتی ہے، جو اس کو سمجھ کر پڑھے اور قرآن اسی وقت سمجھ میں آ سکتا ہے جب انسان اس زبان سے واقف ہو، جس میں وہ نازل ہوا ہے، یعنی عربی زبان۔

مگر صورت حال یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنا تو دور کی بات ہے اکثر مسلمانوں کو قرآن پڑھنا تک نہیں آتا ہے، یہ صورت حال کسی حادثہ عظیم سے کم نہیں ہے، قرآن کے بغیر مسلمان کی حالت شاخ سے ٹوٹے ہوئے اس خشک پتے کی طرح ہوتی ہے، جس کو ہوا جدھر چاہے اُڑا لے جائے، زمانے کے حالات پر ہم غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ہر جانب سے ہمارے ایمان کو کھوکھلا کرنے کی کوششیں مؤثر طور پر کی جارہی ہیں، اور جب ایمان کمزور ہو جاتا ہے تو اخلاقی اور سماجی گراوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور مسلمان ہر میدان میں پیچھے ہو جاتا ہے، ان حالات سے ہم بخوبی واقف ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مرض کا کوئی مؤثر علاج ہو، سچر کمیٹی کے مطابق کوئی ۴ رفیصد اسٹوڈنٹس مدرسے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، مدارس ہمارے مضبوط قلعے ہیں اور ان کے کارنامے روشن مینار ہیں اور جو مدرسے کی تعلیم حاصل کرتا ہے اس کا تو ایمان محفوظ ہو جاتا ہے؛ لیکن سوال ان ۹۶ رفیصد اسٹوڈنٹس کا ہے، جو اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اکثر معیاری اسکولوں کا یہ حال ہے جہاں بے شمار مسلمان بچے صبح و شام اپنی زبان سے کفر و شرک کے الفاظ ادا کرتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہے۔

عصری تعلیمی اداروں (اسکولس) پر ایک نظر

عصری تعلیمی ادارے یا تو اسٹیٹ بورڈ (State Board)، سی، بی، ایس، سی (C.B.S.E) یا پھر آئی، سی، ایس، سی (I.C.S.E) کے تحت چلتے ہیں۔

⊙ ڈائریکٹر: میسکو ڈائگناسٹک سنٹر، حیدرآباد۔

یہ ضروری ہوگیا ہے کہ بچوں کا داخلہ ان اسکولوں میں تین سال کی عمر میں ہی کرادیا جارہا ہے، اور اس عمر کے گذرنے کے بعد انتہائی مشکل ہوجاتا ہے کہ بچوں کو کسی اسکول میں داخلہ ملے، خصوصاً معیاری اسکولوں میں، وہ زمانہ گذر گیا جب بچوں کو گھر پر ہی دادا، دادی، نانا، نانی یا کوئی بڑے قرآن مجید پڑھاتے تھے، یا کسی مدرسے میں یا محلے کی مسجد میں قرآن پاک ناظرہ مکمل کروایا جاتا تھا اور پھر اس کے بعد ہی اسکول میں شریک کیا جاتا تھا۔

تین تا پندرہ سال کی عمر کے سارے بچے اسکول کی تعلیم میں مشغول رہتے ہیں، اسکول سے واپسی پر بہت سارا ہوم ورک اپنے ساتھ لاتے ہیں جس میں ان کا کافی وقت صرف ہوجاتا ہے، پھر ان کو کھیلنا ہوتا ہے اور پھر تھوڑا سا بچا ہوا وقت ٹیلیویزن، کمپیوٹر یا انٹرنیٹ کی نظر ہوجاتا ہے۔

گھروں کا ماحول اس قدر بدل چکا ہے کہ اکثر بچے صرف اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور ان میں دونوں یا ایک کسی ملازمت یا کام میں مشغول ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بچوں کو وقت نہیں دے پاتے اور اکثر ان والدین کو نہ تو دین کی کوئی واقفیت ہوتی ہے اور نہ قرآن پڑھنا آتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ آج کے اسکولوں میں چاہے وہ کسی بھی معیار کے ہوں، کسی بھی میڈیم کے ہوں، خانگی ہوں، ایڈیڈ ہوں، یا پھر سرکاری ہوں 90 تا 100 فیصد بچوں کو قرآن مجید پڑھنا بھی نہیں آتا، اس صورت حال سے ہندوستان کے بہت کم علاقے مستثنیٰ ہوسکتے ہیں؛ لیکن عام طور پر صورت حال یہی ہے جس کا عملی ثبوت ہم اس رپورٹ میں پیش کررہے ہیں، جو آپ آگے دیکھ سکیں گے۔

مسلم زیر انتظام اسکولوں میں دینیات کا نصاب

پورے ہندوستان میں خانگی اسکول چلانے والوں میں سے چند مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے بارے میں فکرمند ہیں اور ضرور کسی نہ کسی حد تک مختلف علماء کرام اور اداروں کے جانب سے شائع کردہ دینیات کو شامل نصاب کرتے ہیں، یہ بہت اچھی فکر ہے جو اخلاص کی بنیاد پر ہوتی ہے اور جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ نہایت عمدہ اور ضروری ہیں؛ لیکن ایک بات ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں قرآن پڑھانے کا کوئی معقول انتظام یا سسٹم نہیں ہے۔

جو اسٹوڈنٹس اسکول کی تعلیم مکمل کرلیتے ہیں اور دسویں جماعت کامیاب کرلیتے ہیں اور اس اثنا میں وہ قرآن مجید کی تعلیم (ناظرہ قرآن) حاصل نہیں کرتے وہ زندگی بھر پھر کبھی قرآن مجید نہیں پڑھتے۔ (الا ماشاء اللہ)

میسکو ایک ایسا ادارہ ہے جو شہر حیدرآباد میں گذشتہ 28 سالوں سے تعلیم، صحت اور دیگر میدانوں میں عوامی خدمت کررہا ہے، ان حالات کے پیش نظر ادارہ میسکو نے اسکولوں اور کالجوں میں قرآنی تعلیم دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔

اسکول میں قرآنی تعلیم نافذ کرنے کے فوائد

(۱) سارے بچے دیگر مضامین کے ساتھ قرآن کی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔

(۲) بچوں کو اسکول کے بعد کسی مدرسے یا مسجد کو دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جانے کی ضرورت نہیں؛ لہٰذا وقت بچتا ہے۔

(۳) ماں باپ کے لئے دینی تعلیم کی غرض سے اضافہ خرچ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۴) چائلڈ سائیکالوجی (Child psychology) کے اعتبار سے ابتدائی عمر میں بچے جو سیکھتے ہیں وہ ان کی پرسنالٹی کا حصہ بن جاتا ہے اور کلاس روم میں جو سیکھتے ہیں بچوں کے ذہن میں اس علم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

(۵) بچوں کے معیار کو جانچنے کی سہولت ہوتی ہے، وغیرہ۔

میسکو عربک لینگویج اینڈ انگلش ایجوکیشن فاؤنڈیشن (میسکو ALEEF)

اسکولوں اور کالجوں میں قرآنی تعلیم کو نافذ کرنے کے لئے میسکو ALEEF نے ایک جامع نصاب معلم اللغۃ العربیۃ کے نام سے مرتب کیا ہے جو دو مرحلوں پر مشتمل ہے :

پہلا مرحلہ : نرسری سے تیسری جماعت پر مشتمل ہے، اس میں اسلامی، اخلاقی تعلیم، سیرۃ النبی ﷺ، دُعائیں اور خاص طور پر تجوید کے ساتھ قرآن خوانی کی تعلیم دی جاتی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ 'کراسۃ التدریب' کے ذریعہ "تحریر" سکھانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

دوسرا مرحلہ : جماعت چہارم سے جماعت ہشتم پر مشتمل ہے، اس میں دینیات، سیرۃ النبی ﷺ عربک گرامر، قرآنی الفاظ و معانی اور اس علم کی روشنی میں قرآن کے ترجمے اور سمجھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اسکولوں میں اس نصاب کو پڑھانے کے لئے ہفتہ میں چار پیریڈس دئے جاتے ہیں، میسکو ALEEF کا نصاب جو ہر جماعت کیلئے کتابی شکل میں لیسن پلان کے ساتھ موجود ہے پڑھایا جاتا ہے۔

ٹیچر کون؟

(۱) دینی مدارس سے فارغ التحصیل علماء و عالمات، میسکو ALEEF کی جانب سے منعقد ہونے والی 300 گھنٹوں کی ٹریننگ جس میں :

- میسکو ALEEF کا نصاب (تجوید اور عربک گرامر)۔
- بنیادی انگلش۔

- طریقہ تعلیم (ٹیچنگ میتھڈالوجی)۔
- پرسنالٹی ڈیولپمنٹ۔
- کمپیوٹرس کی تعلیم۔

ان مضامین کی ٹریننگ کے بعد علماء و عالمات اسکولوں میں میسکو ALEEF کے نصاب کو پڑھانے کے اہل ہوتے ہیں۔

(۲) وہ گریجویٹس یا ٹیچرس جو عصری اداروں سے فارغ ہیں اور میسکو ALEEF کی جانب سے منعقدہ ڈپلومہ ایجوکیشن ان عربک لینگوتج، کا کورس (جو 9 مہینوں پر مشتمل ہے، جس میں میسکو ALEEF کے مکمل نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے) مکمل کرنے کے بعد اس نصاب کو پڑھانے کے اہل ہوجاتے ہیں۔

نتائج

الحمد للہ اسکول میں پڑھنے والے طلباء وطالبات تیسری جماعت تک ناظرہ قرآن، عربی زبان کا لکھنا اور بنیادی دینیات وسیرۃ النبی ﷺ اور صبح وشام کی چالیس دُعائیں سیکھ لیتے ہیں اور آٹھویں جماعت تک صرف ونحو کے قواعد سے واقفیت کے ساتھ قرآن مجید کو سمجھنا اور دینیات اور سیرۃ النبی ﷺ آسانی کے ساتھ سیکھتے ہیں۔

سارے ہندوستان میں کوئی 300 اسکولوں میں یہ پروگرام کامیابی کے ساتھ پڑھایا جارہا ہے، سعودی عرب کے انڈین ایمبیسی اسکول جدہ، اور دیگر کئی مقامات پر خانگی اسکولوں میں بھی پڑھایا جارہا ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ، حکومت ہند (NIOS) اس پروگرام کو منظور کر چکا ہے۔

سی، بی، ایس، سی (C.B.S.E) میں اس نصاب کی منظوری آخری مراحل میں ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اپنے تمام اسکولوں کے لئے اس پروگرام کو منظور کر چکی ہے، انشاء اللہ آئندہ تعلیمی سال سے، اے، ایم، یو (A.M.U) کے سارے اسکولوں میں میسکو ALEEF کا پروگرام نافذ ہوجائے گا۔

ہم میسکو ALEEF کی جانب سے سارے فکرمند حضرات اور خصوصاً علماء کرام سے بہ ادباً گذارش کرتے ہیں کہ وہ اس نصاب کی ترویج واشاعت کو اپنی اہم ذمہ داری سمجھیں اور اللہ رب العزت سے دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس کے پاک وسچے دین کے قائم ہونے کا سبب بنائے اور ہم میں سے ہر ایک کی نجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین

⊙ ⊙ ⊙

قرآن مجید کی تاثیر، اس کی رسائی اور اس کا شیوع

مولانا میر الیاس علی القاسمی⊙

انسان کے بدن پر الفاظ کا اثر ہوسکتا ہے؟

ایک شاہزادہ بیمار ہوا، بادشاہ نے حکیم افلاطون کو علاج کے لئے مدعو کیا، بہتیرے علاج کے بعد بھی افاقہ نہ ہوا، عالم دین کو بلایا گیا کہ کچھ پڑھ کر دم کردیں، عالم دین نے کتاب اللہ کی آیات پڑھنا شروع کیا افلاطون نے استہزاءً کہا اتنی مقدار میں معجون کھلائے گئے افاقہ نہ ہوا، تمہارے کچھ الفاظ کا بھلا کچھ اثر ہوسکتا ہے، جواباً عالم دین نے یہ سخت جملہ کہا ''چل کتے کہیں کے، دور ہوجا'' سن کر غصہ سے افلاطون کے منھ سے جھاگ نکلنے لگا عالم دین نے کہا تمہیں نے تو کہا تھا کہ الفاظ کا کیا اثر ہوگا تو میرے ان الفاظ کا تم پر کیوں اثر ہو رہا ہے یا تو یہ تمہارا بناوٹی غصہ ہے یا حقیقت ہے، حقیقی ہے تو اپنا استہزاء واپس لو، افلاطون شرمندہ ہوا، عالم دین کی قدر و منزلت بڑھ گئی افلاطون مدتوں ندامت میں لبریز تھا، یہ واقعہ انسان کو دعوت فکر دے رہا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں عام الفاظ کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ انسان کے الفاظ دو ملکوں کو جوڑتے بھی ہیں توڑتے بھی ہیں، الفاظ انسانی سے خاندانوں کا شیرازہ بھی بکھرتا ہے، خاندان آپس میں مل بھی جاتے ہیں، آئینہ ٹوٹنے کے بعد جڑ نہیں سکتا جڑ گیا تو بال ضرور نکل آئے گا؛ لیکن انسان کے الفاظ کی وہ طاقت ہے کہ ٹوٹے دل جڑ جاتے ہیں، صدیوں پرانی عداوتیں محبتوں میں بدل جاتی ہیں، پرندوں کے فریاد رسا الفاظ پر انسان دانہ ڈال دیتا ہے، مویشیوں کی پکار پر اس کے سامنے چارہ ڈال دیتا ہے، بے زبان مخلوق کے الفاظ انسانوں کے دل کو اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں تو اندازہ کرسکتے ہیں کہ خالق کائنات کے الفاظ میں کیسی طاقت ہوگی، کیسی روح ہوگی، کیسا نور ہوگا، جب کہ یہ قرآن پاک جو ہمارے ہاتھوں میں ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا جو صرف کتاب اللہ ہی نہیں کلام اللہ بھی ہے، جو رب العالمین کی اپنی زبان میں ہے جو زبان کو اس نے جنت کی زبان قرار دیا وہ الفاظ کیسی عظیم طاقت کے حامل ہیں؟ دنیا اس کا اندازہ کرچکی، دنیا اس کا اثر دیکھ چکی، دیکھنے والے بھی دیکھ چکے نہ جاننے والے بھی دیکھ چکے، یٰسین نے دشمنوں کو نابینا کردیا طٰہٰ نے عمر کو بینا کردیا (رضی اللہ عنہ)۔

⊙ صدر: قرآنک ایجوکیشنل سوسائٹی، مدیر: مدرسہ تجوید القرآن، شکاگو، امریکہ۔

حدیث شریف کے مطابق اللہ پاک نے کائنات کو پیدا کرنے سے پہلے ان دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی تھی، حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں :

عن أبي هريرةؓ قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إن الله تبارك وتعالىٰ قرأ طٰهٰ ويٰسين قبل أن يخلق السمٰوات والأرض بألف عام ، فلما سمعت الملائكة القرآن قالت طوبى لأمة ينزل هذا عليها ، وطوبى لاجواف تحمل هذا ، وطوبى لالسنة تتكلم بهذا . (۱)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا کرنے سے ایک ہزار سال قبل طٰہٰ اور یٰسین کی تلاوت کی، فرشتوں نے جب سنا تو کہا خوشخبری ہو اس اُمت کو جس پر یہ نازل ہوگا، خوشخبری ہو ان سینوں کو جو اس کو اُٹھائیں، خوشخبری ہو ان زبانوں کو جو اس کو پڑھیں۔

قرآن کا جواب

قرآن کریم میں اللہ پاک نے اس سوال کا جواب اس طرح دیا ہے :

اللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَاباً مُّتَشَابِهاً مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهِ مَنْ يَشَاءُ . (الزمر۲۳)

اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ باہم ملتی جلتی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، جس سے ان لوگوں کے بدن کانپ اُٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کی یاد پر، یہ ہے راہ دینا اللہ کا، اس طرح راہ دیتا ہے جس کو چاہے۔

حضرات اسماء بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ صحابہ کرام کا یہی حال تھا کہ جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور بدن پر بال کھڑے ہوجاتے۔(۲)

قرآن کی تلاوت کا اثر صرف بدن اور بدن کی بیماریوں پر ہی نہیں پڑتا؛ بلکہ انسانوں کے دل بھی نرم ہوکر اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔

---

(۱) رواه الامام الحافظ عبد الله بن عبد الرحمن الدارمي في سننه:۳۴۵۷۔

(۲) معارف القرآن عن القرطبی۔

عبداللہ بن مبارک علیہ الرحمہ کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک دینی زندگی سے پہلے شراب و کباب اور رقص وسرور کی مجلسوں میں ہوا کرتے تھے، نائٹ کلب کی رونق بنا کرتے تھے ایسے لوگوں کی رات صبح پانچ بجے شروع ہوتی ہے، ایک مجلس گرم تھی رقص وسرور کا ماحول تھا نصف شب ہو چکی تھی، ان کا پیانو ٹوٹ گیا تھا درست کرنے کے لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور پیانو درست کرنے میں محو تھے اسی درخت کی ٹہنی پر ایک پرندہ بھی شب بسری میں تھا کہ اچانک اس پرندہ نے یہ آیت تلاوت کی :

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ. (الحدید:١٦)

کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لئے ڈر جائیں۔

پرندہ کی سریلی آواز میں تلاوت نے ان کے دل پر ہتھوڑے کا کام کیا، پیانو پھینکا، رقاصاؤں کو رقص سے منع کر دیا، غلاموں اور باندیوں کو آزاد کر دیا، نائٹ کلب بورڈیڈ ہو گیا، سیدھے مسجد کی راہ لی، اس کے بعد فقہ حنفی کے امام اور ولی کامل اور خالق و مخلوق میں ایسے محبوب بنے کہ وہ ایک دفعہ بغداد تشریف لے آئے تو سارا بغداد دیدار وملاقات کے لئے اُمنڈ آیا، ہارون رشید کی بیوی ملکہ زبیدہ نے حیرانی سے پوچھا کہ آج یہ کون آئے ہیں اصل بادشاہ تو یہ ہے، میرا شوہر بھی بادشاہ ہے؛ لیکن جب وہ نکلتا ہے تو سیکوریٹی کے بغیر نہیں نکل سکتا وہ سیکوریٹی کا محتاج ہے، یہ تھا قرآن پاک کی آیت کا اثر دل پر، زندگی بدل گئی، مجلس ایمان کے میر بن گئے۔

قرآن کریم کا جنات کے جسم میں اثر کرنا

قرآن کریم ایک نور ہے، ہر چیز پر اثر کرتا ہے، اس نے جنات کو بھی نہیں چھوڑا جو آگ سے بنی ہوئی مخلوق ہے، شریر جنات کے دماغوں کو بھی درست کیا، ایسے واقعات تو ہزاروں صفحات پر بکھرے پڑے ہیں، نمونہ کے طور پر صرف ایک دو واقعہ مختصراً یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قیس بن حجاج فرماتے ہیں کہ مجھے میرے شیطان نے کہا کہ میں جب تیرے اندر داخل ہوا تو اونٹ کی طرح تھا اور اب میں چڑیا کی طرح ہو گیا ہوں، میں نے پوچھا کیوں؟ اس نے جواب دیا کہ تو مجھے کتاب اللہ کے ذریعہ پگھلا دیتا ہے۔

ابو خالد والبی فرماتے ہیں کہ میں اپنے بیوی بچوں سمیت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس جا رہا تھا، ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا میرے بیوی بچے پیچھے رہ گئے تھے، میں نے لڑکوں کی آواز سنی اور قرآن پڑھنا شروع کیا

،مجھ کو کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی، میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہوا تھا، انھوں کہا کہ شیاطین ہم کو پکڑ کر ہم سے کھیل رہے تھے، جس وقت آپ نے قرآن زور سے پڑھا وہ ہم کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

نیک جنات فساق و فجار کو ہلاک کر دیتے ہیں

ابن عقیل فرماتے ہیں بغداد میں ہمارا ایک مکان تھا، اس میں جو بھی رہتا وہ صبح تک مرجاتا ایک قرآن پڑھانے والے نے اس مکان کو کرایہ پر لیا اور اس میں رہنے لگا، ہم منتظر رہے کہ یہ بھی صبح تک مر جائے گا، مگر وہ نہیں مرا اس سے ہمارے پڑوسیوں کو بڑا تعجب ہوا لوگوں نے اس سے دریافت کیا اس نے کہا جب میں عشاء کی نماز سے فارغ ہوا تو میں نے قرآن کریم کی تلاوت کی اچانک ایک نوجوان کنویں سے برآمد ہوا اور اس نے مجھ کو سلام کیا میں ششدر رہ گیا اس نے کہا ڈرو مت! مجھے کچھ قرآن سکھادو میں نے اس کو قرآن سکھانا شروع کر دیا میں نے اس سے اس مکان کا قصہ معلوم کیا، اس نے ہم سے کہا ہم مؤمن جنات ہیں نماز، تلاوت کے پابند ہیں، اس مکان کو فساق لوگ کرایہ پر لیتے تھے اور اس میں شراب پیتے تھے تو ہم ان کا گلا گھونٹ دیا کرتے تھے۔(۱)

ان مختصر واقعات سے قرآن کریم کی تاثیر بتانا تھا، افسوس کہ اُمت نے اس نورانی کتاب پر اپنی خواہشات کی عمارت تعمیر کر لی اور کتاب چھپ گئی، اگر اُمت تلاوت قرآن کا ہی اہتمام کر لیتی تو سحر و شیطان اور شریر جنات کے خاردار تاریک جنگلوں میں اس کو بھٹکنے کی ضرورت نہ پڑتی، عملیات کا بازار گرم نہ ہوتا، اور کم از کم مسلم معاشرہ پر تو شیطان کی حکومت نہ ہوتی؛ بلکہ جب مسلم گھرانوں میں تلاوت کا اہتمام ہوتا تو یہ شیاطین جنگلات اور پہاڑوں میں پناہ لیتے؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے گھروں میں شیاطین کا ننگا ناچ زوروں پر ہے اور ہر گھر مصائب و پریشانیوں میں مبتلا ہے، اب اُمت کا حال یہ ہے کہ شیاطین نے انسانوں کو اتنی تربیت دے دی کہ اب شہروں میں شیاطین کی ضرورت نہیں رہی؛ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بزرگ جنگل سے گزر رہے تھے دیکھا کہ شیاطین کبڈی کھیل رہے ہیں، بزرگ نے کہا کم بختو تمہارا کام تو انسانوں کو بھٹکانا ہے تم یہاں کھیل رہے ہو شیاطین نے کہا حضرت ہمارا کام اب انسان کررہے ہیں۔

جدید ٹکنالوجی نے زیر زمین خزانوں کا پتہ بتادیا اور جب بلندیوں پر پہنچنے کا عزم کیا تو چاند پر اپنی ترقی کا جھنڈا لہرایا؛ لیکن اپنے سینہ میں موجود گوشت کے ایک لوتھڑے کو چاند کی شبیہ بھی نہ بنا سکا؛ حالاں کہ اس کی ٹکنالوجی چودہ سو سالہ پرانی، آزمودہ، سہل، نافع اور سرتاپا خیر کا بادل ہے۔

تاریخ کا ادنیٰ طالب علم زمانۂ جاہلیت کے اگر دریچوں کو بھی کھولتا ہے تو اس کے تعفن سے سر میں درد شروع

(۱) احکام المرجان فی غرائب الاخبار والجان، از علامہ بدر الدین شبلی متوفی: ۷۶۹ھ۔

ہو جاتا ہے اور اختلاج قلب پیدا ہو جاتا ہے، جس قوم میں بے حیائی کے کارنامے باعث افتخار سمجھے جاتے ہوں، لڑکی کی پیدائش کو ذلت کی علامت سمجھا جاتا ہو، جہاں اپنی ہی لختِ جگر کو اپنے ہی ہاتھوں مسلتے یا زندہ درگور کرتے ہوئے محبت پدری کے سمندر میں کوئی موج نہ اُٹھتی ہو، جہاں انتقامی جذبات کی آگ نسلوں نہ بجھتی ہو، اپنے ہی بھائی کا خون بہاتے ہوئے انھیں لذت ملتی ہو، جو انسانوں کی نظروں میں بے حیثیت اور خالق کی نگاہوں میں بھی بے وقعت ہو اور جب یہی کلام الٰہی جو اللہ پاک کی ذات اقدس کے اندر سے نکلا ہوا ہے اس کمیونٹی میں اُترنا شروع ہوا تو کیا انقلاب آیا خطیب دکن لسان الامت بہادر یار جنگ مرحوم کے الفاظ میں سنئے :

> (نزول قرآن کے بعد) چند ہی دنوں میں تہذیب وتمدن کے مالک اور علوم وفنون سے مالا مال ہوگئے، جب صحرائے عرب سے نکلے اور قرآن کو بغلوں میں دباتے ہوئے آگے بڑھے تو فتح وکامرانی ان کے آگے آگے، اقبال وظفر ان کے ساتھ ساتھ، دولت وحکومت ان کے پیچھے پیچھے، تہذیب وتمدن ان کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے، ان کو ایران نے اپنا تخت وتاج پیش کیا، روما نے انھیں اپنی شان وشوکت بخشی، یونان و ہند نے انھیں اپنے علوم وفنون نذر کئے، مصر نے اپنی دولت وحکومت ان کے قدموں میں ڈال دی، کیا یہ قرآن کا کھلا ہوا معجزہ نہیں کہ صحراء عرب تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا گہوارہ بن گیا صحرانشین عرب علم وحکمت کے بانی قرار پائے۔

قبل از اسلام عرب سوسائٹی کی حیثیت کو سیدنا عمرؓ نے صرف ایک جملہ میں بیان فرما دیا تھا ''**كنا أذلاء في الجاهلية أعزّنا الله بالاسلام** '' (زمانۂ جاہلیت میں ہم بڑے ذلیل تھے اللہ پاک نے اسلام کے ذریعہ ہمیں عزت دی) یہ حالت صرف عرب کی نہیں تھی بلکہ ہند وچین، ایران وتوران بھی ''انسانی زو'' سے کم نہ تھے محمد قاسم کی فرشتہ تاریخ ملاحظہ فرمالیں۔

لیکن جب یہی قرآن انسانوں کے سینوں میں محفوظ اور ان کی زبانوں پر متلو ہوا تو اب خالق کائنات خود محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے اور محبت کے کانوں سے سن رہا ہے؛ چنانچہ حدیث شریف میں ہے رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

> **لله أشد أذنا الى قاري القرآن من صاحب القينة الى قينته .** (۱)
>
> گانے والی لونڈی کا مالک اپنی لونڈی کا گانا جس توجہ سے سنتا ہے، اس سے کہیں زیادہ توجہ سے اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی تلاوت کو سنتا ہے۔

---

(۱) ابن ماجه:۱۳۴۰،عن فضالة بن عبيدؓ ۔

اس منان ذات کے من و احسان کی کوئی حد ہے کہ جو خاک کہ اُڑ کر آنکھوں میں گرے تو لوگ گالیاں دیں جوتے کے نیچے نکل کر جوتے میں آجائے تو لوگ اسے برا کہیں؛ لیکن اسی حنان و منان ذات نے اسی خاک کو اپنے کلام پاک کے ذریعہ زمین سے اُٹھا کر عظمت کے آسمان پر پہنچایا، کسی شاعر نے اسی منظر کو ایسے حسین الفاظ سے مزین کیا ہے کہ وہ شعر خود عظمت کے آسمان سے بندوں کو کلامِ الٰہی کی تلاوت کی دعوت دے رہا ہے:

اس درجہ ترقی خاک کو دی جو ہوش میں آکر شوق بنی
اس شوق کا خود منظور نظر ، سبحان اللہ سبحان اللہ

یہاں انسان جس کا دل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، تاریک تھا اور خود جہالت کی تاریکیوں میں کئی لعنتوں کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا، اسی قرآن پاک کی بدولت دل بھی نور الٰہی سے منور ہوا نگاہ حقیقت بھی منور ہوگئی، نگاہوں کے سامنے راستہ بھی روشن ہوا اور لعنتوں سے نکل کر رحمتوں کے بادل کے سایہ میں سانس لینے لگا۔

قرآن پاک زمین پر نور زیر زمین نور آسمان پر بھی نور

کنوئیں میں گرنے سے آنکھوں کی بصارت تو بچا سکتی ہے؛ لیکن قعر ضلالت میں گرنے سے نور الٰہی ہی بچا سکتا ہے خواہ وہ محروم بصارت ہی ہو؛ چنانچہ قرآن کریم کا تعارف خود صاحب قرآن کرا رہے ہیں، ارشاد ہے:

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ. (حم السجدہ:۴۲)

امام ابو محمد حسین بن مسعود البغویؒ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں مختصر مگر جامع تشریح کی ہے، قتادہؒ سے اس طرح نقل فرمایا ہے کہ: ''الباطل هو الشيطان ، لا يستطيع أن يغيره ، أو يزيد فيه ، أو ينقص منه'' باطل سے مراد شیطان ہے وہ اس میں نہ کچھ ردو بدل کر سکتا ہے نہ کمی زیادتی کر سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ نہ شیطان خود کر سکتا ہے نہ اپنے انسانی دوستوں کو استعمال کر سکتا ہے؛ کیوں کہ قرآن پاک نور ہے تو شیطان نور کے قریب بھی نہیں آسکتا کیوں کہ وہ حکیم وحمید یعنی بڑی حکمت والی ذات کے پاس سے نازل ہوا ہے؛ چنانچہ آج چودہ سو سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی حرکات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکی، شیطانی کوششیں ضرور ہوئیں؛ لیکن زمینی شہاب ثاقب نے ان شیاطین کو رسوا کر دیا؛ چنانچہ ایک واقعہ نقل کر دینا مفید ہوگا:

راقم الحروف شکاگو میں سحری میں ریڈیو سے ایک اسلامی پروگرام سن رہا تھا اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مجاہد غازی نے ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی مرحوم جو پیرس میں مقیم تھے ان کا واقعہ سنایا، انھوں نے یعنی ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں فرینکفرٹ کی لائبریری میں تھا ایک جرمن کرسچن پروفیسر سے ملاقات ہوئی، گفتگو شروع ہوئی تو جرمن پروفیسر نے بیان کیا کہ ہماری آرگنائزیشن نے بائبل کی اصلاح کا کام شروع کیا تھا، کوشش یہ تھی کہ جیسے پوری

دنیا میں ایک ہی قرآن متلو ہے بائبل بھی ایک ہی ہونا چاہئے ؛ چنانچہ ساری دنیا سے بائبل کی ایک لاکھ کا پیاں جمع کیں اور پوری کوششوں کے بعد ۳۵ نسخوں پر کرسچن دنیا کو ہم جمع کر سکے ،اس کے بعد ہم نے 140,000 کاپیاں قرآن کی جمع کیں اور بہت محنت کے بعد بھی ایک نسخہ کو دوسرے نسخہ سے مختلف نہیں پایا یہ قرآن کریم کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

الغرض قرآن کریم میں نہ تو کوئی رد و بدل کرسکتا ہے نہ تو قرآن کریم کے فالور کو راستہ سے کوئی ہٹا سکتا ہے؛ کیوں کہ وہ قرآن نور ہے ،وہ نور کی روشنی میں صحیح راستہ پر جارہا ہے، حدیث شریف میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوذر کی خواہش پر یہ نصیحت فرمائی :

علیک بتلاوة القرآن ، وذكر الله عزوجل ، فانه ذكر لك في السماء ونور لك في الأرض . (۱)

اپنے کو قرآن کی تلاوت اور ذکر کا پابند بنالو ،تو تمھیں اللہ آسمان پر یاد کرے گا ، اور زندگی کی تاریکیوں میں یہ دونوں چیزیں تمہارے لئے روشنی کا کام دیں گی۔

قرآن کی وجہ سے قبر میں نور

شہد کے برتن سے زہر نہیں ٹپک سکتا ، دودھ کے برتن سے شراب نہیں ٹپک سکتی اسی طرح اللہ پاک نور ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات مبارکہ کے اندر سے نکلنے والا کلام اور اس کا ہر حرف نور ہی نور ہوگا ؛ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے ایک خاتون کا انتقال ہوا ، بیٹا شاید حافظ قرآن تھا روزانہ ماں کی قبر پر تلاوت کیا کرتا ، ایک روز ماں خواب میں آئی اور کہا بیٹا ! تم میری قبر پر آتے ہی قرآن مت پڑھا کرو ؛ کیوں کہ جیسے ہی تم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہو تو میری قبر پر انوار کی بارش ہوتی ہے ،اس بارش میں میں تمہارا چہرہ نہیں دیکھ پاتی :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُوراً مُّبِيناً . (النساء:۱۷۴)

اے لوگو! حقیقت میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح روشنی اُتاردی۔

عذاب قبر سے حفاظت

دنیا کی کوئی دولت عذاب قبر سے انسان کو نہیں بچاسکتی ، الا یہ کہ وہ صدقہ وخیرات میں اور دینی کاموں میں

(۱) ابن حبان :۳۶۱، عن ابی ذرؓ۔

استعمال ہو؛لیکن چند آیات کی تلاوت کا اہتمام اس کو عذاب قبر سے بچالیتا ہے، جہاں اس کے عمل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے جہاں اس سے محبت کرنے والے بھی اس کو اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؛لیکن وہاں سورۂ سجدہ اور سورۂ ملک پہنچ جاتی ہیں اور اس بندہ کے لئے جھگڑا کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کی سفارش کرتی ہیں روایت کے الفاظ یہ ہیں :

> إن " الٓمٓ تنزيل " تجادل عن صاحبها في القبر ، يقول : اللهم إن كنت من كتابك فشفعني فيه ، و إن لم أكن من كتابك فامحني عنه ، وإنها تكون كالطير تجعل جناحها عليه ، فيشفع له فتمنعه من عذاب القبر وفي " تبارك " مثله ، فكان خالد لا يبيت حتى يقرأ بهما . (۱)
>
> سورۂ سجدہ اپنے قاری کے بارے میں قبر میں جھگڑا کرتی ہے کہتی ہے کہ اے اللہ اگر میں آپ کی کتاب کا حصہ ہوں تو اس شخص کے بارے میں میری سفارش قبول کیجئے اور اگر میں اس کا حصہ نہیں ہوں تو مجھے اپنی کتاب سے مٹا دیجئے اور یہ سورت پرندہ کی طرح اس میت پر سایہ فگن ہو جاتی ہے (کہ کہیں اس پر عذاب نہ آجائے) اس کی سفارش قبول کی جاتی ہے، اس طرح وہ سورہ اس کے پڑھنے والے مرحوم کے لئے عذاب قبر سے رکاوٹ کا ذریعہ بن جاتی ہے اور سورۂ ملک کے متعلق بھی ایسا ہی ہے، خالد بن معدان راوی جب تک ان دو سورتوں کو نہ پڑھ لیتے نہیں سوتے۔

قبر میں قرآن پاک کی چند آیات کی یہ تاثیر ہے تو پورے قرآن پاک کی کیا تاثیر ہوگی؟ میدانِ حشر میں وہی لوگ اپنی قبر کی رپورٹ دیں گے جنھوں نے قرآن پاک اپنے سینوں میں اُتارا ہوگا یا دنیا میں کلام اللہ کی تلاوت کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا ہوگا، خوش قسمت ہیں وہ جنھوں نے کلام اللہ شریف کی تلاوت کو اس کی خدمت کو دنیا میں اپنا مشغلہ بنایا، دنیا نے انھیں حقیر نگاہوں سے دیکھا، معاشی مسائل نے ان کے اطراف مکڑی کا جالا تان دیا؛لیکن نور قرآن نے اسے خاکستر کر دیا، کلام الٰہی کے عشاق دنیا میں بھی مزے میں رہے، قبر میں بھی جنت کی نعمتوں کے جھولوں میں جھولتے رہے اور آخرت میں بھی آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے۔

آخرت میں نور

فضائل قرآن مکمل بیان کرنا مقصود نہیں ؛ بلکہ یہ اس گلشن کا ایک پھول ہے اور یہ اس کے تاثیری واقعات ہیں ؛ تاکہ جہالت و بے دینی کی تاریکیوں میں بھٹکی یہ اُمت اپنے پرنور ہادیٔ و ملجا کی طرف واپس آجائے ،جہنم کے مستحقین

(۱) رواہ الدارمی:۳۳۵۳۔

کے بارے میں حافظ قرآن کو سفارش کا حق، والدین کے سروں پر سورج سے زیادہ چمکتا ہوا سونے کا تاج کا ''نور السماوات والأرض '' کے مبارک ہاتھوں سے رکھا جانا اور حافظ قرآن کو جنت میں قرآن پاک کی آیات کے بقدر لگ بھگ ۶,۲۲۴ بلند درجات کا ملنا احادیث مبارکہ میں موجود ہے۔ تفصیلات سے بچتے ہوئے برکت کے لئے ایک حدیث نقل کی جاتی ہے :

ثلاثة يوم القيامة على كثيب من مسك أسود ، لا يهولهم فزع ولاينالهم حساب حتى يفرغ من بين الناس : رجل قرأ القرآن ابتغاء وجه الله عزوجل وام به قوما وهم به راضون ...... الخ . (۱)

قیامت کے روز تین آدمی مشک کے ٹیلوں پر ہوں گے نہ انھیں گھبراہٹ ہوگی نہ ان کا حساب ہوگا، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان کے معاملے سے فراغت ہو، ایک شخص وہ جس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قرآن پڑھا اور اس حال میں لوگوں کی امامت کی کہ لوگ اس سے خوش تھے۔

قیامت میں نور

عن أبي هريرة رضى الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من استمع إلى آية من كتاب الله كتبت له حسنة مضاعفة ، ومن تلاها كانت له نور يوم القيامة . (۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو کوئی کتاب اللہ کی ایک آیت سنتا ہے اس کے لئے دو چند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو کوئی اس کی تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا، قیامت کا جس درجہ یقین ہوگا اتنا ہی اس کے پاس نور کی اہمیت ہوگی اور تلاوت کی بھی اتنی ہی اہمیت ہوگی۔

حافظ قرآن کو سفارش کا حق

عن علي رضي الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ''من قرأ القرآن فاستظهره ، فاحل حلاله وحرم حرامه ، أدخله الله الجنة وشفعه في عشرة من أهل بيته كلهم قد وجبت له النار ''. (۳)

(۱) رواہ الطبرانی۔ (۲) مسند احمد: ۸۴۹۴۔ (۳) رواہ احمد والترمذی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس شخص نے قرآن پڑھا، پھر اس کو حفظ کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا، حرام کو حرام جانا، حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس دس آدمیوں کے بارے میں سفارش قبول فرمائیں گے جن کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔

سمندر میں وہ مرغ بسمل کیوں، مال و زر کے خزانوں میں وہ فقیر کیوں، وہ قدرت کی ٹھنڈی ہواؤں میں پشیماں کیوں، وہ غلوں کے ڈھیر میں فاقہ کش کیوں، وہ عزت و رفعت کی چوٹیوں پر بھی قعر مذلت میں کیوں، وہ قوت وشوکت میں بھی مردہ و ذلیل کیوں، وہ عقل کی نعمتوں میں بھی بے عقل کیوں، وہ علوم کے سمندر میں جاہل کیوں، وہ راحتوں کے محلات میں مشقتوں میں کیوں، اسباب صحت میں بیمار کیوں، حکومت کے ایوانوں میں بھی وہ غلام کیوں، محبت کے ماحول میں وہ روشنیوں کی بارش میں بھی گمراہ کیوں، اس کا جواب خود قرآن وحدیث میں ملاحظہ فرمالیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكاً وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى ، قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنتُ بَصِيراً ، قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنسَى . (طٰہٰ:۱۲۴-۱۲۶)

اور جس نے منھ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گزران تنگی کی اور لائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن اندھا، وہ کہے گا اے رب کیوں اُٹھالایا مجھ کو اندھا اور میں تو تھا دیکھنے والا؟ فرمایا یوں ہی پہنچی تھیں تجھ کو ہماری آیات پھر تو نے ان کو بھلادیا اور اسی طرح آج تجھ کو بھلادیں گے۔

اور حدیث شریف میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " إذا عظمت أمتي الدنيا نزعت منها هيبة الإسلام ، وإذا تركت الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر حرمت بركة الوحي ، وإذا تسابت أمتي سقطت عن عين الله ". (۱)

(۱) نوادر الأصول للحكيم الترمذي:۶۰۷۰۔

جب میری اُمت دنیا کو بڑی چیز سمجھنے لگے گی تو اسلام کی ہیبت و وقعت اس کے قلوب سے نکل جائے گی اور جب امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھوڑ بیٹھے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی اور جب آپس میں گالی گلوچ اختیار کرے گی اللہ جل شانہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

اُمت کی تباہی کے اسباب پر لائبریریاں بھری پڑی ہیں، ہر طلوع ہونے والا سورج اُمت کو آگاہ کر رہا ہے، ہر غروب ہونے والا سورج اسبابِ تباہی کی اطلاع دیتا ہوا اور ہماری بے حسی پر ماتم کرتا ہوا رخصت ہوتا ہے، اُجڑی بستی کے کھنڈرات اور اس کے زخمیوں کو دیکھ کر دردمند انسان بھی علاقہ و ملک کی عینک لگانے کا اہتمام نہیں کرتا ہے، بے اختیار مدد کے لئے اس میدان میں کود جاتا ہے، اس وقت ضرورت ہے اُمت کو صد فی صد قرآن پر لانے کی، ایسی تاثیر والی کتاب گھر میں موجود اور صاحب گھر اس کے اثر سے محروم؟

قرآن پر اُمت کو لانے کا طریقۂ کار

ہر طبقہ کے لئے الگ طریقۂ کار ہوگا، غیر مسلموں کے لئے علاحدہ طریقہ، اُمت کے مختلف طبقات کے لئے مختلف طریقے — بہت سے غیر مسلم اسلام کے نام سے تو واقف ہیں؛ لیکن قرآن کے سحر انگیز مضامین سے ناواقف ہیں، جیسے کفار مکہ کے اکثر افراد اسلام کا نام سن کر بھاگتے تھے؛ لیکن جب بھی انھیں قرآن سننے کا موقع ملا تو سنا، اب ان کی زبانوں سے شیطان نہیں قرآن بولنے لگا تھا، اب اسلام کو نہیں شیطانیت اور کفر و طاغوتیت کو مٹانے والے اور اسلام کے پاسبان بن گئے، عہد رسالت کے تقریباً تمام مسلمانوں کی ایسی ہی داستان ہے اس لئے یہ یقین کر لینا چاہئے کہ اس وقت بھی غیر مسلموں کا بڑا طبقہ پیاسا ہے اور کرب و بے چینی کے تنور میں جھلس رہا ہے؛ لیکن ''قلیل من المطفئین'' اس تنور کو بجھانے والے بہت کم ہیں، اس لئے جن تجارتی مراکز میں ترجمہ قرآن کے نسخے رکھے جاسکتے ہیں، وہاں ضرور حسب ضرورت رکھ دینا چاہئے، انگلش نسخے تو ضرور ہی رکھنا چاہئے، اس کے علاوہ مقامی زبان کی رعایت بھی ضروری ہے، ورنہ ایسا ہونا بعید نہیں ہے کہ ایک تلگو داں عربی میں پتہ دیکھ کر اس لفافہ کو پھاڑ کر پھینک دے؛ حالاں اس میں ملین ڈالر کا انعام ہے، تراجم قرآن کا موضوع الگ ہے اور وہ تفصیل طلب ہے، اس لئے اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ مقامی زبانوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

قارئین کو اطلاع دینا مناسب ہوگا کہ شکاگو میں ''الفرقان'' کے نام سے ایک آرگنائزیشن ہے جو قرآن کا انگلش ترجمہ ایک پولیتھین میں رکھ کر ڈور کی ہینڈل پر لگاتے ہیں، اس وقت دنیا کے طوفان وحوادث نے ہر شخص کو بے چین کر دیا ہے اور امریکہ میں تو اسلام کی پیاس زیادہ نظر آتی ہے تو یقیناً صاحب خانہ ضرور پڑھتے ہوں گے، ویسے

تاریخ نبوت بتاتی ہے کہ بارگاہ نبوت سے دعوت نامے ہرقل اور کسریٰ دونوں کو پہنچے تھے اور شاہ حبش کو بھی دعوت ملی تھی، دعوت نامہ کے ساتھ جس نے جیسا سلوک کیا اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا گیا شاہ حبش نے مسلمانوں کو پناہ دی اللہ نے اس کو جہنم کی آگ سے پناہ دی، نبی نے اس کی نماز جنازہ پڑھی، ہرقل نے دعوت نامے کی عزت پر اکتفا کیا تو اس کا ملک محفوظ رہا کسریٰ نے دعوت نامہ پھاڑ ڈالا تو اللہ نے اس کی شاہزادیوں کو مسلمان کی باندی بنایا اس کو ذلیل کردیا اور ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔

نیز یہ بات بھی خوب ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ قرآن پاک Cock کا باٹل نہیں کہ باٹل دیا پیسے پاکٹ میں ڈال لئے، اسی طرح قرآن کہیں رکھ دیا اور رسید لے لی؛ بلکہ قرآن پاک فکر کا عنوان اور انسانیت کے علم کا اظہار ہے، قرآن کا ترجمہ حوالے کرنے کے بعد اس کو Folow بھی کرنا چاہئے اور دُعاء بھی کرنا چاہئے، داعی خود بھی سورۂ طٰہٰ کا مطالعہ کرتا رہے، پیغام رسانی کا جذبہ جب پیدا ہوتا ہے تو لٹنے لٹانے کے تقاضے بھی سامنے آتے ہیں، دُعاؤں سے وہ آسان ہو جاتے ہیں۔

شرعی قباحت یا ممانعت نہ ہو تو بغیر عربی کے قرآن کے تراجم رکھے جائیں، مثلاً Hotels اور Hospitils لائبریریز جیسے مقامات پر رکھے جائیں۔

اُمت کے طبقات میں قرآن کریم کا پیغام

اس اُمت کی حالت یہ ہے کہ جس کے پاس درددل کا مداویٰ ہے وہی درددل کا شاکی ہے، ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ اسی مبارک سیمینار کے موقع سے عالمی ''المجلس القرآنی'' تشکیل دیں ائمہ حرم کی اس کو سرپرستی حاصل رہے اور بین الاقوامی مزاج ومعیار کو سامنے رکھ کر نصابِ تعلیم قرآن تیار کرے، مثلاً :

۱- چالیس آیات مع ترجمہ کا ایک رسالہ تیار کرے اور دنیا کے تمام اسلامک اسکولس سے مجلس قرآنی گزارش کرے کہ اس رسالہ کو اپنے نصاب میں شامل کریں 4th گریڈ تک تو بچہ ناظرہ قرآن مجید مکمل کرلے اور Fif th گریڈ سے یہ اربعین مع ترجمہ حفظ شروع کرے اور ایک سمسٹر میں اربعین مکمل کرلے، اگلے سمسٹر میں نئی اربعین شروع کرے، اس طرح ایک مسلمان بچہ ہر سال ۸۰ آیات مع ترجمہ یاد کرلے گا، ہائی اسکول مکمل کرنے تک ۷۲۰ آیات مع ترجمہ یاد کرلے گا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور جو بچے اسلامک اسکول نہیں جاتے ان بچوں کو مقامی صباحی ومسائی مکاتب میں یہ نصاب پڑھایا جائے، ائمہ حرم کی اپیل پر دنیا کے سارے ہی اسلامک اسکولس صباحی ومسائی مکاتب میں اس نصاب کو جاری کرسکتے ہیں، یہ بطور مثال کے تھا، نصاب کیسا ہو اور کتنا ہو اس کی تدوین کے لئے مستقل ایک کمیٹی بنائی جائے، جو مختلف ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو اور اسی طرح حدیث شریف کی اربعینات

شامل نصاب کرنا چاہئے، اس نصاب کی تکمیل و تعمیل سے ایک نوجوان یونیورسٹی میں داخل ہوگا تو اس طرح ہوگا کہ شیطانی ماحول سے حفاظت کے لئے اپنے آپ کو قرآن وحدیث سے مسلح پائے گا، باطل اس کے قریب نہیں آئے گا، اس نصاب میں فقہ کو شامل نہ کیا جائے، مقامی فقہی کمیونٹی کی صوابدید پر اس کو چھوڑ دیا جائے۔

۲- راقم الحروف ایک اور اہم امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ اُمت میں جہاں عام طور پر قرآن کریم کے خطاب سے ہی غفلت ہے، وہیں تجوید و تحسین تلاوت سے بھی بہت غفلت ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی یا اپنی زبان کے لہجہ میں قرآن پڑھتا ہے اور خوش فہمی یہ ہے کہ میں امام حرم کے لہجہ میں پڑھتا ہوں، عالمی مجلس قرآنی تمام اسلامک اسکولس اور تمام دینی اداروں و مساجد کے ذمہ داروں سے اپیل کرے کہ وہ اپنے اپنے اداروں میں تجوید اور عربی لحن کی طرف توجہ کرے، خود رسول عربی صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ نے حکم فرمایا ''اقرء وا القرآن بلحون العرب''(۱) تم لوگ عربوں کے لہجہ کی پابندی کرو، تحدیث نعمت اور افادہ عام کی غرض سے راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ راقم الحروف نے امریکہ میں اپنے بیس سالہ تجربہ کی روشنی میں ''نورانی قاعدہ'' جو ہمارے مدارس ومکاتب میں متداول ہے، امریکن بچوں کے نفسیاتی مزاج اور اکیڈمک ماحول اور مقامی زبان کو سامنے رکھتے ہوئے کئی سال کی محنت کے بعد ''یسرنا القرآن تجویدی'' کے نام سے ایک قاعدہ مرتب کیا ہے، جس میں قواعد و ہدایات اُردو اور انگلش میں ہیں اور بالکل عصری انداز میں سمجھایا گیا ہے، ہوم ورک بھی اسی میں ہے، امریکہ و یورپ میں علماء و مدرسین نے جس کو بہت پسند کیا ہے اور امریکہ میں مقبول بھی ہے، انگلش میڈیم اسکولس اس کو اپنے نصاب میں رکھ سکتے ہیں، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ ناظم المعہد العالی الاسلامی و داعی قرآن مجید سیمینار کا فاضلانہ تبصرہ روزنامہ منصف میں طبع ہو چکا ہے، پڑھنے پڑھانے میں بہت آسان و سہل ہے، حیدرآباد دکن میں بھی دستیاب ہے، معیار طباعت بھی بین الاقوامی ہے، الحمدللہ علی ذلک۔

۳- دجال تو نہیں نکلا؛ لیکن اس کے آنے سے قبل دجالی فضاء ضرور بن چکی ہے، ہوائیں مسموم ہو چکی ہیں، دجالی انسان دجال کے استقبال کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں، غافلوں کی ہلاکت کا سامان تیار ہو چکا ہے؛ اس لئے اُمت کو اس کے فتنوں سے بچانے کے لئے ایک مختصر سا کتابچہ مختلف زبانوں میں تیار کرائے اور نونہالان اُمت کے دماغوں میں اس فتنہ کی قباحت و ہیبت بٹھادے اور ہائی اسکول شروع کرنے سے پہلے سورۂ کہف حفظ کروادے اور ہر جمعہ اس کی تلاوت کی عادت ڈالوائے، انشاء اللہ ہر قاری مقامی دجالیت کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

---

(۱) المعجم الأوسط:۷۲۲۳۔

حفاظ کرام کے لئے طریقۂ کار

ایک حافظ قرآن کے سینہ میں 3,21,180 نورانی لائٹیں جل رہی ہیں (آیات کے بقدر) لیکن وہ خود اس کے حقائق سے واقف نہیں، ان کے معانی پر مطلع نہیں، بسا اوقات ایسی آیات پڑھتا ہے کہ بے اختیار رو دیتا ہے، کبھی ایسا لگتا ہے کہ شاید ان ہی ہچکیوں میں جان نکل جائے گی؛ لیکن حرمین شریفین میں انھیں ہچکیاں لینے والوں کے بازو معانی سے بے خبروں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں، اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہے، بلاشبہ معانی قرآن سے واقفیت کے بعد تلاوت وسماعت میں دل کی کیفیات بدل جاتی ہیں؛ اس لئے وہ حفاظ کرام کو درجۂ ناظرہ سے ہی معانی قرآن یاد کرانے کا آغاز کر دینا چاہئے؛ اس لئے کہ درجۂ ناظرہ میں یاد کرنے کے لئے وقت زیادہ ملتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر کے مطابق 77,000 سے کچھ زائد الفاظ قرآن پاک میں ہیں اور حفظ کی تکمیل کے لئے اوسطاً ایک بچہ چار سال لیتا ہے؛ یعنی 1,460 دن حفظ میں لگ جاتے ہیں، روزانہ ایک بچہ اگر 50 الفاظ کے معانی یاد کر لے تو حفظ مکمل کرنے تک پورے قرآن پاک کے معانی بھی حفظ کر لے گا اور تکمیل کے بعد دور کے ساتھ صرف نحو بھی پڑھا دیا جائے تو بچے الفاظ کی حقیقت کو بھی سمجھ لیں گے اور تلاوت کا لطف بھی آئے گا اور طلبۂ حفظ کے لئے روزانہ پچاس الفاظ یاد کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے اور اس طرح سے ایک عظیم نعمت سے مستفید ہو جائیں گے اور اگر یہ حفاظ کرام آئندہ عالم کورس یا شریعہ کورس کر لیتے ہیں تو انھیں ترجمۂ قرآن میں بہت آسانی ہوگی، ایک طرح سے معانی کا دَور ہو جائے گا، قرآن کریم چوں کہ ایک بحر ذخار ہے، جتنا اس میں غور کیا جائے گا، اس کے حقائق وعجائب کھلتے چلے جائیں گے۔ لاتنقضی عجائبہ .

عالم کورس میں تفسیر کا موضوع

دنیا کی یونیورسٹی کا کمپیوٹر گریجویٹ گریجویشن کی تکمیل کے بعد کمپیوٹر پروگرامنگ کلاس لے سکتا ہے، بڑی بڑی کمپنیوں کے لئے پروگرامنگ کرسکتا ہے تو کسی جامعہ کا فاضل فراغت کے بعد تفسیر کرنے کے لئے کیوں جھجکتا ہے؛ جب کہ جامعہ نے اسے پڑھایا ہی اسی لئے ہے، اسباب مختلف ہوسکتے ہیں؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس عظیم ذمہ داری کی طرف توجہ بہت کم ہے، ۹ سالہ عالم کورس میں ایک طالب علم صرف دو دفعہ براہ راست قرآن کو سمجھتا ہے، ایک دفعہ ترجمہ قرآن اور ایک دفعہ جلالین شریف اور بس، اس کو بڑھا کر تفسیر کا ایک گھنٹہ پانچ سال تک جاری رکھا جائے، اس سے طلباء کو تفسیر قرآن سے گہرا تعلق ہو جائے گا اور فراغت کے بعد ہمت کے ساتھ اس عظیم ذمہ داری کو تقریباً ہر طالب علم نبھا سکتا ہے — انشاء اللہ — اس سے حضرت شیخ الہندؒ کا مقصد بھی پورا ہوگا۔

تفسیر سورہ فاتحہ مولانا ابوالکلام آزاد کی مختلف زبانوں میں اشاعت یہ قرآن کے عجائب وغرائب اور اعجاز میں سے ہے کہ ہر زمانہ کے تقاضے اور انسانوں کے مزاج وفکر کے لحاظ سے ہر دور میں کسی بھی خادم قرآن یا مفسر قرآن کے دل ودماغ میں اس نئے زمانے کے تقاضے اور انسانوں کے مزاج وفکر کے لحاظ سے ان کی نئی دینی وروحانی ضروریات کی تکمیل کا داعیہ اور اس کا سامان اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ڈال دیتا ہے؛ لیکن بعض مفسرین سمجھنے لگتے ہیں کہ قرآن کریم پر جو کام میں کر رہا ہوں ابھی تک یہ کام نہیں ہوا تھا، اسی طرح مولانا ابوالکلام آزادؒ نے پچھلے اکثر مفسرین پر بڑی تنقیدیں کی ہیں؛ لیکن انھوں نے تفسیر میں جس چیز کو نمایاں رکھا وہ بلاشبہ عصر حاضر کا تقاضہ اور ماحول کی ضرورت تھی اور آج بھی اس کی شدید ضرورت ہے، خاص طور پر انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ربوبیت الٰہی سے استدلال اور توحید باری پر آیات قرآنی سے بڑے سائز کے ۴۷ صفحات کو مزین کیا ہے، یقیناً ان کا رب ان سے ضرور خوش ہوا ہوگا، ان کا طرز استدلال بھی فطری، الفاظ عروسی دل سے نکل کر دلوں کو چھونے والے، ضمیروں کو جھنجھوڑنے والے، دماغوں میں فکر کا بیج بونے والے، شرک کے داغوں کو کھرچنے والے اور دلوں میں توحید کی شجرکاری کرنے والے۔

نمونے کے طور پر ایک دو اقتباسات کا درج کر دینا مناسب ہوگا:

> قرآن پاک کی اس خصوصیت سے انھوں نے بھرپور اور مکمل فائدہ اُٹھایا، غالبًا یہ حدیث شریف ''القرآن یفسر بعضہ بعضا'' کہ قرآن کریم کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر ہے؛ چنانچہ انھوں نے رب کی تفسیر میں وہ تمام آیات نقل کر ڈالیں جو ربوبیت الٰہی کی ترجمانی کرتی ہیں؛ چنانچہ: إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ، (القمر:۴۹)
> ''ہم نے جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں ایک اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہیں''۔

اس آیت کو انھوں نے رب کی تفسیر میں نقل کر کے اس کے ذیل میں یہ تشریح لکھی ہے:

> یہ کیا بات ہے کہ دنیا میں صرف یہی نہیں کہ پانی موجود ہوتا؛ بلکہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ موجود ہوگا؟ یہ کیوں ہے کہ پہلے سورج کی شعاعیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضاء میں پانی کی چادریں بچھادیں، پھر ہواؤں کے جھونکے انھیں حرکت میں لائیں اور پانی کی بوندیں بنا کر ایک خاص وقت ایک خاص محل میں برسادیں؟ پھر یہ کیوں ہے کہ جب کبھی پانی برسے تو ایک خاص ترتیب اور مقدار ہی سے برسے اور اس طرح برسے کہ زمین کی سطح پر اس کی ایک خاص مقدار لینے لگے اور اندرونی حصوں تک ایک

> خاص مقدار میں نمی پہنچے؟ کیوں ایسا ہوا کہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر برف کے تودے جمتے ہیں، پھر موسم کی تبدیلی سے پگھلتے ہیں، پھر ان کے پگھلنے سے پانی کے سرچشمے اُبلنے لگتے ہیں، پھر سرچشموں سے دریا کی جدولیں نکل کر بہنے لگتی ہیں، پھر یہ جدولیں پیچ وخم کھاتی ہوئی دور دور تک دوڑ جاتی ہیں اور سینکڑوں ہزاروں میلوں تک اپنی وادیاں شاداب کر دیتی ہیں؟ کیوں یہ سب کچھ ایسا ہی ہوا؟ کیوں ایسا نہ ہوا کہ پانی موجود ہو مگر اس انتظام وترتیب کے ساتھ نہ ہو؟ قرآن کہتا ہے: اس لئے کہ کائنات ہستی میں ربوبیت الٰہی کارفرما ہے اور ربوبیت کا مقتضا یہی تھا کہ پانی اسی ترتیب سے بہے، اسی ترتیب ومقدار سے اس کی تقسیم ہو، یہ رحمت وحکمت تھی جس نے پانی پیدا کیا، مگر یہ ربوبیت ہے جو اسے اس طرح وطریقہ پر کام میں لائی کہ پرورش اور رکھوالی کی تمام ضرورتیں پوری ہوئیں۔

جب براہان ربوبیت الٰہی کو مضبوط اور ٹھوس اور فطرت کی آواز میں پیش کر دیا تو اب: ''إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْن'' کی تشریح میں توحید کی دعوت کو پیش اور رابعاً کے عنوان سے غیر اسلامی مذاہب میں بت پرستی کا ذکر کر کے قرآن کی دعوت کو پھر اس طرح تحریر فرمایا:

> لیکن قرآن نے حقیقت کو عمل یا خاص کو عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا، جیسا کہ ہندوستان میں خدائی کے تین درجے قرار دیئے گئے، عوام کے لئے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لئے براہ راست خدا کی پرستش، اخص الخواص کے لئے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ، اس نے سب کو خدا کی پرستش کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لئے صفات الٰہی کا ایک ہی تصور پیش کیا، پھر آگے چل کر خامساً کے عنوان سے لکھا کہ انسان کا عالمگیر وجدان کیا ہے؟ یہ ہے کہ کائنات ہستی خود بخود پیدا نہیں ہوئی بلکہ پیدا کی گئی ہے؛ اس لئے صرف اسی کی عبادت کی جانی چاہئے اور صرف اسی سے مانگنا چاہئے۔ (ص:۱۲۰)

الغرض مولانا آزاد مرحوم نے توحید باری کے لئے ربوبیت الٰہی سے دلنشیں استدلال کر کے ذہن نشین کر دیا، مجازی ربوبیت وشرک کے ملبوں کو صاف کرنے کی طاقت اس تفسیر میں پیدا کر دی، ہدایت کا مالک اللہ ہی ہے، آج جب کہ دنیا ہر ازم کے بت کو پیوند خاک ہوتے دیکھ رہی ہے، تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے، گویا ابراہیمی سماں پھر لوٹ کے آیا ہے، اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دوسرے طریقوں کے ساتھ اس طریقہ کو بھی شامل کر لیا جائے

تو اُمید ہے کہ رب ابراہیم طرز ابراہیمی سے دعوت ابراہیمی کو عام کردے گا۔ انشاء اللہ

اس لئے احقر کی تجویز ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تفسیر سورۂ فاتحہ کو مختلف زبانوں میں تراجم کے ذریعہ غیر مسلموں تک پہنچایا جائے؛ لیکن اس کی رعایت ضروری ہے کہ ترجمہ میں بھی مفسر کا انداز بیان، الفاظ کی شوکت اور جملوں کی جامعیت اور مضمون کی ادبی طاقت اسی (یعنی جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے) زبان کے ذریعہ باقی رکھی جائے، تو اہل ذوق اس کو ضرور خوش آمدید کہیں گے، انشاء اللہ۔

بقاء تاثیر کے لئے ماحول کی ضرورت

دنیا میں کسی بھی چیز کی بقاء کے لئے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، آئسکریم فریج میں نہیں ریفریجریٹر میں ہی محفوظ و باقی رہتا ہے، فریج کے باہر تو گھل کر کسی کے بھی پھسلنے کا ذریعہ بنتا ہے، چائے چولہے پر یا تھرمس میں گرم رہتی ہے، علم علمی ماحول میں باقی رہتا ہے اور بڑھتا ہے، عمل صالح بھی اس کی بقاء اور اس کے اثرات کے بقاء کے لئے نیک ماحول چاہتا ہے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جن کے سینے نورِ نبوت سے منور تھے، بارگاہ نبوت کے تربیت یافتہ تھے؛ مگر وہ بھی اس مبارک ماحول کی بقاء کی کوشش کرتے تھے، حکیم الامت حضرت ابوالدرداء ایک دفعہ تشریف لے جارہے تھے، بعض صحابہ نے انھیں روک کر کہا''یا أبا الدرداء إجلس بنا نؤمن ساعة ''اے ابوالدرداء! ذرا ہمارے ساتھ بیٹھیں، ہم اپنے ایمان کو تازہ کریں، یہ جملہ ایمان وعملی ماحول کو باقی رکھنے کی ہی ایک کوشش تھی، لائٹ کی روشنی بغیر بلب کے باقی نہیں رہ سکتی تو ایمان کی روشنی بغیر ماحول کے کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ اس موضوع پر بھی علاحدہ لکھا جائے گا، انشاء اللہ۔

ماحول انسان کو امتحان میں کیسے رسوا کرتا ہے، اس واقعہ سے اندازہ لگا سکتے ہیں :

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک مکتوب میں اپنے متوسل کو نصیحت کرتے ہوئے یہ ہیبت ناک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مریض جو نزع کی حالت میں تھا، اس پر دم کرنے کے لئے مجھے بلایا گیا، میں نے اس پر پڑھ کر بہت دم کیا؛ لیکن افاقہ نہ ہوا، میں نے وہاں بیٹھ کر اس کی حالت کے متعلق مراقبہ کیا تو حق تعالیٰ نے مجھ پر منکشف فرمایا کہ اس شخص کے کفر کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے اس کے دل کو کفر سے تعلق ہو گیا ہے، اس وجہ سے روح نہیں نکل پارہی ہے، سخت بے چینی میں ہے، غلط ماحول آدمی کو کہاں پہنچا دیتا ہے؟

جانور انسانوں میں رہ کر انسانی صفات وکمالات پیدا کر لیتا ہے؛ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک جنگوں کے موقع پر ڈالفن مچھلی کو استعمال کرتے ہیں، وہ سمندر میں سرنگوں کا پتہ سونگھ کر بتادیتی ہے، بعض لوگ طوطے کو کلمہ توحید بھی سکھادیتے ہیں، اس طرح انسان جانوروں کے ریوڑ میں رہ کر حیوانی صفات وکمالات پیدا کر لیتا ہے، الغرض یہ سب

تعلیمی و تدریسی نظام ہیں، ان سے علم میں اضافہ ہوگا، عمل کے لئے عمل کی ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بھی نماز کی تعلیم کے لئے ایک بروشر نہیں تھما کر چھٹی نہیں لے لی؛ بلکہ عملی طور پر نماز پڑھ کر بتایا، حضرت عثمان ﷺ نے اللہ کی مرضی کا وضو نبی کے طریقہ کر کے بتایا، اس لئے سیمیناروں اور کانفرنسوں سے تجاویز وقرارداد کی فائلیں تو تیار ہو جائیں گی، علم آجائے گا؛ لیکن بابِ رحمت کی کنجی یعنی عمل تو عملی تربیت ہی سے آئے گا، اس لئے تعلیم کے لئے تربیتی ماحول بنانا بھی ضروری ہے اور تربیتی و عملی ماحول میں تعلیم آسان بھی ہو جاتی ہے اور ذہن نشین بھی۔

عمومی طور پر غیر مسلموں میں امریکہ میں دعوت کا کام جاری ہے، بسوں اور ہائی ویز پر اسلام کی بڑی بڑی سائٹس لگائی جارہی ہیں، غیر مسلموں کا اسلام کی طرف رُجوع بھی ہے؛ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد تربیتی نظام کا فقدان نظر آتا ہے، راقم الحروف نے ایک دفعہ ذمہ دار بزرگ سے گفتگو کے دوران سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ آرگنائزیشن غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کر کے تبلیغی مرکز کے حوالہ کر دے تو وہاں تربیت ہو جائے گی، انھوں نے اس کی تائید تو کی؛ لیکن مسکرا کر خاموش ہو گئے، ظاہر ہے ہر آرگنائزیشن یہی سمجھتی ہے کہ اپنا Pay Check دوسرے کے اکاؤنٹ میں کون ڈپازٹ کرائے گا، نتیجہ یہ ہے کہ نومسلموں سے غفلت کی وجہ سے وہ دین کی روح سے بے خبر نام کے مسلمان کام کے غیر مسلم ہو جاتے ہیں اور کتنے مرتد بھی ہو جاتے ہیں، تبلیغی محنت سے وابستہ ہو جانے کی وجہ سے حقیقت دین کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

خانقاہیں بھی ہیں تو ایسی بہت کم ہیں جو بدعات وخرافات اور مادیت کے اثرات سے محفوظ ہوں، دوسری طرف اُمت کی بربادی ایسی عالمگیر ہے کہ بھوپال گیس المیہ اس کے سامنے نقطہ ہے اور خانقاہیں تو خال خال ہی ہیں، تبلیغی محنت ایک عالمگیر محنت ہے، اور فرسٹ ایڈ ایمبولنس بھی ہے، یہ اس لئے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس ملک میں مسلمان ایک جزیرہ ہیں اور اس جزیرے کی حفاظت کے لئے اس جماعت کی جو محنتیں نظر آتی ہیں وہ ڈھکی چھپی نہیں ہیں، ایک پرائیویٹ رپورٹ کے مطابق شگاگو واطراف کی یونیورسٹیز میں دنیا بھر کے 35,000 مسلم نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی تعلیم میں مشغول ہیں؛ لیکن بے حیائی کے تنور میں کون کتنا محفوظ ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے؛ لیکن یہ ضرور دیکھا گیا ہے کہ تبلیغی نوجوان ضرور ان کے پیچھے جہاں تک ممکن ہو لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح وہ مسجد کے ماحول میں آئے، اس لئے نوجوانوں کو یہ ماحول فراہم کردیں تو تربیت کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے، اس کے باوجود اگر ان کا تعلق علماء اور خانقاہوں سے نہ ہو تو اس کی مثال ایسی کہ ایرکرافٹ کی لائٹ تو بچہ کے ہاتھ میں دے دی اور بے خبر ہو گئے، بچہ اپنی بائیک پر سوار ہو کر سنیما ہال چلا جائے، یا جہاں اس کو دو روٹی نظر آجائے وہاں چلا جائے؛ اس لئے

تعلیم کے ساتھ خوفِ خدا اور خوفِ آخرت کے واقعات بھی دلنشیں کرائے جائیں؛ تاکہ نور قرآن کو ظلمت نفس میں اضافہ کے لئے استعمال نہ کرے، گو کہ غیبی لگام سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے؛ لیکن علماء سے رابطہ کبھی نہ ٹوٹے، علماء اور بزرگوں سے رابطہ ٹوٹنا ایسا ہے جیسے کسی ایرکرافٹ کا اپنے کنٹرول ٹاور سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔

دین سے غفلت اور مادہ پرستی انسان کو کہاں تک پہنچا دیتی ہے، اس واقعہ سے اندازہ لگائیں، راقم الحروف کے ایک دوست فیزیوتھر پیسٹ ہیں، علاج کے لئے مریضوں کے گھروں پر بھی جانا ہوتا ہے، مذہبی آدمی ہیں تو دوران علاج مذہبی و دعوتی گفتگو چلتی ہے، دورانِ گفتگو انھوں نے انجیل کا حوالہ دیا تو مریضہ نے جواب دیا، اچھا انجیل بیت الخلاء میں ہے ذرا اُٹھالاؤ، یاللاسف، ایک مذہبی کتاب جس کی وہ فالوور ہے اس کتاب کی یہ قیمت ہے کہ اپنی مذہبی کتاب کے مطالعہ کے لئے بیت الخلاء میں اسے وقت ملتا ہے۔

اُمتِ مسلمہ کی مادہ پرستی کو دیکھتے ہوئے اس کے بارے میں ایسا ہی اندیشہ غلط ہے؟ ویسے اُردو اخبار بیت الخلاء میں پڑھتے ہوئے اُمت مسلمہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، أعاذنا الله منه۔

علماء اُمت کو بہت ہی فکر اور اللہ کے سامنے بہت رونے اور مانگنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ اللہ پاک اس سیمینار کو قبول فرما کر ہدایت انسانیت کا ذریعہ بنائے اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ کی عمر میں برکت و صحت عطا فرمائے، ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ان کے ادارہ المعہد العالی الاسلامی اور ان کی اللہ حفاظت فرمائے اور ترقیات سے نوازے اور ہماری تمام تجاویز کو نافع انسانیت بنا کر ہمارے لئے ذریعہ نجات بنائے۔ آمین

⊙ ⊙ ⊙

نواں باب

متفرق مقالات

تربیتِ انسانی — قرآنی منہج اور مادی طریقۂ کار
ایک تقابلی مطالعہ

عربی تحریر: مولانا محمد وثیق ندوی ⊙
ترجمہ: مولانا سید عبد الرشید ☆

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين ، وعلى آله وصحبه أجمعين ، وبعد !

کائنات، زندگی اور انسان کے متعلق اسلام اور دیگر مذاہب کے نقطۂ نظر کے درمیان بہت وسیع اور واضح فرق ہے، جیسا کہ اسلامی نظریات زندگی، مذہب اور انسان کے متعلق مادی فلسفوں، یورپی نظریات، قدیم وجدید مغربی آئیڈیالوجیوں اور رجحانات، مثلاً ڈارون، مارکس اور میکاولی کے فلسفات، وجودیت، ابیقوریت، یورپ کی وجودیت، رمزیت، نیچریت، سیکولرازم، سرمایہ داری، اشتراکیت، کمیونزم، سامراجیت، قومیت و وطنیت وغیرہ کے انتہا پسند یورپی افکار و نظریات اور پیغامات سے یکسر مختلف ہیں۔

انسان کا مقام مادی نظریات میں

تلمود میں ہے: صرف بنی سرائیل ہی بنی آدم ہیں اور یہود کے علاوہ لوگ اُمی (جاہل و ناخواندہ) اور گدھے ہیں، خدا نے اپنی منتخب قوم کو ان پر مسلط کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔(۱)

مغربی نظریہ اجتماعیت کے بانی دورکایم کا کہنا ہے: مذہب فطرت میں داخل نہیں اور اسی طرح نکاح بھی

⊙ استاذ: کلیۃ اللغۃ والعربیۃ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

☆ فاضل دمشق، استاذ: المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد۔

(۱) جاهلية القرن العشرين: ۳۸، مصنف: سید قطب شہید۔

فطرت میں داخل نہیں، جرم ایک عمومی صورت حال ہے اور اخلاق ایسی چیز نہیں جس پر ایک مستقل وجود کی حیثیت سے بحث کی جاسکے۔(۱)

نظریہ ارتقاء کے بانی ڈارون کا کہنا ہے: انسان ایک ترقی پذیر حیوان ہے، اپنے نوعی سفر میں مرحلہ وار وہ مختلف منازل سے گذرتا رہا، ایسا سے حیوان اور حیوان سے انسان بنا، یہاں تک کہ اپنے نوعی کمال کو پہنچا؛ لہٰذا کائنات میں طبعی قوانین کارفرما ہیں، نہ کہ ارادۂ خداوندی، مطلب یہ ہے کہ زندگی نیچر کا تخلیق کردہ خالص میکانیکی عمل ہے اور نیچر ہر چیز کا خالق ہے، جس کی طاقت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس نظریہ نے لوگوں کے اخلاق وسلوک پر گہرا اثر ڈالا، ان کو اس فطری حالت کی طرف لوٹنے کی دعوت دی؛ جب کہ انسان عریاں حالت میں قید وبند سے آزاد زندگی گذارتا تھا، ساتھ ہی اس فلسفہ نے خاندانی نظام کو برباد کردیا، مسٹر شیپرڈ جو ایک انگریز سائنس داں ہیں، لکھتے ہیں :

> انگلینڈ میں ایسی نسل پیدا ہوئی جو گھریلو زندگی سے یکسر ناواقف ہے اور جو مویشیوں، چوپایوں کے طرز زندگی کے علاوہ کسی چیز کو نہیں جانتی۔(۲)

مارکسزم کا بانی کارل مارکس کہتا ہے: مذہب عوام کی افیون ہے اور اخلاق اقتصادی حالت کو برقرار رکھنے کا صرف پرتو ہیں، نہ کہ ثابت شدہ اقدار اور عورتوں کو باہر نکل کر کام کاج میں حصہ لینا ضروری ہے،(۳) اس کا یہ بھی کہنا ہے: جنسی پاکیزگی اور عفت وعصمت تباہ شدہ جاگیردارانہ معاشرہ کی صفات ہیں۔

اور فرائڈ کا کہنا ہے :

> انسان اپنی ذات کی تکمیل کو اپنی جنسی خواہش پورا کئے بغیر نہیں پہنچ سکتا اور کسی قسم کی پابندی، اخلاق، سوسائٹی، رسم ورواج باطل ہیں اور انسانی توانائی کو برباد کرنے والی ہیں، جو غیر قانونی دباؤ ہے۔(۴)

انسان یورپ کی حقیقت پسند نظر میں

یورپ کے حقیقت پسند نظریہ کے مطابق: انسان ایک بھیڑیا ہے، جس کا کام صرف دوسرے انسان کا شکار کرنا ہے۔

---

(۱) جاهلية القرن العشرين:۳۸، مصنف: سید قطب شہید۔

(۲) الشباب المسلم، والحضارة الغربية:۲۱-۲۲، مؤلف: حسن حسن سلیمان۔

(۳) الشباب المسلم، والحضارة الغربية:۲۱، مؤلف: حسن حسن سلیمان۔

(۴) الشباب المسلم، والحضارة الغربية:۳۳، مؤلف: حسن حسن سلیمان۔

مشہور ناقد اور ادیب ڈاکٹر محمد مندور نے اپنی کتاب ''نماذج بشریۃ'' (انسانی نمونے) میں عظیم فرانسیسی ادیب ادنوری ڈی بلزاک (وفات: ۱۸۵۰ء) کے قصوں میں اس نے جن شخصیات کی تصویر کشی کی ہے، ان میں سے ایک کا تجزیہ کیا ہے اور اس کے ذریعہ حقیقت پسندوں کے زندگی اور انسان کے متعلق نظریہ کی وضاحت کی ہے اور ان کے نزدیک انسان کو کامیابی کی راہ ہموار کرنے کے لئے جس قسم کے برتاؤ کو اختیار کرنا چاہئے اس کو واضح کیا ہے۔

یہاں پر اس گفتگو کے کچھ پہلو پیش کئے جاتے ہیں، جو جیل سے فرار اختیار کرنے والے قیدی فوٹرک اور ایک نوجوان کے درمیان ہوئی، جو اپنے چھوٹے سے گاؤں کو چھوڑ کر پیرس آیا تھا اور یہاں کے پرشور معاشرے میں غرق ہو گیا تھا، اس نے لا کالج میں داخلہ لیا، اس کے دل میں شہرت کی بلندی اور شرافت کے مرتبہ تک پہنچنے کے جذبات موجزن ہونے لگے تھے، اس وقت فوٹراک نے کہا تھا:

> تمہاری طرح پچاس ہزار نوجوان ہیں، جو تمہاری پوزیشن میں ہیں، جن کا مطمح نظر جلد حاصل ہونے والی ثروت ہے، تم اس بڑی تعداد کے ایک فرد ہو؛ لہٰذا جو جدوجہد تم کو کرنا ہے اور جس زبردست سرگرمی میں تم داخل ہونے والے ہو، اس میں غور کرلو، اس سے بے خبر نہ رہنا کہ تم نوجوان ہی آپس میں ایک دوسرے کو کھا جاؤ گے ...... کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ یہاں پچاس ہزار بڑے مراکز موجود ہوں ......اور یقیناً تم جانتے ہوگے کہ لوگ اپنی زندگی میں راستے کیسے تلاش کرتے ہیں۔
>
> اے نوخیز جوان! لوگ خست و دناءت اور کمینگی میں مہارت پیدا کر کے اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں......لہٰذا تم لوگوں کی بھیڑ میں بم بن کر گرو، اور ان کے درمیان وبا کی طرح پھیل جاؤ......شرافت میں کوئی فائدہ نہیں......اس سے غافل نہ رہنا کہ لوگ اسی مہارت وعبقریت کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور چوں کہ اس کے مالِ غنیمت میں ان کا حصہ نہیں لگتا، اس لئے اس پر الزام رکھتے ہیں، جب تم اس راہ میں لوگوں کی پرواہ کئے بغیر بڑھتے چلے جاؤ گے، تو لوگ اس کے سامنے جھک جائیں گے ......اس میں بالکل شک نہ کرو کہ جب لوگ اس کو کیچڑ کے دلدل میں نہ گھسیٹ سکیں گے، تو اس کے سامنے زمین پر سر رکھ دیں گے۔
>
> اگر تم مالدار بننا چاہتے ہو تو ملوث ہونا پڑے گا؛ لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ

> ہاتھوں کے ملوث ہونے کے بعد انھیں صاف کیسے کیا جائے ، یہی اس زمانہ کے اخلاق کا خلاصہ اور مجموعہ ہے۔
>
> میں تم سے زندگی کے بارے میں اس طور سے اگر گفتگو کر رہا ہوں تو اس لئے کہ میں اس کو پہچانتا ہوں ، یہ مت سمجھو کہ میں زندگی کو ملامت کر رہا ہوں ، یہ اسی پیراہن میں تھی اور اسی میں رہی ، واعظوں اور دین داروں نے اس کو بدلنے کی ناکام کوشش کی۔(۱)

اخلاق کے متعلق یہ نصیحت میکاولی کے فلسفہ سیاسیات سے مختلف نہیں ، جو اس کی کتاب ''امیر'' میں نظر آتا ہے اور یورپ اخلاق ، برتاؤ اور سیاست ، سب میں ان ہی ہدایات پر عمل پیرا ہے۔

مغربی تہذیب میں مذہب اور انسان

موجودہ مغربی تہذیب ، یونانی اور رومی تہذیبوں کی نسل سے ہے اور یہ دونوں تہذیبیں بت پرست وملحد اور خالص مادی تہذیبیں تھیں ، جس میں دنیاوی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے ، اس کو نہ خدا کی پہچان نہ اخلاقی اقدار کی ، اس کے نزدیک نہ دین کا کوئی وزن ، نہ انسان کی کوئی قدر و قیمت ، نہ اخلاق کی کوئی اہمیت ، مغرب کی مادی تہذیب کے فلاسفہ اور قائدین مثلاً ڈارون ، میکڈول ، فرائڈ ، ایڈلر ، والٹر ، ابیقور ، سارتر ، مارکس ، روسو ، میکاولی نے دین وسیاست میں تفریق کی کھل کر آواز بلند کی ، یہ مانتے ہوئے کہ دین ایک نجی معاملہ ہے ، لوگوں کی عام زندگی میں اس کو مداخلت کی اجازت نہیں ؛ بلکہ اس کو اُخروی زندگی تک محدود رہنا چاہئے ، ان فلاسفہ نے اباحیت کو رواج دیا ، ہر قید وبند سے آزاد ہو کر ، خواہشات کی پیروی اور لذتوں کے حصول میں اس بہیمانہ زندگی پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت کی ، ان کا یہ حملہ معاشرتی اور اخلاقی نظام کے حق میں شدید مضر ثابت ہوا ، انھوں نے گناہ کو آراستہ کر کے پیش کیا اور دنیاوی زندگی ، وقتی لذتوں اور مادی منفعتوں کی قدر و قیمت میں غلو کیا۔

انسان قرآن کی نظر میں

اسلام ، جس کا پہلا سرچشمہ قرآن کریم ہے ، انسانی زندگی کا ایک مکمل نظام اور ہمہ گیر ضابطہ ہے ، قرآنی تصور کے مطابق انسان جسم وروح کا مجموعہ ہے ، دوسرے الفاظ میں وہ مشت خاکی بھی ہے اور عنصر روحانی بھی ، انسان کی انسانیت ان ہی دونوں عنصروں سے تشکیل پاتی ہے اور ان دونوں کے توازن سے اس کی تکمیل ہوتی ہے ؛ لہٰذا انسان

---

(۱) نحو مذهب اسلامی فی الأدب والنقد:۴۴

کے لئے نہ یہ مناسب ہے کہ جسم کے حق میں کمی کر کے روح کے حق کو زیادہ ادا کرے اور نہ یہ مناسب ہے کہ روح کے حساب پر جسم کی خواہشات کو پورا کرے؛ کیوں کہ قرآن کریم انسان کے حیوانی تصور کو نہیں تسلیم کرتا، جیسا کہ ڈارون کا نظریہ ہے اور نہ ہی انسان کے لئے رہبانیت کو پسند کرتا ہے؛ جیسا کہ ہندومت سے متاثر بدھ مت کا نظریہ ہے؛ بلکہ انسان کی عبقریت اس وقت نمایاں ہوتی ہے، جب وہ اپنے جسم کے ساتھ زمین پر چلتا ہوا اور اپنی روح کے ساتھ آسمان میں پرواز کرتا ہوا نظر آئے۔

قرآن کا نقطۂ نظر انسانی زندگی کے بارے میں بالکل مختلف ہے، اگر مغرب کے مادہ پرست نظریات انسان کو عقل وشعور کے ساتھ فطرت حیوانی کا ترقی یافتہ تسلسل سمجھتے ہیں، تو قرآن کریم انسان کو مخلوقات میں سب سے افضل و اشرف مخلوق زمین پر خدا کا خلیفہ اور مسجود ملائکہ کہتا ہے، ساتھ ہی نہ تو فطری رجحانات کو کچلتا ہے اور نہ ان رجحانات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور نہ اس کا خاتمہ کرتا ہے، جیسا کہ تحریف شدہ مسیحیت میں ہے اور پھر وہ انسان کو سرکشی کے لئے بے لگام بھی نہیں چھوڑتا، جیسا کہ مادہ پرست یورپ کرتا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا . (الاسراء:۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے انھیں خشکی اور دریا (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے ان کو نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ . (الحج:۶۵)

کیا تو نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ ہی نے تمہارے واسطے کام میں لگا رکھا ہے، اس کو بھی جو زمین پر ہے۔

قرآن کریم نے انسان کی کہیں انتہائی تعریف فرمائی ہے اور کہیں اس کی انتہائی مذمت بیان کی ہے، ایک پہلو سے وہ محترم ومکرم مخلوق ہے، حسن وکمال کی بہترین صورت پیدا کیا گیا ہے، دوسرے پہلو سے وہ ظالم ہے، ناشکرا ونافرمان ہے، عجلت پسند ہے، کم ہمت ہے، ذلت پر راضی رہنے والا، خواہشات کا دلدادہ ہے، اس کی 'انا' جب خواہشات پر غلبہ پالیتی ہے تو وہ فضا کی بلندیوں میں پرواز کرتا ہے اور اپنے اندر کی بہترین صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے، تو اس وقت وہ ممدوح قابل تعریف ہوتا ہے، دوسرے مرحلہ پر اس کی 'انا' جب خواہشات کے آگے سرنگوں ہوجاتی ہے اور شہوت اس پر مسلط ہوکر اس کو ذلیل کرتی ہے اور نکیل پکڑ کر اونٹ کی طرح اس کو گھسیٹتی ہے تو وہ قابل مذمت قرار پاتا ہے، تیسری حالت میں اس کی 'انا' مشت خاکی اور نفس ربانی کے درمیان جدوجہد اور کشمکش میں رہتی

ہے اور وہ اس کشمکش کو جھیلنے میں بہت مشقت برداشت کرتا ہے اور دشواری اس وقت بڑھ جاتی ہے، جب کوئی کمزوری کا لمحہ آتا ہے اور وہ اس پر خاکی عنصر غالب آتا ہے اور شہوت کے غبار میں اَٹ جاتا ہے اور اس وقت تک یہ دشواری ختم نہیں ہوتی جب تک پروردگار کی طرف نہ پلٹے اور اپنے گناہ سے توبہ نہ کرے اور اس آیت پر عمل پیرا نہ ہو :

وَالَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوْا اللهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ، أُوْلٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِيْنَ . (آل عمران:۱۳۵-۱۳۶)

اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہ جب کوئی بیجا حرکت کر بیٹھتے ، یا اپنی ہی جان پر کوئی ظلم کر ڈالتے ہیں تو اللہ کو یاد کر لیتے ہیں اور اپنے گناہوں سے معافی طلب کرنے لگتے ہیں اور کون معاف کر سکتا ہے گناہوں کو بجز اللہ کے؟ اور یہ لوگ اپنے کئے ہوئے پر ہٹ نہیں کرتے ، دراں حالیکہ وہ جان رہے ہوں ، ایسے لوگوں کی جزا ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے اور بہشت کے باغ ہیں ،جن کے نیچے ندیاں پڑی بہہ رہی ہوں گی ،ان میں وہ ہمیشہ (ہمیش) رہیں گے اور کام کرنے والوں کے لئے کیسا اچھا معاوضہ ہے۔

انسانوں کی متعدد و متنوع اقسام

قرآن کریم میں انسانوں کی متعدد قسمیں بیان کی گئی ہیں ،بعض انسان کم ہمت ہوتے ہیں ، نہ بلاؤں پر صبر کرتے ہیں ، نہ نعمتوں پر شکر کرتے ہیں ،بعض عجلت پسند ، انجام وعواقب پر غور کئے بغیر دل میں جس بات کا گذر ہوا ہے فوراً پورا کرنے کے خواہشمند ،بعض کی صفت جزوع ہے ، اگر ان پر کوئی مصیبت ، بیماری ، خوف ،فقر یا پریشانی آتی ہے تو وہ جزع فزع کرنے لگتے ہیں ، یاس وقنوط میں مبتلا ہو جاتے ہیں ،بعض کی صفت ''منوع'' (بخیل) ہے ، اگر اللہ ان کو نوازتا ہے تو خرچ نہیں کرتے اور روک کر رکھتے ہیں ،بعض کی صفت ''یئوس کفور'' (مایوس اور ناشکرا) ہے ، اللہ کی رحمت سے مایوس ، انتہائی ناشکر گزار ، کفر اور انکار میں غالی ،نعمتوں کو بھولنے اور مصیبتوں کو یاد رکھنے والے ، بعض کی صفت ''ظلوم کفار'' ظلم اور انکار میں مصروف ، اللہ کی حدود سے تجاوز کر کے اپنی ذات پر ظلم کرنے والے ، مصائب میں شکوہ شکایت اور جزع فزع کر کے ظلم میں مبتلا ،نعمتوں میں منعم کو فراموش کرنے والے ، مال جمع کر کے روک کر رکھنے والے۔

بعض کی صفت ''شکور'' (نعمت وثروت ہر حال میں خدا کا شکر اور اس کی حمد بیان کرنے والے) بعض انسان زندگی کے ہر معاملہ میں احکام خداوندی کے پابند، ان صفات سے متصف انسان ہی دنیا وآخرت میں بامراد اور مطلوب ومقصود ہیں؛ کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ اوصاف، مکارم اخلاق، اور بلند صفات یعنی نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، مانگنے والوں کو عطا کرنا، مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا، آخرت کے لئے عمل، عذاب آخرت سے خوف، منکرات ورزائل سے اجتناب، امانت کی ادائیگی اور حق کی گواہی جیسے اوصاف حمیدہ کو اختیار کرتے ہیں، قرآن کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً ، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً ، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعاً ، إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ، الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ، لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ، وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ، وَالَّذِيْنَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُوْنَ ، إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُوْنٍ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ، إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ، أُوْلٰئِكَ فِيْ جَنَّاتٍ مُّكْرَمُوْنَ . (المعارج:۱۹-۳۵)

انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے، جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے، جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، مگر وہ نمازی جو اپنی نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں اور جن کے مالوں میں سوالی، بے سوالی سب کا حق ہے اور جو قیامت کے دن کا اعتقاد رکھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں، واقعی ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھنے والے ہیں؛ لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے؛ کیوں کہ ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو اس کے علاوہ طلب گار ہو، ایسے لوگ اپنی حد سے نکلنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور عہدوں کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، ایسے لوگ بہشتوں میں عزت سے داخل ہوں گے۔

دنیا کی زندگی کے متعلق قرآن کا نظریہ

قرآن کریم دنیاوی زندگی مثال اس کھیتی سے دیتا ہے، جو جلد ہی ریزہ ریزہ ہو جائے گی :

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاء أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيماً تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِراً. (الکہف:۴۵)

آپ ان لوگوں سے دنیاوی زندگی کی حالت بیان کیجئے کہ وہ ایسی ہے جسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو، پھر اس کے ذریعہ زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئی ہو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے کہ ہوا اسے اُڑائے اُڑائے پھرے اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

قرآن نے اس فانی اور قلیل زندگی کی یہ تصویر کشی کئی جگہ کی ہے، سورہ یونس میں ہے :

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاء أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالأَنْعَامُ حَتَّىَ إِذَا أَخَذَتِ الأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلاً أَوْ نَهَاراً فَجَعَلْنَاهَا حَصِيداً كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالأَمْسِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ. (یونس:۲۴)

بس دنیا کی زندگی کا حال تو ایسا ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے زمین کی سبزی گنجان ہو کر نکلی، جس کو انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین (پوری طرح) اپنی رونق پر پہنچ چکی اور اس کی زیبائش ہوگئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب وہ اس پر بالکل متصرف ہو چکے تو ہمارا حکم اس پر (اچانک) رات یا دن کو آپڑا، سو ہم نے ایسا صاف کر دیا کہ گویا وہ کل موجود ہی نہ تھی، ہم اسی طرح آیتوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں۔

اس طرح قرآن اس زندگی کو پیش کرتا ہے، جس کے دوام کا مادیت پرست یقین رکھتے ہیں اور جس کی عبادت میں منفعت پرست اور ابیقوریت کے علمبردار مشغول رہتے ہیں، قرآن اس زندگی کے ان پیمانوں کو کھوٹا قرار دیتا ہے، جن پر کوتاہ بین اور اسباب و مظاہر کے پرستار اعتماد کرتے ہیں، اس کی بڑائی بیان کرتے ہیں اور ان

سے بے شمار اُمیدیں وابستہ کرتے ہیں، قرآن ان پر ایمانی پیمانوں کو فوقیت دیتا ہے :

الْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَاباً وَخَيْرٌ أَمَلاً. (الکہف:۴۶)

مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی ایک رونق ہیں اور باقی رہ جانے والے اعمالِ صالحہ آپ کے پروردگار کے ہاں ثواب کے اعتبار سے بھی کہیں بہتر ہیں اور اُمید کے اعتبار سے بھی کہیں بہتر۔

قرآن کریم پوری قوت اور صراحت سے دنیوی زندگی کی ناپائیداری اور آخرت کے مقابلہ اس کی بے حیثیتی اور حقارت کو ثابت کرتا ہے، قرآن کہتا ہے :

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِيْ الآخِرَةِ إِلَّا قَلِيْلٌ. (التوبۃ:۳۸)

دنیا کی زندگی کا سامان تو آخرت کے مقابلہ بہت ہی قلیل ہے۔

اور قرآن کہتا ہے :

وَمَا هٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. (العنکبوت:۶۴)

اور یہ دنیوی زندگی بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے، اگر ان کو اس کا علم ہوتا (تو ایسا نہ کرتے)۔

اور قرآن کہتا ہے :

اِعْلَمُوْا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِيْنَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِيْ الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرّاً ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَاماً وَفِيْ الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ. (الحدید:۲۰)

تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو ولعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے، جیسے مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیوی زندگانی محض دھوکہ کا اسباب ہے۔

اسی طرح قرآن کریم قوت اور صراحت سے ثابت کرتا ہے کہ دنیوی زندگی آخرت کا پل ہے اور عمل کے لئے فرصت کا موقع، ارشاد ہے :

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً. (الکہف:۷)

ہم نے اس زمین پر جو کچھ ہے اسے اس کے لئے باعث رونق بنادیا؛ تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل کے لحاظ سے۔

اور ارشاد ہے :

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ. (الملک:۲)

جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا؛ تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہ زبردست بخشنے والا ہے۔

قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ آخرت زیادہ بہتر اور پائیدار ہے :

وَلَلدَّارُ الآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ. (الانعام:۳۲)

اور ارشاد ہے :

وَمَا أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا وَمَا عِندَ اللهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى أَفَلاَ تَعْقِلُونَ. (القصص:۶۰)

اور جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے وہ محض دنیاوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے اور یہیں کی زینت اور جو اللہ کے یہاں ہے وہ بدرجہا اس سے بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے، سو کیا تم لوگ نہیں سمجھتے۔

لہٰذا قرآن ہر اس شخص کی مذمت وشناعت بیان کرتا ہے، جو اس بے کار لاغر عارضی اور فانی دنیا کو دائمی، سرمدی، ہر قسم کی کدورت سے پاک اور خطرات سے خالی آخرت پر ترجیح دیتا ہے، ارشاد ہے :

إِنَّ الَّذِينَ لاَ يَرْجُونَ لِقَاءنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ، أُوْلَئِكَ مَأْوَاهُمُ النُّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ. (یونس:۷-۸)

بے شک جن لوگوں کو ہماری آیات کا کھٹکا ہی نہیں اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے اور اسی سے جی لگا بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے (بالکل) بے پروا رہتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے، بہ سبب اس کے کہ جیسا وہ کرتے دھرتے رہے۔

اور ارشاد ہے :

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لاَ يُبْخَسُوْنَ ، أُولَـٰئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (ہود:۱۵-۱۶)

جو کوئی دنیا ہی کی زندگی اور اس کی رونق کو مدنظر رکھتا ہے تو ہم ان لوگوں کو اعمال (جزا) اسی (دنیا) میں پوری طرح دے دیتے ہیں اور ان کے لئے اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہوتی ، یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں کچھ بھی نہیں بجز آگ کے اور جو کچھ انھوں نے کیا کرایا ہے سب آخرت میں ناکارہ نکل جائے گا اور بے اثر۔

اور ارشاد ہے :

وَوَيْلٌ لِّلْكَافِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ، الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَىٰ الآخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجاً أُولَـٰئِكَ فِيْ ضَلاَلٍ بَعِيْدٍ . (ابراہیم:۲-۳)

اور بڑی خرابی ہے عذاب شدید سے کافروں کے لئے ، جو دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کی راہ سے (لوگوں کو) روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں ، یہ لوگ بڑی دور کی گمراہی میں (پڑے) ہیں۔

اور ارشاد ہے :

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ . (الروم:۷)

یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔

اور ارشاد ہے :

فَأَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ، ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ . (النجم:۲۹-۳۰)

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی مقصود نہ ہو ، ان لوگوں کی فہم رسائی کی حد بس یہی ہے ، تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے رستہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہی اس کو بھی خوب

جانتا ہے، جو راہ راست پر ہے۔

اور ارشاد ہے :

إِنَّ هٰـؤُلَآءِ يُـحِبُّوْنَ الْـعَاجِلَةَ وَيَـذَرُوْنَ وَرَاءَ هُـمْ يَوْمـاً ثَـقِيْلاً. (الدھر:۲۷)

یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

اور ارشاد ہے :

فَأَمَّا مَن طَغٰى، وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى. (النازعات:۳۷-۳۹)

تو جس شخص نے سرکشی کی ہوگی اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی، سو دوزخ اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

اور قرآن کریم ان لوگوں کی تعریف بیان کرتا ہے، جو دنیا و آخرت کے جامع ہونے کے ساتھ ساتھ آخرت کے پہلو کو دنیا ئے پہلو پر غالب رکھتے ہیں، اس کی فضیلت اور قدر و قیمت سے واقف اور اس کے لئے کوشاں ہیں :

فَـإِذَا قَـضَيْتُـم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوْا اللهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْراً فَـمِـنَ النَّاسِ مَن يَقُوْلُ رَبَّنَا آتِنَا فِيْ الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِيْ الآخِرَةِ مِنْ خَلاَقٍ، وِمِـنْهُـم مَّـن يَـقُـوْلُ رَبَّـنَا آتِنَا فِيْ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِيْ الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (البقرۃ:۲۰۰-۲۰۱)

پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو، تو اللہ کی یاد کرو، اپنے باپ دادا کی یاد کی طرح؛ بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں، جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری دے اور آخرت میں بھی بہتری اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی ارشاد ہے :

وَاكْتُـبْ لَـنَـا فِـيْ هَـٰـذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِيْ الآخِرَةِ إِنَّا هُدْنَـا إِلَيْـكَ قَالَ عَـذَابِـيْ أُصِيـبُ بِـهِ مَـنْ أَشَـاءُ وَرَحْـمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْئٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَـاةَ وَالَّذِيْنَ هُم بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُوْنَ. (الاعراف:۱۵۶)

اور ہمارے حق میں بھلائی لازم کر دے، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، ہم تو تیرے آگے جھک گئے ہیں (اللہ نے) فرمایا: اپنا عذاب میں اس پر واقع کرتا ہوں جس کے لئے چاہتا ہوں اور میری رحمت تو ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے، سوا ئے ان لوگوں

کے لئے تو ضرور ہی لازم کردوں گا جو خوف خدار کھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

اوراپنے خلیل ابراہیم ؑ کی مدح کرتے ہوئے فرمایا :

وَ آتَيْنَاهُ فِيْ الْدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِيْ الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ ۔ (النحل:۱۲۲)

اور ہم نے دنیا میں بھی انھیں بھلائی دی تھی اور آخرت میں تو وہ صالحین میں ہیں ہی۔

یہاں پر آسمانی مذاہب، نبوت کی تعلیمات، یا نبوت کا مدرسہ فکر ــــ اگر یہ تعبیر غلط نہ ہو ــــ اور دیگر مادی فلسفے اور مادی طرز فکر میں تعارض پیدا ہوتا ہے، جو اس بات پر مصر ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے، یہی منتہا ہے، جو اس کی تقدیس و تعظیم اس کی فکر و اہمیت میں غلو کرتے ہیں اور اس کو پر کشش اور آرام دہ بنانے اور اس کی آرائش وزیبائش میں فکر مند رہتے ہیں۔

قرآن پاک کی یہ نفسیات، یا قرآن کا نظریہ حیات، حضور ﷺ کے پاک کلام میں بھی وضاحت سے ملتا ہے، آپ اکثر فرمایا کرتے: **اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ**، "اے اللہ! زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے" اور آپ ﷺ کی دُعاء کے یہ الفاظ ہوتے تھے: "**اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا ــــ وفی روایۃ ــــ کفافا**" (مسلم) "اے اللہ! محمد (ﷺ) کے گھر والوں کو گذارہ کے لائق رزق عطا فرما۔ (۱)

معاشرہ کی تعمیر میں قرآنی منہج اور مغربی منہج وطریقہ کار

معاشرہ کی تعمیر اور فرد کی تربیت کے سلسلہ میں قرآنی طریقہ کار اُصول و مبادی کے قیام، ذمہ داری کے احساس اور اپنے سے بڑی طاقت کی طرف رہنمائی کرنے پر مبنی ہے، قرآن فرد اور معاشرے کے لئے مثالیں قائم کرتا ہے اور اتباع کے لئے نمونہ پیش کرتا ہے، ہر مرحلہ اور ہر منزل پر آقا و غلام کے درمیان ہر قسم کی غلامی کے تصور کو ختم کرتا ہے، فتنہ و فساد کے دروازے بند کرنے میں اسلام کسی قسم کی نرمی روا نہیں رکھتا، قرآنی نظام دیگر نظاموں کے مقابلہ انسانی طبیعت سے سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ قابل تطبیق، سب سے زیادہ اتباع کے قابل اور سب سے زیادہ مؤثر اور زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سب سے زیادہ اپنے اندر سمونے والا ہے۔

قرآن کریم رزائل اور بے حیائی سے روکتا ہے، سوسائٹی میں فحاشی پھیلانے والوں کو عذاب الیم کی خوشخبری دیتا ہے، ارشاد ہے :

(۱) الصراع بین الایمان والمادیۃ: ۸۰-۸۴، مصنف: ابوالحسن علی حسنی ندویؒ۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ . (النور:۱۹)

یقیناً جو لوگ چاہتے ہیں کہ مومنین کے درمیان بے حیائی کا چرچا رہے، ان کے لئے سزائے دردناک ہے، دنیا میں (بھی) اور آخرت میں (بھی)۔

دوسری جانب مغربی طرز زندگی میں انسان کو زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے اور طبعی تقاضوں کو بے محابا پورا کرنے کی پوری چھوٹ ہوتی ہے، جہاں فن و ثقافت، ترقی اور حقوق نسواں کے نام پر جنسی ہیجان اور جنسی آسودگی کے نت نئے طریقے پیدا کئے جاتے ہیں ؛ تاکہ ایک پاکیزہ معاشرہ کا قیام ممکن نہ ہوسکے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے :

يَمْحَقُ اللهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ . (البقرۃ:۲۷۶)

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

جب کہ جدید نظام مادیت واستحصال، ذاتی منفعت اور مال کی ذخیرہ اندوزی پر قائم ہے، چاہے اس میں انسانیت محرومی و بدبختی کا شکار ہو، جدید اقتصادی نظام سود اور منافع کی بنیاد پر قائم ہیں جس کی وجہ سے کوئی شخص تجارت و معیشت کا تصور بغیر سود کے کر ہی نہیں سکتا۔

قرآن کریم انسان کو نفس کی اصلاح اور زندگی میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی دعوت دیتا ہے، تزکیہ اور صفات نفس پر اُبھارتا ہے، ارشاد ہے :

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ، وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا . (الشمس:۹-۱۰)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا۔

قرآن انسان کو ہر اس عمل کا ذمہ دار بناتا ہے جو اس سے کھلے یا چھپے میں صادر ہو، ارشاد ہے :

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ . (المدثر:۳۸)

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں محبوس ہوگا۔

اور ارشاد ہے :

لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا . (الکہف:۴۹)

اس نے (کوئی گناہ) نہ چھوٹا چھوڑا نہ بڑا، بغیر اس کو درج کئے ہوئے۔

لہٰذا اگر انسان دنیا میں قانون کی سزا سے بچ جائے تو آخرت میں اس سے چھوٹ نہیں سکتا۔

قرآن انسان کی عالمگیریت کو تسلیم کرتا ہے، تمام انسانوں کو قانون کے سامنے برابر قرار دیتا ہے؛ لہٰذا قومیت، زبان، تہذیب اور فکری رجحانات کی بناء پر انسان کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا، ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت اگر ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر، اور تقویٰ حقیقت میں نام ہے پوشیدہ اور علانیہ ہر حال میں ذمہ داری کے احساس، احکام الٰہی کی اتباع اور منہیات سے رکھنے کا۔

لیکن مغرب کا مادی نظام صرف کچھ خاص لوگوں کے فائدے کے گرد گھومتا ہے، ان ہی کے مصالح کو پوری قوم اور معاشرے کے مصالح سمجھتا ہے اور ساری قوم کو ان ہی چند افراد کے قائم کئے ہوئے تصورِ زندگی اور طرزِ فکر کے سامنے سرنگوں کرتا ہے، انسان کا بنایا ہوا قانون کسی چیز سے اس وقت تک تعرض نہیں کرتا، جب تک کہ وہ مملکت کے حق میں مضر نہ ہو۔

ایک اور ناحیہ سے دیکھا جائے تو مغربی معاشرے میں ایک دوسرے سے نفرت، فرد کی سلامتی کو خطرہ، خاندانی نظام میں پراگندگی، حقوقِ انسانی کی عدم پاسداری، سوسائٹی کے افراد پر بے اعتمادی، زندگی کے ہر پہلو میں کشمکش اور انسانی عظمت کی بے حرمتی واضح طور پر نظر آنے لگی ہے، جس کی وجہ سے انسان مظلوم ومقہور اور دوسرے کا پابند ہوگیا، زندگی کی لذتوں کا غلام، ایک ایک لذت کے لئے محرومی کا شکار اور پھر لذتیں اور خواہش لامتناہی، اور مغربی دنیا میں سارے وسائل اسی مقصد کے حصول میں برسرِ خدمت!

قرآن انسان کی زندہ سرگرمیوں کو تسلیم کرتا ہے، اس کو سوچنے سمجھنے اور کام کو خوش اُسلوبی سے انجام دینے پر آمادہ کرتا ہے، قرآن چاہتا ہے کہ انسان اپنی سرگرمی کو انجام دیتا رہے، اپنی جسمانی وعقلی صلاحیت اور روحانی قوت کو انسانیت کی خدمت، اس کے احترام وشرافت کی حفاظت میں صرف کرے اور اس پیغام کو دوسروں تک پہنچائے، جو پیغام ان محدود انسانی تقاضوں سے برتر ہے، جن میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں، روٹی، کپڑا اور جنسی خواہشات کی تکمیل انسانی فطرت کا ایک جزو ہیں، نہ کہ حیاتِ انسانی کے کل تقاضے۔

قرآن کے نزدیک تربیت کے سلسلہ میں اولیت عقیدے کی تصحیح، نفس کو تمام شیطانی وساوس سے پاک کرنے اور پسند ناپسند میں توازن کو برقرار رکھنے کو حاصل ہے؛ تاکہ فطری خواہشات انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی روحانی قوتوں پر غالب نہ آجائیں، ارشاد ہے :

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ، فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ، قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ، وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا . (الشمس: ۷-۱۰)

اور قسم ہے جان کی اور اس کی جس نے اس کو درست بنایا، پھر اس کی بدکرداری

اور پرہیز گاری کا اس کو القاء کیا، یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کرلیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے :

فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ، سَيَذَّكَّرُ مَن يَخْشَىٰ ، وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ، الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَىٰ . (الاعلیٰ:۹-۱۲)

تو آپ نصیحت کیا کیجئے، اگر نصیحت کرنا مفید ہوتا ہو، وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو ڈرتا ہے اور جو بد نصیب ہو وہ اس سے گریز کرتا ہے، جو بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ . (التین:۴-۷)

پھر ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں؛ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے، تو ان کے لئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا۔

وَالْعَصْرِ ، إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ . (العصر:۱-۳)

قسم ہے زمانے کی، کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔

قرآن نے کمانے سے زیادہ خرچ کرنے کی تاکید کی ہے؛ کیوں کہ کمانا تو فطرت انسانی میں داخل ہے؛ لہٰذا قرآن نے خرچ کے مصارف کی تعیین کی، اور افراد اور معاشروں کو حب مال، استحصال اور ناحق ترجیح جیسی صفات سے پاک کرنے کے لئے انفاق پر اُبھارا ہے؛ کیوں کہ یہ صفات تمام بلاؤں کی جڑ ہیں اور مال کی محبت سوسائٹی کے بگاڑ اور طبقاتی استحصال کا وسیلہ ہیں۔

انسان کی تربیت کے لئے قرآنی طریقہ کار

قرآن کریم اسلامی اقدار کے موافق ایک صاف ستھرے معاشرے کی تشکیل کے لئے انسانوں کو خدائے واحد کی عبادت، والدین سے حسن سلوک اور ان کی آسائش کا خیال رکھنے کی دعوت دیتا ہے اور اللہ کے عالم الغیب ہونے، رشتہ داروں، مساکین اور مسافروں سے حسن سلوک کرنے اور زندگی میں میانہ روی اختیار کرنے کی طرف

بلاتا ہے، بخل اور اسراف وتبذیر سے بچنے، روزی کے من جانب اللہ اور معین مقدار میں ہونے کا احساس رکھنے اور اولاد کی تربیت کا اہتمام کرنے کی طرف بلاتا ہے، جنسی تسکین کے لئے انتہا پسندی اور ناحق قتل سے ڈراتا ہے؛ تاکہ اجتماعی امن کا قیام ہو، انسانی جان محفوظ و مامون رہے اور ایک پرسکون سرگرم عمل معاشرہ کی تشکیل ہو، اسی طرح قرآن کریم یتیموں کے مال میں احتیاط برتنے، وعدہ کی پابندی، ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرنے، عوام الناس کی زندگی میں تجسس نہ کرنے کی دعوت دیتا ہے اور لوگوں کو افواہ بازی، تکبر، خود پسندی اور لوگوں پر بڑائی جتانے سے ڈراتا ہے، قرآن کریم نے ان صحیح اور پختہ احکامات اور حیات بشری کے لئے پر حکمت آداب کو بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَکَ الْکِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلاَهُمَا فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلاَ تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْراً، رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ إِن تَكُوْنُوْا صَالِحِيْنَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلأَوَّابِيْنَ غَفُوْراً، وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهُ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلاَ تُبَذِّرْ تَبْذِيْراً، إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوْراً، وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّکَ تَرْجُوْهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلاً مَّيْسُوْراً، وَلاَ تَجْعَلْ يَدَکَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِکَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْماً مَّحْسُوْراً، إِنَّ رَبَّکَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيْراً بَصِيْراً، وَلاَ تَقْتُلُوْا أَوْلاَدَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُم إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْءاً كَبِيْراً، وَلاَ تَقْرَبُوْا الزِّنٰى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيْلاً، وَلاَ تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالحَقِّ وَمَن قُتِلَ مَظْلُوْماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً فَلاَ يُسْرِف فِّيْ الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُوْراً، وَلاَ تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُوْلاً، وَأَوْفُوْا الْكَيْلَ إِذا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِکَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيْلاً، وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَکَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولـٰئِکَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُوْلاً، وَلاَ تَمْشِ فِيْ الأَرْضِ مَرَحاً إِنَّکَ لَن تَخْرِقَ الأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلاً،

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا . (بنی اسرائیل:۲۲-۳۷)

اور تیرے پروردگار نے حکم دے رکھا ہے کہ بجز اس ایک رب کے اور کسی کی پرستش نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک رکھنا، اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان دونوں میں سے ایک یا وہ دونوں، تو تو ان سے (کہیں) چھی بھی نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے ادب کے ساتھ بات چیت کرنا اور ان کے سامنے محبت سے انکسار کے ساتھ جھکے رہنا اور کہتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان پر مہربانی فرما، جیسا کہ کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا پرورش کیا، تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اس کو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر تم (دل سے) سعادت مند ہو تو وہ بھی توبہ کرنے والوں کے حق میں بڑا ہی مغفرت کرنے والا ہے، اور دے تو قرابت دار کو (بھی) اس کا حق اور محتاج اور مسافر کو (بھی ان کا حق) اور مال کو فضولیات میں نہ اُڑا، بے شک فضولیات میں اُڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی بند ہوتے ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے، اور اگر تجھے ان سے پہلو تہی کرنا پڑے اس انتظار میں کہ تیرے پروردگار کی طرف سے کشائش آئے، جس کی تجھے اُمید ہے، تو تو ان سے نرمی کی بات کہہ دے، اور تو نہ اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لے اور نہ اسے بالکل کھول ہی دے، ورنہ تو ملامت زدہ تہی دست ہو کر بیٹھ جائے گا، بے شک تیرا پروردگار جس کے لئے چاہتا ہے رزق بڑھا دیتا ہے اور (وہی) تنگی (بھی) کر دیتا ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کی خوب خبر رکھنے والا ہے، (انھیں) خوب دیکھتے رہنے والا ہے، اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل مت کر دیا کرو، ہم ہی ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بے شک ان کا قتل کرنا بہت بڑا جرم ہے، اور زنا کے پاس بھی مت جاؤ، یقیناً وہ بڑی بے حیائی ہے اور بری راہ ہے، اور جس شخص (کی جان) کو اللہ نے محفوظ قرار دیا ہے اسے قتل مت کرو، ہاں مگر حق، پر اور جو کوئی ناحق قتل کیا جائے گا، سو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دے دیا ہے، سو (اسے چاہئے کہ) وہ قتل کے باب میں حد سے آگے نہ بڑھے، بے شک وہ شخص قابل طرفداری کے ہے، اور یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ، بجز اس طریق کے جو مستحسن ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سن پختگی کو پہنچ جائیں، اور عہد کی پابندی رکھو،

بے شک عہد سے متعلق سوال ہوگا، اور جب ناپو تو ناپ پوری پوری رکھا کرو اور جب تولو تو وزن بھی صحیح ترازو سے کیا کرو، یہی اچھا ہے اور یہی انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے، اور اس چیز کے پیچھے مت ہولیا کرو جس کی بابت تجھے علم صحیح نہ ہو، بے شک کان اور آنکھ اور دل، ان کی پوچھ ہر شخص سے ہوگی اور زمین پر اِتْھلا کر نہ چلا کر، تو نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکتا ہے، یہ سارے برے کام تیرے پروردگار کے نزدیک بالکل ناپسند ہیں۔

کیا متمدن دنیا میں تربیت انسانی کا کوئی طریقہ کار، یا کوئی مادی نظام اس قرآنی منہج کی برابری کر سکتا ہے؟

قرآن کریم نے معاشرتی زندگی کے لئے مضبوط قوانین تفصیلی احکام اور انسانی سوسائٹی کے لئے اخلاقی آداب، اعلیٰ اقدار، شریفانہ روایات کو بیان کیا ہے اور ہر اس چیز سے منع کیا ہے جو زندگی کو مکدر کردے اور بغض، کینہ اور لڑائی جھگڑے تک پہنچا دے، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ . (الحجرات:۹)

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رُجوع ہو جاوے، پھر اگر رُجوع ہو جاوے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو، اور انصاف کا خیال رکھو، بے شک اللہ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے۔

اور فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ . (الحجرات:۱۰)

اے ایمان والو! نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے، کیا عجب ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے، کیا عجب ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں،

اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو، اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو، ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے اور جو باز نہ آویں گے تو وہ ظلم کرنے والے ہیں۔

اور فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْراً مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ . (الحجرات:۱۲)

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو؛ کیوں کہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور سراغ مت لگایا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے، اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

قرآن کریم نے زبان اور ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچانے اور راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانے کا حکم دیا ہے؛ تاکہ کسی کو ضرر نہ پہنچے، اسی طرح زیادتی کرنے سے روکا ہے اور اگر دوسرا کوئی زیادتی کرے تو اس کے مقابلہ میں جواب دینے کی اجازت دی ہے؛ لیکن عفو و درگذر اور صبر اس سے بہتر ہے، قرآن نے پڑوسیوں کے حقوق بیان کئے ہیں اور ہمسایہ سے سلوک کرنے کی تاکید کی ہے، حسن سلوک اور تبادل و تعاون کے ذریعہ مودت کو فروغ دینے کا طریقہ بتائے ہیں، لوگوں کی عزتوں کی پامالی اور بے حیائی کے راستوں کو بند کر کے سوسائٹی کی سلامتی کے لئے راہ ہموار کی ہے، قرآن سختی اور قوت کے ساتھ اقدامات کرتا اور تدابیر اختیار کرتا ہے؛ تاکہ انتشار اور گروہ بندی نہ پیدا ہو؛ بلکہ معاشرہ یکجہتی اور ارتباط کے ساتھ باقی رہے۔

قرآن کریم نے اجڈ زبان استعمال کرنے اور کسی دوسرے مذہب یا ان کے قائدین کے حق میں برا سلوک کرنے سے منع فرمایا ہے، اسی وجہ سے قرآن میں دیگر انبیاء کرام، مثلاً حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حق میں احترام و اکرام کے اوصاف وارد ہوئے ہیں؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَلَا تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِن دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوْا اللّٰهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ . (الانعام:۱۰۸)

اور انھیں دشنام نہ دو جن کو یہ (لوگ) اللہ کے سوا پکارتے رہتے ہیں، ورنہ یہ لوگ حد سے گذر کر براہ جہل اللہ کو دشنام دیں گے، اسی طرح ہم نے ہر طریق کے لوگوں کی نظر

میں ان کا عمل خوشنما بنا رکھا ہے، پھر ان سب کی اپنے پروردگار کے پاس واپسی ہے،
سو وہ انھیں جتلا دے گا، جو کچھ بھی وہ کرتے رہے تھے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللهِ وَمَلآئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيْرُ . (البقرۃ:۲۸۵)

پیغمبر ایمان لائے اس پر جو اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اور مومنین (بھی) یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبر پر، ہم اس کے پیغمبروں میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں: کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی، اے ہمارے پروردگار! ہم تجھ ہی سے بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف واپسی ہے۔

سب سے بڑا گناہ اور سب سے بڑی خطا انسانی جان کا قتل ہے :

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ . (الفرقان:٦٨)

اور جس (انسان) کی جان کو اللہ نے محفوظ قرار دیا ہے اسے قتل نہیں کرتے مگر ہاں حق پر۔

مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِيْ الأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً . (المائدۃ:۳۲)

جو کوئی کسی کو کسی جان کے (عوض کے) یا زمین پر فساد (کے عوض) کے بغیر مار ڈالے، تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو مار ڈالا۔

قرآن کریم کی نظر میں کامیاب انسان

قرآن کریم نے ان نیک صفات کو بیان کیا ہے، جن سے متصف ہونے والے اللہ تعالیٰ نے نزدیک مقام و مرتبہ پاتے ہیں، جن کو ''عباد الرحمٰن'' کا لقب دیا گیا ہے :

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً ، وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً ، وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً ، إِنَّهَا سَاء

تُ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً ، وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً ، وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللهِ إِلٰهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً ، يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَاناً ، إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يُبَدِّلُ اللهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللهُ غَفُوْراً رَّحِيْماً ، وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَإِنَّهُ يَتُوْبُ إِلَى اللهِ مَتَاباً ، وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَاماً . (الفرقان:۶۲-۷۱)

اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جہالت والے لوگ بات کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں: خیر اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ وقیام میں لگے رہتے ہیں اور جو دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم سے جہنم کے عذاب کو دور رکھیو، کہ بے شک اس کا عذاب پوری تباہی ہے، بے شک وہ جہنم برا ٹھکانہ ہے اور (برا) مقام ہے اور وہ لوگ جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور اسی کے درمیان (ان کا خرچ) اعتدال پر رہتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس (انسان) کی جان کو اللہ نے محفوظ قرار دے دیا ہے اسے قتل نہیں کرتے، مگر ہاں حق پر اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی یہ (حرکتیں) کرے گا، اس کو سزا سے سابقہ پڑے گا، قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا جائے گا اور اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر پڑا رہے گا، مگر ہاں جو توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کرتا رہے، سو ایسے لوگوں کو اللہ ان کی بدیوں کی جگہ نیکیاں عنایت کرے گا اور اللہ تو ہے ہی بڑا مغفرت کرنے والا بڑا رحمت والا اور جو کوئی توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے، تو وہ بھی اللہ کی طرف خاص طور پر رُجوع کررہا ہے اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ بے ہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور جب وہ لغو مشغلوں کے پاس سے گذرتے ہیں تو خودداری کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے سورۃ المومنون میں فوز وفلاح اور کامیابی کے اوصاف گنائے ہیں، فرمایا:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ، الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ

حَافِظُوْنَ ، إِلَّا عَلٰی أَزْوَاجِھِمْ أَوْ مَا مَلَکَتْ أَیْمَانُھُمْ فَإِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ، فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَاءَ ذٰلِکَ فَأُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْعَادُوْنَ ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِأَمَانَاتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ ، وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ، أُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْوَارِثُوْنَ ، الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ . (المومنون:۱-۱۱)

یقیناً (وہ) مومنین فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں اور جو لغو (بات) سے برکنار رہنے والے ہیں اور جو اپنا تزکیہ کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہداشت رکھنے والے ہیں، ہاں البتہ اپنی بیویوں اور باندیوں سے نہیں، کہ (اس صورت میں) ان پر کوئی الزام نہیں، ہاں جو کوئی اس کے علاوہ کا طلب گار ہوگا تو بس ایسے ہی لوگ تو حد سے نکل جانے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی رکھنے والے ہیں، بس یہی لوگ تو وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور اس میں (ہمیشہ) رہیں گے۔

قرآن کریم کی نظر میں کامیاب شخص وہ ہے، جو دنیا کی مصیبتوں کو خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے جھیلتا ہے اور (آخرت) کی گھاٹیوں کو پار کرنے کے لئے نیک اعمال کو قائم کرکے اپنی ذات سے مجاہدہ کرتا ہے، غلاموں کو آزاد کرکے غلامی اور ذلت سے چھٹکارا دیتا ہے اور بھوکوں کو کھانا کھلانا، اقربا کی مدد کرنا، فقراء کی اعانت، تواصی بالحق اور آپس میں رحمت و نرمی کا برتاؤ اس کا وتیرہ ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِیْ کَبَدٍ ، أَیَحْسَبُ أَن لَّن یَقْدِرَ عَلَیْهِ أَحَدٌ ، یَقُوْلُ أَھْلَکْتُ مَالاً لُّبَداً ، أَیَحْسَبُ أَن لَّمْ یَرَهُ أَحَدٌ ، أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَیْنَیْنِ ، وَلِسَاناً وَشَفَتَیْنِ ، وَھَدَیْنَاهُ النَّجْدَیْنِ ، فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ، وَمَا أَدْرَاکَ مَا الْعَقَبَةُ ، فَکُّ رَقَبَةٍ ، أَوْ إِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ، یَتِیْماً ذَا مَقْرَبَةٍ ، أَوْ مِسْکِیْناً ذَا مَتْرَبَةٍ . (البلد:۴-۱۶)

(قسم ہے) کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے، کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا اور کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ کر ڈالا، کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں، کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور پھر ہم نے اس کو دونوں راستے (خیر و شر کے) بتلا دیئے، سو وہ

شخص (دین کی) گھاٹی میں سے ہوکر نہ نکلا اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی سے کیا مراد ہے، وہ کسی (کی) گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے، یا کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ داریتیم کو، یا کسی خاک نشین محتاج کو۔

اور قرآن کہتا ہے :

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ، فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا ، قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ، وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا . (الشمس:۷-۱۰)

اور (قسم ہے انسان کی) جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو درست بنایا، پھر اس کی بدکرداری اور پرہیز گاری (دونوں باتوں) کا اس کو القاء کیا، یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس جان کو پاک کرلیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور) میں دبادیا، جو شخص نفس کا تزکیہ کرلے، نیک عمل کرے، تقویٰ اور صبر اختیار کرے، وہی کامیاب اور بامراد ہے اور جو شخص رزائل، فسق و فجور اور نفاق میں مبتلا ہو، وہ ناکام و نامراد۔

بہترین انسان قرآن کی نظر میں وہ شخص ہے جو اللہ پر ایمان لائے، نیک عمل کرے، وہ مخلوق میں سب سے بہتر ہے، اس کے برعکس جو خدائے واحد پر ایمان نہ لائے اور کار خیر میں حصہ نہ لے وہ مخلوق میں سب سے بدتر ہے، ارشاد ہے :

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أُوْلَـٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ، إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ أُوْلَـٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ، جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَداً رَّضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ . (البينة:۶-۸)

بے شک جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے، وہ آتش دوزخ میں جاویں گے، جہاں ہمیشہ ہمیش رہیں گے (اور) یہ لوگ بدترین خلائق ہیں، بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے، وہ لوگ بہترین خلائق ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے نزدیک ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے یہ (جنت اور رضا) اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

ہر وہ شخص جو لوگوں پر عیب باندھے، تہمت لگائے، ان کی عزتوں پر طعن کرے، مال کو جمع کر کے ذخیرہ اندوزی کرے اور اسے خرچ نہ کرے، وہ کھلے ہوئے گھاٹے میں ہے، اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا، قرآن کہتا ہے :

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ، الَّذِیۡ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ ، يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ، كَلَّا لَيُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَةِ ، وَمَاۤ اَدۡرٰكَ مَا الۡحُطَمَةُ ، نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ، الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَةِ ، اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ، فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۔ (الھمزۃ:۱-۹)

بڑی خرابی ہے اس شخص کے لئے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو اور رو در رو طعنہ دینے والا ہو، جو مال جمع کرتا ہو اور اس کو بار بار گنتا ہو، وہ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا، ہرگز نہیں! واللہ وہ شخص ایسی آگ میں ڈالا جاوے گا جس میں جو کچھ پڑے وہ اس کو توڑ پھوڑ دے اور آپ کو معلوم ہے وہ توڑنے پھوڑنے والی آگ کیسی ہے، وہ اللہ کی آگ ہے جو سلگائی گئی ہے، جو دلوں تک جا پہنچے گی، وہ ان پر بند کر دی جائے گی، بڑے لمبے لمبے ستون میں۔

قرآن کریم مومن انسان کی صحبت اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جو ایمان اور عمل صالح سے فیض یاب ہو، یقین و معرفت، ذکر و دُعاء سے وافر حصہ اس کو ملا ہو، اگرچہ کہ مادی اسباب دنیاوی مال و متاع اور زیب و زینت سے وہ تہی داماں ہو :

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا ۔ (الکہف:۲۸)

اور آپ اپنے آپ کو مقید رکھا کیجئے، ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں، صبح و شام محض اس کی رضا جوئی کے لئے اور آپ کی دونوں آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں، دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے اور اس شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔

کامیاب انسان کی صفت ایمان و عمل صالح اور تعلق مع اللہ کو اسباب و آلات اور ظاہری شکلوں پر ترجیح دینا، مادیت اور مادہ پرستوں کے خلاف بغاوت، دنیاوی زیب و زینت اور مال و متاع کو ہیچ سمجھنا ہے، یہی قرآن کی دعوت ہے :

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجاً مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ. (طٰہٰ:۱۳۱)

اور ہرگز آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے ان کے گروہوں کو متمتع کر رکھا ہے، ان کی آزمائش کے لئے، کہ وہ محض دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپ کے پروردگار کا عطیہ کہیں، بہتر اور دیرپا ہے۔

جدید تہذیبیں اور مادی فلسفے قرآن کی اسی روح سے متعارض ہیں، جو مادیت اور مادیت پرستوں کی تعظیم وتقدیس اور ان کے سامنے جھکنے کی دعوت دیتے ہیں، سرمایہ دار کروڑ پتی لوگوں، مادی اثر ونفوذ اور حکومت رکھنے والوں کی تعریف میں غلو کرتے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں :

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعتدال وحق پرستی کی اسپرٹ اس دین میں پوری طرح جاری وساری اور اس کے رگ وریشہ میں پیوست ہے، اس کے تمام قوانین، احکام وتعلیمات اور اس کا کلچر اور ثقافت سب اس کے زیر اثر اور زیر سایہ ہے، اس کے برعکس مادی تہذیب (جو یورپ میں مذہب واخلاق سے عین بغاوت کے موقع پر وجود میں آئی) اول روز سے توازن سے محروم ہے، اس کے نظام اجتماعی میں انتہا پسندی، فکر وفلسفہ میں کج روی، علوم وآداب میں مبالغہ آرائی وطوالت، ہر فعل اور ہر اقدام میں مشکل اور طویل راستہ اختیار کرنے کی خواہش اور عادت پوری طرح جلوہ گر ہے، اس طرح کی تہذیب میں اگر طبائع سلامتی واعتدال سے، عقل حق وصداقت کی راہ سے اور زندگی سہولت وسادگی سے اور قومیں وحدت واُلفت سے محروم ونا آشنا رہتی ہیں تو جائے تعجب نہیں۔(۱)

لہٰذا ہر وہ شخص جو حقیقی کامیابی، دائمی فوز وفلاح اور لازوال سعادت وخوش بختی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اخلاص کے ساتھ عمل کرے :

فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَداً . (الکہف:۱۱۰)

سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے، تو اسے چاہئے کہ نیک کام کرتا رہے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔

---

(۱) معرکہ ایمان و مادیت:۳۰۷، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔

اس دور کا انسان یورپ کے انتہاپسندانہ افکار و پیغامات ،ملحدانہ فلسفات اور مغرب کی مادیت پرست پرفریب اور دھوکہ باز تہذیب کی لائی ہوئی حیرانی ،محرومی ،بدبختی اور قلق واضطراب کا شکار ہے اور اپنے امراض ومشکلات کا حل اور ان سے نکلنے کا راستہ تلاش کررہا ہے؛ لیکن جان لینا چاہئے کہ اگر حل موجود ہے تو صرف اسلام میں ،دنیا کے سارے مسائل ومشاکل کا تنہا حل صرف اسلام ہے ،آج کا بے بس انسان ہم مسلمانوں سے یہ تقاضا کررہا ہے کہ ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر مادیت سے ایمان کی طرف اور بدحالی سے سعادت کی طرف نکال لائیں اور مہذب انسانیت کی کشتی کو ظلم وسرکشی ،شروفساد اور نفاق والحاد کی سرکش موجوں سے بچا کر قرآن کی روشنی میں امن وسلامتی ،خیر وصلاح اور ایمان واسلام کے ساحل پر لگادیں؛ کیوں کہ قرآن ہی قیامت تک انسانیت کے لئے مینارۂ نور اور شمع ہدایت ہے۔

اخیر میں اس 'بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار' کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں ،جن میں سرفہرست حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد ہیں اور جن کی اسلامی کاز خصوصاً فقہ اسلامی کے میدان میں نمایاں سرگرمیاں ہیں ،کہ انھوں نے قرآن کے پیغام کو عام کرنے اور اسے جدید علمی اُسلوب میں تمام لوگوں تک پہنچانے کے طریقے تلاش کرنے کے لئے یہ قیمتی موقع فراہم کیا اور اُمید کرتا ہوں کہ یہ سیمینار اس میدان میں ایک مثبت قدم اور ایجابی پیش رفت ثابت ہوگا۔

⊙ ⊙ ⊙

مراجع ومصادر

۱- الصراع بین الایمان والمادیۃ رالمفکر الاسلامی الشیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی۔

۲- ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین رالمفکر الاسلامی الشیخ ابوالحسن علی الحسنی الندوی۔

۳- فی ظلال القرآن رسید قطب الشہید۔

۴- جاہلیۃ القرآن العشرین رمحمد قطب۔

۵- الانسان بین المادیۃ والاسلام رمحمد قطب۔

۶- الاسلام علی مفترق الطرق رمحمد اسد۔

۷- نحو مذہب اسلامی فی الأدب والنقد رد،عبدالرحمن رأفت باشا۔

۸- صفوۃ التفاسیر رعلی الصابونی۔

۹- الفکر الاسلامی الحدیث فی مواجہۃ الأفکار الغربیۃ رمحمد المبارک۔

۱۰- قیمۃ الأمۃ الاسلامیۃ ،منجز اتہا وواقعہا المعاصر رفضیلۃ الشیخ محمد الرابع الحسنی الندوی۔

۱۱- الشباب المسلم والحضارۃ الغربیۃ رحسن حسن سلیمان۔

۱۲- إلی نظام عالمی جدید رالاستاذ محمد واضح رشید الحسنی الندوی۔

۱۳- ترجمہ آیات از تفسیر ماجدی ،وبیان القرآن۔

قرآن فہمی — ایک مطالعہ

پروفیسر کمال اللہ بختیاری ندوی⊙

قرآن کریم کے تعلق سے ارشاد ربانی ہے :

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ . (القمر:۱۷)

اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

عصر حاضر میں مذکورہ آیت کو بنیاد بنا کر بعض لوگ، خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کہتا ہے کہ فہم قرآن اور تفسیر قرآن میں کسی کو ٹھیکہ دار نہیں بنایا گیا ہے اور ان میں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، قرآن کریم میں غور وفکر کرنے کا سب کو یکساں حق حاصل ہے، ہر شخص کو قرآن کریم میں غور وفکر کے ذریعہ معانی ومطالب نکالنے اور سمجھنے کا پورا اختیار ہے، تفسیر قرآن کے لئے محض عربی زبان کی شد بد واقفیت اور چند ابتدائی کتابوں کی مراجعت کو کافی سمجھتا ہے، اور سنی سنائی باتوں یا چند تقریروں کی سماعت کی بنیاد پر قرآنِ کریم کی تفسیر بیان کرنے لگتا ہے، یہ نہایت نامناسب، غلط اور جاہلانہ حرکت ہے اور اب تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ علماء دین اور سلف صالحین کی تفاسیر وتراجم، شروحات وتوضیحات سے رُجوع واستفادہ تک کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں قرآن کریم کے تعلق سے ایسی باتیں منسوب ہو جاتی ہیں، جو قرآن کریم کی شایانِ شان نہیں ہوتی ہیں، یا مدعائے خداوندی کے خلاف ہوتی ہیں، قرآن کریم کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہ صرف بے ادبی ہے؛ بلکہ قرآن کریم کی توہین ہے، ایسی جسارت کرنے والوں کو ان احادیث پر غور کرنا چاہئے :

من قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار . (۱)

جو شخص قرآن کے معاملے میں محض اپنی رائے سے گفتگو کرے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

⊙ پروفیسر شعبۂ عربی: نیو کالج، چنئی۔

(۱) ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر: ۳۸۷۵۔

من تکم فی القرآن برأیه فاصاب فقد اخطأ . (۱)

جو شخص قرآن کے معاملے میں محض اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے غلطی کی۔

قرآن کریم کے تعلق سے جو ارشادِ ربانی ہے، اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے؛ لہٰذا آگے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، جو لوگ تفسیر قرآن کریم کو آسان سمجھتے ہیں، انھیں ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے کہ ہر چیز میں مراتب و درجات ہوتے ہیں، ہر علم کو حاصل کرنے کے کچھ قوانین وضوابط، لوازم وشرائط ہوتے ہیں، ان کے بغیر وہ علم حاصل نہیں کیا جاسکتا، دنیا میں ہر علم کو سیکھنے اور سمجھنے کے لئے قوانین کی پابندی کی جاتی ہے؛ لیکن قرآنی تعلیمات اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کے سمجھنے اور سیکھنے کے لئے کسی ضابطے یا طریقے کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، یہ کتنی بڑی بدنصیبی اور محرومی کی بات ہے۔

دنیا میں کسی بھی علم یا فن کو محض کتاب یا اپنے ذاتی مطالعہ اور رُجوعِ ترجمہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا، اگر ایسا ممکن ہوتا تو ڈاکٹری کی کتابیں آپ خود پڑھ کر کوئی بھی ڈاکٹر بن جاتا اور انجینئرنگ کی کتابیں دیکھ کر انجینئر کہلاتا، غرض کہ دنیوی زندگی کے کسی بھی شعبہ اور میدان میں غور کیجئے تو آپ کو ایک معلم، ایک مربی اور ایک شارح کی ضرورت محسوس ہوگی، اس کے تعاون اور مدد کے بغیر آدمی آگے نہیں بڑھ سکتا، مگر افسوس کی بات ہے کہ قرآن فہمی کے لئے ایسا آسان طریقہ اور سستا نسخہ ڈھونڈ لیا گیا ہے کہ کسی معلم، کسی رہنما اور کسی مربی کی ضرورت تک کو محسوس نہیں کیا جاتا؛ جب کہ مطالب قرآن، تعلیماتِ اسلام اور فرموداتِ نبوی کو سمجھنے کے لئے کسی معلم، کسی مربی اور کسی شارح کی سخت ضرورت ہے، جس کے بغیر دین کا صحیح فہم اور اسلام کی واضح فکر کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ قرآن فہمی کے تعلق سے یوں فرماتے ہیں :

دنیا کے مختلف علوم وفنون اور مختلف زبانوں میں مہارت اور ملکہ پیدا کرنے کے لئے خاص خاص شرائط ہوتی ہیں، اگر وہ طالب علم میں پائی جائیں گی تو اس کو علم خاص میں مہارت پیدا ہوسکے گی ورنہ نہیں ...... پس اسی طرح قرآن مجید کے مطالب کو واقعی طور پر سمجھنے کے لئے علوم وفنون کی دستگاہ اور عربی زبان کے لطیف ذوق کے علاوہ تیسری چیز، قرآن مجید کا خاصہ ہے کہ وہ متوجہ ہونے والے پر (اگر وہ خشوع وخضوع سے متوجہ ہو تو) منکشف ہونے لگتا ہے، بالآخر بے پناہ اثر انداز ہوتا ہے، اس کے

(۱) حدیث بحوالہ: معارف القرآن: ۱/۵۳، (مفتی محمد شفیعؒ)۔

مطالب کو سمجھنے کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ کھلے دل اور بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اس کا مطالعہ کیا جائے۔

قرآن کہتا ہے: اس قرآن سے مس نہیں رکھتے یا نہیں رکھیں گے، بجز ان کے جو پاک (دل) ہوں، (۵۶-۷۹) پاک سے مطلب صرف جسمانی پاکی نہیں ہے؛ بلکہ قلب و ذہن کی پاکی بھی ہے، یہ ایسی شرط ہے کہ اس سے زیادہ واجبی شرط کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔(۱)

درحقیقت قرآن کریم میں بنیادی طور پر دو قسم کی آیات ہیں، قرآن کریم میں پہلی قسم کی جو آیات ہیں، وہ وحدانیت ورسالت کی تعلیمات، موعظت ونصیحت، سبق آموز قصے وواقعات، جنت ودوزخ کے حالات، خوفِ خدا وفکر آخرت، عبادات ومعاملات اور اصلاحِ نیت واخلاقیات پر مشتمل ہیں، اللہ نے قرآن کریم کے ان مضامین کو اس قدر آسان کردیا ہے کہ جس طرح بڑے سے بڑا عالم، حکیم اور فلسفی سمجھ سکتا ہے، اسی طرح ایک عامی دیہاتی اور بے پڑھا لکھا بھی سمجھ سکتا ہے، قرآن کریم میں مندرجہ بالا اُمور اور مضامین کو یقیناً سیدھے سادھے اُسلوب میں پیش کیا گیا اور ہر ایک کے لئے ان باتوں کو سمجھنا اور سمجھانا آسان کردیا گیا ہے، مندرجۂ بالا آیت میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ ان بنیادی باتوں اور ضروری نکتوں کو ہر ایک کے لئے آسان کردیا گیا ہے اور 'یسرنا' کے ساتھ 'الذکر' کی قید لگانے سے نصیحت وعبرت کے لئے ہونا ثابت ہوتا ہے، قرآن کریم میں ذکر سے متعلق جو آیات ہیں، وہ آسان اور عام فہم ہیں، جب عرب کے بدوؤں نے اس قسم کی آیات کو پہلی مرتبہ سنا تو فوراً سمجھ گئے اور انھیں مزید تشریح اور تفصیل کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

''الذکر'' کے معنی نصیحت وعبرت حاصل کرنے کے ساتھ یاد کرنے اور حفظ کرنے کے بھی آتے ہیں، الذکر کا اطلاق ان دونوں معنوں پر ہوتا ہے، آیت مذکورہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن کریم کو یاد کرنے اور حفظ کرنے کے لئے آسان بنایا ہے، یہ خصوصیت اس سے قبل کسی آسمانی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی ہے؛ چنانچہ تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت ہے کہ 'زبور، تورات، انجیل' یا کسی بھی مذہبی کتاب کو نہ کبھی زبانی یاد کیا گیا اور نہ ہی آج ان میں سے کسی کتاب کو یاد کیے ہوئے لوگ دنیا میں پائے جاتے ہیں، قرآن کریم کو تو زبانی یاد کرنے کا یہ عالم ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے قرآن کریم کو ایسا حفظ کرلیتے ہیں کہ ایک زیر زبر کا تک فرق نہیں ہوتا اور پوری دنیا میں حفاظِ کرام کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ اس کا شمار کرنا بھی ممکن نہیں ہے، چودہ سو برس سے ہر زمانے، ہر خطے اور ہر طبقے

(۱) فہم قرآن، از: مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، بحوالہ: احسن البیان فی علوم القرآن۔

میں لاکھوں حافظوں کے سینوں میں یہ قرآن کریم محفوظ چلا آرہا ہے، قرآن کریم کے بہت سے معجزات میں یہ خود ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔

قرآن کریم میں دوسری قسم کی جو آیات ہیں، وہ مسائل کے استخراج، احکام کے استنباط اور معاملات پر اجتہاد سے متعلق ہیں، وہ اپنی جگہ ایک مستقل فن اور مشکل طلب کام ہے، جس میں عمریں لگانی پڑتی ہیں، ہر طرح کی قربانیاں دینی ہوتی ہیں، یہ راسخین فی العلم اور ماہرین فی التفقہ کا میدان ہے، مفسر قرآن رشید رضا مصریؒ کی عبارت سے اس کی وضاحت یوں ہوتی ہے، رشید رضا مصریؒ فرماتے ہیں :

> آپ ﷺ نے علم دین کو کسی شئے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور نہ علم دین میں کسی کو کسی پر فوقیت ہوسکتی ہے؛ البتہ صرف فہم قرآن کی وجہ سے ایک دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے، یہ فہم قرآن دو چیزوں سے حاصل ہوسکتا ہے، پہلا: کسبی اُمور، دوسرا: وہبی اُمور (اس سے مراد خداداد صلاحیت ہے) وہبی امر کی طرف حضرت علی ؓ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: فہم قرآن ایک خاص نعمت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو نوازتا ہے، اس کے علاوہ چیزیں کسبی ہیں اور ان ہی علوم کسبیہ میں مہارت کی وجہ سے علماء ایک دوسرے پر باہمی فضیلت و برتری رکھتے ہیں، مگر جو شخص ان علوم کسبیہ یعنی سیرت محمدی ﷺ، احادیث نبوی ﷺ اور آثارِ صحابہ کرام ؓ سے ناواقف ہو اور علم عربیت سے ناآشنا ہو، اس کو علم وہبی سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔(۱)

یعنی خلوص وتقویٰ کے ساتھ کسبی اُمور میں کوشش اور جستجو کی بنا پر ہی اللہ تعالیٰ وہبی امر سے نوازتا ہے، کسبی اُمور کے بغیر وہبی امر محال ہے۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ فرماتے ہیں :

> قرآن کی صفت یہ ہے کہ یہ بیان کا سہل ترین طریقہ اختیار کرتا ہے اور یہ اپنے مفہوم میں واضح اور روشن کتاب ہے، اسی بنا پر اس کو 'نور' اور 'تفصیل' قرار دیا گیا ہے؛ لیکن یہ نور اسی معنی میں ہے، جس معنی میں سورج آنکھیں رکھنے والوں کے لئے ایک واضح چیز ہے، وہ اندھوں کو نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے قارئین سے تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ پڑھنے والے پر اسی قدر کھلتا ہے، جتنا اس پر غور وفکر کرتا ہے،

(۱) بحوالہ: مقدمہ تفسیر المنار، از: علامہ رشید رضا مصری، ط: دار المعارف، مصر۔

یہ کتاب اگر چہ ہمیشہ سے نفع بخش، ہدایت دینے والی اور واضح ہے؛ لیکن اس کے ساتھ یہ گہری حکمتوں اور ادب کی باریکیوں کا سرچشمہ بھی ہے، جس طرح دوسرے علوم میں آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے وہ معلوم سے غیر معلوم تک رسائی کرتا چلا جاتا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی ارشاد ہوا: ''وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَ آتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ''(سورۂ محمد:۱۷)''اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی، اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی اور ان کے حصہ کا تقویٰ ان کو عطا کیا''یعنی جو لوگ ہدایت پاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں اضافہ فرماتا ہے۔(۱)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنا یا قرآن کریم کا درس دینا نہایت نازک، مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے، قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنے یا قرآن کریم کا درس دینے کے لئے کسبی علوم ضروری ہیں، جو درحقیقت شرائط تفسیر ہیں، ان کے بغیر تفسیر بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

شرائطِ تفسیر اس طرح ہیں

(۱) علومِ اسلامیہ میں تبحر — یعنی علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ، اُصولِ تفسیر، اُصولِ حدیث، اُصولِ فقہ، حیات نبوی ﷺ اور سنن نبوی ﷺ سے مکمل واقفیت اور گہرے علم کی ضرورت۔

(۲) حیاتِ صحابہ کرام ؓ اور آثارِ صحابہ کرام ؓ پر گہری نظر۔

(۳) سلف صالحین کی قرآنی تحقیقات کا وسیع مطالعہ۔

(۴) مکی دور اور مدنی دور کی خصوصیات سے پوری واقفیت۔

(۵) عربی زبان اور اس کے متعلقات جیسے صرف ونحو، فصاحت و بلاغت، ادب وانشاء میں مہارت۔

(۶) فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور ادب پر ٹھوس معلومات۔

(۷) ذوقِ قرآنی۔

ذوقِ قرآنی جو تفسیر کی روح ہے، اس کا ہونا ضروری ہے، پہلے چھ اُمور کسبی ہیں اور ساتواں امر وہبی ہے، اس لئے قرآن کریم کی تفسیر بیان کرنا یا قرآن کریم کا درس دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے؛ البتہ جو ان شرائط کو پورا کرے اور مذکورہ علوم سے واقف ہو جائے وہ تفسیر بیان کرسکتا ہے، جس طرح تفسیر بیان کرنے کے لئے کچھ

---

(۱) تفسیر قرآن کے اُصول:۱۶، از علامہ حمید الدین فراہیؒ۔

شرائط اس سے قبل بیان کیئے گئے ہیں، اسی طرح بنیادی قرآن فہمی کے لیئے چند ہدایات پیش کی جارہی ہیں، جن کی روشنی میں بنیادی قرآن فہمی ممکن ہے، اگر کسی کی سرپرستی ونگرانی میں ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو انشاء اللہ قرآن فہمی کا کسی حد تک حق ادا ہوسکتا ہے، مزید اللہ توفیق دے اور محنت جاری رہے تو راہِ قرآن میں ترقی کے منازل طے ہوسکتے ہیں۔

بنیادی قرآن فہمی کے لیئے چند ہدایات

(۱) درسِ قرآن کی مجلسوں میں شرکت۔

(۲) مفسرین کرام یا تفسیری موضوع پر وسیع مطالعہ رکھنے والے علماء کرام کی صحبت۔

(۳) چند اہم مقدماتِ قرآن سے استفادہ۔

(۴) تفسیری موضوع پر چند بنیادی کتابوں کی مراجعت۔

(۵) صاحب قرآن کریم رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا اجمالی مطالعہ۔

(۶) صحابہ کرام اور صالحین اُمت کی حیات اور خدمات کے تعلق سے ضروری معلومات۔

(۷) عربی زبان سے بنیادی واقفیت۔

قرآن فہمی کے لیئے ابن کثیرؒ کا اُصول

مطالعہ قرآن اور فہم قرآن کے لیئے امام ابن کثیر دمشقیؒ نے اپنی تفسیر میں چار بنیادی طریقے بتائے ہیں، جس کی تشریح راقم نے اپنے الفاظ میں کی ہے۔

(۱) تفسیر القرآن بالقرآن۔

(۲) تفسیر القرآن بالحدیث۔

(۳) تفسیر القرآن باقوالِ الصحابہ۔

(۴) تفسیر القرآن باللغۃ العربیہ۔

قرآن کریم کی تفسیر قرآن سے کی جائے ''**فذکر بالقرآن**''(ق:۴۵) قرآن کو قرآنی انداز سے سمجھا جائے، یعنی جو بات کہیں مجمل ومبہم نظر آتی ہے اس کی تفصیل اور پوری وضاحت دوسری جگہ کردی گئی ہے، اس لیئے کہ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اس کا طریق اظہار نہایت سادہ اور آسان ہے، قرآن کریم کی تفسیر احادیث کی روشنی میں کی جائے، یعنی مرادِ الٰہی متعین کرنے کے لیئے ارشاداتِ نبوی ﷺ کی رہنمائی حاصل کی جائے، اس لیئے کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہی

معتبر ہے اور احادیث درحقیقت قرآن کریم کی تشریح وتوضیح ہیں ،قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام کے اقوال واعمال کے مطابق یعنی صحابہ کرام نے کس آیت کا کیا مطلب لیا ہے اور اپنی زندگی میں کس طرح عمل کر کے دکھایا ہے اس کو ترجیح دی جائے ،اس لئے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے قرآن کے پیغام کو سنت نبوی ﷺ کی روشنی میں قبول کیا اور قرآن کے بتائے ہوئے راستوں پر کامیابی کے ساتھ گامزن ہوئے ،ان ہی کے سمجھائے ہوئے مطالب قرآن کو فہم قرآنی کا معیار قرار دیا جائے ،قرآن کریم کو عربی لغت اور قواعدِ عربیت سے سمجھا جائے ،لفظ کا وہ معنی لیا جائے ،جو عہدِ نزولِ قرآن میں لیا جاتا تھا،اس سلسلہ میں ابن جریرؒ کی تفسیر طبری اور امام سیوطیؒ کی تفسیر درِ منثور بہت مشہور ہیں،تفسیر ابن کثیر بھی افادی حیثیت اور کتب احادیث کے حوالوں کے اعتبار سے بہت مشہور ہے۔

قرآن فہمی کے لئے دادا حضرتؒ کا ارشاد

قرآن فہمی کے تعلق سے دادا حضرت داعیٔ احسان ومفسر قرآن مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ حسینی بختیاریؒ اس طرح رقم طراز ہیں ،قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ان چند چیزوں کی شدید ضرورت ہے :

(۱) جس ذاتِ بابرکت پر قرآن مجید ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا اس کی زندگی کا ہر گوشہ پیش نظر رہنا چاہئے ؛ تاکہ قرآنی تعلیم کا صحیح معیار قائم ہو سکے اور نہایت صحیح ذوق پیدا ہو جائے ، جب تک رسول اکرم ﷺ کی پوری سوانح حیات محفوظ نہ ہوگی قرآن کی پیش کردہ دعوت حق کو سمجھنا بالکل دشوار ہے ، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کو صرف قرآن کا تلاوت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ؛ بلکہ تلاوت آیات کے ساتھ ساتھ تعلیم کتاب بھی آپ ﷺ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے ،پس آپ ﷺ کی ذات قرآن کی مبلغ ،تالی اور معلم ہے ؛ چنانچہ فرمایا گیا :

> هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ . (الجمعۃ:۲)
>
> وہی خدائے قدوس ہے ،جس نے ان میں ان ہی میں کا ایک رسول مبعوث کیا ،جو ان لوگوں کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو کتاب الٰہی اور عقلمندی کی تعلیم دیتے ہیں اور اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

(۲) جس جماعت نے قرآن کو اس کے نازل ہونے کے زمانے میں خود رسول اکرم ﷺ سے پڑھا ،یعنی صحابہ کرام نے کیوں کر دربارِ نبوت سے درسِ قرآن حاصل کیا اور اس کی وجہ سے ان کی ذہنیت میں کیا انقلاب پیدا ہوا اور اس ذہنی افتاد کا ان کی عملی زندگی پر کہاں تک اثر پڑا ان سب باتوں کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

(۳) قرآن عزیز کی زبان، جس کو خود قرآن ہی نے عربی مبین سے تعبیر کیا ہے، اس کا جاننا لازمی ہے، جس کے لئے عربی قواعد صرف ونحو، معانی وبیان اور لغت وادب سے واقف ہونا لابدی ہے؛ تاکہ صحیح عربیت کا مذاق پیدا ہو جائے، خصوصاً نزولِ قرآن کے زمانہ کا لٹریچر جاننا اور دورِ جاہلیت کے استعمالات ومحاورات سے واقفیت بہت ہی ضروری ہے۔(۱)

قرآن فہمی—مکی ومدنی سورتوں کی روشنی میں

راقم الحروف نے عنوان ہٰذا کے تحت اپنے دادا حضرت مفسرِ قرآن مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ حسینی بختیاریؒ کے چند تفسیری ملفوظات، جو مکی اور مدنی سورتوں سے متعلق ہیں، انھیں اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے، ان تفسیری ملفوظات سے قارئین کو قرآن کریم کی مکی اور مدنی سورتوں کا اجمالی تعارف حاصل ہوتا ہے۔

مکی سورتیں

مکی سورتوں پر غور وفکر کرتے وقت چند بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(۱) عقیدۂ توحید کو راسخ کرتے ہوئے اللہ کی ذات وصفات کو سمجھنا۔

(۲) اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے گناہوں اور نافرمانیوں سے بچنا، اس کے لئے قرآن کریم میں جو آیاتِ وعید ہیں، ان پر تدبر وتفکر سے کام لینا۔

(۳) اللہ کی نعمتوں کے استحضار کے ساتھ اللہ کی رحمت کے طلب گار بنتے ہوئے قرآن کریم میں وعد (وعدوں) کی جو آیات آیات ہیں، ان پر یقین کامل پیدا کرنا۔

(۴) فضائل اخلاق (تحلیہ بالفضائل) اور رذائل اخلاق (تخلیہ عن الرذائل) کا شعور اپنے اندر پیدا کرنا؛ تاکہ نیکیوں سے آراستہ ہو سکیں اور برائیوں اور خرابیوں سے اپنا دامن بچا سکیں۔

(۵) زندگی کے بعد ملاقاتِ رب کے تصور کو دل ودماغ میں پختہ کرنا۔

مدنی سورتیں

مدنی سورتوں پر غور وفکر کرتے وقت بھی چند بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(۱) مدنی سورتوں پر غور وفکر کرتے وقت اطاعتِ خداوندی کے ساتھ اطاعتِ نبوی ﷺ وحب نبوی ﷺ کی علمی وعملی صورتیں کیا ہیں، ان پر غور وفکر سے کام لینا۔

---

(۱) ماخوذ از: ماہنامہ مصحف اکتوبر ۱۹۳۷ء، جامعہ دار السلام عمر آباد، تمل ناڈو۔

(۲) قرآنی تعلیمات اور نبوی ارشادات پر عمل پیرا ہونے کی حتی المقدور کوشش کرنا۔

(۳) قرآنی ہدایات اور اسوۂ نبوی ﷺ کی روشنی میں معاشرتی و عائلی مسائل کا حل ڈھونڈنا۔

(۴) معاملات کی درستگی، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی فکر کرنا۔

(۵) عدل اجتماعی اور دعوت الی اللہ کے فریضے کو سمجھ کر ان سب کو اپنانے اور بحسن و خوبی انجام دینے کی کوشش کرنا۔

اسی طرح ہمیں قرآنی مضامین کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کرنے کی بھی کوشش کرنا ہے، اس سلسلے میں امام ابن کثیرؒ کے اُصولِ تفسیر (جن کا ذکر گزر چکا ہے) ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماءِ حق کی تفاسیر سے رجوع ہونا بھی گزیر ہے۔

مجموعی حیثیت سے قرآنی آیات میں غور و فکر اور تدبر و تفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ قرآن ہم سے کیا کہتا ہے، اس وقت دنیا میں جو ہو رہا ہے قرآن میں اس کا کیا حل ہے، دشمنانِ اسلام کی سازشوں پر کس طرح روک لگائی جائے، موجودہ دور کے نامساعد حالات میں قرآنی ارشادات اور نبوی فرمودات سے کس طرح رہبری و رہنمائی حاصل کی جائے کہ ہمارا روشن و تابناک ماضی لوٹ آئے اور ہمیں فکر کرنی ہے کہ دنیائے انسانیت تک ربانی ہدایات اور نبوی تعلیمات کو کس طرح پہنچایا جائے؛ تاکہ انسانیت کو دنیا میں حقیقی سکون و چین اور آخرت کی ابدی کامیابی و کامرانی نصیب ہو جائے، اسی طرح عقائد صحیحہ و اعمالِ صالحہ، عبادات و معاملات، فرائض و واجبات اور معروفات و منکرات، اجتماعی زندگی کے قواعد اور اسلام کے عائلی اور اجتماعی نظام جیسے موضوعات پر تدبر و تفکر سے کام لیا جائے اور عمل پیرا ہونے کی پوری پوری کوشش کی جائے۔

ناسخ منسوخ، حروفِ مقطعات اور متشابہات پر مبنی موضوعات جیسے: وجہ اللہ (اللہ کا چہرہ) ید اللہ (اللہ کا ہاتھ) وغیرہ پر بحث و مباحثہ کرنے سے گریز اختیار کیا جائے، اس لئے کہ یہ مفسرین کرام اور محققین عظام کا میدان ہے۔

نہ اُلجھاؤ ان کو کرامات میں
جو نازک ہیں ایسے مقامات میں

اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں محکم آیات بھی نازل کی ہیں اور متشابہ آیات بھی، تدبر و تفکر کا موضوع محکم آیات پر مشتمل ہونا چاہئے اور متشابہات کی تاویل سے اجتناب اختیار کرنا چاہئے، ارشاد ربانی ہے:

فَأَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ . (آلِ عمران:۷)

سو جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ پیروی کرتے ہیں، متشابہات کی۔

قرآن فہمی کے لئے بنیادی کتابیں

مطالعہ قرآن اور فہم قرآن کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتابیں نہایت مفید، مستند اور رہنما ہیں، یہ کتابیں قرآنیات، سیرت طیبہ، صحابہ کرام ﷺ اور صالحین اُمت کی حیات اور خدمات، اسی طرح عربی زبان سے بنیادی واقفیت کے لئے بہت مفید اور معلوماتی ہیں، قرآنی مراجع اور کتبِ تفاسیر سے راست استفادہ کرنے سے قبل تمہید کے طور پر حسب استعداد، ان کتابوں کا مطالعہ کرلیا جائے؛ تاکہ فہم قرآن اور تدبر قرآن میں آسانی پیدا ہوجائے اور فہم قرآن کا صحیح معنی میں حق ادا کرنے کی کوشش ہوسکے، خاص طور پر ان حضرات کے لئے جو تفسیری مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں اور درسِ قرآن کی مجلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔

قرآنیات

- مطالعہ قرآن کے اُصول ومبادی: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ۔
- قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے: مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔
- تفسیر قرآن کے اُصول: علامہ حمیدالدین فراہیؒ۔
- قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ۔
- فہم قرآن: پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ۔
- قرآنی افادات: مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ۔
- قرآنی مقالات: مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ حسینی بختیاریؒ، مرتب: مولانا سید کمال اللہ بختیاری ندوی۔
- قرآن اور تعمیر سیرت: ڈاکٹر میر ولی الدینؒ۔
- قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟: مولانا محمد منظور نعمانیؒ۔
- وہ ذہن جس کی تعمیر قرآن کرتا ہے: ڈاکٹر سید عبداللطیفؒ۔
- قرآن آپ سے مخاطب ہے: مولانا سید محمد الحسنیؒ۔
- خطباتِ بہاولپور حصہ قرآن: ڈاکٹر محمد حمیداللہ پیرسؒ۔
- افاداتِ تدوین قرآن: مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مرتب: جناب غلام ربانی۔
- قرآن اور سائنس اور مسلمان: مولانا محمد شہاب الدین ندویؒ۔

- تعلیم القرآن: مولانا اویس نگرامی ندویؒ۔
- قرآنی شعورِ انقلاب: مولانا عبید اللہ سندھیؒ۔
- قرآن سے استفادہ کس طرح کیا جائے؟: مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ۔
- علوم القرآن: مفتی محمد تقی عثمانی۔
- تاریخ افکار علوم اسلامی حصہ اول: راغب الطباخؒ، مترجم افتخار احمد بلخی۔
- ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ: مولانا اخلاق حسین قاسمی۔
- قرآن نمبر نقوش: ادارۂ فروغ اُردو پاکستان۔
- قرآن نمبر راہِ اعتدال: جامعہ دار السلام عمر آباد، تمل ناڈو۔
- قرآن پاک کی تعلیم اور اس کی عظمت: مولانا مجیب اللہ ندویؒ۔
- قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ: ڈاکٹر مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ۔
- تاریخ تفسیر و مفسرین: مترجم غلام حریریؒ۔

چند منتخب مقدمات قرآن کریم

تفسیری مطالعہ کرنے والوں کے لئے درج ذیل مقدمات قرآن کریم کلید کی حیثیت رکھتے ہیں، ان مقدمات سے قرآن کریم کے مقاصد، افکار، احکام، تعلیمات، نظریات اور تاریخی واقعات سے بھرپور واقفیت ہوتی ہے۔

- مقدمہ تفسیر بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانویؒ۔
- مقدمہ تفسیر معارف القرآن: مولانا محمد شفیعؒ۔
- مقدمہ تفسیر ترجمان القرآن: مولانا ابوالکلام آزادؒ۔
- مقدمہ تفسیر ماجدی: مولانا عبد الماجد دریابادیؒ۔
- مقدمہ تفسیر فی ظلال القرآن: مولانا سید قطب شہیدؒ۔
- مقدمہ تفسیر عثمانی: مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔
- مقدمہ تفسیر تدبر قرآن: مولانا امین احسن اصلاحیؒ۔
- مقدمہ تفسیر نظام القرآن: مولانا حمید الدین فراہیؒ۔

- ⊙ مقدمہ تفسیر پیغامِ قرآن: مولانا رشید رضا مصریؒ۔
- ⊙ مقدمہ تفسیر حقانی: شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔

سیرت طیبہ کا اجمالی مطالعہ

- ⊙ رحمت عالم: مولانا سید سلیمان ندویؒ، دارالمصنفین اعظم گڑھ (یوپی)۔
- ⊙ رحمت للعالمین: مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔
- ⊙ نبیٔ رحمت: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔
- ⊙ خطباتِ مدراس: علامہ سید سلیمان ندویؒ، دارالمصنفین اعظم گڑھ (یوپی)۔
- ⊙ النبی الخاتم: مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مکتبہ فیض، جامع مسجد دہلی۔
- ⊙ انبیاء کرام: مولانا غلام رسول مہر، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

صحابہ کرام اور صالحین اُمت کی حیات اور خدمات کے تعلق سے چند اہم کتابیں

- ⊙ حیاۃ الصحابہ: مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ، مرکزی نظام الدین نئی دہلی۔
- ⊙ خلافتِ راشدہ تلخیص از: ''ازالۃ الخفاء'' مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مکتبہ دانش، دیوبند۔
- ⊙ سیرتِ عائشہؓ: علامہ سید سلیمان ندویؒ دارالمصنفین اعظم گڑھ (یوپی)۔
- ⊙ خلفاء اربعہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام لکھنؤ۔
- ⊙ تاریخ دعوت وعزیمت: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام لکھنؤ۔

عربی زبان سے بنیادی واقفیت کے لئے چند مفید کتابیں

- ⊙ عربی زبان کے دس سبق: مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مکتبہ ندویہ لکھنؤ۔
- ⊙ المحاورۃ العربیہ: مولانا محبوب الرحمٰن ندوی ازہری، مکتبہ ندویہ لکھنؤ۔
- ⊙ اللغۃ العربیۃ لغیر الناطقین بہا: دکتور عبدالرحیم، اسلام فاؤنڈیشن ٹرسٹ، چنئی۔
- ⊙ منہاج العربیہ: پروفیسر سید نبی حیدر آبادیؒ، ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس حیدر آباد دکن۔
- ⊙ تحفۃ الصرف وتحفۃ النحو: مولانا سراج الدین ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی۔

چند لغات رفہارس

- مفردات القرآن : امام راغب اصفہانیؒ۔
- مترادفات القرآن : مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ۔
- المعجم المفہرس : علامہ محمد فواد عبدالباقیؒ۔
- تعلم لغۃ القرآن : دکتور عبداللہ عباس ندویؒ۔
- لغات القرآن : مولانا عبدالکریم پاریکھؒ۔

⊙ ⊙ ⊙

قرآنِ کریم کا اعجاز لامحدود ہے!

مولانا سید خلیل حسنی ندوی⊙

قرآن کریم اپنی زبان و بیان اور مضامین کے اعتبار سے ہر زمانہ میں بحث وتحقیق کا موضوع رہا ہے، اس لئے کہ وہ عربی میں نازل ہونے کے باوجود ہر دور اور ہر قوم کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے :

لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلا تَعْقِلُوْنَ . (الانبیاء:۱۰)

ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَى عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ .

(الاعراف:۵۲)

اور ہم نے ان کے پاس کتاب پہنچادی ہے، جس کو علم و دانش کے ساتھ کھول کر بیان کردیا ہے اور مومن لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔

ایک دوسری خصوصیت کی طرف اشارہ اس طرح کیا گیا ہے :

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ ، إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْن .

(یوسف:۱-۲)

یہ کتاب روشن کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا؛ تاکہ تم سمجھ سکو۔

عربوں کو چوں کہ فصاحت و بلاغت کا دعویٰ تھا اور یہ ان کا امتیاز تھا، وہ دوسری قوموں کو عجمی سمجھتے تھے اور وہ قرآن کریم کے مخاطب اول تھے، اس لئے قرآن کریم نے ان کو اس بنیاد پر چیلنج کیا کہ وہ اس سے بہتر نمونہ لاکر دکھائیں، وہ اس میں ناکام رہے؛ بلکہ ان کے اہل علم وذوق نے اس کے معجز ہونے کا اقرار کیا، ولید بن مغیرہ نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے، آپ ﷺ کو قرآن کریم کی بعض آیتیں تلاوت کرتے ہوئے سنا تو اتنا متاثر ہوئے کہ وہ بھاگے ہوئے قریش کے بعض سرداروں کے پاس آئے اور کہا کہ :

⊙ ریسرچ اسکالر: المجمع العلمی للدراسات فی علوم القرآن والسنہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

واللہ لقد سمعت من محمد كلاماً ما هو من كلام الإنس ، ولا من كلام الجن ، وإن له لحلاوة ، وإن عليه لطلاوة ، وإن أعلاه لمثمر ، وإن أسفله لمغدق .

خدا کی قسم میں نے محمد (ﷺ) کو ایسا کلام پڑھتے سنا ہے کہ جو نہ تو انسانوں کا کلام ہوسکتا ہے اور نہ جنات کا، اس میں تو بڑی مٹھاس اور بڑا بانکپن اور دل کشی ہے، اس کا اوپری حصہ (یعنی ظاہری الفاظ) بڑا پھل دار (بڑا سامعہ نواز اور حسین) اور اس کا نچلا حصہ بہت زیادہ پانی والا ہے (یعنی معانی اور مطالب کے لحاظ سے بہت دقیق اور گہرا ہے)۔

اس اعتبار سے قرآن کریم کا بنیادی اعجاز اعجاز بیانی قرار پایا۔

قرآن کریم اعجاز بیانی کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت، علم وفکر، اخبار بالغیب، اُمم سابقہ کا تذکرہ، غلط تصورات اور معتقدات کی تصحیح، خلق انسان اور کائنات کے اسرار اور خدا کی مخلوقات کی خصوصیات، طبیعت انسانی کے رجحانات اور صلاحیتوں، اعمالِ انسانی کے نتائج اور اثرات اور اس طرح کے انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

ان مختلف اور متعدد خصوصیات کی وجہ سے قرآن کریم پر ہر دور میں اہل علم نے اپنے اپنے زاویوں سے کام کیا، ابتدائی دور بیان کا تھا، اس لئے عربوں کا یہ امتیاز تھا، اس لئے قرآن کریم کے اعجاز بیانی پر زیادہ کام ہوا اور اس موضوع پر ایک کتب خانہ تیار ہوگیا اور اس کا سلسلہ اس عہد تک جاری ہے۔

فلسفہ سے استدلال اور علم کلام سے دلچسپی سے قرآن کے بیانی اعجاز کے ساتھ اس کے علمی اعجاز کی طرف توجہ ہوئی، اس دور میں بیان کو کم اہمیت دی گئی، اس لئے اس میں قرآن کریم کے اعجاز علمی پر متعدد اہل علم کے قلم سے کتابیں شائع ہوئیں جن کا سلسلہ اس دور میں جاری ہے اور اس موضوع پر مختلف سیمینار اور کانفرنس منعقد کی جارہی ہیں اور قرآن اور سائنس کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے؛ لیکن اعجاز بیانی وہ اعجاز ہے جس کا قرآن کریم نے خود دعویٰ کیا ہے اور اس پر چیلنج کیا ہے، اس لئے اس کے ساتھ اعجاز بیانی پر بھی کام جاری ہے۔

قرآن کریم کے ترجمے بھی ہر دور میں ہوئے اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہندوستان میں فارسی اور علاقائی زبانوں میں ترجمے کئے گئے، اس دور میں یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمے کئے جارہے ہیں۔

ترجمہ قرآن میں اعجاز کے سارے پہلوؤں کا خیال رکھنا مشکل کام ہے، مختلف اُردو تراجم کے مطالعہ

اور تقابل سے اس دشواری کا اندازہ ہوتا ہے، اس دور میں یورپ کی مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمہ ہو رہے ہیں اور پڑھنے والے متأثر ہو رہے ہیں، باوجود ان کمیوں اور دشواریوں کے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بڑا ہی نازک اور انتہائی خطرناک ہے، مترجم کی ثقافت اور دونوں زبانوں کے مزاج وخصوصیات سے واقفیت کا اثر ترجمہ پر پڑتا ہے، عربی زبان سے واقفیت، عربی ماحول ومزاج، قرآن مجید کے زمانۂ نزول کے حالات، پس منظر، عربی زبان کے علوم سے واقفیت اور ان میں مہارت اور عربی زبان کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی صلاحیت کا ترجمہ پر اثر انداز ہونا لازمی ہے، اس لئے کہ عربی زبان دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کئی اعتبار سے ممتاز اور منفرد ہے، عربی زبان میں ایک لفظ کے معنی موقع ومحل کے اعتبار سے بدل جاتے ہیں، اسی طرح صلات، ضمائر، فواصل، تقدیم وتاخیر، متکلم ومخاطب کے صیغوں کی تبدیلی اور سیاق وسباق سے معانی میں تبدیلی ہو جاتی ہے، مترجم کی قوت فہم وادراک اور عربی زبان کے ذوق ہی نہیں، مزاج اور فکری رجحان سے بھی تراجم میں فرق پڑتا ہے، جو شخص بھی مختلف تراجم کا جائزہ لے گا اور ان کا موازنہ کرے گا تو اس کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو کر آجائے گی کہ قرآن کے معانی کا پوری طرح کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ہے، بہت سے مصنفین نے قرآن مجید کی بلاغت، فصاحت، اعجاز اور مشکل قرآنی الفاظ کے حل پر رہنما کتابیں لکھی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح قرآنی الفاظ کے اصل مفہوم تک رسائی ہو سکتی ہے اور یہ اعتراف کیا ہے کہ قرآن مجید نے جن لفظی اور معنوی رعایتوں کا لحاظ رکھا ہے اور جو باریکیاں اور قوت وتاثیر ان کے اندر پنہاں ہے، ان تمام باریکیوں اور ظاہری ومعنوی محاسن اور فنی اور ادبی خوبیوں کا دوسری زبان میں دونوں زبانوں میں ماہر ادیبوں کے لئے بھی مشکل ہوتا ہے، چہ جائیکہ ان لوگوں کے لئے جو عربی زبان سے بہت کم واقفیت رکھتے ہوں اور ان کی ثقافت بھی محدود ہو۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے مفسر اور مترجم قرآن کریم کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے، وہ لکھتے ہیں :

(۱) لغت، جس سے کلام پاک کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہو جاویں، (۲) نحو کا جاننا ضروری ہے، اس لئے کہ اعراب کے تغیر وتبدل سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں اور اعراب کی معرفت نحو پر موقوف ہے، (۳) صرف کا جاننا ضروری ہے، اس لئے کہ بناء اور صیغوں کے اختلافات سے معانی بالکل مختلف ہو جاتے ہیں، ابن فارس کہتے ہیں کہ جس شخص سے علم صرف فوت ہو گیا اس سے بہت کچھ فوت ہو گیا، (۴) اشتقاق کا جاننا ضروری ہے، (۵) علم معانی کا جاننا ضروری ہے، (۶) علم بیان کا جاننا ضروری ہے، (۷) علم بدیع کا جاننا ضروری ہے (یہ تینوں فن علم

بلاغت کہلاتے ہیں)، (۸) علم قرأت کا بھی جاننا ضروری ہے، (۹) علم عقائد کا بھی جاننا ضروری ہے، (۱۰) اُصولِ فقہ کا معلوم ہونا ضروری ہے، (۱۱) اسبابِ نزول کا معلوم ہونا ضروری ہے، (۱۲) ناسخ ومنسوخ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے، (۱۳) علم فقہ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے، (۱۴) ان احادیث کا جاننا ضروری ہے جو قرآن کی مجمل آیات کی تفسیر واقع ہوئی ہیں، (۱۵) ان سب کے بعد پندرہواں وہ علم وہبی ہے جو حق سبحانہ وتقدس کا عطیۂ خاص ہے، اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتا ہے جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے :

من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم . (۱)

جب بندہ اس چیز پر عمل کرتا ہے جس کو جانتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ ایسی چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتا۔

قرآن کریم کے ترجمہ کی ایسے بہت سے لوگوں نے کوشش کی، جن کے اندر اس غیر معمولی اور عظیم خدمت سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ تھی، علماء نے قرآن مجید کے معانی کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی جو بہت سی شرائط رکھی ہیں، افسوس ہے کہ بہت سے مترجمین نے ان کا لحاظ نہیں رکھا، جب کہ علماء سلف اس معاملہ میں انتہائی ذکی الحس واقع ہوئے تھے، وہ اس بارے میں اتنے محتاط تھے کہ قرآنی الفاظ کی شرح میں بھی ان کو تردد ہوتا تھا، علامہ اصمعی جیسے امام ادب نے قرآنی لفظ ''الخبز'' کے معنی اس لئے نہیں بتائے کہ معلوم نہیں یہ قرآن مجید میں کس سیاق میں آیا ہے؟ عصر حاضر کے سب سے بڑے ادیب مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی جن کا ترجمۂ قرآن (انگریزی اور اُردو) بہت مقبول ہوا اور انھوں نے اس کی کوشش کہ قرآن کریم کے اعجاز کے مختلف پہلوؤں کو ادا کیا جاسکے، اس کا اعتراف کیا ہے کہ قرآنی الفاظ اور تعبیرات کو دوسری زبان میں منتقل کرنے میں بہت سی دشواریاں ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ نے اپنی کتاب ''مطالعۂ قرآن کے اُصول ومبادی'' میں ترجمۂ قرآن کی دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مستشرقین کا ذکر کیا ہے، کہ وہ نہ عربی زبان وثقافت سے واقف تھے اور نہ ہی اسلامی ماحول اور تہذیب سے ان کی شناسائی تھی، ایسے لوگوں نے قرآن کی غلط ترجمانی کی، اسی طرح بعض علماء جو اگرچہ مسلمانوں میں ایک مقام رکھتے تھے؛ لیکن قرآن مجید کے ترجمہ میں جس ادبی ذوق اور عربی زبان سے جس گہری واقفیت اور تعبیر پر جس غیر معمولی قدرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ چوں کہ اس سے یکسر خالی تھے؛ اس لئے ان کے تراجم سے بہت سے مغالطے اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، حضرت مولانا لکھتے ہیں :

(۱) رواه ابو نعيم فى الحليه: ۱۵/۱۰، وضعفه۔

> قرآن مجید صرف اپنے الفاظ وترکیب اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے؛ بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی ومضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم و معارف میں بھی، معلومات غیبی اور حقائق ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی، اخلاقی و معاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات و انقلابات میں بھی، اپنی پیشین گوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے، مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کامل کا صرف ایک پہلو اور گوشہ ہے کوئی مقابلہ نہیں ہوسکا تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلث ہوسکتی ہے۔

قرآن کریم کے اعجاز بیانی پر قرون اولیٰ میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا، بعد کے عہد میں اعجاز علمی کی طرف توجہ ہوئی اور اس موضوع پر متعدد اہل علم کے قلم سے کتابیں تصنیف کی گئیں اور قرآن کریم اور جدید علم وسائنس کے درمیان مطابقت کی کوشش کی گئی، اگر چہ یہ کوشش خطرہ سے خالی نہیں ہے، اس عہد میں متعدد ملکوں میں اعجاز علمی پر سیمینار بھی منعقد کئے گئے اور کئے جارہے ہیں؛ لیکن چوں کہ قرآن کریم کتاب خالد ہے، اس لئے اس کا اعجاز بھی خالد ہے، ڈاکٹر محمود شاکر نے ''الظاهرة الكونية في القرآن '' (مؤلفہ ڈاکٹر مالک بن نبی) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ قرآن ہر عہد کے اعتبار سے معجز ہے اور اس دور میں جو چیز عقل وقلب کے لئے مؤثر ہوگی، قرآن کریم کا اعجاز اس زاویہ سے ظاہر ہوگا۔

اس دور میں قرآن کریم کے خلاف تحریک چل رہی ہے اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ قرآن جنگ اور تشدد سکھانے والی کتاب ہے، ہندوستان میں ان آیات کا انتخاب کرکے اس دعویٰ کو پیش کیا گیا اور یورپ میں ''فتنہ'' نامی فلم بنائی گئی، اس لئے اس وقت ضرورت ہے اس بات کی کہ قرآن کریم میں انسانیت کی فلاح و بہبود، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی رہنمائی کے لئے جو اُصول بیان کئے گئے ہیں، ان کو معاصر علمی انداز میں پیش کیا جائے، یہ قرآن کریم کا اہم ترین موضوع ہے اور قرآن کریم نے اس کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ یہ کتاب ''هدى للناس''، ''شفاء للصدور'' اور ''بيان للناس'' ہے، ضرورت ہے کہ قرآن کریم کی اخلاقی تعلیمات جو دستورِ حیات ہیں، اس میں انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی، اقتصادی زندگی سے تعلق رکھنے والی مکمل اور مفصل تعلیمات ہیں، ان کو نمایاں کیا جائے، یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے خلق انسان سے لے کر زندگی کے آخری دور تک کے احوال و مراحل اور آداب، حقوق انسان، سماج کی تشکیل اور سماج میں بگاڑ کے اسباب اور اس کے خطرات، غیر مسلموں کے ساتھ سلوک، معاملات

میں تسامح اور اعتدال کو بہت تفصیل سے اور متعدد مواقع پر بیان کیا ہے، اس اعجاز کو جس سے دوسری آسمانی کتابیں خالی ہیں پیش کیا جائے اور اس موضوع پر سیمینار کئے جائیں اور غیر مسلموں کو اس میں مدعو کیا جائے، خاص طور پر وہ افراد جو قرآن کریم پڑھ کر اس کی اخلاقی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام لائے اور ان کی تعداد دنیا کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے، اُمید ہے کہ ہمارے اس سیمینار میں اس پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی اور قرآن کریم کو دستورِ حیات کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

⊙ ⊙ ⊙